ہوشربا

حصہ اول

Pakistanipoint

Waqar Azeem

ابن اقبال

نیلے جاودانی آسمان کے نیچے میں نے اس صحرا میں آنکھ کھولی جہاں زندگی کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ دور کے لوگوں کو یہ دنیا بڑی عجیب وغریب معلوم ہوتی تھی لیکن دشت کے رہنے والوں کے لیے وہاں کوئی عجوبہ نہیں تھا' میری ماں مجھے بتاتی تھی کہ میں بارہ جانوروں کی جنتری کے مطابق بکری کے سال میں پیدا ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چنگیز خاں کو مرے ہوئے آٹھ سال گزر چکے تھے اور دشت پر اس کے بیٹے اوغدائی خاقان کی حکومت تھی۔

میری ماں بڑی خوبصورت عورت تھی کیونکہ اس کا تعلق اس دشت سے نہیں تھا۔ وہ ایرانی تھی۔ جسے زبردستی اٹھا کر یہاں لایا گیا اور وہ چنکائی کی بیوی بن گئی تھی جو چنگیز خاں کے اردو (لشکر) میں دس سپاہیوں کے دستے کا سالار تھا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا اور مجھے معلوم ہوا کہ چنکائی میرا باپ ہے تو میں نے اس کی طرف ان نظروں سے نہیں دیکھا جن میں پسندیدگی کی جھلک ہوتی ہے۔ وہ مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ عام منگولوں کی طرح اس کا بدن بھی چھریرا تھا اور جسم پر بہت کم بال تھے۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اوپری دھڑ غیر معمولی طور پر لمبا ہونے کی وجہ سے ٹانگیں بڑی مختصر سی معلوم ہوتی تھیں اور گھوڑے پر سواری کرتے کرتے خمیدہ ہو گئی تھیں۔ ہاتھ اور کندھے بڑے طاقتور معلوم ہوتے تھے۔

چنکائی نے میری ماں کو کبھی خوش نہیں رکھا' اس لیے مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ میرے اس جذبے میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا اور میں سارے منگولوں سے نفرت کرنے لگا۔ یہ نفرت میرے لیے بڑی مشکلات کھڑی کر دیتی لیکن میری ماں نے مجھے جذبوں کو پوشیدہ رکھنے کا ہنر سکھا دیا تھا۔ میں نے ابتدائی طور پر اپنی ماں سے ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ ایک عالم کی بیٹی تھی۔ اس نے مجھے وہ علوم سکھائے جو صرف اس کے وطن کے لوگ جانتے تھے۔ دشت کے رہنے والے لوگوں کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں

تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ باتیں ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتی تھیں۔

ان وحشیوں نے پہلی مرتبہ جس عالم کو دیکھا' اسکا نام لیوچت سائی تھا ختا کے رہنے والے اس چینی دانشمند کو چنگیز خاں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنے ساتھ رکھا اور اس کی عاقلانہ باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے اوغدائی خاقان نے لیوچت سائی کو اپنا وزیر مقرر کرلیا تھا۔

میری ماں مجھے تاکید کیا کرتی تھی کہ میں عام لوگوں کے سامنے ان باتوں کو زبان پر نہ لایا کروں جو وہ مجھے سکھاتی تھی لیکن میں جو ابھی پختہ عمر کو نہ پہنچا تھا' کبھی کبھی اس کی نصیحت بھول جایا کرتا تھا' میری زبان سے کسی نہ کسی وقت ضرور کوئی ایسی بات نکل جاتی کہ منگول چونک جاتے اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگتے جیسے میں نیلے جاودانی آسمان کی کوئی خاص مخلوق ہوں۔ ایک مرتبہ لیوچت سائی نے بھی میرے منہ سے کوئی ایسی بات سن لی اور چونک پڑا۔ عام منگول چونکنے کے بعد کچھ دیر میں میری باتوں کو بھول جاتے تھے مگر لیوچت سائی ایک ایسا شخص تھا جو کسی بات کو بھی نہیں بھول سکتا تھا۔

وہ مجھ پر خصوصی توجہ دینے لگا۔ اس مردِ عاقل کے ہاتھوں میری تعلیم کا دوسرا دور شروع ہوا لیکن افسوس وہ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا۔

اوغدائی بیل کے سال خاقان بنا تھا اور بارہ سال بعد بیل ہی کے سال میں فوت ہوگیا اس کے مرتے ہی اس کی ملکہ تورا کینہ اپنے بیٹے قویوق کو خاقان بنانے کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف ہوگئی۔ قبائلی دستور کے مطابق مردہ سردار کی پہلی بیوی اس وقت تک پوری طرح بااختیار رہتی ہے۔ جب تک مردہ سردار کا جانشین نامزد نہیں ہوجاتا۔ لیوچت سائی اس کا مخالف تھا لیکن ملکہ کے سامنے اسکی ایک نہ چل سکی اور وہ قراقرم میں خانہ نشیں ہوگیا۔ اسے تورا کینہ کے سخت رویئے سے اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کردیا تھا اور یہی صدمہ بالآخر اس کی جان لے کر رہا۔ اژدہے والے سال کے پانچویں چاند میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت قویوق اس دشت کا خاقان بن چکا تھا۔

ان وحشی منگولوں نے مہذب دنیا کو جس طرح خس و خاشاک میں ملایا' اس کی کہانیاں میں نے اپنی ماں سے سنی تھیں اور ان کہانیوں کو سن سن کر منگولوں سے میری نفرت حد انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ دنیا میں کوئی ایسی طاقت پیدا ہو جو ان منگولوں کو ان کی وحشت و بربریت کی عبرتناک سزا دے اور ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔

میری ماں کہا کرتی تھی کہ جب تک ان منگولوں کا اتحاد پارہ پارہ نہیں ہوجاتا' دنیا کی کوئی طاقت انہیں نہیں مٹا سکتی' چنانچہ میرا دماغ ہر وقت اس مسئلے سے الجھا رہنے لگا کہ ان منگولوں کے اتحاد میں دراڑیں ڈالنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔

ملکہ تورا کینہ کی ایک کنیز فاطمہ ایرانی النسل تھی اور اسے ملکہ کے مزاج میں خاصا دخل حاصل ہوگیا تھا۔ وہ مجھے کئی مرتبہ ختا کے مردِ عاقل لیوچت سائی کے پاس دیکھ چکی تھی اور چونکہ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ میں ایک ایرانی عورت کے بطن سے ہوں اس لیے وہ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آنے لگی تھی۔ اسی کی وجہ سے میرا آنا جانا اس محل میں بھی ہوگیا جو اوغدائی خاقان نے بنوایا تھا۔ اس آمد و رفت سے میں تورا کینہ کی نظر میں آگیا اور اس نے میرے منہ سے ایسی باتیں سنیں کہ میری گرویدہ ہوتی چلی گئی۔ ہر چند وہ باتیں بہت معمولی تھیں لیکن دشت کی ملکہ کو بہت عاقلانہ اور دانشمندانہ باتیں معلوم ہوئیں اور اسطرح مجھے ملکہ کا قرب حاصل ہوگیا۔ یہی وہ وقت تھا جب پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ اب میں ان منگولوں کے اتحاد میں شگاف ڈالنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کرسکوں گا۔

وہ تدبیر سوچنے کے لیے میں اکثر اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا طاقت کے پہاڑ "بور خاں قالدون" کی طرف نکل جاتا جہاں چنگیز خاں کا مدفن ہے۔ اس کی ڈھلوان پر جانور چرتے ہیں اور چرواہے اکتارا بجا کر اس کی آواز سے اپنی تنہائی کا ازالہ کرتے ہیں۔

Pakistanipoint
Web
Gzoom

میں وہاں، کسی گوشہ تنہائی میں جا بیٹھتا اور پہروں بیٹھا سوچتا رہتا کہ مجھے ملکہ تورا کینہ کے قرب سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے سارا دن وہیں گزار دیا اور جب شام ہونے لگی تو واپسی کے ارادے سے اٹھا۔ اس وقت مجھے کوئی ایک تیر کی بلندی پر ایک ہیولیٰ سا نظر آیا۔ وہ بس اتنی دیر کے لیے دکھائی دیا تھا جتنی دیر میں ایک مرتبہ پلک جھپکتی ہے اور مجھے کچھ یوں گمان ہوا تھا جیسے وہ کوئی عورت ہے۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ اس وقت جبکہ اندھیرا پھیلنے میں زیادہ دیر نہیں تھی کوئی عورت اتنی بلندی پر کیوں جا چڑھی تھی؟ میرا تجسس اتنا بڑھا کہ میں نیچے اترنے کی بجائے اوپر چڑھنے لگا اور آخر کار بلندی پر اس جگہ پہنچ گیا جہاں میرے خیال کے مطابق مجھے ہیولا نظر آیا تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میرے قدموں کی آواز نہ ہونے پائے لیکن جب میں اس مقام پر پہنچا تو اندھیرا پھیل چکا تھا اور وہ عورت مجھے نظر نہیں آسکتی تھی۔ میں پریشان ہو گیا کہ اب کیا کروں؟ اندھیرے کی وجہ سے اس عورت کو ڈھونڈنا ممکن نہیں رہا تھا اور میں جانے بغیر لوٹنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ عورت کون تھی اور یہاں کیا کرنے آئی تھی۔

اچانک مجھے ایک جانب کچھ مدھم مدھم روشنی دکھائی دی اور میں بے اختیار اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اب بھی میں اس بات کا خیال رکھ رہا تھا کہ میرے قدموں کی آواز نہ ہونے پائے۔ جلد ہی میں اس روشنی کے قریب پہنچ گیا اور تب میں نے دیکھا کہ وہ روشنی ایک غار کے دہانے سے نکل رہی تھی۔ اس روشنی کو دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ یوں لگا تھا جیسے وہ روشنی منجمد ہو۔ اس میں وہ کپکپاہٹ نہیں تھی جو مشعل کے شعلے کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ مجھ پر خوف طاری ہونے لگا لیکن اس خوف کے باوجود کچھ جاننے کی خواہش ختم نہیں ہو سکی خوف نے تذبذب پیدا کر دیا تھا جس کے باعث میرے قدم غار کے دہانے کی طرف بڑھتے ہوئے رک رک کر اٹھ رہے تھے۔

غار کے دہانے پر میں نے چٹان سے چپک کر بڑی احتیاط سے جھانکا اور مجھے وہاں جو عورت نظر آئی، اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہو گئیں۔ وہ تو کوئی سولدہ (روح) معلوم ہو رہی تھی۔ عام عورتیں ایسی نہیں ہوتیں جیسی وہ تھی۔ اس کا لباس، اس کا جسم، اس کی رنگت، اس کے بال، اس کا چہرہ مہرہ، سبھی کچھ مجھے بڑا اجنبی معلوم ہوا۔ اس کے قریب ہی ایک مشعل جل رہی تھی لیکن ایسی مشعل بھی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ ایک ڈبہ سا تھا جس سے روشنی باہر نکل رہی تھی اور اس روشنی میں مشعل کے شعلے کی سی کپکپاہٹ بالکل نہیں تھی۔

وہ ضرور کوئی سولدہ ہے۔ مجھے یہاں سے فوراً بھاگ جانا چاہیے۔ میرے دل میں خیال آیا۔

"اندر آجاؤ منگول!" مجھے ایک سریلی آواز سنائی دی۔

سولدہ مجھ سے مخاطب ہوئی تھی! اس خیال سے میرے پسینے چھوٹ گئے، اگر کوئی درندہ بھی میرے سامنے آجاتا تو میں اتنا خائف نہیں ہوتا جتنا اس وقت ہو گیا تھا۔ میں بہت تیزی سے مڑا۔

"منگول!" سولدہ نے مجھے پھر پکارا۔

لیکن میں اب وہاں رکنے والا نہیں تھا۔ میں شاید گھوڑے کی سی رفتار سے بھاگ نکلا۔ بلندی سے نشیب کی طرف اس طرح دوڑنا بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے لیکن اس وقت میرے لیے سب سے بڑا خطرہ صرف سولدہ تھی۔ میں نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی، اس ماحول میں روحوں سے خوفزدہ ہونا ایک عام سی بات تھی۔ دنیا کے ایک بڑے حصے کو اپنے گھوڑی کے سموں تلے روند ڈالنے والا چنگیز خاں بھی روحوں سے ڈرتا تھا۔

سولدہ مجھے پکارتی ہوئی شاید غار سے نکل آئی تھی لیکن میں ایک بار بھی پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ میں اس وقت شمالی آہو کی طرح بھاگ رہا تھا جسے یہ احساس ہو گیا کہ شکاریوں کے گھوڑے اس کے تعاقب میں ہیں۔ میں ایک آدھ

جگہ گرا بھی لیکن زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ بور خان قالدون کی ڈھلوانوں پر کبھی کوئی اس طرح نہیں دوڑا ہوگا جس طرح میں دوڑا تھا۔

پہاڑ کے دامن میں میرا گھوڑا ایک درخت سے بندھا ہوا تھا۔ میں نے ایک وحشت کے عالم میں اسے کھولا اور جست لگانے کے انداز میں اس پر سوار ہوگیا۔ ہرچند اب سولدہ کی آواز مجھے نہیں سنائی دے رہی تھی اور یقیناً" اس نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا لیکن میں نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔ ہر طرف گہری تاریکی پھیل چکی تھی لیکن میرا گھوڑا اپنے جانے پہچانے راستے پر بے تکان دوڑا چلا جا رہا تھا۔

جب میں اپنے یورت (خیمہ) میں داخل ہوا تو میرا جسم پسینے سے شرابور تھا اور ہوش و حواس قائم نہیں تھے۔ بعد میں میری ماں نے مجھے بتایا کہ میں "سولدہ' سولدہ" چیختا ہوا یورت میں داخل ہوا تھا۔

میرے حواس اس طرح زائل ہوئے تھے کہ مجھے کئی روز تک ہوش نہیں آیا۔ میرے جسم میں جیسے کوئی بھٹی سلگ رہی تھی اور اس کی تپش نے مجھے بری طرح بے چین کر رکھا تھا۔ اس عالم میں کبھی کبھی میرے ہوش و حواس کچھ بحال ہوتے تو مجھے ڈھول بجنے کی آواز سنائی دیتی اور میں سمجھ جاتا کہ بستی کا شامان (جادوگر) میرا علاج کرنے میں مصروف ہے۔

منگولوں میں دوا سے علاج کرنے والے طبیب نہیں ہوتے۔ جسم میں گھس کر بیماری پیدا کرنے والی کیلت (منحوس روح) کو اپنے منتروں اور دعاؤں کے زور سے نکال بھگانا صرف شامانوں ہی کو آتا ہے' اگر یہ نہ ہوں تو مریض مرجائیں۔ یہ ایسی عجیب و غریب طاقت کے مالک ہوتے ہیں کہ انہیں نیلے جاودانی آسمان کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ ان کی روح جسم سے جدا ہو کر آسمان تک چلی جاتی ہے اور وہاں سے مستقبل کا حال معلوم کر کے واپس آتی ہے۔

اگر کوئی بیمار ہوتا ہے تو شامان اس کا علاج شروع کرنے سے پہلے اس کے خیمے پر ایک خاص نشان لگا دیتے اور کسی کو اس نشان زدہ خیمے میں داخل ہونے کی ہمت اس لیے نہیں ہوتی کہ مبادا وہ منحوس کیلت' بیمار کے جسم سے نکل کر اس کے جسم میں نہ داخل ہو جائے!

مریض کا علاج کرنے کے لیے شامانوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ڈھول بجا بجا کر اور ناچ ناچ کر کیلت کو بھگانے کے منتر پڑھتے ہیں اور بالکل اسی طرح میرا علاج ہو رہا تھا۔ میری ماں کو صرف اتنی دیر کے لیے خیمے میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی تھی کہ وہ میرے منہ میں گھوڑی کا دودھ ٹپکا سکے۔ مریض کو گھوڑی کے دودھ کے سوا کوئی غذا نہیں دی جاتی۔

پانچویں روز جب میرے ہوش و حواس پوری طرح بحال تھے تو شامان نے مجھے بتایا کہ وہ منحوس کیلت کو میرے جسم سے نکال بھگانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اس کی کامیابی کی علامت یہ تھی کہ اب میرا جسم بالکل گرم نہیں تھا۔

"بوغا" شامان نے مجھ سے پوچھا۔ "تو اس رات کہاں گیا تھا کہ منحوس کیلت کو اپنے جسم میں داخل کر لایا؟"

"میں اس رات بور خان قالدون پر چڑھا تھا اور میں نے وہاں ایک سولدہ دیکھی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا!" شامان حیرت سے بولا۔ "تجھے وہاں کوئی سولدہ نظر آئی تھی؟"

"ہاں مقدس شامان! وہ ایک غار میں تھی۔"

"لیکن وہ تجھے نظر کیسے آئی؟" شامان نے جرح کی۔ "تو ابھی بتا چکا ہے کہ وہ رات کا وقت تھا۔"

"سولدہ نے اپنے غار میں روشنی کر رکھی تھی اور وہ روشنی ایک ایسی مشعل کی تھی جس کا شعلہ حرکت نہیں کر رہا تھا۔"

یہ جواب سن کر شامان مجھے تشویش کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ شاید وہ سمجھا تھا کہ منحوس کیلت میرے جسم سے نکلنے کی بجائے میرے دماغ میں جا گھسی ہے جس کی وجہ سے میں بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہوں۔

"مقدس شامان۔" میں نے بڑے جوش میں کہا "میں جاودانی آسمان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس وقت ہوش و حواس میں ہوں اور جب مجھے وہ سولدہ نظر

آئی تھی، اس وقت بھی میں ہوش میں تھا وہ بہت کم عمر اور خوبصورت تھی۔ اس نے ایسا عجیب و غریب چست لباس پہن رکھا تھا جو میں نے کبھی نہیں دیکھا اور وہ اپنی کمر کو دباغت کیے ہوئے چمڑے کی ایک چوڑی پٹی سے کسے ہوئے تھی۔ اس پٹی میں موٹے موٹے چمکدار پتھر جڑے ہوئے تھے جو مشعل کے غیر متحرک شعلے کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید بادلوں کی طرح تھا لیکن ہونٹ اتنے سرخ تھے جیسے اس نے ابھی ابھی کسی کا خون پیا ہو عجیب بات یہ تھی کہ خون اس کے ہونٹوں سے ٹپک نہیں رہا تھا بلکہ جما ہوا تھا۔"

میری ان باتوں کے جواب میں شامان کچھ کہنے کے بجائے اچھل کر کھڑا ہوا اور زور زور سے ڈھول پیٹنے لگا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ کیلت اب میرے دماغ میں جا گھسی ہے۔ میں چلاتا رہا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔ اس نے چیخ چیخ کر بستی کے ایک اور شامان کو بھی اپنی مدد کے لیے بلایا۔ ان دونوں نے مل کر مجھے جکڑ دیا اور لکڑیاں سلگا کر مجھے ان کا اتنا دھواں دیا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، ناک جلنے اور سانس گھٹنے لگی۔ میں ذبح کی ہوئی بھیڑ کی طرح تڑپ رہا تھا اور چیخ چلا رہا تھا مگر ان دو مضبوط شامانوں کی گرفت سے نکلنا میرے لیے ناممکن تھا۔ ویسے بھی پانچ روز کی بیماری مجھے کمزور کر چکی تھی۔ ان شامانوں نے جو پہاڑی ندیوں کے پتھروں کی طرح سخت دل تھے، مجھے دھواں بھی دیا اور جنتر منتر پڑھ کر اچھلتے کودتے بھی رہے۔ یہاں تک کہ میرے حواس زائل ہو گئے۔

جب مجھے ہوش آیا تو دونوں شامان میرے یورت میں موجود تھے لیکن اتفاق سے ان کی توجہ میری طرف نہیں تھی اور وہ بڑی سرگرمی سے اس بحث میں مصروف تھے کہ اگر اب بھی منحوس کیلت میری کھوپڑی سے نہیں نکلی ہوگی تو انہیں کون سا منتر آزمانا ہوگا میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ان کی باتیں سنتا رہا جو بڑی خوفناک تھیں وہ دونوں اس مباحثے میں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اب وہ "مونگ کے تینگری کا ساتواں منتر" آزمائیں گے یہ منتر کرنے کے لیے مرض کو الٹا لٹکا کر لونگ کی دھونی دی جاتی ہے۔

اب میرے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ میں منحوس کیلت کو اپنے دماغ سے نکال باہر کروں، یعنی ان سفاک شامانوں سے سولدہ کے بارے میں کچھ نہ کہوں۔ میری بہتری اسی میں تھی ورنہ کوئی بھی مجھے الٹا لٹکنے سے نہیں بچا سکتا تھا۔ میں نے کراہ کر اس طرف کروٹ لی جدھر دونوں شامان بیٹھے ہوئے تھے میری کراہ سن کر وہ دونوں میری طرف متوجہ ہوئے۔

"مقدس شامانو!" میں نے ان سے کہا۔ "کیا میری طبیعت ابھی تک اتنی ٹھیک نہیں ہوئی کہ مجھے بھنا ہوا گوشت کھانے کو مل سکے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ ہر منہ کو کھانے کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"ہم جانتے ہیں بوغا!" وہ شامان بولا جسے میرے معالج شامان نے اپنی مدد کے لیے بلایا تھا۔

"تو پھر تم لوگ مجھے صرف گھوڑی کا دودھ کیوں پلوائے جا رہے ہو؟" میں نے خفگی کے انداز میں کہا۔

"ابھی تجھے گھوڑے کے دودھ پر ایک آدھ دن اور گزارنا ہوگا۔"

اسی شامان نے کہا "لیکن پہلے مجھے یہ تو بتا کہ تجھے وہ سولدہ کہاں نظر آئی تھی؟"

"کون سولدہ؟" میں نے حیرت ظاہر کی۔

دونوں شامانوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ خبیث مسکرانے لگے۔ وہ اس بات پر خوش ہو رہے تھے کہ ان کا منتر میرے دماغ سے کیلت کو نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔

"بتاؤ نا!" میں نے بے چینی ظاہر کی "تم کس سولدہ کی بات کر رہے ہو؟ کیا ہمارے یورتوں میں کوئی سولدہ گھس آئی ہے؟"

"نہیں۔" میرے پہلے معالج نے جواب دیا اور پھر کہا۔ "دراصل یہ سوال تیری بیماری کے علاج ہی کے سلسلے میں کیا گیا تھا۔ اب ہم تیری طرف سے مطمئن ہو گئے ہیں۔ اب تو بالکل ٹھیک ہو گیا ہے لہٰذا ہم یہاں سے جا رہے ہیں اور تیری ماں کو بھیج دیں گے جو تجھے

آج رات کو بھیڑ کا گوشت کھلائے گی۔"

"بھیڑ کا گوشت؟" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "کیا واقعی؟"

"ہاں، مونگ کے تینگری تجھ پر مہربان ہو چکا ہے۔"

"لیکن میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔"

"سورج کے تیسرے سفر تک تیری یہ کمزوری بھی دور ہو جائے گی۔"

اس کے بعد دونوں شامان چلے گئے اور انہوں نے ماں کو یورت میں بھیج دیا، جاتے جاتے وہ یورت کے در سے علامت مرض مٹا گئے تھے۔ میری ماں نے آتے ہی میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور رونے لگی۔

"اب کیوں رو رہی ہو ماں!" میں بولا۔ "اب تو میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔"

"اسی لیے تو میں رو رہی ہوں بوغا!" میری ماں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "یہ خوشی کے آنسو ہیں۔"

"لیکن تم کسی بھی طرح آنسو نہ بہایا کرو ماں! تمہارے دکھ کے آنسو دیکھ کر میرے دل میں اب اتنی تاب نہیں رہی ہے کہ خوشی کے آنسو بھی دیکھ سکے۔"

یہ بات سن کر میری ماں ہنسنے لگی اور وہ ہنستی ہوئی ماں مجھے بہت اچھی، بہت پیاری لگی۔

شامانوں نے میری صحت یابی کی خبر ساری بستی میں پھیلا دی تھی اس لیے میرے باپ چنکائی کی باقی دونوں بیویاں اور ان کی اولادیں بھی مجھے دیکھنے آئیں۔ انہوں نے میری صحت یابی پر بڑی خوشی کا اظہار کیا لیکن میں خوب جانتا تھا کہ وہ خوشی ایسی ہی تھی جیسے قزل قم کے صحرا میں سراب نظر آتے ہیں۔ چنکائی کی وہ دونوں بیویاں اور ان کی اولادیں مجھ سے اور میری ماں سے بہت حسد کرتی تھیں۔ اولادوں میں حسد کا یہ جذبہ ماؤں کی وجہ سے منتقل ہوا تھا اور مائیں اس لیے جلتی تھیں کہ میری ماں ان دونوں سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی، اگر کبھی کوئی تلخی ہو جاتی تو وہ دونوں میری ماں کو یہ طعنہ ضرور دیتی تھیں کہ وہ ایک مفتوح قوم کی عورت ہے جسے بیوی بنا کر چنکائی نے بہت بڑا رتبہ عطا کیا ہے۔

چنکائی ان دنوں بستی میں نہیں تھا۔ قوبوق خاقان نے اسے کسی کام سے مغرب میں زریں جیل کے علاقے کی طرف بھیجا تھا جہاں باتو خان کی عملداری تھی۔ باتو خان جو قوبوق خاقان کا چچازاد بھائی اور چنگیز خان کی مشکوک اولاد جوچی خان کا بیٹا تھا۔

چنگیز خاں کے چار بیٹے تھے۔ تولائی خان، اوغدائی خان، چغتائی خان اور جوچی خان، جن میں جوچی خان سب سے بڑا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ خان اعظم کی جائز اولاد میں سے نہیں تھا۔ اس کی ماں بورتہ کو دشمن قبیلے کے لوگ زبردستی پکڑ کر لے گئے تھے اور جب چنگیز خان اپنی جان پر کھیل کر اسے واپس لایا تو جوچی کی ولادت ہوئی تھی گو کہ چنگیز خاں نے کبھی جوچی اور اپنے دوسروں بیٹوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا تھا لیکن جوچی ہمیشہ احساس کمتری کا شکار رہا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ باقی بھائیوں سے دور دور رہے۔ چنانچہ جب چنگیز خاں ایشیا کی عظیم فتوحات حاصل کر کے اپنے وطن لوٹا اور اپنے مفتوحہ علاقوں کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ان کی حکومت چار بھائیوں کے سپرد کی تو مغربی دشت کا بعید ترین علاقہ جوچی کو سونپ دیا۔ اس تقسیم کے بعد بھی چنگیز خاں نے مرکزی قیادت اپنے ہی ہاتھ میں رکھی اور تاکید کر دی کہ اس کی موت کے بعد بھی مرکزی قیادت چار بھائیوں میں سے ایک ہی کے ہاتھ میں رہے گی۔

جوچی، چنگیز خاں کی زندگی میں ہی مر گیا اور اس کا ورثہ یعنی مغرب کا علاقہ اس کے بیٹے باتو خاں کے حصے میں آ گیا۔

پھر جب ستر سال کی عمر میں چنگیز خاں کی سولدیہ نے اس کے جسد خاکی کو چھوڑا تو اوغدائی اس کا جانشین بنا۔ تولوئی اور چغتائی زندگی بھر اس کے وفادار رہے۔ پھر تولائی تو اوغدائی کی زندگی میں ہی چل بسا اور اوغدائی کی موت واقع ہوئی تو چغتائی بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ رہی سہی کسر کثرت شراب نوشی نے پوری کر دی تھی اور وہ اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ صحرا کے عظیم خانوادہ

ذریں (چنگیز خاں کا خاندان) کی نیابت سنبھال سکے۔ ان حالات میں اوغدائی کا بیٹا قویوق تیسرا خاقان بنا اور اپنے دادا کی بھورے نمدے کی مسند پر بیٹھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے صحرا کا انصرام و انتظام سنبھالا۔ اسی عرصے میں چغتائی بھی انتقال کر گیا اور اب صحرائے گوبی میں چنگیز خاں کے صرف پوتے زندہ رہ گئے۔ ان پوتوں کی تعداد جنتری کے جانوروں سے صرف ایک کم تھی۔

رات کو میں نے بھیڑ کا گوشت اور گھوڑی کے دودھ میں بھیگے ہوئے جو کھائے اور مجھے فوراً ہی نیند آگئی۔

خواب میں، میں نے اسی خوبصورت سولیدہ کو دیکھا جو مجھے بور خان قالدون کے ایک غار میں ملی تھی۔ میں نے اسے اس عالم میں دیکھا کہ وہ دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھے کھڑی تھی اور میری خوفزدگی کو دیکھ کر بے تحاشا ہنس رہی تھی اس کی ہنسی ایسی تھی جیسے جھیل سیکال کے اوپر اڑتے ہوئے پرندوں کی دلکش آوازیں، لیکن مجھے تو اس دلکش ہنسی نے بھی خوفزدہ ہی کیا۔

"تو مجھ سے ڈرتا کیوں ہے منگول؟" وہ بولی "یقین کر، میں تجھے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ اس کے برعکس میری ذات سے تجھے فائدہ ہی پہنچے گا۔" "آ، میں تجھے تمام آفات ارضی سے محفوظ کر دوں"۔ وہ دونوں بازو پھیلا کر اس طرح میری طرف بڑھی جیسے مجھے اپنی آغوش میں قید کر لینا چاہتی ہو۔

اس کے قریب آنے سے میری دہشت حد انتہا کو پہنچ گئی۔ حیرت ہے کہ میری چیخ نہیں نکلی لیکن میری آنکھ ضرور کھل گئی میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا لیکن یورت میں میرے اور میری ماں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس احساس سے مجھے بڑا سکون ملا کہ سولدہ مجھے خواب میں نظر آئی تھی اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن جو خوشبو مجھے خواب میں محسوس ہوئی تھی، وہی خوشبو میرے یورت میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسی خوشبو تھی جو دشت کے رہنے والے کسی خانہ بدوش کی ناک نے کبھی نہیں سونگھی ہوتی۔

مجھے اس احساس سے بڑا سکون ملا تھا کہ سولدہ مجھے صرف خواب میں نظر آئی تھی لیکن جب میں نے وہ خوشبو سونگھی تو خوف مجھ پر پھر مسلط ہونے لگا۔ کیا یہ خوفزدہ کرنے والی بات نہ تھی کہ جب میں سولدہ کو خواب میں دیکھ رہا تھا تو وہ میرے یورت میں بھی موجود تھی؟ آخر اس خوشبو کا اور کیا مطلب ہو سکتا تھا؟

"مونگے کے تمنگری!" میں اوپر دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔ "مجھ پر رحم کر! مجھے اس سولدہ سے بچا!"

اور جب میں ان الفاظ میں مونگے کے تمنگری (آسمان) سے پناہ مانگ رہا تھا تو یورت کے باہر سے سولدہ کی ہنسنے کی آواز سنائی دی وہ آواز سن کر میں اپنے بستر پر بالکل سرد پڑ گیا ہنسنے کی آواز بتدریج دور ہوتی چلی گئی۔ بالآخر سناٹا چھا گیا لیکن میں دہشت کے عالم میں ساکت پڑا رہا۔ میرے یورت میں وہ خوشبو اب بھی موجود تھی اور میرے خوف کے قیام و دوام کا سبب تھی، میں صبح ہونے تک جاگتا رہا۔

اتنی دیر میں وہ پراسرار خوشبو بھی میرے یورت سے ختم ہو چکی تھی۔

جب میری ماں بیدار ہوئی تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نہیں چاہتا تھا، میری ماں یہ سمجھے کہ میں رات بھر جاگتا رہا ہوں۔ میں نے اسے سولدہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، اگر بتا دیتا تو شاید وہ بھی میری دماغی حالت پر شبہ کرنے لگتی۔

جب میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے نیند آگئی۔ میری ماں نے مجھے جگایا بھی نہیں اور میں اس وقت بیدار ہوا جب سورج اپنا ایک تہائی سفر طے کر چکا تھا میری ماں یورت کے تمام کاموں سے فارغ ہو چکی تھی۔ اس نے دودھ دوہ لیا تھا اور دودھ سے مکھن بھی نکال چکی تھی اور اب بیٹھی ہوئی گھوڑے کی دم کے بالوں سے مور چھل بنا رہی تھی۔

میری ماں نے شفقت سے پر نگاہوں سے مجھے بیدار ہوتے دیکھا اور اور مسکرا کر بولی۔ "آج تو تو خوب سویا۔"

"ماں! تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"تو بیمار رہا ہے اس لئے تجھے زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیئے۔"

میری ماں نے جواب دیا اور پھر بولی "محل سے قارون آیا تھا۔"

"فاطمہ نے بھیجا ہوگا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔" ماں نے کہا "وہ پریشان تھی کہ تو کئی روز سے محل نہیں آیا میں نے اسے بتا دیا کہ تو بیمار ہو گیا تھا لیکن اب تیری طبیعت ٹھیک ہے اور جب دو ایک دن میں تیری توانائی بحال ہو جائے گی تو تو محل آئے گا۔"

"میں آج ہی محل جاؤں گا۔"

"لیکن....."

میں نے ماں کی پوری بات نہیں سنی اور کہا۔ "میں اب بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں ماں!"

جب وہ محل نیا نیا بنا تھا تو مختلف قبیلوں کی عورتیں اور بچے اسے دیکھنے کے لئے دور دور سے آیا کرتے تھے۔ وہ پتھروں کا یورت ان کے لئے حیرت انگیز چیز تھی۔ چنگیز خاں کے عہد تک انہوں نے سمور کے خیموں کے سوا اور کسی قسم کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ خود خاقان اعظم بھی ایک ہی خیمہ میں رہا کرتا تھا لیکن جب اوغدائی کا دور خاقانی آیا تو اس کی ملکہ تورا کینہ نے اسے اکسایا کہ اسے شان و شوکت سے زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ اس نے دنیا کے دوسرے بادشاہوں کی مثال دی جو ایسے محلوں میں رہتے جن میں پچی کاری کا فرش ہوتا ہے اور ان کی خوابگاہیں خوشبوؤں میں بسی ہوتی ہیں۔

اوغدائی خاقان اپنے باپ چنگیز خان کی نصیحت کے مطابق خانہ بدوشی ہی کی زندگی گزارنا چاہتا تھا اور اس کے لئے یہی کافی تھا کہ اب ان کے خیموں میں ریشمی پردے لٹکنے لگے تھے لیکن تورا کینہ کی ضد کے آگے اس کی ایک نہ چل سکی۔ اس نے ختا کے علاقے سے ایسے کاریگر بلوائے جو اپنے فن کے ماہر تھے۔ انہوں ٹھوس بنیادوں اور اونچے ستونوں کا ایک ایسا محل بنایا جو ایک تیر کی اڑان کے برابر وسیع تھا اسی محل میں اوغدائی خاقان کا دربار اور تخت گاہ بنوائی گئی اور جا بجا تصویریں اور مجسمے نصب کئے گئے۔

اب اوغدائی مر چکا تھا لیکن تورا کینہ اب بھی وہیں رہتی تھیں۔ ایک تو اس لئے کہ وہ مرحوم خاقان کی چہیتی بیوی تھی اور دوم اس لئے کہ وہ موجودہ خاقان قویوق کی ماں تھی۔

اس محل کے دروازے پر کلہاڑے اور نیزے سنبھالے ہوئے پہریدار موجود رہتے تھے لیکن میری آمد و رفت پر وہ کوئی قدغن نہیں لگاتے تھے کیونکہ میں مادر خاقان کی معتمد فاطمہ کا چہیتا تھا۔

میں جب فاطمہ سے ملا تو وہ حسب معمول بڑی شفقت و محبت سے پیش آئی اور اس نے میری بیماری کے بارے میں پوچھا۔

"اب میں بالکل ٹھیک ہوں چھوٹی ماں"۔ میں نے جواب دیا۔ یہ نکتہ مجھے میری ماں نے تعلیم کیا تھا کہ میں فاطمہ کو "چھوٹی ماں" کہا کروں۔

"اگر آج تو نہ آتا تو کل میں تجھے دیکھنے کے لئے تیرے یورت کی طرف آتی۔" فاطمہ نے کہا۔

"چھوٹی ماں!" میں بولا "تم نے قارون کو کیوں بھیجا تھا؟ کیا مجھ سے کوئی خاص کام تھا؟"

میرا یہ سوال سنتے ہی فاطمہ کے چہرے کی ساری بشاشت غائب ہو گئی، وہ کچھ پریشان نظر آنے لگی اور بولی "ہاں بوغا۔ مجھے تجھ سے ایک مشورہ کرنا تھا۔ میں آج کل بہت پریشان ہوں۔" یہ کہتے ہوئے فاطمہ کی آواز اتنی دھیمی ہو گئی کہ میں بہ مشکل سن سکا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے نمدے کے بستر کے قریب لے گئی اور مجھے اس پر بٹھا کر خود چمڑے کی چوکی پر بیٹھ گئی۔

میں غور سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "تم اس طرح پریشان نظر آ رہی ہو جیسے شمال کی کالی آندھی آنے والی ہو۔"

"بوغا! تو نہیں جانتا۔ مجھے جو آندھی اپنی لپیٹ میں لینے والی ہے، وہ کالی آندھی سے زیادہ خطرناک ہے۔" فاطمہ نے یہ سب کچھ بڑی پریشانی کے عالم میں کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ میں کسی وقت بھی خاقان کے قہر و غضب کا نشانہ بن سکتی ہوں۔"

"کیوں؟" میں حیرت سے بولا۔ "کیا تم نے یاسائے چنگیزی کے کسی قانون کی خلاف ورزی کی ہے؟"

"میرا جرم صرف یہ ہے کہ مجھے ملکہ تورا کینہ کا

اعتماد حاصل ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

"یہ جرم ہے؟" میں نے پہلے سے زیادہ حیرت سے کہا۔

"ہاں۔" فاطمہ نے جواب دیا۔ "قوبوق خاقان کے بعض آدمیوں کے خیال میں یہ بہت بڑا جرم ہے۔ دراصل انہیں صرف اس بات کی جلن ہے کہ میں منگول نہیں ہوں لیکن مجھے ملکہ تورا کینہ کا قرب حاصل ہے اور ملکہ میری کسی بات کو کبھی نہیں ٹالتی۔ اسی جلن میں وہ لوگ خاقان کو میرے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔ وہ اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ میں جادوگرنی ہوں اور میں نے اس کی ماں کو اپنے قابو میں کر لیا ہے لہٰذا کسی وقت بھی میری وجہ سے خاقان کی حکمرانی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ وہ لوگ خاقان کو یہ خوف بھی دلاتے رہتے ہیں کہ اگر مجھے موقع مل گیا تو میں اس پر اور اس کے بھائیوں پر جادو کر دوں گی۔"

میری حیرت برقرار رہی اور میں نے پوچھا۔ "کیا خاقان کو ان باتوں پر یقین آگیا ہے۔"

"ابھی اس نے ان باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے کیونکہ وہ آج کل ایک بہت بڑی مہم کا آغاز کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔"

"بہت بڑی مہم۔"

"ہاں" فاطمہ نے جواب دیا۔ "وہ تیسری عظیم یورش کا ارادہ کر رہا ہے۔ پہلی یورش چنگیز خاں نے کی تھی، پھر دوسری یورش اوغدائی کے زمانے میں ہوئی اور اب قوبوق کی تمنا ہے کہ وہ اپنے باپ سے زیادہ شہرت حاصل کرے وہ ان علاقوں تک پہنچنا چاہتا ہے جہاں منگولوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں اب تک نہیں پڑی ہیں وہ چینی اور اسلامی تمدن کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اور متمدن شہروں کے خلاف دشت کی جنگ کو جاری رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس جنگ کا آغاز کر چکا ہوتا لیکن باتو خاں کی وجہ سے تذبذب میں پڑا ہوا ہے۔"

"کیوں؟" باتو خان نے کیا کیا ہے۔"

"اسے یہ اندیشہ ہو گیا ہے کہ باتو خاں کی وجہ سے منگول سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکتی ہے جبکہ قوبوق ساری دنیا کا خاقان بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ اکثر اپنے دادا کا یہ قول دہراتا ہے کہ جس طرح آسمان پر ایک ہی سورج ہے اس طرح زمین پر ایک ہی خاقان ہونا چاہیے۔"

"لیکن باتو خاں نے ایسی کون سی حرکت کی ہے جس کی وجہ سے خاقان کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے؟"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ باتو خاں سرکش ہوتا جا رہا ہے جب اوغدائی کی موت پر نئے خاقان کا انتخاب کرنے کے لئے قوریلتائی (بین القبائلی اجلاس) طلب کی گئی تھی تو باتو خاں اس میں شریک نہیں ہوا تھا حالانکہ قوریلتائی میں شرکت نہ کرنا یاسائے چنگیزی کے مطابق سنگین جرم ہے۔ پھر اس کے بعد بھی مغربی دشت سے ایسی خبریں آتی رہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ باتو خاں اب اپنے آپ کو خود مختار سمجھنے لگا ہے۔ اب قوبوق خاقان نے اسے آخری مرتبہ آزمانے کے لئے پھر یہ پیغام بھیجا ہے کہ وہ قوریلتائی میں شرکت کرنے کے لئے وطن آئے۔ آج کل میں باتو خاں کا جواب آنے والا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس مرتبہ بھی یہاں آنے سے انکار کر دے گا۔"

فاطمہ سے یہ معلومات حاصل ہوئیں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ منگولوں کے اتحاد میں دراڑ پڑ چکی ہے اب ضرورت اس امر کی تھی کہ کوشش کر کے اس دراڑ کو بڑا کیا جائے۔

میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "چھوٹی ماں اگر باتو خاں نے آنے سے انکار کر دیا تو کیا ہو گا۔"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کیا ہو گا لیکن امکان یہی ہے کہ قوبوق خاقان بیرونی دنیا پر یورش کرنے سے پہلے اپنا اردو (لشکر) کو لے کر مغربی دشت کی طرف بڑھے گا تاکہ باتو خاں کو تخت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کرے۔"

فاطمہ کے اس جواب سے میری خوشی میں اضافہ ہوا۔

وہ پھر بولی۔ "انہی الجھنوں میں قوبوق خاقان ان کے باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دے رہا ہے جو اسے میرے بارے میں بتائی جا رہی ہیں لیکن جیسے ہی وہ ان باتوں پر

توجہ دے گا' فوراً" ہی کوئی قدم بھی اٹھا بیٹھے گا میں اس
کی وجہ سے بہت پریشان ہوں بوغا! میری زندگی
خطرے میں ہے۔ تو مجھے مشورہ دے کہ میں کیا
کروں۔ تو عقلمند ہے اور سوچنا جانتا ہے۔"

"لیکن چھوٹی ماں! تم نے اس سلسلے میں اپنی ملکہ
تورا کینہ سے بات کیوں نہیں کی؟ کیا وہ منگولوں میں
ایک بااختیار عورت نہیں؟"

"وہ یقیناً" بااختیار ہے۔ بڑے بڑے منگول سردار
اس کی عزت کرتے ہیں لیکن وہ خاقان سے زیادہ
بااختیار تو نہیں! وہ مجھے ہر خطرے سے بچا سکتی ہے مگر
خاقان کے قہر سے نہیں بچا سکتی۔"

"یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے۔" میں نے فاطمہ
سے اتفاق کیا۔

وہ بولی "اب مجھے بس تجھ سے ہی امید ہے کہ تو
مجھے کوئی عاقلانہ مشورہ دے گا۔ تو جو عظیم لیوچت سائی
کا شاگرد ہے تو ہی مجھے بتائے گا کہ میں اس مصیبت
سے کس طرح چھٹکارا حاصل کر سکتی ہوں۔ کوئی ایسی
تدبیر سوچ کہ میں خاقان کے دل میں جگہ بنا لوں۔"

ابھی "فوراً" تو میں کچھ نہیں سوچ سکتا۔"

"کل تک سوچ لے۔ کل اسی وقت میں تیرا انتظار
کروں گی۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے' کل تک میں شاید کوئی تدبیر
سوچ لوں۔"

"اچھا اب تو جا! ان حالات میں تیرا یہاں زیادہ دیر
تک رکنا مناسب نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے
دشمن تیرے بھی دشمن ہو جائیں۔"

فاطمہ سے یہ باتیں کر کے میں محل سے نکلا۔ جب
میں محل کی طرف آ رہا تھا تو اس سولدہ کے بارے میں
سوچ رہا تھا جو مجھے بورخاں قالدون کے ایک غار میں
نظر آئی تھی اور پھر میں نے اسے خواب میں بھی دیکھا
تھا۔ پھر جب میں نے فاطمہ سے باتیں کی تھیں تو بھی
سولدہ کا خیال کسی منحوس کیلت کی طرح میرے سر
کے کسی حصے میں کلبلا رہا تھا اور اب میں محل سے نکلا
تو فاطمہ کی باتوں کو بھول کر پھر اسی سولدہ کے بارے میں
سوچنے لگا جس کی خوشبو کل رات میرے یورت میں
پھیلی رہی تھی۔

پہلی مرتبہ خیال آیا کہ وہ سولدہ بہت خوبصورت
ہے اگر وہ ایک زندہ لڑکی ہوتی تو میں ضرور اسے اپنی
بیوی بنانا پسند کرتا۔ میں نے اس کے متناسب جسم کا
تصور کیا تو میرا جسم گرم ہونے لگا۔ میں نے کبھی کسی
منگول لڑکی کے بارے میں ایسی باتیں نہیں سوچی
تھیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ منگولوں میں سولدہ جیسی
حسین لڑکی تھی بھی نہیں!

میں اس کے بارے میں سوچتا ہوا اپنے گھوڑے پر
چلا جا رہا تھا کہ ایک جگہ مجھے رکنا پڑا۔ اور بہت سے
منگول بھی احتراماً" رک گئے تھے کیونکہ اس راستے
سے سرفوشنی بیگی کی سواری گزر رہی تھی۔

یہ بیگی (شہزادی) خانوادہ ذریں کی عظیم خواتین میں
سے ایک تھی۔ چنگیز خاں کے ایک بیٹے تولوئی خان کی
بیوی جس نے تولوئی خان کی موت کے بعد دوسری
شادی کرنا گوارہ نہیں کیا اور اپنی زندگی اپنے بیٹوں کی
تربیت اور نگہداشت کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس
کے چار بیٹے قبلائی' منگو' ہلاکو' اور چوتھے بیٹے کے نام
کا نصف حصہ میرے نام کے نصف حصے کا تھا وہ اویق
بوغا کہلاتا تھا۔

مرحوم اوغدائی خاقان کی بیوی تورا کینہ جتنی
بدصورت تھی' سرفوشنی بیگی اتنی ہی خوبصورت
تھی۔ خوبصورت بھی' اور ذہین بھی' منگول سرداروں
میں سے اسے بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

جب اس کی سواری گزر گئی تو میں نے گھوڑا آگے
بڑھایا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ خاقان قویوق اور باتو
خان میں کشیدگی پیدا ہو چکی ہے' ایسے میں اگر سرفوشنی
بیگی بھی ایک فریق بن جائے تو منگولوں کا اتحاد پارہ پارہ
ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ
اقتدار کی خواہش سرفوشنی بیگی کو بھی ہوگی۔ ہر چند
اس کا شوہر تولوئی' خاقان نہیں بن سکا تھا لیکن وہ اپنے
بیٹوں کی بہتری کے لئے تو ضرور سوچتی ہوگی۔ اس کے
بیٹوں میں قبلائی کو تو خاصا عاقل بھی سمجھا جاتا تھا
روایت تھی کہ ایک مرتبہ چنگیز خاں نے اس کی طرف
اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا۔ "یہ لڑکا بڑی

سمجھ کی باتیں کرتا ہے۔ اس کی باتوں کو توجہ سے سنا کرو۔" اور یہ بات چنگیز خاں نے اس وقت کہی تھی جب قبلائی صرف تیرہ سال کا تھا۔

اب اگر سرتوشنی بیگی اپنے اس عاقل بیٹے کو خاقان بنانے کی کوشش شروع کر دیتی تو اس جھگڑے میں دو کی بجائے تین فریق ہو جاتے اور منگول اتحاد کے پارچہ پارہ ہونے کا امکان خاصا قوی ہو جاتا۔

میں ان سب باتوں کو سوچتا ہوا اپنے ڈیرے پر پہنچا اور جب میں اپنے یورت میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ بغورچی شامان وہاں بیٹھا ہوا میری ماں سے باتیں کر رہا تھا۔ اگر وہ پہلے کبھی میرے یورت میں آیا ہوتا تو مجھے حیرت نہ ہوتی۔

صحرائے گوبی کے شامانوں میں بغورچی شامان کو ایک خاص مرتبہ حاصل تھا۔ دوسرے شامان اس کی عزت کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ دیوتاؤں سے جتنی قربت بغورچی شامان کو حاصل ہے اتنی قربت کسی شامان کو حاصل نہیں۔

"لڑکے!" بغورچی شامان مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

بغورچی مجھے جواب دینے کے بجائے میری ماں سے مخاطب ہوتا ہوا بولا "چنکائی کے یورت کی رکھوالی! تو اپنے بیٹے کو بتا کہ میں اس کا انتظار کیوں کر رہا تھا۔"

"بوغا!" میری ماں نے مجھ سے کہا۔ "مقدس شامان نے تجھے اپنا شاگرد بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

میں حیرت سے بغورچی شامان کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ شامان بڑی مشکل سے کسی کو اپنا شاگرد بناتے تھے۔ شاگرد بننے کے لئے بڑی منت سماجت اور ان شامانوں کی خدمت کرنا پڑتی تھی لیکن بغور شامان خود میرے یورت میں اس لئے آیا تھا کہ مجھے اپنا شاگرد بنائے۔

"تیری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے۔" بغورچی شامان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مونگ کے تینگری تجھ پر مہربان ہے۔ کل رات جب میری روح عالم بالا میں پرواز کر رہی تھی تو مجھے جادوئی آسمان کے احکامات ملے تھے۔ ان میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ میں تجھے شاگرد بناؤں اور سارے علوم سکھاؤں جو میں جانتا ہوں۔"

مجھے ان علوم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ میں شامان بننا چاہتا تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بغورچی شامان کی بات کو رد کر دیتا۔

مجھے شامانوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ میری ماں ان شامانوں کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن صحرائے گوبی میں رہ کر ان شامانوں سے بیر رکھنا ایسا ہی تھا جیسے اپنی سواری کے گھوڑے کی پیٹھ میں تلوار گھونپ دینا۔

"لیکن مقدس شامان!" میں نے پہلو بچانے کی کوشش کی۔ "میں اس قابل نہیں ہوں کہ شامان بن سکوں۔"

"تو کیا بن سکتا ہے اور کیا نہیں بن سکتا۔ یہ نہ تو میں جانتا ہوں، نہ تو جان سکتا ہے۔ یہ صرف نیلے جادوئی آسمان کو معلوم ہے کہ کون کیا بن سکتا ہے۔" بغورچی نے یہ جواب دے کر کسی بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

میں نے بے بسی سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ بولے مگر اس نے سر جھکا لیا۔

"اب تو میرے ساتھ چل!" بغورچی نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"کہاں؟" میں نے بے چارگی سے پوچھا۔

"جہاں میں تجھے لے جاؤں۔" بغورچی نے سختی سے کہا۔

میری ماں نے جلدی سے پوچھا۔ "مقدس شامان! تم اسے کب واپس بھیجو گے؟"

"اس سے پہلے کہ سورج زمین کے اس کنارے اپنی بیوی کی آغوش میں جا چھپے، یہ واپس آجائے گا۔"

اس جواب سے میری ماں کو اور مجھے کچھ اطمینان حاصل ہو گیا ورنہ تو میں یہ سمجھا تھا کہ بغورچی شامان زیادہ عرصے کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔

یورت سے باہر نکل کر بغورچی شامان نے اپنے گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تو اپنے گھوڑے پر میرے پیچھے پیچھے آ۔"

میں نے وہی کیا۔ جو اس نے کہا اور اپنے گھوڑے کو اس کے پیچھے دوڑا دیا۔ اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی اور اگر میں چاہتا تو اس سے آگے نکل سکتا تھا لیکن میں ایسا کیوں کرتا جبکہ اس نے مجھے پیچھے رہنے کا حکم دیا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے اندازہ ہوا کہ ہم بور خان قالدون کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ اندازہ ہوتے ہی مجھے وہ سولدہ یاد آئی اور میں خوفزدہ ہو گیا۔

"مقدس شامان! ادھر مت جاؤ!" میں چیخ پڑا۔

بغورچی شامان نے میری آواز یا سنی نہیں یا سن کر نظر انداز کر گیا۔ اس کے گھوڑے کی رفتار میں کمی نہیں آئی اور اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا بھی نہیں میری خواہش تھی کہ اپنے گھوڑے کو روک لوں اور اپنے پورت کی طرف پلٹ جاؤں لیکن یہ بغورچی شامان کی حکم عدولی ہوتی لہٰذا میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں سولدہ سے تو خوفزدہ تھا ہی لیکن بغورچی شامان کی ناراضگی بھی میرے لئے بہت خوفناک تھی۔ صحرا کا کوئی شخص بھی کسی شامان کو ناراض کر کے سکھ چین سے نہیں رہ سکتا تھا۔

میں نے رکنے یا واپس بھاگ نکلنے کی بجائے یوں کیا کہ اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھا دی اور بغورچی شامان کے برابر پہنچ گیا۔

"بوغا!" بغورچی شامان نے میری بات پوری نہیں ہونے دی اور گرج کر بولا۔ "اپنے گھوڑے کو پیچھے کر لے۔"

میں مجبور ہو گیا کہ اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر دوں۔ بغورچی شامان میری بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ اگر میں زیادہ شور مچاتا تو ممکن تھا کہ وہ غصے میں آ کر مجھے کوئی ایسی سزا دے بیٹھتا جو صرف شامان ہی دے سکتے ہیں۔

ہمارے گھوڑے بور خان قالدون کے قریب ہوتے چلے گئے اور میرا خوف بڑھتا رہا۔ میں اس منحوس سولدہ کے ٹھکانے سے اتنی دور رہنا چاہتا تھا جتنی دور رہا جا سکے لیکن میں بغورچی شامان کو بھی ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں سکتا تھا۔ آخر ہمارے گھوڑے پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے اور بغورچی شامان نے اپنا گھوڑا روک دیا میں نے کچھ اطمینان محسوس کیا ورنہ مجھے یہ ڈر ہو گیا تھا کہ شامان گھوڑے کو دوڑاتا ہوا پہاڑ پر چڑھنا نہ شروع کر دے۔

میں نے اپنا گھوڑا اس کے قریب پہنچ کر روکا اور پھر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑا "اب مجھے بتاؤ کہ تو نے سولدہ کو کہاں دیکھا تھا۔"

اس کے منہ سے سولدہ کا نام سن کر مجھے ایسا جھٹکا لگا کہ اگر میں اس وقت بور خان قالدون کی کسی چٹان پر ہوتا تو لڑھکتا ہوا نیچے جا گرتا۔

"حیران مت ہو!" شامان پھر بولا۔ "مجھے اس کا علم ان شامانوں سے ہوا تھا جو تیرا علاج کر چکے ہیں۔ انہوں نے تیری بات سن کر یہ سمجھا تھا کہ منحوس کیلت تیری کھوپڑی میں گھس گئی ہے لیکن میں یہ بات کیسے سمجھ لیتا جبکہ وہ سولدہ مجھے بھی نظر آ چکی ہے۔"

"تمہیں بھی نظر آ چکی ہے۔" میں پرجوش ہو گیا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو مقدس شامان۔"

"میں جھوٹ کیوں بولوں گا!" بغورچی شامان تند لہجے میں بولا۔

"تم نے اسے کہاں دیکھا تھا مقدس شامان؟" میں پوچھ بیٹھا۔

"وہ مجھے ایک مرتبہ جھیل بیکال کے پاس نظر آئی تھی اس کے پاس غیر متحرک شعلے والی دیسی مشعل تھی جس کا ذکر تو شامانوں سے کر چکا ہے میں تیری سے اس کے قریب پہنچا تو وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی یہ پچھلے چاند کا واقعہ ہے اور تب سے میں اس کی تلاش میں ہوں میں نے مونگ کے تنگری کی قسم کھائی ہے کہ اگر وہ سولدہ اس علاقے میں موجود ہے تو اسے میں اپنے منتروں کے جال میں پھنسا کر رہوں گا۔ اگر وہ میری قیدی بن گئی تو میں اس سے ایسے ایسے کام لوں گا جو آج تک دشت کے کسی شامان نے نہیں کئے ہونگے۔"

"مقدس شامان! کیا تم اسے قابو میں کر سکتے ہو؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔" بغورچی نے

محتاط انداز میں جواب دیا۔ "وہ ایک ایسی سولدہ ہے جس کے بارے میں میرا علم بھی مجھے اب تک کچھ نہیں بتا سکا۔ اسی لئے اب اس سولدہ کو قابو میں کرنا میری زندگی کا مقصد بن چکا ہے۔"

میں اس بات سے بڑا خوش ہوا کہ بغورچی شامان بھی اس سولدہ کو دیکھ چکا تھا۔ میرا خوف بڑی حد تک کم ہو گیا کیونکہ دشت کے ایک نامی گرامی شامان کی موجودگی میں وہ سولدہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

"تو مجھے وہ جگہ دکھا دے جہاں وہ سولدہ نظر آئی تھی۔" بغورچی نے مجھ سے کہا۔

"اسے میں نے ایک غار میں دیکھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے وہاں لے چل!"

میرا خوف اس حد تک کم ہو گیا تھا کہ میں اسے غار تک لے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

پہاڑ کی ڈھلوانوں پر مویشی چرتے پھر رہے تھے ایک چٹان پر بیٹھے دو چرواہے اکتارہ بجا رہے تھے انہوں نے ہمیں دیکھا تو اکتارہ بجانا بند کر دیا' وہ مجھے تو نہیں لیکن بغورچی شامان کو پہاڑ پر چڑھتے دیکھ کر متعجب ہوئے تھے۔ بغورچی شامان نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے اوپر چڑھتا رہا۔ ہر چند اس کی موجودگی سے میری ہمت بندھ گئی تھی لیکن جب وہ غار قریب آ گیا تو مجھ پر خوف پھر مسلط ہونے لگا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ بغورچی کی پراسرار قوتیں بھی اس سولدہ کو قابو میں نہیں کر سکیں گی۔ میں بار بار بغورچی شامان کی طرف دیکھنے لگتا تھا جس کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے وہ زیر لب کوئی منتر پڑھتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ آخر ہم اس غار کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ اس کا دہانہ صاف نظر آنے لگا۔ اب مجھے اپنے پیر اتنے وزنی معلوم ہونے لگے تھے کہ قدم اٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔ میری یہ حالت سولدہ کے خوف کے باعث ہوئی تھی۔ آخر میں رک ہی گیا اور وہیں سے ہاتھ اٹھا کر غار کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ بغورچی شامان اس غار میں جانا چاہے تو اکیلا جائے اور مجھے یہیں چھوڑ دے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ میری کلائی پر بغورچی شامان کی گرفت مضبوط ہو گئی اور وہ مجھے کھینچتا ہوا غار کی طرف لے جانے لگا۔ میری ہچکچاہٹ کو محسوس کر کے اس نے ایک مرتبہ گھور کر میری طرف دیکھا تھا اگر وہ منتر نہ پڑھ رہا ہوتا تو ضرور مجھے ڈانٹتا۔

آخر ہم غار کے دہانے پر پہنچ گئے' اب میرے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ میرے سینے میں کوئی چیز بہت زور زور سے اچھلنے لگی تھی۔ بغورچی شامان غار کے دہانے پر بھی نہ رکا اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے غار میں داخل ہوتا چلا گیا۔ اس نے زور زور سے منتر پڑھنا شروع کر دیا تھا لیکن غار میں داخل ہونے کے بعد وہ یکلخت چپ ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ غار میں سولدہ تو موجود نہیں تھی لیکن اس کا سامان وہیں رکھا ہوا تھا اور یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ ایک سولدہ کو بھی ان چیزوں کی ضرورت رہتی تھی۔

غار میں سولدہ کا بستر لگا ہوا تھا اور ایسے برتن رکھے ہوئے تھے جو کھانے پینے میں کام آتے ہیں۔ بستر پر تو تین کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ کتابیں جو میں نے اس دشت میں صرف لیوحیت سائی کے پاس دیکھی تھیں مگر لیوحیت سائی کی کتابیں اتنی چمکدار اور خوبصورت نہیں ہوتی تھیں۔ سولدہ کے بستر پر بچھی ہوئی ریشمی چادر بھی بڑی نفیس تھی۔ اتنا اچھا ریشمی کپڑا تو چین کے لوگ بھی نہیں بنا سکتے تھے۔ بستر کے قریب کچھ ایسی چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں جو میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھیں اور اسی لئے ان چیزوں کے نام اور کام سے بھی بے خبر تھا۔ ایک طرف وہ مشعل بھی رکھی ہوئی تھی جو سولدہ کے ہاتھ میں دیکھ چکا تھا۔ اس وقت وہ عجیب و غریب مشعل بجھی ہوئی تھی۔

بغورچی شامان نے وہ ساری چیزیں دیکھیں تو اس کا اشتیاق اتنا بڑھا کہ وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ان چیزوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا ہو۔

"مقدس شامان" میں چیخ پڑا۔

اس نے سر موڑ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں پھر بولا۔ "سولدہ کی چیزوں کو مت چھونا۔"

"کیوں؟"

"نہ جانے کیا آفت جائے۔" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

بغورچی شامان نے اس طرح سر جھٹکا جیسے میرے اندیشے کو ذرا بھی اہمیت نہ دینا چاہتا ہو۔ وہ سولدہ کے سامان کے قریب گیا اور ایک ایک چیز کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ فوراً" کسی چیز کو چھونے کی ہمت اسے بھی نہیں ہو سکی تھی۔

"مقدس شامان!" میں کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہمیں یہاں سے فوراً" چلا جانا چاہیئے اگر سولدہ موجود ہوتی تو ہم اسے اپنے منتروں کے جال میں لا سکتے تھے لیکن وہ اس وقت یہاں نہیں ہے بہتر ہو گا کہ تم پھر کسی وقت یہاں آؤ۔"

بغورچی شامان نے اب بھی میری کسی بات پر دھیان نہیں دیا۔ اس نے دوبارہ کوئی منتر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ منتر پڑھتے ہوئے اس نے سولدہ کی عجیب و غریب مشعل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں خفیف سے لرزش تھی۔ وہ سولدہ کی کسی چیز کو چھوتے ہوئے تھوڑا بہت خوفزدہ تھا۔

اس سے پہلے کہ بغورچی شامان کا ہاتھ سولدہ کی مشعل کو چھوتا، غار میں کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی یہی آواز میں نے خواب میں سنی تھی۔ یہ سولدہ کے ہنسنے کی آواز تھی۔ اسے سن کر میں ہی نہیں بلکہ بغورچی شامان بھی اچھل پڑا آواز ہمارے پشت یعنی غار کے دہانے کی طرف سے آئی تھی میں اور بغورچی بہت تیزی سے مڑے لیکن ہمیں کوئی بھی دکھائی نہیں دیا سولدہ کے ہنسنے کی آواز بھی فضا میں بکھر کر معدوم ہو چکی تھی لیکن ایک خوشبو وہاں پھیل گئی تھی۔ وہی خوشبو میں نے سولدہ کو خواب میں دیکھنے کے بعد اپنے حضرت میں پھیلی ہوئی محسوس کی تھی۔

میں نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "یہاں سے بھاگ نکلو مقدس شامان۔"

لیکن بغورچی شامان نے اب بھی میری بات پر دھیان نہیں دیا۔ وہ بہت زور زور سے کوئی منتر پڑھنے لگا تھا اور اس نے اپنے لبادے میں سے دو ہڈیاں نکال کر بجانا شروع کر دی تھیں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا غار کی طرف بڑھا تو میں بھی اس کے پیچھے لپکا لیکن میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ غار سے نکل جانا چاہتا ہے وہ دہانے پر رک گیا تھا اور اس کی بھوری آنکھیں اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔

دفعتاً" سولدہ کے ہنسنے کی آواز پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ بھی وہ پشت کی طرف سے سنائی دی تھی۔ میں اتنا خوفزدہ ہوا کہ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور بغورچی شامان اور زیادہ بلند آواز سے منتر پڑھتا ہوا مڑا۔

سولدہ اب بھی نظر نہیں آئی لیکن غار میں اس کی خوشبو پہلے سے زیادہ پھیل چکی تھی۔ میں پسینے پسینے ہو چکا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا سولدہ کی وہ ساری چیزیں بھی غائب ہو چکی تھیں جن کو میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ غائب ہونے والی ان چیزوں میں وہ عجیب و غریب مشعل بھی تھی۔ غار میں اب صرف وہ سامان نظر آ رہا تھا جو دشت کے رہنے والوں کے استعمال میں رہتا ہے۔

"بھاگو شامان! بھاگو!" میں ایک بار چیخا اور دوڑتا ہوا غار سے نکل گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں کہ بغورچی شامان میرے پیچھے آ رہا ہے یا نہیں۔ مجھ پر اتنی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ میں بھاگتے میں کئی مرتبہ ڈھلوان پر لڑھکتے لڑھکتے بچا۔

اکتارہ بجانے والے چرواہوں نے مجھے اس طرح بھاگتے دیکھا تو زور زور سے مجھے پکارنے اور یہ پوچھنے لگے کہ کیا ماجرا ہے لیکن میں کسی گھوڑے کی طرح دوڑتا ہوا اس مقام سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ میں پہاڑ سے اتر کر اس مقام پر جا کر رکا جہاں گھوڑوں کو چھوڑا تھا۔ اب میں نے پہلی مرتبہ پلٹ کر دیکھا تو بغورچی شامان مجھے نظر نہیں آیا وہ سولدہ سے اتنا خائف نہیں ہوا تھا کہ میری طرح وہاں سے بھاگ نکلتا۔

سولدہ کے منحوس غار سے اتنی دور نکل آنے کے بعد اب پہلی مرتبہ مجھے بغورچی شامان کی ناراضگی کا

خیال آیا اور میں گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے نہیں بھاگ سکا۔ مجھے وہیں رک کر شامان کا انتظار کرنا تھا۔ اگر میں وہاں سے بھی چلا جاتا تو مجھے بغورچی شامان کے عتاب کا نشانہ ضرور بننا پڑتا۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ کر اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ دونوں چرواہے میرے پیچھے پیچھے پہاڑ سے نہیں اترے تھے اور یہ اچھا ہی ہوا تھا ورنہ میں انہیں کیا بتاتا کہ میں اس طرح کیوں بھاگا تھا۔ میں پتھر پر بیٹھا اس عجیب و غریب سولدہ کے بارے میں سوچتا رہا جو عام انسانوں کی طرح رہتی تھی۔ سونے کے لئے اس کا بستر بھی تھا اور وہ انسانوں کی طرح کھاتی پیتی بھی تھی۔

لیوچت سائی جیسے عالم کی طرح اسے کتابیں پڑھنا بھی آتا تھا ایسی کسی روح کے بارے میں میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔

کچھ دیر بعد میں بغورچی شامان کو پہاڑ سے اترتے دیکھا لیکن وہ میری طرح بھاگتا ہوا نہیں آرہا تھا میں دل ہی دل میں اس کی ہمت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ جب وہ قریب آیا تو میں کھڑا ہو گیا۔

"تو بہت بزدل ہے!" بغورچی نے بڑی حقارت سے کہا۔ "میں تجھے اپنا شاگرد نہیں بناؤں گا۔ تو میرا شاگرد بن ہی نہیں سکتا۔"

میں نے بڑی خوشی محسوس کی کہ میری جان چھوٹ گئی لیکن میں نے اس خوشی کا اظہار اپنے چہرے سے نہیں ہونے دیا اور بولا۔ "مقدس شامان! کیا کوئی عام آدمی کسی سولدہ سے مقابلے پر جم سکتا ہے؟ تمہاری بات اور ہے تم شامان ہو، تمہیں نیلے جاودانی آسمان کی پر اسرار قوتیں حاصل ہیں جو تمہیں سولدہ کی ہر نحوست سے بچا سکتی ہیں لیکن میں تو اس سولدہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔"

"لیکن وہ سولدہ تیرا کیا بگاڑ لیتی جبکہ میں تیرے ساتھ تھا۔ مجھے دیکھ! میں تیرے بعد بھی اس غار میں رکا رہا لیکن وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی۔"

"کیا وہ پھر آئی تھی؟" میں نے دہشت سے پوچھا۔

"نہیں، تیرے بھاگنے کے بعد اس کے ہنسنے کی آواز پھر نہیں سنائی دی۔ وہ مجھ سے اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اپنا سامان غار سے لے کر چلی گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا سامان میرے ہاتھ لگے۔"

"مقدس شامان! کیا روحیں بھی سامان کی محتاج ہوتی ہیں؟"

بغورچی نے میرے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ اس کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ وہ خود بھی اس مسئلے میں الجھن کا شکار تھا کہ روحوں کو انسانی ضروریات کی چیزوں سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔

وہ پہاڑ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "اب شاید وہ اس غار میں نہ آئے وہ کہیں اور اپنا ٹھکانہ بنائے گی لیکن میں ہر قسم کھا چکا ہوں کہ اگر وہ اس علاقے میں رہی تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں، ایک نہ ایک روز اسے اپنے قابو میں کر کے رہوں گا۔"

"مقدس شامان! کیا تم نے اپنی پر اسرار قوتوں سے کام لے کر اس سولدہ کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی؟"

"کئی مرتبہ کر چکا ہوں۔ میرے ہر بن مو نے نیلے آسمان کی سرگوشیاں سنی ہیں لیکن وہ سرگوشیاں مجھے اس سولدہ کے بارے میں جو کچھ بتاتی ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید میں اب تک عقل کے اس مقام تک نہیں پہنچ سکا جہاں وہ باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔"

یہ سب کچھ کہتے بغورچی شامان بڑا پریشان اور فکر مند نظر آرہا تھا۔

مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہوئی اور میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "وہ کیا باتیں ہیں مقدس شامان! کیا تم مجھے بتاؤ گے؟"

"سن!" بغورچی اپنے خیالوں میں کھویا ہوا بولا "جاودانی آسمان کی سرگوشیاں مجھے بتاتی ہیں کہ حقیقتاً" وہ کوئی روح نہیں ہے لیکن اس بات پر قادر ہے کہ جب چاہتی ہے، روح بن جاتی ہے اور وہ اس وقت روح بنتی ہے جب اسے وقت کے دھارے پر سفر کرنا ہوتا ہے۔ اب تو مجھے بتا بوغا! میں ان باتوں سے کیا سمجھوں؟" یہ وقت کا دھارا کیا چیز ہے اور اس پر سفر کس طرح کیا جاتا ہے؟ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی

انسان جب چاہے، روپ بدل جائے؟"

"یہ سوال بھی تمہیں پراسرار قوتوں سے کرنا چاہئے تھا مقدس شامان۔" میں نے کہا

"میں نے کئے تھے اور جواب میں سرگوشیوں نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آسکا۔ میں ان باتوں کو اتنا ہی سمجھ سکا کہ مجھے ان کے بارے میں بتا سکوں۔ وہ بڑی الجھی ہوئی باتیں تھیں۔ اچھا اب تو اپنے گھر جا۔ کسی سے ان سب باتوں کا ذکر مت کرنا۔ لوگ پھر یہی سمجھنے لگیں گے کہ منحوس کیلت تیری کھوپڑی میں گھس گئی ہے۔"

"کیا تم یہیں رکو گے؟"

"ہاں!" شامان نے جواب دیا "میں رات کو یہاں رکوں گا اور دیکھوں گا کہ وہ سولدہ واپس آتی ہے یا نہیں۔"

"اچھا مقدس شامان! میں جا رہا ہوں اگر تم اس سولدہ کو اپنے قابو میں کر لو تو مجھے ضرور بتانا۔"

شامان نے صرف سر ہلا دیا اور پہاڑ کی طرف دیکھنے لگا۔

میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر بستی کی طرف چل پڑا اب میں خوفزدہ تو نہیں تھا لیکن میرا دماغ سولدہ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بغورچی شامان نے اس کے بارے میں جو باتیں بتائی تھیں وہ واقعی بہت الجھی ہوئی تھیں۔ مجھے اس وقت عظیم لیوچت سائی یاد آیا۔ اگر وہ مرد عاقل زندہ ہوتا تو شاید ان باتوں کو سمجھ لیتا۔

جب میں اپنے یورت میں پہنچا تو میری ماں حیرت سے بولی۔ "تو اتنی جلدی واپس آگیا؟"

"ماں! دراصل بغورچی شامان کو میری باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس کا شاگرد نہیں بن سکتا۔ مجھ میں اس کی صلاحیت نہیں ہے۔"

"چل اچھا ہوا، جان چھوٹی۔"

"مجھے کچھ کھانے کو دو ماں! بہت زور کی بھوک لگی ہے۔"

"میں نے تیرے لئے بھیڑ کا ادھ کچا گوشت رکھا ہے۔"

"ادھ کچا گوشت!" میں خوش ہو گیا۔

"ہاں میں جانتی ہوں کہ تو اب بالکل ٹھیک ہو گیا ہے ہر چیز کھا سکتا ہے۔"

"لے آؤ ماں! جلدی سے لے آؤ!" میں بے صبری سے بولا۔

میری ماں ہنستی ہوئی یورت کے اس حصے میں چلی گئی جہاں کھانے کی چیزوں کا ذخیرہ رکھا جاتا تھا۔

میں نے اس وقت خوب ڈٹ کر کھایا اور گھوڑی کا دودھ پیا تھوڑا سا دودھ میں نے اونی پتلی کے منہ پر لگا دیا تھا جو میرے سرہانے لٹکی ہوئی تھی۔ یہ دشت کے رہنے والوں کی خاص رسم ہے ہر خیمے میں اس خیمے کے مالک کے سرہانے وہ اونی پتلی ضرور لٹکی رہتی ہے۔

اتنا کھانے پینے کے بعد مجھے گہری نیند آئی اور میں اس وقت اٹھا جب سورج زمین کے اس کنارے پر اپنی بیوی کی آغوش میں گرنے والا تھا۔ میری ماں یورت کے کام میں مصروف تھی۔ میں جاگنے کے بعد بھی دیر تک بستر پر پڑا رہا۔ آخر میری ماں میرے پاس آئی اور مجھ سے پوچھنے لگی کہ آج صبح فاطمہ نے تجھے کیوں بلایا تھا؟

"چھوٹی ماں بڑے خطرے میں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیسا خطرہ؟" ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

میں نے اسے وہ ساری باتیں بتا دیں جو مجھے فاطمہ سے معلوم ہوئی تھیں۔ ان باتوں کو جان کر میری ماں بہت متفکر ہوئی۔ اسے فاطمہ سے بڑی محبت تھی۔

"تو پھر تو اسے کیا مشورہ دے گا؟" ماں نے پوچھا۔

"ابھی تو میں نے کچھ سوچا ہی نہیں۔"

"سوچ بوغا!" میری ماں نے بے چینی سے کہا "اس صحرا میں تیرے بعد وہی تو ہے جسے میں اپنا کہہ سکتی ہوں۔"

"تم فکر نہ کرو ماں! میں ضرور سوچوں گا۔ چھوٹی ماں کو اس خطرے سے بچانے کے لئے کوئی ترکیب تو کرنا ہی پڑے گی۔"

میری ماں چپ ہو کر خیالوں میں کھو گئی اور میں بھی ان خطرات کے بارے میں سوچنے لگا جو فاطمہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ مجھے فاطمہ کو ان خطرات سے

بچانے کی کوشش کرنا تھی لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ میں کامیاب ہو سکوں گا۔ میری یہ بساط کہاں تھی کہ صحرائے اعظم کے خاقان سے ٹکرا سکتا فاطمہ کو اس خطرے سے بچانے کی اگر کوئی صورت ہو سکتی تھی تو صرف یہ کہ ان لوگوں کو رام کیا جاتا جو قویق خاقان کو فاطمہ کے خلاف بھرتے رہتے تھے۔

اچانک مجھے بغورچی شامان کا خیال آیا اور میں نے پہلی مرتبہ سوچا کہ سے اپنی طرف سے دل برداشتہ کر کے میں نے اچھا نہیں کیا۔ اگر میں کسی طرح اس کی ناراضگی ختم کر کے اس کا دل جیت لوں تو میں صحرا کے لوگوں میں خاصا با اثر بن سکوں گا پھر کسی میں اتنی ہمت نہیں ہو گی کہ بغورچی شامان کے چہیتے شاگرد پر اپنی آنکھوں کا زہر اگل سکے۔

بغورچی شامان کا دل جیتنے کے لئے مجھے اس سولدہ کا خطرہ بھی مول لینا پڑتا کیونکہ بغورچی اس سولدہ کو قابو میں کرنے کا تہیہ کئے بیٹھا تھا۔ بغورچی کی رفاقت میں مجھے ان خطرات سے دوچار ہونا پڑتا لیکن امکان یہی تھا کہ بغورچی شامان کی موجودگی میں مجھے وہ سولدہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ میں یہ بات نہیں بھول سکا تھا کہ سولدہ کے غار میں بغورچی شامان خاصی دیر تک رکا تھا لیکن سولدہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی تھی۔ یقیناً" بغورچی شامان کی پراسرار قوتوں کے سامنے وہ سولدہ بھی بے بسی کا شکار ہو گی۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کل صبح بغورچی شامان کے پاس جاؤں گا' اس کی منت سماجت کر کے اسے منالوں گا اور اس کا شاگرد بننے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالوں گا۔ یہی ایک صورت ایسی تھی کہ میں دشت کے رہنے والوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کر سکتا۔

میں دن میں سو لیا تھا اس لئے رات کو مجھے بہت دیر سے نیند آئی۔ دیر سے سویا تھا اس لئے جاگا بھی دیر سے! جاگتے ہی مجھے اپنے رات کے فیصلے کا خیال آیا اور میں بغورچی شامان کے یورت کی طرف جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ میں نے اپنی ماں کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرے گی اسے شامانوں سے نفرت تھی۔

سورج میرے یورت کے عین اوپر تھا جب میں باہر نکل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور تب مجھے خیال آیا کہ میں نے فاطمہ سے اسی وقت ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ ضرور میرا انتظار کرے گی لہٰذا کیوں نہ بغورچی شامان کی طرف جانے سے پہلے میں فاطمہ سے مل آؤں۔ اسے تسلی دلاسہ دینے کے بعد بھی بغورچی شامان کے یورت کا رخ کیا جا سکتا تھا ورنہ میرے نہ آنے سے وہ ضرور پریشان ہوتی۔

میں نے فیصلہ کیا اور اپنے گھوڑے کو محل کی طرف دوڑا دیا۔

جب محل کے دروازے پر پہنچ کر رکا تو اک عجیب واقعہ ہوا۔ محل کے وہ محافظ جو کبھی مجھ سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ ایک ہجوم کی صورت میں میری طرف آئے اور مجھے نرغے میں لے لیا۔

"کیا بات ہے؟" میں گرج کر بولا۔ "کیا تم لوگوں کی آنکھوں پر نحوست کے سائے پڑ گئے ہیں کہ مجھے نہیں پہچان رہے ہو؟" ایک محافظ میرے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "ہم تجھے خوب پہچانتے ہیں بونا! تو جادوگرنی فاطمہ کا چہیتا ہے۔"

اس کی بات سن کر میرا دل دھڑک اٹھا لیکن میں نے ہمت کر کے کہا۔ "تم سب کی کھوپڑیوں پر شاید منحوس کیلت کا راج ہو گیا ہے جو تم فاطمہ کو جادوگرنی کہہ رہے ہو۔"

محل کے محافظ اس طرح قہقہے لگانے لگے جیسے میرا مذاق اڑا رہے ہوں' پھر ان میں سے ایک بولا "چنکائی کے بیٹے! فاطمہ کا فیصلہ ہو چکا' اب تو اپنی فکر کر! ہمیں حکم ملا ہے کہ تجھے خاقان اعظم کے روبرو پیش کریں۔ اگر تو اس وقت یہاں نہ آتا تو ہم خود تیرے یورت کی طرف آتے۔"

"تیری اس بات کا کیا مطلب ہوا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔ "فاطمہ کا کیا فیصلہ ہو چکا ہے؟"

خاقان اعظم کے حکم سے آج صبح اس کو زبردستی کھینچ کر میدان لے جایا گیا تھا اور اسے برہنہ کر کے اتنے کوڑے لگائے گئے تھے کہ اس نے آخر کار

جادوگری کا اقبال کرلیا تھا۔"

"یہ خبر میرے لئے ہولناک بھی تھی اور مجھے اس سے صدمہ بھی پہنچا تھا۔ میں کانپ گیا مجھے محافظ کی آواز اس طرح سنائی دینے لگی جیسے کہیں بہت دور سے آرہی ہو۔ وہ مجھے بتا رہا تھا۔ "اور جب اس جادوگرنی نے اپنے جرم کا اقبال کرلیا تو اسے ڈوبنے کے لئے ایک ندی میں دھکیل دیا گیا۔ شامانوں کو اندیشہ تھا کہ وہ مرنے کے بعد کھل کر اوروں کو نقصان پہنچائے گی لہٰذا ندی میں دھکیلنے سے پہلے شامانوں نے اس کے سر کے سارے سوراخ سی دیئے تھے تاکہ اس کی منحوس سولدہ کو باہر نکلنے کے لئے کوئی سوراخ نہ مل سکے۔"

فاطمہ کی موت کا صدمہ ایسا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ جو کل ہی مجھ سے محل میں ملی تھی، وہ اب مر کر ندی میں ڈوب چکی ہے۔ ان ظالموں نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ وہ ہرگز جادوگرنی نہیں تھی۔ اگر اس نے اس کا اقرار کیا بھی ہوگا تو محض اس لئے کہ کوڑوں کی مار سے بچ سکے۔

جب مجھے قویوں خاقان کے سامنے پیش کیا گیا تو بھی میرے حواس پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے اور میں فاطمہ کی موت کے صدمے سے نڈھال تھا۔

پہلی مرتبہ میں نے قویوق خاقان کو اتنے قریب سے دیکھا اوسط قد کا نحیف الجثہ شخص اپنے تخت پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ گل اندام کنیزیں اس کے پہلو میں تھیں اور وہ محتا کی شراب پی رہا تھا جس میں لونگیں اور شکر ملی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اپنی جسامت کے اعتبار سے ایک معمولی آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ پہاڑی ندیوں کے پتھروں کی طرح سخت دل اور آمر مطلق ہے وہ اس وقت لومڑی کی کھال کا لبادہ پہنے ہوئے تھا۔

"چنکائی کے بیٹے!" وہ مجھے گھورتا ہوا بولا۔ "کیا تو میرے جد عظیم کے بنائے ہوئے قوانین سے واقف نہیں؟ کیا تو نہیں جانتا کہ جادوگروں کو دوست بنانا بھی جرم ہے؟"

میں نے جواب دینا چاہا لیکن میرے حلق سے آواز نہیں نکلی میرے ہونٹ کسی ابابیل کی طرح پھڑپھڑ کر رہ گئے میں اعتراف کروں گا کہ مجھ پر خاقان کی دہشت طاری ہوگئی تھی۔

"بولتا کیوں نہیں؟" خاقان گرجا "کیا تیری ماں نے تجھے اس طرح جنا تھا کہ تیری زبان اس کے پیٹ میں رہ گئی تھی؟"

"خاقان! خاقان!" میں جیسے بلبلا کر بول پڑا۔ "میں مقدس دیوتاؤں کی قسم کھاتا ہوں مجھے علم نہیں تھا کہ فاطمہ جادوگرنی تھی۔"

اس وقت کافر ترک یلواچ بھی موجود تھا اور چونکہ وہ خاقان کا وزیر تھا اس لئے دخل اندازی کی جرات کر بیٹھا۔ اس نے کہا "خاقان! یہ جھوٹ بول رہا ہے عظیم خاقان کو یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ اس کی ماں بھی ایرانی ہے۔"

خاقان نے تیکھی نظروں سے یلواچ کی طرف دیکھا اور پھر بڑے غصے سے بولا "جب مجھے یقین ہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے تو اسے میرے سامنے لانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا تو اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا؟ کیا تو میرا وزیر نہیں ہے؟ کیا تو دشت کے چھوٹے چھوٹے قضیے نپٹانے کے لئے بھی مجھے ہی پریشان کرتا رہے گا؟"

خاقان کے یہ تیور دیکھ کر یلواچ گھبرا گیا اور پھر جلدی سے محافظوں کی طرف رخ کرکے گرجا۔

"اسے لے جاؤ اور قید میں ڈال دو۔ اسے بھوکا رکھو، پیاسا رکھو، یہاں تک کہ یہ مرجائے۔"

یہ سارے احکامات میرے لئے تھے۔ محافظ مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے میں آنے والے وقت سے ڈرا ہوا تھا لیکن میں نے رحم کی بھیک نہیں مانگی۔ مجھے لے جاکر قید کردیا گیا۔

یہ قید خانہ ایک بہت بڑا گڑھا تھا۔ اس کی گہرائی اتنی تھی کہ اگر دس آدمی ایک دوسرے کے کندھوں پر سوار ہوتے چلے جاتے تو بھی اوپر والے آدمی کا صرف ہاتھ گڑھے کے کنارے کو چھو سکتا تھا۔ گڑھے کی چوڑائی تین نیزوں کے برابر تھی۔ سلاخوں کے ایک جال سے گڑھے کو بند کردیا گیا تھا۔ محل کے قریب

ایسے بے شمار گڑھے تھے جن میں قیدیوں کو رکھا جاتا تھا اور آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہاں سے کوئی فرار ہو سکا ہو۔

میں نے ان قید خانوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن انہیں دیکھنے کا اتفاق پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک گڑھے میں چھ سے زیادہ قیدی نہیں رکھے جاتے تھے دن میں ایک مرتبہ رسی سے باندھ کر کھانا لٹکا دیا جاتا تھا۔ چونکہ قیدیوں کو سزا کی مدت پوری کئے بغیر ان گڑھوں سے نہیں نکالا جاتا تھا اس لئے وہاں گندگی بھی بڑھتی رہتی تھی جب نیا چاند طلوع ہوتا تھا تو صرف ایک مرتبہ ان گڑھوں کی گندگی صاف کی جاتی تھی۔

اگر کسی قیدی کو اذیت پہنچانے کے احکامات ہوتے تھے تو دن میں دو تین مرتبہ اوپر سے گرم پانی پھینکا جاتا تھا۔ اس پانی سے قیدیوں کے جسم پر آبلے پڑ جاتے تھے اور وہاں کوئی ان کا علاج کرنے والا نہ ہوتا تھا۔

مجھے ایسے گڑھے میں ڈالا گیا تھا جہاں کوئی اور قیدی نہیں تھا گندگی بھی نہیں شاید بہت عرصے سے اس گڑھے میں کوئی قیدی نہیں آیا تھا۔

سورج بالکل اوپر تھا اس لئے گڑھے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور سلاخوں کے جال کا سایہ پڑ رہا تھا۔

میں گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب میں موت سے نہیں بچ سکوں گا اور مجھے بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر اسی گڑھے میں مرنا ہوگا۔ موت کے خیال سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی سے میرے جسم کی قوت ختم ہوتی جا رہی ہو لیکن جب مجھے فاطمہ کے کرب کا خیال آیا تو مجھے کسی حد تک تسکین ملی کہ میں اتنی خوفناک موت سے دوچار نہیں ہوں گا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ فاطمہ کو کتنی اذیت سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔

پھر مجھے اپنی ماں یاد آئی۔ جب اسے میرے انجام کا علم ہوگا تو اس پر کیا گزر جائے گی؟ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اگر وہ اس صدمے سے مر نہ گئی تو پاگل ضرور ہو جائے گی۔ اس کی حالت کا خیال کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بے بسی کے احساس نے مجھے پھوٹ پھوٹ کر رونے پر مجبور کر دیا۔

سورج اوپر سے سرک گیا اور اس کی دھوپ ایک سمت میں گڑھے کی دیوار پر اوپر کی طرف گھٹتی چلی گئی۔ دفعتاً میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پاگلوں کی طرح گڑھے میں ادھر سے ادھر چکرانے لگا لیکن مجھے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

دھوپ بالکل غائب ہو گئی اور گڑھے میں اندھیرا سا پھیل گیا حالانکہ اوپر آسمان اب بھی چمکدار نظر آ رہا تھا مجھے پیاس لگنے لگی لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے پانی نہیں مل سکتا یلواچ کا حکم یہی تھا کہ مجھے بھوکا پیاسا رکھا جائے۔

جب آسمان کی چمک پر بھی سیاہی غالب آ گئی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے موت کا قدم میری طرف بڑھ گیا ہو اور یہ قدم بڑھتا ہی رہتا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا ابھی بھوک تو میرے لئے پریشان کن نہیں بنی تھی لیکن پیاس کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

آسمان پر ستارے چمکنے لگے اور گڑھے کی گہرائی میں ٹھنڈک پھیلنے لگی میں سکڑا سمٹا ہوا بیٹھا رہا اور اسی عالم میں اونگھنے لگا تھا کہ مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اوپر کی طرف دیکھا سلاخوں کا جال اوپر سے ہٹایا جا رہا تھا اور ہٹانے والے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا مجھے یہ گمان ہوا تھا کہ شاید میری سزا معاف کر دی گئی ہے اور اب مجھے اس منحوس گڑھے سے باہر نکالا جائے گا متوقع آزادی کے خیال سے میں نے بڑی تازگی محسوس کی اور میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

"بس اب لٹکا دو!" اوپر کوئی بولا۔

اب میں نے دیکھا کہ رسی سے بندھا ہوا ایک تختہ نیچے آنے لگا اس تختے پر کوئی بیٹھا ہوا تھا گویا ایک اور قیدی! مجھے بھی اسی طرح گڑھے میں اتارا گیا تھا۔

جب وہ تختہ نیچے آ گیا تو اوپر سے رسی کو ایک مخصوص انداز میں جھٹکا دیا گیا۔ جو ہستی اس تخت پر بیٹھی ہوئی تھی، وہ گڑھے میں گر پڑی اور مجھے اس کی کراہیں سنائی دیں۔ تختہ اوپر کھینچ لیا گیا۔ مجھے نئے

قیدی کی کراہیں کچھ مانوس معلوم ہوئی تھیں۔ میں اس پر جھک گیا لیکن اندھیرے میں مجھے اس کی شکل نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

"تم کون ہو دوست؟" میں نے پوچھا۔

"بوغا" کراہتی ہوئی آواز۔

"ماں! میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں نے اسے بے تحاشا اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

"میرے بچے! میرے جگر بند!" ماں بڑی مشکل سے بول رہی تھی۔ "مجھے اس طرح نہ بھینچ! میرا جسم لہولہان ہے۔ ان ظالموں نے مجھ پر اتنے کوڑے برسائے ہیں کہ....."

"ماں!" میرا خون کھولنے لگا۔ "انہوں نے تمہیں بھی مارا ہے؟"

"ہاں میرے بیٹے! فاطمہ کی دوستی کی سزا دی گئی ہے مجھے۔"

میں اپنی ماں کی تکلیف کے خیال سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"مت رو..... میرے بیٹے!" میری ماں کے منہ سے الفاظ رک رک کر نکلنے لگے۔ "جو مقدر میں تھا۔ وہ پورا ہو کر رہا..... میرے جسم سے..... اتنا خون..... نکل چکا ہے کہ..... اب میں..... زندہ نہیں بچ سکوں گی۔ اب تو میری باتوں کو..... ذرا دھیان سے سن!..... میں تجھے..... ایک راز سے..... سے..... آگاہ کرنا..... چاہتی ہوں۔"

میں نے اپنی سسکیوں پر قابو پالیا لیکن میرے آنسو بہتے رہے۔ مجھے اتنی اذیت محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ کوڑے میری ماں پر نہیں، مجھ پر برسائے گئے ہوں۔

"سن بوغا!..... غور سے سن!" میری ماں اپنی قوت کو مجتمع کر کے ذرا دیر بعد بولی۔ "میں تجھے بتانا..... چاہتی ہو..... کہ..... چنکائی تیرا باپ نہیں ہے۔"

میں اس انکشاف سے اتنا حیرت زدہ ہوا کہ چیخ پڑا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں..... میرے بچے!..... تو ایک عرب امیر زادے کا..... بیٹا ہے..... جب یہ منگول..... مجھے اٹھا کر لائے تھے..... اس وقت تیرا باپ مجھے..... میری ماں کے گھر..... چھوڑ کر..... بغداد گیا ہوا تھا..... میرے پیٹ میں مجھے جنم لیے ہوئے..... ایک مہینہ..... گزر چکا تھا..... یہ منگول..... میرے گھر والوں کو..... قتل کر کے..... مجھے یہاں..... اٹھا..... لائے..... اور چنکائی نے..... مجھے..... اپنی بیوی بنالیا۔"

یہ باتیں میرے لئے حیران کن تھیں کہ میرے آنسو رک گئے۔

"تم سچ کہہ رہی ہو ماں!" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں بیٹا!..... میں تجھ سے..... جھوٹ کیوں..... بولوں گی؟..... چنکائی ہمیشہ..... یہ سمجھتا رہا..... کہ تو اس کے..... نطفے سے ہے..... لیکن..... حقیقت وہی ہے..... جو میں نے..... ابھی تجھے بتائی..... اگر تو کبھی..... اس دشت سے نکل کر..... بغداد..... پہنچ سکے..... تو اپنے باپ کو..... ضرور تلاش کرنا۔ تیرے باپ کا نام....." میری ماں کی آواز اس طرح ڈوبنے لگی جیسے اس پر غشی طاری ہوتی جا رہی ہو۔

"بولو ماں!..... بولو!" میں نے کانپتی آواز میں کہا۔ "مجھے بتاؤ ماں! میرے باپ کا کیا نام ہے۔"

ماں نے ہچکی لی۔

"ماں!" میں نے وحشت میں اس کے شانے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس کا سارا جسم زخمی ہے اور میں اس کے شانوں کو جھنجھوڑ کر اسے تکلیف دے رہا ہوں۔

"میرے..... بچے!" ماں کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

"میرے باپ کا نام بتاؤ ماں!" میں رونے لگا۔

میں اس گڑھے میں قید تھا اور ایسی کوئی صورت نہیں تھی کہ مجھے نجات مل سکتی لیکن اپنے باپ کا نام جاننے کے لئے اس طرح بے چین تھا جیسے مجھے یقین ہوا کہ میں ایک نہ ایک روز بغداد ضرور جاؤں گا اور اپنے باپ کو تلاش کر لوں گا۔

"اس کا..... اس کا نام..... شعبان ہے۔" میری ماں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "شعبان لطفی۔"

میرے باپ کا نام بتا کر اس نے ایک ہچکی لی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئی۔ شاید وہ اتنی دیر بھی

اس لئے زندہ رہی تھی کہ مجھے میرے باپ کا نام بتا سکے۔

میں اس کے بے جان جسم کو اپنے گود میں لیے بیٹھا رہا اور اس پر اپنے آنسو برساتا رہا۔ یہ کیسی بے بسی تھی کہ میں اپنی ماں کو دفنا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ جو اس دنیا سے چلی گئی تھی' اس کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں زندہ تھے۔ اس کے کیے ہوئے انکشاف سے مجھے یہ بات بھی معلوم ہوگئی تھی کہ میں ان منگولوں سے اتنی نفرت کیوں کرتا تھا۔ اس کا سبب خون کے اثرات تھے۔ میری رگوں میں بھی کسی منگول کا نہیں' ایک عرب کا خون دوڑ رہا تھا۔ میری ماں بھی ایرانی تھی' منگول نہیں تھی۔ میں اگر منگول تھا تو صرف اس اعتبار سے کہ میں نے گوبی کے دشت میں آنکھیں کھولی تھیں اور منگولوں میں پرورش پائی تھی۔ ان کا رہن سہن' ان کے رسم و رواج اور ان کے عقائد میری شخصیت کے جزو بن گئے تھے۔ ہر چند میری ماں نے اپنے مذہب کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن میرے ذہن پر اس کے اثرات گہرے نہیں ہوسکے تھے۔ اس کے برخلاف' ماحول کا اثر زیادہ گہرا تھا۔ میں نیلے جاودانی آسمان کی فرماں روائی کو مسلم سمجھتا تھا اور دشت کے رسوم و رواج میری نس نس میں رچ بس گئے تھے۔

میں دیر تک اپنی ماں کی لاش پر آنسو بہاتا رہا اور کسی ارادے کے بغیر ان آنسوؤں کو اپنی زبان سے چاٹ چاٹ کر اپنے گلے کو تر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میری آنکھیں خشک ہوگئیں اور میں اس طرح بیٹھا رہا جیسے اپنے آپ کو بھی بھول گیا ہوں۔

رات کیسے گزری؟ مجھے یاد نہیں۔ سورج کب نکلا؟ مجھے خیال نہیں۔ پھر کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔ میں بہت دیر تک سوتا رہتا لیکن پیاس کی شدت سے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے جن کی تکلیف سے میں جاگ گیا۔

گڑھے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ سورج بالکل اوپر تھا۔ میں نے خود کو گڑھے میں تنہا پایا۔ میری ماں کی لاش موجود نہیں تھی۔ غالباً "بدبخت منگولوں نے اوپر سے دیکھ لیا ہوگا کہ میری ماں مرچکی ہے لہٰذا وہ گڑھے میں آکر لاش اٹھا لے گئے تھے۔ میں اس وقت سو رہا تھا اس لئے مجھے کچھ پتا نہیں چل سکا۔

"ماں!" میں اتنی زور سے چیخا تھا کہ میری آواز دیر تک گڑھے میں چکراتی رہی۔

سلاخوں کے جال سے ایک محافظ نے گڑھے میں جھانکا اور درشت لہجے میں بولا۔ "کیوں شور مچا رہا ہے جادوگرنی کے بیٹے!"

"میری ماں کی لاش کہاں ہے بھیڑیو!" میں غصے سے چیخا تو مجھے پھندا لگ گیا۔ میں کھانسنے لگا اور میرے حلق میں پڑے ہوئے کانٹے اتنے تکلیف دہ ہوگئے کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

"تیری ماں کی لاش کو ندی میں پھینک دیا ہے۔" محافظ نے جواب دیا اور قہقہہ لگا کر بولا۔ "فاطمہ کو بھی اسی ندی میں پھینکا گیا تھا۔ اب دونوں جادوگرنیوں کو تنہائی کا احساس نہیں ہوگا اور وہ ایک دوسری سے باتیں کرکے وقت گزار لیا کریں گی۔"

میں محافظوں کو گالیاں دینا چاہتا تھا لیکن میرے حلق میں پڑے ہوئے کانٹوں نے مجھے چیخنے نہیں دیا اور بے بسی نے مجھے ایک بار پھر رلا دیا۔

محافظ کا چہرہ سلاخوں کے جال سے غائب ہوچکا تھا۔

میری پیاس بڑھتی رہی۔ اگر میں تھوک بھی نگلنا چاہتا تھا تو میرے حلق میں چھریاں سی چلنے لگتی تھیں۔ اب میں پیاسا ہی نہیں بلکہ بھوکا بھی تھا۔ کل سے اب تک میرے منہ میں جو کا ایک دانہ یا گھوڑی کے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں گیا تھا۔

دھوپ جب گڑھے سے جانے لگی تو مجھے کچھ سکون ہوا۔ پیاس کی وجہ سے دھوپ کی تپش بہت تکلیف دہ معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں دو دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ بھوک تو نہیں لیکن پیاس مجھے ضرور مار ڈالے گی۔

"ماں!" ایک بار پھر بلبلا کر رو پڑا۔

اس قید خانے میں مجھے رونے کے سوا کوئی کام نہیں رہا تھا۔ اپنی تکلیف بھی رلا رہی تھی' ماں کی

موت کا غم بھی تھا اور اس باپ کی یاد بھی آرہی تھی جس نے مجھے اور جس کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ بات بھی ممکن تھی کہ وہ بھی مرچکا ہو۔

میں بڑی حسرت سے نیلے جاودانی آسمان کی طرف دیکھتا رہا جس میں نیلاہٹ آہستہ آہستہ سیاہی میں تبدیل ہوتی جارہی تھی۔ گڑھے میں گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے نڈھال ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے بھی نیند تو نہیں آسکتی تھی لیکن میں زمین پر لڑھک گیا۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ بیٹھا رہتا۔

دفعتہً مجھے ایسا لگا جیسے بہت دور سے کوئی مجھے پکار رہا ہو۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور جب آنکھیں کھلیں تو وہ آواز بہت قریب محسوس ہوئی۔

"منگول! منگول!" وہ ایک عورت کی آواز تھی۔

گڑھے کی تاریکی میں مجھے ہلکی ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ میں اچھل کر بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ جو مدھم روشنی میں ہیولے کی طرح نظر آرہی تھی۔ اس نے ایک ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہن رکھا تھا۔ اچانک وہ روشنی غائب ہوگئی اور مجھے یہ اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ روشنی کہاں سے آرہی تھی۔ روشنی کے غائب ہوتے ہی عورت کا ہیولی بھی اندھیرے میں گم ہوگیا لیکن وہ میرے پاس ہی موجود تھی کیونکہ میں نے اس کی آواز پھر سنی۔

"منگول! کیا تو پیاسا نہیں ہے؟"

"تم۔ تم۔ کون ہو؟" میں خوفزدہ ہوگیا تھا۔

حواس کی پراگندگی کی وجہ سے مجھے یاد نہیں آسکا کہ وہ آواز میں نے پہلے کہاں سنی تھی۔ مجھے بس اتنا احساس تھا کہ میں نے اس آواز کو پہلے کبھی سنا ضرور ہے۔

"لے۔ پانی پی لے!" وہ پھر بولی اور پانی کا برتن میرے ہاتھ سے ٹکرایا۔

پانی کی ٹھنڈک میرے ہاتھ نے محسوس کی میں ذرا دیر کے لئے سب کچھ بھول گیا اور پانی کے برتن کو اس طرح جھپٹا مار کر پکڑا کہ بہت سا پانی میرے کپڑوں ہی پر گر گیا۔ جو پانی برتن میں بچا وہ میں نے اپنے حلق میں انڈیل لیا اور مجھے ایسی تسکین حاصل ہوئی جو پہلے کبھی اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوئی تھی۔

"فی الحال میں تیرے کھانے کے لئے کچھ نہیں لاسکی۔"

اس آواز کو سن کر میں ایک بار پھر یاد کرنے لگا کہ یہ آواز پہلے کہاں سن چکا ہوں۔

"شاید تو مجھے پہچاننے کی کوشش کررہا ہے۔" وہ پھر بولی۔ "یقین کر کہ میں تیری دشمن نہیں ہوں۔ مجھ سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیئے۔"

یکایک پانی کا برتن میرے ہاتھ سے گر گیا کیونکہ میں اسے پہچان گیا تھا۔ وہ سولدہ کی آواز تھی۔

"سولدہ!" میرے منہ سے دہشت میں نکلا۔

"میں اس بات پر اعتراض نہیں کروں گی کہ تو مجھے سولدہ کہتا ہے لیکن دراصل میں سولدہ نہیں ہوں۔"

میرے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں اس کی یہ بات نہیں مان سکتا تھا کہ وہ سولدہ نہیں ہے۔ اگر وہ سولدہ نہ ہوتی تو اس گڑھے میں کیسے آجاتی جو سلاخوں کے جال سے بند تھا۔ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو کسی سولدہ ہی میں ہوسکتی ہیں۔ جب میں بغورچی شامان کے ساتھ اس کے غار میں گیا تھا تو اس کے صرف ہنسنے کی آواز سنائی دی تھی اور اس کا وجود نظر نہیں آیا تھا حالانکہ وہ اس غار میں سے اپنا خاص سامان بھی نکال لے گئی تھی۔

دو مرتبہ ایسا ہوچکا تھا کہ میں اس سے دہشت زدہ ہوکر بھاگ نکلا تھا لیکن اب تیسری مرتبہ وہ میرے قریب موجود تھی تو میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں اس گڑھے سے کہاں بھاگتا؟

"منگول!" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میں دیکھ رہی ہوں کہ تو اب بھی دہشت زدہ ہے۔ تیرا جسم خوف سے کانپ رہا ہے۔ آخر تجھے میری بات پر یقین کیوں نہیں آتا کہ میں سولدہ نہیں ہوں؟"

"پھر۔ پھر تو۔ کون ہے؟" میرے حلق سے آواز بڑی مشکل سے نکلی۔

"میں ایک انسان ہوں۔ کیا تو دیکھ نہیں رہا ہے کہ میں ایک ٹھوس جسم رکھتی ہوں۔ مجھے بتا کیا روحوں کا جسم بھی ہوتا ہے؟"

میں اس کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکا۔ میں نے دشت کے شامانوں سے تو یہی سنا تھا کہ روحوں کا جسم نہیں ہوتا اور وہ نظر تو آتی ہیں مگر انہیں چھوا نہیں جا سکتا۔

وہ پھر بولی۔ "میں انسانوں کی طرح سانس لیتی ہوں اور انسانوں کی طرح کھاتی پیتی ہوں۔ انسانوں کی طرح میرے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ یہ دیکھ!" اس نے میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا اور میں نے اس کے دل کی دھڑکنیں محسوس کیں۔ دھڑکنوں کے ساتھ ہی میں نے اس کے سینے کا گداز بھی محسوس کیا اور میرے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی۔ میں نے پہلے کبھی کسی عورت کے بدن کو اس طرح نہیں محسوس کیا تھا۔

"تو نے دیکھا؟" وہ بولی۔

"ہاں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن جب تو سولدہ نہیں ہے تو پھر اس گڑھے میں کیسے آگئی؟" میں نے اپنا ہاتھ کھینچا۔

"مجھے ایک ایسی طاقت حاصل ہے جو تیری دنیا کے لوگوں کو حاصل نہیں۔" اس نے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ "میں مجھے اس طاقت کے بارے میں تو بتا سکتی ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ میری باتیں تیری سمجھ میں نہیں آسکیں گی۔"

سولدہ کی باتوں سے میرا خوف بڑی حد تک کم ہو چکا تھا۔ وہ میرے لئے خطرناک نہیں ثابت ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس نے مجھے پانی پلایا تھا اور یہ اس وقت میرے اوپر بہت بڑا احسان تھا۔

"کیا تو مجھے اس قید نجات دلا سکتی ہے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"یقیناً۔" سولدہ نے جواب دیا۔ "میں تجھے یہاں سے نکالنے ہی کے لئے تو آئی ہوں۔"

"لیکن میں کیسے نکلوں گا؟ میں تیری طرح اڑ کر سلاخوں کے اس جال سے نہیں نکل سکتا۔"

وہ ہنسی اور کہنے لگی۔ "میں بھی یہاں سے اڑ کر نہیں نکلوں گی۔"

"پھر؟"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہنستی ہوئی بولی۔ "بس تو بھی میری طرح سولدہ بن کر یہاں سے نکل جائے گا۔"

"سولدہ بن کر؟" میں پھر کچھ خوفزدہ ہو گیا۔

"ہاں۔"

پھر میں نے ایسی آواز سنی جیسے کمان سے چھوٹا ہوا تیر کسی چٹان سے ٹکرایا ہو۔ اس آواز کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا کہ جیسے یکبارگی میرا جسم، دھوئیں میں تبدیل ہو گیا ہو یا جیسے میں اچانک سو گیا ہوں۔ میری یہ کیفیت بس اتنی دیر کی تھی جتنی دیر میں دو مرتبہ پلک جھپکتی ہے۔ اس وقفے کے بعد میں جاگ گیا اور یہ دیکھ کر حیرت سے میری سانسیں رکنے لگیں کہ اب میں اور سولدہ اس گڑھے میں نہیں تھے۔ چاروں طرف لق و دق صحرا تھا۔ جگہ جگہ ریت کے ٹیلے موجود تھے۔ دشت کے رہنے والوں کا عقیدہ ہے کہ ان ٹیلوں میں بھوت پریت رہتے ہیں اور مسافروں کو ان کی راہ سے بھٹکا دیتے ہیں۔ جب ریت کی یہ چٹانیں ٹوٹتی ہیں تو ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں جیسے دور کہیں پراسرار ڈھول بج رہے ہوں۔

"یہ۔ یہ۔ یہ کون سی۔۔۔ جگہ ہے؟" میں نے بوکھلا کر سولدہ سے پوچھا۔

"جگہ تو وہی ہے لیکن زمانہ بدل گیا ہے۔" سولدہ نے جواب دیا۔

"زمانہ کیسے بدل گیا؟" میں حیرت سے بولا۔

"میں تجھے بتا چکی ہوں کہ میری باتیں تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ میرے ساتھ آ!" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف چل پڑی۔

مجھے عظیم لیوچت سائی یاد آیا۔ سولدہ کی طاقت کے اس پراسرار مظاہرے کو تو شاید وہ بھی نہ سمجھ پاتا۔ میں اب یہ بات کسی طرح بھی نہیں مان سکتا تھا کہ وہ سولدہ نہیں تھی۔ وہ یقیناً" سولدہ تھی ایک ایسی عجیب و غریب سولدہ جو انسانوں کی طرح ایک نرم و گرم جسم کی مالک تھی۔ بہرحال اب میں اس سے خوفزدہ نہیں تھا۔ وہ سولدہ تھی تو کیا ہوا، وہ میری مخالف نہیں بلکہ میری ہمدرد تھی۔

اس کے ساتھ کچھ دور تک چلنے کے بعد مجھے سردی

لگنے لگی۔ یہاں کی فضا بہت ٹھنڈی تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں جیسے برف کا دیوتا سانسیں لے رہا تھا۔ میرے جسم پر اتنے کپڑے نہیں تھے کہ اس ٹھنڈک کا مقابلہ کر سکتے۔

میں نے سولدہ سے کہا۔ "کیا یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ہوا کے تھپیڑوں سے محفوظ رہا جا سکے؟"

"ذرا دور تک اور چل، پھر میں تجھ کو تیری ہی دنیا میں واپس پہنچا دوں گی۔" سولدہ نے جواب دیا۔

"کیا یہ کوئی اور دنیا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"زمانہ بدل جائے تو دنیا بھی بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے ورنہ یہ ہے تو وہی زمین جہاں بعد کے زمانے میں قیدیوں کے لیے گڑھے بنائے گئے۔"

سولدہ کا یہ جواب میری کھوپڑی کے کسی حصے میں بھی نہ سما سکا۔

"اب رک جا!" وہ کچھ دیر بعد بولی اور پھر پلٹ کر دیکھتی ہوئی بڑبڑائی۔ "میرا خیال ہے ہم خاصی دور نکل آئے ہیں۔ اب واپس تیرے زمانے میں پہنچیں گے تو ان گڑھوں سے بہت دور ہوں گے۔"

"تیری باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"یہ میں بھی جانتی ہوں۔" سولدہ نے کہا۔ اس نے اب بھی میرا ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اچانک اس نے اپنا دوسرا ہاتھ اپنی کمر پر رکھا اور میں نے لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سنی۔ ایک پھر مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم دھواں دھواں ہو گیا ہو۔ پھر جب وہ دھواں دوبارہ میرا جسم بنا تو میں نے دیکھا کہ میں دشت کے اسی جنگل میں ہوں جہاں قویق خاقان کی حکمرانی تھی۔ یہاں آتے ہی مجھے سردی سے بھی نجات مل گئی۔ یہاں سے کچھ دور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور میں جانتا تھا کہ ان جھاڑیوں کی دوسری طرف وہ میدان ہے جہاں قیدیوں کے گڑھے ہیں۔

سولدہ بولی۔ "صبح ہونے سے قبل ان لوگوں کو یہاں معلوم ہو سکے گا کہ تو گڑھے سے غائب ہو چکا ہے۔ پھر جب انہیں یہ معلوم ہو گا تو تیری تلاش شروع ہو جائے گی لہٰذا اس سے پہلے کہ تجھے پھر گرفتار کر لیا جائے، اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے سوچ لے!"

"میں کیا سوچوں؟" میں نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"یہی سوچ کہ تو اپنے آپ کو ان لوگوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کیا کر سکتا ہے۔"

"میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ یہاں سے اتنی دور چلا جاؤں کہ منگول گھوڑوں کی ٹاپیں مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔"

"یہ بزدلی ہو گی۔ تجھے ڈٹ کر حالات سے مقابلہ کرنا چاہیے۔"

"میں تن تنہا ان سب کا مقابلہ کیسے کر سکوں گا؟"

"میں جو تیرے ساتھ ہوں۔" سولدہ نے کہا۔ "کیا میری طاقت تیرا سہارا نہیں بن سکتی؟"

"تیری طاقت تو بہت بڑا سہارا ہے لیکن تو ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں ہر وقت تو تیرے ساتھ نہیں رہ سکتی کیونکہ مجھے اپنی حفاظت کی فکر بھی تو رہتی ہے۔"

"اپنی حفاظت؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"ہاں۔" سولدہ نے جواب دیا۔ "میرے کچھ دشمن میرے تعاقب میں ہیں۔"

"لیکن کوئی تیرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟"

"وہ لوگ جو میری ہی طرح طاقتور ہیں، وہ مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"یعنی اور سولدہ ہیں؟" میں حیرت سے بولا۔

"یہی سمجھ لے۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم! میں بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ مجھے مختلف زمانوں میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ جب وقت کے دھارے پر ان کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں تو میں ان سے بچنے کے لیے کسی دور دراز کے زمانے میں بھاگ جاتی ہوں۔"

سولدہ کے اتنے طویل جواب میں سے صرف اتنی

بات میری سمجھ میں آسکی کہ سولدہ کو کسی کے خوف سے بھاگنا بھی پڑتا ہے۔ میں حیرت سے بولا۔ "تو ان سے اتنی خوفزدہ ہے؟"

"ہاں، کیونکہ ان کی تعداد زیادہ ہے۔ میں ان کے مقابلے پر اکیلی ہوں۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے دشت کے ان بے شمار منگولوں کے سامنے تو بالکل اکیلا ہے۔ تیرا سہارا تو میں بن جاؤں گی لیکن میرا سہارا کوئی نہیں ہے اس لیے مجھے ادھر سے ادھر بھاگنا پڑتا ہے۔ دو ایک مرتبہ ان لوگوں سے میرا سامنا بھی ہو چکا ہے اور میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچا سکی ہوں۔"

مجھے یوں اس کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں حیرت سے بولا۔ "کیا تو مر بھی سکتی ہے؟"

"ہاں موت تو میرے لیے بھی ہے۔ کوئی بھی مجھے مار سکتا ہے۔ اگر تو میرے سینے میں تلوار گھونپ دے تو میں مر جاؤں گی۔"

مجھے ایسا لگا جیسے سولدہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہو۔ میں آخر کیسے مان لیتا کہ کوئی سولدہ بھی مر سکتی ہے۔ اس کا کہنا تو یہی تھا کہ وہ سولدہ نہیں ہے لیکن میں نے اس کی یہ بات بھی کب مانی تھی؟ اس میں جو پراسرار طاقت تھی، وہ کسی سولدہ ہی میں ہو سکتی تھی۔

"تجھے میری باتوں پر یقین نہیں آرہا ہے۔" سولدہ ہنس کر بولی۔ "خیر، چھوڑ اس بحث کو! فی الحال ہمیں کسی ایسے مقام تک پہنچنا چاہیے جہاں ہم رات گزار سکیں۔"

"تو کہاں رہتی ہے؟"

"تیرے زمانے میں تو میں بورخان قالدون کے کسی غار میں رہتی ہوں۔"

"اسی غار میں جہاں۔۔۔"

سولدہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "نہیں اب میں نے دوسرے غار میں ٹھکانہ بنا لیا ہے۔ اگر اسی غار میں رہتی تو بغورچی شامان مجھے پریشان کرتا رہتا۔"

"لیکن میں وہاں تک پیدل نہیں جا سکتا۔ مجھ سے تو اب کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا ہے۔ میں دو دن سے بھوکا ہوں۔"

"میں تجھے کھانے کے لیے لا دیتی ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"مجھے ایک ایسے زمانے میں جانا پڑے گا جہاں میں نے کچھ لوگوں کو اپنا دوست بنا لیا ہے۔" سولدہ نے کہا۔ "کیا تو پیٹ بھرنے کے بعد بورخان قالدون تک پیدل چل سکے گا۔"

"ہاں، اس کے بعد تو چلا جا سکتا ہے۔"

"تو پھر میرا انتظار کر!"

میں نے وہی مخصوص آواز سنی، جیسے لوہے سے لوہا ٹکرایا ہو، اور اس آواز کے ساتھ ہی سولدہ میری نظروں سے اچانک غائب ہو گئی۔

میں وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ نقاہت کے باعث واقعی میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں سولدہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ میری دوست بن گئی تھی اس لیے اب مجھے اس سے کوئی خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ بڑی بے بسی کے عالم میں سولدہ کی پراسرار طاقت کا سہارا مل جانے کے باعث میری ڈھارس بندھ گئی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب میں ان درندہ صفت منگولوں سے اپنی ماں کا انتقام ضرور لے سکوں گا۔ سولدہ نے جب مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں ان منگولوں کے مقابلے پر ڈٹ جاؤں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہر طرح سے میرا ساتھ دے گی۔

لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ ان منگولوں سے انتقام لینے کے لیے مجھے کیا قدم اٹھانا پڑے گا۔

مجھے اپنی ماں کی باتیں یاد آئیں تو مجھے خیال آیا کہ مجھے اپنے باپ کی تلاش میں بغداد میں جانا چاہیے؟ بغداد صحرائے گوبی سے بہت دور تھا اور مجھے اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ بغداد اہل علم اور اہل فن مسلمانوں کا ایک خوبصورت شہر ہے اور مسلمانوں کا خاقان وہیں رہتا ہے جسے وہ لوگ خلیفہ کہتے ہیں۔ ان لوگوں کی زبان میں خاقان کو خلیفہ کہا جاتا ہو گا۔

چھوٹی ماں فاطمہ نے مجھے بتایا تھا کہ قوبوق خاقان مسلمانوں کا بہت زبردست دشمن ہے اور ان کو خاک

میں ملانے کے لیے تیسری بڑی یورش کا منصوبہ بنا رہا ہے لیکن اس منصوبے پر عمل کرنے سے پہلے وہ اپنے چچا کے بیٹے باتو خاں کو اپنے تخت کے آگے جھکانا چاہتا ہے۔ باتو خاں جو مغرب کے دشت کا حکمراں تھا اور خود کو مطلق العنان سمجھنے لگا تھا۔

میرے دماغ میں یہ بات بار بار آرہی تھی کہ اگر ان دونوں کا ٹکراؤ ہو گیا تو منگول طاقت کا شیرازہ بکھر جائے گا اور پھر یہ لوگ مہذب دنیا کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہیں ثابت ہو سکیں گے۔

میں ان سب باتوں میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک میں نے سولدہ کو اپنے قریب کھڑا ہوا دیکھا۔ وہ واپس آگئی تھی اور میرے لیے کھانے پینے کا بہت سا سامان لائی تھی۔ کھانے کی وہ چیزیں ایسی تھیں جو میں نے زندگی میں کبھی نہیں کھائی تھیں مگر ان کا مزہ بہت اچھا لگا۔ وہ سامان اتنا تھا کہ میں نے پیٹ بھر کر کھایا، پھر بھی بچ رہا۔ اس کے بعد میں نے پانی بھی خوب پیا لیکن اس کے بعد میرا دل چاہنے لگا کہ وہیں لیٹ کر سو جاؤں، چلنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ جب میں نے سولدہ کو اپنی اس حالت کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔

"تجھے چلنا تو پڑے گا۔ اگر تو یہیں پڑ کر سو گیا تو دن نکلنے پر وہ لوگ تجھے دیکھ لیں گے اور پکڑ لے جائیں گے۔"

"کیا تو مجھے دھواں بنا کر نہیں لے جا سکتی؟"

"دھواں بنا کر؟" وہ حیرت سے بولی اور پھر اس طرح ہنس پڑی جیسے میرا مطلب سمجھ گئی ہو۔ اس نے کہا۔ "نہیں میں اس طریقے سے سفر زمانی تو کر سکتی ہوں، سفر مکانی نہیں کر سکتی۔"

"کیوں؟"

"دیکھ بوغا! تو مجھ سے بحث نہ کیا کر! میں جو باتیں تجھے سمجھانا چاہوں گی، وہ تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ چل اب ہمت کر، قدم بڑھا۔"

چار و ناچار مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ میرے دماغ پر غنودگی چھائی ہوئی تھی اس لیے میں نے راستے میں سولدہ سے کوئی بات بھی نہیں کی۔ بورخان قالدون تک پہنچتے پہنچتے میں بالکل نڈھال ہو گیا اور مجھے نیند کے دیوتاؤں نے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

جب میں جاگا تو غار میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ غار کا دہانہ دھوپ سے چمک رہا تھا۔ سولدہ غار میں موجود نہیں تھی۔ میں بھوک محسوس کر رہا تھا۔ مجھے وہاں کھانے پینے کا سامان نظر آگیا اور میں ساری باتوں کو بھول کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔ جب میں پیٹ بھر چکا تو پہلی مرتبہ میں نے سوچا کہ سولدہ کہاں چلی گئی؟

میں نے سوچا ہی تھا کہ سولدہ غار میں داخل ہوتی نظر آئی۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا ریشمی لبادہ پہن رکھا تھا اور اس کے گلے میں بڑے بڑے موتیوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

"تو خوب سویا۔"

میں اسے تکتا رہا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کا سارا خوف میرے دل و دماغ سے ختم ہو چکا تھا۔

"کیا دیکھ رہا ہے؟" وہ ہنس کر بولی اور نمدے کے بستر پر بیٹھ گئی۔

"تجھے ہی دیکھ رہا ہوں۔ تو مجھے بہت اچھی لگ رہی ہے۔ اگر تو سولدہ نہ ہوتی تو میں تجھے اپنی بیوی بنا لیتا۔" میں یہ سب کچھ بڑی بے باکی سے کہہ گیا۔

سولدہ مسکراتی رہی اور بولی۔ "تو یہاں بڑا مطمئن نظر آرہا ہے وہاں وہ لوگ بڑی سرگرمی سے تجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

"انہیں میرے غائب ہونے کا پتا چل گیا؟"

"ہاں۔" سولدہ نے کہا۔ "تو یوق خاقان کے وزیر یلواچ نے قید خانے کے محافظوں کو حکم دیا ہے کہ وہ شام تک تجھے ڈھونڈ نکالیں ورنہ ان سب کو گڑھوں میں پھینکوا دیا جائے گا اور ان پر کھولتے ہوئے پانی کی بوچھار کی جائے گی۔"

"کاش میں اس صحرا کے ہر منگول کو ان گڑھوں میں پھینکوا سکتا!"

"تجھے سارے منگولوں سے کیا دشمنی ہے؟"

"یہ وحشی اسی قابل ہیں کہ انہیں کچل دیا جائے۔"

"مجھے حیرت ہے کہ تو اپنی ساری قوم سے نفرت

کرنے لگا ہے۔"

"یہ میری قوم نہیں ہے سولدہ!" میں نے بڑی جوش سے کہا۔ "میری ماں منگول نہیں تھی اور جب یہ وحشی اسے اٹھا کر یہاں لائے تھے تو میں اس کے پیٹ میں موجود تھا۔ چنکائی میرا باپ نہیں ہے۔"

"واقعی؟" سولدہ حیرت سے بولی۔

"ہاں۔" میں نے دکھ سے کہا۔ "میری ماں نے مرتے وقت مجھے بتایا تھا کہ میرا باپ بغداد میں رہتا تھا اور وہ زندہ ہے تو اب بھی وہیں رہتا ہوگا۔ سولدہ! میں اپنے باپ کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔"

سولدہ کچھ دیر تک چپ رہی۔ اس کے پیارے چہرے پر مجھے ایسی علامات نظر آرہی تھیں جو میں نے کبھی کبھی عظیم لیوچت سائی کے چہرے پر دیکھی تھیں۔ وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "یقیناً" تیری ماں نے تجھے ٹھیک ہی بتایا ہوگا۔ تیری فطرت واقعی منگولوں کی فطرت سے کچھ مختلف ہے۔"

"اب تو مجھے بتا سولدہ! تو میرے لیے کیا کر سکتی ہے۔"

"تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

"ان منگولوں سے انتقام لینے میں میری کیا مدد کر سکتی ہے؟"

"تو ہی تو بتا کہ تو کیا چاہتا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں کہ ان منگولوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے۔"

"گویا تو ان لوگوں میں مخالفت کا بیج بونا چاہتا ہے؟"

"ہاں۔"

"یہ تو اسی طرح ہو سکتا ہے کہ تو ان کی صفوں میں رہے اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتا رہے۔"

"لیکن اب حالات ایسے ہیں کہ میں ان میں گھل مل نہیں سکتا۔"

"میں ایسے حالات پیدا کر سکتی ہوں۔"

"کیسے؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

سولدہ ذرا دیر کچھ سوچتی رہی، پھر بولی۔ "سرقوشنی بیگی اپنی اولاد کو تخت اقتدار پر دیکھنا چاہتی ہے لیکن

اب تک اس کا یہ خواب پورا نہیں ہو سکا ہے۔ تو اس کا دوست بن کر اسے قوبوق خاقان کی مخالفت میں کھ کر سکتا ہے۔"

"لیکن میں اس کا دوست کیسے بن سکتا ہوں؟"

"میں ایسے حالات پیدا کر دوں گی تجھے اس کا اعتم حاصل ہو جائے۔"

"کس طرح؟" میں تدبیر جاننے کے لیے بے چین ہوا جا رہا تھا۔

"تجھے سرقوشنی بیگی پر یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ تو ایک شامان ہے اور اپنی پراسرار طاقتوں کو سرقوشنی بیگی کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہے۔"

"لیکن وہ یہ کیسے مان لے گی کہ میں شامان ہوں؟"

"تو دو ایک سچی پیش گوئیاں کر کے خود کو شامان ثابت کر سکتا ہے۔"

"لیکن میں سچی پیش گوئیاں کیسے کر سکتا ہوں؟"

"وہ پیش گوئیاں تجھے میں بتا دوں گی۔" سولدہ نے مسکرا کر کہا۔

"تو پیش گوئی کر سکتی ہے؟"

"ہاں میں خوب جانتی ہوں کہ کیا ہونے والا ہے۔"

"تو یہ جانتی ہے کہ کیا ہونے والا ہے پھر بھی تو یہ کہتی ہے کہ تو سولدہ نہیں ہے۔"

"ہاں میں سولدہ نہیں ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"تیری اس بات پر مجھے اب تک یقین نہیں آیا۔"

"ایک نہ ایک روز آجائے گا۔"

"مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے پوچھا "میں سرقوشنی بیگی تک پہنچوں گا کیسے؟"

"آج رات کو میں تجھے اس کے محل میں پہنچا دوں گی۔"

"کس طرح؟"

"میں جو کام کرنے کا وعدہ کر لوں، اس کے بارے میں یہ نہ پوچھا کر کہ وہ میں کس طرح کروں گی۔"

"اچھا یہ تو بتا کہ مجھے کیا کیا پیش گوئیاں کرنا ہوں گی۔"

"یہ میں تجھے آج رات کو اسی وقت بتاؤں گی جب تجھے سرقوشنی بیگی کے محل میں لے جاؤں گی۔" سولدہ نے کہا' پھر بولی "تجھے چاہیے کہ رات تک اس غار سے باہر نہ نکلے' یہاں تک کہ میں واپس آجاؤں اور تجھے سرقوشنی کے محل میں لے جاؤں۔"

"کیا تو کہیں جا رہی ہے؟"

"ہاں۔"

"کہاں؟۔"

"مستقبل میں۔" وہ مسکرائی۔ "میں یہ دیکھنے جا رہی ہوں کہ مستقبل میں ایسے کیا واقعات پیش آنے والے ہیں جن کی پیش گوئی کر کے تو خود کو شامان ثابت کر سکے۔"

میں اس کا منہ تکنے لگا کیا اس کی یہ باتیں ثابت نہیں کرتی تھیں کہ وہ واقعی سولدہ ہے؟

اس نے بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنا ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھا اور میں نے وہی مخصوص آواز سنی جیسے لوہے سے لوہا ٹکرایا ہو' اس آواز کے ساتھ ہی سولدہ میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئی میں اس خالی بستر کو دیکھتا رہ گیا جہاں سولدہ بیٹھی ہوئی تھی۔

مجھے بغور چی شامان کا خیال آیا۔ وہ یقیناً" اب بھی سولدہ کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا ہو گا' لیکن کیا وہ اس سولدہ کو قابو میں کر سکے گا؟ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ بغور چی شامان کی پراسرار طاقت کم از کم اس سولدہ کو تو قابو میں نہیں رکھ سکتی جو میری دوست بن چکی ہے۔

سولدہ کی تاکید کے مطابق میں اپنا وہ دن اس غار میں گزارنا چاہتا تھا لیکن مجھے یہ فکر بھی تھی کہ منگول میری تلاش میں ادھر نکل آئے تو میری حالت اس لومڑی سے مختلف نہیں ہو گی۔ جس کے بھٹ کا ایک ہی راستہ ہو اور اس راستے پر شکاری موجود ہوں۔

لیکن میں نے وہ دن اسی غار میں گزار دیا اور کوئی بھی میری تلاش میں اس طرف نہیں آیا۔ ان لوگوں نے شاید یہ سمجھا ہو گا کہ میں اس علاقے میں رک کر اپنی گرفتاری کا خطرہ مول نہیں لے سکتا اس لیے کہیں دور نکل گیا ہوں گا۔

کھانے پینے کی چیزوں کی وہاں کوئی کمی نہیں تھی اس لیے دن گزارنا میرے لیے مشکل بھی نہیں ثابت ہوا' وقت گزاری کے لیے میں سولدہ کی بعض چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا ان عجیب و غریب چیزوں کو دیکھنا میرے لیے ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ کہ کوئی یہ میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ ان میں سے کون سی چیز کس طرح استعمال کیا جا سکتی ہے۔

جب اندھیرا پھیل گیا تو میں پہلی مرتبہ غار کے دہانے پر پہنچا اور باہر کا جائزہ لینے لگا اب مجھے یہ خوف نہیں تھا کہ کوئی مجھے دیکھ لے گا تاریکی اتنی تھی کہ جب تک کوئی قریب نہ آجاتا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں نے بستی کی طرف دیکھا تو مجھے ننھے ننھے سے شعلے چمکتے ہوئے نظر آئے۔ ان شعلوں کو میں خوب جانتا تھا' وہ دراصل الاؤ تھے۔ جو بستی کے مختلف حصوں میں دہک رہے تھے۔ ان میں سے ہر الاؤ کے گرد لوگ جمع ہوں گے۔ اور گھوڑی کے سڑے ہوئے دودھ کی شراب پی کر گا بجا رہے ہوں گے۔ دشت کے لوگوں میں یہ گیت بہت مقبول ہے۔

اے دیوتا!
جاڑوں میں ہمیں جنوب کا کھا جا ملے
گرمیوں میں ہمیں شمال کا کھا جا ملے
شکار میں ہمیں
بہ کثرت جنگلی سور اور ہرن ملیں۔
اے دیوتا اے دیوتا!"

اور جس الاؤ کے گرد گانا بجانا نہیں ہو گا وہاں کوئی داستان سرا لوگوں کو قدیم سورماؤں کی شجاعت کے قصے سنا رہا ہو گا' یا وہ سب ایک دوسرے کو دشت کی خبریں سنا رہے ہوں گے۔ کہ طاقت کے پہاڑ سے لے کر سرحد کی چوکیوں تک کا کیا خیال ہے۔ ہر آدمی سنی ہوئی خبر کو اپنے دل میں ضرور دہرا رہا ہو گا۔ تاکہ جب اپنے یورت میں واپس جائے تو وہ دلچسپ خبر اپنی بیوی کو اور اپنے بچوں کو سنا سکے۔

میرا خیال تھا کہ آج ہر الاؤ کے گرد یہ خبر ضرور سنائی جا رہی ہو گی کہ چنکائی کا بیٹا بڑے پراسرار طور پر قید خانے سے بھاگ نکلا ہے اور منگول دستے اس کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

میں کچھ دیر تک ان روشنیوں کو دیکھتا رہا اور پھر غار میں بستر پر جا لیٹا وہاں سولدہ کی عجیب و غریب مشعل موجود تو تھی لیکن میں اسے جلانے کا طریقہ نہیں جانتا تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے مجھے نیند آگئی' اور پھر میں اس وقت جاگا جب مجھے سولدہ نے پکارا "بوغا اے بوغا"

میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور میں نے دیکھا کہ غار میں روشنی تھی سولدہ کی مشعل کا غیر متحرک شعلہ ہی وہ روشنی پھیلا رہا تھا مشعل بستر کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ سولدہ بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھی۔ اور اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت تھکی ہوئی ہو۔

"کیا سارے دن سوتا ہی رہا ہے۔"

میں اندھیرا پھیلنے کے بعد بستر پر لیٹا تھا کتنی رات گزر گئی؟"

"ایک تہائی بھی مشکل سے گزری ہوگی۔" سولدہ نے جواب دیا۔

"تو کب آئی؟۔"

"ابھی ابھی آئی ہوں بھوک لگ رہی تھی اس لیے آتے ہی کھانے بیٹھ گئی۔"

"کیا تو مستقبل میں ہو آئی؟۔" مجھے اپنا یہ سوال خود بھی بڑا عجیب سا معلوم ہوا تھا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا "میں تین اہم واقعات معلوم کر کے لوٹی ہوں۔ تجھے فروشنی بیگی کے سامنے انہی واقعات کی پیش گوئی کرنا ہے۔"

"وہ واقعات کیا ہیں؟۔" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ان میں سب سے اہم اور سرقوشنی بیگی کے لیے سب سے پر مسرت معاملہ یہ ہے کہ قویوق خاقان کی موت کا وقت قریب آگیا ہے۔" سولدہ نے بتایا "دشت کے لوگوں کی تربیت کی دی ہوئی جنتری کے مطابق یہ سور کا سال ہے اگلا سال چوہے کا سال ہوگا' اور خان قویوق چوہے کا سال دیکھنے سے پہلے مرجائے گا"

"واقعی؟۔" میں حیرت سے بولا "اس کے بعد دشت کا خاقان کون بنے گا؟"

"سرقوشنی بیگی کا لڑکا۔۔۔"

"قویوق کتنے دن بعد مرے گا؟۔" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"تجھے بس اتنی ہی پیش گوئی کرنا ہے کہ اسے چوہے کا سال دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔"

"تو یہ پیش گوئی پوری ہونے میں تو ابھی کافی دن ہیں؟۔"

"ہاں"

"تو پھر جب تک یہ پیش گوئی پوری نہ ہو جائے سرقوشنی میرے شامان ہونے کا یقین کیسے کرلے گی؟۔"

"اس کے لیے میں تجھے دو اور واقعات بتا رہی ہوں۔" ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ کل شام کو سرقوشنی بیگی کا ایک ملازم سانپ کے کاٹنے سے مرجائے گا۔"

"اس ملازم کا نام کیا ہے؟۔" میں نے سوال کیا۔

"وہ واقعہ اس سے اگلے دن' رات کو پیش آئے گا۔"

سرقوشنی بیگی سے کہہ دینا کہ وہ اس رات اپنی خوابگاہ کے بستر پر نہ لیٹے کیونکہ آدھی رات کے بعد کسی وقت بھی خوابگاہ کی چھت کا ایک شہتیر ٹوٹ کر اس کے بستر پر گرے گا' اگر وہ اس وقت اپنے بستر پر ہوئی تو شہتیر کے نیچے دب کر ہلاک ہو جائے گی۔" سولدہ نے مجھے تفصیل سے بتایا۔ اور پھر بولی۔

"لگے ہاتھوں تو یہ پیش گوئی بھی کر سکتا ہے کہ اس رات کے دو دن بعد قویوق اپنی بہت زبردست عسکری قوت کے ساتھ باتو خان کے دشت کا رخ کرے گا کیونکہ وہ باتو خان کے جواب سے بہت برہم ہے۔ باتو خاں نے پیر میں درد کا بہانہ کر کے قرولتائی میں شرکت کرنے سے معذوری ظاہر کردی ہے' اس کا یہ جواب قویوق کو آج ہی ملا ہے۔"

"یہ پیش گوئی سرقوشنی کو زیادہ متاثر نہیں کر سکتی کیونکہ یہ بات مجھے کسی پراسرار طاقت کو ذریعہ بنائے بغیر بھی معلوم ہو سکتی ہے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لیکن جب تیری دو حیرت انگیز پیش گوئیاں پوری ہو جائیں گی تو سرقوشنی اس

پیش گوئی سے بھی متاثر ہو جائے گی۔ قریبی کچھ پیش گوئی پر اسے قبل از وقت ہی یقین آجائے گا۔"

یکایک میں نے دیکھا کہ سولدہ اچانک گھبرا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ شاید اس نے کوئی خطرہ محسوس کیا تھا اور وہ خوفزدہ معلوم ہونے لگی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"وہ آرہے ہیں۔" سولدہ کے منہ سے نکلا۔

"کون؟"

"میرے دشمن۔" سولدہ نے تیزی سے جواب دیا "یوغا! میں جا رہی ہوں میں آج رات تجھے سرقوشنی کے محل میں نہیں لے جا سکوں گی۔"

پھر اس سے پہلے کہ سولدہ میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ ایک عجیب سی بات ہوئی مجھے یوں لگا جیسے ہلکا سا دھماکا ہوا ہو اور اس کے ساتھ ہی میں نے غار میں پانچ آدمیوں کو کھڑا ہوا دیکھا۔ وہ بالکل اسی طرح ظاہر ہوئے تھے جیسے سولدہ ظاہر ہوتی تھی۔ وہ پانچوں ایسا لباس پہنے ہوئے تھے جو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور ان سب کے ہاتھوں میں ایک ہی وضع کی کوئی چیز دبی ہوئی تھی۔ کالے لوہے سے بنی ہوئی ان چیزوں کا اگلا حصہ سلاخوں کی طرح تھا اور ان سلاخوں میں سوراخ تھے۔

سولدہ انہیں دیکھ کر بہت بری طرح گھبرا گئی تھی اور اس کا ایک ہاتھ بڑی تیزی سے اپنی کمر پر پہنچ گیا تھا۔

پانچوں ایک دم چیخ پڑے۔ انہوں نے سولدہ سے کچھ کہا تھا لیکن جو کچھ کہا تھا' وہ میں نہیں سمجھ سکا' وہ زبان میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔

میں نے لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سنی' وہی آواز جو سولدہ کے غائب ہونے سے پہلے سنائی دیتی تھی۔ اس آواز کے ساتھ ہی غار میں دو دھماکے ہوئے اور میں نے دو آدمیوں کے ہاتھوں میں دبی ہوئی ان چیزوں سے غریب چیزوں کی نال سے دھواں نکلتے دیکھا۔ سولدہ غائب ہو چکی تھی۔

پانچوں نے چیخ کر ایک دوسرے سے کچھ کہا پھر میں نے لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آوازیں سنیں اور پانچوں ہی بھی میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک اتنا تیز اور اتنا عجیب و غریب تھا کہ میری ٹانگیں سنسنانے لگیں۔ اور میں بستر پر گر پڑا میرا دل بہت زور زور سے اچھل رہا تھا' اور میں پسینے میں نہا گیا تھا۔

مجھے سولدہ کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ کچھ لوگ اس کے دشمن ہیں اور اس کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہ پانچوں غالباً" وہی لوگ تھے انہوں نے آج پھر سولدہ کو ڈھونڈ نکالا تھا' لیکن سولدہ ایک مرتبہ پھر ان کی گرفت سے نکل بھاگی تھی۔ وہ پانچوں یقیناً" اس کے تعاقب میں گئے تھے۔

میں اس رات سو نہیں سکا اور سولدہ کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آئی۔ اب میں اس خیال سے پریشان ہونے لگا کہ شاید وہ پانچوں اسے پکڑ لینے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے۔ ورنہ وہ ضرور واپس آتی۔

دن نکلا اور پھر وہ بھی اسی پریشانی میں گزر گیا کھانے پینے کا سامان موجود تھا اس لیے میں بھوک پیاس کی پریشانی سے بچا رہا پھر رات آگئی لیکن سولدہ نہیں آئی۔

سولدہ کی تشعل کل رات سے اب تک جل رہی تھی۔ اور اس کا غیر متحرک شعلہ بجھ نہیں سکا تھا۔

اس رات مجھے نیند آگئی لیکن سولدہ اس رات بھی نہیں آئی

وہ دن نکلا تو میں نے کھانے پینے کا بچا کھچا سامان بھی اپنے پیٹ میں ڈال لیا۔ اب مجھے دوبارہ بھوک پیاس لگتی تو اس کا علاج کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ مجھے بڑی بے بسی اور تنہائی محسوس ہوئی۔ میں ایک بار پھر بے سہارا ہو چکا تھا' مجھے ایک عظیم منگول عورت کا قول یاد آیا جو میں نے کسی داستان سرا سے سنا تھا۔ وہ عظیم منگول عورت چنگیز خان کی ماں تھی۔ اس نے بے سروسامانی کے زمانے میں ایک مرتبہ چنگیز خان سے کہا تھا۔

"ہماری پرچھائیوں کے علاوہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جو ہمارا ساتھ دے سکے۔ اور گھوڑے کی دم کے سوا ہمارے پاس کوڑا تک نہیں۔"

بے چارگی کے یہ الفاظ آج میں بھی کہہ سکتا تھا بلکہ شاید میری حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ کام تھا

طاقت کے پہاڑ بور خان قالدون پر ہونے کے باوجود میں خود کو بے طاقت اور کمزور محسوس کر رہا تھا۔ میں وہاں بھوکا پیاسا رہ کر بھلا کب تک چھپا رہ سکتا تھا! سوامدہ کی طرف سے اب میں قطعی مایوس ہو چکا تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گی اب مجھے اپنی زندگی بچانے کے لیے خود جدوجہد کرنی تھی۔ عام حالات میں اگر گھوڑے سے گر کر، تلوار کا زخم کھا کر یا کسی منحوس بیماری کا شکار ہو کر، میں مرجاتا تو شاید مجھے اپنی موت سے پہلے کوئی قلق نہ ہوتا لیکن مجھے یوں مرنا قبول نہیں تھا۔ میں زندہ رہنے پر بضد تھا اور یہ بڑی عجیب بات تھی۔ اسے عجیب ہی کہیں گے کہ ایک ایسا شخص جینے کی ضد کرے جو ہزاروں لاکھوں دشمنوں کے نرغے میں ہو اور جسے سزائے موت سنائی جا چکی ہو۔ کیا میں ان وحشیوں اور درندوں سے فاطمہ کے خون کا بدلہ نہ لیتا جسے میں چھوٹی ماں کہتا تھا! کیا میں ان قاتلوں سے اس بے گناہ عورت کا انتقام نہ لیتا جس نے مجھے مرنے سے پہلے بتایا تھا کہ میرا ان قاتلوں سے کوئی خونی رشتہ نہیں وہ مظلوم عورت جس کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے اور جو میری سگی ماں تھی۔

نہیں! میں اپنے خون کو نہیں جھٹلا سکتا۔ میں سوچتے سوچتے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا، میں انتقام ضرور لوں گا، ایک بھیانک انتقام! میں نے سوچا اور غار کے دہانے کی طرف بڑھا لیکن دہانے تک پہنچ کر پھر لوٹ آیا ابھی سورج نے اپنا سفر مکمل نہیں کیا تھا میں اس وقت تک غار سے باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا جب تک اندھیرا نہ پھیل جاتا زندہ رہنے کے لیے میرا غار سے باہر آنا ضروری تھا کیونکہ اب مجھے بھوک اور پیاس ستانے لگی تھی مگر اس حد تک نہیں کہ میری جسمانی توانائی پر اثر انداز ہو۔ میں اپنی توانائی کھونے سے پہلے خوراک حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ یہ تو نیلے جاودانی آسمان ہی کو معلوم تھا کہ مجھے کن کن خطروں سے دوچار ہونا تھا۔ انہی ان دیکھے خطروں سے نبرد آزما ہونے کے لیے مجھے اپنی توانائی برقرار رکھنا تھی میں اسی لیے بے چینی سے اندھیرا پھیلنے کا منتظر تھا۔

سولدہ مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلی گئی تھی مگر مجھے جینے کی ایک راہ دکھا گئی تھی۔ وہ راہ جو سرقوشنی بیگی کے محل تک جاتی تھی اور راہ جہاں ہر قدم پر موت اپنا جال بچھائے بیٹھی تھی۔ اب بھی میرے لیے ایک موقع تھا۔ اگر میں کسی طرح سرقوشنی بیگم کے محل تک پہنچ جاتا تو اس کا اعتماد حاصل کر کے اپنی زندگی بچا سکتا تھا۔ سولدہ کی بتائی ہوئی پیش گوئیوں میں سے ایک پیش گوئی کا وقت تو گزر چکا تھا مگر ابھی دوسری پیش گوئیوں کے علاوہ ایک ایسی پیش گوئی کا وقت نہیں گزرا تھا جس کی صداقت اپنے آنکھوں سے دیکھ کر سرقوشنی بیگی مجھے پر اسرار قوتوں کا مالک سمجھ سکتی تھی اس پیش گوئی سے سرقوشنی بیگی کی زندگی بچ سکتی تھی اور میری زندگی بھی! آنے والی رات کے بطن میں سرقوشنی بیگی کے لیے جو خطرہ پوشیدہ تھا، میں اسے اس خطرے سے قبل از وقت آگاہ کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں سرقوشنی بیگی کی زندگی بچالوں تو وہ بھی مجھے نہیں مرنے دے گی۔ اپنی جان بچانے کی، میرے سامنے صرف اور صرف یہی صورت تھی، کوئی اور نہیں میں جانتا تھا کہ اب میرا فرار ناممکن ہے۔ میرا فرار اسی وقت تک ممکن تھا جب تک دشمنوں کو یہ علم نہیں ہوا تھا کہ میں ان کے چنگل سے نکل چکا ہوں۔ اس رات ہی اگر میں فرار ہو جاتا تو ممکن تھا کہ میں بچ جاتا لیکن اب وہ ہوشیار ہو چکے تھے۔ سولدہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں انہی کے درمیان پیدا ہوا تھا اس لیے اچھی طرح جانتا تھا کہ جب وہ کسی کا تعاقب کرتے ہیں تو ان سے بچ کر نکل جانا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ وہ کئی کئی دن تک اپنے دشمن کا تعاقب کرتے ہیں اور آخر کار اسے جا ہی لیتے ہیں۔

اگر آنے والی رات بھی میں اسی غار میں گزار دیتا تو وہ رات بھی گزر جاتی اور اس رات کے ساتھ ہی میری زندگی کی آخری امید بھی دم توڑ دیتی۔ میں نے اسی لیے غار سے نکل کر خطرات کے مقابل آنے کا حوصلہ کیا تھا۔ جان جائے کہ رہے مگر آخری کوشش تو کر لی جائے۔ مجھے یاد نہیں اضطراب کے عالم میں کتنی بار میں غار کے دہانے تک پہنچا اور لوٹ آیا ہاں یہ ضرور

یاد ہے کہ جب میں غار سے باہر نکلا تو شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ میرا اضطراب مجھے مکمل اندھیرا پھیلنے سے پہلے غار سے باہر لے آیا تھا۔

میں نے غار کے دھانے سے باہر نکلتے ہی ایک چٹان کی آڑ میں چھپ کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ چرواہے اپنے مویشی چرا کر جا چکے تھے۔ میں نے نشیب سے نظر اٹھا کر بلندیوں کی طرف دیکھا اور ساکت رہ گیا ایک تیر کی مار کے فاصلے اور بلندی پر کوئی ہیولا سا نیچے آتا دکھائی دے رہا تھا۔ میری نگاہ نے بھانپ لیا کہ وہ کسی جانور کا نہیں' انسان کا ہیولا تھا۔ انسان' اس دشت کا انسان جو میرا دشمن ہی ہو سکتا تھا۔ کیا میرے دشمن دشت میں میری تلاش سے مایوس ہو کر اب پہاڑوں پر بھی مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں! میں نے سوچا اور میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ انسانی ہیولا اب مزید واضح ہوتا جا رہا تھا اور وہ اسی سمت آ رہا تھا جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے جب اسے نیچے اترتے ہوئے دیکھ کر ایک غار میں جھانکتے دیکھا تو میرا یہ یقین مزید پختہ ہو گیا کہ اسے میری ہی تلاش ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی سوچا کہ وہ تنہا نہیں ہو گا اس کے دوسرے ساتھی بھی آس پاس مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے جو فی الحال میرے احاطہ نظر میں نہیں ہیں۔ میں نے راہ فرار کی تلاش میں ایک بار پھر نشیب میں نظر ڈالی۔ دور تک ادھر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں چٹانوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپتا ہوا پہاڑ سے نیچے اتر سکتا تھا۔

میں نے جگہ چھوڑنے سے پہلے ایک بار مڑ کر اس غار کی طرف دیکھا جس میں کئی راتیں اور کئی دن گزارے تھے۔ غار کے اندر روشنی تھی۔ غار میں سولدہ کی پراسرار مشعل روشن تھی جسے بجھانے کا طریقہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ ایسی صورت میں دشمن کا اس غار کی طرف متوجہ ہو جانا لازمی تھا اور یہ بھی یقینی تھا کہ سولدہ کا سامان غیر محفوظ ہو جاتا۔ اصولاً" مجھے سولدہ کی واپسی تک اس کے سامان کی حفاظت کرنی تھی مگر اس کے سامان کی حفاظت سے زیادہ ضروری اپنی جان بچانا تھا۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور بلندی کی طرف' اپنے دشمن کی جانب دیکھا۔ اب وہ اتنا قریب آ گیا تھا کہ اس کا جسم مجھے واضح طور پر نظر آنے لگا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی خوف کی ایک لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی کیونکہ میں نے اسے اس کے سفید لبادے اور بھاری جسم کے سبب پہچان لیا تھا۔ وہ بغورچی تھا' پراسرار قوتوں کا مالک بغورچی شامان۔ وہ جو نیلے جادوئی آسمان کی سرگوشیاں سنتا تھا اور وہ جو سولدہ کو اپنے قابو میں کرنا چاہتا تھا۔ اگر بلندی سے نیچے آنے والا کوئی معمولی شخص ہوتا تو شاید میں اتنا خوفزدہ نہ ہوتا لیکن بغورچی تو غیر معمولی قوتوں کا مالک تھا۔

اب مجھ پر دوہری ذمے داری عائد ہو گئی تھی۔ ایک تو یہ کہ بغورچی کو اس غار تک نہ پہنچنے دوں جس میں سولدہ کا سامان ہے' دوسری یہ کہ بغورچی کو دھوکا دے کر نکل جاؤں جبکہ اسے دھوکا دینا آسان نہیں تھا میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ بغورچی' سولدہ کو کوئی نقصان پہنچا سکے۔ وہ سولدہ کے سامان پر قبضہ کر کے نہ جانے اس سے کیا فائدہ اٹھاتا میرے اندازے کے مطابق وہ سولدہ ہی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

میں نے ان خطرناک ساعتوں میں ایک فیصلہ کیا اور پھر اس پر فوراً" عمل بھی کیا۔ میں چٹان کی آڑ سے نکل کر جھکا اور محتاط انداز میں نہایت تیزی سے گھنی جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا مخالف سمت بڑھا۔ کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی چٹان نظر آ رہی تھی۔ میں اس کے قریب سے گزرتا ہوا مزید آگے بڑھا پھر جھکا جھکا ہی میں ایک بڑی اور گھنی جھاڑی کے پیچھے دبک گیا۔ اب میں مخالف سمت میں کافی فاصلے تک نکل آیا تھا اور مجھے بغورچی کا واضح جسم پھر ایک متحرک ہیولا نظر آنے لگا تھا۔

بغورچی کے متحرک ہیولے پر نظر جماتے ہوئے میں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور اسے نشیب میں لڑھکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ بغورچی کا ہیولا چونک کر رک گیا میں نے دوسرا پتھر لڑھکا دیا۔ سناٹا ایک بار پھر مجروح ہوا اور اسی کے ساتھ میں جھاڑی کے عقب سے نکل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ بے شک یہ بڑی ہمت کا کام تھا

مگر میں نے یہ ہمت اس لیے کی تھی کہ بغورچی کو بھی اتنے فاصلے سے میرا وجود ایک ہیولا ہی نظر آئے گا اور وہ مجھے نہ پہچان پائے گا۔ یوں بھی اب دھند لکا پھیلنے لگا تھا۔

میں نے دیکھا کہ بغورچی نشیب میں اترنے کی بجائے تیزی سے میری طرف لپکا اور اسی وقت میں بھی پہاڑ کی عقبی سمت دوڑ پڑا۔ کچھ دور تک دوڑ کر میں مڑا اور توقع کے مطابق میں نے اسے اپنے تعاقب میں پایا میں اپنے ایک مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے بغورچی کو سولدہ کے سامان تک پہنچنے سے روک دیا تھا لیکن اب مجھے اس فریب دے کر نکلنا تھا۔ مجھے جسمانی اعتبار سے بغورچی پر فوقیت حاصل تھی۔ اس کا جسم بھاری تھا اور میرا جسم چھریرا مگر اس کے باوجود میں اس سے خوفزدہ تھا کہ کہیں وہ میرے خلاف اپنی پراسرار شیطانی قوتیں استعمال نہ کرے۔

رفتہ رفتہ میری رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں پہاڑ کا چکر کاٹ کر دوسری سمت نشیب کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اب مجھے اپنے وجود کو بغورچی کی نگاہ سے چھپانا تھا اس لیے میں جھاڑیوں اور چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر ملگجے اندھیرے میں نظر گاڑ دی۔ بغورچی کا ہیولا دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ گویا میں نے اپنا دوسرا مقصد بھی حاصل کر لیا تھا۔ میں جھاڑی کے عقب سے نکل کر چوکنا انداز میں نشیب کی طرف بڑھا۔

میں اب پہاڑ سے نیچے اتر آیا تھا اور میرے پاؤں مزید آگے بڑھتے ہوئے کانپ رہے تھے، تھکن سے نہیں بلکہ خوف و دہشت سے چند قدم چل کر میری ہمت جواب دے گئی۔ میرے پاؤں کپکپائے اور میں اس صنوبر کے درخت سے کچھ پہلے ہی زمین پر بیٹھ گیا جس کے برابر برابر درختوں کی ایک قطار نظر آ رہی تھی۔ یہی صنوبر کے درخت میرے خوف کا سبب تھے۔ میں بغورچی کو فریب دینے کے چکر میں پہاڑ کے دامن میں اس حصے تک پہنچ گیا تھا جہاں آنے سے میں نے ہمیشہ گریز کیا تھا۔ میں نے ان صنوبر کے درختوں کو ایک آدھ بار دور سے تو دیکھا تھا مگر کبھی ان کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ میں ہی کیا وہاں دشت میں رہنے والا کوئی شخص بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بھلا سولداں (روحوں) سے کون سامنا کر سکتا ہے۔

انہی صنوبروں کے سائے میں کہیں چنگیز خان دفن تھا۔ وہ چنگیز خاں جس کے مدفن کی حفاظت چالیس کنواری سولدائیں کرتی تھیں۔ سولداؤں کے خوف سے میرے جسم پر لرزہ طارہ ہونے لگا اور مجھے وہ تمام داستانیں یاد آنے لگیں جو میں نے بچپن سے اب تک ان چالیس کنواری سولداؤں کے بارے میں سنی تھیں۔ ان داستانوں کا تعلق اس وقت سے ہے جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

کہتے ہیں کہ جب موجودہ خاتون قویوق کا باپ اور چنگیز خان کا بیٹا اوفدائی، خاقان بنا تو اس نے پہلا حکم یہ صادر کیا کہ تین روز تک چنگیز خان کی ماتمی ضیافت کی جائے۔ ہر شخص کے سامنے گھوڑے کا ابلا ہوا گرما گرم گوشت، کھال اترا ہوا بکرے کا گوشت اور ابلا ہوا گائے کا گوشت رکھ دیا جائے۔ اس کے علاوہ ساتھ میں گھوڑیوں کا دودھ اور شراب کے ساغر بھی بوڑھے بڑے فخر سے کہتے تھے کہ انہوں نے اپنے بچپن جیسی ضیافت اس وقت اڑائی پھر کبھی نصیب نہ ہوئی۔ بوڑھے خوش ہو ہو کر سناتے کہ ان کے بزرگ ایک دوسرے کے کان کھینچتے تاکہ کان کھینچنے سے حلق چوڑے ہو جائیں اور بیک وقت وہ زیادہ گوشت اپنے معدوں میں اتار سکیں۔ اس ضیافت کے بعد چنگیز خاں کے بیٹے اوفدائی نے اپنے باپ کی روح کو خوش کرنے کے لیے چالیس نو عمر کنواریاں چنیں۔ یہ سب کی سب اعلیٰ خاندانوں کے سرداروں کی بیٹیاں تھیں۔ اوفدائی نے ان کنواریوں کو چینی کپڑے اور بیش بہا زیورات پہنانے کا حکم دیا۔ جب کنواریوں کو بہترین کپڑے اور زیورات پہنا دیے گئے تو انہیں اوفدائی اپنے ہمراہ بورخان قالدون لے گیا جہاں پہاڑ کے دامن میں، ایک بڑے صنوبر کے نیچے چنگیز خان نشست کی حالت میں مدفون تھا۔ چالیس اعلیٰ نسل کے ابلق گھوڑے اس درخت کے پاس لائے گئے جس کے پاس شمالی آہو

(رین ڈیئر) والا قبیلہ یوران گوت قبر کی چوکیداری کرتا تھا۔ اوفدائی نے اس وقت کے شامان اعظم بیکی کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا جس کی عزت خود چنگیز خاں بھی کرتا تھا۔ یہ وہی شامان اعظم بیکی تھا جس کے کہے ہوئے لفظ نسل در نسل زندہ رہے اور زندہ ہیں چنگیز خاں کی موت پر' ان کے دفن ہوتے ہی جب شامان اعظم بیکی سے استفسار کیا گیا تھا کہ چنگیز خاں کی روح اس کے جسم سے نکل کر کہاں گئی تو شامان اعظم نے وہ تاریخی الفاظ کہے تھے جنہیں نسل بعد نسل منتقل کیا گیا تھا اور جن الفاظ میں منگولوں کی قوت پوشیدہ تھی۔ شامان اعظم نے کہا تھا کہ چنگیز خان کی روح اس کے جسم سے نکل کر اب نویاک کی دموں والے اسدی پرچم میں رہے گی جو فوج کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ وہاں رہ کر چنگیز خاں کی روح منگولوں کی رہنمائی اور حفاظت کرتی رہے گی۔ وہی شامان اعظم اس وقت بھی اوفدائی کے ساتھ موجود تھا۔ وہ اوفدائی کا اشارہ پا کر قربانی کی رسم ادا کرنے آگے بڑھا۔ خوب صورت نوعمر کنواریوں کے گلے گھونٹ دیے گئے اور گھوڑے مار دیے گئے تاکہ وہ چالیس کنواریاں اور چالیس اعلیٰ نسل کے گھوڑے دوسری دنیا میں چنگیز خاں کی خدمت انجام دے سکیں چنگیز خاں کو جس بڑے صنوبر کے سائے میں دفن کیا گیا تھا' اس کی اطراف صنوبر کے چھوٹے چھوٹے درخت اور بھی تھے یوران گوت قبیلے والوں کو اس وقت تک قبر کی حفاظت کرنی تھی جب تک اطراف کے درخت اتنے بڑے نہ ہو جائیں کہ قبر کے نشان والے پرانے صنوبر کو اطراف سے چھپا لیں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ قبر کی حفاظت کرنے والا قبیلہ اطراف کے درختوں کی بڑھوار کا انتظار نہ کر سکا۔ قبیلے والے' چنگیز خاں کی قبر کے رکھوالے ایک صبح بستی کی طرف بھاگتے ہوئے آئے۔ وہ اوفدائی سے ملے اور اسے بتایا کہ ان کی بجائے کسی دوسرے قبیلے کو قبر کی چوکیداری سونپ دی جائے کیونکہ وہ سولداؤں سے سخت خوفزدہ ہیں جو صنوبر کے درختوں کی اطراف میں منڈلاتی رہتی ہیں۔ انہوں نے نیلے جاودانی آسمان کو گواہ بنا کر کہا کہ انہوں نے بہت سے گھوڑوں کو ایک ساتھ ہنہناتے اپنے کانوں سے سنا ہے اور صنوبروں میں سولداؤں کے ہیولے چلتے پھرتے دیکھے ہیں۔ اوفدائی نے یہ ماجرا سن کر شامان اعظم کو بلا بھیجا۔ شامان اعظم نے نیلے جاودانی آسمان کی یوگدرو (روح) سے رابطہ قائم کر کے بتایا کہ اوفدائی کی قربانی قبول ہوئی اور اب چالیس کنواری سولداؤں' چالیس گھوڑوں پر سوار ہو کر قبر کی حفاظت کر رہی ہیں اس لیے وہاں مزید کسی چوکیدار کی ضرورت نہیں۔ اس دن کے بعد سے نہیں سنا گیا کہ دشت میں رہنے والے کسی فرد نے ادھر کا رخ کیا ہو اور میں اس وقت انہی صنوبروں کے سائے میں تھا۔

خوف کے سبب مجھے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی تو کیا عجب دشت میں رہنے والے ہر شخص کا یہی حال ہوتا جو میرا تھا مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ ایک کڑکدار آواز میرے اعصاب پر بجلی بن کر گری اور میں دہشت سے کانپنے لگا۔

"بوغا! کیا تو سمجھتا تھا کہ مجھے جل دے کر نکل جائے گا؟" بغورچی گرجتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔

خوف کے سبب میرا حلق خشک ہو گیا تھا اور زبان موٹی ہو گئی تھی۔ میں نے ہمت کر کے کچھ بولنا چاہا مگر یا تو شاید بغورچی کے ڈر سے میرے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی یا اگر میں کچھ کہہ سکا تو وہ بے ربط الفاظ تھے جن سے کوئی مطلب اخذ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں کیونکہ اس وقت میں اپنے حواس میں نہیں تھا۔ شاید کنواری سولداؤں نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور میری حالت کسی ایسے جانور کی سی تھی جو شکاریوں کے حلقے میں گھر گیا ہو۔ بغورچی سے بھی میری حالت چھپی نہ رہ سکی۔

"اٹھ!" اس نے جھکتے ہوئے کہا اور میری کلائی پکڑ لی۔

بغورچی مجھے تقریباً" گھسیٹتا ہوا' ان صنوبروں سے بہت دور لے گیا مگر اب بھی ہم اور خان قالدن کے دامن میں تھے۔ اب سورج مغرب کی سمت اپنی بیوی کی آغوش میں جا چکا تھا ملگجے دھندلکے کی جگہ

اندھیرے نے لے لی تھی۔ بغورچی ایک جگہ رک گیا اور اس نے میری کلائی بھی چھوڑ دی اب میرا خوف بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا۔

"ہاں اب بتا بوغا کہ سولدہ کہاں ہے؟" اس نے کلائی چھوڑتے ہی سخت آواز میں سوال کیا۔

"سولدہ؟" میں چونک پڑا۔ "کس کی سولدہ؟" میں نے ذرا سنبھل کر حیرت سے کہا۔

"بوغا! میرا نام بغورچی ہے اور میں ان میں سے نہیں جو تجھے جادوگر سمجھ رہے تھے۔ مجھ سے جھوٹ نہ بول!" اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی دوبارہ گرج اٹھا۔ "تیری موت اور زندگی میرے اختیار میں ہے اور سن کہ تو جو زندہ ہے تو میری وجہ سے ورنہ اب تک تیرے جسم کے بھی سارے سوراخ سی کر تجھے گہرے پانی میں ڈبو دیا جاتا۔ تیری بہتری اسی میں ہے کہ میں جو پوچھوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دے۔ بتا وہ سولدہ کہاں گئی جس نے تجھے موت کے گڑھے سے باہر نکالا تھا؟"

میں اس کی بات سن کر اچھل پڑا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر بہت کچھ جان لیا ہے لیکن کس حد تک اور کیا کیا اس سے ابھی میں بے خبر تھا۔ میں نے اسی لیے بہت سنبھل کر جواب دیا جو غلط بھی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "اے مقدس شامان! یقین کر، میں نہیں جانتا کہ وہ سولدہ کہاں سے آئی تھی اور کہاں گئی؟ پر تو نے کیسے جانا کہ اس نے میری مدد کی تھی؟"

بغورچی میری بات سن کر استہزائیہ انداز میں ہنسا اور میرے لہجے کی نقل اتاری۔ "پر تو نے کیسے جانا؟" یہ کہہ کر وہ پھر ہنس پڑا اور بولا۔ "بغورچی کیا نہیں جانتا!" میرا جی چاہا کہ کہہ دوں، تو وہ نہیں جانتا جو مجھ سے پوچھ رہا ہے مگر میں خاموش رہا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "سن! میں نے یہ ڈینگ نہیں ماری کہ تو میری وجہ سے زندہ ہے بلکہ میرے لفظ سچے ہیں۔ آج صبح جب فوجی دستے تجھے دور دور تک ڈھونڈ کر ناکام واپس آ گئے تو خاقان کے وزیر بلواچ نے مجھے بلایا کہ میں اپنے علم کے زور سے پتا چلاؤں کہ تو کہاں ہے اور تو کس طرح اس گڑھے سے باہر نکل گیا جس سے آج تک کوئی بذات خود باہر نہیں نکل سکا۔ ان سوالوں کے جواب پانے کی خاطر میری روح، جسم چھوڑ کر جادوانی آسمان کی طرف پرواز کر گئی تاکہ مونگ کے تینگری کی سرگوشیاں سن سکے۔ جب میری روح یہ سرگوشیاں سن کر دوبارہ اپنے گھر یعنی میرے جسم میں آئی تو میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ مجھے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ تیرے پاس کوئی علم نہیں تو کوئی جادوگر نہیں اور تو خود اس موت کے گڑھے سے باہر نہیں نکلا بلکہ اسی سولدہ نے تجھے باہر نکالا ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ وہ سولدہ تیری ہمدرد بن گئی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اس سولدہ نے تجھے بورخان قالدون کے کسی غار میں چھپایا ہو گا اور خود بھی وہیں ہو گی۔ تو جانتا ہے کہ میں اس سولدہ کو قابو میں کرنا چاہتا ہوں، اسی لیے میں نے وزیر بلواچ سے جھوٹ بولا اور کہا کہ تو واقعی کالا جادو جانتا ہے اور اس کے بل پر تو گڑھے سے نکل کر فرار ہو گیا۔ وزیر بلواچ کے دوسرے سوال کا جواب بھی میں نے جان بوجھ کر غلط دیا۔ میں نے کہا کہ تو جنوب کی سمت میں ختا کی طرف گیا ہے اور اب تیرا ہاتھ آنا محال ہے۔ وزیر بلواچ برہم ہو کر بولا کہ اس کے سپاہی ختا تک تیرا پیچھا کر سکتے ہیں اور تجھے پکڑ سکتے ہیں، سو اس نے تیز رفتار گھوڑوں پر اپنے سپاہیوں کو ختا کی طرف جانے کا حکم دیا۔ میں تیری اور سولدہ کی تلاش میں ادھر آ گیا۔ دوپہر سے میں ایک ایک غار جھانکتا پھر رہا تھا اور دیکھ لے کہ میں نے تجھے ڈھونڈ نکالا۔ اب تو سمجھ گیا کہ میں نے ہی تیری جان بچائی ہے ورنہ وہ پہاڑ کا رخ بھی کر سکتے تھے۔ کیا اب میں تجھے یہ بھی بتاؤں کہ میں تجھے کیوں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں؟" یہ کہہ کر بغورچی خاموش ہو گیا۔

"میں سمجھ گیا مقدس شامان کی تو مجھ سے کیا چاہتا ہے! وہ جو میں نہیں جانتا اور وہ جو میرے بس میں نہیں۔" میں بغورچی کی بات کا لب لباب سمجھ کر بولا۔

"اگر تو سچا ہے تو پھر بتا کہ تجھ پر کیا گزری؟ میں تیری زبان سے سب کچھ سننا چاہتا ہوں۔" بغورچی کے لہجے میں نرمی آ گئی۔

"میں جب لب دم تھا تو میں نے اپنے قریب اس کی خوشبو محسوس کی، پھر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور میرا وجود دھواں بن گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو بور خان قالدون کے دامن میں پایا۔ میں بھوکا اور پیاسا تھا۔ اس نے میرے سامنے عجیب عجیب کھانے چن دیے اور پھر وہ غائب ہو گئی۔ میں نے جی بھر کر کھایا۔ کھانا پھر بھی بہت بچ رہا تھا۔ میں کھانا اپنے ساتھ لے کر پہاڑ پر چڑھ گیا تاکہ کسی غار میں چھپ کر اپنی جان بچا سکوں۔" میں نے بہت احتیاط سے بغورچی کے بیان کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی روداد بیان کی کیونکہ میں بغورچی کو اس سے زیادہ کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا جتنا وہ خود جانتا تھا۔

"تو پہاڑ پر چڑھنے کی بجائے، موقع سے فائدہ اٹھا کر فرار کیوں نہ ہو گیا؟" بغورچی نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"بھوک اور پیاس نے مجھے نڈھال کر دیا تھا اور میری حالت ایسی نہ تھی کہ میں فرار ہو سکتا۔ میں پہاڑ پر بھی گھسٹ گھسٹ کر بمشکل چڑھ پایا تھا۔" میں نے برجستہ جواب دیا۔

"اس نے تجھ سے یا تو نے اس سے کوئی بات نہیں کی؟" بغورچی نے معلوم کیا۔

"نہیں مقدس شامان! مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ کسی سولدہ سے بات کر سکوں! یہ تو تمہاری ہی ہمت ہے۔" میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔ دراصل مجھے یقین تھا کہ بغورچی مجھ سے وہی باتیں پوچھ رہا ہے جو اسے خود نہیں معلوم اس لیے وہ میرے جھوٹ کو نہ پکڑ پائے گا۔

"اس نے تجھے موت کے جبڑوں سے باہر کھینچ لیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تجھ پر ریجھ گئی ہے اور یہ بھی کہ وہ تجھ سے ملنے پھر آئے گی۔" بغورچی معنی خیز لہجے میں بولا۔ "چل اب میں بھی تیرے ساتھ پہاڑ پر رہوں گا تاکہ جب وہ سولدہ تجھ سے ملنے آتے تو میں اسے قابو میں کر لوں۔" اس نے یہ کہہ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور میری روح خشک ہو گئی۔ بغورچی میرے گلے کا ہار بنا جا رہا تھا۔ وہ سولدہ کو قابو میں کرنے کے لیے مجھے ذریعہ بنانا چاہتا تھا اور جب سولدہ اس کے قابو میں آجاتی تو وہ وزیر یواچ کی نظر میں سرخرو ہونے کے لیے مجھے بھی پکڑوا دیتا۔ گویا وہ زبردستی میرے گلے میں پھندہ ڈال رہا تھا۔ میں بھلا کیسے اس کی بات مان لیتا لیکن اگر نہ مانتا تو کیا کرتا!

"معا" مجھے کچھ خیال آیا اور میں جلدی سے بولا۔ "اے مقدس شامان! اگر ہم پہاڑ پر چڑھ گئے تو کھائیں گے کیا؟ میں بھوک اور پیاس سے مجبور ہو کر ہی تو غار سے نکلا تھا۔"

"میں سب انتظام کر کے چلا ہوں۔ میرے ساتھ بھیڑ کا سوکھا ہوا بہت سا گوشت اور گھوڑی کا دودھ ہے۔" اس نے پرسکون آواز میں کہا اور میری آخری امید بھی دم توڑ گئی کہ اس بہانے میں اسے بستی میں واپس بھیج کر اس کے چنگل سے نکل سکوں گا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میرا گھوڑا یہاں سے زیادہ دور نہیں میں ابھی گوشت اور دودھ لے کر آیا۔ تو یہیں ٹھہر!" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا پھر چند قدم چل کر رک گیا اور مڑے بغیر بولا۔ "دیکھ بوغا! اب مجھ سے بھاگنے کی کوشش تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ تجھے سسک سسک کر مرنا پڑے گا۔"

"اے مقدس شامان! یقین رکھ کہ میں کہیں نہ جاؤں گا۔ تو خود جانتا ہے کہ اس دشت میں تیرے سوا سب میرے دشمن ہو چکے ہیں۔ میں بھلا بھوک پیاس کے عالم میں تجھے چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ اب تو تو ہی میرا سہارا ہے۔ مونگ کے تینگری تجھ پر اپنی برکتیں نازل کرے۔" میں نے بغورچی کو اپنی طرف سے مطمئن کرنے کی غرض سے کہا اور میری بات شاید اس کے دل کو لگی۔ وہ بغیر مزید کچھ کہے آگے بڑھ گیا۔

جب شامان بغورچی کا وجود اندھیرے میں گم ہو گیا تو میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میں پنجوں کے بل دوڑتا ہوا ایک سمت بھاگا تاکہ میرے قدموں کی دھمک سے بغورچی چوکنا نہ ہو جائے۔ میں نے دوڑتے ہوئے، پہاڑ کا ایک لمبا چکر کاٹا پھر ایک جگہ رک کر اپنا سانس درست کیا۔ اسی دوران میں مجھے وہ سمت نظر آگئی جدھر مجھے جانا تھا۔ بستی کے روشن الاؤ مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ جب میرا

سانس قابو میں آگیا تو میں نے بستی کی جانب بھاگنا شروع کر دیا۔ میں نے بستی کی طرف جانے والے عام راستے کی بجائے دوسرے راستے کا انتخاب کیا تھا تاکہ اگر بغورچی میرا پیچھا کرے تو بھی میری گرد نہ پا سکے جس کا امکان نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بغورچی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ آسکے گا کہ میں موت کے منہ میں جانے کی ہمت کروں گا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے وہاں نہ پا کر شامان بغورچی یہی سوچے گا کہ میں پھر پہاڑ پر چڑھ کر کسی غار میں چھپ گیا ہوں اور وہ مجھے غاروں میں ڈھونڈتا پھرے گا۔

اردوئے بالوغ (خیموں کا شہر) میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اپنے چڑھے ہوئے سانسوں پر قابو پایا اور ایک ایسی سمت سے بستی میں داخل ہوا جدھر نسبتاً" اندھیرا تھا اور الاؤ دور دور روشن تھے۔ میں دبے پاؤں ایک یورت (خیمہ) کے عقب سے گزر رہا تھا کہ میرے قدم رک گئے۔ ایک عورت کے سسکیاں لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور دوسری اسے تسلی دے رہی تھی۔

"صبر کر! چنکائی کا جادوگر بیٹا ضرور پکڑا جائے گا۔ جب تو اس کی لاش پر تھوکے گی تو تجھے چین آجائے گا کہ وہی تیرے شوہر کی موت کا سبب ہے۔ نہ وہ فرار ہوتا' نہ وہ تمام محافظ قتل کیے جاتے جو اس رات گڑھوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ جس رات وہ فرار ہوا۔ اس رات اگر تیرا شوہر پہرے پر نہ ہوتا تو یوں نہ مارا جاتا۔" میں نے تسلی دینے والی کے واضح الفاظ سنے اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

تو ہر یورت میں میری جادوگری کے قصے پہنچ چکے ہیں! میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک نئی بات آگئی۔ یہ سب کچھ سرقوشنی بیگی کے کانوں تک بھی تو پہنچا ہوگا! تو کیا وہ مجھے پراسرار قوتوں کا مالک نہ سمجھے گی!

میں نے ابھی کچھ فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ مجھے رک جانا پڑا۔ آگے یورتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا میدان تھا جس میں الاؤ روشن تھے اور ان الاؤں کی اطراف لوگ بیٹھے تھے۔ کہیں کوئی داستان سرا قدیم بکھاتروں (بہادروں) کے کارنامے سنا رہا تھا اور کہیں کوئی گیت گا رہا تھا۔ باتیں جانب جو یورت تھے' ان میں لوگ آجا رہے تھے اور انہی یورتوں میں ایک یورت میرے باپ کی ایک بیوی کا تھا۔ اس طرف جانا سخت خطرناک تھا' سو میں نے راستہ کاٹا اور دائیں جانب کے یورتوں میں گھس گیا تاکہ یورتوں کے درمیان چھپتا چھپاتا اس میدان کی دائیں جانب آگے بڑھ جاؤں میں اس میدان سے راستہ کاٹ کر نکل گیا مگر ابھی میری منزل دور تھی۔ مجھے ابھی اس خطرناک علاقے سے گزرنا تھا جہاں محلوں کے قریب قیدیوں کے گڑھے تھے اور جہاں قدم قدم پر محافظ تھے۔ سرقوشی بیگی کے محل تک پہنچنے کے لیے اس راستے سے گزرنا لازمی تھا۔

میں جان ہتھیلی پر رکھے آگے بڑھ رہا تھا اور میرا ذہن آنے والے خطرے سے بچنے کی راہ سوچ رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں اپنے سامنے موجود خطرے کو نہ دیکھ پایا۔ یہ خطرہ جو تھا' میرا ایک سوتیلا بھائی جو نہ جانے کدھر سے نکل کر میرے سامنے آگیا تھا اور اس نے مجھے پہچان لیا تھا پھر وہ زور سے میرا نام لے کر چیخا تھا۔

"بوغا' بوغا جادوگر!" تموجو حیرت زدہ آواز میں چیخا تھا جس میں خوف بھی شامل تھا اور حسد بھی۔

میں نے اسے دھکا دیا' وہ گرا اور میں ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ تموجو اٹھ کر چیختا ہوا میرے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔

"پکڑو' پکڑو! بوغا' بطریق' بوغا' بوغا جادوگر!" تموجو گلا پھاڑ کے چیختا جا رہا تھا۔

میرے بھاگنے کی رفتار پہلے سے دوگنی ہو گئی تھی مگر تموجو کی چیخیں' میں اب بھی اپنے عقب میں سن رہا تھا اور بہت سے دوڑتے قدموں کی آوازیں بھی۔ غالباً" اور لوگ بھی اب تموجو کے ساتھ ہو لیے تھے۔ اب میرے عقب میں ایک چیخ و پکار اور شور سنائی دے رہا تھا' موت کا شور! اگر میں ان کے نرغے میں گھر جاتا تو میری موت یقینی تھی۔ شاید میں اپنے پیچھے لپکنے والی موت کو پیچھے چھوڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا مگر

اب آگے بھی موت تھی۔ شور سن کر آگے والے پورتوں کے پاسی بھی چوکنا ہو کر اپنے پورتوں سے باہر نکل آتے تھے اور الاؤ کے گرد بیٹھنے والے بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں جن پورتوں کے درمیان تھا' ان میں رہنے والے بھی اب باہر آرہے تھے۔ گویا میرے ہر طرف موت ہی موت تھی۔ اسی لمحے جیسے میرے کان میں کسی نے سرگوشی کی کہ اگر میں پورتوں سے نکل کر دشت کی طرف چلا جاؤں تو میری زندگی بچ سکتی ہے۔ میں اچھل کر ایک طرف بھاگا لیکن کچھ دور جا کر ہی مجھے پلٹنا پڑا۔ میرے دشمن چوکنا ہو گئے تھے اور اب وہ مجھے کسی شکار کی طرح شاید ہر طرف سے گھیر رہے تھے۔ میں لوٹ کر مغرب کی طرف بھاگا کہ ادھر میدان اور اندھیرا تھا۔

پیچھے موت کا شور تھا اور آگے اندھیرا میدان! میں میدان میں بھاگتا چلا گیا اور پھر میں نے محلوں کے ہیولے دیکھے جو اس میدان کے پار نظر آرہے تھے۔ میں شاید راستہ بھٹک کر بھاگتے بھاگتے محلوں کے عقبی میدان میں نکل آیا تھا جن کی دوسری جانب گڑھے تھے جہاں محافظ تھے' گڑھوں کے محافظ' ہاں یہ محلوں کا عقبی میدان ہی تھا اور نہ محافظ مجھے ضرور روکتے اور پکڑ لیتے۔

میں بھاگتا ہوا محلوں کے درمیان پہنچا جو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور انہی میں سے ایک محل سرتوشنی بیگی کا تھا۔ میں نے بستی میں داخل ہونے سے پہلے کچھ نہیں سوچا تھا کہ کس طرح سرتوشنی بیگی کے محل میں داخل ہو سکوں گا اور اس وقت میرے حواس اس حد تک قابو میں نہیں تھے کہ میں کچھ سوچ سکتا بھاگتے بھاگتے میں بری طرح نڈھال ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے اور دل سینے سے اچھل کر ریت پر گر پڑے گا مگر اس کے باوجود میں بھاگ رہا تھا۔ موت کا شور اب میدان سے گزر رہا تھا۔ میری امید دم توڑنے لگی۔ یہ شور محلوں کے محافظوں کو چوکنا کر دے گا اور پھر مجھے شکار کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا اور ٹھیک سوچا اسی دوران میں نہ جانے کدھر سے گھوڑوں کے دوڑنے کی صدا سنائی دی۔ ابھی میں سمت کا تعین نہ کر پایا تھا کہ مشعلیں مجھے اپنی طرف لپکتی دکھائی دیں۔ منہ زور گھوڑے میری طرف لپکے جن کے آگے آگے شاہی قشق (شاہی محافظ دستہ) کا نشان تھا۔ میں بھاگتے بھاگتے لڑکھڑا کر گرا اور ایک گھوڑے کی جھپٹ میں آگیا۔ میں نے گرتے ہی اپنا منہ ریت میں چھپا لیا تھا۔ کسی گھوڑے کا سم میری کھوپڑی کے پچھلے حصے سے ٹکراتا ہوا گزرا اور میرے ہر طرف اندھیرا سا چھانے لگا۔ آخر مجھے موت نے آہی دبوچا۔ میں نے اندھیروں میں ڈوبتے ہوئے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔ شاہی قشق کے ہاتھوں پڑ جانے کا مطلب یہی تو ہو سکتا تھا کہ میں خوفناک بھیڑیوں کے جھنڈ میں گھر گیا جن سے بچ کر کوئی زندہ نہیں رہ پاتا۔

اندھیرے چھٹنے کے بعد کچھ دیر تو مجھے یقین نہ آیا کہ میں زندہ ہوں مگر جب میں نے آنکھیں کھول کر اپنے سرہانے بیٹھے ہوئے عظیم لن یا (شمس العلما) یاؤ چاؤ کو دیکھا تو مجھے اپنے زندہ ہونے پر یقین آگیا۔ بوڑھا چینی عالم مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر مجھ پر جھکا۔

"سچین (عاقل) قبلائی اپنی ماں سے مل کر اپنے قشق (شاہی محافظ دستہ) کے ہمراہ لوٹ رہا تھا کہ تو سواروں کی جھپٹ میں آگیا۔ میں بھی سچین کے ساتھ تھا۔ وہ تجھے وہیں پڑا چھوڑ آئے پر میں تجھے ساتھ اٹھا لایا اور تجھے پہچان گیا۔ مجھے تیرا نام تو نہیں معلوم پر میں نے تجھے عظیم لیوچت سائی کے ساتھ دو ایک بار دیکھا تھا۔ اب تو کیسا ہے؟" بوڑھے کی نرم اور شفیق آواز سن کر مجھے جیسے دوسری زندگی مل گئی۔ مونگ کے نینگری نے میری جان بچالی تھی۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کچھ کہنا چاہا مگر سوکھے حلق سے کوئی آواز نہ سنا بھری۔

"کیا تو پیاسا ہے؟ پانی دوں؟" یاؤ چاؤ نے جھک کر پوچھا اور اس کی بڑی بڑی گلہری کی دم جیسی مونچھیں میرے چہرے سے مس ہونے لگیں۔

میں نے گردن ہلائی پھر کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھنا چاہا اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

"شکر ہے کہ تجھے زیادہ چوٹیں نہیں آئیں لے پانی

پی!" بوڑھے نے پانی کا برتن میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

پانی پی کر میرا حلق تر ہوا تو میں بولا۔ "میں بھوکا بھی ہوں اے عظیم لن یا!"

وہ اٹھ کر چلا گیا اور جب لوٹا تو ابلا ہوا گوشت لے کر آیا' اسی کے ساتھ گھوڑی کا دودھ بھی میں گوشت کھانے اور سوچنے لگا کہ اگر لن یا' یاؤ چاؤ مجھے اپنے ساتھ اٹھا کر نہ لاتا تو میرا کیا حشر ہوتا! میں جس مکان میں تھا' اسے میں نے صرف باہر سے دیکھا تھا۔ یہ سرقوشنی بیگی کے دوسرے بیٹے سچن قبلائی خان کا مکان تھا۔ قبلائی بھی شاہی خاندان کے دوسرے افراد کی طرح اب یورت میں نہیں رہتا تھا۔ اس کا مکان سیدار کی لکڑی کا بنا ہوا تھا' چینی یا من کی طرح اس کا فرش پکی کاری کا تھا۔ دروازے پر لکڑی کا ایک پردہ پڑا رہتا تھا کہ شیاطین مکان میں نہ گھسنے پائیں۔ اس پردے کو میں نے ہمیشہ دور سے دیکھا تھا اور پردے کے پیچھے جو کچھ تھا' اس کے بارے میں سنا ہی سنا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ قبلائی نے اپنے یا من (مکان) میں ایک خوب صورت باغ لگوایا ہے جہاں وہ اپنی حسین بیوی جاموی کے ساتھ سیر کرتا تھا۔ بوٹے سے قدو والی حکیم الطبع شہزادی جاموی حسن و جمال میں مشہور تھی اور میں نے اسے ایک بار دور سے دیکھا بھی تھا کیونکہ وہ چینیوں کی طرح پردہ نشین نہیں تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ قبلائی کے مکان میں' اس کے ساتھ یاؤ چاؤ بھی رہتا ہے جو قبلائی کا استاد ہے۔ اس عظیم بوڑھے چینی کو سرقوشنی بیگی کی درخواست پر لیوچت سائی نے قبلائی خاں کی تعلیم کے لیے مقرر کیا تھا۔ بوڑھا عالم ایک عمر سے ابلائی کے ساتھ رہ رہا تھا' اسی مکان کے ایک حصے میں جہاں میں پہنچ گیا تھا۔

ابلا ہوا گوشت کھا کر اور گھوڑی کا دودھ پی کر میرے حواس بحال ہوئے۔ مجھے پہلی بار حفاظت کا احساس ہوا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے دشمن وہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے جہاں مجھے مونگ کے نینگری نے پہنچا دیا ہے۔ وہ سوچ بھی نہ سکیں گے کہ مجھے قبلائی خان کے مکان میں پناہ مل سکتی ہے۔ وہ قبلائی خاں جو خود خاندان زریں کا ایک شہزادہ ہے اور وہ قبلائی خاں جو موجودہ خاقان' قوبوق کا چچا زاد بھائی ہے۔ بھلا ہاں میرا کیا گزر! مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ گیا ہوں۔

میں جہاں تھا' وہاں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں اور پرانے مسودے نظر آ رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں نے عظیم لیوچت سائی کے گھر دیکھے تھے۔ کتابیں' موٹی موٹی کتابیں جن میں عظیم ولن یا کا علم بند تھا۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھا عالم مجھے بڑی دلچسپ اور پسندیدہ نظر سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اے عظیم لن یا! کیا تو مجھے سرقوشنی بیگی کے محل تک پہنچا سکتا ہے؟"

"اس وقت؟" بوڑھے کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تو وہاں کیوں جانا چاہتا ہے؟"

"ہاں' اسی وقت اے عظیم لن یا!" میں نے جواب دیا۔ "آج کی رات بیگی (شہزادی) پر بھاری ہے اور میں اسے چوکنا کرنا چاہتا ہوں۔"

"لڑکے! لوہجھ سے شامانوں کے سے لہجے میں بات نہ کر کہ مجھے شامانوں سے نفرت ہے۔ صاف صاف بتا کہ تو وہاں کیوں جانا چاہتا ہے؟" بوڑھے عالم کی آواز میں سختی آ گئی۔

"اے عظیم لن یا! سچ وہی ہے جو میں نے کہا۔ نیلے جاودانی آسمان کی قسم میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ آج کی رات اس پہ بھاری ہے۔ آدھی رات کے بعد' کسی وقت بھی خواب گاہ کی چھت کا ایک شہتیر ٹوٹ کر اس کے بستر پر گر پڑے گا۔ اگر وہ اس وقت اپنے بستر پر ہوئی تو شہتیر کے نیچے دب کر ہلاک ہو جائے گی۔" میں نے لفظ بہ لفظ وہ پیش گوئی دہرا دی جو مجھے سولدہ نے بتائی تھی۔

"اس کا مطلب یہ کہ تو پیش گوئی کر رہا ہے! کیا تجھے علم ہے کہ غلط پیش گوئیاں کرنے والوں کی زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں؟" بوڑھے عالم نے مجھے تنبیہہ کی۔

"میں جانتا ہوں اے عظیم لن یا!" میں پرجوش لہجے میں بولا۔

"لیکن اگر میری پیش گوئی سچ ہوئی تو اس عظیم

خاتون کی جان بچ جائے گی جسے دشت میں رہنے والے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ عظیم فرزندوں کی عظیم ماں ہے۔ اس کی جان بہت قیمتی ہے۔"

"تیری پیش گوئی سچ ثابت ہوئی تو سرقوشنی بیگی کی جان بچ جائے گی اور اگر غلط نکلی تو تیری زبان کاٹ دی جائے گی، پر تجھے ان دونوں صورتوں میں کیا حاصل ہو گا؟"

"مجھے وہ خوشی حاصل ہو گی اے عظیم لن یا! جو ایک انسان کو دوسرے انسان کی جان بچا کر حاصل ہوتی ہے۔"

میرا جواب سن کر بوڑھے عالم کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ بولا۔ "کاش لیوچت سائی کچھ دن مزید زندہ رہتا اور تو اس سے اکتساب علم کر سکتا۔ تیری باتوں سے دانائی ٹپکتی ہے، پرت مجھے یہ یقین نہیں آتا کہ تو پیش گوئیاں کرنے کا اہل بھی ہے۔"

"اے عظیم لن یا! مجھے خود نہیں معلوم کہ میرے کانوں میں کون سرگوشیاں کرتا ہے اور آنے والے زمانوں کا حال مجھے بتاتا ہے۔" میں نے بوڑھے عالم کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

بوڑھے نے مجھے غور سے دیکھا اور کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "مجھے بیگی کے محل تک خود تیرے ساتھ چلنا پڑے گا کیونکہ محل کے دروازے بند ہوں گے۔ جب ہم وہاں سے چلے تھے تو بیگی اپنی خواب گاہ میں سونے چلی گئی تھی۔ بیگی میری عزت کرتی ہے اور محل کے محافظ بھی یہ بات جانتے ہیں۔ میرے لیے محل کے دروازے کھل سکتے ہیں اور بیگی بھی اپنے خوابگاہ سے باہر آسکتی ہے پر پھر سوچ لے کہ تیری وجہ سے مجھے بھی شرمندہ نہ ہونا پڑے۔"

"نہیں اے عظیم لن یا! میں تیرے علم پر حرف نہ آنے دوں گا۔ مجھ پر یقین کر!" میں نے جلدی سے کہا تاکہ بوڑھا عالم تذبذب میں نہ رہے۔

آخر کار بوڑھا عالم میری بات مان ہی گیا۔ کچھ دیر بعد ہی تین گھوڑے قبلائی خاں کے یامن سے نکلے۔ ایک گھوڑے پر میں سوار تھا، دوسرے پر بوڑھا عالم اور تیسرے گھوڑے پر قبلائی خاں کے قشق کا ایک محافظ جو اس وقت احتراماً قبلائی خاں کے اتالیق سے آگے آگے چلتا تھا جب وہ یامن سے باہر نکلتا تھا۔ قبلائی خان نے غالباً اپنے استاد کے احترام کی خاطر ایسا کیا تھا کہ جب عظیم لن یا کہیں جایا کرے تو اس کے قشق کا کوئی محافظ ساتھ ضرور ہوا کرے۔ قشق کا محافظ اپنا مخصوص نشان بائیں ہاتھ سے بلند کیے آگے چل رہا تھا اور اس کے پیچھے میرے اور عظیم لن یا کے گھوڑے تھے۔ ہمارا رخ سرقوشنی بیگی کے محل کی جانب تھا جو وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

ابھی ہم سرقوشنی بیگی کے محل کی طرف جانے والے راستے پر مڑے ہی تھے کہ سامنے سے ایک گھوڑا سوار دستہ مشعلیں بلند کیے آتا دکھائی دیا۔ میں نے سہم کر اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور لن یا کا گھوڑا میرے گھوڑے سے آگے نکل گیا۔ مشعل بردار سپاہیوں کا دستہ قریب آیا۔ شاہی قشق کا نشان دیکھ کر سپاہی احتراماً نشان کے سامنے جھکے اور اپنے گھوڑے ایک کنارے کر لیے۔ میں اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر پھر لن یا کے قریب پہنچ گیا۔ میں دانستہ لن یا کے گھوڑے کے دائیں جانب اس سے مل کر چل رہا تھا کیونکہ مشعل بردار سپاہیوں کا دستہ بائیں جانب کھڑا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ اس دستے کا کوئی سپاہی مجھے پہچان نہ لے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ مشعل بردار دستہ کس کی تلاش میں سرگرداں ہے! بھلا وہ اس وقت میرے علاوہ کسے ڈھونڈ سکتے تھے؟ ہم آگے نکل گئے تو مشعل بردار دستہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

"یہ لوگ نہ جانے راتوں کو کسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں؟" کتابوں میں کھویا رہنے والا بوڑھا عالم بڑبڑایا۔ وہ غالباً "اس واقعے سے قطعی بے خبر تھا جو عام لوگوں کا موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ یعنی میرا قید سے فرار! مگر خاص لوگ ایسے ہی تو ہوتے ہیں جو ان باتوں میں دلچسپی نہیں لیتے جو عام لوگوں کی توجہ اپنے طرف کھینچ لیتی ہیں۔

سرقوشنی بیگی کے محل تک پہنچ کر ہم رک گئے۔ سامنے ہی بڑے سے دروازے کے باہر سیڑھیوں کے اوپر پانچ محافظ کلہاڑے اور مشعلیں لیے کھڑے تھے

اور محل کا دروازہ بند تھا۔ عظیم لن یا اپنے گھوڑے سے اتر کر سیڑھیوں پر چڑھا اور محافظوں سے ہمکلام ہوا جنہوں نے اپنی سمور کی ٹوپیاں اتار کر اسے تعظیم دی تھی۔ میں ابھی گھوڑے ہی پر تھا اس لیے لن یا اور محافظوں کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکا مگر میں نے دیکھا کہ ایک محافظ نے اپنے کلہاڑے کا دستہ تین بار دروازے پر مار کر کچھ کہا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا جو اندر سے بند تھا۔ میں نے کھلے ہوئے دروازے سے دو محافظوں کو نکلتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں بھی کلہاڑے اور مشعلیں تھیں۔ انہوں نے بھی عظیم لن یا کو تعظیم دی۔ عظیم لن یا ان سے کچھ کہہ کر مڑا اور وہیں کھڑے کھڑے مجھے گھوڑے سے اتر کر آنے کا اشارہ کیا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ گھوڑے سے اترا اور محل کی سیڑھیاں چڑھ کر عظیم لن یا تک پہنچ گیا۔ اس دوران میں اندر سے برآمد ہونے والا ایک محافظ واپس آچکا تھا۔

عظیم لن یا نے میرا ہاتھ تھاما اور دروازے میں داخل ہو گیا۔ ہمارے پیچھے ایک کلہاڑے بردار محافظ تھا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی اس نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا پھر آگے بڑھ کر مشعل اٹھاتے ہوئے ہماری رہنمائی کرنے لگا۔ میں بھی چپ تھا اور لن یا بھی خاموش تھا۔ میں آنے والے لمحوں کے اندیشوں میں گم تھا اور لن یا شاید اس لیے خاموش تھا کہ کہیں میرے سبب وہ جھوٹا نہ پڑے۔

ہم صحن باغ کے قریب سے گزرے۔ محل کے در و بام پھولوں کی خوشبو سے مہک رہے تھے۔ میں اس محل کے اندر پہلے کبھی نہیں آیا تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ سرقوشنی بیگی کا محل شان و شوکت میں خاقان کے محل سے کم نہیں تھا۔ مختلف طویل اور مختصر راستوں سے ہو کر ہم اس بڑے سے دروازے کے سامنے پہنچے جہاں جا کر محافظ رک گیا۔ عظیم لن یا مجھے ساتھ لیے اندر داخل ہوا۔ اندر روشنی تھی کیونکہ دیواروں کے سوراخوں میں روشن مشعلیں موجود تھیں۔ یہ وہ جگہ تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ فرش پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے نمدے کی مسندیں تھیں جن پر سفید سمور اور غالیچے بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر سونے چاندی کے پتر جڑے ہوئے تھے جن کے درمیان اژدہوں، جانوروں اور طائروں کی تصویریں نقش تھیں۔ بلند چھت پر بھی سونے چاندی اور تصویروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ سب اس ورثے کی دین تھی جو چنگیز خاں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے تولوئی کے لیے چھوڑا تھا۔ تولوئی مر چکا تھا اور اب اس کی بیوی سرقوشنی بیگی اس ورثے کی مالک تھی۔

چاندی کے عود دانوں میں عود جل رہا تھا اور ریشم کے پردے دریچوں میں ہوا سے ہل رہے تھے مجھے اس فضا اور اس ماحول میں اپنے خستہ حالی محسوس کر کے حسد ہوا۔ منگولوں نے یہ دنیا بھر کی دولت مجھ جیسے دوسرے انسانوں کا قتل عام کر کے ہی تو حاصل کی تھی۔ نہ جانے اس رنگیں غالیچے میں کس کس بے گناہ کے لہو کا رنگ شامل تھا جس پر میں بیٹھا تھا اور نہ جانے کس کس کا خون ان چاندی کے عود دانوں میں جل رہا تھا! نہ جانے کس کس کے لہو کے چھینٹے اس محل کی دیواروں پر تھے!

کیا خبر میں کب تک ان خیالوں میں گم رہتا کہ ایک محافظ نے اندر داخل ہو کر سرقوشنی بیگی کے آنے کی اطلاع دی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور نگاہ دروازہ پر لگ گئی۔ میں اور عظیم لن یا دوزانوں ہو گئے۔ وہ اندر داخل ہوئی اور لن یا نے جھک کر اپنے سر سے توپی اتار دی۔ میں نے بھی لن یا کی تقلید میں ایسا ہی کیا اور سرقوشنی بیگی کو تعظیم دی۔

وہ ہمارے سامنے والی دیوار سے لگی مسند پر ایک شان سے بیٹھ گئی۔ اس کے جسم پر چینی ساٹن کا لمبا لبادہ تھا۔ میں نے پہلی بار اس ذہین اور بہادر عورت کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ اس کی چوٹی میں سونے کے پھول گندھے ہوئے تھے اور سر پر پروں کی کلغی تھی۔ چہرے کی جلد ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود نرم تھی شاید وہ چہرے کی سلوٹوں پر جلد کو نرم کرنے کے لیے میری بیاں کی طرح دہی ملتی تھی۔ اس کی عمر پچاس سے اوپر تھی

مگر اس کے باوجود اس میں دلکشی برقرار تھی۔ میں نے اس عمر کی کوئی عورت اتنی حسین نہیں دیکھی تھی۔ جب اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی تو میری آوارہ نگاہ بھٹک گئی۔ وہ لن یا سے مخاطب ہوئی تھی، مجھ سے نہیں۔

"اے عظیم لن یا! رات کے اس پہر تو نے آنے کی تکلیف کیوں اٹھائی؟ تو آج ہی تو سچین کے ساتھ آیا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"اور یہ تیرے ساتھ کون اجنبی جوان ہے؟"

"اے بیگی! میں اسی جوان کے کہنے پر اسے لے کر یہاں آیا ہوں، یہ تجھے ایک اہم بات بتانا چاہتا ہے۔" لن یا نے محتاط الفاظ میں کہا۔

"یہ جوان مجھے چہرے سے بیوقوف نظر آتا ہے اور تو جانتا ہے عظیم لن یا کہ بیوقوفوں سے بات کرنا ایسا ہی ہے جیسے گائے کی سینگوں پر اناج بونا۔" سرقوشنی بیگی بولی اور میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ میری تذلیل کر رہی تھی مگر مجھے خاموش رہنا تھا، سو میں خاموش رہا۔

"نہیں اے بیگی! یہ جوان دانا ہے ورنہ میں اسے تیرے پاس تک نہ لاتا۔" عظیم لن یا نے میری تعریف کی اور میں پھول گیا کیونکہ تعریف کرنے والا کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔

"تو کون ہے اور کیا کہنا چاہتا ہے، کہہ! اگر عظیم لن یا کو تیری دانائی پر یقین نہ ہوتا اور وہ تجھے لے کر نہ آیا ہوتا تو شاید میں تجھ سے بات بھی نہ کرتی۔" سرقوشنی بیگی تمکنت سے بولی۔ اس نے پہلی بار مجھے براہ راست مخاطب کیا اور میرا خون کھولا دیا۔ لیکن مجھے اپنے حواس پر قابو رکھنا تھا، سو رکھا۔ میں بھلا یہ کس طرح ظاہر ہونے دیتا کہ مجھے منگولوں سے نفرت ہے!

میں نے انتہائی نرم اور انکسار آمیز لہجے میں کہا۔

"اے خاندان زریں کی عظیم بیگی اور اے الاؤ روشن رکھنے والی! میں تجھے یہ بتانے آیا ہوں کہ آج کی رات تو اپنی خواب گاہ میں نہ سو! آج کی رات تجھ پہ بھاری ہے۔ میں نے نیلے جادوانی آسمان کی سرگوشیاں سنی ہیں کہ آج آدھی رات کے بعد تیری خواب گاہ کی چھت کا ایک شہتیر ٹوٹ کر گرے گا، عین اس جگہ جہاں تو سوتی ہے۔"

"کیا تو نیلے جادوانی آسمان کی سرگوشیاں سن سکتا ہے؟ کیا تو شامان ہے؟" سرقوشنی بیگی نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں اے عظیم بیگی! میں آنے والے زمانوں کی آہٹ سن سکتا ہوں۔ میں آج سے پہلے کبھی تیرے محل میں داخل نہیں ہوا مگر میں جانتا ہوں کہ کل شام تیرا ایک خاص ملازم سانپ کے کاٹے سے مر گیا تھا۔ بتا اے عظیم بیگی کیا میں نے غلط کہا؟ کیا میرا علم جھوٹا ہے؟" میں نے نسبتاً بلند آواز میں کہا۔

"یہ بات تو تجھے میرے محل کے کسی بھی محافظ سے معلوم ہو سکتی ہے۔" سرقوشنی بیگی نے مبہم سے لہجے میں کہا۔

"اور اے عظیم بیگی! جو پیش آنے والا ہے، وہ تو نیلے جادوانی آسمان کے سوا کسی کو معلوم نہیں؟"

"ہاں تو ٹھیک کہتا ہے۔ آج کی رات تیرے سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کر دے گی۔ اگر تیری پیش گوئی سچی نکلی اور میری خواب گاہ کا شہتیر واقعی ٹوٹ کر گرا جس کے کوئی آثار نہیں تو میں تیری مٹھیاں موتیوں سے بھر دوں گی لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو جانتا ہے کیا ہو گا؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"غلط پیش گوئی کرنے پر میری زبان کاٹ دی جائے گی۔" میں نے بے جھجک بولا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، تو یہیں ٹھہر! آج رات تو محل سے نہیں جا سکے گا۔ میں تیرے کہنے پر آج رات اپنی خواب گاہ میں نہیں سوتی میں آدھی رات گزرنے کے بعد خواب گاہ میں جا کر دیکھوں گی کہ مونگ کے تنیگری کیا دکھاتا ہے!" یہ کہہ کر وہ لن یا سے مخاطب ہوئی۔ "اے عظیم لن یا! تو اسے یہیں چھوڑ جا!"

لن یا کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا! وہ مجھے ترحم آمیز نگاہ سے دیکھتا ہوا اٹھا مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔ سرقوشنی بیگی لن یا کو ساتھ لے کر دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے پر کلہاڑے بردار محافظ موجود تھا، جسے سرقوشنی بیگی نے حکم دیا کہ مجھے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔

سرقوشنی بیگی کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سنا تھا۔ دشت میں اس کی ذہانت، بہادری اور حیا کے بہت سے قصے مشہور تھے۔ وہ ترک نسل کے کرائت قبیلے سے تھی اسی لیے اس میں دشت کی عورتوں جیسی قوت برداشت تھی۔ غالباً" اسی لیے وہ مجھ سے اپنے بارے میں ایک ایسی پیش گوئی سن کر قطعی خوفزدہ دکھائی نہیں دی تھی جس میں اس کی جان جانے کا خطرہ تھا۔ وہ یقیناً" خطرے کے سامنے اپنی حفاظت کرنے کا ہنر اور اپنے جذبات چھپانا جانتی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ جب وہ چھوٹی سی تھی تو اس کی شادی چنگیز خاں کے بیٹے تولوئی سے کردی گئی تھی۔ چونکہ وہ تولوئی کی پہلی بیوی تھی اس لیے اسی کی اولاد تولوئی کی وارث تھی۔ داستاں سرا اب بھی تولوئی کی بہادری کے قصے بیان کرتے تھے۔ وہ تولوئی جس کا بیشتر وقت گھوڑے کی زین پر گزرتا تھا اور سرقوشنی بیگی اس کے ہم رکاب رہتی تھی۔ سرقوشنی بیگی کا شوہر تولوئی اپنے بڑے بھائی اوفدائی ہی کی زندگی میں مرگیا تھا۔ اوفدائی نے اپنے بھائی کی موت کے بعد فیصلہ کیا کہ سرقوشنی بیگی کی دوبارہ شادی کرادے کیونکہ وہ اس وقت جوان اور حسین تھی، چار بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود! اوفدائی نے اپنے سب سے بڑے بیٹے موجودہ خاقان، قویوق کا پیغام بھیجا۔ قبائل کا دستور یہی تھا کہ اگر کوئی مرجاتا تو اس کا بھائی یا بھتیجا اس کی بیوی سے شادی کرلیتا۔ اوفدائی نے سوچا تھا کہ اس کا بڑا بیٹا قویوق ہمیشہ افسردہ اور تنہا رہتا ہے اور بیماری کی بلائیں اور آسیب اسے ستاتے رہتے ہیں۔ سرقوشنی بیگی اس کے لیے نعمت بن جائے گی۔ جب قاصد نے یہ پیغام سرقوشنی بیگی کو سنایا تو اس نے خاقان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ دوبارہ شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اس نے کہا کہ خاقان کا حکم اس کی سر آنکھوں پر مگر اس کی تمنا محض یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کرے، انہیں آداب اور تمیز سکھائے، انہیں ایک دوسرے سے نفرت نہ کرنے دے اور ایک دوسرے سے بیگانہ نہ بننے دے تاکہ ان کی وفاداری سے سب کو فائدہ پہنچے۔ اوفدائی ایک ماں کی اس آرزو سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے طے کیا کہ تولوئی کا سارا ورثہ سرقوشنی کو ملنا چاہیے۔ گھر اور مغلوں کا الاؤ جو اصلی قبیلوں کا مرکز ہے اس کو ملے اس کے علاوہ پرانی کار آزمودہ فوج کا زیادہ تر حصہ بھی۔ اوفدائی، سرقوشنی بیگی کو باعفت، باحیا اور عاقل سمجھتا تھا۔ سرقوشنی بیگی نے لشکر کے ساتھ اپنے شوہر کی وراثت کا حق قبول کرلیا تھا۔ سرقوشنی بیگی کے چاروں بیٹے منگو خاں، قبلائی خاں، ہلاکو خاں اور اویت جوان تھے جن کی جوانی دیکھنے کی آرزو میں سرقوشنی بیگی نے ایک عمر گزاردی تھی۔ شاید سرقوشنی بیگی کی جبلت نے اسے یہ سبق سکھایا تھا کہ طاقتوروں کی اس دنیا میں کمزوروں کا کوئی مقام نہیں اور اب سرقوشنی بیگی طاقتور ہو چکی تھی کیونکہ وہ چار طاقتور بیٹوں کی ماں تھی۔

میں نصف شب گزرنے کے انتظار میں، کبھی سرقوشنی بیگی کے بارے میں سنی ہوئی حکایتیں یاد کرتا رہا اور کبھی میرے ذہن کو وسوسوں اور اندیشوں کے ناگ ڈستے رہے۔ اگر سولدہ کی بنائی ہوئی پیش گوئی سچ نہ نکلی تو کیا ہوگا! کیا میری زبان کاٹ دی جائے گی! میں دشمنوں کے ہاتھوں مارا جاؤں گا! انہی خیالوں میں وہ کڑا وقت بیت گیا، آدھی رات گزر گئی اور مجھے احساس ہی نہ ہوا۔ میں اس وقت چونکا جب میں نے سرقوشنی بیگی کو دروازے سے اندر آتے دیکھا۔ وہ پر جوش اور خوش نظر آرہی تھی اور اس کی نیلی آنکھوں میں ہلکے گلابی ڈورے تیر رہے تھے جو اس بات کے غماز تھے کہ وہ جاگتی رہی ہے اور ساغر و مینا سے جی بہلاتی رہی ہے۔

"اے اجنبی شامان! تیری پیش گوئی سچ ہوئی اب میں تیری مٹھیاں وعدے کے مطابق موتیوں سے بھر دوں گی۔" سرقوشنی بیگی پر جوش آواز میں بولتی ہوئی میرے قریب آبیٹھی۔

"اے الاؤ کی رکھوالی! تیرا شکریہ! مگر میں نے یہ پیش گوئی موتیوں سے اپنی مٹھیاں بھرنے کے لیے نہیں کی تھی۔"

"تو پھر تجھے کیا چاہیے؟ بول بول! تو نے میری جان بچائی ہے، میں تجھے مایوس نہیں کروں گی۔"

"اے چار بگھاتر (بہادر) بیٹوں کی ماں! مجھے تجھ سے کچھ نہیں چاہیے!" اس نے میری طرف حیرت اور بے یقینی سے دیکھا اور بولی۔ "تجھے کچھ نہیں چاہیے؟ تعجب ہے، میری نظر سے آج تک ایسا کوئی شاہان نہیں گزرا جسے دولت کی تمنا نہ ہو۔"

"تمنا تو میرے دل میں بھی ہے اے عظیم بیگی! مگر وہ تمنا دولت کی نہیں بلکہ تیری خدمت کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا سارا علم تیرے لیے وقف کر دوں۔ میری آرزو ہے کہ میں نیلے جادوانی آسمان کی سرگوشیاں سن کر تجھے آنے والے زمانوں سے آگاہ کرتا رہوں تاکہ تجھے وہ دن دیکھنا نصیب ہو جس دن کو دیکھنے کی خواہش تیرے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی ہے۔"

میں نے محسوس کر لیا کہ وہ میری باتیں توجہ اور شوق سے سن رہی ہے۔ میں چپ ہوا تو وہ بولی۔ "میں تیری آرزو ضرور پوری کروں گی۔ آج سے تو اسی محل میں رہے گا مگر تو نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ تو کون ہے، تیرا نام کیا ہے اور تو کس باپ کا بیٹا ہے؟ میں نے تجھے آج سے پہلے کبھی اور کہیں نہیں دیکھا۔"

"تیرے خادم کا نام، تیرے سب سے چھوٹے بیٹے کا نصف آخر بوغا اور پورا نام بطریق بوغا ہے۔"

"تیرا نام کچھ سنا ہوا سا لگتا ہے، یاد نہیں آتا کہ کہاں، کب اور کس سلسلے میں سنا تھا!" وہ میرے چپ ہوتے ہی چونک کر بولی۔

میں نے اسے بتا دیا کہ اس نے کب اور کس سلسلے میں میرا نام سنا ہو گا پھر بولا۔ "مگر اے عظیم بیگی! یقین کر کہ میں کالا جادو نہیں جانتا، میں تو شاہان ہوں وزیر پلواج نے مجھے بے گناہ پکڑا تھا اور میری ماں کو بھی بے قصور مار دیا گیا جبکہ وہ جادوگرنی نہیں تھی۔"

میری بات سن کر سرقوتنی بیگی کے چہرے سے انتہائی حیرت کا اظہار ہونے لگا۔ اب اسے معلوم ہو چکا تھا کہ گڑھے سے نکل کر فرار ہونے والا اور بوغا جادوگر میں تھا۔ وہ حیرت زدہ لہجے میں بولی۔ "اگر تو جادوگر نہیں تو پھر اس گڑھے سے کس طرح نکل گیا؟"

"اے عظیم بیگی! تو جانتی ہے کہ شاہان اپنا جسم چھوڑ کر نیلے جادوانی آسمان کی سرگوشیاں سننے عالم بالا تک ہو آتے ہیں تو پھر ان کے لیے ایک معمولی گڑھے سے نکلنا کیا عجب بات ہے! مونگ کے تینگری کو ابھی مجھ سے بہت سے ایسے کام لینے ہیں جیسا کام میں نے آج رات انجام دیا۔ مجھ سے سرگوشیوں میں کہا گیا ہے کہ میں تجھے آنے والے زمانوں کی خبر دوں۔"

"مونگ کے تینگری نے تجھے میرے ہی لیے زندہ رکھا ہو گا کہ تو میری جان بچا سکے۔" وہ متاثر لہجے میں بولی۔ "اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تو اور بھی بہت کچھ جانتا ہے!"

"ہاں اے عظیم بیگی! بہت کچھ، جس کا جاننا تیرے لیے بھی بہت ضروری ہے۔" میں نے برجستہ کہا۔

"تو پھر مجھے وہ سب کچھ بتا دے جو تو جانتا ہے۔" وہ بے صبری سے بولی۔

"نیلے جادوانی آسمان نے سرگوشیوں میں جو کچھ کہا ہے، وہ بڑا عجیب ہے۔ خاقان اعظم (چنگیز خان) نے کہا تھا کہ اپنے خونی عزیزوں کو تباہ کرنا گویا گھر کے چولھے کی آگ بجھانا ہے اور موجودہ خاقان قوبوق گھر کے چولھے کی آگ بجھانا چاہتا ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں بات شروع کی۔

وہ چوکنا نظر آنے لگی اور جلدی سے بولی۔ "بتا، صاف صاف لفظوں میں بتا کہ قوبوق کسے تباہ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے؟"

"آج رات کے دو دن بعد قوبوق اپنی بہت زبردست عسکری قوت کے ساتھ اپنے تایا کے بیٹے باتوخاں کے دشت کا رخ کرے گا کیونکہ وہ باتوخاں کے جواب سے بہت برہم ہے۔ باتوخاں نے اپنے پیر میں درد کا بہانہ کر کے قرولتائی میں شرکت کرنے سے معذوری ظاہر کر دی ہے۔ باتوں خاں کا جواب قوبوق کو مل چکا ہے۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے شاہان! آج میں نے اپنے چاروں بیٹوں کو اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے بلایا تھا۔ تو نے جو کچھ بتایا ہے، وہ میرے علم میں بھی آ چکا

ہے اور آج ہی رات میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ تو اپنے علم کے زور سے یہ بتا کہ کیا میرا فیصلہ ٹھیک ہے؟" سرقوشنی بیگی کی باتوں سے اب صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ مجھ سے بالکل متاثر ہو چکی ہے۔ وہ مجھے بتا رہی تھی۔ "میں نے اپنے چاروں بیٹوں اور عظیم لن یا سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ باتو خاں کو قوبوق کے حملے سے باخبر کر دوں۔ تو بتا کہ کیا یہ فیصلہ مستقبل میں میرے حق میں جائے گا۔"

میں نے اسے دکھانے کو آنکھیں موند لیں حالانکہ میں صرف یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ میں نے اسے شیشے میں اتار لیا اور وہ مجھ سے کھل گئی۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر اور زیادہ مسرت کی بات کیا ہو سکتی تھی کہ سرقوشنی بیگی بھی اس جھگڑے میں ایک فریق بن رہی ہے اور وہ موجود خاقان قوبوق کے خلاف ہے۔ میں نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر اسے مخاطب کیا۔

"اے عظیم بیگی! میں نے تیری خاطر مستقبل میں جھانکا اور جانا کہ تیرا فیصلہ عاقلانہ ہے۔ اسی کے ساتھ ابھی مجھے ایک اور اہم بات معلوم ہوئی جسے سن کر شاید تو یقین نہ کرے مگر مستقبل کوئی نہیں بدل سکتا۔ مستقبل کے فیصلے اٹل ہیں۔"

"تو بتا! بتا تو سہی کہ تو نے مستقبل میں جھانک کر اور کیا جانا؟" سرقوشنی بیگی نے بے چینی سے سوال کیا۔

"تو جانتی ہے عظیم بیگی کہ یہ ہماری جنتری کے مطابق خنزیر کا سال ہے' اگلا سال چوہے کا سال ہو گا' لیکن قوبوق چوہے کا سال دیکھنے سے پہلے مر جائے گا۔"

"شمان.... یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟.... کیا کہہ رہا ہے تو؟" سرقوشنی بیگی کے لہجے میں شدید حیرت تھی اور اس کی آواز ایک اندرونی مسرت سے کانپ رہی تھی۔

"ہاں اے گھر کے الاؤ کی رکھوالی! مستقبل میں یہی ہو گا۔ میں نے مستقبل میں ابھی یہی دیکھا اور سنا ہے۔"

"تو.... تو پھر کل ہی.... کل ہی بلکہ آج رات ہی مجھے اپنا کوئی قاصد باتو خاں کے پاس بھیج دینا چاہیے.... مجھے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے.... اسے ہوشیار کر دینا چاہیے.... ہوشیار۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑانے لگی اور پھر اس نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "تو.... تو شمان!.... تجھ سے زیادہ میرا وفادار کون ہو گا! تو جس نے میری زندگی بچائی ہے اور تو جو آنے والے زمانوں سے باخبر ہے.... اور تو جس پر مونگ کے تینگری مہربان ہے.... ہاں تو باتو خاں تک میرا پیغام لے کر جائے گا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ فیصلہ کن ہو گیا۔

میں بے حد خوش تھا کہ مجھے میرا مقصد حاصل ہو گیا۔ اب میں ان کی صفوں میں رہ کر ان کے درمیان نفاق کے بیج بو سکوں گا۔ سولدہ نے غلط نہیں کہا تھا' میرا فرار ہو جانا واقعی بزدلی ہوتی۔ سرقوشنی بیگی یہ جاننے کے باوجود مجھے اپنانے پر آمادہ تھی کہ خاقان قوبوق کا وزیر یلواچ' مجھے سزائے موت کا حکم سنا چکا ہے اور میں ایک مفرور قیدی ہوں۔ انتہائی مسرت کے باوجود میں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار نہ ہونے دیا۔

"میں عظیم بیگی کا ادنیٰ خادم ہوں اور اس کا ہر حکم بجا لاؤں گا۔" میں نے اسے جواب دیا لیکن اس جواب سے میں نے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ خود میری بھی یہی مرضی تھی۔

میرا جواب سن کر اس نے دروازے پر کھڑے ہوئے محافظ کو بلایا اور اسے فوراً" کسی کو ساتھ لے کر آنے کا حکم دیا۔ جب محافظ چلا گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "سامیں خاں (باتو خاں) سے کہنا' وہ اپنا اردو لے کر بھورے دریائے ایمیل کے دہانے پر پہنچ جائے کیونکہ قوبوق اس پر حملہ کرنے آ رہا ہے۔ اسے خاقان اعظم (چنگیز خاں) کا قول یاد دلانا کہ رزم میں شیروں کی طرح لڑو اور امن ہو تو قمریوں کی طرح گزارو! اس سے کہنا کہ قمریوں کی طرح رہنے کا موسم ختم ہوا اور اب شیروں کی طرح لڑنے کا موسم آ گیا ہے۔"

"کیا مجھے یہ پیغامی زبانی دینا ہے؟" میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں' زبانی!" اس نے جواب دیا۔ "تمہیں اصل

پیغام زبانی ہی دینا ہے لیکن تمہارے پاس جو تحریری پیغام ہوگا، وہ مختلف ہوگا۔"

"لیکن اے عظیم بیگی! سائیں خاں کو میری باتوں پر کیسے یقین آئے گا؟" اسے کیسے معلوم ہوگا کہ تو نے ہی مجھے اس کے پاس بھیجا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ میرے قاصدوں کو پہچانتا ہے۔" سرتوشنی بیگی یہ کہہ کر مسکرائی۔ ہمارے درمیان پیغام رسانی کا ایک ایسا طریقہ ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی دھوکا نہیں کھا سکتا۔"

"وہ پہچان کیا ہوگی اے بیگی؟" میں نے بے صبری کے ساتھ دریافت کیا۔

"اسی پہچان کے لیے میں نے ہنرمند بوڑھے ابلغوری کو بلایا ہے ابھی تو خود جان لے گا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

مجھے علم تھا کہ ابلغوری قبیلہ ہی دشت میں وہ پہلا قبیلہ تھا جس نے منگول وحشیوں کو اپنی بساط کے مطابق لکھنا پڑھنا سکھایا اور یہی قبیلہ دشت والوں کا استاد کہلایا۔ میں نے سوچا کہ اس ذہین عورت نے باتوں خاں اور اپنے درمیان قاصدوں کی شناخت کے لیے کوئی نشان یا کوئی لفظ مقرر کیا ہوگا جو وہ بوڑھا ابلغوری لکھ کر دے گا جسے سرتوشنی بیگی نے طلب کیا تھا۔

حمدیہ کم اور لمبی مونچھوں والا ایک بوڑھا ابلغوری دروازے سے اندر آیا۔ اس کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر اور موٹا ابلغوری بھی تھا جو کوئی چھوٹا سا صندوق اٹھائے ہوئے تھا۔ قریب آکر موٹے ابلغوری نے صندوق فرش پر رکھ دیا پھر ان دونوں نے بیگی کے سامنے جھک کر اپنی سمور کی ٹوپیاں اتاریں اور تعظیم دی۔

"اے ہنرمند ابلغوری! اسے ہم اپنا قاصد بنا کر بھیج رہے ہیں۔ تو اسے ہمارا قاصد بنا دے۔" سرتوشنی بیگی نے بوڑھے کو مخاطب کر کے حکم دیا۔

بوڑھا ابلغوری میرے قریب آیا اور اس طرح میرا سینہ ٹٹولنے لگا جیسے کسی جانور پر ہاتھ ڈال کر یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ آیا وہ صحت مند ہے یا نہیں! اس بوڑھے نے پلٹ کر اپنے ساتھی کو کچھ اشارہ کیا پھر بیگی کو مخاطب کیا۔ "اے عظیم بیگی! یہ جوان، قاصد بننے کے قابل ہے میں نے اس کا سینہ ٹٹول کر دیکھ لیا ہے۔"

"تو پھر اپنا ہنر دکھا۔" سرتوشنی بیگی نے اسے حکم دیا اور میرا ذہن چکرانے لگا کہ بیگی اور اس بوڑھے ابلغوری کے کہے ہوئے جملوں کا مقصد کیا ہے اور بوڑھے نے میرا سینہ کیوں ٹٹولا تھا!

بوڑھے ابلغوری نے دروازے تک جا کر محافظ سے کچھ کہا جسے میں نہ سن سکا پھر وہ میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ "جوان اپنا سینہ کھول دے!"

مجھے بوڑھے کی یہ حرکت بھی عجب لگی مگر میں نے وہی کیا جو اس نے کہا تھا۔ وہ میرے سینے پر گھنے بال دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرایا اور اپنے ساتھی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ سرتوشنی بیگی بڑی دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جیسے اسے بوڑھے کی کسی حرکت پر کوئی تعجب نہ ہو اور تعجب ہوتا بھی کیوں جبکہ بوڑھا ابلغوری اسی کے حکم پر وہاں آیا تھا۔ میری نظر بوڑھے کے ساتھ پر پڑی جو اب میرے قریب آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز آب دار خنجر تھا جو مشعل کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

موٹا ابلغوری کے بل میرے سامنے بیٹھ گیا اور پھر اس نے میرے سینے پر موجود گھنے بال مونڈنا شروع کر دیے۔ مجھے اپنے سینے کے بال مونڈے جانے پر دکھ ہوا کیونکہ میری ماں کو یہ بال پسند تھے۔ وہ میرے سینے پر موجود گھنے سنہری بالوں پر اکثر ہاتھ پھیر کر خوش ہوتی تھی، لیکن آج میرا چوڑا چکلا سینہ سنہری بالوں سے محروم کر دیا گیا۔ اس دوران میں، میں نے ایک اور عجیب بات دیکھی۔ بوڑھا ابلغوری صندوق سے عجیب عجیب سے اوزار نکال کر دہکتی ہوئی انگیٹھی پر رکھ رہا تھا جو اس نے محافظ سے منگوائی تھی۔ موٹا ابلغوری بال مونڈ کر ہٹا تو بوڑھے نے مجھے اٹھ کر اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

بوڑھے نے مجھے فرش پر بٹھا لیا پھر اس نے اپنے نزدیک کھڑے ہوئے موٹے کو کچھ اشارہ کیا۔ موٹا

لپک کر میرے پیچھے پہنچا اور اس نے میرے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے انہیں اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے سامنے مسند پر بیٹھی ہوئی سرقوشنی بیگی کو مخاطب کیا۔ "اے عظیم بیگی! یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟"

"تجھے ہمارا قاصد بنا رہے ہیں۔" سرقوشنی بیگی نے مسکرا کر پرسکون آواز میں جواب دیا۔

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ بوڑھے ایلوری نے اس دوران میں ایسی ہی حرکت کی تھی۔ اس نے قریب رکھی ہوئی انگیٹھی سے ایک اوزار اٹھایا تھا جس کا دستہ لکڑی کا تھا اور بقیہ حصہ لوہے کا۔ وہ ایک سلاخ سی تھی، سرخ دہکتی سلاخ جو بوڑھے ایلغوری نے میرے سینے کے نرم گوشت پر رکھ دی تھی۔

میرے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"گھاتروں کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ چیخیں!" بوڑھے ایلغوری نے ایک اور دہکتی سلاخ اٹھاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے دوسری دہکتی ہوئی سلاخ بھی میرے سینے سے آ لگی۔ بوڑھا ایلغوری اپنے آتشیں قلم سے میرے سینے پر نقش و نگار بناتا رہا اور میں کرب سے گزرتا رہا۔ مجھے اس موقع پر عظیم لوچت سائی کا سنایا ہوا ایک واقعہ یاد آیا۔ یہ واقعہ چنگیز خاں کے عہد کا تھا جب اس نے دنیائے اسلام کو تاخت و تاراج نہیں کیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ خلیفہ 'بغداد' خوارزم شاہ کی تعداد سے ہراساں تھا جس نے خلیفہ کو قطعی بے اثر بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت تک چنگیز خان کی شہرت مسلم ممالک تک پہنچ چکی تھی۔ خلیفہ بغداد کو لوگوں نے سمجھایا کہ چین کی سرحد پر جو خان ہے وہ اس کی مدد کر سکتا ہے۔ بغداد سے قراقرم کے لیے ایک قاصد بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ قراقرم تک پہنچنے کے لیے خوارزم شاہ کے علاقوں سے ہو کر گزرنا ضروری تھا۔ اس لیے خلیفہ نے ایک احتیاطی تدبیر کی قاصد کا منصب اور پیغام اس کا سر مونڈ کر سر کی جلد پر آتش قلم سے لکھ دیا گیا تھا۔ اس

کے بعد بال بڑھ گئے اور قاصد کو اس کا پیغام رٹا دیا گیا سب کچھ ٹھیک ٹھیک ہوا۔ خلیفہ کا قاصد چنگیز خاں کے دربار میں جا پہنچا۔ وہاں چنگیز خاں کے سامنے اس کے بال مونڈے گئے، اس کا منصب شناخت کیا گیا اور اس کا پیغام سنا گیا۔ چنگیز خاں نے خلیفہ 'بغداد' کی درخواست پر کوئی توجہ نہ دی مگر اسے پیغام رسانی کا طریقہ بہت پسند آیا۔ شاید اس لیے کہ اس طریقے میں ایذا رسانی کا پہلو بھی نکلتا تھا۔

سرقوشنی بیگی نے بھی یقیناً "یہ واقعہ سنا ہو گا ممکن ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ اس نے بھی قاصدوں کی شناخت اور خفیہ پیغام رسانی کا یہی طریقہ کچھ معمولی ترمیم کے ساتھ اپنا لیا تھا اور اس وقت میں اس کا تختہ مشق بنا ہوا تھا۔ فرق صرف سر اور سر کا تھا۔ شاید اس ترمیم کا سبب یہ ہو کہ قاصد کے سر کے بال بڑھنے کا انتظار نہ کیا جائے اور اسے فوراً روانہ کیا جا سکے۔

جب بوڑھا ایلوری اپنا ہنر دکھا چکا تو سرقوشنی بیگی نے بوڑھے ایلغوری کو حکم دیا۔ "اب پیغام لکھو!"

بوڑھا ایلغوری اپنے صندوق سے قلمدان اور کاغذ نکال لایا اور سرقوشنی بیگی کے ہونٹوں پر ایک عجیب مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اس نے پیغام لکھوانا شروع کیا۔

سائیں خاں! میں، خاندان زرین کے الاؤ کی قندیل رکھوالی سرقوشنی بیگی تم سے مخاطب ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے اپنے پیر کے درد کا بہانہ بنا کر قولتائی (بین القبائلی اجلاس) میں شرکت سے انکار کر دیا ہے اور ایسا تم نے دوسری بار کیا ہے۔ کیا تمہیں خاقان اعظم کی یاسا (مجموعہ قوانین) حفظ نہیں؟ کیا تم نے خاقان اعظم کا وہ قول بھلا دیا کہ جو قولتائی میں شرکت نہ کرے گا اور اپنے رقبے ہی میں رہے گا اس کی حالت اس پتھر کی سی ہو گی جو گہرے پانی میں پھینک دیا جائے یا اس تیر کی سی ہو گی جو لمبی لمبی گھاس میں چلایا جائے۔ وہ لاپتہ ہو جائے گا۔ تو کیا تم گہرے پانی کے پتھر بننا چاہتے ہو یا لمبی لمبی گھاس میں چلایا جانے والا بے مصرف تیر؟ میں خاقان قویوق کی وفادار ہوں

اور تمہیں آخری تنبیہہ کرتی ہوں کہ راہ راست پر آجاؤ! اب بھی وقت ہے۔ تم خاقان قوبوق کے سامنے آکر اپنی لمبی تور کی ٹوپی اتار دو اور اپنی کمر سے بندھی ہوئی چمڑے کی پیٹی کھول دو! تم اسے تعظیم دو کہ یہ اس کا حق ہے۔

میں نے اس ذہین اور چالاک عورت کا پیغام سنا جو اس نے باتوخاں کو لکھایا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ پیغام محض ایک دکھاوا ہے اور اصل پیغام میرے سینے پر اور سینے کے اندر محفوظ ہے میرا سینہ جل رہا تھا' اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ باہر ان لفظوں کی آگ تھی جو میرے سینے پر رقم کیے گئے تھے اور سینے کے اندر انتقام کی آگ۔ میں نے جھک کر اپنے سینے پر آگ کی تحریر پڑھی۔

سرقوشنی بیگی کا قاصد۔ اس کی باتوں پر اعتبار کرو۔

کیا اعتبار تھا اور کیا بے اعتباری! کچھ بھی طے نہیں تھا۔ یہ وحشی اپنے اندر اور اپنے باہر کس قدر مختلف تھے! میں نے سوچا اور کراہا۔ بوڑھے ایلغوری نے اپنے قلمدان کو بند کرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا سوزش زیادہ ہو رہی ہے جوان؟"

بوڑھے نے یہ سوال اس طرح کیا جیسے مجھے چڑا رہا ہو۔ میرا خون کھول اٹھا۔ میرا جی چاہا کہ جواب میں اسے زمین پر گرا کر اس کے سینے پر بھی دہکتی سلاخ رکھ دوں پھر اس سے پوچھوں 'کیا حال ہے!' مگر میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں سخت جلن ہو رہی ہے۔"

بوڑھا ایلوری اٹھ کر صندوق کے پاس آیا اور اس میں ہاتھ ڈال کر دھات کا ایک ڈبہ نکالا پھر میرے پاس آبیٹھا۔ ڈبہ کھول کر اس نے ایک گاڑھا سا محلول اپنی ہتھیلی پر انڈیلا اور میرے سینے پر مل دیا۔ ناقابل برداشت تکلیف سے میں تقریباً "چیخ پڑا۔ اس محلول نے جلتی آگ پر چربی کا کام کیا تھا مگر یہ کیفیت' یہ کرب صرف کچھ دیر کا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ میرے سینے پر برف مل دی گئی ہے۔

"اب جلن اور سوزش نہیں ہوگی اور تیرے سینے پر لکھے ہوئے لفظ بھی پکے ہو جائیں گے جوان!" بوڑھے ایلغوری نے مجھے تسلی دی اور اس نے جو کچھ کہا تھا' غلط نہیں تھا۔ مجھے حیرت انگیز طور پر افاقہ ہوا تھا۔

"اسے ہماری مہر لگی ہوئی لوح بھی دے دو!" سرقوشنی بیگی نے بوڑھے ایلغوری کو حکم دیا۔

بوڑھے نے اثبات میں سر ہلا کر اپنے صندوق میں ہاتھ ڈالا اور ایک تختی نکال کر باہر رکھ دی جس پر خاندان زریں کی مہر ثبت تھی۔ مہر جس پر شہباز کی تصویر تھی۔

"اس مہر کی رو سے تجھے اختیار ہے کہ راستے میں تیرا گھوڑا تھک کر ڈھیر ہو جائے تو جو سوار نظر آئے' اسے گھوڑے سے اتار کر تو اس کے گھوڑے پر سوار ہو جا اور اپنا سفر جاری رکھ' اس دشت سے مغربی دشت تک کسی کی مجال نہیں جو اپنا گھوڑا تیرے حوالے کرنے سے انکار کر دے۔" سرقوشنی بیگی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور میں نے لوح' بوڑھے سے لے لی۔

اس کے بعد سرقوشنی بیگی نے بوڑھے ایلغوری اور اس کے موٹے ساتھی کو جانے کا حکم دیا۔ وہ دونوں چلے گئے تو بیگی نے کہا' جو پیغام لکھ کر مجھے دیا جا رہا ہے' اس کو میں مغربی دشت میں پہنچ کر پھاڑ دوں پھر اس نے اپنے قشق کے سرداروں کو بلایا اور کچھ دوسرے افراد کو بھی۔ بیگی نے انہیں میرے بارے میں کچھ احکامات دیے جن کا لب لباب یہ تھا کہ مجھے صبح ہونے سے پہلے پوری طرح سفر کے لیے تیار کر کے روانہ کر دیا جائے اور یہ کہ قشق (محافظ دستہ) کے سپاہی اپنا خاص نشان لے کر میرے ساتھ قورت چاغان (گرگ سفید) تک جائیں۔ میں سرقوشنی بیگی کے اس حکم کا مقصد اچھی طرح سمجھ گیا۔ وہ اس بات سے آگاہ ہو چکی تھی کہ خاقان کے سپاہی میری تلاش میں ہیں اس لیے وہ نہیں چاہتی تھی کہ مجھے راستے میں کوئی روکے اور میں پکڑا جاؤں۔

سرقوشنی بیگی مجھے اپنے قشق کے سرداروں اور دوسرے محافظوں کے سپرد کر کے چلی گئی اور جاتے

جاتے اس نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کا کوئی اور پیغام ملنے تک مغربی دشت ہی میں باتوخاں کے پاس رہوں۔ غالباً اس حکم کا مقصد مجھے خاقان قوبوق کے غضب سے بچانا تھا کیونکہ اب اسے شاید یہ توقع بندھ چلی تھی کہ مستقبل میں بھی میں اس کے کام آسکوں گا۔

محافظ اور سردار مجھے محل کے ایک اور حصے میں لے گئے جہاں انہوں نے مجھے پہننے کو گرم اور عمدہ لباس دیا۔ یہ سمور کا لبادہ اور پاجامہ تھا۔ پاجامے کے دونوں پائنچے نیچے سے بالکل تنگ تھے تاکہ ہوا اندر نہ گھس سکے۔ سردی سے بچنے کے لیے مجھے ایک سمور ہی کی صدری بھی پہنچائی گئی جس میں بھیڑ کے چمڑے کا استر لگا ہوا تھا۔ سر پر لمبی سمور کی ٹوپی رکھ دی گئی۔ وہ بڑے انہماک سے میری روانگی کا اہتمام کر رہے تھے۔ آخر میں اب کوئی معمولی شخص نہ رہا تھا بلکہ سرقوشنی بیگی کا خاص قاصد بن چکا تھا جس پر اسے اعتبار تھا۔ مجھے کمند، تلوار اور رسی بھی دی گئی۔ ساتھ ہی ایک تیر کمان اور ترکش بھی جس میں چھوٹے بڑے بہت سے تیر تھے۔ دو چمڑے کے تھیلے بھی دیے گئے جن میں سے ایک میں گھوڑی کا دودھ تھا اور دوسرے میں دودھ میں بھیگے ہوئے جو۔ ایک پیالہ اور پکانے کا سامان، ایک چھوٹی سی کلہاڑی، نمک کی ایک تھیلی، موم اور سوئی دھاگہ، ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی گئی جس کے بغیر مجھے پریشانی ہو۔ لباس تبدیل کرانے سے پہلے میرے سارے جسم پر بدبودار روغن اور چربی کی مالش بھی ہوئی تھی تاکہ میں سخت سردی کا مقابلہ کر سکوں۔

ان تمام تیاریوں کے بعد ایک بوڑھے ایلغوری نے مجھے مغربی دشت تک جانے والے راستوں کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ وہ خود دو بار مغربی دشت تک جا کر واپس آچکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجھے ایک سو اکیاون منزلوں سے زیادہ سفر کرنا ہے۔ اس بوڑھے ایلغوری عالم نے مجھے جو کچھ بتایا، اس سے میں نے بہت سی ایسی باتیں پہلی بار جانیں جن سے میں پہلے لاعلم تھا۔

میں نے پہلی بار جانا کہ دشت میں رہنے والے یہ خانہ بدوش وحشی قدرتی رکاوٹوں کے باعث ہر طرف سے اسی دشت میں گھرے ہوئے تھے جسے صحرائے گوبی کہا جاتا ہے۔ شمال میں بحر منجمد شمالی کا برف زاد ہے۔ شمال مشرق میں کہسار خنگاں ہے جو فصیل کی طرح سیدھا ہے اور اس کہسار کے اس پار منچوریا کے گھنے جنگل ہیں۔ جنوب میں تبت کا کوہستان ہے جو بادلوں سے بھی زیادہ بلند ہے اور نیلے جاودانی آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ اس کوہستانی حصار سے نکلنے کے دو ہی راستے ہیں۔ جنوب مشرق میں چین کی آبادی کی طرف اور مغرب میں وسط ایشیا کے صحراؤں کی طرف! مجھے مغربی راستے پر دشت کی جانب جانا تھا جہاں باتوخاں کی عملداری تھی۔

ایلغوری عالم جب مجھے راستوں کے بارے میں بتا چکا تو محافظوں نے ہاتھوں کو چھوڑ کر میرے جسم کے اوپری حصے پر ایک کپڑا لپیٹ دیا اور نصف چہرے پر بھی کپڑا کس کر باندھ دیا تاکہ میں ہوا اور ریت سے بچ سکوں۔ پھر تمام ساز و سامان ایک اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر لاد دیا گیا۔ مجھے بھی گھوڑے پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا اور قشق کے سواروں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا پھر انہوں نے محل کے عقبی دروازے کا رخ کیا۔

محل کے عقبی دروازے سے نکل کر یہ دستہ اس میدان کے قریب سے گزرا جہاں مجھے مرنے کے لیے ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا تھا اور اب میں قشق کے ہمراہ، بے خطر اس علاقے سے گزر رہا تھا۔

بستی سے نکل کر طاقت کے پہاڑ بور خان قالدون پہنچنے سے قبل میں اپنے ہمراہیوں سمیت شکار والی دیوار کو اپنے بائیں جانب چھوڑتا ہوا آگے بڑھا۔ یہ سوکھی ہوئی مٹی کی دیوار شہر پناہ کی نشانی بھی تھی اور یہاں گھوڑے بھی اکٹھے کیے جاتے تھے۔ یہ دیوار تھیل بیکال کے جنوب میں ہے۔ جہاں سے ایک دریا پھوٹتا تھا۔ گھوڑے دوڑتے رہے اور سورج اپنی بیوی کی آغوش سے اٹھ کر ہمارے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ بور خان قالدون بہت پیچھے رہ گیا اور ہمیں نیلی جھیل

نظر آنے لگی۔ دور ہی سے جھیل کے کنارے بنا ہوا طلائی اردو نظر آنے لگا۔ طلائی اردو اس بڑے سے یورت کا نام تھا جو باہر کی جانب سے طلا سے منقش تھا اور جس کے اندر دیواروں پر غالیچے لٹکتے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ اس یورت میں ہزار آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ نیلی جھیل کے بعد وسیع چراگاہوں کا علاقہ آیا اور پھر دوپہر ہوتے ہوتے قورت چاغان نظر آنے لگا جس کے بعد قشق کے سواروں کو واپس جانا تھا۔

قورت چاغان (گرک سفید) ایک محل کا نام تھا جسے دشت میں ایرانی معماروں نے اوفدائی کے حکم پر تعمیر کیا تھا۔ میں نے ایک بار شکار گاہ کے محافظوں سے سنا تھا کہ جب قراقرم میں چینی معمار اوخدائی کا محل تعمیر کر رہے تھے تو چراگاہوں سے آگے ایرانی معمار قورت چاغان کی تعمیر میں مصروف تھے۔ یہ محل بھی اوفدائی ہی نے بنوایا تھا جہاں اب سپاہیوں کا صرف ایک دستہ رہتا تھا جو محل کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتا تھا یا کبھی کبھار جب قراقرم میں رہتے رہتے اوفدائی کی بیوی تورا کینہ کا جی گھبرا جاتا تھا تو وہ محل میں کچھ دن رہ جاتی تھی ورنہ یہ خالی ہی پڑا رہتا تھا۔ منگولوں کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ ایسے درجنوں محل بنوا کر خالی چھوڑ سکتے تھے۔

محل کو کچھ پیچھے چھوڑ کر قشق رک گیا اور اس کے ساتھ میں بھی! قشق کے ہمراہ وہ ایلغوری عالم بھی آیا تھا جس نے مجھے مغرب کی طرف جانے والے راستوں سے باخبر کیا تھا کیونکہ یہ مغرب کی جانب میرا پہلا سفر تھا۔ اسی ایلغوری عالم نے رخصت ہونے سے قبل ایک بار پھر مختصراً" مجھے راستوں کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد قشق نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اب یہاں سے مجھے تنہا آگے بڑھنا تھا۔ میں نے دشت میں تیز رفتاری سے اپنا سفر شروع کر دیا کیونکہ ایلغوری عالم کی اطلاع کے مطابق اگر میں اپنا سفر تیز رفتاری سے جاری نہ رکھتا تو رات ہونے سے قبل اس یام (سرائے) تک نہ پہنچ پاتا جہاں مجھے رات بسر کرنی تھی۔

شام ڈھل رہی تھی کہ مجھے یام کے یورت نظر آنے لگے۔ میں بہت جلد گھوڑا دوڑاتا ہوا ان یورتوں کے قریب پہنچ گیا۔ میں ایک یورت میں یام کے داروغہ سے ملا جس کے پاس ایک منشی، قلمدان اور لمبا کاغذ لیے بیٹھا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ داروغہ، نائی من قبیلے کا تھا اور اس کا منشی، ایلغوری قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے چہروں کے خدوخال سے یہی پتا چل رہا تھا۔ اپنا گھوڑا میں نے یورت کے باہر لکڑی کے ایک کھونٹے سے باندھ دیا تھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو اور کدھر جانے کا ارادہ ہے؟" داروغہ کا یہ سوال میرے لیے توقع کے مطابق تھا۔

میں اس کے قریب پہنچ کر رکا اور اپنے دائیں ہاتھ میں تھامی ہوئی لوح آگے بڑھا دی جسے شاید وہ اب تک نہ دیکھ سکا تھا۔ میرے ہاتھ میں لوح دیکھتے ہی داروغہ سٹپٹا سا گیا اور ایک دم اس نے اٹھ کر میرے سامنے جھکتے ہوئے اپنی ٹوپی اتار دی۔ یہ سب اسی لوح کا کرشمہ تھا۔ جس پر شہباز کی مہر ثبت تھی جو صرف شاہی خاندان کے قاصدوں کے پاس ہوتی تھی۔

"تم.... تم یہاں رات بسر کرو گے اے شاہی قاصد یا تمہارے لیے گلے سے فوراً" کوئی پشم دار ٹٹو ڈھونڈ کے لاؤں؟" داروغہ نے ادب و احترام کے ساتھ کہا۔

"میں یہیں رات گزاروں گا اور صبح اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔" میں نے نرم لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا تاکہ اس کی گھبراہٹ ختم ہو۔ مجھے داروغہ کو بوکھلایا ہوا دیکھ کر خیال آیا کہ وہ شاہی قاصدوں سے شاید اس لیے لرزہ براندام رہتے ہوں گے کہ کہیں کوئی شاہی قاصد ان کی شکایت نہ کر دے اور ان کی گردن ماردی جائے۔

"تو پھر تم مہمانوں کے یورت میں قیام کرو! میں ابھی بندوبست کراتا ہوں۔" اس نے کہا اور تیزی کے ساتھ یورت سے باہر نکل گیا۔

ایلغوری منشی بھی خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ اس طرح جیسے میں ان جیسا انسان نہیں بلکہ کوئی اور ہی ہیبت ناک شے ہوں۔ ابھی یام کا داروغہ لوٹ کر نہیں آیا تھا کہ یورت میں ایک دراز ریش چینی داخل ہوا جو

موٹے موٹے لحافوں جیسے روئی سدار لبادوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے ایلغوری منشی کے پاس جا کر اسے مخاطب کیا اور میں چونک اٹھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ چینی، دشت کی کوئی زبان جانتا ہو گا۔ اس نے ایلغوری منشی کو ایلغوری زبان ہی میں مخاطب کیا تھا اور داروغہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ منشی نے اس کی بات کا جواب دے کر قلم اٹھا لیا اور سوالات شروع کر دیے جن کا جواب وہ کاغذ پر لکھتا جا رہا تھا۔ نام پتہ اور دوسرے کوائف کے علاوہ مقصد سفر۔ اس کے علاوہ یہ کہ چینی کے پاس کیا مال و اسباب ہے جو وہ اس راستے سے لے جا رہا ہے! مجھ سے داروغہ یا منشی نے اس طرح کے سوال جواب نہیں کیے تھے۔ اس کا سبب غالباً" وہ شاہی مہر تھی جو ان کے ہر سوال کا جواب تھی۔ شاید کسی کے بارے میں یہ جان لینے کے بعد کہ وہ شاہی قاصد ہے، دوسری کسی بات کے جاننے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ باریش چینی اس وقت تک یورت ہی میں رکا رہا جب تک داروغہ نہ آگیا۔

داروغہ، باریش چینی کو نظر انداز کر کے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "مہمانوں کے لیے مخصوص یورت، اس یورت کے پیچھے ہی ہے۔ وہاں بستر لگا دیا گیا ہے اور اب ملازم تمہارے گھوڑے پر لدا سامان اتار کر اسی یورت میں رکھ رہے ہیں۔ ابھی بس تھوڑی دیر میں تمام انتظام ہوا جاتا ہے۔"

داروغہ مجھے اطلاع دے کر پھر جانے لگا تو میں نے اسے چینی کی طرف متوجہ کیا۔ میرے کہنے پر اس نے چینی کی طرف توجہ دی اور اسے یام میں قیام کی اجازت مل گئی جس کے بعد وہ چینی باہر نکل گیا اور داروغہ بھی۔

کچھ ہی دیر بعد داروغہ واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ میرے گھوڑے کو اصطبل میں باندھ دیا گیا ہے اور تمام سامان مہمانوں کے یورت میں پہنچ چکا ہے، اب میں اس کے ساتھ چل سکتا ہوں۔ میں داروغہ کے یورت سے نکل کر اس کے ہمراہ بائیں جانب عقب میں چلا۔

اس یورت کے دروازے پر، پردہ پڑا ہوا تھا اور پردے کی درزوں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ داروغہ نے پردہ اٹھایا اور میں اندر داخل ہوا۔ میرے ساتھ ہی پیچھے پیچھے وہ بھی اندر آگیا۔ میں اس یورت کی آرائش و زیبائش دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک طرف مشعل روشن تھی۔ دیواروں پر خوب صورت غالیچے لٹکے ہوئے تھے۔ یورت کے درمیان میں ایک بڑی سی انگیٹھی دہک رہی تھی اور ایک جانب بستر بچھا ہوا تھا جس کے قریب میرا تمام سامان سلیقے سے رکھا تھا۔ وہ یورت گرم اور آرام دہ تھا۔

میں نے یورت کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے جسم سے کس کر لپیٹا ہوا کپڑا کھولا اور گرد جھاڑی۔ میری بے احتیاطی اور اناڑی پن کے سبب داروغہ گرد کی لپیٹ میں آگیا مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ میں نے جب بجل نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے دانت نکال دیے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ میری اس حرکت پر وہ مجھے دل ہی دل میں کوس رہا ہو مگر اس نے اظہار نہ ہونے دیا۔

میں بستر پر جا کے بیٹھا ہی تھا کہ یورت کا پردہ اٹھا۔ جیام کے دو ملازم اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے میرے سامنے بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت رکھ دیا اور گھوڑی کے سڑے ہوئے دودھ کی تند و تیز شراب بھی۔ میں نے جی بھر کے گوشت کھایا پھر تھوڑی سی شراب پی۔ داروغہ اور اس کے ملازمین اس دوران میں جا چکے تھے۔ کھا پی کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور چہل قدمی کے لیے یورت سے باہر نکلا تاکہ یام کے دوسرے یورتوں اور ان میں ٹھہرے ہوئے مسافروں کو دیکھ سکوں۔

مہمانوں کے یورت سے نکل کر یام کے دوسرے یورتوں تک جاتے ہوئے میری ذہن میں وہ تمام معلومات تازہ ہو رہی تھیں جو سرقوتنی بیگی کے ایلغوری عالم نے مجھے ان یاموں (سراؤں) کے بارے میں بتائی تھیں۔ مجھے اسی لیے یام کی سیر کا خیال آیا تھا۔

میں نے اس یام میں تقریباً" دو سو گھوڑے دیکھے۔ جہاں داروغہ کا یورت تھا، اس کی دائیں، جانب ایک بڑے یورت میں اصطبل تھا۔ میں وہاں گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں سن کر رکا تھا۔ میں نے ایک اور یورت کچھ فاصلے پر دیکھا۔ یہ یورت سامان ذخیرہ کرنے

ے لیے گودام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں سامان
ہ ردو نوش کے علاوہ ضروریات زندگی کی ہر شے تھی۔
ہ بڑے یورتوں میں مسافر قیام پذیر تھے۔ میں ان میں
ے ایک یورت کی طرف بڑھا۔

اس یورت کے باہر مجھے وہ دراز ریش چینی نظر آیا
ے میں نے داروغہ کے یورت میں دیکھا تھا۔ وہ دو
ایوں کی ایک گاڑی کے قریب کھڑا' اس سے اپنا
سامان اتار رہا تھا۔ گاڑی پر پردہ پڑا ہوا تھا اور اندر
سامان بھرا تھا۔ سامان اتروانے میں چینی کے ملازم
اس کی مدد کر رہے تھے۔ میں اس کے قریب پہنچ کر رکا
تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

"سامان یورت میں پہنچ جائے تو پھر تمہیں عمدہ
چائے پلواؤں گا۔" باریش چینی نے مجھ سے کہا۔

"چائے کیا ہوتی ہے؟" میں نے اس سے سوال
کیا' کیونکہ میں نے کبھی یہ لفظ نہیں سنا تھا۔

"ایک طرح کا لذیز مشروب!" اس نے مسکرا کر
جواب دیا۔ "یہ مشروب گھوڑی کے دودھ سے بھی
زیادہ لذیز ہوتا ہے مگر نشہ نہیں کرتا۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا' اور کچھ
فاصلے پر موجود اس پیلے چہرے والے یہودی اور اس
کے نوکروں کو دلچسپی سے دیکھتا رہا جو چینی کی طرح
گاڑیوں سے اپنا سامان اتار رہے تھے۔ باریش چینی کا
سامان اب اس کے ملازم اٹھا کر یورت میں لے جا
رہے تھے۔ چینی نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھاما اور
مجھے اپنے ہمراہ اندر چلنے کے لیے کہا۔ شاید وہ مجھے اپنا
عجیب مشروب پلا کر وہ احسان اتارنا چاہتا تھا جو میں نے
داروغہ کے یورت میں اس پر کیا تھا۔ میں نے اس کے
ساتھ یورت میں جانے کر کوئی اعتراض نہ کیا۔

باریش چینی کے ملازم یورت میں ایک طرف اس
کا سامان رکھنے لگے یورت کے درمیان چھوٹا سا الاؤ
جل رہا تھا جس کے ارد گرد بہت سے افراد جمع تھے جو
آگ تاپ رہے تھے۔ ان میں زرد فام' چوڑی
ٹھوڑیوں والے ارمنی بھی تھے اور منگول بھی۔ منگول
ہی جو کمبل اوڑھے بیٹھے تھے اور اپنی اطراف بیٹھے
ہوئے لوگوں سے ہنس ہنس کر جانے کیا باتیں کر رہے
تھے۔

چینی کے ملازموں نے بستر لگا دیا تو میں اور وہ بستر پر
بیٹھ گئے۔ چینی نے اپنی زبان میں ملازموں سے کچھ کہا
اور ملازم سامان میں سے مختلف اشیا نکالنے لگے۔ اس
بستر کے قریب ہی ایک اور بستر لگا ہوا تھا جس پر بیٹھا ہوا
شخص اپنے حلیے اور حرکتوں کی وجہ سے مجھے بڑا عجیب
لگا۔

"یہ زرد پگڑی والا کون ہے؟" میں نے آہستہ سے
اپنے چینی شناسا سے پوچھا۔

"لاما۔" چینی نے جواب دیا۔ "تم اسے چھوٹا موٹا
شامان سمجھ سکتے ہو" اس نے مجھے سمجھایا۔

میں نے اطراف میں نظر ڈالی تو مجھے اور بھی بہت
سے عجیب لوگ دکھائی دیے۔ زرد پگڑی والا لاما کے
ہاتھ میں ایک چکر تھا جسے وہ گھما رہا تھا اور اس کی چھوٹی
چھوٹی سرخ پراسرار آنکھیں نہ جانے ایک ہی سمت
کیا دیکھے جا رہی تھیں۔ میرے چینی شناسا نے بتایا کہ
وہ عبادت کر رہا ہے۔

"وہ سیاہ پگڑی والے جو الاؤ کے مشرقی سمت بیٹھے
ہیں بدھ یاتری ہیں۔" باریش چینی مجھے بتا رہا تھا۔

"مگر یہ یاتری یہاں دشت میں کیا کرنے آئے
ہیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ان کا مقصد سیاحت نہیں بلکہ ان راستوں سے
گزرنا ہی ان کے لیے عبادت ہے۔" چینی نے جواب
دیا پھر اپنی بات کی وضاحت میں بولا۔ "یہ ان راستوں
کو مہایانا کے راستے کہتے ہیں کیونکہ اب سے صدیوں
پہلے انہی راستوں پر عظیم گوتم بدھ نے سفر کیا تھا۔"

میں چینی سے مزید کچھ پوچھنے کی بجائے اس کے
ملازموں کی طرف دیکھنے لگا جو کالی کالی ٹکیاں توڑ کر آگ
پر رکھے ہوئے ایک برتن میں ڈال رہے تھے۔ چینی
نے مجھے ادھر دیکھتے پا کر بتایا کہ وہ چائے کی ٹکیاں ہیں
اور اس کے ملازمین چائے بنا رہے ہیں۔

چینی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مشروب لذیز ہو گا مگر
اس کا گھونٹ پیتے ہی میرے منہ میں کڑواہٹ بھر گئی۔
میں نے بہت مشکل سے وہ کڑوا مشروب حلق سے نیچے
اتارا اور برتن رکھ دیا۔ عجیب واہیات مشروب تھا جسے

اس نے گھوڑی کے دودھ سے زیادہ لذیز بتایا تھا۔ میں یہ کہہ کر اس چینی کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا اور وہ مشروب بھی نہیں پینا چاہتا تھا' اس لیے میں چونکا جیسے مجھے کوئی بات یاد آگئی ہو۔

"مجھے داروغہ سے ایک ضروری بات کرنی تھی میں چلتا ہوں۔ وہ کہیں سو نہ جائے۔" میں نے چینی کی طرف رخ کر کے کہا۔

میری پشت اور چینی کا منہ دروازے کی طرف تھا۔ اس نے کہا "لو وہ داروغہ تو اسی یورت میں آرہا ہے۔ جا کر بات کرلو!"

میں نے مڑ کر دیکھا تو داروغہ مجھے بھی نظر آگیا جو کافی فاصلے پر کھڑا دروازے میں داخل ہو کر متجسس نظر سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا میں نے پلٹ کر چینی سے کہا۔ "مجھے اس سے خلوت میں کچھ کہنا ہے۔"

چینی عجیب سے انداز میں مسکرایا شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس سے جان چھڑانا چاہتا ہوں اور مجھے اس کا مشروب پسند نہیں آیا۔ وہ بولا "چائے اگر اچھی نہیں لگی تو کوئی بات نہیں' نہ پیو مگر کچھ دیر تو بیٹھو! داروغہ ابھی نہیں سوئے گا۔"

مجھے اس مہمان نواز چینی کی بات ماننی ہی پڑی کیونکہ مجھے اس کے مشروب سے نجات مل گئی تھی جسے وہ بڑے مزے لے لے کر پی رہا تھا۔ میں کچھ دیر بیٹھا اس سے عجیب عجیب مسافروں کی باتیں سنتا رہا اور انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ ان مسافروں میں جو یورت کے اندر موجود تھے۔ ایلغوری حکما بھی تھے جو مخملیں سمور کی اونچی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور اپنے کاندھوں پر زرد لبادے ڈالے ہوئے تھے ان میں ننگے پاؤں سفر کرنے والے جوگی بھی تھے اور دنیا سے غافل لمبے بالوں والے فقیر بھی۔ گفتگو کے دوران میں ایک بھورے لبادے والا نسطوری پادری بھی ہمارے پاس آبیٹھا۔ جب کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلا گیا تو چینی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ان نسطوری پادریوں کو بس جادو ٹونے ہی آتے ہیں کیونکہ وہ نسطوری پادری جتنی دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا تھا' اس نے جادو ٹونوں کے علاوہ کسی موضوع پر بہت کم ہی بات کی تھی۔ چینی نے بتایا کہ ان نسطوری پادریوں کو اپنی مقدس کتاب انجیل کے محض چند فقرے یاد ہوتے ہیں اور یہ ٹھیک طرح سے عبادت کے طریقے بھی نہیں جانتے مگر عیسائیت کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں میں نے چینی کی رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کچھ دیر بعد ہی میں نے اس سے اجازت چاہی کیونکہ دن بھر کی مسافت نے مجھے تھکا دیا تھا اور اب میں یورت میں جا کر آرام کرنا چاہتا تھا۔

میں مسافروں کے یورت سے نکل کر مہمانوں کے یورت کی طرف چلا۔ یورت کے قریب پہنچ کر میں نے داروغہ کی آواز سنی اور ٹھٹھک کر رک گیا۔ داروغہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ "جلدی کرو! وہ لوٹ کر بھی آسکتا ہے۔ یرلیغ (فرمان) اس کے سامان ہی میں ہوگا۔ اس تھیلے کو کھولو۔ جلدی!"

میں چکرا کر رہ گیا۔ آخر داروغہ میرے سامان میں وہ یرلیغ کیوں ڈھونڈ رہا ہے جو سرقوشنی بیگی نے باتو خان کو لکھایا ہے اور یورت میں دوسرا کون ہے! میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ ایک طرف تو یہ عزت و احترام کہ دوسرے مسافروں کی طرح میرے سفر کا مقصد اور نام پتا نہیں پوچھا گیا تھا اور دوسری طرف اتنی ہمت کہ میرے سامان کی تلاشی لی جارہی تھی۔ آخر یہ راز کیا ہے! داروغہ غالباً میری ہی تلاش میں مسافروں کے یورت تک گیا تھا تاکہ میری طرف سے مطمئن ہو کر وہ اطمینان سے اپنا کام کرسکے۔

"یہ رہا یرلیغ" میں نے یورت کے اندر ایک آواز سنی اور اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ داروغہ کے ایلغوری منشی کی آواز تھی۔

"لاؤ مجھے دو!" داروغہ کی آواز ابھری اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میری نظر میں یرلیغ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ یوں بھی مجھے مغربی دشت تک پہنچ کر پھاڑ دینا تھا لیکن اس یرلیغ سے داروغہ کی دلچسپی میرے لیے معنی خیز تھی۔ معاً میں چونک اٹھا۔ میں نے اپنے عقب میں گھوڑا دوڑنے کی آواز سنی تھی جو قریب آتی جارہی تھی۔

"لو اسے وہیں رکھ دو جہاں سے نکالا تھا' کوئی مسافر آرہا ہے۔ یورت کے اندر سے داروغہ کی آواز ابھری پھر اس کے قدموں کی چاپ گونجی۔ اس نے بھی شاید گھوڑا دوڑنے کی آواز سن لی تھی اور اب وہ یورت کے دروازے کی جانب آرہا تھا۔

اب میرا باہر رکنا فضول تھا اور میں داروغہ کی خبر لینا چاہتا تھا۔

میں نے یورت کے دروازے کی جانب قدم اٹھائے۔ اس دوران میں وہ گھوڑ سوار قریب آگیا مگر میں نے اس کی جانب نہیں دیکھا۔

"بوغا!" ایک بھاری آواز نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ دیا اور میں اچھل پڑا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ بغورچی شامان گھوڑے سے اتر رہا تھا۔ میرے پاؤں جیسے کسی نے زنجیریں ڈال دیں اور میں وہیں رک گیا یہ بات خطرے سے خالی نہیں تھی کہ بغورچی شامان میرا تعاقب کرتا ہوا یہاں بھی پہنچ گیا تھا۔

ابھی میں حیرت کی حصار میں تھا کہ وہ گھوڑے سے اتر کر میرے پاس پہنچ گیا اور اسی وقت یورت کے دروازے پر داروغہ کی صورت نظر آئی۔

"شامان بغورچی!" داروغہ حیرت اور خوشی سے چیخا جس سے میں نے جانا کہ شامان بغورچی اور داروغہ پہلے سے شناسا ہیں۔ "آؤ' آؤ' یورت میں آؤ مقدس شامان!" داروغہ بولا۔

"بہت اچھا کیا۔" داروغہ پر مسرت لہجے میں بولا اور پھر کہا۔ "تم مقدس شامان! کیا تم شاہی قاصد کو بھی جانتے ہو؟ میں ان کے یورت میں اس لیے آیا تھا کہ پوچھ لوں' کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"شامان بغورچی سے کون چھپا ہے اور وہ کسے نہیں جانتا!"

بغورچی نے گردن اکڑا کر تمکنت سے بولا پھر مسکرا کر کہا۔ "کیا تم مجھے بھیڑ کا ابلا ہوا گوشت اور گھوڑی کا دودھ نہیں پلاؤ گے؟"

"میں ابھی تمہارے کھانے اور بستر وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں۔

تم میرے یورت میں رہو تو یہ میرے لیے فخر کی بات ہوگی مقدس شامان!" یہ کہہ کر وہ اپنے قریب کھڑے ہوئے ایلغوری منشی سے بولا۔

"تم گودام کے یورت سے بستر وغیرہ نکلوا کر لاؤ اور میں مقدس شامان کے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔

"نہیں میں تمہارے یورت میں نہیں' یہیں بوغا کے پاس رہوں گا۔ میرا بستر بھی یہی لگوا دو!"

"جیسی تمہاری مرضی مقدس شامان"۔ داروغہ بولا۔

داروغہ اور ایلغوری منشی یورت سے باہر نکل گئے تو بغورچی نے مجھے گھور کر دیکھا اور میرے بستر پر بیٹھ گیا۔ میں اس کی سامنے کسی مجرم کی طرح کھڑا تھا کیونکہ میں اسکی پراسرار قوتوں سے ڈرتا تھا۔ مجھے اس طرح کھڑا دیکھ کر اس نے نظر اٹھائی اور بولا۔ "بیٹھ جا"۔

میں اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں اس کا سامنا کروں۔

"تو سمجھ رہا تھا کہ مجھے دھوکا دے کر نکل گیا۔" پھر دیکھ لے کہ میں تجھ تک آپہنچا اور میں نے تجھے آدبوچا۔" وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

"میں نے..... میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا مقدس شامان!" میں نے بمشکل کہا۔ "میں تو خود اپنی جان بچاتا پھر رہا ہوں۔"

"تو کیا تو سمجھتا ہے کہ اسطرح تیری جان بچ جائے گی؟" وہ یہ کہہ کر کریہہ انداز میں ہنسا۔ "تیری جان میری مٹھی میں ہے' میری مٹھی میں سمجھا۔"

"میں نے آخر تیرا کیا بگاڑا ہے مقدس شامان! جو تو میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔" میں نے ہمت کر کے احتجاج کیا۔

"تو دھوکے باز ہے' تو نے مجھے دھوکا دیا ہے۔" وہ برہمی سے بولا؟ تجھے خبر ہے کہ تیری وجہ سے میں رات بھر بورخان قالدون کے غاروں میں بھٹکتا رہا اور تجھے ڈھونڈتا رہا صبح کے قریب جب مجھے یقین ہو گیا کہ تو وہاں نہیں ہے تو میں نے نیلے جاودانی آسمان سے مدد چاہی اور آسمان کی سرگوشیاں سنیں۔ میں نے جان

لیا کہ تو کہاں ہے اور کہاں کس لیے جا رہا ہے!" یہ کہہ کر اس نے مجھے گھورا۔

اس کی باتیں سن کر میری سٹی گم ہو گئی۔ اسے اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے نہ جانے کیا کیا معلوم ہو گیا تھا ابھی میں کچھ نہ کہہ پایا تھا کہ یورت کے باہر قدموں کی آواز ابھری اور پھر داروغہ اپنے ملازموں کے ساتھ نظر آیا جو کھانا لے کر آ رہے تھے۔

کھانے کے دوران میں بغورچی، داروغہ سے باتیں کرتا رہا اور میں خاموشی سے بیٹھا رہا، جب بغورچی نے گھوڑی کا دودھ پی کر برتن نیچے رکھ دیا تو مجھ سے بولا۔ "آؤ کچھ دیر باہر ٹہل آئیں۔"

"اے مقدس شامان! میں بہت تھکا ہوا ہوں اور اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اس سے جان چھڑانے کے لیے کہا تھا تاکہ اس سے مفر حاصل کرنے کے لیے کچھ سوچ سکوں مگر مفر کہاں!

"چلو!" کا لہجہ حکمیہ تھا۔ مجبوراً مجھے اس کے ساتھ اٹھنا پڑا۔

وہ مجھے یام کے یورتوں سے دور لے گیا مجھے سردی لگنے لگی اور میرا جسم کانپنے لگا مگر بغورچی پر سردی کا کوئی اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔

"میں ٹھنڈ سے اکڑ جاؤں گا مقدس شامان!" میں نے کانپتی آواز سے ایک جگہ رک کر کہا۔

"لیکن یہ اس سے بہتر ہے کہ تو ہلاک کر دیا جائے۔" اس نے دھمکی آمیز لہجے میں جواب دیا پھر خود ہی رک کر بولا۔ "سن! میں تجھے اس لیے باہر لایا ہوں کہ تیرے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ تو خطرے کی حدود سے باہر آ گیا ہے۔ میرے ایک اشارے پر تجھے باندھ کر دوبارہ قراقرم بھیجا جا سکتا ہے۔" میں اس کی بات نہ سمجھ پایا اور اس کا احساس اسے بھی ہو گیا۔ وہ چند لمحے رک کر پھر بولا۔ "تجھے معلوم ہے کہ اس یام کے داروغہ کے پاس ریچھ کی شبیہہ والی لوح ہے؟"

"نہیں مجھے نہیں معلوم! اور نہ میں جانتا ہوں کہ اس لوح کا اس کے پاس ہونا کیا معنی رکھتا ہے!" میں نے اعتراف کیا۔

"ہاں تو نہیں جانتا، مگر بغورچی جانتا ہے۔ سن! اس لوح کی رو سے داروغہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ شاہی خاندان کے افراد کو چھوڑ کر کسی بھی شخص کو گرفتار کر سکتا ہے اور یہ لوح بہت کم داروغاؤں کے پاس ہوتی ہے۔ یہ صرف ان داروغاؤں کے پاس ہوتی ہے۔ جو براہ راست خاقان سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں اور جو خاقان کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔"

بغورچی کی بات سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا کہ میں ابھی خطرے کی حدود سے نہیں نکلا۔ بغورچی کی بات سے میری سمجھ میں وہ راز بھی آ گیا جو مجھے حیران کیے ہوئے تھا۔ داروغہ کا میرے سامان کی تلاشی لے کر ریلوے پڑھنا، بغورچی کے بیان کی تائید کر رہا تھا۔ اگر بغورچی داروغہ کو یہ بتا دیتا کہ میں ایک مفرور قیدی ہوں تو میری زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ ایک ایسا خطرہ جسے کسی طرح نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ بغورچی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میری جان اس کی مٹھی میں ہے۔

"تو آخر مجھ سے چاہتا کیا ہے مقدس شامان!" ان خطرناک حالات میں سوائے اس جملے کے میں کچھ اور نہ کہہ سکا۔ اب سردی کے احساس پر خوف کا احساس غالب آ گیا تھا اور میری رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔

"تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تو ایک مفرور مجرم ہے اور سپاہی تجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ سوچ کہ میں نے انہیں غلط راہ پر ڈال کر تیری جان کیوں بچائی تھی؟"

سولدہ! میرے ذہن میں ایک لفظ گونجا۔ ہاں اس نے سولدہ ہی کو قابو کرنے کے لیے میری زندگی بچائی تھی۔

"چپ کیوں ہے، بولتا کیوں نہیں؟ کیا میں نے تیری جان نہیں بچائی؟" میں نے اس کا سوال سن کر اثبات میں گردن ہلائی۔ وہ پھر بولا۔

"اب بھی میں تیری جان بچا سکتا ہوں، اگر تو میری بات مان لے!

سن! میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ سولدہ کو ہر قیمت پر قابو
کروں گا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تو وہیں رہے
جہاں وہ اکثر منڈلاتی ہے۔"

"مگر..... مگر میں..... میں وہاں واپس گیا تو پکڑا
جاؤں گا۔" میں اس کا مطلب سمجھ کر جلدی سے بولا۔
"مجھے واپس بور خان قالدون تک لے جانا چاہتا تھا۔

"پر یہاں بھی تو کون سا بچ سکتا ہے۔" وہ معنی خیز
لہجے میں بولا۔

"تیرے لیے صرف دو راستے ہیں' یا تو مرنے کے
لیے تیار ہو جا یا میری بات مان لے۔ میری بات مان
لے گا تو پھر یہ میری ذمے داری ہے کہ تجھے زندہ
رکھوں۔"

میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ کوئی راہ مفر نہیں
تھی۔ اگر موت اور زندگی میں سے کسی ایک کا انتخاب
مقصود ہو تو ظاہر ہے آدمی زندگی کا ہی انتخاب کرے گا
اور یہی میں نے کیا۔ میں نے بغورچی کی بات مان لی کہ
اس کے سوا دوسرا اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ نہ
جانے کیوں مجھے یقین سا تھا کہ بغورچی اپنی پراسرار
قوتوں کی باوجود سولدہ کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔ شاید
اس کا سبب یہ ہو کہ میں ایک بار بغورچی کو اس کے
سامنے مجبور دیکھ چکا تھا۔ سولدہ اپنا سامان لے کر غائب
ہو گئی تھی مگر بغورچی اسے نہ روک پایا تھا۔ میں سوچ
رہا تھا کہ نہ جانے وہ کہاں ہوگی! اس کی بھی تو دشمن
لگے ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے مقدس شامان! میں تیرے ساتھ چلنے
کو تیار ہوں۔ مجھے تجھ پر اعتماد ہے کہ تو میری زندگی بچا
لے گا اور مجھے دوبارہ موت کے منہ میں نہ جانے دے
گا۔" میں کچھ سوچ رہا تھا کہ شاید واقعی سولدہ' بور خان
یا ان پر آکر مجھے بغورچی کے چنگل سے نکال لے یا
کم از کم ایک بار پھر خود اسے دھوکا دے کر نکلنے کا موقع مل
جائے۔

"بچ لے بوغا! اگر اب کے تو نے مجھے دھوکا دیا تو تو
مارا جائے گا۔" بغورچی نے آخری بار دھمکی دی پھر
بولا۔ "ہم صبح ہوتے ہی قراقرم کی طرف روانہ
ہو جائیں گے۔"

اس کے بعد ہم نے یورت کی طرف واپسی کا سفر
شروع کیا۔ بغورچی نے میرے سارے منصوبے
خاک میں ملا دیئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں باتو
خاں تک سرقوشنی بیگی کا پیغام نہ پہنچا سکا تو کیا ہوگا! کیا
باتو خاں غفلت میں مارا جائے گا اور قوبوق کے قبضے
میں مغربی دشت بھی جائے گا۔

قوبوق جس سے مجھے نفرت ہو چکی تھی کیونکہ اسی
کی حکم پر چھوٹی ماں فاطمہ اور میری حقیقی ماں کی جان لی
گئی تھی۔ میں نے جان پر کھیل کر اور انتہائی کرب
سے گزر کر سرقوشنی بیگم کا اعتماد حاصل کیا تھا۔ اگر میں
باتو خاں کو قوبوق کے متوقع حملے سے باخبر نہ کر سکا تو مجھ
پر سرقوشنی بیگی کا اعتماد ختم ہو جائے گا اور پھر میں کبھی
ان کے درمیان رہ کر نفاق کے بیج نہ بو سکوں گا۔ یہ تمام
باتیں ایک طرف تھیں اور دوسری طرف جان کی
سلامتی درپیش تھی سو میں یہ مجبوری اسی کو ترجیح دے
رہا تھا۔

میں انہی خیالوں میں غرق' بغورچی کے پیچھے پیچھے
چلا جا رہا تھا کہ مجھے ٹھوکر لگی اور میں گرتے گرتے
بچا۔" میرے منہ سے ہلکی سے کراہ بھی نکلی۔ میرے
دائیں پیر کا انگوٹھا مڑ گیا تھا۔

بغورچی نے پلٹ کر پوچھا۔ "کیا ہوا بوغا!"

"ایک پتھر سے پاؤں ٹکرا گیا تھا۔" میں نے جواب
دیا اور جھک کر انگوٹھا ملنے لگا۔

اس کی بجائے ہمدردی کا اظہار کرتا' اس نے سخت
لہجے میں کہا "جلدی آ! مجھے رام بھی کرنا ہے۔" یہ
کہہ کر وہ مڑا اور آگے قدم بڑھائے اور اسی لمحے
میرے ہاتھ کی انگلیاں اس پتھر سے مس ہوئی جس
سے میرا پاؤں ٹکرایا تھا۔

میرے ذہن میں ایک ہولناک خیال آیا۔ ذرا سی
ہمت میرا مسئلہ حل کر سکتی تھی۔ یوں بھی اطراف میں
اندھیرا اور سناٹا تھا۔ میں سیدھا کھڑا ہو گیا مگر اب وہ پتھر
بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے چند قدم آگے بغورچی کا
ہیولا حرکت کرتا نظر آ رہا تھا۔ میں تیز قدم اٹھاتا
بغورچی کے پیچھے پہنچ گیا۔

پھر جو کچھ ہوا خود میرے لیے بھی حیرت انگیز تھا۔

نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سی آگئی کہ بغورچی کی پراسرار قوتوں سے خوفزدہ ہونے کے باوجود میں نے اپنا ہاتھ میں تھاما بھاری پتھر اس کے سر پر دے مارا بغورچی کا جسم ریت کے کسی تودے کی طرح ڈھے گیا۔ اس کے منہ سے چیخ بھی نہ نکل پائی اور یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا تھا۔

جو ہوا تھا' وہ میرے لیے غیر متوقع تھا میں نے کچھ دیر پہلے تک یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ صورت حال یوں اچانک بدل جائے گی اور مجھے فوراً" فرار ہونا پڑے گا مگر اب وقت ضائع کرنا خطرناک تھا میں وہاں یہ دیکھنے نہیں ٹھہرا کہ بغورچی کا کیا حشر ہوا! وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا! میں تیزی کے ساتھ' داروغہ کے یورت کی طرف بڑھا' اسکے علم میں یہ لانا ضروری تھا کہ میں اسی وقت بام چھوڑ کر جا رہا ہوں' کیونکہ اس کے بغیر مجھے اپنا گھوڑا نہیں مل سکتا تھا جو اصطبل پہنچ چکا تھا۔ جو یورت اصطبل کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں پہلے ہی دو پہرے داروں کو دیکھ چکا تھا۔ مجھے بہرحال داروغہ سے ملنے کا خطرہ مول لینا ہی تھا۔

میں اس کے یورت میں داخل ہوا تو دیکھا کہ قریب قریب دو بستر لگے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر داروغہ دراز تھا اور دوسرے پر بلغوری منشی۔ مجھے یورت میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی داروغہ اٹھ بیٹھا تھا کیونکہ ابھی وہ جاگ رہا تھا۔ مجھے اس کی صورت دیکھ کر غصہ آیا تھا مگر یہ وقت اس سے الجھنے کا نہیں تھا۔ اس کے پاس بغورچی کی اطلاع کے مطابق ریچھ کی لوح تھی اور جو خاقان کا جاسوس تھا۔

"شامان بغورچی کہاں ہے؟" اس نے میرے کچھ کہنے سے پہلے اور اپنے یورت میں میرے آنے کی وجہ پوچھے بغیر سوال کیا۔

"شامان!" میں اس غیر متوقع سوال پر گڑبڑا گیا پھر مجھے ایک بہانہ سوجھ گیا۔ میں بولا "وہ مونگ کے تینگری کی سرگوشیاں سننے کے لیے باہر ہی رک گیا ہے۔"

"ہاں وہ۔۔۔ وہ ایسا ہی ہے۔" داروغہ مرعوب کن لہجے میں بولا پھر اسے میرا خیال آہی گیا کہ میں اس کے یورت میں کیوں آیا ہوں اس نے پوچھا "اے معزز شاہی قاصد! کیا تمہیں کچھ چاہیے؟"

"ہاں' گھوڑا" میں نے کہا۔ مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

"کیا تم اسی وقت آگے کے لیے روانہ ہو رہے ہو؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں' جلدی اٹھو اور گھوڑے پر زین کسواؤ' میں جب تک یورت میں جا کر سامان باندھتا ہوں۔" میں نے یورت کے در کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے کہا تاکہ مزید سوال جواب سے بچ سکوں۔ داروغہ گومگو کے عالم میں اٹھا اور میرے پیچھے چل دیا۔ اپنے یورت سے باہر نکل کر وہ دائیں جانب مڑ گیا اور میں بغیر کچھ کہے بائیں جانب چل دیا۔

میں نے یورت میں پہنچ کر جلدی جلدی سامان اکٹھا کیا۔ میرے بستر کے قریب ہی ایک اور بستر بچھا ہوا تھا جو غالباً" بغورچی کی لیے بچھایا گیا تھا۔ داروغہ کو آنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے آکر بتایا کہ گھوڑا یورت کے باہر تیار کھڑا ہے۔ اس نے سامان اٹھوانے میں میری مدد کی۔ میں نے یورت سے نکلتے ہوئے' اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی کمان اسے پکڑا دی اور جسم کے اوپرے حصے پر کس کر چادر لپیٹ لی تاکہ ہوا سے بچ سکوں۔

یورت سے نکل کر میں گھوڑے پر بقیہ سامان بھی ٹھیک طرح سے باندھ لیا جو آخرے پھیرے میں' داروغہ اور میں یورت سے لے کر نکلے تھے۔ داروغہ کو میں نے اتنی مہلت ہی نہ دی تھی کہ وہ سامان اٹھوانے کے لیے اپنے ملازمین کو بلا سکتا۔

کچھ دیر بعد ہی میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ داروغہ نے مجھے حیرت سے گھوڑے پر سوار ہوتے دیکھا تھا مگر میں نے اس سے مزید کچھ کہنے سنے بغیر گھوڑے کو ایڑی لگا دی تھی۔ اسے بہرحال یہ اختیار تو نہیں تھا کہ ایک شاہی قاصد سے کچھ پوچھ سکے یا اسے روک سکے مگر میری غیر متوقع اور اچانک روانگی نے اسے الجھن میں ضرور ڈال دیا تھا جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

رات بھر میں تیز رفتاری سے سفر کرتا رہا۔ راستے میں ایک یام بھی پڑا مگر میں وہاں نہ رک کر آگے بڑھتا رہا۔ صبح سے پہلے میں کہیں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ حالانکہ شب سے زیادہ سفر کرکے میں تھکن محسوس کر رہا تھا سفر کرتے کرتے ہی جھٹپٹا ہوا، صبح ہوئی اور سورج کی گرم اور مہربان کرنیں سردی کو ختم کرنے لگیں۔ میں نے دور دور تک نظر دوڑائی مگر کوئی یام دکھائی نہ دیا۔ مجھے صبح ہونے کے باوجود مجبوراً سفر جاری رکھنا پڑا۔ دوپہر سے کچھ پہلے میں ایک یام تک پہنچ سکا۔ میرا گھوڑا بھی اب کافی تھک چکا تھا۔

میں اس یام کے داروغہ سی ملا، اسے اپنی شناخت کرانے کے لیے لوح دکھائی اور اسے بتایا کہ میں کچھ دیر آرام کرکے دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔ میں نے اسے ایک تازہ دم گھوڑا فراہم کرنے کے لیے بھی کہا۔ حسب توقع وہاں میری آؤ بھگت ہوئی۔ میں نے کھانا کھایا اور بستر پر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی تھکن اور نیند سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں تو میں اٹھ بیٹھا۔ مجھے ابھی نہیں سونا چاہیے تھا کہ اسی میں میری جیت تھی۔ میں جتنا خطرے سے دور ہو سکتا تھا۔ میرے لیے اتنا ہی بہتر تھا، بغورچی میرے لیے خطرہ ہی تو بن چکا تھا۔

داروغہ نے جب ایک تازہ دم گھوڑے پر میرا سامان بندھوا دیا تو پورت میں آکر مجھے اطلاع دی "گھوڑا بالکل تیار ہے اے معزز شاہی قاصد! تم اب جب چاہو روانہ ہو سکتے ہو۔"

میں اس کی بات سن کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے جسم کے بالائی حصے پر حسب معمول کس کر کپڑا لپیٹ لیا۔ داروغہ احتراماً مجھے پورت کے باہر تک چھوڑنی آیا۔ وہ دن بھر کا سفر میرے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔ نیند کے دباؤ سے بار بار میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں، کیونکہ میں گزشتہ دو رات نہیں سو سکا تھا۔ رات ہونے سے پہلے ہی راستے میں جو پہلا یام نظر پڑا میں وہیں رک گیا حالانکہ ابھی سورج موجود تھا اور اندھیرا نہیں پھیلا تھا۔ میں اس خیال سے بھی اس یام میں ٹھہر گیا کہ کیا خبر اب اور کتنا سفر کرنے کے بعد کوئی دوسرا یام آئے۔

میں نے کب داروغہ سے بات کی، کب کھانا کھایا اور کب بستر پر لیٹ کر غافل ہو گیا، مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں۔ جب میں دوسرے دن سو کر اٹھا تو خوب دھوپ پھیل چکی تھی۔

دن بھر سفر اور رات کو کسی یام میں آرام! تیسرے چاند تک میں ایسے ہی شب و روز سے گزرا۔ میں اس دوران میں التائی کے دروں سے ہو کر میدان پہنچا پھر ایک بیری بیر کے تائیگا (گھنے جنگل) سے گزرا۔ اپنے سفر کے آخری حصے میں یورال کی نیچے چوٹیوں کے اوپر سے ہو کر میں مغربی دشت میں اتر گیا اور یہاں پہنچ کر میں نے پیغام پھاڑ دیا جو صرف دکھاوا تھا۔ جس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پیغام پھاڑتے ہوئے مجھے سرقوشنی بیگی یاد آئی اور خاقان قویوق کا وہ جاسوس بھی جس نے یہ پیغام پڑھا تھا۔ مجھے سرقوشنی بیگی کی دوراندیشی کا قائل ہونا پڑا۔ قویوق کے جاسوس نے اس تک یقیناً یہ اطلاع پہنچا دی ہوگی کہ سرقوشنی بیگی نے باتو خاں کو کیا پیغام بھیجا ہے! اس طرح قیوق کی نظر میں سرقوشنی بیگی کی وفاداری مسلم ہو جاتی تھی جبکہ معاملہ برعکس تھا۔ اس چالاک عورت نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ ایک طرف تو ایسا پیغام لکھا کر مجھے مشکوک نہ ہونے دیا تھا اور دوسری طرف قویوق کو اپنی وفاداری کا یقین دلا دیا تھا۔

مجھے ایلغوری عالم نے بتایا تھا کہ دریائے وولگا کے کنارے باتو خاں نے ایک شہر آباد کیا ہے جو قراقرم کی طرح یورتوں پر مشتمل ہے۔ ایلغوری عالم نے کہا تھا کہ اس شہر کا نام "سرائے باتو" ہے اور اس کی فصلیں کچی ہیں جن کے اندر یورت نصب ہیں باتو خان مجھے وہیں ملے گا۔ میرے گھوڑے کا رخ اب سرائے باتو ہی کی طرف تھا۔

میں سفر کے ابتدائی مرحلے میں تو کچھ دن شامان بغورچی کی طرف سے خوفزدہ بھی رہا لیکن جب کچھ دن گزر گئے اور شامان بغورچی مجھ تک نہ پہنچ سکا تو میں مطمئن ہو گیا باقی سفر میں نے بغیر کسی خوف کے طے کیا تھا۔ "سرائے باتو" مجھے دور ہی سے نظر

آنے لگا تھا۔ اس شہر کی کچی فصیلیں دن کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

میں شہر میں داخل ہوا' دو یورتوں کے درمیان بنے ہوئے ایک راستے سے آگے بڑھا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب سا ہوا کہ شہر میں کوئی جوان یا کوئی سپاہی نظر نہیں آرہا تھا۔ بوڑھے تھے' عورتیں تھیں بچے تھے میں نے ایک یورت کے باہر بیٹھے ہوئے بوڑھے کے قریب اپنا گھوڑا روک لیا تاکہ اس سے باتو خاں کے یورت کا پتہ پوچھ سکوں۔ یہ بوڑھا مجھے صورت سے منگول نظر آیا تھا۔

"اے سرائے باتو کے معزز منگول! کیا تو مجھے سائیں خاں کے یورت کا پتا بتائے گا؟" میں نے گھوڑے سے اترے بغیر با آواز بلند بوڑھے کو مخاطب کیا۔

"کیا تو بہت دور دراز کا سفر طے کر کے آرہا ہے؟" تیرے کپڑوں پر گرد جمی ہوئی ہے۔" بوڑھے منگول نے نظر اٹھا کر میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھا۔

"ہاں میں عظیم خاقان کے آبائی گھر سے آرہا ہوں' قراقرم سے"۔ میں نے جواب دیا۔

"کیا تو وہاں سے سائیں خاں کے نام کوئی یرلیغ (فرمان) لایا ہے؟" بوڑھے پھر سوال کیا اور مجھے بوڑھے کے متجسس مزاج سے الجھن ہونے لگی۔

"ہاں! لیکن اب میں تجھے مزید کچھ نہیں بتاؤں گا! اگر تو مجھے سائیں خاں کے یورت کا پتا بتا سکتا ہے تو ٹھیک ورنہ میں کسی اور سے پوچھ لوں گا۔" میں کسی قدر سخت آواز میں کہا۔

بوڑھا میری بات سن کر کچھ سٹپٹا گیا اور شاید اسے پہلی بار میری اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ نرم آواز میں بولا "اے معزز قاصد! سائیں خاں یہاں نہیں ہے۔"

بوڑھے کے چپ ہوتے ہی میں پھر جلدی سے سوال کیا "وہ مجھے کہاں مل سکے گا؟"

"وہ اپنے پورے اردو (لشکر) کے ساتھ دریائے وولگا کے جنوب میں تقریباً "نصف منزل دور شکار کھیل رہا ہے اور اس کی سواری یہاں سے آج صبح ہی روانہ

ہوئی ہے۔" بوڑھے نے بتایا اور میری سمجھ میں آ
کہ شہر میں جوان اور سپاہی کیوں نظر نہیں آرہے!
ان حالات میں باتو خاں سے میرا فوراً "ملنا انتہا
ضروری ہو گیا تھا کیونکہ مجھے علم تھا کہ شکار کھیلنے
مطلب کیا ہے! بوڑھے کی بات نے مجھے الجھن میں
ڈال دیا تھا۔ میں نے بوڑھے سے دریافت کیا "کیا کو
ایسا ہے جو وہاں تک میری رہنمائی کر سکے؟"
"میں بہت بوڑھا ہوں۔ تو کسی اور کو ساتھ
لے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔
میں نے رہنمائی سہولت کی خاطر چاہی تھی ور
میں خود بھی وہاں تک پہنچ سکتا تھا میں نے اپنا گھو
موڑتے ہوئے بوڑھے سے کہا "میں خود وہاں تک
جا سکتا ہوں۔ تیری طرح دوسرے بھی تو بوڑھے
نظر آرہے ہیں۔"
سرائے باتو سے نکل کر میں نے گھوڑا دریا
کنارے ڈال دیا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی اور میں را
ہونے سے قبل شکار گاہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ہزا
لاکھوں کا اردو مجھے دور ہی سے نظر آسکتا تھا۔ یہ مو
گرما تھا اس لیے دریا جما ہوا نہیں تھا اور اس کی
تیز لہریں کناروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ دریا
کنارے تقریباً "چوتھائی منزل طے کر کے میں
جنوب کا رخ کیا جدھر پہاڑیوں کے ہیولے نظر آر
تھی میرے اندازے کے مطابق پہاڑیوں کی دو سر
جانب باتو خاں اور اس کا اردو موجود تھا لیکن وہ پہاڑ
بھی ابھی کافی فاصلے پر تھیں۔ منگولوں کے شکار کا
میری آنکھوں میں گھومنے لگا۔ کیونکہ میں ایک بار
بھی چنکائی کے ایما پر شکار میں شریک ہوا تھا
چنکائی جس کے بارے میں اب مجھے علم ہو چکا تھا
میرا باپ نہیں ہے منگولوں کا شکار ایک طرح سے
کی وحشت و بربریت کی زندہ مثال تھا۔ وہ جس
جانوروں کو گھیر کر شکار کرتے تھے بالکل اسی طر
انسانوں کا شکار کھیلتے تھے۔ جب پہلی بار میں نے
میں شرکت کی تھی تو میری عمر چودہ سال تھی۔
انکے شکار کا طریقہ انتہائی بے رحمانہ لگا اس کے بعد
کبھی میں شکار میں شریک نہ ہوا۔

شکار ان کے لیے کسی باقاعدہ یورش یا حملے سے کم نہیں ہوتا تھا کہ اس میں بجائے انسانوں کے جانوروں سے مقابلہ کیا جاتا۔ شکار میں ان کا پورا اردو حصہ لیتا تھا شکار کے قاعدے خود چنگیز خان نے مرتب کیے تھے اس لیے اٹل تھے۔

باتو خاں کا اپنے اردو کے ساتھ شکار کھیلنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ خاقان قویوق کی طرف غافل ہے۔ وہ اسی لیے تو تین چار ماہ شکار میں گزار رہا تھا۔ اگر سرقوشنی بیگی نے مجھے اسے ہوشیار کرنے کے لیے نہ بھیجا ہوتا تو خاقان قویوق غفلت میں اسے آدبوچتا۔ یہ سوچ کر مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہوا اور میں نے اپنے گھوڑے کو مزید تیز دوڑانا شروع کر دیا۔

پہاڑیوں کو ایک جانب چھوڑ کر میں جیسے ہی میدان میں پہنچا مجھے ڈوبتے سورج کی روشنی میں دور تک ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کا اردو پھیلا ہوا نظر آیا۔ ایک جانب کافی فاصلے پر مجھے کچھ یورت نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنا گھوڑا انہی کی جانب دوڑا دیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ یورت باتو خاں کے لیے نصب کیے گئے ہوں گے۔ وہ بھی تو خود کو خاقان قویوق کا ہم رتبہ سمجھتا تھا اور مغربی دشت کے معاملات میں خاقان قویوق کی بالادستی قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ایک طرح سے باتو خاں۔ اس اردو کا خاقان تھا اور شکار میں اس کی حیثیت خاقان جیسی ہی تھی۔

میں نے ان یورتوں میں سے' سب سے بڑے یورت کی طرف گھوڑے کو موڑا کیوں کہ وہی یورت باتو خاں کا ہو سکتا تھا۔ وہ سفید سمور کا بڑا سا یورت تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے اس یورت کے باہر نوبا کوں کی دموں والا پرچم زمین میں پیوست دیکھا۔ پرچم کے قریب ہی میں نے قشق کا نشان دیکھا۔

قشق کے سپاہی گھوڑوں پر سوار تلواریں اور ڈھالیں سنبھالیں مستعد کھڑے تھے اور ان میں کچھ یورت کی اطراف پہرہ دے رہے تھے۔ نظم و ضبط اتنا سخت تھا کہ مجھے سپاہیوں نے یورت کے قریب سے پہلے ہی روک دیا۔

"تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔" یہاں تیرا کیا کام؟" ایک تومان باشی (دستے کا سردار) نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

میں نے جواب میں لوح دکھائی جس پر شہباز کی مہر ثبت تھی۔ مجھے وہیں روک دیا گیا اور تومان باشی مجھ سے وہ لوح لے کر یورت کے دروازے پر پہنچا پھر گھوڑے سے اتر کر اندر داخل ہو گیا میں قشق (محافظ دستہ) کے سواروں میں گھرا' یورت سے دور رہا۔ کافی دیر بعد تومان باشی لوٹا اور مجھے اپنے ہمراہ یورت کے دروازے پر لے گیا۔ یورت کے اندر سے مجھے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں گھوڑے سے اترا' اپنے جسم پر لپٹی ہوئی گرد آلود چادر کھول کر گھوڑے پر ڈالی پھر دھڑکتے دل سے یورت کے اندر قدم رکھا اور جوتے اتار دیئے۔ جب میں جوتے اتار کر سیدھا کھڑا ہوا تو میں حیرت بھری نظر سے یورت کے اندر کا ماحول دیکھنے لگا وہ ماحول میرے لیے بڑا عجیب تھا۔ یورت کے درمیان دو انسان نما جانور اچھل کود رہے تھے۔ میں نے اس عجیب و غریب جانور کا نام ہی نام سنا تھا' اسے دیکھا کبھی نہیں تھا۔ اسے لوگ بندر کہتے تھے۔ باتو خاں' بندر کا تماشا دیکھ رہا تھا اور یورت میں موجود اس کے دوسرے سردار بندروں کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ان دونوں بندروں کو ایک مصری تاجر نچا رہا تھا جو باتو خان کی مسند کے سامنے اکڑوں بیٹھا ڈگڈگی بجا رہا تھا۔

ان بندروں سے ہٹ کر میری پہلی نظر باتو خاں پر پڑی جو وہاں موجود افراد میں سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ اس کے سر پر سرخ طرے دار چتر تھا جس پر موتی جڑے ہوئے تھے چوڑے سر کے پیچھے دو موٹی موٹی چوٹیاں پڑی تھیں جن میں قیمتی جواہرات گندھے نظر آرہے تھے۔ اس کے گٹھیا سے متورم ٹخنوں میں قرمزی کپڑے کی جوتیاں تھیں۔ چینی ریشم کے زیر جامے پر وہ بھیڑیئے کی کھال پہنے ہوئے تھا اس کے قبضے میں تلوار بھی نظر آرہی تھی جس کا قبضہ خالص چاندی کا لگ رہا تھا۔ اس کی کمر کے گرد بندھی پیٹی میں طلائی مہرے ٹنکے ہوئے تھے جو جگمگا رہے تھے۔

میں آگے بڑھا اور اپنی پیٹی کھول دی پھر اپنے سر

سے ٹوپی اتار کر باتو خاں کی مسند پر نظر جمائے سر جھکا دیا۔ میرے اور باتو خاں کے درمیان اب تک مصری تاجر اور وہ بندر حائل تھے۔ باتو خاں کی مسند کے دائیں بائیں بہت سے افراد بیٹھے تھے مگر میری تمام تر توجہ اس بھوری آنکھوں والے کی طرف تھی جسے لوگ سائیں خاں بھی کہتے تھے۔

باتو خاں نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور اسی کے ساتھ میں نے دیکھا کہ وہاں موجود افراد میں سے زیادہ تعداد اٹھ کھڑی ہوئی گویا یہ تماشا ختم ہونے کا اشارہ تھا یا خلوت کا۔ مصری تاجر بھی، اٹھنے والوں میں شامل تھا۔ وہ اپنے دونوں بندر لیے لوگوں کے ہجوم کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اب خیمے میں باتو خاں سمیت صرف پانچ انسان تھے اور ایک جانور یہ ایک ریچھ تھا جو اپنی تھوتنی زمین پر رکھے ایک ریچھ کی طرح موٹے شخص کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر مجھے نفرت اور خوف کا احساس ہوا کیونکہ اس کے جسم پر شامانوں جیسا لباس تھا۔ وہ ریچھ یقیناً" سدھا ہوا تھا جو اس طرح انسانوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس موٹے سے شامان کے ساتھ وہ ریچھ دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا۔ اسی وقت باتو خاں کی کھنک دار اور بارعب آواز ابھری اور میں اس کی مسند کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔

"تو کس کی طرف سے آیا ہے؟" باتو خاں نے اپنی تیز، روشن بڑی اور بھوری آنکھوں سے مجھے گھور کر سوال کیا۔

"مجھے سرقوشنی بیگی نے مغربی دشت کے آقا کی خدمت میں بھیجا ہے۔" میں نے نظر جھکا کر کہا۔

"تو پھر اپنا سینہ کھول اور شناخت دکھا!" باتو خاں کی آواز گونجی۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل میں اپنا سینہ کھول دیا مگر ڈھائی مہینے میں میرے سینے کے بال پھر بڑھ گئے تھے وہ تحریر چھپ گئی تھی جو گرم لوہے سے لکھی گئی تھی۔ میں کچھ سٹپٹا سا گیا مگر اسی وقت باتو خاں نے اپنی بائیں جانب بیٹھے ایک منگول سردار کو اشارہ کیا۔ وہ منگول سردار اپنی پیٹی سے بندھا ہوا ایک بڑا خنجر نکالتا ہوا اٹھا اور میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بے دردی سے میرا سینہ چھیل دیا مجھے کئی خراشیں لگیں، چرکے لگے لیکن میں نے اف تک نہ کی۔ جب سینے پر بال نہ رہے تو باتو خان نے ریچھ والے شامان کو اشارہ کیا کہ میرے سینے پر لکھی ہوئی تحریر یا آواز بلند پڑھے۔ باتو خان کو بھی اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔

ریچھ والا موٹا شامان اٹھا اور میری طرف آیا مجھے یوں لگا جیسے وہ چل نہ رہا ہو، لڑھک رہا ہو۔ اس نے میرے پاس آکر بیٹھنے کے بعد سینے پر نظر گاڑ دی پھر اسکے بھدے ہونٹ حرکت میں آئے۔ اتنی کریہہ آواز میری سماعت سے پہلے کبھی نہیں ٹکرائی تھی۔ "سرقوشنی بیگی کا قاصد۔ اس کی باتوں پہ اعتبار کرو!" میرے سینے پر لکھے ہوئے لفظ موٹے شامان کے حلق سے پتھروں کی طرح لڑھک کر باہر آئے۔

"ٹھیک ہے، اپنا سینہ ڈھک لے اور پیغام سنا!" باتو خاں نے مجھے حکم دیا اور موٹا شامان پھر لڑھکتا ہوا اپنی جگہ جا بیٹھا۔ اس دوران میں اسکا ریچھ بدستور وہیں بیٹھا رہا تھا۔

"عظیم سرقوشنی بیگی، الاؤ کی رکھوالی نے مغربی دشت کے آقا سے کہلوایا ہے کہ وہ اپنا اردو لے کر بھورے دریائے ایمبل کے کنارے پہنچ جائے کہ خاقان قوبوق اس پر حملہ کرنے آرہا ہے۔"

"کیا تو نے پیغام ٹھیک ٹھیک رٹا تھا؟" میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی باتو خاں پر اضطراب لہجے میں بولا۔

"ہاں اے مغربی دشت کے آقا! میں لفظ بہ لفظ وہی کہہ رہا ہوں جو مجھ سے کہا گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا وہ اپنا اردو لے کر چل پڑا ہے؟" باتو خاں نے فکر مند لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ قراقرم سے میری روانگی کے دو دن بعد چلنے والا تھا۔ وہ راستے میں ہوگا۔" میں نے بتایا۔

"تجھے وہاں سے یہاں تک پہنچنے میں کتنی دیر لگی!" اس نے معلوم کیا۔

"میں تیسرے چاند میں یہاں پہنچا ہوں اے مغربی دشت کے آقا!"

میرا جواب سن کر اس کے چہرے پر کسی قدر اطمینان نظر آنے لگا' اور وہ بولا۔ "تو بہت جلد آیا مگر وہ اتنی جلد نہ آسکے گا کیونکہ اس کے ساتھ پورا اردو ہوگا۔ اسے کم سے کم ڈیوڑھا وقت لگے گا۔ اس دوران میں مزید جنگی تیاریاں کی جاسکتی ہیں۔ ہاں یہ بتا کہ الاؤ کی رکھوالی نے کچھ اور بھی کہا؟"

"الاؤ کی رکھوالی نے مغربی دشت کے آقا کو خاقان اعظم کا قول یاد دلانے کو بھی کہا۔ ایک بار خاقان اعظم نے اپنے بگھاتروں (بہادروں) کو تاکید کی تھی کہ رزم میں شیروں کی طرح لڑو اور امن ہو تو قمریوں کی طرح گزارو چار بگھاتر بیٹوں کی عظیم ماں نے کہا ہے کہ قمریوں کی طرح رہنے کا موسم ختم ہوا اور اب شیروں کی طرح لڑنے کا موسم آگیا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے خاموشی اختیار کرلی۔

"بگھاتر بیٹوں کی بگھاتر ماں نے جو کہا ٹھیک کہا اور بروقت کہا۔"

وہ بولا پھر مجھ سے پوچھا۔ "کیا تو واپس جائے گا؟"

"عظیم بیگی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کا کوئی اور پیغام ملنے تک مغربی دشت کے آقا کی خدمت میں رہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ وفادار اور بگھاتر لگتا ہے کہ اتنا اہم پیغام لے کر اتنی جلد آیا۔ سائیں خاں حکم دیتا ہے کہ اسے ان قاصدوں کے ساتھ رکھا جائے جو سائیں خان کے لشق سے وابستہ ہیں۔" باتو خاں نے اس منگول سردار کی طرف دیکھ کر حکم دیا جس نے میرے سینے پر طبع آزمائی کی تھی۔

"سائیں خاں کے حکم کے بغیر تو کتا بھی نہیں بھونک سکتا۔" منگول سردار نے اس زمانے کی ایک پام کہاوت دہرائی جو پورے مغربی دشت میں مشہور تھی۔

باتو خاں نے اسی وقت اپنے اردو کے تمام سپہ سالاروں کی طلبی کا حکم دیا اور مجھے وہ منگول سردار اپنے ہمراہ لے کر یورت سے باہر نکلا۔ منگول سردار مجھے قشق کے تومان باشی تک لے گیا اور اسے باتو خاں کا حکم سنا کر دوبارہ یورت میں چلا گیا۔

باتو خاں کے اطراف کچھ فاصلے سے کوئی بارہ یورت مزید نصب تھے۔ انہی میں سے ایک یورت کے اندر مجھے پہنچا دیا گیا۔ میرے علاوہ دو اور افراد بھی تھے۔ ان کے ساتھ ہی دو خدمت گار بھی یورت میں موجود تھے ان خدمت گاروں نے میرا گھوڑا یورت کی باہر باندھ دیا اور اس کے آگے گھاس ڈال دی پھر میرا سامان اتار کر یورت میں لے آئے۔

یورت میں موجود دونوں افراد میرے قریب آگئے اور مجھے ان میں سے ایک نے اپنے بستر پر جگہ دی۔ مجھے یورت تک قشق کا تومان باشی چھوڑ کر گیا تھا' اس لیے وہ دونوں میرے بارے متجسس نظر آرہے تھے کہ میں کون اہم شخص ہوں! کھانا کھانے اور بستر لگائے جانے کے دوران میں وہ دونوں مجھ سے باتیں کرتے رہے جن سے میں نے جانا کہ وہ دونوں باتو خاں کے خاص قاصدوں میں سے ہیں اور ہمیشہ قشق کے ساتھ رہتے ہیں۔ گویا اب ان کے اور میرے درجوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ مجھ سے میرے بارے میں جان کر وہ مطمئن نظر آنے لگے۔ میں تھکا ہوا تھا اس لیے ان دونوں سے زیادہ دیر باتیں نہ کرسکا اور کھانا کھاتے ہی سو گیا۔

دوسرے دن صبح میں خود سے بیدار نہیں ہوا بلکہ مجھے ایک خدمت گار نے بیدار کیا میرے کچھ پوچھنے سے پہلے خدمت گار بول اٹھا۔ "رات ہی کو حکم مل چکا تھا کہ صبح روانگی ہے تم اس وقت سو رہے تھے اس لیے تمہیں نہیں جگایا گیا۔ اب اٹھو' اردو روانہ ہونے والا ہے۔"

"کہاں۔" میں نے نیند سے بوجھل ذہن کو قابو کرتے ہوئے پوچھا۔

"سرائے باتو کی طرف! شکار کا حکم واپس لے لیا گیا ہے اور حلقہ توڑ دیا گیا ہے۔" خدمت گار نے جواب دیا اور جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

یورت میں میرے اور دو خدمتگاروں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ باتو خاں کے دونوں قاصد غائب تھے۔ میں

نے ان دونوں کے بارے میں خدمت گار سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ دونوں رات ہی کو باتو خاں کے حکم پر کہیں روانہ ہو چکے ہیں۔ کہاں؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ خدمتگاروں نے مجھے جلدی جلدی کھلایا پلایا اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ اسی دوران قشق کا ایک سپاہی توماں باشی کا پیغام لے کر مجھ تک پہنچا کہ میں جلد سے جلد باتو خاں کے یورت تک پہنچ جاؤں کیونکہ مجھے اس کی سواری کے ساتھ چلنا ہے اور سواری روانہ ہونے والی ہے۔ یہ پیغام دے کر سپاہی چلا گیا اور میں نے جلدی جلدی اپنے جسم پر ہتھیار سجائے۔ اسی دوران ایک خدمت گار نے میرے گھوڑے پر زین کس دی۔ میں گھوڑے پر بیٹھ کر تیزی سے باتو خاں کے یورت کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں میں نے دیکھا کہ یورتوں کو چھکڑوں پر لادا جا رہا ہے میں باتو خاں کے یورت کے یورت پہنچ کر قشق کے توماں باشی سے ملا اور اس نے مجھے اپنے ساتھ رہنے کو کہا۔

کچھ دیر بعد باتو خاں اپنے سپہ سالاروں اور نویونوں (شہزادوں) کے جلو میں یورت سے نکلا۔ خدمت گاروں نے یورت کے باہر موجود ایک اعلیٰ نسل کا ابلق گھوڑا اس کے سامنے پیش کیا جس پر وہ شاہانہ انداز سے بیٹھا۔ اس کے بعد نویون اور سپہ سالار اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ باتو خاں کے گھوڑے سے پہلے قشق چلا جس میں میں بھی شامل تھا۔ پورا اردو پیچھے رہ گیا اور باتو خاں نے مختصر جمعیت کے ساتھ اپنے شہر کا رخ کیا۔ اس مختصر معیت میں وہ موٹا شامان بھی تھا جس نے میرے سینے پر لکھے ہوئے الفاظ پڑھے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی تھی کہ اس کا ریچھ بھی اس کے ہمراہ بالکل انسانوں کی طرح گھوڑے کی پشت پر ادھر ادھر ٹانگیں ڈالے سوار تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کسی جانور کو اس طرح دوسرے جانور پر سوار نہیں دیکھا تھا۔ وہ ریچھ کسی انسان ہی کی طرح موٹے شامان کے پیچھے گھوڑے کی پشت پر سوار تھا۔

یہ قافلہ دوپہر کے بعد سرائے باتو تک پہنچ گیا۔ وہاں بھی قشق کے قاصدوں کے لیے، باتو خاں کے بڑے سے یورت کے قریب ایک چھوٹا یورت نصب تھا۔ باتو خاں اپنے گھوڑے سے اتر کر اپنے یورت میں چلا گیا اور مجھے قشق کے توماں باشی نے ایک سپاہی کے ہمراہ اس چھوٹے یورت میں بھجوا دیا جہاں ضرورت زندگی کی ہر شے موجود تھی اور بستر بچھے ہوئے تھے۔

شام ہونے سے پہلے پہلے پورا شہر جیسے آباد ہو گیا۔ سپاہی اپنے اپنے یورتوں میں لوٹ آئے تھے۔ وہ دونوں خدمتگار بھی آ گئے تھے جو شکار گاہ کے یورت میں خدمت پر مامور تھے۔ انہیں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ باتو خاں کے قاصدوں میں سے ایک یورت میں داخل ہوا۔ وہ چہرے سے خاصا تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایک خادم فوراً باہر دوڑا گیا تاکہ اس کے گھوڑے کا ساز اتار سکے اور اس کے آگے گھاس ڈال سکے۔ دوسرا اسکے لیے کھانا نکالنے لگا۔ وہ میرے بستر پر بیٹھ گیا اور اپنے جسم سے لپٹا ہوا کپڑا کھولنے لگا۔

"تو کہاں گیا تھا اے منلیک"۔ میں اس سے پوچھا کہ اس نے اپنا نام یہی بتایا تھا اور یہ نام میں نے یاد رکھا تھا۔

"سائیں خاں نے مجھے کیف کے رئیس اعظم میخائیل کے پاس بھیجا تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے کر لوٹوں، سو میں اسے اور اس کے نائب کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ سائیں خاں نے کہلوایا تھا کہ وہ خاقان اور سائیں خاں کی سرزمین میں رہے اور حاضر ہو کے سائیں خاں کے آگے نہ جھکے، یہ مناسب نہیں۔ ہر چند کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں مگر تماشا دیکھنے ضرور جاؤں گا۔ کچھ حلق سے نیچے اتار لوں۔"

احتیاط

ایک بہت موٹا آدمی سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ اس نے تانگے والے کو آواز دی۔ اور کہا۔ "ارے بھائی اسٹیشن تک چلو گے۔"

"تانگے والا بولا" جی ہاں چلوں گا تو سہی مگر ذرا احتیاط سے بیٹھیے گا۔ گھوڑے کو پتا نہ چلے۔"

"کیسا تماشا؟" میں نے اس کی بات سن کر پوچھا۔ اس دوران میں خدمت گار اس کے سامنے کھانا رکھ گیا جو سوکھے ہوئے بھیڑ کے گوشت اور گھوڑے کے دودھ میں بھیگے جو پر مشتمل تھا۔

"میخائیل کا تماشا! منلیک نے سوکھا ہوا گوشت چباتے ہوئے جواب دیا پھر بولا۔ "میخائیل 'قشق' کے توماں باشی کی تحویل میں ہے اور ریچھ والا شاہی یورت کے سامنے الاؤ دہکوانے کی تیاری کر رہا ہے۔ میخائیل اور اس کا نائب فیڈور یہ تیاریاں دیکھ کر سخت خوفزدہ ہیں۔ وہ راستے میں بھی مجھ سے ایسی ہی باتیں کرتے آئے تھے۔ انہیں علم تھا کہ سائیں خاں کے سامنے جھکنے سے پہلے انہیں دو دہکتے ہوئے الاؤں کے درمیان خالی جگہ سے گزرنا پڑے گا۔ انہیں خوف تھا کہ ہمارا ریچھ والا تب تنگری جب انہیں آگ کے جادو سے ہو کر گزار دے گا اور انہیں نادیدہ دیوتاؤں کے آگے سر جھکانا پڑے گا تو انکی سولدائیں (روحیں) جہنم واصل ہو جائیں گی۔"

مجھے منلیک سے میخائیل کے بارے میں یہ باتیں جان کر ہنسی آگئی۔ میں سمجھ گیا کہ کیف کا رئیس اعظم میخائیل منگولوں کے طور طریق سے واقف نہیں اسے نہیں معلوم کہ شامان اجنبیوں کو دو دہکتے ہوئے الاؤں کے درمیان سے اس لیے جاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی خطرناک طلسم، تعویذ یا غیر مرئی ہتھیار ہو تو آگ کے دیوتا اسکا اثر زائل کر دیں۔ آنے والے اجنبیوں کو یہ حکم بھی دیا جاتا تھا کہ مشرق کی طرف سجدہ کریں جہاں خاقان کا پایۂ تخت اور خاقان اعظم کا مدفن تھا۔ میخائیل شاید اس سجدہ گزاری کو نادیدہ دیوتاؤں کے آگے سر جھکانا سمجھ رہا تھا۔

میں بھی منلیک کے ہمراہ میخائیل کا تماشا دیکھنے پہنچ گیا۔ جب شاہی یورت کے سامنے پہنچے تو الاؤ دہک چکے تھے اور میخائیل ریچھ والے کی ساتھ اپنے نائب کے ہمراہ الاؤوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان کے پیچھے قشق کا توماں باشی تھا۔

میں اور منلیک الاؤوں کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کیونکہ ہم دونوں کا تعلق شاہی قشق سے تھا اس لیے ہمیں بھلا کون روکتا۔ الاؤوں تک آکر میخائیل اور اس کا نائب فیڈور رک گئے۔

"عیسائیوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ الاؤ کے درمیان سے ہو کر گزریں یا پادری کے سوا کسی اور کے آگے سر جھکائیں۔ میخائیل نے ریچھ والے سے کہا۔

"جا اور سائیں خاں سے وہ سب کچھ بتا دے، جو یہ کہتا ہے۔" ریچھ والے شامان نے میخائیل کو گھورتے ہوئے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے قشق کے توماں باشی سے کہا۔

توماں باشی الاؤں کے درمیان خالی جگہ سے ہو کر یورت کے اندر چلا گیا پھر کچھ دیر بعد لوٹ آیا۔ توماں باشی نے آتے ہی میخائیل کو مخاطب کیا۔ "سائیں خاں سخت برہم ہو گیا ہے اور کہتا ہے کہ تم نے اس کے حکم سے سرتابی کیسے کی؟ اگر تم لوگ اسکے حکم کی تعمیل کرو گے تو وہ اپنے ہاتھ سے تمہیں ریاست بخشے گا لیکن اگر حکم ماننے سے انکار کرو گے تو تمہیں قتل کرا دے گا۔"

توماں باشی کا حکم سن کر میخائیل اور فیڈور آپس میں مشورے کرنے لگے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے! آخر میں فیڈور نے میخائیل سے کہا۔ اگر کسی کی روح جہنم واصل ہو جائے تو اس کے عوض اگر اسے ساری دنیا کی بادشاہی بھی نصیب ہو تو کیا فائدہ!"

فیڈور کی بات سن کر کچھ دیر میخائیل چپ رہا پھر اس نے فیصلہ کن لہجے میں توماں باشی کو مخاطب کیا۔ "ہم زار کے آگے ضرور سر جھکائیں گے کیونکہ خدا نے اسے سلطنت عطا کی ہے مگر ہم باقی چیزوں کے آگے سر نہ جھکائیں گے۔"

اس کا جواب سن کر توماں باشی نے اپنے مسلح دستے کے سپاہیوں کو اشارہ کیا جو اپنے گھوڑوں سے اتر کر اس کی طرف بڑھنے لگے پھر توماں باشی نے رئیس اعظم میخائیل کو جتلایا۔ "میخائیل! احتیاط کرو، تمہارے سر پر موت کھیل رہی ہے۔" گویا میخائیل کے لیے یہ آخری تنبیہہ تھی۔

میخائیل نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا۔ اس دوران میں قشق کے سپاہی میخائیل اور فیڈور کے

پیچھے خاموشی سے آکھڑے ہوئے۔ توماں باشی نے ریچھ والے کی طرف اجازت طلب نظر سے دیکھا۔ ریچھ والے کی طرف اجازت طلب نظر سے دیکھا۔ ریچھ والے نے اپنی موٹی گردن ہلائی اور اسی کے ساتھ توماں باشی نے سپاہیوں کو ہاتھ کا اشارہ کیا ایک سپاہی نے جھپٹ کر فیڈور کی گردن پر پیچھے سے تلوار ماری اور فیڈور کا سر کٹ کر دہکتے ہوئے الاؤ میں جا پڑا مگر میخائیل کے ساتھ یہ نہیں ہوا۔ میخائیل کو سپاہیوں نے زمین پر گرا دیا اور اس کے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے پھر اس کے سینے کے بائیں جانب زور زور سے گھونسے مارنے لگے۔ یہاں تک کہ میخائیل کے دل کی حرکت بند ہو گئی اور اسکا جسم ڈھیلا ہو گیا۔

میخائیل اور اس کے نائب فیڈور کا انجام دیکھ کر میں وہاں مزید نہ رک سکا۔ تماشا ختم ہو چکا تھا اس لیے منلیک بھی میرے ہمراہ یورت کی طرف لوٹ آیا۔ مجھے علم تھا کہ سفاک و بے رحم منگولوں نے میخائیل کو فیڈور کی طرح کیوں نہ ہلاک کیا تھا! چنگیز خاں کی یاسا کے مطابق کسی بھی شاہی خاندان کے فرد کو خون بہانا ممنوع تھا خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہو۔ میخائیل کی رگوں میں بھی شاہی خون تھا اس لیے اسے ہلاک کرنے میں یہ احتیاط برتی گئی تھی۔

منلیک طویل سفر سے لوٹا تھا اس لیے بہت تھکا ہوا تھا وہ یورت میں آتے ہی اس بستر پر لیٹ کر سو گیا جو خدمت گاروں نے ہم دونوں کی غیر موجودگی میں اسکے لیے بچھا دیا تھا۔ اس کا بستر میرے بستر کے برابر ہی لگایا گیا تھا اور دونوں خدمت گاروں نے اپنے بستر ہم سے دور بچھائے تھے۔ منلیک تو سو گیا مگر مجھے بہت دیر تک نیند نہ آسکی۔ میری آنکھوں میں میخائیل اور فیڈور کی موت کا منظر گھومتا رہا۔ میں مرنے والوں کے بارے میں مزید کچھ جاننے کے لیے متجسس تھا لیکن ان کے بارے میں منلیک ہی کچھ بتا سکتا تھا جو سو چکا تھا۔ خاصی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد آخر مجھے نیند آ ہی گئی۔

دوسرے دن صبح میں نے منلیک سے میخائیل کے بارے میں مزید کچھ جاننا چاہا کہ وہ ایسی موت کیوں مارا گیا اور حقیقتاً" اسے کس لیے بلایا گیا تھا! جواب میں مجھے منلیک سے مغربی دشت کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں جن سے میں پہلے ناواقف تھا۔

یہ ٹھیک تھا کہ پورے مغربی دشت پر باتو خاں کی حکمرانی تھی لیکن اسکے باوجود اب تک دو مقامات ایسے تھے جو براہ راست باتو خاں کے قبضے میں نہیں آسکے تھے۔ ان میں شہر کیف اور اس کی اطراف کا کچھ علاقہ تھا جہاں کا رئیس اعظم اور حاکم میخائیل تھا۔ یہ علاقہ چاروں طرف سے ان علاقوں کے درمیان گھرا ہوا تھا جن پر باتو خاں پہلے ہی قبضہ کر چکا تھا یہی سبب تھا کہ باتو خان میخائیل کی طرف سے زیادہ فکر مند نہیں تھا۔ وہ جب چاہتا اس علاقے کو قبضے میں لے سکتا تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ میخائیل اس سے خوفزدہ رہتا ہے اور وہ جب چاہے گا' اسکے ایک اشارے پر میخائیل دوڑا چلا آئے گا۔ موجودہ صورت حال میں جبکہ قویوق اس پر حملہ کرنے آرہا تھا۔ باتو خاں یہ چاہتا تھا کہ دشت کے اندرونی علاقے پورے طور پر اس کے قبضے میں ہوں۔ باتو خاں جانتا تھا کہ جنگ کے دوران میں ذرا سی بھی اندرونی شورش کتنی مہلک ثابت ہو سکتی ہے! باتو خاں نے اسی لیے کیف کی اطراف موجود اپنے توماں باشیوں (فوجی دستوں کے سردار) کے نام حکم جاری کیا تھا کہ وہ فوراً" کیف پر قبضہ کرلیں۔ یہ حکم لے کر منلیک روانہ ہونے والا تھا۔

باتو خاں کے لیے دوسری حریف قوت گرجستانیوں کی ملکہ سودان تھی جہاں باتو خاں نے منلیک کے ساتھی کو بھیجا تھا۔ رو سودان قفقاز کی بلند ترچوٹیوں میں' قصبک کی برف گاہ کے درمیان حکمرانی کر رہی تھی۔ باتو خاں اب تک اسکی جانب سے زیادہ فکر مند نہیں تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایک طویل عرصے سے قفقاز کے دامن میں موجود وسیع چراگاہیں باتو خاں کے قبضے میں تھیں وہاں باتو خاں کا چھوٹا بھائی برقائی متعین تھا اسے قویوق کی طاقت کا اندازہ تھا اس لیے وہ ہر طرح سے مطمئن ہو کر یکسوئی کے ساتھ قویوق سے نبرد آزما ہونا چاہتا تھا۔

منلیک نے مجھے ملکہ روسودان کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بتائی تھیں۔ منلیک اپنے ساتھی کی طرف سے فکر مند تھا کیونکہ اسکا ساتھی وجیہہ اور جوان تھا۔

"ممکن ہے کہ وہ اب کبھی لوٹ کر نہ آسکے۔" منلیک نے ایک چمڑے کے تھیلے میں سوکھا گوشت بھرتے ہوئے ٹھنڈا سانس لے کر کہا تھا۔

"کیوں؟ اس کی طرف سے تم اتنے فکر مند کیوں ہو؟" وہ آخر سائیں خاں کا قاصد ہے' روسودان چاہے اطاعت پر تیار ہو کہ نہ ہو' اسے روک تو نہیں سکتی۔" میں نے کہا۔

"دراصل تم کیونکہ روسودان کے بارے میں نہیں جانتے اس لیے ایسا کہہ رہے ہو۔ وہ بڑی عجیب اور سفاک عورت ہے اگر کسی طرح میرا ساتھی اس سے بچ بھی گیا جس کا امکان نہیں تو اس کی نوجوان بیٹی تھمرو سے نہ بچ سکے گا۔" منلیک بولا اور اس کی بات اب بھی میرے پلے نہ پڑی۔ منلیک نے وضاحت کی "ملکہ روسودان اور اس کی بیٹی تھمرو' دونوں ہوس پرست ہیں۔ وہ وجیہہ اور جوان مردوں کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھائی بغیر نہیں چھوڑتیں۔ تمہیں شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ ان ماں بیٹی کے درمیان کبھی مردوں کی تقسیم پر جھگڑا بھی ہو جاتا ہے۔ وانا اور خوبصورت مردوں کے معاملے میں وہ ایک دوسرے کی رقیب ہیں اور سنو جب انکا دل کسی مرد سے بھر جاتا ہے تو وہ اسے قلعے کی بلند فصیل سے نیچے پھینکوا دیتی ہیں۔" منلیک نے اپنی بات ختم کر کے خوف سے جھرجھری لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

روسودان سفاک اور بے رحم تھی یہ کہنا منلیک کا تھا جس سے مجھے اتفاق تھا بھی اور نہیں بھی جب منلیک ملکہ روسودان کی سفاکی کے قصے سنا رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ منگولوں سے زیادہ بھی کوئی سفاک و بے رحم ہو سکتا ہے۔! ملکہ روسودان تو ان کا عشر عشیر بھی نہیں تھی۔

سرائے باتو آئے ہوئے مجھے تیسرا دن تھا۔ میں بیزار ہو کر گھومنے کے لیے اپنے یورت سے نکلنے ہی والا تھا کہ قشقی کے ایک سپاہی نے میری طلبی کا حکم سنایا یہ پہلا موقع تھا کہ باتو خاں نے مجھے طلب کیا تھا۔ میں اب عموماً" اس کے یورت سے دور ہی دور رہتا تھا کیونکہ وہاں ریچھ والا موٹا شامان' تب تنگری آتا جاتا دکھائی دیتا تھا اور مجھے اس سے خوف سا محسوس ہوتا تھا تب تنگری آتا جاتا دکھائی دیتا تھا اور مجھے اس سے خوف سا محسوس ہوتا تھا میں سوچتا تھا کہ شامان بغور چی کی طرح وہ موٹا بھی میری جان کو نہ جائے۔

میں خوفزدہ سا باتو خاں کے یورت میں داخل ہوا اور یہ دیکھ کر میرا خوف سوا ہو گیا کہ موٹا ریچھ والا شامان اپنے ریچھ سمیت اندر موجود ہے یورت میں اس وقت باتو خاں کے علاوہ صرف وہی تھا۔

میں باتو خاں کے سامنے جھک کر دو زانو بیٹھ گیا تو اس موٹے شامان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تب تنگری کہتا ہے تو ذہین اور بگھتر ہے۔ تجھے الاؤ کی رکھوالی نے میرے پاس اپنا قاصد بنا کر بھیجا تھا۔ تجھے اس پر فخر کرنا چاہئے اور اسپر بھی کہ اب سائیں خاں تجھے اپنا قاصد بنا کر قفقاز کی بلند ترچوٹیوں کی طرف بھیج رہا ہے جہاں موت سے نہ ڈرنے والی ایک عورت روسودان رہتی ہے۔ میں پہلے جو قاصد روانہ کیا تھا' اسے اب تک ہر حال میں لوٹ آنا چاہئے تھا' پر وہ نہ لوٹا۔ اسکے ساتھ کیا ماجرا ہوا' نہیں معلوم پر تو ضرور لوٹ کر آئے گا کہ تو بگھاتر ہے۔ اگر تو بھی نہ لوٹا تو میں برقائی کو حکم دوں گا کہ وہ روسودان کو پہاڑوں سے نیچے گھسیٹ لائے اور وہ ایسا کر سکتا ہے وہ میرا بگھاتر بھائی ہے۔"

باتو بغیر رکے طیش کے عالم میں بولے جا رہا تھا اور یہ سن کر اب مجھے قفقاز جانا ہے اور جہاں جانے والے لوٹ کر نہیں آتے' میرے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ باتو خاں کی آواز مجھے جیسے بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ اب وہ کہہ رہا تھا۔ "کل صبح تجھے روانہ ہو جانا ہے۔ تجھے صبح ہی میرا وہ پیغام مل جائے گا جو تجھے لے کر جانا ہے اور وہ لوگ جو راستوں کا علم جانتے ہیں تجھے وہاں تک پہنچنے کے

ہوں یا نہیں۔" مجھے جانے کا حکم دیا۔

اٹھتے ہوئے میری نظر ریچھ والے پر پڑی۔ وہ مجھے اس شہباز کی طرح دیکھ رہا تھا جو اپنے شکار پر جھپٹنے والا ہو۔ کیا مجھے موت کے منہ میں بھیجنے کی سازش اسی موٹے کی ہے مگر میری اس سے کیا دشمنی!

یہی سوچتا ہوا میں باتو خاں کے یورت سے نکل کر اپنے یورت میں پہنچ گیا۔

خدمت گاروں نے کھانے کے لیے پوچھا اور میں نے بے دلی سے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے میرے سامنے ڈھیر سارا گوشت لا کر رکھ دیا۔ میں نے گوشت کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ یورت کے دروازے سے پھر وہی فسقی کا سپاہی اندر داخل ہوتا دکھائی دیا جو پہلے بھی میری طلبی کا حکم لے کر آیا تھا۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا تو اس نے بتایا کہ باتو خاں نے مجھے فوراً بلایا ہے۔ سپاہی باتو خاں کا حکم سنا کر لوٹ گیا اور میں بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اپنے یورت سے نکل کر باتو خاں کے یورت کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا باتو خاں مجھے صبح کی بجائے اسی وقت ملکہ روسودان کے پاس بھیجنا چاہتا ہے اس فوری طلبی کا مقصد اور کیا ہو سکتا ہے؟ کہیں ریچھ والے نے تو اسے یہ بات نہیں سمجھائی کہ مجھے ابھی روانہ کر دیا جائے؟۔

میں انہی خیالوں کی دھوپ چھاؤں میں سہما سہما سا باتو خاں کے یورت میں داخل ہوا اور اس کے سامنے بیٹھے دو افراد کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ میری قدموں کی چاپ سن کر ان دونوں ہی نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ان دونوں میں سے ایک میری ماں کا دوسرا شوہر چنکائی تھا اور اسکے ساتھ نظر آنے والی شخصیت بغورچی شامان کی تھی۔ انہیں یوں اچانک سامنے پا کر میری جو حالت ہوئی اسے بیان کرنا بڑا مشکل ہے مجھے یوں لگا کہ جیسے میں بورخان قالدوں کی سب سے بلند چوٹی سے نیچے گرتا چلا جا رہا ہوں۔ ان دونوں نے میری طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ دہک رہے تھے۔

میں نے گھبرا کر اپنی نظر نیچی کر لی۔ مجھ میں ان نگاہوں کی تاب لانے کی ہمت نہیں تھی۔

"سائیں خاں! یہی میرا نافرمان باغی بیٹا ہے۔" یورت میں چنکائی کی چنچناتی آواز گونجی اور میں جیسے ہوش میں آ گیا۔

باتو خاں کو احتراماً "سائیں خاں" بھی کہا جاتا تھا۔

"کیا اس کا بیان درست ہے؟" سائیں خاں نے اپنی چمکیلی بھوری آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

میں نے مجرموں کی طرح اپنی گردن جھکا لی۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ میں باتو خاں کے سامنے اظہار حقیقت کر سکتا! میں اسے بھلا یہ کس طرح بتا سکتا تھا کہ میں ایک عرب تاجر کا بیٹا ہوں اور مجھے منگولوں سے نفرت ہے!

"تیرا جھکا ہوا سر کہہ رہا ہے کہ تو واقعی اس کا بیٹا ہے اور اس نے جو کچھ تیرے بارے میں مجھ سے کہا ہے، وہ صحیح ہے۔ تو خاقان قویوق کا مجرم ہے مگر میں تیری زبان سے اعتراف چاہتا ہوں۔"

باتو خاں کی بات سن کر میں سمجھ گیا کہ چنکائی اسے میرے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے اور یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ اگر باتو خاں نے مجھے ان دونوں کے حوالے کر دیا تو میری موت یقینی ہے۔ اس احساس نے میرے دل میں چنکائی کے خلاف دبی ہوئی نفرت کو ابھار دیا اور میں بغیر یہ سوچے سمجھے بول اٹھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں! میں نے کہا "اے مغربی دشت کے آقا! یہ ٹھیک ہے کہ میں اس کا بیٹا ہوں مگر میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا اور اس کی گواہ لاؤ کی رکھوالی ہے ورنہ وہ مجھے تیرے پاس نہ بھیجتی۔"

"تب تنگری!" باتو خاں نے ریچھ والے شامان کو مخاطب کیا جو اس دوران میں خاموش بیٹھا سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ تب تنگری، باتو خاں کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بولا۔ "تو بتا کہ کیا یہ جوان، جادوگر ہے؟ تیرا علم کیا کہتا ہے؟"

"اگر یہ جادوگر ہوتا تو میں مغربی دشت کے آقا کو پہلے ہی بتا چکا ہوتا۔ یہ ہرگز جادوگر نہیں ہے۔" تب

للنگری کی کریہہ اور بھاری گونجیلی آواز سنائی دی۔

"سائیں خاں!" بغورچی شامان پہلی بار ریچھ والے کو گھورتا ہوا بولا۔ "وہ تیرے شامان کا علم نامکمل ہے اور....."

"خاموش ہو جا بے ادب!" سائیں خاں نے غصے سے چیخ کر بغورچی شامان کی بات کاٹ دی۔ "تیری یہ جرات کیسے ہوئی کہ تو ہمارے شامان کے علم پر شک کرے؟"

میں نے دیکھا کہ بغورچی شامان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ ہکلایا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا اے مغربی دشت.."

"تیرا مطلب کیا تھا اور کیا نہیں! اب میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔" سائیں خاں برہم لہجے میں بولا۔ "جا اور خاقان قویوق سے کہہ دے کہ اگر یہ جوان اس کا مجرم ہے تو اب یہ سائیں خاں کی پناہ میں ہے اور سائیں خاں جسے پناہ دے دیتا ہے اسے کوئی نہیں مار سکتا۔"

"سائیں خاں! خاقان تیرے اپنوں میں سے ہے۔ تو اس جوان کی خاطر کیا اس سے بگاڑ لے گا؟" بغورچی شامان عیاری سے بولا۔

"بتاؤ اور بگاڑ سب مونگ کے تینگری کی طرف سے ہے۔ میں کیا چاہتا ہوں اور کیا نہیں، یہ میں ہی بہتر جانتا ہوں۔ تو اپنی چھوٹی سی کھوپڑی میں ہنڈیا نہ پکا!" سائیں خاں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

اپنی جان بچ جانے پر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ بازی یوں پلٹ جائے گی یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔

"جا اور جا کر اپنے یورت میں سو جا کہ تجھے صبح اپنے سفر پر روانہ ہونا ہے۔" باتو خاں مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں اس کے سامنے ادب سے جھکا اور الٹے قدموں چلتا ہوا اس کے یورت سے باہر نکل گیا۔ باتو خاں کے یورت سے نکل کر مجھے یوں لگا، جیسے میں موت کے منہ سے باہر آیا ہوں۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے یورت کی طرف بڑھ گیا۔

یورت میں پہنچ کر میں اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور دونوں خدمتگار مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ کھانا جوں کا توں بستر کے قریب رکھا تھا۔

"یہاں سے کھانا اٹھا لو!" میں نے خدمتگار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ فکر نے میری بھوک اڑا دی تھی۔ میرا دل کھانا کھانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ خدمت گاروں نے بغیر کوئی سوال کیے وہاں سے کھانا اٹھا لیا۔

بغورچی اور چنکائی کے چنگل سے بچ نکلنے کے بعد اب میرے ذہن پر دوبارہ ملکہ روسودان کا خوف مسلط ہو گیا تھا۔ نہ جانے قفقاز جا کر مجھ پر کیا بیتے!

خدمتگاروں نے یورت کے در پر پردہ ڈال دیا تھا اور در کے قریب بچھے ہوئے اپنے بستروں پر دراز ہو چکے تھے۔

سوچتے سوچتے میرے ذہن پر غنودگی چھانے لگی تھی کہ ایک آہٹ نے میرے غنودہ ذہن کو چونکا دیا۔ میری نگاہ یورت کے در کی طرف اٹھی اور میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ یورت کے در پر پڑا ہوا پردہ اٹھ رہا تھا پھر میں نے اپنی ماں کے دوسرے شوہر چنکائی کو یورت میں جھانکتے دیکھا۔ میں نے خدمتگاروں کی طرف دیکھا جو سو چکے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں چیخ کر انہیں جگا دوں مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ نفرت کرنے کے باوجود میں چنکائی سے ڈرتا تھا۔ اسی خوف کا سبب تھا کہ میں نے گھبرا کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں، لیکن اس طرح خطرہ تو نہیں ٹل سکتا تھا۔

آخر چنکائی میرے یورت میں کیوں آیا ہے! میں سوچ رہا تھا۔ کیا وہ اب بھی مجھے اسی طرح مارنا پیٹنا شروع کر دے گا جس طرح بچپن سے مارتا پیٹتا آیا ہے! میں نے تو کبھی اس کے سامنے نظر اٹھا کر بات بھی نہیں کی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھ پر خوف سا طاری ہونے لگتا تھا نہ جانے اس کے چہرے میں ایسی کیا خاص بات تھی جو مجھے خوفزدہ کر دیتی تھی۔

جب چند لمحوں بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ کوئی یورت میں داخل ہو چکا ہے اور دبے پاؤں میرے جانب بڑھ رہا ہے تو میں آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گیا۔ خطرہ اب سر پر آ پہنچا تھا اور آنکھیں بند کیے رہنے سے ٹل نہیں سکتا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی میں نے

چنکائی کو اپنے بستر کے بہت قریب پایا۔ اس نے بھی مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ لیا تھا' اسی لیے اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا' پھر مجھے آنکھیں نکال کر ڈرایا جیسے شیر اپنے شکار کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔

چنکائی گھٹنوں کے بل میرے سرہانے بیٹھ کر جھکا اور میرے کان میں پھنکارا بولا! اگر تو نہیں چاہتا کہ میں تیری ہڈی پسلی ایک کر دوں تو میرے ساتھ خاموشی سے باہر چلا چل!" یہ کہہ کر اس نے میرا بازو پکڑا اور اٹھنے کا اشارہ کیا۔

مرتا کیا نہ کرتا! مجھے اٹھنا ہی پڑا۔ میں کسی سہمی ہوئی فاختہ کی طرح' اس کے ہمراہ یورت کے در کی طرف بڑھا۔ کیا وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے؟ میں سوچ رہا تھا۔ خدمتگار باب تک بے خبر سو رہے تھے۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے میں آہستہ سے کھانسا کہ شاید ان میں سے کسی کی آنکھ کھل جائے مگر ایسا ہوا نہیں! میرے کھانسنے پر چنکائی نے مجھے سخت گھور کر دیکھا تھا جیسے کچا ہی چبا جائے گا۔

چنکائی نے یورت کے در پر پڑا ہوا پردہ اٹھایا اور میرا بازو پکڑے باہر آگیا۔ باہر ہر طرف خاموشی کا راج تھا مگر چاندنی رات ہونے کے سبب اندھیرا نہیں تھا۔

چنکائی مجھے اپنے ساتھ لیے ایک طرف بڑھنے لگا تو میں نے پہلی بار ہمت کر کے احتجاجاً "لب کھولے تو مجھے کہاں کہاں لے جا رہا ہے؟"

"احمق! میں تجھے موت کے منہ سے نکال کر لے جا رہا ہوں۔" اس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"سائیں خاں تجھے موت کے منہ میں بھیجنا چاہتا ہے اور میں تجھے یہاں سے بچا کر قراقرم لے جاؤں گا۔"

"مگر... مگر وہاں بھی تو مجھے... مجھے ہلاک کر دیا جائے گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں! خاقان قویوق نے تیری خطا معاف کر دی ہے۔ بغورچی شامان نے اسے یقین دلا دیا ہے کہ تو جادوگر نہیں ہے۔" چنکائی بولا۔

اس کے لہجے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے' اسی لیے میں نے اس کی گرفت سے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ تو ناممکن سی..."

"چپ رہ!" چنکائی نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟ میں تیرا باپ ہوں اور مجھ زیادہ تیری بھلائی کی کسے فکر ہو سکتی ہے!" اس میرا بازو مزید سختی سے پکڑ لیا۔

"کیا تجھے معلوم ہے کہ سائیں خاں مجھے کہاں والا ہے؟" میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے وا سوال کر ہی دیا۔

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔ "تو جانتا ہے بغورچی شامان مونگ کے تینگری کی سرگوشیاں لیتا ہے۔ اسی نے مجھے بتایا تھا۔"

"مگر وہ خود کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں تجھے اسی کے پاس تو لیے چل رہا ہوں۔ وہ ا یورت کے در پر گھوڑے لیے ہم دنوں کا منتظر ہو جہاں ہمیں ٹھہرایا گیا ہے۔" چنکائی نے بتایا۔

اسی وقت ہم دونوں کو دبے پاؤں آگے بڑھتے دیکھ ایک یورت کے سامنے بیٹھا ہوا کتا زور سے بھونکا ا جب ہم نہ رکے تو وہ بھونکتا ہوا ہمارے پیچھے لپکا چنکائی نے اسے پلٹ کر گھرکی دی اور اس طرح ج جیسے زمین سے پتھر اٹھا رہا ہو۔ ایسا کرتے ہوئے ا نے میرا بازو چھوڑ دیا تھا۔ یہ موقع بہت غنیمت تھا میں بھاگ لیتا لیکن کتے کے پیچھے ہٹ کر بھاگتے چنکائی نے دوبارہ میرا بازو تھام لیا اور میرے خواہش دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

میں جان چکا تھا کہ چنکائی اور بغورچی کیا چاہتے ہیں! یاتو خاں کے یورت میں میرے سامنے جو گفتگو ہوئی تھی' اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ دونو خاقان قویوق کا پیغام لے کر یاتو خاں کے پاس آئے تھے اور وہ پیغام یقیناً" مجھ سے متعلق تھا ورنہ یاتو خاں خاقان قویوق کا نام لیتا۔ خاقان قویوق کی نظر میں مجھ جیسے معمولی حیثیت کے شخص کی کیا حیثیت ہو سکتی تھی یہ میں بخوبی جانتا تھا۔ اسے لازماً" میری حیثیت کا غیر ضروری احساس دلایا گیا تھا ورنہ وہ بغورچی اور

چنکائی کو باتو خاں کے پاس پیغام دے کر نہ بھیجتا۔ ایک صورت یہ بھی ممکن تھی کہ وہ اس طرح باتو خاں سے لڑنے کا ایک اور بہانہ ڈھونڈ رہا ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا اور جیسے تھا، میرے لیے کسی طور بہتر نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں کسی قیمت پر ان دونوں کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہوں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھی زور زور سے چیخ کر ساری بستی ہی کو کیوں نہ جگا دینا پڑے!

انہی خیالوں میں کھویا ہوا میں اس یورت تک پہنچ گیا۔ جہاں بغورچی پہلے ہی سے میرا اور چنکائی کا منتظر تھا۔ چنکائی نے جو کچھ کہا تھا، میں نے ویسا ہی پایا۔ بغورچی یورت کے باہر گھوڑے لیے کھڑا تھا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تو خالی ہاتھ نہ لوٹے گا۔" وہ چنکائی کو دیکھ کر جھکا پھر میری طرف قہر آلود نگاہ سے دیکھا اور بولا۔ "چل بیٹھ جا گھوڑے پر!"

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا، ہرگز نہیں!" میں نے آخر کہہ ہی دیا اور یہ جملہ میں نے تیز آواز میں کہا تھا تاکہ وہ یہ سمجھ لے کہ اگر میرے ساتھ زبردست کی گئی تو میں چیخنے چلانے لگوں گا۔

"تو نہیں چلے گا، کیوں؟" چنکائی نے یہ کہہ کر مجھ پر ہاتھ اٹھانا چاہا۔

"نہیں! ایسا نہ کرو!" بغورچی نے اسے روک دیا۔

"میں کس لیے تمہارے ساتھ آیا ہوں!" یہ کہہ کر بغورچی آگے بڑھ کر میرے قریب آگیا۔

چنکائی اب تک میرا بازو پکڑے ہوئے تھے اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے اپنا بازو چھڑا سکوں۔ بغورچی قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھ رہا ہے۔ چند لمحے بعد ہی اس نے تیزی سے اپنا ایک ہاتھ اٹھایا اور میرے ماتھے پر رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں جھیل بیکال میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ میں نے چیخنا چاہا مگر میرے ہونٹوں سے چیخ نہ نکل سکی۔

"پہلی تو دو بار مجھے فریب دے کر نکل گیا تھا مگر اس بار ایسا نہیں ہو گا۔" میں نے بغورچی شامان کی آواز کہیں بہت دور سے آتی سنی، پھر وہ شاید چنکائی سے

مارشل آرٹ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ!

بروس لی

بروس لی کی مکمل سوانح حیات
اس کے پراسرار فن
"جیت کن ڈو"
کے متعلق معلومات اور ٹریننگ
نن چقو کا مکمل کورس

معظم جاوید کی شاندار تصنیف

بروس لی بُک

شائع ہو گئی ہے۔
آج ہی منگوائیے ___ قیمت -/36 روپے

روبی پبلی کیشنز
راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

مخاطب ہوا تھا۔ "اس کا جسم زمین پر نہ گرنے دیتا۔ یہ بس چند ہی لمحوں میں بے ہوش ہونے والا ہے۔"

ابھی بغورچی کے الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ میں نے ایک تیز غراہٹ سنی اور اس کے ساتھ بغورچی کا ہاتھ میرے ماتھے سے ہٹ گیا۔ میرا ڈوبتا ہوا ذہن جھٹکا کھا کر سنبھلا اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ بغورچی شامان زمین پر پڑا تھا اور اس سے ایک ریچھ لپٹا ہوا تھا۔ چنکائی تصویر حیرت بنا ہوا مجھ سے دور کھڑا تھا اور کچھ فاصلے پر ریچھ والا شامان تب تنگری کھڑا ہوا قہقہے لگا رہا تھا۔

معاً" تب تنگری کے قہقہے رک گئے اور اس کی آواز سنائی دی۔

"اشیکا' اشیکا! بس کر! اس کے لیے اتنی ہی سزا کافی ہے!"

میں نے دیکھا کہ ریچھ' بغورچی شامان کے زخمی جسم کو چھوڑ کر ہٹ گیا اور آدمیوں کی طرح دو پیروں سے چلتا ہوا اپنے آقا کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس کی سرخ زبان منہ سے باہر لٹک رہی تھی اور وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ بغورچی شامان زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اگر تم دونوں چاہتے ہو کہ زندہ رہو تو اسی وقت یہاں سے روانہ ہو جاؤ!" ریچھ والے کی آواز گونجی "اگر تم دونوں خاقان کے قاصد نہ ہوتے تو میں تمہیں زندہ بچ کر نکل جانے کا موقع بھی نہ دیتا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"آ میرے ساتھ! میں تجھے تیرے یورت تک چھوڑ دوں۔" یہ کہتا ہوا وہ میری طرف بڑھا۔ اس کا ریچھ بھی اس کے ساتھ آگے بڑھا تھا۔

مجھے وہ دونوں ہی ریچھ نظر آ رہے تھے۔ دو ریچھوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ جانا غیر فطری نہیں تھا۔

اس دوران میں بغورچی شامان اور چنکائی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے۔ تب تنگری نے بغورچی کو اتنا موقع بھی نہیں دیا تھا کہ وہ اپنے زخموں پر پٹی ہی باندھ لیتا۔ میں نے اس کے بازو سے خون بہتے دیکھا تھا۔ ان دونوں نے غالباً" اس میں اپنی عافیت سمجھی تھی کہ وہاں سے فوراً" فرار ہو جائیں۔

ریچھ والے کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے ویسا ہی خوف محسوس ہو رہا تھا جیسا بغورچی شامان کی موجودگی میں محسوس ہوتا تھا۔

"میں اسی وقت جان گیا کہ وہ تجھے آج رات اغوا کرنے کی کوشش کریں گے جب انہوں نے سائیں خاں سے یہاں ایک شب رہنے کی اجازت مانگی تھی۔" تب تنگری نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"تو نے ان سے میری جان بچا کر مجھ پر احسان کیا۔" میں نے بمشکل اس کا شکریہ ادا کیا۔

جواب میں وہ کچھ نہ بولا۔ باقی راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ وہ مجھے میرے یورت تک چھوڑ کر آگے بڑھنے لگا۔

"اے ریچھ والے! وہ کہیں پھر لوٹ کر تو نہیں آجائیں گے؟" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"اپنے دل سے اب ان کا ڈر نکال دے! وہ اب لوٹ کر نہیں آئیں گے۔" اس نے بغیر مڑے جواب دیا اور چل دیا۔

میں اپنے یورت کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ دونوں خدمتگار ابھی تک اسی طرح سو رہے تھے۔ مجھے ان پر غصہ آیا اور پھر خود ہی یہ سوچ کر غصہ تھوک دیا کہ ان کا بہرحال کوئی قصور نہیں تھا۔ بستر پر لیٹ جانے کے بہت دیر بعد مجھے نیند آسکی' کیونکہ تب تنگری کی تسلی کے باوجود میرے ذہن پر بغورچی کا خوف مسلط تھا۔

صبح دم میں نے اپنے یورت میں مختلف آوازوں کا شور سنا تو بیدار ہو گیا۔ خدمتگاروں کے علاوہ مزید چار افراد یورت میں موجود تھے اور وہ چاروں ہی میرے لیے اجنبی تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جلدی سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھوئے لے!" ان اجنبیوں میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہم تجھے قفقاز روانہ کرنے آئے ہیں۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور ایک برتن میں بھرا ہوا پانی لے کر یورت کے باہر چلا گیا۔ میں ہاتھ منہ دھو کر لوٹا تو

دیکھا کہ ان میں سے دو میرے بستر پر بیٹھے تھے اور بقیہ دو کچھ سامان چمڑے کے تھیلوں میں بھر رہے تھے۔

"آ یہاں آ! ہم تجھے راستہ بتائیں!" بستر پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں میں سے ایک بولا۔ "ہم راستوں کا علم جانتے ہیں اور اس علم کو تیرے سینے میں منتقل کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ سائیں خاں کا حکم ہے۔"

میں ان کے قریب بستر پر جا بیٹھا۔ انہوں نے مجھے قفقاز تک پہنچنے کا راستہ بتایا پھر یہ سمجھایا کہ میں قصبک کی برف گاہ تک کس طرح با آسانی پہنچ سکتا ہوں! اس دوران میں، میں بھی ان سے مختلف سوالات کرتا رہا اور وہ مجھے ان سوالوں کے تشفی بخش جواب دیتے رہے۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا اس سے میں نے جانا کہ سفر آسان نہیں، خصوصاً "سفر کا وہ حصہ جو مجھے پہاڑوں کے درمیان طے کرنا تھا۔

روانگی سے قبل ان میں سے ایک نے وہ تحریری پیغام دیا جو مجھے ملکہ روسودان کو دینا تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس شہباز کی لوح بھی تھی جو مجھے شاہی قاصد ثابت کرتی تھی۔

سورج ابھی اپنی بیوی کی آغوش سے اٹھا ہی تھا کہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر سرائے باتو سے روانہ ہوا۔ راستوں کا علم جاننے والے نے مجھے بتایا تھا کہ میں دوپہر ڈھلنے تک ایک بام کے قریب پہنچ جاؤں گا اور وہاں میں کچھ دیر آرام کر کے آگے بڑھ سکوں گا پھر دن تمام ہونے تک مجھے ایک دوسرے بام تک پہنچ جانا چاہیے جہاں مجھے رات گزارنی تھی۔

سرائے باتو سے قفقاز تک کی مسافت زیادہ نہیں تھی۔ میں چوتھے دن ان چراگاہوں تک پہنچ سکتا تھا جو پہاڑیوں کے دامن میں پھیلی ہوئی تھیں اور جہاں باتو خاں کا بھائی برقائی رہتا تھا، مگر مجھے وہاں رکے بغیر پہاڑوں پر چڑھ جانا تھا۔

سفر کے ابتدائی دو دن بخیر و خوبی گزر گئے۔ میں باموں (سراؤں) سے گھوڑے بدلتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔ شاہی قاصد ہونے کی وجہ سے ہر جگہ میری پذیرائی ہوئی۔ بامو کے داروغہ نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیتی۔

دوسرے دن رات بسر کرنے کے لیے میں جس بام میں ٹھہرا وہاں معلوم ہوا کہ میرے علاوہ بھی کوئی شاہی قاصد ٹھہرا ہوا ہے یہ بات میرے لیے تعجب خیز تھی اور یہ بھی کہ وہ شاہی قاصد شدید زخمی ہے۔

"وہ قفقاز سے لوٹا ہے۔" داروغہ نے جواب دیا۔ "وہاں جاتے وقت بھی وہ ہمیں ٹھہرا تھا میں اسے پہچانتا ہوں۔ وہ سائیں خاں کے خاص قاصدوں میں سے ہے۔"

میں داروغہ کی بات سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ وہ قاصد یقیناً "منلیک کا ساتھی ہی ہو سکتا ہے۔" مگر قفقاز جانے والے کب لوٹتے ہیں؟ میں نے سوچا۔ وہ کیسے لوٹ آیا؟

"مجھے اس کے پاس لے چلو!" میں نے کچھ دیر خاموش رہ کر داروغہ سے کہا۔

"کیا تم بھی اشتر کو جانتے ہو شاہی قاصد؟" داروغہ نے اپنے پورت سے نکلتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ منلیک کے ساتھی کا نام اشتر ہے جو میرے ذہن سے نکل چکا تھا، حالانکہ منلیک اس سے میرا تعارف کرا چکا تھا۔

داروغہ مجھے لے کر بام کے اس پورت میں پہنچا جو شاہی مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ زمین پر بچھے ہوئے آرام دہ بستر پر منلیک کا ساتھی ہی پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔ میں نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اس کے چہرے پر گہرے کرب کے آثار تھے۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"تت.... تو.... تو!" اس نے مجھے پہچان کر بولنا چاہا۔ "تو یہاں.... کہاں.... کہاں؟"

میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر داروغہ کی طرف مڑ کر بولا۔ "میرا بستر بھی اسی پورت میں لگوا دو! میں بھی یہیں رہوں گا۔"

داروغہ چلا گیا تو میں پھر اشتر کی طرف متوجہ ہوا میں دراصل داروغہ کی موجودگی میں اس سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کی بائیں ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تجھ پر قصبک

میں کیا گزری اشتر؟ تو شدید زخمی معلوم ہوتا ہے!" میں اس سے ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔

جواباً" وہ کراہا پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "بوغا! ... میں زندہ... زندہ ہی بچ گیا تو بہت ہے.... مگر.... مگر نہیں! شاید.... شاید میں زندہ نہ بچ سکوں.... آہ!...."

میں نے محسوس کیا کہ اسے بولنے میں دقت محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی۔ "نہیں شتر! تو یوں نہیں مر سکتا۔ تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

میری بات سن کر اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی، پھر اس نے بدقت کہا۔ "مجھے... مجھے معلوم ہے کہ تو مجھے دلاسا دے رہا ہے اور اگر تیری بات ٹھیک بھی ہو تو اس... اس کی.... ایسے آدمی کی کیا زندگی جس کا ایک پیر ٹوٹ گیا ہو اور ایک ہاتھ کی کلائی چیخ گئی ہو۔"

"مگر یہ سب ہوا کیسے؟" میں نے پر تجسس آواز میں کہا۔

"بڑی لمبی کہانی ہے۔ مجھے تو خود... خود اس پر حیرت ہے کہ میں زندہ کیسے بچ گیا! بھلا کوئی... آہ!" وہ پھر کچھ کہتے کہتے کراہنے لگا۔

وہ اس وقت شدید تکلیف کے عالم میں تھا یہ سوچ کر میں نے کہا۔ "فی الحال تو شاید زیادہ تکلیف محسوس کر رہا ہے۔ میں رات بھر یہیں رہوں گا۔ تو کچھ دیر چپ رہ!"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں یام کے خدمتگاروں کو دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اب تک داروغہ یورت سے میرا سامان لے کر وہاں کیوں نہیں پہنچے! میں مہمانوں کے یورت سے نکلا ہی تھا کہ داروغہ ادھر آتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے دو خدمتگار بھی تھے جو میرا سامان اٹھائے ہوئے تھے۔ میں رک گیا۔

خدمتگاروں نے میرا سامان لا کر یورت میں رکھ دیا اور میرے لیے بستر بھی بچھا دیا۔ داروغہ سب کام اپنی نگرانی میں کرا رہا تھا۔ جب میں کھانا کھا کر فارغ ہوا تو اشتر کی آواز سنائی دی وہ پانی مانگ رہا تھا میں نے اٹھ کر اسے پانی پلایا کیونکہ خدمتگار یورت سے جا چکے تھے۔ مجھے اس کی حالت پر بڑا ترس آیا کہ وہ خود سے اٹھ کر پانی بھی نہیں پی سکتا تھا۔

اشتر کی حالت اب پہلے سے کسی قدر غنیمت نظر آ رہی تھی۔ میں نے جب پانی پلا کر اسے دوبارہ بستر پر لٹا دیا تو وہ بولا۔ "بوغا! تو نے میرے اس سوال کا کوئی جواب کیوں نہیں دیا جو میں نے شاید مجھے دیکھتے ہی کیا تھا۔ تو کدھر جا رہا ہے؟"

"ادھر جدھر سے تو آ رہا ہے اشتر!" میں نے بوجھل سی آواز میں جواب دیا۔

میری بات سن کر اس کا زرد چہرہ مزید زرد پڑ گیا اور معاً" چیخ سا پڑا۔

"بوغا! نہ جا ادھر کہ وہاں ہر قدم پر موت اپنا جال بچھائے بیٹھی ہے۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز سانس لینے لگا جیسے اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔ چند لمحے کے توقف سے وہ کچھ اداس اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "مگر بوغا میں اور تو.... ہم تو کھلونے ہیں کھیلنے والے ہاتھ تو کوئی اور ہی ہیں۔ ہماری یہ مجال کہاں کہ خود سے کھیلنے والے ہاتھوں کی گرفت سے بچ سکیں اور اپنے وجود کو ریزہ ریزہ ہونے سے بچا سکیں! تو بھی شاید سائیں خان کا کوئی پیغام لے کر وہاں جا رہا ہو گا!"

"ہاں!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "تیرا خیال صحیح ہے اشتر! مگر کیا تو مجھے پیش آنے والے خطروں سے آگاہ کر سکتا ہے تاکہ میں ان سے مدافعت کے بارے میں سوچ سکوں؟"

"مدافعت ان خطروں سے ممکن ہوتی ہے بوغا جنہیں ٹالا جا سکے، جن سے بچا جا سکے لیکن تو بھی جانتا ہے کہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نا ممکن ہے۔ آدمی دہکتے الاؤ میں ہاتھ ڈال دے گا تو اس کا ہاتھ جلنا لازمی ہے۔ کیا تجھے منلیک نے روسودان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو تو مجھ سے پوچھ رہا ہے؟" اشتر ٹھنڈا سانس لے کر چپ ہو گیا۔

"ہاں منلیک نے مجھے بہت کچھ بتایا تھا، لیکن میں وہ سننا چاہتا ہوں جو تجھ پر گزری۔" میں نے کہا۔

"تو سن بوغا! مجھ پر جو گزری، وہ شاید قصبک جانے والوں پر پہلے بھی گزرتی رہی ہے۔" اشتر نے اپنی روداد سنانا شروع کی۔ "میں قصبک پہنچا اور وہاں پہنچتے ہی

مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے آدمی پہاڑوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں کہ خوب صورت اور اجنبی نوجوانوں کو پکڑ لیں۔ سو میں بھی پکڑا گیا۔ میں نے گرفتار کرنے والوں کو بتایا کہ میں سائیں خان کا قاصد ہوں مگر میری توقع کے خلاف ان لوگوں پر اس اطلاع کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بے نیازی سے یوں ہنس دیے جیسے ان کی نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ میرے حد سے زیادہ اصرار پر انہوں نے یہ ضرور کیا کہ مجھے اسی دن اس جسم موت کے سامنے پیش کر دیا جسے ملکہ روسودان کہتے ہیں۔ میں نے اس کے حسن کا چرچا ہی چرچا سنا تھا مگر اسے دیکھا کبھی نہیں تھا۔ اسے قریب سے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ وہ سارے لفظ جو اس کے حسن کی مدح و سرا میں' میں نے سنے تھے' وہ لفظ جھوٹے تھے۔ ملکہ روسودان اس سے کہیں زیادہ حسین اور کہیں زیادہ جوان نظر آ رہی تھی۔ مجھے یہ بات جھوٹ لگی کہ اس کے کوئی جوان بیٹی بھی ہو گی۔" یہ کہتے کہتے اشتر جیسے کہیں کھو گیا۔ شاید وہ ملکہ روسودان کے تصور میں گم ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"اشتر!" جب وہ کچھ دیر خاموش رہا تو میں نے اسے مخاطب کیا۔

"ہاں!" اس نے یہ کہتے ہوئے اس طرح آنکھیں کھول دیں جیسے گہری نیند سے بیدار ہوا ہو۔ "میں گزری ہوئی ساعتوں کو جمع کر رہا تھا۔ ہاں تو میں تجھے بتا رہا تھا کہ میں نے ملکہ روسودان کو دیکھا اور مجھے اس نظارے کی قیمت ادا کرنی پڑی میں نے سائیں خاں کا تحریری پیغام اسے دیا جسے اس نے بغیر پڑھے پھاڑ دیا اور بولی کہ وہ جانتی ہے' کیا لکھا گیا ہو گا اس کے بعد مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا کہ وہ اپنے آدمیوں سے مجھے رہا کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔" یہ کہہ کر اشتر تلخی سے ہنسا پھر بولا۔ "وہ بھی عجب رہائی تھی۔ مجھے اس کی خوابگاہ میں قید کر دیا گیا ہاں میں اسے قید ہی کہوں گا کیونکہ مجھے خوابگاہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ خوابگاہ کے باہر مسلح جوان پہرہ دے رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہاں تنہا رہا پھر میں نے ملکہ روسودان کو وہاں آتے دیکھا۔ اس کے جسم پر اب ایسا لباس تھا جسے لباس کہنا بھی لباس کی توہین ہے۔ میں اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ جیسے مجھے صحرا میں ہرا بھرا باغ نظر آ گیا ہو۔ ابھی میں اپنے حواسوں پر قابو نہ پا سکا تھا کہ وہ میرے اس قدر قریب آ گئی کہ میں نے اس کے جسم کی خوشبو اپنے سانسوں میں اترتی محسوس کی اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں اس کے سپاہیوں کے نرغے میں تھا جو مجھے اس کی خوابگاہ سے گھسیٹ کر باہر لے جا رہے تھے اور وہ اپنے بستر پر لیٹی عجیب سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میں نے فریاد کی اور فریاد کے جواب میں مجھے اسی کے سامنے زدوکوب کیا گیا۔ وہ قہقہے لگاتی رہی اور اس کے سپاہی مجھے خوابگاہ سے اٹھا گئے۔ مجھے زنداں میں ڈال دیا گیا اور میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ زنداں میں مجھے بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ دوسری شب بھی ملکہ روسودان نے میرے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہا جو گزشتہ شب کر چکی تھی لیکن اب میں اس کا اصل چہرہ دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس کا کھلونا بننے سے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے رام کرنے کے لیے میری بھوک پیاس ختم کر دی لیکن میں رام نہ ہوا۔ وہ جھنجلا اٹھی اور ایک دم غضب ناک ہو گئی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو بلا کر حکم دیا کہ وہ مجھے اس کے قلعے کی بلند دیوار سے نیچے دھکیل دیں۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ اس نے میری ایک نہ سنی سو یوں گویا میری موت کا حکم صادر ہوا۔ اس کا قلعہ ایک اونچی پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ جب مجھے قلعے کی دیوار پر کھڑا کیا گیا تو مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ موت مجھ سے کتنے قریب آ چکی ہے! قلعے کی بلند دیوار کے نیچے ڈھلواں پہاڑی پر برف جمی ہوئی تھی۔ میں اپنے حواس کھو بیٹھا اور ان محافظوں سے بھڑ گیا جو مجھے دیوار سے نیچے پھینکنے والے تھے مگر وہ محافظ شاید پہلے ہی سے میری حملے کے متوقع تھے۔ میں ان کے چنگل سے نہ نکل سکا۔ اور پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ نہ جانے کب انہوں نے مجھے نیچے دھکیل دیا اور نہ جانے کب تک میرا جسم اس پہاڑی پر لڑھکتا رہا! مجھے کچھ یاد نہیں۔" یہ کہہ کر اشتر خاموش ہو گیا۔

"پھر... پھر تو زندہ کیسے بچ گیا؟" میں نے بے چین

سے پوچھا۔

وہ تلخی سے پھر ہنسا۔ "تو تیرے خیال میں، میں زندہ ہوں! اس زندگی سے تو موت بہتر تھی۔ مگر خیر تو سننا ہی چاہتا ہے تو سن! جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو برف کی قبر میں دفن پایا اور یہی میری زندگی کا راز تھا ورنہ شاید اس کے سپاہی مجھے زخمی حالت میں زندہ پا کر قتل کر دیتے۔ میں برف میں دب گیا تھا اور اس طرح ان کی نظر سے محفوظ رہا تھا۔ میرے چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ میں نے اس برف کی قبر سے نکلنا چاہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں اپنا ایک پیر اور ایک ہاتھ توڑ بیٹھا ہوں۔ دوبارہ زندگی پا جانے سے میں پرجوش ہو گیا اور یہ جوش ہی مجھے اس برف کی قبر سے باہر لانے کا سبب بنا ورنہ میں وہیں دفن رہتا۔ میں بھوکا پیاسا ان پہاڑیوں میں بھٹکتا رہا اور کئی بار میں محافظوں کی نظر سے بچا۔ شاید اس لیے کہ تجھے اپنی روداد سنا سکوں۔ مجھے خبر نہیں کہ میں کس طرح اس برف کے زنداں سے نکل کر فقاز کی چراگاہوں پر پہنچا اور پھر کیسے ایک قریبی یام تک جا سکا۔ وہ شاید ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کی کیفیت تھی۔ اس یام کا داروغہ بہت مہربان اور اچھا تھا۔ اس نے ہی میرے زخموں پر پٹیاں باندھیں۔ میں نے اس یام میں کئی راتیں گزاریں۔ پھر جب میں نے محسوس کیا کہ میں گھوڑے کی پشت پر بیٹھ سکتا ہوں تو وہاں سے روانہ ہو گیا۔ داروغہ نے سامان سفر مہیا کر دیا تھا۔ دو دن کے سفر نے مجھے نڈھال کر دیا اور میری ہمت جواب دے گئی۔ میرے زخم جیسے پھر ہرے ہو گئے اور... اور اس یام تک پہنچ کر میں اس قابل نہ رہا کہ مزید سفر کر سکوں۔ سو میں یہاں زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا ہوں۔"

اشتر کے بیان نے مجھے لرزا دیا۔ کیا مجھ پر بھی یہی سب کچھ گزرے گی؟ میں نے سوچا کہ کاش میں اس سفر پر روانہ ہونے سے گریز کرتا لیکن گریز کا مجھے حق بھی کیا تھا! اشتر نے غلط تو نہیں کہا تھا کہ ہم کھلونے ہیں، ہاں ہم جیسے لوگ کھلونے ہی تو ہیں۔ مجھے اس وقت سولدہ یاد آئی۔ اگر وہ اس موقع پر میری مدد کر سکتی تو کتنا اچھا ہوتا! اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ میں قصبک جانے کی بجائے فرار ہو جاؤں۔ یہ بڑا محفوظ راستہ تھا۔ سائیں خاں میرے لوٹنے سے یہی سمجھتا کہ میں بھی اس کے بھیجے ہوئے دوسرے قاصدوں کی طرح ہلاک کر دیا گیا۔ فرار، فرار، فرار! ایک لفظ میرے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا۔ کیا فرار ممکن ہے؟ میں سوچ رہا تھا۔

"تو کیا سوچنے لگا بوغا؟" مجھے خاموش دیکھ کر اشتر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں اشتر! میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے سو جانا چاہیے اور کیونکہ صبح ہی مجھے یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔ مجھے تازہ دم ہونا چاہیے تو بھی اب سو جا!" میں نے جواب دیا۔

"تو تو نے اپنا ارادہ نہیں بدلا؟" اس نے مجھے عجیب سی نظر سے دیکھا۔

"تو نے ہی تو کہا تھا اشتر کہ ہم کھلونے ہیں اور کھلونوں کی کوئی خواہش، کوئی مرضی نہیں ہوتی۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

تو تو فرار فرار ہو سکتا ہے بوغا! فرار ہو سکتا ہے، وہ سرسراتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا۔

میں اس کی بات سن کر چونک پڑا۔ وہ بھی وہی سوچ رہا تھا جو میں نے سوچا تھا۔

"میں اگر زندہ بچ گیا اور سرائے باتو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو یقین جان کہ میں اس بات کا تذکرہ منلیک تک سے نہیں کروں گا۔" اس نے مجھے پھر اکسایا۔

خواہش تو میری بھی یہی تھی مگر میں اپنی اس خواہش کا اظہار و اقرار اشتر سے نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے بولا۔ "فرار کا دوسرا نام بزدلی ہے اشتر! اور میں بزدل نہیں ہوں۔"

میرے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ پھر کچھ نہیں بولا۔ میں اس کے قریب سے اٹھ کر اپنے بستر پر آ گیا۔ بستر پر دراز ہو کر میرا ذہن ایک بار پھر خیالات کی بھول بھلیوں میں گردش کرنے لگا، اور پھر میں نے جو کچھ اشتر سے یوں ہی کہہ دیا تھا، وہ مجھے حقیقت نظر آنے لگا۔ فرار واقعی بزدلی ہی تھی۔ اگر مجھے فرار ہی

ہونا تھا تو پھر مجھے مغربی دشت تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے قراقرم ہی میں سولدہ کا مشورہ کیوں نہیں مان لیا؟ میں نے اس شب خود کو ٹٹولا۔ کیا میں واقعی اتنا ہی بزدل اور کم ہمت ہوں جتنا خود کو ظاہر کرتا ہوں؟ اور میں نے جانا کہ ایسا نہیں ہے ورنہ میں کبھی یہ فیصلہ نہ کرتا کہ اپنے دشمنوں کے درمیان رہوں گا اور ان سے انتقام لوں گا۔ یہ فیصلہ کوئی بزدل ہرگز نہیں کر سکتا۔ سونے سے پہلے میں پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ جان جائے یا رہے، میں **قصبک** ضرور جاؤں گا، ضرور!

صبح جب میں بیدار ہوا تو یورت میں داروغہ اور اس کے بہت سے خدمتگاروں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سب اشتر کے گرد جمع تھے۔ کیا اشتر کی حالت زیادہ خراب ہو گئی؟ میں نے سوچا، مگر رات تو وہ اچھا بھلا سویا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

میں اٹھ کر داروغہ کے قریب پہنچا اور میرے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ اشتر اس کشمکش سے آزاد ہو چکا تھا جو آدمی کو جیتے جی ہار دیتی ہے، موت و حیات کی کشمکش! موت نے اشتر پر فتح پالی تھی اور اس کا مردہ جسم میرے سامنے پڑا تھا۔ وہ نہ جانے کب زندگی کی سرحدیں عبور کر گیا تھا۔ مرنے سے پہلے شاید اس نے مجھے پکارا ہو، شاید مجھ سے پانی مانگا ہو! یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"کیا رات کے وقت اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی؟" داروغہ نے مجھے اپنے پاس کھڑا دیکھ کر سوال کیا۔

"نہیں! رات کو یہ بالکل ٹھیک تھا۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"صبح جب ایک خدمتگار تمہیں بیدار کرنے یورت میں آیا تو اس کی نظر اشتر کے مردہ چہرے پر پڑ گئی۔ وہ تمہیں بیدار کرنے کی بجائے الٹے پاؤں میرے یورت میں پہنچا اور مجھے بتایا کہ شاہی قاصد اشتر مر چکا ہے۔ میں ابھی ابھی یہاں آیا ہوں۔" داروغہ نے بتایا۔

اشتر کی غیر متوقع موت نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں نے اس میں اپنائیت کی خوشبو محسوس کی تھی۔ اس نے مجھے اپنا جان کر ہی تو فرار کا مشورہ دیا تھا۔ میں اس وقت تک یام ہی میں رکا رہا جب تک اشتر کو یام ہی کے قریب دفن نہیں کر دیا گیا۔

جب میں یام سے روانہ ہوا تو دھوپ میں کسی قدر تیزی آ چکی تھی۔ میں نے اپنے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے اپنا سفر تیز رفتاری سے طے نہ کیا تو اندھیرا ہونے سے پہلے اس یام تک نہ پہنچ سکوں گا جہاں مجھے آئندہ شب گزارنی تھی۔

وہ دن تمام ہوا اور وہ شب بھی۔ دوسرے دن دوپہر تک میں قفقاز پہنچ چکا تھا۔ قفقاز کی چراگاہیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے پس منظر میں نیلے جاودانی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ پہاڑیاں جو میری منزل اور مقدر تھیں۔ مقدر اور منزل جن کے بارے میں فیصلہ کن طور پر کبھی کچھ نہیں کہا جا سکتا! مقدر میں کیا ہے کسے خبر! اور منزل ملے گی بھی یا نہیں، کون جانے! ہاں منزل کا قصد ضرور کیا جا سکتا ہے، سو میں نے بھی کیا۔

چراگاہوں کے شروع ہی میں مجھے ایک یام نظر آ گیا۔ غالباً "یہ وہی یام تھا جہاں اشتر ٹھہرا تھا۔ میں یام کے داروغہ سے ملا اور اسے شہباز کی لوح دکھائی۔ حسب توقع اس نے دوسرے تمام کام چھوڑ کر میری رہائش کا بندوبست کرنے کے لیے خدمتگاروں کو احکامات دیے۔

میں رہائش کا بندوبست ہونے کے بعد داروغہ کے ہمراہ اس کے یورت سے نکل ہی رہا تھا کہ میری نظر ایک شخص پر پڑی اور میں اسے دیکھ کر رک گیا۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی ہی کشش تھی۔ وہ داروغہ کے یورت میں داخل ہوا تھا۔ دراز قد، چوڑی چمکتی ہوئی پیشانی، گورا رنگ، چہرے پر گھنی مگر چھوٹی سے داڑھی، ستواں ناک، سر پر دستار، جسم پر ڈھیلا سا لبادہ، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔

داروغہ نے بھی اس شخص کو دیکھ لیا اور اس کے سامنے احتراماً جھکتا ہوا بولا۔ "اے ابو نصار! میں ابھی

آیا۔ ذرا شاہی قاصد کو مہمانوں کے یورت تک چھوڑ آؤں۔"

ابو نصار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی کھیلنے لگی، پھر اس نے کہا۔ "اس شاہی قاصد کی کچھ خبر ملی جو یہاں سے زخمی حالت میں گیا تھا؟ مجھے اس کے سر پر قضا کھیلتی نظر آئی تھی۔"

"اس کی خبر بھلا کون دیتا!" داروغہ نے پر تاسف لہجے میں جواب دیا، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آؤ!"

میں داروغہ کے ہمراہ یورت سے نکل گیا مگر میرے کانوں میں ابو نصار کا کہا ہوا جملہ گونج رہا تھا جو اس نے یقیناً "اشتر کے بارے میں کہا تھا۔ مجھے اس شخص کے بارے میں کچھ جاننے کا تجسس ہوا۔

"وہ شخص جسے تو نے ابو نصار کہہ کر مخاطب کیا تھا، کون تھا؟ اور کہاں کا باشندہ تھا؟" میں نے داروغہ کے ساتھ چلتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ بظاہر ایک عرب تاجر ہے مگر دراصل اس کا مقصد اپنے مذہب کی تبلیغ کرنا ہے۔" داروغہ نے جواب دیا۔

عرب تاجر! میں چونکا۔ میرا باپ بھی تو ایک عرب تاجر ہی تھا۔ میری ماں نے مرنے سے پہلے اس کے بارے میں یہی تو بتایا تھا۔ ابو نصار کی شخصیت میں میری دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ چند لمحے کے توقف سے میں نے پھر پوچھا۔ "وہ یہاں کس مذہب کی تبلیغ کرنے آیا ہے؟"

"مذہب اسلام کی!" داروغہ نے بتایا۔ "وہ خود کو مسلمان کہتا ہے اور شاید تمہیں یہ سن کر تعجب ہوا کہ سائیں خاں کا چھوٹا بھائی برقائی خان بھی ابو نصار کی بہت عزت کرتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت دن سے تیرے یام میں ٹھہرا ہوا ہے!" میں بولا۔

"نہیں! وہ یہاں نہیں ٹھہرا۔" داروغہ یہ کہتا ہوا، مہمانوں کے یورت تک پہنچ گیا اور پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔

میں بھی داروغہ کے ہمراہ مہمانوں کے لیے مخصوص یورت میں پہنچ گیا اور اندر پہنچتے ہی بولا۔ "تو نے ابھی کہا تھا کہ وہ یہاں نہیں رہتا، پھر اس کا قیام کہاں ہے؟"

"اس کا یورت، برقائی خاں کے یورت سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یوں سمجھو کہ وہ برقائی خاں کا مہمان ہے۔" داروغہ نے کہا۔

"پھر وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ کیا وہ تیرا بھی دوست بن گیا ہے؟"

"دوست تو خیر نہیں کہا جا سکتا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کی عجیب باتیں میرے دل کو لگتی ہیں اور میں اس کی عزت کرتا ہوں۔ وہ ہر چوتھے پانچویں دن آتا ہے لیکن صرف مجھ سے ملنے کے لیے نہیں بلکہ وہ یہاں یام میں قیام کرنے والے مسافروں سے ملتا ہے اور انہیں اپنے مذہب کی اچھی باتیں بتاتا ہے۔ میں نے کئی مسافروں کو دیکھا ہے کہ وہ ابو نصار کے مذہب پر یقین لے آئے اور اسی جیسے ہو گئے۔ ممکن ہے کہ کسی دن مجھے بھی ان کی باتوں پر یقین آجائے۔" داروغہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا، پھر بولا۔ "اچھا اب میں چلوں، ابو نصار میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"ایسے کیوں نہ کر کہ اسے بھی یہیں میرے یورت میں لے آ! میں بھی اس کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔" میں نے پر اشتیاق لہجے میں کہا، پھر بولا۔ "تجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا چیز اس کی باتیں سننے پر اکسا رہی ہے! سن کر اس نے کہا تھا، اسے شاہی قاصد کے سر پر قضا کھیلتی نظر آئی تھی اور اب یہ بھی سن کر ابو نصار نے جو کچھ محسوس کیا تھا، وہ سچ ہوا۔"

داروغہ میری بات سن کر اچھل پڑا اور حیرت سے بولا۔ "کیا... کیا وہ شاہی قاصد مر گیا؟ یہاں سے تو وہ اچھا خاصا گیا تھا لیکن... لیکن تم، تمہیں... کیا وہ تمہیں ملا تھا؟"

"ہاں وہ مر گیا اور وہ مجھے ملا بھی تھا۔" میں نے کہا پھر اسے مختصراً "اشتر کی موت کے بارے میں بتایا۔

"ابو نصار واقعی کئی آنکھیں رکھتا ہے۔" داروغہ مرعوب لہجے میں بولا۔ "میں اس سے ابھی جا کر کہتا ہوں کہ تم اس سے ملنے کے خواہشمند ہو۔ اگر وہ آنے

پر راضی ہوا تو میں اسے ساتھ لے کر ابھی آیا۔"

داروغہ' یورت سے نکل گیا اور میں نے بستر پر ٹانگیں پھیلا دیں مگر لیٹا نہیں کیونکہ میں ابو نصار کا منتظر تھا۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ داروغہ ابو نصار کو لیے یورت میں داخل ہوا۔ میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں اور اس شخص کے لیے احتراماً" اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی پر اسرار اور شفیق سی مسکراہٹ تھی جو میں نے داروغہ کے یورت میں دیکھی تھی۔

"اے ابو نصار! تو میری درخواست پر یہاں تک چل کر آیا' میں تیرا شکر گزار ہوں۔" میں نے انکسار آمیز لہجے میں کہا۔

"شکر صرف ایک ذات کا واجب ہے اور وہ ذات سب سے افضل ہے یعنی باری تعالیٰ کی ذات!" ابو نصار آگے بڑھتا ہوا بولا۔ "بیٹھ جاؤ! میں اتنا بڑا آدمی نہیں کہ تم میرے لیے اٹھ کر کھڑے ہو۔"

"ابھی ابھی کچھ اور مسافر بھی آئے ہیں۔" داروغہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اگر تم خیال نہ کرو تو میں چلا جاؤں۔ تم ان سے جی بھر کے باتیں کرو!"

"ہاں' ہاں ضرور! یہ تیرا فرض ہے۔" میں نے جواب دیا پھر ابو نصار کو اپنے بستر پر بٹھا لیا۔

"ابو نصار کے قریب بیٹھ کر مجھے یوں لگا جیسے کسی گھنے سایہ دار درخت کے سائے میں بیٹھا ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی خفیف سی مسکراہٹ تھی مگر یہ مسکراہٹ بغورچی یا' تب تنگری کی مسکراہٹ سے مختلف تھی۔ مستقبل میں جھانکنے کے اہل وہ بھی تھے اور ابو نصار نے بھی ایسی ہی ایک بات کہہ کر میری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی لیکن ابو نصار میں اور ان شامانوں میں کوئی نہ کوئی فرق ضرور تھا جسے میں کوئی نام نہ دے سکا تھا۔

میں نے کچھ سوچ کر اسے مخاطب کیا۔ "اے ابو نصار! کیا تو بھی نیلے جادوانی آسمان کی سرگوشیاں سنتا ہے جو تو نے مستقبل میں جھانک کر دیکھ لیا کہ اشتر کے سر پر قضا کھیل رہی ہے؟"

"نہیں! تم نے غلط سمجھا۔ مستقبل کا حال صرف خدا جانتا ہے' اور کوئی نہیں۔ میں نے تو اس کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا۔" ابو نصار کے لہجے میں سچائی کی خوشبو تھی۔

اس کے لہجے کی سچائی کے باوجود مجھے اس کی بات نے الجھا دیا۔ اگر وہ سچ کہتا تھا تو پھر دشت میں رہنے والے شامان کس طرح مستقبل میں جھانکنے کے اہل تھے! اور پھر سولدہ نے کیسے سچی پیشین گوئیاں کی تھیں! یہی سوال مختلف الفاظ کی صورت میں میری زبان پر بھی آگیا۔ میں نے کہا۔ "اے ابو نصار! تیرے لہجے سے سچ کی خوشبو آتی ہے مگر تیری بات اس کے باوجود میں نہیں سمجھ سکا۔ اگر تو کہتا ہے کہ تیرے خدا کے سوا کسی اور کو مستقبل کا حال نہیں معلوم تو پھر ہمارے شامان کس طرح پیشین گوئیاں کرتے ہیں؟"

"کسی بھی حقیقت تک پہنچنے کے دو راستے ہوتے ہیں۔" ابو نصار بولا۔ "ایک نیک اور ایک بد! اس بات کو یوں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر مال حاصل کرنے کے دو طریقے ہوں تو ان میں سے بہتر طریقے کا انتخاب ہی ایک راست فکر کو کرنا چاہیے۔ مال محنت سے بھی کمایا جا سکتا ہے اور بغیر محنت کے بھی! یعنی زبردستی کسی کے مال پر قبضہ کر لیا جائے۔ مذہب اور خصوصاً" مذہب اسلام راہ راست کی تبلیغ کرتا ہے....."

ابو نصار نہ جانے کیا کیا کہتا رہا جن میں سے بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہ آسکیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس کی باتوں نے مجھے کسی حد تک مطمئن ضرور کیا۔ اس کے لہجے میں نہ جانے کیا اثر تھا کہ اس کی باتیں نہ سمجھنے کے باوجود میں اس سے متاثر تھا۔ میں نے اس دوران میں اس کے مذہب سے متعلق بھی کئی سوالات کیے اور اس نے جواب میں جو کچھ کہا' وہ میرے لیے نیا ہونے کے باوجود دلچسپ' عجیب اور پرکشش تھا۔ شاید یہ اس خون کا اثر تھا جو میری رگوں میں دوڑ رہا تھا' ایک مسلمان عرب تاجر کا خون!

میں نے ابو نصار سے بغداد کے بارے میں بہت

سی باتیں پوچھیں مگر اسے یہ نہیں بتایا کہ میں بغداد میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہوں اور یہ کہ میرا باپ بھی ایک عرب تاجر تھا۔

ابو نصار ابھی میرے پاس سے اٹھ کر نہیں گیا تھا کہ ایک خدمتگار میرے لیے کھانا لے کر آگیا۔

"اچھا اب میں چلوں گا بوغا!" ابو نصار نے کہا۔ اس دوران میں وہ مجھ سے میرا نام بھی پوچھ چکا تھا۔

"میں نے تمہارے جذبہ تجسس اور جاننے کے شوق سے اندازہ لگایا ہے کہ تم ذہین ہو۔"

خدمتگار میرے سامنے کھانا رکھ چکا تھا۔ میں نے ابو نصار کو بھی اپنے ساتھ کھانے پر مدعو کیا اور وہ راضی ہو گیا۔

"اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور برتن میں پانی لے کر ہاتھ دھونے کے لیے پورٹ سے باہر چلا گیا۔

کھانے کے دوران میں بھی اس سے گفتگو ہوتی رہی مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ کھانا کھاتے ہوئے بولنے سے کچھ اجتناب کر رہا ہے۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد وہ بولا۔ "کیا خبر بوغا کہ اب کبھی تم سے ملاقات ہو نہ ہو! ویسے تمہارا قصد کدھر کا ہے؟"

"میں سائیں خاں کا ایک پیغام لے کر قصبک جا رہا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"ملکہ روسودان کے پاس؟" ابو نصار نے حیرت زدہ سے لہجے میں کہا۔

"ہاں!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کیا تو بھی اس کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں کون نہیں جانتا! وہ عیاش و سفاک عورت ان اطراف میں بہت مشہور ہے اور نوجوان اس سے ڈرتے ہیں۔" ابو نصار کے لہجے سے نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "اس کے آدمی اکثر پہاڑوں سے اتر آتے ہیں اور نوجوانوں کو پکڑ لے جاتے ہیں۔ اور پھر وہ نوجوان کبھی اپنے گھروں کی طرف واپس نہیں آتے۔"

"اے ابو نصار! کیا میں بھی واپس نہ آسکوں گا؟" میں نے گھبرا کر سوال کیا۔

"کیا کہا جا سکتا ہے! لیکن خدا نہ کرے کہ ایسا ہو اور وہ تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کرے جو کرتی آئی ہے۔" ابو نصار نے جواب دیا۔

"برقائی خاں بھی اس کی طرف سے نالاں ہے۔"

"تو پھر وہ اسے پہاڑوں سے نیچے کیوں نہیں گھسیٹ لاتا؟" میں نے کہا۔ مجھے باتو خاں کا وہ جملہ یاد آگیا تھا جو اس نے میری روانگی سے قبل کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر روسودان اب بھی باز نہ آئی تو وہ اپنے بھائی برقائی خاں کو اس پر حملے کا حکم دے دے گا۔

ابو نصار نے میرا سوال سن کر ایک ٹھنڈا سانس لیا اور بولا۔

"برقائی خاں، سائیں خاں کا حکم ملے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔ "اگر روسودان باغی ہے تو اسے سزا دینا لازمی ہے اور اس کی بغاوت سے تو خود سائیں خاں بھی آگاہ ہے۔"

"اور سائیں خاں ہی کی طرف سے برقائی خاں کو یہ حکم ملا تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر روسودان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔" ابو نصار معنی خیز لہجے میں بولا۔

"مگر سائیں خاں نے یہ حکم کیوں دیا تھا؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"بڑوں کی باتیں بڑے ہی جانیں، ہم اور تم کیا جانیں! سائیں خاں کی کوئی مصلحت رہی ہو گی جو اس نے اب تک روسودان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنے دی۔" ابو نصار نے گول مول سا جواب دیا، لیکن میں نے محسوس کر لیا کہ وہ کوئی بات چھپا رہا ہے۔

"اے ابو نصار! سچ بتا کہ تو جو کچھ کہہ رہا ہے، اس سے زیادہ نہیں جانتا؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ میری بات سن کر مسکرایا اور بولا۔ "تم خاصے ذہین ہو۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا کہ واقعی ایک بات ایسی ہے جو میں تمہیں نہیں بتانا چاہتا۔"

میں جب ضد کرنے لگا تو آخر اسے وہ بات بتانی ہی

ی۔

"دراصل یہ بات مصدقہ نہیں' اس لیے میں
ہیں بتانے سے گریز کر رہا تھا۔" ابو نصار بولا۔
ایک افواہ یہ بھی ہے کہ خود سائیں خاں' ملکہ
سودان کے قرب کا آرزو مند ہے اور اسی لیے وہ اب
ب رو سودان کی خود سری کو برداشت کرتا آیا ہے۔"

"ممکن ہے کہ یہ محض افواہ نہ ہو۔" میں نے اس
ں تائید میں کہا' پھر بولا۔ "اے ابو نصار! تو نے اس
صر سے عرصے میں' میرے دل میں جگہ بنالی ہے۔
ے یہ بتا کہ کیا اس عورت' اس خطرناک عورت سے
چنے کی کوئی راہ بھی ہے؟ یقین کر کہ اب تک میں نے
ں کے بارے میں جو کچھ سنا ہے' وہ مجھے اس کی طرف
ے خوفزدہ کر رہا ہے۔"

"موت اور زندگی اللہ کے اختیار میں ہے۔" ابو
ار نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "اگر ابھی
ہارا وقت پورا نہیں ہوا تو وہ تمہیں نہیں مار سکتی!
ہی خوف کی بات تو میں تم سے صرف یہی کہہ سکتا
ں کہ صرف ایک ذات سے ڈرو' ایک ذات سے
ف کھاؤ! تمہارے دل سے ہر خوف نکل جائے گا۔
ہری مراد خدائے واحد کی ذات سے ہے۔"

ابو نصار بڑی عجیب باتیں کر رہا تھا' ایسی باتیں جو میں
نے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں' لیکن یہ حقیقت ہے کہ
ں کی باتیں مجھ پر اثر کر رہی تھیں۔ میرے وجود میں
ٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ میرے اندر غیر محسوس طور
کوئی تبدیلی ہو رہی تھی جس سے خود میں بے خبر تھا۔

کچھ دیر بعد ابو نصار نے مجھے مخاطب کیا۔ "اچھا بوغا
ب میں چلوں گا۔ خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو۔" یہ کہتا
وہ اٹھا اور میں بھی احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔

میں' ابو نصار کو یورت کے در تک چھوڑنے گیا اور
رت کے سامنے کھڑے ہو کر اسے دور تک جاتا ہوا
یکھتا رہا۔ وہ بڑا عجیب آدمی تھا۔ ایسا آدمی میں نے اب
ک نہیں دیکھا تھا۔

میں یورت میں آکر بستر پر دراز ہو گیا' تاکہ کچھ دیر
رام کر لوں اور دوبارہ سفر کے قابل ہو سکوں۔ میرا
رادہ اسی دن قصبک کے لیے روانہ ہو جانے کا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ پہاڑیوں تک اس وقت پہنچوں جب اندھیرا پھیل جائے۔ اندھیرے میں میرا فوراً" دیکھ لیا جانا ممکن نہیں تھا' اور میرا مقصد بھی یہی تھا۔

دوپہر ڈھلتے ہی میں اس یام سے روانہ ہو گیا۔ میرا رخ اب پہاڑیوں کی طرف تھا۔ قفقاز کی چراگاہوں میں اپنی بائیں جانب' یوروتوں پر مشتمل ایک بستی کو چھوڑتا ہوا' میں آگے بڑھتا رہا۔ یہ وہی بستی تھی جہاں باتو خاں کا چھوٹا بھائی برقائی خاں رہتا تھا مگر مجھے اس بستی میں نہیں جانا تھا۔

سورج کا سفر تمام ہو رہا تھا اور میں تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا ہوا پہاڑیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہاں پہنچ کر پہلا احساس مجھے شدید سردی کا ہوا۔ ہرچند کہ میرے جسم پر سردی سے بچنے کے لیے بہترین لباس موجود تھا مگر وہ بھی مجھے ناکافی محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے ایک پہاڑی کے دامن میں گھوڑا روک لیا اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ یہ پہاڑیاں صحرائے گوبی میں موجود پہاڑوں سے مختلف تھیں۔ میں نے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ میں اگر محتاط اور چوکنا رہوں تو گھوڑے پر سوار ہو کر بھی پہاڑیوں پر چڑھ سکتا ہوں۔ وہ پہاڑیاں نہ تو زیادہ بلند ہی تھیں اور نہ زیادہ ڈھلواں۔ غالباً" ان پہاڑیوں پہ بسیرا کرنے والوں نے اسی لیے انہیں منتخب کیا تھا۔

ایک پہاڑی کا چکر کاٹ کر مجھے وہ قدرتی راستہ بھی نظر آگیا جو شاید آمد و رفت ہی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ میں نے اپنا گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا۔ آس پاس سناٹا تھا اور ایک ذی روح بھی نظر نہیں آتا تھا اور یہ بات میرے لیے تعجب خیز تھی۔ وہاں کم سے کم کسی نہ کسی جانور کو تو نظر آنا ہی چاہیے تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لی کہ شاید پہاڑیوں پر بسیرا کرنے والوں نے جانوروں کا اتنا شکار کیا ہے کہ اب وہاں کوئی جانور باقی نہیں بچا۔ یا اگر کوئی تھا بھی تو وہ وہاں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ چکا ہے۔

راستوں کا علم جاننے والوں نے مجھے بتایا تھا کہ پہاڑیوں کے اس سلسلے کی ابتدائی دو پہاڑیوں سے گزر کر مجھے وہ بڑی پہاڑی نظر آجائے گی جس پر ملکہ

روسودان کا قلعہ ہے۔ ان دونوں پہاڑیوں کو عبور کیے بغیر میں وہاں تک کسی اور راستے سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔

میں نے ملکہ روسودان کے بارے میں جو باتیں سنی تھیں' ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ بہادروں کو پسند کرتی ہے۔ استر نے مجھے بتایا تھا کہ روسودان کے سپاہی ان پہاڑیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور ادھر آنے والوں کو گرفتار کر لیتے ہیں اور خود اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر میں کسی طرح روسودان کے محافظوں کی نظر میں آئے بغیر یا انہیں دھوکا دے کر اس کے قلعے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً" یہ میری بہادری کا ثبوت سمجھا جائے گا۔ ممکن ہے کہ میں اس طرح ملکہ روسودان کو متاثر کر سکوں۔ یہی سوچ کر میں نے اندھیرے میں سفر کرنے کا خطرہ مول لیا تھا۔

میں پہلی پہاڑی سے بخیریت اتر کر دوسری پہاڑی کی جانب بڑھا۔ ہر چند کہ میرا گھوڑا پہاڑی پر چڑھنے اور پھر دوسری طرف اترنے سے ہانپ گیا تھا مگر ابھی وہ اتنا نڈھال نہیں ہوا تھا کہ میں اس پر سوار ہو کر دوسری پہاڑی پر نہ چڑھ سکتا۔

دوسری پہاڑی' پہلی سے زیادہ دشوار گزار ثابت ہوئی۔ مجھے بار بار گھوڑے سے اتر کر پیدل چلنا پڑا مگر میں نے گھوڑے کو نہیں چھوڑا کیونکہ اس پر میرا سامان بھی لدا ہوا تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر میں نے سامنے کی طرف دیکھا۔ دھندلکے میں کافی فاصلے پر مجھے ایک قلعے کے برج نظر آ رہے تھے اور ان برجوں میں روشنی بھی تھی۔ قلعے کے ان برجوں میں یقیناً" محافظ ہوں گے۔ میں نے سوچا اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ نیچے اترتے ہوئے بھی مجھے گھوڑے سے اترنا پڑا۔ اس طرف ڈھلان زیادہ تھی اور جگہ جگہ برف بھی جمی ہوئی تھی۔ اگر میرے گھوڑے کا پاؤں پھسل جاتا تو میرا بچنا محال ہو جاتا۔ میں اسی لیے بڑی احتیاط کے ساتھ گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے نیچے اتر رہا تھا۔

ابھی میں نصف پہاڑی ہی اتر پایا تھا کہ میری سماعت سے کچھ ایسی آوازیں ٹکرائیں جیسے کوئی ایک شخص یا کئی اشخاص اوپر چڑھ رہے ہوں۔ میں چونک کر رک گیا۔ آوازیں بدستور آ رہی تھیں اور رفتہ رفتہ قریب بھی ہوتی جا رہی تھیں۔ میں پوری توجہ اور انہماک سے نیچے کی طرف دیکھنے لگا مگر دھندلکے میں مجھے کچھ نظر نہ آ سکا۔ خطرہ دبے پاؤں میرے طرف بڑھ رہا تھا اور میں اس خطرے کی نوعیت سے بے خبر تھا۔

میں سوچ ہی رہا تھا' مجھے کیا کرنا چاہیے کہ یکایک اچانک ہی عقب سے کوئی شے' آ کر میرے جسم سے ٹکرائی اور نیچے گری' وہ ایک چھوٹا سا پتھر تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور اسی وقت ایک قہقہے سے فضا گونج اٹھی۔ مجھ سے ایک تیر کی بلندی پر کوئی شخص کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر معاً" اس کے قہقہے رک گئے۔

"گھیر لو' گھیر لو اسے!" وہ شخص چیخا۔

اردگرد موجود غاروں نے آدمیوں کو اگلنا شروع کر دیا۔ پھر وہ حلقہ بنائے میری طرف بڑھنے لگے۔ مجھے سوچ کر دکھ ہوا کہ ملکہ روسودان کے محافظوں نے بے کار مجھے گرفتار کر ہی لیا۔ اب میں اس عورت پر بہادری کا سکہ نہ بٹھا سکوں گا۔

مزاحمت اب فضول ہی تھی اور اس میں خطرہ تھا۔ وہ سب مسلح تھے اور مزاحمت کی صورت میں ان نیزوں سے میرے جسم میں سوراخ بھی کر سکتے تھے۔ مجھے بہرحال ملک روسودان ہی کے پاس پہنچنا تھا' چاہے گرفتار ہو کر چاہے بذات خود! مگر مجھے ان لوگوں کا تیور اچھے معلوم نہیں ہو رہے تھے۔ مجھے خوف تھا کہیں وہ مجھے اسی جگہ ہلاک نہ کر دیں۔

وہ نیزے بلند کیے میرے قریب پہنچ چکے تھے اب وہ شخص بھی نیچے اتر آیا تھا جس نے میری پشت پر پتھر مارا تھا۔ وہ ان سب کا سردار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا قد دراز اور چہرہ خوب صورت تھا۔ میں نے اس کو مخاطب کیا۔ "میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا' کیونکہ میں قاصد ہوں۔ میں تمہاری ملکہ کے لیے باتو خان کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ مجھے ملکہ روسودان کے پاس چلو!"

"روسودان کے پاس!" دراز قد شخص نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا' پھر بولا۔ "بھول جا کہ تو یا تو خاں کا قاصد ہے اور ملکہ روسودان کے نام کوئی پیغام لے کر آیا ہے کیونکہ اب تو شاید کبھی اس سے نہ مل پائے گا۔"

"مگر کیوں' آخر کیوں؟" میں گھبرا کر تقریباً" چیخ پڑا۔ "کیا تم مجھے یہیں ہلاک کر دو گے؟ نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے!" میں ہذیانی انداز میں چیخا۔

"نہ ہم تجھے ابھی ہلاک کریں گے اور نہ ہی ملکہ روسودان کے پاس لے جائیں گے۔" دراز قد شخص نے جواب دیا۔

"پھر.... پھر تم.... تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے بمشکل سوال کیا۔ "اور.... اور تم.... تم لوگ کون ہو؟ کیا تمہارا تعلق ملکہ روسودان سے نہیں؟"

"ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں' یہ تجھے وقت بتائے گا۔ اب زیادہ بکواس نہ کر!" دراز قد نے مجھے ڈانٹ دیا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ "باندھ لو اسے!"

مجھے رسیوں میں جکڑ دیا گیا۔ پھر انہوں نے مجھے میرے ہی گھوڑے کی پشت سے باندھ دیا اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ میرا ذہن چکرا کر رہ گیا کہ آخر میں کن لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا ہوں؟ اگر وہ ملکہ روسودان کے محافظ ہوتے تو ملکہ کا نام سن کر ان کا سردار استہزائیہ انداز میں قہقہہ نہ لگاتا اور وہ سب کچھ نہ کہتا جو اس نے کہا۔

جب وہ مجھے لے کر پہاڑی سے اترے تو اندھیرا پھیل چکا تھا' لیکن ان میں سے کسی نے مشعل روشن نہ کی حالانکہ میں ان میں سے کئی کے پاس مشعلیں دیکھ چکا تھا۔ وہ اندھیرے ہی میں اس اونچی پہاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے جس پر موجود قلعے کے برج اب ہیولے سے دکھائی دے رہے تھے۔

انہوں نے جیسے ہی اس پہاڑی پر چڑھنے کے لیے قدم رکھا' ایک تیز آواز سنائی دی۔

"شناخت!"

"اژدر!" جواب میں دراز قد چیخ اور اس کے ساتھ ہی اوپر کی جانب روشنی نظر آئی۔ وہ روشنی کسی مشعل ہی کی تھی۔

وہ لوگ بغیر رکے اوپر چڑھتے رہے اور روشنی سے قریب ہوتے رہے۔ میرا جسم خوف سے نہیں بلکہ شدید سردی سے بری طرح کانپ رہا تھا مگر وہ لوگ اطمینان سے اس شدید سردی میں بھی آگے بڑھ رہے تھے۔ اس پہاڑی پر یقیناً" برف جمی ہوئی تھی۔

اب وہ سب اس غار کے دہانے سے چند قدم دور رہ گئے تھے جس کے سامنے ایک مشعل بردار کھڑا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے دراز قد سے شناخت پوچھی تھی۔ غار کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ غار کے اندر بھی روشنی تھی۔ وہاں شاید کچھ اور افراد بھی موجود تھے۔

میری الجھن لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر یہ سب کیا تماشا ہے؟ اگر وہ ملکہ روسودان کے محافظ نہیں تو پھر اس پہاڑی پر کیوں چڑھ رہے تھے جس پر ملکہ روسودان کا قلعہ تھا؟ کیا دراز قد شخص نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو کیوں؟ اسے مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

قلعے کے پھاٹک تک پہنچنے سے پہلے کئی جگہ دراز قد شخص سے اس کی شناخت پوچھی گئی اور پھر وہ قلعے کے بلند پھاٹک کے سامنے جا کر رک گیا جو بند تھا' پھاٹک کے سامنے نیزے بردار اور کلہاڑے بردار پہرہ دے رہے تھے۔

"مبارک ہو کہ آج تم لوگوں نے بھی شکار کر ہی لیا۔" اسی نیزے برداروں میں سے ایک نے دراز قد کی طرف دیکھا پھر مجھے گھوڑے کی پشت سے بندھا ہوا دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"ہاں محنت اور تلاش کبھی تو رنگ لاتی ہے۔" دراز قد شخص نے جواب دیا اور زور سے ہنس پڑا پھر بولا "پھاٹک تو کھلواؤ"

"ابھی کھلواتے ہیں۔" نیزے بردار نے جواب دیا۔

وہ نیزے بردار مڑا اور اس کے ساتھ دوسرا بھی ان دونوں نے باہر سے پھاٹک پر مخصوص انداز میں نیزے مارے اور چیخے "اژدر آئے ہیں' دروازہ کھول دو"

انہوں نے کئی بار یہی ایک فقرہ دہرایا اور پھاٹک آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔

دراز قد اپنا قافلہ لیے اندر داخل ہوا اندر بھی محافظوں کی خاصی تعداد تھی ان میں سے کئی کے پاس مشعلیں بھی تھیں جو روشن تھیں اور وہ سب ہی مسلح تھے ہمارے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے قلعے کا پھاٹک دوبارہ بند کردیا اور میں نے سوچا کہ کیا مجھ پر زندگی کا دروازہ بند ہوگیا اندر روشنی تھی اور جگہ جگہ دیواروں میں روشن مشعلیں پیوست تھیں ایک چھوٹا سا میدان عبور کرکے وہ مجھے ایک سنگی عمارت کی جانب لے گئے میں اب تک سب کچھ خاموشی سے دیکھتا اور سنتا رہا لیکن اب تک میں کچھ بھی نہ سمجھ پایا تھا۔

انہوں نے مجھے اس سنگی عمارت میں پہنچ کر گھوڑے کی پشت سے اتار لیا' اور پھر میرے ہاتھ پاؤں بھی کھول دیئے وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے دراز قد شخص نے مجھے ان کے حوالے کردیا ان کی تعداد پانچ تھی اور وہ بھی مسلح تھے ان میں سے ایک میرے گھوڑے کو لے کر کہیں چلا گیا۔ دراز قد اور اس کے ساتھی بھی رخصت ہوگئے بقیہ چاروں محافظوں نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کردیا۔ سردی سے میرا جسم کانپ رہا تھا۔

"کیا کچھ اوڑھنے کے لیے مل جائے گا؟۔" میں نے کوٹھڑی کی سلاخوں کے قریب آکر کپکپاتے ہوئے ایک محافظ کو مخاطب کیا جو نیزہ سنبھالے کوٹھڑی کے سامنے کھڑا تھا۔

"ہاں مل جائے گا۔" اس نے جواب دیا۔ پھر بولا "کیا تو گرم علاقوں سے آیا ہے"

"ہاں۔" میں نے کہا۔

اس محافظ نے اپنے ایک ساتھی سے کسی جانور کی کھال لانے کو کہا۔

"کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ مجھے یہاں کیوں قید کردیا گیا ہے؟۔" میں نے اس محافظ کو ہمدرد سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

"اس لیے کہ تم اجنبی ہو نوجوان ہو اور خوبصورت ہو۔" محافظ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"لیکن یہ کوئی جرم تو نہیں۔" میں بولا۔

"تو تمہیں مجرم کون کہہ رہا ہے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"پھر مجھے قید کیوں کیا گیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"یہ قید عارضی ہے صرف کچھ دیر کے لیے' ابھی جاروق آئے گا اور تمہیں یہاں سے لے جائے گا۔ اس نے جواب دیا "پھر تمہیں غسل دیا جائے تمہارے جسم پر خوشبو ملی جائے گی اور تمہیں بہترین سمور پہنایا جائے گا اور۔۔۔ اور۔۔۔ اس کے بعد۔۔۔" کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"اور اس کے بعد' اس کے بعد کیا ہوگا؟۔" میں نے دریافت کیا۔

"وہ تم خود دیکھ لوگے۔" وہ پھر مسکرایا۔

"یہ جاروق کون ہے؟۔" میں نے معلوم کیا۔

"وہی جو تمہیں یہاں چھوڑ گیا تھا۔" اس نے بتایا اور میں نے سمجھا کہ دراز قد کا نام جاروق ہے۔

اسی دوران میں اس محافظ کا ساتھی بڑے بڑے بالوں والے کسی جانور کی کھال لے آیا جو میلی اور بدبودار تھی۔ محافظ نے سلاخوں میں سے وہ کھال میری طرف بڑھا دی میں نے اس سے کھال لے کر اوڑھ لی اور میرے کپکپاتے جسم کو کھال اوڑھ کر کچھ راحت سی محسوس ہوئی ہر چند کہ بدبو کے مارے میرا دماغ پھٹا جارہا تھا مگر سردی اتنی شدید تھی کہ میں وہ بدبودار کھال اوڑھنے پر مجبور تھا۔

میں کھال اوڑھ کر کوٹھڑی کے ایک کونے میں گٹھری ہوا نہ جانے کتنی دیر پڑا رہا کہ اچانک میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی میں نے دروازے کی طرف دیکھا تو جاروق اندر داخل ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ دو دوسرے افراد بھی تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

"اٹھ۔" اس نے جھک کر میرا بازو پکڑ لیا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھتے ہی مجھے پھر سردی لگی میرا جسم بری طرح کانپنے لگا۔

"تم اب مجھے کہاں لے جارہے ہو؟۔" میں نے اس سے بمشکل پوچھا کیونکہ سردی کی وجہ سے بولنا

بھی مشکل ہو رہا تھا۔

"کوئی ضروری نہیں کہ میں تیری ہر بات کا جواب دوں۔" جاروق کی آواز میں سختی تھی "خاموشی سے ساتھ چلا چل" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے آگے کی طرف گھسیٹا۔

"اور اگر میں بغیر کچھ معلوم کیے تیرے ساتھ جانے سے انکار کر دوں تو؟۔" مجھے بھی اس کے رویئے پر غصہ آگیا۔

وہ جواب میں کریہہ سے انداز میں ہنس پڑا پھر بولا "اگر تو جاروق کو جانتا تو یہ جملہ کہنے کی ہمت نہ کرتا مگر تو اجنبی ہے اس لیے میں تیری گستاخی کو نظر انداز کیے دے رہا ہوں کیا تجھے قصبہ بھیجنے والے نے یہ نہیں بتایا کہ یہاں آنے والے کبھی لوٹ کر نہیں جاتے؟" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں درندگی سی عود کر آئی اور میں اس درندگی کو محسوس کر کے ڈر گیا۔

مجھے اسی میں عافیت نظر آئی کہ خاموشی سے وہ کرتا جاؤں جو وہ کہتا رہے لیکن اس کے باوجود بھی میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

"کیا تم مجھے ملکہ روسودان کے پاس لے جائے گا؟۔"

"نہیں!۔" اس نے سخت لہجے میں جواب دیا پھر کہا "اب اگر تیری زبان بند نہ ہوئی تو میں یہ خیال نہیں کروں گا کہ تو اجنبی ہے اور مجھے نہیں جانتا۔"

میں خاموش ہو گیا کہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا جاروق اور اس کے دونوں ساتھی مجھے اپنے ہمراہ اس نگلی عمارت سے باہر نکال لائے میں سہما سہما سا ان کے ساتھ چلتا رہا، پتھروں اور چٹانوں کو کاٹ کر بنائے گئے اونچے نیچے مختلف راستوں سے گزر کر میں ایک ایسی عمارت کے دروازے کے سامنے پہنچا جو سنگ سفید سے بنائی گئی تھی، اس عمارت کے دروازے پر خوبصورت نوجوان پہرہ دے رہے تھے انہوں نے جاروق کو آتے دیکھ کر اپنے سر جھکا دیئے جس سے میں نے جانا کہ جاروق کوئی کم رتبہ شخص نہیں ہے۔

نگی عورت کے محافظ نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا میرے ساتھ وہی ہوا مجھے غسل کرنے کے لیے گرم کھولتا ہوا پانی دیا گیا تاکہ میں شدید سردی میں نہاتے ہوئے اکڑ کر نہ رہ جاؤں، جب میں غسل سے فارغ ہوا تو وہاں موجود نو عمر لڑکوں نے میرے جسم پر ایک عجیب سا روغن ملا جو انتہائی خوشبودار تھا اس کے بعد مجھے بہترین سمور کے لبادے پہنے کو دیئے گئے۔ جب میں اس کمرے سے لباس پہن کر نکلا جہاں غسل کیا تھا تو جاروق کو باہر اپنا منتظر پایا میرا ذہن یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ مجھے اس اہتمام سے کس کے سامنے پیش کیا جائے گا کیونکہ جاروق اس بات سے انکار کر چکا تھا کہ وہ مجھے ملکہ روسودان کے پاس لے جا رہا ہے۔

وہ عمارت اندر سے اتنی ہی صاف ستھری اور خوبصورت تھی جتنا صاف اور حسین سرقوشی بیگی کا محل تھا، اس کا فرش بھی دیواروں کی طرح سنگ سفید کا تھا اور کچھ کچھ فاصلے سے مشعلیں دیواروں میں پیوست تھیں میں جاروق کے ہمراہ خاموشی سے اطراف کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ جاروق سے مزید کچھ پوچھ کچھ کر سکوں۔

مختلف راہداریوں سے گزرنے کے بعد جاروق ایک ایسی راہداری میں داخل ہوا جس کے سامنے دو کلہاڑے بردار مستعد کھڑے تھے اور انہوں نے راستا روک رکھا تھا بقیہ راہداری خالی تھی جاروق مجھے اور اپنے دو ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھا اور ان کلہاڑے برداروں کے نزدیک پہنچ کر آہستہ سے کچھ کہا ان دونوں نے پلٹ کر میری جانب دیکھا اور سر ہلا دیئے جاروق پھر میرے پاس آگیا۔ اس نے میرا بازو تھاما اور آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

جاروق تو وہیں رک گیا اور ان دو کلہاڑے برداروں میں سے ایک مجھے اپنے ساتھ لے کر اس راہداری میں چلا کافی فاصلہ طے کر کے بائیں جانب ایک موڑ آیا جو پہلے مجھے دور سے نظر نہ آسکا تھا۔ کلہاڑہ بردار مجھے اسی جانب لے گیا۔ مڑتے ہی میں نے دیکھا کہ ہر دو قدم کے بعد ایک کلہاڑا بردار مستعد و چوکنا کھڑا ہے۔ میں ڈرتا جھجکتا ان کے سامنے سے گزرتا رہا۔

کچھ فاصلہ طے کر کے بائیں ہی جانب ایک دروازہ نظر آیا جو بند تھا۔

اس دروازے کی دونوں طرف بھی مسلح محافظ کھڑے تھے وہ کلہاڑہ بردار محافظ دروازے کے سامنے جا کر رک گیا جو مجھے وہاں تک لے کر آیا تھا۔

"اسے جاروق نے شکار کیا ہے اسے اندر لے جا۔" کلہاڑہ بردار دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے محافظوں میں سے ایک کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

وہ محافظ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بولا "جاروق نے بہت دن بعد اتنا اچھا شکار کیا ہے اسے یقیناً" بڑا انعام ملے گا" یہ کہہ کر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا "چل' میرے ساتھ چل" اس نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔

دروازہ شاید اندر سے بند نہیں تھا اسی لیے جب محافظ نے اپنے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا کھل گیا۔

اندر داخل ہو کر مجھے یوں لگا جیسے میں خاقان قوتوق یا ملکہ تورا کینہ کی خوابگاہ میں داخل ہو گیا ہوں وہی ریشمی پردے' وہی خوشبو اور وہی خواب خواب عالم میں نے خاقان تتوق کی خوابگاہ تو کبھی نہیں دیکھی تھی لیکن ملکہ تورا کینہ کی خوابگاہ ضرور دیکھی تھی۔ وہ بھی ایسی ہی تھی۔

"جاروق شکار کر کے لوٹا ہے اور اس بار وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔" محافظ نے با آواز بلند ان ریشمی پردوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جن کی دوسری جانب مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ وہ پردے بھاری تھے اور ان کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا یقیناً" ان پردوں کے پیچھے کوئی تھا جسے محافظ نے مخاطب کیا۔

"تو اسے چھوڑ جا' میں دیکھ لوں گی۔" پردوں کے پیچھے جیسے گھنٹیاں سی بج اٹھیں اس آواز میں ایسا لوچ' ایسی نازکی اور ایسا گداز تھا کہ میری سماعت نے اس کی لذت محسوس کی۔

محافظ الٹے قدموں دروازے کی طرف چلا گیا اور میں وہیں مبہوت سا کھڑا رہ گیا میں چونکا اس وقت جب میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی میں نے مڑ کر دیکھا دروازہ واقعی بند ہو چکا تھا کمرے میں پہلے سناٹا سا چھایا رہا پھر مجھے ہلکی ہلکی سرگوشیاں سنائی دیں۔ جو ریشمی پردوں کے پیچھے سے ابھر رہی تھیں۔ مجھے اپنی بے بسی و مجبوری کا احساس تھا اور یہ احساس بھی تھا کہ مجھے اس طرح کشاں کشاں لائے جانے کا مطلب کیا ہو سکتا ہے کیا ایک عورت کے سامنے بھی مرد اتنا بے بس ہو سکتا ہے؟ یہ سوچ کر مجھے اپنے وجود پر غصہ آیا کئی بار میں نے اپنے بارے میں "شکار" کا لفظ سنا تھا اور اس لفظ نے بھی میرے اندر چھپے ہوئے غصے کو ہوا دی تھی گویا میں آدمی نہیں شکار ہوں' شکار کا لفظ تو جانوروں کے لیے استعمال ہوتا ہے تو کیا وہ مجھے جانور سمجھ رہے ہیں لمحہ بہ لمحہ میرا غصہ بڑھتا گیا مجھے جاروق پر بھی سخت تاؤ آ رہا تا جس نے مجھ سے آخری وقت تک جھوٹ بولا تھا کیونکہ وہ نسوانی آواز سن کر اب میں سمجھ چکا تھا کہ مجھے ملکہ روسودان ہی کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

اس آواز کے گداز اور حسن کے باوجود مجھے اپنے اندر سے ایک نفرت کا لاوا ابلتا محسوس ہو رہا تھا وہ ملکہ روسودان ہی تو تھی جس نے اشترکو اپنے قلعے کی فصیل سے نیچے پھنکوا دیا تھا' اور نہ جانے اشتر کے علاوہ بھی وہ کتنے نوجوانوں کی زندگی سے کھیل چکی تھی۔ مجھے اس وقت غصے میں یہ خیال ہی نہ رہا کہ خود میری زندگی بھی خطرے میں ہے۔

بزرگوں نے اسی لیے تو کہا ہے کہ غصے سے عقل کو زنگ لگ جاتا ہے۔

میں انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ ریشمی پردوں کے پیچھے جیسے حرکت سی ہوئی میں چوکنا ہو گیا' اسی وقت پھر ہلکی سی سرگوشی ابھری میں ہمہ تن گوش ہو گیا مگر سرگوشیوں میں ادا کیے جانے والے الفاظ سن نہ سکا۔

معاً" ریشمی پردوں میں سے ایک پردہ اٹھا اور میرے سارے اعصاب جھنجھنا اٹھے ریشمی پردہ اٹھا کر باہر آنے والی کوئی عورت نہیں بلکہ ایک وجیہہ خوبصورت نوجوان تھا' اس نوجوان نے مجھے کینہ توز نظر سے دیکھا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

ابھی اس نوجوان نے دروازے سے باہر قدم رکھا ہو گا کہ میری سماعت سے وہی شہد جیسی آواز ٹکرائی "اے اجنبی میں تیرا دیدار کرنا چاہتی ہوں چلا آ تمام

پردے اٹھاتا ہوا چلا آکہ جاروق میرے لیے اچھے شکار لاتا رہا ہے۔"

پھر میرے لیے وہی لفظ استعمال کیا گیا جس نے میرے خون کو کھولا دیا تھا مجھ میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ با آواز بلند احتجاجاً" بولا "اے ملکہ میں آدمی ہوں کوئی جانور نہیں جس کا شکار کیا گیا ہو۔"

جواب میں ہنسی کی ایسی آواز ابھری جیسے بیک وقت بہت سے داستاں سراؤں کی انگلیاں اپنے اپنے اکتاروں پر پڑی پھر وہ شیریں آواز ابھری "مجھے تجھ جیسے جری اور صاف گو نوجوان پسند ہیں" پر تو کسی غلط فہمی میں ہے میں ملکہ نہیں ملکہ زادی ہوں گیا تو نے تھمرو کا نام نہیں سنا "وہ تھمرو جس کے سامنے مرد اپنی پلکیں جھپکانا بھول جاتے ہیں اور راہب تبلیغ کرتے کرتے اس کے سامنے ہکلانے لگتے ہیں۔"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور کچھ دیر کو میں سکتے میں رہ گیا۔ تو جاروق نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا تھا' میں نے سوچا۔

"میں نے تجھ سے کہا تھا کہ میرے پاس آجا پر تو ابھی تک اپنی جگہ کھڑا ہوا ہے۔" اس بار اس کی آواز میں کسی قدر سختی تھی لیکن سختی کے باوجود آواز کا حسن برقرار تھا۔

میں سحر زدہ سا ریشمی پردوں کی طرف بڑھا پردوں کی دوسری جانب بھی مدھم روشنی جھلک رہی تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے ایک پردہ اٹھایا اور ساکت رہ گیا۔ وہ منظر ہی ایسا تھا کہ آدمی ہوش کھو بیٹھے سامنے ہی دبیز قالین پر وہ پھول جیسا بدن گاؤ تکیے پر کہنی ٹیکے نیم دراز تھا اس کے جسم کا رنگ باریک سے لبادے سے باہر جھلک رہا تھا میں واقعی ہوش کھو بیٹھا اس نے جو کچھ کہا تھا غلط نہیں کہا تھا وہ حسن بے مثال کہ خواب و خیال میں بھی نہ آسکے۔

"ہوش میں آ اور قریب آکہ تو مجھے اچھا لگا کیا تو میرے حسن کے حضور سجدہ نہیں کرے گا؟۔" ان ہونٹوں میں حرکت ہوئی اور اس کے ساتھ میں جیسے ہوش میں آگیا۔

"معاً" میرے ذہن میں ابونصار کے کہے ہوئے الفاظ گونج اٹھے جو اس نے گفتگو کے دوران میں کہے تھے اس نے کہا تھا کہ سجدہ صرف ایک ہی ذات کو واجب ہے اور وہ ذات واحد' خدا کی ذات ہے میں جیسے خواب کے سے عالم میں بولا "تھمرو میں تجھے سجدہ نہیں کروں گا کہ سجدہ صرف خدا کے سامنے لازم ہے۔"

"تو کیا تو مسلمان ہے؟۔" اس نے ایک ادائے خاص سے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا "مگر مسلمان صحیح کہتے ہیں آدمی کا آدمی کو سجدہ کرنا آدمیت کی توہین ہے۔"

"تو باتیں بڑی اچھی کرلیتا ہے کیا میرے پاس نہ آئے گا۔" اس کی آواز میں بلاوا تھا "کیا تو نے کبھی مجھ جیسی حسین عورت بھی دیکھی ہے۔"

"نہیں۔" میں بولا "لیکن تیرا حسن قاتل ہے' تو اور تیری ماں دونوں کی گردنوں پر نہ جانے کتنے بے گناہوں کا خون ہے۔"

"تیری بے خوفی اب بے ادبی کی حدود میں داخل ہوتی جارہی ہے کیا تو اس سے بے خبر ہے کہ تجھ بے گناہ کا خون بھی اپنی گردن پر لیتے ہوئے مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" حسین تھمرو کے لہجے میں سفاکی عود کر آئی اور اس لہجے جیسے اس کی آواز کا سارا حسن غائب ہوگیا۔ وہ معاً" چیخ پڑی "ادھر آ"

موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہے ابونصار کے کہے ہوئے الفاظ میری سماعت میں پھر گونجے اور میں بے خوفی سے آگے بڑھا مجھے اس کے قریب جاکر یوں لگا جیسے اس کے سرخ سرخ ہونٹوں پر اس کے لہو کی سرخی نہ ہو بلکہ ان بے گناہوں کے خون کی سرخی ہو جنہیں وہ اب تک ہلاک کرچکی تھی۔

"خود سری چھوڑ دے اور آ میں تجھے ان جہانوں میں لے جاؤں جن کی ہر مرد آرزو کرتا ہے۔" وہ خوابناک لہجے میں بولی اس کی آواز میں پھر مٹھاس آگئی تھی اور وہ مجھے اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"تھمرو مجھے ان جہانوں میں جانے کی کوئی آرزو

نہیں۔" میں نے کہا "تو مجھے آزاد کردے تاکہ میں تیری ماں ملکہ روسودان سے مل سکوں میں اس کے لیے! تو خاں کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں اور وہ پیغام انتہائی اہم ہے۔"

"باتو خاں کا پیغام۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑی "تجھ سے پہلے بھی یہاں اس کے قاصد آتے رہے ہیں اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہاں قصبک میں اس کے قاصدوں کا کیا حشر ہوتا ہے ہاں یہ ضرور ہے بلکہ اس سے ہمیں یہ شکایت ہے کہ کبھی کبھی وہ عمر رسیدہ قاصدوں کو بھیج دیتا ہے جو ہمارے بالکل کام نہیں آتے اور ہمیں مجبوراً" انہیں فوراً" ہلاک کرنا پڑتا ہے رہا مسئلہ تجھے ملکہ روسودان کے پاس بھیجنے کا تو اب یہ ممکن نہیں تجھے میرے آدمی پکڑ کر لائے ہیں اور تجھ پر میرا حق ہے ملکہ روسودان کا نہیں۔"

"تو تو اس طرح کہہ رہی ہے جیسے میں جنگ میں ہاتھ آجانے والا مال غنیمت ہوں۔" میں نے حقارت بھرے لہجے میں کہا کیونکہ اب میرے ذہن پر اس کے حسن کا سحر نہیں تھا۔

"سن اے اجنبی نوجوان تھمرو ایک حد تک نازبرداریاں کرتی ہے اور وہ حد اب گزر چکی ہے اگر تو چاہتا ہے کہ ابھی کچھ دن اور زندہ رہے تو اپنی گستاخ زبان کو لگام دے ورنہ....."

"ورنہ تو مجھے قلعے کی فصل سے نیچے پھنکوا دے گی۔" میں نے اس کی بات پوری کردی۔

"نہیں میں تجھے اتنی آسانی سے نہیں مرنے دوں گی اور تجھ سے اتنی جلدی دستبردار نہیں ہوں گی تھمرو جسے اچھا کہہ دیتی ہے جسے پسند کرلیتی ہے اسے ہر قیمت پر اس کے سامنے کم از کم ایک بار تو جھکنا ہی پڑتا ہے' چاہے پھر تھمرو ایک بار کے بعد اسے ٹھکرا ہی کیوں نہ دے بول تجھے دونوں میں سے کیا بات پسند ہے تو صرف چند راتوں کی زندگی چاہتا ہے یا اس سے زیادہ جینے کا آرزو مند ہے ہاں یہ سن لے کہ موت بہرحال تیرا مقدر ہے۔ صرف موت تک کا وقفہ کم یا زیادہ ہوسکتا ہے۔ یہ اب تیرے اختیار میں ہے کہ مرنے میں جلدی کرے یا دیر" یہ کہہ کر وہ معنی خیز نگاہ سے مجھے دیکھنے لگی جیسے اپنی دی ہوئی دھمکی کا اثر میرے چہرے پر تلاش کررہی ہو۔

"جب تو مجھے ہلاک ہی کرنے کا فیصلہ کرچکی ہے تو پھر اس میں دیر کیا اور جلدی کیا۔" میں نے بے خوفی سے کہا اور مجھے اپنی آواز پر خود بھی حیرت ہوئی' میرے لہجے میں ایسی بیباکی پہلے تو نہیں تھی' یہ ابونصار نے ایک ہی دن میں مجھ پر کیا جادو کروایا تھا کہ میرے دل سے موت کا خوف جاتا رہا تھا۔

میری بات سن کر وہ ایک دم برہم ہوگئی "خاموش" وہ چیخی اور اٹھ کھڑی ہوئی اس کا پھول سا جسم غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔

وہ کسی صحرائی طوفان کی طرح میرے قریب سے گزری۔

اور پھر میں نے اس کی تیز بلند آواز سنی۔

"اسے لے جاؤ یہاں سے اور بتاؤ کہ تھمرو کے روبرو کیسے گفتگو کی جاتی ہے۔"

میں نے اس دوران میں دروازہ کھلنے کی آواز بھی سنی تھی۔ تھمرو یقیناً" اپنے محافظوں سے مخاطب تھی۔ میں مبہوت سا ریشمی پردوں کے پیچھے کھڑا رہا۔ اور پھر میں نے وہ ریشمی پردے اٹھتے دیکھے دو کلہاڑے بردار میری طرف بڑھ رہے تھے اور ان کے تیور خطرناک تھے۔

"چلو۔" ان میں سے ایک میرے قریب پہنچ کر غرایا۔

میں بغیر کچھ کہے ان کے ساتھ ہولیا' ریشمی پردوں سے نکل کر میں نے دیکھا کہ تھمرو کھڑی ہوئی ہے اس نے کلہاڑے برداروں کو سخت لہجے میں مخاطب کیا "جاروق سے کہلوا دینا کہ وہ اس کے سارے کس بل آج ہی نکال دے اور جب یہ کل رات میرے سامنے پیش ہو تو اس کا سر جھکا ہوا ہو" وہ یہ کہہ کر ریشمی پردوں کی طرف بڑھ گئی پھر جاتے جاتے اک دم پلٹی اور کہا "سمیر کو پھر بھیج دو"

میں سمجھ گیا کہ سمیر شاید اس وجیہہ نوجوان کا نام تھا جو مجھ سے پہلے تھمرو کے قرب کی خوشبو سے سرشار ہورہا تھا یا تھمرو اس نوجوان سے اپنے حسن کا خراج

وصول کر رہی تھی۔

کلہاڑے بردار مجھے تھمرو کی خوابگاہ سے لے کر باہر نکل گئے ان کا رویہ اور انداز و اطوار ایسے تھے کہ اگر میں نے ذرا بھی مزاحمت کی تو وہ کلہاڑے سے میری گردن اڑا دیں گے۔

کچھ دیر بعد ہی مجھے تھمرو کے پیغام کے ساتھ جاروق کے سپرد کر دیا گیا جو اب تک اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ اس راہداری کے سرے پر موجود تھا' جہاں اس نے مجھے کلہاڑے برداروں کے سپرد کیا تھا' شاید اسے اس جگہ سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

جاروق مجھے پھر اسی سنگی عمارت میں لے آیا جہاں ایک کوٹھڑی میں مجھے پہلے قید کیا گیا تھا۔ اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور وہ مجھے بڑی خونخوار نگاہ سے دیکھ رہا تھا' سنگی عمارت میں موجود محافظ بھی میرے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ جاروق نے ان میں سے ایک سے کہا کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھول دو۔

دروازہ کھلا اور مجھے اندر دھکیل دیا گیا پوری بے رحمی نفرت اور سفاکی کے ساتھ! پھر جاروق نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا "گرمی بہت ہے' اسے بھی شاید گرمی لگ رہی ہو گی۔ اس کے کپڑے اتار لو! اس کے جسم پر صرف ایک پاجامہ کافی ہے۔"

جاروق کا حکم سن کر اس کے ساتھی مجھ پر اس طرح جھپٹے جیسے شاہین' کبوتر پر جھپٹتا ہے۔ انہوں نے میرے جسم سے سمور کے گرم اور بہترین کپڑے اتار لیے اور میں شدید سردی کے احساس سے تھر تھر کانپنے لگا۔ میرے پاؤں سردی کے سبب پہلے ہی کانپ رہے تھے' میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پتھریلے فرش پر گر پڑا۔

"رات بھر سردی کا مزا لے گا تو صبح تک دماغ درست ہو جائے گا۔" جاروق نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' پھر بولا۔ "اور اگر پھر بھی کس بل باقی رہے تو کل دن باقی ہے۔" وہ یہ کہہ کر آگے بڑھا۔

"لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ اگر۔۔۔" جاروق کے ایک ساتھی نے میری جانب دیکھا اور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟۔"

جاروق آگے بڑھتے بڑھتے رکا اور اپنے ساتھی کی طرف پلٹا۔

"میں۔۔۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر۔۔۔ اگر یہ رات بھر میں سردی سے اکڑ کر مر گیا تو۔۔۔ تو کیا ہو گا؟۔" جاروق کا ساتھی بولا۔

"نہیں' ایسا نہیں ہو گا۔ اس کے جسم میں اتنی جان ہے کہ یہ زندہ رہ سکے۔" جاروق کوٹھڑی کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو گیا۔ ٹھنڈا پتھریلا فرش مجھے یوں لگا جیسے میں برف پر لیٹا ہوں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا مگر سردی تو جیسے میری ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے دانت زور سے بھینچ رکھے تھے تاکہ سردی کم لگے۔ میں نہ جانے کب تک اسی طرح گٹھڑی بنا بیٹھا کانپتا رہا۔ میں قاریق (برف کا رہنے والا) نہیں تھا جو اتنی شدید سردی میں رہنے کی سزا بھی دی جا سکتی ہے اور یہ سزا اتنی خطرناک ہو سکتی ہے! جب مجھے بیٹھے بیٹھے قرار نہ آیا اور میں تھک گیا تو مجبوراً لیٹ گیا۔ لیٹ کر مجھے مزید سردی لگی تو میں نے اپنی دونوں ٹانگیں سمیٹ کر پیٹ سے لگا لیں۔

ابھی مجھے اس حالت میں لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں چونک اٹھا۔ وہ یقیناً کوٹھڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز تھی میں نے اپنی خواہش کے خلاف اور سخت سردی کے باوجود کانپتے ہوئے ٹانگیں سیدھی کیں' پھر کہنی کے بل اٹھ کر کوٹھڑی کے دروازے کی جانب دیکھا۔ ایک لمحے کو میں حیران سا رہ گیا۔ آخر تھمرو وہاں کیوں آئی ہے؟ مگر نہیں' وہ تھمرو تو نہیں تھی۔ میں نے دوبارہ پلکیں جھپکا کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ کوٹھڑی کے دروازے سے گزر کر وہاں موجود ایک ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی اور مجھے حیرت و دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے تھمرو کی عمر میں کچھ اضافہ ہو گیا ہو۔ وہ تھمرو نہیں ہو سکتی تھی۔ تھمرو تو غنچہ نو شگفتہ تھی اور میرے سامنے

ایک پھول کھڑا تھا۔ اس کے سر پر عجیب سا تاج تھا' جیسے سانپ کنڈلی مارے اور پھن اٹھائے بیٹھا ہو۔ جسم پر ڈھیلا ڈھالا لبادہ سا تھا اور اس کا چہرہ سنگ عقیق کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ حسن و خوبصورتی میں کسی بھی طرح تھمرو سے کم نہیں تھی۔ میں نے چند لمحوں ہی میں اس کا بھرپور جائزہ لے لیا تھا۔

"اٹھ کر کھڑا ہو اور تعظیم دے کہ تیرے سامنے ملکہ روسودان کھڑی ہے۔" وہ حسین ساحرہ لب کشا ہوئی۔ اس کے لہجے میں غرور تھا۔

میں کانپتا ہوا اٹھا اور تعظیماً" اس کے آگے سر جھکا دیا' پھر بمشکل بولا۔ "اے ملکہ! میں... میں باتو... باتو خاں کا قاصد ہوں مگر مجھے... مجھے تیرے پاس پہنچے سے پہلے ہی قید... کر دیا گیا اور میرا تمام سامان بھی مجھ سے چھین لیا گیا۔ اسی سامان میں وہ... وہ پیغام بھی تھا جو میں..."

"بس' بس کر!" وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "مجھے اس پیغام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے تو تجھ سے..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کی نگاہ میرے بھرے بھرے بازوؤں اور چوڑے سینے پر بھٹک رہی تھی۔ وہ معاً" کوٹھری کے دروازے کی طرف مڑی اور کسی کو مخاطب کر کے بولی۔

"اسے لے چلو! یہ واقعی ایسا ہے جیسا مجھے بتایا گیا تھا۔"

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی تین افراد کوٹھری میں داخل ہوئے جو غالباً" ملکہ روسودان کا حکم سننے کوٹھری کے باہر کھڑے تھے۔ انہیں میں پہلے یوں نہ دیکھ پایا تھا کہ میری ساری توجہ ملکہ روسودان کی طرف تھی۔

ان میں سے ایک جسیم شخص ملکہ روسودان کے قریب پہنچا اور اس نے مدھم لہجے میں کہا۔ "اے ملکہ! تھمرو ناراض تو نہ ہو جائے گی کہ یہ شکار اس کے آدمیوں نے کیا تھا؟"

"جوان لڑکیوں کے گیسو لمبے اور عقل کوتاہ ہوتی ہے۔" ملکہ روسودان اپنے خوبصورت ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولی۔ "اگر وہ اس پر ناراض ہوگی تو یہ اس کی بے عقلی ہوگی۔ وہ بھی تو کبھی کبھی میرے شکار جھپٹتی رہی ہے۔"

جسیم شخص خاموش ہو گیا اور اس وقت میرے ذہن میں منگولوں کی ایک کہاوت آئی۔ "لڑکی اگر ماں نہ ہو تو وہ آوارہ ہو جاتی ہے۔" یہ کہاوت قصبک آکر مجھے بے معنی سی لگ رہی تھی۔ تھمرو اپنی ماں روسودان کی موجودگی میں بھی آوارہ تھی۔

ملکہ روسودان کوٹھری کے دروازے کی طرف مڑی اور وہ جسیم شخص میری طرف متوجہ ہوا۔

"چلو اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کرو ملکہ نے تمہیں تھمرو کے عذاب سے نجات دلا دی۔" جسیم شخص نے مجھ سے کہا اور چلنے کا اشارہ کیا۔

وہاں سردی سے اکڑ کر مرنے سے بہتر تھا کہ میں اس شخص کی بات مان لیتا' اور یوں بھی میں ان کے لیے کھلونا ہی تھا جسے وہ جب چاہے توڑ سکتے تھے۔ مجھے بھلا یہ مجال ہی کب تھی کہ ان کا کوئی حکم ماننے سے انکار کر سکوں۔

"کیا تم مجھے پہننے کو کپڑے نہیں دو گے؟" میں نے جسیم شخص کے ساتھ کوٹھری سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ اس کے دونوں ساتھی میری پیچھے آ رہے تھے۔

"کیوں نہیں' تمہیں کپڑے ضرور ملیں گے۔" اس نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ دوسرا جملہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر سی کھنچ گئی۔

سنگی عمارت کے محافظ پتھر کے مجسموں کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑے تھے اور ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ملکہ روسودان تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی نگاہ سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں اب کچھ کچھ معاملے کی نوعیت سمجھتا جا رہا تھا۔ میں یقیناً" ان دونوں عیاش ماں بیٹی کے درمیان نزاع کا سبب بن رہا تھا اور مجھے اپنی جان بچانے کے لیے انہی دونوں کے اختلاف سے فائدہ اٹھانا تھا۔ میں جسیم شخص اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ چلتا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ میں کس طرح اس سفاک عورت کو شیشے میں اتاروں؟ اس عورت کو جس کے ظلم اور عیاشی کی داستانیں پورے مغربی دشت میں مشہور ہیں اور پھر میرے ذہن میں آ ہی گیا کہ مجھے

کیا کرنا چاہیے۔

سنگی عمارت سے نکل کر کھلی فضا میں آتے ہی میرے جسم پر ایسی کپکپی طاری ہوئی کہ چلنا دو پھر ہو گیا۔ ہوا' تیزے کی الی کی طرح میرے جسم میں پیوست ہوئی جا رہی تھی۔ جسیم شخص نے بھی میری کیفیت کو محسوس کر لیا۔ وہ کپڑوں کے علاوہ اپنے جسم پر ایک موٹا سا لبادہ بھی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے رک کر وہ لبادہ اتار کر میری طرف بڑھا دیا۔

"لے یہ پہن لے!" اس نے کہا اور میں نے کانپتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا۔

سردی سے اکڑتے ہوئے جسم کے سبب بمشکل میں نے وہ لبادہ پہنا اور دونوں ہاتھ مضبوطی سے سینے پر باندھ لیے۔

کچھ دیر بعد میں ملکہ روسودان کے محل میں پہنچ گیا۔ اندر داخل ہو کر مجھے یوں لگا جیسے میں دوبارہ تھمرو کے محل میں آ گیا ہوں' کیونکہ ملکہ روسودان کا محل بھی سنگ سفید کا بنا ہوا تھا اور اسی طرح صاف ستھرا تھا۔

محل میں پہنچتے ہی مجھے پہننے کو گرم کپڑے دیے گئے۔ پھر وہ جسیم شخص مجھے اپنے ہمراہ ملکہ روسودان کی خواب گاہ تک لے گیا۔ سردی کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ یوں بھی محل کی فضا اندر سے گرم تھی۔ جگہ جگہ بڑے بڑے لوہے کے تسلوں میں انگارے دہک رہے تھے۔

ملکہ روسودان اپنی خواب گاہ میں میری ہی منتظر تھی۔ وہ گاؤ تکیے پر کہنی ٹیکے ایک آوائے بے نیازی سے بیٹھی ہوئی تھی۔

جب جسیم شخص خواب گاہ سے چلا گیا تو ملکہ روسودان مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آ میرے پاس آ کر بیٹھ جا!" وہ ندیدوں کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی کہا۔ "اے ملکہ! تو نے مجھے اپنے قریب بٹھا کر عزت بخشی۔ میں تیرا احسان مند ہوں اور میں تیرا یہ احسان اس طرح اتارنا چاہتا ہوں کہ تجھے آنے والے ہولناک دنوں سے قبل از وقت آگاہ کر دوں۔"

"ہولناک دن؟ کیسے ہولناک دن؟" اس کی حسین اور چوڑی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"میں تجھے ان ہولناک دنوں سے باخبر کرنا چاہتا ہوں جب سائیں خاں اپنا اولوس (لشکر) لے کر قصبک پر چڑھ دوڑے گا' اس لیے بہتر یہ ہے کہ تو اس کی اطاعت قبول کر لے۔" میں نے وہ بات کہہ ہی دی جو سوچی تھی۔

میری بات سن کر وہ ہنس پڑی' پھر بولی "کتنا بھولا اور ناسمجھ ہے تو کہ یہ بھی نہیں جانتا' کس سے مخاطب ہے! میرا نام روسودان ہے اور میں دلوں کا حال چہروں پر پڑھ لیتی ہوں۔ تو مجھے' ملکہ روسودان کو باتو خاں کے حملے کا خوف دلا کر اپنی جان بچانے کے چکر میں ہے۔ بول کیا ایسا نہیں؟"

اس خطرناک عورت کی چالاکی نے مجھے دنگ کر دیا۔ اس کا دعویٰ غلط نہیں تھا کہ وہ چہروں سے دلوں کا حال جان لیتی ہے۔ میں کچھ دیر کو سکتے کے سے عالم میں بیٹھا رہا۔

مجھے چپ دیکھ کر وہ بولی۔ "سن! ملکہ روسودان وہ کر غیز (زرخیز کھیت) نہیں جس کی فصل دشمنوں کے لیے بوئی گئی ہو۔ جب تک جیوں گی اپنی مرضی اور خواہش سے جیوں گی۔ باتو خاں مجھے اپنے سامنے نہیں جھکا سکتا۔ جس دن میں نے یہ محسوس کر لیا میں دوسروں کی خواہش پر زندہ رہنے کے لیے مجبور ہوں' وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ میں جانتی ہوں کہ منگول بھیڑیا کیا چاہتا ہے اور اس کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں بھی ہے لیکن میں اس کی خواہش کبھی پوری نہیں کروں گی۔ میں روسودان ہوں روسودان' جو اپنی مرضی سے جینا اور مرنا جانتی ہے۔" وہ ایک جوش کے عالم میں بولے جا رہی تھی اور میں اس عجیب و حسین عورت کی شکل دیکھ رہا تھا۔ مجھے ابونصار کی کہی ہوئی وہ بات یاد آ رہی تھی جو اس نے باتو خان کے بارے میں بتائی تھی۔ ملکہ روسودان کی بات سن کر اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ واقعی باتو خاں اس کے قرب کا آرزومند تھا۔

"اے ملکہ! میں نہیں جانتا کہ تیرے اور باتو خاں کے درمیان کیا معاملہ ہے۔" میں بولا۔ "میں نے تو

تجھے وہی بتایا تھا جو باتو خاں کے یورت میں سنا تھا۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"خیر' ان فضول باتوں کو چھوڑ اور یہ بتا کہ تو نے اب تک کتنی عورتوں کا منہ دیکھا ہے؟"

"عورتوں کا منہ؟" میں اس کا سوال ٹھیک طرح نہ سمجھ پایا۔

"تو نے کتنی بیویاں کی ہیں یا کتنے معشوق پالے ہیں؟" اس نے اپنے سوال کی وضاحت میں کہا۔

"ایک بھی نہیں۔" میں جواب دیا۔

"کیا؟" وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ "کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟"

میں اس کی بات کا مقصد اب پوری طرح سمجھ چکا تھا' اس لیے تائید میں بولا۔ "ہاں' میں نے اب تک کسی عورت کا منہ نہیں دیکھا۔"

وہ میرے قریب کھسک آئی اور میرے بازو پر اپنا نرم و نازک ہاتھ پھیر کر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تو۔ تو پھر اسی خوشی میں کل شب میں ایک خودور (تقریب) منعقد کروں گی اور چاول کی شراب پیوں گی' پھر اس کے بعد۔ اس کے بعد۔" اس کی آواز ڈوبتی چلی گئی اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کی انگلیاں تیزی سے میرے بازو پر حرکت کر رہی تھیں۔

مجھے یہ جان کر مسرت سی محسوس ہوئی کہ چاہے ایک شب ہی کے لیے سہی' میں اس کے دست ہوس میں محفوظ ہو گیا تھا۔

معاً میں نے ایک تیز اور غصیلی آواز سنی اور وہ آواز خواب گاہ کے دروازے کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے اس طرف نگاہ اٹھائی اور اسی وقت دروازہ کھلا۔ دروازے میں مجھے روسودان کی بیٹی تھمرو کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے قہر آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا' پھر وہ شمال کی کالی آندھی بوران کی طرح آگے بڑھی۔

"تھمرو! ملکہ روسودان اسے دیکھ کر چیخی۔" تجھے یہ جرات کیسے ہوئی کہ تو بغیر میری اجازت کے یہاں گھس آئے؟"

تھمرو کے بڑھتے ہوئے قدم اسی وقت رکے جب وہ بالکل قریب آ گئی۔ اس کے چہرے پر شدید غصے اور نفرت کے آثار تھے۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا' پھر ملکہ روسودان کو گھورتی ہوئی بولی۔ "جس طرح تجھے یہ جرات ہو گئی کہ تو اسے میری قید سے نکال کر یہاں لے آئی۔ مجھے بتا کہ کیا اس پر میرا حق نہیں تھا جبکہ اسے میرے ہی آدمیوں نے پکڑا تھا؟"

"آپے سے باہر نہ تھمرو اور یہ نہ بھول کہ میں تیری ماں ہی نہیں ملکہ بھی ہوں۔"

"اور تو بھی یہ نہ بھول کہ اس تخت و تاج کا مالک ابھی مرا نہیں' زندہ ہے۔" تھمرو نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تو مجھے داؤد کی دھمکی دے رہی ہے! اس داؤد کی دھمکی' جو گہرے خشک کنوئیں میں پڑا ہے' جہاں سانپ اور بچھو اس کے ساتھی ہیں!"

"ہاں میں اسی داؤد کا ذکر کر رہی ہوں' جو میرے چچا کا بیٹا ہے اور جو اس تاج و تخت کا اصل وارث ہے۔" تھمرو نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو کیا تو اسے وہاں سے نکال لائے گی احمق لڑکی؟" ملکہ روسودان حقارت آمیز آواز میں بولی۔ "اگر یہی ممکن ہوتا تو میں اب تک اسے زندہ نہ رکھتی۔"

"اسے زندہ رکھنا تیری مجبوری ہے۔" تھمرو نے کہا۔ "خوب!"

"اور کیا تو اس مجبوری سے بھی واقف ہے؟" روسودان کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

"ہاں میں واقف ہوں۔" تھمرو بے باکی سے بولی۔ "جب تو دیکھے گی کہ قصبک کے لوگ سرکشی پر آمادہ ہو گئے ہیں اور تیری اطاعت نہیں کر رہے تو پھر تو داؤد کو اس کنوئیں سے نکال لے گی۔ اس کے بعد تو اس سے میری شادی کا اعلان کر دے گی۔ اس طرح وقتی طور پر تیرے خلاف اٹھنے والی آوازیں دب جائیں گی' پھر تو کیا کرے گی' یہ بھی بتا دوں! سن کہ تو پھر اس دن کا بے چینی سے انتظار کرے گی جب تجھے یہ خوش خبری سنائی جائے کہ تیری بیٹی تھمرو ایک بیٹے کی ماں بن گئی ہے اور وہی دن داؤد کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔ تو کسی بہانے داؤد کو قتل کرا دے گی اور اس کے بیٹے کی وارث بن کر تخت حکومت سے چمٹی رہے گی۔ بتا کہ

میں نے تیرے خواب بیان کردیے کہ نہیں؟"
تھمرو یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔

ملکہ روسودان نے ایک طویل سانس لیا' پھر بولی۔
"اول تو یہ سب تیرے مفروضات ہیں لیکن اگر تیری باتوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تو کیا تو اپنے ہونے والے بیٹے کو تخت حکومت پر بیٹھا دیکھ کر خوش نہ ہوگی؟"

"میں تیری طرح ایسے خواب نہیں دیکھتی جن کی تعبیر ممکن نہ ہو۔" تھمرو حقارت سے بولی۔ "فضول بحث کو چھوڑ اور نوجوان کو میرے حوالے کردے!"

"تجھے اس سے دستبردار ہونا پڑے گا کہ میں اسے اپنے لیے پسند کرچکی ہوں۔" ملکہ روسودان فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "کیا تو نے میرے احسان بھلا دیے؟ ابھی کچھ دن پہلے ہی کی تو بات ہے' میں نے سمیرا کو صرف اس لیے تجھے بخش دیا کہ وہ تجھے پسند آگیا تھا اور تیری آغوش خالی تھی۔"

"تو پھر تو نے یہ شرط کیوں لگائی تھی کہ جسے تیرے آدمی پکڑ کر لائیں' اس پر تیرا حق تسلیم کیا جائے اور جو تیرے آدمیوں کی تلاش کے نتیجے میں پکڑا جائے اسے میں برتوں؟" تھمرو نے غصے سے کہا۔

"بعض معاملوں میں اصول اور قانون توڑنے بھی پڑتے ہیں۔ اپنی کھوپڑی ٹھنڈی رکھ اور جاکر سمیرا سے مل۔ بھلا کہ تیرے حق میں یہی بہتر ہے۔"

ملکہ روسودان کی بات سن کر تھمرو پاؤں پٹختی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا انداز ضدی اور خود سر بچوں جیسا تھا۔ اس کے جاتے ہی ملکہ روسودان بھی اپنی جگہ سے اٹھی اور خواب گاہ کے دروازے تک پہنچ کر کسی کو پکارا۔

فوراً ہی جسیم شخص خواب گاہ میں داخل ہوا جو مجھے یہاں تک لے کر آیا تھا۔

"اسے لے جا! اور سخت پہرے میں رکھ۔ تھمرو کے محافظوں کو ہوا نہیں لگنی چاہیے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے! سمجھ گیا؟" ملکہ روسودان نے جسیم شخص سے کہا۔

جسیم شخص نے اثبات میں گردن ہلائی اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

میں اس کے ساتھ خواب گاہ سے نکلا تو دو محافظ اور ساتھ ہولیے۔ وہ مجھے اسی محل کے ایک حصے میں لے گئے۔ وہاں صرف ایک مشعل روشن تھی اور لمبی سی راہداری میں محافظوں کے سائے بڑے پراسرار لگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑے تھے اور شانوں سے کمانیں لٹکی ہوئی تھیں۔

راہداری کے اختتام پر مجھے ایک بھاری سلاخوں دار دروازہ نظر آیا۔ محافظوں نے دروازہ کھول دیا۔ اندر تاریکی تھی۔ ایک محافظ نے مشعل روشن کی اور آگے آگے چلنے لگا۔ چند قدم چلتے ہی پتھریلی سیڑھیاں نظر آئیں۔ مجھے نیچے اترنے کے لیے کہا گیا۔ وہ جگہ ایک تہ خانے کی طرح تھی جسے پتھروں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ آگے چلتے ہوئے محافظ نے تہ خانے کے ایک ستون میں مشعل پیوست کردی جہاں غالباً مشعل پیوست کرنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔

مجھے وہاں ایک طرف فرش پر میلا سا موٹا کپڑا بچھا نظر آیا۔ میں نے تہ خانے کا جائزہ لیا۔ ہر چند کے وہاں ہوا آنے کا راستہ نہیں تھا مگر پھر بھی مجھے وہاں زیادہ سردی محسوس ہورہی تھی۔ اتنی سردی میں بغیر کچھ اوڑھے سونا بہرحال ناممکن تھا۔

"آرام سے یہاں سو!" جسیم شخص مجھے حیران پریشان دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میں سردی دور کرنے کے لیے تیرے پاس آگ بھی بھجوادوں گا اور تو کہے تو سیال آگ بھی!" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "اندر باہر آگ ہی آگ! کچھ سمجھا؟"

"اور ہوسکے تو کچھ اوڑھنے کو بھی بھیج دینا۔" میں نے کہا۔

"ضرور! تو آخر ہماری ملکہ کا جوچی (مہمان) ہے' تیری بات ہم کیوں نہ مانیں گے۔" جسیم شخص بولا۔

جوچی! میں دل ہی دل میں ہنسا۔ وہ لوگ بھی کیسا سنگین مذاق کرتے تھے! بھلا کسی جوچی کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے!

وہ سب تہ خانے سے چلے گئے اور میں اپنی تقدیر کی ستم ظریفی پر غور کرنے لگا۔ تقدیر مجھے کہاں سے کہاں لے آئی تھی! کہاں قراقرم اور کہاں قصبہ! اگر

موت ہی آنا تھی تو قراقرم کیا برا تھا؟ وہ قراقرم جہاں میں پیدا ہوا تھا' وہ جہاں بھی میری ماں تھی' چھوٹی ماں فاطمہ تھی اور بورخان قالدون تھا جہاں جاکر مجھے سکون سا ملتا تھا۔ یہ ایک دم سب کیا ہو گیا؟ میری ماں کہاں گئی؟ چھوٹی ماں فاطمہ مجھ سے کیوں روٹھ گئی؟ اور میرا سکون کیسے غارت ہو گیا؟ میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔ کیا میں اسی دن کے لیے پیدا ہوا تھا کہ یوں خاموشی سے ہلاک کر دیا جاؤں۔ ملکہ روسودان کی قید میں ہونے کا اور کیا مقصد ہو سکتا تھا!

میں نے اپنی ہم عمروں سے عورت کے جسم کے بارے میں بہت سی باتیں سنی تھیں۔ بظاہر میں ان باتوں میں دلچسپی نہیں لیتا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان باتوں نے میرے دل میں اشتیاق ضرور پیدا کر دیا تھا۔ پہلی بار یہ اشتیاق اس وقت بڑھا تھا جب میں نے سولدہ کو دیکھا تھا۔ حسین و پراسرار سولدہ مجھے بڑی اچھی لگی تھی اور میرا چاہا تھا کہ کاش وہ بھی میرے پورت میں اسی طرح رہے جیسے میری ماں' چنکائی کے ساتھ رہتی تھی لیکن سولدہ تو سولدہ (روح) تھی۔ وہ بھلا کیسے میری ہو سکتی تھی۔ دوسری بار قصبک آکر میرے دل میں وہ جذبات جاگے تھے' اس وقت جب میں نے تھمرو کو دیکھا تھا۔ میں نے اس وقت دل ہی دل میں سولدہ اور تھمرو کے حسن کا تقابل کیا تھا لیکن چند ہی لمحوں بعد جب تھمرو کے حسن کا سحر ختم ہوا تھا اور اس کا اصل چہرہ میرے سامنے آیا تھا تو مجھے اس سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ ملکہ روسودان بھی بلا کی حسین تھی اور اگر وہ عام حالات میں ایک معمولی عورت کی طرح مجھے ملتی تو شاید میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا مگر وہ بھی تھمرو ہی کی ماں تھی اور اس سے مختلف نہیں تھی۔

میں نے تہ خانے کی سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنی تو میرے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔ آنے والے دو محافظ تھے۔ ان میں سے ایک محافظ بڑے سے برتن میں آگ رکھ کر لایا تھا۔ برتن کو وہ موٹے کپڑے سے پکڑ کر اٹھائے ہوئے تھا۔ دوسرے محافظ کے شانے پر کسی جانور کی کھال پڑی ہوئی تھی اور ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور مٹی ہی کا گلاس تھا۔

ان دونوں نے میرے قریب آکر سامان رکھا اور خاموشی سے رخصت ہو گئے۔ یہ ممکن تھا کہ میں ایک یقینی موت سے بچنے کے لیے ان دونوں محافظوں پر حملہ کر دیتا اور ممکن تھا کہ انہیں بے بس کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا کیونکہ وہ دونوں میری طرف سے قطعی مطمئن نظر آرہے تھے' لیکن میں یہ بھی تو جانتا تھا کہ اس کے باوجود موت کے حصار سے نہ نکل سکوں گا۔ قدم قدم پر مسلح محافظ موجود تھے۔ ان سے بچ کر نکل جانا ایسا ہی تھا۔ جیسے کوئی بڑے سمندر (بحرالکاہل) کو تیرتے ہوئے پار کرنے کی بڑھانکے۔

ان کے جاتے ہی میں نے وہ کھال اوڑھ لی جو وہ رکھ گئے تھے۔ وہ کھال زیادہ بدبودار نہیں تھی۔ مٹی کی صراحی میں لہو رنگ شراب تھی۔ میں نے گلاس بھر لیا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ پورا گلاس پی کر میں نے دوبارہ گلاس بھرا اور اس سے ایک گھونٹ پی کر دیوار سے پشت لگا دی۔

میرا بستر اس ستون کی آڑ میں بچھا ہوا تھا جس میں مشعل پیوست تھی اس لیے وہاں نسبتاً کم روشنی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا' موت کا سا سناٹا مجھے اپنے سانس کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی' اس لیے جب میری سماعت سے ایک ہلکی سی آواز ٹکرائی تو میں چونک پڑا اور میں نے شراب کا گلاس فرش پر رکھ دیا۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی پتھر کی سل اپنی جگہ سے ہٹائی گئی ہو۔ میں مستعد و چوکنا ہو گیا اور سامنے کی طرف دیکھنے لگا' مگر تہ خانے میں میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ تنہائی میں آدمی کو ایسے ہی برے برے خیالات آتے ہیں۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا۔

"اگر تو ذرا بھی چیخا چلایا تو میں تیرے دل میں یہ نیزہ پرو دوں گا۔" ایک آشنا آواز سنائی دی اور اسی کے ساتھ ایک نیزے کی نوک میری سینے سے آلگی۔

میں دم بخود رہ گیا۔ میرے سامنے جاروق کھڑا تھا۔ وہی جاروق جس نے مجھے تھمرو کے لیے "شکار" کیا تھا۔

"خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ اور میرے ساتھ چل!" وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

میں پہلے ہی خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ رو سو دان نہ سہی تو تھمرد سہی! اس سے فرق بھی کیا پڑتا تھا! قید یہاں بھی تھی اور وہاں بھی، موت یہاں بھی تھی اور وہاں بھی! ہاں یہ ممکن تھا کہ شاید صورت حال بدلنے سے کوئی فرق پڑ جاتا۔

میں نے جاروق کا حکم مان لیا اور پھر میں نے جانا کہ وہ اس تہ خانے میں کیسے پہنچا تھا۔ وہ ایک پہاڑی سرنگ تھی جو اسے تہ خانے میں لائی تھی۔ اور وہ مجھے اسی سرنگ کے ذریعے کہیں لے جا رہا تھا۔ اس نے سرنگ میں اترتے ہی دوبارہ اس کا دہانہ بند کر دیا تھا اور زمین پر پڑی ایک روشن مشعل اٹھالی تھی جو شاید وہ اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا اور چلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ جاروق میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ سرنگ اس قدر طویل ہوگی۔ اب مجھے اس میں چلتے ہوئے گھٹن کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ میری رفتار سست پڑنے لگی۔

"تیز تیز چل!" اس نے مجھے ڈانٹا۔ "اگر تو اسی طرح چلتا رہا تو چلتے چلتے صبح ہو جائے گی، اگر تو تیز نہ چلا تو میں تجھے یہیں چھوڑ جاؤں گا، پھر سرنگ کے دوسرے دہانے پر پہنچ کر پتھر رکھ دوں گا تاکہ جو تھوڑی بہت تازہ ہوا اندر آ رہی ہے، وہ بھی آنا بند ہو جائے۔ سوچ لے کہ پھر تیرا کیا حشر ہوگا۔"

اس نے مجھے ڈرایا اور میں واقعی ڈر گیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں تیز تیز اس سے قدم ملا کر چلنے لگا۔

سرنگ کے دوسرے دہانے تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس بری طرح پھول گیا۔ سرنگ کے اختتام پر اس کے دہانے تک پہنچنے کے لیے باقاعدہ سیڑھیاں نہیں تھی بلکہ بڑے بڑے سے پتھر رکھے ہوئے تھے، ایک کے اوپر ایک اور انہی سے سیڑھیاں سی بنا دی گئی تھیں۔ اوپر ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آ رہا تھا جس کے باہر تاریکی تھی۔ وہ سوراخ اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں سے ایک وقت میں صرف ایک آدمی باہر جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اس سوراخ سے باہر نکلنے کے لیے پہل کرنی چاہیے اور یہ سوچ کر میں آگے بڑھا تاکہ پتھروں پر چڑھ کر اس سوراخ تک پہنچ سکوں۔ اسی وقت جاروق نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ٹھہر جا! زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کر! میرا نام جاروق ہے اور میں تجھ جیسے لونڈوں کو انگلیوں پر نچا سکتا ہوں۔" اس کی آواز میں سختی تھی۔

میں رک گیا اور جاروق آگے بڑھ کر پتھروں پر چڑھنے لگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں پتھروں پر چڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب وہ وقت آ ہی گیا ہے کہ موت کے منہ میں سے نکلنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ شاید جاروق زیادہ دیر میرے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ وہ ادھیڑ عمر تھا اور میں جوان۔ سرنگ کے دہانے سے نکل کر میں اس سے نمٹ لوں گا۔ میں نے فیصلہ کیا۔

میں نے جو سوچا تھا، سرنگ سے باہر نکل کر وہی دیکھا۔ وہ پہاڑی سرنگ مجھے اور جاروق کو قلعے سے باہر لے آئی تھی بلکہ کافی دور! میں نے مڑ کر قلعے کی اونچی فصیلوں اور برجوں کو دیکھا قلعے کے برجوں میں مشعلیں روشن تھیں جن سے میں نے قلعے کی سمت اندازہ لگایا۔ میں آخر کار موت کے منہ سے نکل آیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس میں میری کوشش کو کوئی دخل نہیں تھا۔

میں جاروق پر حملہ کرنے سے پہلے اردگرد کا جائزہ لے لینا چاہتا تھا۔ جاروق اس دوران میں تیزی سے سرنگ کا دہانہ بند کر چکا تھا اور اب اس نے مشعل بھی بجھا دی تھی۔ چاندنی رات میں بغیر مشعل کے بھی راستہ طے کیا جا سکتا تھا۔ میں اس پر حیران ضرور تھا کہ جاروق مجھے قلعے سے کیوں نکال لایا ہے اور اب کہاں لے جا رہا ہے! لیکن یہ وقت ان باتوں کے سوچنے کا نہیں، کچھ کرنے کا تھا۔

"چلو!" یہ کہتے ہوئے جاروق نے اپنے نیزے کی نوک، میری گردن کے پچھلے حصے پر رکھ دی۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا، اس سے بھڑ جاؤں کہ ایک

قریبی غار کے دہانے سے روشنی کی جھلک نمودار ہوئی اور پھر غار سے دو افراد باہر نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں جو انہوں نے غار سے باہر نکلتے ہی بجھا دیں۔ وہ قریب آئے تو میں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ جاروق کے ساتھی تھے اور انہیں میں نے محل میں بھی اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ میری ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ میں بیک وقت تین مسلح افراد سے نمٹنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا اور اب مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اردگرد ان کے دوسرے ساتھی بھی موجود ہوں گے۔ میں نے یقیناً" جاروق کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ وہ لومڑی کی طرح چالاک اور چوکنا تھا۔ وہ شاید جانتا تھا کہ موت کے چنگل میں پھنس جانے والا کس کس طرح ہاتھ پاؤں مار سکتا ہے۔

وہ سب مجھے اپنے نرغے میں لے کر پہاڑی سے اترنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ مجھ پر قبضہ کرنے کے لیے تھمرو نے ایسی چال چلی ہے کہ اس کی ماں ملکہ روسودان تڑپ کر رہ جائے۔ میرا قیاس تھا کہ تھمرو مجھے ملکہ روسودان کی نظر سے دور رکھنے کے لیے قلعے سے باہر رکھنا چاہتی ہے۔ شاید مجھے اسی پہاڑی یا کسی اور دوسری پہاڑی کے کسی غار میں قید کر دیا جائے گا۔

مجھے اس موقع پر چھوٹی ماں فاطمہ کا ایک قول یاد آیا۔ وہ کہا کرتی تھی جسم کا سب سے طاقتور حصہ ذہن ہے، بشرطیکہ اسے صحیح طرح استعمال کیا جائے۔ بڑھتے ہوئے قدموں کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں لاوا سا پکتا رہا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا کرنا چاہیے مجھے؟ مگر میرے ذہن میں کچھ نہ آسکا۔

وہ مجھے لیے ہوئے قلعے والی پہاڑی سے نیچے آگئے۔ اب ان کا رخ دوسری قریبی پہاڑی کی طرف تھا۔ یہ وہی پہاڑی تھی جہاں سے انہوں نے مجھے پکڑا تھا۔ جاروق آگے آگے تھا اور اس کے دونوں ساتھی نیزے سنبھالے میرے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

دوسری پہاڑی پر چڑھتے ہوئے معاً" میرا پاؤں ایک پتھر سے پھسلا۔ اس پتھر پر یقیناً" برف جمی ہوئی تھی۔ مجھے پیچھے آنے والے محافظوں نے گرنے سے بچا لیا ورنہ میں پہاڑی سے نیچے لڑھک جاتا۔ جاروق نے مڑ کر دیکھا۔

"زندہ رہنا چاہتا ہے تو سنبھل کر چل، ورنہ مارا جائے گا۔" وہ میری طرف دیکھ کر غرایا۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جس نے میرے ذہن میں روشنی سی کر دی، مجھے راہ مفر نظر آگئی تھی۔ اس میں خطرہ ضرور تھا مگر اتنا نہیں کہ میں زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھوں اس پہاڑی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے میں نے دائیں جانب پھسلوان ڈھلان کی طرف دیکھا" پھر بل کھاتی اوپر پہاڑی کی چوٹی پر جاتی پگڈنڈی پر نظر جمادی، کچھ اوپر پگڈنڈی دائیں جانب مڑ گئی تھی۔

میں کچھ دیر ہی میں ان لوگوں کے ہمراہ پگڈنڈی کے اس موڑ تک پہنچ گیا اور پھر معاً" میرے قدم لڑکھڑائے، اگلے ہی لمحے میں برف جمی ہوئی پتھریلی اور پھسلوان ڈھلان سے نیچے لڑھک رہا تھا لڑھکتے ہوئے میری پوری کوشش یہ تھی کہ میرے ہاتھ پاؤں کی کوئی ہڈی نہ ٹوٹے۔

"ارے... ارے... وہ... وہ... اس کا پاؤں پھسل گیا شاید حیرت کے چند لمحوں کے بعد جاروق بولنے کے قابل ہوا تھا میں نے لڑھکتے ہوئے اس کی آواز سنی پھر اس کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔"

بلندی زیادہ نہیں تھی لیکن یہ طے تھا وہ بہرحال مجھ تک پہنچنے کے لیے پگڈنڈی ہی کے ذریعے نیچے آنے پر مجبور تھے اور ایسا کرنے کے لیے انہیں ایک طویل چکر کاٹنا ضروری تھا میں نے اسی لیے ہی تو پگڈنڈی کے اس موڑ کا انتخاب کیا تھا۔

اگر نادانستگی میں میرا پاؤں پھسلا ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ مجھے زیادہ چوٹیں آتیں مگر میں نے تو جان کر یہ خطرہ مول لیا تھا، ایک بڑے خطرے کو ٹالنے کے لیے یہ چھوٹا خطرہ مول لینا لازمی ہی تھا۔ اس وقت پہاڑی سے نیچے لڑھکنے کے بعد مجھے اتنا ہوش نہیں تھا کہ میں اپنے جسم پر آنے والی خراشوں اور زخموں کو گنتا جیسے ہی میں لڑھک کر نشیب میں پہنچا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پھر میں اتنی تیز دوڑا کہ زندگی میں کبھی کہیں دوڑا تھا اس وقت بھی نہیں جب میں نے پہلی بار بورخان قالدون پر سولدہ کو دیکھا تھا اور خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا

ہوا تھا موت تعاقب میں ہو تو بھلا قدم کیسے رک سکتے ہیں۔

مجھے یاد نہیں کہ میں کس طرح موت کے حصار سے باہر نکلا' ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ بھاگتے بھاگتے میں ایک جگہ گر پڑا تھا اور کچھ دیر کے لیے میرے حواس جواب دے گئے تھے پہاڑیوں کے نیچے قفقاز کی چراگاہوں تک پہنچ چکا تھا' جب دوبارہ میرے حواس درست ہوئے تھے تو میں نے اپنے قریب ایک چرواہے کو دیکھا تھا جس کے جانور ارد گرد چر رہے تھے اسی چرواہے نے مجھے زمین پر پڑا ہوا دیکھا تھا اور مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور کچھ بولنا چاہا تاکہ میں اس کا شکریہ ادا کر سکوں مگر میری زبان سے کوئی لفظ نہ نکل سکا' مجھے اپنے حلق میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہوئے مسلسل دوڑنے کے سبب میرا گلا خشک ہو گیا تھا اور زبان پر کانٹے پڑ گئے تھے۔

"پانی پیئے گا؟۔" چرواہے نے میری حالت کا اندازہ لگا کر کہا۔

"تو تو زخمی بھی ہے تیرے ماتھے پر خون جما ہوا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا چرواہا میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا اور میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا چرواہا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا گرم چوٹ میں مجھے کچھ احساس ہی نہیں ہوا تھا لیکن اب چرواہے کے احساس دلانے پر میں نے اپنا جوڑ جوڑ دکھتا محسوس کیا۔

چرواہے کا پورت وہاں سے شاید زیادہ دور نہیں تھا یا اسے کوئی ایسی قریبی جگہ معلوم تھی جہاں سے وہ با آسانی پانی لا سکتا تھا وہ جلد ہی لوٹ آیا میں نے اس کے ہاتھ میں پانی کا برتن دیکھا' حلق تر ہونے کے کچھ دیر بعد میں اس قابل ہوا کہ بول سکوں مگر مجھ سے پہلے چرواہا بول اٹھا "اب تیرا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا "تو نے پانی پلا کر مجھ پر احسان کیا۔"

چرواہے نے میری بات کو نظر انداز کر کے پوچھا "تو کہاں سے زخمی ہو کر آیا ہے۔"

"وہاں سے جہاں جا کر لوگ زندہ نہیں لوٹتے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا تو قصبک سے آ رہا ہے؟۔" چرواہا میری بات سن کر حیرت سے بولا اس کی آواز میں خوف تھا۔

"ہاں!۔" میں نے سر ہلایا پھر بولا "تو مجھے یہ بتا دے کہ یہاں سے قریبی پام کتنے فاصلے پر ہے؟"

"تقریباً" ایک منزل پر" اس نے بتایا' پھر کہا "لیکن تو اتنی دور کیوں جانا چاہتا ہے؟"

"اس لیے کہ مجھے وہاں سے سامان سفر مل سکے۔"

"تو رہنے والا کہاں کا ہے؟ اور پہاڑیوں پر کیوں گیا تھا؟ کیا ملکہ کے سپاہی تجھے بھی پکڑ لے گئے تھے؟۔" چرواہے نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"مجھے وہاں پکڑ کر نہیں لے جایا گیا تھا بلکہ میں خود وہاں گیا تھا۔" میں نے ماتھے کی چوٹ کو سہلاتے ہوئے بتایا۔

چرواہے نے پانی کا خالی برتن اپنے میلے سے کپڑے کے تھیلے میں رکھتے ہوئے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولا "کیا تجھے موت سے ڈر نہیں لگتا؟"

"کیا تیرا پورت یہیں کہیں قریب ہی ہے۔" میں نے سوال کیا تاکہ وہ مزید تفصیلات میں نہ الجھے۔

"نہیں!۔" اس نے کہا "یہاں قریب ہی ایک پہاڑی چشمہ بہتا ہے' میں وہیں سے پانی لے کر آیا تھا" چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔

"ہاں یہ تو بتا تجھے جانا کہاں ہے؟"

"سرائے باتو۔" میں نے جواب دیا "تو نے اس کا نام سنا ہے؟"

"ہاں سنا تو ہے مگر مجھے یہ پتا نہیں کہ وہ ہے کہاں۔" چرواہے نے کہا

"یہاں سے بہت دور ہے یوں سمجھ لے کہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر بھی وہاں چوتھے دن پہنچ سکوں گا۔"

"اچھا!۔" وہ اس طرح حیران ہو کر بولا جیسے میں نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تجھے گھوڑے کی ضرورت ہے لیکن تو پام تک

جانے کی بجائے قفقاز کی بستی میں کیوں نہیں چلا جاتا' وہ یہاں سے بمشکل چوتھائی منزل دور ہوگی وہاں سے تجھے باآسانی گھوڑا مل سکتا ہے لیکن ... لیکن ....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیوں' کیا کہنا چاہتا ہے تو؟۔" "اپنی بات پوری کر" میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"میں دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ تجھے گھوڑا کون دے گا تیرے پاس تو گھوڑا خریدنے کے لیے کچھ نظر نہیں آتا۔" چرواہا فکر مند لہجے میں بولا "تو کس چیز کے عوض گھوڑا خریدے گا؟"

"تو اس کی فکر نہ کر اور مجھے بستی تک پہنچنے کا راستہ بتا دے باقی جو ہوگا میں خود بھگت لوں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

میں نے یام تک جانے کی بجائے اب بستی پہنچنے کا فیصلہ کر لیا تھا' کیونکہ ایک منزل کا پیدل سفر وہ بھی نڈھال ہونے کی صورت میں' کسی طور میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

میں کچھ دیر چرواہے کے پاس رکا پھر اس سے بستی کی طرف جانے والے راستے کے بارے میں تفصیل پوچھ کر روانہ ہو گیا۔

میں صبح دم بستی کے لیے روانہ ہوا تھا میں نے اور سورج نے اپنا سفر تقریباً" ایک ساتھ شروع کیا تھا سورج میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور بلند ہوتے ہوتے میرے سر پر آگیا۔ سورج اپنا نصف سفر کر کے آگے بڑھ گیا مگر میں قفقاز کی بستی میں رک گیا۔

قراقرم اور سرائے باتو کی طرح وہ بستی بھی یورتوں پر مشتمل تھی بستی تک کے پیدل سفر نے مجھے خاصا تھکا دیا تھا اور میں آرام کی شدید ضرورت محسوس کر رہا تھا نیند اور تھکن دونوں نے مجھے نڈھال کر رکھا تھا اور آرام کی صرف یہی صورت ممکن تھی کہ میں کسی طرح باتو خان کے چھوٹے بھائی برقائی خان سے ملنے میں کامیاب ہو جاؤں اور اسے بتا سکوں کہ میں کون ہوں اور مجھ پر کیا گزری ہے۔"

برقائی خاں کے یورت تک پہنچتے پہنچتے میرا یہ عالم ہو گیا کہ اب گرا جب گرا حسب توقع مجھے برقائی خاں کے قشق (محافظ دستہ) نے یورت کے باہر ہی روک لیا' ویسے میری حالت بھی ایسی تھی کہ مجھ پر نظر پڑتے ہی شبہ کیا جا سکے۔

"آخر تو کیوں برقائی خاں سے ملنا چاہتا ہے؟۔" قشق کے ایک تومان باشی نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں سائیں خاں کا قاصد ہوں۔" میں نے تھکی تھکی سی آواز میں بمشکل کہا۔

"تو پھر لوح دکھا۔" تومان باشی چبھتے ہوئے لہجے میں بولا وہ دیکھ چکا تھا کہ میں خالی ہاتھ ہوں۔

"میرے پاس لوح تھی مگر اب نہیں ہے لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں حقیقت ہے۔" میں نے عاجزی کے ساتھ کہا مجھے بستی میں آنے سے پہلے اندازہ نہیں تھا کہ برقائی خاں تک پہنچنے کے لیے اتنی مشکلات پیش آسکتی ہیں' میں نے تومان باشی کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ میں واقعی سائیں خاں کا قاصد ہوں' مختصراً" اپنی بپتا سنا دی جسے اس نے حیرت اور بے یقینی سے سنا۔

"تو نے بڑی عجیب اور ناقابل یقین باتیں کی ہیں لیکن یاد رکھ کہ اگر تیری باتیں جھوٹی ثابت ہوئیں تو....."

"میں جانتا ہوں کہ پھر کیا ہوگا؟۔" میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا اور اسی وقت مجھے ابونصار یاد آگیا جو برقائی خاں کا مہمان تھا' اور مجھے پہچان سکتا تھا لیکن میں نے تومان باشی سے اس کا ذکر فضول سمجھا کیونکہ میں محسوس کر چکا تھا کہ وہ مجھے برقائی خاں سے ملوا دے گا میں سمجھ گیا تھا کہ ان حالات میں برقائی خاں بھی میری باتوں پر فوراً" یقین نہیں کرے گا۔ میں ایسی صورت میں ابونصار کا حوالہ دے سکتا تھا جو مجھے باتو خاں کے قاصد کی حیثیت سے شناخت کر سکتا تھا کیونکہ اس نے مجھے قصبک کے لیے روانہ ہوتے دیکھا تھا۔

تومان باشی کچھ دیر بعد میری بات ماننے پر آمادہ ہو گیا اور مجھے اپنے سپاہیوں کے درمیان چھوڑ کر برقائی خاں کے یورت کی طرف چلا گیا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

جب تومان باشی لوٹ کر آیا تو اس نے میری تلاشی لی' میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اپنے ہمراہ برقائی خاں کے یورت میں لے جانے والا ہے اور تھا بھی ایسا ہی برقائی خاں نے مجھے ملنے کی اجازت دے دی تھی۔

کچھ دیر بعد جب میں برقائی خاں کے یورت میں داخل ہوا تو ایک لمحے کو حیران سا رہ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ میں جیسے باتو خاں کے سامنے کھڑا ہوں باتو خاں اور برقائی خاں دونوں بھائیوں کے تن و توش یکساں تھے اور چہرے مہرے بھی ایک سے تھے وہی چوڑا سا سر اور سر کے نیچے دو موٹی موٹی چوٹیاں جن میں قیمتی جواہرات گندھے ہوئے تھے وہی کٹھیا سے متورم تخنے جن میں قرمزی کپڑے کی جوتیاں تھیں اور جسم پر ویسا ہی لباس جیسا باتو خان پہنتا تھا باتو خاں اور برقائی خاں توام بھائی معلوم ہوتے تھے ہاں اگر ان دونوں میں کوئی فرق تھا تو صرف جسم کے رنگ کا تھا برقائی کی جلد کا رنگ زردی مائل تھا۔

میں لمحہ حیرت سے نکلتے ہی اس کی مسند کے سامنے جا کر جھکا اور اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی پٹی کھول کر اسے تعظیم دی۔ وہ یورت میں تنہا نہیں تھا بلکہ اس کی بائیں جانب ایک نوجوان و نوخیز عورت بیٹھی تھی جو غالباً اس کی کوئی بیوی تھی۔

"مجھے جو کچھ تیرے بارے میں بتایا گیا ہے کیا سچ ہے؟" برقائی خاں مجھ سے مخاطب ہوا اور اس کی آواز سن کر مجھے حیرت ہوئی اس کی آواز میں خاندان زریں کے دوسرے افراد کی سی سختی اور غرور کا نام و نشان نہیں تھا بلکہ اس میں نرمی اور خلوص تھا۔

"ہاں اے قفقاز کے آقا! تیرے غلام نے جھوٹ نہیں بولا۔" میں نے ادب سے جواب دیا۔

"کیا تو اپنی کہی ہوئی بات کسی طرح ثابت کر سکتا ہے کہ واقعی تو سائیں خاں کا قاصد ہے؟" اس نے حسب توقع سوال کیا۔

"تیرے غلام کو اس حیثیت سے عالم ابونصار بھی جانتا ہے جو ـــــ"

"کیا؟" برقائی ایک دم چونک پڑا "تو اسے کیسے جانتا ہے؟"

"جب میں قصبک کے لیے روانہ ہونے والا تھا تو ابونصار اس یام میں مجھ سے ملا تھا جو چراگاہوں کے ابتدائی حصے میں ہے۔" میں نے جواب دیا اور برقائی خاں نے ایک طویل سانس لیا۔

"تیری شناخت کے لیے اتنا کافی ہے کہ تو ابونصار کو جانتا ہے۔" برقائی خان بولا "اب یہ بتا کہ تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

"صرف سامان سفر اور کل تک اس بستی میں رہائش کا بندوبست میرے آقا۔" میں نے مختصر الفاظ میں اپنا مقصد بیان کر دیا۔

"ٹھیک ہے انتظام ہو جائے گا۔" برقائی خاں کا اتنا کہنا کافی تھا قشق کا تومان باشی اب تک یورت میں موجود تھا' اور وہ برقائی خان کے الفاظ سن رہا تھا برقائی خاں نے اسے اشارہ کیا اور وہ مجھے اپنے ہمراہ یورت سے باہر لے آیا۔

میرے جسم پر جہاں جہاں چوٹیں اور خراشیں آئی تھیں وہاں مرہم لگا دیا گیا مجھے کھانے کے لیے بہترین کھانا ملا اور سونے کے لیے عمدہ بستر فراہم کیا گیا۔ میں کھانا کھا کر بستر پر دراز ہوا اور پھر غافل ہو گیا۔ نیند نے مجھے فوراً ہی آ دبوچا۔

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں نے اردگرد کا جائزہ لیا' میں کہاں ہوں؟ میں نے نیند سے بوجھل ذہن کو جھٹکا اور پھر مجھے یاد آ گیا کہ میں قفقاز کی بستی میں ہوں' یورت میں مشعل روشن تھی اور میرے علاوہ وہاں ایک اور شخص بھی سو رہا تھا میں دوپہر ڈھلے سویا تھا اور اب رات کے وقت آنکھ کھلی تھی نہ جانے ابھی کتنی رات باقی تھی میں نے کروٹ لی اور آنکھیں بند کر لیں کچھ دیر بعد ہی میں دوبارہ سو چکا تھا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو مجھے ابونصار کا خیال آیا میں نے روانگی سے قبل چاہا کہ اس سے مل لوں مگر مجھے معلوم ہوا کہ وہ گزشتہ دن ہی سے کہیں گیا ہوا ہے کہاں' یہ مجھے نہیں بتایا گیا' میرے لیے سامان سفر کا بندوبست کر دیا گیا تو میں نے گھوڑے پر سوار ہو کر برقائی خاں کے یورت کا رخ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ برقائی خاں کا شکریہ ادا کر دوں لیکن مجھے قشق کے تومان

باشی نے روک دیا۔

"برقائی خاں کا حکم ہے کہ تو جلد سے جلد سائیں خاں کی طرف لوٹ جا!"

توبان باشی بولا "اس نے کہا ہے کہ تو وقت ضائع نہ کر سائیں خاں تیرا منتظر ہوگا۔"

مجھے برقائی خاں کا یہ حکم عجیب سا لگا اس کا واضح مطلب یہ تھا وہ پہلے ہی توبان باشی کو حکم دے چکا تھا کہ مجھے اس سے نہ ملنے دیا جائے مگر اس میں کیا مصلحت تھی یہ میں نہ سمجھ سکا میں نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑی اور اسی وقت میری نظر برقائی خاں کے یورت کی طرف اٹھ گئی میرا چونک اٹھنا بے جا نہیں تھا برقائی خاں کے یورت سے ابونصار باہر نکل رہا تھا کیا وہ لوٹ آیا؟ میں نے سوچا اور گھوڑا روک لیا۔

"تو جاتا کیوں نہیں؟" توبان باشی نے مجھ سے سخت لہجے میں کہا۔

"کیا مجھے برقائی خاں کے حکم کا پاس نہیں؟" اس کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

"اس کا حکم میرے سر آنکھوں پر" میں نے جواب دیا "بس ابھی جاتا ہوں' ذرا ابونصار سے مل لوں وہ شاید ابھی لوٹ کر آیا ہے کیونکہ تم نے مجھے پہلے بتایا تھا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے اور بستی میں نہیں" میں نے ابونصار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اب قریب آچکا تھا۔

میں اسے دیکھ کر احتراماً گھوڑے سے اتر گیا اور اترتے ہی پوچھا۔

"اے ابونصار تو کب لوٹا؟"

"کہاں سے؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"جہاں تو کل سے گیا ہوا تھا۔" میں بولا۔

"کل سے تو میں کہیں نہیں۔"

"اے محترم ابونصار!" توبان باشی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ذرا ادھر آکے میری ایک بات سن لے۔"

ابونصار نے حیرت سے توبان باشی کی طرف دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوا "میں ابھی آیا بوغا! تم جانا نہیں۔" وہ یہ کہہ کر توبان باشی کے ساتھ الگ چلا گیا۔

توبان باشی اس سے کچھ کھسر پھسر کرتا رہا اور مجھے اس پر غصہ آتا رہا میں سمجھ چکا تھا کہ توبان باشی نے پہلے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور اب وہ اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لیے ابونصار کو بھی جھوٹ بولنے پر مجبور کر رہا تھا' ابونصار اس کی باتیں سن کر گردن ہلا رہا تھا پھر وہ دونوں ہی میری طرف لوٹ آئے اب توبان باشی کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا لیکن ابونصار کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

ابونصار میرے قریب آتے ہی بولا "ہاں اب بتاؤ بوغا' تم یہاں کیسے آگئے؟ کیا تم قصبک ہو آئے۔"

"میں تیری بات کا جواب ضرور دوں گا مگر پہلے مجھے یہ بتا کہ کیا تو واقعی کل یہیں تھا؟۔" میں نے توبان باشی کی طرف سخت نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا مجھے اس کے جھوٹ بولنے پر غصہ آگیا تھا۔

"خیر تم فی الحال ان باتوں کو چھوڑو! جو ہوا سو ہوا اس پر خاک ڈالو۔" ابونصار کے ہونٹوں پر وہی مخصوص مسکراہٹ عود کر آئی جو اس کی شخصیت کا جزو تھی۔

"تمہیں دوبارہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

میں نے محسوس کیا کہ شاید ابونصار سچ بات کہہ کر توبان باشی کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا' اس لیے میں بھی خاموش ہو گیا' پھر کچھ دیر توقف کے بعد بولا "میری خواہش تھی کہ میں تیری باتیں سنتا اور اپنے ذہن کو جلا بخشتا لیکن برقائی خاں کا حکم ہے کہ میں فوراً یہاں سے چلا جاؤں" یہ کہتے ہوئے میں نے پھر توبان باشی کی جانب دیکھا اور اس نے اپنی نگاہ جھکا لی' جھوٹ اس کے چہرے پر لکھا تھا مگر میں حیران تھا کہ اسے مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اچھا جا! خدا تیرا حافظ و ناصر ہو۔" ابونصار کے لہجے میں ٹھنڈک اور مٹھاس تھی "زندگی رہی تو انشاء اللہ پھر کبھی ملیں گے۔"

میں گھوڑے پر سوار ہو گیا مجھے واقعی افسوس تھا کہ مجھے ابونصار کی باتیں سننے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

مجھے قفقاز سے چلے چوتھا دن تھا اور اب میں سرائے باتو میں داخل ہو رہا تھا' مجھے دوبارہ سرائے باتو لوٹ کر

عجیب سی خوشی ہو رہی تھی جیسے مجھے نئی زندگی مل گئی ہو، میں باتو خاں کا پہلا قاصد تھا جو قصبک سے زندہ و سلامت لوٹ کر آیا تھا، ریچھ والے شامان تب تنگری کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی تھی سرائے باتو سے قصبک کے لیے روانہ ہوتے وقت میرے دل میں جتنا خوف تھا، اتنی ہی اب میں خوشی محسوس کر رہا تھا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا باتو خان کے یورت کی طرف جا رہا تھا

قشق کے توماں باشی نے مجھے فوراً ہی اور اسی حالت میں باتو خان کے یورت میں بھیج دیا اس وقت باتو خاں اپنے یورت میں تنہا تھا اور ٹہل رہا تھا اس کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا میں نے یورت میں داخل ہوتے ہی اسے تعظیم دی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر موجود تاثرات ایک دم بدل گئے۔

"تو لوٹ آیا، تب تنگری ٹھیک ہی کہتا تھا کہ تو (یگھاتر) بہادر ہے۔" باتو خاں میری طرف مڑ کر بولا "کیا اس نے تجھے کوئی پیغام دیا ہے۔"

"نہیں اے مغربی دشت کے آقا۔" میں نے جھک کر جواب دیا اور پھر بہت ہی مختصر الفاظ میں اپنی روداد بیان کر دی۔ لیکن مجھے اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ اسے ملکہ روسودان اور اس کی بیٹی تھمرو کے مقصد سے آگاہ کر سکتا شاید اس نے خود ہی میری باتیں سن کر سمجھ لیا ہو گا کہ ان دونوں ماں بیٹی نے مجھے کیوں قید کیا تھا۔

میری روداد سن کر اس نے ایک طویل سانس لیا، پھر بڑبڑایا انداز خود کلامی کا سا تھا "ٹھیک ہے یہ وقت اس سے الجھنے کا نہیں برقائی وہاں موجود ہی ہے۔ وہ اسے پہاڑوں سے نہ اترنے دے گا" پھر اسے فوراً ہی وہاں میری موجودگی کا احساس ہوا اور بولا "اچھا تو جا"

میں جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ توماں باشی یورت میں داخل ہوا۔

"اے مغربی دشت کے آقا وہ لوٹ آیا جس کا تو انتظار کر رہا تھا کیا اسے بھیج دوں؟۔"

باتو خاں نے چونک کر توماں باشی کی طرف دیکھا اور کہا "اسے فوراً اندر بھیج دو"

توماں باشی الٹے قدموں لوٹ گیا اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے یورت سے باہر نکل گیا باہر نکلتے ہی میری نظر منلیک پر پڑی اور میں اچھل پڑا وہ بھی مجھے دیکھ کر چونکا تھا۔

"بوغا!۔"

"منلیک!"

ہم نے ایک دوسرے کو حیرت سے مخاطب کیا، پھر منلیک بولا۔

"میں ابھی سائیں خاں سے مل کر یورت میں آتا ہوں پھر باتیں ہوں گی۔" یہ کہہ کر وہ باتو خاں کے یورت میں داخل ہو گیا۔

میں اس یورت میں پہنچا جو باتو خاں کے خاص قاصدوں کے لیے مخصوص تھا خدمتگاروں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ بھی مجھے دیکھ کر خوش ہوئے تھے ہاتھ منہ دھو کر میں ابلا ہوا گوشت کھا رہا تھا کہ منلیک بھی یورت میں آ گیا۔ خدمتگار اس کی آؤ بھگت میں لگ گئے اور میں گوشت کھاتا رہا میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ کیا میں منلیک کو اس کی موت سے آگاہ کر سکوں گا؟ اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں اسے نہیں بتاؤں گا کہ اشتر مجھے ملا تھا مجھے کیا حق تھا میں اس کی یہ امید توڑ دوں کہ اس کا دوست کبھی نہ کبھی لوٹ آئے گا کسی کا دل توڑنا اچھی بات تو نہیں۔"

منلیک منہ ہاتھ دھو کر میرے ہی بستر پر آ بیٹھا اور خدمتگار اس کے سامنے گوشت اور کھوڑی کا دودھ بھرا برتن رکھنے لگے۔

"تمہاری قصبک سے واپسی پر مجھے حیرت بھی ہے اور خوشی بھی!" اس نے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر اس کا چہرہ ایک دم اداس ہو گیا۔ چند لمحے بعد ہی وہ پھر بولا "نہیں معلوم کہ اشتر پر کیا گزری کیا تم نے وہاں اس کا ذکر سنا تھا؟"

"نہیں!۔" میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

پھر گفتگو کا موضوع بدلنے کی خاطر اس سے پوچھا "تم شہر کیف ہی گئے تھے نا؟"

"وہاں سے تو میں تیسرے ہی دن لوٹ آیا

تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"اس وقت تو میں آلتائی کی شجر پوش چوٹیوں کا چکر کاٹ کر آرہا ہوں مجھے سائیں خاں نے قوبوق کی خبر لینے بھیجا تھا کیونکہ اطلاع ملی تھی کہ وہ تیزی سے اپنے اردو کے ساتھ مغربی دشت کی طرف بڑھ رہا ہے۔"

"تو کیا وہ اطلاع صحیح تھی؟" میں نے پر اضطراب لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں!" وہ بولا' پھر تفصیل بتانے لگا "میں نے لدے ہوئے اونٹوں کے قافلوں کو شمالی شاہراہ پر آتے دیکھا ان کے پیچھے گرد کا بادل امنڈا چلا آرہا تھا سوار قطار در قطار اپنے چہرے پر ڈھاٹے باندھے بڑھے چلے آرہے تھے ان کے نقاروں کی صدا ہوا سے بھی زیادہ تیز اور بلند تھی نقارے ان کی زینوں کے ساتھ کسے ہوئے تھے۔ وہ ان نقاروں کے شور سے ریگستان کی سولداؤں (روحوں) کو ڈرا ڈرا کر بھگا رہے تھے۔ ان کے چھکڑوں پر سیاہ تنے ہوئے شامیانے تھے چھکڑے آپس میں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے اور ان کے سموری گنبدوں کے سائے میں سپاہی چل رہے تھے۔ یوں قوبوق نے گوبی کی سرحد پار کی اب وہ سفید ہڈیوں والے علاقے میں ریگستان کو پار کر رہا ہے۔ قوبوق کوہستانی دروں سے گزر کر دریائے ایمل کے کنارے تک پہنچنا چاہتا ہے جہاں بلندیوں پر اس کے باپ اوغدائی کی ایک چراگاہ ہے۔"

میں دلچسپی اور شوق سے یہ ساری تفصیل سنتا رہا گویا وہ وقت آگیا تھا کہ منگولوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے میں نے بمشکل اپنے دلی جذبات کو چھپایا اور اپنے لہجے سے خوشی کا اظہار نہ ہونے دیا میں نے منلیک سے کہا "تو پھر شاید کل صبح ہی سائیں خاں اپنے اولوس کو سرائے باتو سے نکلنے کا حکم دے دے گا۔"

"تو کس خیال میں ہے بوغا تو شاید سائیں خاں کو نہیں جانتا' وہ اسی وقت کل صبح کے لیے احکامات جاری کر رہا ہوگا' وہ بہت ذہین اور بگھاتر ہے۔" منلیک نے دودھ کا برتن اٹھاتے ہوئے کہا' پھر وہ مجھ سے میری روداد سننے کی خواہش کرنے لگا۔

میں نے مختصراً" اسے بھی اپنی بپتا سنا دی' اور پھر کچھ دیر ہم دونوں ہی سونے کے لیے اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے کیونکہ ہم دونوں ہی تھکے ہوئے تھے۔

دوسرے دن صبح وہی ہوا جو میں نے اور منلیک نے سوچا تھا باتو خاں واقعی رات ہی کو صبح کی روانگی کے احکامات صادر کر چکا تھا ہمیں صبح ہی معلوم ہو سکا تھا کہ پوری رات سارا شہر جاگتا رہا ہے ہم دونوں کو بھی لشکر کے ساتھ ہی جانا تھا اس لیے جلدی جلدی تیار ہو کر یورت سے باہر آگئے۔

باتو خان کیونکہ قوبوق کی منزل سے آگاہ ہو چکا تھا اس لیے اس نے سرائے باتو سے نکلتے ہی لشکر کو جھیل کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ درے کے اس پار دریائے ایمل شاہینوں کی جھیل ہی میں آکے گرتا تھا۔

لشکر شاہینوں کی جھیل پر پہنچا جہاں ہوا کی مار سے پانی میں جھاگ بن رہے تھے اور موجیں کناروں سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ یہاں دریائے ایمل کے دہانے پر باتو خاں نے اپنے لاکھوں ساتھیوں کو رک جانے کا حکم دیا باتو خاں اب مزید آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا جھیل کے آگے وسیع ریگستان تھا اور ریگستان کے بعد وہ درہ جس سے گزر کر قوبوق حملہ آور ہونے والا تھا چھکڑوں پر موجود یورت' جھیل کے کنارے کنارے نصب کر دیئے گئے اور اطراف میں جاسوس مقرر کر دیئے گئے تاکہ وہ حملے کی ہر وقت اطلاع دے سکیں۔

شاہینوں کی جھیل کے کنارے وہ تیسرا دن تھا جو تمام ہورہا تھا میں بیزار ہو کر گھومنے کے لیے اپنے یورت سے نکلنے ہی والا تھا کہ قشق (لشکر) کے ایک سپاہی نے میری طلبی کا حکم سنایا تین دن کے دوران میں یہ پہلا موقع تھا کہ باتو خاں نے مجھے طلب کیا تھا میں اب عموماً" اس کے یورت سے دور ہی دور رہتا تھا' کیونکہ وہاں مجھے ریچھ والا موٹا شامان تب تنگ کرتا آتا جاتا دکھائی دیتا تھا اور مجھے اس سے خوف سا محسوس ہوتا تھا میں سوچتا تھا کہ شامان بغورچی سے نجات ملنے کے بعد اب وہ موٹا میری جان کو نہ آجائے حالانکہ ایک بار اسی نے مجھے بغورچی سے بچایا تھا۔

میں باتو خاں کے یورت میں داخل ہوا تو توقع کے مطابق

موٹا تب تنگوی اپنے ریچھ سمیت اندر موجود تھا اور اس کے علاوہ باتو خاں کے پاس کوئی نہیں تھا میں باتو خاں کے سامنے جھک کر دوزانو ہو گیا تو باتو خاں نے مجھے مخاطب کیا "میرے جاسوس خبر لائے ہیں کہ قویوق کے ساتھ الاؤ کی رکھوالی اور اس کے چاروں بگھاتر بیٹے آئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ تو جا اور الاؤ کی رکھوالی سے مل باتو اس سے پوچھ کر آ کہ قویوق حملے میں کیوں دیر کر رہا ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا میرے عقب میں قدموں کی چاپ گونجی اور قشق (لشکر) کا تومان باشی' یورت میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک طلائی لوح تھی۔ اس نے حکم نامے کی وہ طلائی لوح باتو خان کے سامنے پیش کی' اس طلائی لوح کا مطلب یہ تھا کہ کوئی قاصد خان قویوق کے لشکر سے آیا ہے۔

"قاصد کو فوراً" یورت میں لاؤ۔" باتو خاں نے تومان باشی کو حکم دیا۔

تومان باشی الٹے قدموں لوٹا اور پھر کچھ دیر ہی بعد قاصد کے ساتھ اندر داخل ہوا اس کے پیچھے تومان باشی تھا۔

"کیا پیغام لایا ہے؟۔" باتو خاں نے اسے دیکھتے ہی کہا

قاصد نے باتو خاں کے سوال کا جواب دیا "اسے سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ اس کے ساتھ یورت میں موجود دوسروں کا حال ہوا تھا وہ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ میرا دل بھی بلیوں اچھل پڑا تھا۔

طلائی لوح لے کر آنے والا قاصد' خاقان قویوق کے مرنے کی خبر لا رہا تھا' تفصیلات کے مطابق جب خاقان قویوق کا عظیم اردو اکتائی کے شجر پوش پہاڑوں سے اترا اور سفید ہڈیوں والے علاقے میں پہنچا تو اس کے جسم میں موجود کیلت نے زور باندھا۔ منحوس کیلت پہلے ہی سے اس کے جسم پر قابض تھی' سو اس کیلت نے قویوق کا کام تمام کر دیا اور اسے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ شاہینوں کی جھیل تک پہنچ کر باتو خاں کے مقابل آ سکتا۔

باتو خان تو اس لیے خوش تھا کہ تقدیر نے اسے

درج ذیل کتاب کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے

حمل سے پیدائش تک

حکیم حافظ عبدالکریم

اس کتاب میں حمل میں حفاظت کے لیے حاملہ کے لیے ہدایات' امراض حمل اور ان کا علاج' زچگی میں حفاظت' زمانہ زچگی میں غذا اور پرہیز۔ بچے کو دودھ پلانے کا طریقہ اور وہ تمام معاملات جن کا جاننا ہر شادی شدہ عورت کے لیے ضروری ہے' شامل ہیں۔

اس کے علاوہ بچوں کی ابتدائی خوراک' مصنوعی غذا' دانت نکلنے اور دودھ چھڑانے کا طریقہ اور بچوں کے امراض کے متعلق ابتدائی باتیں بتائی گئی ہیں۔

قیمت صرف -/50 روپے

-:- منگوانے کا پتہ -:-

ثناء پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

بغیر جنگ لڑے اپنے حریف کی ضرب سے بچا دیا تھا اور میں اس لیے مسرور تھا کہ میری پیش گوئی سچ ثابت ہو گئی تھی۔ ہر چند کہ یہ پیش گوئی میرے علم کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ مجھے سولدہ نے تعلیم کی تھی، مگر الاؤ کی رکھوالی سرقوشی بیگی کے روبرو تو میں ہوا تھا۔ میں نے ہی تو اس سے کہا تھا کہ خاقان قویوق مغلوں کی جنتری کے مطابق چوہے کا سال نہ دیکھ سکے گا اور وہی ہوا تھا۔ ابھی خنزیر کا سال ختم نہیں ہو پایا تھا۔

میں نے باتو خان کی طرف نظر اٹھائی اور دیکھا کہ اس کے چہرے پر جوش اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ جیسے کچھ کہنا چاہ رہا تھا، مگر شاید اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

قاصد اور قشق کا تومان باشی، یورت سے جا چکے تھے۔ میں اب تک وہاں اس لیے موجود تھا کہ باتو خاں نے مجھے ابھی جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ قاصد کی آمد سے قبل وہ مجھے سرقوشی بیگی کے پاس بھیج رہا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ خاقان قویوق خیمے میں دیر کیوں کر رہا ہے! مگر اب تو حملہ کرنے والا ہی نہیں رہا تھا۔ میرے خیال سے اب وہاں میری روانگی بے معنی تھی۔ اب باتو خاں نے مجھے کیوں روک رکھا ہے؟ میں نے سوچا ضرور مگر زبان سے کچھ نہ بول پایا۔

کچھ دیر بعد ہی باتو خاں نے میری بجائے ریچھ والے شامان تب تنگری کو مخاطب کیا۔ میرے علاوہ وہ بھی باتو خاں کے یورت میں اپنے ریچھ سمیت موجود تھا۔

"تیرا علم کیا کہتا ہے کہ اب کیا ہو گا؟" باتو خاں نے تب تنگری کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا تیری آنکھیں مستقبل کے ماتھے پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ سکتی ہیں؟"

(دشت کے رہنے والے، کیلت اس منحوس روح کو کہتے تھے جو انسانی جسم میں داخل ہو کر بیماری کا سبب بنتی تھی۔)

"کیوں نہیں اے مغربی دشت کے آقا!" شامان تب تنگری کے منہ سے پتھروں کی طرح الفاظ لڑھکے اور میری سماعت سے ٹکرائے۔ وہ چند لمحے رک کر پھر باتو خاں سے بولا۔ "اے سائیں خاں! تو جانتا ہے کہ مجھے مستقبل کا حال جاننے کے لیے اپنا جسم چھوڑ کر نیلے جاودانی آسمان کی طرف جانا ہو گا تاکہ میں یوگدو (آسمان کی روح) کی سرگوشیاں سن سکوں۔ تجھے بھی خبر ہے کہ وہاں جانے کے بعد واپسی کسی شامان کے بس میں نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ تجھے میرے لوٹنے کا زیادہ دیر انتظار کرنا پڑے، سو اگر تو کہے تو میں چلا جاؤں؟"

"ہاں تو جا اور جس قدر جلد ممکن ہو لوٹ کر آ!" باتو خاں کے لہجے میں حکم تھا۔

شامان تب تنگری ایک دم بیٹھے بیٹھے لڑھک گیا، اور پھر چند ہی لمحوں بعد میں نے اس کے جسم کو بے حس و حرکت دیکھا جیسے اس کے جسم سے واقعی اس کی سولدہ (روح) نکل گئی ہو۔ میں نے شامانوں کے اس حیرت انگیز عمل کے بارے میں صرف سنا ہی سنا تھا اور کسی کو اس طرح اپنا جسم چھوڑ کر آسمان کی طرف جاتے نہ دیکھا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میرے دل میں اسے قریب جا کر دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی، مگر باتو خاں کی موجودگی میں یہ کس طرح ممکن تھا!

"اچھا تو اب تو بھی جا!" معاً باتو خان میری طرف پلٹ کر بولا۔

"جا اور الاؤ کی رکھوالی سے پوچھ کہ تو را کینہ اور ادغول غائش کیا کر رہی ہیں، ان کے ارادے کیا ہیں اور خود الاؤ کی رکھوالی کیا چاہتی ہے! سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا اے مغربی دشت کے آقا!" میں نے ادب سے جھک کر جواب دیا۔

"تو پھر جا!" یہ کہہ کر باتو خاں نے اپنا چوڑا سر گھما کر شامان تب تنگری کے ریچھ کی طرف دیکھا جو اس طرح چوکنا سا بیٹھا تھا جیسے تب تنگری کے جسم کی حفاظت کر رہا ہوں۔

میں ایک بار پھر اس کے سامنے جھکا اور الٹے پاؤں چلتا ہوا یورت سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد جب میں گھوڑے پر سوار اس درے کی طرف بڑھ رہا تھا جسے عبور کر کے خاقان قویوق کے

اردو میں پہنچ سکتا تھا تو میرے ذہن میں لاوا سا پک رہا تھا۔

میرے لیے یہ بات خوشی کا باعث ثابت ہوئی تھی کہ قوبوق مر گیا تھا اور میری پیش گوئی پوری ہوئی تھی۔ پیش گوئی سچ ہونے کی صورت میں سرقوشنی بیگی کے لیے مزید مہربان ہو سکتی تھی۔ میری عزت دو قیمتی بڑھنے والی تھی لیکن اب مجھے ایک قلق ہو رہا تھا۔ اگر قوبوق نہ مرتا تو کتنا اچھا ہوتا! اس کی اچانک موت نے ہزاروں منگولوں کو مرنے سے بچا لیا تھا۔ اگر جنگ ہوتی تو کتنا خون بہتا' کتنے منگول مرتے! منگول جن سے مجھے نفرت تھی۔ منگول' مرتے! منگول جن سے مجھے نفرت تھی' منگول' جن سے میں انتقام لینا چاہتا تھا' اور جن کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتا تھا' قوبوق کی غیر متوقع موت نے میری تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا تھا اب صرف ایک موقع تھا اگر میں کسی طرح اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تو کچھ ہو سکتا تھا' خاقان قوبوق کی موت کے بعد اب خاندان زریں کے کسی نہ کسی لوان (شہزادہ) کو چنگیز خان کی بھوری مسند پر بیٹھنا تھا' اگر کسی صورت نئے خاقان کے انتخاب میں جھگڑا ہو جائے تو بات بن سکتی تھی۔

چنگیز خان کی بھوری مسند کے چار دعوے دار ہو سکتے تھے' چار گھرانے اور ان گھرانوں میں سے کوئی ایک لوان' چنگیز خان کے چاروں بیٹے مر چکے تھے' اور اب خاندان زریں کی چار شاخیں تھیں' چنگیز خان کے بڑے بیٹے جوچی کی نسل میں سے باتو خان اور برقائی خان زندہ تھے۔ لیکن ان دونوں میں سے کسی کے برسر اقتدار آنے کا سوال نہیں تھا' اس کے دو اسباب تھے

پہلا سبب یہ کہ خاندان زریں کے تمام ہی افراد کو اس بات کا علم تھا کہ اپنے بڑے بیٹے جوچی کی طرف سے خود چنگیز خان کا دل صاف نہیں تھا' چنگیز خان نے اسے کبھی اپنی جائز اولاد تصور نہیں کیا اسی لیے اسے خود سے دور بھی رکھا' جوچی کا آخری وقت بھی مغربی دشت میں گزرا اس کی موت کے بعد باتو خاں کو یہ علاقہ ورثے میں ملا۔ یاسائے چنگیزی کے مطابق اقتدار سب سے چھوٹے بیٹے کا حصہ ہوتا تھا مگر چنگیز

وجہ'

"رشیدا اسپتال کیوں پہنچ گیا؟"

"وہ کل منیر صاحب کے گھر میں منیر صاحب کی طرح زندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اوپر سے منیر صاحب آ گئے۔!"

خان کی موت کے بعد وہی بھورے غلدے کی مسند پر بیٹھا' گویا اقتدار اوغدائی کے خاندان میں چلا گیا۔ سرقوشنی بیگی کو یہی دکھ تھا اگر اس کا شوہر زندہ ہوتا تو شاید ایسا نہ ہوپاتا' اس صورت حال میں باتو خان کے برسر اقتدار آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اگر اقتدار کے لیے کوئی کشمکش ہو سکتی تھی تو صرف دو گھرانوں کے درمیان ممکن تھی۔ اوغدائی کے گھرانے اور سرقوشنی بیگی کے گھرانے ہی کے مابین کوئی جھگڑا ہو سکتا تھا۔

اوغدائی نے یاسائے چنگیزی کے مطابق اپنے سب سے چھوٹے بیٹے شیرامون کے بارے میں وصیت کی تھی کہ اسے خاقان بنایا جائے' مگر ایسا نہیں ہوا تھا' شیرامون کیونکہ تورا کینہ کی اولاد نہیں تھا اور کمسن بھی تھا' اس لیے تورا کینہ اور اوغول غائمش نے مل کر قوبوق کو خاقان بنا دیا کہ وہ بہرحال بالغ تھا اور اوغدائی کا بیٹا تھا' شیرامون کی ماں احتجاج بھی نہ کر سکی تھی کیونکہ ملکہ تورا کینہ اتنی صاحب اثر تھی کہ اس کے فیصلے کو غلط کہنے کی کسی میں جرات نہ تھی۔ یوں قوبوق برسر اقتدار آ گیا تھا۔

قوبوق کے علاوہ اوغدائی کے دو اور بیٹے تھے قائدو اور قدان' مگر قوبوق کے خاقان بننے سے ان کا حق بھی مارا گیا تھا اب یاسائے چنگیزی کے مطابق قوبوق کی اولاد ہی میں سے کسی کو خاقان بننا چاہیے تھا مگر قوبوق بے اولاد تھا۔

"چنگیز خاں کے ایک اور بیٹے چغتائی کی اولاد میں سے بوری باور بائی دار زندہ تھے مگر ان دونوں کے اقتدار میں آنے کا سوال ہی نہیں تھا' نہ یاسائے چنگیزی کے مطابق اور نہ قوت و اقتدار کے اعتبار سے۔"

صورت حال یوں تھی کہ حق تو اوغدائی کے گھرانے کا تھا اور قوت و طاقت سرقوشنی بیگی کے گھرانے میں وہ چار بگھاتر (بہادر) بیٹوں کی ماں تھی۔ یوں اختلاف اور جھگڑے کے قوی امکانات تھے۔

میں تمام راستے انہی تمام باتوں پر غور کرتا ہوا اردو کے پڑاؤ تک پہنچ گیا۔ قوبوق کی موت کے بعد اب وہاں میری زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا میرے لیے خطرہ بن سکتے تھے' وہ خود خطرے کی زد میں تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت قوبوق کی بیوہ اوغول غانمش اور اس کی ماں تورا کینہ کا کیا حال ہوگا؟ اقتدار کی کشمکش میں ان دونوں عورتوں اور سرقوشنی بیگی کو اہم کردار ادا کرنا تھا دیکھنا یہ تھا کہ جیت کس کی ہوتی ہے' لیکن مجھے کسی کی ہار جیت سے زیادہ دلچسپی ان کے درمیان اختلاف پیدا ہونے میں تھی۔

مجھے قوبوق کے اردو میں پہنچ کر' سرقوشنی بیگی کا یورت تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اس کے یورت کی اطراف مسلح جوانوں کا پہرہ تھا' توقع کے مطابق مجھے روک لیا گیا۔ سرقوشنی بیگی کے قشق (محافظ دستہ) کا ایک توبان باشی میرا پیغام لے کر اس کے یورت میں گیا۔ میں نے جان بوجھ کر کہلوایا تھا کہ باتو خان کا پیغام لے کر میں آیا ہوں' تاکہ وہ مجھے فوراً بلا لے۔ وہی ہوا ابھی توبان باشی تیزی کے ساتھ یورت سے نکلا اور مجھ سے اندر جانے کے لیے کہا۔

میں یورت میں پہنچا تو دیکھا' سرقوشنی بیگی وہاں تنہا نہیں تھی بلکہ اس کا ایک جوان بیٹا ہلاکو خاں بھی اس کے قریب بیٹھا تھا۔ ہلاکو خاں کو اتنے قریب سے میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس چیتے جیسی چمک تھی جو اپنے شکار پر جھپٹنے والا ہو اس کا چہرہ خاندان زریں کے دوسرے نوجوانوں ہی کی طرح تھا' مگر اس میں نہ جانے کیا ایسی بات تھی جو دوسروں سے مختلف تھی' اور میں اسے کوئی نام نہ دے سکتا تھا بس مجھے اتنا محسوس ہوا جیسے میں اچانک کسی خطرناک درندے کے سامنے پہنچ گیا ہوں یہ صرف ایک نظر کا جائزہ تھا۔

میں نے یورت میں داخل ہو۔ تے ہی احتراماً اپنی سموری ٹوپی اتار لی تھی۔ اور اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی پیٹی بھی کھول دی تھی۔ میں آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل سرقوشنی بیگی کی مسند کے سامنے بیٹھا اور سر جھکا دیا' حالانکہ میرا دل بغاوت پر آمادہ تھا۔

"بوغا۔ ہم تجھے دیکھ کر خوش ہوئے اور اس پر بھی کہ تیری پیش گوئی صحیح ہوئی ہم تو یہ بھول ہی گئے تھے کہ تو نے قوبوق کے بارے میں بھی پیش گوئی کی تھی' بول' سائیں خاں کیا کہتا ہے؟" سرقوشنی بیگی کے لبوں کو حرکت ہوئی۔

میں نے باتو خاں کا پیغام دہرا دیا۔

"تو سن۔۔۔ اس سے کہنا کہ تورا کینہ اور اوغول غانمش ہراساں ہیں۔"

سرقوشنی بیگی کچھ دیر بعد میری بات سن کر بولی "وہ قوبوق کے مرنے کی خبر چھپانا چاہتی ہیں جس طرح جسد عظیم (چنگیز خاں) کی موت کو چھپایا گیا تھا۔ پہلی بار تو راکینہ پریشان نظر آرہی ہے۔ اس نے قوبوق کی چالاکی اور وہی بیوہ اوغول غانمش سے مشورہ کیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ مشورے کے بعد تورا کینہ نے احکامات جاری کر دیے ہیں۔ ان احکامات کی رو سے تمام راستے بند کر دیے جائیں گے اور منزلوں پر مسافروں کو روک دیا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

میں نے واپسی کی اجازت چاہی' کیونکہ اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا تھا۔ میں شاہینوں کی جھیل تک پہنچنے سے پہلے ملکہ تورا کینہ سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتی تھی اور خود اپنی زبان سے بھی میرے دانش مند ہونے کا اعتراف کر چکی تھی۔ میں ایک طرف تو اس کے ارادوں سے باخبر ہونا چاہتا تھا اور دوسری جانب اسے سرقوشنی بیگی کی جانب بھڑکانا چاہتا تھا۔ ہر چند کہ یہ کھیل خطرناک تھا' مگر میں یہ کھیل کھیلنے پر آمادہ تھا۔

سرقوشنی بیگی نے مجھے رخصت کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ "بوغا! اب تو نے ہمارے دل میں جگہ بنالی ہے اور تجھے جلد ہی ہم سائیں خاں سے واپس مانگ لیں گے۔"

میں اب خود یہی چاہتا ہوں کہ اس کے قریب رہوں تاکہ مجھے اپنا مقصد حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ یہی سوچ کر میں بولا۔ "خادم تو خود الاؤ کی رکھوالی کے قریب رہ کر، اس کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ یہی خادم کی آرزو ہے۔"

"تیری یہ آرزو پوری کی جائے گی۔" سرقوشنی بیگی نے کہا۔

میں اس کے سامنے جھکا اور یورت سے نکل گیا۔

پہاڑوں کے دامن میں دور تک پھیلا ہوا یہ ایک ریگستانی علاقہ تھا جس میں قویوق کے اردو نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ اسی علاقے کو سفید ہڈیوں والا علاقہ کہا جاتا تھا، کیونکہ یہاں مغل قبیلوں کی بادداشت سے پہلے کوئی اولوس (لشکر) تباہ ہوا تھا اور مغلوں کو اس اولوس کی ہڈیوں کا ڈھانچے ملے تھے۔ اسی وقت سے یہ علاقہ سفید ہڈیوں والا علاقہ کہلاتا ہے۔

میں نے سرقوشنی بیگی کے یورت تک پہنچتے ہوئے راستے ہی میں ان یورتوں کو دیکھ لیا تھا جو خاقان قویوق اور اس کے اہل خاندان کے لیے مخصوص تھے۔ شاہی یورت کستوری عیسائیوں کی ایک عبادت گاہ کے قریب لگائے گئے تھے۔ ایک چھکڑے پر لکڑی کا کلیسا تھا جس میں بھری رنگی ہوئی تصویریں تھیں۔ میں نے اس کلیسا کے بارے میں راستوں کا علم جاننے والے ایک ایغوری سے سنا تھا۔ اس ریگستان میں عیسائیوں کی یہ عبادت گاہ نہ جانے کب سے تھی۔

مجھے دور ہی سے وہ عبادت گاہ نظر آنے لگی جس سے میں نے سمت کا اندازہ کیا اور اپنا گھوڑا ادھر دوڑانے لگا۔ میرے تصور میں ملکہ تورا کینہ کا چہرہ تھا، بوڑھا اور بدصورت چہرہ۔ وہ چہرہ جیسے سرقوشنی بیگی کے چہرے کی ضد تھا۔ سرقوشنی بیگی ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود جتنی پرکشش اور حسین تھی، تورا کینہ اسی قدر بدصورت اور کریہہ تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لے گی۔ وہ میری چھوٹی ماں فاطمہ کے مشوروں کو فوراً قبول کرلیتی تھی اور چھوٹی ماں ہی کے پاس آنے جانے کی وجہ سے وہ مجھے بھی اچھی طرح پہچان گئی تھی۔ قویوق نے اپنے مصاحبوں کے مشورے پر چھوٹی ماں فاطمہ کو راستے سے ہٹا دیا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تورا کینہ اپنے بیٹے کے اس فیصلے سے خوش نہ رہی ہوگی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ فاطمہ کو کس قدر عزیز رکھتی تھی۔ اب میری دانست میں قویوق کی موت کے بعد یہ سارا معاملہ ہی ختم ہوگیا تھا۔ میں اور میری ماں اس لیے قابل سزا ٹھہرے تھے کہ ہمارا تعلق فاطمہ سے تھا ورنہ اس کے سوا ہمارا کوئی قصور نہ تھا۔ ان حالات میں ملکہ تورا کینہ سے رعایت حاصل کی جاسکتی تھی۔ اور میں اسی رعایت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے ملنے جارہا تھا۔

ابھی شاہی یورت دور تھے کہ میں نے معاً اپنی دائیں اور بائیں سمت سے کچھ گھڑسواروں کو تیزی سے آگے بڑھتے دیکھا۔ میں نے چونک کر اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ مجھے خطرے کا احساس ہوا تھا۔ دو طرف سے اس طرح گھڑسواروں کا میری جانب بڑھنا بے معنی نہیں ہوسکتا تھا۔ میں ان چند لمحوں میں یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ آگے جاؤں یا پیچھے لوٹ جاؤں۔ میں نے اپنا گھوڑا روک لیا تھا، اور یہی میری غلطی تھی۔ گھڑسوار تیزی سے میرے قریب آگئے تھے۔ میں نے ان کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں دیکھیں اور سمجھ گیا کہ ان کے ارادے خطرناک ہیں۔

میں ایک جانب مغربی دشت کے فرمانروا باتو خاں کا خاص قاصد تھا تو دوسری جانب خاندان زریں کی ایک جلیل القدر بیگی کا منظور نظر۔ یہ طے شدہ تھا کہ ان حملہ آوروں کو بعد میں مجھ پر حملہ کرنے کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی مگر اس وقت تو مجھے ان سے اپنی جان بچانی تھی۔ بعد میں جو بھی ہوتا۔ اس سے بھلا مجھے کیا حاصل تھا۔

دونوں سمتوں سے حملہ آور ہونے والوں کی تعداد دس سے زیادہ نہیں تھی اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں ان کا مقابلہ کروں۔ میں نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی تلوار کھینچ لی۔

گھڑسواروں کو شاید یہ توقع نہیں تھی کہ میں ان سے مقابلے کی جرات کروں گا۔ اس لیے وہ کچھ ٹھٹک کر رک گئے۔ میرے لیے ان کا اس طرح ٹھٹک کر

رک جانا سود مند ثابت ہوا کیونکہ اس طرح مجھے حملے میں پہل کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ مجھے ابھی اپنے نرغے میں نہیں لے سکے تھے۔

میں نے جھپٹ کر ایک گھڑ سوار پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ حملہ اچانک تھا اس لیے وہ مدافعت نہ کر سکا۔ میری تلوار نے اس کی گردن اڑا دی۔ میرے ہاتھوں یہ پہلے منگول کا قتل تھا۔ میں نے اس کا جسم گھوڑے سے گرتے دیکھا' اور اس نظارے سے میری رگ رگ میں مسرت کی لہریں سی دوڑ گئیں۔ میرا ہاتھ پھر بلند ہوا لیکن اب وہ چوکنا ہو چکے تھے۔ دوسرے گھڑ سوار نے میری تلوار کی ضرب کو اپنی تلوار پر روکنا چاہا لیکن ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کی تلوار دو ٹکڑے ہو گئی۔ پھر اس کے فرار ہونے سے قبل ہی میں اس کا سینہ چھید چکا تھا۔ میرے ہاتھوں دوسرے منگول کا قتل ہوا اور جیسے میری ہمت دوگنی ہو گئی۔

اب میرے مقابلے پر آٹھ حملہ آور رہ گئے اور انہیں صورت حال کا اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ سب مل کر ایک ساتھ چیخے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ان کے نرغے سے نکل گیا۔ وہ دو طرف سے مجھ پر جھپٹے' مگر میں ان کے درمیان سے تیر کی طرح نکل گیا تھا۔ وہ آپس میں ٹکرا گئے۔ ان میں سے دو خود کو نہ سنبھال پائے۔ ان کے گھوڑے اچانک لگام کھینچے جانے کے سبب الف ہو گئے اور انہیں اپنی پشت سے نیچے پھینک دیا میں نے اس موقع سے بھی پورا فائدہ اٹھایا اور پلٹ کر ان پر حملہ کیا۔ اس حملے میں ایک گھوڑے کی پشت اور خالی ہو گئی۔ اب ان کی تعداد نصف رہ گئی تھی۔

مجھے اس وقت یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ وہ گھڑ سوار کون ہیں' اور کس کے ایما پر انہوں نے مجھے گھیرا ہے۔ میری وجود میں تو جیسے بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ میرے اوپر تو صرف یہ دھن سوار تھی کہ ان سب کو قتل کر دوں۔

ایک گھڑ سوار میری تلوار سے زخم کھا کر فرار ہوا تو [illegible] اب [illegible] گھوڑوں سے گرے تھے' وہ بھی بھاگ چکے تھے۔ وہ سب بھاگ گئے' مگر ان میں سے ایک بھاری تن و توش والا میرے مقابلے پر ڈٹا رہا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بکھاتری (بہادری) کا ثبوت دے رہا تھا۔ وہ چیخ مار کر مجھ پر جھپٹا' مگر میں تو خود انہی میں سے تھا اور ان کے طریق جنگ کو خوب سمجھتا تھا تو بھلا میں ان کی چیخ سے کیوں حواس کھوتا میں نے تیزی سے اپنے گھوڑے کو پیچھے ہٹا کر اس کا وار خالی کر دیا۔ پھر پینترا بدل کر اس پر حملہ کیا۔ اس نے میری تلوار کی ضرب اپنی ڈھال پر روک لی۔ ان حملہ آوروں میں سے صرف اسی کے اس چمڑے کی ڈھال تھی۔ میں نے اس پر دوسری ضرب لگانا چاہی۔ اس نے دوسری ضرب اپنی تلوار پر روکی' اور یہی اس کی غلطی تھی۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اسی وقت میں نے یورتوں کی جانب سے ایک شور سنا۔ تلوار گرنے کے بعد وہ گھڑ سوار ابھی فرار نہ ہو سکا تھا کہ میں اسے با آسانی قتل کر سکتا تھا۔ لیکن اس شعور نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی یہی وہ لمحے تھے کہ گھڑ سوار کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔

میں نے کچھ فاصلے پر موجود یورتوں کی جانب دیکھا اور اس سمت مجھے دھول اڑتی نظر آئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس دھول کا کیا مطلب ہے یقیناً سواروں کی ایک بڑی تعداد اس طرف گھوڑے دوڑاتی آ رہی تھی۔ وہ لوگ جو میرے مقابلے پر نہ جم سکے تھے۔ شاید وہی اپنے دوسرے ساتھیوں کو لے کر آ رہے تھے۔

اب وہاں رکنے کا مقصد خود کو ہلاکت میں ڈالنا تھا' اس لیے میں نے فرار کو ترجیح دی۔ میں نے اپنے گھوڑے کا رخ پہاڑوں کی طرف کر دیا۔ اور تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑانے لگا۔ کچھ دور ہی جا کر مجھے محسوس ہو گیا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ میں نے اپنے گھوڑے کی پسلیوں پر ٹخنوں کا دباؤ بڑھا دیا۔ میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنا لگا' مگر تعاقب میں آنے والے بھی اپنے گھوڑوں کو تیزی ہی سے دوڑا رہے تھے۔

میں گھوڑا دوڑاتا ہوا اس پہاڑی درے تک پہنچ گیا

سے عبور کر کے میں شاہینوں کی جھیل تک پہنچ سکتا تھا اور پھر میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا پڑاؤ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا اور ریگستانی علاقہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اب میں اپنے تعاقب میں آنے والوں کی تعداد کا اندازہ کر سکتا تھا کیونکہ اب دھول نہیں اڑ رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور اگر میں اس وقت میں پلٹ کر نہ دیکھتا تو شاید وہ نیزہ میری پشت میں پیوست ہو کر سینے سے باہر نکل جاتا جو میرے تعاقب میں آنے والوں نے میری طرف پھینکا تھا۔ میں ایک دم جھک کر گھوڑے کی پشت سے چمٹ گیا اور پھینکا ہوا نیزہ سر سراتا ہوا میرے اوپر سے گزر گیا۔ نیزہ پھینکنے والے کا نشانہ یقیناً اچھا تھا۔

تعاقب میں آنے والے میری توقع کے خلاف کافی قریب آ چکے تھے اسی لیے میں انہوں نے نیزہ پھینک کر مجھے ہلاک کرنا چاہا تھا۔ میں نے گھوڑے کی پشت سے چمٹے ہی چمٹے پیچھے دیکھا' ایک گھڑ سوار پھر نیزہ پھینکنے کے لیے ہاتھ بلند کر رہا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ تعداد میں تھے اور ان کے پاس نیزے بھی تھے۔ میں رک کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے لیے صرف یہی راہ تھی کہ کسی طرح ان کے چنگل سے نکل کر فرار ہو جاؤں۔

اچانک میرا گھوڑا زور سے ہنہنایا اور اچھلا۔ میرے جسم کو بھی ایک جھٹکا سا لگا اور اسی وقت سامنے سے شور بلند ہوا۔ اسی طرف میرا گھوڑا دوڑ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گھڑ سواروں کا ایک دستہ میری طرف لپک رہا ہے۔ انہیں دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی۔ میں درے کے آخر تک پہنچ گیا تھا۔ یہ گھڑ سواروں کا وہ دستہ تھا جسے باتو خاں نے درے پر جاسوسی کے لیے متعین کیا تھا۔

میں گھوڑے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور مڑ کر دیکھا۔ میرے تعاقب میں آنے والے مڑ کر بھاگ رہے تھے۔ انہیں خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ اس دوران میں سامنے سے آنے والے گھڑ سواروں کا دستہ میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے اپنا گھوڑا روک لیا اور انہیں شہباز کی لوح دکھائی۔ ان میں سے ایک مجھے پہچان بھی گیا' کیونکہ قویوق کے پڑاؤ کی طرف جاتے ہوئے میں اسی درے سے گزرا تھا۔ اور جاتے ہوئے بھی میں نے لوح دکھائی تھی۔ تعاقب کرنے والوں کا پیچھا نہیں کیا گیا اور وہ فرار ہو گئے۔

"اے شاہی قاصد۔ تیرا گھوڑا زخمی ہے' اور اس کی پشت سے خون بہہ رہا ہے ایک نیزہ گھوڑے کے جسم میں پیوست ہے۔" ایک سپاہی نے مجھے بتایا۔

میں سمجھ گیا کہ میرا گھوڑا کیوں زور سے ہنہنا کر اچھلا تھا۔ میرا تعاقب کرنے والوں نے میری بجائے میرے گھوڑے کو نشانہ بنایا تھا تاکہ میں سواری سے محروم ہو جاؤں اور وہ میرا کام تمام کر دیں۔ اگر جاسوس دستہ بروقت مداخلت نہ کرتا تو جانے میرا کیا حشر ہوتا۔

میں نے گھوڑے سے اتر کر اس کے جسم سے نیزہ کھینچ لیا۔ گھوڑا الف ہو گیا اور میں نے جھپٹ کر اس کی لگام تھام لی۔

جاسوس دستے کے سردار نے میرے لیے دوسرے گھوڑے کا بندوبست کر دیا اور زخمی گھوڑے کی لگام اس سپاہی نے تھام لی جس نے مجھے اپنا گھوڑا سواری کے لیے دے دیا تھا۔

میں دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ اب مجھے جلد سے جلد باتو خاں کے یورت تک پہنچنا تھا' تاکہ اسے وہ باتیں بتا سکوں جو مجھ سے سرقوتنی نے کی تھیں۔

میں درے سے گزر کر میدان میں اترا اور باتو خان کے یورت کی طرف گھوڑا دوڑا دیا۔ خطرے کی حدود سے نکل کر اب میرا ذہن گزرے ہوئے لمحوں کا حساب کر رہا تھا۔ آخر وہ حملہ آور کون تھے؟ اگر وہ راستے میں حائل نہ ہو جاتے تو میں ملکہ تورا کینہ سے مل سکتا تھا' لیکن انہوں نے مجھے اتنی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ میں نے اس مسئلے پر کافی غور کیا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا اور باتو خاں کا یورت قریب آ گیا۔

باتو خاں نے مجھے فوراً اپنے یورت میں بلوا لیا۔ میں نے اسے تعظیم دے کر سرقوتنی بیگی سے اپنی ملاقات کا حال بتایا۔ میں نے آخر میں ان حملہ آوروں کا ذکر بھی کر دیا جنہوں نے درے تک میرا تعاقب کیا

تھا۔

"کیا ان میں سے تو نے کسی کو پہچانا؟۔" باتو خاں نے میری روداد سن کر پوچھا۔

"نہیں اے مغربی دشت کے آقا۔ وہ سب میرے لیے اجنبی تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر وہ تیرے دشمن کیوں ہو گئے؟ کیا تو نے انہیں لوح نہیں دکھائی اور نہیں بتایا کہ تو کس کا قاصد ہے؟۔" باتو خاں کے لہجے میں غصہ تھا۔

"اے سائیں خاں! مجھے اس کی مہلت ہی نہیں مل سکی۔ انہوں نے مجھ پر اچانک حملہ کر دیا تھا اور میں اپنی جان کی حفاظت میں لگ گیا تھا۔"

ابھی میرا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ باتو خاں کے قشق کا ایک تومان باشی 'یورت' میں داخل ہوا اور باتو خاں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اے سائیں خاں۔ قوبوق کے پڑاؤ سے ایک قاصد آیا ہے۔ تومان باشی نے بتایا۔

"اسے اندر بھیج۔" باتو خاں نے حکم دیا۔

تومان باشی یورت سے چلا گیا' اور چند ہی لمحے بعد ایک دراز قد منگول اندر داخل ہوا۔ اس نے یورت میں آتے ہی گھٹنوں کے بل جھک کر اور ٹوپی اتار کر باتو خاں کو تعظیم دی۔ پھر بولا۔ "اے سائیں خاں! مجھے ملکہ تورا کینہ نے تیرے پاس بھیجا ہے اور میں تجھ تک اس کا ایک اہم پیغام لے کر آیا ہوں۔"

"پیغام زبانی ہے یا تحریری؟۔" باتو خاں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

"زبانی۔" دراز قد قاصد نے کہا۔

"تو پھر سنا کہ اس نے کیا کہلوایا ہے۔" باتو خاں بولا۔ لہجے کی سختی اب بھی برقرار تھی۔

"اس نے کہا ہے کہ خاقان قوبوق کی موت کے بعد اب اس کی بیوہ اوغول غانمش بھورے نمدے کی مسند پر بیٹھے گی' پر وہ تجھ سے مشورہ چاہتی ہے اور اس نے کہلوایا ہے کہ تو اس سے جا کر مل لے۔" قاصد نے زبانی پیغام سنا دیا۔

قاصد کی بات سن کر چند لمحے باتو خاں چپ رہ کر بولا۔ "سن اس سے کہنا کہ میرے گھوڑے جھیل کے کنارے آرام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ میری ٹانگ میں بھی درد ہے۔ شاہانوں کا کہنا ہے کہ مجھے اس حالت میں سواری نہیں کرنی چاہیے' سو میں اس سے ملنے نہیں جا سکتا۔"

باتو خاں نے بھی زبانی پیغام کا زبانی جواب دیا اور قاصد سے دوبارہ اپنا جواب سن کر اسے واپس کر دیا تاکہ وہ وہ سمجھ لے کر قاصد نے اس کا پیغام رٹ لیا ہے اس کے بعد مجھے بھی اس نے اپنے یورت میں جانے کی اجازت دے دی۔ میں اس کے یورت سے باہر آ گیا۔

حسب معمول قشق سے وابستہ شاہی قاصدوں کے یورت' باتو خاں کے یورت سے دور نہیں لگایا گیا تھا۔ باتو خاں کے خاص قاصدوں میں منلیک اور اشتر ہی تھے جن میں سے اشتر مر چکا تھا۔ گویا اب میں نے اشتر کی جگہ لے لی تھی لیکن قوبوق کی موت کے بعد اب میں وہاں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اب حالات بدل چکے تھے اور ان بدلے ہوئے حالات کا تقاضا یہ تھا کہ میں قراقرم میں رہوں جو ان منگولوں کا پایہ تخت تھا۔ اس کی اب ایک راہ بھی پیدا ہو گئی تھی۔ سرقوشنی بیگی مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ تھی۔ میں اسی لیے خوش بھی تھا۔

میں شاہی قاصدوں کے یورت میں پہنچا تو منلیک وہاں موجود تھا عموماً" جب ہم دونوں ملتے تو ایک دوسرے سے اس کے سفر کی روداد پوچھتے تھے۔ حسب معمول منلیک نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں کہاں گیا تھا۔ میں نے اسے مختصراً" روداد سفر سنا دی۔ اس نے حملہ آوروں کے ذکر پر حیرت کا اظہار کیا۔

"تجھے خبر ہے بوغا کہ کسی ایسے شخص پر حملہ کرنے کی کیا سزا ہے جس کے پاس شہباز کی لوح ہو؟۔" منلیک میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"خاندان زریں کے کسی بھی قاصد پر حملہ کرنے کی سزا موت ہے۔" منلیک نے بتایا پھر بولا۔ "اور قاصد تو چاہے دشمن کی طرف سے کوئی پیغام لے کر آئے' اسے کچھ نہیں کہا جاتا۔"

"اگر ایسا ہے تو ملکہ روسودان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟۔" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

ملکہ روسودان کے ذکر پر اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ شاید اسے اپنا دوست اور ساتھی اشتریاد آگیا تھا۔ چند لمحے بعد وہ بولا۔ "روسودان کی مثال انفرادی ہے۔ حیران باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ اب تمہارے خیال میں کیا ہوگا؟ نیا خاقان کون بنے گا؟"

"ظاہر ہے کہ یہ تو قرولتائی (بین القبائلی اجلاس) ہی میں طے ہوگا۔" میں نے اپنے خیال کو چھپانے کی خاطر ایک عام سی بات کہہ دی۔

"یہ تو خیر سبھی جانتے ہیں کہ قرولتائی منعقد ہوگی اور اسی میں نئے خاقان کو منتخب کیا جائے گا۔ میں تو تمہاری رائے پوچھ رہا تھا۔" منلیک نے کہا۔

"قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

میں اور منلیک باتیں کرتے رہے اور اس دوران میں ہم نے کھانا بھی کھالیا۔ کھانے سے فراغت پاکر منلیک اور میں گھوڑی کا دودھ پی رہے تھے کہ منلیک کا بلاوا آگیا۔

"کیا سائیں خاں کے یورت میں کوئی اور بھی ہے یا وہ اکیلا ہے؟" منلیک نے دودھ کا برتن زمین پر رکھتے ہوئے قشتی کے اس سپاہی سے سوال کیا جو اسے بلانے آیا تھا۔

"الاؤ کی رکھوالی کے دو بڑے بگھاتر (بہادر) بیٹے بھی اس کی یورت میں موجود ہیں۔ وہ اپنے یورت میں اکیلا نہیں اور شامان تب تنگری بھی وہیں ہے۔" قشق کے سپاہی نے بتایا۔

میں سپاہی سے یہ بات سن کر چونک پڑا۔ سرقوشنی بیگی کے دونوں بڑے بیٹے، منگو اور سچین قبلائی یہاں کیسے پہنچ گئے؟ مجھ سے تو سرقوشنی بیگی نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا تھا، پھر یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے سوچا۔ منلیک کو یقیناً" کہیں روانہ کرنے کے لیے ہی بلایا گیا ہوگا۔ تو کیا صورت حال نے کوئی نئی کروٹ لی ہے؟ میں سوچتا رہا اور منلیک، سپاہی کے ہمراہ یورت سے نکل گیا۔ منلیک کو یہاں بھی بھیجا جا رہا تھا اس سلسلے میں مجھے زیادہ فکر نہیں تھی کیونکہ مجھے یہ بات با آسانی منلیک سے معلوم ہو سکتی ہے۔ مجھے اصل فکر منگو اور قبلائی کے وہاں آنے سے تھی۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ میرے آنے کے بعد سرقوشنی بیگی نے کوئی نئی چال چلی تھی۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ وہ کسی صورت بھی قوبوق کی بیوہ اوغول غانمش کی حاکمیت تسلیم نہیں کر سکتی تھی میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ منلیک یورت میں لوٹ آیا اور سفر کی تیاریاں کرنے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو تم؟۔" میں نے اس کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔

"زیادہ دور نہیں، قوبوق کے پڑاؤ تک جانا ہے۔" اس نے بتایا۔

"مگر پہلے تو سائیں خاں نے مجھے وہاں بھیجا تھا۔؟"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "شاید اس بار سائیں خاں تمہیں یوں نہیں بھیج رہا کہ پہلے کی طرح کہیں اس بار بھی تمہارے دشمن تمہیں نہ گھیر لیں۔"

منلیک ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، مجھے نہ بھیجنے کا یہی سبب ہو سکتا تھا میں نے اپنے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے نسبتاً" پرسکون آواز میں منلیک سے پوچھا۔ "بیگی کے بگھاتر بیٹے کیوں آئے ہیں، کچھ پتا چلا؟۔"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر میرا اندازہ ہے کہ وہ موجودہ حالات پر گفت و شنید کرنے ہی آئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"تم کس کے نام سائیں خاں کا پیغام لے جا رہے ہو؟۔" میں نے دریافت کیا۔

"ملکہ تورا کینہ اور اوغول غانمش کے نام۔!" اس نے بتایا اور اسی وقت ایک خدمت گار نے یورت میں داخل ہو کر اس سے کہا کہ سفر کے لیے گھوڑا تیار ہے۔

میں اس سے کچھ اور بھی پوچھتا مگر وہ جلدی میں تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ یورت سے نکل گیا اور میرا ذہن الجھنے لگا۔ منگو اور قبلائی کی باتو خاں سے ملاقات پھر باتو خاں کا تورا کینہ کے نام پیغام ان دونوں باتوں میں یقیناً" کوئی ربط تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ ان کے درمیان کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا ہو جائے اور کوئی

ایسی منزل آجائے کہ وہ آپس میں لڑ پڑیں۔
میری دل میں تجسس پیدا ہو گیا تھا کہ جان سکوں' منگو اور قبلائی وہاں کیوں آئے ہیں۔ یہی سوچ کر میں یورت سے باہر نکلا۔ میں اس سلسلے میں قشق کے توان باشی سے کچھ نہ کچھ اگلوا سکتا تھا' کیونکہ میرے خیال کے مطابق اسے کسی نہ کسی حد تک کچھ نہ کچھ سن گن ضرور ہو گی۔ یوں بھی وہ باتو خاں کے یورت میں آتا جاتا رہتا تھا۔
میں ٹہلتا ہوا' باتو خاں کے یورت کی طرف چلا تو میں نے دور ہی سے وہاں غیر معمولی قسم کی سرگرمی محسوس کر لی۔ قشق کا دستہ چوکنا اور مستعد کھڑا ہوا تھا قشق کے کچھ سپاہی گھوڑوں پر سوار باتو خاں کے یورت کی اطراف میں پہرہ دے رہے تھے' اور سب پوری طرح مسلح تھے۔ یورت کے در سے ذرا ہٹ کر توان باشی کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اب قشق کا ایک ایک سپاہی پہچان گیا تھا' اس لیے کسی نے بھی مجھے آگے بڑھنے سے نہیں روکا۔
میں توان باشی کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔ انداز دوستانہ ہی تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ میری آمد کے بارے میں کوئی سوال کرتا میں بول اٹھا "تم لوگ ٹھیک ہو جو ہر وقت سائیں خاں کی خدمت میں رہتے ہو اور تمہیں ہماری طرح کہیں آنا جانا نہیں پڑتا' یا تو ہم سفر میں رہتے ہیں یا اپنے یورت میں پڑے رہتے ہیں۔ بعض وقت یورت میں پڑے پڑے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔"
"ہاں یہ تو ہے۔" توان باشی مسکرا کر بولا۔ "مگر ہماری طرح اگر تمہیں بھی ہر وقت مستعد و چوکنا رہنا پڑے تو تمہارے اعصاب بھی جواب دے جائیں۔ خیر اور سناؤ کیا حال ہے؟ کیا اس وقت بھی یورت میں پڑے پڑے اکتا گئے تھے؟ تم ابھی ایک پہر پہلے ہی تو سفر سے لوٹے ہو۔"
"ہاں اکتا ہی گیا تھا۔" میں نے جواب دیا' اور پھر مطلب کی بات پر آگیا۔ "سنا ہے کہ الاؤ کی رکھوالی کے دونوں بڑے بگھاتر بیٹے سائیں خاں سے ملنے آئے ہیں۔ کیا یہ خبر صحیح ہے؟" "تمہیں تو سب کچھ معلوم ہو گا۔" آخری جملہ میں نے اس کی ستائش کے انداز میں ادا کیا' اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ توان باشی کا ہوا سینہ کچھ اور تن گیا۔
"ہاں مجھے کیا خبر نہیں ہوتی۔! آخر میں سائیں خاں کے قشق کا توان باشی ہوں۔" وہ سینہ پھلا کر بولا "تم نے ٹھیک ہی سنا ہے' اور اب تو سائیں خاں۔ ضیافت کا یورت نصب کرنے کا حکم دیا ہے۔"
"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں نویان (شہزادے) ابھی ٹھہریں گے۔" میں نے اسے مزید کریدنے کے لیے کہا۔
"ہاں اور کیا۔!" وہ بولا۔ "سائیں خان نے تو باقی تمام نویانوں کو بھی یہیں بلوایا ہے۔"
"اچھا۔" میں نے اظہار حیرت کیا۔ "تو منلیک کو اسی لیے وہاں بھیجا گیا ہے۔!"
"ہاں۔ میں نے خود سائیں خاں کو منلیک سے کہتے سنا تھا کہ وہ ملکہ توراکینہ سے جا کر ملے اور سائیں خاں کا یہ پیغام دے۔ سائیں خاں کا کہنا ہے کہ قرولتائی' یہیں منعقد ہونی چاہیے۔" توان باشی نے بتایا۔
اسی وقت یورت کے اندر سے تالی بجنے کی صدا آئی۔ میں اور توان باشی یورت کے در سے قریب ہی تھے۔ توان باشی کی طرف لپکا اور اندر داخل ہو گیا۔
میرا الجھا ہوا ذہن اب سلجھ چکا تھا۔ توان باشی سے حاصل ہونے والی اطلاعات کی روشنی میں تمام صورت حال مجھ پر واضح ہو گئی تھی۔ مجھے جو بعد میں منلیک سے معلوم ہوتا' توان باشی ہی سے معلوم ہو گیا تھا' اور اب وہاں میرا رکنا فضول ہی تھا۔ میں یہ سوچ کر واپس ہونے لگا' مگر ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ توان باشی لپکتا ہوا میرے قریب پہنچا۔
"تمہیں سائیں خاں نے طلب کیا ہے۔" اس نے بتایا۔
مجھے اس وقت کی طلبی کھل گئی' کیونکہ میری طلبی کا ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا کہ سائیں خان مجھے کہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ میں ان حالات میں وہیں رہنا چاہتا تھا

لیکن شاید اب ایسا ممکن نہیں رہا تھا۔ قویق کے پڑاؤ کی طرف تو وہ منلیک کو بھیج ہی چکا تھا' اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے کسی اور جگہ روانہ کرنے والا تھا۔

حکم سے سرتابی بھلا ممکن بھی کیسے تھی اندر ہی اندر غصے سے بل کھاتا ہو یورت کے در کی طرف بڑھا۔

اندر پہنچ کر باتو خاں کی تعظیم دیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہاں کافی افراد موجود ہیں۔ منگو اور قبلائی خان کو میں نے پہچان لیا۔ ان دونوں کے ساتھ میں نے خانوادہ تولوئی کے دوسرے سرداروں کو بھی دیکھا۔ یہ سردار اس اردو سے متعلق تھے جو تولوئی کی موت کے بعد سرقوشنی بیگی کو ورثے میں ملا تھا۔ ان افراد کے علاوہ میں نے باتو خاں کے یورت میں پہلی بار خود اس کے اردو کے بوڑھے اور جہاں دیدہ سرداروں کو دیکھا۔ وہ سب یقیناً" کسی اہم مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ خلاف توقع اس وقت وہاں ریچھ والا شامان تب تنگوری نہیں تھا۔

میں جیسے ہی تعظیم سے فارغ ہوا باتو خاں نے مجھے مخاطب کیا۔ "تو الاؤ کی رکھوالی کے پاس جا۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رکا اور میں خوش ہو گیا کہ مجھے زیادہ دور نہیں بھیجا جا رہا۔ "اس سے کہنا کہ سائیں خاں اور اس کے دونوں بگھاتر بیٹوں نے فیصلہ کیا ہے کہ قوتلائی یہیں منعقد ہو۔ اسے بتانا کہ اس کے دونوں بگھاتر بیٹے سائیں خاں کے جوچی (مہمان) ہیں۔ ہاں اس سے یہ بھی کہنا کہ سائیں خاں نے تورا کینہ سے بھی یہ کہلوایا ہے کہ قوتلائی یہیں ہو گی اور تو اس سے یہ بھی پوچھ کر آنا کہ کیا وہ سائیں خاں اور اپنے بگھاتر بیٹوں کے فیصلے سے متفق ہے؟ سمجھ گیا پوری بات؟۔"

"سمجھ گیا اے مغربی دشت کے آقا۔" یہ کہہ کر میں نے اس پورا پیغام لفظ بہ لفظ دہرا دیا۔

"ٹھیک ہے" اور ہاں سن کہ میں نے تومان باشی کو حکم دے دیا ہے تیرے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ بھی جائے گا کہ تجھ پہ جو پہلے بیتی تھی اس بار نہ بیتے۔" باتو خاں نے کہا۔

میں تعظیماً" اس کے سامنے جھک کر یورت سے نکل گیا۔

اس دوران میں تومان باشی نے باتو خاں کا حکم پورا کرنے کے لیے دس سپاہیوں کے ایک دستے کا بندوبست کرنے کی غرض سے قشقی کے ایک سپاہی کو روانہ کر دیا تھا۔

"تم اپنے یورت میں جا کر سفر کی تیاری کرو' سپاہیوں کا دستہ تمہارے یورت کے در پر پہنچ جائے گا۔" تومان باشی نے میرے باہر نکلتے ہی مجھ سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلایا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے یورت کی طرف چل دیا۔

سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ اس لیے مجھے تیاری میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ میں نے احتیاطاً" چمڑے کے ایک تھیلے میں کچھ سوکھا گوشت رکھ لیا کہ واپسی میں نہ جانے کتنی دیر ہو جائے۔ ایک اور چرمی تھیلے میں گھوڑی کا دودھ بھی بھر لیا تھا کہ پیاس لگے تو پی سکوں۔ اس کے علاوہ تلوار' نیزہ' تیر کمان اور خنجر بھی ساتھ لے لیے تھے کہ اس بار کوئی خطرناک صورت حال پیدا ہو تو میں اس سے نمٹ سکوں۔ اس کے بعد میں نے اپنے جسم پر کپڑا لپیٹ لیا۔ اس تیاری میں دونوں خدمتگاروں نے بھی میرا ہاتھ بٹایا۔ پوری تیاری کے بعد یورت سے باہر نکلا۔ حسب توقع سپاہیوں کا ایک مسلح دستہ یورت کے باہر میرا منتظر تھا۔ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور سپاہیوں کی حفاظت میں روانہ ہو گیا۔ پانچ سپاہی میری ایک جانب تھے اور پانچ دوسری جانب۔

سورج' دن بھر کا تھکا ہارا سورج نڈھال ہو کر اپنی بیوی کی آغوش میں گرنے والا تھا' اس لیے سپاہیوں نے اپنے ساتھ مشعلیں بھی لے لی تھیں جو ابھی روشن نہیں کی گئی تھی۔ واپسی میں ہمیں بہرحال رات ہو سکتی تھی۔ اور اس وقت مشعلیں کام آسکتی تھیں۔

جب میں محافظوں کے ساتھ سفید بڑیوں والے علاقے میں پہنچا تو ہلکا ہلکا اندھیر پھیل چکا تھا۔ مگر ابھی مشعلیں روشن کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ہمارے گھوڑے ریگستان میں پڑاؤ کی جانب دوڑنے لگے جو زیادہ دور نہیں تھا۔

کچھ فاصلہ طے کرتے ہی مجھے پڑاؤ کی جانب سے ایک ہیولا سا آباد کھائی دیا۔ وہ ہیولا فاصلہ کم ہونے سے کچھ واضح ہوا تو پتا چلا ایک گھڑسوار ہماری طرف آرہا تھا۔

قریب آنے پر میں نے اس گھڑسوار کو پہچان لیا' وہ منلیک تھا جو یقیناً "ملکہ تورا کینہ سے مل کر آرہا تھا۔ وہ بھی شاید مجھے پہچان گیا اور پھر ہم دونوں نے اپنے اپنے گھوڑے آمنے سامنے روک لیے۔ میرے ہمراہ سپاہی بھی رک گئے۔

منلیک کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ "کیا ملکہ تورا کینہ نے سائیں خاں کی بات مان لی؟۔"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ پھر بولا۔ "مگر تم کہاں جارہے ہو؟۔"

"مجھے سائیں خاں نے الاؤ کی رکھوالی کے پاس بھیجا ہے۔" میں نے بتایا' پھر پوچھا۔ "ملکہ کیا کہتی ہے؟ اس نے کوئی تو بہانہ کیا ہی ہوگا۔"

"اس کا اور اوغول غانمش دونوں کا کہنا یہ ہے کہ دستور کے مطابق قولتائی صرف مغلوں کے وطن میں ہی منعقد ہونی چاہیے۔" منلیک نے کہا' پھر اپنے گھوڑے کو ایک جانب کرتے ہوئے بولا۔ "تم لوٹ کر آؤ تو پھر باتیں ہوں گی۔"

میں نے سرہلایا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ سپاہی پھر میرے یورتوں کی جانب بڑھنے لگے۔

منلیک کے ساتھ رہ کر مجھے علم ہوچکا تھا کہ شاہی قاصدوں کا اس طرح معاملات میں دلچسپی لینا کوئی غیر معمولی فعل نہیں سمجھا جاتا' اسی لیے میں منلیک سے بے تکلفی کے ساتھ پوچھ گچھ کرلیتا تھا۔ یہ تمام معلومات حاصل کرنے کا اصل مقصد کیا ہے' اس سے وہ بہرحال واقف نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک اسے ہی کیا' میرے وجود میں بھڑکتی ہوئی آگ کا علم تو کسی کو بھی نہیں تھا۔ ہاں شامانوں سے میں ضرور خوف زدہ رہتا تھا' کہیں وہ اپنی پراسرار قوتوں سے یہ پتا نہ چلالیں کہ میرے دل میں کیا ہے۔ میں اسی لیے تب تنگوری سے بھی دور دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

پڑاؤ کے بالکل قریب پہنچ کر' میں نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کردی۔ میرے ہمراہ چلنے والے سپاہیوں نے بھی اپنے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں۔

پھر میں جیسے ہی پڑاؤ میں داخل ہوا' ایک للکار سن کر ٹھٹک گیا۔ میں نے اپنا گھوڑا روک لیا اور میری ساتھ میرے محافظ بھی رک گئے۔

"یہی ہے' گھیر لو اسے۔" وہی للکار دوبارہ گونجی۔

یہ للکار یقیناً "بغورچی کی تھی جو مجھ سے کچھ فاصلے پر بہت سے مسلح سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا' اور اس کی انگلی میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہمراہ جو سپاہی تھے' وہ بھی گھوڑوں پر سوار تھے' مگر وہ خود اپنے گھوڑے کی لگام تھامے زمین پر کھڑا تھا۔

بغورچی کے حکم پر سپاہی نیزے سنبھالے آگے بڑھے' مگر وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ میرے محافظوں نے بھی نیزے علم کرلیے۔

مجھے صورت حال کی نزاکت کا پوری طرح احساس ہوگیا اور میں زور سے چیخ پڑا۔ میرے مخاطب آگے بڑھنے والے سپاہی تھے۔ "ٹھہرو۔ پہلے یہ جان لو کہ میں کون ہوں۔ تم مجھ پر حملہ کرکے' یاسا کی خلاف ورزی کررہے ہو۔"

سپاہی نہ رکے' وہ اور قریب آگئے۔ ان کے تیور خطرناک نظر آرہے تھے۔

"ٹھہر جاؤ میں کہتا ہوں ٹھہر جاؤ۔" میں پھر چیخا۔ "میں شاہی قاصد ہوں اور مجھے سائیں خاں نے الاؤ کی رکھوالی کے پاس پیغام دے کر بھیجا ہے۔"

سپاہی اب بالکل سامنے آچکے تھے اور ان کے اٹھے ہوئے نیزے کسی قدر جھک گئے تھے۔ انہوں نے ایک نیم دائرے کی صورت میں' مجھے اور میرے محافظوں کو گھیر لیا تھا۔ بغورچی فاصلے پر کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نرغے میں لینے والے سپاہیوں نے اپنے گھوڑے روک لیے۔

میں نے ایک بار پھر باآواز بلند اپنے الفاظ دہرائے۔

"تو کیا تو بطریق بوغا نہیں ہے؟" ایک بوڑھا سپاہی بولا جس کا گھوڑا میرے بالکل سامنے پہنچ کر رکا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تو کیا تو واقعی وہ نہیں جسے وزیر یلواچ نے گرفتار کرنے کا حکم دیا ہے اور جس نے آج ہی ہمارے کئی ساتھیوں کو ہلاک کر دیا ہے؟"

"نہیں، میں وہ نہیں۔" میں نے دانستہ ہلکی آواز میں جواب دیا تاکہ میری آواز بغورچی نہ سن سکے۔

میری بات سن کر بوڑھے کے چہرے پر ایک لمحے کو الجھن کے آثار نظر آئے، پھر وہ بولا۔ "پر شامان بغورچی کا علم تو جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو آسمانوں کی سرگوشیاں سنتا ہے۔ وزیر یلواچ نے اسی لیے تو اسے ہمارے ساتھ بھیجا تھا۔ اس نے تو پہلے ہی اپنے علم کے زور سے معلوم کر لیا تھا تو اس راستے سے آئے گا۔ ہم اسی لیے تو یہاں موجود تھے۔ پر تیرا کہنا ہے کہ تو شاہی قاصد ہے اور تجھے۔"

"تم اسے پکڑ کیوں نہیں لیتے؟" شامان بغورچی چیخ پڑا اور بوڑھے سپاہی کی بات ادھوری رہ گئی۔

"اے معزز شامان! اس کا کہنا ہے کہ یہ شاہی قاصد ہے۔" بوڑھے سپاہی نے پلٹ کر با آواز بلند کہا۔

"یہ جھوٹا ہے۔" بغورچی اپنی بھاری اور گونجیلی آواز میں چیخا۔ "یہ بطریق بوغا ہے بطریق بوغا!"

میں یہ محسوس کر چکا تھا کہ سپاہی مجھ پر حملہ کرنے یا مجھے گرفتار کرنے سے کیوں جھجک رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں ابھی چنگیز خاں کے بنائے ہوئے قوانین کا احترام باقی تھا۔ یہ سوچ کر میں نے بڑی عجلت میں گھوڑے کی پشت سے بندھی ہوئی لوح کھول لی، اور اسے ہاتھ میں لے کر بلند کیا۔

"یہ دیکھ لوح۔" میں نے با آواز بلند سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ "میں جھوٹا نہیں ہوں۔"

دو تین سپاہی اپنے گھوڑے میرے گھوڑے کے قریب لے آئے۔ وہ میرے ہاتھ میں شہباز کی لوح دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے۔ باری باری کئی گھڑسوار آگے بڑھے اور انہوں نے لوح کو دیکھا۔ ان میں وہ بوڑھا بھی شامل تھا جس نے مجھ سے گفتگو میں پہل کی تھی۔

پھر حملہ آور سپاہیوں نے اپنے گھوڑے ایک طرف کر کے مجھے اور میرے محافظوں کو آگے بڑھنے کا راستہ دے دیا۔ وہ شامان بغورچی کے کہنے پر قانون شکنی نہ کر سکتے اور انہیں اپنی زندگی بھی عزیز تھی۔ انہیں شاید اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی شاہی قاصد پر حملہ کرنے کی کم سے کم سزا کیا ہے۔

میرا گھوڑا جیسے ہی آگے بڑھا، بغورچی کی بھاری آواز پھر گونجی۔ "تم نے وزیر یلواچ کا حکم ٹال دیا، تم سزا پاؤ گے۔"

وہ چیختا رہا مگر سپاہیوں نے اس کی ایک نہ سنی، اور میرا جی چاہا کہ میں اس کی بے بسی پر قہقہے لگاؤں۔ میں نے اسے جیت گرا دیا تھا اور وہ کسی ایسی بھیڑ کی طرح ریت پر تنہا کھڑا رہ گیا تھا جو اپنے گلے سے بچھڑ گئی ہو۔ میں اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔ سپاہی اس سے دور ایک طرف اپنے گھوڑوں پر سوار موجود تھے۔ مگر اب وہ بغورچی کے کہنے میں نہیں تھے۔

اس دن پہلی بار میں نے جانا کہ قوت و طاقت سے بھی بڑی چیز عقل ہے، اگر اسے استعمال کرنا آتا ہو۔ چھوٹی ماں فاطمہ غلط نہیں کہتی تھی میں اگر اس وقت عقل سے کام نہ لیتا اور حملہ آوروں سے بھڑ جاتا تو شاید نقصان میں رہتا۔ ان کی تعداد میرے ہمراہ محافظوں سے آٹھ گنی تھی۔

مجھے اس وقت دہری خوشی محسوس ہو رہی تھی ایک تو یہ کہ میں نے شامان بغورچی کو کھلی مات دے دی۔ دوسرے یہ کہ میری ذہنی الجھن ختم ہو گئی۔

شامان بغورچی کے کھل کر سامنے آنے سے میں کچھ سمجھ چکا تھا۔ کہ اس دن ملکہ تورا کینہ کے یورت کی طرف جاتے ہوئے مجھے کیوں گھیرا گیا تھا۔ یقیناً شامان بغورچی میری ٹوہ میں ہوگا اور اس نے اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے پتا چلا لیا ہوگا کہ میں کہاں اور کس حال میں ہوں۔ اس کے بعد وزیر یلواچ کو اس نے یہ بتایا ہوگا کہ میں پڑاؤ میں آنے والا ہوں، پھر اسی کے اشارے پر سپاہی میرے پیچھے لگے ہوں گے۔

میں انہی خیالوں میں سرقوتنی بیگی کے یورتوں تک پہنچ گیا۔

میرے محافظ باہر ہی رک گئے اور میں سرقوشنی بیگی کے یورت میں داخل ہو گیا۔ وہاں مجھے سرقوشنی بیگی کے پاس کافی افراد بیٹھے نظر آئے۔ ان میں زیادہ تعداد بڑی عمروں کے سرداروں کی تھی۔ وہ ان سے کچھ گفتگو کر رہی تھی، مگر مجھے دیکھ کر چپ ہو گئی۔

میں تعظیم دے کر فارغ ہوا تو سرقوشنی بیگی نے کہا۔ "کیا پیغام لایا ہے؟"

میں نے سائیں خاں کا پیغام دہرا دیا۔

پیغام سن کر وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر بولی۔ "تو ٹھہر جا۔ مجھے بھی سائیں خاں سے کچھ کہلوانا ہے، پر میں پہلے کسی فیصلے پر پہنچ جاؤں۔ ایک طرف بیٹھ جا، اور خاموش رہ۔"

میں پیچھے ہٹ کر یورت کے در سے قریب بیٹھ گیا۔

"ہاں اب اپنی بات پوری کر۔ تو کیا کہہ رہا تھا؟" سرقوشنی بیگی ایک بوڑھے سردار سے مخاطب ہوئی۔

"اے الاؤ کی رکھوالی۔ ہمارے لیے یا سا روشنی ہے، اور ہم اس روشنی کو نہیں جھٹلا سکتے۔ جد عظیم (چنگیز خاں) نے جو کہا وہ اویغوری منشیوں نے لکھا اور وہی ہمارے لیے روشنی ٹھہرا قانون بنا۔ کیا اس نے اپنی یاسا میں صاف صاف نہیں لکھایا کہ قوتائی جب بھی ہوگی ہماری زمین پر ہوگی، ہماری چراگاہوں میں اور ہمارے مسکن پر۔ پھر تو کیسے سائیں خان کی بات مان لے گی۔"

"جد عظیم کے چاروں بھاتر بیٹے مر چکے ہیں۔" سرقوشنی بیگی کی بلند آواز گونجی۔ "کیا اب سائیں خاں تمام نویانوں (شہزادوں) میں سے بڑا نہیں؟ اور کیا وہ اس کا سردار نہ کہلائے گا؟ وہ تعظیم اور عزت کا مستحق ہے کہ نہیں؟" سرقوشنی بیگی کی آواز تیز ہوتی چلی گئی۔ "کس کو حق ہے کہ ایسے وقت میں اس کے حکم سے سرتابی کرے۔" اس کی آواز میں بے رحمی تھی۔

کچھ دیر کو یورت میں سناٹا چھا گیا، پھر ایک بوڑھے سردار نے بولنے کی ہمت کی، مگر اس کی آواز نمایاں طور پر کانپ رہی تھی۔ "اے چار بھاتر بیٹوں کی عظیم ماں! مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے جب میں نے قویوق کے باپ اور اوغدائی کی موت پر قسم کھائی تھی کہ جب تک اوغدائی کے خاندان میں گوشت کا ایک لوتھڑا بھی باقی رہے گا، میں اس کی اطاعت کروں گا۔ میں اور۔۔۔ میں ہی کیا، یہاں موجود تمام قبیلوں کے سرداروں نے قسم کھائی تھی کیا میں۔۔۔ میں وہ قسم بھول جاؤں، اور کیا تیرے خیال میں قسم توڑ دینی چاہیے؟۔"

بوڑھے سردار کی بات میں بڑا وزن تھا، مگر اس کی بات کا جواب دینے والی کوئی اور نہیں سرقوشنی بیگی تھی۔ وہ توقف کیے بغیر بولی۔ "تو نے اپنے قسم کا حوالہ دیا ہے اور میں تجھے یاسا کا قول یاد دلاتی ہوں۔ بتا کہ کیا ہمارے مورث اعلیٰ (چنگیز خاں) نے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر اوغدائی کے جانشین نالائق نکلیں تو بھورے نمدے کی مسند پر بٹھانے کے لیے کسی اور کو تلاش کیا جائے؟۔"

یورت میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ کافی دیر کوئی بھی کچھ نہ بولا۔ میں اس مغلول عورت کے تیور دیکھ کر دنگ تھا جس نے جہاں دیدہ بوڑھے سرداروں کو لاجواب کر دیا تھا۔

جب کافی دیر کوئی بھی نہ بولا تو سرقوشنی بیگی کی آواز بلند ہوئی۔ "تم میں سے کسی کے پاس میری بات کا جواب نہیں۔ تم چپ ہو اور اس کا مطلب یہ ہے تمہیں میری بات سے اتفاق ہے، تم میں سے کوئی بھی میرا حکم نہ ٹالے گا۔" آخری جملہ اسے نے نرم لہجے میں ادا کیا تھا۔

تائید میں بیک وقت بہت سی آوازیں سنائی دیں۔

سرقوشنی بیگی کا چہرہ کھل اٹھا۔ پھر اس نے کہا "تو پھر جاؤ اور میرے نئے حکم کا انتظار کرو۔"

بوڑھے سردار اٹھ کھڑے ہوئے ادب سے اس کے سامنے جھکے پھر یورت سے نکل گئے۔ میں سرقوشنی بیگی کے ہمراہ یورت میں تنہا رہ گیا۔

"یوغا!" سرقوشنی بیگی نے مجھے مخاطب کیا۔

"قریب آ۔"

میں اس کا حکم سن کر اپنی جگہ سے اٹھا اور مسند کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ مجھے اس کے لہجے میں کوئی

عجیب ہی بات محسوس ہوئی تھی۔ وہ میری طرف بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"اگر مجھے سائیں خاں کو کوئی پیغام بھیجنا ہوتا تو میں کسی بھی قاصد سے یہ کام لے سکتی تھی۔" سرقوشنی بیگی نے کہا۔ اور اس کی بات سن کر میں چونک پڑا۔ پھر اس نے مجھے کیوں روکا ہے؟ وہ ایک لمحے رک کر پھر بولی۔ "مجھے دراصل تجھ سے کچھ بات کرنی تھی۔ تو اب میرے اتنے قریب آچکا ہے کہ مجھے تیرے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہیے۔ تو بتا کہ تیرا باپ کون ہے؟"

میرے لیے اس کا سوال قطعی غیر متوقع تھا۔ آخر وہ میرے بارے میں ایک دم سب کچھ جاننے کے لیے کیوں بے چین ہوگئی؟ اس سوال کے پردے میں یقیناً" کوئی خوفناک حقیقت چھپی ہوئی تھی جس سے میں نا آشنا تھا' اسی لیے میں چوکنا ہوگیا۔

"میرے باپ کا نام چنکائی ہے اور وہ اردو میں دس سپاہیوں پر سردار ہے۔" میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

سرقوشنی بیگی نے سرہلایا جیسے وہ میرے جواب سے مطمئن ہو' پھر بولی۔ "سنا ہے تیری ماں ایرانی تھی۔" اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

اس کے سوال نے میرے سینے میں نشتر سا اتار دیا۔ میرے زخم جیسے لو دینے لگے' اور ماں کے ذکر پر میرے سینے میں چھپے ہوئے زخموں کا تازہ ہوجانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دکھ کے ساتھ ہی مجھے حیرانی بھی تھی کہ سرقوشنی بیگی کو میری ماں کے بارے میں کیسے علم ہوا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اس بار لہجے میں کسی قدر سختی تھی۔ میری خاموشی کو اس نے لازماً" بے ادبی ہی سمجھا تھا۔

"ہاں اے الاؤ کی رکھوالی۔ ایسا ہی ہے۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"تجھے اپنی ماں سے زیادہ محبت ہے یا باپ سے؟"

سرقوشنی بیگی کے اس سوال نے مجھ پر ساری حقیقت ظاہر کردی۔ وہ بڑی ذہانت اور چالاکی سے میرے دل کے اندر چھپے ہوئے چور کو سامنے لانا چاہتی تھی۔

دراصل اس کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ مجھے منگول زیادہ عزیز ہیں یا کوئی اور قوم؟

"مجھے اپنی ماں کی نسبت باپ سے زیادہ محبت ہے' حالانکہ میری ماں مرچکی ہے۔" میں نے مصلحتاً" سفید جھوٹ بولا' کیونکہ میں اس کے سوال کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے سوال کا جواب دے کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس سے اب اطمینان جھلک رہا تھا۔

"تو بڑا بدنصیب ہے بولا کہ تیرا باپ تجھ سے اتنی محبت نہیں کرتا۔" سرقوشنی بیگی نے کہا۔

مجھے اس کی یہ بات سن کر بھی تعجب ہوا۔ تو کیا وہ چنکائی کو جانتی ہے؟ اسے یہ کس طرح معلوم ہوا کہ چنکائی مجھ سے محبت نہیں کرتا؟

پھر اس نے خود ہی میری ساری الجھن ختم کردی۔ اس نے بتایا۔ "تیرا باپ آج ہی شامان بغورچی کے ہمراہ مجھے ملا تھا۔ اور اس نے تجھ پر نافرمانی و غداری کا الزام لگایا تھا۔ شامان بغورچی نے مجھے تیرے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائیں جن پر مجھے یقین نہیں آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تو منگولوں کا جانی دشمن ہے اور تو اس تلاش میں ہے کہ تجھے گھر کے چولہے کی آگ بجھانے کا موقع مل جائے۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔

شامان بغورچی یوں سامنے آئے گا' یہ میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ سرقوشنی بیگی کی منہ سے وہ سب کچھ سن کر جو میرے دل کی گہرائیوں میں تھا' میں خوفزدہ ہوگیا۔ شامان بغورچی نے مجھ پر بڑے خوفناک الزامات لگائے تھے جن کی سزا موت سے کم نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر میں زندہ کیسے ہوں؟ مجھ سے گفتگو کیوں کی جارہی ہے اور اب تک مجھے گرفتار کیوں نہیں کرلیا گیا؟ یہ تو سرقوشنی بیگی کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سرقوشنی بیگی ان سوال و جواب کے بعد مجھے گرفتار کرادے؟

"تو پھر کہیں گھو گیا۔" سرقوشنی بیگی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"اے الاؤ کی رکھوالی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ شامان بغورچی نے مجھ پر جو الزامات لگائے ہیں' وہ بے حد سنگین اور بے سروپا ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"میری رگوں میں تو خود ایک منگول کا خون دوڑ رہا ہے۔ کیا کوئی خود اپنے خون کا دشمن بھی ہوا ہے جو میں ایسا کروں گا۔" میں اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنے پر مجبور تھا حالانکہ میری ماں نے مجھے جھوٹ بولنے سے منع کیا تھا۔

"مجھے خود بھی کچھ کچھ یہ اندازہ تھا کہ شامان بغورچی غلط کہتا ہے۔" سرقوشنی بیگی بولی۔ "ورنہ اب تک تو گرفتار ہو جاتا۔ اگر یہی ہوتا کہ تو منگولوں کا دشمن ہوتا تو میری جان ہی کیوں بچاتا۔ میں بھی تو آخر ایک منگول عورت ہوں۔"

مونگ کے تمنگری نے خود میرے جینے کی راہ نکال دی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر سرقوشنی بیگی کو چنکائی اور شامان بغورچی کی باتوں پر اعتبار آجاتا تو کیا ہوتا۔

"اچھا اب زیادہ اپنی جان نہ گھلا اور سائیں خان کے پاس روانہ ہو جا۔" سرقوشنی بیگی کے لہجے میں اس بار نرمی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "اس سے کہنا کہ مجھے اس کا ہر فیصلہ منظور ہے۔ اسے بتانا کہ مجھے پل پل کی خبریں مل رہی ہیں' اور یہ بھی بتانا کہ تورا کینہ غصے اور حسد سے تلملا رہی ہے۔ اوغول غانمش شامانوں کی پیش گوئیاں سن رہی ہے۔ اس سے کہنا کہ کل صبح ہی الاؤ کی رکھوالی اپنا اولوس (لشکر) لے کر اس کے پاس پہنچ رہی ہے۔ سمجھ گیا پوری بات؟ ہاں یہ بھی کہنا کہ قرولتائی' شاہینوں کی جھیل کے کنارے ہی ہوگی' سمجھا۔!"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ پھر میں نے بہت مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ اس دن مجھ پر کیا گزری۔ مجھے کس طرح دوبارہ گھیرا گیا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی بوغا کہ شامان بغورچی اور خود تیرا باپ چنکائی دونوں تیری جان کے دشمن کیوں ہو گئے ہیں؟"

ظاہر ہے کہ میں اسے حقیقت سے آگاہ تو کر نہیں سکتا تھا' مجھے بہرحال کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر کے اسے اطمینان دلانا تھا۔ میں اسی لیے کچھ دیر چپ رہا اور اس دوران میں مجھے ایک بہانہ سوجھ ہی گیا۔

"شامان بغورچی کسی طرح اس بات سے آگاہ ہو گیا تھا کہ مونگ کے تمنگری نے مجھے کچھ ایسی قوتیں عطا کی ہیں کہ میں مستقبل میں جھانک سکتا ہوں۔ وہ مجھے اپنا شاگرد بنا کر ان قوتوں کا راز جاننا چاہتا تھا۔" میں نے بہانہ بنایا اور یہ بہانہ ایسا تھا کہ وہ ذہین اور چالاک منگول عورت بھی دھوکے میں آگئی۔ یہ بات بہت عام تھی کہ شامان ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے' اور میں نے سرقوشنی بیگی کے سامنے خود کو ایک شامان ہی ظاہر کیا تھا۔

"اور تیرا باپ چنکائی؟ وہ تجھ سے کیوں متنفر ہے؟" سرقوشنی بیگی نے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ دراصل بچپن ہی سے مجھے نالاں رہا ہے۔ وہ مجھے سپاہی بنانا چاہتا تھا' مگر میں سپاہی کے بجائے شامان بن گیا۔" میں نے برجستہ جھوٹ بولا' اور یہ جھوٹ بھی ایسا تھا کہ اس پر آسانی سے یقین کیا جا سکتا تھا۔

"تیرے شامان ہونے کا ذکر اچھا چھڑ گیا۔ اپنے علم کو کام میں لا اور مستقبل میں جھانک کر یہ بتا کہ اب بھورے نمدے کی مسند پر کون بیٹھے گا؟" سرقوشنی بیگی نے سوال کیا۔

میں اس کو سوال سن کر لرز گیا' کیونکہ میری جواب پر خود میرے ہی مستقبل کا دارومدار تھا۔ یہ سوال معمولی نہیں تھا۔ اگر میں کوئی غلط جواب دے دیتا تو آئندہ کے لیے سرقوشنی بیگی کی نظر سے گر جاتا۔ مجھے اس وقت سولدہ بہت یاد آئی۔ کاش وہ مجھے بے سہارا چھوڑ کر نہ جاتی' اور کاش وہ مجھے کچھ اور پیش گوئیاں بتا جاتی۔ میں بھلا گذشتہ پیش گوئیوں کے سہارے کب تک سرخرو رہ سکتا تھا۔

"تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا بوغا!" سرقوشنی بیگی نے مجھے خاموش دیکھ کر ٹوک دیا۔

"میرا علم کہتا ہے کہ آخری فتح تیری ہوگی۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے بوغا! میں تجھ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ اب قویوق کی موت کے بعد خاقان کون بنے گا؟"

میں چکرا گیا۔ میں اس قدر سخت آزمائش میں کبھی نہیں پڑا تھا۔ وہ مجھ سے اس بات کا دو ٹوک جواب چاہتی تھی جو میرے علم ہی میں نہیں تھی' مگر اسی وقت مجھے ریچھ والا شامان تب تنگری یاد آگیا۔ سائیں خاں نے بھی اس سے کچھ اسی طرح کا سوال کیا تھا' اور اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے تب تنگری کو آسمانی سرگوشیاں سننے جانا پڑا تھا۔ میں نے بھی ذرا سے فرق سے وہی چال چل دی' کیونکہ مجھے اس مشکل سے نکلنے کے لیے سوچنے کی غرض سے کچھ وقت درکار تھا۔

"اے چار بگھاتر بیٹوں کی ماں! مجھے اس سوال کا جواب پانے کے لیے نیلے جاودانی آسمان کی سرگوشیاں سننا پڑیں گی۔ مجھے اپنا جسم چھوڑ کر آسمانوں کی طرف جانا ہوگا۔ وہاں جانا میرے اختیار میں ہے مگر وہاں سے واپسی اختیار میں نہیں۔ اس میں چند لمحے بھی لگ سکتے ہیں اور پورا ایک دن یا ایک رات بھی۔ اس وقت مجھے سائیں خان کی طرف لوٹنا ہے' اس لیے میں رات کو یہ کام کرلوں گا اور کل تجھے بتادوں گا۔" میں نے پرجوش لہجے میں اپنی بات ختم کی' تاکہ وہ میری بات پر یقین کرکے جان چھوڑ دے۔

"تو پھر ٹھیک ہے وہ طویل سانس لے کر بولی۔ "کل میں خود اپنا اردو لے کر وہاں پہنچوں گی' اور پھر وہیں میں تجھے اپنے یورت میں طلب کرلوں گی۔"

کچھ دیر بعد ہی اس نے مجھے رخصت کی اجازت دے دی اور میں اس کے یورت سے باہر نکل گیا۔ یورت کے باہر میرے محافظ موجود تھے جنہوں نے اب مشعلیں روشن کرلی تھیں۔ مجھے باہر نکلتے دیکھ کر وہ اپنے اپنے گھوڑوں کی طرف بڑھے جو ان کے قریب ہی موجود تھے۔

میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے ہمراہ چل دیا۔

راستے بھر میں سوچتا رہا کہ کیا کروں' کیا نہ کروں' سرتوشنی بیگی نے مجھے ایک نئی ہی مشکل میں گرفتار کردیا تھا۔ بھلا مجھے یہ کس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ قوریق کے بعد کون خاقان بنے گا۔

واپسی میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ شاید شامان بغورچی ہار مان کر بیٹھ گیا تھا۔ میں پہاڑی درہ عبور کرکے شاہینوں کی جھیل تک پہنچ گیا۔ ہر طرف مشعلیں روشن تھیں۔ میں اپنے گھوڑے کو سیدھا باتو خاں کے یورت کی طرف لے گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ باتو خاں اپنے اردو کے سرداروں سے صلاح مشوروں میں مشغول ہے' لیکن اس نے میرے لیے قشق کے تومان باشی کو حکم دیا تھا کہ بلا تاخیر مجھے اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ منگو خاں اور قبلائی خاں کے لیے دو الگ الگ یورت' باتو خان کے یورت کے قریب ہی لگا دیے گئے تھے' اور وہ دونوں اس وقت اپنے اپنے یورتوں میں تھے۔

میں باتو خاں کے یورت میں داخل ہوا' اس کی مسند کے سامنے پہنچ کر تعظیم دی' پھر سرتوشنی بیگی نے جو کچھ کہا تھا' دہرا دیا۔

پیغام سن کر اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے رخصت کی اجازت دی' پھر یورت میں موجود سرداروں سے مخاطب ہوگیا۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب سی لگی کہ جب میں سرتوشنی بیگی کے یورت میں پہنچا تھا تو وہاں بھی سرداروں کو دیکھا تھا اور باتو خاں کے یورت میں بھی اردو کے سردار جمع تھے معاملہ یقیناً" خاصا اہم تھا۔ آخر چنگیز خاں کی مسند پر بیٹھنے والے کا انتخاب ہونا تھا' کسی اور کا نہیں۔

میں باتو خاں کے یورت سے نکل تو آیا مگر میری نظر میں اس کے سرداروں کے فکر مند چہرے گھومتے رہے۔ آخر وہ کس لیے اتنے فکر مند تھے؟ میں یہی سوچتا ہوا قاصدوں کے یورت تک پہنچ گیا۔

خدمت گاروں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ منلیک جو سونے کی تیاری کر رہا تھا مجھے یورت میں دیکھ کر اپنے بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنے جسم پر لپٹا ہوا کپڑا کھول کر میں نے ایک خدمت گار کو دیا اور وہ یورت کے ایک کونے میں جا کر کپڑے سے گرد جھاڑنے لگا۔ پھر میں نے ہتھیار کھولے اور منلیک کے قریب اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔

"ہاں منلیک اب بتا کہ تیرے خیال میں خاقان

کون بنے گا؟۔" ذہن میں چکراتا ہوا سوال میری زبان پر آگیا۔

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے۔"

"کیا صاف ظاہر ہے؟۔" میں نے اسے کریدا۔

"یہی کہ اب بھورے نمدے کی مسند پر سائیں خاں کا حق ہے' اور وہی خاندان زریں میں اب سب سے بڑا نویان (شہزادہ) ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

خدمت گاروں نے میرے سامنے ابلا ہوا گوشت لا کر رکھ دیا۔ میں کھانے کے دوران میں بھی منلیک سے اس بارے میں گرما گرم بحث کرتا رہا۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ میں اس بہانے تمام صورت حال سے واقف ہو جاؤں اور آئندہ روز سرقوشنی بیگی کے سوال کا جواب دے سکوں۔ میرے پاس سوچنے کے لیے صرف ایک ہی تو رات تھی۔

میں اس رات دیر تک جاگتا اور سوچتا رہا۔ مجھے منلیک کے اس خیال سے اتفاق نہیں تھا کہ اب باتو خاں' خاقان بن جائے گا۔ میرے خیال میں یہ لڑائی صرف دو گھرانوں کی تھی' اور انہیں میں سے کسی ایک گھرانے کے فرد کو خاقان بننا تھا' اوغدائی کا گھرانہ اور سرقوشنی بیگی کا گھرانہ ان کے درمیان باتو خاں کہیں نہیں آتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ خاندان زریں کے تمام نویان (شہزادے) اور مختلف قبائل کے سردار' باتو خاں کو خاقان بنانے پر ہرگز متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کا بڑا سبب' باتو خاں کا مشکوک نسب تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ خود باتو خاں صرف مغربی دشت کی فرمانروائی میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اگر قراقرم' مغربی دشت کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت سے باز آجاتا تو باتو خاں کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ وہ شاید اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا تھا۔

اس ساری کشمکش میں سرقوشنی بیگی کی جیت کے امکانات بھی تھے اور تورا کینہ بھی فتح مند ہو سکتی تھی۔ بظاہر اس سرد جنگ میں سرقوشنی بیگی کا پلا بھاری نظر آرہا تھا لیکن اسی کے یورت میں ایک بوڑھے منگول سردار سے میں نے جو کچھ سنا تھا' وہ بڑا اہم تھا۔ یہ بڑی معمولی بات تو نہیں تھی کہ اوغدائی کی موت پر اور قویوق کے خاقان بنتے وقت تمام منگول سرداروں نے ایک عہد کیا تھا۔ وہ عہد یہ تھا کہ جب تک اوغدائی کے خاندان کا ایک لوتھڑا بھی بر سر حیات ہے' اس کے خاندان سے باہر کسی کو خاقان منتخب نہیں کیا جائے گا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ سارے منگول سردار اس عہد کو توڑ دیتے؟ میں سوچ رہا تھا۔ یہی وہ بات تھی جو میری امیدوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ یہی وہ نازک مرحلہ تھا جہاں سے ان کے اتحاد میں دراڑ پڑ سکتی تھی۔ اگر نصف نصف سردار دونوں جانب ہو جاتے تو بات بڑھ کر نفاق اور پھر جنگ کی صورت اختیار کر سکتی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ اس رات میں خیالات کی بھول بھلیوں میں اس طرح گم ہوا کہ اصل مسئلہ میرے ذہن سے نکل گیا جس کے لیے سارا سوچ بچار کر رہا تھا۔ خاقان کون بنے گا' کون نہیں۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ جانے کب سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

صبح دم نعروں کی گونج سے میری آنکھ کھلی' اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے منلیک بھی بیدار ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار تھے۔ حالات ہی ایسے تھے کہ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

"یہ نعرے کیسے ہیں بوغا؟۔" وہ نیند سے بوجھل آواز میں بولا۔

"میں خود ابھی جاگا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "چلو باہر چل کر دیکھتے ہیں۔"

"ہاں چلو۔" وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

خدمت گار بھی ہم سے پہلے بیدار ہو چکے تھے اور یورت سے باہر جا رہے تھے۔

ہم یورت سے باہر نکلے۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا' اور اس اجالے میں شاہینوں کی بھیل کے سامنے والی پہاڑیاں جیسے انسانوں کو اگل رہی تھیں۔ موج در موج گھوڑوں پر سوار افراد آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ باتو خاں کے حق میں نعرے لگاتے آرہے تھے۔ اردو کے اے' اے' ایک بت کا ہی جس پر یورت نصب تھا'

ور اس یورت پر نویاکوں کی دموں والا پرچم لہرا رہا تھا۔
مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ وہ اردو سرقوشنی بیگی کا تھا۔
مغربی دشت کا آقا باتو خاں بھی اپنے یورت سے باہر نکل آیا تھا اور اس کے اردگرد سرداروں کے علاوہ قشق کا پورا دستہ موجود تھا۔ قبلائی خاں اور منگو خاں بھی اس کے نزدیک کھڑے نظر آرہے تھے۔
سرقوشنی بیگی کا اردو جو نعرے لگا رہا تھا' ان کا جواب باتو خاں کے اولوس سے بھی دیا جانے لگا۔ یہ استقبالیہ نعرے تھے۔
میں نے منلیک کی طرف ہاتھ بڑھایا اور آہستہ سے بولا۔ "آؤ ہم بھی قشق میں شامل ہو جائیں۔ اس طرح ہم سائیں خاں اور الاؤ کی رکھوالی سے زیادہ قریب ہوں گے۔"
منلیک نے مجھ سے اتفاق کیا۔ میں اور منلیک یوں بھی قشق ہی سے متعلق تھے۔ ہمیں آگے جانے سے بھلا کون روک سکتا تھا۔
سرقوشنی بیگی کی کبت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور میری نگاہ اسی پر جمی ہوئی تھی۔ کبت کا ایک جانب ہلاکو خاں اور دوسری جانب سرقوشنی بیگی کا سب سے چھوٹا بیٹا اداق بوغا' گھوڑوں پر سوار چل رہے تھے۔ کبت کا کے آگے آگے قشق تھا۔
میں اور منلیک باتو خاں کے اس حد تک قریب پہنچ گئے تھے کہ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ قبلائی خاں سے مخاطب تھا۔
"الاؤ کی رکھوالی کے ساتھ بہت بڑا اولوس دکھائی دے رہا ہے' اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہر دلعزیز ہے۔ اس نے راہ ہموار کرلی ہے۔" باتو خاں کے لہجے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔
"ہاں اے سائیں خاں' اور اسے خاندان زریں لے بڑے!۔ وہ ایسی ہی ہے۔" قبلائی خاں نے جواب دیا۔
مجھے جو کچھ نظر آرہا تھا۔ وہ میری توقع کے خلاف نہیں تھا۔ سرقوشنی بیگی کو جو قدم اٹھانا تھا' اٹھا چکی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ تورا کینہ کیا کرتی ہے۔

سرقوشنی بیگی کی کبت کا باتو خاں کے یورت تک پہنچی تو اس کا قشق دائیں بائیں ہو گیا۔ سرقوشنی بیگی یورت سے باہر نکلی' اور اسی کے ساتھ وسط ایشیا کا وہ مسلح پڑاؤ لعوں سے گونج اٹھا۔
سرقوشنی بیگی اپنی کبت کا سے اتری اور باتو خاں کی طرف بڑھی۔
"آفریں' آفریں! اے الاؤ کی رکھوالی آفریں!" باتو خاں بلند آواز میں بولا۔
"مجھے بھی آفریں اے سائیں خاں' اے خاندان زریں کے بڑے۔" سرقوشنی بیگی نے بھی تحسین و آفریں کا جواب دیا اور باتو خاں کے قریب پہنچ گئی۔
ہلاکو خاں اور اداق بوغا' سرقوشنی بیگی کے پیچھے خاموش کھڑے تھے۔
اور پھر اسی وقت باتو خاں کی زبان سے وہ الفاظ نکلے جنہوں نے مستقبل کا گویا فیصلہ کر دیا۔ وہ جوش کے سے عالم میں بولا تھا۔ "اے الاؤ کی رکھوالی! باقی باتیں یورت میں چل کر ہوں گی مگر ایک بات تو سمیں یورت کے ورہی پر سن لے' تاکہ اور بہت سے گواہ رہیں۔ سن کہ مجھے منگو میں پختگی' فراست اور طاقت کے آثار نظر آتے ہیں۔ تربیت اور تجربے کے لحاظ سے وہی خاقان بننے کا مستحق ہے۔"
یہ الفاظ سننے اور اس موقع کے انتظار میں سرقوشنی بیگی نے برسوں گزار دیئے تھے۔ منگو اور قبلائی دونوں میں خاقان بن کر حکومت کرنے کی اہلیت تھی۔ میں نے سنا تھا کہ سرقوشنی بیگی نے بڑی سختی اور ہمدردی سے دونوں کی تربیت کی تھی' اس صبر و تحمل کے ساتھ جو دشت کی عورت کا حصہ ہوتا ہے۔ سرقوشنی بیگی کی آرزو تھی کہ اس کے بیٹے اس ورثے کو حاصل کر سکیں جو اس کے شرابی شوہر تولوئی کو حاصل نہ ہو سکا تھا۔
باتو خاں کی بات سن کر سرقوشنی بیگی کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی' پھر اس نے کہا تھا۔ "اے سائیں خاں! مونگ کے تینگری تیرے کہے ہوئے لفظوں کی عزت رکھے۔"

سرقوشنی بیگی کے ان الفاظ کا واضح مقصد یہی تھا کہ اس نے باتو خاں کی پیشکش قبول کرلی ہے۔

خاندان زریں کے سارے افراد باتو خاں کے یورت میں چلے گئے۔ یورت کے در پر باتو خاں کے قشق اور سرقوشنی بیگی کے قشق میں شامل سپاہی جم گئے۔ جاتے جاتے باتو خاں نے حکم دیا تھا کہ اس کے یورت میں کسی کو داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اس نے اپنے اردگرد کے سرداروں کو بھی باہر چھوڑ دیا تھا۔

باتو خاں کے ہمراہ یورت میں صرف خاندان زریں کے افراد ہی گئے تھے۔ ان افراد میں سرقوشنی بیگی کے چاروں جوان بیٹے بھی تھے اور چغتائی کے دو بیٹے بھی جو سرقوشنی بیگی سے مل گئے تھے۔

یورت میں کسی اور کے داخل ہونے پر پابندی کا مطلب میں یہی سمجھا کہ باتو خاں کو کوئی خفیہ اجلاس کررہا ہے۔ جس میں خاندان زریں کے افراد ہی شامل ہوسکتے تھے۔

اب میرا وہاں ٹھہرنا فضول ہی تھا۔ یورت کے سامنے موجود سردار بھی اب منتشر ہورہے تھے۔

منلیک میرے برابر ہی کھڑا تھا۔ میں نے اسے چھیڑا۔ "آؤ منلیک! اب چلیں۔ تو ہار گیا نا آخر۔" وہ میری بات سن کر چونکا اور بولا۔ "کیا مطلب؟"

"کیا کل رات تو نے نہیں کہا تھا کہ بھورے نمدے کی مسند پر سائیں خاں کا حق ہے؟"

"تو میں نے کیا غلط کہا تھا۔" منلیک نے کہا۔ "اب اگر سائیں خاں خود اپنے حق کو چھوڑ دے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔"

"اچھا اب بحث سے کیا حاصل۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔" یہ کہہ میں آگے بڑھا اور منلیک بھی میرے ساتھ ساتھ چل دیا۔

باتو خاں کے الفاظ نے میری بہت بڑی مشکل حل کردی تھی۔ اگر وہ اپنے یورت کے در ہی پر یہ اعلان نہ کردیتا کہ وہ کیا چاہتا ہے تو مجھے کچھ علم ہی نہ ہوتا۔ بھلا مجھے کیسے پتا چلتا کہ منگو خاں کو خاقان بننا ہے۔ اب اگر مجھے سرقوشنی بیگی بلاتی اور پیش گوئی کے لیے کہتی تو مجھے کوئی دقت پیش نہ آتی۔

باتو خاں کے اعلان سے یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ وہ خود خاقان بننا نہیں چاہتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے گزشتہ شب جو کچھ سوچا تھا' وہ غلط نہیں تھا۔ اب میرے لیے صرف اور صرف ایک بات تشویش طلب تھی کہ کہیں تورا کینہ میدان چھوڑ کر نہ بھاگ جائے۔

یہی سب سوچتا ہوا' منلیک کے ہمراہ یورت میں پہنچ گیا۔ ہمارے خدمت گار بھی لوٹ آئے تھے اور اب وہ گھوڑی کا دودھ دوہنے جارہے تھے تاکہ حسب معمول پیٹ بھرا جاسکے۔

اسی دن دوپہر ہونے سے پہلے میری طلبی ہوئی اور یہ طلبی سرقوشنی بیگی کی طرف سے تھی۔ میں اس طلبی پر کچھ پریشان سا ہوا۔ آخر اب وہ مجھ سے کیا پیش گوئی چاہتی ہے۔ کیا اسے ابھی یقین نہیں آیا کہ وہ اپنی حریف تورا کینہ اور توہم پرست اوغول غانمش کے مقابلے میں جیت چکی ہے۔ اگر مجھے بہرحال اس سے ملنا تھا۔

باتو خاں کے یورت کے دائیں جانب' قبلائی اور منگو کے یورتوں سے پہلے سرقوشنی بیگی کا یورت نصب کیا گیا تھا۔ ہلاکو خاں اور اویق بوغا کے یورت پیچھے نصب کیے گئے تھے۔

میں پہنچا تو سرقوشنی بیگی اپنے یورت میں تنہا تھی' اور شاید اس نے ایسا دانستہ کیا تھا تاکہ مجھ سے خلوت میں گفتگو کرسکے۔ میں تعظیم دے کر اس کی مسند کے سامنے ادب سے بیٹھ گیا۔

"کیا تو آسمانوں کی طرف گیا بوغا؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں! اے الاؤ کی رکھوالی۔" میں نے ڈرتے ہوئے جھوٹ بولا۔

"تو تو نے وہاں کیا سنا؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کہ تیرا بڑا بگھاتر بیٹا بھورے نمدے کی مسند پر بیٹھے گا۔" میں نے بے جھجک کہا۔

"اس کے علاوہ تو نے اور کیا سنا؟" اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ "یہ بتا کہ تورا کینہ اور اوغول غانمش قویوق کی لاش لے کر قراقرام کیوں گئی

ہیں؟۔"

یہ اطلاع خود میرے لیے چونکا دینے والی تھی۔ چند لمحے میں خاموش رہا' اور آنکھیں بند کرلیں' تاکہ سرقوشنی بیگی یہ سمجھے کہ میں آسمان کی سولدہ (روح) یوگدو سے رابطہ قائم کررہا ہوں' اور اس دوران میں مجھے اپنے حواس پر قابو پانے کی مہلت مل جائے۔

ان دونوں کی قراقرم روانگی کا مقصد یہی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی شکست قبول کرلی ہے' اور اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ تورا کینہ کو باتو خان کا فیصلہ قبول نہیں' وہ قرولتائی میں شرکت نہیں کرے گی۔ تورا کینہ نے میرے خیال میں بڑی ہوشیاری دکھائی تھی اسے یقیناً یہ شک تھا کہ قرولتائی اس کے حق میں فیصلہ نہیں کرے گی۔ میں نے چند لمحوں میں سب کچھ سوچ لیا اور آنکھیں کھول دیں۔

"اے الاؤ کی رکھوالی! میں نے یوگدو کی سرگوشیاں سنیں' کل رات بھی اور اس وقت بھی۔ تورا کینہ تیرے سامنے نہ ٹک سکے گی۔" میں بولا۔

"مگر میرا سوال کچھ اور تھا۔" سرقوشنی بیگی نے کہا اور اپنا سوال دہرایا۔

"وہ تجھ سے شکست کھا کر اس لیے قراقرم گئی ہے کہ اوغدائی کا گھرانہ قرولتائی میں شرکت نہ کرسکے اور اس طرح یاسا کی آڑ لے کر تجھے مجبور کیا جائے کہ قرولتائی' قراقرم ہی میں ہو۔" میں نے اندازوں کی راہ پر خیالی گھوڑے دوڑا دیے۔

میں نے اپنی بات کا ردعمل اس کے چہرے پر دیکھا۔ وہ کچھ پریشان نظر آنے لگی تھی۔ چند لمحے بعد اس کی آواز سنائی دی۔ "بوغا! اب یہ بتا کہ کیا وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے گی؟۔"

بات مستقبل کی تھی اور وہ بھی مستقبل قریب کی نہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ کل کیا ہو' مگر جواب تو دینا ہی تھا۔ میں بے دھڑک بولا۔ "اے عظیم بیگی! قرولتائی' قراقرم ہی میں ہوگی۔ تورا کینہ اپنے اس مقصد میں تو کامیاب ہوجائے گی' مگر بھورے نمدے کی مسند پر تیرا بھاتر بیٹا ہی بیٹھے گا۔"

میرا یہ جواب کچھ ایسا زیادہ غلط بھی نہیں تھا' کیونکہ یاسائے چنگیزی کے مطابق خاقان کا انتخاب اسی وقت عمل میں آسکتا تھا جب خاندان زریں کے تمام افراد ایک جگہ جمع ہوں۔ تورا کینہ اور اوغول غائمش کی وہاں سے روانگی کا مطلب یہی تھا کہ باتو خاں یا سرقوشنی بیگی ان کی غیر موجودگی میں کوئی بھی فیصلہ کرلیں' اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔

سرقوشنی بیگی کچھ دیر خاموش رہی پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ "جاتے جاتے اس بوڑھی عیارہ نے کہلوایا تھا کہ سائین خاں نویانوں کا آقا ہے اور اس کے حکم کی تعمیل ان پر واجب ہے۔ کوئی سائین خاں کا مشورہ ماننے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود وہ اوغول غائمش کو لے کر یہاں سے چلی گئی۔ چالاک کہیں کی۔" پھر شاید اسے یہ احساس ہوگیا کہ اس کے سامنے میں بیٹھا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ "سن بوغا! فیصلہ آج ہی ہوجائے گا' آج ہی شام۔ اب تو جا۔!"

اور پھر وہی ہوا جو سرقوشنی بیگی نے کہا تھا۔ شام سے پہلے ہی ایک بہت بڑا یورت نصب کیا گیا۔ اس یورت میں ایک تاریخی فیصلہ ہونے والا تھا۔ وہاں صرف منگول سرداروں اور قشق سے متعلق افراد کے علاوہ کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میں منلیک کے ہمراہ وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ باتو خاں نے پورے اردو کے اہم سرداروں کو اس بڑے اجلاس میں طلب کیا تھا۔

تورا کینہ اور اوغول غائمش کے ہمراہ بہت کم سپاہی قراقرم گئے تھے اردو کا بڑا حصہ سرقوشنی بیگی کا ہمنوا بن کر اس کے ساتھ شاہینوں کی جھیل پر پہنچ گیا تھا۔ ان میں وہ منگول سردار بھی تھے جو مصلحت وقت کو دیکھتے ہوئے سرقوشنی بیگی کے ساتھ ہولیے تھے۔ لیکن درحقیقت وہ ملکہ تورا کینہ ہی کو راہ راست پر جانتے تھے' اور اسی کے حامی تھے۔ انہی سرداروں میں سے ایک جلائر سردار کہن سال الچی دائی بھی تھا جو واضح طور پر تورا کینہ کے حامیوں میں گنا جاتا تھا۔

شاہینوں کی جھیل کے کنارے ایک بڑے سے یورت میں منعقد ہونے والا یہ اجلاس کچھ افراد کی قسمت کا

فیصلہ کرنے والا تھا اس اجلاس میں سرقوشنی بیگی کے چاروں بگھاتر بیٹے منگو قبلائی ہلاکو اور ادیق پہنچ چکے تھے۔ وہ چاروں اپنی عظیم ماں سرقوشنی بیگی کے برابر برابر بیٹھے تھے۔ چغتائی کے دونوں بیٹے بوری اور بائی دار بھی موجود تھے۔ مگر اوغدائی کے خاندان کا کوئی فرد اس اجلاس میں شریک نہیں تھا۔

میں اور منلیک قشق کے دوسرے سپاہیوں کی جمعیت میں 'یورت کے در سے لگے کھڑے تھے۔ مجھے اس بات پر عجیب سی خوشی ہوئی کہ اس اجلاس میں ریچھ والے شاہان تب تنگری کو بھی آنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ مگر میں قشق سے وابستہ ہونے کے سبب وہاں موجود تھا۔

باتو خاں جانشیں بنا مگر بہت دیر تک اس نے خود کچھ نہیں کہا' اس کے چہرے سے عجیب سے تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا' یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اندرونی کشمکش میں مبتلا ہو' شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ چنگیز خان کی باسا سے وفاداری کرے یا سرقوشنی بیگی کی دلی خواہش پوری کردے جس سے وہ واقف تھا۔ اس اجلاس سے پہلے منلیک نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سرقوشنی بیگی کے ہمراہ آنے والے اردو میں گیا تھا' وہاں اسے معلوم ہوا کہ بہت سے بوڑھے سردار قویوق سے اس لیے ناراض تھے کہ اس نے ان کی خاندانی جاگیریں ضبط کرلی تھیں' اب وہ اوغدائی کے برسر حکومت خاندان کے اندھا دھند خیر خواہ نہ رہے تھے۔ لیکن وہ سب کے سب یاسائے چنگیزی اور مغل روایات سے انحراف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔

باتو خاں جب تھا اور منگو بھی! جس کی حمایت کا اعلان باتو خاں پہلے ہی کرچکا تھا' باتو خاں خاصا جہاں دیدہ شخص تھا۔ اس نے معنی خیز سی نظر سے بوڑھے منگول سردار اچی دائی کی طرف دیکھا وہی اچی دائی جو اوغدائی کے خاندان کا ہمنوا تصور کیا جاتا تھا۔ باتو خاں کے اس طرف دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ یہ چاہتا ہو کہ اچی دائی گفتگو چھیڑے۔

بوڑھا منگول سردار اچی دائی باتو خاں کی نگاہ کا مفہوم سمجھ گیا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جب وہ بولا تو یوں معلوم ہوا کہ کوئی بوڑھا جسم نہیں' جوان جسم بول رہا ہو' اس کی آواز اتنی ہی بلند اور کڑکدار تھی۔

"اے خاندان زریں کے نوبانو' اور اے جد عظیم (چنگیز خاں) کے شاہنو! میں اس اجلاس میں کھلے کھلے الفاظ سے اپنے دل کا اظہار کروں گا۔' تو سنو کہ میں اچی دائی' اوغدائی کے خاندان کا حق تسلیم کرتا ہوں کہ عہد کرنے والوں میں سے ایک میں ہی تھا۔ ہاں میں نے بھی عہد کیا تھا کہ اوغدائی کے بعد اس کے خاندان سے وفا کروں گا' سو میں نے اوغدائی کے بیٹے قویوق سے وفا کی۔ وہ مرگیا مگر میں اپنی وفا اور اپنے عہد کو شرمندہ نہیں کروں گا۔ قویوق مرگیا' پر ابھی اس کا خاندان باقی ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ اسی کے خاندان میں سے خاقان کا انتخاب کریں۔"

بوڑھے باحوصلہ منگول سردار اچی دائی کی بات نے میرا جی خوش کردیا۔ گویا ان کے درمیان اختلاف موجود تھا اچی دای اپنی بات کہہ کر بیٹھ گیا' مگر باتو خاں خاموش ہی رہا۔

معاً" قبلائی اپنی جگہ سے اٹھا اور با آواز بلند بحث کی "ہم نے اب تک وہی کیا جو تم نے کہا' لیکن اوغدائی کی اولاد ہی نے سب سے پہلے اوغدائی کی وصیت کے خلاف عمل کیا اور انہوں نے قویوق کو بھورے نمدے کی مسند پر بٹھادیا۔ کیا تم بھول گئے کہ اوغدائی نے کمسن شیرامون کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا؟"

کچھ دیر کو سناٹا چھا گیا' پھر اچی دائی دوبارہ اٹھا۔

"تو پھر اے بگھاتر ماں کے بگھاتر بیٹے اب مناسب یہ ہے کہ شیرامامون کو خاقان بنادیا جائے" اچی دائی بولا۔

"اور یہ بھی تو کہو اے منگول سردار کہ جب تک شیرامون جوان نہ ہوجائے قویوق کی بیوہ اوغول غانمیش حکومت کرے۔" قبلائی' اچی دائی کے بیٹھنے سے قبل ہی بول اٹھا' اس کے لہجے میں چبھن تھی اس نے اچی دائی کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔

قبلائی کی بات پوری ہی ہوئی تھی کہ ایک اور سردار اٹھا۔ یہ منگسار تھا منگسار' سرقوشنی بیگی کے

شوہر تولوئی کی ماتحتی میں سپہ سالاری کر چکا تھا' وہ سرتوقتنی بیگی کے حامیوں میں بااثر سردار تھا

"سلطنت کا کاروبار ایک لڑکے کے ہاتھوں میں نہیں سونپا جا سکتا۔" منگسار کی آواز بلند ہوئی "کسی ایسے کو خاقان بناؤ جو لڑائی میں سب کی سپہ سالاری کر سکے میں زندہ نویانوں میں سب سے بڑے نویان سائیں خاں کا نام لیتا ہوں کہ اب وہ بھورے نمدے کی مسند پر بیٹھے۔"

منگسار نے بہت چالاکی سے بالواسطہ منگو خاں کی حمایت میں بات کہی تھی کیونکہ اسے کیا سب ہی کو علم ہو چکا تھا کہ باتو خاں خود خاقان بننے کی بجائے منگو خاں کو خاقان بنانا چاہتا ہے۔

تب باتو خان نے زبان کھولی وہ ہاتھ اٹھا کر بولا "میں کسی کو اجازت نہ دوں گا کہ وہ خاقان بننے کے سلسلے میں میرا نام لے۔"

لوگ قطار در قطار بیٹھے' باتو خاں کی بات پوری توجہ اور انہماک سے سن رہے تھے۔

باتو خاں کچھ توقف کے بعد پھر بولا "تمام نویانوں میں صرف منگو اتنا تجربہ کار ہے کہ ہمارا خاقان بن سکے۔ اس نے زمانے کے نشیب و فراز دیکھے ہیں کئی مرتبہ جنگ اور یلغار میں اس نے سپہ سالاری کی ہے' اوغدائی اس کی تمکنت اور سخت مزاجی کو بڑی پسندیدہ نگاہ سے دیکھتا تھا' اے بوڑھے منگولو! کیا تمہیں یاد نہیں کہ جب اوغدائی خاقان تھا تو اس نے منگو کو میرے اردو کے ساتھ دشت قپچاق اور اس سے آگے کے ملکوں کی طرف روانہ کیا تھا؟ کیا تم بھول گئے کہ ہم نے ان ملکوں کو زیر کیا؟ وہ منگو ہی تھا جس نے قپچاقیوں اور چرکسوں کا زور توڑا' اور ان کے ملکوں کو ہماری چراگاہ بنایا۔ کیا وہ منگو ہی نہیں تھا جس نے اپنے ہاتھوں دونگا کے سردار کو قید کیا؟" یہ کہتے ہوئے باتو خاں لمحے بھر کو رکا' پھر اس نے بوڑھے سرداروں کی طرف نظر جما کے کہا "اس کے بعد بیل والے سال میں اوغدائی خاقان نے اپنا یرلیغ "فرمان" روانہ کیا کہ نویان واپس آجائیں۔ جب وہ وہاں پہنچے تو اوغدائی مر چکا تھا' یرلیغ کے مطابق شیرامون کو اس کا وارث ہونا چاہیے تھا لیکن تورا کینہ خاتون نے اس کا حکم نہ مانا اور اس کے حکم کو بدل دیا۔ اس نے ہمارے سروں پر قویوق کو لا بٹھایا۔ یاسا کا حکم ہے اور مغلوں کا دستور بھی ہے کہ باپ کا وارث سب سے چھوٹا بیٹا ہوتا ہے اس لیے خاقان اعظم کی موت کے بعد سلطنت کا وارث تولوئی کو ہونا چاہیے تھا جو خاندانی الاؤ کا محافظ اور میرا عزیز چچا تھا' ہوا یوں کہ تولوئی پہلے ہی مر گیا پر تولوئی کا گھرانہ تو زندہ تھا' میں پوچھتا ہوں کہ آج جس طرح تم اوغدائی کا حق جتا رہے ہو' اس دن تمہیں کیا ہوا تھا' جب پہلی ناانصافی ہوئی تھی کیا یہ یاسا کی خلاف ورزی نہ تھی کہ تولوئی کے خاندان کی بجائے حکومت اوغدائی کو ملی جب کہ تولوئی کے بیٹے زندہ ہے۔ ہاں تم کہو گے کہ وہ جوان نہ ہوئے تھے تو کیا شیرامون جوان ہے جو تم اسے خاقان بنا رہے ہو؟" سنو کہ یاسا کے مطابق جد عظیم (چنگیز خاں) کی موت پر حکومت تولوئی کے گھرانے کو ملنی چاہیے تھی۔ بولو کیا جد عظیم نے یہ قانون خود نہ بنایا تھا؟ تو پھر پہلی ناانصافی کا بدل اب کیوں نہ ہو! منگو تولوئی ہی کا بڑا بیٹا ہے چنگیز خاں کا اور کون سا پوتا اس قابل ہے کہ روشن دماغی اور فراست سے اتنی بڑی سلطنت سنبھال سکے! قابلیت میں منگو دوسرے نویانوں سے ممتاز ہے۔ اس وقت خاقان بننے کا سب سے زیادہ مستحق وہی ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی باتو خاں کی پرجوش تقریر ختم ہو گئی اس نے بڑی مدلل باتیں کی تھیں اور اپنی تقریر کے ثبوت میں جگہ جگہ یاسا کا حوالہ دیا تھا' تو پھر کون ایسا تھا جو یاسا کے خلاف آواز اٹھا سکتا!

تقریر کے خاتمے پر کسی نے اس کی مخالفت میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ پہلے پہل دستور کے مطابق منگو نے انکار کیا' قبلائی نے اس سے اصرار کیا۔

اسی دوران میں ایک سردار نے تیز اور بلند آواز میں اجتماع کو مخاطب کیا "ہم سب نے عہد کیا تھا کہ ہم سائیں خاں کا مشورہ قبول کریں گے۔ منگو اکیلا اس سے کس طرح انکار کر سکتا ہے؟ کیا اس پر اپنی وعدے کی پابندی لازم نہیں؟"

اس کے بعد منگو اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا "میں تم

سب کے کہنے پر خاقان بننا قبول کرتا ہوں، میں تم سب کی خدمت اور حفاظت کروں گا۔"

خوشی کے نعروں سے پورا یورت گونج اٹھا، مگر ابھی تاج پوشی باقی تھی جس کے لیے قرولتائی منعقد ہونا ضروری تھا۔

جب نعرے تھمے تو باتو خاں کی بلند آواز سنائی دی "طاقتور اولوسی (لشکر) منگو اور قبلائی کی معیت میں قراقرم جائیں گے۔ اور میں تمام رشتے داروں کو دعوت نامے بھیجوں گا کہ وہ منگو کے جشن تاجپوشی میں شریک ہوں یہ کہہ کر اس نے ضیافت کا اعلان کیا۔

میرا دل بجھ گیا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ باتو خاں کی تقریر اس طرح کا پلٹ دے گی خاقان کے لیے منگو کے انتخاب نے میری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

خاقان قوبوق ہو کہ منگو اس سے مجھ پر کیا فرق پڑتا تھا! میرے لیے دونوں یکساں تھے قوبوق مر گیا تو منگو کا انتخاب ہو گیا اور منگو مر جائے گا تو کوئی اور آ بیٹھے گا؟ پھر میں اپنا وقت کیوں گنوا رہا ہوں، میں نے سوچا۔ اور بار بار سوچا اس طرح تو میں اپنا مقصد کسی طرح بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ سوچ کی یہی منزل تھی کہ میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی، میرے ذہن میں بالکل نئی اور انوکھی بات آئی تھی۔

وہاں اب کیا رہا تھا جسے میں دیکھنے اور سننے کے لیے بے تاب ہوتا، اجلاس ختم ہو چکا تھا اور ضیافت کی تیاریاں ہو رہی تھیں مجھے سوچنے سمجھنے اور مستقبل کے لیے کوئی لائحہ عمل بنانے کی خاطر تنہائی چاہیے تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ منلیک ابھی وہیں رکنا چاہتا ہے۔ اور یوں بھی میں اسے اپنے ساتھ لے کر قاصدوں کے یورت تک نہیں جانا چاہتا تھا

"میں چلتا ہوں۔" میں نے منلیک سے کہا۔

"کہاں؟۔" وہ حیرت سے بولا "کیا تم ضیافت میں شرکت نہ کرو گے؟ ایسی ضیافتوں میں شریک ہونے کا موقع روز روز نہیں ملتا۔"

"میں اپنے یورت میں جا رہا ہوں تم چاہو تو یہیں ٹھہرو۔" یہ کہہ کر میں یورت کے در کی طرف مڑ گیا اور منلیک مجھے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ مگر میں نے اسے دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا۔ میری کھوپڑی میں تو جیسے بوران (شمال کی کالی آندھی) گردش کر رہی تھی۔

میں قاصدوں کے یورت تک پہنچا وہاں اس وقت خدمتگار نہیں تھے۔ یورت میں مشعل روشن تھی میں نے اندر داخل ہو کر دیکھا کہ خدمتگاروں نے میرے اور منلیک کے لیے بستر بچھا دیئے تھے۔ میں نے اپنے بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور ایک بار پھر میری سوچ کے بے لگام گھوڑے سرکشی کرنے لگے۔

میں نے اب تک منگولوں سے انتقام لینے کے لیے صرف ایک ہی نہج پر سوچا تھا کہ میں ان کے درمیان رہ کر نفاق کے بیج بوتا رہوں اور نتیجہ دیکھوں مگر ان سے انتقام لینے کی اور صورتیں بھی تو ہو سکتی تھیں۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ میں ان لوگوں سے مل جاتا، جو منگولوں سے نفرت کرتے تھے؟ وہ لوگ جن کی زمینوں کو انہوں نے اپنی چراگاہیں بنا لیا تھا، وہ جن کی حیثیت غلاموں جیسی ہو کر رہ گئی تھی اور وہ جو بھی سرتاج تھے۔ میرے سامنے ایسی کئی مثالیں تھیں، مجھے شہر کیف کا رئیس اعظم میخائل یاد آیا جسے ہلاک کر دیا گیا تھا اور اب شہر کیف پر باتو خاں کا قبضہ تھا کیا میخائل کے اہل خاندان اور شہر کیف کے بسنے والے باتو خاں سے خوش ہوں گے؟ میں نے سوچا۔ "بھلا یہ کیسے ممکن تھا، مجھے ملکہ روسوان یاد آئی وہ جسے باتو خاں زیر دام لانا چاہتا تھا وہ جو جیتے جی باتو خاں کی غلامی قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی اور وہ جو حسین و خوفناک تھی۔ ہاں وہ بھی تو باتو خاں کے خلاف کسی سازش میں شریک کی جا سکتی تھی لیکن وہ تھی خطرناک عورت اس لیے میں نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ ان دونوں کے علاوہ بھی اور نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو اپنی زمینوں اور حکومتوں سے محروم کر دیئے گئے ہوں گے۔ میرا ذہن سوچ رہا کیا ایسے لوگوں سے کوئی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ اور یہ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں منگولوں کی طاقت بھی تھی ان کے خلاف کھلے عام کچھ کرنا اور ان کے خلاف آواز اٹھانا یقیناً

موت کو دعوت دینا تھا۔
میں نے کافی دیر سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ مجھے ان کی
ملوں سے باہر نکلنا پڑے گا' میں اسی صورت میں ان
کے خلاف کچھ کر سکوں گا لیکن یہ ممکن کیسے ہوا! مجھے
ی سوچنا تھا میں سرقوشنی بیگی کی نظر میں تھا۔ وہ بھلا
مجھے کب چھوڑنے والی تھی۔ ان حالات میں صرف
ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ ایک طرف تو میں ان
کے وفاداروں میں شامل رہوں اور دوسری جانب ان
کے دشمنوں سے مل جاؤں' یوں کہ انہیں خبر بھی نہ ہو
اور وہ غفلت میں مارے جائیں۔
مجھے اس ضمن میں کچھ معلومات بھی درکار تھیں' اور
معلومات اس نوع کی تھیں کہ ان کے بغیر میں اگلا
قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔
اور پھر اسی رات جب منلیک ضیافت سے لوٹا تو میں
اسے بورت میں داخل ہوتے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔
"تجھے کیا ہوا یوغا؟" وہ مجھے دیکھتے ہی بولا "تو وہاں
سے کیوں چلا آیا تھا؟"
"مجھے اپنا جسم کچھ گرا گرا سا لگ رہا تھا۔" میں نے
اسے ٹالنے کی غرض سے بہانہ بنایا۔
وہ میرا جملہ سن کر چونک پڑا اور بولا "کہیں تیرے جسم
میں کوئی منحوس کیلت تو نہیں گھس گئی اگر ایسا ہے تو
میں ابھی ریچھ والے شامان کو خبر کرتا ہوں ہمارا علاج
وہاں کرتا ہے۔"
"نہیں نہیں؟" میں ایک دم گھبرا گیا اور مجھے وہ
دن یاد آگیا جب میں سولدہ سے خوفزدہ ہو کر اپنے
بورت کی طرف بھاگتا ہوا آیا تھا اس وقت بھی شامانوں
نے اپنی دانست میں میرا علاج کیا تھا میرے ذہن میں وہ
یادیں ابھی زندہ تھیں۔
مجھے گھبراتے محسوس کر کے منلیک میرے قریب آگیا
اور ہمدردی سے بولا "دیکھ یوغا! علاج سے نہیں ڈرتے
ہم میں بہت سے افراد ایسے ہیں جو شامانوں کے علاج
سے خوف کھاتے ہیں اور اسی خوف کے سبب وہ یہ
بات چھپاتے ہیں کہ ان کے جسم میں منحوس کیلت
گھس گئی ہے جو انہیں بیمار ڈال چکی ہے۔ ایسے لوگ
گھاٹے میں رہتے ہیں اور بے خبری میں مارے جاتے
ہیں۔ میں تیرا ہمدرد ہوں مجھ سے کچھ نہ چھپا"
ایک چھوٹا سا بہانہ میرے لیے جنجال بن گیا تھا میں
سوچ رہا تھا کہ اگر میں تب تنگوی کے پلے پڑ گیا تو وہ
میرا کچومر ہی نکال دے گا۔ یہ سوچ کر میں نے منلیک
کو مخاطب کیا "دیکھو منلیک یقین کرو کہ ایسی کوئی
بات نہیں میں ان لوگوں میں سے نہیں جو شامانوں کے
خوف سے اپنی بیماریاں چھپاتے ہیں' اور نہیں بتاتے
کہ ان کے جسم میں منحوس کیلت گھس گئی ہے۔"
میں بڑی مشکل سے منلیک کو یہ یقین دلانے میں
کامیاب ہوا کہ میرے جسم میں منحوس کیلت نہیں
گھسی' پھر میں اصل موضوع کی طرف آیا۔ مجھے اس
سے بہت سی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔
"منلیک! تجھے شہر کیف کا وہ رئیس اعظم میخائل
یاد ہے؟" میں نے گفتگو چھیڑی۔
"ہاں' کیوں؟ تجھے اس وقت وہ کیسے یاد
آگیا؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔
"بس یونہی ذہن میں آگیا۔" میں نے جواب دیا
"میں اس کی موت کا منظر کبھی نہیں بھول سکتا'
سیاہوں نے کس طرح اس کا خون بہائے بغیر اسے
ہلاک کر دیا تھا۔"
"ہاں یوغا مجھے یاد ہے۔" منلیک بولا "دراصل یہ
یاسا کا حکم ہے کہ شاہی خاندان کے کسی فرد کا خون نہ
بہایا جائے' چاہے وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔"
"تو پھر میخائل کے اہل خاندان کے ساتھ بھی یہی
کیا گیا ہو گا۔ تو تو شہر کیف گیا تھا نا!" میں نے اس سے
کچھ اگلوانے کی راہ ہموار کرنے کے لیے کہا۔
"ہاں میں تو ان باشیوں کے نام سائیں خاں کا پیغام
لے کر گیا تھا' لیکن میں وہاں زیادہ نہیں رکا البتہ مجھے یہ
معلوم ہے کہ بعد میں وہاں کیا ہوا؟" منلیک یہ کہہ
کر خاموش ہو گیا۔
"بعد میں کیا ہوا تھا' سائیں خاں کے توان باشیوں
نے بہت آسانی سے شہر پر قبضہ کر لیا ہو گا۔" میں نے
کچھ مزید جاننے کی خاطر اسے اکسایا۔
"ہاں ہونا تو یہی چاہیے تھا' مگر ایسا ہوا نہیں
تھا۔" منلیک نے بتایا اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے

مرعوب کرنا چاہتا ہو۔ وہ چند لمحے توقف کے بعد بولا "جب ہمارے تومان باشیوں کے اردو نے شہر کیف کو چاروں طرف سے گھیر کر اس پر یلغار کی تو یہی امید تھی کہ کسی میں مقابلہ کرنے کی جرات نہ ہوگی' پر میخائل کا چھوٹا بیٹا مارکوف مقابلے پر آگیا۔ میخائل کے دوسرے بیٹوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور قانون کے مطابق انہیں ہلاک کردیا تھا شہر کیف کا قلعہ ہمارے قبضے میں آگیا' شہر کو فتح کرلیا گیا تھا' پر مارکوف فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ میخائل کے خاندان کا ایک ایک بچہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلاک کیا جاچکا ہے' پر اب تک مارکوف ہاتھ نہیں لگا وہ بزدل بھگوڑا آئے دن چھپ چھپ کر ہمارے اردو پر حملے کرتا رہتا ہے حالانکہ اس کے ساتھ بہت کم سپاہی ہیں مگر شہر کیف والے اس کی مدد کرتے ہیں۔ وہ مارکوف اور اس کے ساتھیوں کو یہ جاننے کے باوجود پناہ دے دیتے ہیں کہ اگر یہ بات کھل گئی تو انہیں نہیں چھوڑا جائے گا مارکوف اب تک اسی لیے بچا ہوا ہے" منلیک نے تفصیل بیان کردی۔

اس کے بعد میں منلیک سے شہر کیف اور مارکوف کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرتا رہا' ان معلومات سے میں نے جانا کہ مارکوف نوجوان' خوبصورت اور بہادر ہے میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی طرح شہر کیف پہنچ کر مارکوف سے رابطہ قائم ہوجائے تو وہ اور میں دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

اس شب میں یہی سوچتے سوچتے سوگیا کہ کس طرح شہر کیف پہنچا جاسکتا ہے کہ کوئی میری جانب شک بھی نہ کرے۔ اور میں منگولوں کے دشمن سے جاملوں۔

دوسرے دن صبح ہی منلیک کی طلبی ہوگئی' جب وہ باتو خاں کے یورت سے لوٹا تو پتا چلا کہ باتو خاں اسے اپنے چھوٹے بھائی برقائی کے پاس بھیج رہا ہے۔

وہ سفر کی تیاریاں کرنے لگا تو میں نے اس سے وہاں جانے کا سبب دریافت کیا۔

"وہی پرانا چکر ہے۔" اس نے جواب دیا "مگر اس بار فیصلہ ہوجائے گا۔"

"یعنی؟" میں نے پوچھا۔

"سائیں خاں نے برقائی سے کہلوایا ہے کہ و
روسودان کو گرفتار کرکے اس کے پاس بھیج دے
اس کے بھتیجے داؤد کو اس شرط پر قصبک کا حا
بنادے کہ وہ سائیں خاں کی وفاداری کا عہد کر
منلیک نے بتایا۔

"مگر داؤد تو قید میں ہے۔" میں بولا۔

"اسے قید سے رہائی بھی دلائی جاسکتی ہے یہ
بڑی بات نہیں۔" منلیک نے کہا۔

"تمہارے خیال میں برقائی خاں اسے گر
کرسکے گا؟" میرے منہ سے یوں ہی نکل گیا۔

منلیک نے ایک چمڑے کے تھیلے کا منہ باند
ہوئے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولا "بوغا! تو کیسی
کررہا ہے تو برقائی خاں کو کیا سمجھتا ہے وہ بڑا بگھا
اگر سائیں خاں اس سے پہلے ہی یہ کہلوا دیتا جو
کہلوا رہا ہے تو اب تک اس عورت کا غرور پاش
ہوجاتا۔"

"بالکل' بالکل!" میں نے جلدی سے تائید
تقریباً" یہی بات مجھ سے مسلمان مبلغ ابونصار نے
کہی تھی۔ کچھ دیر بعد منلیک قفقاز کے لیے ر
ہوگیا' اور میں نے مونگ کے تومنگری کا شکریہ ا
کہ مجھے قفقاز نہیں بھیجا گیا' لیکن منلیک کی رو
سے میں پریشان ضرور ہوگیا اس پریشانی کا سبب یہ ق
سائیں خاں مجھے بھی منلیک کی طرح کہیں پیغام
کرنہ بھیج دے۔

اس خطرے سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت
کہ میں اب سائیں خاں کے ساتھ قاصد کی حیثی
سے نہ رہوں میں نے اسی دن سرقوشنی بیگی سے
کا فیصلہ کیا۔

دوپہر ڈھلے میں یورت سے نکلا اور اس طرف
جہاں سرقوشنی بیگی کا بڑا سا یورت نصب کیا گیا تھا
اس نے فوراً" ہی اندر بلوالیا۔

میں اسے تعظیم دے کر فارغ ہوا تو اس نے مجھے سوا
نگاہ سے دیکھا اور بولی "کیا چاہتا ہے بوغا؟"

"اسے الاؤ کی رکھوالی! میں اب تیرے ساتھ ر

تیری خدمت کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے مدعا بیان کردیا۔"

"میں نے خود بھی یہی سوچا تھا کہ اب تجھے سائیں خاں سے واپس مانگ لوں' اچھا ہوا کہ تو خود آگیا۔" اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ ایک لمحے کو رک کر وہ پھر بولی "تیری کئی پیش گوئیاں سچ ثابت ہوئیں ہیں اور اب مجھے نئی پیش گوئیوں کی ضرورت ہے اب سے تو میرے قشق کے ساتھ رہے گا' میں سائیں خاں سے کہلوادوں گی اور اپنے قشق کے توماں باشی کو بھی حکم جاری کردوں گی بس یا کچھ اور بھی چاہتا ہے۔"

"میرے لیے یہی بہت بڑی اور عزت کی بات ہے کہ میں تیری خدمت میں رہوں' مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔" میں ادب سے اس کے سامنے جھکا۔

"مجھے تو اسی لیے پسند ہے کہ شامانوں کی طرح لالچی نہیں۔" سرقوشنی بیگی نے کہا۔

میرا جو مقصد تھا' وہ حاصل ہوچکا تھا' میں نے اس سے رخصت کی اجازت لی اور یورت سے نکل گیا۔

اسی دن شام سے پہلے میں نے باتو خاں کے قاصدوں کا یورت چھوڑ دیا۔ اور سرقوشنی بیگی کے یورت سے قریب ایک دوسرے یورت میں منتقل ہوگیا۔ وہ چھوٹا سا یورت بطور خاص میرے ہی لیے نصب کیا گیا تھا اور اس یورت کے اردگرد قشق سے وابستہ سپاہیوں کے یورت تھے۔ مجھے ایک خدمتگار بھی فراہم کردیا گیا تھا اور یہ سب کچھ سرقوشنی بیگی کے حکم پر ہوا تھا۔

شاہنیوں کی جھیل کے کنارے باتو خاں' سرقوشنی بیگی اور اس کے بکھاتر بیٹوں کی آؤ بھگت کررہا تھا۔ وہ انکی قراقرم روانگی سے قبل سرائے باتو لوٹنا نہیں چاہتا تھا' اس لیے اب تک وہ اپنے اولوس لشکر کو لیے وہیں پڑا تھا۔

اگر سرقوشنی بیگی چاہتی تو فوری طور پر اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر قراقرم روانہ ہوسکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا تھا' اس کا ایک سبب تھا' وہ یہ کہ سرقوشنی بیگی مناسب وقت پر قراقرم پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ پہلے منگو کے جشن تاج پوشی کی خاطر تمام راہیں ہموار کرلینا چاہتی تھی' تاکہ عین وقت پر کوئی رکاوٹ نہ ہو تمام عزیزوں اور رشتے داروں کو باتو خاں کی جانب سے دعوت نامے بھیجے جاچکے تھے کہ وہ قراقرم پہنچ کر منگو کے جشن تاج پوشی میں شریک ہوں۔ قاصد روانہ ہوچکے تھے' لیکن سرقوشنی بیگی ابھی وہیں تھی۔ وہ قبل از وقت قراقرم پہنچنا نہیں چاہتی تھی' اس کا مقصد یہ تھا کہ ادھر عزیز رشتے دار قراقرم پہنچے ادھر وہ پہنچ جائے تاکہ تورا کینہ کو کوئی چال چلنے کا موقع نہ مل سکے۔ اور منگو کو فوراً" بھورے نمدے کی مسند پر بٹھایا جاسکے۔

ان تمام باتوں کا علم مجھے سرقوشنی بیگی کے قریب رہ کر ہوا مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ آخر میں سرقوشنی بیگی اپنی قراقرم روانگی سے قبل ملکہ تورا کینہ کی طرف ایک پیغام بھجوانا چاہتی ہے لیکن اس پیغام کے بارے میں مجھے کچھ علم نہ ہوسکا۔

سرقوشنی بیگی کے وہاں رکنے کا مقصد جان کر میری ذہنی الجھن ختم ہوگئی ورنہ پہلے میں پریشان سا تھا آخر وہ قراقرم کیوں نہیں چلی جاتی۔

ایک چاند ڈوب کر دوسرا چاند ابھر آیا تھا' مگر ابھی تک میں ایسی کوئی راہ نہ نکال پایا تھا کہ شہر کیف کے رئیس اعظم میخائل کے نوجوان و بہادر بیٹے مارکوف سے مل سکتا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہر دوسرے تیسرے دن میری طلبی ہوتی رہتی تھی سرقوشنی بیگی مجھ سے آنے والے زمانوں کا حال پوچھتی' اور میں بمشکل اسے مطمئن کرپاتا' اب مجھے اتنا تو پتا چل ہی چکا تھا کہ جھوٹ کس طرح بولا جائے' اور کیسے ایسی گول مول باتیں کی جائیں کہ آئندہ گرفت نہ ہو! اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس چالاک و ذہین عورت کو مطمئن کرنا یا بے وقوف بنانا ہنسی کھیل نہیں تھا ایسا کرتے ہوئے میرے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

اب میں اکتاہٹ کا شکار ہونے لگا تھا' باتو خاں سے تو میں نے جان چھڑالی تھی۔ مگر اب سرقوشنی بیگی جان کی لاگو ہوگئی تھی۔ وہ تو خیر ایک مقصد سے وہاں ٹھہری تھی مگر میں کیوں اس کے ساتھ لگا پھر رہا تھا جس غرض

سے میں اس تک پہنچا تھا' وہ پوری نہ ہو سکی تھی اور آئندہ بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا' کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے! قوبیق کی ناوقت موت نے سارا کھیل بگاڑ دیا تھا اگر وہ نہ مرتا تو باتو خاں اور اس کے درمیان زبردست خوں ریز معرکہ ہوتا۔ اس معرکے میں ہزاروں لاکھوں منگول مارے جاتے کیونکہ وہ بالکل جانوروں کی طرح لڑتے تھے۔ اور رحم ان کے لیے ایک بے معنی جذبہ تھا' اس وقت انہوں نے چنگیز خاں کے اس قول کو پس پشت ڈال دیا تھا کہ "اپنے خونی عزیزوں کو تباہ کرنا۔ گھر کے چولھے کی آگ بجھانا ہے۔" وہ اپنی اپنی طاقت و قوت کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابل آگئے تھے' اور سرقوشنی بیگی بھی اس سلسلے میں ملوث ہو گئی تھی' ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے پہلے ٹھیک ہی قدم اٹھایا تھا کہ ان کے درمیان رہوں اور نفاق کے بیج بوتا رہوں۔

اب وہ وقت گزر گیا تھا' اور گزرے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ میرے لیے یہ لازم ہو گیا تھا کہ میں اپنے لائحہ عمل میں تبدیلی کروں۔

میخائل کے بیٹے اور منگولوں کے باغی مارکوف سے ملاقات نہ ہونے کے بعد اب میرا ذہن دوسرے خطوط پر کام کر رہا تھا۔ میں ابھی مایوس نہیں ہوا تھا' کافی غور و خوض کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اب بھی ان کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کا ایک موقع ہے اور وہ موقع شاید آخری موقع ہے۔ اگر کسی طرح ملکہ تورا کینہ اور قوبیق کی بیوہ اوغول غانمش اتنی طاقتور ہو جائیں کہ سرقوشنی بیگی کے مقابل آسکیں تو بات بن سکتی تھی۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو کم از کم اتنا تو ہو کہ وہ دونوں اپنے گھرانے کے اولوس (لشکر) کو کام میں لا کر سرقوشنی بیگی کے خلاف کوئی سازش کر سکیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ انہیں ایسا کرنے پر اکسایا جائے۔

میں نے ملکہ تورا کینہ سے ملنے کے لیے بھی کوشش کی تھی مگر بغورچی درمیان میں آگیا تھا۔

میں اب یہ جان چکا تھا کہ جب تک خاندان زریں کے تمام افراد ایک جگہ جمع نہ ہوں' تاج پوشی کی رسم ادا نہیں ہو سکتی' یا جب تک ہر گھرانے کی نمائندگی نہ ہو' نیا خاقان تاج نہیں پہن سکتا۔ اگر کسی طرح اوغدائی کا گھرانہ جشن میں شرکت نہ کرے تو منگو کی تاج پوشی ممکن نہیں' یہ یاسا کا قانون تھا جسے نہیں بدلا جا سکتا تھا۔ اگر تورا کینہ اور اوغول غانمش کو اسی پر آمادہ کر لیا جائے کہ وہ جشن میں شریک نہ ہوں' تب بھی بات بن سکتی تھی' نفاق پیدا ہو سکتا تھا۔

میں انہی خطوط پر غور کرتا ہوا ایک شام اپنے یورت سے نکل کر باہر جا رہا تھا کہ میرے کان کھڑے ہو گئے' ایک تومان باشی اپنے ساتھی سے گفتگو کرتا ہوا میرے قریب سے گزرا تھا۔ وہ دونوں ہی مجھے جانتے پہچانتے تھے۔ ان کا تعلق سرقوشنی بیگی کے قشق (محافظ دستے) سے تھا میں لپک کر ان کی طرف بڑھا۔

"سنو' ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟ کیا... کیا ملکہ روسودان نے خودکشی کر لی؟" میں نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

وہ دونوں رک گئے پھر تومان باشی نے مجھے تفصیل بتائی' وہ بولا "ہاں آج ہی خبر ملی ہے کہ قصبک پر برقائی خاں کا قبضہ ہو گیا' برقائی خاں نے ملکہ روسودان کو زندہ گرفتار کرنا چاہا تھا' تاکہ اس باغی اور خود سر عورت کو سائیں خاں کے پاس بھیج سکے' مگر اس نے زہر کھا لیا' اور مر گئی۔"

میری سماعت میں اس وقت ملکہ روسودان کے وہ الفاظ گونجنے لگے جو اس نے خود میرے سامنے کہے تھے اس نے کہا تھا "ہن' ملکہ روسودان وہ کر غیر (زرخیز کھیت) نہیں جس کی فصل دشمنوں کے لیے بوئی گئی ہو۔ میں جب تک جیئوں گی۔ اپنی مرضی اور خواہش سے جیوں گی۔ باتو خاں مجھے اپنے سامنے نہیں جھکا سکتا' جس دن میں نے یہ محسوس کر لیا کہ میں دوسروں کی خواہش پر زندہ رہنے کے لیے مجبور ہوں' وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ منگول بھیڑیا کیا چاہتا ہے' اور اس کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں بھی ہے لیکن میں اس کی خواہش کبھی پوری نہیں کروں گی۔ میں روسودان ہوں روسودان جو اپنی مرضی سے جینا اور مرنا جانتی ہے۔

اس کے کہے ہوئے الفاظ رہ رہ کر میری سماعت میں گونجتے رہے۔ اس نے جو کچھ کہا تھا' سچ کر دکھایا تھا' وہ واقعی اپنی مرضی سے جینا اور مرنا جانتی تھی۔

اس کے علاوہ توماں باشی نے ایک اور حیرت انگیزیات بتائی جسے سن کر مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ اس نے کہا "سائیں خاں نے اپنا جو قاصد قفقاز بھیجا تھا اس نے آخر خبر دی ہے کہ جب وہ برقائی سے ملا تو وہ کعبے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہا تھا' اور اس کے ساتھ ایک مسلمان مبلغ بھی رہتا ہے۔ سائیں خاں نے برقائی کے لیے نئے احکامات جاری کر دیئے ہیں کہ وہ فوراً" قفقاز کو اس کے بھیجے ہوئے سرداروں کے حوالے کر دے' اور شمالی چراگاہوں کا علاقہ سنبھال لے۔ غالباً" سائیں خاں اس طرح برقائی کو مسلمانوں سے دور رکھنا چاہتا ہے۔" توماں باشی نے آخر میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

توماں باشی اپنے ساتھی کے ہمراہ چلا گیا اور میں وہیں سناٹے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ برقائی خاندان زریں کا پہلا شخص جس نے کوئی اور مذہب قبول کر لیا تھا۔ میری آنکھوں میں ابونصار کا چہرہ گھومنے لگا۔ یقیناً" یہ ابو نصار ہی کی تبلیغ کا اثر ہو گا کہ برقائی مسلمان ہو گیا شاید اسی دن کے لیے برقائی اپنے بھائی سے اپنا مذہب چھپاتا تھا۔ اب میری سمجھ میں آگیا کہ مجھے زیادہ دیر قفقاز میں کیوں نہیں ٹھہرنے دیا گیا تھا۔ میں باتو خاں کا قاصد تھا اور غالباً" برقائی خاں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں ابونصار سے ملوں اور کسی طرح مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ برقائی خاں مسلمان ہو چکا ہے یہی سبب رہا ہو گا کہ مجھ سے کہا گیا تھا کہ ابونصار قفقاز میں نہیں' تمام کڑیاں خود بخود ملتی جا رہی تھیں۔ برقائی' منلیک سے اپنا مذہب نہ چھپا سکا اور بطور سزا اسے قفقاز چھوڑنا پڑا۔ حالانکہ باتو خاں اسے کوئی سخت سزا بھی دے سکتا تھا مگر اس نے کسی مصلحت سے ایسا نہیں کیا تھا وہ مصلحت کیا تھی' اسے باتو خاں ہی اچھی طرح جان سکتا تھا۔

معاً" مجھے ملکہ رو سودان کی حسین و نوجوان بیٹی تھمو کا خیال آیا اس کا کیا بنا مگر توماں باشی جا چکا تھا میں اس

آپ کیا چاہتے ہیں؟

صحت؟
دولت؟
شہرت؟
عزت؟
کامیابی؟

سوال ہزار لیکن جواب صرف مستقبل دے سکتا ہے۔

مستقبل کا حال جاننے کے لیے پڑھیے

بولتی لکیریں

مصنف :- منصور احمد بٹ

قیمت صرف -/50 روپے

:- منگوانے کا پتہ :-

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

کے بارے میں بھی جاننے کے لیے مضطرب تھا اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں منلیک ہی سے مل کر تمام تفصیلات معلوم کرلوں۔ یہ سوچ کر میں نے ابھی آگے بڑھنے کے لیے قدم ہی اٹھایا تھا کہ اپنی جانب ایک سپاہی کو تیزی سے بڑھتے ہوئے دیکھا اس سپاہی سے بھی میں واقف تھا۔ اس کا تعلق بھی سرقوشنی بیگی کے قشق سے تھا۔ وہی سپاہی اکثر طلبی کے احکامات لاتا رہتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ شاید اس وقت بھی وہ سرقوشنی بیگی کا حکم لے کر آیا ہوگا مجھے کوفت محسوس ہوئی میں اس وقت سرقوشنی بیگی سے ہرگز ملنا نہیں چاہتا تھا۔

سپاہی قریب پہنچ گیا اور اس نے حسب معمول طلبی کا حکم سنایا۔

میں بجھے دل اور تھکے قدموں سے سرقوشنی کے یورت تک پہنچا میں نے یورت میں پہنچ کر اسے تعظیم دی اور جب سر اٹھایا تو سرقوشنی بیگی کے الفاظ سنائی دیئے۔

"بوغا! میں تجھے قراقرم بھیجنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔

میں تصویر حیرت بنا خاموش کھڑا رہا۔

"مگر تو وہاں میرا قاصد بن کر نہیں بلکہ سائیں خاں کا قاصد بن کر جائے گا سمجھ گیا؟۔" سرقوشنی بیگی بولی اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر توقف کے بعد پھر بولی "جا سائیں خاں کے یورت میں چلا جا وہ تیرا منتظر ہوگا' اور پیغام لکھانے والا ہوگا تجھے وہ پیغام لے کر تورا کینہ کے پاس جانا ہے اور اس وقت تک وہیں رہنا ہے جب تک میں اپنا اولوس (لشکر) لے کر وہاں نہ پہنچ جاؤں۔ تجھے اسی وقت روانہ ہو جانا ہے کیونکہ ابھی رات نہیں ہوئی۔ ہاں اس کر تجھے جلد سے جلد وہاں پہنچنا ہے' کیونکہ میں بھی بہت تیزی سے وہاں پہنچوں گی' میں چاہتی ہوں کہ تو مجھ سے پہلے وہاں پہنچے' اور تورا کینہ کو میرے وہاں پہنچنے سے پہلے سائیں خاں کا پیغام مل جائے۔"

سرقوشنی بیگی حکم دینا جانتی تھی اور اس نے حکم دے دیا تھا۔ میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ تعمیل حکم کروں۔

میں سرقوشنی بیگی کے یورت سے نکلا تو مجھے قراقرم کا خیال آتے ہی' ایک اور شخص یاد آیا جو یقیناً "قراقرم ہی میں ہو سکتا تھا وہ شخص بغور رچی تھا۔ باتو خاں کا قاصد ہونے کی حیثیت سے وہ میرے پیچھے سرکاری کارندوں کو تو نہیں لگا سکتا تھا مگر بذات خود ضرور مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا بہرحال وہ پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔

کچھ بھی ہو مجھے ہر حال میں قراقرم جانا ہے۔ میں نے سوچا تقدیر نے مجھے خود یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ میں ملکہ تورا کینہ سے ملوں اور اسے شیشے میں اتار کر سرقوشنی بیگی کے خلاف اکسا سکوں۔ یہ کام کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا کیونکہ وہ پہلے ہی سرقوشنی بیگی کی حریف تھی۔ مجھے صرف یہ کام کرنا تھا کہ اسے کوئی غلط قدم اٹھانے پر اکساؤں' چاہے وہ قدم خود اس کے لیے ہی خطرناک کیوں نہ ہو۔

میں انہی خیالوں میں گھرا ہوا' باتو خاں کے یورت تک پہنچ گیا۔ اس نے قشق کے توان باشی کو پہلے ہی حکم دے دیا تھا کہ میں جیسے ہی وہاں پہنچوں' مجھ اس کے پاس بھیج دیا جائے۔

میں باتو خان کے یورت میں داخل ہوا تو دیکھا وہ تنہا نہیں تھا' وہاں ریچھ والا شامان تب تنگری بھی اپنے ریچھ سمیت موجود تھا' اور باتو خاں اس سے کوئی پیغام لکھا رہا تھا۔ وہ مجھے یورت میں داخل ہوتے دیکھ کر چپ ہو گیا۔ اور جب میں تعظیم دے چکا تو بولا۔ "آؤ کی رکھوالی چاہتی تھی کہ یہ پیغام تیرے ہی ہاتھوں تو راکینہ تک پہنچے میں خود بھی تجھ سے خوش ہوں کہ تو ایک اچھا قاصد ہے' اور تیرا حافظہ بہتر ہے۔ پر میں مصلحتاً "یہ پیغام تحریری بھیج رہا ہوں' تاکہ وہ یہ بہانہ نہ کر سکے کہ قاصد نے پیغام صحیح نہیں رٹا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں تب تنگری سے دور بیٹھ گیا' اور باتو خاں کے پیغام کا بقیہ حصہ بولنے لگا۔

"تو اے ریچھ والے لکھ کہ منگو ہی وہ شخص ہے جس نے جد عظیم (چنگیز خاں) کی یاسا (مجموعہ قوانین) اور برلوغ (فرمان) کو کانوں سے سنا اور آنکھوں سے

لکھا ہے۔ تمام اولوس (لشکر) اور نویانوں (شہزادوں) ں بہتری اسی میں ہے کہ منگو خاقان بنے اس لیے تو ی اے تورا کینہ! اسے تسلیم کرلے بس پیغام ختم ہوا' ے ریچھ والے! اب اس پر ہماری مہر لگا دے۔"

غام لکھ کر میرے حوالے کر دیا گیا۔ پھر شہباز کی لوح ی گئی' اس کے بعد سفر کی تیاری کے لیے مجھے یورت سے باہر بھیج دیا گیا۔

ں قاصدوں کے یورت میں پہنچا۔ باتو خاں پہلے ہی میرے سفر کے لیے احکامات دے چکا تھا' اس لیے خدمتگار میرے وہاں پہنچنے سے قبل ہی تمام تیاریاں کر چکے تھے۔

مجھے یورت میں منلیک نظر نہیں آیا تو میں نے خدمتگاروں سے اس کے بارے میں دریافت "منلیک کہاں ہے؟"

"وہ آج دوپہر ہی سائیں خاں کے نئے احکامات لے کر برقائی کے پاس قنقاز روانہ ہو چکا ہے۔" ایک خدمتگار نے میرے سوال کا جواب دیا۔

میں روانگی سے قبل منلیک کو نہ دیکھ سکا اور اس سے نہ مل سکا۔

میں روانگی سے قبل منلیک کو نہ دیکھ سکا اور اس سے نہ مل سکا۔ اس کا مجھے رنج ہوا۔ کیا خبر اب اس سے کبھی ملاقات بھی ہوتی یا نہیں یوں بھی میں اس سے ملکہ روسودان کی بیٹی تھیمو کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا' جواب ممکن نہیں تھا۔ تفصیلات بھلا اس کے علاوہ مجھے اور کون بتا سکتا تھا!

ادھر سورج نے شاہنیوں کی جھیل کے سامنے والی پہاڑیوں کو عبور کیا اور ادھر میں ایک طویل سفر پر روانہ ہو گیا۔

*_*_*

کئی چاند ڈوبے اور ابھرے۔ میں قریہ قریہ' منزل منزل آگے بڑھتا رہا اور پھر وہ دوپہر بھی آئی جب مجھے دور ہی سے طاقت کا پہاڑ بورخان قالدون نظر آنے لگا۔

طاقت کا پہاڑ نظر آتے ہی میرے ذہن میرے ذہن میں بھولی بسری یادیں' صحرائی بگولوں کی طرح گردش کرنے لگیں۔ بورخان قالدون کے ساتھ میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں' تلخ بھی اور حسین بھی' مگر تلخی کا حصہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ حسین لمحے تو بس گنے چنے ہی تھے۔ وہ حسین لمحے جو میں نے سولدہ کے قرب میں گزارے تھے۔

میری آنکھوں میں اس وقت سولدہ کا حسین چہرہ گھوم رہا تھا جب میں بورخان قالدون کے بالکل قریب سے گزر رہا تھا۔

میں بے خیالی میں پہاڑ سے کچھ زیادہ ہی نزدیک ہو گیا تھا' اور اب ایک ابھری ہوئی چٹان کے نیچے سے گزر رہا تھا۔

میں بے خیالی میں پہاڑ سے کچھ زیادہ ہی نزدیک ہو گیا تھا اور اب ایک ابھری ہوئی چٹان کے نیچے سے گزر رہا تھا۔

معاً" مجھے یوں لگا جیسے فضا اکتاروں کی آوازوں سے گونج اٹھی ہو' مگر وہ آواز اکتاروں کی نہیں بلکہ کسی کے ہنسنے کی آواز تھی۔ یہ ہنسی کی آواز شہد کی طرح قطرہ قطرہ میری سماعت میں اترتی چلی گئی اور میں نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں' پھر وہ آواز بھی کہیں معدوم ہو گئی۔

میں گھوڑا روک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا مگر وہاں مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ کہیں میری سماعت نے مجھے دھوکا تو نہیں دیا تھا؟ میں نے سوچا' مگر یہ کیسے ممکن تھا وہ آواز وہ مانوس ہنسی کی آواز میں کیسے بھول سکتا تھا۔

میں نے کچھ دیر گھوڑے کو وہیں روکے رکھا پھر جب مجھے یقین سا ہو گیا کہ وہ میرا وہم ہی تھا تو میں نے گھوڑے کو آگے بڑھانے کے لیے ایڑ لگا دی۔

اسی لمحے وہ ہنسی کی آواز پھر سنائی دی اور اسی کے ساتھ مجھے یوں لگا جیسے کوئی خوشبو میرے وجود پر چھا گئی۔

میرا گھوڑا بدک اٹھا تھا کیونکہ کوئی اس کی پشت پر کودا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور اسے قابو میں کر لیا۔ گھوڑے کی پشت پر اب میرے سوا کوئی اور بھی تھا جو یقیناً" چٹان کے اوپر سے کودا تھا۔

اب کسی شک کی گنجائش نہیں رہی تھی وہی مانوس ہنسی' وہی مانوس خوشبو میں چیخ اٹھا۔ "سولدہ!"

_

وہ سولدہ ہی تھی جس کے جسم کی گرمی میں اپنے پیچھے محسوس کر رہا تھا اور جس کے وجود کی نامانوس خوشبو میرے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ زور سے باگیں کھینچے جانے کے سبب گھوڑا اب رک گیا تھا۔

"تجھے پتا ہے بوغا کہ میں کب سے تجھے تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔" سولدہ کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی اور مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ سولدہ کو میرے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی۔

"بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ تجھے میرے بارے میں کچھ خبر نہ ہو!" میں حیرت کے ساتھ بولا۔ "تو تو سولدہ ہے، تجھے تو آنے والے زمانوں کی بھی خبر ہے۔"

میری بات سن کر وہ پھر ہنس پڑی۔ "میں شاید تیرے ذہن سے یہ بات کبھی نہ ٹال پاؤں کہ میں کوئی سولدہ (ساحرہ) نہیں ہوں۔" وہ بولی۔

"تو کچھ اور کہتی ہے مگر میں کچھ اور دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر تو سچی ہے تو پھر..."

"خیر ان باتوں کو چھوڑ، آ کسی غار میں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔ میں کئی دن سے بڑی تنہائی محسوس کر رہی تھی۔" سولدہ نے کہا۔ "میں نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے کل ایک نوجوان چرواہے کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا مگر وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھا، بالکل اس طرح جیسے پہلی بار تو بھاگا تھا۔"

میں نے اس لمحے نوجوان چرواہے کے لیے اپنے دل میں نفرت و رقابت محسوس کی اور بولا۔ "کیا تو میرے علاوہ بھی..." میں نہ جانے کیوں اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ شاید آگے کچھ کہنے کی مجھے ہمت نہیں ہوئی تھی۔

"تو کچھ کہتے کہتے رک کیوں گیا؟" وہ خوش مزاجی سے بولی۔

"شاید تو نے میری بات کا کوئی اچھا اثر قبول نہیں کیا۔ تو غالباً یہ چاہتا ہے کہ میں تیرے سوا کسی سے نہ ملوں۔"

اس نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی اس لیے میں نے کہا۔ "ہاں میں یہی چاہتا ہوں۔"

"تو غالباً کیا چاہتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ... یہ تو مجھے خود... خود بھی نہیں معلوم۔" میں اس کے سوال پر گڑبڑا گیا۔

"اب تو پہاڑ پر بھی چلے گا... یا۔ یہیں باتیں کرتا رہے گا! یہاں اکثر بغورچی منڈلاتا رہتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کی نظر مجھ پر پڑے۔" سولدہ بولی۔

"مگر میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ بغورچی تیرا کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔" میں نے کہا۔ "پھر تو اس سے خوفزدہ کیوں ہے؟"

"میں اس سے ہرگز خوفزدہ نہیں ہوں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن میں خوامخواہ اسے اپنے پیچھے نہیں لگانا چاہتی۔ میں سکون سے رہنا چاہتی ہوں۔" سولدہ نے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں بے خوفی تھی۔

میں نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور بورخان قالدون کی طرف موڑ دیا۔ چرواہوں کے آنے جانے کے سبب پہاڑ کے درمیان ایک پگڈنڈی سی بن گئی تھی۔ میں نے اسی پگڈنڈی پر گھوڑے کو ڈال دیا۔ کچھ اوپر چڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر مزید بلندی پر چڑھنا خطرناک ہے۔ یہ سوچ کر میں گھوڑے کی پشت سے اتر گیا۔ سولدہ بھی اترنے لگی تو میں نے اسے روک دیا۔

"تو بیٹھی رہ!" میں نے گھوڑے کی باگ تھامتے ہوئے کہا اور پہلی بار کافی دن بعد اس کے حسین چہرے پر نگاہ ڈالی۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے ملکہ روسودان کی بیٹی تھیمرو یاد آئی۔ سولدہ مجھے اس لمحے تھیمرو سے بھی کہیں زیادہ حسین نظر آئی۔ اس کے جسم پر بڑا عجیب سا لباس تھا۔ ایسا لباس جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اتنا خوب صورت لباس میں نے خاندان زریں کے کسی نوبان یا بیگی کے جسم پر بھی نہیں دیکھا تھا۔

"کیا دیکھ رہا ہے بوغا؟" اس کے یاقوتی لب ہلے۔

"میں وہ دیکھ رہا ہوں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں پر نظر جما کر کہا۔

"تیری یہی بھولی اور معصوم باتیں تو مجھے پسند ہیں جنہیں سننے کے لیے میں تیرے عہد میں آگئی تھی ورنہ میں کسی اور عہد میں بھی جا سکتی تھی۔"

"تو پھر ایسی باتیں کرنے لگی جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"تیری یہ شکایت بھی میں بہت جلد دور کر دوں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "میں نے سوچا ہے کہ اس بار میں تجھے اپنے ساتھ کسی اور عہد میں لے جاؤں گی۔ جب تو خود اس تجربے سے گزرے گا تو سب کچھ سمجھ جائے گا۔ میں سوچتی ہوں کہ وہ کتنی دلچسپ اور عجیب صورت حال ہو گی! اب سے پہلے میں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اپنے کسی دوست کو میں کسی اور عہد میں لے گئی ہوں۔ یہ تجربہ خود میرے لیے بھی نیا اور دلچسپ ہو گا۔"

میں نے اس کی بات سے صرف یہی نتیجہ نکالا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتی ہے۔ شاید اپنی پر اسرار دنیا میں جہاں وہ خود رہتی ہے۔ وہاں تو سب سولدائیں ہی سولدائیں ہوں گی۔ یہ سوچ کر میں خوفزدہ ہو گیا اور بولا۔ "نہیں! میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟ کیا تو میرے ساتھ جاتے ہوئے ڈرتا ہے؟" سولدہ نے غالباً میرے چہرے پر خوف کے تاثرات دیکھ لیے تھے۔

"ہاں مجھے خوف آتا ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"میں سولداؤں سے ڈرتا ہوں۔"

"اچھا خیر اس موضوع پر پھر بات ہو گی، تو آگے تو بڑھ!"

میں گھوڑے کی باگ تھامے خاموشی سے پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ سولدہ مجھے راستہ بتاتی جا رہی تھی کیونکہ وہ مجھے اس غار تک لے جانا چاہتی تھی جہاں اس کا قیام تھا۔

کافی اونچائی پر پہنچ کر اس نے مجھے ایک غار کے سامنے رکنے کو کہا اور خود بھی گھوڑے کی پشت سے کود کر نیچے آگئی۔

غار کا دہانہ کافی بڑا تھا اور اس میں گھوڑے کو لے جانا مشکل نہیں تھا۔ میں گھوڑے کی باگ تھامے سولدہ کے پیچھے غار کے دہانے میں داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے مدھم سی روشنی کا احساس ہوا۔

"سولدہ کی متحرک مشعل!" میرے ذہن میں خیال آیا۔ وہ اسی متحرک مشعل کی روشنی ہو سکتی تھی جو میں نے پہلے بھی دیکھی تھی۔ فرق صرف روشنی کی کمی اور رنگ کا تھا۔ پہلے والی متحرک مشعل کی روشنی دودھیا اور تیز تھی۔ لیکن اس وقت ہلکی اور آسمانی رنگ کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ جادوانی آسمان کا رنگ بھی تو نیلا ہے۔ میں نے سوچا۔ سولدہ "یقیناً" یہ روشنی نیلے جادوانی آسمان ہی سے لی ہے۔ میرے ذہن میں یہ خیال آتے ہی ایک خوف سا پیدا ہوا۔ سولدہ کی یقین دہانی کے باوجود کہ وہ سولدہ نہیں ہے، مجھے اس کی باتوں پر پورا یقین نہیں آیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بھی دوسری سولداؤں کی طرح بہلا پھسلا کر میرا خون پی جانا چاہتی ہو؟ میں سوچ رہا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ سولدائیں انسانی خون پیتی ہیں۔

غار میں پہنچ کر میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔ وہاں ہر طرف عجیب عجیب چیزیں موجود تھیں جنہیں دیکھ کر میری عقل دنگ تھی۔ مجھے اتنا ہوش بھی نہیں تھا کہ میں پہلے گھوڑے کو کسی بڑے پتھر سے باندھ دوں۔ غار کے ایک کونے میں چھوٹے بڑے پتھروں کا ایک ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ غار کی فضا مجھے کسی طلسماتی دنیا سے کم معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اس بار سولدہ اپنی دنیا سے بہت سی عجیب اور پر اسرار چیزیں لے کر آئی تھی جو پہلے میں نے اس کے ساتھ نہیں دیکھی تھیں۔ زمین پر موٹا سا گدا بچھا ہوا تھا جس کی ایک طرف نیلی متحرک مشعل روشن تھی۔ متحرک مشعل کے قریب ہی لوہے کے کچھ اوزار اور دوسری عجیب اشیاء تھیں۔ سارے غار میں پر اسرار ہلکی نیلی روشنی بھری ہوئی تھی۔ میں نے لوہے کی آوزاروں کے پاس ہی موٹی موٹی جلدوں والی کچھ کتابیں بھی دیکھیں۔ ان موٹی جلدوں والی کتابوں کے برابر ہی پتلی پتلی اور بڑی بڑی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

اسی وقت میں نے دیکھا کہ سولدہ غار کی ایک دیوار

کے قریب پہنچی، پھر اس نے جھک کر کوئی چیز دبائی۔ اس کے ساتھ غار میں ہلکا ہلکا سا شور سن کر میں اچھل پڑا۔

"یہ... یہ آواز... یہ آواز کیسی ہے؟" میں نے خوفزدہ سی آواز میں سولدہ کو مخاطب کیا۔

"میں نے اگر تجھے بتا بھی دیا تو شاید تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا کہ یہ آواز کس چیز کی ہے! بس یہ سمجھ لے کہ اب غار کے اندر کی گھٹن آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔" سولدہ نے بتایا۔

"مگر کیسے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی تو تو نہیں سمجھ سکتا۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "دراصل یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے غار کی کثیف ہوا باہر نکل جائے گی اور تازہ ہوا غار کے اندر آنے لگے گی۔"

"یہ... یہ تو جادو ہوا۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کیا تو یہ جادو دیکھے گا؟" اس نے ہنس کر کہا۔

"نہیں، بالکل نہیں!" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

سولدہ اپنی متحرک مشعل کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ "بیٹھ جا! کھڑا کیوں ہے بوغا!"

میں آگے بڑھا تو میں نے سولدہ کو اس کی متحرک مشعل سے ہاتھ لگاتے دیکھا۔ اس نے متحرک مشعل کا اوپری حصہ الگ کر لیا تھا اور اب غار میں ایک دم اندھیرا ہو گیا تھا۔

میں اپنی جگہ رک گیا اور خوفزدہ آواز میں بولا۔ "سولدہ! یہ یہ کیا ہوا؟"

"ابھی میرے الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ اچانک غار میں دودھیا روشنی کا سیلاب سا آ گیا۔ یہ روشنی سولدہ کی متحرک مشعل سے پھوٹ رہی تھی۔ میں نے اپنی نگاہ اس جادوئی مشعل سے ہٹالی کیونکہ اس کی طرف براہ راست دیکھنے سے میری آنکھیں دکھنے لگی تھیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آنے لگا تھا۔ شاید یہ بھی اس جادوئی مشعل کا کوئی اسرار تھا۔ میں نے متحرک مشعل کا پہلا اوپری حصہ نیچے رکھا دیکھا۔ اس کی جگہ اب سولدہ نے ایک اور بڑا سا حصہ جوڑ دیا تھا۔

"سولدہ! مجھے زیادہ جادو دکھا کر نہ ڈرا!" میں نے اس سے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"میں نے تجھ سے بیٹھنے کے لیے کہا تھا بوغا!" وہ میری بات نظر انداز کرتی ہوئی بولی۔

میں گدے پر بیٹھتے ہی جیسے اندر دھنستا چلا گیا۔ کیا گدا بھی جادوئی ہے؟ میں نے سوچا۔ میں لڑھکتے لڑھکتے بچا تھا اس لیے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ گدا پھر اپنی جگہ پر آ گیا اور میں کھڑا ہو کر اس جگہ کو گھورنے لگا جہاں میرے بیٹھنے سے چھوٹا سا گڑھا بن گیا تھا۔

"تو اٹھ کر کیوں کھڑا ہو گیا؟" سولدہ نے میری طرف دیکھا اور مسکرائی۔

"میں اس جادوئی گدے پر نہیں بیٹھ سکتا!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تیرا خیال غلط ہے بوغا! یہ جادوئی گدا نہیں ہے بلکہ اسفنج ہے۔" وہ مجھے سمجھانے کے انداز میں بولی۔

"اس... پیچ؟... یہ کیا ہوتی ہے؟" میں نے وہ عجیب لفظ دہرایا جو پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

"اس پیچ نہیں، اسفنج!" اس نے میری تصحیح کی۔

"کہو، اس!"

میں نے دہرایا۔

"فنج... فنج!"

میں نے فنج بھی کہہ دیا تو اس نے دوبارہ پورا لفظ کہلوایا۔

میں بولا۔ "اسفنج!"

"ہاں اب ٹھیک ہے۔ تو یہ اسفنج ہے۔ یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا بلکہ آرام دے گا۔"

میں اس کے سمجھانے پر دوبارہ گدے پر بیٹھ گیا۔ اس بار میں پہلے سے چوکنا تھا، اس لیے میرے جسم کا توازن بگڑا تو میں فوراً سنبھل گیا۔ سولدہ بھی گھسک کر میری قریب آ گئی، پھر وہ گدے پر بیٹھے بیٹھے ہی اچھلنے لگی اور میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"جس طرح اس پر میں اچھل رہی ہوں، اس طرح تو بھی بوغا! تجھے بڑا مزا آئے گا۔" وہ ہنس کر

گدے پر بیٹھنے کے بعد اب کچھ کچھ میرا خوف کم ہو
یا تھا اس لیے میں نے سولدہ کی بات مان لی اور واقعی
ے بڑا مزا آیا۔ نرم نرم گدگدا گدا مجھے بہت اچھا
ا۔

"سولدہ! کیا تو اپنا یہ گدا مجھے دے دے گی؟" میں
نے اچھلتے ہوئے کہا۔ "میں اس پر اسی طرح اچھلا
کروں گا۔" میرے لہجے میں سادگی اور معصومیت کا
اثر تھا۔

میری بات سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی' پھر بولی۔
"ارے یہ اچھلنے کے لیے نہیں ہے بلکہ آرام کرنے
ور سونے کے لیے ہے۔ میں نے تو تیرے دل سے
س کا خوف نکالنے کے لیے یہ ترکیب بتائی تھی۔"

"اچھا!" میں نے اچھلنا بند کر دیا۔

"تو اس پر لیٹ کر دیکھ! اور بھی اچھا لگے گا۔"
سولدہ نے مجھے بچوں کی طرح سمجھایا۔

میں کچھ جھجکتے ہوئے گدے پر لیٹ گیا۔ اتنا
گداز' نرم اور آرام دہ تو وہ قالین بھی نہیں تھا جس پر
میں سرقوشی بیگی کے محل میں بیٹھا تھا۔ میں چت لیٹا
ہوا تھا۔ سولدہ بھی میرے برابر آ کر لیٹ گئی۔

اس نے میری طرف کروٹ لی' پھر بولی۔ "کیوں
اچھا لگا بوغا؟"

"ہاں بہت!" میں خوش ہو کر بولا' پھر کہا۔ "مگر تو
نے میرے بات کا جواب نہیں دیا۔"

"کس بات کا جواب؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کہ تو مجھے یہ گدا دے دے گی کہ نہیں؟" میں
نے اپنی بات دہرائی۔

"تو کیا کیا چیزیں لے گا بوغا! ابھی تو تجھے اس گدے
کے بارے ہی میں پتا چلا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔
"میرے پاس تو ایسی ایسی چیزیں ہیں کہ تیری عقل گم ہو
جائے۔ کیا تجھے یہ چیز پسند نہیں آئی؟" اس نے اپنی
متحرک مشعل کی طرف انگلی اٹھائی۔

"یہ یہ میں ہرگز نہیں لوں گا۔ اس میں تو جادو بند
ہے۔" میں گھبرا کر بولا۔

"اٹھ میں تجھے اس کا جادو سکھا دوں۔" اس نے
میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں! مجھے جادو نہیں سیکھنا میں شامان بننا نہیں
چاہتا۔" میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"تو اٹھ تو سہی!" اس نے مجھے زبردستی اٹھاتے
ہوئے کہا۔

"یقین کر بوغا! اس میں کوئی جادو بند نہیں۔ یہ بہت
معمولی چیز ہے۔"

میں مجبوراً اٹھا۔ سولدہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے
تھی۔ وہ مجھے متحرک مشعل کے قریب لے گئی۔

"یہ دیکھ!" اس نے متحرک مشعل کے ایک حصہ
کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے دبانے سے روشنی بند ہو
جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر وہ ابھرا
ہوا حصہ دبا دیا اور غار میں اندھیرا ہو گیا اور اسی وقت
میں نے دوبارہ اس کی آواز سنی۔ "اب میں اسے ایک
بار پھر دبا رہی ہوں۔ اب روشنی پھر آ جائے گی۔"

سولدہ کے الفاظ ختم ہونے سے پہلے ہی غار میں
روشنی ہو چکی تھی۔

"تو روشنی سمٹ کر اس میں بند ہو جاتی ہے؟" میں
نے متحرک مشعل کے نعل کو سمجھنے کے انداز میں
پوچھا۔

"ہاں تو ایسا ہی سمجھ لے!" سولدہ مسکرا کر بولی۔

"مگر تو نے بتایا ہے کہ یہی چیز دبانے سے روشنی
سمٹ کر اس میں بند ہو جاتی ہے تو پھر اسے دوبارہ دبانے
سے روشنی کیسے آ جاتی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اسے اسی طرح بنایا گیا ہے۔" سولدہ نے بتایا۔

"اسے سولدائیوں نے بنایا ہو گا۔" میں نے خیال
آرائی کی۔

"تو فی الحال اپنے دل کو سمجھانے کے لیے ایسا ہی
سمجھ لے۔" اس نے کہا' پھر بولی۔ "اچھا اب تو خود
روشنی بند کر اور دوبارہ جلا۔"

دل تو میرا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ میں خود اس متحرک
مشعل کو جلا بجھا کر دیکھوں مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔
سولدہ کے کہنے پر میں نے اپنا دل مضبوط کیا اور ہاتھ
آگے بڑھا کر اس سخت ابھار پر رکھ دیا' پھر ہتھیلی کا زور
لگایا۔ غار میں اندھیرا ہو گیا۔

"اب دوبارہ دبا!" سولدہ نے ہدایت کی۔
میں سختی سے اس ابھار کو دبائے ہوئے تھا۔ میں نے مزید زور لگایا مگر روشنی نہ ہوئی۔ میری ہتھیلی میں اب وہ ابھار چبھنے لگا تھا۔
"یہ یہ اور نہیں دبتا!" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا اسی وقت میں نے اپنے ہاتھ پر سولدہ کا ہاتھ محسوس کیا اور میں اچھل پڑا۔
"ارے اسے مزید دبانے کی کیا ضرورت ہے!" سولدہ نے اس ابھار پر سے میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔
میں نے ہاتھ ہٹا لیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی ہتھیلی سہلانے لگا۔
"اب دوبارہ اسے دبا!" سولدہ کی آواز سنائی دی۔
میں نے اندھیرے میں ہاتھ آگے بڑھایا مگر مجھے وہ ابھار نہ مل سکا۔ میرا ہاتھ کسی نرم چیز سے ٹکرایا۔
"ارے ارے یہ کیا کر رہا ہے بونا؟"
سولدہ کی آواز سن کر میں چونک پڑا اور اپنا ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے بولا۔ "مم ..... مجھے وہ ابھار نہیں مل رہا۔"
"لیکن تم مجھے کیوں ٹٹولنے لگے؟" وہ ہنس پڑی اور اسی کے ساتھ غار میں روشنی ہو گئی۔
"اچھا تو... تو میرا ہاتھ تیرے جسم سے ٹکرا گیا تھا!" میں سولدہ کی بات سن کر بدحواس سا ہو گیا کیونکہ میں نے اس سے پہلے کسی لڑکی کے جسم کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ میرے چہرے پر یقیناً بدحواسی اور شرمندگی کے تاثرات رہے ہوں گے۔
"اب لڑکیوں کی طرح تو نہ شرما بونا! ادھر آ میں تجھے سمجھاؤں۔" سولدہ نے نرمی سے کہا۔ "دیکھ ادھر دیکھ!" اس نے متحرک مشعل کے ابھار کی جانب ایک انگلی بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں طاقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ذرا سے دباؤ سے نیچے ہو جائے گا۔ ایک بار دبا کر ہاتھ ہٹانے کے بعد دوبارہ بھی اسے آہستہ سے ہی دبایا جاتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کئی بار مجھے متحرک مشعل جلا بجھا کر دکھائی، پھر بولی۔
"اب سمجھ گیا؟"
"ہاں!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی، کیونکہ اب میں واقعی اس متحرک مشعل کا فعل اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔
سولدہ نے مجھ سے کئی بار وہ متحرک مشعل جلوا کر بجھوائی اور مجھے اس بات پر شدید حیرت ہوئی کہ یہ کام تو بہت ہی آسان تھا۔ مجھے متحرک مشعل جلانے بجھانے میں ذرا بھی طاقت نہیں لگانی پڑتی تھی۔ میں کام سیکھ کر بہت خوش ہوا اور میرا دل چاہا کہ سولدہ سے وہ متحرک مشعل بھی مانگ لوں مگر میں نے ایسا نہیں کیا، آخر سولدہ کیا سوچتی!
"کیا تمہیں غار میں کسی طرح کی گھٹن کا احساس ہو رہا ہے؟ میری مراد اس گھٹن سے ہے جیسی عموماً غاروں میں ہوتی ہے۔" سولدہ نے پوچھا۔
"نہیں!" میں نے جواب دیا اور واقعی ایسا ہی تھا۔ "مجھے تو یہاں گھٹن کی بجائے ایک طرح کی تازگی کا احساس ہو رہا ہے جیسے میں کھلی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔"
"اسی لیے تمہیں یہ ہلکا ہلکا سا شور سنائی دے رہا ہے جو تمہیں پہلی بار سن کر تو فوراً محسوس ہو گیا تھا لیکن اب تمہارے کان اس کے عادی ہو گئے ہیں اس لیے تمہیں یہ شور زیادہ سنائی نہیں دے رہا۔"
سولدہ نے جو کچھ کہا تھا، سچ تھا۔ اب مجھے وہ ہلکا ہلکا شور برا نہیں لگ رہا تھا جیسے تیز ہوا چل رہی ہو۔ معاً میرے ذہن میں سولدہ کے ان دشمنوں کا خیال آیا جن کا اس نے خود ذکر کیا تھا۔
"کیا تم نے اپنے ان دشمنوں کو ہلاک کر دیا جو تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں!" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ہاں میں انہیں کچھ دن کے لیے دھوکا دینے میں ضرور کامیاب ہو گئی ہوں۔ آج کل وہ مجھے اٹھارھویں صدی میں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔"
"اٹھارھویں صدی کیا؟" میں نے ایک نئی بات سنی تو پوچھا۔
"تم نہیں سمجھ پاؤ گے، پھر کبھی فرصت سے بتاؤں گی۔" اس نے جواب دیا، پھر بولی۔ "ہاں تم بتاؤ تم پر کیا گزری؟"

"تو مجھے حیرت سے کیا دیکھ رہا ہے بوغا! میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا؟" سولدہ بولی۔

"میں یہ کیسے مان لوں کہ تجھے میرے بارے میں کچھ علم نہ ہوگا؟" میں نے کہا۔

"سچ جان بوغا کہ مجھے نہیں معلوم!" سولدہ نے اس طرح کہا کہ مجھے اس کی بات پر یقین سا آگیا۔ اس کے لہجے میں سچائی اور خلوص تھا۔

میں نے مختصراً اسے اپنی بپتا سنا دی۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تو بہت ذہین اور تیز ہو گیا ہے۔" اس نے میری پوری داستان سن کر تبصرہ کیا۔ "تیری جگہ کوئی اور ہوتا تو جی چھوڑ بیٹھتا۔"

"اب میں باتو خاں کا پیغام لے کر قوبوق کی ماں ملکہ توراکینہ کے پاس جا رہا تھا۔" میں نے اسے بتایا۔

"اوغول غائش اور ملک توراکینہ، منگو کو خاقان بنتا نہیں دیکھنا چاہتیں۔ ان کی خواہش ہے کہ خاقان انہی کے خاندان سے منتخب ہو۔"

"ان کی بات تو چھوڑ! تو بتا کہ کیا چاہتا ہے؟" سولدہ نے دریافت کیا۔

"خاقان منگو بنے یا کوئی اور، میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے جواب دیا۔ "تجھے معلوم ہے کہ میں تو ان میں پھوٹ ڈالنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو خیر ان کا مقدر ہے مگر میں فی الحال کچھ اور چاہتی ہوں۔" سولدہ بولی۔

"کیا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں نے ابھی کچھ دیر پہلے جو ہنسی ہنسی میں تجھ سے کہا تھا اب میں اس پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"میں نہیں سمجھا سولدہ کہ تیری بات کا مقصد کیا ہے۔؟" میں نے کہا۔

"میں ایک تجربہ کر کے اس کے نتائج دیکھنا چاہتی ہوں۔" سولدہ بولی۔ "میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ میں نے ٹھیک سوچا ہے یا غلط!"

"کچھ بتا تو صحیح کہ بات کیا ہے؟" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"میں اپنے ساتھ تجھے کسی اور زمانے میں لے جانا چاہتی ہوں۔" سولدہ نے جواب دیا۔

میری الجھن اور بڑھ گئی "اور زمانے میں؟" میں حیرت سے بولا۔ "کیا اس زمانے کے علاوہ بھی کوئی اور زمانہ ہے؟ میری سمجھ میں تیری بات بالکل بھی نہیں آئی۔"

"تو ابھی سمجھ نہیں سکے گا۔" سولدہ نے کہا۔

"لیکن گھوڑا تو ایک ہی ہے۔ تجھے میرے گھوڑے پر بیٹھ کر چلنا پڑے گا۔" میں بولا، پھر مجھے یہ بات یاد آگئی کہ میرے پاس شہباز کی لوح ہے۔ کسی بھی یام (سرائے) سے لوح دکھا کر ایک اور گھوڑا لیا جا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے کہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

سولدہ ایک دم زور سے ہنس پڑی تھی "کسی اور زمانے میں جانے کے لیے گھوڑا!" اس نے ہنسی کے دوران میں کہا اور دوبارہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

میں کچھ بھی نہ سمجھ پایا کہ آخر میں نے ایسی کیا مضحکہ خیز بات کہہ دی ہے جس پر وہ اس قدر ہنس رہی ہے! میں اسے حیرت سے دیکھے جا رہا تھا۔

"تو نے کمال کر دیا بوغا!" وہ اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"آخر ہوا کیا؟ کیا کمال کر دیا میں نے؟" میں نے کسی قدر الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں کہ میں تجھے کسی طرح سمجھا پاؤں گی یا نہیں!" وہ ہنستے ہوئے بولی، پھر کہا۔ "اچھا یہ بتا کہ تو نے مجھے غائب ہوتے دیکھا تھا؟"

"کس وقت؟" میں اس کی باتوں سے الجھ رہا تھا۔

"اس وقت جب میرے دشمن میرا تعاقب کرتے ہوئے غار تک آپہنچے تھے اور میں تجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔" اس نے بتایا۔

"ہاں میں نے دیکھا تھا۔" میں نے فوراً کہا۔ "تو جیسے دھواں بن کر غائب ہو گئی تھی۔"

"تو اب بھی ایسا ہی ہو گا۔" سولدہ نے مجھے سمجھایا۔

"تو کیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ دھواں بنا کر لے اڑے گی؟" مجھے اس کی بات سن کر خوف آنے لگا۔

"یہ تو خیر تیرے محسوسات ہیں کہ میں دھواں بن کر غائب ہو گئی تھی لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ تو دھواں نہیں بنے گا۔" سولدہ مسکراتے ہوئے بولی۔

معاً مجھے اس پیغام کا خیال آیا جو مجھے ملکہ تورا کینہ تک پہنچانا تھا۔

"کیا سوچنے لگا تو؟" سولدہ نے مجھے خاموش دیکھ کر مخاطب کیا۔

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تیرے ساتھ چلا گیا تو اس پیغام کا کیا ہو گا جو میرے پاس ہے اور جسے ملکہ تورا کینہ تک پہنچانا میری ذمے داری ہے۔" میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"تو پھر ایسا کر کہ تو پیغام پہنچا کر دوبارہ یہاں آجا۔" سولدہ نے تجویز پیش کی۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، پھر پوچھا۔ "تو مجھے جہاں تک لے جانا چاہتی ہے، وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟ وہاں تک کتنی منزلیں ہوں گی؟"

میں نے دیکھا کہ میری بات سن کر وہ پھر اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "ہمارے راستے میں کوئی منزل نہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ دور نہیں جانا۔" میں مطمئن لہجے میں بولا اور اس بار وہ اپنی ہنسی نہیں روک سکی۔

اس نے ہنستے ہوئے ہی کہا۔ "تیری باتیں سن کر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی معصوم اور بھولے بھالے بچے سے بات کر رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے کو خاموش ہو گئی، پھر سنجیدگی سے بولی۔ "دیکھ بوغا! بہت سی باتیں ایسی ہیں جنہیں ابھی تو نہیں سمجھ پائے گا۔ میں سمجھانا بھی چاہوں گی تو وہ باتیں تیری سمجھ میں نہیں آسکیں گی اس لیے زیادہ سوال جواب نہ کیا کر، رفتہ رفتہ تو خود سب کچھ سمجھنے لگے گا۔"

سولدہ کے لہجے میں محبت کی مٹھاس تھی۔ میں نے بغیر کوئی اعتراض کیے اس کی بات مان لی اور بولا۔ "ٹھیک ہے، اب میں ایسا ہی کروں گا۔"

کچھ دیر بعد ہی میں سولدہ سے اجازت لے کر ا
گھوڑے کی لگام تھامے اس غار سے باہر نکل رہا تھا
سولدہ مجھے غار کے دہانے تک چھوڑنے آئی تھی۔

"کسی چکر میں نہ پھنس جانا اور جلد لوٹ کر آنا"
سولدہ نے مجھے رخصت کرتے ہوئے تاکید کی تھی۔

"میں ہوشیار رہوں گا۔" میں نے جواب دیا تھا
اس پر الوداعی نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

غار سے باہر نکل کر مجھے ایک دم گرمی اور حبس کا
احساس ہوا تھا۔ غار میں تازگی اور ٹھنڈک تھی لیکن
کچھ فاصلہ طے کر کے میں غار کی ٹھنڈک کو بھول گیا
اب میری آنکھوں میں وہ چہرے گھوم رہے تھے جن
سے قراقرم میں واسطہ پڑنے والا تھا۔

میں بورخان قالدون سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو
اور گھوڑے کو بستی کی طرف ڈال دیا۔

مجھے دور ہی سے بستی کے آثار نظر آنے لگے تھے
وہ بستی جہاں میں پیدا ہوا تھا، ہوش سنبھالا تھا اور جوان
ہوا تھا۔ وہ بستی جہاں ملکہ تورا کینہ تھی، اوغول
غانمش تھی، میرا باپ چنکائی تھا، بغورچی شامان
اور وہ بہت سے آشنا چہرے تھے جن سے مجھے نفرت
تھی۔

بستی کی مانوس فضا میں داخل ہونے کے بعد میری
نظر کئی ایسے افراد پر پڑی جنہیں میں اچھی طرح جانتا
تھا مگر میں نہ رکا اور میرا گھوڑا ملکہ تورا کینہ کے محل کی
طرف دوڑتا رہا۔

میں آخر کار اس محل کے دروازے پر پہنچ گیا جس
میں کبھی چھوٹی ماں فاطمہ رہتی تھی اور میں اس سے
ملنے آیا کرتا تھا۔ چھوٹی ماں کا چہرہ میری آنکھوں میں
گھوم گیا اور اسی کے ساتھ ہی میرے خون کی حرارت
بڑھ گئی۔

میں گھوڑے سے اترا اور محل کے دروازے پر
موجود کلہاڑہ برداروں کی طرف بڑھا جنہوں نے مجھے
خشونت سے دیکھا۔ میں نے اپنے لباس سے شہباز کی
لوح نکال کر ہاتھ میں لے لی اور ان کے قریب پہنچ کر
لوح ان کے سامنے کر دی۔

"میں مغربی دشت سے آیا ہوں اور ملکہ تورا کینہ

کے لیے مغربی دشت کے آقا سائیں خاں کا پیغام لایا ہوں۔" میں نے کلہاڑہ برداروں میں سے ایک کو مخاطب کیا۔

اس کلہاڑہ بردار کی آنکھوں میں میرے لیے اجنبیت نہیں تھی اور میں بھی اسے کچھ کچھ پہچان رہا تھا۔ وہ یقیناً" محل کے قدیم محافظوں میں سے تھا۔

"کیا تو بطریق بوغا ہے؟" کلہاڑہ بردار نے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا تو وہی نہیں ہے جسے مرنے کے لیے گڑھے میں ڈال دیا گیا تھا اور پھر۔"

"میں کبھی بطریق بوغا تھا مگر اب میں صرف سائیں خاں کا قاصد ہوں۔" میں نے کلہاڑہ بردار کی بات کاٹ کر کہا۔

"تو میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ تو وہی ہے جسے ہم نے کبھی خاقان قویوق کے حکم پر گرفتار کیا تھا۔" کلہاڑہ بردار محافظ پھر بولا اور اس بار دو دوسرے محافظوں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اگر میں بطریق بوغا بھی ہوں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے!" میں نے بے خوفی سے کہا۔

"ہاں اب کوئی فرق نہیں پڑتا' کیونکہ تیرے پاس شہبازی کی لوح ہے۔" کلہاڑہ بردار بولا' پھر کہا۔ "اچھا تو یہیں ٹھہر میں ملکہ تورا کینہ کو تیری آمد سے مطلع کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کلہاڑہ بردار محل کے اندر چلا گیا۔

میرے ذہن میں وہ تمام باتیں چکرانے لگیں جو میں نے وہاں پہنچنے سے پہلے راستے میں سوچی تھیں۔ ملکہ تورا کینہ مجھ سے واقف تھی۔ وہ پہلے بھی مجھے ذہین اور سمجھدار کہا کرتی تھی۔ اگر میں کسی طرح اس کے ذہن میں اس خیال کو مزید پختہ کر دوں کہ سرقوشنی بیگی کے بیٹوں کی بجائے بھورے نمدے کی مسند پر اوغدائی کے خاندان کا زیادہ حق ہے تو وہ سرقوشنی بیگی کے مقابلے پر ڈٹی رہے گی۔ اس طرح ایک نئی جنگ کے لیے راہ ہموار ہو سکتی تھی۔

میں انہی خیالوں میں کھویا رہا اور کلہاڑہ بردار محافظ محل کے اندر سے لوٹ آیا۔

"چل وہ تجھے بلا رہی ہے۔" کلہاڑہ بردار نے مجھ سے کہا۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ جانے پہچانے راستوں پر آگے بڑھا اور مختلف راہداریوں سے گزرتا ہوا اس جگہ تک پہنچا جہاں ملکہ تورا کینہ ملاقاتیوں سے ملتی تھی۔ کلہاڑہ بردار محافظ مجھے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا اور میں بے جھجک کمرے میں داخل ہو گیا۔

مجھے سامنے ہی ملکہ تورا کینہ ایک مسند پر بیٹھی نظر آئی مگر وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کی دائیں جانب اوغول غانمش موجود تھی اور اس کے سامنے تین افراد مودب بیٹھے ہوئے تھے جن کی پشت میری جانب تھیں۔

"تیرا علم سچا ہے بغورچی! تو ٹھیک ہی کہتا تھا۔" معاً" میری سماعت سے ملکہ تورا کینہ کی آواز ٹکرائی اور میں چونک پڑا میں اتنا بدحواس ہوا کہ ملکہ تورا کینہ کو تعظیم دینا بھی بھول گیا۔

اسی وقت ملکہ تورا کینہ کے سامنے بیٹھے ہوئے افراد میں سے ایک نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ وہ شامان بغورچی ہی کا چہرہ تھا جس پر نفرت اور حقارت لکھی تھی۔ اچانک اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

"بوغا! ملکہ کو تعظیم دے!" اس کی آواز میں حکم تھا۔

میں جیسے ہوش میں آگیا۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے سر سے ٹوپی اتار دی اور سر جھکا دیا۔ اس کے بعد میں اٹھا اور اپنے لباس سے وہ پیغام نکالا جو باتو خاں نے ملکہ تورا کینہ کے لیے بھیجا تھا۔ میں ادب کے ساتھ آگے بڑھا اور وہ پیغام ملکہ کے قدموں میں رکھ کر مودب کھڑا ہو گیا۔

"بغورچی! پیغام کھول کر سنا۔" ملکہ تورا کینہ نے حکم دیا۔

بغورچی نے آگے بڑھ کر وہ پیغام ملکہ تورا کینہ کے قدموں سے اٹھا لیا لیکن اسے کھولا نہیں۔ وہ پیغام ہاتھوں میں لیے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

"میں نے تجھے پیغام پڑھنے کا حکم دیا تھا بغورچی!" ملکہ تورا کینہ نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔

"اے ملکہ! میں تیرے ہی حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔" بغورچی سر جھکا کر بولا۔ "دراصل میں تجھے اپنے علم کی

ایک اور نشانی دکھانا چاہتا تھا۔"

"صاف بات کر! میں تیرا مطلب نہیں سمجھی۔" ملکہ تورا کینہ کے لہجے میں اب بھی سختی تھی۔

"میں یہ پیغام کھولے بغیر لفظ بہ لفظ تجھے پڑھ کر سنا سکتا ہوں' اے ملکہ۔" بغورچی نے کہا اور اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ آگئی۔

"تو جانتا ہے کہ میرے سامنے غلط دعوے کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟" ملکہ تورا کینہ نے بغورچی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں اے ملکہ! بغورچی جانتا ہے۔" اس نے کہا۔ پھر بولا۔ کیا میں نے یہ سچ نہ کہا تھا کہ بوغا' مغربی دشت سے باتو خاں کا پیام لے کر آرہا ہے؟ کیا میں نے یہ بھی سچ نہ کہا تھا کہ۔۔۔"

"پچھلی باتیں نہ دہرا!" ملکہ تورا کینہ نے بغورچی کی بات کاٹ دی۔ "تو نے دعویٰ کیا ہے کہ تو یہ پیغام کھولے بغیر لفظ بہ لفظ پڑھ سکتا ہے تو پڑھ!"

بغورچی پھر چند لمحے کچھ بڑبڑایا' اور پھر وہ با آواز بلند پیغام پر اپنی نگاہ گڑائے بولنے لگا۔ میں وہ پیغام پہلے ہی سن چکا تھا اس لیے جان گیا کہ بغورچی نے غلط دعویٰ نہیں کیا تھا۔

بغورچی کے خاموش ہوتے ہی ملکہ تورا کینہ بولی۔ "اب یہ پیغام شامان راہون کو دے دے!"

بغورچی نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف پیغام بڑھا دیا۔ اس شخص نے پیغام لے لیا۔

"شامان راہون! یہ پیغام کھول کر بلند آواز میں سنا!" ملکہ تورا کینہ نے حکم دیا۔

شامان راہون نے پیغام کھولا اور بلند آواز میں پڑھنے لگا پیغام لفظ بہ لفظ وہی تھا جو بغورچی نے سنایا تھا۔

"اے خاندان زریں کی عظیم ملکہ اور اے عظیم خاقان کی عظیم ماں! تجھے اب یقین آیا کہ شامان بغورچی کا علم سچا ہے؟" گفتگو کے دوران میں پہلی بار میں نے قویوق کی بیوہ اوغول غانمش کی کریہہ آواز سنی۔

"ہاں مجھے یقین آگیا اے اوغول! اب میں اس کی باتوں پر کان دھروں گی۔" ملکہ تورا کینہ نے کہا۔

"تو کیا اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ مرنے والے خاقان کے حکم کا احترام کیا جائے اور باتو خاں کا پیغام لے کر آنے والے بوغا کو گرفتار کر لیا جائے' کیونکہ وہ مجرم ہے اور اسے بہت پہلے موت کی سزا سنائی جا چکی تھی؟"

اوغول غانمش کے کہے ہوئے غلط لفظ میرے کانوں میں جیسے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اترے اور میں اچھل پڑا اب میں بغورچی کا سارا کھیل سمجھ چکا تھا۔ اس نے مجھ سے انتقام لینے ہی کے لیے یہ سارا جال بچھایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ملکہ تورا کینہ' اوغول غانمش کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"لیکن یہ ہمارے پاس باتو خاں کا قاصد بن کر آیا ہے۔" کچھ دیر بعد ملکہ تورا کینہ بولی۔ "اسے مار دینا یاسا کے خلاف ہو گا۔ یاسا میں صاف کہا گیا ہے کہ قاصدوں کو نہ مارا جائے۔ اگر یہ باتو خاں کا پیغام لے کر نہ آیا ہوتا اور اس کے پاس شہباز کی لوح نہ ہوتی تو میں ابھی اسے ہلاک کرا دیتی۔"

ملکہ تورا کینہ کی بات سن کر اوغول غانمش کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے مگر وہ زبان سے کچھ نہ بولی۔ تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی اور اس خاموشی میں مجھے موت کے قدموں کی آہٹ سی سنائی دی۔

"صرف ایک بات ممکن ہے۔" معاً" دوبارہ ملکہ تورا کینہ کی آواز سنائی دی۔ "وہ یہ کہ اسے فوراً" بستی سے نکل جانے کا حکم دے دیا جائے۔"

صورت حال ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میں جو کچھ سوچ کر آیا تھا' اس پر عمل کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ بغورچی نے حالات کو میرے خلاف کر دیا تھا۔ اس صورت میں بھلا میں کس طرح ملکہ تورا کینہ کے سرقوشنی بیگی کے خلاف بھڑکا سکتا تھا! مجھے تو خود اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

"میں ایک بار پھر ملکہ سے یہی التجا کروں گی کہ اسے قتل کر دیا جائے۔" اوغول غانمش پھر بولی۔ اس نے اپنا جملہ ادا کرتے ہوئے میری جانب انگلی اٹھائی تھی۔

"نہیں!" ملکہ تورا کینہ کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ "یہ دانشمندی نہیں! اس سے حالات بگڑ بھی سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "تو اسی وقت قراقرم سے نکل جا! اگر تو دن کے تیسرے پہر سے پہلے بستی سے باہر نہ نکلا تو تجھے قتل کر دیا جائے گا۔ یہاں موجود افراد گواہ رہیں گے کہ میں نے تجھے مہلت دی تھی۔"

میں اپنی زندگی بچ جانے پر فوراً اس کے سامنے جھکا اور بولا "اے عظیم ملکہ! میں تیرے حکم کی فوراً تعمیل کروں گا۔" یہ کہتے ہی میں الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور کمرے سے نکل آیا۔

محل سے باہر نکلنے میں میں نے انتہائی تیزی دکھائی تھی یہ ضروری تو نہیں تھا کہ ملکہ تورا کینہ اپنی بات پر قائم رہتی۔

میں محل کے باہر موجود اپنے گھوڑے پر بیٹھا اور تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ سرائے باتو سے روانہ ہوتے وقت سرقوشنی بیگی نے مجھ سے قراقرم ہی میں رہنے کے لیے کہا تھا اس وقت تک کے لیے جب تک وہ خود اپنا اولوس (لشکر) نے کر وہاں نہ پہنچ جائے مگر ان حالات میں میرے پاس قراقرم ہی میں قیام کا کوئی جواز نہیں تھا اور یوں بھی سولدہ مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتی تھی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں سولدہ کی مدد کے بغیر اپنا انتقام نہیں لے سکوں گا اس لیے ضروری تھا کہ میں اس کی بات مان لیتا۔ اس کے علاوہ میں خود بھی اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا کیونکہ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کی دوبارہ واپسی کے بعد ایک بار پھر میرے دل میں عجیب عجیب سے جذبات جاگ اٹھے تھے۔

میں ابھی بستی سے باہر نہ نکل پایا تھا کہ میں نے اپنے پیچھے ایک تیز رفتار گھڑ سوار کو آتے دیکھا۔ میں چوکنا ہو گیا اور نیام سے اپنی تلوار نکال کر ہاتھ میں لے لی مگر گھوڑے کو اسی رفتار سے بھگاتا رہا۔

پیچھے آنے والے شخص کے گھوڑے کی رفتار بہت تیز تھی اس لیے وہ بہت جلد میرے قریب پہنچ گیا اور میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا وہ میری ماں کا دوسرا شوہر چنکائی تھا۔

"تجھے شرم نہ آئی بوغا کہ تو مجھ سے ملے بغیر بستی سے لوٹ رہا تھا۔" چنکائی نے غصے اور نفرت سے کہا۔ "کیا تو بھول گیا کہ میں تیرا باپ ہوں؟ کیا تجھے یاد نہ رہا کہ تو مجھ سے پیدا ہے؟"

اب میں نے اپنا گھوڑا روک لیا تھا۔ چنکائی کا گھوڑا بھی برابر ہی آ کر رک گیا تھا۔ اس کی بات کا بھلا میں کیا جواب دیتا! اس لیے خاموش رہا۔ اس کی آمد کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ کیا وہ واقعی مجھ سے ملنے کے لیے اتنا ہی بیتاب تھا؟ میں سوچ رہا تھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے شامان بغورچی میرے پاس آیا تھا۔ وہ ملکہ تورا کینہ کے محل سے آ رہا تھا۔" چنکائی مجھے خاموش دیکھ کر پھر بولا۔ "اسی نے مجھے تیرے بارے میں بتایا تھا اور میں تجھ سے ملنے دوڑ پڑا تھا۔"

بغورچی کے ذکر نے میری ساری الجھن دور کر دی۔ میں چنکائی کا مقصد سمجھ گیا اور مجھے چنکائی سے نفرت محسوس ہوئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "تجھے بغورچی نے یہ نہیں بتایا کہ ملکہ تورا کینہ نے مجھے کیا حکم دیا ہے؟" میری آواز میں چبھن تھی۔

"نہیں!" چنکائی بولا اور اس کے لہجے سے مجھے صاف پتا چل گیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں تو بس یہ سنتے ہی روانہ ہو گیا تھا کہ تو یہاں آ کر فوراً واپس جا رہا ہے۔"

"تو پھر سن کہ ملکہ تورا کینہ نے مجھے کیا حکم دیا ہے!" میں نے کہا۔

"اس کا حکم ہے کہ میں دن کے تیسرے پہر سے پہلے بستی سے باہر نکل جاؤں ورنہ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔"

"اچھا!" چنکائی نے اس طرح کہا جیسے اسے حیرت ہوئی تھی لیکن میں اس کے مکر کو پہچان گیا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہ کر پھر بولا۔

"بوغا! یہ حکم واپس بھی ہو سکتا ہے۔ بغورچی کی محل میں بڑی پہنچ ہے میں چاہتا ہوں کہ تو کچھ دن میرے ساتھ رہ! بول کیا تو راضی ہے؟"

"نہیں!" میں نے تلخی سے جواب دیا۔

"کیوں؟" اس کے لہجے میں بھی تلخی آ گئی۔

"اس لیے کہ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔" میں بھی ترکی بہ ترکی بولا۔

"اس وقت نہ جانے میرا وہ خوف کہاں چلا گیا تھا جو ہمیشہ چنکائی کو اپنے سامنے پا کر مجھ پر مسلط ہو جاتا تھا۔"

"کیا تیرا خون سفید ہو گیا ہے بوغا؟ تجھے اپنے باپ سے محبت نہیں؟" چنکائی کا لہجہ اس بار نرم تھا۔

"میرا خون نہیں تیرا خون سفید ہو گیا ہے جو تو بغورچی کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے۔" میں نے بے خوفی سے کہہ دیا۔

"تو کیا تو میرے ساتھ واپس نہیں چلے گا؟" چنکائی کے لہجے میں پھر سختی آ گئی۔

"تو مجھے مرنے پر مجبور نہیں کر سکتا!" میں نے زندگی میں پہلی بار چنکائی سے آنکھیں ملائیں۔

"نگاہ نیچی کر!" چنکائی دہاڑا۔

جب ایک بار دل سے کسی کا خوف نکل جائے تو پھر کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے نگاہ نیچی نہ کی اور بولا۔ "اب تو مجھے نہیں دھمکا سکتا! میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔"

میری بات سن کر چنکائی غصے سے بپھر گیا اور مجھے ننگی ننگی گالیاں دینے لگا' پھر اس نے مجھے مارنے کو ہاتھ اٹھایا اور اسی وقت میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

چنکائی شاید سمجھ چکا تھا کہ اب میں اس کے رعب میں نہیں آؤں گا اسی لیے غالباً" اس نے میرا تعاقب نہیں کیا۔ اسے یقیناً" یہ احساس بھی رہا ہو گا کہ وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ بستی میں واپس نہیں لے جا سکتا' کیونکہ میں جوان تھا اور وہ بوڑھا۔ وہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

شامان بغورچی کی آخری چال بھی ناکام ہو گئی۔ میں نے سوچا اور ہنس دیا۔ میرا گھوڑا اب تیزی کے ساتھ طاقت کے پہاڑ بورخان قالدون کی طرف دوڑ رہا تھا۔

میں پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر گھوڑے سے اتر گیا' اور پھر اس کی باگ تھام کر اوپر چڑھنے لگا۔

مجھے اس غار تک پہنچنے میں دقت نہ ہوئی جہاں میں نے سولدہ کو چھوڑا تھا' کیونکہ جاتے وقت میں اچھی طرح اردگرد کا جائزہ لیا تھا تاکہ مجھے وہ غار یاد رہے۔

میں گھوڑے کی لگام تھامے غار میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ غار خالی تھا سولدہ کی متحرک مشعل اس طرح روشن تھی۔ ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دے رہا تھا اور وہ ٹھنڈک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ سب کچھ اسی طرح تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا مگر سولدہ نہیں تھی۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے۔ میں سوچنے لگا کہ کیا سولدہ کے دشمنوں نے اسے پھر تلاش کر لیا؟ کیا سولدہ پھر ایک طویل عرصے کے لیے غائب ہو گئی؟ میں کافی دیر انہی خیالوں میں گھرا ہوا گھوڑے کی لگام تھامے ایک ہی جگہ کھڑا رہا۔ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ میں سوچ رہا تھا۔ کیا میں سولدہ کا انتظار کروں؟ پہلے بھی تو میں نے اس کا بہت انتظار کیا تھا مگر وہ نہیں لوٹی تھی۔ کہیں اس بار ایسا نہ ہو۔ میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا' اور پھر آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے کم از کم ایک دن اس کا انتظار ضرور کرنا چاہیے۔ کیا خبر وہ لوٹ ہی آئے۔

گھوڑے کی پشت سے وہ تھیلا بندھا ہوا تھا جس میں سوکھا ہوا گوشت اب بھی موجود تھا اور دوسرے تھیلے میں گھوڑی کا دودھ بھی تھا۔ میں آسانی کے ساتھ بغیر بھوکا رہے ایک دن اس کا انتظار کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر دوسرے دن صبح تک سولدہ نہ لوٹی تو میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ ضرور کر لوں گا۔ یہ تو طے تھا کہ میں قراقرم کی طرف واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس صورت میں میرے لیے صرف ایک ہی راہ تھی کہ میں دوبارہ سرائے باتو کے لیے روانہ ہو جاتا تاکہ کم سے کم سرقوشی بیگی کے ساتھ رہ کر اپنے آئندہ منصوبوں پر عمل کر سکتا۔

میں نے یہ سوچ کر گھوڑے کو کونے میں ایک کیل سے باندھا اور اس کی پشت سے تھیلے کھولنے لگا کیونکہ اب مجھے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔

گھوڑے کی پشت سے تھیلے کھول کر میں نے گدے پر رکھ دیے اور خود بھی گدے پر بیٹھنے لگا کہ اسی وقت

چونک پڑا۔ میں نے لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سنی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سولدہ غار میں موجود تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی مجھے ایک تھیلا نما سی چیز نظر آ رہی تھی جس میں کچھ بھرا ہوا تھا۔

"تم آ گئے لوٹ کر!" وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے بولی اور میری طرف بڑھی۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "لیکن تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"کھانے کا بندوبست کرنے گئی تھی۔" اس نے قریب آ کر وہ تھیلا میرے قریب رکھ دیا اور گدے پر بیٹھ گئی۔ "میں نے اپنی دانست میں جلد آنے کی کوشش۔۔۔"

"اس میں کیا ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر تھیلے نما شے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کھانا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے تھیلے نما چیز میں ہاتھ ڈالا اور دو چوکور سے ڈبے نکالے پھر اس نے ان میں ایک ڈبہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ایسا کھانا تم نے شاید پہلے نہیں کھایا ہو گا۔"

میں کچھ نہ بولا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"لے کھا!" اس نے ایک ڈبہ میرے سامنے کھول کر رکھ اور دوسرا اپنے سامنے رکھ لیا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا چیز ہے؟" میں نے ڈبے کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"کھانا ہے اور کیا۔" وہ ڈبے میں سے ایک لمبی سی چیز نکال کر منہ کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔

میں نے بھی اس کی تقلید میں کھانا شروع کر دیا۔ عجب پھیکا پھیکا سا اور بے مزہ سا کھانا تھا۔ میں بولا۔ "میرا یہ سوکھا ہوا گوشت ہے۔ میں وہ کھاؤں گا۔ یہ کھانا مجھے اچھا نہیں لگا۔"

"تیری مرضی!" وہ منہ چلاتی ہوئی بولی۔ "ویسے میں تمہیں جہاں لے جانے والی ہوں وہاں تمہیں یہی کھانا ملے گا۔"

"تب تو بڑی مشکل ہو گی۔" میں نے وہ تھیلا کھولتے ہوئے کہا جس میں سوکھا ہوا گوشت تھا۔

"مشکل کی کوئی بات نہیں۔" سولدہ نے کہا۔ "شروع شروع میں مجھے بھی مختلف زمانوں کے کھانے کھاتے ہوئے بدمزگی کا احساس ہوتا تھا لیکن اب میں ہر زمانے کا کھانا مزے لے لے کر کھاتی ہوں۔ ذرا اپنا سوکھا ہوا گوشت تو چکھا! میں نے بہت دن سے نہیں کھایا۔"

میں نے گوشت کا ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھا دیا اور وہ بالکل اسی طرح کھانے لگی جیسے میں کھا رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے کھوڑی کا دودھ پیا اور سولدہ نے گدے کی ایک جانب رکھا ہوا کوئی لمبا سا برتن اٹھا لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس برتن کا منہ ایک ڈھکنے سے بند تھا۔ سولدہ نے وہ ڈھکنا کھا کر کھولا، پھر وہ چیز نکالی جو اس برتن کے چھوٹے سے منہ میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک عجیب سی چیز کا بنا ہوا دوسرا برتن اٹھا کر اس میں لمبے برتن کو انڈیلا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لمبے ڈھکنے دار برتن میں پانی تھا۔

"تو پانی کو اتنی احتیاط سے اور اتنے پردے میں سنبھال کر کیوں رکھتی ہے؟" میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"اس میں پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔" سولدہ نے بتایا اور پانی پینے لگی۔

"مگر کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

"بس یوں سمجھ لے کہ رہتا ہے۔ یہ اسی لیے بنایا گیا ہے۔ لے تو بھی پی کر دیکھ۔" اس نے وہ لمبا برتن اور دوسرا برتن میری طرف بڑھا دیا۔

"تو خود دے دے۔" میں اس کے پراسرار سامان کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کچھ ڈر محسوس کر رہا تھا۔

اس نے مجھے پانی انڈیل کر دیا۔ میں نے پانی ہونٹوں سے لگایا۔ تو واقعی وہ بہت ٹھنڈا تھا۔ میں نے پانی پی کر برتن واپس کرتے ہوئے کہا۔ "واقعی تو ٹھیک کہتی تھی۔"

کھانا کھا کر وہ گدے پر لیٹ گئی اور مجھے ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ ہی لٹایا۔ پھر بولی۔ "تو کچھ دیر بعد اس گھوڑے کو غار سے باہر چھوڑ آنا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اس لیے کہ یہ یہاں بندھا بندھا بھوکا مرجائے گا۔ کیا خبر ہماری واپسی کب ہو۔" وہ بولی۔

مجھے اس کی بات بڑی عجیب سی لگی۔ نہ جانے وہ مجھے کس طرح اپنے ساتھ سفر پر لے جانا چاہتی تھی۔ گھوڑا ساتھ ہوتا تو کم سے کم مجھے یہ سہارا تو ہوتا کہ سفر میں دقت نہیں ہوگی لیکن اسی وقت مجھے وہ بات یاد آگئی جو اس نے پہلے بتائی تھی۔ وہ بات یاد آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ مجھے دھواں بنا کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ یہ احساس میرے لیے بڑا خوفزدہ کردینے والا تھا کہ میرا جسم دھواں بننے والے تھا۔

میں نے کچھ سوچ کر اسے مخاطب کیا۔ "تو نے ابھی کہا ہے کہ واپسی کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر مجھے اپنے ساتھ نہ لے۔ تو جانتی ہے کہ مجھے منگولوں سے انتقام بھی لینا ہے۔"

"تو میں تجھے انتقام سے کب روک رہی ہوں۔" سولدہ نے کہا۔ "جب وہاں تیرا دل نہ لگے تو بتادینا۔ میں تجھے تیرے زمانے میں چھوڑ جاؤں گی۔"

"سولدہ! کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم ساتھ ساتھ رہیں؟" میں نے اس کے حسین چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "تجھ سے بچھڑنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"میں خود تجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں لیکن تو ہے کہ بات بات پر ڈر جاتا ہے۔ ذرا اپنے اندر ہمت پیدا کر۔ تو آخر مرد ہے۔"

"نہیں تو شاید میرا مطلب نہیں سمجھی۔" میں جلدی سے بولا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ تو بھی اب کہیں نہ جا بلکہ یہیں میرے ساتھ رہ۔"

"تو آخر ایسا کیوں چاہتا ہے؟" اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس میرا دل۔۔۔ میرا دل چاہتا ہے کہ۔۔۔ کہ میں۔۔۔ تجھے دیکھے جاؤں۔۔۔ دیکھے جاؤں اور۔۔۔ اور تو سامنے۔۔۔ میرے سامنے بیٹھی رہ!" میں نے رک رک کر اپنی خواہش بیان کردی۔

وہ ہنس پڑی۔ "بس اتنی سی بات!" اس نے میری طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" میں نے گردن ہلادی۔

"اور کچھ نہیں چاہتا تو؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں کیونکہ میں پہلے ہی اس کی طرف کروٹ لیے لیٹا ہوا تھا۔

اس وقت میرا دل چاہا کہ میں سولدہ کو بالکل اس طرح اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگالوں جس طرح میں نے ایک بار چنکائی کو اپنی ماں سے لپٹتے ہوئے دیکھا تھا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ ہوئی۔

"کیا سوچنے لگا؟" اس نے مجھے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا اور نظر جھکالی۔

"تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" یہ کہہ کر اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"میرے دل میں۔۔۔ دل میں جانے۔۔۔ کیا کیا آتا ہے۔۔۔ لیکن تو۔۔۔ تو سولدہ ہے ورنہ۔۔۔ ورنہ میں تجھے۔۔۔" میں کوشش اور ہمت کے باوجود اپنا جملہ پورا نہ کرسکا۔

"ورنہ تو کیا کرتا؟" سولدہ نے خواب آلود سی آواز میں سوال کیا۔

"ورنہ میں تجھے اپنے بازوؤں میں لے کر اتنی زور سے۔۔۔" میں ایک جوش کے عالم میں کہتا چلا گیا مگر ایک بار پھر میری زبان گنگ ہوگئی۔

"اپنا جملہ پورا کر بوغا! میں تیری پوری بات سننا چاہتی ہوں۔" سولدہ کی آواز جیسے مجھے کہیں بہت دور سے آتی سنائی دی۔

"میں تجھے اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگالیتا۔" میں تیزی کے ساتھ کہہ گیا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں تاکہ اس سے نگاہ نہ ملے۔ مجھے اس سے یہ بات کہتے ہوئے شرمندگی سی محسوس ہورہی تھی۔

"آنکھیں تو کھول بوغا!" میں نے سولدہ کی آواز بہت قریب سے سنی۔

جب میں نے آنکھیں کھولیں تو بوکھلا سا گیا۔ اس کا چہرہ میرے چہرے سے بہت قریب تھا اور اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی نامانوس خوشبو میں جیسے میں نہا رہا تھا۔

"سولدہ! میرے۔۔۔ میرے اتنے قریب نہ آ۔ کہ۔ کہ میں خود پر قابو نہ رکھ۔۔۔ سکوں اور تجھے۔۔۔ تجھے۔۔۔ اپنے بازوؤں میں۔۔۔ لے لوں۔" میں نے بمشکل رک رک کر کہا۔

پھر مجھے یاد نہیں کہ پہل سولدہ نے کی تھی یا میں نے لیکن میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ اس کے اور میرے جسم جیسے ایک ہو گئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خنا کی شراب کا پورا مٹکا پی لیا ہو۔ میرا جسم جیسے اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی نامانوس خوشبو میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس کے گرم گرم سانس میری سانسوں میں گھل رہے تھے اور میں سب کچھ بھولتا جا رہا تھا۔ میں کون ہوں' وہ کون ہے اور میں کہاں ہوں' مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ اگر میرے ہوش و حواس سلامت ہوتے تو شاید میں یہ سوچ کر بھی نہ پاتا کہ کسی سولدہ کو اپنے سینے سے لگا سکوں گا۔ وقت اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا یا میں اور سولدہ وقت کے حصار سے باہر نکل گئے تھے لیکن جو بھی تھا میرے لیے انجانا اور لذت انگیز تھا۔

معاً" اسی کیفیت میں مجھے ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔ ایک غیر انسانی سی آواز جیسے کوئی درندہ بولا ہو۔ اس سے پہلے میں نے لوہے سے لوہا ٹکرانے کی ہلکی سی آواز بھی سنی تھی جس پر کوئی توجہ نہ دی تھی میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دو درشت چہروں والے افراد آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں لوہے کے بڑے بڑے سے ڈنڈے تھے جن کے درمیان میں خلا تھا۔ ان لوہے کے سوراخ دار ڈنڈوں کا رخ میری اور سولدہ کی طرف تھا۔

سولدہ کے دشمن! اچانک میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے سولدہ کو چوکنا کرنا چاہا لیکن اسی لمحے سولدہ کا ایک ہاتھ اس کی کمر پر پہنچا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اب بھی مجھے جکڑے ہوئے تھا۔ میں نے ایک بار پھر لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سنی اور پھر اسی لمحے میری جسم کو شدید جھٹکے سے لگے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سولدہ کا وہ ہاتھ جو میری گردن میں پڑا تھا' دہکتے ہوئے لوہے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ اپنی گردن سے ہٹانا چاہا لیکن میں اپنی کوشش میں ناکام ہو گیا۔ میں اپنی مرضی سے اپنے جسم کو حرکت نہ دے سکا' اور پھر جسم کے ساتھ ہی میرے ذہن کو بھی جھٹکا سا لگا۔ دماغ میں ایک دھماکا سا ہوا۔ اس کے بعد ذہن پر تاریکی کی چادر پھیل گئی۔

مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو دھندلکوں کے درمیان پایا۔ میرے ذہن پر ہلکا ہلکا اندھیرا سا پھیلا ہوا تھا۔ چند لمحے مجھے کچھ یاد نہ آسکا کہ میں کن حالات میں سے دوچار ہوں۔ اور پھر جب میں نے اپنے ہاتھ میں کسی کا ہاتھ محسوس کیا تو میں جسم میں جیسے بجلیاں سی دوڑنے لگیں وہ ہاتھ سولدہ کا ہی ہو سکتا تھا۔ وہی میرے ساتھ تھی۔ پھر رفتہ رفتہ میرے ذہن سے اندھیرے چھٹتے گئے اور مجھے اردگرد کا ماحول واضح طور پر نظر آنے لگا۔ میں یقیناً" کسی جنگل میں تھا۔

"بوغا!" اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں عجیب سی خوشی تھی۔

"ہاں!" میں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا اور اسی وقت میری نظر سامنے پڑی جہاں کسی شے کا بڑا سا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے سولدہ سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"اسے ابھی تو نہیں سمجھ پائے گا۔ یہ وہ شے ہے جس کے ذریعے ہم اس زمانے تک آئے ہیں۔" سولدہ نے جواب دیا۔

میں نے چند قدم آگے بڑھ کر اس عجیب شے کو دیکھا جس پر خشک پتے اور جھاڑ جھنکار پڑے تھے۔ وہ شے اس جھاڑ جھنکار میں اس طرح چھپی ہوئی تھی کہ ذرا فاصلے سے دیکھنے پر شاید نظر نہ آتی۔ میں نے اسے ڈرتے ڈرتے چھو کر دیکھا۔ وہ ٹھوس اور لوہے کی طرح سخت محسوس ہوئی۔ میں پلٹا اور سولدہ کو مخاطب کیا۔

"یہ تو مجھے کہاں لے آئی ہے؟ میں نے تو کبھی دشت میں ایسا گھنا جنگل نہیں دیکھا۔ مجھے بتا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟" مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔

"آ ادھر میرے قریب آ کر بیٹھ جا!" سولدہ زمین پر بیٹھتے ہوئے بولی اور ایک قریبی درخت کے تنے سے ٹیک لگا لی۔ "میں تجھے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں

کہ تو کہاں ہے۔"

میں خاموشی سے اس کے قریب بیٹھ گیا جہاں لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں حیرت سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ جگہ بڑی سرسبز و شاداب تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میرا گھوڑا بھی ہوتا تو بڑے مزے لے لے کر وہ ہری ہری گھاس کھاتا جو دور تک پھیلی ہوئی تھی

"ہوغا! ہم وقت کی لہروں پر بہتے ہوئے صدیوں آگے نکل آئے ہیں اور۔۔۔"

"صدیاں کیا ہوتی ہیں؟۔" میں نے سولدہ کی بات کاٹ کر سوال کیا اور بولا "میں نے پہلے بھی ایک بار تجھ سے پوچھا تھا اور تو نے کہا تھا کہ کبھی فرصت سے بتائے گی۔"

سولدہ مجھے منگولوں کی جنتری کے حساب سے صدیوں کا مطلب سمجھانے لگی۔ "تیرے یہاں جنتری بارہ سالوں کی ہوتی ہے۔ یوں سمجھ کہ آٹھ درجن سالوں میں اگر چار سال اور ملا دیئے جائیں تو وہ پوری ایک صدی کہلاتی ہے۔ دو صدی کا مطلب اس کا دگنا اور تین صدی کا مطلب تگنا ہوا۔"

میں صدیوں کا مطلب جان کر حیران رہ گیا۔ "تو۔۔۔ تو۔۔۔ میں صدیوں آگے آگیا ہوں مگر۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے؟۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیا اب دشت پر چنگیز خاں کے پوتوں کی حکومت نہیں رہی؟۔"

"وہ اور زمانہ تھا' یہ اور عہد ہے۔" سولدہ نے جواب دیا۔ "کیسا دشت اور کیسے چنگیز خاں کے پوتے! وہ صدیوں پہلے مرکھپ چکے ہیں۔" یہ کہہ کر سولدہ ہنس پڑی۔

"مگر ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ سب زندہ تھے۔" میری حیرت کم نہ ہوئی۔

"کچھ دیر پہلے تک تم اس زمانے میں ضرور تھے مگر اب تم صدیوں آگے آچکے ہو۔ نہ یہ وہ زمانہ وہ جگہ۔" سولدہ نے بتایا' پھر وہ اس عجیب سی ٹھوس شے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولی جو پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ "وہ شے دیکھ رہا ہے۔ اس شے کی قید میں زمان و مکاں ہیں۔ ایسی ہی ایک شے بورخان قالدون کے ایک غار میں بھی چھپی ہوئی ہے۔ جس کے بارے میں یقیناً تجھے علم نہ ہوگا۔ میں وہاں بھی اسی شے کے ذریعے پہنچتی ہوں۔ میرے زمانے والے اس شے کو ٹائم مشین کہتے ہیں مگر شاید تو میری بات نہیں سمجھ پا رہا بس یوں سمجھ لے کہ یہ شے ہی سب کچھ ہے۔ اسی کے ذریعے میرا جسم لہروں سے دوبارہ جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے مختلف زمانوں میں ایسی ہی دوسری خودکار مشینیں پہنچا دی ہیں تاکہ میں ان زمانوں تک پہنچ سکوں۔" سولدہ مجھے عجیب عجیب اور حیران کن باتیں بتاتی رہی جنہیں سمجھنا واقعی میرے لیے مشکل تھا۔

اس نے مجھے ایسی پراسرار باتیں بتائیں جن پر یقین کرنے کو میرا جی نہ چاہا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ کسی انسان کا جسم لہروں میں تبدیل ہو جائے اور وہ ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں پہنچ جائے۔ پھر یہی نہیں بلکہ وہ پلک جھپکتے ہزاروں منزلوں کا فاصلہ طے کر کے کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ اس کے باوجود کہ میں سولدہ کی پراسرار باتیں بہت کم سمجھ رہا تھا' میں اس کی باتوں کو توجہ اور حیرت سے سنتا رہا۔

"مجھے یقین ہے کہ تو بہت کم باتوں کو سمجھ پایا ہوگا۔" اپنی بات کے آخر میں وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "اور اگر کچھ باتیں تیری سمجھ میں آبھی گئی ہوں تو تو نے ان پر یقین نہ کیا ہوگا۔ کیا میرا خیال غلط ہے؟۔"

"تو ٹھیک کہتی ہے۔" میں نے تائید کی۔ پھر بولا۔ "لیکن یہ بتا کہ تو مجھے یہاں کیوں بلائی ہے؟۔"

"مجھے یاد ہوگا کہ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ میں ایک تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔" میں نے گردن ہلائی۔

"میں دراصل یہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا میرے ہمراہ کوئی ماضی کا انسان بھی مستقبل کا سفر طے کر سکتا ہے یا نہیں۔" سولدہ نے کہا۔ "میں سوچا کرتی تھی کہ ایسا ممکن ہے مگر مجھے کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اب تجھے اپنے ساتھ دیکھ کر مجھے عجیب سی خوشی ہو رہی ہے حالانکہ سب کچھ حادثاتی طور پر ہوا ہے جس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ ویسے تو خود بھی تو

میرے ساتھ رہنے کا خواہش مند تھا۔"

"ہاں تیرے ساتھ رہنے سے بڑھ کر میرے لیے کوئی خوشی کی بات نہیں۔" میں نے اس کے حسین چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تو یہ بھی جانتی ہے کہ منگولوں سے اپنا انتقام لینا چاہتا ہوں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" سولدہ نے کہا' پھر پر عزم لہجے میں بولی۔ "تو اپنے دشمنوں سے ضرور انتقام لے گا۔"

اسی وقت مجھے سولدہ کے دشمنوں کا خیال آگیا اور میں بولا۔ "تو نے تو کہا تھا کہ تو اپنی دشمنوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوگئی ہے اور وہ تجھے کسی اور جگہ تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے؟ تو یہ کیسے ہوا کہ وہ بورخان قالدون تک پہنچ گئے؟"

"میں نے تجھ سے جو کچھ کہا تھا' غلط نہیں کہا تھا۔ حقیقت یہی تھی۔" سولدہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "دشمنوں نے مجھے میری توقع سے پہلے تلاش کرلیا اور مجھ تک پہنچ گئے۔"

"پھر تو وہ یہاں بھی آسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں ضرور آسکتے ہی لیکن اب میں نے ان سے بچنے کی ایک اور صورت سوچی ہے۔ میں اب اس مشین کے قریب نہیں رہوں گی تاکہ وہ مجھ پر فوراً حملہ آور نہ ہوسکیں۔ یوں بھی انہیں میری تلاش میں کافی وقت لگے گا۔" سولدہ نے جواب دیا۔

"اس شے کے قریب نہ رہنے سے کیا فرق پڑے گا؟" میں نے پوچھا۔

"جس طرح میرے اور تیرے جسم لہروں میں تبدیل ہونے کے بعد دوبارہ اپنی اصل ہیئت میں واپس آگئے بالکل اسی طرح ان کے جسموں کی لہریں بھی اس مشین سے ٹکرا کر دوبارہ جسموں میں تبدیل ہوجائیں گی۔" سولدہ نے مجھے سمجھایا اور میں کچھ نہ سمجھ پایا۔

"مگر وہ ہیں کون؟ اور تیرے دشمن کیوں ہوگئے ہیں؟" میں نے معلوم کیا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" وہ ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔ "پھر کبھی فرصت سے تجھے سب کچھ بتاؤں گی۔ شاید تو سمجھ بھی نہ پائے۔"

"تو ان کے سامنے ٹھہر کر ان کا مقابلہ کیوں نہیں کرتی؟ ہر بار فرار ہی کیوں ہوجاتی ہے؟" سولدہ نے میرے پہلے سوال کا جواب نہ دیا تو میں نے دوسرا سوال کیا۔

"اس لیے کہ یہی میرے لیے بہتر ہے۔ میں ان سے مقابلے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی۔"

"وجہ؟"

"دشمن بے شمار ہیں اور میں تنہا۔" وہ بولی۔ "اگر میں کبھی ان سے بھڑ گئی تو ان کے دوسرے ساتھی بھی ان کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں لیکن میرا کون ہے جو مدد کو آئے گا۔؟" سولدہ کے لہجے میں عجیب سی بے بسی تھی۔ "بس اب اس بارے میں کچھ نہ پوچھ کہ اس طرح میرے زخم تازہ ہوجائیں گے۔" پھر اس نے میرا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "آچل بوغا! یہاں سے کہیں دور نکل چلیں۔"

"مگر کہاں؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے چند میل دور ایک شہر ہے جو دھوپور ہم وہاں چلیں گے۔" سولدہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"کیا تو یہاں پہلے بھی آئی ہے؟" میں نے سوال کیا اور آگے قدم بڑھایا۔

"ہاں صرف ایک بار۔ مگر یہ بہت دن کی بات ہے۔" سولدہ نے بتایا۔

"کیا ہم وہاں تک پیدل چلیں گے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تو نے یہ نہیں بتایا کہ یہ جگہ کون سی ہے؟" میرا تجسس مجھے بار بار سوال کرنے پر اکسا رہا تھا۔

"یہ ہندوستان ہے۔" سولدہ نے کہا۔

"یہاں حکومت کس کی ہے؟"

"جب میں پہلے آئی تھی تو یہاں ایک طاقتور مسلمان بادشاہ ظہیر الدین بابر کی حکومت تھی۔ یا تو اب بھی وہی حکمراں ہوگا یا اس کا کوئی بیٹا حکمرانی کر رہا ہوگا۔"

مجھے اس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ اسے سولدہ ہو کر بھی بہت سی باتیں معلوم نہیں تھیں۔ میں نے سولدہ سے بھی اپنی اس حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں میں بہت سی باتوں سے بے خبر ہوں۔ یوں سمجھ کہ میں وہی جان سکتی ہوں جو جاننا چاہوں۔" سولدہ بولی۔

مجھے کافی دیر سے کچھ پیاس سی محسوس ہو رہی تھی جو پیدل چلنے کے سبب اب کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے سولدہ سے کہا۔ "کیا یہاں کہیں پانی مل سکے گا؟ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

وہ میری بات سن کر رک گئی۔ اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو۔ چند لمحے بعد اس کی آواز سنائی دی۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہاں سے دائیں جانب کچھ فاصلے پر ایک جوہڑ ہے۔ میرے ساتھ۔" سولدہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں سولدہ کے ہمراہ دائیں جانب کے گھنے جنگل کی طرف مڑا۔ ابھی کچھ فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ میرے کانوں سے ایسی آوازیں ٹکرائیں جیسے کہیں قریب ہی کافی افراد موجود ہوں اور ایک دوسرے سے محو گفتگو ہوں۔ میں ٹھٹکا اور اسی کے ساتھ سولدہ کو مخاطب کیا۔ "کیا تو بھی آوازیں سن رہی ہے؟"

"ہاں!" سولدہ نے تصدیق کی مگر اس کے قدم نہ رکے۔ "یہ آوازیں اسی جوہڑ کی جانب سے آ رہی ہیں۔"

ہم کچھ دیر ہی میں ایک ایسے میدان میں پہنچ گئے جسے چاروں طرف سے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس میدان میں کافی افراد نظر آ رہے تھے۔ درمیان میں ایک خیمہ بھی لگا ہوا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر عجیب سی خوشی ہوئی کہ وہاں گھوڑا بھی موجود تھے۔ وہ ایک چھوٹا سا قافلہ دکھائی دیتا تھا۔ اسی قافلے کی ایک جانب پانی کا جوہڑ نظر آ رہا تھا۔

سولدہ مجھے اپنے ساتھ لیے قافلے کی طرف بڑھی۔ شاید قافلے والوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا۔ وہ مجھے اپنے لباسوں سے سپاہی نظر آ رہے تھے لیکن ان کے جوڑوں پر بڑے عمدہ لباس تھے اور وہ ہتھیار بھی لگائے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند ہمیں اپنی جانب آتا دیکھ کر ہماری طرف لپکے اور ہمیں گھیر لیا۔ میں نے فوراً اپنی تلوار نیام سے باہر نکال لی۔ جواباً ان کے ہاتھوں میں تلواریں نظر آنے لگیں۔

"اپنی تلوار نیام میں رکھ لو۔" سولدہ نے مجھ سے کہا۔

"کہیں اگر انہوں نے حملہ کر دیا تو؟" میں نے احتجاج کیا۔

تمہارے تلوار نکالنے سے وہ بھی اشتعال میں آ گئے ہیں ورنہ شاید وہ ایسا نہ کرتے۔" سولدہ بولی۔ "یوں بھی تم تنہا کس طرح ان کا مقابلہ کر سکتے ہو۔"

سولدہ کی بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے تلوار نیام میں رکھ لی۔ وہ نہ جانے کس زبان میں مجھ سے اور سولدہ سے کچھ کہہ رہے تھے۔

میں نے دیکھا کہ سولدہ نے بھی اسی زبان میں ان سے کچھ کہا اور انہوں نے بھی اپنی تلواریں نیاموں میں ڈال لیں اور ہمیں آگے بڑھنے کے لیے راستہ دے دیا۔

"یہ لوگ کون ہیں؟ اور کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے سولدہ کے ہمراہ جوہڑ کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ شاہی فوج کے سپاہی ہیں اور ہم سے ادھر آنے کا مقصد پوچھ رہے ہیں۔" سولدہ نے بتایا۔

"شاہی فوج؟ کس کی شاہی فوج؟" میں بولا۔

"یہ پوچھنے کی نوبت ابھی نہیں آئی پہلے پیاس بجھا لیں پھر پوچھ لوں گی۔" سولدہ نے جواب دیا۔

جوہڑ پر پہنچ کر میں نے چلو بھر کے پیا اور سولدہ نے بھی پیاس بجھائی۔

ہم پانی پی کر اٹھے ہی تھے کہ میں نے گھوڑا دوڑنے کی آواز سنی۔ میں سیدھا کھڑا ہو کر اس طرف دیکھنے لگا جدھر سے آواز سنائی دی تھی۔ میں نے ایک گھڑسوار کو جنگل سے نکل کر میدان میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے گھوڑے کا رخ خیمے کی جانب تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ گھڑسوار خیمے تک پہنچتا، میں نے ایک دراز قد اور باریش پروقار چہرے والے ایک شخص کو خیمے سے نکلتے دیکھا۔ اس کی نگاہ گھڑسوار کی

جانب اٹھی ہوئی تھی جیسے وہ اسی گھڑ سوار کا منتظر تھا۔ میں نے دراز قد شخص کو غور سے دیکھا جو زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس کے سر پر عجیب سا تاج نظر آرہا تھا اور جسم پر بہترین پوشاک تھی۔

"ہندوستان کا شہنشاہ!" معاً میں نے سولدہ کی بڑبڑاہٹ سنی اور چونک پڑا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ شہنشاہ ہے؟ کیا تم نے پہلے بھی اسے دیکھا ہے؟" میں نے سولدہ سے پوچھا۔

"نہیں میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا لیکن مجھے اس کے سر پر مغلیہ تاج نظر آرہا ہے۔ یہی تاج میں نے شہنشاہ بابر کے سر پر دیکھا تھا۔ شاید یہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور بابر مرچکا ہے کیونکہ یہ بابر نہیں ہے۔" سولدہ نے جواب دیا۔

اس دوران میں وہ گھڑ سوار، دراز قد شہنشاہ کے سامنے پہنچ کر گھوڑے سے اتر چکا تھا اور اب شہنشاہ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

گھوڑ سوار کچھ کہہ کر خاموش ہوگیا اور دراز قد شہنشاہ کے چہرے سے پریشانی کا اظہار ہونے لگا۔ اب وہاں موجود دوسرے افراد بھی اس کے سامنے مودب کھڑے تھے۔ معاً شہنشاہ نے بلند آواز میں ان سے کچھ کہا۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ مجھے بھی سنائی دے رہی تھی مگر میں اس نامانوس اور اجنبی زبان کے الفاظ نہیں سمجھ پارہا تھا۔ میں نے سولدہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔

"وہ اپنے سپاہیوں کو فوراً کوچ کا حکم دے رہا ہے۔" سولدہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مگر معاملہ کچھ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"کیوں؟" میں بولا۔

"وہ مغلیہ تاجدار ہے، شہنشاہ ہندوستان۔ پھر وہ ایک معمولی راجہ سے پناہ کا طالب کیوں تھا؟" سولدہ کے لہجے میں تجسس تھا۔ "گھوڑ سوار نے اسے آکر بتایا ہے کہ جودھپور کا راجہ اسے پناہ دینے پر راضی نہیں، کیونکہ وہ کسی شیر شاہ سے ڈرتا ہے اور چاہتا ہے کہ شہنشاہ کو گرفتار کرکے شیر شاہ کے حوالے کردے۔"

اسی وقت میں نے دراز قد شہنشاہ کو دوبارہ خیمے کے اندر جاتے دیکھا۔

"بوغا! شاید اس کے سپاہیوں سے کچھ پتا چل سکے۔" سولدہ میرا ہاتھ تھام کر آگے بڑھی۔

سولدہ مجھے لیے سپاہیوں کے قریب پہنچی اور سپاہیوں سے کافی دیر گفتگو کرتی رہی۔ سپاہی اپنا اپنا سامان باندھ رہے تھے اور سولدہ سے باتیں بھی کرتے جارہے تھے۔

اب ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور دن کا اجالا ختم ہورہا تھا۔ میں نے سپاہیوں سے گفتگو کرتے ہوئے سولدہ کے پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں ابھرتی ہوئی دیکھیں۔ سولدہ کے چہرے سے کسی قدر پریشانی کا اظہار ہورہا تھا۔

وہ سپاہیوں سے گفتگو کرچکی تو میری طرف مڑ کر بولی۔ "بوغا! اب ہماری بہتری بھی اسی میں ہے کہ ہم انہی لوگوں کے ساتھ یہاں سے نکل چلیں۔ جودھپور کی طرف جانا اب خطرناک ہوسکتا ہے۔" یہ کہہ کر سولدہ نے مجھے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

اس دراز قد شہنشاہ کا نام نصیر الدین ہمایوں تھا جو کچھ دیر قبل خیمے کے اندر گیا تھا۔ وہ بابر ہی کا بیٹا تھا۔ اس کے ہمراہ اس کی بیگم بھی تھی جو حاملہ تھی۔ اپنے بھائیوں کی بے وفائی اور سازشوں کے سبب وہ قریہ قریہ مارا مارا پھر رہا تھا اور اسے کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی۔ اس کے تخت پر شیر شاہ قابض ہوگیا تھا۔ گنتی کے صرف چند سپاہی اب اس کے ساتھ رہ گئے تھے جنہیں ساتھ لیے وہ اپنی جان بچاتا پھر رہا تھا کہ شاید اسے کہیں پناہ مل جائے اور شاید وہ دوبارہ اپنی طاقت جمع کرکے دشمن کے مقابلے پر آسکے۔ اس نے جودھپور کے ہندو راجہ کے پاس اس امید پر پیغام بھیجا تھا کہ شاید راجہ اسے جودھپور میں رہ کر فوجی تیاریاں کرنے دے مگر زمانہ شناس راجا ابن الوقت ثابت ہوا تھا۔ ہمایوں کا بھیجا ہوا پیغام اب خود اس کے لیے عذاب جان بن گیا تھا۔ اسے راجہ کے ارادوں کا علم ہوگیا تھا کہ وہ اسے شیر شاہ کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت میں وہاں سے فوری کوچ ضروری تھا، تاکہ

راجہ کے سپاہی وہاں پہنچ کر اسے حراست میں نہ لے لیں۔

اطلاع کے مطابق راجہ کے سپاہی جودھپور سے روانہ ہونے والے تھے۔ ایسی صورت میں جودھپور کی طرف سولدہ کا اور میرا جانا خطرناک ہی تھا کیونکہ ہمیں بھی ہمایوں کا ساتھی سمجھ کر گرفتار کیا جاسکتا تھا۔ ان حالات میں بہتر یہی تھا کہ ہم اس برگشتہ نصیب قافلے کے ساتھ ہو لیتے۔ سولدہ نے اپنے اس خیال کا اظہار قافلے کے سپاہیوں سے بھی کردیا تھا اور ان خانماں خرابوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ہمایوں کی اجازت ضروری سمجھی گئی تھی۔

سولدہ ایک سپاہی کے ہمراہ مجھے دوسرے سپاہیوں کے درمیان چھوڑ کر خیمے کی طرف چلی گئی تھی۔

میرے ذہن میں اس وقت یہ خیال آیا کہ کسی ایسے قافلے کے ساتھ ہمیں بہرحال نہیں جانا چاہیے جس کے دشمن لاتعداد ہیں اور کسی بھی وقت وہ کسی ابتلا کا شکار ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ سولدہ لوٹ کر آئے گی تو میں اس سے یہ بات ضرور کہوں گا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ سولدہ مجھ سے بہتر طور پر حالات کو سمجھ سکتی تھی اس لیے مجھے امید تھی کہ وہ کوئی غلط فیصلہ بہرحال نہیں کرے گی لیکن میں اس سے اپنے دل کی بات کہہ کر مطمئن ہو جانا چاہتا تھا۔

سولدہ جلد ہی خیمے سے نکل کر میری جانب آئی۔ اس کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا وہ میرے پاس پہنچی تو اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے خدشات کا اظہار کردیا۔

"ایک تو یہ کہ اب رات ہونے والی ہے۔ اگر ہم ان لوگوں سے کٹ کر جودھپور کی طرف روانہ ہوگئے تو راہ بھٹک جانے کا خطرہ ہے۔" سولدہ میری بات کا جواب دینے لگی۔ "دوسرے یہ کہ ہمارا راجہ کے سپاہیوں سے بچ کر نکل جانا بھی ضروری نہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم اس وقت یہیں جنگل میں چھپے رہنے کو ترجیح دیں تو بھی ہمارے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ راجہ کے سپاہی، ہمایوں کو تلاش میں سارے جنگل کو چھان ماریں گے اور اگر ہم ان کے پلے پڑ گئے تو وہ ہمیں لازماً "ہمایوں کے ساتھی ہی سمجھیں گے۔ میں نے ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد ہی قافلے کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر سولدہ چند لمحے خاموش رہی، پھر بتایا کہ ہمایوں نے اسے اپنی بیگم کی نگہداشت کے لیے ساتھ چلنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ میرے بارے میں اس نے بتایا کہ میں بھی ہمایوں کے خدمت گزاروں میں رہوں گا اور اس کے خاص خادموں کے ساتھ سفر کروں گا۔

سولدہ کی بات میں وزن تھا اس لیے میں اس کی تردید نہ کرسکا۔ اس نے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹھیک فیصلہ ہی کیا تھا۔ یوں بھی میں اس کی پراسرار قوتوں سے آگاہ تھا۔ وہ جو اپنے اور میرے جسم لمحوں میں تبدیل کرسکتی تھی، کوئی معمولی عورت تو نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے اس پر اعتماد کرلینا چاہیے تھا اور میں نے اعتماد کرلیا۔

وہ مجھے اپنے ہمراہ لے کر خیمے کی طرف چل دی۔ خیمے کے باہر ایک سپاہی برہنہ تلوار لیے کھڑا تھا مگر اس نے ہمیں نہیں روکا۔ شاید اسے ہمایوں کا حکم مل چکا تھا۔ کہ ہمیں اندر داخل ہونے سے نہ روکا جائے۔

خیمے میں پہنچ کر سولدہ اس دراز قد شہنشاہ کے سامنے جھکی اور تین بار جھک کر اپنے ہاتھ کو نیچے سے اوپر لے گئی اور میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہاں زمین پر قالین بچھا ہوا تھا اور وہ دراز قد شہنشاہ جس کا نام سولدہ نے مجھے ہمایوں بتایا تھا، ایک گول سے موٹے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

ہمایوں نے سولدہ سے کچھ کہا اور سولدہ نے جواب دیا، پھر ہمایوں کچھ بولا۔ سولدہ احتراماً" جھکی اور مجھے اپنے ہمراہ لے کر خیمے کے دوسرے حصے کی جانب بڑھی۔

خیمے میں دو اور خادم بھی موجود تھے جو مختلف سامان باندھ رہے تھے سولدہ نے مجھے ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے کہا اور خود خیمے کے دوسرے حصے کا پردہ اٹھا کر اندر

چلی گئی۔ غالباً" خیمے کے اس حصے میں شہنشاہ کی حاملہ بیوی تھی۔

میں ان دونوں خادموں کے ساتھ کام سے لگ گیا۔ شاید سولدہ نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں ان کی زبان نہیں سمجھ پاؤں گا اس لیے ان دونوں میں سے کسی نے مجھے مخاطب نہیں کیا اور میں بھی کچھ نہ بولا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ بھی میری زبان نہ سمجھ پائیں گے۔ مجھے سولدہ پر ضرور حیرت تھی کہ وہ بہت روانی سے ان اجنبیوں کی زبان بول اور سمجھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد تمام سامان بندھ گیا۔ اس کے بعد ہمایوں خیمے سے باہر نکل گیا۔ خیمہ بھی لپیٹ کر ایک گھوڑے کی پشت سے باندھ دیا گیا۔ ہمایوں کی بیوی کو سولدہ پہلے ہی وہاں سے نکال لے گئی تھی۔ اور ایک گھوڑے پر سوار کرا دیا تھا۔ اس کی بیوی کے ساتھ ایک اور بوڑھی عورت بھی تھی۔

گھوڑوں کی تعداد کم تھی اور افراد زیادہ تھے اس لیے کچھ افراد کو پیدل سفر کرنا تھا اور انہی میں میرا بھی شمار تھا۔

قافلہ روانہ ہوتے ہوتے ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن خوش قسمتی سے چاند آسمان پر روشن تھا۔ غالباً" اسی لیے اور احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے مشعلیں روشن نہیں کی گئی تھیں حالانکہ میں سامان میں مشعلیں دیکھ چکا تھا۔ رات کے اندھیرے میں مشعلوں کی روشنی دور سے ہی نظر آجانے کا امکان تھا۔ خطرے کے پیش نظر یہ قدم درست تھا مگر جنگل کے اندر چاند کی ناکافی روشنی میں چلنا ذرا مشکل ہو رہا تھا۔ اطراف میں گھنے پیڑ تھے جو چاند کی روشنی کو روک لیتے تھے جس کی وجہ سے کہیں کہیں بالکل اندھیرا تھا۔

سولدہ بھی میری ہی طرح پیدل سفر کر رہی تھی۔ وہ اس گھوڑے کی لگام تھامے آگے آگے چل رہی تھی جس پر بادشاہ کی بیوی سوار تھی۔ اسی کے برابر میں ایک مریل سے گھوڑے پر وہ بوڑھی عورت سوار تھی جو خیمے سے سولدہ کے ساتھ ساتھ نکلی تھی۔ اس بوڑھی عورت کے آگے ایک نوجوان بھی بیٹھا تھا جو گھوڑے کی باگیں سنبھالے ہوئے تھا۔

میں سولدہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ مجھے اس رات وہ سفر بڑا عجیب اور پراسرار سا لگ رہا تھا۔ ابھی ہم اسی جنگل میں سفر کر رہے تھے۔ سفر کی سست رفتاری وہ افراد تھے جو سواریاں نہ ہونے کے سبب پیدل چلنے پر مجبور تھے۔

سفر کرتے کرتے ابھی نصف پہر بھی نہ گزرا تھا کہ معاً" میرے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ آواز یقیناً" بہت سے گھوڑوں کے دوڑنے کی تھی جو لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔

قافلہ ایک دم رک گیا۔ میرے علاوہ دوسروں نے بھی یقیناً" وہ آواز سن لی تھی۔

آنے والے یقیناً" دشمن ہی ہو سکتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ راجہ جودھپور کے سپاہی غالباً" اس جنگل میں داخل ہونے کے بعد اب ٹکڑیوں میں بٹ کر قافلے کو تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے اور میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔

ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی اور پھر قافلے والے پہلے ہی سے چوکنا ہو گئے تھے اس لیے جب انہوں نے حملہ کیا تو ٹکر برابر ہی کی تھی۔

میں نے بھی قافلے کے دوسرے سپاہیوں کی طرح اپنی تلوار نیام سے باہر نکال لی تھی۔ مجھ پر ایک بھاری تن و توش والے گھوڑ سوار نے حملہ کیا تھا۔ وہ میری طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا جھپٹا تھا۔ شاید اس ارادے سے کہ مجھے اپنے گھوڑے کے نیچے روند دے مگر میں نے ایک جانب اچھلتے ہوئے اس کے گھوڑے کی اگلی دونوں ٹانگوں پر تلوار کر بھرپور وار کیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ وہ گھوڑ سوار میرے وار سے قطعی غافل تھا ورنہ اگر وہ چاہتا اور ہوشیار ہوتا تو اپنے گھوڑے کو میرے وار سے بچا سکتا تھا۔ دشت میں پروان چڑھنے والا ایک بچہ بھی یہ وار بچا سکتا تھا مگر وہ گھوڑ سوار اس وار سے اپنے گھوڑے کو نہ بچا سکا۔ گھوڑا زور سے ہنہنا کر منہ کے بل زمین پر گرا اور اسی کے ساتھ سوار بھی نیچے آرہا۔ پھر اسے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا میں اس کی طرف جھپٹا اور اٹھنے سے پہلے اس کا سینہ چھید دیا۔

اسی وقت میری نگاہ بادشاہ پر پڑی۔ وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھا گویا برق کی طرح کوند رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ اپنی بیوی اور حملہ آوروں کے درمیان دیوار بن گیا تھا۔ اس نے اب تک ایک بھی "حملہ آور کو یہ موقع نہیں دیا تھا کہ وہ اپنے اس گھوڑے تک پہنچ سکتا جس پر اس کی بیوی سوار تھی اور جس گھوڑے کی باگ سولدہ تھامے ہوئے تھی۔

مرنے والوں کی چیخوں، زخمی ہونے والوں کی کراہوں اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا۔ حملہ آور زیادہ دیر مقابلے پر نہ ٹک سکے اور انہیں راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔

مصلحتاً" حملہ آوروں کا تعاقب نہیں کیا گیا۔ حملہ آوروں کے فرار ہوتے ہی قافلے میں شامل سپاہیوں کو شمار کیا گیا۔ پتا لگا کہ اس جھگڑے میں دس سپاہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ زخمیوں کی تعداد درجن بھر سے زیادہ تھی جن میں سے چار شدید زخمی تھے۔ زخمیوں کی مرہم پٹی ہوئی مگر ہلاک ہونے والوں کو نہیں دفنایا گیا۔ اس کا سبب یہ کہ قافلے کو وہاں سے جلد از جلد روانہ ہو جانا تھا تاکہ فرار ہونے والے حملے آور اپنے دوسرے ساتھیوں کو لے نہ چڑھ دوڑیں۔ قافلہ جس راستے پر پہلے سفر کر رہا تھا، وہ راستہ بھی بدل دیا گیا۔

قافلہ صبح ہونے سے پہلے ہی جنگل سے نکل چکا تھا لیکن اس نے قیام کہیں نہیں کیا۔ ہر چند کہ حملہ آوروں کا خطرہ جنگل سے نکلنے کے بعد کچھ کم ہو گیا تھا مگر بالکل ختم نہیں ہوا تھا اس لیے مسلسل سفر ضروری تھا۔

کچھ دیر بعد جب سورج طلوع ہوا اور اس کی حدت بڑھی تو مجھے پیاس لگی مگر اب قافلہ ریگستان میں سفر کر رہا تھا۔ دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ سر پر چلچلاتی دھوپ اور نیچے گرم ریت، قافلے کے بہت سے سپاہی جی ہارنے لگے۔ میرے لیے وہ سفر کوئی ایسا زیادہ مشکل اور دشوار گزار نہیں تھا کیونکہ میں اس سے زیادہ کڑے سفر کیے تھے۔ پیاس بھی ابھی میرے لیے قابل برداشت تھی۔

میں پیدل، بادشاہ کی سواری کے پیچھے، اس کے دونوں خادموں کے ہمراہ چل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بادشاہ کا ایک خادم تیزی سے آگے بڑھا بادشاہ کے گھوڑے کی لگام تھام کر کچھ کہا۔

جواب میں بادشاہ بھی کچھ بولا۔ میں نے بادشاہ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھے۔ بادشاہ کے رکنے سے قافلہ بھی رک گیا جو اب تقریباً" دو درجن افراد پر مشتمل تھا جن میں سے صرف چھ کے پاس سواریاں تھیں، بقیہ پیدل چل رہے تھے۔

بادشاہ کی بات سن کر وہ خادم اس گھوڑے کی طرف بڑھا جس پر بادشاہ کی بیوی سوار تھی۔ خادم نے اس کے گھوڑے کی لگام تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے سولدہ سے کچھ کہا، کیونکہ سولدہ اس گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے چل رہی تھی۔ سولدہ نے بادشاہ کو مخاطب کر کے کچھ کہا۔ بادشاہ نے فوراً" کوئی جواب نہ دیا، پھر چند لمحے بعد کچھ بولا۔ سولدہ نے گھوڑے کی لگام چھوڑ دی، پھر وہ بادشاہ کی بیوی کو گھوڑے سے نیچے اترنے میں مدد دینے لگی۔

میں حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بادشاہ کی بیوی جیسے ہی گھوڑے سے اتری، وہ خادم گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے سولدہ سے کچھ کہا۔ سولدہ، بادشاہ کی بیوی کو اس کے قریب لے آئی، پھر بادشاہ نے اپنی بیوی کو اپنے گھوڑے پر سوار کیا اور خود لگام تھام کر پیدل چلنے لگا۔ اس کے بعد قافلہ پھر روانہ ہوا۔

اب سولدہ بھی بادشاہ کی سواری کے پیچھے میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

"سولدہ! یہ کیا ہوا؟ اس خادم نے بادشاہ کی بیوی کو گھوڑے سے کیوں اتار دیا اور خود کیوں گھوڑے پر چڑھ کر بیٹھ گیا؟" میں نے سولدہ سے سوال کیا۔

"جب آدمی پر برا وقت پڑتا ہے تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے، وہ تو پھر بھی بادشاہ کا خادم ہی تھا۔" سولدہ نے طویل سانس لے کر میری بات کا جواب دیا۔

"آخر ہوا کیا؟ کچھ تفصیل....."

سولدہ میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "وہ گھوڑا جس پر بادشاہ کی بیگم سوار تھی، وہ اسی خادم کا

فا۔ اس بے وفا نے بادشاہ سے اپنا گھوڑا مانگ لیا۔ بادشاہ نے اس خادم کو توقع کی نزاکت کا بھی احساس دلانا چاہا کہ اس کی بیوی دوسرے حال سے ہے مگر وہ نہ مانا۔ مجبوراً" بادشاہ کو اس کی بات ماننا پڑی۔"

"قافلے میں تو اور کئی سپاہیوں کے پاس گھوڑے ہیں۔" میں بولا۔ "ان میں کسی کو بھی اتنی غیرت نہ آئی کہ وہ اپنا گھوڑا پیدل چلتے ہوئے بادشاہ کو دے دیتے۔ یہ لوگ تو دل کے بڑے کھوٹے ہیں۔ بھلا جو برے وقت پر اپنے بادشاہ کے کام نہ آئے وہ کس کے ہوں گے۔"

سولدہ نے میری خیال آرائی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اس کے بعد میں بھی کچھ نہ بولا۔ مجھے صحرائے گوبی کے وہ وفادار منگول یاد آرہے تھے جو اپنے خاقان کی خاطر جان تک قربان کردیتے تھے۔ میرا ذہن صحرا کی طرف گیا تو مجھے ایک نیا خیال آیا۔ سولدہ مجھے کسی اور دنیا میں لے تو آئی تھی مگر میں دوبارہ دشت میں واپس بھی پہنچ سکوں گا یا نہیں؟ یہی سوچ کر میں نے سولدہ کو مخاطب کیا اور جو سوچا تھا کہہ دیا۔

"تو یقیناً" دشت میں واپس جاسکے گا بوغا! لیکن صرف میرے ساتھ۔" اس نے جواب دیا' پھر میرے مزید کچھ کہنے یا پوچھنے سے پہلے ہی دوبارہ بولی۔ "جس طرح ہم اس زمانے میں آئے ہیں اسی طرح ہماری واپسی بھی ہوگی۔"

"یعنی ایک بار پھر ہمارے جسم ہوا بن جائیں گے۔" میں نے بات کو سمجھنے کے انداز میں کہا۔

سولدہ آہستہ سے ہنس کر بولی۔ "ہوا نہیں بلکہ ہمارے جسم لہروں میں تبدیل ہوجائیں گے۔ ہم بور خان قالدون کے اسی غار میں نمودار ہوں گے جہاں سے چلے تھے۔"

"اسی غار میں کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیونکہ اسی غار میں پتھروں کے درمیان ایک جگہ وہ مشین چھپی ہوئی ہے جو ہمارے جسموں کی لہروں کو دوبارہ جسموں میں تبدیل کردے گی۔" سولدہ نے بتایا۔

میں اس کی بات سن کر تعجب کا اظہار کیا۔

"اگر وہ مشین اس غار ہی میں موجود نہ ہوتی تو میرے دشمن سیدھے اسی غار میں نہ پہنچ پاتے' کیونکہ ان کے جسم بھی لہروں کی صورت ہی وہاں تک پہنچتے ہوں گے۔" سولدہ نے کہا۔

"تو کیا اس غار میں بھی وہ عجیب اور پراسرار شئے موجود تھی کیونکہ پہلا غار زیادہ بلندی پر نہیں تھا اور وہاں تک کوئی بھی مقامی باشندہ پہنچ سکتا تھا۔"

"تیری باتیں بڑی الجھا دینے والی اور پر پیچ ہوتی ہیں۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ گھومنے لگتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے اعتراف کیا۔

"لیکن مجھے خوشی بھی ہے اور حیرت بھی کہ تو اتنی الجھی ہوئی اور مشکل باتوں کو جلدی سمجھ لیتا ہے ورنہ تیری جگہ اگر دشت کا کوئی اور نوجوان ہوتا تو کچھ بھی نہ سمجھ پاتا۔" سولدہ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

"پھر بھی بہت سی باتیں ہیں جنہیں میں بالکل نہیں سمجھ سکا۔" میں بولا۔

"مثلاً"!" سولدہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مثلاً" یہی کہ تیرے دشمنوں نے تجھے دیکھتے ہی تجھ پر حملہ کیوں نہ کردیا؟ وہ تجھے اپنے پراسرار ہتھیاروں سے ہلاک بھی تو کرسکتے تھے؟" میں نے کہا۔

"وہ مجھے مجبوری کی حالت ہی میں ہلاک کرسکتے ہیں ورنہ وہ مجھے زندہ پکڑنے ہی کو ترجیح دیں گے۔ کیا تو بھول گیا کہ تیرے سامنے جب وہ پہلی بار آئے تھے تو انہوں نے اپنے ہتھیار استعمال کیے تھے؟"

سولدہ نے مجھے یاد دلایا تو میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب اس کے پانچ دشمنوں نے بیک وقت اپنے پراسرار ہتھیاروں سے اس پر حملہ کیا تھا اور وہ غائب ہوگئی تھی۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔" میں نے تائید کی' پھر پوچھا۔ "تو اپنا ہاتھ اپنی کمر تک کیوں لے گئی تھی؟ مجھے اس وقت بھی تیری کمر پر کوئی سخت اور ٹھوس چیز بندھی محسوس ہوئی تھی جب تو میرے ساتھ غار میں لیٹی تھی مگر مجھے کچھ پوچھنے کی مہلت نہ مل سکی تھی۔ تیری کمر

سے کیا چیز بندھی ہوئی ہے؟۔"

"کیا تو ساری باتیں ایک ساتھ ہی پوچھ لے گا؟۔" وہ مسکرا کر بولی۔ پھر خود ہی کہا۔ "تیرے لیے فی الحال اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ تیری زبان میں یہ بھی ایک پراسرار شئے ہے اور یہی جسم کو لہوں میں تبدیل کرتی ہے۔"

"تو پھر یہ تو بڑی خطرناک چیز ہے۔" میں نے تبصرہ کیا۔

"تو جو بھی سمجھ لے۔" سولدہ نے مسکرا کر کہا۔ "تیری نظر میں تو میں بھی کم خطرناک نہیں۔"

میں اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔ اس نے کچھ ایسے ہی انداز میں بات کہی تھی۔

میں اور سولدہ باتیں کرتے چل رہے تھے کہ معاً ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ایک سپاہی تیورا کر گرم ریت پر گر پڑا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ اس کی زبان بار بار باہر نکل رہی تھی اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سخت پیاسا ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر کھڑا کیا مگر وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا اور دوبارہ گر پڑا۔

قافلہ رک گیا تھا۔ سولدہ بھی میرے قریب ہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "یہ پیاس سے مر رہا ہے۔ کسی کے پاس پانی ہو تو اسے پلوا دو۔"

سولدہ نے اپنے گرد جمع ہونے والے سپاہیوں سے کچھ کہا۔ سپاہیوں نے جواب میں گردنیں ہلا دیں۔

"ان لوگوں کے پاس پانی کی ایک بوند نہیں۔" سولدہ نے مجھے بتایا۔

"کیا تم اپنی پراسرار قوتیں استعمال کر کے کہیں سے پانی نہیں لا سکتیں؟۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سولدہ سے کہا۔ "تم بوخان قالدون پر بھی تو خورد و نوش کا بندوبست کر کے لاتی تھیں۔"

"ان تمام قوتوں کے باوجود بھی میری کچھ مجبوریاں ہیں بوعا؟۔" سولدہ بولی۔ "اس بارے میں تجھے پھر بتاؤں گی۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے اس سپاہی نے ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ کسے پڑی تھی کہ اس کی لاش کو دفن کرتا۔ اور کس میں

ہمت تھی کہ مفت میں قبر کھودنے کی مشقت کر
اس سپاہی کی لاش کو وہیں گرم ریت پر پڑا ہوا چھو
قافلہ آگے بڑھ گیا۔ بقیہ افراد کی حالت بھی پیاس
سبب کچھ اچھی نہیں تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ
کی بجائے گھسٹ رہے ہوں۔

اب میں پھر سولدہ کے ساتھ چل رہا تھا اور میں
ذہن میں کئی سوال گردش کر رہے تھے جو اپنے
بخش جواب چاہتے تھے۔ آخر میں نے سولدہ کو مخاط
کر ہی لیا اور اس سے تقریباً" وہی سوال دہرایا جو
دیر قبل لب مرگ سپاہی کے سامنے دہرایا تھا۔

"تو اپنی کچھ مجبوریوں کے بارے میں کہہ ر
تھی۔" میں نے سولدہ سے کہا۔ "مجھے بتا کہ کیا مجبو
تھی جو تو اس مرنے والے سپاہی کے لیے پانی
لا سکی؟۔"

"وہاں بوخان قالدون پر وہ مشین موجود تھی
میرے جسم کو لہوں سے دوبارہ جسم میں تبدیل کر
تھی لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ اس زمانے میں ا
جیسی دوسری مشین یہاں سے کافی فاصلے پر ہے
یہاں سے جانا تو میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن مج
واپسی وہیں ہوتی جہاں سے میں نے اور تو نے اپنے
کا آغاز کیا ہے۔ جہاں تو نے وہ مشین جنگل میں دیکھ
تھی مجھے وہیں لوٹ کر آنا پڑتا۔" سولدہ نے مجھے
سمجھایا۔

سولدہ کی بات بڑی حد تک میری سمجھ میں آ گئی
بھی میں نے مزید وضاحت کی خاطر کہا۔ "اس
مطلب یہ ہوا کہ تو لہوں میں تبدیل ہونے کے بعد
دوبارہ اسی صورت میں اس جگہ اپنے جسم کو پا سکتی
جہاں وہ پراسرار شئے موجود ہو جس کا تو نے ذکر ک
ہے۔"

"بالکل۔" سولدہ فوراً" بولی۔ "تو میری بات سمج
گیا۔"

اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا کا
کی طرح چبھا۔ مجھے وہ دن آیا جب سولدہ نے مجھے
موت کے گڑھے سے باہر نکالا تھا۔ اس وقت تو مجھے
وہاں کوئی ایسی پراسرار شئے نظر نہیں آئی تھی۔ میں

نے سولدہ سے اپنے خیال کا اظہار کر دیا۔

"بونا! یہ محض تیرا خیال ہے۔" سولدہ نے مسکرا کر کہا۔" وہ مشین اس وقت گڑھے کے قریب موجود ایک ریت کے ٹیلے میں چھپی ہوئی تھی۔ یہ کام میں نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ میں نے مجھے اس گڑھے سے نکال کر جس زمانے میں لے گئی تھی' اس زمانے میں اب تک وہ مشین ریت کے نیچے دفن ہے۔ مجھے اب تک یہ موقع نہیں مل سکا کہ میں اسے وہاں سے کہیں اور منتقل کر دیتی۔ اب تو نے یاد ہی دلا دیا ہے تو میں پہلی فرصت میں وہ مشین کہیں اور چھپا دوں گی۔ کسی اور زمانے میں' کسی اور محفوظ جگہ۔"

"تو بھی عجیب ہے اور تیری باتیں بھی عجیب۔" میں نے ہنس کر کہا۔" تیرا وجود اتنا پراسرار ہے کہ میں ایک پردہ اٹھاتا ہوں تو اور درجنوں پردے نظر آنے لگتے ہیں۔"

وہ بھی ہنس پڑی۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ ہمارے ساتھ چلنے والے سپاہی ہمیں ہنستا ہوا دیکھ کر حیران نظر آ رہے ہیں۔ ایسا بے سبب بھی نہیں تھا۔ وہ تو سخت اذیت میں گرفتار تھے اور ہم ہنس رہے تھے۔ ان کا حیران ہونا سمجھ میں آتا تھا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں اور پیاس کے سبب ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں اور سولدہ حسب معمول ہنستے مسکراتے اور باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

فاصلہ کچھ دور اور آگے بڑھا تھا کہ میں نے سپاہیوں کو ایک جانب انگلیاں اٹھاتے دیکھا۔ میں نے بھی اس سمت دیکھا۔ وہ یقیناً" کوئی چھوٹی سی آبادی تھی۔ دور سے ہی کچی دیواروں والے مکان اور کچھ جیسے نما سے گھر نظر آ رہے تھے۔ قافلہ تیزی کے ساتھ اس سمت روانہ ہو گیا۔

آبادی قریب آتے ہی لوگ اس کی جانب دوڑے۔ بادشاہ' اس کی بیوی' سولدہ اور میرے علاوہ سبھی افراد بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ پیاس مجھے بھی لگ رہی تھی لیکن میں اس قدر بے تاب نہیں ہوا تھا کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا مگر قافلے کے سپاہیوں کی حالت ایسی ہی تھی۔ انہیں جیسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا۔ میں اور سولدہ بھی بادشاہ کے ہمراہ اسی آبادی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ابھی ہم آبادی میں داخل ہی ہوئے تھے کہ چیخ و پکار سنائی دی۔ ایک سپاہی پانی کا کوئی برتن لے کر بھاگ اٹھا تھا اور دوسرے اس کے پیچھے چیختے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگے بھاگنے والے سپاہی کو دوسرے سپاہیوں نے پکڑ لیا اور اسے زدوکوب کر کے پانی کا پیالا چھین لیا۔ جب اس سے پانی کا پیالا چھینا جا رہا تھا تو وہ پیالے کو اپنے ہونٹوں سے لگا رہا تھا۔ کچھ پانی پیالے سے گر کر ریت میں جذب ہوا اور شاید کچھ پیالے میں بچا' پھر پیالا چھیننے والے سپاہی آپس میں لڑ پڑے۔ ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ پیالا اسے مل جائے۔ پیالا تو ایک سپاہی کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور تلواریں نیاموں سے باہر نکل آئیں۔

بادشاہ کے چہرے پر انتہائی رنج و غم کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے سپاہیوں کو پانی کے لیے اس طرح لڑتے اور جان دیتے ہوئے دیکھ کر سخت ملول نظر آنے لگا تھا۔

اس ہنگامے میں تین سپاہی اپنی جان سے گئے۔ اس کے بعد جیسے سپاہیوں کو ہوش آ گیا۔ انہوں نے اپنی تلواریں نیاموں میں رکھ لیں اور وحشت زدہ سی نظروں سے مرنے والوں کی لاشوں کو دیکھنے لگے۔

ہنگامہ فرار ہوا تو بادشاہ کی سواری آگے بڑھی۔ اسی وقت سولدہ نے آگے بڑھ کر ایک جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بادشاہ سے کچھ کہا۔ میں نے بھی اس سمت دیکھا۔

اس طرف ایک کنواں تھا۔ آبادی کے بیچوں بیچ۔ کنواں دیکھ کر ایک بار پھر سپاہیوں کا جوش واپس آ گیا۔ وہ لپکتے ہوئے بادشاہ سے پہلے ہی کنویں تک پہنچ گئے۔ کنویں کے پاس ایک بڑا سا ڈول رکھا تھا جس سے رسی بندھی ہوئی تھی۔ ایک سپاہی نے وہ ڈول کنویں میں ڈال دیا۔ ڈول پانی بھرنے کے سبب شاید کافی وزنی ہو گیا تھا اس لیے ایک سپاہی سے نہ کھنچا۔ دو اور سپاہیوں نے ڈول کھینچنے میں مدد دی۔ بقیہ تمام سپاہی کنویں کے

گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے تھے۔

ڈول کے کنوئیں سے باہر آتے ہی سبھی اس پر جھپٹ پڑے اور ایک دوسرے کو دھکے دے کر پیچھے ہٹانے لگے معاً ایک زور کا دھماکا ہوا پھر اس کے بعد دوسرا دھماکا دو سپاہی دھینگا مشتی میں کنوئیں کے اندر جا پڑے تھے۔ کچھ دیر کو سارا ہنگامہ رک سا گیا مگر پیاس نے پھر انہیں اندھا کر دیا ڈول میں بچا کھچا پانی انہیں للچا رہا تھا انہوں نے ڈول میں ہاتھ ڈال ڈال کر چلو میں پانی بھرا اور اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرنے لگے کچھ پانی گرا، کچھ حلق تک پہنچا ڈول دوبارہ کنوئیں میں ڈالا گیا۔

میں اور سولدہ ہمایوں کے قریب کھڑے ہوئے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ دوسرے ڈول کا سارا پانی پی کر ان میں سے کچھ نڈھال ہو کر کنوئیں کے قریب ہی گر پڑے۔ سخت پیاس کے عالم میں بہت سا پانی پی کر ان کا یہی حشر ہونا چاہیے تھا۔

جب تیسری بار بھی انہوں نے پورا ڈول پی لیا تو وہ کنوئیں سے ہٹ گئے اب ہمایوں کنوئیں کی جانب بڑھا اسی وقت سولدہ نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بادشاہ سے کچھ کہا، بادشاہ کے قدم رک گئے، میں نے ڈول کنوئیں میں ڈال کر اکیلے ہی باہر کھینچ لیا۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ ڈول بہت بھاری ہو گا میں نے ڈول کو کنوئیں سے نکالا تو سولدہ کو اپنے قریب پایا اس کے ہاتھوں میں دو بڑے بڑے برتن نظر آ رہے تھے۔ میں نے وہ دونوں برتن پانی سے بھر دیئے، پھر خود پانی پینے کی بجائے ایک برتن اٹھا کر سولدہ کے ہمراہ واپس ہوا دوسرا برتن سولدہ اٹھائے ہوئے تھی۔

سولدہ نے ہمایوں کی بیوی کو اور میں نے ہمایوں کو پانی سے بھرے برتن دیئے، میں جب ہمایوں کی جانب پانی سے بھرا برتن بڑھا رہا تھا اس وقت میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ برتن لے کر مجھ سے کچھ بولا جسے میں نہ سمجھ پایا۔ میرے بجائے سولدہ نے اس کی بات کا جواب دیا۔

ہمایوں اور اس کی بیوی کو پانی پلا کر میں اور سولدہ پھر کنوئیں پر پہنچے تو میں نے سولدہ سے پوچھا کہ ہمایوں مجھ سے کیا کہہ رہا تھا۔

"وہ پہلے تم سے پانی پینے کے لیے کہہ رہا تھا۔" سولدہ نے بتایا

جب میں اور سولدہ سیراب ہو کر لوٹے تو ہمایوں کے قریب چند اجنبی افراد کو دیکھا ہمایوں ان سے کچھ گفتگو کر رہا تھا۔

"یہ اس آبادی کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔" سولدہ، ہمایوں کے قریب پہنچتے ہوئے مجھ سے بولی۔

میں کچھ نہ بولا اور سولدہ ان لوگوں کی باتیں غور سے سننے لگی کچھ دیر بعد میں نے ہمایوں کو اپنے گھوڑے کی پشت سے بندھی ہوئی ایک تھیلی کھولتے ہوئے دیکھا۔ وہ اجنبی اب واپس ہو رہے تھے۔

جب وہ پلٹے تو ان کے ہمراہ ایک لمبا سا عجیب جانور تھا جس کی گردن لمبی تھی اور پشت کا درمیانی حصہ کسی پہاڑ کی چوٹی کے مانند اوپر اٹھا ہوا تھا۔

"یہ یہ کون سا جانور ہے؟" میں نے حیرت کے ساتھ سولدہ سے پوچھا "ایسا جانور میں نے دشت میں کبھی نہیں دیکھا۔"

"اسے اونٹ کہتے ہیں۔" سولدہ نے جواب دیا "ریگستانوں میں سفر کرنے کے لیے عموماً اس زمانے کے لوگ اسی جانور کو استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ کئی کئی دن بغیر پانی پیے سفر کر سکتا ہے۔"

اس عجیب جانور کو بٹھا دیا گیا پھر اس کی پشت پر لکڑی کا لایا ہوا ایک چوکور سا دروازہ رکھ دیا گیا۔ یہ دروازہ وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

اسی وقت ہمایوں نے ان لوگوں میں سے ایک کو تھیلی کھول کر سونے کے کچھ ٹکڑے دیئے اس کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔

جب میں نے ہمایوں کو اس جانور پر سوار ہوتے دیکھا تو میرا جی چاہا کہ میں بھی اس پر بیٹھ کر دیکھوں مگر میں نے اپنی اس خواہش کو دبا دیا وہ شخص بہرحال بادشاہ تھا جو اس جانور پر سوار ہو رہا تھا، اس جانور پر سوار ہوتے وقت ہمایوں نے سولدہ سے کچھ کہا اور سولدہ نے

واب میں اس گھوڑے کی لگام تھام لی جس پر ہمایوں
ی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی آگے بڑھ کر سولدہ
کے قریب پہنچ گیا۔
ب وہ آفت زدہ قافلہ دوبارہ روانہ ہوا تو میں نے سولدہ
کو مخاطب کیا "کیا اس قافلے کی کوئی منزل نہیں۔؟"
"ہے کیوں نہیں۔" سولدہ نے کہا۔ قافلہ اب امر
کوٹ کی طرف جا رہا ہے۔"
"امر کوٹ کیا؟" میں نے پوچھا۔
"یہ یہاں کے ایک شہر کا نام ہے۔" سولدہ نے
بتایا۔
"وہ شہر یہاں سے کتنی منزل پر ہوگا؟" میں نے
دریافت کیا۔
"میرے اندازے کے مطابق تقریباً" تین منزل
پر۔" سولدہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔
"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ابھی تین یا چار
دن کا سفر درپیش ہے۔" میں بولا۔
"اس سے زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں کیونکہ ہم
پیدل چل رہے ہیں۔" سولدہ نے کہا۔
میں اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔
"ہم واپس صحرائے گوبی کیوں نہ چلیں آخر اس
قافلے کے ساتھ ساتھ مارے مارے پھرنے سے کیا
فائدہ؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سولدہ کو مخاطب
کیا۔
"کیوں کیا ہمت ہار گئے؟" وہ مسکرا کر بولی "تم ہی
نے تو کہا تھا کہ تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو۔"
"میں تمہارے ساتھ ہی تو وہاں جاؤں گا۔" میں
نے فوراً کہا۔
"لیکن ابھی وہاں دوبارہ واپس جانا خطرناک
ہے۔" اس بار سولدہ نے سنجیدگی سے کہا۔
"ممکن ہے کہ میرے دشمن بھی اس کی توقع
کر رہے ہوں اور وہاں اس عہد میں میری واپسی کی
منتظر ہوں۔" سولدہ نے بتایا، پھر بولی "ہاں یہ ممکن ہے
کہ ہم کسی اور زمانے کی طرف نکل جائیں لیکن میں
ابھی ایسا بھی نہیں سوچتی۔" اس سے پہلے کہ میں کوئی
سوال کرتا، چند لمحے توقف کے بعد اس نے پھر بولنا
شروع کیا "بوغا! سختیوں اور مصائب کا سامنا کرنے کا
نام ہی تو زندگی ہے۔ مجھے ایسی ہی زندگی سے پیار ہے۔
یہی مصائب، یہی سختیاں مجھے جینے کا حوصلہ دیتے ہیں۔
تو اسے میرے شوق یا تفریح کا نام بھی دے سکتا ہے۔
میں چاہوں تو سکون و اطمینان اور عیش و عشرت میں
بھی زندگی بسر کر سکتی ہوں۔ میں تاریخ کے کسی بھی
ایسے موڑ یا ایسے زمانے تک پہنچ سکتی ہوں جہاں آرام
ہی آرام ہو، مصائب نہ ہوں مگر میں نے ایسا کبھی نہیں
کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میرے دشمن اب تک مجھ پر
ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ میں ہمیشہ ایسے
زمانوں میں سفر کرتی ہوں جو ہنگاموں سے پر ہوں۔
جہاں ہر قدم آلام ہی آلام ہوں۔ آلام و مصائب ہی تو
میری زندگی ہیں۔"
اس کے بعد میں نے سولدہ سے اس بارے میں کچھ
نہیں کہا، کیونکہ میں اس کی بات پوری طرح سمجھ چکا
تھا اور اس کی تفریح برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔
قافلہ سبک خرامی سے آگے بڑھتا رہا اور اسی میں
شام ہو گئی۔ شام ہوتے ہوتے پیدل چلنے کے سبب
میری بھوک بھی چمک اٹھی تھی۔ اس دن میں نے پانی
پینے کے سوا کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ دوسرے افراد کا
حال بھی مجھ سے کچھ مختلف نظر نہیں آتا تھا۔
اندھیرا ہونے سے قبل ہی قافلہ رک گیا۔ ایک
مناسب جگہ دیکھ کر بادشاہ کا خیمہ بھی لگا دیا گیا اور بادشاہ
اپنی بیوی کے ہمراہ خیمے میں چلا گیا۔ بادشاہ کے دونوں
خادم مر چکے تھے اس لیے اب ان کی جگہ میں ہی اس
کی خدمت میں تھا۔ میں اور سولدہ دونوں ہی بادشاہ کے
ساتھ خیمے میں تھے۔ ہمارے علاوہ وہ بوڑھی عورت
بھی خیمے کے دوسرے حصے میں بادشاہ کی بیوی کے پاس
تھی جو پہلے سے اس کے ساتھ تھی۔ راستے میں سولدہ
نے مجھے اس عورت کے بارے میں بھی بتایا تھا۔
بادشاہ نے اس عورت کا دودھ پیا تھا اور اسی لیے اسے
بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس کا درجہ بادشاہ کی ماں جیسا تھا۔
خیمے میں آئے ہمیں زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ باہر
ایک شور سنائی دیا۔ ہمایوں نے مجھے ہاتھ سے اشارہ
کیا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور خیمے سے باہر نکل

کر دیکھا۔

کچھ سپاہی کہیں سے ایک گائے پکڑ لائے تھے اور اب اسے پچھاڑ کا کاٹ ڈالنا چاہتے تھے۔ میں نے ان کے ہاتھوں میں برہنہ تلوار دیکھی تھیں۔

میں یہ دیکھ کر خیمے کی طرف واپس ہوا اور اسی وقت مجھے خیال آیا کہ میں بادشاہ کو اس شور کا سبب کیسے بتا سکوں گا؟ میں یہی سوچتا ہوا خیمے میں داخل ہو گیا۔ بادشاہ کو غالباً" اس بات کا احساس پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ایک عجیب سا نام لیا۔ جب اس کے جواب میں مجھے سولدہ کی آواز سنائی دی تو میں سمجھ گیا کہ اس نے سولدہ کو ہی پکارا تھا۔

سولدہ خیمے کے دوسرے حصے کا پردہ اٹھا کر سامنے آ گئی۔ بادشاہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کچھ کہا۔

"شور کا سبب کیا تھا؟۔" سولدہ نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے جواب دے دیا جب سولدہ نے اس اجنبی زبان میں بادشاہ سے دہرایا۔ بادشاہ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

"سنو!" میں نے سولدہ کو اپنے قریب بلایا۔

"کیا بات ہے؟۔" اس نے میرے پاس آ کر کہا۔

"ابھی بادشاہ نے تمہیں جس نام سے پکارا تھا' کیا وہی تمہارا نام ہے؟ تم نے بادشاہ کو اپنا نام بتایا ہو گا۔" میں نے مدہم لہجے میں کہا۔ ہر چند کہ بادشاہ' میرے اور سولدہ کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن مدنظر اس کا احترام تھا' کیونکہ وہ اسی خیمے میں ہم سے کچھ فاصلے پر موجود تھا۔

میری بات سن کر سولدہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی پھر وہ بولی۔ "میرے بارے میں سب کچھ جان لینے کی تجھے اتنی جلدی کیوں ہے؟۔"

"میں نے اب تک تیرے بارے میں جانا ہی کیا ہے۔ مجھے تو اب سے پہلے تیرا نام تک معلوم نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"بوغا! مختلف زمانوں میں میرے مختلف نام ہیں۔ تو کیا کیا نام یاد رکھے گا۔ کل جب ہم کسی اور زمانے میں

ہوں گے تو میرا کوئی اور نام ہو گا۔ بادشاہ نے مجھ
میرا نام پوچھا تھا اور جو نام پہلے میرے ذہن میں آ
میں نے بتا دیا۔ ہاں میں نے یہ خیال ضرور رکھا تھا
نام اس عہد کا نام ہو۔" سولدہ یہ کہہ کر خاموش ہو
پھر بولی۔ "اچھا اب میں اندر جاتی ہوں۔ تو اس گا
گوشت لانے کی کوشش کر جسے سپاہیوں نے
ہے۔"

سولدہ خیمے کے دوسرے حصے کی طرف بڑھ گئی
میں خیمے کے در کی طرف چل دیا۔

افراد کم تھے اور گوشت زیادہ اس لیے مجھے یا
کے لیے گوشت حاصل کرنے میں کوئی مشکل
ہوئی۔ میں گوشت لے کر خیمے میں داخل ہوا اور
کو آہستہ سے پکارا' کیونکہ بادشاہ تکیے سے ٹیک لگ
للائے اونگھ گیا تھا۔

سولدہ نے اور میں نے گوشت کو آگ پر بھونا
بادشاہ اور اس کی بیوی کے سامنے رکھ دیا۔ ان د
نے پیٹ بھر لیا تو اس بڑھیا کو بھی ہم نے گوشت
دیا جو اب تک صبر کیے بیٹھی تھی۔ اس کے بعد
نے اور سولدہ نے گوشت کھایا۔

سپاہیوں نے قریب ہی ایک پانی کا جوہڑ بھی
کر لیا تھا جہاں سے پانی لا کر پیا گیا۔

کھانے سے فراغت پا کر میری آنکھیں تھک
نیند سے بند ہونے لگیں۔ بادشاہ پہلے ہی سو چکا
میں بھی خیمے کے در سے قریب ہی پڑ رہا' اور پھر
آنکھ اسی وقت کھلی جب ایک شور بلند ہوا۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور تیزی کے ساتھ خیمے
باہر نکلا۔ باہر صبح کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ خیمے سے
ہی مجھے ایک جانب کالا غبار سا نظر آیا اور اسی
ساتھ میرا ہاتھ اپنی تلوار کے قبضے پر پہنچ گیا۔ اس
کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دیر نہیں
تھی کہ کیا ماجرا ہے۔

غبار قریب ہی آتا گیا' اور جب غبار بیٹھا
متعدد گھڑ سوار نظر آئے۔ میرا خیال غلط نہیں تھا
ان گھڑ سواروں کے آگے آگے ایک گھوڑ

کوئی نوجوان عجیب سا لباس پہنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سر پر بھی جال دار عجیب سا تاج رکھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر مجھے ایک رنگین داغ نظر آرہا تھا۔

اس نوجوان نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور بلند آواز میں بجلی کی طرح کڑکا۔ سولدہ بھی اب خیمے سے نکل کر میرے قریب ہی آکھڑی ہوئی تھی۔ اس نوجوان گھڑ سوار سے کچھ فاصلے پر گائے کی کھال اور اس کا کٹا ہوا سر پڑا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اور کون ہے؟" میں نے سولدہ کی طرف مڑ کر اس سے پوچھا۔

"یہ راجہ جودھپور کا بیٹا ہے۔" سولدہ نے بتایا۔ "یہ سوال کر رہا ہے کہ ہم لوگ اس کی حدود میں بغیر اجازت کیوں داخل ہوئے۔؟"

اسی دوران میں ہمایوں بھی اپنے خیمے سے باہر نکل آیا تھا اور حیرت سے صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔

معاً" اس نوجوان نے اپنے سپاہیوں سے کچھ کہا اور ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے تقریباً" نصف سپاہی اپنے گھوڑے آگے بڑھا لائے اور دائرے کی صورت میں پھیل کر تمام قافلے کے سپاہیوں کو اپنے گھیرے میں لینے لگے۔

اس وقت قافلے کے سپاہیوں کو نہ جانے کیا سوجھی کہ ایک دم قریبی جنگل کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ حملہ آور سپاہی ان پر اس طرح جھپٹے جیسے شکرا کبوتر پر جھپٹتا ہے۔

میں نے بادشاہ کو بھی خیمے کی جانب بھاگتے دیکھا' اور پھر مجھے سولدہ بھی اس کے ساتھ خیمے کی طرف جاتی نظر آئی۔ میں نے بھی ادھر ہی کا رخ کیا۔

خیمے کو اسی طرح وہیں چھوڑ کر بادشاہ' اپنی بیوی کو لے کر ہمارے ہمراہ خیمے کا پچھلا پردہ اٹھا کر گھنے جنگل میں گھس گیا۔ بادشاہ کے ساتھ ہی دو تین سپاہی اور بھی اسی طرف دوڑے تھے۔ ایک عجب افراتفری کا عالم تھا۔

دور سے لوگوں کی چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ حملہ آور سپاہی' قافلے والوں کو قتل کر رہے تھے۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک جوہڑ نظر پڑا۔ غالباً" یہ وہی جوہڑ تھا جو قافلے کے سپاہیوں نے تلاش کیا تھا۔ ہم سب ہی پیدل بھاگ رہے تھے اور ان بھاگنے والوں میں بادشاہ کی حاملہ بیوی بھی تھی جو شاید اپنی ساری زندگی میں کبھی اس طرح اور اس حال میں نہ بھاگی ہوگی۔ اسے بھاگنے میں یقیناً" دقت پیش آرہی تھی اور اس بڑھیا کا حال بھی برا تھا جو سولدہ کی دائیں جانب لرزتی کانپتی بھاگ رہی تھی۔ سولدہ ایک ہاتھ سے بادشاہ کی بیوی کا بازو تھامے اور دوسرے سے بڑھیا کی کلائی پکڑے بھاگ رہی تھی۔

ابھی ہم جنگل میں زیادہ اندر نہیں گئے تھے کہ معاً" گھوڑے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ وہ آواز قریب آتی جارہی تھی۔

ہم اور بھی تیز دوڑنے لگے۔ یقیناً" دشمن ہمارے تعاقب میں تھا۔ بادشاہ کی بیوی اور وہ بڑھیا اب مزید دوڑنے کے قابل نہیں تھیں۔ آخر کار وہ دونوں تیز تیز سانسیں لیتی ہوئی ایک جگہ رک ہی گئیں۔ وہ دونوں ہی تیورا کر زمین پر گرنے والی تھیں کہ سولدہ نے انہیں تھام لیا اور زمین پر بٹھا دیا۔ بادشاہ دوڑتا ہوا آگے نکل گیا تھا' اس کے قدم بھی رک گئے اور اسی کے ساتھ میں بھی رک گیا۔ جو دو تین سپاہی ساتھ ہو لیے تھے وہ نہ رکے اور بھاگتے ہوئے آگے چلے گئے۔

میں نے بادشاہ کی آنکھوں میں بے بسی دیکھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی بیوی کے پاس جارہا تھا اور میں اس کے پیچھے تھا۔ ابھی وہ اس جگہ تک نہ پہنچ سکا تھا جہاں اس کی بیوی زمین پر بیٹھی ہوئی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی کہ دشمن سر پر آپہنچا۔

دور ہی سے تیز اور بلند آواز میں کسی نے کچھ کہا' اور پھر مجھے وہ نوجوان نظر آگیا جسے سولدہ نے راجہ جودھپور کا بیٹا بتایا تھا۔ وہ ایک پیڑ کی آڑ سے نکل کر سامنے آگیا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں ایک سفید

پرچم تھا۔ اس کے ساتھ کافی سپاہی تھے۔

وہ نوجوان اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر بادشاہ کے سامنے پہنچا اور اس سے مخاطب ہوا۔ بادشاہ نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہا۔ بادشاہ کے لہجے میں عجیب سی رقت تھی اس نے بات کا جواب دیتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف بھی ہاتھ اٹھا کر کچھ کہا تھا۔

میں حیران ہوا کہ اس نوجوان نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑتے ہوئے بادشاہ سے کچھ کہا اور اپنے سپاہیوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ مجھے اس وقت بھی شدید حیرت ہوئی جب حملہ آور نوجوان اپنے سپاہیوں کو لے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں اس کا سبب جاننے کے لیے بے چین تھا اس لیے میں آگے بڑھ کر سولدہ کے قریب پہنچا اور اسی وقت بادشاہ نے سولدہ سے کچھ کہا۔ سولدہ نے گردن ہلائی' اور پھر بادشاہ کی بیوی کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔

واپسی کا سفر شروع ہوا اور اسی دوران میں مجھے سولدہ سے گفتگو کا موقع مل گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نوجوان کو بادشاہ کے حال پر رحم آگیا تھا اور اس نے بادشاہ کو آگے جانے اجازت دے دی تھی۔ اس نوجوان نے گائے کاٹنے پر بھی جواب طلبی کی تھی۔ مجھے سولدہ سے یہ بات سن کر تعجب ہوا کہ وہ لوگ گائے کی پوجا کرتے تھے۔

ہم کچھ دیر بعد اس جگہ واپس پہنچے جہاں بادشاہ کا خیمہ لگایا گیا تھا۔ خیمے کے سامنے سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اس دوران میں کچھ اور زندہ بچ جانے والے سپاہی بھی جنگل سے نکل کر خیمے کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن ان کی تعداد اب صرف پانچ رہ گئی تھی۔

آٹھ دس افراد پر مشتمل وہ لٹا پٹا قافلہ دوبارہ روانہ ہوا لیکن اب تعاقب کا خوف نہیں تھا اس لیے سبھی مطمئن تھے۔

وہ پورا دن سفر میں گزر گیا اور رات ہو گئی۔ پھر پڑاؤ کیا گیا۔ رات گزار کر پھر سفر شروع ہوا۔ آخر کار تیسرے دن شام ہوتے ہوتے ایک آبادی دکھائی دی اور پتا چلا کہ وہی امرکوٹ تھا۔

قافلہ اس شہر میں داخل ہوا تو میری عقل دنگ رہ گئی۔ میں نے اب تک دشت کے کچھ شہر دیکھے تھے مگر وہ شہر اور اس میں بسنے والے مجھے بڑے عجیب دکھائی دیے۔ مجھے طرح طرح کی عجیب و غریب سواریاں بھی نظر پڑیں۔ میرے لیے سب ہی کچھ اجنبی اور پراسرار تھا۔ میرے لیے یہ بڑی حیرت کا مقام تھا کہ اس شہر میں مجھے کوئی یورت نظر نہیں آرہا تھا۔ وہاں ہر طرف زیادہ تر پختہ "محل" بنے ہوئے تھے۔ میں اس شخص کی امارت سے بہت متاثر ہوا جو اس شہر کا راجہ تھا۔

بادشاہ اس عجیب جانور پر بیٹھا ہوا آگے آگے چل رہا تھا جس کا نام سولدہ نے بتایا تو تھا مگر مجھے یاد نہ رہا تھا۔ اس عجیب جانور کے پیچھے وہ گھوڑا تھا جس پر بادشاہ کی بیوی چادر سے اپنا سارا جسم ڈھانپے بیٹھی تھی۔ میں اور سولدہ اسی گھوڑے کے آگے آگے پیدل چل رہے تھے۔ گھوڑے کے پیچھے بقیہ افراد تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خواب کے عالم میں کسی جادوئی شہر سے گزر رہا تھا۔

امرکوٹ کے راجہ کو شاید پہلے ہی شہر میں بادشاہ کی آمد سے باخبر کر دیا گیا تھا اس لیے جب ہم اس کے عظیم الشان محل تک پہنچے تو وہ بذات خود بادشاہ کی پذیرائی کے لیے محل کے دروازے پر موجود تھا۔

بادشاہ نے اپنے جانور کو زمین پر بٹھایا اور نیچے اترا۔ راجہ نے جھک کر تین بار اسے تعظیم دی۔ راجہ کے ساتھ ہی شاید اس کی رانی بھی تھی اور وہ بھی بادشاہ کے سامنے تعظیماً تین بار جھکی تھی۔

میں نے راجہ اور رانی کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں محسوس کر لیا کہ ان کی عمروں میں کافی فرق تھا۔ رانی اور راجہ دونوں ہی کے جسموں پر عجیب اور خوبصورت پوشاکیں تھیں اور سر پر جال دار تاج رکھے ہوئے تھے۔

رانی جب بادشاہ کی بیوی کو سہارا دے کر گھوڑے سے اتار رہی تھی تو میری نگاہ اس سے ملی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور دراز پلکوں میں جانے کیا جادو تھا

کہ میں اسے دیکھتا رہ گیا اور میں نے سوچا کہ حسن صرف دشت ہی تک محدود نہیں' اس سے باہر بھی موجود ہے۔ بلاشبہہ رانی کا متناسب جسم بے حد حسین تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ خود رانی کی نگاہ بھی میرے چوڑے سینے اور بھرے بھرے بازوؤں پر پڑی تھی اور کچھ دیر کو اس کا بھی وہی حال ہوا تھا جو میرا۔ وہ بھی مجھے ایک ٹک دیکھتی رہ گئی تھی۔ یہ صرف گنتی کے چند لمحوں کی بات تھی اور ان چند لمحوں میں مجھے سولدہ کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ جو میرے قریب ہی کھڑی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ رانی' سولدہ سے زیادہ حسین ہرگز نہیں تھی لیکن اس میں کچھ ایسی ہی ملاحت اور کشش تھی جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایسا سحر تھا کہ چند لمحے کو میں سولدہ تو کیا اپنے وجود کو بھی فراموش کر بیٹھا تھا۔

امرکوٹ کا راجہ نمک حرام نہیں تھا۔ اس لیے اس نے بادشاہ کی پذیرائی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ بادشاہ کو اس نے اپنے محل میں الگ کمرہ دیا اور اس کی بیوی کو الگ۔ بادشاہ کی خدمت پر میں تھا۔ اس کی بیوی کے ساتھ سولدہ اور بوڑھی عورت تھی۔ بقیہ سپاہیوں کے قیام کا بندوبست الگ کیا گیا تھا۔

راجہ کا محل دیکھ کر بھی میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ میں جیسے خوابوں کی دنیا میں آگیا تھا اور ایک ایک شے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

ابھی رات زیادہ نہیں گزری تھی اور بادشاہ بیدار تھا۔ میں بھی نہیں سویا تھا۔ میرا بستر بادشاہ کی خوابگاہ کے باہر بچھایا گیا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ بادشاہ سے اشاروں ہی اشاروں میں اجازت لے کر سونے چلا جاؤں کہ سولدہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے سے انتہائی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے آتے ہی بادشاہ سے کچھ کہا اور بادشاہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ بادشاہ نے فوراً اپنی کمر پر ہاتھ ڈالا اور پٹکے سے بندھی ہوئی کوئی چیز کھول کر پہلے سولدہ کو دی پھر مجھے۔

وہ اون جیسی کوئی تھے' تھی جو انتہائی خوشبودار تھی۔ ایسی خوشبو میں نے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ میں نے سوالیہ نگاہ سے سولدہ کو دیکھا اور پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"مشک!" سولدہ نے جواب دیا اور الٹے قدم کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔

میرے دل میں شدید تجسس تھا اس لیے میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ میں اس کی اور بادشاہ کی خوشی کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ آخر وہ برگشتہ نصیب بادشاہ ایک دم اتنا خوش کیوں نظر آنے لگا تھا۔

میں کمرے کے دروازے سے نکلتے ہی دوڑ کر سولدہ تک پہنچا جو تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ایک طرف جا رہی تھی۔

"کیا بات ہے بوغا؟" اس نے پلٹ کر پوچھا۔

"مجھے بھی تو بتاؤ کہ تم اتنی خوش کیوں نظر آرہی ہوں؟" میں نے سوال کیا۔

"بادشاہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہے اور اسی خوشی میں اس نے شگون کے طور پر مجھے اور تمہیں خوشبو دی ہے۔" سولدہ نے جواب دیا' پھر بولی۔ "اب تم جاؤ اور سو جاؤ۔ رات کافی ہو گئی ہے۔"

"اچھا!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ اور لوٹ آیا۔ اب میں سمجھ چکا تھا کہ بادشاہ ایک دم خوش کیوں نظر آنے لگا تھا۔

میں دوبارہ بادشاہ کی خواب گاہ میں پہنچا اور اشارے سے سونے کی اجازت چاہی۔ اس نے جواب میں ہاتھ اور گردن ہلا کر مجھے اجازت دے دی۔ میں خواب گاہ سے نکل کر باہر آگیا۔

میرا آرام دہ بستر خواب گاہ کے باہر کے دروازے سے ذرا ہٹا کر بچھایا گیا تھا۔ میں اس پر دراز ہو گیا۔ مسلسل پیدل سفر کرنے کے بعد پہلی بار پورا آرام ملا تھا اس لیے میری آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہوتی چلی گئیں۔

بیدار ہونے کے بعد میرا پہلا احساس یہ تھا کہ کوئی مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر

اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک عورت تھی جو مجھ سے بار بار ایک ہی جملہ دہرا کر اٹھنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں نہ اس کی کوئی بات سمجھ سکتا تھا اور نہ ہی اس سے کچھ کہہ سکتا تھا اس لیے اٹھ کر بیٹھ جانا ہی غنیمت جانا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے یہ ظاہر کیا کہ اس عورت کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی مگر وہ مدہم لہجے میں بولتی ہی رہی۔ بہت جلد اسے بھی یہ احساس ہو گیا کہ میں اس کی بات قطعی نہیں سمجھ پا رہا۔ اس نے کچھ کہنے کی بجائے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ جب میں اٹھ کھڑا ہوا تو ہاتھ ہی کے اشارے سے اس نے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

میں کچھ بھی نہ سمجھ پایا تھا کہ وہ عورت کون ہے اور مجھے کہاں لے جانا چاہتی ہے۔ اس کے باوجود میں اس کے ساتھ چل دیا۔ میری تلوار حسب معمول کمر سے بندھی ہوئی تھی اس لیے مجھے اس عورت کے ساتھ جاتے ہوئے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا۔

محل میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پیالوں میں روشنیاں جل رہی تھیں اور وہ پیالے مٹی کے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے سے مٹی کے پیالے دیکھ کر مجھے اس وقت بھی حیرت ہوئی تھی جب میں محل میں داخل ہوا تھا۔ وہ مٹی کے روشن پیالے میرے لیے بڑے عجیب تھے۔

میں اس ادھیڑ عمر عورت کے ہمراہ مختلف راہداریوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا' پھر وہ عورت ایک پتلی سی راہداری میں داخل ہو کر رک گئی۔ میں بھی رک گیا۔ وہ عورت ایک کمرے کے دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دے رہی تھی۔

چند لمحے بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ اندر بھی روشنی تھی اور اس روشنی میں مجھے ایک ایسا چہرہ نظر آیا تھا کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے رانی نے بلایا ہو گا۔ میں ابھی عالم حیرت ہی کھڑا تھا کہ رانی نے اپنا نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھایا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے سارے وجود میں جیسے برق سی کوند گئی۔ اس کے ہاتھ کا لمس جیسے مجھے دیوانہ بنا گیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر بلا لیا اور میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ ادھیڑ عمر عورت باہر ہی رہ گئی۔

وہ مجھے لیے ایک جانب بڑھی اور اسی وقت اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ میں سحر زدہ سا اسے دیکھنے لگا۔ وہ پھر کچھ بولی مگر اس بار بھی میں کچھ نہ سمجھا۔ مجھے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔

مجھے اپنے ساتھ لیے وہ ان ریشمی پردوں تک پہنچ گئی جن کے بیچوں بیچ کسی اونچی چیز پر اس کا بستر بچھا ہوا تھا۔

وہ میرے ساتھ مجھ سے بالکل لگ کر بستر پر بیٹھ گئی' پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ وہ ایک دم میری گود میں سر رکھ کر بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں میرے چہرے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور ایک ہاتھ میرے گریبان میں داخل ہو کر سینے پر موجود بالوں سے کھیل رہا تھا۔ میری ماں کے بعد وہ پہلی عورت تھی جس نے میرے سینے کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تھا۔ وہ میرے سینے کے بالوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر نہ جانے کیا بڑبڑا رہی تھی جسے سمجھنا میرے لیے محال تھا۔ اس کے یاقوت کی طرح دمکتے ہونٹ ہل رہے تھے اور میں اس کی آنکھوں کے سحر میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا کہ معاً میں نے ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنی اور اچھل پڑا۔ وہ بھی اچانک چونک کر بجلی کی طرح تڑپی تھی اور اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

مجھے فوری طور پر شدید خطرے کا احساس ہوا تھا' اور پھر میں نے خطرے کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ امرکوٹ کا راجہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مجھے قہر آلود نگاہ سے گھور رہا تھا اور اس کا ہاتھ اس کی تلوار کے قبضے پر تھا۔

♥ ♥

راجہ نے چیختے ہوئے کچھ کہا۔ پتا نہیں اس کی مخاطب رانی تھی یا میں! پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی تلوار نیام سے نکالی اور میری طرف جھپٹا۔ میری تلوار کمر ہی سے بندھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ راجہ مجھ تک پہنچ پاتا' میں نے بھی تلوار نکال لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے بڑے بچکانہ سے انداز میں تلوار سے مجھ پر حملہ کیا جسے روکنا میرے لیے قطعی مشکل ثابت نہ ہوا۔ اب میری باری تھی لیکن شاید وہ ہوشیار ہو چکا تھا اور جان چکا تھا کہ اس کا مقابلہ کسی اناڑی سے نہیں' وہ تیزی سے پیچھے ہٹ کر میرا وار بچا گیا۔

میرا مقصد اسے ہلاک کرنا نہیں تھا اس لیے میں زیادہ تر اس کے وار بچانے ہی کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اس کے ہاتھ سے تلوار نیچے گرا دوں۔ میرا ذہن بے حد الجھا ہوا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں! یہ تو میں بخوبی سمجھ چکا تھا کہ جو کچھ بھی ہوا ہے' اس کا سبب غلط فہمی ہے اور یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی ذمہ دار رانی ہے۔ اس نے مجھے جس غرض سے اپنی خوابگاہ میں بلایا تھا' وہ بھی میں سمجھ چکا تھا۔ راجہ سے لڑتے ہوئے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ راجہ کو حقیقت کا علم ہو جائے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب سولدہ' راجہ کو اس کی زبان میں پوری بات سمجھا سکتی۔ میں نے سوچا تھا راجہ کے ہاتھ سے تلوار گرنے کے بعد میں خوابگاہ سے فرار ہو کر سولدہ کے پاس پہنچ جاؤں گا اور اسے ساری بات بتا دوں گا۔

میں راجہ کے وار بچاتا ہوا پیچھے ہٹ رہا تھا کہ معاً میرے جسم کا توازن برقرار نہ رہ سکا۔ میرا پاؤں کسی گڑھے میں جا پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا' اس گڑھے میں لڑھکتا چلا گیا۔ لڑھکتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ میں نے اسی دوران میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنی مگر میں اس کا سبب اسی وقت جان سکا جب سیڑھیوں سے لڑھک کر نیچے پختہ فرش پر گرا۔ وہ گڑھا اوپر سے بند ہو چکا تھا۔ میں جس زینے سے نیچے پہنچا تھا اس کے اختتام پر اب غالباً ایک بھاری پتھریلی سل آ چکی تھی۔

میں اس وقت ایک سرنگ میں تھا اور سرنگ کے اندر روشنی تھی' کیونکہ سرنگ کی دیوار میں ایک جانب مشعل پیوست تھی جو روشن تھی۔

اس سرنگ کا یقیناً" کوئی دوسرا دہانہ بھی ہو گا۔ میں نے سوچا۔ وہ دہانہ بھی لازماً" محل ہی میں ہو گا کیونکہ راجہ اسی سرنگ کے ذریعے رانی کی خوابگاہ میں پہنچا تھا۔ میں سرنگ کے دوسرے دہانے سے با آسانی فرار ہو کر سولدہ تک پہنچ سکتا تھا مگر اس کے ساتھ میں اس خطرے سے بھی غافل نہیں تھا کہ مجھ پر عقب سے بھی حملہ کیا جا سکتا ہے۔

میں چوکنا انداز میں تلوار تھامے سرنگ کی مخالف سمت روانہ ہو گیا۔ جب میں نے کافی فاصلہ طے کر لیا اور عقب سے حملہ نہ ہوا تو میں سمجھ گیا کہ شاید اس سرنگ کے دہانے پر موجود پتھریلی سل کو رانی کی خوابگاہ میں رہ کر ہٹایا جانا ممکن نہیں ہو گا۔ اس سرنگ کے ذریعے خوابگاہ میں جا کر دوبارہ واپس آنے کے بعد باہر سے نہ کھولا جا سکتا ہو گا۔ وہ طلسماتی نظام مجھے بڑا عجیب اور پراسرار سا محسوس ہوا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سرنگ کے دوسرے سرے پر پہنچ گیا۔ وہاں بھی میں نے ایک زینہ دیکھا جس پر میں بلا جھجک چڑھنے لگا۔ ابھی میں نے زینے کی تیسری سیڑھی پر ہی قدم رکھا تھا کہ چونک پڑا۔ میری سماعت سے ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز ٹکرائی تھی۔ اسی طرح کی آواز میں پہلے بھی دوبار سن چکا تھا۔

میں نے اوپر نگاہ اٹھائی۔ آواز اوپر ہی سے آئی تھی۔ مجھے وہاں سیڑھیوں کے اختتام پر ایک روشن خلا نظر آیا۔ اس خلا سے روشنی نیچے بھی آ رہی تھی۔ میں ایک لمحے رک کر پھر اوپر چڑھنے لگا۔

پھر جیسے ہی میں زینے سے نکل کر ایک سجے سجائے سے کمرے میں پہنچا' مجھے چاروں طرف سے مسلح سپاہیوں نے گھیرے میں لے لیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا' بیک وقت متعدد تلواروں کی نوکیں

میرے جسم سے آ لگیں اور اسی حیرت کے لمحے میں کسی نے میرے ہاتھ سے تلوار بھی چھین لی۔

مجھے بے دست و پا کر کے رسیوں میں جکڑ دیا گیا۔ جب سپاہی اپنے کام سے فارغ ہو کر الگ ہٹے تو میں نے وہاں راجہ کو دیکھا۔ وہ بڑی قہر آلود نگاہ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سپاہیوں کو کوئی حکم دیا۔

سپاہیوں نے راجہ کا حکم سن کر مجھے کسی گٹھری کی طرح فرش سے اٹھا لیا اور اس کمرے سے نکل گئے۔ مختلف نیم تاریک راہداریوں سے گزرتے ہوئے وہ مجھے محل سے نکال لے گئے۔

محل سے نکل کر انہوں نے مجھے ایک گھوڑے کی پشت سے باندھ دیا۔ ہر طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ سپاہیوں کا دستہ مجھے لے کر ایک جانب روانہ ہو گیا۔

کیا وہ مجھے محل سے کہیں دور لے جا کر قتل کر دیں گے؟ میں نے سوچا اور یہ بھی سوچا کہ کیا سولدہ اپنی پر اسرار قوتوں کے ذریعے مجھے بچا لے گی؟ کیا اسے معلوم ہو جائے گا کہ مجھ پر کیا بیت چکی ہے؟

وہ سفر نہ جانے کتنی دیر جاری رہا مگر جب سفر ختم ہوا تو میں نے خود کو ایک بڑی سی پتھریلی عمارت کے سامنے پایا جس کے درمیان میں بڑا سا پھاٹک تھا۔

مجھے گھوڑے کی پشت سے کھول لیا گیا تھا لیکن میرا جسم اب تک رسیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ سپاہیوں نے مجھے اٹھا لیا اور اس پھاٹک کے سامنے پہنچ کر زمین پر ڈال دیا۔

ایک سپاہی نے پھاٹک پر دستک دی تو کچھ دیر بعد پھاٹک کا ایک حصہ کھلا جو کسی کمرے کے چھوٹے سے دروازے کی طرف دکھائی دے رہا تھا۔ اس دروازے سے دو سپاہی باہر نکلے مجھے اپنے ساتھ لے کر آنے والے سپاہیوں نے اس عمارت کے سپاہیوں سے کچھ کہا اور پھر مجھے ان کے سپرد کر کے لوٹ گئے۔

ان دونوں سپاہیوں نے مجھے اٹھایا اور پھاٹک کے اندر لے گئے جہاں اور بھی مسلح سپاہی نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں نے مجھے لے جا کر بے دردی سے زمین پر ڈال دیا جس سے میرے دائیں کولھے میں شدید ضرب آئی اور میرے منہ سے ہلکی سی سسکاری نکل گئی۔ ان دونوں نے پھاٹک کا ذیلی دروازہ اندر سے بند کیا اور اپنے ساتھی سپاہیوں سے کچھ کہا۔

دو نئے سپاہی مجھے اٹھا کر عمارت کی اندرونی سمت چل دیے۔ وہ مجھے اٹھائے ہوئے بائیں جانب ایک طرف جا رہے تھے جہاں روشنی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ روشنی کے قریب پہنچ گئے وہ روشنی ایک مشعل کی تھی۔

وہاں مجھے راہداری میں چند مسلح سپاہی نظر آئے۔ دونوں سپاہیوں نے مجھے ان کے سامنے ڈال کر کچھ کہا اور بغیر کچھ سنے واپس ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ میرے ساتھ یہ کھیل کھیلا جا رہا تھا! اگر وہ مجھے قتل ہی کرنا چاہتے تھے تو پھر وہاں لے کر کیوں آئے تھے؟ کیا ابھی راجہ مجھے زندہ رکھنا چاہتا ہے؟ مگر کیوں؟ میرے ذہن میں مختلف سوالات گردش کرتے رہے۔ جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اسی دوران میں میری نظریں دائیں جانب اٹھی یہاں مجھے ایک سلاخ دار دروازہ نظر آ رہا تھا۔ دروازے کے برابر والی دیوار میں ایک روشن مشعل پیوست تھی۔ ایک سپاہی اس سلاخوں دار دروازے پر پڑا ہوا بڑا سا قفل کھولنے کی کوشش کر رہا تھا جو شاید زنگ آلود تھا۔

قفل کھول کر اس سپاہی نے دروازہ کھولا' پھر اپنے ساتھیوں سے مڑ کر کچھ بولا۔ میرے قریب موجود چار سپاہیوں میں سے دو سپاہیوں نے مجھے اٹھا لیا اور اس دروازے کی طرف بڑھے مجھے دروازے تک پہنچ کر سیڑھیاں نظر آئیں جو نیچے جا رہی تھیں۔

"وہ ایک چھوٹا سا زینہ تھا جس سے اتر کر وہ مجھے لیے ہوئے ایک چھوٹی سی راہداری میں چلے جس کی دونوں جانب چھوٹی چھوٹی سی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جو خالی تھیں۔ کوٹھریوں کے دروازے بھی سلاخوں دار تھے اور ان پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ اس چھوٹی سی راہداری میں صرف ایک مشعل روشن تھی۔ کوٹھریوں کی تعداد نصف درجن تھی۔

مجھے انہی کوٹھریوں میں سے ایک کا دروازہ کھول کر اندر پھینک دیا گیا' اور پھر دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد سپاہی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ مجھے ان کے دور ہوتے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی پھر کچھ دیر بعد یہ آوازیں بھی معدوم ہو گئیں اور سناٹا چھا گیا۔ اب میں اس قید خانے میں تنہا تھا۔ راہداری میں جلتی ہوئی مشعل کی کچھ روشنی کوٹھری کے اندر بھی آ رہی تھی لیکن میرا جسم مکمل تاریکی میں تھا۔

میں نے اپنے جسم پر کسی ہوئی رسیوں کی گرفت کو آزمایا۔ گرفت سخت تھی اور میں کسی صورت بھی اس سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اس عالم میں رانی پر شدید غصہ آنے لگا جس کے سبب میں اس عذاب میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ بو الہوس عورت اگر مجھے اپنی خوابگاہ میں نہ بلواتی تو میں اس مصیبت سے دوچار نہ ہوتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید اس عورت پر راجہ کو شبہ رہا ہو گا اسی لیے تو وہ خفیہ سرنگ کے ذریعے عین وقت پر رانی کی خوابگاہ میں پہنچ گیا تھا۔

میں نہ جانے کب تک انہی خیالوں اور سوچوں میں گھرا رہا اور چونکا اس وقت جب میں نے قریب ہوتی قدموں کی چاپ سنی۔ میں نے چاپ سے اندازہ لگایا کہ آنے والی کئی تھے پھر میں نے ایک تیز اور برہم نسوانی آواز سنی اور چونک پڑا' یہ آواز یقیناً" اسی منحوس اور بو الہوس عورت کی تھی جس نے مجھے مصیبت میں پھنسا دیا تھا مگر اس وقت وہ آواز سن کر مجھے نفرت نہیں ہوئی بلکہ امید بندھی کہ شاید وہ مجھے رہا کرانے آئی ہے۔

قدموں کی چاپ میری کوٹھری کے سامنے آ کر رک گئی۔ آنے والے تین تھے۔ دو سپاہی اور تیسری وہ عورت! مجھے اس عورت کے چہرے پر انتہائی غصے کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ ان دو سپاہیوں میں سے ایک نے میری کوٹھری کے دروازے پر پڑا ہوا قفل کھولا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور میں سمجھا کہ بس اب رہائی کا لمحہ آ گیا مگر جب میں نے دروازہ کھلتے ہی ایک ناقابل یقین منظر دیکھا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ ان سپاہیوں نے دروازہ کھلتے ہی رانی کو اندر دھکا دے دیا تھا اور فوراً" باہر سے دروازہ لگا دیا تھا۔

رانی چیخ چیخ کر پہلے سپاہیوں سے کچھ غصیلے لہجے میں کہتی رہی' پھر میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں لجاجت اور عاجزی آ گئی مگر وہ جیسے گونگے بہرے ہو گئے تھے۔ انہوں نے رانی کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ کہا اور کوٹھری کا قفل لگا کر جانے لگے۔ رانی پھر چیخنے لگی لیکن نہ تو وہ رکے اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔ رانی کوٹھری کے دروازے کی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زور آزمائی کرنے لگی' پھر رونے اور سسکنے لگی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ سب کیا ہو رہا تھا! میں سوچ رہا تھا کہ کیا رانی بھی میری طرح راجہ کے عتاب کا شکار ہو گئی ہے؟ لیکن اسے میری ہی کوٹھری میں کیوں قید کیا گیا ہے؟ اور پھر یہ کہ میں اور وہ زندہ کیوں ہیں؟ ہمیں ہلاک کیوں نہیں کر دیا گیا؟ راجہ آخر کیا چاہتا ہے؟ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ اگر راجہ نے مجھے قتل کرا دیا تو وہ مغل بادشاہ ہمایوں کو کیا جواب دے گا کہ اس نے مغلیہ تاجدار کے ایک خاص خادم کو کیوں ہلاک کرا دیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بادشاہ کے سامنے قطعی لاعلمی کا اظہار کرے کہ اسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں اور خاموشی کے ساتھ مجھے موت کے گھاٹ اتروا دے؟ اندیشوں اور وسوسوں کے ناگ میری روح کو ڈسنے لگے۔ میں نے خوف کے سبب اپنا گلا خشک ہوتے محسوس کیا تو گلا صاف کرنے کے لیے کھنکھارا۔ میں نے دیکھا کہ رانی اچھل پڑی۔ اسے شاید یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اس کوٹھی میں کوئی اور بھی ہے۔

اس نے کچھ کہا مگر ظاہر ہے کہ میں اس کے کہے ہوئے لفظ نہ سمجھ سکا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے مجھے ہی مخاطب کیا تھا۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور دوبارہ دانستہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ وہ عورت کم از کم مجھے رسیوں کی سخت گرفت سے تو آزاد کر ہی سکتی تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی روشنی سے اندھیرے میں آ گئی۔ میں اس کی رہنمائی کے لیے پھر کھانسا تاکہ اسے

معلوم ہو جائے کہ میں کہاں ہوں! وہ میری آواز کے سہارے مجھ تک پہنچ گئی اور زمین پر بیٹھ کر میرے جسم کو ٹٹولنے لگی۔ اس نے دوبارہ کچھ کہا اور میں صرف کھانس کر رہ گیا۔

اس نے غالباً" محسوس کر لیا تھا کہ میرا جسم رسیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس نے ایک بار میرے جسم کو گھسیٹنا چاہا مگر ناکام رہی۔ شاید وہ مجھے روشنی میں لے جانا چاہتی تھی تاکہ میری صورت دیکھ سکے۔ میرے منہ میں زبان تھی مگر بے زبان تھا۔ مجھے اپنی بے بسی پر سخت ملال ہو رہا تھا کہ میں اس عورت کو یہ تک نہیں بتا سکتا تھا کہ میں وہی بد نصیب ہوں جو اس کی وجہ سے قید کر دیا گیا ہوں۔ میں اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ میرے جسم سے بندھی ہوئی رسیاں کھول دے۔

لیکن میں جو اپنی زبان سے نہ کہہ سکا شاید مونگ کے تنگوری (آسمانی روح) نے اس سے کہہ دیا۔ وہ میرے جسم سے بندھی ہوئی رسیاں کھول رہی تھی۔

کچھ دیر بعد میں رسیوں کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ وہ میرا بازو پکڑ کر مجھے روشنی میں لے آئی' پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ایک لمحے کو اس نے مجھے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا' پھر دوڑ کر میرے سینے سے لپٹ گئی۔ میرا دل چاہا کہ اسے دھکا دے کر خود سے الگ کر دوں مگر نہ جانے کیوں میں ایسا نہ کر سکا۔

وہ میرے سینے سے لگی کسی بچے کی طرح سسک رہی تھی اور رفتہ رفتہ میرے دل میں اس کے لیے رحم جاگ رہا تھا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں اسے تسلی دوں مگر اس کے لیے میں الفاظ کے سہارے کی بجائے جسمانی لمس ہی پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ وہ بھلا صحرائے گوبی میں بسنے والوں کی زبان کس طرح سمجھ سکتی تھی! اور وہ بھی بقول سولمہ کئی صدی آگے کی عورت تھی اسے دشت نشینوں کی زبان سے کس طرح واقفیت ہو سکتی تھی! یہ سوچ کر میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے مجھے اپنی آنسو بھری آنکھوں سے اٹھا کر دیکھا اس کے سرخ مرطوب ہونٹ جذبات کی شدت سے کانپ رہے تھے۔ اس لمحے وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کے رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے جنہیں میں نے اپنے ہاتھ سے پونچھ دیا۔ اس نے لرزتی آواز میں کچھ کہا اور میرے کشادہ سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے اظہار پسندیدگی کے طور پر اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس نے اپنے کانپتے لرزتے ہونٹ میری گردن پر رکھ دیے اور مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں کا لمس میرے پورے وجود میں دوڑ گیا ہو۔ اس کے بعد اس کی انگلیوں کی لرزش نے میرے سارے جسم میں جیسے آگ سی لگا دی۔ اس کے ہاتھ میرے جسم کے مختلف حصوں کو سہلا رہے تھے۔ میرے جسم کا ایک ایک تار جیسے جھنجھنا اٹھا تھا۔ میری یہی کیفیت اس وقت بھی ہوئی تھی جب مجھے سولمہ کا قرب حاصل ہوا تھا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ میں نے سوچا کیا ہو رہا ہے یہ مجھے؟ یہ میرے جسم میں آگ سی کیوں لگ رہی ہے؟ میں ابھی کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور کوٹھری کے اندھیرے حصے میں چلی گئی۔

میں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا' تیز اور گہرے سانس! ہر لمحہ میرا تنفس تیز ہوتا جا رہا تھا جیسے میں طاقت کے پہاڑ بوڑ خان قالدون پر تیزی سے چڑھ گیا ہوں اور اوپر چڑھ کر ہانپنے لگا ہوں۔

اس نے مجھے پتھریلے فرش پر ہاتھ پکڑ کر لٹا دیا۔ میں اس کی حرکات سمجھنے سے قاصر تھا۔ آخر کیا کر رہی تھی؟ میرے لیٹتے ہی وہ بھی برابر لیٹ گئی کیونکہ میں نے فوراً" اس کے جسمانی لمس کو محسوس کر لیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے جسمانی لمس سے میری حالت ایسی ہوتی جا رہی تھی جیسے میں نے لونگیں ملی۔ ختا کی شراب کے خم پہ خم چڑھا لیے ہوں۔

چند لمحے بعد ہی میں نے خود کو اس کی بانہوں کی گرفت میں پایا' اور پھر میں نے اپنے جسم پر اس کی انگلیوں کا متحرک لمس محسوس کیا۔ اس کی انگلیوں کے لمس میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ میں گہرے نشے میں

اڑتا چلا جا رہا تھا۔ اب مجھے بھی اس کے تیز تیز سانس سنائی دے رہے تھے جو میری سانسوں میں گھل رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے اگر کچھ دیر میں اور اس کی گرفت میں رہا تو میرا وجود جل جائے گا۔

"میرا وجود جل رہا ہے۔" میں یہ جانے بغیر بڑبڑایا کہ وہ میری بات نہ سمجھ پائے گی۔

جواب میں اس نے کچھ کہا تو مجھے ہوش آیا کہ نہ میں اس کی کوئی بات سمجھ سکتا ہوں نہ وہ میری بات سمجھی ہوگی۔

مجھے ہوش نہیں کہ پھر کیا ہوا! میں نے صرف اتنا محسوس کیا کہ ایک ٹھنڈی اور فرحت بخش آگ مجھے اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے اور میرا جسم اس حصار میں بلند ہوتا جا رہا ہے۔ یوں جیسے میں آسمانوں کی بلندیوں کو چھو لوں گا' یوں جیسے میرا جسم بھی جھیل بیکال پر اڑنے والے پرندوں کی طرح ہے اور یوں جیسے میرے آنکھیں کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہیں۔

ایک نشہ تھا جو لحہ بہ لحہ تیز سے تیز ہوتا جا رہا تھا۔ ایک کیفیت تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ شدید پیاس کے عالم میں جیسے ٹھنڈا پانی مل جائے۔ دھوپ سے تپتے ہوئے صحرا میں جیسے کہیں سایہ نصیب ہو جائے۔ یوں جیسے بنجر زمین پر چلتے چلتے سرسبز و شاداب چراگاہیں دکھائی دے جائیں۔ ہر طرف ٹھنڈک' ہریالی ہی ہریالی' سایہ ہی سایہ! میں جیسے سرسبز و شاداب وادیوں میں رقص کر رہا تھا اور خنکی کی شراب پی رہا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ میں شراب پیتے پیتے جیسے سیراب ہو گیا جیسے تپتے ہوئے صحرا پر بادل گھر آئے اور پوری شدت سے برسنے لگے۔ نشہ اتنا شدید گہرا اور تیز ہوتا چلا گیا کہ میں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ نشے کی ان منزلوں تک تو میں سولدہ کے ساتھ بھی نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار عورت کا نشہ کیا تھا اور مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس نشے سے تیز دنیا کا کوئی نشہ نہیں میں اس نشے میں بالکل ڈوب گیا اور مجھے خبر نہ رہی کہ میں کون ہوں' کہاں ہوں اور کن حالات سے دوچار ہوں۔"

مجھے ہوش اس وقت آیا جب کوئی میرا شانہ پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا اور کچھ کہہ رہا تھا۔

"کیا ہے؟" میں نے نشے سے بوجھل ذہن کے ساتھ کہا۔

میرے سوال کے جواب میں پھر کچھ کہا گیا۔ آواز آشنا تھی' وہی آواز' رانی کی آواز! وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کے انداز سے پتہ چل رہا تھا جیسے وہ مجھے زمین سے اٹھانا چاہتی ہو۔ میں اس کا مقصد جان کر اٹھ بیٹھا اور اپنا بکھرا ہوا وجود سمیٹ لیا۔ مجھے اپنی حالت دیکھ کر شرم سی محسوس ہوئی' ویسی ہی شرم جیسی کسی شرابی کو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب وہ شراب پی کر مدہوش ہونے کے بعد دوبارہ ہوش میں آتا ہے۔ میں نے بھی تو آخر نشہ ہی کیا تھا اور مدہوش ہو گیا تھا۔

چند ہی لمحے بعد میرے ہوش و حواس بحال ہو گئے اور اسی وقت میں نے ایک تیز چیخ سنی۔ اگر میری سماعت مجھے دھوکا نہیں دے رہی تھی تو وہ کسی انسان کی آخری چیخ ہی تھی۔ میں چوکنا ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی دوسری مردانہ چیخ سنائی دی' پھر اس قید خانے میں کسی کے قدموں کی چاپ گونجنے لگی۔

آنے والا کون ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا مگر کچھ نہ سمجھ پایا۔ وہ چیخیں کیسی تھیں؟ اور کس کی تھیں؟ ان چیخنے والوں کو ہلاک کرنے والا کون تھا؟ ابھی میرے ذہن میں یہی سوال گردش کر رہے تھے کہ جیسے میرا سارا وجود میری آواز میں منتقل ہو گیا اور میں چیخ پڑا۔

"سولدہ!"

ہاں وہ سولدہ ہی تھی جسے دیکھ کر میں چیخا تھا اور خود پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ وہ مجھے کوٹھری کے باہر راہداری میں نظر آئی تھی۔

"بوغا! تو کہاں ہے؟" جواب میں سولدہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کوٹھری کے سلاخوں دار دروازے پر کھڑی ہوئی اندھیرے میں گھور رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سی شے تھی۔ ویسے ہی عجیب شے جیسی میں نے اس کے دشمنوں کے پاس دیکھی تھی۔ لوہے کی لمبی سی نالی جس کے درمیان سوراخ تھا۔

"میں یہاں ہوں' اس کوٹھری میں!" میں نے بلند آواز میں جواب دیا اور اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آگیا۔ میرے ہمراہ رانی بھی روشنی میں آگئی تھی۔

"دروازے سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو جا!" سولدہ نے مجھے مخاطب کیا۔

میں یہ دیکھ کر حیران تھا کہ سولدہ کوٹھری میں میرے ساتھ رانی کو دیکھ کر ذرا بھی نہیں چونکی تھی۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ آخر سولدہ کو اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے میرے بارے میں پتا چل گیا تھا کہ میں کہاں اور کس حال میں ہوں مگر وہ مجھے کوٹھری سے کس طرح نکالے گی؟ میں سوچنے لگا۔

"تو ابھی پیچھے نہیں ہٹا!" مجھے اسی جگہ کھڑا ہوا دیکھ کر سولدہ نے کہا۔

میں جلدی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "تو کیا مجھے اس کوٹھری سے نہیں نکالے گی؟"

"میں اسی کا بندوبست تو کر رہی ہوں۔" سولدہ نے جواب دیا۔

میرے پیچھے ہٹتے ہی رانی بھی پیچھے ہو گئی تھی کیونکہ وہ میرے دائیں بازو سے تقریباً لپٹی ہوئی تھی۔ پھر میری آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ سولدہ کے ہاتھ میں جو لوہے کی لمبی سی سوراخ دار نالی دبی ہوئی تھی' اس سے ایک بجلی کا کوندا سا نکلا اور کوٹھری کے سلاخوں دار دروازے سے ٹکرایا۔ میں نے لوہے کے سلاخوں دار دروازے کا وہ حصہ آگ کی طرح سرخ ہوتے دیکھا جہاں وہ بجلی کا کوندا ٹکرایا تھا' پھر میں نے لوہے کو پگھل کر موم کی طرح بہتے ہوئے دیکھا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سولدہ کا وہ پراسرار ہتھیار اتنا طاقتور ہو گا' یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکا تھا۔ اگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ منظر نہ دیکھا ہوتا تو مجھے ہرگز یقین نہیں آتا۔ بھلا لوہا بھی کہیں موم کی طرح پگھل کر بہہ سکتا ہے! وہ بھی صرف چند لمحوں میں!

سولدہ نے کسی قدر توقف کے بعد اپنا دایاں پاؤں آگے بڑھا کر دروازے پر ٹھوکر ماری اور دروازہ کھل گیا۔ میں دروازہ کھلتے ہی باہر جانے کے لیے جھپٹا۔

"ذرا دیکھ کر! ابھی لوہا گرم ہے۔ تیرے جسم کا کوئی حصہ دروازے سے مس نہ ہو۔" سولدہ نے تیزی کے ساتھ کہا' پھر اجنبی زبان میں رانی سے کچھ بولی۔ غالباً" رانی سے بھی اس نے محتاط رہنے کے لیے کہا تھا۔

میں اور رانی کوٹھری سے باہر آگئے۔ میں نے باہر آتے ہی سولدہ سے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تو مجھے بچانے ضرور آئے گی۔ تجھے اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے پتا چل جائے گا کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں!"

میری بات سن کر وہ ہنس پڑی۔ "تو ایسی باتیں کرنا نہیں چھوڑے گا! میں تجھ سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ میرے پاس کوئی پراسرار قوت نہیں اور میں بھی تیری طرح انسان ہوں۔" سولدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پھر تجھے کیسے پتا چل گیا کہ میں یہاں قید ہوں؟" میں اپنی بات پر بضد رہا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں تجھے فرصت سے سناؤں گی۔" فی الحال یہاں سے نکلنے کی کوشش کر! میں نہیں چاہتی کہ تیری وجہ سے مجھے مزید بے گناہوں کا خون بہانا پڑے۔" سولدہ نے جواب دیا اور آگے بڑھی' پھر اس نے پلٹ کر رانی کی طرف دیکھا اور کچھ بولی۔

رانی نے بھی جواب میں کچھ کہا۔ سولدہ نے اثبات میں سر ہلایا اور رانی سے کچھ بولی۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی۔

"تو رانی سے کیا بات کر رہی ہے؟ اور یہ کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے سولدہ کے پیچھے چلتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"ہم یہاں سے فرار ہو رہے ہیں۔" سولدہ نے بتایا۔ "میں رانی سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے!"

"پھر رانی نے کیا جواب دیا؟" میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

سولدہ میری جانب دیکھ کر مسکرائی، پھر بولی۔ "تجھے رانی کی بہت فکر ہو رہی ہے!"

میں اس کی بات سن کر کچھ جھینپ سا گیا جیسے اس نے میرے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔

"کیوں، چپ کیوں ہو گیا؟ کیا تجھ پر واقعی رانی کا جادو چل گیا؟" سولدہ مجھے خاموش دیکھ کر پھر بولی۔

"نن ... نہیں ... نہیں ایسی ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

"گھبرا مت! مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔" سولدہ نے مسکرا کر کہا اور زینے پر چڑھنے لگی۔ میں اور رانی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

میں سوچ رہا تھا کہ سولدہ کی بات کا رانی نے کیا جواب دیا؟ اور آخر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے سولدہ کو مخاطب کیا۔ "تو نے بتایا نہیں کہ رانی نے تیری بات کے جواب میں کیا کہا؟ کیا وہ بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہے؟"

"ہاں!" سولدہ نے جواب دیا۔ "اگر وہ یہاں رہی تو قتل کر دی جائے گی اس لیے اس کا بھی یہاں سے فرار ہونا لازمی ہے۔"

"کیا تو اسے بھی میری طرح اپنے ساتھ لیے پھرے گی؟" میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"نہیں، یہ ضروری نہیں! اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اسے امرکوٹ سے نکال کر کہیں اور پہنچا دوں۔" سولدہ نے بتایا۔

زینہ چڑھ کر جیسے ہی میں سولدہ کے ہمراہ دروازے سے نکلا میری ناک میں جلے ہوئے گوشت کی بو گھسی اور اس کے ساتھ راہداری میں پڑی ہوئی دو لاشوں پر میری نظر پڑی۔ وہ لاشیں قید خانے کے محافظوں کی تھیں۔

"کیا تو نے اس قید خانے میں موجود تمام سپاہیوں کو اپنے پراسرار ہتھیار سے قتل کر دیا؟" میں نے سولدہ سے سوال کیا۔

"نہیں!" سولدہ نے جواب دیا۔ "سب کو ہلاک کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ وہ اپنے ان ساتھیوں کا حشر دیکھ کر فرار ہو گئے، جنہوں نے میرا راستہ روکنا چاہا تھا۔"

"میں نے پہلے تو کبھی تیرے پاس یہ پراسرار ہتھیار نہیں دیکھا۔" میں آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"پہلے اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی ورنہ یہ میرے پاس ہر وقت موجود رہتا ہے۔" سولدہ نے بتایا۔

"لیکن جب مغلیہ بادشاہ پر دشمن سپاہیوں نے حملہ کیا تھا، اس وقت تو نے یہ ہتھیار استعمال نہیں کیا؟" میں نے کہا۔

"اس وقت اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ہاں اگر تیری یا میری زندگی خطرے میں پڑ جاتی تو میں اسے ضرور استعمال کرتی۔" سولدہ بولی۔ "یوں بھی میں اجنبیوں کے سامنے یہ ہتھیار نکالتے ہوئے گریز کرتی ہوں تاکہ وہ مجھ سے غیر معمولی پوچھ گچھ شروع نہ کر دیں۔"

میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اب ہم پھاٹک تک پہنچ چکے تھے۔ پھاٹک کے قریب ہی گھوڑوں کا اصطبل تھا جسے شاید سولدہ آتے ہوئے ہی دیکھ چکی تھی۔ وہاں سے گھوڑوں کی ہنہنانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"جا وہاں سے اپنے لیے ایک گھوڑا لے آ! میں جس گھوڑے پر یہاں آئی تھی اسی پر سواری کروں گی۔ میرا گھوڑا پھاٹک کے باہر موجود ہے۔" سولدہ نے مجھے اصطبل کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔

"لیکن رانی ... رانی کے لیے بھی تو ... میرا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گی تو اس کے لیے بھی سواری چاہیے گی۔" میں نے کس قدر جھجکتے ہوئے کہا۔

سولدہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، پھر بولی۔ "اسے اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھا لینا! تیرا سفر اچھا کٹ جائے گا۔"

میں اس کی بات پر شرمندہ اور چور چور سا ہو گیا، پھر بغیر کچھ کہے اصطبل کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے نہ جانے کیوں سولدہ کے سامنے رانی کے ذکر پر شرمندگی سی ہو

رہی تھی۔ میں نے تو سنا تھا کہ جب دو عورتیں ہوتی ہیں اور ایک مرد تو دونوں ہی عورتیں ایک دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرتیں مگر میرے ساتھ مختلف واقعہ پیش آ رہا تھا۔ سولدہ کے لہجے اور اس کے انداز و اطوار سے پتا چل رہا تھا جیسے وہ سب کچھ سمجھ چکی ہے۔ اس نے اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے کوٹھری کے اندھیرے میں پیش آنے والا واقعہ دور رہتے ہوئے بھی جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ سولدہ کے رویے میں رقابت کی ذرا سی بھی جھلک نہیں تھی' حالانکہ میرے خیال میں ایسا ہونا چاہیے تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا اصطبل میں داخل ہو گیا اور ایک گھوڑے کو اس کے کھونٹے سے کھولتے ہوئے اچھل پڑا۔ اصطبل میں ایک مشعل روشن تھی جس کی روشنی میں واضح طور پر میں نے ایک شخص کو گھوڑے کے پیچھے چھپا کھڑا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ لباس سے سپاہی معلوم ہو رہا تھا۔

اس سپاہی نے مجھ پر نظر پڑتے ہی اپنی نیام سے تلوار نکالی اور مجھ پر جھپٹا۔ میں خالی ہاتھ تھا اس لیے تیزی کے ساتھ جھک کر اس کے وار کو بچا گیا۔ تلوار کا وار گھوڑے کی پشت پر پڑا اور گھوڑا زور سے ہنہنا اٹھا۔ اس کی پشت یقیناً لہولہان ہو گئی ہو گی۔ میرے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں راہ فرار اختیار کرتا۔ میں اسی لیے تیزی سے اصطبل کے دروازے کی جانب دوڑا مگر میں اس سے بے خبر تھا کہ اصطبل میں اس سپاہی کے علاوہ اور سپاہی بھی چھپے ہوئے تھے' مجھے اس بات کا علم اس وقت ہوا جب مختلف سمتوں سے کئی سپاہی گھوڑوں کی آڑ سے نکل کر میری طرف تلواریں لہراتے ہوئے جھپٹے۔ ایک لمحے کو میں گھبرا گیا۔ ان مسلح سپاہیوں نے فرار کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ اب میں دروازے سے نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ دروازے کے قریب دو سپاہی تلواریں اٹھائے اس کے منتظر تھے کہ میں ادھر جاؤں اور وہ میرا کام تمام کر دیں۔

"معاً" میری نگاہ زمین پر پڑے ہوئے ایک ہتھوڑے پر پڑی جو غالباً "گھوڑوں کے کھونٹے گاڑنے کے کام آتا تھا۔ میں نے تیزی سے جھک کر ہتھوڑا اٹھا لیا لیکن اس دوران میں دو سپاہی مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے پوری قوت سے وہ بھاری ہتھوڑا گھمایا اور اس کے ساتھ اصطبل میں ایک دلدوز چیخ گونج اٹھی۔ ہتھوڑا اس سپاہی کے سر پر پڑا تھا اور وہ لہرا کر زمین بوس ہو گیا تھا اور گرتے گرتے اپنے ساتھی کو بھی لے گرا تھا کیونکہ اس کا ساتھی پیچھے ہی تھا۔ دوسرے سپاہیوں کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"بوغا' کیا ہوا بوغا؟" میں نے سولدہ کی تیز اور گھبرائی ہوئی آواز قریب آتی سنی اور اس کے ساتھ بھاگتے قدموں کی چاپ قریب آنے لگی۔

"یہاں سپاہی چھپے ہوئے ہیں۔" میں نے چیخ کر سولدہ کی بات کا جواب دیا۔ "میں نے ایک کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔"

"گھبرانا مت! میں آ رہی ہوں۔" سولدہ کی آواز اور قریب آ گئی۔

میں نے دیکھا کہ وہ دونوں سپاہی دروازے کے دائیں بائیں چھپ کر چوکنا کھڑے ہو گئے جنہوں نے میرا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ وہ شاید بے خبری میں سولدہ کو شکار کرنا چاہتے تھے جو اس دروازے سے اندر آنے والی تھی۔

"سولدہ!" میں چیخ پڑا۔ "اندر نہ آنا! دو سپاہی دروازے کے قریب چھپے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھ میں برہنہ تلواریں ہیں۔ وہ غالباً" تجھ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔"

قدموں کی چاپ ایک دم رک گئی۔

عجیب اور خطرناک صورت حال تھی۔ میں اندر دشمنوں کے نرغے میں تھا اور سولدہ میری مدد کے لیے اندر نہیں آ سکتی تھی۔ اندر موجود مسلح سپاہی کسی بھی لمحے میرے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔

"پھر میں کیا کروں؟" سولدہ کی آواز سنائی دی۔ "کیا تو باہر نہیں آ سکتا؟"

"تو باہر ہی رہ!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میں خود باہر آرہا ہوں۔"

اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں تھی کہ میں خطرے کا مقابلہ کرتا۔ اصطبل کے اندر موجود رہنا خطرناک ہی تھا۔ میں نے ان سپاہیوں سے بھڑنے کا فیصلہ کر کے قدم آگے بڑھائے جو دروازے کی دونوں سمت چھپے کھڑے ہوئے تھے۔

وہ دونوں بھی شاید میرے ارادے کو بھانپ گئے۔ انہوں نے چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا تھا اور اسی وقت مجھے باہر سے سولدہ کی آواز سنائی دی تھی۔

"وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے ہیں کہ پیچھے سے تجھ پر حملہ کردیں۔" سولدہ نے بتایا۔

سولدہ نے مجھے بروقت ان کے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا کیونکہ وہ ان کی زبان سمجھتی تھی۔ سولدہ کی بات سنتے ہی میں نے ایک نظر پیچھے دیکھا۔ مجھے تین سپاہی تلواریں لہراتے اپنی جانب جھپٹتے دکھائی دیے۔ "جو ہو سو ہو!" یہ سوچ کر میں نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی مگر اس کے ساتھ میں اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے بھاری ہتھوڑے کو بھی چاروں طرف گردش دیتا جا رہا تھا تاکہ کوئی میرے بالکل قریب نہ پہنچ سکے۔

میں جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچا، وہ دونوں میری طرف لپکے میں کھلے ہوئے دروازے کے بالکل سامنے تھا اس لیے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے ان دونوں کو دروازے کی آڑ سے باہر آنا پڑا تھا۔

میں نے ہتھوڑا لہرایا ہی تھا کہ ان میں سے ایک لہرا کر زمین پر آرہا مگر وہ میرے ہتھوڑے کی ضرب سے نہیں گرا تھا۔ میں نے وہ خطرناک اور پراسرار بجلی کوندتے دیکھ لی تھی جو غالباً اس سپاہی کی پشت سے ٹکرائی تھی۔ اصطبل میں جلتے ہوئے گوشت کی بو پھیل گئی۔ پھر مجھ پر حملہ کرنے والا دوسرا سپاہی ڈھیر ہوا۔ اس کے بعد میرے پیچھے آنے والوں کی باری تھی کہ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ تینوں خود زمین پر گر کر کچھ کہہ رہے تھے جیسے گڑگڑا کر معافی مانگ رہے ہو مگر سولدہ نے انہیں معاف نہیں کیا۔ یکے بعد دیگرے تین کوندے لپکے اور وہ تینوں بھی چیخ کر زمین پر لڑھک گئے۔

"میں انہیں ضرور معاف کردیتی اگر یہ تجھ پر حملہ نہ کرتے۔" سولدہ نے مجھ سے کہا، پھر بولی۔ "اس سے پہلے کہ پھر کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو، تو ایک گھوڑا کھول لے۔"

میں نے بغیر کچھ کہے جلدی سے قریب ہی بندھا ہوا ایک گھوڑا کھول لیا لیکن گھوڑے کی پشت پر زین کسی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی تو ایک کونے میں مجھے کئی زینیں پڑی ہوئی نظر آگئیں۔ میں نے ایک زین اٹھا کر گھوڑے پر کس لی۔ وہ زین بہت عمدہ چمڑے کی تھی اور اس سے عمدہ زین میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی میں اور سولدہ اصطبل سے نکل آئے۔ میں نے رانی کو پھاٹک کے قریب کھڑا ہوا دیکھا۔ اس کے چہرے سے انتہائی خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ سولدہ نے بھی غالباً اس بات کو محسوس کر کے شاید اسے تسلی دینے کی خاطر کچھ کہا۔

مجھے پھاٹک کا ایک حصہ بھی جلا ہوا نظر آیا۔ سولدہ نے یقیناً "قید خانے میں داخل ہونے کے لیے اپنا پراسرار ہتھیار استعمال کیا تھا۔

باہر ایک گھوڑا کھڑا تھا۔ سولدہ اس پر بیٹھ گئی۔ مجھے اور رانی کو اس نے دوسرے گھوڑے پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ میں نے پہلے رانی کو گھوڑے پر بٹھایا، پھر خود بیٹھ گیا۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہی سولدہ سے پوچھا۔

"کہیں بھی چلے جائیں گے۔" اس نے جواب دیا۔ "فی الحال ہمیں جلد از جلد اس شہر کی حدود سے دور نکل جانا ہے تاکہ جب تک راجہ کو اس واقعے کا علم ہو ہم اس کی دسترس سے بہت دور نکل چکے ہوں۔"

"لیکن جب تیرے پاس پراسرار ہتھیار ہے تو پھر کیا ڈر ہے؟" میں بولا۔

"میں بے گناہ انسانوں کا خون نہیں بہانا چاہتی۔"

سولدہ نے کہا۔

"تو دشمنوں کو بے گناہ کہہ رہی ہے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں! اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔" یہ کہہ کر سولدہ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

میں نے بھی اپنا گھوڑا دوڑا دیا اور سولدہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور پھر اپنے گھوڑے کو تیز دوڑا کر اس کے ساتھ ساتھ ہو گیا۔ تاریکی اور سناٹے میں سفر شروع ہو گیا۔

سولدہ اپنے گھوڑے کو زیادہ تیز نہیں دوڑا رہی تھی جس کا مقصد فوراً ہی میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ سفر کے دوران میں گفتگو بھی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنا گھوڑا مجھ سے کچھ اور قریب لے آئی پھر رانی سے مخاطب ہوئی۔

رانی اور سولدہ کچھ دیر گفتگو کرتے رہے اور میں الجھن کا شکار ہوتا رہا۔ جب ان دونوں کے درمیان گفتگو ختم ہو گئی تو میں ضبط نہ کر سکا۔ میں سولدہ سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ خود بول اٹھی۔

"بوغا! اب ہم کسی منزل کے بغیر سفر نہیں کر رہے۔" سولدہ بولی۔ "ہم یہاں سے قصبہ پہلودی چل رہے ہیں جو زیادہ دور نہیں ہے۔"

"اس قصبے میں کون رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رانی کا باپ راجہ مالدیو!" سولدہ نے بتایا۔ "وہ ان اطراف کا ایک بااثر راجہ ہے۔ تمہیں شاید یہ جان کر تعجب ہو کہ راجہ مالدیو میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔ میں اس سے ایک بار مل چکی ہوں مگر یہ بات مغلیہ تاجدار بابر کے عہد کی ہے۔ اس وقت راجہ مالدیو نوجوان تھا۔ یہ میرے لیے بڑی پر لطف بات ہو گی کہ میں اسے اب بوڑھا دیکھوں گی۔"

"اس وقت تو بہت کم عمر اور بچی ہو گی۔" میں نے قیاس آرائی کی۔

"راجہ مالدیو تجھے شاید نہیں پہچان سکے گا۔"

میری بات سن کر سولدہ زور سے ہنس پڑی اور بہت دیر تک ہنستی رہی۔ میں حیران تھا کہ آخر میں نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے کہ وہ ہنس ہنس کر بے حال ہوئی جا رہی ہے!

"تو آخر میری بات پر اتنا کیوں ہنس رہی ہے؟" میں نے کسی قدر جھنجلا کر کہا۔

"تو نے بات ہی ایسی کی تھی۔" وہ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولی "یہ زیادہ دن پہلے کی بات نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ سال بھر کی بات ہے۔"

"مگر تو نے کہا ہے کہ اس وقت راجہ مالدیو نوجوان تھا اور اب بوڑھا ہو گا۔ یہ آخر کیسے ممکن ہے؟" میں اب بھی اس کی بات نہ سمجھ پایا اور الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

اگر یہ ممکن نہیں تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ تو صدیوں آگے آ گیا؟" سولدہ بولی۔ اب میں اس کی بات کسی حد تک سمجھ چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سال بھر پہلے اس عہد میں گئی تھی جب راجہ مالدیو نوجوان تھا اور ہندوستان پر مغلیہ تاجدار کی حکومت تھی۔

"اب سمجھ گیا؟" مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے سر ہلایا۔ "تیری باتیں ذرا چکرا دینے والی ہوتی ہیں اور فوراً سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"میں نے اعتراف کیا" پھر بولا۔ "ہاں تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تو قید خانے تک کیسے پہنچ گئی تھی؟ میں نے تو سوچا تھا کہ تجھے اپنی پراسرار قوتوں سے سب کچھ پتا چل گیا ہو گا مگر تو نے میری بات کی تردید کر دی تھی۔"

"ہاں میں نے غلط نہیں کہا تھا۔" وہ بولی۔ "مجھ سے رانی کی وہ کنیز ملی تھی جو تجھے اس کی خواب گاہ تک لے گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ تجھے گرفتار کر لیا گیا ہے اور قید خانے بھیج دیا گیا ہے۔ اسی نے رانی کے بارے میں بھی بتایا تھا اور کہا تھا کہ تجھے اور رانی کو صبح کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ میں نے اسی سے قید خانے کا پتہ معلوم کیا تھا اور فوراً محل سے روانہ ہو گئی تھی۔ وہ کنیز رانی کی خاص کنیزوں میں سے تھی اور وہ بچپن سے رانی کی

خدمت میں رہی تھی۔ شادی ہونے کے بعد راجہ مالدیو نے اسے رانی کے ساتھ کر دیا تھا۔" سولدہ نے پوری تفصیل بتادی۔

میں نے ایک طویل سانس لیا اور بولا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر رانی کو گرفتار نہ کیا جاتا تو میں مارا ہی جاتا۔ اس کنیز نے یقیناً" رانی ہی کی جان بچانے کے لیے تجھے سب کچھ بتایا ہو گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ رانی نے مجھے کیوں بلوایا تھا؟" میں نے آخر میں پوچھا۔

"اب تو اتنا بھولا بھی نہیں کہ یہ بھی نہ سمجھ پائے۔" سولدہ مسکرا کر بولی۔ "سیدھی سی بات ہے کہ تو رانی کو پسند آگیا تھا اور تجھ پر ہی کیا منحصر یہ تو رانی کا مشغلہ ہے۔ راجہ کو اس پر شک رہا ہو گا اور غالباً" وہ رانی کی نگرانی کرا رہا ہو گا اسی لیے وہ رانی کی خوابگاہ میں عین اس وقت پہنچ گیا جب تو وہاں موجود تھا۔ ہاں بولو غایہ تو بتا کہ اس وقت تو نے اور رانی کس حال میں تھے؟"

میں اس کے سوال پر جھینپ کر رہ گیا میں نے اب تک کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ مجھ سے کسی لڑکی نے بھی اس بیباکی سے کبھی گفتگو نہیں کی تھی۔

"تو بالکل لڑکیوں کی طرح شرما رہا ہے۔ بتا نا جو میں نے پوچھا ہے۔" سولدہ نے مجھے چپ دیکھ کر ایک بار پھر چھیڑا۔

"کک... کچھ... کچھ بھی تو نہیں سولدہ... وہ... رانی میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی تھی اور اور اسی وقت راجہ خفیہ سرنگ سے آگیا تھا۔" میں نے گڑبڑا کر حقیقت بیان کر دی' پھر تیزی کے ساتھ بعد میں پیش آنے والے واقعات بیان کرنے لگا تاکہ پچھلی بات کا تاثر ختم ہو جائے۔

"سولدہ نے بھی غالباً" اس بات کو محسوس کر لیا۔ میری بات ختم ہوتے ہی وہ بولی "اصل بات کو چند لفظوں میں بیان کر کے آگے بڑھ گیا۔ ہے تو بہت تیز!" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

میں نے موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر ایک اور بات چھیڑ دی جو پہلے بھی میرے ذہن میں کھٹکی تھی۔ مجھے اس بات پر سخت تعجب ہوا تھا کہ مغلیہ تاجدار نے میرے جسم پر صحرا کا لباس دیکھ کر کوئی تعجب نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس نے سولدہ کے جسم پر موجود عجیب لباس پر حیرت ظاہر کی تھی۔ میرے اور سولدہ کے جسموں پر جو لباس تھے وہ ان جیسے نہیں تھے جو بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کے جسموں پر تھے۔ اگر بادشاہ نے اس سلسلے میں کچھ پوچھ گچھ کی تھی تو میں اس سے ناواقف تھا۔ سولدہ نے یقیناً" میرے اور اپنے بارے میں بادشاہ کو کوئی فرضی کہانی سنا کر مطمئن کر دیا تھا لیکن میں اس کہانی سے ناآشنا تھا۔ مجھے پہلے اتنی مہلت نہیں مل پائی تھی کہ میں سولدہ سے اس بارے میں پوچھ سکتا۔ اب موقع تھا اس لیے میں نے یہ بات پوچھ لی۔

"میں نے اسے بتایا تھا کہ میں یونان کی رہنی والی ہوں اور۔"

"یونان کیا؟" میں نے سولدہ کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"ایک ملک کا نام ہے۔" سولدہ نے بتایا۔

"تو کیا تو واقعی وہیں کی رہنے والی ہے؟" میں نے موقع غنیمت جان کر پوچھ لیا۔

"اگر تو اسی طرح درمیان میں مجھے بات بات پر ٹوکتا رہا تو میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ سمجھ گیا میری بات؟" وہ کسی قدر غصیلے لہجے میں بولی اور چپ ہو گئی۔

"اچھا اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔" میں نے وعدہ کیا۔ "تو آگے بتا!"

"دیکھ جب کوئی بات کر رہا ہو تو درمیان میں نہیں بولا کرتے۔" وہ مجھے بچوں کی طرح سمجھانے لگی۔ "جب بولنے والا اپنی بات ختم کر لیتا ہے تو کچھ پوچھتے ہیں۔" اس بار اس کی آواز نرم تھی۔

"میں نے وعدہ کر تو لیا کہ اب ایسا نہیں کروں گا۔" میں نے اسے دوبارہ یقین دلایا۔

"ہاں تو میں تجھے یہ بتا رہی تھی کہ میں نے بادشاہ کو اپنے بارے میں کیا بتایا تھا! میں نے اس سے کہا تھا کہ میں یونان کی رہنے والی ہوں اور اپنے والد کے ساتھ سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئی تھی۔ میرے والد کو سیاحت کے علاوہ شکار کا شوق بھی تھا۔ ہم نے اسی

غرض سے پہاڑوں کا رخ کیا اور دور تک نکل گئے' پھر ہم راستہ بھٹک کر صحرا کی طرف نکل گئے جہاں ایک چھوٹی سی آبادی میں ہمیں تو مل گیا اور تو نے ہمارے رہنمائی کی۔ میرے والد نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا کیونکہ تو وفادار اور بہادر تھا۔" سولدہ وہ فرضی داستان سنا رہی تھی جو اس نے اپنے اور میرے بارے میں بادشاہ کو سنائی تھی۔ "پھر میں نے بادشاہ کو بتایا کہ میرے والد ایک برفانی ریچھ کا شکار کھیلتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئے اور انتقال کر گئے۔ اس کے بعد میں تجھے ساتھ لیے ہندوستان کی گھنی آبادیوں کی طرف آ گئی۔ تیرے جسم پر جو لباس ہے میں نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ تیرے قبیلے کا مخصوص لباس ہے۔ بادشاہ نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور اپنے قافلے کے ساتھ لے چلنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ یوں بھی اسے ایک عورت کی ضرورت تھی جو اس کی بیوی حمیدہ بیگم کی دیکھ بھال کر سکے کیونکہ اس کی بیوی حاملہ تھی۔" سولدہ پوری داستان سنا کر خاموش ہو گئی۔

میرے دل میں یہ داستان سننے سے پہلے جو تجسس تھا' ختم ہو گیا۔ میں اس روانی کے ساتھ سولدہ کے جھوٹ بولنے پر سخت حیران تھا' پھر میں نے اپنی حیرت کا اظہار کر ہی دیا۔

"سولدہ! تو اتنا جھوٹ کیسے بول لیتی ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اگر تو بارھویں صدی کی بجائے بعد کی صدیوں میں پیدا ہوتا تو تجھے یقیناً" جھوٹ بولنے پر حیرت نہ ہوتی اور تو کسی کو سچ بولتے دیکھ کر حیران ہوا کرتا۔" سولدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

قصبہ پہلودی کا راستہ کچھ تو رانی کے ذہن میں محفوظ تھا اور کچھ کچھ سولدہ کو بھی یاد آتا جا رہا تھا' کیونکہ ہم امرکوٹ کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اب صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

رانی دوران سفر میں زیادہ تر خاموش ہی رہی تھی۔ اس نے بس سولدہ سے کچھ باتیں کی تھیں۔ وہ کچھ ڈری ڈری اور سہمی ہوئی سی تھی۔ شاید اسے یہ خوف ہو گا کہ کہیں راجہ امرکوٹ کے سپاہی پھر اسے اور ہمیں گرفتار نہ کر لیں!

دن پوری طرح نکل آیا تو ہمیں ایک چھوٹی سی آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ دور ہی سے پہلودی کا قلعہ صاف نظر آ رہا تھا۔ رانی اس قلعے کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش نظر آنے لگی۔ وہ قلعے کی جانب اشارہ کر کر کے کچھ کہہ رہی تھی۔

"کیا ہم یہاں پوری طرح محفوظ ہوں گے؟" میں نے رانی کی خوشی کو نظر انداز کرتے ہوئے سولدہ سے پوچھا۔ "کیا راجہ امرکوٹ یہاں تک نہیں پہنچ سکتا؟"

"کیوں نہیں پہنچ سکتا!" سولدہ نے کہا۔ "لیکن اب اگر اس نے تجھے یا رانی کو راجہ مالدیو سے طلب کیا تو بات صرف یہیں تک نہیں رہے گی۔ راجہ امرکوٹ کو راجہ مالدیو سے دشمنی مول لینا پڑے گی۔ یہ معاملہ دو ریاستوں کے مابین لڑائی کا سبب بن سکتا ہے جو غالباً" راجہ امرکوٹ نہیں چاہے گا کہ اپنی پڑوسی ریاست سے دشمنی مول لے۔"

سولدہ کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ راجہ مالدیو کسی بھی قیمت پر مجھے یا رانی کو راجہ امرکوٹ کے حوالے نہیں کر سکتا تھا اور رانی تو یوں بھی اس کی بیٹی تھی۔

ہم آبادی میں داخل ہو گئے' اور پھر قلعے کی طرف بڑھ گئے کیونکہ راجہ مالدیو قلعے ہی میں رہتا تھا۔ ابھی ہم قلعے تک نہ پہنچ پائے تھے کہ ہم نے قلعے کے پھاٹک سے چند گھوڑ سواروں کو نکلتے دیکھا جن کے درمیان ایک سجے سجائے خوب صورت سے گھوڑے پر کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا اور اس کے اوپر ایک پیلے کپڑے کا چھوٹا سا پردہ تنا ہوا تھا جو اس شخص پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ وہ پیلا پردہ ایک لکڑی کے ڈنڈے سے بندھا ہوا تھا مجھے گھوڑے پر تنا ہوا وہ سایہ دار چھوٹا سا شامیانہ بڑا اچھا اور عجیب سا لگا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اپنے لیے ویسا ہی شامیانہ بنواؤں گا۔

معاً" میں نے رانی کی تیز آواز سنی وہ سولدہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کی گفتگو میں صرف ایک لفظ میرے پلے پڑا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ اس سجے

ائے گھوڑے پر بیٹھ کر آنے والا کا نام ہے کیونکہ رانی نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سب سے پہلے وہی لفظ ادا کیا تھا جو راجہ مالدیو سے ملتا جلتا تھا ی لیے میں اسے بھی نام ہی سمجھا تھا۔ وہ لفظ تھا جگدیو تو میرے خیال میں نام ہی ہو سکتا تھا۔

اس شخص کی سواری ہماری ہی طرف آ رہی تھی ی لیے شاید سولدہ نے اپنا گھوڑا روک لیا تھا اور مجھ سے بھی گھوڑا روکنے کے لیے کہا تھا۔ ہم نے راستے کی یک جانب گھوڑے روک لیے۔

کچھ دیر ہی میں اس شخص کی سواری ہمارے بالکل قریب پہنچ گئی' اور پھر میں نے اس شخص کے چہرے پر انتہائی شدید حیرت کے آثار دیکھے۔ وہ شخص نوجوان ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے تیزی سے اپنا گھوڑا دوڑایا اور میرے گھوڑے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نوجوان کے کچھ کہنے سے پہلے رانی نے پھر ایک دم وہی لفظ کہا' جگدیو! اور اس کے جواب میں نوجوان نے شاردا کہہ کر مخاطب کیا۔ غالباً" رانی کا نام شاردا تھا۔

کچھ دیر دونوں ایک دوسرے کو جیسے پتھر بنے ہوئے دیکھتے رہے پھر میں نے رانی کی بھرائی ہوئی آواز سنی۔ وہ اس نوجوان سے کچھ کہہ رہی تھی جسے سن کر نوجوان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا جا رہا تھا نوجوان رانی کی بات پوری ہونے سے پہلے ایک دم چیخ پڑا اور اپنے گھوڑے کو آگے بڑھانے لگا۔ میں سب کچھ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ شاید رانی نے ہاتھ اٹھا کر نوجوان کو روکنا چاہا مگر وہ نہ رکا' اور پھر اسی وقت میں نے سولدہ کے گھوڑے کو اس کا راستہ روکتے دیکھا۔ اب تک غالباً" اس نوجوان نے سولدہ کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا دیکھا تو صرف سرسری نظر سے دیکھا ہو گا کیونکہ اس کی پوری توجہ رانی کی طرف تھی۔ میں نے سولدہ کو اس نوجوان سے گفتگو کرتے دیکھا اور اس کے ساتھ یہ بھی محسوس کیا کہ وہ نوجوان سولدہ کے حسین جسم کے نشیب فراز میں جیسے گم ہو کر رہ گیا ہے۔

کچھ دیر بعد ہی اس نے اپنے گھوڑے کی باگیں قلعے کی طرف موڑ دیں۔ وہ شاید سولدہ کی بات مان گیا تھا۔

میں نے اس کے انداز سے یہی اندازہ لگایا تھا۔ پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ اس نے اپنا گھوڑا میرے قریب لاتے ہوئے رانی سے کچھ کہا۔

"بوغا! جگدیو' رانی کو اپنے گھوڑے پر بٹھانا چاہتا ہے۔" سولدہ نے مجھے مخاطب کیا۔

"مگر یہ ہے کون؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"راجہ مالدیو کا بیٹا اور رانی کا چھوٹا بھائی!" سولدہ نے بتایا۔

رانی میرے گھوڑے سے اتر کر اپنے بھائی کے گھوڑے پر جا بیٹھی اور وہ چھوٹا سا قافلہ قلعے کی جانب روانہ ہو گیا۔

میں نے راستے میں سولدہ سے پوچھا کہ اس کے اور جگدیو کے درمیان کیا بات ہوئی تھی اور رانی نے جگدیو سے کیا کہا تھا جسے سن کر جگدیو آپے سے باہر ہو گیا تھا؟

سولدہ نے میری بات کا جو جواب دیا' اس کا حاصل یہ تھا کہ رانی نے اپنے بھائی کو ایک من گھڑت کہانی سنا کر اپنے شوہر راجہ امر کوٹ کی طرف سے برگشتہ کر دیا تھا۔ رانی نے اپنے بڑے بھائی کو بتایا تھا کہ راجہ امر کوٹ نے اس پر بے راہروی کا الزام لگایا تھا جب کہ یہ بات قطعی غلط تھی۔ رانی نے یہ بھی کہا تھا کہ راجہ امر کوٹ نے اسے قتل کیے جانے کا حکم دے دیا تھا۔ اگر میں اور سولدہ اپنی جان پر کھیل کر اسے قید خانے پہنچنے سے قبل ہی سپاہیوں سے لڑ بھڑ کر نہ بچا لاتے تو وہ قتل کر دی جاتی۔ رانی نے مجھے اور سولدہ کو مغلیہ بادشاہ ہمایوں کے خاص خدمتگاروں میں بتایا تھا اور کہا تھا کہ بس ہمیں اتفاق سے رانی پر لگائے جانے والے الزام کا پتا چل گیا تھا۔ اپنی بہن کی زبانی وہ من گھڑت کہانی سن کر جگدیو کا جوان خون غصے سے کھول اٹھا تھا۔ وہ اسی وقت اور اسی حال میں راجہ امر کوٹ سے جواب طلبی کے لیے جانا چاہتا تھا لیکن سولدہ نے اسے سمجھا بجھا کر روک لیا تھا۔

مجھے اس پر بھی حیرت ہوئی کہ رانی بھی اسی طرح

تیزی کے ساتھ جھوٹ بول سکتی تھی جس طرح سولدہ! میں سوچنے لگا کہ کیا اگلے زمانے کی عورتیں واقعی اتنی ہی جھوٹی ہوں گی!

سولدہ اور میں گفتگو کرتے ہوئے جگدیو کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے قلعے میں داخل ہوئے۔ اسی دوران میں سولدہ نے مجھے بتایا کہ جگدیو اس وقت شکار کھیلنے کے قصد سے جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ہم مل گئے۔

قلعے ہی کے اندر درمیان میں راجہ بلدیو کا چھوٹا سا خوب صورت محل بنا ہوا تھا جو سرخ پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ سپاہی محل کے دروازے ہی پر رک گئے اور میں سولدہ کے ہمراہ جگدیو کے پیچھے پیچھے چل دیا مگر ابھی تک ہم گھوڑوں پر سوار تھے محل کا ایک ایک اندرونی دروازہ بھی تھا جہاں پہنچ کر ہم گھوڑوں سے اترے۔ دروازے ہی پر مسلح سپاہی اور خدمتگار موجود تھے جنہوں نے ہمارے گھوڑوں کی باگیں تھام لیں۔

جگدیو ہمیں ساتھ لیے محل میں داخل ہوا۔ محل اندر سے صاف ستھرا اور آراستہ تھا' بالکل ویسا ہی جیسا راجہ مالدیو کوٹ کا محل تھا۔ میں نے نرم و نازک جسموں والی خادماؤں کو ادھر سے ادھر آتے جاتے دیکھا۔ ان کے جسموں پر وہی عجیب سا لباس تھا جو میں نے امرکوٹ میں بھی عورتوں کو پہنے دیکھا تھا۔ اس لباس میں عورت کا پورا جسم نہیں چھپتا تھا اور جسم کے کچھ ایسے حصے بھی نظر آتے تھے جن پر نگاہ پڑے تو رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو جائے۔ خود رانی بھی اس سے ملتا جلتا لباس زیب تن کیے ہوئے تھی۔

مختلف راستوں سے گزر کر ہم ایک ایسے بڑے کمرے میں پہنچے جس کی چھتوں سے آرائشی سامان لٹکا ہوا تھا' فرش پر قالین بچھے تھے اور ایک جانب چھوٹا سا لکڑی کا تخت رکھا ہوا تھا جو خالی تھا۔ اس تخت پر بھی بہترین قالین بچھا ہوا تھا اور دیوار کے سہارے گول گول موٹے تکیے ٹکے ہوئے تھے۔

جگدیو مجھے اور سولدہ کو وہاں بٹھا کر' رانی کو ساتھ لیے چلا گیا۔ جانے سے قبل اس نے سولدہ سے کچھ کہا تھا اور جواب میں سولدہ نے سر ہلا دیا تھا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے سولدہ سے پوچھا۔ "وہ کہاں چلا گیا؟ اور ہمیں یہاں کیوں بٹھا گیا ہے؟ وہ اپنے ساتھ رانی کو بھی لے گیا۔"

"کیوں' مجھے رانی کے لے جانے پر کوئی اعتراض ہے؟" سولدہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "وہ اسی محل میں ہے اور تو بھی یہیں رہے گا' پھر ملاقات ہو جائے گی۔ ویسے وہ اپنے ماں باپ سے ملنے گئی ہے اور شاید ان کے ساتھ ہی واپس بھی آئے۔ جگدیو اپنے باپ راجہ مالدیو کو اور اپنی ماں کو بلانے گیا ہے تاکہ وہ بھی ہم سے مل لیں۔ راجہ مالدیو یقیناً" مجھے دیکھتے ہی پہچان لے گا۔ اس وقت بہت لطف آئے گا۔ اب مجھے دوبارہ جوان حالت میں دیکھ کر اسے اور بھی یقین ہو جائے گا کہ میں واقعی دیوی ہوں کیونکہ اس دوران میں وہ بوڑھا ہو چکا ہو گا اور میں اسی طرح ہوں۔" سولدہ کے لہجے میں عجیب سی خوشی تھی۔

"دیوی کیا ہوتا ہے؟" میں نے ایک نیا لفظ سن کر دریافت کیا۔

"ہوتا نہیں ہوتی ہے؟" سولدہ ہنس کر بولی۔ "بس تو یہ سمجھ لے کہ وہ بھی تیری طرح مجھے سولدہ سمجھتا ہے۔"

"سمجھتا کیا ہے' تو ہے ہی سولدہ!" میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑی' پھر بولی۔ "نہیں جانتی ہوں کہ میں کبھی تم لوگوں کو نہ سمجھا پاؤں گی۔ تمہیں کبھی یقین نہ آسکے گا کہ میں کوئی روح نہیں ہوں۔"

ہم گفتگو کرنے کے سبب ان لوگوں کے قدموں کی چاپ سن سکے جو اس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہمیں کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا ہم نے بیک وقت مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔

"دیوی!" معاً" وہ بوڑھا شخص چیخ اٹھا جس کے چہرے پر بڑی بڑی گھنی مونچھیں تھیں اور سر پر بڑی سی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہی راجہ مالدیو ہے۔

راجہ مالدیو کی چیخ سن کر سولدہ مسکرائی اور جواب

ں کچھ کہا، پھر ہاتھ کے اشارے سے راجہ مالدیو کو اندر
نے کے لیے کہا۔

راجہ مالدیو تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں
نب ایک بوڑھی عورت اور جگدیو تھے۔ راجہ کے
چھے رانی تھی، یعنی شاردا، راجہ مالدیو کی بیٹی اور راجہ
مرکوٹ کی بیوی! شاردا کے ساتھ ہی مجھے ایک اور چاند
ا چہرہ نظر آیا۔ اس نوخیز و نوجوان لڑکی کے خدوخال
ہی حد تک شاردا سے ملتے جلتے تھے مگر وہ شاردا سے
کہیں زیادہ حسین تھی۔ شاردا اگر بھری بہاری تھی تو
ہ لڑکی بہار کا ہلا چھونکا تھی۔ شاردا اگر مہکتا ہوا پھول
تھی تو وہ ایسی کلی تھی جو بس کھلنے ہی والی ہو۔ میں اس
سراپا قیامت کو دیکھتا رہی رہ گیا اور چونکا اس وقت جب
میں نے راجہ مالدیو کو سولدہ کے روبرو سجدے میں گرا
ہوا دیکھا۔ راجہ مالدیو کو سجدے میں گرا ہوا دیکھ کر اس
کی رانی بھی سجدے میں چلی گئی۔ جگدیو نے ایک لمحے
کو ماحول کا جائزہ لیا، پھر اس نے بھی اپنے ماں باپ کی
تقلید میں ایسا ہی کیا۔

شاردا اور اس کے ساتھ کھڑی ہوئی ہرنی جیسے
آنکھوں والی لڑکی حیرت سے اپنے ماں باپ اور بھائی کو
سولدہ کے سامنے سجدہ ریز دیکھ رہی تھی۔

معاً" سولدہ کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی، پھر اس نے
آگے ہاتھ بڑھا کر راجہ مالدیو کو سجدے سے اٹھا لیا۔
اس کے بعد بوڑھی عورت اور جگدیو بھی سجدے سے
اٹھ گئے۔ وہ بوڑھی عورت یقیناً" راجہ مالدیو کی بیوی
اور شاردا کی ماں تھی۔ میں نے شاردا کے ساتھ کھڑی
ہوئی لڑکی کے بارے میں اندازہ لگایا تھا کہ وہ شاید شاردا
کی چھوٹی بہن ہے۔

راجہ مالدیو اور سولدہ کے درمیان کچھ گفتگو ہوئی، پھر
میں نے دیکھا کہ راجہ نے سولدہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا
اور اس چھوٹے سے تخت کی طرف لے جانے لگا جو
دیوار کے قریب بچھا ہوا تھا۔ سولدہ مسکرا کر کچھ کہتی جا
رہی تھی اور انکار میں سر ہلا رہی تھی۔ میں کچھ بھی
نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ سولدہ، راجہ سے کیا کہہ رہی ہے
اور راجہ کیا چاہتا ہے! لیکن اس وقت میری سمجھ میں
ساری بات آگئی جب راجہ نے سولدہ کو تخت پر بٹھا دیا
اور خود مودب انداز میں تخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ معاً"
راجہ کو جیسے کچھ خیال آگیا۔ وہ شاردا اور اس حسین
لڑکی سے مخاطب ہوا اور کچھ کہا۔ جواب میں ان دونوں
نے انکار میں سر ہلائے تو راجہ نے سخت لہجے میں
انہیں کوئی حکم دیا۔ اسی وقت سولدہ بھی کچھ بولی اور پھر
میں نے شاردا کے ساتھ اس حسین لڑکی کو بھی تخت
کے سامنے سجدہ ریز ہوتے دیکھا۔ غالباً" راجہ نے ان
سے یہی پوچھا ہو گا کہ ان دونوں نے سولدہ کو سجدہ کیا یا
نہیں جب اسے معلوم ہوا ہو گا کہ انہوں نے سجدہ
نہیں کیا تو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہو گا۔ وہ نازک سا
جسم سجدے میں جھکتا ہوا اور پھر سجدے سے اٹھتا ہوا
مجھے بہت اچھا لگا۔

سولدہ کے ہونٹوں پر اس وقت ایک عجیب اور پر
اسرار سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا
کہ شاید سولدہ ان لوگوں کی سجدہ گزاری اور اظہار
عقیدت سے خوش ہوئی تھی۔

"بونگا!" معاً" سولدہ نے مجھے مخاطب کیا تو میں
چونک پڑا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تو بھی یہاں میرے پاس
آکر بیٹھ جا! تو دور بیٹھا اچھا نہیں لگ رہا۔"

میں اس کی بات کا کوئی جواب دیے بغیر اپنی جگہ
سے اٹھا اور اس چھوٹے سے تخت کی طرف بڑھا جس
پر سولدہ بیٹھی ہوئی تھی۔

ابھی میں تخت تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ اچانک میری
سماعت سے ایک کریہہ، بھیانک اور تیز قسم کی آواز
ٹکرائی جیسے بہت سی منحوس کیلیں (روحیں) بیک
وقت ہم آواز ہو کر چیخ اٹھی ہوں۔ میرے آگے بڑھتے
ہوئے قدم رک گئے۔ وہ آواز دروازے کی جانب سے
آئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا اور
اسی وقت راجہ مالدیو ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر
دروازے کی جانب لپکا۔

"مہاراج!" راجہ مالدیو کی زبان سے میں نے ایک
اجنبی لفظ سنا اور اس عجیب و غریب شخص کو غور سے
دیکھا جس کے لیے وہ لفظ استعمال کیا گیا تھا۔

کمرے کے دروازے میں ایک عجیب الخلقت شخص کھڑا تھا جس کے سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ وہ پستہ قد تھا اور اس کے جسم پر ایک پیلا سا لبادہ تھا۔ اس کے ہاتھوں میں لوہے کا ایک بڑا سا چمٹا تھا اور دونوں ہاتھوں میں لوہے کے کڑے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے پورے وجود میں اس کی آنکھیں بہت عجیب اور نمایاں تھیں چھوٹی چھوٹی گول گول انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی سرخ آنکھیں!

میں نے دیکھا کہ راجہ مالدیو اس شخص کے قدموں پر جھک گیا۔ اس دوران میں سولدہ اور میرے علاوہ وہاں موجود تمام افراد ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ سب باری باری اس کے قدموں پر جھکتے جا رہے تھے۔ جب وہ جھکنے والے کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا اور جھکنے والا اس کے پاؤں چھو لیتا تو ادب سے پیچھے ہٹ جاتا۔ اس کے بعد دوسرا آگے بڑھتا۔ اس شخص کا حلیہ ان سادھوؤں سے ملتا جلتا تھا جنہیں میں نے صحرائے گوبی کی یاموں (سراؤں) میں دیکھا تھا۔ وہ جو دشت میں رہنے والوں کو اپنے اپنے مذاہب کی خوبیاں گنواتے تھے اور انہیں اپنا مذہب اختیار کرنے کے لیے کہتے تھے۔

میں نے اس سادھو کی جانب سے اپنی نگاہ ہٹا کر سولدہ کو دیکھنا چاہا مگر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ اس سادھو کی اور میری نگاہیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ وہ پلیں جھپکائے بغیر میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے اور کیوں میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔ کہ میں بھی راجہ مالدیو اور دوسروں کی طرح اس سادھو کے قدموں پر جھک جاؤں۔ یہ خواہش چند ہی لمحوں میں اتنی بڑھ گئی کہ میں بے اختیار ہو کر سادھو کی طرف بڑھا۔ سادھو کے ہونٹوں پر بڑی شفیق سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے قریب پہنچ کر قدموں پر جھک گیا اور پاؤں چھو لیے میں نے اپنے سر پر سادھو کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا اور پھر میں ادب سے پیچھے ہٹ کر شاردا اور جگدیو کے قریب کھڑا ہو گیا۔

اب مجھ میں یہ جرات نہ ہو رہی تھی کہ میں سادھو کو نظر اٹھا کر دیکھوں۔ سادھو، راجہ مالدیو سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے الفاظ ختم ہوئے تو مجھے سولدہ کی آواز سنائی دی۔

"بوغا! میں نے تجھ سے اپنے قریب آ کر بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔" سولدہ کے لہجے میں سختی تھی۔ غالباً اسے میرا سادھو کے قدموں پر جھکنا پسند نہیں آیا تھا۔

میں سولدہ کی بات سن کر پلٹا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سولدہ اور اس سادھو کی نگاہیں آپس میں الجھی ہوئی ہیں۔ سولدہ کے چہرے سے سنجیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ معاً" میں نے اس کے ہونٹوں کو حرکت کرتے دیکھا۔ وہ یقیناً" سادھو کو مخاطب کر کے کچھ کہہ رہی تھی۔ جواب میں اس سادھو نے بھی کچھ کہا تھا، پھر ایک دم، مڑ کر دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔ راجہ مالدیو اسے حیرت سے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا تھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ سب کیا ہو رہا تھا! میں خاموشی سے سولدہ کے قریب تخت پر جا بیٹھا۔ راجہ مالدیو اور وہاں موجود دوسرے افراد ایک بار پھر سولدہ کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔

سولدہ نے راجہ کو مخاطب کیا، سولدہ اور راجہ کے درمیان کافی دیر گفتگو ہوتی رہی، پھر گفتگو کے آخر میں سولدہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

راجہ مالدیو اور دوسرے بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ہم سب اس کمرے سے نکلے اور ایک جانب بڑھے۔ راجہ مالدیو آگے آگے تھا۔

راجہ مجھے اور سولدہ کو ایک چھوٹے مگر آرام دہ کمرے میں لے آیا، پھر سولدہ کے پاؤں چھو کر پیچھے ہٹتا ہوا کچھ بولا۔ بقیہ افراد نے بھی سولدہ کے پاؤں چھوئے اور یکے بعد دیگرے راجہ مالدیو کے ساتھ اس کمرے سے نکل گئے۔

جیسے ہی وہ لوگ گئے سولدہ نے مجھے دروازہ بند کرنے کے لیے کہا اور آرام دہ بستر پہ نیم دراز ہو گئی۔ وہاں دو لکڑی کی چوکیوں پر بستر بچھے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر سولدہ نیم دراز ہو گئی تھی۔ دوسری چوکی بھی قریب ہی تھی۔ سولدہ نے مجھے اس پر دراز ہونے کے

لیے کہا میں نے محسوس کیا کہ سولدہ کچھ فکر مند سی ہے۔ اس کے چہرے سے ایسا ہی پتا چل رہا تھا۔

میرے ذہن میں متعدد سوالات گردش کر رہے تھے جن کا تعلق اس عجیب و غریب سادھو سے تھا۔ میں زیادہ دیر اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکا۔

"سولدہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میرے لہجے میں اضطراب و تجسس تھا۔

"ایسا لگتا ہے جیسے ہم زیادہ عرصے یہاں نہ رہ سکیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میری وجہ سے اس سادھو کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا ہے۔" سولدہ بولی۔

"مگر وہ سادھو ہے کون؟ اور وہ اس طرح محل میں کیسے داخل ہو گیا؟"

"راجہ مالدیو اس سادھو کا بے انتہا عقیدت مند ہے۔ اب سے برسوں پہلے جب وہ بے اولاد تھا تو یہ سادھو اس سے ملا تھا۔ اسی سادھو کی دعا کے نتیجے میں راجہ مالدیو صاحب اولاد ہو سکا تھا۔ اسی وقت راجہ مالدیو نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ سادھو کسی بھی وقت اس کے محل میں داخل ہو سکتا ہے، اسے نہ روکا جائے۔" سولدہ مجھے اس سادھو کے بارے تفصیل سے بتا رہی تھی۔

"سنا گیا ہے کہ اس سادھو کے پاس کچھ پراسرار قوتیں ہیں جن کا کچھ تجربہ راجہ مالدیو کو بھی ہو چکا ہے اور میں نے بھی ابھی اندازہ لگایا تھا کہ اس میں کچھ غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔ وہ تنویمی عمل کا بھی ماہر لگتا ہے اور ..."

"تنویمی عمل کیا ہے۔" میں نے سولدہ کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"اسے تو ایک طرح سے آنکھوں کی قوت سمجھ لے۔ اسی قوت کا مظاہرہ اس نے تجھ پر کیا تھا تو تجھے اپنے قدموں پر جھکا لیا تھا لیکن میرے سلسلے میں وہ ناکام رہا تھا۔ وہ اسی وجہ سے جھنجھلا گیا تھا۔" سولدہ نے مجھے سمجھایا۔ "جب راجہ مالدیو نے اس سے کہا تھا کہ میں دیوی ہوں تو اس نے راجہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا اور بولا تھا کہ وہ مجھے بھی اپنے قدموں پر جھکنے کے لیے مجبور کر دے گا۔ جب وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا تو برہم ہو کر چلا گیا اور جاتے جاتے اس نے کہا کہ وہ مجھے بہت جلد اپنی پراسرار قوتوں سے زیر کر لے گا۔ وہ جو عمل جانتا ہے، وہ باقاعدہ ایک علم ہے اور میں بھی یہ علم جانتی ہوں مگر اسے استعمال نہیں کرتی کیونکہ میرا تعلق جس عہد سے ہے، وہاں اب اس علم کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ اس کی وجہ یہ کہ اس کا توڑ دریافت کر لیا گیا ہے۔ اب میرے عہد سے متعلق کسی بھی فرد پر اس علم کے ذریعے مسلط نہیں ہوا جا سکتا اور نہ اس سے کوئی بات منوائی جا سکتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پھر تجھ سے ٹکرانے اور تجھے زیر کرنے کی کوشش میں یہاں آئے گا؟" میں نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"ہاں مجھے اپنی طرف سے تو کوئی فکر نہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ میری طرف سے مایوس اور ناکام ہو کر کہیں تجھ پر حاوی ہونے کی کوشش نہ کرے!" سولدہ بولی، پھر چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "خیر جو ہو گا دیکھا جائے گا تو فکر مند نہ ہو۔"

ابھی سولدہ کے الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ کمرے میں ایک تیز قسم کی بھنبھناہٹ سی گونجی جو لحہ بہ لحہ تیز ہوتی چلی گئی۔ میں چونک پڑا۔

"یہ یہ آواز آواز کیسی ہے سولدہ؟" میں نے خوفزدہ سی آواز میں کہا۔

"پتا نہیں یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے!" سولدہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

اسی وقت میری نگاہ کمرے کے دریچے پر پڑی اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ سولدہ نے بھی اس طرف دیکھا۔ دریچے سے ایک سیاہ سانپ اندر آ رہا تھا۔

سولدہ نے جلدی سے اپنے لباس میں ہاتھ ڈالا، اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں پراسرار ہتھیار نظر آیا۔ اس نے ہتھیار، سانپ کی طرف کیا اور کمرے میں بجلی سی کوند گئی۔ بجلی کا کوندا سانپ سے ٹکرایا اور دوسرے ہی لمحے سانپ کی جگہ اس کے جسم کی راکھ

کھڑکی کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔ اب وہ بھنبھناہٹ بھی ختم ہو چکی تھی۔ میرے حواس اب بحال ہو چکے تھے اور سانپ کی راکھ پر میری نگاہ جمی ہوئی تھی۔

ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میں نے اس راکھ میں حرکت دیکھی۔

"سولدہ!" میں کانپتی آواز میں بولا اور راکھ کی جانب انگلی اٹھائی۔

"ہاں میں دیکھ رہی ہوں کہ راکھ میں حرکت ہو رہی ہے۔" سولدہ کی آواز پر سکون تھی۔ جتنی دیر میں سولدہ کا فقرہ پورا ہوا' اس عرصے میں راکھ تیزی سے حرکت کرتی ہوئی کچھ آگے بڑھ آئی تھی۔ پھر اس وقت میں نے بمشکل خود پر قابو رکھا جب اس راکھ سے ایک بڑا سا بچھو نکل کر سولدہ کے بستر کی جانب بڑھا۔

سولدہ نے اس بچھو کو بھی اپنے ہتھیار کا نشانہ بنا دیا۔ بچھو غائب ہو گیا اور اب راکھ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

سولدہ نے اطمینان کا ایک طویل سانس لیا اور بولی۔ "یہ سب اسی سادھو کی شعبدہ بازی ہے۔ وہ مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔"

سولدہ کی بات ختم ہوتے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ سولدہ نے مجھے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ میں ڈرتا ہوا بستر سے اترا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ پر شاردا اور وہی حسین لڑکی تھی جسے میں شاردا کی بہن سمجھا تھا مگر ابھی اس خیال کی تصدیق نہ ہو سکی تھی۔

وہ دونوں اندر آ گئیں۔ شاردا کے چہرے سے گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سولدہ سے کچھ کہا سولدہ نے مسکرا کر اس کی بات کا جواب دیا اور انکار میں سر ہلا دیا۔ سولدہ نے ان دونوں کو اپنے قریب ہی بستر پر بٹھا لیا۔

میں اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گیا اور اس حسن مجسم کی رعنائیوں میں کھو گیا جو اس وقت میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس وقت میں نے اس کی آنکھوں میں ایک [illegible] اور ادا ہی! اس کے علاوہ میں نے اس کی نگاہ میں اپنے لیے پسندیدگی بھی محسوس کی۔

شاردا' سولدہ سے باتیں کر رہی تھی اور میں اس لڑکی کی حسین آنکھوں میں اپنے وجود کو ڈوبتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ پھر سولدہ نے اس لڑکی کو بھی مخاطب کر لیا۔ سولدہ اس سے شاید کچھ پوچھتی رہی اور وہ لڑکی نگاہ جھکائے جواب دیتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی باتیں سن کر سولدہ کے چہرے سے غصے کا اظہار ہونے لگا تھا مگر میں یہ نہ سمجھ سکا کہ سولدہ کس لیے غصے کا اظہار کر رہی تھی' اس لڑکی کے لیے یا کسی اور کے لیے! اس دوران میں کئی بار شاردا نے بھی مجھے میٹھی نگاہ سے دیکھا تھا لیکن میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

شاردا' سولدہ اور وہ حسین لڑکی کافی دیر تک آپس میں گفتگو کرتے رہے' پھر وہ دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سولدہ نے ان سے پھر کچھ کہا۔ اس کے لہجے سے پتا چل رہا تھا جیسے وہ ان دونوں کو تسلی دے رہی ہو۔

میں نے ان کے جاتے ہی سب سے پہلے سولدہ سے اس حسین لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ "سولدہ! وہ شاردا کے ساتھ دوسری لڑکی کون تھی؟"

"کل دیپ!" سولدہ نے جواب دیا۔ "وہ شاردا کی چھوٹی بہن ہے۔ کیوں' تو اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟"

میں سولدہ کی بات سن کر گڑبڑا گیا اور بولا۔ "بس۔۔۔ بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔" پھر بات ٹالنے کے لیے جلدی سے کہا۔ "وہ دونوں کیوں آئی تھیں؟"

سولدہ نے طویل سانس لے کر کہا۔ "لمبی کہانی ہے۔ ہاں کسی نے تیری چیخ سنی تھی۔ وہ محل کی ایک کنیز تھی جو ادھر سے گزر رہی ہو تھی۔ اس نے شاردا کو جا کر بتایا تھا۔ شاردا کے پاس اس وقت کل دیپ بھی تھی۔ وہ دونوں یوں بھی مجھ سے ملنے آنے والی تھیں۔"

"کس لیے؟" میں نے سوال کیا۔

"مجھے اپنی بپتا سنانے!" سولدہ نے جواب دیا' پھر سولدہ نے بڑی عجیب و غریب باتیں بتائیں جنہیں سن

کر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں خوف محسوس کرنے لگا۔

سولدہ نے بتایا تھا کہ شاردا کی حسین بہن کل دیپ اس سادھو کے قبضے میں ہے۔ سادھو اس نوخیز و حسین لڑکی کو بڑے پر اسرار طریقے پر اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے جو کل دیپ کے لیے انتہائی اذیت ناک ہے۔ ہر ہفتے کی رات کو وہ سادھو ایک سانپ کی صورت میں کل دیپ کی خواب گاہ کے اندر نمودار ہوتا ہے، پھر وہ اپنی اصل شکل اور جسم میں لوٹ آتا ہے۔ سادھو، کل دیپ کو بے لباس کرنے کے بعد دوبارہ سانپ بن جاتا ہے اور کل دیپ کے جسم سے لپٹ جاتا ہے۔ کل دیپ کے ساتھ جب پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا تھا تو اس نے چیخنا چاہا تھا لیکن اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود نہ چیخ پائی اور دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ جب اسے ہوش آیا تھا تو اس نے انتہائی تکلیف و اذیت محسوس کی تھی۔ سادھو، سانپ بن کر اس کے جسم سے لپٹا ہوا تھا اور جسم کے نازک حصوں کو ڈس رہا تھا۔ تمام رات یہی تکلیف دہ عمل جاری رہا اور صبح ہونے سے پہلے سادھو، کل دیپ کو یہ دھمکی دے کر چلا گیا کہ اگر اس نے کسی سے اس واقعے کا ذکر کیا تو وہ اسے ہلاک کر دے گا۔ کل دیپ کو سادھو کی دھمکی کے بعد اتنی جرات نہ ہوئی کہ وہ کسی سے کچھ کہہ سکتی اور یوں بھی یہ ایسی بات تھی کہ جس کا تذکرہ بھی کرتے ہوئے وہ انتہائی شرم محسوس کرتی تھی۔ اس رات کے بعد سے اب تک سادھو کا یہی معمول ہے۔ وہ ہر ہفتے کی رات، کل دیپ کی خواب گاہ میں گزارتا ہے۔ اس دوران میں کل دیپ نے سادھو کے بارے میں چند ایسی باتیں معلوم کر لی ہیں جن پر عمل کر کے سادھو کو ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔ خود سادھو ہی نے ایک دن لہر میں کل دیپ کو بتا دیا تھا کہ اگر اس وقت کوئی اس پر غفلت میں حملہ کر دے جب وہ سانپ بن کر کل دیپ کے جسم کو ڈس رہا ہوتا ہے تو وہ مدافعت نہیں کر پائے گا لیکن ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ حملہ آور کی طرف سے غافل ہو۔ اس کے علاوہ یہ کہ اگر کوئی شخص ان مخصوص دنوں میں اس کی کٹیا کے اندر جا کر حملہ آور ہو جائے جب وہ جاپ کر رہا ہو تو وہ قطعی بے بس ہو جائے گا۔ سولدہ نے مجھے جاپ کا مطلب بھی سمجھایا اور یہ بھی بتایا کہ سادھو ہر چالیس دن کے بعد اپنی پر اسرار قوتوں کو بحال رکھنے کے لیے پورے تین دن اور تین رات جاپ کرتا ہے۔ اس دوران میں نہ وہ کسی سے ملتا ہے اور نہ کچھ کھاتا پیتا ہے۔ انہیں دنوں میں ایک بار کل دیپ نے سادھو پر حملہ کرنا چاہا تھا۔ وہ ایک شب سادھو کی کٹیا تک پہنچ گئی تھی لیکن کٹیا کے اندر سے بھیانک آوازیں آتی ہوئی سن کر وہ خوفزدہ ہو گئی تھی اور کٹیا میں گھسنے کی ہمت نہ کر سکی تھی۔ کل دیپ نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ سادھو اس واقعے سے بے خبر رہا تھا حالانکہ وہ خوفزدہ تھی کہ بعد میں سادھو اس سے استفسار کرے گا۔

مجھے سولدہ [illegible] سن کر [illegible] محسوس ہوا کہ آنے والی رات ہفتے کی [illegible] اور سولدہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ کل دیپ کی خوابگاہ میں ضرور جائے گی۔ اس کے ساتھ خوف کے باوجود میرے دل میں اس جسم حسین کے بے حجاب نظارے کا بھی اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ میرے تصور میں کل دیپ کا حسین جسم لہرانے لگا۔

"سولدہ! میں بھی کل..... کل رات تیرے ساتھ وہاں چلوں گا۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

سولدہ نے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولی۔ "تو تو میرے ساتھ چلے گا؟ کیا تجھے خوف نہ آئے گا؟ ابھی کچھ دیر پہلے میں تیری حالت دیکھ چکی ہوں۔"

"جب تو میرے ساتھ ہے تو پھر مجھے کس کا خوف؟ تو بھی تو سولدہ ہے۔" میں نے اپنے دل کو تسلی دینے کی خاطر کہا۔

میں مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ آنے والے دو خادم تھے جو ہمارے لیے کھانا لے کر آئے تھے۔

مجھے وہ کھانا بڑا عجیب اور بدمزا لگا مگر سولدہ نے خوب کھایا اور مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔ آخر میں نے

کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"کیوں، کھا کیوں نہیں رہے؟" سولدہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہ کوئی کھانا ہے؟" میں منہ بنا کر بولا۔

"جب تک یہاں ہیں اس پر گزارہ کرنا پڑے گا۔ یہاں گوشت نہیں ملے گا بوغا!"

"کیوں؟"

"ان کے مذہب میں گوشت کھانا گناہ ہے۔" سولدہ نے جواب دیا۔

"عجیب لوگ ہیں۔" میں بڑبڑایا۔ "بھلا بغیر گوشت کے پیٹ کیسے بھر سکتا ہے؟"

پانی پی کر میں بستر پر دراز ہو گیا۔ تھکن کافی تھی اس لیے مجھے نیند آنے لگی۔ یہ محسوس کر کے میں نے سولدہ سے کہا "میں سو جاؤں؟"

"جیسی تیری مرضی!" سولدہ نے جواب دیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

میری آنکھ ایک تیز چیخ کی آواز سے کھلی تھی اور وہ چیخ نسوانی تھی۔ مجھے پہلا خیال سولدہ کا آیا تھا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ پے در پے پھر چیخیں سنائی دیں جیسے کوئی انتہائی خوف و دہشت کے عالم میں چیخ رہا ہو۔

میں نے دیکھا کہ سولدہ اپنے بستر سے غائب تھی اور کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ غالباً "شام ہو چکی تھی۔ مجھے معاً" دوپہر کا منظر یاد آ گیا جب میں نے دریچے سے ایک سانپ کو داخل ہوتے دیکھا تھا، پھر اس سانپ کی راکھ سے ایک بچھو پیدا ہو گیا تھا۔

میں تنہا اس کمرے میں تھا جہاں وہ واقعہ پیش آیا تھا۔ خوف کے سبب میرے سارے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ کمرے سے نکل کر حقیقت حال جان سکتا کہ وہ چیخیں کس کی تھیں!

اب چیخیں سنائی دینا بند ہو گئیں تھیں اور مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ شاید کوئی اسی کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کمرے کے دروازے سے اندر آنے والی شاردا اعظم جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ وہ میرے قریب آئی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ مجھے کہاں لے جانا چاہتی تھی! مگر اس کمرے میں تنہا رہنے سے یہی بہتر تھا کہ میں اس کے ساتھ چلا جاتا اور میں نے ایسا ہی کیا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ لیے کمرے سے نکلی اور ایک جانب بڑھی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ خاموشی سے چلنے لگا۔ مختلف راہداریوں سے ہو کر وہ مجھے محل کے ایک حصے میں لے گئی۔ وہاں مجھے قدم قدم پر مسلح پہرے دار نظر آئے جو شاردا کو آتے دیکھ کر مودبانہ انداز میں ایک طرف ہٹ جاتے تھے۔

محل کے اس حصے میں پہنچ کر شاردا ایک کمرے کے دروازے تک گئی اور مڑ کر مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اس کمرے کے دروازے پر بھی دو مسلح پہرے دار موجود تھے جن کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے سولدہ نظر آ گئی جو ایک بڑی سی چوکی کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس چوکی پر بستر بچھا ہوا تھا اور بستر پر کل دیپ آنکھیں بند کیے دراز تھی۔

کمرے میں سولدہ کے علاوہ راجہ مالدیو، اس کی بیوی اور جگدیو بھی نظر آ رہے تھے۔ ان سب ہی کے چہروں سے فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مجھے اور شاردا کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر یا ہمارے قدموں کی چاپ سن کر سولدہ نے مڑ کر دیکھا۔ میں سیدھا اس کی طرف چلا گیا۔ اس نے مجھے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کل دیپ کو کیا ہوا؟" میں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔ میری نظر اس حسن خوابیدہ کے نشیب و فراز پر بھٹک رہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ سولدہ میرے پہلے سوال کا جواب دیتی میں نے دوسرا سوال کیا۔ "تو مجھے وہاں اکیلا چھوڑ کر کیوں چلی آئی تھی؟"

"میں جانتی تھی کہ تو وہاں اکیلا ڈرنے لگے گا۔

سولدہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس لیے تجھے یہاں اپنے پاس بلوالیا۔"

"ہاں مجھے وہاں ڈر لگ رہا تھا۔" میں نے اعتراف کیا، پھر بولا۔

"ہاں تو نے یہ نہیں بتایا کہ اسے کیا ہوا؟" میں نے کل دیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلو بدلا۔

"یہ اسی سادھو کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔" سولدہ نے بتایا پھر بولی۔

"شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کل دیپ نے شاردا کو اور مجھے سادھو کی حرکتوں کے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا جو وہ سادھو نہیں چاہتا ہوگا۔"

"لیکن اسے ہوا کیا؟" میں نے سولدہ کے خاموش ہوتے ہی پھر سوال کیا۔

"کل دیپ جب ہوش میں آتی ہے تو کہتی ہے کہ کوئی انتہائی خوفناک، بدشکل اور کریہہ وجود اس کی گردن دبانے لگتا ہے۔ وہ پراسرار وجود کل دیپ کے علاوہ کسی اور کو نظر نہیں آتا۔" سولدہ بتانے لگی۔ "وہ خوفناک اور نادیدہ وجود کبھی بہت چھوٹا ہو جاتا ہے اور کبھی اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ اس کا سر چھت سے جا لگتا ہے۔ کل دیپ کی خوفناک شکل دیکھ کر چیخنے لگتی ہے۔"

سولدہ کی بات ختم ہوئی تھی کہ مجھے کل دیپ کے جسم میں حرکت نظر آئی۔ میری نگاہ اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی اس لیے میں نے فوراً اس حرکت کو محسوس کرلیا۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں بلا کی وحشت نظر آرہی تھی۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ معاً اس کے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنی گردن تک پہنچ گئے، بالکل اس طرح جیسے وہ کسی کو اپنا گلا دبانے سے روک رہی ہو۔

میں نے دیکھا کہ راجہ مالدیو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں سولدہ سے کچھ کہا جسے سن کر سولدہ کے چہرے پر میں نے ناپسندیدگی کے آثار دیکھے پھر اس نے راجہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سولدہ کی بات سن کر راجہ مالدیو اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

"عجب شخص ہے، اسی کو بلانا چاہتا ہے جس نے کل دیپ کا یہ حال کیا ہے۔" سولدہ بڑبڑائی۔

میں اس کی بڑبڑاہٹ کا مقصد سمجھ گیا مگر پھر بھی وضاحتاً پوچھا "کیا راجہ، اسی سادھو کو بلوانا چاہتا ہے؟"

سولدہ نے اثبات میں سر ہلایا مگر زبان سے کچھ نہ بولی۔ کمرے میں اب بھی کل دیپ کی گھٹی گھٹی سی چیخیں سنائی دے رہی تھیں اور اس کی بہن شاردا بھرائی ہوئی آواز میں شاید اسے تسلیاں دے رہی تھی راجہ مالدیو اس دوران میں پھر اپنی جگہ منہ لٹکائے آ بیٹھا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی کل دیپ ایک تیز چیخ مار کر پھر بے ہوش ہو گئی۔ اس کا جسم اس بار کچھ اکڑا سا گیا تھا۔ شاردا کھڑی ہوئی پھر جھک کر اس کے جسم کو سیدھا کرنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ سادھو کے آنے تک کل دیپ کو دوبار ہوش آیا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

سادھو کے چمٹا بجانے کی آوازیں دور ہی سے سنائی دینے لگی تھیں۔ یہ آوازیں سنتے ہی راجہ مالدیو اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ اٹھا تھا اور کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ غالباً سادھو کا استقبال کرنے کے لیے گیا تھا۔ اس کے پیچھے اس کا بیٹا جگدیو بھی کمرے سے چلا گیا تھا۔

چمٹا بجنے کی آوازیں اور عجیب و غریب بے ہنگم صدائیں لحہ بہ لحہ قریب آتی گئیں۔

سادھو چمٹا بجاتا ہوا اور اپنے منہ سے خوفناک سی آوازیں نکالتا ہوا، راجہ مالدیو اور جگدیو کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا، ایک دم بے ہوش کل دیپ ہوش میں آگئی اور پھر وہ

اچانک اٹھ کر بستر سے اتر گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ سادھو کے قدموں پر جھک رہی ہے۔ سادھو نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس نے میری اور سولدہ کی جانب بڑی حقارت بھری نگاہ سے دیکھا۔ اس کے بعد وہ سولدہ سے کچھ بولا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔ سولدہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سادھو مڑ کر راجہ مالدیو سے مخاطب ہوا۔ کل دیپ، سادھو کے قدموں سے اٹھ کر مودب انداز میں ایک طرف بیٹھ گئی۔

معاً سولدہ کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ اس نے بھی راجہ مالدیو سے کچھ کہا، پھر اس کی بات سنے بغیر مجھ سے بولی۔ "اٹھ بوغا؟"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گیا۔

"سولدہ! وہ منحوس سادھو مجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟" میں نے باہر نکلتے ہی دریافت کیا۔

"وہ مجھ پر اپنی بڑائی جتا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اگر میں واقعی دیوی ہوں تو میں نے کل دیپ کو ٹھیک کیوں نہ کر دیا!" سولدہ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں نہ غصہ تھا نہ حقارت!"

"پھر تو خاموش کیوں ہو گئی؟" میں بولا۔

"اس لیے کہ میں دیوی نہیں ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

سولدہ مجھے لے کر اسی کمرے میں آ گئی جہاں مجھے اور اسے ٹھہرایا گیا تھا۔ اب وہ کمرہ روشن نظر آ رہا تھا۔ شاید میری غیر موجودگی میں محل کے کسی خادم نے مٹی کا وہ چھوٹا سا پیالہ روشن کر دیا تھا جو ایک جانب طاق میں رکھا ہوا تھا اور جس پر پہلے میری نگاہ نہیں پڑی تھی۔ کمرے میں اس کے سوا بظاہر کوئی تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی مگر نہ جانے کیوں وہاں پہنچتے ہی مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا! میں نے اپنے اس خوف کو اظہار سولدہ سے بھی کر دیا۔

"مجھے یہاں آ کر ڈر سا لگ رہا ہے۔" میں نے سولدہ سے کہا۔

"سب تیرا وہم ہے۔ اس واقعے کو اپنے ذہن سے جھٹک دے جو دوپہر کو پیش آیا تھا۔ تیرے ذہن پر ابھی تک اسی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔" سولدہ نے مجھے سمجھایا۔

سولدہ کے سمجھانے سے یہ ضرور ہوا کہ میں نے اپنے دل کو مضبوط کر لیا مگر خوف پھر بھی میرے حواس پر مسلط رہا۔ سولدہ نے میرے دل سے خوف دور کرنے کے لیے دشت کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کی باتوں کا یہ اثر ہوا کہ میں ذہنی طور پر کچھ دیر کے لیے صحرائے گوبی میں پہنچ گیا جہاں باتو خاں تھا، سرقوشی بیگی تھی، ملکہ تورا کینہ اور اوغول غمائش تھیں۔ اسی دوران میں محل کے خادم ہمارے لیے کھانا لے کر آ گئے۔

"یہ بھی ویسا ہی بدمزہ کھانا ہو گا جیسا دوپہر کھایا تھا۔" میں منہ بنا کر بولا۔

"ظاہر ہے!" سولدہ نے مسکرا کر کہا۔ "نہ یہاں تجھے گھوڑی کے دودھ میں بھیگے ہوئے جو مل سکتے ہیں اور نہ سوکھا ہوا گوشت!"

"یہاں گھوڑیاں تو ہوں گی؟" میں نے کہا۔

"ہاں ہیں کیوں نہیں؟" سولدہ ہنس کر بولی۔ "مگر کوئی ان کا دودھ نہیں پیتا۔"

"اسی لیے لوگوں میں جان نظر نہیں آتی۔" میں نے جل کر کہا اور سولدہ ہنسنے لگی۔

کسی طرح وہ پھیکا سیٹھا کھانا زہر مار کر کے میں نے خوب پانی پی لیا تاکہ کچھ تو پیٹ بھر سکے پھر میں بستر پر دراز ہو گیا۔ اب بڑی حد تک میرے دل سے خوف نکل چکا تھا۔

میں نے جیسے ہی آنکھیں بند کیں، سادھو کا منحوس چہرہ میری آنکھوں میں گھومنے لگا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور سولدہ سے مخاطب ہوا۔ "مجھے پھر ڈر لگ رہا ہے، تو میرے پاس آ جا!"

"بوغا! تو بالکل بچہ ہے کیا؟" سولدہ کی آواز سنائی دی، پھر وہ اپنے بستر سے اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔

"تو بھی میرے ساتھ سو جا!" میں نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی' پھر بولی۔ "اچھا جب تک تجھے نیند نہیں آجائے گی میں تیرے پاس بیٹھی رہوں گی' بس!"

"نہیں! لیٹ جا میرے پاس!" میں ٹھنکا۔

"اچھا بابا لے!" یہ کہہ کر وہ واقعی میرے برابر لیٹ گئی۔

اس کے پاس لیٹنے سے میرا خوف جیسے بالکل ختم ہو گیا۔ چند لمحے بعد ہی اس کے جسمانی لمس نے میرے جسم میں سنسناہٹ سی پیدا کر دی۔

"سولدہ! میرے طرف منہ کر لے!" میں نے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا اب بھی ڈر لگ رہا ہے ننھے بچے؟" وہ مسکرائی اور میری طرف کروٹ لے لی۔

"نہیں' بالکل نہیں! اب ڈر نہیں لگ رہا۔" میں نے جواب دیا۔

سولدہ کے گرم گرم سانس میرے سانسوں میں الجھ رہے تھے اور مجھے قید خانے میں گزرے ہوئے وہ لمحے یاد آ رہے تھے جو شاردا کے قرب میں گزرے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا سولدہ بھی مجھے اسی لذت اور مسرت سے ہمکنار کر سکتی تھی جو مجھے شاردا نے بخشی تھی؟ آخر وہ بھی تو شاردا کی طرح عورت تھی اور شاردا سے کہیں زیادہ حسین! لیکن وہ تو سولدہ تھی۔ بھلا کسی سولدہ (روح) سے کوئی کس طرح قرب کی آرزو کر سکتا ہے! یہ سوچ کر میرا دل کچھ بجھ سا گیا۔ میں نے سولدہ کی خمار آلود اور نشیلی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوچا کیا وہ حسین آنکھیں واقعی ایک سولدہ کی ہیں؟

"کیا دیکھ رہا ہے تو؟ سوتا کیوں نہیں؟ کیا سوچ رہا ہے تو؟" سولدہ بولی تو میں چونک پڑا۔

"کچھ نہیں! میں میں یہ سوچ رہا تھا کہ....." میں اپنی بات پوری نہ کر سکا کیونکہ جو بات اس وقت میرے ذہن میں آئی تھی' اسے زبان سے ادا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔

"رک کیوں گیا؟ اپنی بات پوری کر!" سولدہ نے مجھے ترغیب دی۔

"میں وہی بات کہنا چاہتا تھا جو میں نے تجھ سے بور خان قالدون کے غار میں اس وقت کہی تھی جب تو اسی طرح میرے پاس لیٹی ہوئی تھی۔" میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"اچھا!" سولدہ یہ کہہ کر ہنس پڑی۔ "تو ہے بڑا ہرجائی بوغا! ایک طرف تو تو کل دیپ کو بھی نشیلی سی آنکھوں میں دیکھتا رہتا ہے' دوسری طرف مجھ سے عشق کا دعویٰ بھی ہے اور ہاں میں شاردا کو تو بھول ہی گئی۔ وہ بھی تو تیری پسند ہے۔"

"دشت میں بھی تو لوگ کئی کئی بیویاں رکھتے ہیں۔" میرے منہ سے نکل گیا اور میں رو میں کہتا چلا گیا۔ "باتو خان کی تو درجنوں بیویاں ہیں۔"

"تو کیا تو بھی درجنوں بیویاں رکھے گا؟" سولدہ نے ہنس کر پوچھا' پھر میرا جواب سنے بغیر بولی۔ مگر میں تو تیری بیوی نہیں!"

"ہاں تو تو میری بیوی نہیں اور اور نہ شاید کبھی میری بیوی بن سکتی ہے۔" میں نے اداس سے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ میں نہیں بن سکتی؟" سولدہ کے لہجے میں شوخی تھی۔

"تو تو سولدہ ہے اور سولدائیں بیویاں نہیں بنا کرتیں۔" میں نے جواب دیا۔

میری بات سن کر ضرور سے ہنس پڑی' پھر بولی۔ "تو کیسی بھولی بھالی باتیں کرتا ہے! جی چاہتا ہے کہ تو ایسی ہی باتیں کرتا رہے اور اور بول رہی زندگی بیت جائے۔" یہ کہتے ہوئے سولدہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس لمحے وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کی دراز پلکیں رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے سینے سے چمٹا لوں مگر میں نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ میری بیباکی پر خفا بھی ہو سکتی تھی۔

چند لمحے بعد ہی میں نے دیکھا کہ اس کے جسم نے غیر محسوس انداز میں حرکت کی' اور پھر اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو میں جیسے میرا سارا وجود ڈوبتا چلا گیا۔ اس کی نرم و نازک بانہیں میرے گلے کا ہار بن گئیں' پھر جیسے میں اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو

گیا۔

میں جس سمت کروٹ لیے ہوئے تھا' اس جانب دریچہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں دریچے کی طرف دیکھوں' اور پھر میری نگاہ جیسے خود بہ خود دریچے کی جانب اٹھ گئی۔ دریچے میں مجھے دو دہکتے ہوئے سے انگارے نظر آ رہے تھے جن پر نگاہ پڑتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کو جھٹکا لگا ہو۔ میں نے ان دہکتے ہوئے انگاروں سے نظر ہٹانا چاہی اور یہ محسوس کر کے خوفزدہ ہو گیا کہ میں اس طرف دیکھنے کے سوا کسی جانب دیکھ ہی نہیں سکتا۔ میری نگاہ جیسے ان دہکتے ہوئے انگاروں سے چپک کر رہ گئی تھی۔ میں نے چاہا کہ اپنی اس کیفیت کا اظہار سولدہ سے کروں میں نے بولنے کے لیے اب کھولنا چاہے مگر ہونٹ نہیں کھلے اور نہ ہی منہ سے سے کوئی آواز نکل سکی۔

یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میں نے سوچا اور ایک بار پھر ان دہکتے ہوئے انگاروں سے نگاہ ہٹانا چاہی۔ اس بار بھی میں ناکام رہا۔

کیا مجھے نہیں معلوم کہ سولدائیں انسانوں کا خون پی جاتی ہیں؟ میرے وجود میں جیسے کسی نے سرگوشی کی۔ یہ سولدہ بھی تیرا خون پی جائے گی اس لیے بہتر ہے کہ تو اسے ہلاک کر دے۔ یہ اس وقت تیرے قبضے میں ہے۔ ہلاک کر دے' ہلاک کر دے اسے! سرگوشی تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

عین اسی وقت میری سماعت سے سولدہ کی آواز ٹکرائی۔ "بوغا! کیا ہو گیا تجھے؟ کیا تو جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا جسم جھنجھوڑ دیا مگر میری کیفیت ختم نہ ہوئی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر وہ تیزی کے ساتھ دریچے کی طرف لپکی جہاں وہ دہکتے ہوئے انگارے نظر آ رہے تھے۔

معاً دونوں دہکتے ہوئے انگارے دریچے سے غائب ہو گئے اور ان کے غائب ہوتے ہی جیسے میری قوت گویائی لوٹ آئی۔

"سولدا

انگارے

ہٹالی۔ مہ

آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ میں اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔

اس دوران میں سولدہ' دریچہ بند کر چکی تھی۔ وہ پلٹی اور میری طرف آئی' پھر بولی۔ "یہ وہی سادھو تھا۔"

"مگر..... مگر وہ ایک دم کہاں غائب ہو گیا؟" میں اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

سولدہ نے ایک طویل سانس لیا اور کہا۔ "تو جانتا ہے کہ وہ شیطانی قوتوں کا مالک ہے' اسے غائب ہونے میں زیادہ دیر کیسے ہو سکتی تھی! یوں بھی آج شاید وہ محل ہی میں رہے۔ ہاں یہ بتا کہ تجھے کیا ہو گیا تھا؟ تیری آنکھیں ایک دم کھلی کی کھلی کیوں رہ گئی تھیں اور جسم بے حس و حرکت کیوں ہو گیا تھا؟"

میں نے سولدہ کی بات کے جواب میں اسے سب کچھ واضح طور پر بتا دیا' یہ بھی کہ میں نے کیا محسوس کیا تھا اور یہ بھی کہ میں نے کیا سرگوشی سنی تھی!

میں نے سولدہ کے چہرے پر کسی قدر فکر مندی کے آثار دیکھے' پھر وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔ "شاید وہ جان چکا ہے کہ مجھ پر اس کا کوئی وار کارگر نہیں ہو گا اسی لیے وہ دوسرا حربہ آزما رہا ہے۔"

"لیکن لیکن میں بھلا ایسا کس طرح کر سکتا تھا! میں تجھے اس کے کہنے پر ہلاک تو نہیں کر سکتا۔" میں نے سولدہ سے کہا۔

"یہ تیرے بس کی بات نہیں بوغا کہ تو اس کا حکم ٹال سکے۔" سولدہ بولی۔

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ تو اس کے زیر اثر آ جاتا ہے اور تجھے اپنے عمل پر اختیار نہیں رہتا۔ یہ معاملہ صرف تیرے ساتھ ہی نہیں ہر شخص کے ساتھ ہو سکتا ہے۔" سولدہ نے بتایا۔

"کیا اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے لیے ایک طویل ریاضت و تربیت کی
ورت ہوتی ہے۔" سولدہ نے جواب دیا۔ "فی الحال
واقعے کو ذہن سے نکال دے اور سونے کی کوشش
!" یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ چند لمحے
ف کے بعد اس نے پھر کہا۔ "کل ہفتے کی رات ہے
اید کل رات میں اس سے نمٹ سکوں۔"
میں نے سولدہ کے مشورے پر سونے کی کوشش
روع کر دی لیکن نیند تو جیسے آنکھوں سے روٹھ گئی
ی۔ میں کافی دیر کروٹیں بدلتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ
پنے ذہن سے پریشان کن خیالوں کو جھٹک دوں اور پھر
اید میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ میری آنکھ نہ
انے کب لگ گئی! دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں نے
کمرے میں سولدہ کے علاوہ شاردا کو بھی پایا۔ وہ دونوں
اپس میں کچھ گفتگو کر رہی تھیں۔ شاید میں بہت گہری
یند سویا تھا اسی لیے دروازہ کھلنے اور شاردا کے اندر
انے سے بے خبر رہا تھا۔
میں نے ایک انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سولدہ
ور شاردا نے بیک وقت میری جانب دیکھا۔ سولدہ کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ معنی خیز نگاہوں سے
مجھے دیکھ رہی تھی۔
"تو مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہے؟" میں نے
سولدہ کو مخاطب کیا۔
"کوئی خاص بات نہیں۔ میں تو بس یہ سن کر خوش
ہو رہی ہوں کہ تیری شادی کا بندوبست ہو گیا ہے۔ تو
بہت شادی شادی کی رٹ لگائے رہتا ہے۔" سولدہ نے
مسکرا کر جواب دیا۔
"مگر کس سے؟"
"اسی سے جس کے ساتھ تو نے قید خانے کی
کوٹھری میں ایک رات گزاری تھی۔" سولدہ نے یہ
کہہ کر شاردا کی طرف دیکھا اور بولی۔ "اس نے مجھے
سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بیچاری تیرے عشق میں گرفتار
ہو گئی ہے۔ بول کیا ارادہ ہے؟"
شاردا ایسی عورت نہیں تھی کہ جس کی آرزو نہ کی
جائے۔ وہ بلا مبالغہ بے حد حسین تھی لیکن اس کے
اور میرے درمیان ایک دیوار حائل تھی، لاعلمی کی
دیوار، زبان کی اجنبیت کی دیوار! یہ دیوار کیسے گرائی جا
سکتی تھی! اور پھر اگر کسی عورت کو میں اپنی بیوی بنانے
کی خواہش کرتا تو وہ سولدہ ہوتی لیکن یہ میری نظر میں
ناممکن تھا۔ ایسی صورت میں کم از کم میری رائے شاردا
کی بجائے کل دیپ کے حق میں ہوتی۔
"چپ کیوں ہے؟ کچھ بولتا کیوں نہیں؟" سولدہ
نے مجھے چونکا دیا۔
"نہیں!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
"کیوں؟" وہ شوخ لہجے میں بولی۔ "کیا تمنا پوری ہو
گئی؟"
"مجھے تو تیری تمنا ہے۔" میں بیباکی سے بولا۔
"جھوٹا کہیں کا!" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی، پھر بولی
۔ "اچھا تو پھر میں اسے تیری طرف سے مایوس کیے دیتی
ہوں۔ ویسے سوچ لے، راجاؤں کی بیٹیاں کسے نصیب
ہوتی ہیں!"
"راجہ کی دوسری بیٹی بھی تو ہے!" میں نے ہمت کر
کے کہہ دیا۔
"اچھا تو یہ بات ہے۔" اس نے کہا، پھر میری طرف
آنکھیں نکال کر بولی۔ "تو ابھی تو میری تمنا کر رہا تھا؟"
"وہ اپنی جگہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"گویا ایک ساتھ کئی کی تمنا ہے؟"
"حرج بھی کیا ہے!" میں بولا۔
"یہ بھی سوچ لیا ہے کہ درمیان میں وہ سادھو بھی
ہے۔ وہ تجھے ناک چنے چبوا دے گا۔"
"اس کے لیے تو کافی ہے۔" میں نے بھی مسکرا کر
کہا۔
"اچھا تو اس سے نمٹنے کے لیے میں اور عیش
اڑانے کے لیے تو؟"
"تو اور میں الگ الگ کب ہیں!"
"بڑی باتیں بنانی آ گئی ہیں!" وہ ہنس کر بولی۔ "اچھا
اب کچھ دیر چپ رہ! میں ذرا شاردا سے آج رات کے
لیے بات کر لوں کہ اس نے کیا انتظام کیا ہے؟"
میں خاموش ہو گیا اور سولدہ ایک بار پھر شاردا سے

گفتگو کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد شاردا مجھے حسرت بھری نگاہ سے دیکھتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ غالباً" سولدہ نے اسے میری طرف سے مایوس کر دیا تھا۔ اس کے جاتے ہی خادم کھانے پینے کو لے آئے۔

کھا پی کر سولدہ مجھے اپنے ساتھ لیے کمرے سے نکلی اور محل کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں میں گزشتہ دن بھی آچکا تھا۔

کل دیپ کے کمرے میں پہنچ کر میں نے اس کی ماں اور شاردا کو بھی وہیں دیکھا۔ سولدہ اس کی مزاج پرسی کے لیے گئی تھی۔ کل دیپ اب بالکل صحت مند اور خوش نظر آرہی تھی۔

سولدہ وہاں زیادہ دیر نہ رکی اور مجھے لے کر پھر کمرے میں آگئی حالانکہ کل دیپ کے پاس سے اٹھنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہیں پتا چلا کہ سادھو رات بھر وہیں رہا تھا اور صبح ہوتے ہی محل سے چلا گیا تھا۔

وہ سارا دن ایک طرح سے سوتے جاگتے گزرا۔ گزشتہ شب کیونکہ میں اور سولدہ دونوں ہی دیر سے سوئے تھے اور آج آنے والی شب بھی جاگنا تھا اس لیے ہم نے آرام کو ترجیح دی۔

شام ہوئی' اور پھر رات کے سائے پھیلنے لگے۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے پیالوں سے محل روشن ہو گیا۔ سولدہ دن ہی میں مجھے ان معلومات سے آگاہ کر چکی جو اسے شاردا سے حاصل ہوئی تھیں۔

شاردا نے بتایا تھا کہ کل دیپ کی خواب گاہ میں داخل ہونے کا ایک چور دروازہ بھی ہے جس کا راستہ برابر والے کمرے سے ہے۔ اس کمرے میں کل دیپ کا بھائی جگدیو رہتا تھا۔ اس سے بھی شاردا نے اپنے طور پر بات کرنا تھی۔ شاردا نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا صرف اتنا ہی کہا تھا کہ ایک رات کے لیے اس کا کمرہ چاہیے اور وہ کسی دوسرے کمرے میں سو جائے جگدیو نے شاردا سے اس کی وجہ جاننا چاہی تھی لیکن سولدہ کی ہدایت پر اس نے جگدیو کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ سارے معاملے سے صرف چار افراد واقف تھے۔ ایک خود کل دیپ' دوسری شاردا اور ان دونوں کے علاوہ سولدہ اور مجھے علم تھا۔ راجہ بلدیو کو پہلے سے کچھ بتانا سولدہ نے ا حاصل سمجھا تھا۔

جو طے ہوا تھا' اس کے مطابق شاردا وقت پر آگئ اور ہمیں اپنے ساتھ لے گئی۔ ہم کل دیپ کی خوابگا کے برابر والے کمرے میں پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد سولد اس کمرے سے نکل کر چلی گئی۔ جاتے ہوئے اس نے بتایا تھا کہ وہ باہر رہ کر سادھو کو سانپ کی صورت میں وہاں آتے ہوئے دیکھنے کے بعد ہی کمرے میں لوٹ کر آئے گی تاکہ پھر کچھ دیر کے بعد خفیہ دروازے کے ذریعے کل دیپ کی خوابگاہ میں داخل ہوا جائے۔

کمرے میں اب میں اور شاردا ہی رہ گئے۔ سولد کے جاتے ہی شاردا میرے کچھ اور قریب آگئی۔ ہم دونوں ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے جس پر قالین بچھا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے لگ کر بیٹھ گئی تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک پیاس سی کروٹیں لیتی محسوس ہوئی۔ وہ مجھے بڑی وارفتگی کے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے بعد اس نے اپنا سر میرے شانے سے سرکا کر آنکھیں بند کر لیں اور تیز تیز سانس لینے لگی۔ اس کا لمس اور سینے کا زیروبم میرے جسم میں ویسی ہی آگ لگا رہا تھا جیسی آگ ایک شب قید خانے کی کوٹھی میں بھڑکی تھی۔

نہ جانے کتنی دیر میری رگوں میں لہو سنسناتا رہا اور پھر میں بے قابو سا ہونے لگا۔ میرا جی چاہا کہ ایکبار پھر اس کے وجود میں خود کو گم کر دوں' اور عین اس وقت سولدہ تیزی کے ساتھ کمرے کے کھلے دروازے سے اندر آگئی۔ میں اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ غالباً" شاردا نے بھی سولدہ کے قدموں کی چاپ سن لی تھی اور ہڑبڑا کر آنکھیں کھولتے ہی اپنا سر میرے شانے سے ہٹا لیا تھا' پھر کھسک کر بیٹھ گئی تھی۔

"وہ وہ آگیا ہے۔" سولدہ نے چڑھے ہوئے سانسوں کے درمیان سرگوشی کی۔

میرے اعصاب تن گئے۔ شاردا کے چہرے سے بھی گھبراہٹ کا اظہار ہونے لگا۔

سولدہ نے شاردا سے کچھ کہا اور جواب میں شاردا

نے ایک جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا' ہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سولدہ نے ہاتھ کے اشارے سے سے بیٹھنے کو کہا۔

میں نے اس طرف دیکھا جدھر شاردا نے اشارہ کیا ا۔ ادھر ایک پتلی سی گلی نظر آ رہی تھی۔

"کچھ دیر بعد سولدہ نے شاردا کو اٹھنے کا اشارہ کیا تو ں بولا۔ "کیا میں بھی چلوں؟"

"ہاں! مگر تم میرے پیچھے رہو گے۔" یہ کہہ کر اس نے پھر شاردا سے کچھ کہا۔ شاردا نے اپنے لباس میں ہاتھ ڈال کر ایک خنجر نکالا اور سولدہ کو تھما دیا۔ شاردا کے چہرے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ خنجر کسی ہوئی سی نیام جیسی شے میں رکھا ہوا تھا۔ اس کا صرف ستہ باہر نظر آ رہا تھا۔ سولدہ نے دستہ پکڑ کر خنجر باہر کھینچ ا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خنجر خوب صورت اور آبدار ا۔

وہ پتلی سی گلی کمرے کے ایک کونے میں تھی مگر اتنی ل نہیں تھی کہ ایک فرد بھی اس میں داخل نہ ہو سکے آگے سولدہ تھی' اس کے پیچھے شاردا پھر میں!

شاردا نے شاید رکنے کے لیے کہا اور دائیں جانب وار کے ایک حصے کو دبایا۔ ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی ر سامنے اس گلی کے اختتام پر جو دیوار راہ میں حائل ی ہٹ گئی۔

دیوار کے ہٹتے ہی کل دیپ کی خوابگاہ نظر آنے لگی۔ سامنے ہی ایک بستر پر وہ بے لباس پڑی ہوئی نظر آ رہی ی اور اس کے گورے بدن سے ایک سیاہ سانپ لپٹا وا تھا۔ اس کا کمرہ بھی روشن تھا اور اس روشنی میں ھے اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے صاف دکھائی دے ہے تھے۔ میں وہ عجیب اور حیرت ناک منظر دیکھ کر ے پتھر کا ہو گیا۔ میری نگاہ کے سامنے جو منظر تھا اس نے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ میں نے دیکھا کہ معاً سانپ نے اپنا پھن اٹھا لیا اور شاید ل دیپ کے جسم کو ڈسا' پھر جس طرح رسی کے بل کھلتے چلے جاتے ہیں' بالکل اسی طرح وہ سیدھا ہوتا چلا گیا۔ وہ سانپ بہت تیزی کے ساتھ کل دیپ کے جسم کو اپنی گرفت سے آزاد کر چکا تھا۔ اسی وقت سولدہ بجلی کی طرح کوند کر خنجر لہراتی ہوئی سانپ کی طرف لپکی لیکن وہ سانپ سولدہ کے پہنچنے سے پہلے پراسرار طور پر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا! میں نے اسے بس ایک لمحے کو کنڈلی مار کر سمٹتے ہوئے دیکھا تھا' پھر دوسرے ہی لمحے وہ غائب ہو گیا تھا۔

سانپ کے غائب ہوتے ہی شاردا اپنی بہن کی طرف دوڑی تھی مگر نہ جانے کیوں میرے قدم آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ میں نے اس سے پہلے یوں کسی عورت کے جسم کو بے لباس نہیں دیکھا تھا مجھے عجیب سی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

سولدہ نے شاردا سے پہلے آگے بڑھ کر کل دیپ کے جسم پر وہاں موجود پائنتی رکھی ہوئی چادر ڈال دی تھی۔ کل دیپ اب سسک سسک کر رونے لگی تھی۔

"یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہماری طرف سے چوکنا تھا۔ اسے شاید ہماری طرف سے حملے کا خطرہ رہا ہو گا۔" سولدہ بجھے بجھے سے لہجے میں بولی' پھر معاً اس کا لہجہ بدل گیا۔ اب اس کی آواز میں غصہ تھا۔ اس بار بچ گیا تو کیا مگر میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ وہ ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی پر ظلم کر رہا ہے۔ جس کی سزا اسے ضرور ملنی چاہیے!"

میں نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ میں اور سولدہ جب تک بیدار رہے سادھو ہی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ مجھے حیرت تھی کہ سولدہ بھی اس سادھو کے سامنے بے بس سی ہو کر رہ گئی تھی۔

سونے سے پہلے سولدہ نے کمرے کا دریچہ بند کر دیا تھا۔ جب تک مجھے نیند نہ آ گئی میری آنکھوں میں وہی روح فرسا منظر گھومتا رہا۔

پتا نہیں کہ میری آنکھیں کیوں اور کیسے کھلی تھیں! آنکھ کھولتے ہی میں نے سولدہ کے بستر کی طرف دیکھا تھا اور میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ سولدہ کا بستر خالی تھا اور اس کے بستر پر بچھی ہوئی چادر بھی آدھی زمین پر

پڑی ہوئی تھی۔ میں نے گھبرا کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا اور چکرا کر رہ گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دریچے کی طرف نگاہ اٹھائی' وہ بھی بند تھا۔ سولدہ آخر بند کمرے میں سے کہاں اور کیسے غائب ہو گئی؟ میرے ذہن میں بار بار یہی ایک سوال گردش کیے جا رہا تھا۔

پھر میرے ذہن میں ایک بھیانک خیال آیا۔ کیا سولدہ مجھے وہاں تنہا چھوڑ کر حسب معمول غائب ہو گئی؟ کیا وہ کسی اور عہد یا کسی اور زمانے میں چلی گئی؟

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا! وہ مجھے یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

"اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں بستر سے اٹھ کر تیر کی طرح دروازے تک پہنچا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی میں چونک پڑا۔ میری پہلی نظر اسی منحوس سادھو پر پڑی تھی۔ سادھو کے پیچھے راجہ مالدیو کا بیٹا جگدیو کھڑا ہوا تھا۔ میں نے سادھو سے نظر بچا کر اس کی طرف دیکھا تو خلاف توقع مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت و حقارت نظر آئی۔"

اس نے کچھ کہتے ہوئے مجھے نفرت بھری آواز میں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ سادھو نے پلٹ کر اس سے کچھ کہا' پھر میری طرف دیکھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ سادھو سے نظر نہ ملاؤں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ سادھو کی آنکھوں میں پراسرار قوت پوشیدہ ہے میں نے لاکھ چاہا کہ اس سے نظر نہ ملنے پائے مگر ناکام رہا۔ میرے وجود میں بار بار کوئی سرگوشی سی کر رہا تھا۔ نظر اٹھاؤ' نظر اٹھاؤ!

سادھو نے نگاہ ملتے ہی مجھے وہی احساس ہوا جس سے میں پہلے بھی بار آشنا ہو چکا تھا۔ میرے جسم کو جھٹکا سا لگا اور پھر میری نگاہ اس کی دہکتی ہوئی آنکھوں سے چپک کر رہ گئی۔

تم اب وہی کرو گے جو تمہیں حکم دیا جائے گا۔ میرے وجود میں پھر سرگوشی ہوئی۔

"ہاں میں حکم کی تعمیل کروں گا۔" میرے ہونٹ جیسے خود بہ خود حرکت کرنے لگے۔

میرے پیچھے پیچھے آؤ! سرگوشی میں جیسے کسی نے حکم دیا حالانکہ میں سادھو کے ہونٹوں کو ایک دوسرے سے ملا ہوا دیکھ رہا تھا۔ سادھو خاموش تھا مگر مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

مجھے اس وقت خود پر بڑا تعجب ہوا جب میں سادھو کے مڑ کر آگے بڑھتے ہوئے سر جھکائے ہوئے اس کے پیچھے چلنے لگا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے! میں نے سوچا مگر اپنے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ روک سکا۔

میرے آگے آگے سادھو اور جگدیو چل رہے تھے جو کچھ گفتگو کر رہے تھے لیکن میں ان کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ محل میں اب تک مٹی کے چھوٹے چھوٹے پیالے روشن تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی رات باقی ہے لیکن جب میں ان دونوں کے ہمراہ محل کے دروازے تک پہنچا تو دیکھا کہ ہر طرف صبح کا جھٹپٹا پھیلا ہوا تھا۔ محل کے محافظ' سادھو اور جگدیو کو آتا دیکھ کر احتراماً" ادھر ادھر ہٹ جاتے تھے۔ محل کے صدر دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی محافظوں نے دروازے کے پٹ کھول دیے تھے۔

محل کے دروازے پر سادھو نے رک کر جگدیو سے کچھ کہا تھا اور جگدیو نے جھک کر سادھو کے قدم چھو لیے تھے' پھر وہ محل کے اندرونی حصے کی جانب واپس چلا گیا تھا۔

سادھو نے محل کے دروازے سے باہر قدم رکھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے پیچھے آگے بڑھا جیسے کوئی نادیدہ پراسرار قوت مجھے آگے کی طرف دھکا دے رہی تھی۔

محل کی حدود سے باہر نکلتے ہی اچانک سادھو نے مڑ کر میرا دایاں ہاتھ تھام لیا اور اسی وقت میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ سادھو کا جسم فضا میں بلند ہوتا جا رہا تھا اور میں بھی اس کے ہمراہ زمین سے بلند ہو گیا تھا۔ میرے سارے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی اور کوشش کے باوجود میں اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکا

مجھے بہت زور کا چکر آیا اور پھر میرا دل جیسے ڈوبتا چلا گیا۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور تاریکیوں میں کھو گیا۔

تاریکیاں چھٹیں تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ مجھے اپنا جسم بڑا ہلکا پھلکا سا محسوس ہوا۔ میرے اطراف دھواں ہی دھواں تھا مگر وہ دھواں عجیب تھا نہ اس کی موجودگی میں مجھے کھانسی اٹھ رہی تھی اور نہ دم گھٹنے کا احساس ہو رہا تھا بلکہ اس دھویں سے ایک مانوس سی خوشبو آ رہی تھی۔ اس دھویں کے درمیان جب میری نظر ایک نیم برہنہ عورت کے چہرے پر پڑی تو میں چونک پڑا۔ وہ یقیناً "کلدیپ" تھی جس کا جسم اس دھوئیں میں کسی روشن مشعل کی طرف چمک رہا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کا جسم دھوئیں پر دراز ہو۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی سحر انگیز مسکراہٹ تھی اور وہ میری ہی جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کا لودیتا ہوا نیم برہنہ جسم مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ میں ایک عالم بے خودی میں اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر اسے اپنی آغوش میں لے لینا چاہا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے روشن جسم سے اس طرح گزر گئے جیسے دھوئیں سے یا ہوا کے درمیان سے گزر گئے ہوں۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی جیسے میری بے بسی کا مذاق اڑا رہی ہو۔ میرا جسم خوف و دہشت سے کانپنے لگا اور میں ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ پیچھے ہٹتے ہی مجھے اپنی پشت کی جانب سے اس کی ہنسی سنائی دی حالانکہ وہ میرے سامنے تھے۔ میں نے ڈرتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ کچھ فاصلے ہی پر مجھے کلدیپ کا جسم دھوئیں کے درمیان روشن نظر آیا۔ میں نے گھبرا کر سامنے دیکھا۔ سامنے بھی اس کا جسم تھا۔ ایک ہی عورت کے دو جسم کس طرح ہو سکتے تھے؟ میں نے شدت خوف سے چیخنا چاہا مگر میری آواز حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی اور میں تیورا کر زمین پر گر گیا۔

جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ اب وہاں کلدیپ نہیں تھی اور میرے اطراف دھواں بھی نہیں تھا۔ میں ایک بڑی سی کٹیا کے کچے فرش پر پڑا ہوا تھا۔

میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا' اور پھر میری نگاہ بائیں جانب موجود دھوئیں کی اس دیوار سے ٹکرائی جو کٹیا کے درمیان کسی چادر کی طرح تنی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا کہ میں وہاں کس طرح آ گیا؟۔ آہستہ آہستہ مجھے سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ میں راجہ مالدیو کے محل میں تھا اور وہیں محل کے ایک کمرے میں سولدہ بھی میرے ساتھ تھی۔ میں جب بیدار ہوا تھا تو اس بند کمرے سے سولدہ غائب تھی۔ اس کے بعد میں نے دروازے پر دستک کی آواز سنی تھی' پھر دروازہ کھول دیا

دنیا بھر کی خوفناک، دہشتناک، ہیبت ناک، پُراسرار
کہانیاں
خوفناک کہانیاں
پُراسرار کہانیاں
ہیبت ناک کہانیاں
سنسنی خیز کہانیاں
آسیبی کہانیاں
ڈراؤنی کہانیاں
جرائم کہانیاں
حیرت ناک کہانیاں
مافوق الفطرت کہانیاں
دہشت ناک کہانیاں
تاریخی کہانیاں
دیو ملائی کہانیاں
آدم خوروں کی کہانیاں
خون آشام لڑکیاں
بھوت کہانیاں
وحشت ناک کہانیاں
جاسوسی کہانیاں
انعام یافتہ کہانیاں
روبی پبلیکیشنز
راجپوت مارکیٹ
اردو بازار لاہور ۲

تھا۔ اس کے بعد میری نظر سادھو پر پڑی تھی' پھر جو کچھ ہوا تھا' وہ مجھے کسی بھیانک خواب کی طرح یاد تھا۔ اپنے دل میں سادھو کا خوف ہونے کے باوجود میں نے اس سے نفرت محسوس کی' مجھے یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ میرا ذہن اب سادھو کے سحر سے آزاد ہو چکا تھا۔

میں نے اس کٹیا سے فرار ہونے کے لیے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی میں کٹیا کے جس حصے میں تھا وہاں کوئی کھڑکی یا دروازہ وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے دھوئیں کی دیوار کو دیکھا تو مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ میں اس کی دوسری جانب بھی دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے دوسری جانب کھڑکی بھی نظر آئی اور دروازہ بھی! یہ الگ بات کہ دونوں ہی اندر سے بند تھے۔ میں معاً اچھل پڑا۔ مگر میرے اچھلنے کا سبب بند دروازہ یا بند کھڑکی نہیں کچھ اور تھا۔ میری نگاہ سادھو کے دھندلے سے ہیولے پر پڑی تھی۔ وہ الٹی پالتی مارے ایک مخصوص انداز میں کٹیا کے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں' جیسے بیٹھے بیٹھے گہری نیند میں چلا گیا ہو مگر اس کے متحرک ہونٹوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بیدار ہے۔ اس کے ہونٹ بہت آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ ممکن ہے کہ اس کے منہ سے کوئی آواز نکل رہی ہو مگر مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید اس کا سبب میرے اور اس کے درمیان موجود فاصلہ رہا ہو۔

میں کچھ دیر حیرت سے سادھو کو دیکھتا رہا پھر میں نے سوچا کہ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر دبے پاؤں دروازے تک پہنچ جاؤں اور دروازہ کھول کر بھاگ نکلوں۔ درمیان میں دھوئیں کی دیوار ہونے کے سبب دوسری طرف کا حصہ ذرا دھندلا نظر آ رہا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ مجھے اندازہ نہ ہو پاتا' سادھو کہاں بیٹھا ہے! مجھے اس سے بچ کر نکلنا تھا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ وہ سادھو مجھے کہاں لے آیا ہے' اور یہ کہ وہاں سے فرار ہو کر میں کہاں جاؤں گا۔ اس وقت تو میرے ذہن پر صرف یہ دھن سوار تھی کہ کسی طرح اس سادھو کے چنگل سے نکل جاؤں' بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا۔

میں نے چند لمحے مزید غور کیا پھر آگے بڑھا' میں بڑے محتاط انداز میں چل رہا تھا تاکہ میرے قدموں کی آہٹ نہ ہو' میں پنجوں کے بل چلتا ہوا دھوئیں کی دیوار تک پہنچ گیا اور پھر میں نے جیسے ہی دھوئیں میں قدم رکھا' میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا اور میں پشت کے بل زمین پر گر پڑا جیسے کسی نادیدہ پراسرار قوت نے مجھے پیچھے دھکیل دیا ہو۔

بمشکل میں نے اپنی چیخ روکی اور زمین سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گرنے کے سبب میری دونوں کہنیوں اور کمر کی ہڈیوں پر ضربیں آئی تھیں۔ میں چوٹوں کو سہلانے لگا۔

کیا میں سادھو کی قید سے رہائی نہ پا سکوں گا؟ میرے ذہن میں ایک بھیانک خیال آیا' پھر میں نے سوچا کہ آخر وہ مجھے کیوں قید کیے ہوئے ہے؟ ابھی میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ پایا تھا کہ اچانک میری سماعت سے انتہائی خوفناک آوازیں ٹکرائیں جیسے کئی خوفناک درندے آپس میں لڑ پڑے ہوں اور ایک دوسرے کو چیر پھاڑ ڈالنا چاہتے ہوں۔ میں اچھل پڑا اور پھر میرا جسم خوف سے کانپنے لگا۔ وہ سولداؤں ہی کی بھیانک آوازیں ہو سکتی تھیں کیونکہ اس کٹیا میں میرے اور سادھو کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ میں نے سنا تھا کہ سولدائیں (روحیں) آواز بدل بدل کر بولنے پر بھی قادر ہوتی ہیں۔

میں نے خوف کے باوجود' دھوئیں کی دیوار کے پار دیکھا۔ سادھو اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا ہوا منہ ہی منہ میں بدبدا رہا تھا' درندوں کی بھیانک آوازیں مزید تیز ہو گئی تھیں جیسے وہ میرے بہت قریب ہی موجود ہوں۔

کٹیا میں موجود کھڑکی دھوئیں کی دیوار سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس وقت میری نگاہ اسی سمت اٹھی ہوئی تھی۔ معاً میں نے کھڑکی میں آگ لگتی ہوئی دیکھی' اور پھر جلتی ہوئی کھڑکی میں آ پڑی۔ میں نے کھڑکی کے باہر جسے کھڑا ہوا دیکھا' اسے دیکھ کر میرا سارا خوف ہوا

ہو گیا۔

"سولدہ!" میں بے اختیار چیخ پڑا۔

"بوغا! میں آ رہی ہوں۔" یہ کہتے ہی سولدہ کا جسم کسی تیر کی طرح اچھلا اور کھڑکی سے گزرتا ہوا کٹیا میں آ گیا۔ اسی وقت میں نے اس کے ہاتھ میں وہ پراسرار ہتھیار دیکھا جس کا جادو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

سولدہ اب سادھو سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی اسے گھور رہی تھی مگر سادھو کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کچھ پڑھے جا رہا تھا۔ درندوں کی بھیانک آوازیں کھڑکی ٹوٹتے ہی ختم ہو گئی تھیں۔

معاً شاید سولدہ کو میرا خیال آ گیا اور اس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی، پھر اس کی نظر دھوئیں کی دیوار پر پڑی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں لمحے بھر کو حیرت سی نظر آئی۔ اس نے غالباً دھوئیں کی دیوار کے پار مجھے دیکھ لیا تھا۔

جیسے ہی اس نے دھوئیں کی جانب قدم بڑھایا میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "سولدہ ادھر نہ آ، یہ جادو کی دیوار ہے تو اس سے ٹکرا کر گر پڑے گی۔"

سولدہ کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، پھر اس نے مڑ کر سادھو کی جانب دیکھتے ہوئے کچھ کہا لیکن سادھو نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں میں نے یہ ضرور دیکھا کہ اس کے ہونٹوں کی حرکت پہلے کی نسبت کافی تیز ہو گئی تھی۔

سولدہ نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا اور اپنی جادوئی ہتھیار اس کی طرف اٹھایا۔ کٹیا میں اچانک سانپوں کی سی تیز پھنکاریں بلند ہوئیں۔ سولدہ نے چونک کر چاروں طرف دیکھا مگر وہاں کوئی سانپ نہیں تھا۔ یہ پھنکاریں چند ہی لمحوں میں اتنی تیز ہو گئیں کہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔

سولدہ کے جادوئی ہتھیار سے روشنی کی ایک دھار سی نکلی اور سادھو کے جسم سے ٹکرائی۔ سادھو کا جسم اس طرح پگھل کر فرش پر بہنے لگا جیسے وہ موم کا بنا ہوا تھا۔ گوشت جلنے کی تیز بو میری ناک سے ٹکرائی اور میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ میرے اور سولدہ کے درمیان جو دھوئیں کی دیوار حائل تھی، وہ پراسرار طور پر غائب ہو چکی تھی۔ اسی کے ساتھ سانپوں کی پھنکاریں بھی بند ہو گئی تھیں۔ میں لپک کر سولدہ کے قریب پہنچ گیا اور کٹیا کے فرش پر بہتے ہوئی ملغوبے کو دیکھنے لگا۔

"آ، اب یہاں سے چلیں!" سولدہ نے میری طرف دیکھ کر کہا "یہ اپنی تمام تر پراسرار قوتوں سمیت ختم ہو چکا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

"مگر تو... تو کہاں چلی گئی تھی سولدہ؟ اور پھر اچانک یہاں کیسے آ پہنچی؟" میں نے اس سے ایک ہی سانس میں دو سوال کر ڈالے۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی، پھر بولی۔ "لمبی کہانی ہے محل تک پہنچتے پہنچتے راستے میں سناؤں گی۔" یہ کہہ کر سولدہ دروازے کی طرف بڑھی اور میں اس کے پیچھے چل دیا۔

سولدہ نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھولی اور باہر چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے کٹیا سے نکلا، باہر ایک باغ تھا جس کے گھنے پیڑوں میں سادھو کی کٹیا چھپی ہوئی تھی۔

باغ سے نکل کر میں نے دیکھا کہ وہاں سے قصبے کی آبادی زیادہ دور نہیں تھی۔ سولدہ مجھے ساتھ لیے آبادی کی جانب بڑھی۔ راستے میں اس نے مجھے ان باتوں سے آگاہ کیا جن سے میں بے خبر تھا اور جاننے کے لیے مضطرب تھا۔

سولدہ نے بتایا کہ سادھو اس دن سے جاپ کرنے کے لیے بیٹھنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے وہ سولدہ کا اور میرا کوئی بندوبست کر دینا چاہتا تھا۔ یہ مقصد حاصل کرنے کی غرض سے سادھو نے راجہ کے بیٹے جگدیو کو اپنا آلہ کار بنایا۔ سادھو نے جگدیو کو یقین دلا دیا تھا کہ سولدہ اس کا کچھ نہ بگاڑ پائے گی اور یہ کہ سولدہ دیوی نہیں ہے۔ سادھو کی یقین دہانی پر جگدیو کے دل کا چور سامنے آ گیا۔ وہ سولدہ سے اپنی ہوس کی آگ بجھانا چاہتا تھا اور مجھے اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے جگدیو کی آنکھوں میں اس وقت اپنے لیے حقارت

محسوس کی تھی جب وہ سادھو کے ہمراہ مجھ تک آیا تھا' ۔ جگدیو' سادھو کے اشاروں پر ناچنے کے لیے تیار ہو گیا۔ سادھو نے اسے پٹی پڑھائی کہ وہ اسی رات اپنے آدمیوں سے سولدہ کو اغوا کرالے۔ جس کمرے میں میرا اور سولدہ کا قیام تھا اس کمرے میں ایک چور دروازہ بھی تھا۔ اسی چور دروازے کے ذریعے جگدیو کے آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور سولدہ کو اٹھا لے گئے انہوں نے سوتے ہی میں سولدہ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے تھے اور منہ پر کپڑا باندھ دیا تھا تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔

وہ سولدہ کو محل ہی میں موجود ایک تہ خانے میں لے گئے۔ سولدہ اس تہ خانے میں بندھی ہوئی پڑی رہی' پھر کافی دیر بعد جگدیو تنہا تہ خانے میں پہنچا۔ اس نے سولدہ کے جسم سے اپنی ہوس کے آگ بجھانے کے لیے اس کے پاؤں کھول دیے اور یہی اس کے حق میں غلط ثابت ہوا۔ سولدہ نے اسے لاتوں پر رکھ لیا۔ یہاں تک کہ جگدیو مار کھا کھا کر بے ہوش ہو گیا۔ اسی دوران میں اچھل کود کے باعث سولدہ کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسی کی گرفت بھی کچھ ڈھیلی ہو گئی۔ اس نے کوشش کر کے رسی کی گرفت سے اپنا ایک ہاتھ آزاد کر لیا اور پھر دوسرا ہاتھ بھی آزاد کرانا مشکل نہ ہوا۔ سولدہ حیران تھی کہ جگدیو نے اتنی ہمت کیسے کی! وہ اسی لیے جگدیو کو ہوش میں لانے کا بندوبست کرنے لگی۔ تہ خانے میں ایک مٹی کی صراحی موجود تھی جس میں پانی بھی تھا۔ سولدہ نے جگدیو کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آ گیا۔ وہ ہوش میں آ کر سولدہ کے قدموں پر گر پڑا اور اس سے کہا کہ سب کچھ سادھو کا کیا دھرا ہے اور سادھو ہی نے اسے بہکایا تھا۔ ہر چند کہ سولدہ کو جگدیو کی بات پر یقین نہیں آیا مگر اس نے جگدیو کی جان بخشی کر دی۔ جگدیو ہی نے سولدہ کو یہ بتایا تھا کہ سادھو تین دن کے لیے جاپ میں بیٹھنے والا ہے اور اس درمیان وہ جگدیو سے نہ مل سکے گا۔ میرے بارے میں بھی سولدہ کو جگدیو ہی سے علم ہوا تھا۔ سولدہ کو سادھو کی کٹیا تک بھی جگدیو ہی چھوڑ کر گیا تھا مگر اس نے سادھو کا سامنا کرنے سے معذرت کر لی تھی اور محل کی طرف لوٹ گیا تھا۔ سولدہ کو بھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تن تنہا سادھو سے نمٹنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اسے کلدیپ کی بتائی ہوئی وہ بات یاد آ گئی تھی کہ اگر کوئی ان مخصوص دنوں میں سادھو کی کٹیا کے اندر جا کر اس پر حملہ آور ہو جائے جب وہ جاپ کر رہا ہو تو وہ قطعی بے بس ہو جائے گا۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو مجھے یقین تھا کہ سولدہ میری مدد کے لیے وہاں ضرور پہنچتی۔

سولدہ مجھے گزرے ہوئے واقعات سے آگاہ کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اب ہم قصبے کی آبادی میں داخل ہو چکے تھے اور محل نظر آنے لگا تھا۔ اچانک میرے کان کھڑے ہو گئے۔

"سولدہ! تو نے کچھ سنا؟" میں نے کہا۔

"نہیں!" سولدہ نے جواب دیا' پھر بولی۔ "کیوں' کیا ہوا؟"

"کیا تو بہت سے گھوڑوں کے بھاگنے کی آواز نہیں سن رہی ہے؟" میں نے پھر حیرت سے کہا۔

"نہیں' مجھے تو کوئی ایسی آواز سنائی نہیں دے رہی۔" سولدہ کے لہجے میں بھی حیرت تھی۔

"اچھا تو پھر رک جا اور زمین سے اپنے کان لگا دے تجھے خود معلوم ہو جائے گا کہ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" میں نے تجویز پیش کی اور رک گیا۔

سولدہ میری بات سن کر ہنس پڑی' پھر کہا "ارے ہاں میں یہ تو بھول ہی گئی کہ تو دشت کا رہنے والا ہے اور تیری سماعت خصوصاً ایسے معاملات میں کافی تیز ہونی چاہیے۔" یہ کہہ کر سولدہ زمین پر بیٹھ گئی' پھر اس نے جھک کر اپنا دایاں کان زمین سے لگا دیا۔

"کچھ سنائی دیا؟" میں نے اس کے زمین سے اٹھتے ہی پوچھا۔

"ہاں مجھے کچھ دھمک سی محسوس ہوئی ہے۔" اس نے جواب دیا' پھر کہا۔ "لیکن تو اتنا فکر مند کیوں ہو رہا ہے؟ ہوں گے کچھ لوگ!"

"کچھ لوگ نہیں سولدہ' آنے والے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور وہ چاروں طرف سے قصبے

کی طرف بڑھ رہے ہیں۔" میں نے اسے وہ بات بتائی جو محسوس کی تھی۔

"کیا واقعی؟" یہ کہہ کر سولدہ فکر مند نظر آنے لگی' پھر وہ سنجیدگی سے بولی۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ راجہ مالدیو کے کسی دشمن نے اس پر حملہ کر دیا ہو اور....." سولدہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں اس کے خاموش ہونے کے سبب جان گیا۔ اب گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں واضح طور پر سنائی دینے لگی تھی جو لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔

"ہمیں جلد از جلد محل پہنچ جانا چاہیے۔" سولدہ بولی اور تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

میں بھی اس کے ساتھ دے رہا تھا۔ ابھی ہم نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ اچانک ایک شور بلند ہوا' پھر چیخ و پکار کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ قصبے پر حملہ ہو چکا تھا۔

"بھاگو!" معاً سولدہ میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگی۔ اس کا رخ محل کی طرف تھا۔

راستے میں عورتیں' مرد' بوڑھے اور بچے سب ہی بھاگتے نظر آ رہے تھے مگر ان کا رخ قصبے سے باہر کی جانب تھا' محل کی مخالف سمت۔

"یہ لوگ تو قصبے سے باہر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔" میں نے سولدہ کی توجہ لوگوں کی طرف مبذول کی۔

"انہیں بھاگنے دو! وہ بوکھلا گئے ہیں۔" سولدہ نے بھاگتے ہوئے جواب دیا۔

اسی وقت نہ جانے کدھر سے گھڑ سواروں کا ایک دستہ ہمارے سامنے آ گیا۔

"سولدہ اپنا جادوئی ہتھیار نکالو!" میں چیخ پڑا۔

"نہیں!" سولدہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں ہتھیار اس وقت نکالوں گی جب دیکھوں گی کہ وہ ہمیں جان سے مار دینا چاہتے ہیں ورنہ نہیں۔ یہ لوگ بے گناہ ہیں اور میں بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتی۔"

اس دوران میں سپاہی ہمیں اپنے نرغے میں لے چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ سولدہ نے انہیں مخاطب کر کے کچھ کہا جس کے جواب میں ایک گھڑ سوار نے قہقہہ لگایا اور کچھ بولا۔ سولدہ نے پھر کچھ کہا اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "یہ لوگ ہمیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں میرا خیال ہے کہ فی الحال گرفتار ہونا ٹھیک ہے بعد میں ان کی قید سے نکلنا مشکل نہ ہوگا۔ اگر ہم نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش نہ کر دیا تو ممکن ہے یہ لوگ تشدد پر اتر آئیں میں چاہوں تو انہیں ہلاک کر کے یہاں سے فرار ہو سکتی ہوں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ دوسرے سپاہی ہمیں نہیں روکیں گے۔ کیا میں تیری اور اپنی جان بچانے اور فرار ہونے کے لیے لاتعداد افراد کو قتل کرتی چلی جاؤں جبکہ یہی مقصد دوسری طرح بھی حاصل ہو سکتا ہے؟"

"جیسی تیری مرضی!" میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ مجھے سولدہ کی موجودگی میں کیا فکر ہو سکتی تھی لیکن میری سمجھ میں اس کی یہ منطق نہیں آئی تھی کہ وہ دشمنوں کو بے گناہ کہہ رہی تھی۔ بھلا جو حملہ آور ہوتا ہے' وہ بے گناہ کب ہوتا ہے۔

دو سپاہی اپنے گھوڑوں سے اترے' پھر انہوں نے میرے اور سولدہ کے ہاتھ باندھ دیے اور اپنے دستے سے کٹ کر ہمیں ایک جانب لے چلے۔ اپنے گھوڑے انہوں نے وہیں چھوڑ دیے تھے جنہیں ان کے دوسرے ساتھی گھڑ سواروں نے سنبھال لیا تھا۔

ہم قصبے کی آبادی میں جنوب کی سمت سے داخل ہوئے تھے۔ سپاہی ہمیں مشرقی سمت لے گئے۔ آبادی سے نکلتے ہی میں نے ایک چھوٹا سا پڑاؤ دیکھا۔ اس پڑاؤ کے درمیان ایک بڑا سا یورت نصب تھا اور ارد گرد مسلح سپاہی تھے۔ راستے میں ان دونوں سپاہیوں نے ایک بوڑھے اور ایک عورت کو بھی پکڑ لیا تھا۔ وہ انہیں بھی ہمارے ساتھ ہی لے آئے تھے۔

ابھی ہم اس یورت سے کافی دور تھے کہ ہمارے پیچھے آبادی کی جانب سے ایک گھڑ سوار دستہ آیا اور ہمارے قریب سے تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا یورت کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد ہی فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ میری سمجھ میں صرف ایک لفظ "امرکوٹ" آیا اور میں چونک پڑا۔ اسی وقت میں نے سولدہ کو بھی چونکتے دیکھا۔

"یہ لوگ کیا نعرے لگا رہے تھے؟" میں نے سولدہ سے سوال کیا۔

"یہ اپنے راجہ کے حق میں نعرے لگا رہے ہیں۔" سولدہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی اور میں نے محسوس کر لیا کہ وہ مجھ سے کوئی بات چھپا گئی ہے مگر میں اس کے ایک ہی جملے سے حقیقت تک پہنچ چکا تھا۔

"کیا وہ راجہ امرکوٹ کے حق میں نعرے لگا رہے ہیں سولدہ؟" میں معنی خیز لہجے میں بولا۔

"ہاں!" اس نے طویل سانس لے کر بتایا "میں تجھے جان بوجھ کر یہ بات نہیں بتا رہی تھی کہ کہیں تو گھبرا نہ جائے، بہرحال اب تو تو سمجھ ہی گیا ہے لیکن فکر مند نہ ہو میں تیرے ساتھ ہوں۔"

اس دوران میں ہم پورت کے قریب پہنچ چکے تھے۔ معاً پورت سے ایک ایسا شخص نکلا جس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں بوکھلا سا گیا اور آہستہ سے سرگوشی کی "راجہ امرکوٹ!"

"ہاں میں نے بھی اسے پہچان لیا ہے۔" سولدہ نے بھی مدھم آواز میں کہا۔

"مگر یہ جا کہاں رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ممکن ہے کہ محل میں جا رہا ہو۔" سولدہ نے جواب دیا "ان نعروں کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ حملہ آوروں نے محل پر قبضہ کر لیا ہے گھوڑ سواروں کا دستہ شاید فتح کی خبر ہی لے کر آیا ہو گا"

"پھر تو کلدیپ شارو اور راجہ مالدیو سب ہی گرفتار ہو چکے ہوں گے۔" میں نے فکرمندی سے کہا۔

"کیا کہا جا سکتا ہے، ممکن ہے تیرا خیال درست ہو۔" سولدہ بولی۔

"یہ تو..... یہ تو بہت برا ہوا۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

اسی وقت میں نے راجہ امرکوٹ کو گھوڑے پر سوار ہوتے دیکھا، اور پھر وہ سپاہیوں کے جلو میں ہماری جانب ہی بڑھا میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، دن کی روشنی میں اس کی نظر مجھ پر یا سولدہ پر پڑ سکتی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوتا، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

"سولدہ، سولدہ! وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔

"آنے دو، اور گھبراؤ مت!" سولدہ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

راجہ امرکوٹ کا گھوڑا قریب آ گیا، اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا، اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی تھی۔ اس نے اپنے گھوڑے کی باگیں اتنی زور سے کھینچیں تھیں کہ گھوڑا الف ہو گیا تھا، پھر وہ میری طرف ہاتھ اٹھا کر چیخ پڑا تھا۔

بیک وقت پورے دستے نے مجھے اور سولدہ کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ ہمارے ساتھ جو بوڑھا اور ایک عورت تھی، ان دونوں کو سپاہی ہم سے الگ کر لے گئے تھے۔ ہمیں نرغے میں لینے والے سپاہیوں کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔ وہ تلواریں اٹھائے ہماری طرف جھپٹے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ہمیں وہیں ہلاک کر دینے کا مقصد رکھتے ہوں۔ میں نے گھبرا کر سولدہ کی جانب دیکھا۔ اس کے بندھے ہوئے ہاتھ تیزی سے کمر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رسیاں کلائیوں پر بندھی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں کی انگلیاں آزاد تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ سولدہ اپنا جادوئی ہتھیار نکالنے پر مجبور ہو گئی ہے لیکن اسی لمحے راجہ کوٹ نے ہماری طرف بڑھتے ہوئے سپاہیوں سے کچھ کہا اور دوسرے ہی لمحے سپاہی رک گئے، پھر چند لمحے بعد ہی دوبارہ آگے بڑھے اب ان کے تیور ذرا بدلے ہوئے تھے، میں نے دیکھا کہ سولدہ کے ہاتھ بھی رک گئے۔ اس نے اپنا جادوئی ہتھیار نہیں نکالا تھا۔

"راجہ نے اپنے سپاہیوں سے کیا کہا ہے۔؟" سپاہیوں کے قریب پہنچنے سے قبل ہی میں نے سولدہ سے پوچھا۔

"اس نے سپاہیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ہم دونوں کو زندہ گرفتار کر کے گھوڑوں کی پشت سے باندھ دیں۔"

سولدہ نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

"مگر کیوں؟ آخر وہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟" میں نے پھر دریافت کیا۔

"شاید وہ ہمیں اتنی آسان موت نہیں مارنا چاہتا۔" سولدہ بدستور پرسکون لہجے میں بولی۔

اس کا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ ہمیں سپاہیوں نے نرغے میں لے لیا۔ ہمارے ساتھ جو دو اور مقامی قیدی تھے انہیں الگ کر دیا گیا۔

کچھ دیر بعد ہی مجھے اور سولدہ کو دو الگ الگ گھوڑوں کی پشت سے باندھا جا چکا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر سولدہ کیا چاہتی ہے! ہاں میں یہ ضرور سمجھ چکا تھا کہ وہ اس آخری لمحے تک کسی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتی جب تک اس کی یا میری زندگی کو خطرہ نہ ہو۔

ہمیں گھوڑوں کی پشت سے باندھ کر یقیناً دوسرے گھڑ سواروں نے ہمارے گھوڑوں کی لگامیں تھام لی ہوں گی کیونکہ راجہ کا قافلہ پھر ایک بار آگے بڑھنے لگا تھا اور اب ہم بھی اس کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

میں نے اپنے گھوڑے کے اردگرد مسلح گھڑ سواروں کو چلتے دیکھا جو آپس میں باتیں کرتے ہوئے چل رہے تھے جن کی گفتگو میرے لیے بے معنی ہی تھی کیونکہ میں کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ گھوڑوں کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی اس لیے غالباً" انہیں باتیں کرنے میں قباحت نہیں ہو رہی تھی۔

مجھے اندازہ تھا کہ راجہ کہاں جا رہا تھا! یقیناً اس کا رخ محل ہی کی جانب تھا۔ راستے میں مجھے بہت سے لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دی اور یہ بھی محسوس کیا کہ لوگ اب تک قصبے سے فرار ہو رہے ہیں۔ مجھے گھوڑے پر پشت کے بل باندھا گیا تھا اس لیے میں زیادہ دور تک اپنی اطراف کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ باندھنے والوں نے مجھے سختی اور بے دردی سے باندھا تھا جس سے میرا دوران خون بھی متاثر ہو رہا تھا۔ میں اپنے جسم کا کوئی حصہ، یہاں تک کہ گردن بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ بس میں دور تک کھلے نیلے جاودانی آسمان کو دیکھ سکتا تھا، وہ آسمان جو دشت تک پھیلا ہوا تھا۔

آخر کار وہ تکلیف دہ سفر ختم ہوا۔ ایک بار پھر فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ شاید ہم محل تک پہنچ چکے تھے۔ میری آنکھوں میں بار بار کلدیپ کا چہرہ گھوم رہا تھا کہ نہ جانے اس کا کیا حشر ہوا ہو!

مجھے گھوڑے کی پشت سے کھول کر مسلح سپاہیوں نے پھر نرغے میں لے لیا۔ اسی دوران میں میری نگاہ اطراف پر پڑی۔ مجھے دور تک لاشیں ہی لاشیں نظر آئیں۔ یہ محل کا صدر دروازہ تھا۔ راجہ مالدیو کے سپاہیوں نے یقیناً" محل کا قبضہ دینے سے پہلے سخت جدوجہد کی تھی۔ میں نے دیکھا کہ سولدہ کو بھی گھوڑے کی پشت سے کھول دیا گیا اور پھر ہم دونوں ہی کو ایک ساتھ سپاہیوں نے نرغے میں لے کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

مجھے اور سولدہ کو محل میں لے جا کر ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ سپاہیوں نے ہمیں وہاں قید کرنے سے پہلے یہ جائزہ لے لیا تھا کہ وہاں کوئی دریچہ نہیں تھا۔ وہ چھوٹا کمرا شاید محل میں استعمال ہونے والی اشیاء کا ذخیرہ کرنے کے لیے تھا۔ وہاں کچھ ایسا سامان نظر بھی آ رہا تھا۔ ایک طرف کچھ بوریاں تلے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک بوری پر میں اور سولدہ بیٹھ گئے۔ ہم دونوں کے ہاتھ اب تک بندھے ہوئے تھے۔

"میں یہ نہیں سمجھ سکا سولدہ کہ تو چاہتی کیا ہے؟ آخر اس طرح قید ہونے سے تیرا کیا مقصد ہے؟ جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ تو چاہے تو اس قید سے با آسانی نکل سکتی ہے۔" میں نے بوری پر بیٹھتے ہی وہ سوال کر دیا جو میرے ذہن میں کافی دیر سے گردش کر رہا تھا۔

میری بات سن کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود کر آئی، پھر وہ بولی۔

"میں دراصل راجہ کی بے بسی سے ذرا لطف لینا چاہتی ہوں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ ہمارے لیے کیا سزا تجویز کرتا ہے! ظاہر ہے کہ وہ ہمیں یقیناً" کوئی بہت عبرت ناک سزا دینا چاہے گا۔ ذرا سوچ کہ جب وہ ایسا

کرنے پہ قادر نہ ہو سکے گا تو خود کو کتنا بے بس محسوس کرے گا! ویسے اب میں اس عہد میں مزید رہنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی۔ میں تجھے کسی اور عہد میں لے چلوں گی۔"

"مگر کہاں؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"جہاں جی چاہے گا یا جہاں تو کہے!" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میں تو دشت میں واپس جانا چاہتا ہوں۔" میں جلدی سے بولا۔ "تو نے کہا بھی تھا کہ تو مجھے دشت میں واپس لے چلے گی۔"

"وہاں جا کر ابھی کیا کرے گا! وہاں کچھ نہیں رکھا۔ تو غالباً" اسی زمانے میں واپس جانے کی بات کر رہا ہے جہاں سے میں تجھے لائی تھی' کیوں؟" اس نے سوالیہ نگاہ سے مجھے دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بولا۔ "ظاہر ہے۔"

"تجھے شاید یہ نہ معلوم ہو کہ میں جس زمانے سے تجھے لائی ہوں' اس میں دو سال تک صرف اس کے لیے جدوجہد ہوتی رہی تھی کہ سرقوشنی بیگی کے بڑے بیٹے منگو کو بھورے نمدے کی مسند پر بٹھا کر خاقان بنا دیا جائے اور یہ کوششیں دو سال بعد بار آور ثابت ہوئی تھیں۔ ایسا اس وقت ہوا تھا جب سرقوشنی بیگی کے ایک پیغام کا جواب دیتے ہوئے باتو خاں نے لکھا تھا کہ سرقوشنی بیگی' منگو کو مسند پر بٹھا دے اور جو بھی اسے خاقان تسلیم نہ کرے' اس کو قتل کر دیا جائے۔ ان حالات میں یہ دو سال قطعی بیکار اور فضول سے ہیں۔ تو اس دوران کچھ نہ کر سکے گا۔" سولدہ یہ کہہ کر ایک دم خاموش ہو گئی اور کچھ سوچنے لگی۔

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا کیونکہ میں اس کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ سولدہ کے انداز سے پتا چل رہا تھا جیسے وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہو اس لیے میری خاموشی اور بھی ضروری تھی۔ مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں تھی کہ سولدہ نے آنے والے سالوں کے بارے میں یہ سب کچھ اتنی تفصیل سے کس طرح جان لیا! کیونکہ مجھے علم تھا کہ سولدہ پراسرار قوتوں کی مالک ہے۔ وہ جو چاہے معلوم کر سکتی ہے۔

میں ابھی اپنے خیالوں ہی میں کھویا ہوا تھا کہ معاً" سولدہ کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "بوغا! میرے ذہن میں ابھی ابھی ایک اور خیال آیا ہے' سن' اگر تو دشت ہی میں واپس جانے پر مصر ہے تو تیرے لیے دو سال بعد کا زمانہ' یعنی وہ زمانہ زیادہ مناسب ہے جب منگو کو خاقان بنایا جا رہا تھا۔ تو دشت میں ٹھیک اس دن پہنچے جب جشن تاجپوشی منعقد ہو۔"

"مگر... مگر... یہ کیسے ممکن ہے سولدہ؟" میں اس کی بات نہ سمجھ سکا۔

"یہ بالکل اسی طرح ممکن ہے جس طرح تو میرے ساتھ صدیوں آگے آ گیا ہے۔" سولدہ نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"تیری باتیں تو ہی جانے!" میں اس کی بات سن کر بولا' پھر معاً" مجھے کچھ خیال آیا اور بولا۔ "مگر اس طرح تو میری زندگی کے دو سال کم ہو جائیں گے!"

وہ ہنس پڑی اور بولی۔ "اگر تیری بات صحیح مان لی جائے تو اس کے حساب سے تو تجھے یہاں صدیوں آگے تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جانا چاہیے تھا۔"

اس کی بات واقعی ٹھیک تھی۔ اب میں کچھ کچھ اس کی بات سمجھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "یہ تو تو ٹھیک ہی کہتی ہے مگر پھر بھی میں پوری طرح تیری بات نہیں سمجھ سکا۔"

"تیرے لیے صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ تیری جتنی زندگی ہے تو اس سے کم نہیں جیے گا۔ اب تو راضی ہے' دو سال بعد اس عہد میں جانے پر؟"

"ہاں' پھر ٹھیک ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تو پھر کب چلے گی؟"

"عین اس وقت جب مجھے اور تجزے سزائے موت دی جا رہی ہو گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

موت کے ذکر پر مجھے کلدیپ کا خیال آ گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ جنگ میں راجہ مالدیو اپنی دونوں بیٹیوں اور بیٹے سمیت مارا گیا ہو گا۔ یہی سوچ کر میں بولا۔ "نہ جانے کلدیپ پر کیا گزری ہو گی اور راجہ مالدیو....."

"بس بس، رہنے دے!" سولدہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "مجھے صرف کلدیپ کا خیال ہے۔ تجھے راجہ مالدیو سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں اس لیے اس کا نام لے کر مجھے نہ بنا۔" میرے چہرے پر خجالت کے آثار آ گئے ہوں گے اور غالباً" انہی کو دیکھ کر سولدہ ہنس پڑی ہو گی، کیونکہ میں نے واقعی اس وقت شرمندگی محسوس کی تھی۔ مجھے واقعی کلدیپ ہی کی فکر تھی۔ چند لمحے توقف کے بعد سولدہ نے جو کچھ بتایا اسے سن کر میں چونک پڑا۔ اس نے کہا تھا۔ "راستے میں سپاہی باتیں کرتے آ رہے تھے۔ مجھے ان کی باتوں سے پتا چلا کہ راجہ مالدیو اپنی دونوں بیٹیوں اور بیٹے کے ہمراہ محل پر قبضہ ہونے سے پہلے فرار ہو گیا تھا، محل کے ایک خفیہ راستے سے!"

"یہ بہت اچھا ہوا۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ابھی میرا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ معاً" اس کمرے کے باہر بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی، پھر دروازہ کھل گیا۔ آنے والے مسلح سپاہی تھے۔ سولدہ اور ان سپاہیوں میں سے ایک کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا، پھر سولدہ مجھ سے بولی۔ "چلو یوغا!"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سپاہی ہمیں محل ہی میں موجود چھوٹے سے ایک میدان تک لے گئے جہاں پہلے ہی سے کافی افراد موجود تھے۔ اس میدان کی اطراف کچھ بلندی تک سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں جن پر سپاہی بیٹھے تھے۔ ایک جانب سیڑھیوں کے نیچے تخت بچھا ہوا تھا جس پر راجہ امرکوٹ اور شاید اس کی فوج کے خاص خاص سردار بیٹھے تھے۔ اس میدان کے بیچوں بیچ ایک گول سا آہنی پنجرہ بنا ہوا تھا جس کی سلاخیں زمین میں پیوست تھیں۔ اس پنجرے کے دو حصے تھے، ایک اندرونی اور ایک بیرونی! اندرونی اور بیرونی حصوں کو ایک آہنی دروازے کے ذریعے الگ الگ کیا گیا تھا۔ وہ آہنی دروازہ غالباً" پنجرے کے اوپر سے اٹھایا جاتا تھا۔ پنجرے کے اوپر دو قوی ہیکل سپاہی نظر آ رہے تھے۔ اس پنجرے کے اندرونی حصے میں دو ببر شیر بند تھے جو مجمعے کو دیکھ دیکھ کر دہاڑ رہے تھے میں نے ایک ہی نظر میں اطراف کا جائزہ لے لیا۔

مجھے اور سولدہ کو اس طرف لے جایا گیا جدھر راجہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں تخت کے سامنے کھڑا کر دیا گیا اور ہمارے پیچھے موجود سپاہیوں نے کچھ کہا جسے میں نہ سمجھ سکا مگر سولدہ نے شاید اس کی بات سمجھ لی اور جواب میں کچھ کہا۔

سولدہ کا جواب سن کر راجہ زور سے چیخ پڑا اور میدان میں موجود آہنی پنجرے کی طرف انگلی اٹھا کر غصے سے دہاڑا۔ سپاہی ہمیں کھینچ کر پنجرے کی طرف لے جانے لگے۔

"کیوں کیا ہوا سولدہ.....؟ تو نے کیا کہہ دیا جو وہ ایک دم بپھر گیا؟" میں نے سولدہ سے پوچھا۔

"سپاہی نے راجہ کے سامنے سر جھکانے کو کہا تھا۔ میں نے جواب میں کہا تھا کہ میں اس حقیر انسان کے سامنے سر نہیں جھکا سکتی جس کی بیوی دوسروں کی آغوش گرمائی ہو۔" سولدہ نے ہنس کر بتایا۔ "میں نے یہ بھی کہا کہ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ سنتے ہی اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہمیں شیروں کے پنجرے میں ڈال دیا جائے۔"

"مگر یہ شیر یہاں محل میں کہاں سے آ گئے؟" میں نے سوال کیا۔

"راجہ مالدیو کو شیر پالنے کا شوق تھا۔ یہ اس کے شیر ہیں۔" سولدہ نے بتایا۔

وہ سپاہی ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے جو شیروں کے پنجرے تک لے جا رہے تھے۔ ان کے لیے ہمارا اطمینان واقعی حیرت کا سبب رہا ہو گا۔

سپاہی ہمیں شیروں کے پنجرے تک لے آئے، پھر پنجرے کا آہنی دروازہ بند کر دیا۔ شیر ہمیں یا اپنی خوراک کو خود سے اس قدر قریب دیکھ کر دہاڑنے لگے اور اطراف میں سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے سپاہی ایک جوش کے عالم میں چیخنے چلانے لگے۔ اس کے لیے یقیناً" وہ منظر حیرت انگیز اور دلچسپ رہا ہو گا۔ وہ منظر تھے کہ کب شیر ہم پر جھپٹیں اور ہمارے جسموں کے

چیتھڑے اڑا دیں مگر ہمارے اور شیروں کے درمیان ابھی ایک آہنی دروازہ حائل تھا کیونکہ ہم پنجرے کے بیرونی حصے میں تھے۔

معاً میری نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ پنجرے کے اوپر چڑھے ہوئے دونوں قوی ہیکل سپاہی اب جھک کر پنجرے کے اندرونی حصے کا آہنی دروازہ اٹھا رہے تھے تاکہ شیر ہم تک پہنچ سکیں۔

"سولدہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" میں نے گھبرا کر سولدہ کو اس طرف متوجہ کیا۔

"فکر نہ کر! اپنے حواس قابو میں رکھ اور مجھ سے بالکل مل کر کھڑا ہو جا تاکہ تیرا جسم میرے جسم سے مس ہو تا رہے۔" سولدہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔

میں فوراً ہی اس سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا بایاں شانہ اور بائیں ٹانگ اس کے جسم سے مس ہو رہا تھا۔

چند لمحے بعد ہی آہنی دروازہ اوپر اٹھنے لگا۔ دونوں شیر اس کی طرف لپکے مگر ابھی وہ اتنا اوپر نہ اٹھ سکا تھا کہ وہ پنجرے کے بیرونی حصے میں داخل ہو سکتے۔ شیروں میں سے ایک پیٹ کے بل آگے پنجے پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے دونوں اگلے پنجے اندرونی حصے سے نکال لیے اور پیدا ہو جانے والے خلا میں اپنا سر گھسیڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے سولدہ کی طرف دیکھا۔ سولدہ بڑی دلچسپی سے شیر کی طرف دیکھ رہی تھی مگر موت کو خود سے اتنے قریب دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ میں نے اس سے قبل زندگی میں کبھی خود کو موت سے اتنے نزدیک نہیں دیکھا تھا۔

آہنی دروازہ کچھ تیزی کے ساتھ اٹھنے لگا۔ شاید دونوں سپاہیوں نے اس بھاری آہنی دروازے کو اوپر اٹھانے کے لیے اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔ اسی لمحے دونوں شیروں نے ایک دل ہلا دینے والی دہاڑ ماری اور دونوں ہی ایک ساتھ میری اور سولدہ کی طرف جست لگائی۔ ان کے بھیانک جبڑے کھلے ہوئے تھے اور پنجے سمٹے ہوئے تھے۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا اور میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے اچانک لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولنا چاہیں مگر شاید کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا پورا وجود تیزی سے۔۔۔ انتہائی تیزی سے گردش کر رہا ہو پھر اس کے بعد میرے حواس جواب دے گئے۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں نے اپنے جسم میں بہت تیز قسم کی سنسناہٹ محسوس کی۔ چند لمحے بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو ایک غار میں پایا۔

غار میں دھندلکا سا تھا مگر اس کے باوجود مجھے سولدہ کا مسکراتا ہوا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے سامنے ہی کھڑی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک بڑا سا آہنی جالیوں والا صندوق سا رکھا ہوا تھا جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

"سولدہ! کیا ہم بور خان قالدون کے کسی غار میں ہیں؟" میں نے خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں سولدہ کو مخاطب کیا کیونکہ وہی اس سوال کا جواب دے سکتی تھی۔

"نہیں!" اس نے جواب دیا۔ "ہم بور خان اور قراقرم کے درمیان واقعی ایک چھوٹی سی پہاڑی کے غار میں ہیں۔ یہ پہاڑی ذرا اصل راستے سے ہٹ کر ہے۔" یہ کہہ کر وہ غار میں پڑے ہوئے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی اور میں بھی اس کے قریب دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔

"تو بور خان قالدون کے غار میں کیوں نہیں پہنچی جہاں سے ہم گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ زمانہ دو سال پہلے کا تھا۔ اگر ہم دو سال قبل کے اسی زمانے میں جانا چاہتے تو وہیں پہنچتے۔ اس زمانے میں یہ مشین اسی پہاڑی پر ہے۔" سولدہ نے آہنی صندوق کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

"تیری ہر بات نرالی ہے۔" میں ہنستے ہوئے بولا، پھر کہا۔ "ویسے میں اس پہاڑی کے بارے میں سمجھ گیا کہ یہ کہاں واقع ہے! اگر یہ وہی پہاڑی ہے جس کے بارے میں مجھے معلوم ہے تو اس کی مشرقی سمت میں

کرائت قبیلہ آباد ہے۔" میری آواز خوشی کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ مجھے دشت میں دوبارہ لوٹ کر بے حد خوشی محسوس ہو رہی تھی' کیونکہ اس سے میری بہت سی تلخ اور خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔

"سن۔۔۔! ان باتوں کو چھوڑ اور میری باتوں پر توجہ کر!" سولدہ بولی۔

"تجھے اب بستی کی طرف روانہ ہونا ہے کیونکہ آج شام سے پہلے منگو کی رسم تاج پوشی ہونے والی ہے۔ تجھے اس میں شرکت کرنی ہے اور اپنے لیے مقام پیدا کرنا ہے تاکہ تو ان کی صفوں میں گھس جائے۔"

سولدہ کی بات ختم ہوئی تو میں بولا۔ "سرقوشنی بیگی تو اب اپنے بیٹے کے خاقان بنتے ہی اور بھی بااختیار ہو جائے گی اور تو جانتی ہے کہ میری گزشتہ پیش گوئیوں سے وہ کتنی متاثر ہوئی تھی! اب دوبارہ اسی کے ذریعے میں منگولوں میں ایک اہم شخصیت بن کر ابھر سکتا ہوں۔"

"نہیں!" سولدہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "تجھے اپنی حیثیت برقرار رکھنے کی خاطر فوری طور پر کوئی ایسی پیش گوئی کرنی پڑے گی جس کی صداقت فوراً ہی ظاہر ہو جائے۔"

"تو پھر تو ہی مجھے کوئی ایسی پیش گوئی بتا سکتی ہے۔" میں جلدی سے بولا۔

"ہاں تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے گزشتہ زمانوں کی تاریخ غور سے پڑھی ہے۔ مجھے تاریخ کے ایک ایک موڑ کی خبر ہے۔ تاریخ سے مجھے عشق ہے۔ تاریخ میرا مشق بھی ہے اور ضرورت بھی! تیرے عہد کی تاریخ بھی مجھے ازبر ہے اسی لیے میں نے تجھے منگو کے دور حکومت میں لوٹنے کے لیے کہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ تیری حیثیت دوبارہ منوانے کے لیے کسی پیش گوئی کی ضرورت ہوگی۔" یہ کہہ کر سولدہ نے چند لمحے کو توقف کیا' پھر بولی۔ "سن' تاریخ بتاتی ہے کہ جس دن منگو کی رسم تاج پوشی ہوئی' اوغدائی خاندان کے نویونوں (شہزادوں) نے ایک سازش تیار کی کہ جب منگو اور دیافت میں شریک تمام مہمان شراب پی کر مدہوش ہو جائیں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ تجھے اسی سازش کی پیش گوئی کرنی ہے۔"

"تو کیا واقعی کوئی ایسی سازش ہوئی ہے اور سرقوشنی بیگی اس سازش سے بے خبر ہے؟ کیا تو مجھے اس سازش کی تفصیلات سے آگاہ نہ کرے گی؟" میں نے کہا۔

"ہاں میں خود تجھے تفصیلات بتانے والی تھی۔ جو کچھ ہونے والا ہے اسے توجہ سے سن بوغا کہ یہ تیرے کام آئے گا۔" سولدہ تفصیلات بتانے لگی۔ "جب منگو اور اس کے مہمان ضیافت کر رہے ہوں گے' جب زریں شامیانے کے دروازے پر شراب اور گھوڑیوں کے دودھ سے بھرے ہوئے چھکڑے آکر خالی ہو رہے ہوں گے اور جب منگو رسم تاج پوشی کے بعد تقریر بھی کر چکا ہوگا تو دفعتاً" ضیافت پر ایک طرح کی اداسی سایہ فگن ہو جائے گی۔ ضیافت کے زریں شامیانے میں میں ایک خچر ہنکانے والا آئے گا اور نئے خاقان یعنی منگو سے بات کرنے کی اجازت چاہے گا۔ اس شخص کو منگو کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ وہ منگو کو بتائے گا کہ ایک خچر کی تلاش میں بھٹک رہا تھا تو اس نے سواروں کا ایک دستہ دیکھا۔ اس دستے کے ساتھ بھرے ہوئے چھکڑے تھے اور وہ دستہ قرولتائی کی طرف آ رہا تھا۔ دستے کے ایک سپاہی نے اس خچر ہنکانے والے کو ایک ٹوٹے ہوئے پہیے کی مرمت کے لیے بلایا تو اس نے دیکھا کہ چھکڑے میں ہتھیار بھرے ہوئے ہیں۔ اس چھکڑے کے علاوہ دوسرے چھکڑوں میں بھی ہتھیار بھرے ہوئے تھے۔ خچر ہنکانے والا بتائے گا کہ اس نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ وہ سوار اوغدائی خاندان کے نویونوں نے بھیجے ہیں تاکہ منگو اور دوسرے مہمانوں کو عالم مدہوشی میں ٹھکانے لگا دیں۔ تو سمجھ گیا کہ وہ خچر ہنکانے والا اس سازش کا انکشاف کرے گا! تجھے اس سے پہلے ہی سب کچھ سرقوشنی بیگی اور منگو کو بتا دینا ہے۔" یہ کہہ کر سولدہ خاموش ہو گئی۔

سولدہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ کسی ایسی سازش کا قبل از وقت انکشاف انتہائی اہمیت کا حامل ہو سکتا تھا جس

میں نئے خاقان کے قتل ہونے تک کا خطرہ تھا۔ میں نے سولدہ کی بتائی ہوئی تمام باتیں اپنے ذہن میں محفوظ کرلی تھیں۔

"میں تیری پوری بات اچھی طرح سمجھ گیا۔" میں نے سولدہ کو یقین دلایا۔ "یہاں سے بستی زیادہ دور نہیں ہے' میں پیدل' وہاں تک جاسکتا ہوں۔" یہ کہہ کر معاً" مجھے ایک خیال آیا اور میں بولا۔ "کیا میری واپسی تک تو اسی غار میں رہے گی؟"

"نہیں اس کی کیا ضرورت ہے!" سولدہ بولی۔ "مجھے اب ذرا تنہا بھی گھومنے پھرنے دے۔ میں اس بار یہاں آتی جاتی رہوں گی یقین کر کہ اب میں تیری طرف سے غفلت نہیں برتوں گی۔"

میں اس کی بات سن کر رنجیدہ سا ہو گیا اور اداس سے لہجے میں بولا۔ "تو مجھے پھر چھوڑ کر جا رہی ہے۔ میں میں تیرے بغیر...." میری آواز بھرا گئی اور میں اپنا فقرہ پورا نہ کرسکا۔

"میں نے کہا تو ہے کہ میں یہاں آتی رہوں گی۔" وہ تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

"لیکن میں تجھے کہاں تلاش کروں گا؟" میں نے بمشکل کہا۔

"تجھے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی' میں خود تجھ تک پہنچ جاؤں گی۔" سولدہ نے کہا۔ "اچھا اب میں چلتی ہوں ورنہ میں جتنی دیر یہاں رہی تو اس غار سے باہر نہیں نکلے گا جبکہ تجھے پیش گوئی سے فائدہ اٹھانے کے لیے فوراً" قراقرم پہنچ جانا چاہیے۔" سولدہ کے الفاظ ختم ہوتے ہی میں نے لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سنی اور پھر سولدہ غائب ہو گئی۔

اس سے پہلے کہ میں اس سے مزید کچھ کہتا' وہ رخصت ہو گئی تھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر وہ اپنے دشمنوں سے جان چھڑا کر مجھ تک نہ پہنچ سکی اور میں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تو کیا ہو گا! اب کچھ سوچنا ہی بیکار تھا وہ جا چکی تھی۔ مختصر ہی سے دن میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے مگر اس کی جدائی مجھے محسوس ہوئی۔ مجھے اس سے اتنی جلد بچھڑنے کی توقع نہیں تھی۔

میں کچھ دیر یونہی گم صم سا اس غار میں بیٹھا رہا' پھر مجھے خیال آیا کہ وقت ناحق ضائع ہو رہا ہے اور یہ وقت پھر واپس نہیں آئے گا۔ مجھے اس وقت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا اور اس غار سے نکلا۔ باہر پہنچ کر میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ وہ وہی پہاڑی تھی جس کی مشرقی سمت میں کرائت قبیلہ آباد تھا۔ میری بائیں جانب قراقرم کی بستی تھی اور دائیں جانب طاقت کا پہاڑ بور خان قالدون تھا۔ میں آہستہ آہستہ پہاڑی پر سے اترنے لگا کیونکہ ڈھلان خطرناک تھا۔ ذرا سی بھی غفلت سے پاؤں پھسل سکتا تھا اور میں موت سے ہمکنار ہو سکتا تھا۔ میں اس پہاڑی پر یوں بھی پہلے کبھی نہیں چڑھا تھا۔ وہاں چرواہے بھی نہیں تھے کیونکہ وہ پہاڑی سرسبز و شاداب نہیں تھی۔

پہاڑی سے نیچے اترتے ہوئے اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ سرقوشنی بیگی نے مجھے باتوخاں کا پیغام دے کر قراقرم بھیجا تھا' ملکہ تورا کینہ کے پاس! میں نے وہ پیغام پہنچا دیا تھا اور اس کے بعد سولدہ کے ہمراہ چلا گیا تھا۔ اب سولدہ مجھے اپنی پراسرار قوت کے ذریعے دو سال بعد کے زمانے میں لے آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں پورے دو سال غائب رہا تھا۔ کیا سرقوشنی بیگی مجھ سے ان دو سالوں کے بارے میں نہ پوچھے گی کہ میں اس دوران میں کہاں رہا؟ میں نے سوچا۔ میں اسے کیا جواب دوں گا؟ میں اسی سوال کا جواب سوچتا ہوا پہاڑی سے نیچے اتر آیا مگر اس سوال کا جواب نہ سوچ پایا۔

پہاڑی سے اتر کر میں پیدل ہی قراقرم کی طرف چل دیا کیونکہ سواری نہیں تھی لیکن بستی زیادہ دور نہیں تھی۔ اندازے کے مطابق میں تقریباً" ایک پہر گزرنے سے پہلے وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔

قراقرم کی طرف جاتے ہوئے بھی میرے ذہن میں وہی سوال گونج رہا تھا۔ آخر بستی میں پہنچنے سے قبل میں نے اس سوال کا جواب سوچ ہی لیا۔ میں سرقوشنی بیگی سے ایک شامان کے روپ میں ملا تھا۔ شامان جو

پراسرار قوتوں کے مالک ہوتے ہیں اور جو اپنا جسم زمین پر چھوڑ کر نیلے جاودانی آسمان کی یوگد (روح) سے باتیں کرنے چلے جاتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں اس دوران میں یوگدا کی سرگوشیاں سننے آسمان پر چلا گیا تھا؟ میں نے سوچا۔ شامانوں کے بارے میں ایسی ہی بہت سی کہانیاں میں نے پہلے بھی سنی تھیں کہ وہ اکثر مدتوں کے لیے غائب ہو جاتے ہیں اور اس دوران میں کوئی انہیں نہیں دیکھ پاتا۔ وہ کسی کو بھی نظر نہیں آتے۔ میں بھی دو سال تک کسی کو نظر نہیں آیا تھا اس لیے یہ بہانہ قطعی مناسب تھا۔ میرے اس دعوے کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ یہ سوچنے کے بعد میرے ذہن کا خلفشار کچھ کم ہوا لیکن شامانوں کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے شامان بغورچی کا بھی خیال آ گیا تھا۔ نہ جانے وہ دشمن جاں اب میرے ساتھ کیا چال چلے! پھر مجھے چن کائی یاد آیا جسے یہ غلط فہمی تھی کہ میں اس کا بیٹا ہوں۔ وہ دونوں ہی میرے لیے دشمن کا درجہ رکھتے تھے اور دشمنی کر بھی چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس بار موجود حالات سے نمٹ کر اور اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے بعد سب سے پہلے میں انہی دونوں سے نمٹوں گا۔ ان دونوں نے مجھے بڑے دکھ پہنچائے تھے اور مجھے چین کا سانس نہیں لینے دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ سورج اپنی بیوی کی آغوش میں جا گرتا، میں قراقرم پہنچ گیا۔ بستی کے باہر ہی میدان میں مجھے بہت سے بڑے یورت نظر آئے جو غالباً" ان نوئیونوں ہی کے تھے جو قرولتائی میں شرکت کرنے آئے تھے۔ ان سب میں دو یورت سب سے بڑے تھے اور وہ دونوں یورت سنہری تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ان میں سے ایک یورت تو وہ ہو گا جہاں قرولتائی ہو رہی ہو گی اور دوسرا یورت ضیافت کے لیے ہو گا۔

وہاں مجھے کئی آشنا چہرے نظر آئے مگر میں نے کسی سے رک کر بات نہ کی۔ کئی آشناؤں کی آنکھوں میں مجھے حیرت کے آثار بھی دکھائی دیے مگر میں تیزی سے آگے بڑھ گیا کیونکہ میں جلد سے جلد سرقوشنی بیگی تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وقت بہت قیمتی تھا کیونکہ مجھے ایک اہم پیش گوئی کرنی تھی۔

میں لوگوں سے بچتا بچاتا بہت جلد اس یورت کے سامنے پہنچ گیا جہاں مسلح سوار پہرہ دے رہے تھے اور جس یورت کے اندر خاندان زریں کے سارے زندہ نوئیون جمع تھے۔ اس یورت کے در پر نوئیاکوں کی دموں والا پرچم لہرا رہا تھا مجھے علم تھا کہ ہر شخص کو اس یورت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اسی لیے وہاں سخت پہرہ تھا۔ مجھے اس یورت کے در سے بہت پہلے ہی شاہی قشق (محافظ دستہ) کے ایک سپاہی نے روک دیا۔ مجھے اس کی توقع تھی اس لیے میں قطعی نہ گھبرایا۔

"مجھے الاؤ کی رکھوالی سے ملنا ہے۔" میں نے قشق کے سپاہی کو مخاطب کیا۔ "مجھے اپنے تومان باشی (دستے کا سردار) کے پاس لے چلو!"

"کیا تجھے نہیں معلوم کہ اس وقت اندر کیا ہو رہا ہے؟" سپاہی نے آنکھیں نکالیں۔

"ہاں میں جانتا ہوں کہ یورت میں قرولتائی ہو رہی ہے مگر مجھے عظیم بیگی سے فوراً" ملنا ہے۔" میں نے بلا جھجک سپاہی کو جواب دیا، پھر بولا۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ بعد میں تم پر لعنت نہ ہو تو میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو اور مجھے اپنے تومان باشی تک لے چلو!"

میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور اس کے گھوڑے سے چند قدم پیچھے پیچھے چلنے لگا قشق کا تومان باشی سمجھدار شخص ثابت ہوا۔ میں نے اسے اپنا نام بھی بتا دیا۔

"تم یہیں باہر رکو! میں الاؤ کی رکھوالی کو خبر کرتا ہوں کہ بطریق بوغا اس سے فوراً" ملنا چاہتا ہے۔ اور اس نے تمہیں بلوا لیا تو ٹھیک ورنہ تمہیں یہیں سے لوٹنا پڑے گا۔" تومان باشی بولا۔

"ٹھیک ہے، تم عظیم بیگی کو میرا نام بتا دو!" میں نے سر ہلایا۔

تومان باشی خیمے کے در کی طرف چلا گیا اور میں قشق کے سپاہیوں کی نگرانی میں وہیں کھڑا رہا۔ تومان باشی خلاف توقع جلد لوٹ آیا۔

"خوش ہو جاؤ کہ عظیم بیگی نے اجازت دے دی ہے کہ تم اس سے مل لو!" تومان باشی نے آتے ہی کہا۔

پھر میں تومان باشی ہی کے ہمراہ یورت کے دوسرے در سے اس حصے میں پہنچا جہاں سرقوشنی بیگی موجود تھی۔ وہ ایک حریری پردے سے لگی بیٹھی تھی اور اس پردے کی دوسری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس صرف چند خادمائیں مودب بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ اس حصے میں کوئی نہیں تھا۔ پردے کی دوسری جانب خاندان زریں کے نویونوں کے علاوہ اردو (لشکر) کے بڑے بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے جن کی تعداد سینکڑوں تھی۔

میں نے باتوخاں کے بھائی برقائی خاں کو بھی پردے کی دوسری سمت بیٹھے دیکھا۔ اسے اپنے خاندان کے پرانے مرض گٹھیا کے سبب آرام دہ گدوں پر بٹھایا گیا تھا۔ سرقوشنی بیگی کا ذہین بیٹا قبلائی، برقائی خاں کے آگے بیٹھا ہوا تھا۔ منگو غالباً مہمانوں کا استقبال کرنے کی غرض سے در کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ سرقوشنی بیگی کا تیسرا بیٹا ہلاکو خاں ایک بڑی سی چوکی کے پاس بیٹھا تھا جس پر مشروب رکھے ہوئے تھے۔ ہلاکو مزاجاً سخت گیر واقع ہوا تھا اسی لیے غالباً اسے مشروبات کی چوکی کے قریب بٹھایا گیا تھا تاکہ کوئی غیر قانونی حرکت نہ کرنے پائے۔

سرقوشنی بیگی کے سامنے پڑا ہوا پردہ اتنا باریک تھا کہ میں نے دور ہی سے ایک نظر میں پردے کی دوسری جانب کا پورا منظر دیکھ لیا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر سرقوشنی بیگی نے مجھے مڑ کر دیکھا تھا اور میں نے احتراماً اپنی کمر کی پیٹی کھول کر سر سے سمور کی ٹوپی تار لی تھی، پھر میں اس کے سامنے دوزانو ہو کر جھک گیا تھا۔

"بوغاتو؟" سرقوشنی بیگی کے لہجے میں انتہائی حیرت تھی۔ "تو آخر اب تک کہاں تھا؟" سرقوشنی بیگی نے پہلا سوال وہی کیا تھا جس کا جواب میں پہلے ہی سوچ چکا تھا۔

"اے عظیم بیگی، اے خاندان زریں کے الاؤ کی رکھوالی۔" اے چار بگھاتر بیٹوں کی ماں اور اے نئے خاقان کو دعا دینے والی! تیرا خادم بوغا، نیلے جاودانی آسمان کو یوگدا کے پاس تھا۔" میں نے پورے پورے القاب کہتے ہوئے محتاط نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

"اچھا!" اس کے لہجے میں خوشی بھی تھی اور حیرت بھی! "تو نے یوگدا کی سرگوشیاں سنی ہوں گی اور آنے والے زمانوں کا حال بھی تجھے معلوم ہوا ہو گا پر میں ابھی تجھ سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔ اس وقت پہلے مجھے اپنے آنکھوں کی پیاس بجھا لینے دے کہ یہ منظر دیکھنے کے لیے میں نے ایک عمر صبر کیا ہے۔ وہ دیکھ لوگ منگو کو بھورے نمدے کی مسند پر بٹھانے لے جا رہے ہیں۔" اس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

آخر سرقوشنی بیگی کی آرزو پوری ہو گئی۔ اس کے چاروں بگھاتر فرزند سرفراز ہوئے اور اس کے شوہر تولوئی کے خانوادے کا سردار منگو خاں خاقان بن گیا۔ منگو خاں کو بھورے نمدے کی مسند پر بٹھا دیا گیا۔ اردو کے بڑے بڑے سردار اور نویون حلقہ باندھے منگو کی اطراف کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے کمر بند اظہار عقیدت اور اطاعت کی خاطر ان کے شانوں پر پڑے ہوئے تھے۔ منگو خاں ایک خاموش طبع شخص مشہور تھا۔ وہ بہت کم مواقع پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا کرتا تھا اس لیے لوگ اس کے خیالات سے زیادہ آگاہ نہیں تھے۔ خاقان بننے کے بعد اس نے جس طرح لوگوں کو خطاب کیا وہ وہاں موجود تمام افراد ہی کے لیے یقیناً باعث حیرت رہا ہو گا۔

منگو خاں نے ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں انتہائی مختصر مگر جامع الفاظ استعمال کیے۔ اس خاموش طبع شخص نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ہر طرح کی زندہ مخلوق کو امن و چین نصیب ہو۔ میری لوغ (فرمان) یہ ہے کہ آج کے دن کوئی جاندار کسی جاندار پر ظلم نہ کرے۔ ہر شخص زندگی سے بھرپور طور پر لطف اندوز ہو اور ہر ایک کو اپنے حصے کا آرام ملے۔ آج گھریلو جانوروں پر کوئی سواری یا بار برداری نہ کرے۔ جانوروں کو کھول کر یا کسی اور طرح شکار نہ کیا جائے۔ آج چڑیا جہاں جی چاہے آزادی سے اڑتی پھریں۔"

منگوخان کی مختصر سی تقریر میں سنجیدگی کے علاوہ ایک معصومیت سی تھی جس سے غالباً لوگ متاثر نظر آرہے تھے جس کا اظہار ان کے چہروں پر موجود تاثرات سے ہو رہا تھا لیکن بوڑھے اور جہاں دیدہ مغلوں کی رائے مختلف تھی جو مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھی۔ ان کے خیال میں نئے خاقان کو ایسی نرم تقریر نہیں کرنی چاہیے تھی۔

معاً سرقوشنی بیگی میری جانب متوجہ ہوئی اور بولی۔ "بوغا! اب کچھ دیر بعد سب لوگ اس زریں یورت میں چلے جائیں گے جو بوڑھے وزیر بلواچ نے نوجوان خاقان کو تحفتاً دیا ہے۔ وہیں ضیافت ہوگی لیکن اس سے پہلے میں کم از کم تیری اچانک آمد کا مقصد جاننے کے لیے بے چین ہوں۔ کیا تو آسمان پر کوئی خاص سرگوشی سن کر آیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو فوراً بتا!"

"ہاں اے عظیم بیگی! میں اسی لیے آیا ہوں ورنہ ابھی زمین کی طرف نہ لوٹتا۔" میں نے موقع سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے جلدی سے کہا۔ "میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اترے کہ میں نے جو کچھ سرگوشیوں میں سنا وہ بہت ہولناک تھا۔ آج کے دن نئے خاقان اور دوسرے قابل احترام مہمانوں کو قتل کیے جانے کی سازش طے پا گئی ہے اور یہ سازش۔۔۔"

"کیا کیا کہہ رہا ہے بوغا؟ تو اپنے حواسوں میں تو ہے؟" سرقوشنی بیگی میری بات کاٹ کر چیخ پڑی۔ "کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں تیری زبان کو گدی سے باہر کھنچوا سکتی ہوں؟"

"ہاں اے الاؤ کی رکھوالی تو اس پر قادر ہے لیکن مجھے قرار آجائے گا میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔" میں نے بغیر جھجک کہا کیونکہ مجھے علم تھا کہ میں نے جو پیش گوئی کی ہے وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوگی۔

"تو پھر ہمیں اس سازش کی تفصیل سے جلد از جلد آگاہ کر!" اب سرقوشنی بیگی کے لہجے میں اضطراب تھا۔

"میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ کچھ چھکڑے قرولتائی کی طرف آرہے ہیں اور جن چھکڑوں میں ہتھیار بھرے ہوئے ہیں۔ ان چھکڑوں کے ساتھ ایک لڑاکا دستہ ہے۔ اس دستے کو یہ کام سونپا گیا ہے کہ جب بھورے نمدے پر بیٹھنے والا اور اس کے مہمان شراب پی کر مدہوش ہو جائیں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔" میں نے بتایا اور یہ بتاتے ہوئے میں نے اپنی بات میں مزید تاثر پیدا کرنے کی غرض سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"کیا تو یہ بھی بتا سکتا ہے کہ یہ سازش کس کی طرف سے ہے؟" سرقوشی بیگی نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"ہاں اے عظیم بیگی میں جانتا ہوں' یہ لڑاکا دستہ اوغدائی خاندان کے نوبونوں نے بھیجا ہے اور سازش میں اوغول غانمش کا بھی بڑا ہاتھ ہے بلکہ یہ سازش اوغول غانمش اور ملکہ توراکینہ کے ذہنوں ہی کی پیداوار ہے۔" میں نے جواب میں کہا اور سرقوشنی بیگی کے چہرے کو دیکھا جس پر انتہائی غیض و غضب کی تاثرات نظر آرہے تھے۔

"میں ان کے ناپاک ارادوں کو ناکام بنا دوں گی۔" سرقوشنی بیگی خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی پھر چونک کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "یہ کیسے پتا چلے گا کہ تیری پیش گوئی سچی ہے؟"

مجھے اس سوال کی توقع تھی اس لیے میں نے فوراً جواب دیا۔ "جب سارے لوگ ضیافت کے یورت میں جمع ہو جائیں گے تو میری پیش گوئی کی صداقت ثابت ہو جائے گی۔"

"کیا بکتا ہے بوغا؟" سرقوشنی بیگی سخت غصیلی آواز میں بولی۔ "کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں تیری پیش گوئی کی صداقت جاننے کے لیے اپنے بیٹے اور دوسروں کی جان خطرے میں ڈال دوں گی؟"

میں اس کی برہمی پر کچھ گھبرا سا گیا۔ اس عورت سے گفتگو کرنا ہمیشہ میرے لیے آگ سے کھیلنے کے مترادف ہوتا تھا۔ وہ لمحے بھر میں بدل جاتی تھی۔ میں جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے ایک اشارے پر میرا سر قلم کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسی لیے جلدی سے اپنی بات کی وضاحت میں کہا۔ "اے الاؤ کی

رکھوالی! میرا مطلب یہ نہیں تھا سن کہ ضیافت کے دوران ہی میں ایک خچر ہنکانے والا نئے خاقان سے ملنے آئے گا۔ میری التجا ہے کہ اس شخص کو نہ روکا جائے اور اس کی باتوں کو توجہ سے سنا جائے کیونکہ....."

"اس بات کا تعلق اس خچر ہنکانے والے سے کیا ہے؟" سرقوشنی بیگی تیوری پر بل ڈال کر بولی۔

"وہ ان ہتھیاروں سے بھرے ہوئے چھکڑوں کو دیکھ کر ہی اطلاع دینے یہاں آئے گا۔" میں نے بتایا "مجھے پتا ہے کہ عام حالات میں اس خچر ہنکانے والے کو ضیافت کے یورت میں داخل نہ ہونے دیا جاتا اسی لیے میں نے تجھ سے یہ التجا کی ہے کہ قشق کو تو پہلے سے بتادے کہ ایک ایسا شخص آنے والا ہے' اسے نہ روکا جائے۔"

"کیا وہ خچر ہنکانے والا تیرا ساتھی ہے؟" سرقوشنی بیگی نے سوال کیا۔

"نہیں اے عظیم بیگی! اسے تو میں نے دیکھا ابھی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے تو آسمانوں پر یہ سرگوشی سنی تھی کہ اگر اس شخص کو نئے خاقان سے نہ ملنے دیا گیا تو قتل کی سازش کامیاب ہو جائے گی۔ جب ضیافت کے یورت پر وہ ہتھیاروں سے بھرے چھکڑے آکر کھڑے ہوں گے تو سب یہی سمجھیں گے کہ ان میں شراب بھری ہوئی ہے یا گھوڑیوں کا دودھ بھرا ہوا ہے' ان پر اسی لیے شک نہ ہوگا کہ دوسرے چھکڑے بھی وہاں شراب اور دودھ لے کر آرہے ہوں گے۔"

"یہ سازش تو راکینہ کے شیطانی ذہن میں ہی جنم لے سکتی ہے یا یہ سازش اوغول غانمش کے ذہن میں پیدا ہوئی ہے' مجھے اب تیری باتوں پر یقین آچلا ہے۔" سرقوشنی بیگی بولی۔

اسی وقت میں نے نئے خاقان منگو کو بھورے نمدے کی مسند سے اٹھ کر پردے کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ وہ غالباً اپنی ماں سے ضیافت کے یورت میں جانے کی اجازت طلب کرنے آیا تھا اور بعد میں پتا چلا کہ حقیقت بھی یہی تھی۔ منگو نے پردہ اٹھایا اور میں نے اٹھ کر اسے تعظیم دی۔ وہ مجھے اپنی ماں کے پاس بیٹھا ہوا دیکھ کر کچھ حیران سا ہوا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش بھی کر رہا تھا کیونکہ وہ مجھے مغربی دشت میں دیکھ چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ منگو خاں کچھ کہتا' سرقوشنی بیگی بولی "اے نئے خاقان! تجھ پر نویاکوں کی دعیں اپنا سایہ کریں اور اے میرے بڑے بیٹے! تجھ پر جد عظیم کی سولدہ مہربان ہو۔ میں تجھے ایک سازش سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر سرقوشنی بیگی نے وہ سب کچھ بتا دیا جو مجھ سے سنا تھا۔

"اے مغلوں کے قدیم الاؤ کی رکھوالی اور اے میری ماں! تو نے یہ سب کیسے جانا؟" منگو نے پوچھا۔

"یہ بطریق بوغا ہے۔" سرقوشنی بیگی نے میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اسے شاید تو نے پہلے بھی دیکھا ہو!" سرقوشنی بیگی کی نگاہ بھی اب میری جانب اٹھی ہوئی تھی اور اب اس کی نگاہ میں محبت تھی۔

"ہاں میں نے اسے پہلے بھی کبھی دیکھا ہے مگر کہاں یہ مجھے یاد نہیں۔ کیا یہی اس سازش کی خبر لے کر تیرے پاس آیا ہے؟" منگو نے دریافت کیا۔ اس کے لہجے سے کسی قسم کا ہیجان ظاہر نہیں ہو رہا تھا بلکہ اس کی آواز پر سکون تھی جبکہ میں متوقع تھا کہ سازش کے بارے میں سن کر وہ فکر مند ہو جائے گا۔

"ہاں میرے بڑے بیٹے! سازش کی خبر یہی لایا ہے اور اس کی بات پر مجھے یقین ہے۔ اس نے قویق کی موت سے پہلے پیش گوئی کی تھی کہ وہ جلد مر جائے گا اور وہی ہوا۔" سرقوشنی بیگی نے بتایا۔

"تو یہ پیش گو ہے اے میری ماں! مگر ساری پیش گوئیاں سچ نہیں ہوتیں۔ تو غم نہ کر!"

"یہ پیش گو نہیں شمامان ہے۔ اس نے نیلے جاودانی آسمان کی سرگوشیاں سنی تھیں اسی لیے یہ میرے پاس خبر دینے آیا تھا۔ یہ آسمانوں پر تھا اور وہیں اس نے یہ خبر سنی تھی۔" سرقوشنی بیگی بولی۔

منگو اب کسی قدر متاثر سا نظر آنے لگا۔ چند لمحے

بعد وہ بولا۔ "مگر اس کے جسم پر شامانوں جیسا لباس نہیں۔"

"اس لیے کہ یہ عام شامانوں سے مختلف ہے اور ان کی طرح لالچی نہیں میں اسے آزما چکی ہوں۔ یہ وفادار اور قابل اعتبار ہے۔ یہ لالچی نہیں اسی لیے شاید اپنی ظاہری وضع اس نے شامانوں کی طرح نہیں بنائی۔"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے اے میری ماں! میں قشق کے توماں باشی سے کہہ دوں گا کہ اگر کوئی مجھ سے ملنا چاہے تو اسے نہ روکا جائے۔" منگو نے کہا' پھر بولا۔ "کیا اب تو ضیافت کی اجازت دے گی؟"

"ہاں' جا اے نئے خاقان ضیافت کر! تو اپنے ساتھ اپنے تینوں بھاتر بھائیوں' مہمانوں اور اروڈ کے سرداروں کو بھی لے جا! میری طرف سے اجازت جان!" سرقوشنی بیگی نے اسے اجازت دے دی۔

منگو الٹے قدموں لوٹ گیا اور پردہ اٹھا کر دوسری جانب چلا گیا۔ کچھ دیر ہی میں وہ یورت بالکل خالی ہو گیا۔ اس یورت میں سرقوشنی بیگی' اس کی خاداؤں اور میرے علاوہ کوئی نہ رہا۔

"اب ہمیں بھی وہیں چلنا چاہیے۔" سرقوشنی بیگی اٹھ کھڑی ہوئی۔

سرقوشنی بیگی ضیافت کے یورت میں بھی دوسرے در سے داخل ہوئی۔ وہاں بھی اس کے لیے ایک حصہ مخصوص تھا اور پہلے یورت کی طرح پردہ پڑا ہوا تھا۔

وہاں پہنچتے ہی سرقوشنی بیگی نے مجھے مخاطب کیا۔

"جا تو مردوں میں جا کہ تو مرد ہے۔"

میں اٹھتے ہوئے احتراماً اس کے سامنے جھکا' پھر پردہ اٹھا کر دوسری جانب چلا گیا۔ اس وقت منگو خاں کی نگاہ اسی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے پردے سے نکل کر باہر آتے دیکھا تو مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلا لیا۔ وہاں موجود تمام ہی افراد کی توجہ میری طرف ہو گئی۔ انہی میں وزیر بلواچ بھی تھا۔ وہ وزیر بلواچ جو پہلے قویوق کا وزیر تھا اور جس نے مجھے قویوق کے کہنے پر موت کے گڑھے میں بھوکا پیاسا مرنے کو ڈلوا دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجھے نئے خاقان کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ کر چونکا۔ وہ غالباً مجھے پہچان گیا تھا۔

میں منگو کی مسند کے پاس پہنچ کر جھکا اور پھر ادب سے دوزانو ہو کر ایک جانب بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں پہنچانے والے اور بہت سے لوگ تھے۔ انہی میں سے ایک باتو خاں کا بھائی برقائی خاں بھی تھا۔ مجھے اپنے لیے اس کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے مسلمان مبلغ ابو نصار یاد آ گیا۔ وہ ابو نصار جس نے برقائی کی دنیا بدل دی تھی اور اسے مسلمان بنا لیا تھا۔ اس ضیافت میں برقائی خان خاندان زریں کا واحد شخص تھا جو مسلمان تھا' خاندان زریں کا پہلا مسلمان شخص! جسے باتو خاں نے قفقاز کی چراگاہوں سے ہٹا کر شمالی چراگاہوں کا علاقہ عطا کر دیا تھا تاکہ وہ مسلمانوں سے دور رہے۔

ضیافت کے یورت میں منگو کا چھوٹا بھائی قبلائی اس کی مسند کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے منگو کو مخاطب کیا۔

"اے خاقان اے میرے بڑے! کیا یہی وہ ہے جس کے بارے میں تو نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھے اور ہلاکو خاں کو بتایا تھا۔"

"ہاں اے سچین! یہی وہی ہے۔" منگو خاں نے جواب دیا اور میں نے جان لیا کہ وہ میری پیش گوئی کے بارے میں اپنے بھائیوں کو بتا چکا ہے۔

کچھ دیر بعد جب مجھ سمیت ضیافت کے یورت میں موجود تمام افراد ابلا ہوا گوشت کھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ختا کی لونگیں ملی ہوئی شراب پی رہے تھے تو قشق کا توماں باشی ایک ادھیڑ عمر شخص کو ساتھ لیے یورت میں داخل ہوا۔ توماں باشی اسے لیے ہوئے سیدھا منگو کی طرف آیا۔

"اے خاقان! یہ خچر ہنکانے والا تجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے تیرے حکم پر اسے اندر آنے دیا اور اپنے ساتھ تیرے پاس لے آیا۔" توماں باشی نے ادب سے جھک کر کہا۔

اس دوران میں خچر ہنکانے والے نے منگو خاں کو

تعظیم دی۔ میرا دل یہ سنتے ہی خوشی سے دھڑکنے لگا تھا کہ تومان باشی نے اسے خچر ہنکانے والا بتایا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری پیش گوئی سچ ہونے والی تھی۔ منگو بھی تومان باشی کی بات سن کر چونکا تھا۔

پورے پورت پر ایک دم سناٹا سا چھا گیا تھا۔ اس بوجھل سے سکوت کو منگو کی آواز ہی نے توڑا۔ وہ پہلے ہی سب کچھ جانتا تھا پھر بھی خچر ہنکانے والے سے مخاطب ہوا۔ "بول تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

جواب میں خچر ہنکانے والے نے لفظ بہ لفظ وہی سب کچھ دہرایا جو میں نے سولدہ سے سنا تھا اور جو سرفوشی بیگی کے سامنے میں نے کہا تھا۔

منگو نے دانستہ اس قصے کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ اس کی باتوں سے ایسا ہی ظاہر ہوا جس پر مجھے کچھ تعجب سا ہوا لیکن پھر میں اس کا مقصد سمجھ گیا۔ اس طرح وہ ایک طرف تو خچر ہنکانے والے کی صداقت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا اور دوسری جانب وہاں موجود نویونوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے فن کی سازش سے قطعی نہیں بوکھلایا۔ خچر ہنکانے والا اپنی بات پر اڑا رہا۔

"اے عظیم خاقان! میں تین روز کی مسافت اسی لیے ایک دن میں طے کر کے تجھ تک پہنچا ہوں کہ تجھے پہلے سے باخبر کر دوں۔ یقین کر کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، سچ ہے۔" خچر ہنکانے والا بولا۔

منگو خاں نے جواب میں کچھ نہ کہا اور ایک جانب نگاہ اٹھائی۔ میں نے بھی ادھر دیکھا۔ منگو خاں ایک بوڑھے سردار کی طرف دیکھ رہا تھا جو قریب ہی مودب بیٹھا ہوا تھا۔

"اے منگسار! جا اور ان سواروں کو ان کے چھکڑوں سمیت یہاں لے آ!" منگو خان نے اس بوڑھے سردار کو مخاطب کیا، پھر بولا اور ہاں سن! اپنے ساتھ اسے بھی لے جا!" منگو خاں نے خچر ہنکانے والے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ان سواروں کو پہچان لے گا۔ ہاں تو اس دستے کے سواروں کو کچھ نہ بتانا۔"

منگسار حکم سن کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور خچر ہنکانے والے کو اپنے ساتھ لے کر پورت سے نکل گیا۔ وہ چلا گیا تو ضیافت پھر شروع ہو گئی۔ لوگ ایک دوسرے کے کان کھینچ رہے تھے تاکہ ان کے حلق چوڑے ہو جائیں اور وہ زیادہ گوشت نگل سکیں۔

منگسار نے لوٹنے میں کافی تیزی دکھائی تھی۔ کھانا ختم ہی ہوا تھا اور شراب کا دور چلا تھا کہ منگسار سپاہیوں کے ایک دستے کو لے کر پورت میں داخل ہوا۔

منگو خاں نے ہاتھ کے اشارے سے اس نئے آنے والے دستے کو ایک جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے چہرے سے ذرا بھی پریشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ خچر ہنکانے والا بھی انہی کے ساتھ واپس آیا تھا۔ ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ ہر چند کہ منگسار نے منگو کے حکم پر انہیں کچھ نہیں بتایا ہو گا مگر ان کے دلوں میں چور تھا اور ان کا گھبرا جانا قطعی فطری تھا۔

منگو خاں نے انہیں بڑی پرسکون آواز میں مخاطب کیا اور خچر ہنکانے والے نے ان کے بارے میں جو اطلاع دی تھی، وہ انہیں لفظ بہ لفظ بتا دی، پھر کہا۔

"ایسی باتوں پر آسانی سے اعتبار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ تم پر شک نہ رہے کیونکہ شک ایک ایسی شے ہے جو وقت گزرنے سے زائل نہیں ہوتا، بڑھتا ہی جاتا ہے اگر تم بے خطا ہو تو جس نے تم پر الزام لگایا ہے اسے سخت سزا دی جائے گی۔"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ وہ سب رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے اس لیے جرم سے انکار ممکن نہیں تھا۔ جب انہیں گرفتار کیا گیا تھا تو ان کے ہمراہ موجود چھکڑوں پر ہتھیار لدے ہوئے پائے گئے تھے۔ وہ اپنے پاس اتنے سارے ہتھیاروں کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے تھے۔ شاید یہی سوچ کر انہوں نے اقرار جرم ہی میں عافیت سمجھی۔ اس طرح نیا خاقان ان کے ساتھ رعایت برت سکتا تھا۔

اس دستے کا ایک سردار آخر بول ہی اٹھا "اے بھورے نمدے کے مسند پر بیٹھنے والے اور اے جد عظیم کے عظیم جانشین! ہمیں قویوق کی بیوہ اوغول

قانمش نے اس فعل بد پر اکسایا اور بہکایا تھا۔ اس نے ہمیں بھاری لالچ دیا تھا۔ ہم اپنے کیے پر سخت شرمندہ ہیں۔ تجھے اختیار ہے کہ ہمیں جو چاہے سزا دے کہ ہم سزا ہی کے مستحق ہیں۔" یہ کہہ کر اس ادھیڑ عمر سردار نے سر جھکا لیا جو اعتراف گناہ کا اقرار تھا۔

"یہ جھوٹا ہے۔" معاً ایک آواز بلند ہوئی اور سب ہی نے اس طرف دیکھا۔ وہ ایک نوجوان تھا اور اس کا تعلق اوغدائی کے خاندان سے تھا وہ چیخ کر بولا۔ "یہ شخص قویوق کی بیوہ پر تہمت باندھ رہا ہے۔"

"اگر واقعی یہ شخص جھوٹا ہے تو باقی دستے کے سپاہی سچ بول دیں گے۔" اس نوجوان کے جواب میں منگو خاں کی بجائے قبلائی خاں کی آواز بلند ہوئی اور پھر وہ دستے کے باقی سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "تمہارا قصور کم ہے کہ تم لالچ میں آ گئے۔ تم سے زیادہ وہ قابل سزا ہے جس نے تمہیں جرم پر اکسایا تھا۔ ممکن ہے یہ سوچ کر میرا بڑا بھائی اور میرے ہی ساتھ تم سب کا نیا خاقان تمہیں سزا نہ دے یا سزا میں سختی نہ برتے اس لیے بتاؤ کیا تمہارا سردار سچا ہے؟"

"ہاں اس نے جو کچھ کہا لفظ بہ لفظ درست ہے۔" کئی سپاہیوں کی آوازیں بیک وقت سنائی دیں، پھر دوسرے سپاہیوں نے بھی پہلوں کی تائید میں بیان دیے۔

خاندانی اوغدائی کے نوجوان نویون کا چہرہ اتر گیا اور اسی کے ساتھ خاندان اوغدائی کے دوسرے نویون بھی پریشان نظر آنے لگے۔ ان کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس متوقع سازش سے بے خبر نہیں تھے۔ وہ سر جھکائے اور منہ چھپائے بیٹھے ہوئے تھے۔

اچانک منگو خاں کی آواز بلند ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ جن افراد کو ہتھیاروں سمیت پکڑا گیا ہے، انہوں نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ انہوں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ان میں زیادہ تعداد ایسے سرداروں کی ہے جو ادھیڑ عمر اور تجربے کار ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔" یہ کہہ کر اس نے حاضرین پر نگاہ ڈالی، پھر اس کی نگاہ مجھ پر جم گئی اور وہ بولا۔ "اے الاؤ کی رکھوالی کے چیتے! تیرا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟"

یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ ایک خاقان کچھ افراد کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے کی خاطر اتنے بڑے مجمع میں مجھ سے مشورہ طلب کر رہا تھا۔ اصولاً" واقعی وہ لوگ بے قصور ہی تھے اور منگو خاں کا خیال صحیح تھا کہ انہیں آزاد کر دیا جائے مگر ان کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ منگول تھے۔ منگول جن کا خون بہتا دیکھنا اب میری آرزو بن چکی تھی۔ وہ منگول تھے اس لیے انہیں زندہ نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے چند ہی لمحے میں فیصلہ کر لیا اور بہت محتاط لہجے میں بولا۔ "اے عظیم خاقان! میں اس سلسلے میں کیا عرض کر سکتا ہوں! ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اگر خاقان میرے ساتھ باغ میں چلے تو میں اسے دکھاؤں کہ باغ کی سرسبزی و شادابی برقرار رکھنے کے لیے باغ کا رکھوالا گہری جڑوں والے پرانے تناور درختوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے اور ان کی جگہ نرم اور کمزور پودے لگا دیتا ہے۔"

منگو خاں نے چند لمحے میری تشبیہ پر غور کیا، پھر اس نے حکم دیا۔ "سازش میں ملوث ان تمام افراد کو قتل کر دیا جائے مگر اس طرح کہ آج کے دن ان کا خون نہ بہے۔ میں ان کی جگہ ان کے جوان بیٹوں کا تقرر کرتا ہوں۔"

منگو کے حکم سناتے ہی یورت میں موجود مستعد سپاہی آگے بڑھے اور ان تمام سپاہیوں کو نرغے میں یورت سے باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ایک بار پھر ختا کی شراب کے دور چلنے لگے۔

شام ہونے تک محفل نوش جاری رہی۔ میں نے شراب اپنے ظرف کے مطابق پی تاکہ میرے ہوش و حواس برقرار رہیں اور عالم مدہوشی میں کہیں میرے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جس سے میرے دل کی بات زبان پر آ جائے۔ مجھے علم تھا کہ شراب آدمی کے ظرف کا پیمانہ ہوتی ہے اور جو وہ اندر سے ہوتا ہے ظاہر کر دیتی ہے۔

ضیافت ختم ہونے سے پہلے مجھے سرقوشنی بیگی نے

پردے کے پیچھے طلب کر لیا۔ میں نے مشعل کی روشنی میں اس کی آنکھوں کو سرخ دیکھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس خوشی کے موقع پر اس نے بھی جی بھر کے شراب پی تھی۔

"آج سے تو ہمارے محل ہی میں رہے گا تاکہ ہم تجھے جب چاہیں طلب کر سکیں۔" سرقوشنی بیگی نے کہا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شراب نوشی کے باوجود اس کا لہجہ مضبوط تھا اور زبان قطعی نہیں لڑکھڑا رہی تھی حالانکہ اس کی آنکھوں میں سرخی دیکھ کر میں کچھ اور ہی سمجھا تھا۔

"عظیم بیگی کے حکم کی تعمیل ہو گی۔" میں نے سر جھکا کر ادب سے کہا۔ "بیگی کا غلام اس انعام پر بے حد شکر گزار ہے اور امید کرتا ہے کہ آئندہ بھی بیگی کی نظر اس پر سیدھی ہی رہے گی۔"

"تو نے سازشیوں کے بارے میں جو تشبیہ دی اور جس طرح تو نے نئے خاقان کو کسی فیصلے تک پہنچنے میں مدد دی، اسے دیکھ اور سن کر ہم خوش ہوئے۔" سرقوشنی بیگی نے کہا۔

میں ضیافت کے یورت سے سرقوشنی بیگی کے محل تک اس کے ساتھ ہی گیا۔ مجھے اس کے ساتھ جاتے ہوئے اگر کوئی خوف تھا تو صرف یہ کہ کہیں وہ مجھے پھر اپنا قاصد بنا کر کسی طرف نہ بھیج دے!

محل پہنچتے ہی سرقوشنی بیگی نے میری رہائش کے انتظامات کی خاطر احکام دیے۔ مجھے وہ کمرہ رہائش کے لیے دینے کا حکم دیا جو اسکے کمرے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میری خدمت پر دو خادموں کو بھی مقرر کرنے کا حکم دیا۔ وہ اس وقت تک کے لیے مجھے اپنے ساتھ اپنی خوابگاہ ہی میں لے گئی جب تک میرے لیے وہ کمرہ خالی نہ کر دیا جاتا کیونکہ پہلے اس کمرے میں محل کے محافظ اعلیٰ کی رہائش تھی۔ وہ مجھ سے کہیں اور بیٹھ کر یا محل کے کسی اور کمرے میں جا کر انتظار کو بھی کہہ سکتی تھی مگر میں اس کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ وہ غالباً مجھ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی تھی۔

جب میں اس کی خوابگاہ میں اس کے سامنے مودب بیٹھ گیا تو وہ میری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "بوغا! شاید تو جانتا ہو کہ آج کے دن تک مجھے کس طرح اذیت پہنچائی گئی ہے اور تجھے یہ بھی علم ہو گا کہ اذیت پہنچانے والے کون ہیں! میرے حق پر ایک طویل عرصے کون لوگ قابض رہے ہیں! اب میرا وقت آیا ہے کہ میں بدلے لوں مگر منگو کا دل نرم ہے۔ وہ درگزر کا عادی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو شاید مرنے کے بعد بھی میری روح کو چین نصیب نہیں ہو گا۔ تو مجھے مشورہ دے کہ میں کیا کروں؟"

نیلے جاودانی آسمان نے مجھے خود بخود ایک ایسا موقع فراہم کر دیا تھا جس سے میں بھرپور فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ یہ میرے لیے بھی انتقام لینے کا وقت تھا۔ قوبوق نے ہی میری چھوٹی ماں فاطمہ پر جادوگری کا الزام لگا کر اس کے قتل کا حکم دیا تھا۔ اسی کے حکم پر میری ماں پر اتنے کوڑے برسائے گئے تھے کہ وہ مر گئی تھی اور اسی نے خود میری موت کا حکم سنایا تھا۔ آج وہ تو زندہ نہیں تھا مگر اس کی ماں ملکہ تورا کینہ زندہ تھی، اس کی بیوہ اوغول غمائش حیات تھی اور بقیہ افراد خاندان تھے جن سے میں بھرپور انتقام لے سکتا تھا۔ میں نے موقع کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے دھڑکے دل کے ساتھ سرقوشنی بیگی کے سوال کا جواب دیا "اے الاؤ کی رکھوالی! تو اسی وقت اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کر سکتی ہے جب تو منگو سے یہ اختیار لے لے کہ تو مجرموں کو سزا دے۔ اس کے بعد جو تو چاہے گی بڑی آسانی سے اس پر عمل کر سکے گی اور تجھے منگو کی نرم دلی سے بھی خطرہ نہ رہے گا۔"

میری بات سن کر سرقوشنی بیگی کا شراب کے اثر سے سرخ چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

"اے عظیم بیگی! میرے لیے تیرا قرب ہی کافی ہے۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔" میں نے ادب سے کہا۔

"تو خود ہیرا ہے بوغا، ہیرا!" وہ خوش ہو کر بولی۔ "مجھے پہلے ہی خبر تھی کہ تو لالچی نہیں اور تجھے دوسرے

شامانوں کی طرح زر و جواہر کی طلب نہیں۔"
سرقوشنی بیگی اس وقت تک مجھ سے راز و نیاز کرتی رہی جب تک کہ اس کے خادموں نے آکر میری رہائش کے بندوبست کی اطلاع نہ دے دی۔
اس رات میں دیر تک اپنے ذہن میں انتقام کے منصوبے باندھتا رہا اور یہی منصوبے باندھتے باندھتے سو گیا۔ میں نے سونے سے پہلے چنکائی اور بغورچی شامان کے بارے میں بھی سوچا تھا۔
صبح میں گھوڑی کا دودھ پی رہا تھا کہ سرقوشنی بیگی کا ایک خادم مجھے بلانے آگیا۔ میں نے دودھ کی بالٹی منہ سے ہٹا کر فرش پر رکھ دی جو خالی ہو چکی تھی اور اس خادم کے ہمراہ چل دیا۔
سرقوشنی بیگی نے مجھے اس کمرے میں بلوایا تھا جہاں وہ عموماً "لوگوں سے ملاقات کرتی تھی اور جہاں میں پہلے بھی آچکا تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر اسے تعظیم دی اور مودب بیٹھ گیا۔
"بوغا! ہم نے تیرے مشورے پر آج صبح ہی صبح عمل کیا۔ تجھے یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ابھی کچھ دیر پہلے منگو سے ہم نے اسی کمرے میں گفتگو کی اور اس نے ہمارے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔" سرقوشنی بیگی پر مسرت لہجے میں کہے جا رہی تھی۔ "ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ خود بھی اس سے خوش نظر آرہا تھا کہ درمیان سے ہٹ گیا۔ غالباً" وہ اس معاملے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔"
"مبارک ہو اے الاؤ کی رکھوالی کہ تیری دلی مراد پورے ہونے کے دن آگئے۔" میں بولا۔
"اب تو بتا کہ ہمیں کیا قدم اٹھانا چاہیے؟" اس نے سوال کیا۔
"تو پہلے ان دونوں کانٹوں کو راستے سے ہٹا دے جو طویل عرصے سے تیری نظر میں کھٹک رہے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ درخت گرانے کے لیے اس کی جڑوں پر حملہ کرنا چاہیے ڈالیاں اور شاخیں اس طرح خود بخود گر پڑتی ہیں۔" میں معنی خیز لہجے میں بولا۔

خوفزدہ

دو دوست سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک گاڑیوں کے ہارن کی آواز سن کر ڈر جاتا تھا۔ اس پر اس کے دوست نے پوچھا۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہارن کی آواز سن کر تم خوفزدہ کیوں ہو جاتے ہو؟"
دوسرے دوست نے جواب دیا۔
"اس کی وجہ نفسیاتی ہے۔ گزشتہ ہفتے کوئی آدمی میری بیوی کو کاریں ڈال کر فرار ہو گیا تھا۔ اب ہارن کی آواز سے خوف آتا ہے کہ کہیں وہ اسے واپس نہ چھوڑ جائے۔"

"تیرا اشارہ ملکہ تورا کینہ اور اوغول غائمش کی طرف ہے؟" اس نے میری بات سمجھتے ہوئے کہا۔
"ہاں اے عظیم بیگی! تو ٹھیک ہی سمجھی۔" میں نے جواب دیا۔
"ہاں وہ بدذات عورتیں کتیوں سے بدتر ہیں۔ وہ صلح اور جنگ کے مسائل کو کیا خاک سمجھ سکتی تھیں! انہیں کیا خبر کہ اقتدار کیسے حاصل کیا جاتا ہے اور کس طرح برقرار رکھا جاتا ہے! وہ دنیا کو امن اور چین نہیں بخش سکتی تھیں اسی لیے نیلے جاودانی آسمان نے انہیں بے آبرو کر دیا۔ وہ اگر باحیا ہوتیں تو خودکشی کر لیتیں مگر ان میں حیا کہاں!" سرقوشنی بیگی پرجوش لہجے میں بولی۔
میں خاموشی سے اس کے جوش کا عالم دیکھتا رہا کیونکہ اس وقت میرے لیے خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔
"تو پھر میں یہ کرتی ہوں کہ منگسار کو بلاتی ہوں۔ وہ ان دونوں کو پکڑ لائے گا۔ بول تو کیا کہتا ہے؟ ان پر غداری اور خاقان کو قتل کرانے کے الزامات کافی ہیں۔ انہیں سزائے موت سنانا بہت آسان ہو گا۔"
سرقوشنی بیگی نے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے رائے مانگی۔

"نہیں ان پر صرف یہی الزامات عائد کرنا کافی نہیں ہیں۔" میں نے معاً ایک خیال کے تحت کہا۔

"پھر تو اور کیا چاہتا ہے؟" سرقوشنی بیگی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تجھے معلوم ہے کہ کسی پر بھی بہت آسانی سے جادوگری کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ انہیں آسان موت نہیں مرنا چاہیے۔" میں نے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔ مجھے اس موقع پر اپنی چھوٹی ماں فاطمہ یاد آگئی تھی جس پر یہی الزام لگایا گیا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تو چاہتا ہے ان کے سارے جسم کے سوراخ سی دیے جائیں اور پھر انہیں گہرے پانی میں غرق کر دیا جائے؟" سرقوشنی بیگی کے لہجے سے پتا چل رہا تھا کہ اسے میری رائے پسند آئی تھی اور وہ اس طریقہ موت سے متفق تھی۔

میں نے جواب میں صرف سر کو اثباتی حرکت دینا کافی سمجھا۔

"ٹھیک ہے الزامات میں پہلا الزام جادوگری ہی ہوگا۔" سرقوشنی بیگی بولی۔ اس کے بعد سرقوشنی بیگی نے بوڑھے سردار منگسار کو طلب کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔ جب منگسار آگیا تو اسے تورا کینہ اور اوغول غانمش کو گرفتار کر کے لانے کو بھیج دیا گیا۔

میرا دل خوشی کے سبب تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ قویوق کی ماں اور اس کی بیوی موت کے گھاٹ اتارے جانے والے تھے۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی تھی!

منگسار اپنے دستے کے ساتھ بہت جلد تورا کینہ اور اوغول غانمش کو گرفتار کر لایا کیونکہ ان کا محل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

جب ان دونوں کو سرقوشنی بیگی کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے بڑی نفرت و حقارت سے ان کی جانب دیکھا تھا۔ پھر منگسار کو حکم دیا "ان دونوں کے ہاتھ چمڑے کے تھیلوں میں سی دیے جائیں۔"

"مگر تو ہمیں کس جرم میں یہ سزا دے رہی ہے؟" معاً ملکہ تورا کینہ کی احتجاجی آواز سنائی دی۔

"تجھے انجام تک پہنچانے سے پہلے تیری یہ آرزو بھی پوری کر دی جائے گی۔" سرقوشنی بیگی سخت غصیلے لہجے میں بولی "سن کہ تو اور تیری بہو اوغول غانمش جادوگری کرتی ہیں۔ تم دونوں پر پہلا الزام تو یہی ہے اور صرف اسی الزام کی سزا سے تو واقف ہے۔"

"نہیں تو ہم پر تہمت دھر رہی ہے۔" اس بار اوغول غانمش بولی۔ اس کی آواز بلند تھی۔

اس دوران میں ملکہ تورا کینہ کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور لمحے بھر کو اس کی آنکھوں میں حیرت سی ابھری۔ وہ شاید مجھے پہچان گئی تھی مگر اس نے مجھے مخاطب نہیں کیا کیونکہ اس وقت تو اس کی موت اور زندگی کا مسئلہ درپیش تھا۔

منگسار کے اشارے پر اس کے سپاہی چمڑے کے تھیلے لے آئے تھے اور اب اس کے اشارے کرنے پر وہ سپاہی آگے بڑھے۔

تورا کینہ اور اوغول غانمش چیختی رہ گئیں مگر ان کے ہاتھ چمڑے کے تھیلوں میں سی دیے گئے، جب سپاہی اپنے کام سے فارغ ہوئے تو سرقوشنی بیگی نے بوڑھے سردار منگسار کو مخاطب کیا "منگسار! کیا تو نہیں جانتا کہ جادوگر اور جادوگرنیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟"

"اے عظیم بیگی! منگسار کو معلوم ہے۔" منگسار یہ کہہ کر پہلے ملکہ تورا کینہ کی طرف بڑھا، منگسار کے ہاتھ تورا کینہ کے قریب پہنچ کر آگے بڑھے، اور پھر میں نے دیکھا کہ اس نے تورا کینہ کے جسم پر موجود لباس پھاڑ کر اتار دیا۔ بوڑھی تورا کینہ میں اتنی جرات و طاقت ہی کہاں تھی کہ وہ منگسار کو ایسا کرنے سے روک سکتی، میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور مجھے اپنی چھوٹی ماں یاد آگئی۔ اس کی آنکھوں میں بھی یقیناً اپنی بے بسی اور برہنہ کیے جانے پر اسی طرح آنسو آئے ہوں گے۔

جب منگسار کے قدم اوغول غانمش کی جانب بڑھے تو وہ چیخ پڑی "تو میرے جسم پر کیسے نظر ڈال سکتا ہے' اس جسم پر جسے سوائے ایک شہنشاہ کے کسی اور کی آنکھوں نے نہیں دیکھا۔"

مگر منگسار کہاں رکنے والا تھا اس نے اوغول غانمش کو بھی بے لباس کر دیا۔

"اب محل کی خادماؤں کو بلوا کہ وہ آئیں اور ان دونوں کے جسموں کے سارے سوراخ سی دیں۔" سرقوشنی بیگی نے دوسرا حکم دیا۔

اور پھر کچھ دیر بعد ہی میں نے اس کمرے میں ایک ایسا منظر دیکھا کہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا' وہ منظر دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہوا کہ چھوٹی ماں فاطمہ کو اپنی موت سے قبل کتنی اذیت سے گزرنا پڑا ہو گا! سرقوشنی بیگی کے دوسرے حکم کی تعمیل ہو رہی تھی۔ ملکہ تورا کینہ اور اوغول غانمش دونوں ہی گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھیں لیکن خادمائیں ان کے جسموں کے سوراخ سینے میں مصروف تھیں۔

"بہتر یہ ہے کہ پہلے ان کے ہونٹ سی دیے جائیں تاکہ یہ ان جانوروں کی طرح نہ چیخیں جن کے گلے پر چھری پھیری جاتی ہے۔" سرقوشنی بیگی نے خادماؤں کو مخاطب کر کے کہا۔

موٹے ڈورے سے ان دونوں کے ہونٹ سیے جانے لگے۔ میں نے ان کے ہونٹوں سے خون ٹپکتا ہوا دیکھا۔ سپاہی انہیں اس طرح پکڑے ہوئے تھے کہ وہ اپنے جسموں کو اپنی مرضی سے ذرا بھی حرکت نہ دے سکتی تھیں۔ میں سانس روکے ہوئے وہ ہولناک منظر دیکھ رہا تھا۔

جب خادمائیں ان دونوں کی آنکھوں کے پپوٹے' ہونٹ' کانوں اور جسم کے دوسرے سوراخ سی چکیں تو آخر میں ناک کے سوراخ سینے کے لیے انہوں نے ہاتھ بڑھائے۔

"ٹھہرو! ناک کے سوراخ بعد میں سیے جائیں گے۔" معاً سرقوشنی بیگی کی آواز بلند ہوئی۔ اس کے

میک اپ کرنے کا سلیقہ سیکھیے

زرق برق لباس اور چکا چوند کر دینے والے زیورات سے حسن نہیں نکھرتا۔ اس کے لیے ستاروں جیسی جگمگاہٹ اور پھولوں جیسی تازگی اور شگفتگی بھی ضروری ہے۔

آپ گھر بیٹھے اپنا روپ نکھار سکتی ہیں اور اپنے حسن کو دوبالا کر سکتی ہیں۔ یاد رکھیے میک اپ کرنا ایک فن ہے۔ اسے سیکھنا بے حد ضروری ہے۔

طبی اور آزمودہ مشوروں سے مزین ایک کار آمد کتاب

رنگین تصاویر اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ

میوٹی ٹپس

قیمت -/50 روپے بمعہ ڈاک خرچ

گھر بیٹھے منی آرڈر یا پے آرڈر بھیج کر منگوائیے

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

لہجے میں بلا کی سفاکی تھی۔ "ان دونوں پر غداری کا الزام بھی ہے اس لیے اس کی سزا دینا بھی لازمی ہے۔ میں حکم دیتی ہوں کہ ان کے جسموں کو گرم لوہے سے اس طرح آہستہ آہستہ داغا جائے کہ یہ ہلاک نہ ہوں۔"

وہ دونوں یوں ہی قریب المرگ دکھائی دینے لگی تھیں لیکن سزا تو بہرحال دی ہی جانی تھی۔

سزا کا آغاز ہوا۔ ہونٹ سلے ہونے کے سبب ان کی ناکوں سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے منحوس کیلیتیں (بدروحیں) کراہ رہی ہوں۔ کچھ دیر بعد ہی ان کے جسم اس قابل نہ رہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی رہ سکتیں۔ وہ زمین پر گر کر تڑپتی رہیں مگر سرقوشنی بیگی نے ان پر رحم نہ کیا۔ ان کے جسم اس وقت تک گرم لوہے سے داغے جاتے رہے جب تک کہ بے حس و حرکت نہ ہو گئے۔

"رک جاؤ اور دیکھو کہ کہیں یہ مر تو نہیں گئیں!" سرقوشنی بیگی نے ان سپاہیوں کو مخاطب کیا جن کے ہاتھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں تھیں انہیں کو جو تورا کینہ اور اوغول غائمش کے جسموں کے داغ رہے تھے۔ سپاہی رک گئے اور ان میں سے ایک نے باری باری دونوں کے سینوں پر ہاتھ رکھا پھر بولا۔ "اے الاؤ کی رکھوالی! ابھی یہ زندہ ہیں۔ یہ صرف بے ہوش ہوئی ہیں۔"

"انہیں ہوش میں لاؤ!" سرقوشنی بیگی نے حکم دیا۔

لہولہان عورتوں کے جسموں پر پانی ڈالا گیا۔ انہیں کافی دیر بعد ہوش آیا جس کا اندازہ اس سے ہوا کہ ان کے جسم پھر ان مچھلیوں کی طرح تڑپنے لگے تھے جنہیں پانی سے نکال کر خشک زمین پر ڈال دیا گیا ہو۔

"اب ان کی ناکوں کے سوراخ بھی سی دیے جائیں مگر اس طرح کہ یہ اتنا سانس ضرور لے سکیں کہ زندہ رہیں!" سرقوشنی بیگی با آواز بلند خادماؤں سے مخاطب ہوئی۔

سپاہیوں نے ان دونوں کو تڑپتے ہوئے جسم قابو میں کر لیے اور پھر خادماؤں نے ناکوں کے سوراخ سی دیے۔

"ان کے جسموں کو سمور میں لپیٹ کر اچھی طرح کچل دو اور پھر انہیں گہرے پانی میں پھینک آؤ!" سرقوشنی بیگی ایک کے بعد ایک حکم دے جا رہی تھی۔ اس کی آواز میں سفاکی کے علاوہ ایک ایسا تاثر بھی تھا جیسے وہ کوئی دلچسپ کھیل کھیل رہی ہو۔

سمور کی موٹی موٹی چادروں میں ان دونوں کے جسم اچھی طرح لپیٹ کر باندھ دیے گئے پھر وہاں موجود درجن بھر سپاہی اپنے پیروں سے ان کے جسموں کو کچلنے لگے۔ یہ عمل کافی دیر تک جاری رہا پھر سرقوشنی بیگی کے حکم پر سپاہی غالباً ان کے بے روح جسموں کو اٹھا لے گئے۔ خادمائیں بھی چلی گئیں۔ کمرے میں اب سرقوشنی بیگی اور میرے علاوہ کوئی باقی نہ رہا۔ معاً مجھے ایک خیال آیا کہ شامان بغورچی اور میری ماں کا دوسرا شوہر چنکائی، ملکہ تورا کینہ اور اوغول غائمش سے وابستہ تھے یہ خیال آتے ہی میں نے سرقوشنی بیگی کو مخاطب کیا "اے عظیم بیگی! کیا تو نے ان غداروں کے بارے میں بھی کچھ سوچا جنہوں نے آخری وقت تک تورا کینہ اور اوغول غائمش کا ساتھ دیا تھا؟"

"کیا تیری مراد ان کے قشق اور ان کے شامانوں سے ہے؟" سرقوشنی بیگی نے پوچھا۔

"ہاں اے عظیم بیگی!" میں نے جواب دیا۔

"قشق کے علاوہ بھی کچھ لوگ انکے وفاداروں میں تھے۔ مثلاً چنکائی بھی انہی میں سے ایک تھا۔ وہ قشق سے متعلق نہیں تھا مگر اس کے باوجود ان دونوں کا حامی تھا اور ان کے احکامات کی تعمیل کرتا تھا۔"

"وہی چنکائی تو نہیں جو ایک بار مجھ سے شامان بغورچی کے ساتھ ملا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تیرا باپ ہے؟" سرقوشنی بیگی حیرت سے بولی۔

"ہاں میں اسی کا ذکر کر رہا تھا۔" میں نے جلدی سے

ہا۔

"مگر وہ تو تیرا باپ ہے۔" وہ بولی۔ "کیا تو یہ پسند کرے گا کہ اسے کوئی سزا دی جائے؟"

"مجرم کوئی بھی کیوں نہ ہو اسے سزا ملنی چاہیے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ میرا باپ ہے۔ انصاف انصاف ہے۔ اگر اس معاملے میں نرمی برتی گئی تو لوگ یہی کہیں گے کہ میں نے اپنی حیثیت اور مرتبے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے باپ کی جان بچالی۔" میں بے جھجک بولا۔ دراصل میں سرقوشنی بیگی کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ چنکائی میری ماں کا دوسرا شوہر ضرور ہے مگر میرا باپ نہیں ہے۔

"مگر میں نہیں چاہتی کہ تجھے میرے کسی فیصلے سے دلی صدمہ ہو۔" سرقوشنی بیگی کے لہجے میں محبت تھی۔

"اگر چنکائی کو چھوڑ دیا گیا تو دوسروں پر بھی ہاتھ ڈالا جا سکے گا۔ اس کی آڑ میں دوسرے غدار بھی بچ جائیں گے۔ اگر دوسروں کو پکڑ بھی لیا گیا اور چنکائی کو نہ پکڑا گیا تو وہ چنکائی کی مثال دے کر سزا سے بچنا چاہیں گے۔ یہ بہرحال کسی بھی طرح مناسب نہیں کہ ایک شخص کی خاطر تمام غداروں کو چھوڑ دیا جائے۔ ایسا کرنے سے واقعی مجھے دلی صدمہ ہو گا۔ اگر انہیں زندہ چھوڑا گیا تو یہ خلاف انصاف بھی ہو گا اور خلاف دانش بھی!" میں سرقوشنی بیگی کو شیشے میں اتارنے کے لیے پرجوش ہو گیا۔

"بوغا! تو میری سمجھ سے باہر ہے۔" سرقوشنی بیگی عجیب سے لہجے میں بولی۔ "میری نظر سے تجھ جیسا بے غرض اور سچا نوجوان نہیں گزرا۔ کبھی کبھی تیری اس قدر شدید وفاداری اور بے غرضی مجھے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بھلا کوئی ایسا ہو گا جو وفاداری اور انصاف کی خاطر خود اپنے باپ کی ہلاکت پر بحث کرے! یا تو تو بہت بڑا فریبی ہے یا بہت بڑا انسان! بتا میں تجھے کیا سمجھوں؟"

"وقت سے بڑا منصف اور کون ہو گا اے عظیم بیگی! وقت ثابت کر دے گا کہ میں کون تھا!" میں نے اپنے سینے میں دبی ہوئی نفرت کی آگ کو دباتے ہوئے کہا وہ آگ، وہ نفرت کی آگ جو ہر منگول کو جلا کر خاک میں تبدیل ہوتے دیکھنا چاہتی تھی، خواہ وہ منگول کوئی بھی ہو۔

"تو جا میں نے تجھے اختیار دیا کہ تو جس غدار کو چاہے پکڑ اور ہلاک کر دے، خواہ وہ چنکائی ہو یا بغورچی شامان ہو یا کوئی اور! میں ابھی منگسار کو بلا کر حکم دے دیتی ہوں کہ وہ تیرا حکم مانے۔"

سرقوشنی بیگی کے الفاظ ختم ہوتے ہی میں اظہار تشکر کے طور پر ادب سے اس کے سامنے جھک گیا۔

"کچھ دیر بعد ہی میں بوڑھے سردار منگسار کے ہمراہ ایک مسلح دستہ لے کر سرقوشنی بیگی کے محل سے نکل رہا تھا۔ اس وقت میرے ہاتھ میں فرمان قضا تھا۔ وہ میری فتح کا دن تھا۔ میں جسے چاہتا تہہ تیغ کر دیتا۔ مجھ سے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔

میں منگسار کے ہمراہ گھوڑا دوڑاتا ہوا ملکہ تورا کینہ کے محل تک پہنچ گیا۔ اس محل کے در و دیوار پر عجیب سی اداسی برس رہی تھی۔ نہ اس کے صدر دروازے پر کلہاڑے بردار محافظ تھے نہ وہاں کوئی اور ہی نظر آ رہا تھا۔ محل کا صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں گھوڑا دوڑاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ یہ وہی محل تھا جہاں کبھی میری چھوٹی ماں فاطمہ رہا کرتی تھی اور میں اس سے ملنے آتا تھا۔ اسی محل کے صدر دروازے پر ایک دن کلہاڑے بردار محافظوں نے مجھے گرفتار کیا تھا۔ اس دن گویا میں اس محل میں ایک فاتح کی طرح داخل ہو رہا تھا۔

محل کے اندر بھی ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی، سارا محل خالی پڑا تھا، نہ وہاں کوئی محافظ تھا نہ کوئی خادم اور نہ کوئی خادمہ!

"آج جب تم تورا کینہ اور اوغول غانمش کو یہاں سے گرفتار کر کے لے گئے تھے تو کیا اس وقت بھی یہ محل اسی طرح خالی چھوڑ گئے تھے؟" میں نے پلٹ کر

بوڑھے سردار سنگسار سے پوچھا۔

"نہیں اس وقت ایسا نہیں تھا۔" منگسار نے جواب دیا پھر بولا۔

"شاید محل کے سارے محافظ اور خادم اپنے آقاؤں کا حشر دیکھ کر فرار ہو گئے ہیں۔"

"ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے اس کے خیال سے اتفاق کیا پھر کہا "آؤ میرے ساتھ!" یہ کہہ کر میں نے گھوڑے کی باگیں موڑیں اور محل سے باہر جانے کے لیے صدر دروازے کی جانب بڑھا۔

ملکہ تورا کینہ کے ویران محل سے نکل کر اب میرا رخ اس یورت کی طرف تھا جہاں میں پیدا ہوا تھا' پلا بڑھا تھا اور جوان ہوا تھا۔

میرے اشارے پر سپاہیوں نے اس یورت کو گھیر لیا جہاں کبھی میری ماں رہتی تھی اس یورت سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے یورت میں چنکائی کی دوسری بیوی رہتی تھی جو منگول نسل ہی سے تھی۔

میں نے گھوڑے سے اترتے ہوئے سپاہیوں سے کہا "اس یورت میں چن گائی رہتا ہے اس سے کہو کہ باہر آجائے اور خود کو گرفتار ہونے کے لیے پیش کر دے۔ اگر وہ باہر نہ آئے تو یورت میں گھس کر اسے باہر گھسیٹ لاؤ۔"

سپاہی میرا حکم سنتے ہی اپنے گھوڑوں سے اترے' ان میں سے ایک نے چنکائی کو آواز دی اور میرے کہے ہوئے لفظ دہرائے کچھ دیر اندر سناٹا چھایا رہا' موت کا سا سناٹا' پھر اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ میں اس کی آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا' یہ چنکائی کی دوسری بیوی بول رہی تھی۔

"چنکائی اندر نہیں ہے' وہ بغورچی شامان کے ساتھ صبح سے گیا ہوا ہے۔" نسوانی آواز سنائی دی۔

سپاہیوں نے میری جانب پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا' مقصد یہ تھا کہ اب وہ کیا کریں۔

"ہو سکتا ہے وہ جھوٹ بول رہی ہو' اور چنکائی اندر موجود ہو۔" مجھ سے پہلے منگسار بول اٹھا اور خود میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو منگسار' خود میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا۔

میری بات سنتے ہی منگسار کے اشارے پر سپاہی یورت میں گھس گئے اور پھر اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے ان آوازوں سے اندازہ ہوا کہ یورت میں چنکائی کی دوسری بیوی کے علاوہ کوئی اور بھی تھا۔

کچھ دیر بعد ہی سپاہی یورت سے ایک ادھیڑ عمر منگول عورت اور ایک نوجوان کو گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔

"لعنت ہو تجھ پر اسے سفید چمڑی والی کے بیٹے!" ادھیڑ عمر منگول عورت نے مجھے دیکھتے ہی نفرت سے کہا۔ "تو اپنے باپ کی عزت پامال ہوتے دیکھ رہا ہے اور کچھ نہیں بولتا بلکہ تو ان ظالموں کے ساتھ ہے۔"

"چپ رہ اے بد زبان عورت!" میں سخت طیش کے عالم میں بولا۔ وہ میری ماں کو اسی حقارت سے سفید چمڑی والی اور مجھے سفید چمڑی والی کا بیٹا کہتی تھی۔

اپنی ماں پر مجھے یوں غصہ ہوتے دیکھ کر تموجو بپھر گیا اور مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان امڈ رہا تھا۔ یہ وہی تموجو تھا' وہی جو مجھ سے بچپن میں میرا شکار چھین کر بھاگ جاتا تھا۔ تموجو مجھے اپنا سوتیلا بھائی سمجھ کر نفرت کرتا تھا حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ مجھ پر اپنی جسمانی برتری جتاتا رہتا تھا اور وہ تھا بھی مجھ سے طاقتور کچھ دن قبل ہی اسنے میری زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت جب میری حیثیت ایک مفرور مجرم جیسی تھی۔ اس نے چیخ کر سب کو میری طرف متوجہ کر دیا تھا اور میں اپنی جان بچانے کی خاطر بھاگ اٹھا تھا' پھر مجھے عظیم چینی عالم لن یانے بچا لیا تھا۔ میں بغورچی شامان سے بچ کر بستی کی طرف آیا تھا تاکہ سرقوشنی بیگی سے مل سکوں۔ اسی دوران میں تموجو سامنے آگیا تھا۔

اس وقت تموجو کو خود پر حملہ آور ہوتے دیکھ کر

میری ساری نفرت عود کر آئی۔ وہ شاید مجھ پر حملہ کرنے کی جسارت نہ کرتا اگر اسے میری موجودہ حیثیت کا علم ہوتا۔

اس سے پہلے کہ تموجو مجھ تک پہنچ سکتا، سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ سپاہیوں کی گرفت سے نکلنے کے لیے زور کرنے لگا۔ وہ چیخ رہا تھا۔

"چھوڑ دو مجھے! میں اس سفید چمڑی والے کے بیٹے کو بچپن سے پچھاڑتا آیا ہوں۔ میں اسے ابھی رگڑ دوں گا۔"

اس کی ماں فریادی لہجے میں اسے منع کر رہی تھی کہ وہ ایسا نہ کرے غالباً" وہ سمجھ چکی تھی کہ اس وقت میں شاہی سواروں کے ساتھ ہوں اور میں ہی انہیں وہاں لے کر آیا ہوں۔

"اسے چھوڑ دو!" معاً" میں نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ میں چاہتا تو سپاہیوں کو حکم دے کر تموجو کو قتل بھی کرا سکتا تھا مگر میں اس کے اس غرور کو پارہ پارہ کر دینا چاہتا تھا کہ وہ مجھے بچپن سے پچھاڑتا آیا تھا اور یہ کہ وہ مجھ سے جسمانی طور پر طاقتور و برتر ہے۔

سپاہیوں نے لمحے بھر کو میری جانب دیکھا، پھر منگسار کی طرف اور میرا ایما پا کر تموجو کو چھوڑ دیا۔ میں نے اسی لمحے ایک سپاہی سے تلوار لے لی۔

"بونا! یہ تیری بزدلی کا کھلا ثبوت ہے کہ تو مجھ نہتے کے سامنے تلوار تھامے کھڑا ہے۔" تموجو نے نفرت و حقارت سے کہا اور میرا خون کھولا دیا۔

"اسے بھی تلوار دے دو!" میں نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔

سپاہی نے تلوار تموجو کی طرف بڑھا دی جسے ہاتھ میں لیتے ہی، تموجو وحشیانہ انداز میں چیخ مار کر خالص منگولوں کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ پہلا وار اسی نے کیا جسے میں بہت خوب صورتی سے پیچھے ہٹ کر بچا گیا۔ تمام سپاہی حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور دلچسپی سے اس مقابلے کو دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ تموجو دوسرا وار کرتا میں نے اس پر بھرپور ضرب لگانا چاہی۔

اس نے مجھے دھوکا دینے کے لیے ایک دم آگے بڑھ کر اس طرح تلوار اٹھائی تھی جیسے اس کی تلوار کی زد پر میری گردن ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کے دھوکے میں آگیا اور میرا ہاتھ بہک گیا۔ اس نے موقع سے پورا فائدہ اٹھا کر پے در پے مجھ پر حملے کیے تاکہ میں سنبھل نہ سکوں۔ میں بھلا کیسے گھبرا جاتا! وہ توانائی کی جنگ تھی۔ وہ جنگ مجھے ہر حال میں جیتنی تھی۔ اس کے پے در پے حملوں کا زور کچھ کم ہوا تو میں سنبھلا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے پہلے ہی حملے میں اس کا بایاں بازو زخمی کر دیا۔ تلوار ذرا اچٹتی ہوئی پڑی تھی ورنہ اس کا بایاں بازو کٹ کر الگ جا گرتا۔ دوسری بار میں نے اس کے پیروں کو نشانہ بنانا چاہا مگر وہ اچھل کر وار بچا گیا۔ لڑتے لڑتے میرے اور اس کے جسم پسینوں میں شرابور ہو چکے تھے مگر کوئی بھی شکست تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس کا سانس بھی بری طرح پھولا ہوا تھا اور میرا بھی مگر ہم بغیر دم لیے لڑ رہے تھے۔ تموجو مجھ سے یقینی طور پر طاقتور تھا لیکن میں اس کی برتری تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اب میں بچہ نہیں جوان تھا۔ وہ مجھے احساس کمتری میں مبتلا نہیں کر سکتا تھا۔

لڑتے ہوئے اچانک ایک ایسا مرحلہ آگیا کہ مجھے اس کا وار بچانے کی خاطر اتنی تیزی سے پیچھے ہٹنا پڑا کہ میں اپنا جسمانی توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر گر گیا۔ اس نے تیزی کے ساتھ مجھے اٹھنے کا موقع دیے بغیر ضرب لگائی جسے میں نے اپنی تلوار پر روک لیا اور میرا ہاتھ ضرب کی شدت سے جھنجھنا اٹھا اس نے تلوار اوپر اٹھانے کی بجائے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر نیچے کی طرف زور لگایا۔ اس کی تلوار کا زور نیچے کی جانب تھا اور میں اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی تلوار لحہ بہ لحہ میرے چہرے کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میرا وہ ہاتھ بہت آہستہ آہستہ نیچے ہوتا جا رہا تھا۔ کیا وہ ایک بار پھر مجھے نیچا دکھا دے گا؟ میں نے سوچا۔ وہ بچپن ہی سے مجھے شکست دیتا آیا تھا۔ کیا

میری آخری شکست بھی اس کے ہاتھوں لکھی تھی؟ میں سوچ رہا تھا اور اسی کے ساتھ میرا ذہن تیزی سے اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ معاً" میرے ذہن میں بچاؤ کا ایک طریقہ آ ہی گیا مگر اس میں ایک بڑا خطرہ تھا۔ اگر میں متوقع انداز میں اپنے جسم کو حرکت نہ دے سکتا تو میری شکست لازمی تھی اور صرف شکست ہی نہیں بلکہ موت بھی! تموجو کی تلوار میری گردن الگ کر دیتی۔ ان نازک اور خطرناک لمحوں میں اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہ تھی۔ میں نے اپنے جسم کی پوری طاقت لگا کر اس کی تلوار کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور پھر اسی لمحے انتہائی تیزی کے ساتھ دائیں جانب لڑھک گیا۔ اگر مجھ سے لڑھکنے میں ایک لمحے کی غفلت بھی ہو جاتی تو تموجو کی تلوار پوری قوت سے زمین پر پڑنے کی بجائے میری گردن پر پڑتی مگر میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ تموجو اوندھے منہ زمین پر آ رہا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں لڑھکتے ہوئے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اٹھنے میں اتنی تیزی دکھائی تھی کہ تموجو زمین سے نہ اٹھ سکا تھا۔ وہی لمحہ میری فتح کا لمحہ تھا۔ تموجو نے سیدھا ہو کر اٹھنا ہی چاہا کہ میں نے تیزی سے جھپٹ کر اس کے سینے میں اپنی تلوار اتار دی۔

بیک وقت دو چیخیں بلند ہوئی تھیں جن میں سے ایک چیخ آخری تھی اور وہ چیخ تموجو کی تھی۔ دوسری چیخ تموجو کی ماں کے حلق سے نکلی تھی۔ میرے پیچھے ہٹتے ہی وہ ایک بار پھر چیخی اور تموجو کے خون آلود تڑپتے ہوئے جسم سے لپٹ گئی۔

مجھے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے بچپن سے جوانی تک کی ساری نفرت کا حساب چکا دیا ہو۔ تموجو کا تڑپتا ہوا لہولہان جسم دیکھ کر مجھے عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔

"اس عورت سے پوچھو کہ اس کا شوہر شامان بغورچی کے ساتھ کہاں گیا ہے؟" میں نے منگسار سے کہا۔

منگسار آگے بڑھا اور چنکائی کی بیوی کا بازو پکڑ کر اسے جھٹکے سے کھڑا کر دیا، پھر سخت لہجے میں بولا "بتا تیرا شوہر کہاں گیا ہے؟"

"میں..... میں بتا چکی ..... چکی ہوں کہ وہ شامان بغورچی کے ساتھ گیا ہے۔" وہ ہچکیوں کے درمیان بمشکل بولی۔

"مگر کہاں گیا ہے؟" منگسار نے پھر سوال کیا۔

"بستی سے باہر کہیں..... کہاں..... یہ..... یہ میں نہیں جانتی۔"

"میں سمجھ گیا کہ وہ کہاں گیا ہو گا۔" میں نے منگسار سے کہا۔ "آؤ!" یہ کہہ کر میں اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے لیے بستی سے باہر جانے کا اشارہ کافی تھا۔

میرے خیال میں شامان بغورچی، بورخان قالدون کے کسی غار میں چھپا ہوا تھا اور وہ اپنے ہمراہ چنکائی کو بھی لے گیا تھا۔ میں اسی لیے مسلح سپاہیوں کو ساتھ لیے بورخان قالدون تک پہنچنے کی خاطر بستی سے نکلا۔ بستی سے نکل کر ابھی ہمیں بورخان قالدون کی طرف بڑھتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ معاً" کچھ فاصلے پر مجھے کسی کا ہیولا نظر آیا۔ وہ کسی انسان ہی کا ہیولا ہو سکتا تھا جو لحہ لحہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بستی ہی کی طرف جا رہا تھا۔ میرے علاوہ شاید منگسار کی نظر بھی اس پر پڑ گئی تھی۔

"حیرت ہے کہ کوئی پیدل بستی کی طرف جا رہا ہے۔" منگسار نے کہا جو میرے برابر برابر ہی گھوڑا دوڑا رہا تھا۔

"یہ بغورچی شامان یا چنکائی بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے اپنا خیال پیش کیا۔

وہ جو کوئی بھی تھا، راستے سے ذرا ہٹ کر چل رہا تھا۔ ہم نے اپنے گھوڑے اسی کی جانب دوڑا دیے۔ کچھ دیر بعد ہی وہ اور واضح نظر آنے لگا۔ پھر معاً" میں نے اسے چونکتے دیکھا تھا۔ وہ غالباً" محسوس کر چکا تھا کہ ہم اسی کی طرف آ رہے ہیں۔

ذرا سا فاصلہ اور کم ہوا تو مجھے اس کے جسم پر موجود عجیب لباس نظر آنے لگا اور یہ لباس میرے لیے اجنبی

میں تھا لیکن ابھی فاصلے کے سبب اس کا چہرہ واضح نظر میں آسکا تھا۔ ہاں میں نے اس کی پشت پر لہراتے ہوئے بال ضرور دیکھ لیے تھے۔

سولدہ! میں نے چیخ کر کہنا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے جیسے مجھے ہوش آگیا اور میں صرف بڑبڑا کر رہ گیا لیکن میرے ساتھ دوسرے افراد ضرور چیخ پڑے تھے۔

"سولدہ، سولدہ!" کئی سپاہیوں نے چیخ کر کہا تھا اور ان کے چیخنے کا سبب بھی تھا۔ سولدہ اچانک غائب ہو گئی تھی۔

کیا منگسار اور کیا اس کی سپاہ سب ہی یہ منظر دیکھ کر حواس کھو بیٹھے تھے۔ انہوں نے اسی بدحواسی میں تیزی سے اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑیں اور سرپٹ بستی کی طرف بھاگ اٹھے۔ اس سے پہلے کہ میں انہیں روک سکتا، وہ کافی دور نکل چکے تھے۔

میں چند لمحے اسی جگہ گھوڑا روکے کھڑا رہا، پھر میں سوچا کہ مجھے طاقت کے پہاڑ بور خان قالدون کی طرف جانا چاہیے۔ چنکائی اور شامان بغورچی کو تلاش کرنا بہت ضروری تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر انہیں قابو میں نہ کیا گیا اور وہ زندہ رہے تو کسی بھی وقت میرے لیے شدید خطرے کا باعث بن سکتے ہیں۔

میں نے اپنے گھوڑے کو بور خان قالدون کی جانب دوڑانا شروع کر دیا۔ میں راستے میں سولدہ کے بارے میں سوچتا ہوا جا رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ پھر لوٹ آئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ واپسی میں اس سے ملتا ہوا جاؤں گا۔ اسے اسی پہاڑی پر ہونا چاہیے تھا جس کے ایک غار میں وہ مجھے لے کر آئی تھی اور جہاں سے غائب ہو گئی تھی۔ سولدہ کی واپسی نے میری ہمت اور بڑھا دی تھی ورنہ شاید میں تنہا بور خان قالدون کی طرف جانے کا فیصلہ نہ کرتا جہاں اندازے کے مطابق میرے دو خطرناک دشمن چھپے ہوئے تھے۔

سولدہ جس جگہ نظر آتی تھی، وہاں سے وہ پہاڑی زیادہ دور نہیں تھی جو اس کا مسکن تھا لیکن اس کے باوجود میرے لیے یہ بات تشویش طلب تھی کہ وہ بستی کی طرف جا رہی تھی۔ کیا اس نے میری تلاش میں بستی کا رخ کیا تھا؟ میں سوچ رہا تھا اور اب مجھے بور خان قالدون کے قریب پہنچتے ہوئے یہ افسوس ہو رہا تھا کہ میں پہلے سولدہ سے کیوں نہ مل لیا!

میں اب طاقت کے پہاڑ تک پہنچ چکا تھا۔ دن کی روشنی میں چنکائی اور شامان بغورچی کی تلاش میرے لیے نسبتاً" آسان تھی۔ اگر میں دوبارہ بستی کی طرف لوٹ کر سپاہیوں کو اپنے ساتھ وہاں تک لاتا تو رات ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ میرے ذہن میں ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کہیں چنکائی اور شامان بغورچی وہاں سے فرار نہ ہو جائیں! یہی سوچ کر میں نے انہیں اسی وقت تلاش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں اپنے گھوڑے کو پہاڑ کے نیچے ہی ایک بڑے سے پتھر سے باندھ کر اوپر چڑھنے لگا۔ راستے میرے دیکھے بھالے تھے۔ میں تیزی سے پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔

پہلا غار نظر آتے ہی میں نے اس میں جھانک کر دیکھا اور آہٹ لی مگر وہ غار خالی تھی۔ کچھ اوپر دو تیر کی بلندی پر ایک اور غار کا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ میں اس طرف بڑھا۔

اس غار کے دہانے پر پہنچتے ہی مجھے ایک دم خطرے کا سا احساس ہوا جیسے خطرہ کہیں بہت قریب ہی موجود ہو۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس غار میں جھانکوں یا نہ جھانکوں کہ معاً" اوپر سے ایک رسیوں کا جال آکر مجھ پر گرا اور پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا، میرے جسم پر جال کی گرفت سخت ہو گئی۔ اسی کے ساتھ فضا میں ایک کریہہ قہقہہ گونج اٹھا اور یہ قہقہہ شامان بغورچی کا تھا۔

"میں یہاں تیرے ہی لیے جال بچھائے بیٹھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تو ادھر ہی آئے گا۔" میں نے شامان بغورچی کی بھاری گونج دار آواز سنی مگر مجھے وہ نظر نہ آیا۔ اس کے فوراً" بعد ہی میرے پاؤں زمین سے اوپر اٹھ گئے۔ جال آہستہ آہستہ میرے جسم کو گرفت میں لیے اوپر اٹھ رہا تھا۔

میری آنکھوں میں موت ناچنے لگی۔ ظاہر تھا کہ بغورچی شامان مجھے کیوں زندہ چھوڑتا! میں اس کے خون کا پیاسا ہو چکا تھا اور یہ بات اس سے پوشیدہ نہیں رہی ہوگی۔ اسے یقیناً اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر معلوم ہو چکا تھا کہ میں اس کی تلاش میں طاقت کے پہاڑ بور خان قالدون کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ میرا دوسرا دشمن چن کائی بھی ہوگا۔ میں دو خطرناک دشمنوں کے درمیان تنہا اور بے بس تھا۔

میرا جسم رسیوں کے جال کی گرفت میں مسلسل اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ میں نے اوپر کی طرف دیکھا اور میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ چٹان سے بھرا ہوا ایک نوکیلا پتھر لمحہ بہ لمحہ مجھ سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اگر بغورچی مجھے اسی طرح اوپر کھینچتا رہتا تو اس پتھر سے میرے سر کا ٹکرا جانا لازمی تھا۔

"ٹھہرو، رک جاؤ! مجھے اور اوپر نہ کھینچو! میرا سر۔۔۔"

میرا جملہ ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ جواب میں بغورچی کا کریہہ قہقہہ سنائی دیا تھا جس میں میرے الفاظ دب کر رہ گئے تھے۔ وہ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی حرکت سے باز نہیں آئے گا اور میرا چیخنا چلانا بے سود ہے۔

میں نے اوپر نگاہ اٹھائی اور خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نوکیلا پتھر اب بالکل میرے سر کے اوپر آ چکا تھا، اور پھر میرا سر بہت زور سے پتھر کے ساتھ ٹکرایا۔ میرے منہ سے شاید چیخ نکل گئی تھی، پھر میرے اطراف دن کا اجالا ہونے کے باوجود تاریکیاں پھیل گئی تھیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ ہوش آنے پر کچھ دیر میرے سر میں آندھیاں سی چلتی رہیں، پھر یوں محسوس ہوا جیسے پے در پے کوئی میری کھوپڑی پر پتھر مار رہا ہے۔ اس کے بعد میری سماعت سے ایک نفرت انگیز مگر آشنا آواز ٹکرائی تھی۔

"اے شامان! تو مجھے اجازت دے کہ میں اس کا گلا کاٹ دوں۔" یہ آواز میری ماں کے دوسرے شوہر چن کائی کی تھی جسے دنیا میرا باپ سمجھتی تھی۔

"نہیں چن کائی! میں تجھے ابھی اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ تو نہیں جانتا کہ تیرا بیٹا میرے لیے کتنا قیمتی ہے! اس کے ذریعے میں ان پراسرار قوتوں کو اپنے قابو میں کر لوں گا جن کی مجھے ایک عرصے سے تمنا ہے۔ خود اس سے بھی مجھے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ میرے علم کے مطابق اس نے گزشتہ دو سال دشت میں نہیں گزارے۔ یہ اچانک کس طرح اور کہاں چلا گیا تھا، اس میں یقیناً کوئی بھید ہے۔ اگر تو نے اسے قتل کر دیا تو میں یہ بھید کبھی نہ جان سکوں گا۔" بغورچی شامان نے چن کائی کی بات کا تفصیلی جواب دیا۔

"تو کہتا ہے تو میں ایسا نہیں کرتا ورنہ میرا خون کھول رہا ہے۔" چن کائی نے پژمردہ سے لہجے میں کہا، جیسے اسے میرے مزید زندہ رہنے کا دکھ ہو۔

مجھے یہ جان کر وقتی طور پر اطمینان ہوا کہ بغورچی شامان ابھی مجھے قتل نہیں کرنا چاہتا۔ وہ میرے ذریعے سولدہ تک پہنچنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ خواب جو شاید کبھی پورا نہیں ہوگا۔

"اسے اب ہوش میں آ جانا چاہیے، بہت دیر ہو گئی۔ آؤ دیکھیں!" بغورچی شامان کی آواز سنائی دی، پھر قدموں کی چاپ قریب آتی محسوس ہوئی۔

میں ہوش میں تو آ چکا تھا لیکن ان کے لیے بے ہوش بنا رہنا چاہتا تھا تاکہ اس دوران میں اپنے بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچ سکوں میں اسی لیے بے حس و حرکت پڑا رہا۔

قدموں کی چاپ قریب آ کر رک گئی، پھر چن کائی کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ تو ابھی تک بے ہوش پڑا ہے۔ شاید اسے کوئی بند چوٹ لگی ہے کیونکہ خون بالکل نہیں بہا۔"

جواب میں بغورچی شامان کے ہنسنے کی آواز سنائی دی، پھر وہ بولا۔ "تیرا بیٹا بہہ رو پیا ہے۔ یہ میری پراسرار قوتوں سے آگاہ ہونے کے باوجود ڈھونگ رچا رہا ہے۔ یہ تیرے لیے بے ہوش ہوگا مگر بغورچی شامان کے لیے نہیں جو نیلے جاودانی آسمان کی سرگوشیاں بھی سن لیتا

ہے۔ دیکھ میں اس کا ڈھونگ ابھی ختم کیے دیتا ہوں۔"

معاً میں نے سر کے پچھلے حصے پر دباؤ محسوس کیا۔ یہ سر کا وہی حصہ تھا جو نوکیلے پتھر سے ٹکرایا تھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ میرے منہ سے کراہ یا چیخ نہ نکلنے پائے مگر ناکام رہا۔ مجھے اتنی شدید تکلیف و اذیت محسوس ہوئی کہ میں چیخ اٹھا اور گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بغورچی شامان کا منہ پھیلا اور اس سے قہقہہ ابل پڑا۔

"تو نے دیکھا چن کائی! اسے کتنی جلدی ہوش آگیا!" بغورچی شامان ہنستے ہوئے بولا' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تو مجھے دھوکا دینا چاہتا تھا..." بغورچی شامان کو؟"

میں خاموش رہا اور کن انکھیوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ میں ایک غار کے پتھریلے فرش پر پڑا ہوا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ چن کائی قریب ہی کھڑا ہوا تھا اور بغورچی شامان مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ پھر وہ بھی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر چن کائی کو معلوم ہو جائے کہ میں اس کی دوسری بیوی کے بیٹے اور اس کے چہیتے تموجو کو قتل کر آیا ہوں تو وہ بغورچی شامان کی پرواہ کیے بغیر مجھے اسی وقت قتل کر دے۔

"سن یوغا!" معاً بغورچی شامان نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں تجھ سے کچھ سوالوں کے جواب چاہتا ہوں جن پر تیری زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ اگر تو نے غلط جواب دیے تو میں سمجھوں گا کہ تو زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ بول کیا تو میرے سوالوں کے جواب دینے پر راضی ہے؟" اس نے مجھے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھورا۔

میں نے بے سوچے سمجھے اثبات میں سر ہلا دیا اور سوچنے لگا کہ بغورچی شامان پر اسرار قوتوں کا مالک ہونے کے باوجود یہ جاننے سے قاصر ہے کہ میں نے گزشتہ دو سال کہاں گزارے! اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کا علم محدود تھا۔ یہ سوچ کر مجھے خوشی سی ہوئی۔ اسی وقت اس کی آواز پھر آئی اور میری سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"بتا کہ جب تو ملکہ تورا کینہ کے پاس باتو خاں کا پیغام لے کر آیا تھا تو کس طرف واپس گیا تھا؟" بغورچی شامان نے سوال کیا۔

"میں مغربی دشت ہی کی طرف لوٹا تھا۔" میں نے پھر بغیر سوچے جواب دیا۔

"تو جھوٹا ہے۔" بغورچی شامان غصے سے چیخ پڑا۔ "تو نہ اس دشت میں تھا نہ مغربی دشت میں! میرا علم جھوٹا نہیں ہو سکتا۔"

"اے عظیم شامان! نہ میں جھوٹا ہوں نہ تیرا علم!" میں نے کچھ سوچ کر جلدی سے کہا۔ "میں ایک جھوٹ گھڑ چکا تھا۔" مجھے مغربی دشت پہنچتے ہی باتو خان نے دور دراز علاقوں کی طرف قاصد بنا کر روانہ کیا تھا۔ میں واقعی دشت میں نہیں تھا۔"

میرا جواب سن کر بغورچی شامان کے چہرے پر غصے کی بجائے الجھن کے سے تاثرات نظر آنے لگے۔ میں نے بات ہی ایسی کی تھی کہ وہ الجھ کر رہ جائے۔ کچھ دیر کے لیے غار میں خاموشی چھائی رہی' پر اس خاموشی کو بغورچی شامان ہی کی آواز نے توڑا۔ اس نے براہ راست سوال کیا۔ "کیا تجھے اس دوران میں وہ سولدہ ملی جسے تو نے کبھی اس پہاڑ پر دیکھا تھا؟"

تو اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا؟ میں نے سوچا۔ میں باآسانی جھوٹ بول کر اپنی جان چھڑا سکتا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب انکار میں دیا۔

"یہ کیسے ممکن ہے!" وہ ایک بار پھر برہم ہو گیا۔ "تو مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جب کوئی سولدہ کسی پر عاشق ہو جاتی ہے تو اسے نہیں چھوڑتی۔"

"مگر وہ سولدہ مجھ پر عاشق ہی کب ہوئی تھی!" میں نے بھولپن سے جھوٹ بولا۔

"اگر وہ تجھ پر عاشق نہ ہوتی تو تجھے موت کے منہ سے کیوں نکال لے جاتی! بتا کیا تو خود اس موت کے گڑھے سے نکل سکتا تھا جس میں تجھے مرنے کے لیے ڈالا گیا تھا؟" وہ میرے قریب آکر مجھے گھورنے لگا۔

"اگر تیرا کہنا درست ہے تو یقین کر اے عظیم شامان! مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔" میں نے خوشامدانہ انداز اختیار کیا۔ "میں تو خود اس سے ڈرتا تھا۔ اچھا ہوا اس نے میری جان چھوڑ دی۔"

"سولدہ تجھ سے آخری بار کب ملی تھی؟" بغورچی شامان پھنکارا۔

"اسی وقت جب اس نے مجھے گڑھے سے نکالا تھا۔" میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

"پھر تو مجھے دھوکا دے کر سرقوشنی بیگی تک کیسے پہنچ گیا تھا؟"

"مجھے سرقوشنی بیگی کے پاس چین سن یا' یاؤ چاؤ نے پہنچایا تھا۔"

"تو کس لیے بیگی کے پاس گیا تھا؟" وہ پے در پے سوال کر رہا تھا۔

"تاکہ عظیم بیگی مجھے پناہ دے دے۔" میں نے بغیر رکے کہا۔

"پھر تو بیگی کا پیغام لے کر باتوں خاں کی طرف چلا گیا تھا۔ ہے نا یہی بات! لیکن سوال یہ ہے کہ بیگی نے تجھے پناہ کیوں دی؟ تو نے اس کا اعتماد کیسے حاصل کر لیا؟"

"یاؤ چاؤ نے اس سے میری سفارش کی تھی۔" ایک جھوٹ بولنے کے سبب مجھے دوسرے جوٹ بھی بولنے کی ہمت ہو گئی تھی۔

"اسے کیا پڑی تھی کہ بیگی سے تیری سفارش کرتا؟" بغورچی شامان نفرت سے بولا۔

"اسے مجھ پر رحم آ گیا تھا۔"

"لیکن مجھے تجھ پر ہرگز رحم نہیں آئے گا۔" بغورچی شامان ایک دم پھٹ پڑا۔ "سن! میرا علم مجھے بتا رہا ہے کہ تو نے مجھ سے جو باتیں کی ہیں' ان میں سے بیشتر جھوٹی ہیں اور میں تجھے جھوٹ بولنے کی سزا ضرور۔" "معاً" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور چونک پڑا۔ اس نے چن کائی کو مخاطب کیا۔ "غار کے دہانے پر جا کر دیکھ! مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی پہاڑ چڑھ رہا ہے۔"

"مگر مجھے تو کوئی آواز سنائی نہیں دی۔" چن کائی کے لہجے میں حیرت کے ساتھ خوف بھی تھا۔

"وہ جو آسمانوں کی سرگوشیاں سنتا ہے' اس کی سماعت ظاہر ہے تجھ سے تیز ہونی چاہیے۔" "جا' جلدی کر! میں خطرے کی بو سونگھ رہا ہوں۔" بغورچی شامان غصے سے بولا۔

چن کائی تیزی سے غار کے دہانے کی طرف بڑھ گیا' پھر جب وہ پلٹا تو تقریباً" دوڑ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ "بہت سے سپاہی پہاڑ پر چڑھ آئے ہیں۔ وہ غاروں کی تلاشی لے رہے ہیں اور کچھ سپاہی اس غار کی طرف بھی آ رہے ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ یہ ہولناک خبر سن کر بغورچی شامان ذرا بھی نہ گھبرایا بلکہ اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔

"چن کائی!" وہ پرسکون آواز میں بولا۔ "بوغا کو اپنی پشت پر لاد لے! میں نے کچھ سوچ کر ہی اس غار کا انتخاب کیا تھا۔ اس غار کا دوسرا دھانہ بھی موجود ہے جدھر سے ہم با آسانی فرار ہو سکتے ہیں۔"

بغورچی شامان کی بات سن کر چن کائی کے بدحواس چہرے پر اطمینان کی جھلک آ گئی۔ شاید اس کے علم میں نہیں تھا کہ اس غار کا ایک اور دہانہ بھی تھا۔

میرے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا کہ میں جدوجہد کرتا مگر میرے ہاتھ پاؤں بہت سختی سے جکڑے ہوئے تھا۔ میں نے زور لگایا مگر رسیاں ذرا بھی ڈھیلی نہ ہوئیں۔ اسی وقت چن کائی نے تیزی کے ساتھ جھک کر ایک جھٹکے سے مجھے اٹھا لیا اور اپنی پشت پر لاد لیا۔

بغورچی شامان نے غار کی دائیں جانب تیزی سے بڑھنا شروع کیا۔ چن کائی نے ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود مجھے آسانی سے اپنی پشت پر لادا ہوا تھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بغورچی شامان کے پیچھے چل رہا تھا۔ چن کائی کا جسم گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس غار میں ان لوگوں کا کچھ سامان بھی موجود تھا۔ مگر انہوں نے وہ سامان وہیں چھوڑ دیا تھا۔

یہ تو میرے علم میں تھا کہ منگسار اور دوسرے

سپاہیوں کو میرے بارے میں خبر تھی۔ میں ان کے ہمراہ بور خان قالدون کی طرف ہی جا رہا تھا کہ راستے میں سولدہ کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں بغورچی شامان اور چن کائی کی تلاش میں بور خان قالدون ہی کی طرف گیا ہوں گا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کچھ دور جا کر منگساز کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا جو وہ دوبارہ پلٹ آیا؟ مجھے علم نہیں تھا کہ میں تھوڑی دیر بے ہوش رہا تھا یا طویل عرصے کے لیے! میں اسی لیے کوئی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ کہ منگساز اور اس کے سپاہی راستے ہی سے لوٹ آئے تھے یا بستی پہنچ کر دوبارہ لوٹے تھے! پھر ایک بات اور میرے لیے الجھن کا باعث تھی کہ ان لوگوں کے دل سے ایک دم سولدہ کا خوف کس طرح نکل گیا جو انہوں نے اس طرف دوبارہ آنے سے گریز نہیں کیا!

معاً میں نے اپنے پیچھے کچھ فاصلے پر قدموں کی چاپ سنی اور بہت سی آوازیں بھی! غالباً سپاہی اس غار میں داخل ہو چکے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا مگر غار کا وہ حصہ نیم تاریک سا تھا اس لیے مجھے کچھ نظر نہ آسکا۔

"دوڑو!" اچانک بغورچی شامان بھاگ اٹھا۔ "وہ غار میں داخل ہو چکے ہیں۔"

چن کائی تیز تیز چلنے کی بجائے دوڑنے لگا اور اسی وقت میرے ذہن میں بچاؤ کی تدبیر آگئی۔

"بچاؤ، بچاؤ!" میں اپنے گلے کی پوری قوت صرف کر کے چیخنے لگا تاکہ سپاہی اس طرف متوجہ ہو کر دوڑ پڑیں۔

"بوغا! خاموش رہ ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔" بغورچی شامان بھاگتے بھاگتے پلٹ کر دہاڑا مگر میں کہاں باز آنے والا تھا! میں مسلسل چیخنے جا رہا تھا۔

"میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا کہ اسے قتل کرنے دے مگر تو نہ مانا۔ ہم اسے کہاں کہاں اٹھائے پھریں گے!" چن کائی پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان چنچنایا۔

"چپ رہ!" بغورچی شامان نے چن کائی کو ڈانٹ دیا۔

اسی وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ سپاہی دوڑتے ہوئے اس طرف بڑھ رہے ہوں۔ میں نے اور زور سے چیخنا شروع کر دیا لیکن اسی وقت چن کائی دوڑتا ہوا غار کے دوسرے دہانے تک پہنچ گیا۔

"وہ رہے، وہ بھاگے جا رہے ہیں۔" کوئی پیچھے سے چیخا۔

"ان پر تیر چلاؤ!" ایک آواز سنائی دی۔ میں اس آواز کو سن کر چونک پڑا کیونکہ یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی مگر اس وقت مجھے ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہ آسکا کہ میں نے وہ آواز کہاں سنی تھی۔

شاید تیر چلایا گیا تھا کیونکہ میں نے اس کی سنسناہٹ سنی تھی لیکن اس وقت تک چن کائی غار کے دہانے سے نکل چکا تھا۔ یہ پہاڑ کی وہ سمت تھی جدھر پہاڑ کے دامن میں چنگیز خاں دفن تھا اور جہاں سولدائیں (روحیں) منڈلاتی تھیں۔ بغورچی شامان اسی طرف نشیب میں بھاگ رہا تھا۔

"شامان..... اے شامان! راستہ بدل دے۔" اچانک چن کائی چیخ پڑا۔

"کیوں؟" بغورچی بھاگتے ہوئے چیخا۔

"مجھے خوف آتا ہے۔ وہاں سولدائیں رہتی ہیں۔" چن کائی نے چیخ کر جواب دیا۔

بغورچی شامان نہ رکا مگر چن کائی کے قدم آہستہ ہونے لگے۔ بھلا وہ چنگیز خاں کے مدفن کی جانب کیسے جا سکتا تھا اس کی دانست میں آگے بھی موت ہی تھی۔

"ٹھہر جا!" معاً عقب سے ایک بلند آواز سنائی دی۔

اس آواز نے تازیانے کا کام دیا۔ چن کائی ایک بار پھر تیزی سے نشیب میں اترنے لگا۔

"ٹھہر جا! ورنہ میں تجھے تیرے چھیدوں گا۔" یہ آواز یقیناً ان سپاہیوں میں سے کسی کی تھی جو تعاقب کر رہے تھے۔

میں نے مڑ کر سپاہی کی طرف دیکھا۔ وہ بلندی پر تھا اور تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو اور سپاہی نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کمان پر تیر چڑھا لیا تھا۔ یہ دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی اگر تیر چلایا جاتا تو میں

ہی اس کا نشانہ بنتا کیونکہ میرے جسم نے چن کائی کے جسم کو تقریباً ڈھانپ رکھا تھا۔ نہ جانے تیر چلانے والے کے ذہن میں یہ بات تھی بھی یا نہیں!

میرے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اس لیے میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ چن کائی نے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس طرح تھاما ہوا تھا جیسے کسی بوری کو تھامتے ہیں۔ وہ بڑے فیصلہ کن لمحے تھے۔ موت کسی بھی لمحے تیر کی صورت میں میری طرف لپک سکتی تھی۔ اس صورت میں یہ بہت ضروری ہو گیا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح چن کائی کی پشت سے الگ ہو جاؤں تاکہ سپاہی با آسانی اسے اپنے تیروں سے شکار کر لیں۔

دھمکی دینے کے باوجود اب تک تیر نہیں چلایا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ تیر چلانے والا صورت حال کی نزاکت سے آگاہ ہے۔ غالباً" چن کائی بھی یہ بات سمجھ چکا تھا کہ اگر تیر چلایا گیا تو اس کا نشانہ وہ نہیں بلکہ میں بنوں گا۔ شاید اسی لیے اس پر دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور وہ مسلسل تیزی کے ساتھ نشیب میں اترتا جا رہا تھا۔ سپاہی اب تک تعاقب میں تھے۔

بغورچی شامان اب مجھے نیچے کافی فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ وہ پہاڑ کے دامن میں ان پیڑوں تک پہنچ چکا تھا جو چنگیز خاں کے مدفن کی اطراف تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اس پر فوراً عمل بھی کیا تھا۔ میرا منہ چن کائی کی گردن کے قریب تھا۔ میں نے منہ کھولا اور اپنے دانت اس کی گردن کے پچھلے حصے میں گاڑ دیے۔ وہ غالباً اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے مجھے ایک موٹی سی گالی دی اور اسی کے ساتھ میری توقع کے عین مطابق اس کے ہاتھوں کی گرفت میرے جسم پر ڈھیلی ہوتی گئی۔ میں نے کچکچا کر اپنے دانت اس کے گوشت میں اتار دیے اور میرے منہ میں اس کی گردن سے بہنے والا خون بھر گیا۔ وہ بری طرح چیخ پڑا' پھر دوسرے ہی لمحے اس نے مجھے اپنی پشت سے اچھال کر پھینک دیا۔ میرے منہ سے بھی چیخ نکلی اور میرا جسم نشیب میں لڑھکنے لگا۔ میں چھوٹے بڑے پتھروں سے ٹکراتا ہوا نیچے لڑھکتا جا رہا تھا۔ لڑھکتے ہوئے کسی بھی پتھر سے ٹکرا کر میرا سر پاش پاش ہو سکتا تھا مگر اس کے باوجود میں نے اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے۔ اگر میرے ہاتھ پاؤں بندھے نہ ہوتے تو شاید میری زندگی کو اتنا خطرہ نہ ہوتا۔ میں حتی الامکان طور پر اپنے جسم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ناکام تھا۔ پھر شاید وہ کوئی غیبی مدد ہی تھی جس نے مجھے ایک یقینی موت سے بچا لیا تھا۔ میری راہ میں ایک بڑا پتھر حائل ہو گیا تھا۔ اس پتھر سے ٹکرا کر میرے کولہے میں تو ضرور چوٹ آئی تھی لیکن میرا جسم مزید نشیب میں لڑھکنے سے رک گیا تھا۔ میری پشت اس پتھر سے ٹکی ہوئی تھی اور میرا چہرہ بلندی کی طرف تھا۔ میری نگاہ اس لیے فوراً چن کائی پر پڑی جو جھکتا ہوا میری طرف ہی بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اسی وقت میں نے اسے لڑکھڑاتے دیکھا' پھر وہ گر پڑا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی پشت میں دو تیر پیوست تھے۔ میری نگاہ اور اوپر اٹھی تو میں نے مزید بلندی پر سپاہیوں کو دیکھا۔ وہ تعداد میں تین تھے اور نشیب کی طرف آ رہے تھے۔ یقیناً چن کائی انہی کے تیروں کا شکار ہوا تھا۔ چن کائی کا جسم گرنے کے بعد ڈھلان ہونے کے سبب اپنی جگہ نہ رک سکا تھا۔ اس کا جسم لڑھکا مگر کمر میں تیر پیوست ہونے کے سبب رک گیا۔ میں اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ تکلیف اور اذیت سے چیخنے لگا' پھر وہ غالباً دانستہ لڑھکا تاکہ میرے قریب پہنچ سکے۔ شاید وہ یہی چاہتا تھا لیکن یہ کوشش اسے مہنگی پڑی۔ وہ میرے قریب تو پہنچ گیا مگر اس کی پشت میں پیوست تیر اس کے جسم کا بوجھ پڑنے کے سبب سینے کی پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل گئے۔ اس کے منہ سے خون ابل پڑا۔ اس نے مجھے بڑی عجیب سی نگاہ سے دیکھا' پھر اس کے خون آلود ہونٹ حرکت کرنے لگے۔

"بب... بوغاتو... تو نے مجھے... مجھے ہلاک کرا دیا اپنے آپ باپ کو مروا دیا تو نے اپنے" تکلف و اذیت کے سبب اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

"چن کائی! مرنے سے پہلے جان لے کہ تو میرا باپ نہیں تھا۔" میں نے نفرت و حقارت سے اس کی طرف تھوکتے ہوئے کہا۔

"کک کیا؟ تو تجھے کیا تجھے تیری ماں نے۔"

"ہاں مجھے میری ماں نے مرنے سے پہلے بتا دیا تھا کہ تو میرا باپ نہیں تھا۔ میں منگول نہیں اور منگولوں سے نفرت کرتا ہوں۔ تو ظالم تھا کہ میری ماں کو یہاں دشت میں اٹھا لایا تھا اور دیکھ لے کہ تو کتنی ذلیل موت مر رہا ہے۔" میرے لہجے میں انتہائی نفرت تھی۔

اذیت کے باوجود مجھے اس کے چہرے پر حیرت اور دکھ کے آثار نظر آئے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر اسی وقت اس کے منہ سے خون ابل پڑا اور اس کے ہونٹ صرف ہل کر رہ گئے۔

مرنے سے پہلے اسے مزید روحانی اذیت ہو' یہ سوچ کر میں نے کہا۔ سن چن کائی! میں یہاں تیری تلاش میں آنے سے پہلے تیرے بیٹے تموجو کو قتل کر کے آیا تھا۔" یہ کہہ کر میں زور سے ہنس پڑا۔

چن کائی نے غصے سے اپنے ہاتھوں کی دونوں مٹھیاں بھینچ کر اٹھنا چاہا اور اس کا جسم ذرا سے اٹھ کر پھر زمین پر آ رہا' پھر اس کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

چند لمحے بعد ہی سپاہی دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے۔

"کیا یہ ختم ہو گیا؟" ان میں سے ایک نے چن کائی کے جسم کو ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں مر گیا!" میں نے جواب دیا۔

اسی سپاہی نے اپنے دونوں ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ "تم دوسرے کو دیکھو! میں اسے کھولتا ہوں۔"

ان میں سے ہر ایک میرے اقریب رک کر دوسروں کو آگے بڑھنے کے لیے کہنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ ان میں سے کوئی چنگیز خاں کے مدفن کی طرف جانے پر آمادہ نہ ہو گا۔

"یہ جھگڑا چھوڑو اور مجھے کھولو!" میں نے ان سے کہا۔ "وہ بھاگ چکا ہے اور اب تم اس کی گرد بھی نہ پا سکو گے۔"

وہ خود یہی چاہتے تھے کہ انہیں بغورچی شامان کی تلاش میں ادھر نہ جانا پڑے جدھر ان کے خیال میں سولدا میں تھیں۔ انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھتے ہوئے مجھے اپنے کولھے میں تکلیف محسوس ہوئی تھی لیکن وہ اتنی نہیں تھی کہ میں برداشت نہ کر سکتا۔

"کیا تم لوگ منگسار کے ساتھ یہاں آئے ہو؟" میں نے تصدیق کی خاطر ایک سپاہی سے پوچھا اور ان کے ہمراہ پہاڑ کی دوسری جانب اترنے کے لیے پہاڑ پر چڑھنے لگا کیونکہ اس طرف سے تو نیچے اترنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ادھر چنگیز خان کا مدفن تھا۔

ایک سپاہی نے میری بات کا جواب اثبات میں دیا۔

"کیا تو اس وقت بھی منگسار کے ساتھ تھا جب راستے میں ایک سولدہ نظر آئی تھی اور سب بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟" میں نے اس سپاہی سے سوال کیا جس نے پہلے جواب دیا تھا۔

"ہاں!" اس بار بھی اس سپاہی نے اثبات میں جواب دیا۔

"تو کیا تم لوگ راستے ہی سے دوبارہ اس طرف پلٹ آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں!" سپاہی بولا۔ "ہم بستی تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں منگسار کو ایک بڑی ڈاڑھی والا مسلمان عالم ملا تھا۔ اس کے کہنے پر اور اسی سے بات کر کے منگسار دوبارہ ادھر آیا تھا۔"

"مسلمان عالم؟" میں بڑبڑایا۔

"ہاں مسلمان عالم!" سپاہی نے کہا۔ "وہ ہمارے ہی ساتھ تھا اور ہمارے ہی ساتھ تیری تلاش میں اس غار تک آیا تھا جہاں سے تجھے اٹھا کر چن کائی بھاگا تھا۔"

"سپاہی کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھے پہچانتا ہے مگر اس وقت میرا ذہن مسلمان عالم کے مسئلے میں الجھا ہوا تھا آخر وہ کون ہو سکتا تھا؟"

"کیا تو اس مسلمان عالم کو جانتا ہے؟" میں نے

سپاہی سے دریافت کیا۔

"نہیں! میں اسے نہیں جانتا۔ ہاں میں نے اسے برقائی خاں کے پورتوں کی طرف آتے جاتے دیکھا ہے۔ وہ شاید اسی کے ساتھ آیا ہے۔" سپاہی نے بتایا۔

"ابو انصار!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کہیں وہ ابو انصار ہی تو نہیں؟ میں نے سوچا۔ برقائی خان کے ساتھ اور کون مسلمان عالم ہو سکتا تھا!

جب مجھے باتو خاں نے ملکہ روسودان کے پاس ایک پیغام دے کر قصبک بھیجا تھا تو ابو نصار مجھے قفقاز میں ملا تھا۔ اس کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ اگر وہ برقائی خاں کے ساتھ قراقرم آیا تھا تو یہ میرے لیے خوش نصیبی کی بات تھی۔

میں ابو نصار ہی کے بارے میں سوچتا ہوا پہلے پہاڑ پر پہنچا' اور پھر دوسری جانب سپاہیوں کے ہمراہ نشیب میں اترنے لگا۔ ابھی ہم نے نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کچھ سپاہی اوپر چڑھتے ہوئے نظر آئے۔ وہ ہمیں نیچے اترتے ہوئے دیکھ کر رک گئے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب ان سپاہیوں کی صورتیں واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ صرف ان کے جسموں پر موجود لباس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ سپاہی تھے۔ فاصلہ کچھ اور کم ہوا تو انہی سپاہیوں کے درمیان مجھے ایک شخص ایسا بھی نظر آیا جس کے جسم پر سپاہیوں جیسا لباس نہیں تھا۔ میں اس شخص کا حلیہ دیکھ کر چونکا۔ اس شخص کے جسم پر ڈھیلا ڈھیلا سا لبادہ تھا اور سر پر بڑا سا پگڑ بندھا ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ابو نصار ہی ہو سکتا تھا۔ میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا اور میری رفتار میں تیزی آ گئی۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ ابو نصار ہی تھا جس نے مجھے قریب آتے دیکھ کر اپنے دونوں بازو پھیلا دیے تھے جیسے مجھے سینے سے لگا لینا چاہتا ہو۔ اس کے قریب ہی بوڑھا منگسار کھڑا ہوا تھا جس کے چہرے پر خجالت اور خوشی کے ملے جلے اثرات تھے خجالت غالباً مجھے راستے میں چھوڑ کر بھاگ جانے کے سبب تھی اور خوشی مجھے دوبارہ پا لینے کی!

میں نے بھی ابو نصار کے قریب پہنچ کر اپنے بازو پھیلا دیے' اور پھر اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی کی پناہ میں پہنچ گیا ہوں۔ ساری بلائیں اور سارے دکھ جیسے مجھ سے دور ہو گئے ہیں۔ مجھے اس کے سینے سے لگ کر عجیب سی راحت اور خوشی محسوس ہوئی حالانکہ میری اس کی ملاقات اور آشنائی زیادہ قدیم نہیں تھا۔

"بوغا! تجھے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔" اس کی نرم و شیریں آواز سنائی دی اور اس نے گرمجوشی سے مجھے بھینچ لیا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ ابو نصار ایک طرح سے میرا نجات دہندہ ثابت ہوا تھا۔ اگر وہ میری تلاش میں منگسار سے نہ ٹکرا جاتا تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا!

واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ ابو نصار کو جب پتا چلا کہ میں قراقرم ہی میں ہوں تو اسے مجھے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ میری تلاش میں سرقوشنی بیگی کے محل تک جا پہنچا۔ وہاں اسے پتا چلا کہ میں بغورچی شامان اور چن کالی کی تلاش میں گیا ہوں۔ وہ چن کالی کے یورت پہنچا اور معلوم ہوا کہ میں منگسار کے ہمراہ طاقت کے پہاڑ بور خان قالدون کے لیے روانہ ہو چکا ہوں۔ اسی دوران میں اسے یہ احساس ہو چکا تھا کہ مجھے کوئی خطرہ بھی پیش آ سکتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہو چکا تا کہ میں نے تموجو کو قتل کر دیا ہے۔ وہ یہ سوچ کر بور خان قالدون کی طرف چلا مگر ابھی بستی سے نکلا ہی تھا کہ اسے منگسار مل گیا۔ منگسار سے اسے میرے بارے میں معلوم ہوا وہ منگسار کی بات سن کر مزید فکر مند ہو گیا۔ وہ سولدہ کے معاملے کو بغورچی شامان کی کوئی چال سمجھا تھا۔ اس نے منگسار کو احساس دلایا کہ میں خطرے میں ہوں اور اسے فوراً اپنے سپاہیوں کے ہمراہ میری مدد کو پہنچنا چاہیے۔ منگسار کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ بور خان قالدون کی طرف لوٹنے پر فوراً آمادہ ہو گیا۔

میں ابو نصار' منگسار اور سپاہیوں کے ہمراہ باتیں

کرتا ہوا پہاڑ سے اتر آیا میرا گھوڑا اسی جگہ بندھا ہوا ملا جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔

ہم سب گھوڑوں پر سوار ہوئے اور بستی کی طرف چل دیے۔ چن کائی کے بے گور و کفن لاش وہاں اسی حال میں چھوڑ دی گئی تھی۔ نہ تو اسے سپاہیوں نے اٹھانا چاہا تھا اور نہ میں نے انہیں ایسا کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے اگر مجھے کوئی دکھ تھا تو صرف یہ کہ بغورچی شامان زندہ بچ گیا تھا' بغورچی شامان' میرا جانی دشمن جو کسی بھی وقت میرے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ **منگسار** کو سپاہیوں سے علم ہو چکا تھا کہ بغورچی شامان زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن نہ تو سپاہی اس پر آمادہ ہو سکتے تھے کہ اس طرف جانے کی ہمت کرتے جدھر وہ فرار ہوا تھا اور نہ خود **منگسار** میں اتنی ہمت تھی کہ ادھر کا قصد کر سکتا۔ یہ بات میں نے محسوس کر لی تھی اسی لیے جب **منگسار**' بغورچی شامان کے ذکر کو سرسری طور پر ٹال گیا تھا تو میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔

ہمارے گھوڑے بستی میں داخل ہوئے تو میں نے اپنے گھوڑے کو ابو نصار کے گھوڑے سے قریب کر لیا' پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"اے ابو نصار! کیا تو میرے ساتھ نہ چلے گا؟"

"کہاں؟" ابو نصار نے اپنی شفیق آواز میں پوچھا۔

"سرقوشنی بیگی کے محل ..... جہاں میں رہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

ابو نصار ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ **منگسار** اور اس کے سپاہی رخصت ہو گئے۔

ابھی ہم محل نہ پہنچ پائے تھے کہ کچھ گھوڑ سواروں کو بستی میں داخل ہوتے دیکھا جن کے درمیان ایک گھوڑے پر عجیب الخلقت سا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس شخص کے بال عورتوں کی طرح اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے' جسم پر ڈھیلا سا پیلا لبادہ تھا اور سخت سردی کے باوجود وہ ننگے پاؤں تھا۔ وہ خاصا فربہ اور دراز قد دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اور ابو نصار نے ان لوگوں کو دیکھ کر اپنے گھوڑے روک لیے۔

"اے ابو نصار! معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دور دراز کا سفر لے کر کے آ رہے ہیں۔" میں نے قیاس آرائی کی "ان کے چہروں اور لباس پر گرد جمی ہوئی ہے لیکن ان گھوڑ سواروں کے درمیان وہ موٹا شخص کون ہے؟ یہ دشت کا باشندہ تو معلوم نہیں ہوتا!"

"تو ٹھیک کہتا ہے بوغا!" ابو نصار نے کہا۔ "یہ شخص اپنے لباس سے مجھے کوئی عیسائی راہب معلوم ہوتا ہے۔ آ' معلوم کریں کہ یہ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر ابو نصار نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور میں نے بھی اسی طرف اپنا گھوڑا بڑھایا۔

میں اور ابو نصار ان گھوڑ سواروں کے قریب پہنچ کر ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے' پھر ابو نصار ہی نے ایک سپاہی کو مخاطب کیا۔

"تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو اور کدھر کا قصد ہے؟"

"ہم مغربی دشت سے آئے ہیں اور ہمیں سائیں خاں نے بھیجا ہے۔" سپاہی نے جواب دیا۔

ابو نصار نے جب سپاہی سے عیسائی راہب کے بارے میں پوچھا تو بڑی عجیب باتیں معلوم ہوئیں۔ اس عیسائی راہب کا نام ولیم تھا اور اسے فرانس کے شاہ لوئی نے بھیجا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کے پاس خاقان منگو کے حضور پیش کرنے کو کوئی نذرانہ نہیں تھا۔ نہ وہ شاہ لوئی کا سفیر تھا اور نہ کوئی تاجر! پھر اسے کیوں بھیجا گیا تھا' یہ ایک معمہ تھا۔

سپاہی کی اطلاع کے مطابق پہلے راہب ولیم باتو خاں کے بیٹے سرتاک سے ملا تھا جس نے اسے اپنے باپ کے پاس بھیج دیا تھا۔ وہ منگولوں کے لیے سربمہر خطوط تو لایا تھا مگر تحائف نہیں۔ جب اسے باتو خاں کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے منگولوں کے درمیان رہنے کی اجازت چاہی باتو خاں نے اجازت دینے سے انکار کرتے ہوئے حکم دیا کہ جب تک وہ منگولوں کے حضور میں حاضر نہ ہو لے' اسے اجازت نہیں مل سکتی۔ باتو خاں نے اب اسے سپاہیوں کے ایک دستے کی حفاظت میں نئے خاقان کے پاس بھیجا

تھا۔

یہ تمام معلومات حاصل کر کے ابو نصار میرے ساتھ چل دیا۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے آثار تھے۔

"تو کس سوچ میں پڑ گیا ابو نصار؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ شخص بہت گہرا معلوم ہوتا ہے اور خطرناک بھی!" اس نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"تو اس طرح کچھ نہیں سمجھ سکے گا۔" وہ طویل سانس لے کر بولا۔ محل میں چل کر میں شاید تجھے سمجھا سکوں۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

بقیہ راستے میں ابو نصار کسی سوچ میں ڈوبا رہا۔ میں نے بھی پھر اسے مخاطب نہیں کیا لیکن اس کی پریشانی دیکھ کر میں بھی الجھ گیا تھا۔ اس نے راہب ولیم کے بارے میں نہ جانے کیسے سمجھ لیا تھا کہ وہ خطرناک ہے حالانکہ معلوم یہی ہوتا تھا کہ راہب ولیم کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا ہم محل میں پہنچ گئے۔ میں ابو نصار کو اپنے کمرے میں لے گیا اور اسے احترام و عقیدت کے ساتھ اپنے بستر پر بٹھایا' پھر بولا۔ "بول تو کیا پئے گا' شراب یا گھوڑی کا دودھ؟"

"شراب پینا میرے مذہب میں حرام ہے اور گھوڑی کا دودھ پینے کو اس وقت میرا جی نہیں چاہ رہا۔" ابو نصار نے سنجیدگی سے کہا' پھر چند لمحے توقف کے بعد مدھم لہجے میں بولا۔ "بوغا! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو سرقوتنی بیگی اور نئے خاقان منگو خاں کے بہت قریب ہے۔ کیا تو میرے لیے ایک کام انجام دے سکتا ہے؟" یہ کہہ کر اس نے اپنی بڑی بڑی روشن آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔ ان آنکھوں میں محبت و خلوص بھی تھا' اپنائیت بھی اور ایک التجا بھی۔

"میں بھلا ان آنکھوں کی التجا کیسے ٹھکرا دیتا۔ میں فوراً" بغیر کچھ سوچے سمجھے بولا۔ "اگر میں تیرے کسی کام آسکا تو اسے اپنے لیے عزت سمجھوں گا۔"

"مجھے تجھ سے یہی توقع تھی۔" ابو نصار کے چہرے سے جیسے غور و فکر کے بادل چھٹ گئے۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "جب وہ راہب خاقان کے حضور پیش ہو تو اس وقت تجھے بھی وہاں ہونا چاہیے۔ راہب اور خاقان کے درمیان جو گفتگو ہو تو دھیان سے سننا اور یاد رکھنا۔ میں بعد میں تجھ سے معلوم کر لوں گا کہ کیا گفتگو ہوئی تھی!"

مجھے ابو نصار کی بات بڑی عجیب سی لگی۔ وہ آخر ایسا کیوں چاہتا تھا؟ میں نے سوچا مگر اپنی زبان پر یہ سوال لانے کے بجائے بولا۔ "تو نے کہا تھا کہ محل پہنچ کر مجھے بتائے گا کہ تو نے اس راہب کو گہرا اور خطرناک کیوں کہا تھا!"

ابو نصار نے ایک طویل سانس لیا' پھر بولا۔ "میں نے یہ اس لیے کہا کہ جب کوئی شخص اپنے ملک کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک جاتا ہے تو اس کے کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ ان اسباب میں سے عموماً" تجارت' سیاحت اور سفارت اہم ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ اسباب ہو سکتے ہیں جن میں ایک سبب جاسوسی ہے۔ یہ تو ظاہر ہو چکا ہے کہ راہب ولیم نہ تو سفیر بن کر آیا ہے نہ تاجر اور سیاحت بھی اس کا مقصد نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ شاہ لوئی کی جانب سے آیا ہے۔ اس صورت میں اس کا مقصد صرف جاسوسی ہی ہو سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر ابو نصار چند لمحوں کو خاموش ہوا تو میں نے جاسوسی کی وضاحت چاہی۔

"وہ منگولوں کی قوت و طاقت کا اندازہ لگانے آیا ہے اور غالباً" یہ جائزہ لینے بھی کہ شاہ لوئی' منگولوں کو اپنا دوست بنا کر ان سے کوئی کام لے سکتا ہے' انہیں اپنے اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے یا نہیں! اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اہم معلومات بحیثیت جاسوسی حاصل کی جا سکتی ہیں۔" ابو نصار نے وضاحت کی۔

"مگر شاہ لوئی نے ایسا کیوں کیا؟ یہ کام وہ اپنے کسی سفیر سے بھی تو لے سکتا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "یا وہ راہب ولیم ہی کو سفیر بنا کر بھیج سکتا تھا اور ساتھ ہی اس

کے سپرد یہ کام بھی کر سکتا تھا کہ وہ منگولوں کی جاسوسی کرے۔"

"جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' اس کا صرف ایک ہی سبب ہو سکتا ہے کہ شاہ لوئی اب یہاں اپنے کسی آدمی کو سفیر بنا کر نہیں بھیجنا چاہتا تاکہ اس غلط فہمی کا اعادہ نہ ہو جو پہلے ہو چکی ہے۔" ابو نصار نے سوچتے ہوئے میری بات کا جواب دیا۔

اس کی بات اب بھی میری سمجھ میں نہ آسکی تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی وضاحت چاہتا' مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کچھ اور بھی کہنے والا ہو۔ میں اس لیے خاموش ہی رہا۔

چند لمحوں بعد اس کی آواز ابھری۔ شاہ لوئی نے گزشتہ سال اپنے ایک سفیر انڈریو کو قراقرم بھیجا تھا جو اس کی طرف سے خاقان کے لیے ایک سرخ کلیسائی خیمہ بطور تحفہ لایا تھا۔ ہوا یوں کہ وہ سرخ خیمہ اوغول غائمش کے ہاتھ لگا جو اس وقت قراقرم میں اپنے برسر اقتدار ہونے کے دعویدار تھی۔ اوغول غائمش نے اسے تحفے کو فرانسیسی بادشاہ کا خراج اطاعت سمجھا اور اپنے حاشیہ برداروں سے کہا کہ فرانس کے بادشاہ نے اس کی اطاعت کے اظہار میں تحفہ بھیجا ہے۔ غالباً" اسی لیے اب شاہ لوئی اپنے کسی آدمی کو سفیر بنا کر نہیں بھیجنا چاہتا۔"

ابو نصار کی بات میری سمجھ میں آگئی۔ مجھے اس کے باخبر ہونے پر حیرت تھی کہ وہ حالات پر پوری نظر رکھتا تھا لیکن یہ بات سمجھنے کے باوجود اب تک میرے ذہن میں یہ بات نہیں آسکی تھی کہ راہب ولیم خطرناک کس طرح تھا اور یہ خطرہ کس لیے تھا کہ یہی بات میری زبان پر بھی آگئی۔

"خطرے کی نوعیت ذرا مختلف ہے جسے میں ہی بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر ابو نصار خاموش ہو گیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کوئی بات چھپانا چاہتا ہے یہ سوچ کر میں بولا۔ "اے ابو نصار! یقیناً" تو مجھ سے زیادہ سمجھ رکھتا ہے اور مجھ سے زیادہ جانتا ہے لیکن اگر تو اسے خطرے سے مجھے بھی آگاہ کر دیتا تو میں تیرا شکر گزار ہوتا۔"

"تیرے لیے یہ جاننا کچھ زیادہ اہم نہیں بوغا!" اس نے جواب دیا' پھر ذرا توقف کے بعد کچھ سوچ کر بولا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ تو میرے ساتھ مخلص ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ تجھے وہ بات بتا دوں جو میرے دل میں ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر چند لمحے خاموش رہا' پھر کہا۔

"سن! اس میں کوئی شک نہیں اس وقت منگولوں کی بڑھتی ہوئی بے پناہ طاقت سے ساری دنیا باخبر ہو چکی ہے۔ تو نے شاید محسوس نہیں کیا کہ اس وقت دنیا کی مختلف قوموں اور ملکوں کے بے شمار افراد یہاں قراقرم میں موجود ہیں۔ ان میں ارمنی ہیں' مشینری ہیں' روسی ہیں' ہنگروی ہیں' ختائی (چینی) ہیں' عربی ہیں اور ان کے علاوہ بہت سے ہیں' ان میں کچھ سفیر ہیں' کچھ تاجر ہیں کچھ سیاح ہیں اور کچھ اپنے اپنے مزاہب کے مبلغ ہیں لیکن انہی میں سے جاسوس بھی ہیں جو اپنے اپنے ملکوں کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔ اس وقت دنیا کی بڑی طاقتیں یہ چاہتی ہیں کہ یا تو وہ منگولوں کو اپنا دوست بنا کر رکھیں یا اپنا حلیف! اور دلچسپ بات یہ ہے کہ منگول خود کو سب سے برتر اور صرف اپنے آپ ہی کو ساری دنیا کا واحد حکمراں تصور کرتے ہیں۔ ان باتوں کا علم اب دنیا کی دوسری قوموں کو بھی ہوتا جا رہا ہے اور وہ اس خطرے کو سمجھنے لگی ہیں۔ دنیا میں اس وقت منگولوں کے علاوہ دو بڑی طاقتیں ہیں۔ ایک بڑی طاقت عیسائیوں کی ہے اور دوسری مسلمانوں کی! صورت حال یہ ہے کہ ان دونوں بڑی طاقتوں میں سے منگولوں نے براہ راست یا بالواسطہ جس کا ساتھ دیا' وہی فتح مند ہو گی۔ یہ دونوں ہی طاقتیں اس وقت برسرپیکار ہیں۔ شاہ لوئی عیسائیوں کی طاقت کا نمائندہ ہے اور خلیفہ بغداد مسلمانوں کی طاقت کا! تو میری باتیں سمجھ رہا ہے؟" ابو نصار نے گفتگو کرتے کرتے مجھے کچھ سوچتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"ہاں اے ابو نصار! تیری باتیں بہت واضح اور صاف ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ دراصل بغداد

کے ذکر پر مجھے اپنی ماں کے وہ آخری الفاظ یاد آ گئے تھے جو اس نے میرے باپ کے بارے میں کہے تھے کہ وہ بغداد میں ہے۔ میں اسی لیے سوچ میں گم ہو گیا تھا اور اس بات کو ابو نصار نے محسوس کر لیا تھا۔

مجھے اپنی طرف پوری طرح متوجہ پا کر ابو نصار پھر بولنے لگا۔

"تو میں تجھے بتا رہا تھا کہ اس وقت عیسائی اور مسلمان برسرِ پیکار ہیں۔ بیت المقدس مسلمانوں کے پاس ہے جس پر عیسائیوں کا دانت لگا ہوا ہے۔ وہ بیت المقدس کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے۔ ان حالات میں شاہ لوئی کی طرف سے یہاں راہب ولیم کی آمد کے کیا معنی ہو سکتے ہیں' اب تو اسے بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے کیونکہ میں نے تجھے حالات سے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔ اب تو بتا کیا سمجھا؟"

"تیرے کہنے کے مطابق اس وقت دنیا میں تین بڑی طاقتیں ہیں' عیسائی مسلمان اور منگول! تیسری طاقت یعنی منگول ابھی تک غیر جانبدار ہیں۔ ان حالات میں دونوں بڑی طاقتوں کی یہ خواہش ہو گی کہ تیسری طاقت ان کا ساتھ دے۔" میں نے سوچ سمجھ کر جواب دیا' پھر اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ "راہب ولیم کی آمد کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی طرح منگولوں کو اپنا ہمنوا بنا کر عیسائیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لے۔"

میرا جواب سن کر ابو نصار کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ بولا۔ "تو عام نوجوانوں کی نسبت زیادہ ذہین اور سمجھدار ہے بوغا! تو نے بالکل صحیح نتیجہ نکالا۔"

میں جانتا تھا کہ ابو نصار کی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہو سکتی تھیں اور اب یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ اس نے راہب ولیم کو خطرناک کیوں کہا تھا! ظاہر ہے کہ مجھے عیسائیوں سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی! اگر میرے دل میں کسی کے لیے نرم گوشہ ہو سکتا تھا تو وہ مسلمان ہی ہو سکتے تھے کیونکہ میری رگوں میں ایک مسلمان ہی کا خون تو دوڑ رہا تھا جس سے ابو نصار لاعلم تھا۔ یہ سوچ کر میں نے ابو نصار سے کہا۔ "اے ابو نصار یہ بھی تو ممکن ہے کہ راہب ولیم کو یہاں نہ ٹکنے دیا جائے!"

میری بات سن کر وہ چونک پڑا اور بولا۔ "مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟" اس کے انداز سے یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ میری زبان سے یہ بات سن کر حیران ہوا ہے۔

"یہ کام تو مجھ پر چھوڑ دے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

ابو نصار مجھے عجیب سی نگاہ سے دیکھنے لگا' پھر غیر یقینی سے لہجے میں بولا۔ "کیا کیا تو ایسا کر سکے گا بوغا؟ اور..... اور تو ایسا کرنے پر کیوں آمادہ ہے؟" تیرا تو اس میں کوئی بھی فائدہ نہیں۔"

"میں ایسا اس لیے کروں گا ابو نصار کہ تو بھی یہی چاہتا ہے۔" میں نے پرجوش سے لہجے میں کہا۔ "رہی فائدے کی بات تو میرے لیے اس سے بڑا کیا فائدہ ہو گا کہ مجھے تیری خوشنودی حاصل ہو جائے۔"

"بوغا!" فرطِ جذبات سے ابو نصار کی آواز کانپنے لگی۔

اسی وقت کمرے کے دروازے پر کسی کی آہٹ سنائی دی۔ ابو نصار کچھ کہتے کہتے رک گیا اور میں بھی دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

آنے والا سرتوشنی بیگی کا خادم تھا۔

"اے بوغا! تجھے الاؤ کی رکھوالی یاد کر رہی ہے۔" خادم نے ادب سے جھک کر کہا۔

"وہ اس وقت کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اس کمرے میں ہے جہاں مہمانوں اور اجنبیوں سے ملتی ہے۔" خادم نے جواب دیا۔

ابھی ابھی کچھ دیر قبل راہب ولیم کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ وہ بھی نووارد تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں وہی تو سرتوشنی بیگی سے ملنے نہیں پہنچ گیا؟ مگر اسے قراقرم آئے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی! یہ سوچ کر میں نے خادم سے پوچھا۔ "کیا اس کے پاس کوئی مہمان بیٹھا ہے؟"

"ہاں!" خادم نے جواب دیا۔ "وہ ایک فرانسیسی ہے۔"

خادم کا جواب سن کر میں چونک پڑا اور ابو نصار کو بھی میں نے چونکتے دیکھا۔

"تو عظیم بیگی سے کہہ دے کہ میں ابھی آتا
ں۔" میں نے خادم سے کہا اور خادم کمرے سے
ل گیا۔

"تو بیگی کے پاس جا!" ابونصار بولا۔ میں چلتا ہوں'
ہ سے جلد ہی ملنے کی کوشش کروں گا۔ یہ بہت اچھا
را کہ بیگی نے تجھے خود ہی مہمان کے سامنے بلوا لیا۔
ں طرح تو ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکے
ا۔ میں یہاں ٹھہر کر تیرا انتظار کرتا مگر پتا نہیں تجھے
اں کتنی دیر لگے!" یہ کہہ کر ابونصار اٹھ کھڑا ہوا۔

حالانکہ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ ابونصار چلا جائے
کر یہ اسے روکنے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں کچھ نہ
لا۔

ابونصار چلا گیا اور میں کمرہ نشست کی طرف بڑھ گیا
ں کے دروازے پر موجود دو کلہاڑے بردار اس بات
اثبوت تھے کہ سرقوشنی بیگی اندر موجود ہے۔

میں قریب پہنچا تو کلہاڑے بردار ادب سے الگ
ٹ گئے اور میں اندر چلا گیا۔ میری پہلی نظر اجنبی پر
ی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ راہب ولیم
میں تھا کیونکہ میں اسے دیکھ چکا تھا۔ جو شخص
سرقوشنی بیگی کے سامنے ادب سے بیٹھا تھا' وہ
ہرے بدن کا تھا اور دراز قد بھی معلوم ہوتا تھا۔ میں
سرقوشنی بیگی کے مقابل پہنچ کر تین بار جھکا اور احتراماً
ی سمور کی ٹوپی اتار کر ادب سے مہمان کے قریب بیٹھ
گیا۔

"تو کب لوٹا بوغا؟" سرقوشنی بیگی نے پوچھا۔

"ابھی کچھ دیر ہوئی ہے اے عظیم بیگی!" میں نے
واب دیا۔

"خیر باقی باتیں بعد میں ہوں گی پہلے تو اس شخص کو
یھ اور اپنے علم کے ذریعے معلوم کر کہ یہ جو دعوی کرتا
ہے کیا اس میں سچا ہے؟" سرقوشنی بیگی نے حکم دیا۔

میں چکرا کر رہ گیا۔ میں بالکل لاعلم تھا کہ وہ شخص
ون تھا اور سرقوشنی بیگی کے پاس کیوں آیا تھا! اس
ے علاوہ یہ کہ اس نے کیا دعوی کیا تھا جس کی سچائی کا
اندازہ لگانا تھا!

"یہ شخص فرانس کے ایک بڑے شہر سے آیا ہے۔" میرے منہ سے یوں ہی نکل گیا۔

"ہاں میں فرانس کے شہر پیرس ہی سے آیا ہوں اور پہلے بھی ایک بار یہاں آ چکا ہوں۔ مجھ سا بڑا سنار پورے پیرس میں کوئی نہیں۔" معاً اجنبی نے کہا اور میری مشکل آسان کر دی۔

"تو چپ رہ اے اجنبی! بوغا تیرے بغیر کچھ بتائے سب کچھ جانتا ہے۔" سرقوشنی بیگی نے اجنبی کو سختی سے ڈانٹ دیا۔ "بوغا' نیلے جاودانی آسمان کی سرگوشیاں بھی سن لیتا ہے۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے سرقوشنی بیگی کے لہجے میں تفاخر تھا۔

سرقوشنی بیگی کی ڈانٹ سن کر اجنبی خوفزدہ سا نظر آنے لگا اور اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

میں سوچنے لگا کہ ایک سنار کیا دعوی کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ دعوی کوئی انوکھا اور عجیب زیور بنانے سے متعلق ہی ہو سکتا تھا۔ وہ ایک بڑے ملک کے بڑے شہر سے آیا تھا اور زیور بنانا اس کا پیشہ تھا' پھر وہ کوئی ایسی بات کیوں کرتا یا کہتا جس پر اسے قدرت نہ ہو! ذلیل و رسوا ہونا کون پسند کرتا ہے! البتہ ایک بات میرے ذہن میں رہ رہ کر کھٹک رہی تھی کہ وہ اجنبی فرانس سے آیا تھا اور راہب ولیم کا تعلق بھی وہیں سے تھا۔ کیا ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی رشتہ تھا یا یہ محض اتفاق تھا! بہرحال مجھے محتاط رہنا تھا۔

میری آنکھیں بند تھیں اور ذہن سوچنے میں مصروف تھا۔ اس منگول عورت نے خوامخواہ مجھے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ کمرے میں بوجھل سی خاموشی تھی جو میرے اعصاب کو گراں گزرنے لگی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور بولا۔ "اے الاؤ کی رکھوالی یہ اجنبی اپنے دعوے میں سچا ہے۔"

"تو کہتا ہے بوغا تو میں مانے لیتی ہوں حالانکہ میرا خیال مختلف تھا۔" سرقوشنی بیگی نے کہا اور کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے اجنبی کو مخاطب کیا۔ "کیا نام بتایا تھا تو نے اپنا؟"

"بوشیر' اے عظیم بیگی!" اجنبی نے جواب دیا۔

"تو اے بوشیر! تیرا کہنا تھا کہ تو سونے کے درخت بنا سکتا ہے' نقرئی شیر اور سانپ بنا سکتا ہے۔ تو سن کہ میرے پاس اتنا سونا ہے کہ میں تجھ سے کام لے سکوں۔ میری خواہش ہے کہ میں اپنے بڑے بیٹے اور بھورے نمدے کی مسند پر بیٹھنے والے خاقان کو اپنی جانب سے کوئی تحفہ دوں' ایسا تحفہ جو کوئی اور نہ دے سکے۔ اگر تو نے میرا دل خوش کر دیا تو میں تجھے مالا مال کر دوں گی لیکن اگر تو ناکام رہا تو میں تجھے ذلیل و رسوا کر کے قراقرم سے فوراً نکلوا دوں گی۔ بول کیا تو اس شرط پر راضی ہے؟" سرقوشنی بیگی نے بوشیر کو گھورتے ہوئے کہا۔

چند لمحے بوشیر خاموش رہا۔ اس نے کچھ سوچا' پھر بڑے اعتماد سے بولا۔ "اے عظیم بیگی! مجھے تیری ہر شرط منظور ہے۔ یوں بھی تیرا شامان بتا چکا ہے کہ میں اپنے دعوے میں سچا ہوں۔"

"تو وہ بات سن اور غور سے سن جو میں نے ابھی ابھی سوچی ہے۔" سرقوشنی بیگی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ وہ قدرے توقف سے بولی۔ "تو ایک چاندی کا درخت بنا اور درخت کی جڑ کے قریب چار نقرئی شیر بنا۔ ان شیروں کے منہ سے گھوڑیوں کا دودھ ابلے۔ چار طلائی سانپ اس چاندی کے درخت کے شاخوں سے لپٹے ہوں جن میں سے ایک سانپ کے منہ سے شراب بہہ رہی ہو دوسرے سانپ کے منہ سے گھوڑی کا دودھ' تیسرے کے منہ سے شراب عسل اور چوتھے کے منہ سے چاولوں کی شراب! میں یہ درخت اپنے بیٹے کے محل میں' محل کے درمیانی دروازے پر نصب کراؤں گی۔ بتا کیا تو میری باتیں اور خواہشیں اچھی طرح سمجھ گیا۔ اگر تو سمجھ چکا ہے تو میرے سامنے میری خواہشیں دہرا!"

میں نے دیکھا کہ اس دوران میں بوشیر کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور میں بھی فکر مند ہو گیا۔ سرقوشنی بیگی نے جن خواہشوں کا اظہار کیا تھا' وہ معمولی نہیں تھیں۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں بوشیر انکار کر کے مجھے سرقوشنی بیگی کی نگاہ سے نہ گرا دے کیونکہ میں نے بوشیر کے دعوے کی تصدیق میں بیان دیا تھا مگر میرے خدشات غلط نکلے۔

بوشیر نے لفظ بہ لفظ سرقوشنی بیگی کی باتیں دہرا دیں' پھر بولا۔ "اے عظیم بیگی! میں تیری خواہشیں ضرور پوری کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ ذلیل و رسوا نہیں ہوں گا۔"

"تو پھر تو انعام بھی پائے گا۔" سرقوشنی بیگی نے کہا۔ "تو کب سے کام شروع کرے گا؟ تاکہ میں اس سلسلے میں حکم جاری کر دوں کہ تجھے جتنا سونا اور چاندی چاہیے فراہم کیا جائے۔"

"میں کل ہی سے اپنا کام شروع کر دوں گا۔" بوشیر نے جواب دیا۔

اس کے بعد سرقوشنی بیگی نے اسے رخصت کر دیا اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "تو جس غرض سے گیا تھا' کیا کامیاب ہوا؟"

"ہاں اے عظیم بیگی!" میں نے جواب دیا۔ "چن کائی ہلاک ہو گیا مگر بغورچی شامان فرار ہونے میں کامیاب رہا۔"

"کیوں؟" سرقوشنی بیگی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "کیا منگسار واقعی بوڑھا اور نااہل ہو چکا ہے جو اس نے بغورچی شامان کو فرار ہو جانے دیا!"

"اس میں منگسار کا کوئی قصور نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "بغورچی شامان صنوبروں کے ان درختوں میں جا کر روپوش ہو گیا تھا جہاں جد عظیم کا مدفن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرف جانے کی ہمت کون کر سکتا ہے!"

میری بات سن کر سرقوشنی بیگی کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے اور وہ بڑبڑائی۔ "مگر اس نے ادھر جانے کی ہمت کیسے کی؟ وہاں تو سولدائیں منڈلاتی ہیں۔"

"اے عظیم بیگی! تو نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ وہ شامان ہے اور شیطانی قوتوں کا مالک ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں تو ٹھیک کہتا ہے۔" سرقوشنی بیگی بولی۔

میں نے سوچا کہ موقع ہے' میں راہب ولیم کے بارے میں پہلے ہی اس کے کان بھر دوں مگر میں نے قبل از وقت کوئی بات کرنی مناسب نہ سمجھی۔

کچھ دیر بعد سرقوشنی بیگی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ محل کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی اور میں اپنے کمرے میں! کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے خادم سے کھانا منگوایا اور اس دوران میں فیصلہ کیا کہ مجھے فوری طور پر سولدہ سے جا کر ملنا چاہیے۔ وہ اپنی ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پہاڑی کے اسی غار میں مل جائے گی جس کے نزدیک نظر آئی تھی اور جہاں سے وہ رخصت ہوئی تھی۔ اس نے جانے سے پہلے کہا تھا کہ وہ میری خبر گیری کے لیے آتی رہے گی۔ اسے مجھ سے ملے بغیر یقیناً واپسی کا ارادہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

کھانے سے فراغت پا کر میں نے گھوڑی کا دودھ پیا اور محل کے اصطبل کی جانب بڑھ گیا۔ اصطبل سے گھوڑا لے کر مجھے محل سے نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

میں ایک بار پھر بستی سے باہر جا رہا تھا اور میرے آنکھوں میں سولدہ کا حسین چہرہ گھوم رہا تھا۔ سولدہ وہ واحد ہستی تھی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ اگر وہ سولدہ نہ ہوتی تو میں یقیناً" اسے ہی اپنی بیوی بنانا پسند کرتا۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر میرے دل میں ٹیس سی اٹھتی تھی کہ میں اسے سولدہ ہونے کے سبب کبھی نہ اپنا سکوں گا۔

جب تک میں پہاڑ کے قریب نہ پہنچ گیا' میرے ذہن پر اسی کا تصور چھایا رہا۔ وہ پہاڑی ایسی نہیں تھی کہ میں اس پر اپنے گھوڑے کو نہ لے جا سکتا۔ اس کے باوجود میں احتیاطاً گھوڑے سے اتر گیا اور اس کی لگام تھام کر پہاڑی پر چڑھنے لگا کیونکہ بلندی پر چڑھتے ہوئے گھوڑے کا پاؤں پھسل بھی سکتا تھا۔

اس غار کی نشانیاں میرے ذہن میں محفوظ تھیں جہاں سولدہ کو ہونا چاہیے تھا اس لیے میں با آسانی وہاں تک پہنچ گیا۔ میں نے گھوڑے کو غار سے باہر ہی ایک ابھری ہوئے پتھر سے باندھ دیا جو ایک چٹان کا حصہ تھا' اس کے بعد میں غار کے اندر چلا گیا' غار میں داخل ہوتے ہی میں ٹھٹک گیا۔ غار خالی تھا۔ کیا سولدہ چلی گئی؟ میں نے سوچا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں اس کا انتظار کروں یا واپس ہو جاؤں؟ چند ہی لمحوں کے اندر میرے ذہن پر مختلف سوالات نے یورش کر دی۔ اگر سولدہ واپس کسی اور زمانے میں چلی گئی تھی تو اس کی فوری واپسی ممکن نہیں تھی لیکن اگر وہ کہیں قریب ہی گئی تھی اور کسی دوسرے عہد میں نہیں گئی تھی تو اس کی واپسی کے امکانات تھے۔ دونوں ہی باتیں ممکن تھیں۔

غار میں نیم تاریکی تھی لیکن اس کے باوجود مجھے وہاں سولدہ کا عجیب اور پراسرار سامان نظر آ گیا۔ جب سامان پر میری نظر پڑی تو مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ اگر وہ کسی دوسرے زمانے میں چلی جاتی تو اپنا سامان بھی لے جاتی۔ اس کے ساتھ مجھے اس کے دشمنوں کا خیال آیا۔ اگر اس کے دشمن اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں بھی پہنچ گئے ہوں گے اور اسی ہنگامی طور پر فرار اختیار کرنا پڑا ہو گا تو وہ اپنا سامان نہ لے جا سکی ہو گی۔ بہرحال جو بھی تھا' مجھے کچھ دیر وہاں ٹھہر کر اس کا انتظار ضرور کرنا تھا۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھا اور اس کے نرم بستر پر ڈرتے ڈرتے بیٹھ گیا۔ اس کی چیزیں چھوتے ہوئے مجھے کچھ خوف سے محسوس ہوتا تھا۔ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ معاً میری سماعت سے ایک شیر کے

کوئی جلدی نہیں

ایک صاحب سگریٹ پر سگریٹ پیتے چلے جا رہے تھے۔ ایک بزرگ سے نہ رہا گیا۔ وہ ان کے پاس گئے اور بولے۔

"شاید آپ کو پتا نہیں' یہ سگریٹ ایک آہستہ رو زہر ہے۔" وہ صاحب بڑے اطمینان سے ایک لمبا کش لے کر بولے۔

"مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔"

دہاڑنے کی آواز ٹکرائی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ شیر کی دہاڑ غار کے دہانے ہی سے اندر آئی تھی جیسے شیر و ہیں غار کے دہانے پر موجود ہو۔ یہ احساس ہوتے ہیں میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ اگر وہ شیر غار میں گھس آتا تو میرا کیا حال ہوتا! مجھے اعتراف ہے کہ میں گھبرا گیا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال تک نہیں آیا کہ وہاں کبھی میں نے شیر کو نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی کسی سے اس بارے میں سنا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر شیر کی دہاڑ سن کر اٹھتے ہوئے اپنی تلوار نیام سے نکال لی تھی جو اس وقت میرے ہاتھ میں تھی۔

شیر کی دہاڑ ایک دم غائب ہو گئی اور اس کی جگہ کسی کے کھلکھلا کر ہنس پڑنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز نسوانی تھی اور اس آواز کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ سولدہ کے ہنسنے کی آواز تھی۔ سولدہ غار کی طرف آ رہی تھی اور غار کے قریب ہی کہیں شیر موجود تھا۔ میں نے سوچا کہ سولدہ اس بات سے بے خبر ہو گی اور یہ بے خبری اس کے لیے موت کا پیغام بن سکتی تھی۔ مجھے علم نہیں کہ مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ میں غار کے دہانے کی طرف دوڑ پڑا۔

"سولدہ، سولدہ! ہوشیار، خطرہ ہے۔ غار کے قریب ایک شیر موجود ہے۔" میں غار کے دہانے کی طرف دوڑتے ہوئے چیخ پڑا۔

اور پھر میں نے سولدہ کے قہقہوں کی آوازیں سنیں۔ میں نے اسے چند لمحے بعد ہی غار میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ اب بھی زور زور سے ہنس رہی تھی۔ میں نے اپنی تلوار نیام میں رکھ لی۔

میں اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ بہرحال ایک سولدہ تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں اس پر دیوانگی کا دورہ تو نہیں پڑ گیا؟ لیکن کچھ دیر بعد ہی اس کی ہنسی مسکراہٹ میں بدل گئی۔

"تو ڈر گیا تھا نا؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور میرے قریب آ گئی۔

"ڈرنے کی بات ہی ہے۔" میں نے جواب دیا، پھر اسے بتایا۔

"غار کے باہر ایک شیر موجود ہے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے اس کے دہاڑنے کی آواز سنی تھی۔"

"تیرا وہم ہو گا بوغا!" وہ ہنس کر بولی۔ "میں تو خود باہر سے آ رہی ہوں مجھے تو کوئی شیر نظر نہیں آیا۔" اس کا انداز ایسا تھا جیسے میں جھوٹ بول رہا تھا۔

"وہ کہیں چھپ گیا ہو گا، ادھر ادھر چلا گیا ہو گا۔ یقین کر کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔" میں نے اسے یقین دلانا چاہا۔

"اچھا تو بیٹھ تو سہی!" وہ آگے بڑھتے ہوئی بولی اور اسی وقت پہلی بار میری نظر اس چھوٹے سے ڈبے پر پڑی جو وہ اپنے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے تھی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی تو میں بھی اس کے قریب جا بیٹھا۔ میں نے شیر کی طرف سے اس کی غفلت کو محسوس کر کے ایک بار پھر اس سے کہا۔ "تو اتنے سکون اور اطمینان سے آ کر بیٹھ گئی اور وہاں شیر موجود ہے۔" میں نے غار کے دہانے کی طرف انگلی اٹھائی۔

"اب وہ شیر وہاں نہیں ہے، سمجھا!" وہ ہنس کر بولی۔

"تو کیا وہ بھاگ گیا؟" میں نے فوراً پوچھا۔ "تو نے اسے دیکھا تھا؟"

"میں نے اس شیر کو اس میں بند کر دیا ہے۔" سولدہ نے اپنے قریب رکھے ہوئے اس ڈبے کی طرف اشارہ کیا جو کچھ دیر پہلے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی۔

"ناممکن!" میں بولا۔ "میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ تیری بات پر یقین کر لوں۔ بھلا اس چھوٹے سے ڈبے میں شیر کو کیسے بند کیا جا سکتا ہے!"

"یقین کرو بوغا کہ وہ شیر اسی میں بند ہے۔" وہ اپنی بات پر بضد رہی، پھر بولی۔ "مگر تجھے اس طرح یقین نہیں آئے گا۔" یہ کہہ کر اس نے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اچانک میں اچھل پڑا۔ قریب تھا کہ میں اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوتا کہ سولدہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور

دوسرا ہاتھ ڈبے کی جانب بڑھا۔ شیر کی دہاڑ ختم ہو گئی۔

"کیا تو نے وہ کھڑکی بند کر دی جس سے شیر کی دہاڑ سنائی دی تھی؟" میں نے سولدہ سے خوفزدہ سی آواز میں پوچھا۔

"ہاں!" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی، پھر بولی۔ "میں اس ڈبے میں تجھے بھی بند کر سکتی ہوں۔ بول بند ہو گا؟"

"شیر کے ساتھ؟" میں نے سہم کر کہا۔

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔

"ایسی باتیں نہ کر جو مجھے خوفزدہ کر دیں۔ جب میں ڈرنے لگتا ہوں تو پھر تو ہی کہتی ہے کہ تو سولدہ نہیں اور مجھے تجھ سے نہیں ڈرنا چاہیے۔" میں نے ہمت کر کے کہا۔

"تیری ایسی ہی بھولی باتیں سن کر تو میرا دل خوش ہوتا ہے۔ میں نے تجھے اس لیے جان بوجھ کر ڈرایا تھا۔ ہاں! اس میں شیر قید نہیں بلکہ صرف اس کی آواز قید ہے، سمجھ گیا؟" اس نے سمجھانے والے انداز میں بتایا۔

آواز قید ہے؟ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا اور میں نے اس بات کا اعتراف بھی کر لیا۔

"یوں سمجھ کہ جب کوئی بولتا ہے تو اس میں اس کی آواز محفوظ ہو جاتی ہے۔ خواہ وہ انسان کی آواز ہو یا جانور کی یا کوئی اور آواز!" سولدہ نے وضاحت کی۔ "میں نے اس میں شیر کی دہاڑ محفوظ کر لی تھی جو تو نے دوبار سنی اور تو اسے بار بار بھی سن سکتا ہے۔ ایک بات اور بتاؤ کہ تو نے اس وقت جو کچھ چیخ کر کہا تھا، جب میں غار کے اندر آنے والی تھی وہ بھی لفظ بہ لفظ اس میں محفوظ ہے۔"

"یعنی میری میری اپنی آواز؟ تو نے اسے بھی اس میں بند کر لیا؟" میں نے اپنی شدید حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں میں تجھے تیری آواز سنوا سکتی ہوں لیکن اب ذرا نامت! پہلے شیر کی دہاڑ سنائی دے گی، پھر میرے ہنسنے کی آواز، اس کے بعد تیری آواز آئے گی، اس وقت کی آواز جب تو نے مجھے شیر کے خطرے سے آگاہ کیا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں اپنا دل مضبوط کر کے بیٹھا رہا۔ پہلے وہی شیر کی آواز سنائی دی، پھر سولدہ کی ہنسی سنائی دی اور آخر میں میرا کہا ہوا پورا وہی جملہ جو میں نے چیخ کر بولا تھا۔ اس دوران میں جب سولدہ کی ہنسی سنائی دی تو مجھے سخت تعجب ہوا تھا، میں نے سولدہ کی طرف غور سے دیکھا تھا لیکن وہ خاموش رہی تھی۔ جب اس ڈبے سے میری آواز آنے لگی تو میں ایک بار پھر اچھل پڑا تھا۔ مجھے اپنی ہی آواز اجنبی سی لگی تھی جیسے میں نے اپنی آواز پہلی بار سنی ہو۔ وہ میرے لیے بڑا عجیب تجربہ تھا۔ اتنا عجیب اور ناقابل یقین تجربہ کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کے باوجود مجھے اس پر اعتبار نہیں تھا۔

"کیا تو دوبارہ اس میں میرے کہے ہوئے لفظ قید کر سکتی ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"کیوں نہیں!" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تو کچھ بول!" یہ کہہ کر اس نے پھر ڈبے کی طرف اپنا ہاتھ

بڑھایا اور میں اس کی حرکات کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے چند لمحے بعد اپنا ہاتھ ہٹالیا۔ میں اب تک خاموش ہی تھا مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پھر مجھ سے بولنے کو کہا۔

"تو ہی بتا کہ میں کیا بولوں؟" میں نے کہا۔ مجھے یہ سوچ کر عجیب سا احساس ہو رہا تھا کہ میری آواز کو سولدہ اس ڈبے میں قید کر رہی تھی۔

"جو بھی جی میں آئے بول!" سولدہ نے مجھے بولنے پر اکسایا۔

"نہیں! تو اس جادو کے ڈبے کی کھڑکی بند کر دے' میں نہیں بولوں گا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"حالانکہ تو بول رہا ہے۔" یہ کہہ کر سولدہ ہنس پڑی' پھر اس نے ڈبے میں کچھ کیا اور میری جانب پلٹ کر بولی۔ "دیکھ ابھی جو تیرے میرے درمیان بات ہوئی' وہ سنائی دے گی۔" یہ کہتے ہی اس نے ڈبے کا کوئی حصہ دبا دیا۔

پہلے سولدہ کی آواز آئی جو مجھ سے کچھ بولنے کو کہہ رہی تھی' پھر میری آواز' اور پھر آخر میں اس کے لفظ اور ہنسی کی آواز! اس کے بعد سولدہ نے شاید ڈبے کی کھڑکی بند کر دی کیونکہ آواز آنا ختم ہو چکی تھی۔

"کمال ہے تو نے ان آوازوں کو بھی قید کر لیا!" میں نے سخت تعجب سے کہا۔

وہ میری بات سن کر مسکرانے لگی' پھر بولی۔ "میں اطراف کا جائزہ لینے غار سے باہر گئی تھی کہ میں نے تجھے گھوڑے کی لگام تھامے پہاڑی پر چڑھتے دیکھ لیا۔ اسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ تجھ سے کچھ مزا لیا جائے۔"

"بڑی بری ہے تو!" میں چڑ کر بولا۔ "تو نے مجھے جان بوجھ کر ڈرایا تھا؟"

"اور کیا! ورنہ تیری بھولی بھالی۔ باتیں کیسے سننے کو ملتیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا' پھر اسے کچھ خیال آ گیا اور میری طرف آنکھیں نکال کر بولی۔

"بوغا! تو میرے اوپر سپاہیوں کو لے کر کیوں چڑھ دوڑا تھا؟"

جواب میں اسے میں نے چن کائی اور بغور چی شامان کے بارے میں پوری بات بتا دی' پھر اس کے بعد ہی اسے ملکہ تورا کینہ اور اوغول غانمش کے حشر سے آگاہ کر دیا۔

"تو تو بڑا سنگدل نکلا۔ میں تو تجھے بڑا بھولا بھالا سمجھتی تھی۔" سولدہ شوخ لہجے میں بولی۔

"تیرا خیال غلط ہے سولدہ!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"سنگدل میں نہیں ہوں۔ سنگدل تو وہ وحشی منگول ہیں جن کی نظریں' انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں میری روح پر جو عذاب گزر چکے ہیں' ان کا تصور بھی شاید کسی اور کے لیے ممکن نہ ہو۔"

"تو نے تو منہ پھلا لیا پگلے! میں تو بس یوں ہی تجھ سے مذاق کر رہی تھی۔" سولدہ بولی۔

"جب میری نظر تجھ پر پڑی تھی تو تیرا رخ بستی کی طرف تھا۔ کیا تو مجھ سے ملنے بستی میں جا رہی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"دن کے وقت؟" وہ حیرت سے بولی۔ "تیرا دماغ ٹھکانے ہے! بھلا میں دن کے اجالے میں بستی کی طرف کیسے جا سکتی تھی!"

"پھر تو کہاں جا رہی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"دراصل میں نے تجھ سے رات کے وقت ملنے کا فیصلہ کیا تھا اور میں دن ہی میں یہاں آ گئی تھی۔ غار میں پڑے پڑے میرا دل اوب گا میں نے سوچا کہ پہاڑی سے اتر کر ذرا چہل قدمی کی جائے۔ میں اطراف میں گھوم پھر کر پہاڑی کی طرف چل ہی پڑی تھی کہ میرا

اہ کچھ گھوڑ سواروں پر پڑی۔ میں نے سوچ کر اپنا رخ
تی کی طرف کر لیا کہ وہ مجھ پر کسی طرح کا شک نہ
رنے لگیں۔ اب سمجھا تو؟" سولدہ نے میری
نکھوں میں آنکھیں ڈال دیں پھر قدرے توقف سے
ہا۔ "جب میں نے ان گھوڑ سواروں کو اپنی ہی جانب
تے محسوس کر لیا اور وہ بہت قریب آ گئے تو مجبوراً مجھے
رار ہونا پڑا۔ ہاں فرار سے قبل میں نے تجھے ضرور
یان لیا تھا۔ تجھے دیکھ کر مجھے الجھن بھی ہوئی تھی کہ تو
گھوڑ سواروں کے لیے کہاں بھٹکتا پھر رہا ہے! ہاں اس
سلمان عالم کا تو نے کیا نام بتایا تھا جس نے تیری جان
بائی تھی؟"

"ابو نصار!" میں نے جواب دیا اور اسی کے ساتھ
رے ذہن میں وہ باتیں آنے لگیں جو ابو نصار نے مجھ
سے کی تھیں۔ میں نے ان ساری باتوں سے بھی سولدہ
و آگاہ کر دیا تاکہ وہ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر
کے۔

"ابو نصار بہت ذہین شخص معلوم ہوتا ہے۔ اس
نے تجھ سے جو باتیں کی ہیں وہ اس کے ذہین اور دور
ریش ہونے کا ثبوت ہیں مگر اس کی جو آرزو ہے وہ
اید پوری نہ ہو سکے کیونکہ آنے والا زمانہ کچھ اور ہے
س کی ہولناکی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔" سولدہ
نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"تو کیا راہب ولیم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو
ائے گا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"مسئلہ اس کی کامیابی اور ناکامی کا نہیں بوغا! ان
وں کو چھوڑ، تو انہیں نہیں سمجھ سکے گا۔ میرا مشورہ
ہے کہ تو اس چکر میں نہ پڑ!" سولدہ نے جواب دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ گفتگو کرتے ہوئے سولدہ
جیدہ ہو گئی ہے اور مجھے یہ بھی خیال آیا کہ کچھ باتیں
ضرور ایسی ہیں جو وہ مجھے نہیں بتانا چاہتی لیکن یہ کیسے
مکن تھا کہ میں اپنے محسن ابو نصار کے کام نہ آتا!

"سولدہ!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "میں تجھے بتا
کا ہوں کہ ابو نصار نے میری جان بچائی ہے۔ میرا
رض ہے کہ میں اس کے کام آؤں۔"

خواتین بہنوں کے لیے کھانا پکانے
کی خوبصورت اور معیاری کتابیں جن
کے بغیر آپ کی کچن لائبریری مکمل
نہیں۔ منفرد اور اعلیٰ کھانوں کی
تراکیب سے مزین بہترین کتابیں

آپ کا دسترخوان	150/-
چائنز کھانے اور سوپ	100/-
کوکب کا دسترخوان	75/-
شاء کا دسترخوان	75/-
لذیز کھانے	75/-
کچن بک	24/-
انڈین کھانے	24/-
اچار، مربے، چٹنیاں	24/-

آج ہی اپنے قریبی بک سٹال سے طلب
فرمائیں یا براہ راست ہم سے منگوائیں۔

-:- منگوانے کا پتہ -:-

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

میری بات سن کر وہ کچھ سوچنے لگی' پھر چند لمحوں بعد بولی۔ "تجھے معلوم ہو گا کہ سرقوشنی بیگی کرائت قبیلے کی عورت ہے اور کرائت قبیلہ نسطوری عیسائی ہے۔ راہب ولیم بھی عیسائی ہے۔ وہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے سرقوشنی بیگی کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرے گا لیکن تیری باتیں سن کر میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ عورت تجھ سے بہت متاثر ہے۔ اگر تو اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور ذہن استعمال کرتے تو با آسانی راہب ولیم کو یہاں سے ناکام و نامراد بھاگنے پر مجبور کر سکتا ہے۔"

"کیا تو اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتی؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں نے کہہ تو دیا کہ تو خود اسے تنہا شکست دے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میری مدد کی تجھے کوئی ضرورت نہیں۔" سولدہ نے جواب دیا۔

"اب تو مجھے آئندہ کے لیے مشورہ دے کہ میں کیا کروں؟ منگول تو ابھی تک اسی طرح طاقتور اور متحد ہیں۔ میں نے ان کے درمیان جو نفرتوں کے بیج بوئے تھے' وہ پھلے پھولے مگر اس کے باوجود ان کی قوت ایک بار پھر بڑھ گئی۔ قوبوق کی موت اور اوغدائی کے خاندان کی تباہی سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ایک خاندان تباہ ہوا تو دوسرے خاندان نے اس کی جگہ لے لی۔" میں نے کسی قدر دکھ بھرے لہجے میں اپنی بات ختم کی۔

"بوغا! تو اوپر اوپر دیکھ رہا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ ان کی قوت تقسیم نہیں ہوئی۔" سولدہ پر زور لہجے میں بولی۔ "کیا تو سمجھتا ہے کہ مغربی دشت پہلے ہی کی طرح منگو خاں کے قبضے میں ہے؟"

"میرے خیال میں تو ایسا ہے۔ منگو خاں کو خاقان بنانے میں مغربی دشت کے آقا باتو خاں ہی کا تو ہاتھ ہے۔ منگو خاں اور باتو خاں دونوں ایک ہیں۔" میں نے اپنی فہم کے مطابق جواب دیا۔

"تیرا خیال قطعی غلط ہے بوغا! سولدہ بولی۔ "حقیقت اس کے برعکس ہے۔ عملی طور پر اب پورا مغربی دشت الگ ہو چکا ہے۔ اس پر صرف اور صرف باتو خاں کی حکمرانی ہے۔ وہ وہاں کا حکمراں ہے۔ مغربی دشت کے معاملات میں منگو خاں کو اب مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں رہا۔ یوں سمجھ لو کہ چنگیز خاں نے جس بڑی مملکت کی بنیاد رکھی تھی' وہ اب تو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔"

سولدہ کی باتوں میں وزن تھا جس سے میں متاثر ہوا۔ اس کی باتیں میری سمجھ میں آنے لگیں لیکن میں تو کوئی اور ہی خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ بات میری روحانی تسکین کے لیے بہت تھی کہ منگول طاقت دو حصوں میں بٹ چکی تھی لیکن میں تو اسے ٹکڑے ٹکڑے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے انہی خیالات کا اظہار سولدہ سے بھی کر دیا۔

صبر کر کہ وہ دن بھی آئے گا۔ تو دیکھے گا' تقسیم در تقسیم! اور پھر شاید تیرے خواب پورے ہو جائیں گے مگر ابھی اس میں بہت دن ہیں۔"

سولدہ نے کہا۔ "فی الحال تجھے میرا یہ مشورہ ہے کہ تو کسی طرح یہاں سے مغربی دشت چلا جا! میں سمجھتی ہوں کہ وہاں کی فضا تیرے لیے سازگار رہے گا۔ وہاں تجھے اپنے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کو سرد کرنے کے بہت سے مواقع مل جائیں گے۔"

"مغربی دشت؟" میں سولدہ کی بات سن کر حیران ہوا۔ "مگر میں وہاں اب کیسے جا سکتا ہوں؟ کیا میں اس سلسلے میں سرقوشنی بیگی سے درخواست کروں کہ وہ مجھے مغربی دشت جانے کی اجازت دے دے؟"

"نہیں! سرقوشنی بیگی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اس سلسلے میں ابو نصار کی مدد لے سکتا ہے۔" سولدہ نے بتایا۔

"مگر وہ کیا کر سکے گا؟" میں نے سوال کیا۔ "وہ نہ صاحب اختیار ہے نہ منگول!"

"کیا تو یہ بھول گیا کہ برقائی خاں اس کی کتنی عزت کرتا ہے! کیا برقائی خاں اس شخص کی کوئی بات ٹال سکتا ہے جسے وہ اپنے استاد کا درجہ دیتا ہے!" سولدہ بولی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابو نصار، برقائی خاں سے میرے بارے میں بات کرے گا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ مغربی دشت لے چلے اور برقائی خاں مجھے سرقوشنی بیگی سے مانگ لے گا۔" میں نے سولدہ کی بات کا مقصد سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" سولدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے کہ سرقوشنی بیگی، برقائی کی بات نہیں ٹال سکے گی کیونکہ وہ یقیناً برقائی کو خوش رکھنا چاہتی ہوگی۔"

"لیکن ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں اگر خود بھی سرقوشنی بیگی سے اپنی اس خواہش کا اظہار کروں گا تو شاید وہ میری بات مان لے گی۔" میں بولا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ تجھے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو گی۔ تجھ جیسا بظاہر بے غرض اور کار آمد شخص اسے اور کون ملے گا! دوسرے بات یہ کہ مغربی دشت پہنچ کر تیرے لیے یہ ضروری ہے کہ تو حکمرانوں کے قریب رہے۔ تو ان کے قریب رہ کر ہی اپنا مقصد حاصل کر سکتا ہے۔ میری تجویز کے مطابق تمہیں سے تو برقائی خاں کے ساتھ جائے گا اور یوں تیرا راستہ پہلے ہی سے آسان ہو جائے گا۔" سولدہ نے مجھے سمجھایا۔

میں نے سولدہ کی بات پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا، پھر پوچھا۔ "کیا تو مغربی دشت میں بھی مجھ سے ملتی رہے گی؟"

"تو یہ بات اس طرح کہہ رہا ہے جیسے یہ تیری میری ملاقات آخری ہو۔" وہ ہنس کر بولی۔

"تیرا کیا بھروسہ! کیا خبر کب تیرے دشمن پیچھے لگ جائیں اور تو ایک طویل عرصے کے لیے غائب ہو جائے!" میں نے بھی ہنس کر کہا۔

"میں اس کے انتظامات کر لوں گی کہ وہاں بھی تجھ سے ملاقات ہوتی رہے۔ بس اب تو تیرے دل کو تسلی ہو گئی؟" اس نے مجھے شوخ سی نگاہ سے دیکھا۔

"تو یہاں ابھی کتنے دن اور رہے گی؟ تاکہ میں تجھ سے ملنے آتا رہوں۔" میں نے کہا۔

"میرے آنے کا مقصد تجھ سے ملاقات کرنا تھا، وہ ہو گئی۔ اب مجھے مزید رکنے کی کیا ضرورت ہے!"

"پھر کب آئے گی؟" میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

"آجاؤں گی کسی بھی دن!" اس نے شاید میری بے چینی کو محسوس کر لیا اور مجھے تسلی دی۔ "میں تجھ سے کہہ تو چکی ہوں کہ تیری طرف سے غافل نہیں رہوں گی، پھر تجھے کیا فکر ہے!"

میں لاجواب سا ہو گیا۔ میں بھلا اسے کس طرح بتاتا کہ میں اس کا قرب چاہتا ہوں اور اس کی جدائی مجھے کس کرب میں مبتلا کر دیتی ہے! میں نے چاہا کہ حال دل کہہ دوں لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ شاید مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد ہی وہ مجھے غار کے باہر رخصت کر رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھی اور میں اسے مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا پہاڑی سے اتر رہا تھا۔ کچھ دیر ہی میں وہ میری نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔ شاید وہ غار میں چلی گئی تھی، وہاں سے جانے کی تیاری کرنے کے لیے!

پہاڑی سے اتر کر میں گھوڑے کی پشت پر سوار ہوا اور ایڑ لگا دی۔ دن ڈھلنے والا تھا۔ میں نے تیزی سے گھوڑے کو بستی کی طرف دوڑایا۔

جب میں بستی میں پہنچا تو شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ میں سیدھا سرقوشنی بیگی کے محل کی طرف بڑھ گیا۔

محل میں داخل ہو کر میں نے گھوڑا اصطبل میں چھوڑا اور اندرونی دروازے کی طرف چلا۔ جس وقت میں محل کے اندرونی دروازے سے اندر پہنچا، ایم دم ٹھٹھک سا گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ راہب ولیم اتنی جلدی سرقوشنی بیگی سے مل لے گا۔ وہ غالباً اسی سے ملاقات کر کے لوٹ رہا تھا۔ وہ میرے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ رہنمائی کے لیے ایک کلہاڑے بردار تھا۔

مجھے راہب ولیم کو کس طرح شکست دینی تھی، اس کے بارے میں سولدہ نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ صرف اتنا کہا تھا کہ اگر میں اپنی آنکھیں کھلی رکھوں اور اپنے

ذہن کو استعمال کروں تو اسے با آسانی شکست دے سکتا ہوں۔ مجھے راہب ولیم کو وہاں دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ وہ منگو خاں کے دربار میں پیش ہونے سے قبل سرقوشنی بیگی کی حمایت حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا یا نہیں' اس کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ اگر اس وقت میں محل ہی میں موجود ہوتا تو اس کے اور سرقوشنی بیگی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکتا۔ یہ بھی امکان تھا کہ اس دوران میں سرقوشنی بیگی نے مجھے طلب بھی کیا ہو۔ میں محل میں نہیں تھا لیکن اب سرقوشنی بیگی مجھ سے پوچھ سکتی تھی کہ میں اس دوران میں کہاں رہا! مجھے محل سے اپنی غیر حاضری کا کوئی مناسب بہانہ بھی سوچنا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں اسے سولدہ کے بارے میں تو کچھ بتا ہی نہیں سکتا تھا۔ میں انہیں خیالوں میں گھرا ہوا اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میری نگاہ سرقوشنی بیگی کے خادم پر پڑی جو محل کی اندرونی سمت سے آ رہا تھا۔ میں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا اور جب وہ قریب آ گیا تو پوچھا۔ "میری غیر حاضری میں عظیم بیگی نے تو مجھے نہیں بلوایا؟"

"نہیں اے بوغا!" خادم نے جواب دیا۔ "کوئی اور بات؟"

"اور کوئی بات نہیں! میں صرف یہی پوچھنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا اور اطمینان کا سانس لیتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

ان دنوں منگو خاں روز رات کو دربار کر رہا تھا۔ اس کا سبب یہ کہ وہ نیا نیا خاقان بنا تھا اور ابتدا ہی میں تمام معاملات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت پر اس کی گرفت سخت ہو۔ مجھے علم تھا کہ اس رات بھی دربار ہونا تھا اور اس دربار میں راہب ولیم کی حاضری ضروری معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دربار میں میری موجودگی بھی ضروری سمجھی جائے گی کیونکہ ایک تو میں سرقوشنی بیگی یعنی نئے خاقان کی ماں کا چہیتا تھا' دوسرے نئے خاقان کی نظر میں بھی میں نے عزت حاصل کر لی تھی۔ میں اپنے بستر پر دراز ہو کر کافی دیر موجودہ حالات پر غور کرتا رہا۔ میں اپنے خیالوں میں اس قدر غرق تھا کہ مجھے یہ احساس بھی نہ ہوا کہ کب سرقوشنی بیگی کا خادم میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جب مجھے مخاطب کیا تو میں چونکا۔ وہ سرقوشنی بیگی کے حضور میں میری طلبی کا فوری حکم لایا تھا۔ خادم کی اطلاع کے مطابق سرقوشنی بیگی اپنی خوابگاہ میں تھی۔ میں خادم کے ساتھ ہی ساتھ اپنے کمرے سے نکلا۔

سرقوشنی بیگی کی خوابگاہ کے دروازے پر موجود کلہاڑے برداروں کو غالباً" بتا دیا گیا تھا کہ مجھے طلب کیا گیا ہے اس لیے وہ مجھے آتا دیکھ کر ادب سے ایک طرف ہو گئے۔ میں خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ اس وقت سرقوشنی بیگی اپنے سامنے ساغر و مینا سجائے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے تعظیم دی اور ادب کے ساتھ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"بوغا! میں نے تجھے ایک خاص مقصد سے بلایا ہے۔" سرقوشنی بیگی نے اپنے جام سے گھونٹ بھر کر اسے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"تیرا آدم حاضر ہے اسے الاؤ کی رکھوالی! حکم دے!" میں اس کی طرف دیکھ کر بولا اور احتراماً اپنی بات کہہ کر سر جھکا لیا۔

"سن بوغا! تو اب میرے بگھار تر بیٹے کی نظر میں چڑھ گیا ہے۔ وہ تجھے اپنے دربار میں ضرور بلائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ جب آج وہ تجھ سے ایک معاملے میں مشورہ طلب کرے تو تو وہی کہہ جو میں تجھے بتاؤں۔" سرقوشنی بیگی کے لہجے میں حکم تھا اور کسی قدر سرور کی کیفیت بھی! شاید وہ کافی دیر سے پی رہی تھی۔

"اے عظیم بیگی! تیرے حکم کی تعمیل ہو گی۔" میں نے جلدی سے کہا۔ اس کی بات سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے! اس پر یقیناً راہب ولیم کا جادو چل گیا تھا اور مجھے اس جادو کا توڑ کرنا تھا لیکن ایسا اسی وقت ممکن تھا کہ سرقوشنی بیگی بات

آگے بڑھاتی۔ میں اس کا منتظر تھا۔

"سن! آج خاقان کے دربار میں ایک شخص پیش ہو گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دوبارہ گھونٹ بھرنے کے لیے اپنا جام اٹھایا۔

سرقوشنی بیگی کو متاثر کرنے کا وہ بہت اچھا موقع تھا اور میں نے اسے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ گھونٹ بھر کر یقیناً اپنی بات پوری کرتی مگر میں فوراً بول اٹھا۔

"اے الاؤ کی رکھوالی! اگر تو حکم دے تو میں اس شخص کے بارے میں تجھے سب کچھ بتا دوں؟"

سرقوشنی بیگی نے گھونٹ بھر کر جام رکھا اور مجھے حیرت سے دیکھا، پھر بولی۔ "کیا تو اس کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟ لیکن وہ تو آج ہی قراقرم پہنچا ہے ابھی ایک گھڑی پہلے!"

"وہ تو خیر قراقرم پہنچ بھی چکا ہے اے عظیم بیگی! تیرا خادم تو ان کے بارے میں بھی سب کچھ بتا سکتا ہے جو ابھی راہ میں ہیں اور یہاں نہیں پہنچے۔" میں نے موقع دیکھ کر اسے متاثر کرنے کی خاطر پرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں تو ایسا ہی ہے بوغا! میں تجھے آزما چکی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی، پھر کہا۔ "اچھا تو پھر بتا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟"

میں نے ڈھونگ رچانے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور پھر چند لمحے بعد ہی آنکھیں کھول کر پر اعتماد لہجے میں بولا۔ "اس کا نام راہب ولیم ہے اور وہ فرانس کے شاہ لوئی کی طرف سے آیا ہے مگر اس کے مقاصد وہ نہیں جو ظاہر کرتا ہے۔"

سرقوشنی بیگی میری بات سن کر چونک اٹھی۔ "اپنی بات کی وضاحت کر بوغا!" وہ بولی۔

"نہ وہ تاجر ہے نہ سیاح، نہ مبلغ ہے نہ سفیر بن کر آیا ہے اے الاؤ کی رکھوالی! کیا تو نے یہ بھی سوچا کہ وہ کس حیثیت سے یہاں آیا ہے؟" میں نے مزید کہا۔

"مجھ سے کوئی سوال نہ کر بوغا! تیرا علم اس کے بارے میں کیا کہتا ہے وہ بتا!"

"وہ یہاں اس لیے آیا ہے کہ اپنے بادشاہ کے لیے جاسوسی کر سکے۔ اس کا اصل مقصد منگولوں کی طاقت کا اندازہ لگانا ہے تاکہ اس سلسلے میں اپنے بادشاہ کو جا کر بتا سکے۔ اس کے سوا وہ جو کچھ ظاہر کرتا ہے، غلط ہے۔" میں نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

"اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تیرا علم کہتا ہے تو پھر میں قطعی تجھ سے نہیں کہوں گی کہ تو دربار میں اس کی حمایت کرے۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ میرا بگھاتر بیٹا اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا۔"

سرقوشنی بیگی کے الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ اس کا خادم اندر آ گیا اور بولا۔ "اے عظیم بیگی! خاقان کا خادم بوغا کو بلانے آیا ہے کہ وہ اس کے دربار میں حاضری دے۔"

"جا بوغا اور بھول جا وہ باتیں جو میں نے تجھ سے کی تھیں۔" سرقوشنی بیگی نے مجھے رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔

میں نے خواب گاہ کے باہر ایک کلہاڑے بردار کو اپنا منتظر پایا اور اس کے ساتھ ہو گیا۔

میں کلہاڑے بردار کے ہمراہ اس بڑے سے زرکار یورت تک پہنچ گیا جس میں منگو خاں کا دربار لگا ہوا تھا۔

میں نے یورت کے اندر جا کر شعلوں کی روشنی میں منگو خاں کے دربار کا جائزہ لیا۔ وہاں خاندان ذریں کے بہت سے نویان جمع تھے جو قرولتائی میں شرکت کرنے آئے تھے اور ابھی قراقرم سے نہ گئے تھے۔ انہی میں برقائی خاں بھی شامل تھا۔ نویانوں کے علاوہ لشکر کے معتبر سردار بھی موجود تھے۔ یورت کی ایک جانب مجمعے سے بلند تخت بچھا ہوا تھا جس پر سیل کے سمور کا فرش تھا۔ منگو خاں کی ناک چپٹی تھی اور عمر بھی پونے چار درجن سال کے قریب تھی مگر اس کے باوجود وہ تخت پر بیٹھا ہوا بڑا بارعب لگ رہا تھا، مجمعے کے درمیان میں تخت تک تھوڑی سی جگہ چھوٹی ہوئی تھی تاکہ نئے آنے والے خاقان کے تخت تک پہنچ کر اسے تعظیم دے سکیں۔ جس بات سے میرے ذہن کو فوری طور پر جھٹکا سا لگا وہ یہ تھی کہ منگو خاں تخت پر تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے زانو پر کوئی حسین و نوخیز نیم برہنہ

لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کا چہرہ دور سے صاف نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کا متناسب اور گورا بدن دور سے بھی جیسے لودے رہا تھا۔ میں مجمعے کے درمیان چھوڑی ہوئی جگہ سے گزرتا ہوا آگے بڑھا۔ میری نگاہ جیسے اس لڑکی کے حسین جسم سے چپک کر رہ گئی تھی میں منگو خاں کو تعظیم دینے اس کے تخت تک جا رہا تھا لیکن جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا اس لڑکی کے خدوخال اور چہرے کے نقوش واضح ہوتے جا رہے تھے۔ میں مبہوت سا قدم اٹھائے جا رہا تھا اور مجھے خود اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا' یہ بھلا کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ میری نظر کا دھوکا ہے۔ میں سوچ رہا تھا مگر جب میں تخت کے بالکل قریب پہنچ گیا تو مجھے اپنی بصارت پر یقین کرنا ہی پڑا۔ منگو خاں کے زانو پر بیٹھی ہوئی حسین و نوخیز لڑکی ملکہ روسودان کی بیٹی تھمرو وہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور میں تعظیم دینا بھول گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے دیکھ کر تھمرو بھی چونک اٹھی تھی۔ یقیناً اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میں ایک ساعت میں جیسے زمانہ حال سے زمانہ ماضی تک جا پہنچا۔ یہ وہی تھمرو تھی جس نے مجھے اغوا کر لیا تھا اور مجھے اپنی خوابگاہ میں بلا کر مجبور کیا تھا کہ میں اس کی خواہشوں کے آگے سر جھکا دوں۔ اس وقت وہی تھمرو' منگو خاں کے زانو پر بیٹھی تھی۔ چند لمحوں کو میں جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا مگر جلد ہی میں نے خود پر قابو پا لیا اور مجھے احساس ہو گیا کہ میں کہاں ہوں!

میں نے منگو خاں کو جلدی سے تعلیم دی اور تیزی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ اسی وقت منگو خاں کی آواز گونجی۔

"بونا! تو یہاں ادھر دائیں جانب تخت کے قریب بیٹھ!" منگو خاں نے حکم دیا۔

میرے پیچھے ہٹتے ہوئے قدم رک گئے اور میں نے حکم کے مطابق تعمیل کی۔

"معا" پھر منگو خاں کی آواز سنائی دی۔ "اس شخص کو پیش کیا جائے جسے فرانس کے بادشاہ نے ہمارے پاس بھیجا ہے۔"

یورت کے در پر کھڑا ہوا تو مان باشی باہر چلا گیا' پھر جب وہ لوٹا تو اس کے ساتھ راہب ولیم بھی تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنے مخصوص لباس میں تھا۔ دربار کے دبدبے سے یقیناً اسے متاثر ہونا چاہیے تھا مگر میں نے اس کے چہرے پر بے خوفی کے اثرات دیکھے۔ وہ تعظیم دینے آگے بڑھا' پھر تعظیم دے کر بولا۔ "میں فرانس کے شاہ لوئی کی طرف سے آیا ہوں اے عظیم خاقان! میں جو تیری نام اس کا خط لایا تھا' وہ میں نے آتے ہی تجھے بھجوا دیا تھا۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ تیرے حضور کوئی تحفہ پیش نہیں کر سکا۔"

"سن! جس طرح سورج کی شعاعیں ہر طرف پہنچتی ہیں' اسی طرح ہماری اور باتوں خاں کی طاقت دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچتی ہے۔ ہمیں تجھ سے سونے چاندی کی حاجت نہیں۔ بتا کہ تو کس غرض سے آیا ہے؟ تو اپنے بادشاہ کی طرف سے مدد کی درخواست لے کر آیا ہے یا رحم کی؟" منگو خاں اپنی بھاری اور صاف آواز میں بولا۔

"اے عظیم خاقان! نہ میں مدد کی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں نہ رحم کی!" راہب ولیم نے جواب دیا۔

"پھر تو کیوں آیا ہے؟" منگو خاں نے سوال کیا۔

"باتو خاں نے اپنے پیغام میں سب کچھ تجھے لکھ دیا ہو گا۔" راہب ولیم نے کہا۔

"اس نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی۔ ہم اس کا پیغام سن چکے ہیں۔" منگو خاں کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔ "تو خود اپنی زبان سے کہہ کہ کیوں آیا ہے؟"

راہب ولیم کے چہرے سے لمحے بھر کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ گھبرا گیا ہو مگر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور بولا۔ "اے عظیم خاقان! میرا بادشاہ تجھ سے محض دوستی چاہتا ہے جس کا اظہار اس نے اپنے پیغام میں بھی کیا ہو گا۔ میں خود ذاتی طور پر انجیل کی تلقین کرنے آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے منگولوں کے درمیان رہنے کا موقع دیا جائے تاکہ میں راہ راست کی تبلیغ کر سکوں۔"

"ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے اور ہم صدق دل

میں اسی موقع کا منتظر تھا جو مجھے خود بخود نصیب ہو گیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر تخت کے سامنے پہنچا اور ادب سے جھک کر گویا ہوا۔ "اے عظیم خاقان! یہ شخص نہ تاجر ہے نہ سفیر! اس شخص کا اب یہ کہنا ہے کہ ہمارے درمیان رہ کر اپنے مذہب کی تبلیغ چاہتا ہے۔ تو اے خاقان! یہاں پہلے سے بہت سے عیسائی مبلغ موجود ہیں اور وہ یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں اس کا رہنا کوئی ضروری نہیں۔ ویسے خاقان خود ذہین ہے اور مناسب فیصلہ کر سکتا ہے۔ خادم کو جو کہنا تھا کہہ چکا۔"

مجھے توقع تھی کہ منگو خاں میری بات سن کر راہب ولیم سے کہہ دے گا کہ وہ قراقرم سے چلا جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ منگو خاں بولا۔ "ہم اس کا فیصلہ کل سنائیں گے۔ کل تجھے پھر دربار میں حاضر ہونا ہے۔"

اس کے کچھ دیر بعد دربار برخواست کر دیا گیا۔ مجھے اس وقت اندازہ ہوا کہ سرقوشنی بیگی نے کتنا صحیح فیصلہ کیا تھا۔ سے یقین تھا کہ منگو خاں میرا مشورہ طلب کرے گا اور وہی ہوا تھا لیکن یہ دیکھ کر میرا ذہن کچھ الجھ گیا کہ راہب ولیم آئندہ شب تک کے لیے ٹل گیا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ اب راہب ولیم کا معاملہ میرے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ناحق اپنی بات میں جھول رکھا تھا اور کہہ دیا تھا کہ منگول خاں جو چاہے فیصلہ کر سکتا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں قطعی انداز اختیار کرنا چاہیے تھا۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا سرقوشنی بیگی کے محل تک پہنچ گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے کھانا کھایا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ہی میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں کیونکہ میں نے دن بھر بہت بھاگ دوڑ کی تھی۔ ابھی میرے ذہن کو نیند کے جال نے پوری طرح اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ آنے والا محل کا ایک محافظ تھا۔ میں نے اسے سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔

"اے بوغا! خاقان کے محل سے ایک خادم آیا

یادگار گلاس

کہتے ہیں کہ ایک سردار جی ہمیشہ شراب کے دو گلاس ایک ساتھ بنا کر باری باری گھونٹ گھونٹ پیا کرتے تھے۔ وجہ پوچھی گئی تو بتایا کہ دوسرا گلاس وہ اپنے ایک عزیز دوست کے ساتھ گزری ہوئی شاموں کی یاد میں پیتے ہیں۔ جواب پردیس چلا گیا ہے۔ ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے صرف ایک گلاس رکھا ہے۔ پھر وجہ پوچھی گئی تو بولے۔

"یہ تو میرے یار کا گلاس ہے۔ مجھے تو ڈاکٹر نے سختی سے منع کر دیا ہے۔"

سے اس کی پرستش کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ منگولوں کو تمہاری تبلیغ کی ضرورت نہیں۔" منگو خاں نے کہا۔

"بغیر تائید ایزدی کے یہ توفیق ممکن نہیں۔" راہب ولیم بے دھڑک بولا۔

منگو خاں اس کی بات سن کر چند لمحے چپ رہا، پھر بولا۔ "خدا نے ہاتھ میں پانچ انگلیاں بنائی ہیں اور اتنے ہی مذاہب خلق خدا کو بخشے ہیں۔ تم پر اس نے انجیل نازل کی مگر تم اس کی پابندی نہیں کرتے۔ یقیناً تمہاری انجیل میں یہ تو نہیں لکھا ہو گا کہ تم ایک دوسرے کی غیبت کرو۔"

"نہیں! ہمیں یہ بھی تلقین کی گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے پرخاش نہ رکھیں۔" راہب ولیم بولا۔

"میں نہ کسی کی غیبت کرتا ہوں نہ کسی سے پرخاش رکھتا ہوں۔"

"میں تمہارا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔" منگو خاں نے کہا، پھر بولا۔

"تمہاری انجیل میں یہ بھی لکھا ہو گا کہ مال و دولت کی خاطر انصاف سے منہ موڑ لو!"

جب راہب ولیم نے تجویز پیش کی کہ اس نے خود کبھی روپیہ یا انعام قبول نہیں کیا تو منگو خاں نے اسے

خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"خدا نے تم پر انجیل نازل کی مگر تم اس کے پابند نہیں۔ خدا ہی نے ہمیں ساحر اور شامان دیے لیکن ہم ان کی بات سنتے ہیں اور امن چین سے رہتے ہیں۔" منگو خاں نے یہ کہہ کر میری جانب دیکھا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔ "اس بات کا فیصلہ بھی ہمارا ایک شامان کرے گا کہ تمہیں منگولوں کے درمیان رہنے کی اجازت دی جائے یا نہیں! کیونکہ اس کی آنکھیں اتنی تیز ہیں کہ وہ تمہارے دل میں بھی جھانک سکتا ہے۔" اتنا کہہ کر منگو خان نے مجھے مخاطب کیا۔

"بوغا! اپنی جگہ سے اٹھ اور بتا کہ اس شخص کا قراقرم میں رہنا مناسب ہے یا نہیں؟"

"ہے۔ تجھے وہاں طلب کیا گیا ہے۔" محافظ نے بتایا۔

منگو خاں رات کے وقت مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ ایسی کیا ضروری بات ہے جس کے لیے صبح کا انتظار نہیں کیا جا سکتا؟ میرے ذہن میں سوالات ابھرے مگر میں بہرحال وہاں جانے پر مجبور تھا ہی اس لیے فوراً کمرے سے نکل کر محافظ کے ساتھ ہو لیا۔

محل کے صدر دروازے پر ایک خادم موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں مشعل تھی۔ میں نے اس خادم سے کچھ دریافت کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ منگو خاں کا محل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں خادم کے ساتھ چل دیا۔ خادم مجھے مشعل کی روشنی میں راستہ دکھاتا ہوا آگے آگے چل رہا تھا۔

جلد ہی میں خادم کے ہمراہ منگو خاں کے محل میں داخل ہو گیا۔ وہاں میں پہلی بار آیا تھا۔ خادم مختلف راہداریوں سے گزرتا ہوا ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گیا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ دروازہ بند تھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ دروازے پر کلہاڑے بردار محافظ موجود نہیں تھے۔

دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ میں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ میں نے کمرے میں قدم رکھا اور مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ میرے سامنے منگو خاں کی بجائے تھمرو کھڑی مسکرا رہی تھی۔ تو مجھے منگو خاں نے نہیں، تھمرو نے بلایا تھا۔ میں نے سوچا مگر کیوں؟

میں ابھی حیرت کے لمحوں سے نہ نکل سکا تھا کہ معاً میری سماعت سے دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ ٹکرائی۔ تھمرو بھی چونک اٹھی اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز قریب آتی گئی، اور پھر وہی خادم کمرے میں ہانپتا ہوا آ گیا جو مجھے وہاں لے کر آیا تھا۔

"وہ..... وہ خاقان ادھر..... ادھر ہی آ رہا ہے۔" خادم نے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان بتایا۔

اسی وقت میری نگاہ کمرے میں موجود دریچے پر پڑی اور میں بغیر کچھ کہے تیزی سے اس کی طرف دوڑا، پھر میں نے دوسری طرف کودنے میں دیر نہیں کی۔ میرے کودنے سے تیز آواز ہوئی کیونکہ دریچے سے زمین کا فاصلہ کافی تھا۔ میں ابھی دریچے سے کود کر کچھ دور ہی دوڑا ہوں گا کہ ایک تیز آواز سنائی دی۔

"کون ہے؟ ٹھہرو جا ورنہ تیرا جسم تیروں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔" اسی آواز کے ساتھ ایک جانب اندھیرے سے چند مشعلوں کی متحرک روشنی نظر آئی۔

میں روشنی کی مخالف سمت دوڑنے لگا، پھر میں نے دوڑتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ متحرک مشعلیں میرے تعاقب میں تھیں۔ میں اور بھی تیز دوڑنے لگا۔ میرے پیروں کے نیچے پختہ زمین تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ میں محل ہی کے کسی حصے میں ہوں۔

معاً تعاقب کرنے والے زور زور سے چیخنے لگے۔ "پکڑو، پکڑو!" میں ان کا مقصد سمجھ گیا۔ وہ غالباً اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی میرے وجود سے آگاہ کر دینا چاہتے تھے تاکہ مجھے گھیر لیا جائے۔

اور پھر وہی ہوا۔ میں جس سمت دوڑا چلا جا رہا تھا، ادھر سے بھی متحرک مشعلیں آگے بڑھتی دکھائی دیں۔ میں ایک طویل راہداری میں دوڑ رہا تھا۔ میرے دونوں طرف سنگین دیواریں تھیں۔ میں صرف یا تو سیدھا دوڑ سکتا تھا یا پھر مخالف سمت! اگر اب میں دونوں جانب سے گھیرا جا چکا تھا۔ یہ سوچ کر میرے قدم خود بخود رکنے لگے اور دل ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔

اضطراری طور پر میں جو قدم اٹھا بیٹھا تھا' اب مجھے اس پر پچھتاوا محسوس ہو رہا تھا۔ اگر میں تھمرو کے کمرے سے اس طرح بدحواس ہو کر نہ بھاگ کھڑا ہوتا تو اتنی بڑی مصیبت میں کبھی گرفتار نہ ہوتا۔ میں بہت آسانی سے یہ ثابت کر سکتا تھا کہ خود منگو خاں کے محل میں نہیں آیا تھا بلکہ مجھے تھمرو نے ایک خادم کو بھیج کر بلوایا تھا۔ میں یہ سمجھا تھا کہ مجھے خاقان نے طلب کیا ہے کیونکہ خادم نے مجھ سے تھمرو کا نام نہیں لیا تھا۔ سرقوشنی بیگی کے محل کا محافظ بھی میرے بیان کی تصدیق کر سکتا تھا لیکن اب ان تمام باتوں کا وقت گزر چکا تھا۔ میں نے تھمرو کے کمرے سے فرار ہو کر خود کو مجرم بنا لیا تھا۔

منگو خاں کا تھمرو کے کمرے میں ٹھیک اس وقت آنا جب میں وہاں پہنچا تھا' اس کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ وہ تھمرو پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کے آدمی یقیناً" تھمرو کی نگرانی کر رہے تھے منگو خاں شاید اس کی طرف سے کسی شک میں مبتلا تھا۔ وہ افراد جو تھمرو کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوں گے' انہوں نے ہی منگو خاں کو بروقت آگاہ کیا ہو گا کہ تھمرو نے اپنی خوابگاہ میں مجھے بلایا ہے۔ منگو خاں کا خود وہاں آنا اس بات کی دلیل تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ تھمرو کے جسم کی خواہش میں وہاں پہنچا تھا۔ وہ کوئی معمولی شخص نہیں خاقان تھا' چنگیز خاں کا پوتا اور سرقوشنی بیگی کا بڑا بیٹا! اگر اسے تھمرو کے جسم کی خواہش ہوتی تو وہ اسے اپنی خوابگاہ میں طلب کرتا' خود اس کی خوابگاہ میں کبھی نہ جاتا۔ اس کا بھی قوی امکان تھا کہ تھمرو کی نگرانی کرنے والے مجھے پہچانتے ہوں اور انہوں نے منگو خاں کو بتا دیا ہو کہ تھمرو نے اپنی خوابگاہ میں کسے بلایا ہے! اگر واقعی ایسا ہی ہوا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے سر پر شدید خطرہ منڈلا رہا تھا۔ جواب طلبی کی صورت میں میرے پاس تھمرو کی خوابگاہ سے فرار ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

میں دوڑتے دوڑتے اب تقریباً" رک گیا تھا۔ مشعل بردار محافظ اب بہت قریب آ گئے تھے۔ میرے پاس تلوار بھی تھی جو کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ میں ان سے بھڑ جاؤں مگر وہ تعداد میں کافی تھے اور سب ہی مسلح تھے ہر محافظ کے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے میں برہنہ تلوار تھی۔ ایک تو یہی ضروری نہیں تھا کہ میں ان درجن بھر مسلح محافظوں کا حلقہ توڑ کر نکل جاتا' دوسرے یہ کہ اگر ایسا ہو بھی جاتا تو محل میں ان کے علاوہ بھی اور محافظ موجود ہی ہوں گے۔ میں ان سے کس طرح بچتا! خاقان کے محل میں محافظوں کو زخمی یا ہلاک کر کے نکل جانا کوئی ہنسی کھیل تو نہیں تھا۔

"ارے یہ تو بطریق بوغا ہے۔" قریب آتے ہوئے محافظوں میں سے ایک حیرت کے ساتھ چیخا۔

"ہاں یہ وہی ہے۔ میں نے اسے دربار کے یورت میں بھی دیکھا تھا۔" ایک اور محافظ نے تائید کی۔

وہ سب اب میرے قریب پہنچ کر رک گئے تھے۔ ان کے چہروں پر ایسی حیرت تھی جیسے وہ کوئی عجوبہ دیکھ رہے ہوں۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ ان میں سے بیشتر مجھے پہچانتے ہیں اور یہ بات میری سلامتی کی ضامن بن گئی تھی۔

"میں نے کچھ دیر پہلے تجھے محل کے دروازے سے ایک خادم کے ساتھ اندر آتے دیکھا تھا۔" ایک محافظ بولا۔ "پھر تو اب اس طرح محل میں چوروں کی طرح کیوں بھاگا پھر رہا تھا؟"

یہ بات ان کے لیے واقعی بڑی عجیب اور حیرت انگیز رہی ہو گی کہ میں خاقان کا ایک معتبر اور قریبی آدمی ہونے کے باوجود اس طرح محل میں کیوں بھاگ رہا تھا! پھر یہ کہ جب میں محل میں چوری چھپے داخل نہیں ہوا تھا تو مجھے کیا خوف تھا جو چھپ کر فرار ہو رہا تھا! اس میں شک نہیں کہ محافظوں نے مجھے پہچان کر میری بڑی مشکل حل کر دی تھی ورنہ اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس وقت تک شاید اس کی لاش فرش پر پڑی ہوتی مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ انہیں مطمئن کرنا بہت ضروری تھا۔ ان کے چہروں پر تجسس

ہونے کے ساتھ ساتھ میں نے جو خاص بات محسوس کی وہ یہ تھی کہ وہ مجھ سے مرعوب تھے۔

مجھے خاموش دیکھ کر ایک محافظ پھر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "میں ستاروں کا تعاقب کر رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل ایک منحوس ستارہ محل کے اوپر سے گزرا تھا۔ مجھ سے اب مزید راز کی باتیں پوچھنے کی کوشش نہ کرو! تمہاری بے جا دخل اندازی اور ستاروں کا تعاقب کرنے کے سبب میں محل کے صدر دروازے تک پہنچنے کا راستہ بھی بھول چکا ہوں۔ وہاں تک میری رہنمائی کرو کہ اب میں جانا چاہتا ہوں۔"

میں نے جو کچھ کہا تھا' بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ ان کے مرعوب ہونے کے کیا اسباب ہیں! پہلا سبب تو یہ تھا کہ میں خاقان منگو کے قریب تھا اور سرقوشنی بیگی کا چہیتا تھا۔ دوسرا سبب یقیناً" وہ باتیں تھیں' وہ پراسرار باتیں جو مجھ سے منسوب تھیں اور لازماً" ان محافظوں کے علم میں بھی وہ باتیں ہوں گی۔ ان میں سے کچھ باتیں قطعی غلط تھیں اور کچھ درست! مثلاً" اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ میں اس موت کے گڑھے سے نکل کر فرار ہو گیا تھا جس سے خود نکلنا قطعی ممکن نہیں تھا۔

میری بات سن کر وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے تھے جیسے آپس میں مشورہ کرنا چاہتے ہوں کہ انہیں میری بات ماننی چاہیے یا نہیں! انہیں یہ تک پوچھنے کی جرات نہ ہوئی تھی کہ میں کھلے میدان کی بجائے محل کے اندر کس طرح ستاروں کو دیکھ رہا تھا اور ان کا تعاقب کر رہا تھا! اس کا سبب بھی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھ سے بے حد متاثر و مرعوب تھے۔

"ہم تجھے اپنے محل کے نگراں کی خوابگاہ تک لے چلیں گے۔ ہم تیرا معاملہ اس کے سپرد کر دیں گے کہ وہ جو چاہے کرے۔" ایک ادھیڑ عمر محافظ بولا۔ "ہم تیرے معاملے میں اپنے سر کوئی الزام لینا نہیں چاہتے۔ تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟" اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس نے ساتھی محافظوں سے رائے طلب کی۔

اس کے محافظ ساتھیوں نے ادھیڑ عمر کی رائے سے اتفاق کیا' اور پھر وہ مجھے لیے آگے بڑھنے لگے۔ ہرچند کہ میں ان کے نرغے میں تھا اور وہ سب مسلح تھے لیکن میں نے صاف طور پر محسوس کر لیا کہ اب ان کے انداز و اطوار جارحانہ نہیں تھے۔

مختلف راہداریوں سے گزرنے کے بعد' میں محافظوں کے نرغے میں' محل کے صدر دروازے سے متصل اس خوابگاہ تک پہنچ گیا جہاں نگراں کا قیام تھا۔ خوابگاہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک محافظ نے دروازے پر دستک دی اور ادب سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے بعد ہی دروازہ کھلا اور ایک درشت چہرے والا بوڑھا نظر آیا۔ اس کے چہرے سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ سوتے ہوئے اٹھ کر آیا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ محافظوں پر برس پڑا۔ "کیا ہے؟" چیختے ہوئے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی تھی اور اس کا چہرہ متغیر نظر آنے لگا تھا۔ اب اس کے چہرے سے غصے کے ساتھ ہی حیرت کے اظہار بھی ہو رہا تھا۔ "خاقان کا شامان!" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔

"ہم نے اسے محل میں دوڑتے پایا اور تیرے پاس پکڑ کر لے آئے کہ تو جو چاہے فیصلہ کر!" اسے بڑبڑاتے دیکھ کر ادھیڑ عمر محافظ بولا۔

"کیا تجھے خبر ہے کہ یہ کون ہے؟" نگراں کے لہجے میں اب بھی غصہ شامل تھا۔

"ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ بطریق بوغا ہے۔" ادھیڑ عمر محافظ نے جواب دیا۔

"اور یہ جان کر بھی تو اسے پکڑ لایا ہے؟ کیا تو یہ چاہتے ہے کہ منحوس کیلیتیں ہمارے جسموں میں گھس جائیں اور خاقان ہمیں زندہ زمین میں گڑوا دے؟"

محل کے نگراں کی بات سن کر ادھیڑ عمر محافظ نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانب سے معافی مانگی' پھر اس نے جو کچھ پیش آیا تھا لفظ بہ لفظ صحیح صحیح بیان کر دیا۔ اس کا انداز صفائی پیش کرنے کا سا تھا۔ اس نے یہ بھی

دیا کہ جب میں پکڑا گیا تھا تو میں نے جواب میں کیا کہا
ا۔
محل کا نگراں چند لمحے خاموش رہ کر غالباً" کچھ سوچتا
ہا' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے خاقان کے عظیم
شامان بوغا! میرے علم کے مطابق خاقان کافی دیر پہلے
ونے کے لیے اپنی خوابگاہ میں جا چکا تھا۔ اس کے بعد
ں میں اپنی خوابگاہ میں گھسا تھا۔ مجھے بتا کہ کیا تجھے
اقان نے اپنی خوابگاہ میں بلایا تھا؟"
کچھ چھپانا فضول ہی تھا اور غلط بھی! یہ سوچ کر میں
نے بالکل صحیح جواب دیا۔ "جب محل کا ایک خادم مجھے
انے گیا تو میں یہی سمجھا تھا کہ مجھے خاقان نے طلب
کیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ خادم مجھے تھمرو کی خوابگاہ
یں لے گیا تھا جہاں پہنچ کر میں نے آسمان کی
سرگوشیاں سنیں اور مجھے پتا چلا کہ محل پر سے ایک
نحوس ستارہ گزر رہا ہے۔ میں اسی منحوس ستارے کا
عاقب کرتا ہوا تھمرو کی خوابگاہ سے نکلا تھا اور
حافظوں نے اپنی لاعلمی کے سبب مجھے پکڑ لیا تھا۔"
"یہاں آنے سے پہلے کیا تو نے خادم سے نہیں
پوچھا تھا کہ تجھے کس نے بلایا ہے؟" نگراں نے
پوچھا۔
"نہیں!" میں نے بتایا۔ "نہ اس نے بتایا نہ میں
نے اس سے کچھ پوچھا۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا
اور سوچنے لگا کہ محل کے نگراں کی اطلاع کے مطابق
منگوخاں اپنی خوابگاہ میں سونے کے لیے جا چکا تھا تو پھر وہ
ایک دم کس طرح بیدار ہو کر تھمرو کی خوابگاہ تک جا
پہنچا؟ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے اس سوال نے
مجھے الجھا دیا تھا۔ میری دوسری الجھن کا سبب یہ تھا کہ
اگر واقعی ایسا ہی تھا جو حالات سے ظاہر ہو رہا تھا اور جو
میں سمجھ رہا تھا تو اب تک منگوخاں کہاں ہے؟ محل کا
کوئی محافظ' اس کا یہ حکم لے کر صدر دروازے تک
کیوں نہیں پہنچا کہ مجھے محل سے نہ نکلنے دیا جائے اور
گرفتار کر لیا جائے؟
نگراں کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔
"اے خاقان کے عظیم شامان! کیا تو تھمرو سے بات
کر چکا اور اب محل سے باہر جائے گا یا اسی کی طرف
دوبارہ جانا چاہتا ہے؟"
"میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ خاقان
اس وقت سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟ اگر وہ نہیں جاگ
رہا تو ستارے اس کے حق میں ہیں۔ اسے سوتا پا کر
منحوس ستارہ آگے بڑھ گیا ہو گا لیکن اگر وہ اس گھڑی
بیدار تھا جب وہ منحوس ستارہ محل کے اوپر سے ہو کر
گزرا تھا تو مجھے آسمانوں پر جا کر بتانا پڑے گا کہ کہیں
اس منحوس ستارے کا سایہ خاقان پر تو نہیں پڑ گیا!"
نگراں نے فوراً" ہی ایک محافظ کو محل کے اندرونی
سمت دوڑا دیا کہ وہ خاقان کے بارے میں معلوم کر کے
آئے' وہ اپنی خوابگاہ میں ہے یا باہر! مجھے نہ جانے کیوں
اب یقین سا ہو چلا تھا کہ بظاہر جو حالات نظر آ رہے
ہیں' درحقیقت ویسے نہیں تھے۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات
ضرور تھی جو میری نگاہ سے پوشیدہ تھی اور میں وہی
بات جاننا چاہتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے فرار
کا ایک سنہری موقع کھو دیا تھا کیونکہ اگر میں چاہتا تو محل
کا نگراں مجھے باآسانی محل سے نکل جانے دیتا لیکن میرا
ذہن تو اب کسی اور ہی نتیجے تک پہنچ رہا تھا اور میں اپنے
ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کی تصدیق چاہتا
تھا۔ یوں بھی مجھے اب تک منگوخاں کے حکم پر گرفتار
ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اور اسی بات
سے میں کھٹک گیا تھا۔
کچھ دیر بعد وہ محافظ لوٹ آیا جسے نگراں نے اندر
بھیجا تھا۔ اس نے آ کر جو اطلاع دی' وہ میرے اندازوں
اور قیاسات کے عین مطابق تھی۔ اس لیے میں قطعی
نہیں چونکا۔ میں تھمرو کا سارا کھیل اچھی طرح سمجھ
چکا تھا۔ محافظ نے آ کر بتایا تھا کہ منگوخاں اپنی خوابگاہ
میں ہے اور جب سے اندر گیا ہے' وہاں سے نہیں
نکلا۔ میں پہلے ہی سوچ چکا تھا کہ اگر میرے قیاسات
درست ہوئے تو مجھے کیا کرنا ہے!
"کیا تو اس خادم کو یہاں بلوا سکتا ہے جو مجھے یہاں
لے کر آیا تھا؟" میں نے محل کے نگراں سے کہا۔
"کیا تو اسے نہیں جانتا؟ کیا نام تھا اس کا؟" نگراں

بولا۔

"میں جانتا ہوں اسے!" محافظوں میں سے ایک نے کہا۔ "میں نے اسے عظیم شامان کے ساتھ محل میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' تو ہی اسے بلا کر لا!" نگراں نے اس محافظ کو حکم دیا۔

محافظ محل کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا اور نگراں نے مجھ سے ادب کے ساتھ گزارش کی کہ میں اس کی خوابگاہ میں چل کر بیٹھوں۔ میں نے اس کی پیش کش قبول کرلی کیونکہ اب مجھے وہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ ٹل چکا تھا' بری گھڑی گزر چکی تھی اور اب مجھے گزرے ہوئے لمحوں کا قرض اتارنا تھا۔ محل کے دوسرے محافظ خوابگاہ کے دروازے ہی سے رخصت ہو چکے تھے۔

"میرے بڑے نصیب کہ تو نے میری خوابگاہ میں قدم رکھا اے عظیم خاقان!" محل کا نگراں عقیدت سے بولا۔ "تو کیا پیئے گا؟ گھوڑی کا دودھ یا چاولوں کی شراب؟"

"میرا پیٹ بھرا ہوا ہے' میں کچھ نہیں پیوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"اے عظیم شامان! تجھے دیکھ کر مجھے رشک آتا ہے کہ تو نوجوانی ہی میں اتنے بلند مرتبے پا گیا جو ایک عمر لوگوں کو حاصل نہیں ہوتے۔۔۔"

محل کا نگران اس وقت تک میری مدح کرتا رہا جب تک محافظ لوٹ نہ آیا۔ اس محافظ کے ہمراہ وہ خادم بھی تھا جو مجھے محل میں لے کر آیا تھا۔

میں نے خادم کی طرف نظر اٹھائی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا جیسے وہ انتہائی خوفزدہ ہو۔ وہ دروازے سے اندر آیا تو میں نے اس کے پاؤں بھی کانپتے دیکھے۔

"تو جانتا ہے کہ تو نے جو کچھ کیا ہے' اس کی سزا کیا ہے؟" میں ایک دم کڑک کر بولا۔

توقع کے عین مطابق وہ خادم آگے بڑھ کر میرے قدموں پر گر گیا اور گڑگڑانے لگا۔ "اے عظیم شامان! مجھے معاف کردے' معاف کردے! میں نے جو کچھ کیا' اس میں میرا قصور نہ تھا۔"

"مجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں' میں سب جانتا ہوں کہ تو نے یہ سب کچھ تھمرو کے اشارے پر کیا ہے۔" میں بدستور سخت لہجے میں بولا۔ میں نے کن آنکھیوں سے محل کے نگراں کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار تھے۔ معاً مجھے خیال آیا کہ خادم سے اس کی موجودگی میں مزید کچھ پوچھنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ خیال آتے ہی خادم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ "اٹھ! اور مجھے تھمرو کی خوابگاہ تک لے چل کہ میں نے تیرا قصور معاف کردیا۔"

خادم جلدی سے اٹھ گیا اور میں نے کھڑا ہونے میں دیر نہیں کی۔

"اے عظیم شامان! کیا تو مجھے نہیں بتائے گا کہ اس نابنجار نے کیا قصور کیا تھا جو تو نے معاف کردیا ہے؟" محل کے نگراں نے مجھے مخاطب کیا۔

اسکا تجسس میرے لیے خلاف توقع نہیں تھا اس لیے میں نے فوراً کہا۔ "ان باتوں کا جاننا تیرے لیے ضروری نہیں۔ تو اپنے کام سے کام رکھ!" میرا لہجہ سپاٹ اور سرد تھا تاکہ اسے مزید کوئی سوال کرنے کی جرات نہ ہو اور وہی ہوا بھی!

"تو ٹھیک کہتا ہے اے عظیم شامان!" محل کے نگراں نے بجھے بجھے سے لہجے میں کہا۔ "تو اپنے بھید خود ہی بہتر جانتا ہے۔"

خادم کے ہمراہ میں خوابگاہ سے نکلا اور اس کی رہنمائی میں چلنے لگا۔ میرے ذہن میں اس وقت بہت سے سوالات گردش کر رہے تھے جن کے جواب تھمرو ہی دے سکتی تھی اور میں اس کی طرف جا رہا تھا۔ اس میں تو اب کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا تھا کہ یہ سارا کھیل تھمرو نے کھیلا تھا مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟ یہ سوال مجھے الجھائے ہوئے تھا۔ اس نے مجھے اپنی خوابگاہ میں اسی لیے بلایا تھا کہ میں بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوں اور پھر پکڑا جاؤں۔ مجھے بدحواس کرنے اور اپنی خوابگاہ سے فرار ہونے پر مجبور کرنے کے لیے اس نے بہت خوب صورت چال چلی

ی۔ خادم کا اعتراف اس بات کا ثبوت تھا کہ اس نے
ھمرو کے اشارے ہی پر اچانک اس کی خوابگاہ میں
خل ہو کر منگو خاں کے ادھر آنے کی اطلاع دی تھی۔
ھمرو کا مقصد یہ تھا کہ بدحواس ہو کر کوئی ایسی غلط
کت مجھ سے سرزد ہو جائے جو میرے گلے کا
ندا بن جائے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی
ی۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا وار خالی نہ جاتا
راس نے مجھے اور میری حیثیت کو سمجھنے میں غلطی کی
ی۔ میں اسی لیے اس کے وار سے بچ گیا تھا۔ تھمرو
ی قراقرم میں موجودگی بھی میرے لیے ایک بڑا سوال
ی۔ آخر وہ اچانک اتنے دن غائب رہ کر کہاں سے
آمد ہو گئی؟ میں انہی خیالوں میں الجھا ہوا خادم کے
راہ اس کی خوابگاہ کے دروازے تک پہنچ گیا۔

خادم سے پہلے میں نے ہی بند دروازے پر دستک
ی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی
ھمرو ہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر پہلے
رت کے آثار نظر آئے' پھر وہ کچھ خوفزدہ سی دکھائی
ی۔ اس کے بعد چند ہی لمحوں میں جیسے اس نے خود پر
و پالیا۔ اب اس کے ہونٹوں پر بڑی قاتل مسکراہٹ
قص کر رہی تھی۔

"اے بوغا! میں تیرا ہی انتظار کر رہی تھی۔" وہ
کرا کر بولی۔

"میرا انتظار یا اس خبر کا انتظار کہ مجھے محل کے
فظوں نے ہلاک کر دیا؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تو اندر تو آ! باہر کیوں کھڑا ہے؟" اس نے ایک
ائے دلبری سے میرا ہاتھ تھام لیا' پھر خادم سے
طب ہوئی۔ "تو جا اور اپنی زبان بند رکھ!"

خادم پلٹ کر روانہ ہو گیا اور میں اس کے ہمراہ
ابگاہ میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے اپنے بستر پر لے جا
ر بٹھا دیا اور پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ اچانک
رے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ میرے لیے اس کا یہ
ل غیر متوقع تھا۔ چند لمحوں کے لیے میں گم صم ہو کر
گیا۔ اس کے حسین اور گداز جسم کے لمس نے میرا
ان خون تیز کر دیا۔ اب میں بہرحال وہ پہلے والا بوغا
نہیں تھا جس کے لیے عورت کا جسم ایک راز تھا۔ میں
اب عورت کے جسم کا ذائقہ چکھ چکا تھا۔ جب تھمرو
مجھے پہلی بار ملی تھی تو میرا رویہ مدافعت کا تھا۔ اس کا
ایک سبب یہ بھی تھا کہ مجھے اپنی زندگی کی طرف سے
خطرہ لاحق تھا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ مجھے ہلاک کرا دیا
جائے گا لیکن اب ایسی کوئی بات نہیں تھی اس لیے
اس کے قرب سے میرا متاثر ہونا فطری بات تھی۔ اسی
کے ساتھ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی
تھا کہ تھمرو ایک حسین ناگن ہے۔ وہ ڈس بھی سکتی
ہے بلکہ اس نے مجھے ڈسنے ہی کی کوشش میں ناکام ہو
کر اپنے قرب سے فیضیاب ہونے کا موقع دیا ہے۔ وہ
دوبارہ بھی حملہ کر سکتی ہے۔ میرے ذہن میں جیسے ہی یہ
خیال آیا' میں نے اس کا سر اپنے زانو سے ہٹا دیا۔

"تھمرو! اٹھ کر بیٹھ جا اور سیدھی طرح بات کر!"
میرے لہجے میں سختی تھی۔ "یہ نہ بھول کہ یہ قصبک
نہیں قراقرم ہے۔"

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر غم و غصے کے
تاثرات ابھرے اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شاید اس طرح
کبھی کسی نے اس کی ہتک نہیں کی تھی۔

"تو اتنے دن بعد بھی ویسا ہی ہے' بالکل پتھر' بالکل
بے حس!" وہ بولی مگر اس کے لہجے میں غصہ نہیں دکھ
تھا۔

"ان باتوں کو چھوڑ تھمرو اور مجھے بتا کہ تو نے
میرے ساتھ یہ کھیل کیوں کھیلا تھا؟" میں نے بدستور
سخت لہجہ اختیار کیا حالانکہ میرا دل کچھ اور ہی چاہ رہا
تھا۔ اس کے حسن کی بہار دیکھ کر میرے دل کی
دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔

"سیدھی اور صاف بات سننا چاہتا ہے تو سن بوغا کہ
میں تجھ سے انتقام لینا چاہتی تھی۔" اس نے بلا جھجک
کہہ دیا۔

"کس بات کا انتقام؟ میں نے آخر تیرا کیا بگاڑا
تھا؟"

"تو نے میرے حسن کی توہین کی تھی۔" اس نے
جواب دیا۔ "میں نے جس مرد کو چاہا اپنے قدموں

پر جھکا لیا۔ کبھی کوئی مرد میری خوابگاہ سے کنوارا بچ کر نہیں گیا مگر وہ تو اور صرف تو تھا جس نے مجھے ٹھکرا کر میری توہین کی۔ کیا تو وہ دن بھول گیا جب تجھے میری ماں نے میرے ہاتھوں سے جھپٹ لیا تھا؟"

"ہاں مجھے یاد ہے' سب کچھ یاد ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر اب تو ان باتوں کو بھول جا!"

"میں بھول سکتی ہوں لیکن صرف ایک شرط پر کہ تو مجھے یہ موقع دے کہ میں تجھے فتح کرلوں۔" اس کی آواز اور لہجے میں وہی شوریدہ سری تھی جو میں نے قصبک میں محسوس کی تھی۔

"اگر میں تیری خواہش کو ٹھکرادوں تو؟" میں نے اسے گھور کر کہا۔

"تو پھر تیری اور میری کھلی جنگ ہے۔" تھمرو کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"ہم دو دشمنوں کی طرح جئیں گے اور یقین کر کہ مجھے دوستی ہی کی طرح دشمنی کے آداب بھی آتے ہیں۔"

مجھے اعتراف ہے کہ اس کی صاف گوئی اور سچائی سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہا جو کچھ اس کے دل میں تھا' وہ زبان پر تھا۔ وہ اس بات سے ناآشنا تھی کہ جسے وہ اپنی خواہش کا نام دے رہی ہے' وہ اب خود میری خواہش بن چکی ہے مگر میں فوری طور پر ہتھیار ڈالنے کے حق میں نہیں تھا۔

"خیر! اس بات کا فیصلہ بعد میں ہوگا تھمرو کہ تو میری دشمن بنتی ہے یا دوست! فی الحال مجھے یہ بتا کہ تو یہاں کیسے آپہنچی؟" میں نے نرم لہجہ اختیار کیا۔

"میں یہاں خود نہیں آئی بلکہ لائی گئی ہوں۔" وہ غمگین سے لہجے میں بولی۔ "مفتوح افراد کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے بوغا! یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ان سے ان کی مرضی چھین لی جاتی ہے۔ میں بھی مفتوح ہوں اس لیے یہاں آنے میں میری مرضی کو دخل نہیں تھا۔"

"مجھے معلوم ہوا تھا کہ تیری ماں نے خودکشی کرلی تھی مگر مجھے تیرے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ تو کہاں گئی یا تجھ پر کیا گزری!" میں نے کہا۔

"کیا تو واقعی یہ جاننے کے لیے بے چین تھا؟ کیا تجھے میری یاد آئی تھی بوغا؟" وہ عجیب سے پراشتیاق لہجے میں بولی۔

"ہاں!" میں نے سر ہلایا حالانکہ میرے ذہن میں اس کے لیے تجسس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں صرف یہ جاننے کے لیے متجسس تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا! لیکن نہ جانے کیوں اس وقت میں نے اس سے کہہ دیا۔ "ہاں تھمرو تو مجھے یاد آئی تھی کیونکہ تو ایسی عورت نہیں جسے آسانی سے بھلا دیا جائے۔" شاید میں نے یہ الفاظ اس لیے کہے تھے کہ میں اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔" وہ واقعی مسرور نظر آنے لگی۔

"تو پھر میرے سوال کا جواب دے!" میں بولا۔

"ملکہ روسودان نے خودکشی کرلی تھی' تجھے علم بھی ہے۔" اس نے بتایا۔ "برقائی خاں نے قصبک کو فتح کرلیا تھا مگر وہ میری خود سر ماں کو فتح نہ کرپایا۔ وہ آزاد پیدا ہوئی تھی اور آزاد ہی مری۔ اب وہ مرچکی ہے تو مجھے اس کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ میں ناحق اس کا مقابلہ کرتی تھی حالانکہ میں اس کے پاؤں کی خاک بھی نہیں تھی۔ یہی دیکھ لے کہ اس نے آزادی کی موت کو پسند کیا اور میں فاتحوں کی آغوش میں قید ہو گئی۔" تھمرو کا لہجہ اداس ہوتا چلا گیا "مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ قصبک فتح کرلیا گیا ہے اور راہ فرار بھی مسدود ہو چکی ہے۔ مجھے علم تھا کہ ملکہ روسودان نے خودکشی کرلی مگر اس کے باوجود مجھ میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ بڑھ کر خود بھی موت کو گلے لگا لیتی۔ سو اس کا انجام وہی ہوا جو ہونا تھا۔ مجھے گرفتار کرلیا گیا اور جب پہلی بار مجھے اپنے فاتح کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ جیسے پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ اس نے شاید اپنی پوری زندگی میں مجھ سے حسین عورت نہیں دیکھی تھی۔ میرا فاتح برقائی خاں تھا مگر اس نے میرا جسم تو فتح کرلیا' میری روح کو فتح نہ کرسکا۔ اس نے مجھے اپنی کنیز بنا لیا۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہ ہوئی کیونکہ وہ چاہتا تو مجھے قتل

بھی کرا سکتا تھا۔ اس نے وہی کیا جو ایک فاتح، مفتوح کے ساتھ کرتا ہے۔ ہاں اس نے میرے اوپر ایک احسان بھی کیا کہ میرے جسم کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لیا ورنہ وہ چاہتا تو مجھے قحبہ بھی بنا سکتا تھا۔ سو میں اس کی آغوش گرمائی رہی لیکن کب تک آخر کو وہ دن آتا ہی تھا کہ وہ میرے جسم کی شادابیوں سے اکتا جاتا اور وہ اکتا گیا۔ سن بوغا! مرد بھی ایک عورت کی یکسانیت قبول نہیں کر سکتا، صرف ایک ہی عورت کا جسم اسے مطمئن نہیں کر سکتا۔ شاید اسی لیے کسی مذہب کے بارے میں، میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس نے ایک مرد کو کئی کئی عورتیں رکھنے کی مذہبی آزادی دی ہے مگر میرے خیال میں یہ آزادی عورتوں کے لیے بھی ہونی چاہیے تھی، خصوصاً مجھ جیسی عورتوں کے لیے! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا جیسے اپنی بات کی تائید چاہتی ہو۔

"میں کیا سمجھتا ہوں، اس بات کو چھوڑ اور اپنی بات کر!" میں بولا۔

"ہاں تو میں تجھے بتا رہی تھی کہ برقائی خاں مجھ سے اکتا گیا اور پھر اس نے فیصلہ کی کہ وہ مجھے اپنے بڑے بھائی اور نئے خاقان منگو خاں کو بطور تحفہ نذر کر دے گا۔ سو جب وہ قراقرم کے لیے چلا تو میں بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے مجھے بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا اور میرے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کا فیصلہ قبول کر لیتی۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"تو اب تو خاقان منگو خاں کا پہلو گرما رہی ہے؟" میں نے کسی قدر حقارت سے کہا۔

"نہیں! ابھی اس نے مجھے اپنی آغوش کی زینت نہیں بنایا لیکن میں نے محسوس کر لیا ہے کہ اسے اپنے بھائی کا تحفہ پسند آ گیا ہے ورنہ آج وہ مجھے بر سر دربار اپنے زانوں پر نہ بٹھاتا۔ مجھے زانو پر بٹھانے کا مطلب یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس نے اپنے بھائی کے تحفے کو قبول کر لیا ہے مگر تو۔۔۔ تو کیوں اس بات سے کبیدہ خاطر ہو رہا ہے؟"

"اس لیے کہ تجھے دعویٰ میری محبت کا ہے اور بیٹھی کسی دوسرے کی آغوش میں ہے۔" اس نے کہا۔

"میں نے تجھ سے محبت کا دعویٰ تو نہیں کیا بوغا! میں تو محبت پر یقین ہی نہیں رکھتی۔" اس نے بے جھجک اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"پھر تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟" میں نے اسے گھور کر پوچھا۔

"صرف تیرا جسم!" اس نے جواب دیا اور جسم محبت نہیں ضرورت ہے۔"

"مگر تیری یہ ضرورت تو منگو خاں بھی پوری کر سکتا ہے۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے لیکن جوان جسموں کے مطالبے کچھ اور ہوتے ہیں۔ جوان جسموں کو جوان جسموں ہی کی طلب ہوتی ہے۔ منگو خاں بھی اپنے بھائی برقائی خاں کی طرح جوانی کی حدود سے گزر کر ادھیڑ عمری کی حدود میں داخل ہو چکا ہے مگر تو ابھی جوان ہے اور تیرا ہرا بھرا بدن ابھی بہت دن جوان رہے گا۔ اس وقت تک تو ہر جوان جسم کی تمنا رہے گا۔"

"لیکن تو نے یہ بھی سوچا کہ اگر منگو خاں کو پتا چل گیا کہ تو کسی جوان جسم کی تمنا رکھتی ہے تو تیرا کیا حشر ہو گا؟" میں نے کہا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے کہ قتل کر دی جاؤں گی۔" وہ پر سکون لہجے میں بولی۔

"پھر بھی تجھے خوف نہیں آتا؟"

"موت تو ایک دن آنی ہی ہے تو پھر اپنی زندگی کیوں نہ جیا جائے!"

مجھے تھمرو کی خوابگاہ میں کافی دیر ہو گئی تھی میں اس نڈر اور بے باک عورت سے خوف سا محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنی موت کی کوئی پروا نہیں تھی مگر میں ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا۔

مجھے علم تھا، اس بات کے قوی امکانات تھے کہ یہ بات منگو خان سے نہ چھپی رہ سکے گی کہ میں محل میں آیا تھا اور کافی دیر تھمرو کی خواب گاہ میں رہا تھا۔

عورت کے معاملے میں ہر مرد شکی ہو جاتا ہے' خاص طور پر حسین عورت کے معاملے میں۔ تھمرو بھی حسین تھی اور منگو خاں مجھ پر شک کر سکتا تھا۔ میرے ذہن میں جیسے ہی یہ خیال آیا' میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو کہاں چلا اچانک؟ کیا ہوا؟" مجھے کھڑا ہوتا دیکھ کر تھمرو نے حیرت سے کہا۔

"میں اب جا رہا ہوں۔ مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ابھی اس بات کا فیصلہ تو ہوا ہی نہیں کہ میں تجھے اپنا دوست سمجھوں یا دشمن!" تھمرو بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔

وہ اس لمحے اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے مجھے بڑی اچھی لگ رہی تھی' اتنی اچھی کہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ میں اسے بڑھ کر اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں مگر ابھی میں محتاط رہنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے قیامت جسم سے نظر ہٹالی تاکہ میرے جذبات بے قابو نہ ہوں۔

"تھمرو! بعض فیصلے بہت اہم ہوتے ہیں جن میں جلد بازی ممکن نہیں ہوتی۔" میں نے نگاہ نیچی کر کے کہا۔ "تو مجھے سوچنے کا موقع دے!"

"تو میرے لیے سوچنے پر تو آمادہ ہوا بوغا! میرے لیے یہ بات بھی انتہائی مسرت کا سبب ہے۔ تو پہلے بھی ایک بار میری خوابگاہ میں جیسا آیا تھا ویسا ہی چلا گیا تھا۔ اگر آج بھی یوں ہی چلا جائے گا تو مجھے زیادہ دکھ نہیں ہو گا۔۔۔ جا اور میرے بارے میں سوچ۔" یہ کہہ کر وہ میرے سامنے سے ہٹ گئی۔

میں اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی کے ساتھ خوابگاہ سے نکل گیا۔ اس کی خوابگاہ تک آتے ہوئے میں نے راستے کو ذہن میں رکھا تھا اس لیے مجھے محل کے صدر دروازے تک پہنچنے میں دقت پیش نہیں آئی۔

کچھ دیر بعد ہی میں منگو خاں کے محل سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سرقوشنی بیگی کے محل کی طرف جا رہا تھا۔

سرقوشنی بیگی کے محل میں پہنچ کر جب میں اپنے کمرے میں داخل ہو رہا تھا تو نیند سے میری پلکیں بوجھل تھیں اس لیے بستر پر دراز ہوتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

دوسرے دن صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ بیدار ہونے کے بعد میں گھوڑی کا دودھ پی کر ہی بیٹھا تھا کہ سرقوشنی بیگی کے خادم نے آ کر بتایا کہ سرقوشنی بیگی نے مجھے اپنی خوابگاہ میں طلب کیا ہے۔ صبح ہی صبح میں اس طلبی کا مقصد نہ سمجھ سکا۔ بہرحال مجھے تعمیل حکم تو کرنی ہی تھی۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ اتنی صبح کوئی اس سے ملنے آ جائے گا لیکن وہاں موجود شخص کوئی غیر نہیں بلکہ اسی کا بیٹا ہلا کو خاں تھا جو اس وقت تنہا نہیں تھا۔ ہلا کو کے ہمراہ اس کی چہیتی بیوی دوقوز بھی تھی۔ ہلا کو خاں سے میں ہمیشہ کٹا کٹا سا رہتا تھا کیونکہ وہ مجھے بہت گہرا دکھائی دیتا تھا۔ بظاہر وہ بہت پرمزاح اور خوش مزاج نظر آتا تھا مگر اندر سے اتنا ہی سخت گیر اور سفاک تھا۔ ہلا کو خاں کے ظاہر و باطن سے تمام ہی منگول اچھی طرح آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بظاہر وہ ہنستا مسکراتا ہوا شخص اپنے اندر جہنم سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے وہ اچانک رک کر کسی کو قتل کیے جانے کا حکم دے دے' اور پھر دوبارہ قہقہے لگانے لگے۔ ہلا کو خاں کے مزاج میں اس کی بیوی دوقوز کو بھی بہت دخل تھا۔ ہلا کو خاں کی کئی بیویاں تھیں مگر اس کے قریب ترین دوقوز ہی تھی۔ وہ دوقوز جو کبھی اس کے باپ تولوئی کی بیوی یعنی اس کی سوتیلی ماں تھی' اب باپ کی موت کے بعد اس کی بیوی بن گئی تھی۔ منگولوں میں یہ دستور تھا کہ اولاد اپنے باپ کی بیویوں کو باپ کے انتقال ہونے پر آپس میں بانٹ لیتے تھے وہ اپنے باپ کی بیویوں کو بھی باپ کا ورثہ جانتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا نقطۂ نظر یہ بھی تھا کہ گھر کی عزت باہر یا مال نہ ہو۔ دوقوز' ہلا کو خاں کے باپ تولوئی کی سب سے کم عمر بیوی تھی مگر اس کے

باوجود وہ عمر میں ہلاکو خاں سے کئی سال بڑی تھی۔ دو قوز کا تعلق بھی کیونکہ کرائت قبیلے سے تھا جس سے سرقوشنی بیگی تھی اس لیے وہ بھی نسطوری عیسائی تھی البتہ ہلاکو خاں کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتا تھا۔

میں نے سرقوشنی بیگی کی خوابگاہ میں داخل ہو کر باری باری ہلاکو خاں اور دو قوز کی جانب دیکھا' پھر سرقوشنی بیگی کے سامنے پہنچ کر اسے تعظیم دی۔ سرقوشنی بیگی نے مجھے ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب میں بیٹھ گیا تو بولی۔ "بوغا! میں تجھے بھی اب اپنی اولاد کی طرح سمجھتی ہوں۔ یوں بھی میرے ایک بیٹے کا نام' تیرے نام کا نصف ہے۔" میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے اویق بوغا کی طرف ہے۔ وہ قدرے توقف سے پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "ہلاکو آج اپنی طاقت کا عام مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔ دو قوز کا بھی منشا ہے کہ ہلاکو ایسا کرے اور اس کے شوہر کی دھاک بیٹھ جائے۔ ہلاکو کا خیال تھا کہ اویق بوغا بھی اس سے مقابلہ کرے مگر میں نے منع کر دیا۔ کیونکہ تو بھی میری اولاد کی طرح ہے اور بگھاتر ہے اس لیے میں نے کہا کہ ہلاکو سے اویق بوغا کی جگہ بطریق بوغا مقابلہ کرے۔ بول کیا تو راضی ہے؟"

میں سرقوشنی بیگی کی بات سن کر سناٹے میں آگیا۔ بھلا میرا اور ہلاکو خاں کا کیا مقابلہ ہو سکتا تھا! میں کچھ دیر خاموش رہا' پھر پہلو تہی کی غرض سے بولا۔ "اے الاؤ کی رکھوالی اور اے چار بگھاتر بیٹوں کی ماں! مجھے تیرے حکم سے انکار کی جرأت بھلا کیسے ہو سکتی ہے مگر میں اور میرے بگھاتر بیٹے کا سامنا کروں' یہ کیسے ممکن ہے؟ میں تجھ پر اور تیرے بگھاتر بیٹوں پر اپنی جان تو قربان کر سکتا ہوں لیکن ان کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتا۔"

میری بات سن کر ہلاکو خاں زور سے ہنس پڑا' پھر بولا "اے ماں! میں نہ کہتا تھا کہ یہ ڈر جائے گا۔ یہ مقابلہ نہ کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے۔"

"نہیں!" سرقوشنی بیگی نے سخت لہجے میں' ہلاکو خاں کی تردید میں کہا۔ "تو نے غلط کہا تھا۔ بوغا کو تو نہیں سمجھ سکتا۔ یہ تیرے خوف سے ایسا نہیں کہہ رہا بلکہ حقیقت میں اس کے خیالات یہی ہیں۔"

"مگر میں تو اس سے اونی سپاہیوں سے بھی لڑوں گا۔ اس طرح میرا مرتبہ تو کم نہیں ہو جائے گا! مجھے کسی نہ کسی سے تو لڑنا ہی پڑے گا۔ پھر یہ کہ اس کے علاوہ بھی میں دوسروں سے لڑوں گا۔ اس صورت میں اس کے انکار کی گنجائش کہاں ہے!" ہلاکو خاں نے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس لمحے مجھے اس کی مسکراہٹ بہت زہریلی۔

"دراصل بوغا اس بات کو ٹھیک طرح سمجھ نہیں پایا ورنہ وہ انکار نہ کرتا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ بزدل نہیں ہے۔" سرقوشنی بیگی بولی۔

اور میں یہ جان گیا تھا کہ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے اویق بوغا کی جان بچانے کے لیے مجھے قربان کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے خوب علم تھا کہ اس طرح کے مظاہرے محض تماشا نہیں ہوتے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ مجھے اپنی تقدیر کو قبول کرنا ہی پڑے گا۔ یہ سوچ کر میں مضبوط و مستحکم لہجے میں بولا۔ "اے عظیم بیگی! تیرا خادم تیرے حکم کے آگے سر جھکاتا ہے۔ تیرا خادم تیرے حکم پر ہلاکو خاں سے لڑے گا۔"

"تو نے دیکھا ہلاکو؟" سرقوشنی بیگی نے فخرو تمکنت سے کہا۔

"ہاں اے ماں! میں نے دیکھا اور اپنے کانوں سے

حسنِ کلام

دفتر کے منیجر نے ملازم کو جواب دینا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس کی دل شکنی بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ملازم کو بلا کر کہا۔

"صاحبزادے! معلوم نہیں کہ تمہارے بغیر ہم کاروبار کیسے چلائیں گے۔ بہرحال پیر کے دن سے ہم یہ تجربہ کر کے دیکھ رہے ہیں۔"

سنا کہ تیرا شاہان اپنی زبان سے اپنی موت کا اعلان کر رہا ہے۔" ہلاکو خاں ہنس کر بولا۔

"نہیں!" سرقوشنی بیگی سخت لہجے میں بولی۔ "اگر اس نے تیرے آگے ہتھیار پھینک کر تیری اطاعت میں سر جھکا دیا تو تو اسے قتل نہیں کرے گا۔"

"مگر اے ماں! یہ رعایت تو صرف اویق بوغا کے لیے تھی کیونکہ وہ میرا بگھاتر بھائی اور تیرا چھوٹا بیٹا تھا۔" ہلاکو خاں نے اعتراض کیا۔

"ہلاکو کیا تو نے ابھی اپنے کانوں سے نہیں سنا کہ میں نے اسے بھی اپنی اولاد کا درجہ دیا ہے؟ پھر تو کیسے اعتراض کر سکتا ہے!" سرقوشنی بیگی نے کہا اور اس کی بات سن کر میری جان میں جان آئی۔ کم از کم اتنا تو تھا کہ ہلاکو خاں سے اپنی جان بچانے کا میرے پاس ایک موقع تو تھا۔

اس کے بعد وہ دونوں میاں بیوی چلے گئے۔ وہ ابھی نکلے ہی تھے کہ سرقوشنی بیگی کا خادم اندر آیا اور سر جھکا کر بولا۔ "اے عظیم بیگی! بوغا کو خاقان نے طلب کیا ہے۔ اس کا خادم بوغا کو لینے آیا ہے۔"

"مگر کیوں؟ منگو نے بوغا کو کیوں بلایا ہے؟" سرقوشنی بیگی خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی' پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "بوغا! تو جا اور جب لوٹے تو مجھ سے ملنا نہ بھولنا۔"

"جو تیرا حکم اے الاؤ کی رکھوالی!" میں نے ادب سے سر جھکا دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ منگو خاں کے محل سے واپسی پر وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھی! وہ یقیناً" اس طلبی کا مقصد جاننا چاہتی تھی۔

میں سرقوشنی بیگی کی خوابگاہ سے نکلا تو باہر ایک کلہاڑے بردار خادم کو اپنا منتظر پایا۔ وہ خادم مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "اے بوغا! تجھے یقیناً" یہ بتا دیا گیا ہو گا کہ عظیم خاقان نے تجھے طلب کیا ہے!"

"ہاں مجھے پتا چل گیا ہے۔" میں نے جواب دیا اور آگے قدم بڑھاتا ہوا بولا۔ "میں تیرے ساتھ ہی چل رہا ہوں۔"

کلہاڑے بردار خادم میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ یہ طلبی میرے لیے غیر متوقع تھی۔ سرقوشنی بیگی کو منگو خاں کے محل میں میرے طلب کیے جانے پر کوئی خاص تجسس رہا ہو یا نہ رہا ہو مگر میرے دل میں یہ تجسس ضرور تھا کہ مجھے کیوں بلایا گیا ہے! یہ تجسس اس وقت تک برقرار رہا جب تک کہ میں خاقان کے محل تک نہ پہنچ گیا۔

محل پہنچ کر مجھے اس کمرے میں بٹھا دیا گیا جہاں منگو خاں اپنے مہمانوں سے ملاقات کرتا تھا۔ میں اس وقت کمرے میں تنہا اور کچھ خوفزدہ سا تھا۔ میرے خوف کا سبب گزشتہ رات کا واقعہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا منگو خاں کو معلوم ہو چکا ہے' میں رات کے وقت تھمرو کی خوابگاہ میں تھا؟ تھمرو اب کوئی معمولی عورت نہیں رہ گئی تھی۔ اسے بر سر دربار اپنے زانو پر بٹھا کر' منگو خاں نے اس پر اپنا حق ثابت کر دیا تھا۔ اس کا مقصد اگر ایک طرف یہ تھا کہ اس نے اپنے بھائی برقائی کے تحفے کو قبول کر لیا ہے تو دوسری طرف یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اب خاقان کے سوا تھمرو کے جسم پر کسی کا حق نہیں۔ میں منگولوں کے درمیان رہ کر' ان کے تمام رسوم و عقائد سے واقف تھا کیونکہ میں انہی میں پیدا ہوا تھا اور انہی کے درمیان پلا بڑھا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے تھمرو کے حسین اور قیامت خیز جسم نے متاثر کیا تھا لیکن میں نے حدود سے تجاوز نہیں کیا تھا۔ اس سلسلے میں مجھ پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ خوف کے باوجود میرا ضمیر مطمئن تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ اگر میں تھمرو کے قرب کی ذرا سی بھی خواہش ظاہر کرتا تو وہ اپنا جسم میرے سامنے دسترخوان کی طرح بچھا دیتی مگر میں نے اپنے جذبات کو بے لگام نہ ہونے دیا تھا۔ یوں بھی تھمرو میری نظر میں ایک خطرناک عورت تھی' ایک خوبصورت ناگن! جسے کسی کو ڈستے ہوئے ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ تھمرو کا مقصد زندگی ہی حصول خواہش تھا' خواہ اس خواہش کے حصول میں

اسے اپنی زندگی ہی کو داؤ پر کیوں نہ لگا دینا پڑے۔ میں تھمرو کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا اسی لیے بے حد محتاط رہا تھا اور یہ احتیاط میرے کام آئی تھی۔

مجھے ملاقات کے کمرے میں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ میں نے بھاری قدموں کی آوازیں قریب ہوتے سنیں اور پھر کچھ دیر بعد ہی منگو خاں کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں احتراماً" اپنی جگہ سے اٹھا اور سر جھکا کر اسے تعظیم دی۔ وہ کمرے میں ایک جانب اپنے لیے مخصوص مسند پر بیٹھ گیا تو اس نے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے تعمیل حکم کی۔

"بوغا! میں دیکھتا ہوں کہ تو جوان ہے۔" منگو خاں نے آغاز گفتگو کیا۔ جب میں تیری عمر کا تھا تو میرے دل میں بھی اسی طرح آرزوئیں مچلتی تھیں جس طرح تیرے دل میں مچلتی ہوں گی۔ یہ عمر ہی ایسی ہے مگر سن کہ میں نے کبھی قویوق اور اس جیسے دوسروں کی طرح اپنی آرزوؤں کو بے لگام نہیں چھوڑا۔ میں ذرا مختلف تھا اور مختلف ہوں۔ میری نگاہ میں عورت کے جسم کی حیثیت کبھی اس سمور سے زیادہ نہیں بڑھی جسے میں سردی سے بچنے کی خاطر اوڑھتا ہوں۔ دنیا میں عورت کے جسم سے بڑے مقاصد موجود ہیں جن کے حصول کی آرزو انسان کی عظمت ہے اور میں نے ہمیشہ انہی کی آرزو کی ہے۔ کیا میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تو سمجھ رہا ہے" اس نے سوال کیا۔

"ہاں اے عظیم خاقان! میں تیرے ایک ایک لفظ کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" میں نے ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔

"سن کہ میری عظیم ماں تجھ پر مہربان ہے اور وہ تجھ پر اعتماد کرتی ہے اس لیے مجھے بھی تجھ پر اعتماد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تو میرے اس اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گا اور میں جو کچھ پوچھوں گا' سچ سچ بتا دے گا۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کیا اور میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا جیسے میرے چہرے سے دل کا حال جاننا چاہتا ہو۔ میں بڑی حد تک سمجھ چکا تھا۔ پھر آخر اس کی زبان پر وہ سوال آ ہی گیا جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ کہہ رہا تھا تو کل رات میرے محل میں کیوں آیا تھا۔"

"مجھے تھمرو نے بلایا تھا۔" میں نے بغیر جھجکے جواب دیا۔

"کیوں کیا وہ تجھے پہلے سے جانتی ہے اور تو بھی اس سے واقف ہے؟"

میں نے جواب میں اسے اپنے قصبک جانے کا مختصراً" احوال سنایا اور اسی دوران میں ملکہ روسودان کے علاوہ تھمرو کی بوالہوسی کا بھی میں نے اشارتاً" ذکر کر دیا۔ میں نے اسے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ یہ بھی کہ تھمرو مجھ سے کیا چاہتی تھی اور اب اس کا مقصد کیا ہے!

"تو وہ عورت لیوشا (ریگ رواں کے ٹیلے جو کسی ایک جگہ نہ ٹھہریں) کی مانند ہے۔" منگو خاں میری بات سن کر بولا۔ "ایسی عورتوں کا صرف ایک علاج ممکن ہوتا ہے اور وہ علاج ہے جسم کی قید سے ان کی رہائی! انہیں جس جسم پر ناز ہو' وہ ان سے چھین لیا جائے مگر یہ فیصلہ کرنے سے قبل میں تجھ سے ایک بار ضرور یہ پوچھوں گا کہ تو کیا چاہتا ہے میرے اختیار میں یہ بھی ہے کہ میں اس حسین مگر خطرناک عورت کو تیرے حوالے کر دوں۔ بول' بے جھجک بول!"

تھمرو کی موت اور زندگی کا انحصار اس وقت میرے صرف چند الفاظ پر تھا۔ میری آنکھوں میں اس کا حسین و گداز جسم گھوم گیا۔ وہ جسم اس لیے تو نہیں تھا کہ اسے ختم کر دیا جائے۔ میرے ذہن میں خیال آیا۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر میں نے اسے اپنے لیے مانگ لیا تو منگو خاں یہی سمجھے گا کہ میں اس میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ یہی خیال کر کے میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا مگر وہ راستہ تھمرو کی موت پر ختم نہیں ہوتا تھا۔

"اے عظیم خاقان! مجھ پر تیرا احسان ہے کہ تو نے میری باتوں پر یقین کیا اور انہیں سچ جانا لیکن میں اس کے حق میں نہیں کہ اسے ہلاک کر دیا جائے۔" میں

فہرست

ایک شخص کو ایک پاگل کتے نے کاٹ لیا۔ ڈاکٹر نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ فوراً اپنے وکیل کو بلوا کر اپنی وصیت لکھوا دے۔ وکیل کی آمد پر مریض نے ایک طویل فہرست تیار کروانی شروع کر دی۔ وکیل نے بالآخر اُکتا کر کہا۔

"جناب فہرست بہت طویل ہو گئی ہے۔"

"تم چپ رہو۔" مریض نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "میں اس فہرست میں اور بہت سے نام شامل کرنا چاہتا ہوں۔ جنہیں میں یہاں سے نکل کر کاٹ کھاؤں گا۔"

*****

نے عاجزی سے کہا۔

"تو کیا تو اسے اپنانا چاہتا ہے۔" میرا جملہ ختم ہوتے ہی وہ بول اٹھا۔

"مجھے پہلے ہی کچھ شک سا تھا کہ تیرے دل میں اس کی طرف سے چور ہے مگر میں اس عورت کو تجھے بخش دینے کا وعدہ کر چکا ہوں اور میں اس وعدے پر قائم ہوں۔"

"نہیں اے عظیم خاقان! تو نے اپنے خادم کا مدعا نہیں سمجھا۔" میں نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔

"تیرا خادم ہرگز اسے اپنانا نہیں چاہتا۔"

"تو پھر تو اسے زندہ کیوں دیکھنا چاہتا ہے۔" منگو خاں پھر میرا جملہ ختم ہوتے ہی بول اٹھا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس لیے اے عظیم خاقان کہ تیرا بھائی برقائی یہ نہ سمجھے کہ تو نے اس کے تحفے کو حقیر جان کر ٹھکرا دیا۔" میں نے آخر وہ بات کہہ ہی دی جو اس مسئلے کا حل ہو سکتی تھی۔ اس طرح نہ تو میری حیثیت مشکوک ہوتی تھی اور نہ تھمرو کی زندگی خطرے میں پڑتی تھی۔

میری بات سن کر منگو خاں کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔

"میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔ تو شاید نہ جانتا ہو کہ میری عظیم ماں سائیں خاں اور برقائی خاں کی خوشنودی کو کتنی اہمیت دیتی ہے! جب مجھے بھورے نمدے کی مسند پر بٹھایا گیا تھا تو اس دن خود میری عظیم ماں نے برقائی خاں کو اس کے گھٹیا سے متورم ٹخنوں کے سبب آرام دہ گدوں پر بٹھایا تھا۔ یہ اعزاز میری عظیم ماں کی طرف سے کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ بوغا! تیرے آنکھیں بہت دور تک دیکھتی ہیں۔ میں نے تجھے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔"

میرا وار کارگر رہا اور تھمرو کی زندگی بچ گئی۔ یہ سوچ کر مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے منگو خاں کی ستائش کے جواب میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

"بوغا! مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس بے وفا عورت کو قتل نہ کیا جائے لیکن وہ اس قابل بہرحال نہیں کہ میری آغوش میں آئے۔ میں فیصلہ کرتا ہوں کہ اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ بظاہر وہ میرے لیے مخصوص رہے گی لیکن میں اس عورت کو تجھے بخشتا ہوں۔ تو جوان ہے اور تیرے جسم کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ جنہیں بہرحال پورا ہونا چاہیے لیکن تجھے یہ خیال رکھنا ہے کہ یہ راز صرف دو سینوں سے آگے نہ بڑھ پائے کہ میں نے اسے تجھے بخش دیا ہے یاد رکھ کہ یہ راز میری عظیم ماں پر بھی آشکار نہیں ہونا چاہیے۔" منگو خاں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ہر چند کہ اس کے فیصلے نے مجھے مسرور کر دیا تھا مگر میں نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا۔ میں نے کہا۔ "اے عظیم خاقان! تیری عظمت کو تعظیم! تیرا حکم سر آنکھوں پر لیکن یقین کر کہ میرے دل میں اس عورت کے جسم کی کوئی خواہش نہیں۔"

"تیری خواہش ہو نہ ہو مگر تجھے ہمارا فیصلہ قبول کرنا ہو گا اور اس فیصلے کی ایک اہم وجہ ہے۔ سن! جیسا تو نے بتایا اور جیسا میں نے اس عورت کو سمجھا، اسے سننے اور جاننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس

ابوالہوس کو اگر کوئی جسم نہ ملا تو وہ برداشت نہ کر پائے گی۔ ایسی صورت میں وہ میرے لیے رسوائی کا سبب بھی بن سکتی ہے جو میں بہرحال نہیں چاہتا۔ تو اس کے اندر بھڑکنے والے جہنم کو سرد کرتا رہے گا تو وہ شاید وقتی طور پر اپنی آوارگی سے باز آجائے گی۔ جب برقائی خان یہاں سے چلا جائے گا تو اسے قتل کرائے جانے میں کوئی قباحت نہیں ہو گی۔" منگو خاں نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

منگو خاں نے جو کچھ کہا تھا' وہ غلط نہیں تھا۔ اس نے تھمرو کو سمجھ لیا تھا اور اس سے نجات پانے کا راستہ بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ میں نے منگو خاں کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "اے عظیم خاقان! تو نے جو کچھ کہا' وہ تیری دانشمندی کی دلیل ہے۔ تھمرو واقعی ایسی ہی ہے۔ کاش مجھے اس بے وفا اور ابوالہوس عورت کے جذبات کی بھینٹ نہ چڑھنا پڑتا۔"

"مجھے اس کا احساس ہے بوغا! لیکن میں اس سلسلے میں تیرے سوا کسی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں۔ تو نے بہت کم وقت میں میری عظیم ماں کی طرح میرا بھی اعتماد حاصل کر لیا ہے۔"

میں منگو خاں کی بات سن کر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص پر اپنے اعتماد کا اظہار کر رہا تھا جو اس کا جانی دشمن تھا اور نہ صرف اس کا بلکہ پوری منگول قوم کا دشمن تھا۔ وقت اور حالات بھی عجیب کرشمہ ساز ہیں کہ دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست ثابت کر دیتے ہیں۔ میں ان کے درمیان رہ کر ان کی جڑیں کاٹ رہا تھا اور وہ مجھ پر اعتماد کا اظہار کر رہے تھے' مجھے اپنا دوست جان رہے تھے۔ منگو خاں نے مجھ پر اعتماد کر کے ایک طرح سے مجھے اپنی عزت و آبرو کا نگہبان بنا دیا تھا۔ بظاہر جس عورت پر صرف اسی کا حق تھا' اس نے مجھے اس عورت کے جسم سے کھیلنے کی آزادی دے دی تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جو عورت خاقان کے لیے مخصوص ہو' اسے کوئی اور برتے مگر میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا اور میں اس پر

شاعر مشرق

علامہ اقبال رح

کے شعری مجموعے

بانگ درا	36 روپے
بال جبریل	30 روپے
ضرب کلیم	30 روپے
کلیات اقبال	90 روپے

عمدہ کاغذ۔ اعلیٰ طباعت

آج ہی طلب فرمائیں

منگوانے کا پتہ:۔

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

خوش تھا۔"

جب کچھ دیر بعد میں منگوخاں کے محل سے لوٹا تو میری آنکھوں میں تھمو کا حسین اور گداز جسم گھوم رہا تھا۔ میں چشم تصور سے اس حسین جسم کے نشیب و فراز دیکھ رہا تھا جو اب صرف اور صرف میرا ہو چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں واقعی اس راز کو راز ہی رکھوں گا اور تھمو پر بھی اس راز کو آشکار نہیں ہونے دوں گا لیکن پہلا مسئلہ تو سرقوشنی بیگی کو مطمئن کرنا تھا۔ مجھے اسے جا کر بتانا تھا کہ منگوخاں کے حضور میری طلبی کیوں ہوئی تھی! سرقوشنی بیگی کا محل قریب آنے لگا تو بار بار میرے ذہن میں یہی سوال ابھرنے لگا کہ میں اسے کیا بتاؤں؟ ظاہر تھا کہ میں اسے حقیقت سے تو آگاہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ آخر کار جب میں محل کے اندر پہنچ گیا تو مجھے ایک بہانہ سوجھ ہی گیا۔

سرقوشنی بیگی اس وقت بھی اپنی خوابگاہ ہی میں تھی۔ میں نے اس کے خادم سے اطلاع کرائی کہ میں منگوخاں کے محل سے لوٹ آیا ہوں۔ اگر وہ اجازت دے تو حاضر ہو جاؤں۔ اس نے مجھے فوراً اندر بلوا لیا۔

میں اس کے سامنے مودب بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔ "ہاں بوغا! بتا کہ میرے بگھاتر بیٹے منگو نے تجھے کیوں بلوایا تھا؟"

"عظیم خاقان مجھ سے راہب ولیم کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا۔" میں نے پہلے سے سوچا ہوا جھوٹ دہرا دیا۔

میری بات سن کر اس نے ایک طویل سانس لیا اور بولی۔ "اچھا!" اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ پہلے سے کوئی بات فرض کر چکی تھی اور غالباً "وہ یہ بات نہیں تھی۔ قدرے توقف سے وہ پھر بولی۔ "اس نے کیا پوچھا اور تو نے کیا مشورہ دیا؟"

"عظیم خاقان نے وہی بات کی تھی جو کل دربار میں ہوئی تھی۔" میں بولا۔ "وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس راہب کا ہمارے درمیان رہنا سود مند ہے یا نقصان دہ! میں نے اسے بتا دیا کہ راہب کا اصل مقصد کیا ہے!"

"پھر اس نے راہب کے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟" سرقوشنی بیگی نے سوال کیا۔ اس کے لہجے سے اشتیاق کا اظہار ہو رہا تھا اور میں اس اشتیاق کا سبب جانتا تھا۔ وہ عقائد کے اعتبار سے عیسائی تھی اور قدرتی طور پر اس کی ہمدردیاں راہب ولیم کے ساتھ تھیں لیکن میں نے راہب ولیم کی طرف سے اس کے دل میں جو شکوک و شبہات پیدا کر دیے تھے، ان کے سبب وہ خاموش ہو گئی تھی۔

میں نے یہ جاننے کے باوجود کہ راہب ولیم کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ ہے بے جھجک اس کے سوال کا جواب دیا۔ "میں نے عظیم خاقان کو مشورہ دیا ہے کہ وہ راہب ولیم کو قراقرم میں قیام کرنے کی ہرگز اجازت نہ دے تاکہ وہ راہب ہمارے درمیان رہ کر جاسوسی نہ کر سکے۔"

"تو نے ٹھیک مشورہ دیا۔" سرقوشنی بیگی بولی مگر اس کے لہجے میں گرمجوشی نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد ہی میں اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور اس عصبیت کے بارے میں سوچنے لگا جو ہلاکو خاں کی صورت میں میرے مقابل آنے والی تھی۔ سرقوشنی بیگی نے مجھے رخصت کرنے سے قبل بتا دیا تھا کہ سورج ڈوبنے سے پہلے محل کے قریبی میدان میں ہلاکوں خاں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے والا تھا۔

شام ہونے تک میں انہی وسوسوں اور اندیشوں میں گھرا رہا کہ اگر ہلاکو خاں نے اپنی طاقت کا لوہا منوانے کے لیے مجھے ہلاک کر دیا تو کیا ہو گا وہ ایسا کرنے کے لیے کوئی بھی بہانہ تراش لیتا۔ بھلا اس سے جواب طلبی والا تھا بھی کون؟ وہ بہت آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ مقابلے کے دوران میں ایسی صورت پیش آ گئی تھی جو اسے مجبوراً مجھ کو ہلاک کرنا پڑا اور اگر وہ مجھے ہلاک نہ کرتا تو خود اس کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ اس صورت میں بھلا سرقوشنی بیگی کیا کر سکتی تھی! ہلاکوں خاں بہرحال اس کا بیٹا تھا لیکن اگر وہ ہلاکو سے ناراض بھی ہو جاتی تو اس سے مجھے بعد از مرگ کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا! میں وحشی منگولوں کی سرشت اور ان کے انداز و اطوار

سے بخوبی واقف تھا۔ مجھے علم تھا کہ انسانی زندگی سے کھیل جانا' ان کا دلچسپ اور پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ہلاکو خاں بھی منگول تھا اور خاندان زریں کا ایک فرد تھا۔ اس کی رگوں میں بھی منگول خون دوڑ رہا تھا۔ پھر بھلا میں اس کی طرف سے شکوک و شبہات میں مبتلا کیوں نہ ہوتا! خاص طور پر ان حالات میں جبکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اسے اور اس کی بیوی دوقوز کو سرقوشنی بیگی کی یہ بات ناگوار گزری تھی کہ میرے ساتھ بھی وہی رعایت برتی جائے جو خاندان زریں کے کسی فرد کے ساتھ برتی جا سکتی تھی۔ سرقوشنی بیگی نے مجھے اپنے چھوٹے بیٹے اویق بوغا کی جگہ ہلاکو خاں سے لڑوانے کا فیصلہ غالباً اس لیے کیا تھا کہ اس کا کوئی بیٹا بھرے مجمع میں رسوا نہ ہو۔ یہ رسوائی کا طوق اس نے میری گردن میں ڈال دیا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ہلاکو خاں کا مقابلہ کرتے ہوئے سخت خوفزدہ تھا۔ اس کا مضبوط اور گٹھیلا جسم دیکھ کر بھلا کون تھا جو مقابلے کی جرات کرتا! مگر مجھے اس سے مقابلہ کرنا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے میں دیر نہیں کروں گا۔

شام ہوئی تو سرقوشنی بیگی نے مجھے پھر بلا بھیجا۔ اس وقت وہ بڑی سجی سجائی لگ رہی تھی۔ وہ مقابلے میں شریک ہونے کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر بہترین لباس اور سر پر تاج تھا۔ ایک خادم اس کے قریب مختلف ہتھیار لیے کھڑا تھا۔ ان ہتھیاروں میں کلہاڑا' نیزہ' تلوار' ڈھال' خنجر اور تیر کے علاوہ ایک لوہے کی زنجیر بھی تھی۔ جس کے دونوں سروں پر خاردار آہنی گیندیں بندھی ہوئی تھیں۔

"تجھے خبر ہے بوغا کہ یہ ہتھیار کس کے ہیں؟" اس کے لہجے میں عجیب سا جوش تھا۔

"اے عظیم بیگی! مجھے نہیں معلوم!" میں نے جواب دیا۔

"یہ ہتھیار تولوئی کے ہیں' چنگیز خاں کے بگھاتر بیٹے تولوئی کے ہتھیار چار بگھاتر بیٹوں کے اپ نے یہ ہتھیار آخر دم تک اپنے ساتھ رکھے۔ یہ میرے شوہر کے ہتھیار ہیں جو اس کی موت کے بعد آج تک کسی نے استعمال نہیں کیے مگر آج تو' ہاں اے بوغا تو یہ ہتھیار اپنے جسم پر سجائے گا کیونکہ میں نے تجھے اپنا بیٹا کہا ہے۔ میں نے آج تک ان ہتھیاروں سے اپنے بیٹوں کو بھی ہاتھ نہیں لگانے دیا لیکن تو یہ ہتھیار استعمال کرے گا۔ ہاں آج بہت دن بعد میں ان ہتھیاروں کو چلتے ہوئے دیکھوں گی۔ بوغا! انہیں بے عزت نہ ہونے دینا! یہ وہ ہتھیار ہیں جو کسی کے آگے زمین پر نہیں پھینکے گئے۔" سرقوشنی بیگی ایک جوش کے عالم میں کہے گئی۔ اسے یہ بھی ہوش نہ رہا کہ اس طرح بالواسطہ کہہ وہ مجھے اپنے بیٹے ہلاکو خاں کو بھرپور شکست سے دوچار کرنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ بہرحال یہ بڑی بات تھی کہ وہ مجھے اپنے شوہر کے ہتھیار دے رہی تھی جن سے اس کی جذباتی وابستگی تھی۔ انہی جذبات کا نتیجہ تھا کہ ہلاکو خاں کے مقابل وہ مجھے فتح یاب دیکھنا چاہتی تھی۔

میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔ "اے عظیم بیگی! یقین کر کہ میں تیرے عظیم شوہر کے ہتھیاروں کی لاج رکھوں گا۔"

"مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ تیرے لہجے میں وہ جوش نہیں جو ہونا چاہیے تھا۔" وہ بولی۔

"اس لیے کہ ایک طرف تیرا بگھاتر بیٹا ہلاکو خاں ہے اور دوسری جانب تیرے شوہر کے ہتھیار! میں سوچ رہا ہوں کہ تو ان دونوں میں سے کسی کو بھی زمین پر گرتا ہوا دیکھنا پسند نہ کرے گی۔" میں نے اس کی بات سن کر برجستہ کہا۔

"یہ... یہ... تو... تو... کیا کہہ رہا ہے بوغا؟ کیا کہہ رہا ہے؟" سرقوشنی بیگی کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی جیسے اس کے جذبات کے دہکتے الاؤ پر کسی نے پانی ڈال دیا ہو۔ چند لمحے وہ خاموش رہی' پھر ایک دم پرجوش انداز میں کہا۔ "کچھ بھی ہو بوغا! تجھے اپنے جسم پر یہ ہتھیار سجانے ہوں گے۔ سرقوشنی بیگی ایک بار جو کہہ دیتی ہے' اس سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ تجھے یہ ہتھیار استعمال بھی کرنے ہوں گے اور ان کی آبرو بھی رکھنا ہو

گی۔"

"مگر..... مگر..... کیسے..... کیسے اے عظیم بیگی؟"

میں اس کی ضد سے پریشان ہو گیا۔ اس جذباتی عورت نے خواہ مخواہ میرے لیے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔

"تو ہتھیار نہیں پھینکے گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" اس کا لہجہ واقعی فیصلہ کن تھا۔ "اگر یہ ہتھیار زمین پر گرے تو میرے عظیم شوہر اور چنگیز خاں کے بیٹے تولوئی کی روح پر بڑا عذاب ہو گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ تو ہلاکو کے مقابلے پر نہیں ٹھہر سکے گا مگر اس کے باوجود تو ہتھیار زمین پر نہیں پھینکے گا' چاہے خود بے جان ہو کر زمین پر گر پڑے۔"

سرقوشنی بیگی کی بات سن کر میرے ہوش گم ہو گئے۔ مجھے پہلے اپنی زندگی کی جو امید بندھی تھی' وہ امید دم توڑ گئی۔ میری آنکھوں میں موت ناچنے لگی۔ میں خاموش اور دم بخود اس کے سامنے کھڑا رہا۔

"اپنے جسم پر ہتھیار سجا!" معاً سرقوشنی بیگی نے سخت لہجے میں حکم دیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ میں خود اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کاٹ لوں مگر مجھے اس کا حکم ماننا ہی تھا اور میں نے اس کے حکم کو مانا۔ اپنے جسم پر ہتھیار سجا کر میں یوں سرقوشنی بیگی کے ساتھ چلا جیسے وہ مجھے مقتل کی طرف لے جا رہی ہو۔ مجھ سے اس کی محبت یہ دن دکھائے گی' یہ کبھی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ وہ جذباتی عورت زبردستی مجھے اپنے جذباتی سکون کی خاطر دانستہ موت کے منہ میں دھکیل رہی تھی۔

اس میدان میں پہنچنے سے پہلے جہاں وہ مظاہرہ ہونا تھا' مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ موت کا کھیل اتنے بڑے پیمانے پر کھیلا جائے گا اور اسے دیکھنے کو خاندان زریں کے تمام نویانوں کے علاوہ خود خاقان منگو بھی موجود ہو گا۔

جیسے ہی میں' سرقوشنی بیگی کے ہمراہ اس میدان میں پہنچا' پورا میدان نعروں سے گونج اٹھا' وہاں موجود جم غفیر سرقوشنی بیگی اور میرے لیے نعرے لگا رہا تھا۔ سرقوشنی بیگی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ وہ اپنی اور میری تکریم و عزت پر خوش نظر آ رہی تھی مگر میرا خون خشک ہو رہا تھا۔

میدان کی اطراف ایک بڑے سے دائرے کی صورت میں لوگ جمع تھے۔ درمیان میں کافی جگہ چھوڑی گئی تھی ایک جانب بڑا سا تخت بچھا ہوا تھا جس کی دونوں اطراف چھوٹی چھوٹی سی چوکیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دائیں جانب ایک چوکی خالی تھی۔ بقیہ چوکیوں میں سے ایک پر قبلائی خان اور اس کی بیوی جاموی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک اور چوکی پر تنہا اویق بوغا بیٹھا تھا۔ وہ چوکی بائیں جانب تھی۔ بائیں ہی جانب تخت کے بالکل قریب والی چوکی پر ہلاکوں خاں اپنی بیوی دوقوز کے ہمراہ بڑی شان سے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے جسم پر ہتھیار سجے ہوئے تھے جن پر اس کی بیوی دوقوز بڑے پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ تخت پر منگو خاں بیٹھا ہوا تھا۔ جس کی بائیں طرف اس کی محبوب بیوی قطقطائی بیٹھی ہوئی تھی۔ چار چوکیاں تھیں اور ایک تخت جن میں سے صرف ایک چوکی خالی تھی اور سرقوشنی بیگی کے قدم اسی چوکی کی جانب اٹھ رہے تھے۔ ان چوکیوں پر بہترین ایرانی قالین بچھے ہوئے تھے۔ وہ چوکی غالباً" اس لیے خالی چھوڑ دی گئی تھی کہ اس پر سرقوشنی بیگی آ کر بیٹھے۔

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ سرقوشنی بیگی کے ساتھ میں اس چوکی پر بیٹھوں گا اس لیے جب وہ چوکی پر بیٹھ گئی تو میں ایک جانب مودب کھڑا ہو گیا۔

"بوغا! میرے ساتھ آ کر بیٹھ!" سرقوشنی بیگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا اور میں حیرت زدہ سا اس کے قریب جا بیٹھا۔

معاً" اسی وقت ہلاکو خاں تخت کی بائیں جانب بچھی ہوئی چوکی سے اٹھا اور با آواز بلند بولا۔ "میری عظیم ماں آ چکی ہے اور اب میں اپنے کرتب دکھاؤں گا۔" اس کے لہجے میں ہلا کی شوخی تھی۔

اس کی آواز سن کر میرے حواس باختہ ہو گئے۔ موت کا وقت قریب آ رہا تھا۔ میں نے ہلاکوں خاں کی

آواز میں موت کی پکار سن لی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بس اب مجھے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھنا پڑے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ میری بجائے ایک جانب سے دس جوان اپنے جسموں پر ہتھیار سجائے میدان میں آ گئے۔

ان جوانوں کو دیکھ کر ہلاکوں خاں چند قدم آگے بڑھا، پھر قہقہہ لگایا۔ اس کا قہقہہ بڑا وحشیانہ تھا۔ اس نے قہقہہ لگانے کے بعد ان جوانوں کو مخاطب کیا۔ "تمہیں قسم ہے اپنی ماؤں کے اس دودھ کی جو تم نے ان کی چھاتیوں سے پیا ہے، میرے ساتھ کوئی رعایت نہ کرنا۔ یہ سوچ کر مجھے ہلاک کرنے سے دامن نہ بچانا کہ میں خاقان منگو کا بھائی ہوں اور الاؤ کی رکھوالی کا بیٹا ہوں اور چنگیز خاں کا پوتا ہوں اور خاندان زریں کا ایک نوبان ہوں۔" ہلاکو خاں کسی شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ "سن لو کہ میں بھی تم میں سے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کروں گا۔ اس میدان سے یا تو تمہاری لاشیں اٹھیں گی یا میری!" یہ کہہ کر وہ چند لمحے رکا، مسکرایا، پھر بولا۔ "اگر میدان سے بھاگے تو میں ہلاکو خاں تمہیں تمہاری بیویوں کی آغوش سے بھی کھینچ لاؤں گا اور پھر تمہیں ذلیل و رسوا کر کے تمہارے گلے کاٹ ڈالوں گا اس لیے بہتر ہے کہ تم عزت کی موت قبول کرو!" اپنے الفاظ ختم ہوتے ہی اس نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا اور اپنے کندھے سے لٹکا ہوا کلہاڑا اتار کر فضا میں لہرایا۔

گویا وہ مقابلے کا اعلان تھا کیونکہ میں نے دیکھا کہ جواب میں ان دسوں جوانوں نے بھی اپنے اپنے کلہاڑے اور ڈھالیں سنبھال لی تھیں۔

ہلاکوں خاں، شمال کی جانب سے چلنے والی کالی آندھی بوران کی طرح ان جوانوں کی طرف اپنا کلہاڑا لہراتا ہوا جھپٹا اور فضا ایک بار پھر نعروں سے گونج اٹھی لیکن اب یہ نعرے چنگیز خاں کی سولدہ کے نام لگائے جا رہے تھے۔ گویا چنگیز خاں کی سولدہ (روح) ہلاکو خاں کے جسم میں حلول کر گئی تھی۔

چشم زدن میں یوں محسوس ہوا جیسے ہلاکو خاں بادل کی طرح ان جوانوں پر چھا گیا۔ اس کے پہلے ہی حملے میں جوانوں کی تعداد دس کی بجائے آٹھ رہ گئی۔

ہلاکو خاں جس طرح بوران کی طرح ان پر جھپٹ کر حملہ آور ہوا تھا، اسی طرح پلٹا اور تخت کے قریب کھڑا ہو کر قہقہے لگانے لگا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک جوان کا کٹا ہوا سر، اس کے دھڑ سے الگ ہو کر زمین پر تڑپ رہا تھا، اور ہلاکو خاں اس طرف انگلی اٹھا اٹھا کر یوں قہقہے لگائے جا رہا تھا جیسے اس کٹے ہوئے سر کو زمین سے اچھلتے دیکھ کر اسے اپنے قہقہوں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ دوسرے مقتول جوان کا سینہ، ہلاکو خاں کے کلہاڑے نے اس طرح کھول دیا تھا جیسے کتاب کے دو ورق جدا جدا پڑے ہوں۔

وحشت و بربریت اور سفاکی کا وہ تماشا دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن دوسری جانب میں یہ سوچ کر خوش بھی ہو رہا تھا کہ جو خون بہہ رہا تھا، وہ منگول خون تھا، منگول خون جس سے مجھے نفرت تھی۔

کچھ دیر ہی میں دونوں لاشیں میدان سے اٹھالی گئیں۔ اس بار ہلاکو خاں نے اپنی تلوار نیام سے نکال کر لہرائی۔ یعنی اب وہ کلہاڑے کے بعد تلوار کے ہاتھ دکھانا چاہتا تھا۔ بقیہ آٹھ جوانوں نے بھی اپنی تلواریں جواب میں لہرائیں مگر فاصلہ ہونے کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ وہ سب گھبرائے ہوئے سے تھے۔ نہ جانے اب کس کی قضا آئی ہے؟ میں نے سوچا اور دیکھا کہ ہلاکو خاں اپنی تلوار لہراتا ہوا اور اس بار کسی صحرائی بگولے کی طرح رقص کرتا ہوا ان جوانوں کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا جو اس کا حملہ روکنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔

پے در پے چھناکے سے ہوئے اور پھر یکے بعد دیگرے تین چیخیں بلند ہوئیں۔ انہیں چیخوں میں ایک وحشیانہ قہقہہ بھی شامل تھا اور یہ قہقہہ موت کا قہقہہ تھا جو ہلاکو خاں کے حلق سے ابلا تھا۔ وہ بگولے ہی کی طرح رقص کرتا ہوا پھر ایک بار تخت کے قریب آ کھڑا ہوا۔ میں نے اس مجسم موت کو دیکھا اور اسی وقت میری نگاہ اس کے بائیں بازو پر پڑی جس سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے زخمی بازو کو

اپنے منہ سے قریب کیا اور پھر اپنا خون چاٹنے لگا۔ جب اس نے اپنے زخم سے منہ ہٹایا تو اس کے ہونٹوں پر خون لگا ہوا تھا۔ اس نے سرقوشنی بیگی کی طرف دیکھا اور زور سے ہنس پڑا۔ مجھے اس کے خون میں لتھڑے ہوئے ہونٹ بڑے کریہہ لگ رہے تھے جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی درندہ ہو۔

اب جوانوں کی تعداد نصف رہ گئی تھی۔ تینوں لاشیں میدان سے اٹھائی جا چکی تھیں۔ پانچوں جوانوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک زخمی بھی تھا مگر زخمی ہونے والے کو بھی میدان سے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں سے ان کی لاشیں ہی لے جائی جا سکتی تھیں اور شاید انہیں اب یقین ہو چکا تھا کہ موت ان کا مقدر ہو چکی ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہلاکوں خاں نے اپنے بازو کے زخم کو دو تین بار چاٹا تھا اور خون بہنا بند ہو گیا تھا اور اب وہ اپنے ہاتھ میں نیزہ سنبھال رہا تھا۔

پانچوں جوانوں نے ہلاکو خاں کے ہاتھ میں نیزہ دیکھتے ہی جلدی سے اپنے اپنے نیزے سنبھال لیے تھے۔ میں نے اس طرح یہ جانا کہ لڑائی کے لیے ہتھیار منتخب کرنے کا حق ہلاکو خاں کو تھا۔

ایک زخمی درندہ نیزہ سنبھالے پانچ بے گناہوں کا خون بہانے کسی تیر کی طرح ان کی طرف گیا۔ ہر بار اس کا انداز جدا ہوتا تھا' کبھی آندھی کی طرح' کبھی بگولے کی طرح رقص کرتا ہوا اور کبھی تیر کی طرح بالکل سیدھا اور انتہائی تیز! جس طرح زخمی ہو کر درندے کی وحشت میں اضافہ ہو جاتا ہے' وہی حال ہلاکو خاں کا تھا۔ اس کے منہ سے بڑی بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں جیسے واقعی کوئی زخمی درندہ غرا رہا ہو۔ وہ بجلی کی طرح کوند کوند کر اپنے شکار پر جھپٹ رہا تھا' میں شاید وہ منظر کبھی نہ بھول سکوں جب اس کے مقابلے پر صرف ایک جوان رہ گیا تھا اور وہ اپنا نیزہ پھینک کر اس کے قدموں میں گر گیا تھا مگر موت سے پناہ کس کو ہے؟ ہلاکو خاں نے اپنے قدموں پر جھکی ہوئی اس جوان کی گردن کو اپنے خون آور نیزے سے چھید دیا تھا اور پھر اس کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا تھا۔

اس شخص کی گردن پر دس بے گناہ انسانوں کا خون تھا جو یوں وحشیانہ قہقہے لگا رہا تھا۔ میں نے اپنے دل میں اس کے لیے مزید نفرت محسوس کی اور سوچا کہ کاش میں اس سے زیادہ طاقتور ہوتا' اس کے غرور کو خاک میں ملا سکتا!

ہلاکوں خاں پھر تخت کے قریب آ کھڑا ہوا تھا اور اب وہ میری جانب دیکھ کر بڑے تمسخرانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میں نے اپنی نگاہ دوسری طرف کر لی۔ میدان سے پانچوں جوانوں کی لاشیں اٹھائی جا رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کچھ دیر بعد میری لاش بھی اسی طرح اٹھائی جا رہی ہو گی؟ یہ سوچ کر میرا دوران خون تیز ہو گیا۔ اسی وقت سرقوشنی بیگی نے مجھے مخاطب کیا۔

"تو نے دیکھا بوغا کہ میرے لہو میں کتنی زندگی ہے!" اس کے لہجے سے غرور جھلک رہا تھا۔ قدرے توقف سے وہ پھر بولی۔ "مگر تو میرا حکم ۔ یاد رکھے گا' بھولے گا نہیں! تو نے دیکھا کہ ان جوانوں میں سے بھی کسی نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ وہ کتنی بہادری کی موت مر گئے!"

میرا دل چاہا کہ جواب دوں اور اسے بتاؤں' اگر ان میں سے کوئی ہتھیار ڈال بھی دیتا تو زندہ نہ بچتا۔ میں اس جوان کی مثال دے سکتا تھا جس نے ہلاکو خاں کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ کیا وہ اعتراف شکست نہیں تھا؟ کیا وہ ہتھیار ڈالنے سے بھی آگے کی بات نہیں تھی؟ تو کیا ہلاکو خاں نے اسے زندہ چھوڑ دیا؟ میں نے یہ سب کچھ سوچا ضرور مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔

"تو خاموش کیوں ہے بوغا؟ بولتا کیوں نہیں؟" سرقوشنی بیگی نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر کہا۔

"اے عظیم بیگی! مجھے تیرا حکم یاد ہے اور میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔" میں سپاٹ سے لہجے میں بولا۔ دراصل اس وقت مجھے بڑی شدت سے سولدہ یاد آ رہی تھی۔ وہ مجھے اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے اس یقینی موت سے بچا سکتی تھی۔ مجھے اس کا وہ پراسرار

ہتھیار بھی یاد آ رہا تھا جس سے لوہا پانی کی طرح بہنے لگتا تھا اور آدمی پلک جھپکے مر جاتا تھا۔ اگر میرے پاس وہ پراسرار ہتھیار ہوتا تو میں ہلاکو خاں کو اس کے غرور کا مزا چکھا دیتا۔

"اب میری ماں کا چیتا مجھ سے مقابلہ کرے گا۔" معاً" ہلاکو خاں کی طنز بھری بلند آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی اور میں چونک اٹھا تھا۔

میں نے میدان کی طرف دیکھا۔ وہاں سے جوانوں کی لاشیں اٹھائی جا چکی تھیں۔

"اٹھ کر کھڑا ہو جا بوغا!" سرقوشنی بیگی نے سخت لہجے میں حکم دیا۔ "کھڑا ہوتے ہی اپنی تلوار نیام سے نکال کر لہرا کہ اب ہتھیار کے انتخاب کا حق تجھے ہے۔"

میں ایک خواب کے سے عالم میں اٹھا اور نیام سے تلوار نکال کر بلند کی۔ وہ تلوار عام قسم کی تلواروں سے بہت بڑی اور چوڑے پھل کی تھی۔ ہلاکو خاں کی تلوار اس کے سامنے بہت چھوٹی تھی۔ مجمع نے میرے اور ہلاکو خاں کے نام لے کر نعرے لگائے اور اس کے فوراً" بعد ہی منگو خاں کی گونجیلی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں اس تلوار کو اچھی طرح پہچان گیا ہوں۔ یہ تلوار میرے عظیم باپ اور جد عظیم کے بیٹے تولوئی کی ہے۔ میں بوغا سے سوال کرتا ہوں کہ اس کے پاس یہ تلوار کہاں سے آئی؟"

"یہ تلوار مجھے الاؤ کی رکھوالی نے لڑنے کے لیے دی ہے اے عظیم خاقان!" میں نے تخت کے سامنے پہنچ کر کہا۔

"سن بوغا! یہ تلوار میرے عظیم باپ کی زندگی میں کبھی نہیں جھکی۔ میں تجھے اس تلوار کی عزت و آبرو کا امین نہیں بنا سکتا۔ تو کوئی دوسری تلوار لے لے۔" منگو خاں بولا۔

ہلاکو خاں کا مقابلہ کرنے سے بچنے کا یہ سنہری موقع تھا اور میں اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے سنبھل کر کہا۔ "اے عظیم خاقان! مجھے اس تلوار کی عزت کا امین الاؤ کی رکھوالی نے بنایا ہے۔ میں اسی تلوار سے لڑوں گا۔"

میں اچھی طرح واقف تھا کہ کسی خاقان کے حکم سے سرتابی کا مطلب موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا مگر موت تو دوسری صورت میں بھی تھی پہلی صورت میں مجھے خاقان کی ماں سرقوشنی بیگی کا تعاون حاصل تھا اور اسی لیے میں نے یہ جرأت کی تھی کہ خاقان کی بات ماننے سے انکار کر دوں۔

"تو پھر یہ مقابلہ نہیں ہو گا۔" منگو خاں کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

تخت کے اردگرد موجود بوڑھے سرداروں نے بھی نعرے لگا کر منگو خاں کی بات سے اتفاق کیا۔ ان کا کہنا بھی یہی تھا کہ تولوئی کی عزت کو یوں داؤ پر نہیں لگایا جا سکتا۔

معاً" سرقوشنی بیگی کی تیز آواز بلند ہوئی۔ "اے خاقان' اے میرے بیٹے! تو نے جو حکم دیا ہے اس کا ماننا ہم سب پر فرض ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ یہ مقابلہ نہ ہو تو میں اس پر ضد نہیں کروں گی لیکن اگر مقابلہ ہو گا تو بوغا انہی ہتھیاروں سے لڑے گا جو میں نے اسے دیے ہیں۔"

"میں اپنے عظیم باپ کی تلوار کے سامنے اپنی تلوار نہیں اٹھاؤں گا' چاہے یہ تلوار میری گردن ہی کیوں نہ کاٹ دے!" سرقوشنی بیگی کے چپ ہوتے ہی ہلاکو خاں طیش کے عالم میں چیخا۔

"پھر یہ مقابلہ ختم کیا جاتا ہے۔" منگو خاں نے فیصلہ سنا دیا۔

میں نے تلوار نیام میں رکھ لی۔ موت مجھ سے کچھ دیر پہلے جتنی قریب آ چکی تھی' اب اتنی ہی دور جا چکی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں اب معمول پر آتی جا رہی تھیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اچانک یوں بازی پلٹ جائے گی۔

کچھ دیر بعد ہی میں سرقوشنی بیگی کے ساتھ محل میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جو مجھے الجھن میں ڈالے ہوئے تھی مگر مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس سے مسکرانے کا سبب

دریافت کر سکتا۔ اس مسکراہٹ کے پیچھے کوئی ایسی بات ضرور تھی جسے اسرار کہا جا سکے۔ سرتوشنی بیگی مجھے اپنے ہمراہ خوابگاہ میں لے گئی۔ شاید وہ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔

خوابگاہ میں پہنچ کر جب وہ آرام سے بیٹھ گئی اور میں بھی اس کے سامنے مودب بیٹھ گیا تو وہ مسکرا کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "کیا تو یقین کرے گا بوغا کہ جو کچھ ہوا' اس کی مجھے پہلے ہی سے توقع تھی۔ میں نے اسی لیے تجھے سب سے پہلے تلوار نکالنے کے لیے کہا تھا کہ میرا بیٹا اور خاقان منگو اس تلوار کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ یہ مقابلہ نہ ہونے دے گا۔"

"تو اے الاؤ کی رکھوالی! کیا تو خود اس مقابلے کے حق میں نہیں تھی؟" میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بھلا میں یہ کیسے چاہتی کہ تو میرے بیٹے ہلاکو خاں کے ہاتھوں مارا جائے! میں نے صبح دانستہ ہلاکو خاں کے سامنے اپنا بیٹا کہا تھا تاکہ اسے یا میرے کسی اور بیٹے یا خاندان زریں کے کسی نویان (شہزادے) کو اس پر اعتراض نہ ہو کہ میں نے تجھے اپنے عظیم شوہر تولوئی کے ہتھیار دے دیے۔"

سن! تو شاید ہلاکو خاں کی ضد سے واقف نہیں۔ وہ بچپن ہی سے ایسا ہے میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں کیونکہ میں اس کی ماں ہوں۔ وہ اویق بوغا سے لڑنے پر مصر تھا اور اس کی واحد صورت یہ تھی کہ میں اس کی جگہ تجھے اس سے لڑنے کے لیے پیش کر دوں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے دونوں بیٹوں میں سے کوئی ایک بھی لوگوں کے سامنے بے عزت ہو۔ مقابلے کی صورت میں کسی ایک کو شکست ہوتی یا کوئی ایک مارا جاتا۔ میں جانتی ہوں کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی ہتھیار ڈال کر اپنی شکست قبول نہ کرتا اور لڑتے لڑتے مرجانا پسند کرتا۔ میں نے پہلے یہ بھی سوچا تھا کہ میں اپنے عظیم شوہر کے ہتھیار اویق بوغا کو دے دوں مگر اس صورت میں یہ خطرہ تھا کہ معاً کوئی اور فیصلہ کرتا۔ اویق بوغا بھی تولوئی ہی کا خون ہے اس لیے اسے تولوئی کے ہتھیار استعمال کرنے کی اجازت مل جاتی۔" یہ کہہ کر سرتوشنی بیگی خاموش ہو گئی۔

وہ عورت واقعی بڑے ذہن کی مالک تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ ایسا ہی تھا تو پھر اس نے مجھے ہتھیار نہ ڈالنے کے لیے کیوں کہا تھا؟ یہی میری زبان پر بھی آ گیا۔

وہ میری بات سن کر ہنس پڑی۔ "میں تجھ سے لطف لے رہی تھی اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے ذہن میں ایک خیال اور ہے وہ خیال یہ تھا کہ اگر میری توقع کے مطابق منگو خاں تلوار کو نہ پہچان سکا تو کیا ہو گا؟ اس صورت میں بہرحال میں یہی چاہتی کہ میرے شوہر کی سولدہ (روح) شرمندہ نہ ہو۔"

اس کی وضاحت میری سمجھ میں آ گئی' اور پھر میں نے اس سے رخصت کی اجازت چاہی۔ اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی مگر اس سے پہلے اپنے شوہر کے ہتھیار لینا نہیں بھولی۔

کچھ دیر بعد مجھے منگو خاں کے دربار میں جانا تھا کیونکہ اس دن راہب ولیم کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ یوں بھی اب میری دربار میں حاضری ضروری قرار دے دی گئی تھی۔ میں اپنے کشیدہ اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے' اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گیا موت کا سایہ میرے بہت قریب سے ہو کر گزر گیا تھا اس لیے میرے اعصاب کی کشیدگی بے محل نہیں تھی۔ میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

میں سونا نہیں چاہتا تھا لیکن جب میرے اعصاب کو کچھ سکون میسر آیا تو ذہن پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے آرام کرتے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اب مجھے محل سے نکل جانا چاہیے تھا۔

محل سے نکل کر دربار کے یورت تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی لیکن جب وہاں پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کچھ جلدی ہی پہنچ گیا تھا۔ ابھی خاقان نہیں آیا تھا مگر وہاں خاندان زریں کے دوسرے نویان اور اردو کے بڑے بڑے سردار پہنچ چکے تھے۔ وہاں برقائی خاں بھی موجود تھا۔

میں یورت میں داخل ہو کر اپنی مخصوص جگہ کی طرف بڑھا کیونکہ میں نے اسے خالی دیکھا۔ وہ یقیناً میرے ہی لیے خالی چھوڑ گئی تھی۔ میں اپنے جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ہی یورت کے پچھلے در سے منگو خاں داخل ہوا۔ یورت میں موجود تمام افراد اسے اندر آتا دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنی اپنی سموری ٹوپیاں اتار کر منگو خاں کو تعظیم دی۔ تعظیم دینے والوں میں خود میں بھی تھا۔ منگو خاں تخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا مگر اس شام اس کے ہمراہ تھمرو نہیں تھی۔ وہ تنہا ہی تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔

"راہب ولیم کو پیش کیا جائے!" منگو خاں نے تخت پر بیٹھتے ہی بلند آواز میں کہا۔

چند لمحے بعد ہی راہب ولیم ایک تومان باشی کی رہنمائی میں یورت در سے اندر آتا دکھائی دیا۔ تومان باشی در کے قریب ہی رک گیا اور راہب ولیم آگے بڑھ کر تخت کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے منگو خاں کو صرف سر جھکا کر تعظیم دی کیونکہ نہ اس کے سر پر ٹوپی تھی جسے وہ اتارتا اور نہ کمر سے پیٹی بندھی ہوئی تھی جسے وہ کھولتا!

"راہب ولیم!" منگو خاں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم واپس چلے جاؤ! میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے ہمراہ میرے ایک سفیر کو بھی لے جاؤ تاکہ وہ تمہارے بادشاہ کو میری طرف سے پیغام پہنچائے۔"

"میں اپنے ساتھ خاقان کے کسی سفیر کو لے جانے کی ذمہ داری قبول کرنے سے قاصر ہوں، کیونکہ میں دیکھ چکا ہوں کہ راستے سخت دشوار ہیں۔" راہب ولیم بے جھجک بولا۔

"تو پھر تمہیں خود میرا پیغام لے کر جانا پڑے گا۔" منگو خاں نے کہا۔

"اگر مجھے پیغام کے الفاظ صاف صاف سمجھا دیے جائیں تو میں حتی المقدور اس پیغام کو پہنچا دوں گا۔" راہب ولیم نے جواب دیا۔

"نہیں!" منگو خاں کے لہجے میں سختی آگئی۔ "میں چاہتا ہوں کہ لفظ بہ لفظ وہی پیغام پہنچے جو میں چاہتا ہوں۔ تم پیغام بھول بھی سکتے ہو اور میرے کہے ہوئے لفظوں کی جگہ دوسرے ہم معنی لفظ دہرا سکتے ہو لیکن میں تمہیں بتاؤں راہب ولیم کہ دنیا میں کوئی لفظ ہم معنی نہیں ہوتا۔ کسی بھی زبان کا کوئی لفظ ایک دوسرے کا بدل نہیں بن سکتا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو پھر دوسرا لفظ پیدا ہی نہ ہوتا۔ تو یہ طے پایا کہ کسی لفظ کا کوئی بدل نہیں! تو پھر میرے کہے ہوئے لفظوں کا بدل بھی ممکن نہیں۔ میرا مقصد تمہارے بادشاہ پر اسی وقت صحیح واضح ہو سکتا ہے جب الفاظ وہی ہوں جو میں ادا کروں اس لیے ضروری ہے کہ میرا پیغام خط کی صورت میں لکھا جائے۔ تم یہ خط اپنے بادشاہ کو دے دینا۔ میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔"

راہب ولیم نے منگو خاں کی بات مان لی۔ وہ پیغام لے کر جانے پر مجبور تھا۔

"اے راہب! تو مجھ سے کیا تحفہ لے گا؟ سونا، چاندی یا کپڑے؟" منگو خاں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، ان میں سے کچھ نہیں اے عظیم خاقان! مجھے صرف زاد راہ اور آرمینیا کے راستے خیریت سے سفر کرنے کا پروانہ عنایت ہو جائے۔"

"مجھے منظور ہے، میں تجھے وہاں تک پہنچوا دوں گا۔" منگو خاں بولا۔

"اس کے بعد تو خود اپنی خبر گیری کرنا!" یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔ "سر میں دو آنکھیں ہوتی ہیں لیکن دونوں ایک ہی طرف دیکھتی ہیں۔ میرا اور باتو خاں کا رشتہ بھی ایسا ہی ہے جیسا ایک آنکھ کا دوسری آنکھ کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو باتو خاں کے پاس سے آیا ہے اس لیے اسی کی طرف واپس جا!"

"میں اپنے بادشاہ کی طرف سے سفیر بن کر تیرے پاس نہیں آیا تھا اے عظیم خاقان! مگر تو مجھ سے سفیروں جیسا ہی سلوک کر رہا ہے۔" راہب ولیم نے منگو خاں کی بات سن کر احتجاج کیا۔ "میں امن دوست آدمی ہوں۔ مجھے اپنے آقا اور بادشاہ کے دل کا حال

نہیں معلوم کہ وہ کیا چاہتا ہے! میں تو تیرے اور اس کے درمیان ایک غیر جانبدار شخص ہوں۔ میں ایکبار پھر تجھ سے درخواست کروں گا کہ مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دے تاکہ میں تبلیغ دین کر سکوں۔"

منگو خاں نے راہب ولیم کی بات کو صبر سے سنا مگر اس کی درخواست کو قطعی نظر انداز کر گیا اور بولا۔

"تجھے بہت دور کا سفر کرنا ہے' خوب کھا' پی تاکہ سفر کی تاب لا سکے۔ اب تو چپ رہ! میں تیرے بادشاہ کے نام پیغام بولوں گا۔"

تخت کی بائیں جانب نیچے بیٹھے ہوئے ایغوری منشی نے منگو خاں کی بات سنتے ہی اپنا قلمدان کھول لیا تھا۔

چند لمحے بعد ہی منگو خاں بلند آواز میں فرانس کے شاہ لوئی کو پیغام لکھا رہا تھا۔

"بہ حکم سمائے جاوداں جس طرح آسمان صرف ایک ہے' اسی طرح روئے زمین پر صرف ایک فرمانروا باقی رہے گا۔ جاودانی آسمان کی قوت سے' چنگیز خاں کے فرمان کی رو سے یہ فرمان تمہیں سنایا جا رہا ہے اور ساری دنیا کے لیے جہاں تک کہ انسان سن سکتا ہے یا گھوڑا پہنچ سکتا ہے۔" منگو خاں یہ کہہ کر چند لمحے رکا' پھر بولنے لگا۔ "مغلوں کے خاقان منگو کا حکم نامہ' فرانسیسیوں کے بادشاہ لوڈووک کے نام اور فرنگیوں کی عظیم دنیا کے دوسرے سرداروں اور پادریوں کے نام! امید ہے کہ وہ یہ الفاظ سمجھ سکیں گے۔ تو سنو کہ ایک شخص جس کا نام داؤد تھا' تمہارے پاس گیا اور اس نے مغلوں کا سفیر ہونے کا دعویٰ کیا لیکن وہ جھوٹا تھا۔ اس کے ساتھ تمہارا قاصد خاقان کے پاس آیا۔ اس وقت تک خاقان قوبوق مر چکا تھا۔ تمہارا قاصد دربار میں حاضر ہوا۔ قوبوق کی بیوی اوغول غائمش نے تمہیں ایک تحفہ بھیجا لیکن وہ بدکردار عورت جو کتیا سے بدتر تھی' جنگ و امن کے آئین کیا سمجھتی! وہ کس طرح اس دنیا کو امن چین سے رہنا سکھاتی؟ اور سنو کہ جو راہب تمہارے پاس سے سرتاک کے پاس آیا تھا' سرتاک نے اسے اپنے باپ باتو خاں کے پاس بھیج دیا لیکن منگو خاں مغلوں کی دنیا میں سب سے سربلند ہے اسی لیے اس کے بھائی باتو خاں نے راہب کو اس کی پیشی میں روانہ کر دیا۔ اب اس خیال سے کہ فرنگیوں کی آبادی اپنے علاقوں میں امن چین سے رہے اور جاودانی آسمان کا حکم نامہ تم لوگوں تک پہنچے' میں نے خاقان منگو نے چاہا کہ اپنا قاصد تمہارے پاس' راہب کے ہمراہ بھیجوں مگر وہ راضی نہ ہوا۔ ہاں وہ ہمارا پیغام لے جانے پر آمادہ ہو گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ اسے تم تک پہنچا دے گا۔ اس وجہ سے میں نے تمہارے پاس اپنا کوئی سفیر نہیں بھیجا۔ میں تمہارے راہب کے ہاتھ جاودانی آسمان کا یہ فرمان بھیج رہا ہوں۔ جب تم یہ فرمان سنو اور سمجھ لو تو اپنے سفیر کو میرے حضور بھیجو! تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ تم کیا چاہتے ہو' جنگ یا امن! جب جاودانی آسمان کی قدرت سے ساری دنیا ایک ہو جائے گی اور مشرق و مغرب تک امن چین کی زندگی بسر کرے گی تب یہ واضح ہو گا کہ میرا مقصد کیا تھا! لیکن اگر تم جاودانی آسمان کا پیغام سنکر اس کی پرواہ نہ کرو گے' اس پر ایمان نہ لاؤ گے اور اس خیال خام میں مبتلا رہو گے کہ ہماری سلطنت بڑے بڑے پہاڑوں اور سمندروں کے اس پار ہے اور یہ سوچ کر تم ہمارے خلاف فوج کشی کرو گے تو پھر وہ جو مشکل راستوں کو آسان بناتا ہے اور دور کو نزدیک کر دیتا ہے یعنی جاودانی آسمان ہی یہ جانتا ہے کہ کیا پیش آئے گا!"

منگو خاں کا پیغام ختم ہو گیا۔ اس کے الفاظ باتو خاں کے خطوط کی طرح دھوکے کی ٹٹی نہیں تھے اور نہ قوبوق کے سخت طلبی نامے کی طرح تھے۔ اس کے الفاظ واضح اور صاف تھے۔ وہ مغربی دنیا سے مفاہمت کی تجویز پیش کر رہا تھا۔ اس نے مغربی دنیا کو اختیار دیا تھا کہ وہ دو روایتی راستوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لے' جنگ یا امن! اس کا نقطہ نظر قطعی واضح تھا۔

پیغام لکھا جا چکا تو اس پر منگو خاں کی مہر ثبت کر دی گئی اور اسے خود منگو خاں نے راہب ولیم کے حوالے کیا۔

میں نے راہب ولیم کے چہرے پر دکھ کے سائے

پھیلتے دیکھے۔ میں اس کا دکھ بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اتنا دور دراز کا سفر طے کرنے کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ مجھے اس کی ناکامی پر مسرت تھی کیونکہ اس کی ناکامی میری کامیابی تھی۔ میں نے اپنے محسن ابونصار سے جو وعدہ کیا تھا' پورا کر دیا تھا۔

دربار برخواست ہوا تو مجھے ابونصار سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے اس کا کام کر دیا تھا اور اب اس سے اپنا کام نکالنا چاہتا تھا۔ یہ سوچ کر میں ان یورتوں کی جانب چل دیا جو برقائی خاں اور اس کے ہمراہیوں کی خاطر نصب کیے گئے تھے۔

مجھے وہاں پہنچ کر ابونصار کا یورت ڈھونڈنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ وہ اپنے ہمراہیوں میں جانا پہچانا تھا۔ اس کا یورت' برقائی خاں کے بڑے سے یورت کی بائیں جانب تھا۔

جب میں اس کے یورت میں پہنچا تو وہ زمین پر بیٹھا نظر جھکائے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ روشن نظر آیا۔ اس چہرے پر عجیب سی تازگی اور رونق تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مصروف عبادت ہے۔ میں نے اسی لیے اسے مخاطب نہیں کیا اور ایک جانب بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گیا۔ میں نے سنا تھا کہ جب مسلمان عبادت کرتے ہیں تو بات نہیں کرتے۔

کچھ دیر بعد ہی وہ عبادت سے فارغ ہو گیا اور میری جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "بوغا! تو نے اپنا وعدہ پورا کیا' میں تیرا شکر گزار ہوں۔"

"لیکن اے ابونصار! تجھے کس نے یہ بات بتائی؟ یہ فیصلہ تو ابھی کچھ دیر پہلے ہی منگو خاں کے دربار میں ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تو وہاں نہیں تھا۔" میں حیرت سے بولا۔

وہ پھر مسکرایا اور کہا۔ "تیرے چہرے پر پھیلی ہوئی خوشی سے مجھے پتا چلا کہ تو کامیاب رہا۔ اسے علم قیافہ بھی کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور زمین پر بچھا ہوا ریشمی کپڑا لپیٹ کر ایک جانب رکھا' پھر میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"میں تجھے یہ خوشخبری سنانے تو آیا ہی تھا لیکن مجھے تجھ سے ایک اور کام بھی تھا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرم اور دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں اگر تیرے کسی کام آسکا بوغا تو مجھے خوشی ہو گی۔ بول' بے جھجک بول کہ میں تیرے کیا کام آسکتا ہوں!" ابونصار کے لہجے میں خلوص تھا۔

میں نے چند لمحے خاموش رہ کر یہ سوچا کہ اگر میں نے اس سے یہ کہا کہ میں مغربی دشت چلنا چاہتا ہوں تو وہ اس کی وجہ ضرور دریافت کرے گا اس لیے مجھے کوئی بہانہ پہلے ہی سوچ لینا چاہیے۔ ظاہر تھا کہ میں اسے اصل بات کا علم کیسے ہونے دیتا!

"تو کیا سوچنے لگا بوغا؟" ابونصار مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔

"یقین کر کہ اگر وہ کام جو تو نے سوچا ہے' میرے بس میں ہوا تو انشاء اللہ میں ضرور کروں گا۔"

میں اس دوران میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے! میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اداس سے لہجے میں کہا۔ "اے ابونصار! کیا یہ ممکن نہیں کہ میں ہمیشہ تیرے ساتھ رہوں؟"

"میرے ساتھ!! ہمیشہ؟" ابونصار حیرت سے بولا۔

"میں تیری بات کا مطلب نہیں سمجھا بوغا!"

"مجھے تجھ سے یہی کام تھا اے ابونصار!" میں نے جلدی سے کہا۔ میں نے اپنے لہجے کو پرجوش بنا لیا تھا۔ "تو بہت آسانی سے میرا یہ کام کر سکتا ہے۔"

"مگر میں تو یہاں سے برقائی خاں کے ساتھ مغربی دشت چلا جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "تو کیا تو بھی میرے ساتھ چلے گا؟"

"ہاں' میں تیرے ساتھ وہاں بھی چلوں گا۔" میں نے مستحکم اور مضبوط لہجے میں کہا۔

"لیکن یہ ممکن کس طرح ہے' تو نے یہ بھی سوچا؟ تجھے بھلا سرتوشی بیگی کیسے چھوڑ سکتی ہے؟" وہ فکرمند لہجے میں بولا۔ "ویسے میرے لیے یہ انتہائی خوشی کی بات ہو گی کہ تو میرے ساتھ رہے۔"

"اس ناممکن بات کو ممکن بنانا تیرے اختیار میں

ہے اے ابونصار!" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"تو اچھی طرح جانتا ہے کہ سرتوشنی بیگی' برقائی خاں کی کوئی بات نہیں ٹال سکتی۔ اگر برقائی خاں مجھے سرتوشنی بیگی سے مانگ لے تو وہ انکار نہ کر سکے گی اور یہ بات میں خوب جانتا ہوں کہ برقائی تیری بات نہیں ٹالتا اب غالباً" تو میرا مطلب سمجھ گیا ہو گا!"

میری بات سن کر اس نے ایک طویل سانس لیا' پھر چند لمحے بعد بولا۔ "دراصل بظاہر یہ اتنی معمولی سی بات ہے جس کے لیے برقائی خاں کو درمیان میں لانا مجھے بڑا عجیب سا لگتا ہے لیکن میں تیری خاطر ایسا ضرور کروں گا۔"

"اور مجھے یقین ہے کہ تو کامیاب رہے گا۔" میں نے اس کی بات ختم ہوتے ہی کہا۔

"انشاء اللہ!" وہ بولا۔ تو کل دوپہر آجانا! امید ہے کہ میں اس وقت تک برقائی سے بات کر چکا ہوں گا۔"

اس گفتگو کے بعد میں نے اس سے رخصت کی اجازت چاہی اور اجازت ملنے پر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے یورت کے در تک رخصت کرنے آیا۔

میں برقائی خاں کے یورتوں سے نکلا تو دائیں جانب کچھ فاصلے پر موجود منگو خاں کے محل پر میری نظر پڑی اور مجھے تھمرو کا خیال آگیا۔ وہ تھمرو جو میرے قرب کے لیے تڑپ رہی تھی اور وہ تھمرو جسے منگو خاں نے مجھے بخش دیا تھا' میرے دل میں اس سے ملاقات کی خواہش اتنی شدید ہوئی کہ میں کوشش کے باوجود اس کا خیال اپنے ذہن سے نہ نکال سکا اور میرے قدم جیسے خود بخود منگو خاں کے محل کی جانب اٹھنے لگے۔

کسے مجال تھی کہ مجھے محل میں گھسنے سے روک سکتا! میں اب بہرحال کوئی معمولی فرد نہیں رہا تھا۔ میں محل میں داخل ہوا۔ محافظوں نے مجھے تعظیم دی اور ایک طرف ہٹ گئے۔ میں سیدھا تھمرو کی خوابگاہ جانے والے راستوں پر ہو لیا۔ میں جیسے ہی اس راہداری کی طرف مڑا جس میں تھمرو کی خوابگاہ تھی' میری نظر ایک شخص پر پڑی جو اپنے لباس سے خادم معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح ایک جانب لپکا۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ وہ تھمرو کی خوابگاہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر کھٹک گیا اور پھر ایک دم تیزی سے اس کی طرف بھاگا۔ وہ خادم چونکا اور میری طرف مڑ کر دیکھتا ہوا سیدھا بھاگنے لگا۔ خوابگاہ کا دروازہ ابھی نہیں کھلا تھا اور میں دروازے پر کھڑا تھا۔ میں نے بھاگنے والے خادم کا پیچھا نہیں کیا کیونکہ میں اسے پہچان گیا تھا۔ وہ وہی تھا جو گزشتہ سب مجھے سرتوشنی بیگی کے محل سے بلا کر لایا تھا اور جس نے تھمرو کی خوابگاہ میں آکر یہ جھوٹ بولا تھا کہ منگو خاں آرہا ہے۔

میں نے کچھ سوچ کر دروازے سے کان لگا دیے اور اسی وقت خوابگاہ کے اندر سے ابھرنے والی مدھم آواز سنی۔ یہ آواز سو فیصد تھمرو ہی کی تھی۔

"جلدی کرو' جلدی!" تھمرو کسی سے کہہ رہی تھی۔ "کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ میں نے ابھی دروازے پر دستک سنی ہے۔"

تو اس کا مطلب یہ تھا کہ تھمرو کے علاوہ بھی کوئی اس کی خوابگاہ میں تھا مگر وہ کون ہو سکتا تھا؟ میں سوچنے لگا اور مجھے غصہ آنے لگا۔ تھمرو پر اب صرف اور صرف میرا حق تھا۔ اسے اب یوں میری امانت میں خیانت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرا جسم غصے سے کانپنے لگا۔ میں نے پہلی بار اپنے اندر رقابت کا جذبہ محسوس کیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔

"کون ہے؟" اندر سے تھمرو کی سخت آواز سنائی دی' پھر وہ آواز اتنی مدھم ہو گئی کہ میں کچھ نہ سن سکا۔ اس نے یقیناً" خوابگاہ میں موجود شخص سے کچھ کہا تھا۔

"میں ہوں بوغا' دروازہ کھولو!" میں نے بلند آواز میں کہا۔

دوسری جانب فوراً" ہی قدموں کی چاپ سنائی دی جو دروازے کے قریب آکر رک گئی' پھر دروازہ کھل

دروازہ کھلتے ہی میری نظر اس کے بے ترتیب لباس پر پڑی۔ وہ میری طرف دیکھ کر بڑی ادا سے مسکرائی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "تجھے میرا کیسے خیال آگیا بوغا! آ اندر آجا!"

میں بغیر کچھ کہے اندر چلا گیا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اندر جاتے ہی خواب گاہ کا جائزہ لیا۔ دریچہ اندر سے بند تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ شخص خوابگاہ ہی میں تھا۔ اسے تھمرو نے وہیں کہیں چھپا دیا تھا۔ خوابگاہ کی دیواروں پر بھاری ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ میرا پہلا خیال انہی کی طرف گیا۔

"تو ادھر ادھر حیرت سے کیا دیکھ رہا ہے بوغا؟" تھمرو اٹھلا کر بولی۔ "میری موجودگی میں تیرا کسی اور طرف دیکھنا کیا معنی؟"

مجھے اس بے وفا اور بوالہوس عورت کی آواز زہر معلوم ہوئی۔ اب میری نگاہ پردوں سے ہٹ کر اس بڑے سے چھپر کھٹ کی طرف اٹھی جس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ وہ شخص اس چھپر کھٹ کے نیچے بھی چھپ سکتا تھا۔ میں نے پہلے تیزی سے آگے بڑھ کر پردوں کے پیچھے دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا' پھر لپک کر چھپر کھٹ کے نیچے جھانکا۔ خوابگاہ میں جلتی ہوئی مشعل کی روشنی وہاں نہیں پہنچ رہی تھی لیکن بہرحال نیم تاریکی میں بھی کسی کی وہاں موجودگی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ چھپر کھٹ کے نیچے بھی کوئی نہیں تھا۔ کوئی خفیہ راستہ! میرے ذہن میں آیا مگر پھر خود ہی میں نے اپنے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ہلکی یا تیز قسم کی کوئی گڑگڑاہٹ ضرور سنتا جو دیوار یا فرش میں پیدا ہونے والے خلا کے سبب سنائی دیتی۔

دریچہ اندر سے بند تھا' کپڑوں کے پیچھے اور چھپر کھٹ کے نیچے بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ پھر شخص کہاں گیا جس سے تھمرو مخاطب تھی اور جو کچھ دیر پہلے اس کی خوابگاہ میں موجود تھا؟ میں نے سوچا اور میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔

"بوغا! یہ تو کیا دیکھتا پھر رہا ہے؟" تھمرو میرے قریب آکر بولی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ "ابھی یہاں میرے آنے سے پہلے کون تھا؟"

"کوئی بھی نہیں!" اس نے بھولپن سے کہا۔ اس کی آواز میں ذرا سی بھی لرزش نہیں تھی جس سے میں سمجھ سکتا کہ وہ میرے براہ راست سوال سے گھبرا گئی ہے۔

"جھوٹ نہ بول تھمرو!" میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"مجھے آخر تجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے! تو کوئی خاقان منگو تو نہیں!"

"میں خاقان منگو نہ سہی مگر پھر بھی تجھ سے جواب طلبی کا حق رکھتا ہوں۔" میں طیش کے عالم میں بولا۔

"مگر میں نے تو تجھے یہ حق نہیں دیا۔" اس کا لہجہ بدل گیا۔ "اگر تو نے اب سخت لہجہ اختیار کیا تو میں تجھے اپنی خوابگاہ سے نکال دوں گی۔"

"اور اگر میں نہ نکلوں تو؟" میں نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔

"تو میری بجائے تجھے جواب طلبی کے مرحلے سے گزرنا پڑے گا کہ تو میری خوابگاہ میں کیوں داخل ہوا!" وہ مجھے گھور کر بولی۔

"تھمرو! آوارگی چھوڑ دے اور کسی ایک کی ہو کے رہ!" میں نے کسی قدر نرم لہجہ اختیار کیا۔

"یہ ناممکن ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"تو پھر تجھے اس کی سزا بھی بھگتنی پڑے گی۔ یہ نہ بھول کہ تو قصبک میں نہیں قراقرم میں ہے اور اب تیری حیثیت حاکم کی نہیں محکوم کی ہے۔" مجھے پھر غصہ آگیا۔

"میں اپنی مرضی سے جینا اور اپنی مرضی سے مرنا جانتی ہوں۔ تو بھی یہ نہ بھول کہ میں ملکہ روسودان کی بیٹی ہوں جسے باتوخاں نے اپنی آغوش کی زینت بنانے

کے لیے ہر جتن کر لیا مگر ناکام رہا۔" وہ بڑے فخر سے بولی۔

"وہ ملکہ روزودان تھی مگر تو تھمرو ہے۔ وہ بہادر تھی مگر تو بزدل ہے۔ کیا تجھے اس سے انکار ہے اور کیا تو خود اس بات کا اعتراف نہیں کر چکی؟"

"کچھ بھی سہی لیکن میں وہی کروں گی جو میرا دل کہے گا۔ مجھ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔ تو اپنے انجام کے لیے تیار رہ!" یہ کہہ کر میں غصے میں دروازے کی طرف بڑھا۔

میں چند قدم ہی چلا تھا کہ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا اور بولی۔ "کل رات تو نے کہا تھا کہ میری بات کا سوچ کر جواب دے گا۔ بتا تو نے میرے بارے میں کیا سوچا؟"

"مجھے اب تیرے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میں اب فیصلہ کر چکا ہوں کہ تجھے تیری خود سری کی سزا دی جائے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ میرا جواب سن کر ہنس پڑی' پھر بولی۔ "تو اور مجھے..... 'تھمرو' کو سزا دے گا!"

"ہاں میں اور تجھے 'تھمرو' کو سزا دوں گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر اسے ایک جانب ہٹا کر تیزی کے ساتھ خواب گاہ کا دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا محل کے صدر دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ میں اس کے پاس کچھ اور ہی سوچ کر آیا تھا مگر اس کے رویے نے مجھے سخت مکدر کر دیا تھا اور مجھے غصہ آ گیا تھا۔ میں نے اس کے لیے سزا سوچ لی تھی۔ اس کے لیے سب سے بڑی سزا یہی ہو سکتی تھی کہ اس پر کسی مرد کا سایہ بھی نہ پڑنے دیا جائے لیکن ابھی میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس سزا پر عمل کس طرح ہو گا! میں انہی خیالوں میں سرگرداں منگو خاں کے محل سے نکل کر سرقوشنی بیگی کے محل میں پہنچ گیا۔

اس شب مجھے بڑی دیر تک نیند نہ آسکی۔ میرے دماغ میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ ایک طرف تھمرو کے قرب کی خواہش اور اس میں ناکامی نے مجھے نڈھال کر دیا تھا دوسری جانب مستقبل کے اندیشوں نے مجھے فکر مند کر رکھا تھا۔ مغربی دشت میں پہنچ کر مجھے کیا کرنا تھا اور وہاں مجھے کیا حالات پیش آنے والے تھے' سولدہ نے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اس نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ میری بہتری اسی میں ہے کہ میں مغربی دشت چلا جاؤں اور وہاں جانے کی راہ بھی اس نے سجھا دی تھی۔

دوسرے دن دوپہر تک میں محل ہی میں رہا اور کھانا کھا کر ابو نصار سے ملنے چل دیا۔ میں ابھی محل سے نکل کر کچھ دور ہی گیا تھا کہ میں نے پیلے پیلے لمبے لبادوں میں ملبوس ایک گروہ کو منگو خاں کے محل کی جانب بڑھتے دیکھا۔ ان کے سر گھٹے ہوئے تھے اور پیروں میں لکڑی کے کھڑاؤں پہنے ہوئے تھے۔ میں ان کے حلیے سے سمجھ گیا کہ وہ کون لوگ ہیں! وہ بدھ لاماؤں کا گروہ تھا۔ میں نے ان سب میں ایک دراز قد لاما کو سب سے نمایاں دیکھا۔ وہ آگے آگے چل رہا تھا اور اس کے ساتھی بڑے ادب سے پیچھے چل رہے تھے۔ میں حیران تھا کہ وہ گروہ منگو خاں کے محل کی طرف کیوں جا رہا ہے! لیکن میں وہاں رکا نہیں کیونکہ مجھے جلد از جلد ابو نصار سے ملنا تھا۔

میں برقائی کے یورتوں تک پہنچا اور پھر ابو نصار کے یورت کی طرف بڑھا۔

ابو نصار میرا ہی منتظر تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔ "اے ابو نصار! کیا تو نے برقائی خاں کو راضی کر لیا؟"

"ہاں یوغا!" اس نے جواب دیا۔ "وہ آج ہی سرقوشنی بیگی سے مل کر اس سے تجھے مانگ لے گا۔ اب تو تو خوش ہے؟"

"بہت خوب!" میں واقعی خوش ہو کر بولا۔ "یہ بتا کہ اب یہاں سے روانگی کب ہو گی کیونکہ روانگی سے قبل مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں؟"

"کیسے کام؟"

ابو نصار کا سوال سن کر میں چکرا گیا۔ میرے منہ سے بس رواداری میں وہ بات نکل گئی تھی جو میرے دل میں تھی۔ دراصل مجھے تھمرو کا خیال آگیا تھا۔ مغربی دشت روانگی سے قبل مجھے اپنے کہے ہوئے الفاظ کی عزت بھی رکھنی تھی جو میں نے تھمرو سے کہے تھے کہ اسے سزا ضرور ملے گی۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی فیصلہ بھی کرنا تھا جس کا تعلق تھمرو اور میرے دونوں ہی کے مستقبل سے تھا۔ منگو خاں نے اسے میرے لیے چھوڑ دیا تھا' یہ سوچ کر کہ تھمرو کی آوارگی بے لگام نہ ہو جس سے اس پر حرف آئے مگر تھمرو تھی کہ کسی طرح قابو ہی میں نہیں آرہی تھی۔ اب جو ابو نصار نے ایک دم سوال کیا تو میں جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔ میں بھلا اسے تھمرو کے بارے میں کس طرح بتا سکتا تھا!

"کیا کچھ ایسے کام ہیں جنہیں تو راز رکھنا چاہتا ہے؟" ابو نصار مجھے خاموش دیکھ کر بولا' پھر مجھے شاید شرمندگی سے بچانے کے لیے وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہے تو میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔ ہاں تو نے [illegible] کہ یہاں سے روانگی کب ہوگی! تو اس سلسلے میں ابھی کچھ [illegible] میں کیا گیا۔ کسی بھی وقت برقائی خاں روانگی کے احکامات دے سکتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے فوری طور پر تھمرو کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ میں چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ "آج برقائی خاں سرقوشنی بیگی سے بات کرلے گا' اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل مجھے معلوم ہو جائے گا کہ کیا رہا!"

"ہاں کل تک معلوم ہو جانا چاہیے۔" ابو نصار نے کہا۔

"ٹھیک ہے' میں کل دوپہر بھی آؤں گا۔" میں اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں تجھے آنے سے نہیں روکتا لیکن شاید تجھے اس بارے میں یہاں آنے سے پہلے ہی علم ہو جائے۔ کیا سرقوشنی بیگی تجھے بلا کر یہ بات نہ بتائے گی؟"

"تو ٹھیک کہتا ہے ابو نصار!" میں نے اس کی تائید میں کہا' پھر بولا۔ "اچھا اب مجھے جانے دے!"

"تو پھر تو کل نہیں آئے گا؟" ابو نصار بھی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"میرے آنے کا مقصد تو یہی معلوم کرنا تھا لیکن اگر میرا دل چاہا تو ضرور آؤں گا۔" میں نے جواب دیا اور یورت کے در کی طرف بڑھ گیا۔ ابو نصار میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

محل میں پہنچ کر جب میں اس کمرے کے سامنے گزرا جہاں سرقوشنی بیگی اپنے مہمانوں سے ملاقات کرتی تھی تو اس کے دروازے پر مجھے کلہاڑا بردار نظر آئے۔ وہاں اندر یقیناً" سرقوشنی بیگی کسی کے ساتھ موجود تھی ورنہ دروازے پر کلہاڑے بردار نظر نہ آتے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ برقائی خاں اتنی جلدی سرقوشنی بیگی سے ملنے آجائے گا اس لیے میرا ذہن اس کی طرف نہیں گیا لیکن حقیقت یہی تھی جو مجھے سرقوشنی بیگی کے خاص خادم سے معلوم ہوئی۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے راہداری میں ملا تھا اور میرے استفسار پر اس نے بتایا تھا کہ ملاقات کے کمرے میں سرقوشنی بیگی کے ہمراہ برقائی خاں ہے۔

میں اپنے کمرے میں پہنچ کر' یہ انتظار کرنے لگا کہ کب برقائی خاں رخصت ہوا اور کب سرقوشنی بیگی مجھے بلائے لیکن کافی دیر تک جب میرا بلاوا نہ آیا تو مجھے فکر ہوئی۔ میں کمرے سے نکلا اور کمرہ نشست کے دروازے کی طرف دیکھا کیونکہ وہ کمرہ اسی راہداری میں تھا۔ اب وہاں کلہاڑے بردار نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ برقائی خاں جا چکا ہے۔ میرا ذہن پریشان ہو گیا۔ کیا برقائی خاں نے سرقوشنی بیگی سے میرے بارے میں بات نہیں کی؟ اور اگر ایسا ہی تھا تو پھر وہ سرقوشنی بیگی سے ملنے کیوں آیا تھا؟ اس سے قطع نظر اگر اس نے سرقوشنی بیگی سے میرے بارے میں بات کرلی ہے تو پھر سرقوشنی بیگی نے مجھے کیوں

نہیں بلایا' مجھ سے بات کیوں نہیں کی؟ میرے ذہن میں سوالات ابھرتے رہے اور میں دوبارہ اپنے کمرے میں آگیا۔

شام تک میں اپنے کمرے میں پڑا رہا اور اسی وقت اٹھا جب دربار میں پہنچنے کا وقت ہو گیا۔ مجھے اس وقت تک سرقوشنی بیگی نے نہیں بلایا تھا۔ میں نے دربار میں جانے سے قبل فیصلہ کیا کہ اپنی ذہنی الجھن دور کرنے کے لیے سرقوشنی بیگی سے مل لوں۔ اب مزید صبر کرنا میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے سرقوشنی بیگی کے خادم کو تلاش کیا اور اس سے کہا کہ وہ بیگی تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں کیونکہ خود اپنی زبان سے یہ اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مغربی دشت روانگی میں خود میری مرضی کو دخل ہے اس لیے میں کوئی ایسا بہانہ سوچ رہا تھا جو ملاقات کا جواز بن سکے۔ سرقوشنی بیگی کا خادم اس کی خوابگاہ میں جا چکا تھا۔ میرا ذہن اس وقت اتنا الجھا ہوا تھا کہ مجھے کوئی بہانہ سوجھ ہی نہ رہا تھا۔ اسی دوران میں جب میں نے خادم کو خوابگاہ سے نکلتے دیکھا تو گھبرا گیا۔ میں اس سے ملاقات کا کیا سبب بتاؤں گا؟ میں نے سوچا۔

اسی وقت خادم نے قریب پہنچ کر مجھے مخاطب کیا۔

"اے بوغا! الاؤ کی رکھوالی تجھ سے نہیں ملنا چاہتی۔ اس نے یہی کہا ہے۔"

خادم نے جو کچھ کہا تھا' وہ میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ ملاقات سے انکار کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ آخر وہ مجھ سے ملنا کیوں نہیں چاہتی؟ میں پریشان ہو گیا۔ مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا اور وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ خادم جا چکا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اپنے حواس میں آگیا اور میرے قدم محل کے صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ مجھے بہرحال دربار میں تو شریک ہونا ہی تھا۔

میں جب دربار کے یورت میں پہنچا تو کچھ دیر ہو چکی تھی۔ منگوخاں آچکا تھا اور اس کے سامنے وہی پیلے لبادے والا دراز قد لامہ کھڑا تھا جسے میں نے اسی دن دوپہر منگوخاں کے محل کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

میں آگے بڑھا اور منگوخاں کو تعظیم دی۔ میرے برابر ہی وہ دراز قد لامہ کھڑا ہوا تھا۔ میں تعظیم دے چکا تو معاً" منگوخاں کی کرخت آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "بوغا دربار میں وقت پر آیا کر! اور سن کہ آج سے دربار میں تیری روز حاضری منسوخ کی جاتی ہے۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

میں نے جواب میں سر جھکا کر آئندہ وقت سے پہلے پہنچنے کا یقین دلایا اور اپنے لیے مخصوص جگہ کی طرف بڑھا۔

"نہیں! اب تو وہاں نہیں بیٹھے گا۔" منگوخاں کی آواز سن کر میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ میں مڑا تو وہ پھر بولا۔ "اب اس جگہ عظیم نامو بیٹھا کرے گا۔" منگوخاں نے دراز قد لامہ کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم نے نامو کو اپنی سلطنت کا مذہبی پیشوا مقرر کیا ہے۔"

منگوخاں کے الفاظ سن کر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے بر سر بازار ذلیل و رسوا کر دیا ہو' جیسے میرا منصب مجھ سے چھین لیا ہو۔ پچھلی صفوں تک جانے سے پہلے میں نے ایک نظر نامو کی طرف دیکھا اور لمحے بھر کو ہماری نگاہیں ایک دوسرے سے مل گئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی نظر آنکھوں کے راستے میرے وجود میں اتر گئی ہو۔ مجھے اس سے نفرت محسوس ہوئی کیونکہ بالواسطہ میرے زوال کا سبب وہی تھا۔ میں منگوخاں کی بات سن کر سمجھ چکا تھا کہ پہلے مجھے جو درجہ حاصل تھا' اس پر اب نامو قابض ہو چکا ہے۔

اس دن دربار میں کیا ہوا' میں نے جیسے نہ دیکھا نہ سنا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں گم رہا۔ نامو کی آمد' اور پھر اسے فوراً" وہ درجہ مل جانا معمولی بات نہیں تھی۔ پوری سلطنت کے مذہبی پیشوا کا درجہ تو مجھے بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ آخر اس نے منگوخاں پر کیا جادو کر دیا تھا کہ آتے ہی اتنے بڑے عہدے پر فائز ہو گیا تھا! سرقوشنی بیگی کا مجھ سے نہ ملنا اور پھر منگوخاں کا بدلا ہوا رویہ کوئی نہ کوئی معنی ضرور رکھتا تھا۔ میرے ذہن

میں اس وقت تک آندھیاں سی چلتی رہیں جب تک کہ دربار برخواست نہ ہو گیا۔ دربار برخواست ہونے سے پہلے میں نے ناموکی زبان سے ایک پیش گوئی ضرور سنی تھی۔

"کل برف کی آندھی آئے گی اے عظیم خاقان!" اس نے منگوخاں سے کہا تھا۔ "اپنے لوگوں سے کہہ دے کہ وہ جانوروں کو باندھ کر رکھیں!"

جواب میں منگوخاں بولا۔ "اے عظیم گوتم بدھ کے عظیم لامہ! جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ تیرے لفظ سچے ہیں تو کیا تو اپنی قوتوں سے آنے والی برف کی آندھی کو نہیں روک سکتا؟ طوفانی برف کی آندھی سے جانوروں کے گلوں کو نقصان پہنچے گا۔ اس سے بہت سے جانور مرجائیں گے۔ بہت سے جانور گابھن ہیں اور تھوڑے دنوں میں ان کے بچھڑے ہوں گے۔"

"اے عظیم خاقان! اس طوفانی آندھی کو آنے سے روکا جا سکتا ہے لیکن اگر وہ نہ آئی تو یہی کہا جائے گا کہ میری پیش گوئی غلط تھی اس لیے آندھی تو ضرور آئے گی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس سے تباہی نہ پھیلنے پائے اور اسے فوراً ہی روک دیا جائے۔"

ناموبہت بڑا دعویٰ کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی وہ ایسی ہی طاقتوں کا مالک ہے کہ ہوا پر بھی اسے قابو ہے؟

دربار برخواست ہوا تو میں یورت سے نکل کر محل کی طرف چل دیا۔ میری سماعت میں ناموکے کہے ہوئے لفظ گونج رہے تھے اور نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ آئندہ روز آندھی نہ آئے۔ ناموا سی طرح خاقان منگوخاں کی نظر سے گر سکتا تھا۔

"سن اے بوغا!" اچانک پیچھے سے ایک آواز آئی اور میں اچھل پڑا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو ناموا میرے قریب ہی موجود تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

"تو نے مجھے کیوں روکا ہے؟" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے سختی سے کہا۔

"صرف یہ کہنے کے لیے میرے بچے کہ کسی کے لیے بدی نہ سوچ اور بدی نہ کر!" اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "اگر میں چاہتا تو تیرے بارے میں منگوخاں کو سب کچھ بتا دیتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا صرف اس لیے کہ تجھ پر ماضی میں بہت ظلم ہوا ہے اور تیرا دل زخمی ہے۔ تو جو کچھ سوچتا اور کرتا ہے، وہ اسی ظلم کا ردعمل ہے جو تجھ پر ہو چکا ہے۔"

مجھے ناموکی باتوں نے چونکا دیا۔ کیا وہ میرے اندر سلگتی ہوئی انتقام کی آگ سے واقف ہے؟ میں نے سوچا مگر زبان سے کچھ اور ہی کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ تو کیا باتیں کر رہا ہے! مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوا اور میں نے اس کے ردعمل میں کچھ بھی نہیں کیا۔"

"تو جھوٹ بول رہا ہے میرے بچے! تیرا سینہ انتقام کی آگ سے جل رہا ہے اور تو اس آگ میں ساری منگول قوم کو جلا دینا چاہتا ہے۔ تو ان کے درمیان رہ کر نفرت کے بیج بوتا رہا ہے اور اب بھی ان کی طاقت کو پارہ پارہ ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ کیا میں نے سچ نہیں کہا میرے بچے؟" ناموا میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

میں نے اپنی نگاہ جھکالی۔ مجھ میں اب اتنی تاب نہیں رہی تھی کہ اس سے نگاہ ملا سکتا۔ اس نے بڑی ہولناک باتیں کی تھیں۔ اگر کسی کو ان کی ہوا بھی لگ جاتی تو میری موت یقینی تھی۔ مجھے اس بوڑھے لامہ سے خوف آنے لگا۔ اس نے اپنی پراسرار قوتوں سے میرے بارے میں جو کچھ معلوم کر لیا تھا، وہ بہت خطرناک تھا۔ اس خطرے سے بچنے کا فوری طور پر میرے ذہن میں جو حل آیا، وہ یہی تھا کہ میں اس زبان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں جو میرا راز دوسروں تک پہنچا سکتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے تلوار نیام سے نکال کر بلند کی۔ اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ میرا اٹھا ہوا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میرا ہاتھ پتھر کا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو حرکت دینا چاہی تھی مگر ناکام رہا تھا۔

اور پھر میں نے نامو کو اپنے ہاتھ سے تلوار لیتے دیکھا۔ اب میری تلوار اس کے ہاتھ میں تھی اور تلوار کی نوک میرے سینے پر رکھی تھی۔

"معا" لامہ نامو کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ اس کی آواز میں اب بھی نرمی تھی۔ میں ایک خواب کے سے عالم میں اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "میرے بچے! اگر میں چاہوں تو تجھے اسی وقت ہلاک کر سکتا ہوں کہ تو میرے قابو میں ہے اور اگر چاہوں تو تیرا سارا بھید کھول کر تجھے انہی کے ہاتھوں قتل کرا سکتا ہوں جن کے خلاف تو سازش کر رہا ہے مگر میں ان دونوں باتوں پر عمل نہیں کروں گا۔ میرا مقصد تجھے صرف سمجھانا تھا لیکن تو نے مجھے غلط سمجھا اور میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔ جو کچھ پیش آنے والا ہے۔ اسے نہ تو بدل سکتا ہے نہ میں! آدمی کو خوامخواہ اپنے بارے میں یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ اس کے کچھ کرنے سے حالات بدل گئے مگر حقیقتاً" ایسا نہیں ہوتا' جو پیش آنے والا ہوتا ہے' ہوتا وہی ہے۔ تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا اور نہ کوئی کسی کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ تیرے لیے جو حرکات اور جو عمل تقدیر کر دیے گئے ہیں' تو انہی سے گزرے گا اور وہی کرے گا جو پہلے ہی تیری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے اس لیے اپنی قسمت پر شاکر رہ!" یہ کہہ کر اس نے میرے سینے سے تلوار کی نوک ہٹالی' پھر بولا۔ "لے' یہ اپنی تلوار اور نیام میں رکھ لے!"

اس نے تلوار میری طرف بڑھائی۔ میرے جس ہاتھ میں پہلے تلوار تھمی ہوئی تھی' وہ ہاتھ اب تک اسی طرح بلند تھا مگر نامو کے الفاظ ختم ہوتے ہی جیسے اس میں جان آگئی۔ میں نے ہاتھ کو حرکت دی اور اس سے اپنی تلوار لے لی۔

نامو پر دوبارہ حملہ کرنا فضول ہی تھا کیونکہ میں اپنے پہلے حملے کا حشر دیکھ چکا تھا' اور پھر یہ کہ اس نے جو کچھ کہا تھا' اس کی روشنی میں مجھے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تو میری تلوار ہی کیوں واپس کرتا! اس کے علاوہ یہ کہ مجھے اس کے لہجے میں صداقت نظر آئی تھی۔

"اے عظیم نامو! میں تجھ سے شرمندہ ہوں کہ میں نے تیرے لیے برا سوچا۔" میں نے اپنی تلوار نیام میں رکھتے ہوئے کہا۔

"شرمندہ نہ ہو بوغا کہ شرمانا مردوں کو زیب نہیں دیتا۔" وہ بولا۔

"جا وہاں جانے کی تیاریاں کر جہاں تجھے پہنچنا چاہیے اور جہاں تو ضرور پہنچے گا۔"

مجھے اس کی بات سن کر پھر حیرت ہوئی اور میں نے سوچا کہ کیا وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں قراقرم پھوز کر مغربی سمت جا رہا ہوں؟

"اے عظیم نامو! کیا تجھے یہ بھی علم ہے کہ میں کہاں جانے والا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں مجھے خبر ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اور یہ بھی معلوم ہے کہ تو وہاں کیوں جا رہا ہے! لیکن یہ سب کچھ جان لینا اور بتا دینا کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ مڑا' اور پھر چند ہی لمحوں میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

میں اسی جگہ کھڑا ہوا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اب میرے لیے یہ سمجھنا زیادہ دشوار نہیں تھا کہ اس نے ایک ہی دن میں خاقان منگوخاں پر ایسا کیا جادو کر دیا تھا جو منگوخاں نے اسے پوری سلطنت کا مذہبی پیشوا بنا دیا تھا! اس سے ایک اور بات کا بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اب لامہ نامو کی وجہ سے منگوخاں کا جھکاؤ لازمی طور پر بدھ مذہب کی طرف ہو جائے گا۔

جب لامہ نامو میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا تو میں

نے بھی سرقوشنی بیگی کے محل کا رخ کیا۔

میں جب محل پہنچا تو میرے ذہن میں مختلف خیالات گردش کر رہے تھے۔ ایک طرف مجھے اپنی حیثیت کم ہو جانے کا احساس تھا تو دوسری طرف سرقوشنی بیگی کی خفگی کا خیال تھا۔ وہ آخر مجھ سے کیوں ناراض ہو گئی تھی؟ اس کے علاوہ میں مستقبل کے اندیشوں میں بھی گھرا ہوا تھا۔ مجھے قراقرم سے ابونصار اور برقائی خاں کے ساتھ مغربی دشت روانہ ہونا تھا مگر اس سے پہلے تھمرو کے مسئلے سے بھی نمٹنا تھا جس سے میں کہہ چکا تھا کہ اسے سزا ضرور دوں گا۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ برقائی خاں کب قراقرم سے روانہ ہو جاتا! ابھی یہ بھی طے نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ روانہ ہو سکوں گا۔ اس کے اور سرقوشنی بیگی کے درمیان میرے بارے میں کیا بات ہوئی تھی اس سے میں لاعلم تھا۔

مجھے ابھی اپنے کمرے میں پہنچے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" میں نے بلند آواز میں بستر پر لیٹے لیٹے ہی سوال کیا۔

جواب میں سرقوشنی بیگی کے خادم کی آواز سنائی دی تو میں تیزی کے ساتھ بستر سے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔

میں نے دروازہ کھولا۔ سرقوشنی بیگی کے خادم نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "بوغا! تجھے الاؤ کی رکھوالی نے اسی وقت بلایا ہے۔"

خادم سے اس طلبی کا مقصد پوچھنا بے سبب ہی تھا اس لیے میں اس سے کوئی سوال کیے بغیر ساتھ ہو لیا مگر میں اس بے وقت طلبی پر حیران ضرور تھا۔

سرقوشنی بیگی کی خوابگاہ کے دروازے پر حسب معمول کلہاڑے بردار محافظ موجود تھے جو مجھے خادم کے ساتھ آتا ہوا دیکھ کر ایک جانب ہو گئے۔ خادم محافظوں کے قریب ہی رک گیا اور میں دروازے سے اندر چلا گیا۔

اندر جاتے ہی میری نظر سرقوشنی بیگی پر پڑی۔ وہ شراب نوشی میں مصروف تھی اور اس کے سامنے ساغر و مینا سجے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے روبرو پہنچ کر تعظیم دی، پھر اس کا اشارہ پا کر ایک جانب مودب بیٹھ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سرقوشنی بیگی مجھ سے کچھ کہے بغیر مستقل اپنے شغل سے دل بہلا رہی تھی۔

میں نے کچھ دیر بعد ہمت کر کے اسے مخاطب کیا۔

"اے چار بگھاتر بیٹوں کی ماں! کیا تو اپنے خادم سے ناراض ہے؟"

میری بات سن کر اس نے نگاہ اٹھائی، پھر شراب کا ایک گھونٹ لیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جن سے پتا چل رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے پی رہی تھی۔ شراب کا برتن نیچے رکھ کر اس نے ایک بار میری طرف دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ "تو تو اتنا بے وفا ہو گا، یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر تو مغربی دشت جانا ہی چاہتا تھا تو کیا خود مجھ سے نہیں کہہ سکتا تھا؟ تو نے برقائی خاں سے کیوں کہلوایا؟" اس کی آواز نشے کے سبب کسی قدر لڑکھڑا رہی تھی۔

میرا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ آخر اسے یہ بات کیسے پتا چلی کہ میں خود مغربی دشت جانے کا خواہشمند ہوں؟ میں تو یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ خود برقائی خاں مجھے مغربی دشت لے جانا چاہتا ہے۔ اس صورت حال میں جھوٹ بولنا فضول تھا۔ اس کی بات سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی طرح اسے سب کچھ علم ہو چکا تھا۔

"جب کیوں ہے، بولتا کیوں نہیں؟ بول کہ میں نے تجھے کوئی دکھ دیا؟ بتا کہ کیا میں نے تجھے اپنے بگھاتر بیٹوں جیسا نہ جانا؟ کہہ دے کہ میں غلط کہہ رہی ہوں!" مجھے خاموش دیکھ کر سرقوشنی بیگی برس پڑی۔ اس کے لہجے میں شعلوں کی سی لپک تھی۔

"نہیں اے عظیم بیگی! تیرا کہا سچ ہے۔" میں نے فوراً کہا۔

"پھر تو نے بے وفائی کیوں کی؟" اس کے سوال میں

چبھن تھی۔

"یہ بے وفائی نہیں اے آلاء کی رکھوالی بلکہ یہ نیلے جادوانی آسمان کا فیصلہ ہے جسے نہ تو ٹال سکتی ہے اور نہ میں بدل سکتا ہوں۔" میں نے جھوٹ گھڑا کہ پناہ کی یہی صورت تھی۔ "مجھے حکم ملا ہے کہ میں مغربی دست چلا جاؤں۔"

"اور یہاں لامہ ناموسی میرے بگھاتر بیٹے کو اپنے رنگ میں رنگ لے؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"یقین کر اے عظیم بیگی کہ ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے رو میں کہہ دیا اور کہتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ مجھے ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ کیا خبر کل کیا ہو! میں لامہ ناموسی کے پراسرار قوتوں سے تو واقف ہو ہی چکا تھا۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ منگو خان کو واقعی اپنے مذہب پر ایمان لانے کے لیے مجبور کر دے مگر اب کمان سے تیر نکل چکا تھا اس لیے میں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے مزید کہا۔ "جد عظیم کی اولادوں کے ذہن اتنے کچے نہیں کہ وہ کسی مذہب سے متاثر ہو جائیں۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو وہ پہلے ہی عیسائی ہو جاتے۔" میں نے سرقوشنی بیگی کے خوف کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ میں جان چکا تھا کہ اسے کیا خوف ہے! اس کی ناراضگی کا سبب بھی اب میں سمجھ چکا تھا۔

"کیا تو سچ کہہ رہا ہے بوغا؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

"تیرے خادم نے تجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا اے الاؤ کی رکھوالی!"

میں نے کہا، پھر اسے مزید شیشے میں اتارنے کے لیے بولا۔ "دراصل مجھے خود اتنی ہمت نہ ہو سکی تھی کہ تجھے آسمانوں کے حکم سے آگاہ کرتا میں نے اسی لیے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ اگر تو میری اس بات سے ناراض ہے تو مجھے معاف کر دے!"

میری بات سن کر سرقوشنی بیگی کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں ہے۔ پھر وہ ایک دم ہی بول اٹھی۔ "بوغا! کیا تو اپنے علم کے زور پر برقائی خاں کے بارے میں بھی مجھے کچھ بتا سکتا ہے؟"

میں اس کا سوال سن کر الجھ سا گیا۔ آخر وہ برقائی کے بارے میں کیا پوچھنا چاہتی تھی؟ اور ایسی کیا بات تھی جس سے وہ بے خبر تھی؟ پھر یہ کہ میں بھلا وہ بات کیسے بتا سکتا تھا جو خود اسے بھی معلوم نہیں تھی مگر اس کے باوجود مجھے کہنا پڑا "تیرا خادم پوری کوشش کرے گا کہ تیرے سوال کا جواب دے سکے اے عظیم بیگی!"

"میں نے سنا ہے کہ برقائی خاں نے مسلمانوں کے سے طور طریقے اپنا لیے ہیں اور وہ انہی کی طرح عبادت کرتا ہے۔ بتا کہ حقیقت کیا ہے؟" سرقوشنی بیگی نے سوال کیا۔

اس کے سوال کرنے سے قطعی پتا چل رہا تھا کہ اس نے جو کچھ پوچھا ہے، اس کے بارے میں اسے حتمی طور پر نہیں معلوم۔ ذاتی طور پر میں اس بات سے واقف تھا کہ نے جو سنا تھا درست سنا تھا لیکن اگر میں اس سے سچ بول دیتا تو میری اس بات کی تردید ہو جاتی جو میں نے کچھ دیر قبل کہی تھی کہ جد عظیم کی اولادوں کے ذہن اتنے کچے نہیں۔

"جہاں تک میرا علم بتاتا ہے یہ بات قطعی غلط ہے۔" میں نے پریقین انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

"ہاں خود میرا بھی یہی خیال تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔" سرقوشنی بیگی بولی، پھر کچھ دیر رک کر کہا۔ "اگر معاملہ برقائی خاں کا نہ ہوتا تو میں تجھے ہرگز خود سے جدا کرنے پر آمادہ نہ ہوتی لیکن میں سائیں خاں کے بھائی کو خوش خوش یہاں سے بھیجنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس وقت بڑا تعجب ہوا تھا جب یہ پتا چلا تھا کہ خود برقائی خاں تجھے کسی اور وجہ سے اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہوا ہے۔ اس نے اپنے استاد ابو نصار کی خواہش پر ایسا کیا ہے اور ابو نصار سے تو نے خود اپنی مرضی بتائی تھی۔ ابو نصار نے برقائی خاں کو اور برقائی

خاں نے مجھے یہ بات بتا دی تھی۔ خیر میں نے برقانی خاں سے وعدہ کر لیا ہے کہ تجھے اس کے ساتھ بھیج دوں گی۔ تو کہتا ہے کہ تجھے یہ حکم آسمانوں سے ملا ہے تو ٹھیک ہے' تو جا اور جب چاہے واپس قراقرم آجا! تو سرقوشنی بیگی کو خود پر مہربان ہی پائے گا۔"

میں اس کی شکر گزاری کے اظہار میں احتراماً جھک گیا۔ اس نے خود تمام معاملے کی وضاحت کر دی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوتا' میرے حق میں بہتر ہی ہوا تھا۔ میں نے سرقوشنی بیگی سے رخصت کی اجازت چاہی۔ اس نے اپنے سر کی خفیف سی جنبش سے مجھے جانے کی اجازت دی اور اپنا جام اٹھا لیا۔

میں سرقوشنی بیگی کی خوابگاہ سے نکلا تو اس کا خادم میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "عظیم بیگی کا حکم تھا کہ جب تو اس کے پاس ہو تو کوئی خوابگاہ میں نہ آئے اس لیے تجھے فوراً" اس حکم سے باخبر نہیں کیا جا سکا جس پر عمل کرنا تیرے لیے ضروری تھا اور۔"

"کیسا حکم اور کس کا حکم؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے پوچھا۔

میں وہی بتا رہا تھا۔" خادم بولا۔ "جب تو الاؤ کی رکھوالی کے پاس گیا تھا' اس سے تھوڑی دیر بعد ہی عظیم خاقان کا خدم' خاقان کا حکم لے کر آیا تھا کہ تجھے اس نے فوراً" طلب کیا ہے۔ خادم کو بتا دیا گیا تھا کہ تو کہاں ہے اور یہ کہ خاقان کا حکم فوراً" تجھ تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ جب تو عظیم بیگی کی خوابگاہ سے باہر آئے گا تو تجھے خاقان کا حکم سنا دیا جائے گا۔ خاقان کا خادم یہ خبر لے کر واپس جا چکا ہے۔" خادم وضاحت کے ساتھ پوری بات بتا کر خاموش ہو گیا۔

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ فوراً" خاقان منگو سے ملنے روانہ ہو جاتا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ خاندان زریں کے برسر اقتدار افراد کی قربت مجھے مہنگی پڑ رہی تھی' مجھے اس کا پوری طرح احساس تھا لیکن میں ان کے قریب رہنے پر مجبور تھا۔ ان کے درمیان رہ کر کوئی بھی لمحہ' میری زندگی کا آخری لمحہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ان کے حکم کو بھلا ٹال بھی کون سکتا تھا! ان کی خوشنودی ہی میری زندگی کی ضمانت تھی۔

میں سرقوشنی بیگی کے محل سے نکل کر خاقان منگو خاں کے محل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے ہمراہ سرقوشنی بیگی کے دو خادم تھے جن کا تعلق اس کے فشق (محافظ دستہ) سے تھا۔ وہ دونوں مشعلیں لیے آگے آگے چل رہے تھے۔

دونوں خادم محل کے دروازے ہی پر میرے انتظار میں رک گئے۔ خاقان کے محل کا بوڑھا نگراں میرا منتظر تھا۔ اسے غالباً" میری آمد کے بارے میں پہلے ہی مطلع کیا جا چکا تھا۔

"اے عظیم شامان بوغا! آ کہ میں تجھے خاقان کی خوابگاہ تک لے چلوں۔" بوڑھا نگراں مجھے دیکھتے ہی بولا۔ اس کے لہجے میں عقیدت تھی۔

میں' بوڑھے نگراں کی رہنمائی میں آگے بڑھا۔ میرے ذہن میں مختلف سوالات تھے اور دل میں عجیب عجیب وسوسے! میں خاموشی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ راستے میں دو ایک بار بوڑھے نگراں نے مجھے مخاطب کرنا چاہا مگر میں نے سرد مہری سے کام لیا اور اس کی باتوں کے کم سے کم جواب دیے جس کے نتیجے میں وہ بالکل خاموش ہو گیا۔

بوڑھے نگراں نے مجھے منگو خاں کی خوابگاہ تک پہنچا دیا جہاں کلہاڑے بردار محافظ مستعد کھڑے تھے۔ مجھے وہیں رکنے کے لیے کہہ کر نگراں خوابگاہ میں چلا گیا' پھر چند ہی لمحے بعد لوٹ آیا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میں دھڑکتے دل سے خوابگاہ میں داخل ہوا۔ میں نے اندر جاتے ہی دیکھا کہ منگو خاں اپنی خوابگاہ میں ٹہل رہا ہے۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر وہ ایک جگہ رک گیا۔ اس کے چہرے سے کسی قدر فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر اسے تعظیم دی۔

میں نے تعظیم سے فارغ ہو کر سر اٹھایا ہی تھا کہ اس کی بھاری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "مجھے

اسپیشلسٹ

ایک تقریب میں ایک خاتون کی ملاقات ایک ڈاکٹر صاحب سے ہوئی۔ خاتون نے مسکرا کر پوچھا۔

"ڈاکٹر آف فلاسفی؟"

"نہیں ڈاکٹر آف میڈیسن۔"

"جنرل؟"۔

"نہیں ماہر خصوصی۔"

"آنکھ ناک اور گلا؟"

"جی نہیں صرف ناک کا۔"

"دونوں نتھنوں کے ماہر؟"

"جی نہیں صرف دائیں نتھنے کا۔"

تب خاتون نے کہا۔

"معاف کیجیے گا میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گئی کہ ناک مرد کی یا عورت کی۔"

****

افسوس ہے بوغا کہ میں نے تجھے اپنے راز میں شریک کیا حالانکہ تو اس کا اہل نہیں تھا۔" منگو خاں کے لہجے میں دکھ بھی تھا اور سختی بھی!

"میں عظیم خاقان کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔" میں نے کسی قدر خوفزدہ سے لہجے میں کہا۔

"ایک عورت، ایک ناپاک اور آوارہ عورت اس محل میں موجود ہے جسے تو نے قتل ہونے سے بچا لیا تھا اور اس وقت تو نے جو کچھ کہا تھا میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ اسے فوراً" قتل کیا جانا مصلحت کے خلاف تھا۔ میں نے تیری بات مان لی تھی مگر تو بھول گیا کہ میں نے تجھ سے کچھ اور بھی کہا تھا۔ کیا میں نے تجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر اس ابوالہوس کو کوئی جسم نہ ملا تو وہ برداشت نہ کر پائے گی۔ ایسی صورت میں وہ میرے لیے رسوائی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ کیا میں نے تجھے اجازت نہیں دی تھی، حکم نہیں دیا تھا کہ تو اس کے اندر بھڑکنے والے جہنم کو سرد کرتا رہ! پھر پتا کہ تو نے اسے بے لگام کیوں چھوڑ دیا؟" منگو خاں کے لہجے میں شعلوں کی سی لپک تھی۔

میں سناٹے میں آ گیا۔ مجھے توقع بھی نہیں تھی کہ یہ معاملہ ہو گا۔ اس کی برہمی کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اس نے تھمرو کی آوارگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور سن لیا ہے، جب میں خود تھمرو کی خوابگاہ میں کسی مرد کی موجودگی کے بارے میں آگاہ ہو سکتا تھا تو بھلا منگو خاں اپنے محل میں ہونے والی ان حرکتوں سے کس طرح بے خبر رہ سکتا تھا!

"تو مجرموں کی طرح چپ کیوں ہے، بولتا کیوں نہیں؟" مجھے خاموش دیکھ کر منگو خاں پھر برس پڑا۔ "اگر تو اس قابل نہیں تھا تو پہلے بتایا ہوتا۔ کچھ بھی ہوتا، میں اسے قتل کرا دیتا۔"

وہ براہ راست میری مردانگی پر تہمت دھر رہا تھا۔ یہ سوچ کر میرا خون کھول اٹھا اور میں چند لمحوں کے لیے جیسے یہ بھول گیا کہ کس سے مخاطب ہوں! میں نے بے خوفی سے کہا۔ "مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ آوارہ عورت دو ایک دن ہی میں حد سے گزر جائے گی ورنہ تیرے کانوں تک ایسی باتیں نہ پہنچتیں۔ یقین کر کہ اب ایسا نہیں ہو گا۔"

نہ جانے وہ میرے لہجے کی بے خوفی تھی یا کچھ اور کہ منگو خاں کے چہرے کی تنی ہوئی نسیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ وہ کسی قدر نرم انداز میں بولا۔

"ہاں میں یہی چاہتا ہوں کہ اب اس کا نام میرے کانوں تک نہ پہنچے ورنہ میں ہر مصلحت کو بھول کر اسے قتل کرا دوں گا۔"

"ایسا ہی ہو گا اے عظیم خاقان!" اسے نرم پڑتے دیکھ کر میں بھی اپنے حواس میں لوٹ آیا۔

"تو پھر جا اور آج ہی رات اس بھڑکتے ہوئے جہنم کو سرد کر دے!" اس نے حکم دی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے رخصت کی اجازت دے دی۔

میں نے اس کے سامنے سر جھکایا اور خوابگاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں خوابگاہ سے باہر آیا تو محل کا نگراں موجود تھا۔

میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تھمرو کی خوابگاہ تک میری رہنمائی کر!"

"تھمرو کی خوابگاہ تک؟" نگراں کے لہجے میں حیرت تھی۔

میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے پر حیرت کے علاوہ بھی کوئی تاثر محسوس ہوا جسے میں اس وقت کوئی نام نہ دے سکا۔

"کیوں، تجھے حیرت کیوں ہے؟" میں سخت لہجے میں بولا۔

"نن نہیں مجھے مجھے کوئی حیرت نہیں!" وہ گڑبڑا سا گیا۔ "میں تجھے وہاں تک پہنچا دیتا ہوں مگر میرے پیٹ میں چھ لزبڑ سی ہو رہی ہے اس لیے پہلے مجھے اپنی رہائش گاہ تک چلنا پڑے گا۔ آ میرے ساتھ آ!" وہ آگے بڑھا۔

بوڑھے نگراں کا رویہ خلاف معمول تھا۔ میں کھٹک گیا۔ پہلے اس کا اظہار حیرت، پھر بوکھلاہٹ اور اب مجھے براہ راست وہاں نہ لے جانے کے لیے بہانہ! آخر ان باتوں کا کیا مطلب تھا؟ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ میرے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور میں نے کہا۔ "تو جانا چاہتا ہے تو جا! میں کسی بھی محافظ کو اپنا رہنما بنا لوں گا۔ کسی اور کو میرے ساتھ کر دے!"

وہ آگے بڑھتے ہوئے ٹھٹک گیا، پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ "ٹھیک ہے، میں کسی اور کو تیرے ساتھ کر دیتا ہوں۔"

اس راہداری کے اختتام پر ہی ایک محافظ نظر آ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی محافظ نظر آ رہا ہے۔"

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔ "وہاں تک تو میرے ساتھ چل!"

میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ چند قدم چل کر ہی میں نے یہ بات محسوس کر لی کہ بوڑھا نگراں مجھ سے پہلے اس محافظ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے بھی تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دیے کیونکہ

آپ کی شخصیت ستاروں کی روشنی میں

آپ کی قسمت کے ستارے کب عروج پر ہوتے ہیں؟
آپ کا شریک حیات کیسا ہونا چاہیے؟
آپ کے مالی و کاروباری حالات کیسے بدل سکتے ہیں؟
آپ کی نفسیاتی پریشانیاں کیسے دور ہو سکتی ہیں؟

ان سب سوالوں کا جواب جاننے کے لیے

ہم اور ہمارے ستارے

قیمت:-/40 روپے بمعہ ڈاک خرچ کا مطالعہ کیجیے۔

محبت، شادی، مستقبل اور قسمت!!!

آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟

برجوں کی مکمل کتاب

جس کی مدد سے آپ جان سکتے ہیں کہ:
آپ کے نفسیاتی مسائل کا حل کیا ہے؟
آپ کی آئندہ زندگی میں کیا رونما ہونے والا ہے؟
آپ کی شخصیت کے کمزور پہلو کونسے ہیں؟
اپنے دوستوں اور دشمنوں کو پہچانیں؟

بارہ برجوں پر ایک مستند اور مکمل کتاب

قیمت:-/40 روپے بمعہ ڈاک خرچ

آج ہی قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں
یا ہم سے منی آرڈر بھیج کر منگوائیں۔

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

میں پیچھے رہ گیا تھا۔

پھر میں اور بوڑھا نگراں دونوں ہی ساتھ ساتھ محافظ کے قریب پہنچے۔

"اسے اسے تھمرو کی خوابگاہ تک پہنچا دے!" بوڑھے نگراں نے محافظ کو حکم دیا پھر بولا۔ "اور ہاں اشرق کو میرے پاس بھیجتا ہوا ادھر جا!"

محافظ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

"میں نے تجھ سے جو کہا ہے اس پر عمل کر! پہلے اشرق کو میرے پاس بھیج! پھر اسے تھمرو کی خوابگاہ تک لے جا!" بوڑھا نگراں، محافظ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دوبارہ بول اٹھا۔

محافظ نے اثبات میں سر ہلا کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ بوڑھا نگراں بائیں جانب جانے والی راہداری میں مڑ گیا۔ میں، محافظ کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے لے کر دائیں طرف والی راہداری میں مڑا تھا۔

میں نے چند قدم چلتے ہی محافظ کو مخاطب کیا۔ "یہ اشرق کون ہے؟"

"میری ہی طرح ایک اور محافظ جو جنوبی سمت پہرہ دیتا ہے۔" محافظ نے جواب دیا۔

"اور تھمرو کی خوابگاہ کس سمت میں ہے؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"شمالی سمت!" محافظ نے کسی قدر جھجکتے ہوئے بتایا۔

"اسی طرف جدھر تمہارا نگراں گیا ہے؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

محافظ نے اثبات میں سر ہلایا۔

میرا اندازہ قطعی درست ثابت ہوا تھا۔ اب کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ محل کا نگراں کسی سبب یہ چاہتا تھا کہ میں فوراً اور براہ راست تھمرو کی خوابگاہ تک نہ پہنچ سکوں۔ اس کی یہ حرکت نازیبا تھا اور حدود سے تجاوز بھی! غصے کے سبب میرا خون کھول اٹھا۔

"تو اب سیدھا تھمرو کی خوابگاہ چل!" میں نے محافظ کو حکم دیا۔ "اشرق کی تلاش میں جنوبی سمت جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" یہ کہتے ہی میں رک گیا۔

"لیکن، لیکن وہ مجھ پر خفا ہو گا۔" محافظ ڈرتے ہوئے بولا اور اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدم بھی رک گئے۔

"تو مجھے جانتا ہے؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ہاں!" اس نے سر ہلایا۔ "تو بوغا ہے۔"

"تو پھر تجھے میرا حکم ماننا چاہیے!"

محافظ کچھ دیر بعد ہی میرا حکم ماننے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ مجھے بہرحال ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یوں بھی میں نے اسے تسلی دے دی تھی کہ اس کا نگراں، اس سے جواب طلبی نہیں کرے گا۔ میں نے اسے تیز تیز چلنے کا حکم دیا تھا اور خود بھی تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔

میں ناواقف تھا کہ محل کا نگراں کیا کھیل کھیل رہا تھا مگر مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے اور محل کا نگراں مجھ سے کوئی بات چھپانا چاہتا ہے۔

کچھ دیر بعد محافظ مجھے لیے ہوئے اس راہداری میں پہنچ گیا جس میں تھمرو کی خوابگاہ تھی۔ وہاں میں پہلے بھی آ چکا تھا اس لیے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ تھمرو کی خوابگاہ ہی کا دروازہ تھا جہاں کوئی شخص کھڑا تھا۔ دور سے اس کے خدوخال واضح نظر نہیں آ رہے تھے اس لیے میں اسے نہیں پہچان سکا لیکن فاصلہ کچھ کم ہوا تو میں نے اسے واضح طور پر پہچان لیا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ محل کا نگراں تھا۔ خوابگاہ کا دروازہ بند تھا۔ میری سماعت سے اب محل کے نگراں کی آواز بھی ٹکرا رہی تھی مگر وہ کیا کہہ رہا تھا، یہ مجھے صاف سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے صرف اپنا نام واضح سنا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ فاصلہ مزید کم ہوتا معاً محل کے نگراں کو شاید میرے اور محافظ کے قدموں کی چاپ سے یہ اندازہ ہو گیا کہ راہداری میں کوئی داخل ہو کر اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ چونک اٹھا، اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا، راہداری کی دوسری سمت!

وہ راہداری آگے جا کر دائیں جانب مڑ جاتی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے آواز دے کر روک سکتا' وہ تیزی سے چلتا ہوا غائب ہو گیا۔ راہداری کا موڑ اس کے اور میرے درمیان حائل ہو گیا تھا۔

مجھے دوسری طرف بھیج کر خود اس کا وہاں پہنچنا' اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ میری آمد سے تھمرو کو پہلے ہی آگاہ کر دینا چاہتا تھا۔ میرا ذہن کڑیاں جوڑنے لگا۔ گزشتہ شب تھمرو کی خوابگاہ میں کوئی مرد تھا جسے تھمرو نے پراسرار طور پر فرار کرا دیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا آج رات بھی اس کے پاس کوئی موجود ہے اور اس کی وہاں موجودگی سے محل کا نگراں پریشان تھا؟ کیا وہ بھی تھمرو کے جرم میں برابر کا شریک تھا؟ مگر کیوں؟

میں انہی سوالوں کے حصار میں گردش کرتا ہوا' تھمرو کی خوابگاہ کے دروازے تک پہنچ گیا۔ میں نے وہاں پہنچتے ہی پہلے محافظ کو رخصت کیا' پھر دروازے پر دستک دی۔

چند دستکوں کے بعد ہی دروازہ کھل گیا اور تھمرو کی شکل نظر آئی۔ میں نے واضح طور پر یہ بات محسوس کر لی کہ اس وقت میری آمد اسے گراں گزری تھی اور یہ بھی کہ میرے آنے سے قبل وہ یقیناً "دنیا و مافیہا سے بے خبر رہی ہو گی۔ اس کی ظاہری حالت اسی بات کی نشاندہی کر رہی تھی' کھلے ہوئے دراز گیسو' شکن شکن پیراہن' اڑی اڑی رنگت اور تنفس کی رفتار تیز! وہ یقیناً" کچھ دیر پہلے تک کسی کی آغوش میں تھی مگر خوابگاہ خالی ہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا' پراسرار طور پر غائب ہو چکا تھا۔

میں اب اس کی خوابگاہ میں داخل ہو چکا تھا اور بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

مجھے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "بوغا! کل رات تو چیختا گر چلا گیا تھا۔ کیا تو نے وہ سزا سوچ لی جو مجھے دینا چاہتا ہے؟" اس کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔

"تیرے لیے فی الحال یہی سزا کیا کم ہے کہ تو اپنی خواہشوں کے جہنم میں سلگ رہی ہے اور مجھ پر فتح حاصل نہیں کر پائی۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے اپنی نفرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ دراصل اس کے ہرجائی پن نے مجھے اس کی طرف سے بددل کر دیا تھا حالانکہ میرے وہاں آنے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ وہ بظاہر اتنی ہی حسین و پرکشش تھی کہ اس کے قرب کو زندگی کا حاصل کہا جا سکے۔

میری بات سن کر اس نے بڑی قاتل نگاہ سے دیکھا اور بغیر کچھ کہے دروازہ اندر سے بند کر دیا' پھر میری جانب پلٹ کر بولی۔ "ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تیری آرزو کی اور تجھے نہ پا سکی لیکن شاید میری آرزو' آرزو ہی رہے۔ کچھ مرد ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو بظاہر مرد دکھائی دیتے ہیں مگر۔" اس نے بڑے معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

صحرائی گوبی کے اولوالعزم نوجوان کا اعمال نامہ زیست ابھی جاری ہے' وحشت و بربریت کی سرحد پر آباد ہونے والی جادوگری کے بقیہ واقعات آئندہ ملاحظہ کریں۔

ہوشربا

حصہ دوم

Pakistanipoint

Waqar Azeem

ایچ اقبال

اس لمحے میرا دل چاہا کہ اسے پیس کر رکھ دوں' اس کا جسم ادھیڑ کر رکھ دوں' اسے دھن ڈالوں' بالکل اس طرح جس طرح میری ماں کا دوسرا شوہر چنکائی' میری ماں کو دھن ڈالتا تھا لیکن اسی وقت میری نگاہ مسہری کے کنارے سمٹے ہوئے قالین پر پڑی۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب سی اور خلاف معمول سی نظر آئی کہ وہ قالین مسہری کے نیچے تک بچھا ہوا تھا۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور سمٹے ہوئے قالین کو باہر کی طرف کھینچنے لگا۔

"یہ کیا کر رہا ہے تو؟" تھمرو بھی لپک کر میرے قریب آگئی اور میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھانے لگی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور سختی سے بولا۔

"میرا بازو چھوڑ دے تھمرو!" اپنی بات کہتے ہوئے میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی تھی اور میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا تھا کہ وہ کسی قدر گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میں اور شک میں پڑ گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور مسہری کے نیچے دبا ہوا قالین' مسہری کو ایک جانب سے اٹھا کر نکال لیا' پھر اسے باہر کی جانب کھینچنے لگا مگر قالین سرہانے کی جانب سے بھی دبا ہوا تھا۔ اس وقت میرا ذہن ایک نتیجے تک

پہنچ رہا تھا۔ میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھتے ہی مسہری کو ایک جانب گھسیٹ لیا۔

مسہری اپنی جگہ سے ہٹی تو اس کے نیچے مجھے ایک خلا نظر آیا جو غالباً" قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ اب میں اس راز کی تہہ تک پہنچ چکا تھا کہ تھمرو کا آشنا وہاں سے گزشتہ رات کس طرح فرار ہو گیا تھا! کچھ دیر قبل بھی اس کی خوابگاہ میں جو شخص تھا' وہ بھی یقیناً" اسی راستے سے فرار ہوا تھا اور اس کے فرار ہوتے ہی تھمرو نے دوبارہ خلا پر قالین بچھا کر وہاں مسہری بچھا دی تھی۔ خلا میں سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔

"تو یہ ہے تیری عیاشی کا راز!" میں نے تھمرو کی جانب پلٹ کر غصے سے کہا۔

"جذباتی نہ بن! اس خلا کو اسی طرح ڈھک دے جس طرح یہ ڈھکا ہوا تھا۔" تھمرو پرسکون آواز میں بولی۔ اب اس کے چہرے پر ذرا بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ وہ بڑی بیباکی سے کہہ رہی تھی۔ "میں نے تجھ سے کب یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں پارسا ہوں!"

میں اس کی بات کا کوئی جواب دیے بغیر خلا کی طرف بڑھا اور پھر اس میں اترنے لگا۔

"کہاں جا رہا ہے بوغا؟" تھمرو یہ کہتی ہوئی میری جانب لپکی۔

"تو اس خلا میں اتر کر یہی تو معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کا دوسرا سرا کہاں ہے! یہ میں تجھے اس میں اترے بغیر بھی بتا سکتی ہوں۔"

میرا اندازہ تھا کہ وہ خفیہ راستہ محل ہی میں کسی کمرے تک جاتا ہو گا' اسی شخص کے کمرے تک جس کے ساتھ تھمرو رنگ رلیاں منا رہی تھی مگر اس کے باوجود میرے قدم رک گئے۔ میں نے تھمرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں بتا کہ یہ خفیہ راستہ کس کے کمرے میں جاتا ہے؟"

"یہ کسی کے کمرے تک نہیں جاتا بلکہ یہ محل کے باغ میں نکلتا ہے۔" تھمرو نے جواب دے کر میری اندازے کو غلط ثابت کر دیا۔

"میں خود جب تک اس کی تصدیق نہیں کر لوں گا' مجھے یقین نہیں آئے گا۔" میں بے یقینی سے بولا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

"تو بیکار وقت ضائع کر رہا ہے۔" وہ بے دلی سے بولی اور پیچھے ہٹ گئی۔

میں سیڑھیاں اتر کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرے آگے اندھیرے کی دبیز چادر پھیلی ہوئی تھی۔ مگر اس کے باوجود میں سیدھا بڑھتا چلا گیا اور مجھے اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا جب میرا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ وہ دیوار ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے ٹٹول کر اس کی تصدیق کر لی۔ راستہ سیدھا نہیں بلکہ دائیں یا بائیں جانب تھا۔ اس خلا میں بغیر مشعل لیے اترنا حماقت ہی تھی اور مجھے اب اس حماقت کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ راستہ کہیں بھی نکلتا تھا لیکن اب یہ تو پتا چل ہی گیا تھا کہ تھمرو کا آشنا اسی راستے سے فرار ہوا تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ پہلے سے ہی اس راستے کو جانتا ہو گا ورنہ اندھیرے میں اس طرح اس کا فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ اب راز کھل جانے کے بعد تھمرو کی زبان بھی کھلوائی جا سکتی تھی۔ وہ شخص یقیناً" بڑے دل گردے والا تھا جس نے خاقان کی امانت میں خیانت کرتے ہوئے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا کیا حشر ہو گا! میں یہی سوچتا ہوا پھر زینے تک پہنچ گیا اور اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

میں جب خلا سے نکلا تو تھمرو نے حیرت سے کہا۔ "کیا تو اتنی جلدی باغ تک ہو آیا؟"

"نہیں!" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے تیری بات پر یقین کر لیا۔"

کچھ دیر ہی میں تھمرو اور میں نے خلا کو دوبارہ ڈھک کر اس پر مسہری بچھا دی' پھر میں مسہری پر اس کے قریب ہی بیٹھ کر اسے گھورنے لگا۔

"اس طرح گھور گھور کر دیکھ رہا ہے؟ کیا تو یہاں مجھے صرف گھورنے ہی آیا ہے؟" وہ ایک ادا سے ہنس کر بولی اور ایک دم میری آغوش میں گر گئی۔

"تھمرو! وہ کون تھا جسے تو نے آج اور گزشتہ شب' خفیہ راستے سے فرار کر دیا تھا؟" میں نے اس کے گداز

جسم کی لذت میں پوری طرح گم ہونے سے پہلے پوچھا۔ اس کا لمس میرے لہو کی گردش تیز کر رہا تھا اور میں بڑی مشکل سے خود پر قابو پا رہا تھا کیونکہ میری آغوش میں آنے کے بعد اس کے ہاتھوں کی بے حجابانہ حرکتیں جاری تھیں جنہیں میں نے دانستہ نہیں روکا تھا۔

"گئی گزری باتوں کو چھوڑ بوغا اور مجھے محسوس کر!" وہ خوابناک سی آواز میں بولی۔

میں نے سنا تھا کہ قرب کے دوران میں عورت اور مرد ایسے خود فراموشی کے لمحوں تک جا پہنچتے ہیں جب ان سے کچھ بھی منوا لینا مشکل نہیں ہوتا۔ میں ایک بار ذاتی طور پر ایسے لمحوں سے گزر چکا تھا اس لیے اب اس سنی ہوئی بات پر مجھے یقین آ گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ایسے ہی لمحوں کے دوران میں تھمرو کی زبان کھلوائی جا سکتی ہے۔ یوں بھی اب میرے دل میں عجیب عجیب سی خواہشیں مچلنے لگی تھیں۔ اب میرے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ خود پر قابو پا سکتا۔ میری سماعت میں اس وقت منگوخاں کے وہ الفاظ گونج رہے تھے جن میں اس نے میری مردانگی پر شک کیا تھا اور یہی طعنہ مجھے تھمرو نے دیا تھا۔

"تھمرو! کیا تجھے اب میری مردانگی پر یقین آ گیا؟" میں نے اس کے یاقوتی لبوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"ابھی نہیں!" یہ کہہ کر وہ بہت زور سے ہنس پڑی، اور پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"تو یہ نہ سمجھنا کہ تو نے مجھے اپنی خواہش کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیا بلکہ میں تیری غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے خجالت سے بچنے کے لیے کہا۔

"چل تو اپنے دل کو اسی طرح سمجھا لے! اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے!" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

اور پھر مجھے اس کے بعد کچھ یاد نہیں رہا کہ کیا ہوا! مجھے کچھ دیر بعد ہی یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے مجھ پر ایک آندھی سی چھا کر چلی گئی تھی اور اس آندھی میں میرا وجود کسی صحرائی بگولے کی طرح رقص کر رہا تھا۔ میں جیسے اس تنکے کی مانند ہو گیا تھا جسے ہوا ادھر سے ادھر اڑائے اڑائے پھرتی ہے۔

اچانک تھمرو کو نہ جانے کیا ہوا کہ وہ مجھ سے جدا ہو گئی اور مجھے یوں لگا جیسے میری جان ہونٹوں تک آ گئی ہو۔

"تھمرو!" میں چیخ پڑا۔

وہ سراپا قیامت بنی مسہری کے قریب کھڑی ہوئی مجھے عجیب سی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ اس ایک نگاہ میں نہ جانے کیا کیا تھا، نفرت بھی، غرور بھی، ذلت بھی اور طنز بھی!

"تھمرو! آ آ! یہ تو نے کیا کیا؟ میں۔۔۔ میں یہ۔۔۔ یہ آگ برداشت نہیں کر سکتا یہ آگ مجھے۔۔۔ مجھے جلا ڈالے گی۔" جذبات کی شدت سے میری آواز کانپ رہی تھی۔

"جس آگ میں تو جل رہا ہے بوغا وہی آگ مجھے بھی جلا رہی ہے مگر تھمرو تیری طرح نہیں جو اس کی جلن برداشت نہ کر سکے۔" وہ ایک طیش کے عالم میں بولی۔ "کل بھی میں اسی آگ میں جلی تھی اور جب تو اچانک یہاں آ گیا تھا تو بھی مجھے اسی آگ میں جلنا پڑا تھا۔ میں تجھے احساس دلانا چاہتی ہوں کہ تو بھی اس آگ کی۔"

"تھمرو!" میں نے اس کی بات کاٹ دی، اور پھر جیسے مجھ پر جنون سا طاری ہو گیا۔ میں ایک دم تیزی سے اٹھا اور اسے دبوچ لیا۔ مجھ میں مزید صبط کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس مرتبہ تھمرو میری وحشت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ میری آغوش میں بے بس ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد میں تھمرو کی خوابگاہ کے فرش پر بے سدھ پڑا تھا اور مجھے اس کا احساس کافی دیر بعد ہوا تھا۔

"اٹھ بوغا! بہت رات بیت گئی۔ کیا تو واپس نہیں جائے گا؟" تھمرو نے میرا شانہ ہلا کر کہا تھا۔

"ہاں آں!" میں اٹھ بیٹھا، اور پھر مجھے یاد آیا کہ محل کے دروازے پر دو خادم میرے اب تک منتظر ہوں گے۔ اگر وہ میرے ساتھ نہ آئے ہوتے تو شاید اس

شب میں تھمرو سے جدا نہ ہوتا۔

مجھے روانگی سے پہلے پھر اس شخص کا خیال آیا جو اب میرا رقیب بن چکا تھا۔ میں خود فراموشی کے لمحوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ میں تو جیسے اس کے قرب میں اپنے وجود تک کو بھول بیٹھا تھا' مجھے بھلا اپنے رقیب کا خیال کس طرح آتا! اب وقت گزرنے کے بعد مجھے اس کا خیال آیا تو ایک موہوم سی امید پر کہ شاید اب تھمرو کچھ بتا دے' اس سے پوچھا۔

"تھمرو! تو نے اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جو کل شب اور آج میرے یہاں آنے سے پہلے تیری خوابگاہ میں تھا۔ کیا تو اب بھی نہیں بتائے گی کہ وہ کون تھا؟"

"تجھے اس سے کیا لینا! اس ذکر کو چھوڑ اور یہ بتا کہ کیا تو کل رات بھی آئے گا؟" وہ اپنے شکن شکن لباس کو درست کرتی ہوئی بولی۔

میں نے سمجھ لیا کہ وہ کچھ نہیں بتائے گی اور یہ جان کر مجھے سخت غصہ آگیا۔ میں کسی قدر تیز لہجے میں بولا۔ "تو نہ بتا مگر میں اس کے بارے میں معلوم کرلوں گا۔" یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں محل کے نگراں کا خیال آگیا تھا۔ تھمرو کی نسبت اس کی زبان با آسانی کھلوائی جاسکتی تھی۔ محل کا نگراں میری حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "دیکھ تھمرو! اب تک تو کچھ ہوا سو ہوا مگر میں آئندہ تیری آوارگی برداشت نہیں کروں گا۔ اگر تو باز نہ آئی تو یہ تیرے حق میں برا ہو گا۔" اب میرے ذہن سے اس کے جسم کا نشہ اتر چکا تھا اور میں بیباکی سے بات کر رہا تھا۔

"آوارگی؟ کیا کہہ رہا ہے تو؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"تو کون ہوتا ہے مجھ پر پہرے بٹھانے والا؟ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں' جو چاہوں سو کروں۔ تجھے میں نے یہ اختیار کب دیا ہے کہ تو مجھ پر پابندی لگائے یا مجھے حکم دے؟"

"تھمرو! تو پھر اپنی حدود سے آگے بڑھ رہی ہے۔" میں نے طیش کے عالم میں کہا۔ "تو ابھی شاید میرے اختیار سے واقف نہیں۔ میں اگر چاہوں تو تجھے ایسی جگہ قید کیا جا سکتا ہے جہاں کسی مرد کا سایہ تک تجھے دیکھنا نصیب نہ ہو۔" میں غصے میں کہتا چلا گیا۔

"تو پھر تجھے انتظار کیا ہے؟ اپنی حسرت نکال لے!" اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

میں نے جو کچھ کہا تھا' غلط نہیں کہا تھا۔ میں خاقان منگو سے کہہ کر ایسے سخت انتظامات کرا سکتا تھا کیونکہ اسے تھمرو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ تو تھمرو سے جان چھڑانے کے لیے اسے قتل تک کرانے پر آمادہ تھا۔ اگر میں اسے مصلحت کا احساس دلا کر' ایسا کر گزرنے سے نہ روکتا تو تھمرو کبھی کی قتل ہو جاتی لیکن میرے سامنے ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ مجھے قراقرم چھوڑ کر مغربی دشت جانا تھا۔ میں جب منگو خاں سے ملا تھا تو مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی کہ میں اس سلسلے میں آگاہ کر سکتا۔ یوں بھی وہ اس وقت غصے میں تھا۔ ان حالات میں تھمرو میرے لیے ایک مسئلہ بن کر رہ گئی تھی لیکن مجھے اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل بہرحال ڈھونڈنا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر تھمرو نے پھر چڑایا۔ "تو پھر تو اپنے اختیارات کب استعمال کرے گا؟"

وہ شاید میری بات کو محض دھمکی سمجھی تھی یا اسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا کہ واقعی میں اتنا با اختیار ہوں۔ اس کے لہجے سے یہی پتا چل رہا تھا۔

"میں جلد اور بہت جلد اپنے اختیارات استعمال کروں گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"میں اس دن کا انتظار کروں گی۔" وہ بولی۔

تھمرو سے مزید گفتگو کا مطلب خود کو طیش دلانا ہی تھا اس لیے میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"سن بوغا!" معاً اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "تجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا' اب میری بات سن! اب اگر تو نے میری خوابگاہ کے دروازے پر دستک دی تو دروازہ نہیں کھلے گا۔ میں تجھے اپنی خواہشوں کے سامنے جھکا چکی ہوں۔ میں نے تجھ پر سچائی ہے اور اب میرے دل

میں تجھ پر غالب آنے کی مزید کوئی آرزو نہیں۔ میں جسے ایک بار فتح کر لیتی ہوں، پھر ضروری نہیں سمجھتی کہ دوبارہ بھی اسے اپنے قریب آنے دوں۔ ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب میں خود چاہوں ورنہ ہرگز نہیں اور میں اب تیرے قرب کی آرزو تو کیا، تیری صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں۔"

الفاظ تھے کہ پگھلا ہوا سیسہ جو میرے کانوں میں تھمرو نے انڈیل دیا تھا۔ غصے سے بے قابو ہو کر میرے منہ سے مغلظات کا طوفان امڈ پڑا اور وہ قہقہے لگانے لگی۔ اس پر ان مغلظات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں غصے کے عالم میں پاؤں پٹختا ہوا، اس کی خوابگاہ سے نکلنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا!

تھمرو کی خوابگاہ سے صدر دروازے تک پہنچنے کا راستہ مجھے یاد تھا مگر میرا ذہن اس وقت اتنا بے قابو تھا کہ میں راستہ بھول گیا۔ خاقان منگو کا محل ہی اتنا بڑا تھا کہ راستہ بھول جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ مجھے کچھ دیر بعد ہی احساس ہو گیا کہ میں راہ بھٹک گیا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ایک محافظ کو ساتھ لے لیا جو ایک راہداری میں پہرہ دے رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی میں خاقان منگو کے محل سے نکل کر دونوں خادموں سمیت سرقوشنی بیگی کے محل کی طرف جا رہا تھا۔ محل کے نگراں کی زبان کھلوانے کا معاملہ میں نے آئندہ دن پر ٹال دیا تھا کیونکہ میں اب کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس پر سکون کے ساتھ اچھی طرح غور و خوض کر لینا چاہتا تھا۔ تھمرو نے مجھے جس طرح ذلیل و رسوا کیا تھا، اس کی خلش میرے دل میں تھی۔ اس ذلت و رسوائی کا یہی سبب تھا کہ میں نے پہلے سے کچھ نہیں سوچا تھا اور خود کو حالات کے سپرد کر دیا تھا۔

میرا ذہن کیونکہ بے حد الجھا ہوا تھا اس لیے اس شب مجھے فوراً" نیند نہ آ سکی۔ میں دیر تک مختلف خیالات کے حصار میں گردش کرتا رہا۔ میں نے سونے سے قبل جو فیصلہ کیا تھا، وہ یہ تھا کہ سب سے پہلے تو آئندہ روز میں، منگو خاں کو قراقرم سے اپنی روانگی کے بارے میں آگاہ کر دوں گا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ میں نے دوسرا فیصلہ تھمرو کے سلسلے میں کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا، میں، منگو خاں سے کہہ دوں گا کہ تھمرو کی آوارگی کو روکنے کا صرف ایک طریقہ ممکن ہے۔ وہ یہ کہ اسے کسی ایسی جگہ قید کر دیا جائے جہاں اس پر کسی مرد کا سایہ تک نہ پڑے۔ اس کی نگرانی پر تجربے کار خادماؤں کو متعین کیا جا سکتا تھا۔ میں، خاقان منگو خاں کو صاف صاف بتا دینا چاہتا تھا کہ تھمرو اس حد تک بے لگام ہو چکی ہے کہ کسی ایک مرد پر اکتفا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا اس لیے میرا قرب بھی اسے مطمئن نہ کر پائے گا اور وہ بدستور اپنی آوارگی میں مشغول رہے گی جو بہرحال مناسب نہیں۔ تھمرو کو اس وقت تک سخت قید میں رکھا جائے، جب تک برقائی خاں، قراقرم میں رہے۔ اس کے بعد اسے خاموشی سے قتل کر دیا جائے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ منگو خاں، تھمرو کے بارے میں یہ سب کچھ جان کر فوری طور پر اس کے قتل کا حکم دے دیتا۔ اگر تھمرو کو خاموشی سے ہی قتل کیا جانا تھا تو وہ برقائی خاں کے قراقرم میں موجودگی کے باوجود بھی تو ممکن تھا۔ ایسا پہلے بھی کیا جا سکتا تھا لیکن میں نے منگو خاں کے ذہن میں یہ بات نہیں ڈالی تھی اور نہ ہی اسے خیال آیا تھا۔ منگو خاں جیسے با اختیار شخص کے لیے ایک معمولی سی عورت کے قتل کو چھپانا کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن اس وقت مجھے تھمرو کی زندگی سے دلچسپی تھی۔ اب تھمرو کسی بھی رعایت کی مستحق نہیں رہی تھی۔ اس نے مجھے ذلیل و رسوا کر کے گویا اپنی موت ہی کو دعوت دی تھی۔

رات کو میں کافی دیر سے سویا تھا اس لیے اسی وقت بیدار ہوا جب کوئی زور زور سے میرے دروازے کو پیٹ رہا تھا۔ یہ بات میرے لیے خلاف توقع تھی۔ میں تو یہ سوچ کر سویا تھا کہ جب تک چاہوں گا، سوؤں گا، مجھے بھلا کون بیدار کرے گا!

دروازہ غالباً" کافی دیر سے پیٹا جا رہا تھا۔ میں تیزی کے ساتھ بستر سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی میرے پہلی نظر ایک کلہاڑے بردار پر پڑی، اور پھر میں نے سرقوشنی بیگی کے خاص خادم کو

دیکھا۔

"تجھے کیا ہو گیا تھا بوغا؟" سرقوشنی بیگی کا خادم مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "میں کافی دیر سے تیرا دروازہ پیٹ رہا تھا مگر تیرے کانوں پر جوں ہی نہیں رینگ رہی تھی۔ کیا تو گھوڑے بیچ کر سویا تھا؟"

"ہاں رات کو میں دیر سے سویا تھا اس لیے فوراً آنکھ نہیں کھل سکی۔" میں نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔ "کہہ کیا بات ہے؟"

"کیا تو خاقان کے محافظ خاص کو نہیں پہچانتا؟ یہ تجھے لینے یا ہے۔" خادم نے بتایا۔

میں نے اس کلہاڑے بردار کو یقیناً "منگوخاں کے محل میں دیکھا تھا مگر اس وقت میرے ذہن پر نیند کا خمار تھا اس لیے اسے فوراً" نہ پہچان سکا تھا۔ ذہن سے کچھ نیند کا خمار چھٹا تو میں نے کلہاڑے بردار سے اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ کمرے میں آگیا اور سرقوشنی بیگی کا خادم وہاں سے چلا گیا۔ اس کلہاڑے بردار کا وجود میرے لیے سوال بن گیا تھا۔ میں اسے بھیجے جانے کا مقصد اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مجھے بلوانے کے لیے کسی خادم کو بھی بھیجا جا سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا تھا۔ کلہاڑے بردار محافظوں کو کسی کے پاس بھیجے جانے کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ وہ مطلوبہ شخص کو اپنے ساتھ ہی لے کر آئیں۔ عموماً" ایسا اسی صورت میں ہوتا تھا جب کہ مطلوبہ شخص کی حفاظت مقصود ہو یا طلبی کا مقصد انتہائی اہم نوعیت کا ہو یا پھر مطلوبہ شخص کسی جرم میں ماخوذ ہو۔ ظاہر تھا کہ کلہاڑے بردار کو بھیجنے کا مقصد میری حفاظت تو ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ میری زندگی کو کوئی ایسا خطرہ درپیش نہیں تھا۔ ایسی صورت میں آخری دو باتیں ہی ممکن تھیں اس لیے میرا فکر مند ہونا بے جا نہیں تھا۔ میں نے اسی لیے اس کلہاڑے بردار کو اپنے کمرے میں بٹھا لیا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ ہی جانا تھا۔ میں اس دوران میں منگوخاں کے محل روانگی کی خاطر تیار ہونا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کلہاڑے بردار میری طلبی کے مقصد سے آگاہ نہیں ہو گا اور اگر اسے کچھ علم بھی ہو گا تو وہ کچھ نہیں بتائے گا اس لیے میں نے اس سے کچھ پوچھنا غیر ضروری ہی سمجھا۔

کچھ دیر بعد ہی میں اس کلہاڑے بردار کے ہمراہ منگوخاں کے محل کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اس دوران میں یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ وہ کلہاڑے بردار میری جانب سے پوری طرح چوکنا اور مستعد تھا۔ وہ اپنے کلہاڑے کو سنبھالے ہوئے میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ خادموں کا رویہ اس کے برعکس ہوتا تھا وہ آگے آگے چلتے تھے۔

کلہاڑے بردار مجھے لیے ہوئے منگوخاں کے محل میں داخل ہو گیا۔ اب صدر دروازے پر موجود ایک کلہاڑے بردار ہمارے ساتھ ہو گیا تھا جو میرے آگے آگے چل کر رہنمائی کر رہا تھا۔

وہ ایک طویل سی راہداری تھی جس کے آغاز ہی میں دو کلہاڑے بردار مستعد کھڑے تھے جو ہمیں آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئے اور ہم ان کے قریب سے گزر گئے۔ اسی راہداری میں کچھ فاصلے پر بائیں جانب ایک دروازے کے سامنے چار کلہاڑے بردار چوکنا کھڑے ہوئے دکھائی دیے۔ محل کا وہ حصہ میرے لیے نیا ہی تھا۔ میں اس سے پہلے ادھر نہیں آیا تھا۔

جو کلہاڑے بردار مجھے ساتھ لایا تھا وہ مجھے اپنے دوسرے ساتھیوں کی تحویل میں دے کر دروازے سے اندر چلا گیا پھر جلد ہی لوٹ آیا۔

"عظیم خاقان تیرا منتظر ہے۔" کلہاڑے بردار نے مجھے مخاطب کیا۔ "جا اندر جا!"

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر قدم رکھا۔ وہ بہت بڑا کمرہ تھا اور انتہائی عمدہ طریقے پر سجا ہوا تھا۔ وہ شاید منگوخاں کا کمرہ نشست تھا جہاں وہ مہمانوں اور دوسرے لوگوں سے ملاقات کرتا تھا۔ کمرے میں وہ تنہا ہی تھا اور ایک جانب مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے مسند کے قریب پہنچ کر اسے تعظیم دی اور ابھی میں تعظیم دے کر فارغ نہیں ہوا تھا کہ منگوخاں کی سمع خراش آواز بلند ہوئی۔

"بوغا! کیا کل شب تو تھمرو سے ملا تھا؟ کیا تو نے

اس حکم پر عمل کیا تھا جو تجھے دیا گیا تھا؟"

"ہاں اے عظیم خاقان!" میں نے ادب سے جھک کر جواب دیا۔ میں نے سوچا کہ اس نے پہلا سوال فضول ہی کیا تھا کیونکہ یہ بات بہرحال اس سے چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی تھی۔ کہ میں تھمرو کی خوابگاہ میں گیا تھا مگر اس سے کسی فضول سوال کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں یہی سوچا جا سکتا تھا کہ اس طرح شاید وہ میرے سچ یا جھوٹ کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ میں نے لمحے بھر رک کر اس کے دوسرے سوال کا جواب دیا۔ "اے بگھاتر ماں کے بگھاتر بیٹے اور اے عظیم خاقان! تیرے خادم نے تیرے حکم پر عمل کیا اور تھمرو کے اندر بھڑکتے ہوئے جہنم کو سرد کیا۔ تیرا خادم اس کی خوابگاہ میں تقریباً" نصف شب تک رہا۔" یہ کہہ کر میں نے سر جھکا لیا۔

"تو پھر وہ کہاں غائب ہو گئی؟ اسے زمین نگل گئی یا آسمان؟" منگو خاں طیش کے عالم میں بولا۔

"غائب ہو گئی؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ یہ خبر میرے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔

"ہاں وہ بند دروازے سے غائب ہو گئی۔" منگو خاں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تو نیلے جاودانی آسمان سے باتیں کرتا ہے تو مستقبل میں جھانک سکتا ہے اور آنے والے زمانوں کی خبر دے سکتا ہے اور تو سچی پیش گوئیاں کر سکتا ہے تو پھر کیا یہ نہیں بتا سکتا کہ ایسا کس طرح ہوا؟ وہ کہاں غائب ہو گئی؟ کیا اس کے پاس کوئی اسرار قوت تھی؟"

میری دانست میں منگو خاں بڑی عجیب باتیں کر رہا تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے ہی محل میں خفیہ راستوں کی موجودگی سے وہ بے خبر رہا ہو؟ یا وہ مجھے آزما رہا تھا؟ میرے ذہن میں پے در پے کئی سوال پیدا ہوئے لیکن میں سب سے پہلے پورا واقعہ جاننا چاہتا تھا۔ بظاہر پوری بات جانے میرا کچھ کہنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے منگو خاں کو مخاطب کیا۔ "اے عظیم خاقان! کیا تو اپنے خادم کو یہ بھی نہیں بتائے گا کہ اصل واقعہ کیا پیش آیا ہے! یقین رکھ کہ تیرا خادم معاملے کی تہ تک پہنچنے میں دیر نہیں کرے گا۔"

منگو خاں چند لمحے مجھے گھورتا رہا' پھر بولا۔ "صبح جب ایک خادم' تھمرو کے لیے گھوڑی کا دودھ لے کر گیا تو متواتر دستکیں دینے کے باوجود دروازہ نہیں کھولا گیا۔ اس نے کافی دیر بعد مجبور ہو کر محل کے نگراں زقورا کو اس کی اطلاع دی۔ اس کے بعد زقورا ہی کے ایما پر دروازہ توڑا گیا۔ جب دروازہ توڑا گیا تو وہاں محافظوں اور خادموں کی کافی تعداد موجود تھی۔ تھمرو کی خوابگاہ کے دریچے بھی اندر سے بند ملے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ خوابگاہ میں تھمرو نہیں تھی اور اس بات کے گواہ بہت سے لوگ ہیں" یہ بتا کر منگو خاں چپ ہو گیا۔

منگو خاں کے بیان سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یا تو اسے محل میں موجود خفیہ راستوں کا علم نہیں تھا یا اسے یہ خبر نہیں تھی کہ تھمرو کو بھی کسی ایسے ہی کمرے میں رکھا گیا تھا جہاں خفیہ راستہ موجود تھا۔ ان دونوں باتوں ہی میں سے کوئی ایک بات ممکن تھی۔ مجھے اس بات کا بھی پورا یقین تھا کہ محل کے نگراں زقورا کو اس خفیہ راستے کا علم تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو گزشتہ شب وہ تھمرو کی خوابگاہ سے کسی شخص کو فرار کرانے کے لیے مجھے دھوکا نہ دیتا۔

"تو کچھ بولے گا بھی یا چپ ہی رہے گا؟" معاً" منگو خاں کی آواز سنائی دی۔

منگو خاں کی آواز سے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں جلدی سے بولا "اے عظیم خاقان! مجھے یہ بتا' کیا تیرے علم میں ہے کہ اس محل کے کچھ کمروں میں خفیہ راستے بھی ہیں؟"

میرا سوال سن کر وہ چونک پڑا پھر چند لمحے بعد کہا "میرے ذہن میں بھی پہلا خیال یہی آیا تھا' کیونکہ حقیقتاً" ایسا ہے لیکن اگر اس کمرے میں بھی کوئی خفیہ راستہ موجود ہوتا تو پھر زقورا دروازہ کیوں تڑواتا! پھر یہ کہ قورا' تھمرو کو کسی ایسے کمرے میں رکھتا ہی کیوں؟"

منگو خاں کی بات سن کر میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ

تھمرو کے فرار میں یقیناً" محل کے نگراں زقورا کا ہاتھ ہے۔ اس کے باوجود بھی میں نے منگوخاں سے اس بات کی تصدیق چاہی۔" کیا محل میں موجود خفیہ راستوں سے زقورا واقف ہے اے عظیم خاقان؟"

"ہاں وہ واقف ہے اور نہ صرف وہ بلکہ اس کے علاوہ پانچ اور دیرینہ خادم بھی ان راستوں سے باخبر ہیں مگر تو یہ ساری باتیں کیوں پوچھ رہا ہے؟" منگوخاں بولا۔

منگوخاں کا جواب سن کر میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "اے الاؤ کی رکھوالی کے بگھاتر بیٹے! تیرے خادم نے پتا لگا لیا ہے کہ تھمرو کے فرار میں کس کا ہاتھ ہے! تو زقورا کو گرفتار کیے جانے کا حکم دے دے!"

"کیا کہہ رہا ہے بوغا! سوچ سمجھ کر بات کر! زقورا میرا دیرینہ خادم ہے اور مجھے اس پر پورا اعتبار ہے۔ ثبوت پیش کر کہ اس سازش میں زقورا کا ہاتھ ہے۔" منگوخاں تیز لہجے میں بولا۔

"زقورا کے خلاف سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ اس نے تھمرو کی خوابگاہ کا دروازہ تڑوایا۔"

"وہ کیسے؟" منگوخاں نے میرے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی سوال کیا۔

"وہ یوں اے عظیم خاقان کہ تھمرو کی خوابگاہ میں خفیہ راستہ موجود ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور اگر نہ ہوا؟" منگوخاں کے لہجے میں اب بھی بے یقینی تھی۔

"تیرا خادم خود اپنی آنکھوں سے اس خفیہ راستے کو دیکھ چکا ہے اے عظیم خاقان! ظاہر ہے کہ وہ خفیہ راستہ اب بھی وہاں موجود ہوگا۔"

میرا جواب سن کر منگوخاں اس قدر جوش میں آیا کہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "میں خود اپنی آنکھوں سے وہ خفیہ راستہ دیکھ کر تیری بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ آ میرے ساتھ چل!" یہ کہہ کر منگوخاں دروازے کی طرف بڑھا۔

میں منگوخاں کے پیچھے پیچھے ہی مودبانہ انداز میں کمرہ نشست سے نکلا۔

"زقورا کو بلا کر لا!" منگوخاں باہر پہنچتے ہی ایک کلہاڑے بردار پر گرجا۔ "اس سے کہہ کہ وہ تھمرو کی خوابگاہ میں پہنچے!"

کلہاڑے بردار تیزی سے ایک جانب دوڑ گیا۔

منگوخاں کو باہر آکر شاید اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اسے خود علم نہیں تھا کہ تھمرو کو محل کے کس کمرے میں رکھا گیا تھا! منگوخاں کے کمرہ نشست سے نکلتے ہی سناٹا سا چھا گیا تھا۔ یوں بھی اس کے چہرے سے انتہائی غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ کلہاڑے بردار سر جھکائے مودب کھڑے تھے۔ منگوخاں ان کی طرف مڑ کر بولا۔ "کیا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ تھمرو کو کہاں رکھا گیا تھا؟"

ایک کلہاڑے بردار نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ہاں اے عظیم خاقان!"

"تو پھر ساتھ چل!" منگوخاں نے حکم دیا۔

کلہاڑے بردار، منگوخاں اور میں ایک سمت روانہ ہو گئے وہاں موجود بقیہ دو کلہاڑے بردار بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔

تھمرو کی خوابگاہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے خوابگاہ کا ٹوٹا ہوا دروازہ راہداری میں پڑا دیکھا جسے ابھی وہاں سے نہیں اٹھوایا گیا تھا۔

منگوخاں نے اس ٹوٹے ہوئے دروازے پر قدم رکھا، پھر رک کر کچھ سوچتا رہا اور راہداری کی دونوں سمتوں میں باری باری دیکھا۔ اس کے بعد منگوخاں نے انگلی اٹھا کر غالباً" تھمرو کی خوابگاہ کے علاوہ اس رو میں بنے ہوئے دوسرے کمروں کو گنا، پھر معاً" میری جانب پلٹ کر بولا۔ "تو سچ کہتا تھا مگر مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ تھمرو کو یہاں رکھا گیا تھا۔ یہ وہی مخصوص کمرہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ راہداری کا۔" منگوخاں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ غالباً" اس کی زبان پر کوئی ایسی راز کی بات آنے والی تھی جو سوائے چند مخصوص لوگوں کے کسی کو پتا نہیں لگنی چاہیے تھی۔ وہ قدرے توقف سے بولا۔ "پھر بھی تصدیق کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔" یہ کہہ کر وہ خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

میں اور کلہاڑے بردار محافظ احتراماً" باہر ہی رہ گئے مگر اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی اندر چلا گیا۔ منگو خاں نے ادھر ادھر نگاہ گھما کر خوابگاہ کا جائزہ لیا' پھر اس کی نگاہ مسہری پر جم گئی اور اس نے کلہاڑے برداروں کو آواز دی۔

"اسے یہاں سے ہٹاؤ!" کلہاڑے بردار اندر آگئے تو منگو خاں نے مسہری کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا۔

"وہ خفیہ۔"

"خاموش رہ!" منگو خاں نے میری بات کاٹ کر مجھے ڈانٹ دیا۔

میں سمجھ گیا کہ منگو خاں' کلہاڑے برداروں کی موجودگی میں خفیہ راستے سے متعلق کوئی بات سننا یا کہنا نہیں چاہتا لیکن مسہری ہٹتے ہی خلا نظر آنے لگا تھا' کیونکہ وہاں سے قالین ہٹا ہوا تھا اس خلا کو وہاں دیکھ کر کلہاڑے برداروں کے چہرے سے حیرت کا اظہار ہوا تھا مگر وہ کچھ بولے نہیں تھے۔ ظاہر تھا کہ وہاں منگو خاں موجود تھا اور وہ اس کے سامنے بولنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

"اسے پھر وہیں بچھا دو۔" منگو خاں نے مسہری کی طرف انگلی اٹھا کر پھر حکم دیا۔

ابھی مسہری کو کلہاڑے برداروں نے ہاتھوں ہی پر اٹھایا ہوا تھا منگو خاں کا حکم سن کر وہ مسہری اٹھائے ہوئے آگے بڑھے اور اسے دوبارہ وہیں رکھ دیا جہاں پہلے رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس کام سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ معاً" قدموں کی چاپ گونجی۔ میں اور منگو خاں ایک ساتھ ہی مڑے میری نگاہ محل کے نگراں زقورا پر پڑی جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا' شاید افشائے راز اور خوف کے سبب!

"تو آگیا نمک حرام۔" منگو خاں کسی شیر کی طرح گرجا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے منگو خاں کو نیام سے تلوار نکالتے دیکھا۔ وہ اس قدر شدید غصے میں تھا کہ اسے روکنے کی ہمت کم از کم مجھ میں نہیں تھی۔ زقورا کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کانپے مگر شاید شدید خوفزدہ ہونے کی وجہ سے اس کی آواز نہیں نکل سکی۔ منگو خاں اپنی تلوار بلند کیے اس پر جھپٹا اور پھر اس نے تلوار کی ایک بھرپور ضرب ہی میں زقورا کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔ زقورا کا سر کٹ کر میرے قدموں پر گرا اور اچھلنے لگا' خون کی پھوار سے میرے کپڑے خراب ہو گئے اور میں دور ہٹ گیا۔ لمحے بھر کو زقورا کا جسم اپنی جگہ لہرایا۔ پھر زمین پر گر پڑا۔ اس کی کٹی ہوئی گردن سے خون کا فوارہ سا بلند ہو رہا تھا' میں وہ منظر' بھیانک اور ہولناک منظر دیکھ کر کانپ اٹھا۔

منگو خاں نے زقورا کو صفائی کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ میرے خیال میں زقورا کو اس طرح فوراً" قتل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کا سبب یہ کہ زقورا ہی تھمرو کے فرار کی سازش کو بے نقاب کر سکتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اسے بہت کچھ معلوم ہونا چاہیے تھا۔ میری نظر میں زقورا براہ راست جرم میں ملوث نہیں تھا بلکہ سے کسی نے اپنا آلہ کار بنایا تھا۔ زقورا کی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی مگر اب سوال یہ تھا کہ تھمرو کس کے ساتھ فرار ہوئی تھی! وہ شخص ابھی تک پردہ راز میں تھا جو خفیہ راستے کے ذریعے تھمرو کی خوابگاہ میں پہنچا تھا۔ میرا قیاس یہی تھا کہ تھمرو اسی کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ ممکن تھا کہ تھمرو فوری طور پر کوئی ایسا قدم نہ اٹھاتی مگر گزشتہ شب میں نے اسے جو دھمکی دی تھی' شاید یہ اسی کا اثر تھا۔ اسے خوف رہا ہو گا کہ کہیں میں واقعی اپنی دھمکی کو حقیقت کا روپ نہ دے دوں! اسی لیے اس نے شاید فوری طور پر فرار ہونا ضروری سمجھا تھا۔

میرے ذہن میں مختلف خیالات چکرا رہے تھے کہ معاً" میری سماعت سے منگو خاں کی آواز ٹکرائی اور چونک پڑا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا تھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

دروازے سے نکلتے ہی منگو خاں' کلہاڑے برداروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اس نمک حرام کی لاش کو صحرا میں پھینکوا دیا جائے تاکہ بھوکے گدھ ضیافت اڑائیں اور اس کمرے پر دروازہ چڑھوا کر اسے بند کر دیا جائے'

اور پھر اسے کوئی نہ کھولے!" یہ کہہ کر منگو خاں آگے بڑھ گیا اور میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

دو کلہاڑے بردار، منگو خاں کے حکم کی تعمیل کرانے کے لیے وہیں رک گئے اور ان میں سے ایک ہمارے پیچھے چلنے لگا۔

وہ مجھے لے کر پھر کمرہ نشست میں آ گیا، پھر اپنی مسند پر بیٹھتے ہی اسے کچھ خیال آیا اور اس نے کلہاڑے بردار کو طلب کر لیا۔

کلہاڑے بردار مودب انداز میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تو وہ بولا۔

"محل کے تمام خادموں، محافظوں، پہریداروں اور دوسرے رہنے والوں کو میرا یہ حکم سنا دیا جائے کہ کسی کی زبان پر اب تھمرو کا نام نہ آئے۔ اگر ایسا ہوا تو ان کی زبانیں کاٹ لی جائیں گی۔"

کلہاڑے بردار اس کا حکم سن کر احتراماً جھکا پھر الٹے قدموں کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی منگو خاں نے میری جانب دیکھا اور کہا۔

"بوغا! اپنے علم کے زور سے یہ بتا کہ اس نمک حرام زقورا نے تھمرو کو کس کے ساتھ اور کہاں فرار کرایا ہے؟ وہ فاحشہ اتنی ہمت بہرحال نہیں کر سکتی تھی کہ تنہا فرار ہو جاتی۔ ویسے میرے تیز رفتار گھڑ سوار میرا حکم لے کر روانہ ہو چکے ہیں۔ اس فاحشہ کو جہاں اور جس حال میں دیکھا جائے گا، قتل کر دیا جائے گا۔ بہرحال وہ بچ نہیں سکے گی لیکن میں یہ جاننا ضرور چاہتا ہوں کہ اس سازش میں زقورا کا ساتھ کس کس نے دیا ہے تاکہ ان کے سر بھی قلم کر دیے جائیں۔"

منگو خاں کی بات سن کر میں بوکھلا اٹھا۔ وہ اگر زقورا کے قتل میں جلدی نہ کرتا تو سارے سوالوں کے جواب خود بخود مل جاتے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا! اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اصل مجرم زقورا ہی کو سمجھ رہا تھا جبکہ ایسا نہیں تھا۔ میں نے قدرے توقف سے ذرا سنبھل کر اسے مخاطب کیا۔ "اے عظیم خاقان! اگر تو زقورا کو فوراً قتل نہ کر دیتا تو اس سازش کے بارے میں اس سے سب کچھ معلوم ہو جاتا اور ب کہ۔"

"کیا تیرا علم کو زنگ لگ گیا ہے، جو تو ایسی باتیں کہہ رہا ہے؟" وہ میری بات کاٹ کر سخت لہجے میں بولا اور مجھے گھورنے لگا۔

"جہاں تک میرا علم رہنمائی کرتا ہے، اصل مجرم زقورا نہیں تھا بلکہ اسے کسی نے اپنا آلہ کار بنایا تھا یا وہ آلہ کار بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔" میں نے ہمت کر کے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"اگر تیرا علم سچا ہے اور تو سچ کہتا ہے، تو پھر بتا کہ اصل مجرم کون ہے؟" منگو خاں نے پوچھا۔

"وہ کوئی ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے جسے تھمرو کی خوابگاہ میں موجود خفیہ راستے کا علم تھا۔" میں نے پر یقین لہجے میں کہا۔

"میں تجھے بتا چکا ہوں کہ زقورا کے علاوہ محل کے صرف پانچ دیرینہ خادموں کو خفیہ راستوں کا علم ہے جن پر مجھے بھروسہ ہے مگر۔" منگو خاں کچھ کہتے کہتے رک گیا، پھر قدرے توقف سے کہا۔ "مگر جب زقورا نمک حرامی کر سکتا ہے تو پھر کسی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے! تیری بات سے پتا چلتا ہے کہ انہی پانچوں میں سے کوئی اصل مجرم ہے۔ میں ان سب کو ابھی بلواتا ہوں۔ اس طرح یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان میں سے کون غائب ہے! جو غائب ہو گا، وہی اصل مجرم ہو گا۔"

منگو خاں خود بخود ایک نتیجہ اخذ کر رہا تھا لیکن میرا ذہن نہ جانے کیوں اس کے اخذ کردہ نتیجے سے متفق نہیں ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی منگو خاں کے حکم پر پانچ بوڑھوں کو اس کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا۔ ان میں سے کوئی غائب نہیں ہوا تھا اور یہ بات میرے لیے تشویش طلب تھی۔ انہیں دیکھ کر منگو خاں میری جانب مڑا اور اس کے دیکھنے کا انداز جواب طلب تھا۔

"یہ بھی ممکن ہے اے عظیم خاقان کہ ان سب میں سے کسی نے یا زقورا نے محل کے خفیہ راستوں سے کسی کو آگاہ کر دیا ہو!" میں جلدی سے بولا۔

"نمک حرام زقورا تو اب زندہ نہیں لیکن میں ان پانچوں کی کھال ضرور کھنچوادوں گا اور انہیں بتانا پڑے گا کہ انہوں نے کسے اپنے راز میں شریک کیا!" منگوخاں کے لہجے میں بڑی سفاکی تھی۔

وہ پانچوں میری بات سن کر اندازہ لگا چکے تھے کہ ان پر کی الزام لگایا گیا ہے اسی لیے وہ منگوخاں کے سامنے تقریباً" سجدہ ریز ہو گئے' پھر ان میں سے ایک بوڑھا گڑگڑایا۔ "اے الاؤ کی رکھوالی کے عظیم فرزند! یقین کر کہ ہم نے تیرے ساتھ بے وفائی نہیں کی مجھے خود پر اور اپنے ساتھیوں پر پورا اعتبار ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ ان کی زبانوں پر راز کی باتیں نہیں آسکتیں۔"

وہ بوڑھا خاموش ہوا تو دوسرے بوڑھے نے بھی تقریباً" وہی الفاظ ادا کیے۔

"میں تمہارے سفید بالوں میں خون کی سرخی دیکھ رہا ہوں۔ محل کے خفیہ راستوں کا علم تمہارے سوا کسی کو نہیں تھا۔ یا تو تمہی میں سے کوئی اصل مجرم ہو سکتا تھا یا تمہاری ہی مدد سے مجرم' تھمرو کو یہاں سے فرار کرا سکتا تھا۔ بوغا کی بات میری سمجھ میں آچکی ہے۔ اس کا علم جھوٹا نہیں ہو سکتا۔"

منگوخاں کے الفاظ ابھی ختم ہی ہوئے تھے کہ ایک کلہاڑے بردار اندر آیا۔ منگوخاں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا تو وہ بولا۔ "اے عظیم خاقان! عظیم لامہ نامو تجھ سے ملنے آیا ہے۔"

"اسے اندر آنے دے!" منگوخاں نے کہا۔ "اچھا ہے کہ اس موقع پر وہ بھی آگیا۔ اب وہ بہت جلد لیا سارا معاملہ ختم کر دے گا اور اپنی پراسرار قوتوں کو کام میں لا کر سب کچھ صحیح صحیح بتا دے گا۔"

لامہ نامو کی اس بے وقت آمد کے بارے میں جان کر میں فکر مند ہو گیا۔ میرے لیے اس کا وجود بہر حال خطرناک تھا کیونکہ وہ میرے باطن سے آگاہ تھا۔ جب تک لامہ نامو کمرے میں داخل نہ ہو گیا' خاموشی ہی رہی۔

لامہ نامو نے منگوخان کو تعظیم دی' پھر بولا۔ "اے عظیم خاقان! کیا تو میرے ساتھ چل کر برف کی آندھی آنے کا منظر نہیں دیکھے گا؟"

منگوخاں اس کی بات سن کر چونک پڑا۔ وہ تھمرو کے معاملے میں اس قدر الجھ کر رہ گیا تھا کہ شاید لامہ نامو کی پیش گوئی اس کے ذہن ہی سے نکل گئی تھی۔ وہ چند لمحے چپ رہا' پھر اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں اور اس نے کہا۔ "مگر تو نے تو مجھ سے کہ تھا کہ اس آندھی کو آنے سے روک دے گا؟"

"اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا اے عظیم خاقان کہ آندھی تو ضرور آئے گی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس سے تباہی نہ پھیلے اور اسے روک دیا جائے۔" لامہ نامو نے جواب دیا۔

"تو پھر جا اور اسے روک دے! تو پھر یہاں میرے پاس کیوں آیا ہے؟" منگوخاں نے کہا۔

"میں چاہتا تھا کہ تو خود بھی اپنے آنکھوں سے آندھی کو رخ بدلتے دیکھ لے اے عظیم خاقان! لیکن اگر تو وہ حیرت انگیز منظر نہیں دیکھنا چاہتا تو نہ دیکھ! میں اصرار نہیں کروں گا۔" لامہ نامو بولا۔

لامہ نامو کی بات بڑی عجیب و دلچسپ تھی۔ خود میرے دل میں بھی یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں آندھی کو رخ بدلتے دیکھوں۔ لامہ نامو کی بات سن کر منگوخاں کے چہرے پر الجھن نظر آنے لگی تھی اور میں اس الجھن کا سبب اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ پہلے تھمرو کا معاملہ نمٹانا چاہتا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ منگوخاں کچھ کہتا' لامہ نامو دوبارہ بول اٹھا۔

"تو جس معاملے میں الجھا ہوا ہے اے عظیم خاقان' اس معاملے کو بعد میں بہت آسانی کے ساتھ سلجھایا جا سکتا ہے لیکن اس وقت برف کی آندھی کا رخ بدلنا بہت ضروری ہے ورنہ بڑی تباہی پھیلے گی۔"

یہی وہ لامہ نامو تھا جو تبت کا پہلا دلائی لامہ کہلایا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے نامو!" معاً" منگوخاں اپنی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو بھی ہمارے ساتھ چل بوغا!" لامہ نامو نے مجھے مخاطب کیا۔

ان پانچوں بوڑھوں کو کلہاڑے برداروں کی تحویل میں دے دیا گیا۔ پھر منگو خاں' میں اور لامہ نامو محل کے صدر دروازے کی طرف بڑھے۔ دو کلہاڑے بردار بھی منگو خاں کے پیچھے ہو لیے تھے جن کے ساتھ چلنے پر منگو خاں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

محل سے نکل کر منگو خاں گھوڑے پر سوار ہوا۔ لامہ نامو اور مجھے بھی گھوڑے فراہم کر دیے گئے۔ ہمارے علاوہ دو کلہاڑے بردار بھی گھوڑوں پر بیٹھ چکے تھے۔ لامہ نامو نے بتایا تھا کہ وہ حیرت انگیز مناظر دیکھنے کے لیے ہمیں بستی سے باہر جانا پڑے گا۔

ہمارے گھوڑے یورتوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ میں نے اس دوران میں کسی جانور کو بغیر بندھا ہوا نہیں پایا۔ غالباً" گزشتہ شب ہی منگو خاں حکم دے چکا تھا کہ بستی والے اپنے جانوروں کو باندھ کر رکھیں۔ ہوا میں ابھی سے تیزی محسوس ہونے لگے تھی۔

بستی سے نکل کر جب ہم ایک کھلے میدان میں پہنچے اور اپنے اپنے گھوڑوں سے اترے تو ہوا مزید تیز ہو چکی تھی۔ اگر اس میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا تو ہمارا وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو جاتا۔

"اپنے اپنے گھوڑوں کی لگامیں سختی سے تھام لو!" لامہ نامو نے باآواز بلند کہا۔

چند لمحے بعد ہی ہوا میں تیزی آ گئی اور پھر اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں بمشکل اپنی جگہ قدم جمائے کھڑا ہوا تھا اور سختی سے اپنے گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی۔ اس وقت میری نگاہ لامہ نامو پر پڑی اور میں حیران رہ گیا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی لگامیں ایک کلہاڑے بردار کو تھما دی اور اس تیز ہوا میں ہم سے آگے بڑھنے لگا تھا جس میں ہمارے لیے چلنا تو درکنار' کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں حیرت سے لامہ نامو کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں ذرا سی بھی لغزش نہیں تھی۔ ہاں اس کا پیلا لبادہ تیز ہوا سے ضرور اڑ رہا تھا۔

پھر بس اچانک ہی ساری فضا سفید ہو گئی تھی۔ تیز ہوا میں برف کے ذرات گردش کرتے ہوئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ شدید ٹھنڈک کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ سفید سفید برف کی ایک بہت بڑی دیوار تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اگر لامہ نامو کی پر اسرار قوتیں اس آندھی کو نہ روک پائیں تو میرا کیا حشر ہو گا؟ ہاں میں نے صرف اپنے بارے میں سوچا تھا۔ مجھے کلہاڑے برداروں منگو خاں اور لامہ نامو سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

معاً" میں نے لامہ نامو کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوتے دیکھے۔ اس کی پشت میری طرف تھی ورنہ شاید میں اسے کوئی منتر پڑھتے ہوئے بھی دیکھ سکتا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی منتر ضرور پڑھ رہا ہو گا۔ برف کی آندھی کا رخ یوں نہیں موڑا جا سکتا تھا۔

چند ہی لمحے بعد وہ برف کی دیوار لامہ نامو کے جسم کو چھونے لگی اور اسی کے ساتھ ہوا کا شور اتنا بڑھ گیا جیسے کان کے پردے پھاڑ ڈالے گا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ برف کی دیوار لامہ نامو کے جسم کو پیس کر رکھ دے گی یا اسے اپنے ساتھ اڑا لے جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ برف کی دیوار رک گئی' اور پھر وہ منظر میرے لیے بہت ہی حیرتناک تھا جب میں نے واضح طور آندھی کو رخ بدلتے ہوئے دیکھا۔ سفید دیوار تیزی کے ساتھ دائیں جانب مڑ رہی تھی اور لامہ نامو کے دونوں ہاتھ ابھی تک فضا میں بلند تھے۔

کچھ دیر بعد ہی سفیدی آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی اور اسی کے ساتھ اندھیرا بھی چھٹنے لگا' پھر رفتہ رفتہ فضا پر سکون ہو گئی۔ لامہ نامو کے دونوں ہاتھ اب نیچے ہو چکے تھے اور وہ پلٹ کر ہماری طرف آ رہا تھا' اس کا سرخ چہرہ' برف کی طرح سفید دکھائی دے رہا تھا۔

"اے عظیم خاقان! تو نے اپنی زندگی میں اتنا حیرت انگیز منظر دیکھا تھا؟" لامہ نامو' منگو خاں کے قریب پہنچ کر بولا۔ اب لحہ بہ لحہ اس کے چہرے پر سرخی آتی جا رہی تھی۔

"نہیں اے نامو! تجھے نیلے جاودانی آسمان نے بڑی قوتیں دی ہیں کہ تو آندھیوں کا رخ بدل سکتا ہے مگر یہ

تیرا چہرہ کیوں سفید ہو گیا تھا اور اب بھی کچھ سفیدی برقرار ہے؟" منگو خاں نے کہا۔

"یہ اس آندھی کا اثر ہے جو گزر گئی اے عظیم خاقان!" لامہ نامو نے جواب دیا۔

"تو کیا اب محل واپس چلیں؟" منگو خاں نے پوچھا۔

"ہاں ایک عظیم خاقان! اب خطرہ ٹل چکا ہے۔" لامہ نامو بولا۔ منگو خاں اپنے گھوڑے پر چڑھ گیا۔ میں نے اور بقیہ افراد نے بھی ایسا ہی کیا' پھر ہمارے گھوڑے بستی کی طرف دوڑنے لگے۔ لامہ نامو نے اپنی پراسرار قوتوں کو ثابت کر دیا تھا اور میں نے صاف طور پر محسوس کر لیا تھا کہ منگو خاں اس سے کافی متاثر نظر آ رہا تھا۔

محل میں پہنچتے ہی منگو خاں نے پھر ان پانچوں بوڑھوں کو طلب کر لیا' پھر وہ عقیدت مندانہ لہجے میں لامہ نامو سے مخاطب ہوا جو اس کی مسند کے بالکل سامنے ہی بیٹھا تھا۔ منگو خاں نے کہا۔ "اے نامو! اس محل میں کچھ خفیہ راستے ہیں جن سے خاندان زریں کے چند افراد واقف ہیں یا زندوں میں یہ پانچوں! ایک وہ تھا جو میرے ہاتھوں قتل ہو چکا۔ تو اپنے علم سے پتا لگ کہ ان میں سے کون مجرم ہے اور کس نے یہ راز کھولا!" یہ کہہ کر منگو خاں چپ ہو گیا اور ان پانچوں بوڑھوں کو گھورنے لگا جن کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔

منگو خاں کی بات سن کر لامہ نامو نے بھی ان بوڑھوں کی طرف دیکھا' پھر بولا۔ "ایک مٹی کا برتن منگوا لے عظیم خاقان! اس کے علاوہ کاغذ اور قلم بھی! برتن ایسا ہو کہ اس میں کوئی سوراخ بھی ہو۔"

جلد ہی لامہ نامو کی خواہش پوری کر دی گئی۔ لامہ نامو اپنی جگہ سے اٹھ کر ان بوڑھوں کے قریب گیا۔ کاغذ اور قلم دوات اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اس نے بوڑھوں سے ان کے نام پوچھ پوچھ کر کاغذ کے ان پانچ ٹکڑوں پر لکھے جنہیں اسنے پہلے ہی پھاڑ لیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ پھر اپنی جگہ آ بیٹھا اور ان کاغذ کے ٹکڑوں کی پڑیاں سی بنانے لگا جن پر بوڑھوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد لامہ نامو نے ایک پڑیا' برتن کے سوراخ میں پھنسا دی اور ہونٹوں میں کچھ بدبدانے لگا۔ میں حیرت اور دلچسپی سے اس کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی نگاہ مٹی کے برتن پر جمی ہوئی تھی۔ چند لمحے بعد ہی اس نے برتن کے سوراخ سے وہ پڑیا نکال کر الگ رکھ دی اور اس سوراخ میں دوسری پڑیا پھنسا دی۔

لامہ نامو بار بار اپنا عمل دہراتا رہا اور پھر تمام پڑیاں ختم ہو گئیں تو وہ ایک دم بولا۔ "اے عظیم خاقان! یہ پانچوں بالکل بے گناہ ہیں۔ ان کی زبانوں پر وہ راز نہیں آیا۔"

اسی لمحے جیسے میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ اگر وہ پانچوں بے گناہ تھے تو پھر محل کا نگراں زقورا ہی گنہگار تھا۔ اگر ان پانچوں بوڑھوں میں سے کسی نے خفیہ راستوں کے بارے میں زبان نہیں کھولی تھی تو یہ راز زبان پر لانے والا زقورا ہی ہو سکتا تھا۔ ذہن میں یہ خیال آتے ہی میں فوراً بول اٹھا۔ "اے عظیم نامو! جیسا کہ عظیم خاقان نے بتایا کہ اس کے ہاتھوں قتل ہونے والا بھی اس راز سے واقف تھا' تو کیا یہ ممکن نہیں کہ افشائے راز اسی نے کیا ہو؟"

"ہاں بوغا! یہ ممکن ہے۔" لامہ نامو نے جواب دیا۔ "مجھے اس کا نام بھی بتا' اگر تجھے معلوم ہو!"

"زقورا!" میں نے جلدی سے کہا۔

لامہ نامو نے قلم اور کاغذ سنبھال لیا' پھر نام لکھ کر اس کاغذ کو بھی پڑیا کی شکل دے دی' پھر وہی سارے عمل دہرانے لگا جو پہلے دہرا چکا تھا۔

چند لمحے بعد ہی اچانک زمین پر رکھا ہوا وہ مٹی کا برتن خود بخود آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا اپنی جگہ گھومنے لگا حالانکہ لامہ نامو کے ہاتھ اس برتن سے بہت دور تھے۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے برتن کو خود بخود گھومتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ لامہ نامو کی نگاہ برتن پر جمی ہوئی تھی۔

پھر جیسے ہی لامہ نامو کی نگاہ مٹی کے برتن سے ہٹی' برتن گھومنا بند ہو گیا۔ لامہ نامو اب منگو خاں کی طرف

متوجہ تھا جس کے چہرے پر شدید حیرت نظر آ رہی تھی۔

"اے عظیم خاقان!۔" لامہ نامو کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ "مجرم وہی تھا جو تیرے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے' اسی نے کسی کو خفیہ راستوں کے بارے میں بتایا تھا۔"

"مگر وہ شخص کون تھا جسے زقورا نے خفیہ راستوں کے بارے میں بتایا تھا؟۔" منگو خاں نے پوچھا۔

اس کا سوال سن کر لامہ نامو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں' اور ایک بار پھر وہ کچھ پڑھنے لگا مگر اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد لامہ نامو نے آنکھیں کھول دیں۔

"اے عظیم خاقان! اپنے محل میں موجود خادموں کا شمار کر! ان میں سے جو کم ہے' وہ وہی شخص ہے جس کا نام تو معلوم کرنا چاہتا ہے۔" لامہ نامو نے جواب دیا اور اس کے ساتھ رخصت کی اجازت چاہی۔

محل میں موجود خادموں کو شمار کرنا دیر طلب کام تھا۔ دل میں تجسس ہونے کے باوجود اب میں وہاں مزید رکنے پر آمادہ نہ تھا مگر منگو خاں نے لامہ نامو کو تو جانے کی اجازت دے دی اور مجھے نہ جانے دیا۔ مجبوراً مجھے اس کے پاس ہی رکنا پڑا۔

الیفوری منشیوں نے توقع سے پہلے اپنا کام نمٹا دیا اور وہ نام سامنے آ گیا جس کی تلاش تھی۔ وہ زقورا کا بیٹا سقیف تھا جو تلاش بسیار کے باوجود نہ محل میں ملا اور نہ بستی میں! حالانکہ اسے محل ہی میں ہونا چاہیے تھا۔

اب تمام معاملہ واضح ہو چکا تھا۔ زقورا نے کبھی سقیف کو محل کے خفیہ راستوں سے آگاہ کر دیا ہو گا اور پھر جب اسے پتا چلا ہو گا کہ اس کا بیٹا' تھمرو کی زلف کا اسیر ہو گیا تھا تو اس نے اپنے بیٹے کو بچانے کی خاطر سب کچھ کیا ہو گا۔ بیٹے کی محبت میں اس کا اس حد تک آگے بڑھ جانا سمجھ میں آنے والی بات تھی۔

سقیف کے مجرم ثابت ہونے پر پانچوں بوڑھوں کو رہا کر دیا گیا تھا لیکن پھر نہ جانے منگو خاں کے ذہن میں کیا بات آئی تھی کہ اس نے ان بدنصیب بوڑھوں کو فوری طور پر قتل کیے جانے کا حکم دیا تھا۔ جب وہ بوڑھوں کو قتل کرنے کا حکم دے رہا تھا' میں اس کے قریب موجود تھا۔

"خفیہ راستے اب ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔" منگو خاں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "کیا خبر کل اور کون غداری کر جائے!"

"تیرا کہنا درست ہے اے عظیم خاقان!" میں نے دل پر جبر کر کے اس کی تائید میں کہا حالانکہ میں اس کے فیصلے سے متفق نہیں تھا۔ ان بے گناہ بوڑھوں کو قتل کرا دینا' سراسر ظلم تھا جن کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی مگر میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لی کہ وہ بوڑھے بھی بہرحال منگول ہی تھے' منگول جن سے مجھے شدید نفرت تھی اور جن سے میں انتقام لے رہا تھا۔

منگو خاں کے محل سے لوٹتے ہوئے مجھے دوپہر ہو گئی تھی اور میں یہ سوچتے ہوئے سرقوشنی بیگی کے محل کی طرف جا رہا تھا کہ مغربی دشت کے لیے میری روانگی میں جو مسئلہ درپیش تھا' وہ خود بخود حل ہو گیا تھا۔ صبح سے میں نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا اس لیے میری بھوک چمک اٹھی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے ڈھیر سارا ابلا ہوا گوشت منگوایا اور گھوڑی کا دودھ بھی! ابھی میں کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک خادم کمرے میں داخل ہوا۔

"ایک بوڑھا تجھ سے ملنے آیا ہے جو اپنا نام ابونصار بتاتا ہے۔ تو کہے تو اسے میں یہاں تیرے پاس لے آؤں بونا؟" خادم نے کہا۔

"ہاں اسے فوراً لے آ!" میں خادم سے بولا۔

خادم چلا گیا اور میں ابونصار کی آمد کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ کیوں آیا ہے؟ مجھے یاد آیا کہ اس سے تو میں نے خود ملنے کے لیے کہا تھا تاکہ برقائی خاں اور سرقوشنی بیگی کے درمیان ہونے والی گفتگو کے نتیجے سے آگاہ ہو سکوں۔ ابونصار نے کہا تھا کہ مجھے خود سرقوشنی بیگی سے اس سلسلے میں معلوم ہو جائے گا اور

یہی ہوا بھی تھا' پھر ابونصار کیوں آیا تھا؟ میں اس وقت تک اسی الجھن میں مبتلا رہا جب تک ابونصار مجھ تک نہ پہنچ گیا۔ اس کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"مبارک ہو تجھے بوغا کہ سرقوشنی بیگی نے برقائی خاں کی بات مان لی۔" وہ بیٹھتے ہی بولا۔ "مگر تجھے تو کل ہی اس کے بارے میں پتا چل گیا ہو گا۔"

"ہاں اے ابونصار! تیرا خیال درست ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تجھے اس وقت یہ خوشخبری سنانے کے علاوہ ایک اور خوشخبری بھی سنانے آیا تھا۔ برقائی خاں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ کل صبح ہی یہاں سے مغربی دشت کے لیے روانہ ہو جائے گا۔ آج وہ رسمی طور پر خاقان منگو سے بھی رخصت کی اجازت لے لے گا۔" ابونصار نے بتایا۔

ابونصار کی زبان سے روانگی کے بارے میں سن کر میں واقعی خوش ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ سوچنے لگا کہ اگر تھمرو کا معاملہ خود بخود نہ نمٹ جاتا تو کیا ہوتا؟ جو ہوا تھا اچھا ہی ہوا تھا۔ تھمرو اپنے آپ ہی راستے سے ہٹ گئی تھی اور میری ذمے داری ختم ہو گئی تھی۔ میں نے بھی جواباً" ابونصار سے خوشی کا اظہار کیا۔ کچھ دیر بعد ابونصار مجھے دن بھر آرام کرنے کا مشورہ دے کر رخصت ہو گیا کیونکہ ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر درپیش تھا۔

وہ سارا دن میں نے آرام کرتے ہی گزارا اور شام ہوئی تو میں اٹھا۔ ہر چند کہ اب منگو خاں نے دربار میں میری روزانہ حاضری موقوف کر دی تھی اور میرے لیے ضروری نہیں تھا کہ اس کے دربار میں جاتا مگر وہ قراقرم میں میرا آخری دن تھا۔ یہ سوچ کر میں دربار میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں محل سے نکل کر وقت سے پہلے ہی دربار کے بڑے یورت میں پہنچ گیا تھا۔ اس وقت تک خاقان منگو نہیں آیا تھا لیکن قبلائی خاں اور ہلاکو خاں وہاں پہنچ چکے تھے اور برقائی خاں بھی موجود تھا۔

منگو خاں کچھ دیر بعد آ گیا اور دربار کی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے برقائی خاں اپنی جگہ سے اٹھ کر منگو خاں کے سامنے پہنچا اور اسے تعظیم دینے کے بعد بولا۔ "اے میرے بگھاتر بھائی اور اے الاؤ کی رکھوالی کے بیٹے! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل صبح قراقرم سے روانہ ہو جاؤں۔ تو مجھے جانے کی اجازت دے!"

"۔اے بگھاتر بھائی! ابھی تو میں نے تیری خاطر بھی نہیں کی' ابھی تو مجھے مسند پر بیٹھے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے اور ابھی تو میرے دل کے ارمان بھی نہیں نکلتے' ابھی سے جا کر کیا کرے گا! کچھ دن میرے پاس اور رہ کہ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔" منگو خاں نے جواب دیا مگر میں نے محسوس کر لیا کہ اس کی باتیں رسمی تھیں۔

"تو مجھے جانے ہی دے تو بہت اچھا ہے اے میرے بگھاتر بھائی! مجھے سائیں خاں نے جس علاقے میں رکھا ہے وہاں ابھی پوری طرح امن چین نہیں۔ میخائیل کا بیٹا مارکوف چھپ گیا ہے اور آہستہ آہستہ اپنی طاقت بڑھا رہا ہے لیکن مطمئن رہ کہ میں اسے تیرے تخت کی جانب سجدہ کرنے پر مجبور کر دوں گا۔"

پھر منگو خاں کے استفسار پر برقائی خاں نے شہر کیف کے رئیس اعظم میخائیل کی موت کا حال سنایا اور بتایا کہ جب شہر کیف پر قبضہ کیا گیا تو کس طرح مارکوف بچ نکلا تھا!

"اگر ایسا ہے تو میں تجھے نہیں روکتا۔" منگو خاں ساری بات سن کر بولا۔ "تو جا اور اس باغی کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج تاکہ میں یہ دیکھ سکوں کہ وہ کون خود سر تھا جسے منگولوں سے ٹکرانے کی جرات ہوئی!"

اس کے بعد برقائی خاں اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد دوبارہ منگو خاں کی آواز بلند ہوئی۔ "وہ کڑی اور بڑی سخت کمانیں پیش کی جائیں جو ہم یورپ کے درباروں اور مسلمانوں کے خلیفہ کی طرح بھیجنا چاہتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ چاندی کے تیر بھی جن کے سرے چھدے ہوئے ہیں۔"

منگو خاں کے حکم کی تعمیل میں یورت کے ایک در

سے بہت سے خادم دخل ہوئے۔ دو دو خادم ایک ایک کمان اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ سات کمانیں تھیں۔ کمان اٹھانے والے خادموں کے پیچھے کچھ خادم ترکشیں لیے چلے آرہے تھے جن میں چاندی کے تیر تھے۔ وہ سارے خادم تخت کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

"میں یہ کمانیں اور تیر اپنے پیغامبروں کے ذریعے ان کی طرف بھیج رہا ہوں۔ میں انہیں امن کا پیغام بھیج رہا ہوں کہ وہ مجھے تسلیم کرلیں۔ وہ امن سے انکار کریں گے تو انہیں یہ کمانیں دکھادی جائیں گے اور ان کی تنبیہہ کے لیے تیر ہوا میں چلادیے جائیں گے اور میرے پیغامبر ان سے کہیں گے کہ ہمارے پاس ایسی کڑی کمانیں اور سنسناتے ہوئے تیر ہیں۔" منگو خاں ایک عجیب سے جوش کے عالم میں بول رہا تھا۔

منگو خاں کے اشارے پر وہ تمام خادم پورے دربار میں پھیل گئے جو کمانیں اور ترکش اٹھائے ہوئے تھے تاکہ تمام اہل دربار انہیں اچھی طرح دیکھ لیں۔

میں نے بھی ان کمانوں اور چاندی کے تیروں کو دیکھا۔ تیروں کے سرے عجیب شکل کے اور چھدے ہوئے تھے۔ جب تمام اہل دربار انہیں دیکھ چکے تو منگو خاں کے اشارے پر خادم انہیں دربار کے یورت سے لے گئے۔

"کیا تم سب مجھ سے متفق ہو یا کوئی مشورہ دینا چاہتے ہو؟" منگو خاں کی آواز اچانک بلند ہوئی۔

میں نے ہلاکو خاں کو اٹھتے ہوئے دیکھا' پھر اس کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا "اے عظیم خاقان اور اے میرے بڑے بھاتر بھائی! تیرے کہے ہوئے لفظ ہمارے لیے حکم ہیں' قانون ہیں لیکن اگر تو ہم سے مشورہ ہی لینا چاہتا ہے تو ہم تیرے حکم سے کچھ کہنا چاہیں گے۔ کیا تو مجھے کچھ بولنے کی اجازت دے گا؟"

"اجازت ہے اے میرے بھاتر بھائی!" منگو خاں نے فوراً کہا۔ "میں تیرا مشورہ سنوں گا۔"

تمام اہل دربار ہلاکو خاں کی طرف متوجہ تھے۔ وہ منگو خاں کی اجازت ملتے ہی بولا۔ "اے عظیم خاقان اور اے جد عظیم کی مسند کے رکھوالے! تیرے پیغام میں بڑی نرمی ہے جو ہمیں زیب نہیں دیتی۔ ساری زمین پر صرف اور صرف ہمارا حق ہے' کسی اور کا نہیں! ہماری موجودگی میں کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ حکومت اور اقتدار کا دعوی کرے۔ وہ ہمارے محکوم بن کر ہی رہ سکتے ہیں۔ انہیں اسی صورت میں جینے کا اختیار دیا جاسکتا ہے کہ وہ واضح طور پر ہماری حاکمیت تسلیم کریں۔"

ہلاکو خاں اس وقت خلاف عادت نہایت سنجیدگی اور جوش کے عالم میں بول رہا تھا۔ "تو انہیں حکم دے کہ وہ اپنی تمام ہتھیار تلف کردیں اور اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو ان سے ہماری کھلی جنگ ہے۔" یہ کہہ کر ہلاکو خاں اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

کچھ دیر کے لیے دربار پر سناٹا چھا گیا۔ یہ ہلاکو خاں کی جارحانہ باتوں کا ردعمل تھا۔ ہلاکو خاں نے ایک طرح سے پوری منگول قوم کی نمائندگی کا فرض ادا کیا تھا۔ وہ ایسے ہی سفاک اور جارحیت پسند تھے۔

چند لمحوں کے بعد اس بوجھل سے سناٹے کو منگو خاں کی آواز نے توڑا۔ "جو کچھ میرے بھاتر بھائی نے کہا' میں اس سے متفق ہوں۔ بھیجے جانے والے پیغاموں میں ان باتوں کا اضافہ کردیا جائے گا۔"

ادھر منگو خاں کے الفاظ ختم ہوئے اور ادھر پورا یورت وحشیانہ نعروں سے گونج اٹھا یہ گویا خوشی کا اظہار تھا اور اس بات کا اظہار بھی کہ جو کچھ فیصلہ ہوا ہے' وہ سب اس سے پوری طرح متفق ہیں۔

س کے بعد دربار برخاست ہونے کا اعلان کردیا گیا۔ دربار میں جو فیصلہ ہوا تھا' وہ معمولی نہیں تھا۔ میں اسی کے بارے میں سوچتا ہوا سرقوشنی بیگی کے محل تک پہنچا۔ بھلا عیسائی اور مسلمان طاقتیں جو اس وقت ایک دوسرے سے برسرپیکار تھیں' منگو خاں کے حکم پر اپنے ہتھیار کس طرح تلف کرسکتی تھیں! میں خون کی بو محسوس کررہا تھا۔ یقیناً" مستقبل قریب میں ایک بڑی پیکار ہونے والی تھی۔

دوسرے دن میں صبح ہی صبح اٹھا۔ پہلے میں

سرقوشنی بیگی سے ملاور رخصت کی اجازت لی' پھر میں خاقان منگوخاں کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں قراقرم چھوڑنے سے پہلے رسمی طور پر اس سے بھی اجازت لے لینا چاہتا تھا۔

منگوخاں میری زبان سے مغربی دشت جانے کے بارے میں سن کر حیران ہوا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ برقائی خاں مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے اور یہی آسمانوں کا حکم بھی ہے تو وہ چپ ہو گیا۔ میں نے اس کے انداز گفتگو سے سمجھ لیا تھا کہ وہ میری روانگی کے حق میں نہیں تھا۔

میں' منگوخاں سے رخصت ہو کر سیدھا برقائی خاں کے یورتوں کی طرف گیا۔ اس وقت تک یورت خالی کیے جا چکے تھے اور تمام ساز و سامان گھوڑوں پر لادا جا چکا تھا۔ روانگی کی تمام تیاریاں مکمل تھیں اور اب صرف برقائی خاں کا انتظار کیا جا رہا تھا جو سرقوشنی بیگی اور خاقان منگوخاں سے ملنے گیا ہوا تھا۔ میں ابونصار کے قریب پہنچ کر اپنے گھوڑے سے اتر گیا۔

"تو آ گیا بوغا!" ابونصار نے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں اے ابونصار! میری خواہش پوری ہو گئی۔ اب میں تیرے ساتھ رہ کر علم و دانش کی باتیں سیکھ سکوں گا۔" میں نے بھی خوش دلی سے کہا۔

"میں کہاں اور عالم و دانش کی باتیں کہاں!" ابونصار انکساری سے بولا۔

میں اور ابونصار اس وقت تک باتیں کرتے رہے جب تک کہ برقائی خاں نہ لوٹ آیا۔ اس کے آتے ہی قافلے کو روانگی کا حکم ملا۔ وہ قافلہ تقریباً" بیس درجن افراد پر مشتمل تھا۔ ابونصار' برقائی کی سواری کے ساتھ ساتھ تھا اور میں ابونصار کے ساتھ! میں برقائی خاں سے پہلے بھی مل چکا تھا اس لیے اس نے مجھے پہچان لیا اور مسکرا کر آشنائی کا اظہار کیا۔ برقائی خاں کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ وہ کسی سے ایک بار بھی مل کر اسے یاد رکھتا تھا۔

دوپہر ڈھلتے ہی ایک یام میں پڑاؤ کیا گیا۔ یام کا داروغہ برقائی خاں کی خاطرداری کے لیے بچھ گیا۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھایا گیا۔ یام (سرائے) اب پہلے کی نسبت خاصی ترقی کر چکے تھے۔ اب یاموں میں ایسے افراد بھی رکھے جاتے تھے جو کسی شدید عجلت یا جلدی کے موقع پر دن میں دو سو میل کی مسافت طے کر سکتے ہوں' اور پھر رات کو بھی اتنی ہی مسافت طے کر سکیں۔ ہر قاصد ایک چوڑی پٹی پہنتا تھا جس میں گھنٹیاں لگی ہوتی تھیں۔ ان گھنٹیوں کے بجنے کی آواز بہت دور سے سنائی دینے لگتی تھی۔ یام پہنچ کر وہ قاصد' دوسرے قاصد کو بالکل اسی طرح تیار پاتا تھا۔ وہ اپنا پیغام اسے دے دیتا اور دوسرا قاصد پیغام لے کر آگے روانہ ہو جاتا۔ پیغام رسائی کے اس نئے نظام سے بڑی سہولت ہو گئی تھی۔ اس طرح صرف ایک ہی قاصد کو پیغام لے کر ہزاروں میل سفر نہیں کرنا پڑتا تھا لیکن جو پیغامات خصوصی نوعیت کے حامل ہوتے تھے اور براہ راست انہیں خاقان جاری کرتا تھا' وہ پیغامات اب بھی کسی ایک ہی معتبر قاصد کو منزل تک پہنچانے پڑتے تھے۔ خاقان کے ان خاص قاصدوں کو چھپر کہا جاتا تھا۔ یام اب مجھے پہلے سے زیادہ آرام دہ معلوم ہوئے۔

کام بالو (خاقانوں کا شہر یعنی قراقرم) اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ ہمیں وہاں سے چلے تقریباً" دو درجن دن ہو چکے تھے۔ میں نے اس دوران میں کئی بار ابونصار کو ایک موٹی سی کتاب پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہماری شبیں یاموں ہی میں گزرتی تھیں اور صبح ہوتے ہی روانگی عمل میں آتی تھی۔ ابونصار علی الصبح اٹھتا تھا اور وہ موٹی سی کتاب ایک لکڑی کی مخصوص چوکی پر رکھ کر با آواز بلند پڑھتا تھا۔ میں اسی کے قریب سوتا تھا اس لیے اکثر میری آنکھ' اس کی آواز سے کھل جاتی تھی اور میں دیر تک خاموش پڑا ہوا' ابونصار کی سریلی آواز سنتا رہتا تھا۔ مجھے اس کی آواز میں عجیب سی کشش اور سحر سا معلوم ہوتا تھا۔ ایک صبح جب وہ اپنی عبادت سے فارغ ہو کر اپنی کتاب پڑھ رہا تھا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابونصار نے میری طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔

"اے ابونصار! میں تیری زبان نہیں جانتا مگر اس کے باوجود مجھے اس میں بڑی کشش اور اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ تیری اس کتاب میں کیا لکھا ہے اور تو روز کیا پڑھتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس میں اللہ کے احکام درج ہیں۔" ابونصار نے جواب دیا۔

"اچھی میرے اٹھ کر بیٹھنے سے پہلے تو جو پڑھ رہا تھا' مجھے اس کا مطلب بتا!" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب تھا' اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔" ابونصار نے بتایا۔

کیا تو مجھے اپنی زبان سکھا دے گا اے ابونصار!" میں پر اشتیاق لہجے میں بولا۔

"اگر تجھے شوق ہے تو میں ضرور سکھاؤں گا۔" ابونصار نے یقین دلایا اور پھر اس دن کے بعد سے میں نے ابونصار سے باقاعدہ عربی پڑھنا شروع کر دی۔ ابونصار حیران تھا کہ میں اتنی جلدی اس کی زبان کس طرح سیکھ رہا ہوں! اسے کیا خبر تھی کہ میرے تو لہو ہی میں وہ زبان شامل تھی۔ میرا باپ ایک عرب ہی تو تھا۔

راستے ہی میں مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ہمیں کہاں پہنچنا ہے! ہماری منزل شہر کیف تھی۔

جب میں نے دربار میں پہلی مرتبہ برقائی خاں کی زباں سے شہر کیف کا نام سنا تھا تو اسی وقت میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا تھا لیکن اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ برقائی خاں کی منزل بھی وہی ہو گی۔ میرے انتقام کی راہ خود بخود استوار ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے جب میں مغربی دشت میں تھا تو میں نے سوچا تھا کہ منگولوں کے باغی میخائیل کے بیٹے مارکوف سے ملوں گا اور اس کے ساتھ مل کر منگولوں سے انتقام لوں گا مگر اس وقت مجھے یہ موقع نہیں مل سکا تھا۔ اب مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں رہی تھی کہ سولدہ نے یہ مشورہ کیوں دیا تھا کہ میں مغربی دشت روانہ ہو جاؤں!

روز و شب کی گردشوں نے آخر کر ہمارے قافلے کو شہر کیف تک پہنچا ہی دیا۔ میں نے پہلی بار وہ شہر دیکھا تھا۔ وہ خان بالیغ (قراقرم) سے قطعی مختلف تھا۔ وہاں ہر طرف کچی پکی عمارتیں ہی عمارتیں تھیں جن میں لوگ رہتے تھے اور انہی عمارتوں میں ایک بڑی پتھریلی عمارت دور ہی سے نظر آ رہی تھی۔ ابونصار نے مجھے اس عمارت کا نام قلعہ بتایا اور یہ بھی کہا کہ برقائی خاں اسی میں رہتا ہے اس لیے خود ابونصار کا قیام بھی وہیں ہے۔

"کیا یہ بڑی عمارت برقائی خاں نے اپنی رہائش کے لیے بنوائی ہے؟" میں نے ابونصار سے پوچھا۔

"نہیں! یہ قلعہ یہاں کے رئیس اعظم میخائیل نے بنوایا تھا۔" ابونصار نے جواب دیا۔

"وہی میخائیل جس کا ایک بیٹا مارکوف باغی ہو چکا ہے اور اس نے اب تک اطاعت قبول نہیں کی؟" میں نے مزید تصدیق کی غرض سے سوال کیا۔

ابونصار نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اے ابونصار! کیا تو نے کبھی اس باغی کو دیکھا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں!" ابونصار نے بتایا۔ "وہ ہوا کی طرح حملہ آور ہوتا ہے اور ہوا ہی کی طرح روپوش ہو جاتا ہے۔ اسے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے اور جنہوں نے دیکھا ہے' انہیں بھی پوری طرح یقین نہیں کہ وہ مارکوف ہی ہے۔"

"لیکن مقامی باشندے تو اس سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"مقامی باشندے یقیناً" اسے پہچانتے ہوں گے مگر اول تو اب ان کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے کیونکہ جب اس شہر پر قبضہ کیا گیا تھا' یہاں قتل عام ہوا تھا۔ جن لوگوں نے مزاحمت کی تھی' انہیں تو زندہ چھوڑنے کا سوال ہی نہیں تھا جبکہ اکثریت' مزاحمت کرنے والوں کی تھی۔ رہے بقیہ لوگ تو ان میں سے بھی بہت سے قتل عام کا شکار ہو گئے تھے۔" ابونصار مجھے تفصیل کے ساتھ بڑی کار آمد باتیں بتا رہا تھا جو آئندہ میرے کام آ سکتی تھیں۔ وہ بتا رہا تھا۔

"اس کے علاوہ یہ کہ بظاہر تو یہ مقامی باشندے اطاعت گزار ہیں لیکن درحقیقت وہ خوش نہیں ہیں۔

وہ اب بھی غالباً" دل ہی دل میں یہ دعائیں مانگتے ہیں کہ مارکوف کامیاب ہو جائے اس لیے وہ مارکوف کو پہچاننے کے باوجود اس کی نشاندہی کس طرح کر سکتے ہیں! بلکہ یہ بھی سنا گیا ہے کہ ان میں سے اکثر مارکوف کو خطرناک موقعوں پر پناہ بھی دے دیتے ہیں۔ اگر کبھی کسی مقامی باشندے پر یہ شک ہو جاتا ہے تو اس کے پورے خاندان کو تہ تیغ کر دیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود وہ باز نہیں آتے۔"

قلعہ اب قریب آ چکا تھا اس لیے ابونصار نے باقی باتوں کو پھر کسی وقت پر اٹھا رکھا اور میں نے بھی فی الحال اتنی باتیں جان لینے پر ہی اکتفا کیا۔

قلعے میں موجود منگول سرداروں نے قلعے سے نکل کر ہمارے قافلے کا پرجوش خیر مقدم کیا۔

جس وقت ہم قلعے میں داخل ہوئے، شام ہو رہی تھی۔ ایک طویل سفر کرنے کی وجہ سے سب ہی کافی تھکے ہوئے تھے اور میرا بھی یہی حال تھا۔

جس کمرے میں ابونصار کی رہائش تھی اسی کے قریب ایک دوسرا کمرہ مجھے رہائش کے لیے مل گیا۔ ابونصار اور میں نے ایک ساتھ ہی کھانا کھایا اور پھر میں اس سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔

دوسری صبح میں بیدار ہوتو نسبتاً" تازہ دم تھا۔ سفر کے دوران میں میرا معمول رہا تھا کہ ہر صبح ابونصار سے عربی پڑھتا تھا۔ وہ اپنی عبادت سے فارغ ہو کر مجھے پڑھایا کرتا تھا۔ یہ معمول میں نے وہاں بھی برقرار رکھنا مناسب جانا۔ اس وقت تک میں خاصی عربی سیکھ چکا تھا مگر ابھی بولنے اور لکھنے پر پوری طرح قادر نہیں ہوا تھا۔

مجھے پڑھانے کے بعد ابونصار، قلعے کی سیر کرانے لے گیا۔ قلعہ کافی بڑا اور مضبوط تھا۔ میں نے اسی دوران میں پھر مارکوف کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر لینا چاہتا تھا تاکہ ان سے آئندہ فائدہ اٹھا سکوں لیکن اسی کے ساتھ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ ابونصار کو مجھ پر شک نہ ہو۔ میں اسی لیے بہت محتاط انداز میں یہ ذکر چھیڑتا تھا۔ درمیان میں دانستہ میں دوسری غیر متعلق باتیں بھی کرنے لگتا تھا، اور پھر مارکوف کا ذکر نکال بیٹھتا تھا لیکن ابونصار میری توقع سے زیادہ ذہین تھا۔

"تمہیں مارکوف کے ذکر میں بڑی دلچسپی معلوم ہوتی ہے!" ابونصار نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اس وقت مارکوف کے بارے میں ایک خاص بات دریافت کی تھی۔

"ہاں!" میں نے فوراً" اعتراف کر لینا ہی مناسب سمجھا لیکن اس دلچسپی کا سبب میں نے کچھ اور ہی بتایا۔

"دراصل مجھے اس شخص کے بارے میں جان کر شدید حیرت ہے اے ابونصار! وجہ یہ کہ وہ منگولوں کی طاقت سے آگاہ ہونے کے باوجود بھی ایسی جرات کر رہا ہے۔ وہ یا تو جنونی اور پاگل شخص ہے یا انتہائی جری اور بہادر! مجھے یہ بھی حیرت ہے کہ وہ اب تک گرفتار کیوں نہیں ہو سکا!"

"اس کے گرفتار نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ منگولوں کے حربے انہی پر استعمال کرتا ہے۔" ابونصار نے بتایا۔ "وہ عموماً" منگولوں کو قتل کرنے کی بجائے قیدی بنا کے لے جاتا ہے تاکہ جب وہ دوبارہ کہیں حملہ کرے تو ان قیدیوں کو آگے آگے رکھے۔ تجھے معلوم ہی ہو گا کہ یہ منگولوں کا بڑا موثر حربہ رہا ہے۔ اس طرح حملے میں پہل کرنے کے سبب جو جانی نقصان ہوتا ہے وہ انہی قیدیوں کا ہوتا ہے۔ وہ قیدی ایک طرح سے ڈھال ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مارکوف کی کامیابی کا دوسرا سبب میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مقامی باشندے اس کی مدد کرتے ہیں۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ مقامی باشندے اس کے لیے جاسوسی کرتے ہوں!" میں بولا۔

"ہاں یہ ممکن ہے۔" ابونصار نے اتفاق کیا۔

میں اور ابونصار بہت دیر تک قلعے کی سیر کرتے رہے۔ میں نے اس دوران میں، قلعے کے اندر بہت سی غیر منگول حسین و جوان عورتیں بھی دیکھیں اور مجھے ابونصار سے ان عورتوں کے بارے میں جو کچھ معلوم

ہوا اسے سن کر دکھ ہوا۔ ان عورتوں میں اکثریت مقامی عورتوں ہی کی تھی۔ یہ وہ عورتیں تھیں جن کے باپ، بھائی، شوہر اور بچے قتل کر دیے گئے تھے اور انہیں صرف منگولوں کی عیاشی کے لیے زندہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان میں زیادہ تر اس وقت کنواری تھیں جب انہیں زبردستی قلعے میں اٹھا لایا گیا۔ جو شادی شدہ تھیں اور حسین بھی تھیں، ان کے شوہروں اور بچوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ صرف انہی عورتوں کو زندہ رہنے کا حق دیا گیا تھا جو غیر معمولی طور پر حسین تھیں بقیہ کو تہ تیغ کر دیا گیا تھا۔ ایک ایک منگول سردار کے پاس دو دو تین تین درجن خوب صورت عورتیں تھیں لیکن سرداروں کے سوا کسی کو عورت رکھنے کا حق نہیں تھا۔

میں جب لوٹ کر اپنے کمرے میں آیا تو مارکوف کے بارے میں بہت سی نئی باتیں جان چکا تھا اور ان کی روشنی میں مجھے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ مارکوف سے ملنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا میں پہلے سمجھ رہا تھا۔ اگر اس تک پہنچنا اتنا ہی آسان ہوتا تو اب تک منگول اسے گرفتار کر چکے ہوتے۔

کافی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد میرا ذہن صرف اور صرف ایک ہی راہ تلاش کر سکا۔ ہر چند کہ وہ راہ انتہائی خطرناک تھی مگر اس کے سوا کوئی اور دوسری راہ بھی نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مارکوف کو اپنے جاسوسوں کے ذریعے منگولوں کی نقل و حرکت کا پتا لگتا رہتا ہوگا اور میں اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے میں نے ابونصار سے وہ بات چھیڑ دی جس پر پہلے ہی کافی غور و خوض کر چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"اے ابونصار! کیا یہ ممکن ہے کہ مجھے مارکوف کی سرکوبی کا اہم کام سونپ دیا جائے؟"

وہ میری بات سن کر مسکرایا پھر بولا۔ "مجھے تیری باتیں سن کر پہلے ہی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ تو ایسی ہی کسی خواہش کا اظہار کرے گا مگر میں تجھے اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

"کیوں؟ اس میں کیا حرج ہے؟ کیا تو مجھے اس قابل نہیں سمجھتا؟" میں نے کہا۔

"مجھے تیری بہادری کا یقین ہے لیکن شاید تو یہ کام انجام نہ دے پائے۔ بڑے بڑے منگول سردار اس خواہش کی تکمیل میں اپنی جان گنوا چکے ہیں اور کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ تجھے میں نے ابھی یہ نہیں بتایا کہ جس منگول سردار کو یہ کام سونپا جاتا ہے، وہ بہت کم عرصے آزاد رہ پاتا ہے اور مارکوف کی قید میں چلا جاتا ہے۔ مارکوف کی پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ منگول سردار کو اپنا قیدی بنا کر لے جائے۔ ایسا کرنے سے اسے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ پہلا فائدہ تو یہ کہ اس طرح اس سردار کے ماتحت سپاہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور مقابلے پر زیادہ دیر نہیں ٹکتے، دوسرا فائدہ یہ کہ باقی منگول سردار اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ کر مارکوف سے ٹکرانے میں پہل نہیں کرتے اور نہ برقائی خاں سے یہ خواہش کرتے ہیں کہ نہیں مارکوف کی سرکوبی کا کام سونپ دیا جائے۔ اب سمجھا تو؟" ابونصار نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

ابونصار کی زبان سے وہ باتیں سن کر میں خوفزدہ ہونے کی بجائے خوش ہو گیا۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا، وہ میرے مقصد کے حصول میں معاون ثابت ہو سکتا تھا اس لیے میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں تیری بات اچھی طرح سمجھ گیا اے ابونصار! اور اس کے باوجود میں وہی خواہش رکھتا ہوں جس کا اظہار پہلے کر چکا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے کہ برقائی خاں فوراً میری بات مان لے گا لیکن میں پھر کہوں گا کہ تو اپنے ارادے سے باز آ جا بوغا!" ابونصار نے مجھے سمجھایا اور پھر بہت دیر تک سمجھاتا رہا۔

جب میں کسی طرح نہ مانا تو اس نے حامی بھر ہی لی کہ وہ اس سلسلے میں اسی دن برقائی خاں سے بات کرے گا۔

پھر اسی شام ابونصار نے مجھ سے کہا کہ برقائی خاں خود مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں ابونصار کے ہمراہ برقائی سے ملنے پہنچ گیا۔

"تیرے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی کہ تو اس

باغی سے ٹکر لے؟" برقائی خاں نے سوال کیا۔

"اے بگھاتر سائیں خاں کے بگھاتر بھائی! جب تو نے پہلی بار خاقان منگوخاں کے دربار میں مارکوف کا ذکر کیا تھا تو اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مغربی ثبت پہنچ کر منگولوں کے اس دشمن سے ضرور ٹکراؤں گا۔"

"کیا تو اس کے بارے میں سب کچھ جان چکا ہے؟" برقائی خاں نے دریافت کیا۔

"ہاں!" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "مجھے ابونصار نے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"پھر بھی تو اس سے ٹکر لینا چاہتا ہے؟"

"نہ صرف ٹکر لینا چاہتا ہوں بلکہ میں اس کا سر کاٹ کر خاقان منگوخاں کی خواہش پر قراقرم بھجوانا چاہتا ہوں۔" میں نے پرجوش لہجے میں جواب دیا۔

"تجھے اس کے لیے کتنے سپاہی چاہئیں؟" برقائی خاں نے پوچھا۔

میں نے سوچا کہ میرے ساتھ جتنے کم سے کم سپاہی ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ اس طرح میرا مقصد باسانی حل ہو سکتا تھا۔ زیادہ سپاہی ساتھ ہونے کی صورت میں مارکوف کے کام میں دشواری بھی ہو سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے کہا۔ "صرف دس دس سپاہیوں کے دس دستے کافی ہوں گے۔"

"صرف دس دستے؟" برقائی خاں حیرت سے بولا۔ "شاید تجھے نہیں معلوم کہ اس باغی کی سرکوبی کرنے کے لیے درجنوں دستے اب تک بھیجے جا چکے رہے ہیں۔"

"میں نے جان کر کم تعداد بتائی ہے۔" میں نے کہا۔ "مارکوف جو طریق جنگ اپنا رہا ہے' اس میں سپاہیوں کی زیادہ تعداد ہمیشہ اس کے لیے فائدے مند رہی ہے۔ کیونکہ زیادہ تعداد اب تک ناکام رہی ہے اس لیے میں دانستہ کم سپاہی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکوں۔"

میری دلیل میں وزن تھا اس لیے برقائی خاں نے میری بات تسلیم کر لی اور بولا۔ "ٹھیک ہے بوغا! کل صبح تو سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے کر قلعے سے نکل سکے گا۔ میں آج ہی اعلان کر دوں گا کہ اب مارکوف کی سرکوبی تیرے سپرد کر دی گئی ہے تاکہ وقت پڑنے پر تجھے فوری طور پر کمک پہنچائی جا سکے اور دوسرے منگول سردار تیرے ساتھ تعاون کریں۔"

وہ اعلان ہونا بھی میرے حق میں تھا۔ اس طرح مارکوف کو اپنے جاسوسوں کے ذریعے میرے بارے میں اطلاع مل سکتی تھی اور وہ چوکنا ہو کر مجھ پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد برقائی خاں نے مجھے رخصت کی اجازت دے دی۔ اس دن مجھے ابونصار نے کئی تجربے کار منگول سرداروں سے ملوایا جنہوں نے مجھے بتایا کہ شہر کیف کی اطراف پھیلی ہوئی پہاڑیاں' مارکوف کا مسکن ہیں۔ مارکوف اور اس کے ساتھی انہی پہاڑیوں میں کہیں رہتے ہیں اور اپنے ٹھکانے بھی بدلتے رہتے ہیں تاکہ اگر ان کے دشمن کبھی کسی ٹھکانے سے واقف بھی ہو جائیں تو وہ اپنا بچاؤ کر سکیں۔ ان پہاڑیوں کے درمیان کئی بار مارکوف' منگول سرداروں سے نبرد آزما ہو چکا تھا۔ کیونکہ وہ پہاڑی سلسلہ شہر کو تین جانب سے گھیرے ہوئے تھا اس لیے مارکوف کسی طرف سے بھی نمودار ہو کر شہر پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔ عموماً" وہ اسی وقت حملہ کرتا تھا جب منگول اردو کہیں سے آتا تھا یا کہیں روانہ ہوتا تھا۔ وہ شہری آبادی کو نہیں چھیڑتا تھا کیونکہ اس میں زیادہ تعداد مقامی باشندوں کی تھی۔

منگول سرداروں سے تمام تفصیلات جاننے کے بعد میں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے یہی فیصلہ کیا کہ خود اس پہاڑی سلسلے کا رخ کروں۔ مارکوف پہلے ہی سے میری آمد کا منتظر ہو گا اس لیے کام اور بھی آسان ہو گا۔

اس پہاڑی سلسلے میں کوئی دوسرا منگول سردار اتنے کم سپاہی ساتھ لے کر گھسنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا اس لیے جب میں نے منگول سرداروں کو اپنے

ارادے سے مطلع کیا تو وہ حیران رہ گئے' اور پھر میری بہادری کی تعریف کرنے لگے۔ جو کام' مقصد کے حصول کی وجہ سے میری نظر میں بہت آسان تھا' وہی ان کے لیے انتہائی مشکل تھا۔

دوسری صبح جب میں اپنے ہمراہ سپاہیوں کے دس دستے لے کر قلعے سے نکلا اور شہر میں داخل ہوا تو مقامی باشندے حیرت و خوف سے میری طرف دیکھنے لگے۔ شاید وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہے تھے کہ میں پہاڑی سلسلے سے واپس نہ ہو سکوں کیونکہ میرے گھوڑے کا رخ ادھر ہی تھا۔ وہ اس بات سے ناواقف تھے کہ پہاڑیوں کی طرف سپاہیوں کو لے کر جانے والا کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے!

شہر سے نکلتے ہی پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ میرے ہمراہ جو سپاہی تھے' وہ سب چونکا اور مستعد نظر آنے لگے تھے۔ میں سپاہیوں کو لے کر پہاڑی سلسلے میں دور تک گھستا چلا گیا۔

اونچے نیچے پتھریلے رستوں پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونج رہی تھیں اور میں آگے ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس وقت ایک پیالے نما سے میدان سے گزر رہا تھا جس کی اطراف بڑی بڑی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں وہاں ایک درے سے گزر کر پہنچا تھا اور بہت دور ایک اور درہ نظر آ رہا تھا۔ میرے گھوڑے کا رخ اسی طرف تھا لیکن میرا گھوڑا اس درے تک نہیں پہنچ سکا۔ معاً" ساری فضا وحشیانہ نعروں سے گونج اٹھی اور یہ نعرے چاروں طرف سے سنائی دے رہے تھے۔ مجھے اور میرے سپاہیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔ میں نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ چٹانوں سے ہر سمت نوکیلے تیر نکلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور تیر انداز بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں تھے۔ اگر میں ان پر تیر چلانے کا حکم دیتا تو وہ بچے رہتے لیکن وہ تیر چلاتے تو مجھے اور میرے سپاہیوں کو چھید ڈالتے۔

♥ ♡ ♡ ♥

میرے ہمراہ جو سپاہی تھے' ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ موت انہیں نوکیلے تیروں کی صورت میں چاروں طرف سے گھیرے ہوئی تھی۔ اپنی تعداد کم ہونے کے سبب وہ ساتھ آتے ہوئے پہلے ہی کچھ خوفزدہ تھے۔ ان کے دلوں میں یقیناً" اندیشے رہے ہوں گے جنہوں نے اب حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ خوف کے علاوہ ان کے چہروں سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے کسی حکم کے منتظر تھے۔

مجھے علم تھا کہ مارکوف اپنی روایت کے مطابق کم از کم مجھے ہلاک کرنے کی بجائے زندہ پکڑنا چاہے گا۔ مجھے اپنے ساتھ موجود منگول سپاہیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ میری دلی خواہش یہی تھی کہ ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے لیکن اس وقت مصلحت کا تقاضا کچھ اور تھا۔

"تم سب ہمارے تیروں کی زد پر ہو اس لیے اپنے ہتھیار پھینک دو!" معاً" فضا میں ایک تیز اور بلند آواز گونجی جس کی بازگشت چند لمحے تک سنائی دیتی رہی۔

"مارکوف! میں بطریق بوغا تم سے مخاطب ہوں۔ میری بات غور سے سنو!" میں نے بھی بلند آواز میں کہا' پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "میں ان سپاہیوں کا سردار ہوں۔ اگر تم میرے سپاہیوں کو جانے دو تو میں خود کو تمہارے سپرد کر دوں گا۔"

"نہیں!" جواب دیا گیا۔ "ہم تمہیں تمہارے سپاہیوں سمیت پکڑنا چاہتے ہیں۔ تم اس وقت ایسی حیثیت میں نہیں ہو کہ مجھ سے اپنی کوئی بات منوا سکو اس لیے بہتر ہے کہ میرا حکم مان لو ورنہ تمہیں تمہارے سپاہیوں سمیت ہلاک کر دیا جائے گا۔"

"بکھاتر لڑتے ہوئے مرتے ہیں مارکوف! دشمن کے سامنے ہتھیار پھینک کر موت کو بزدلی کے ساتھ قبول نہیں کرتے۔" میں نے پھر تیز لہجے میں کہا۔

جواب میں ایک وحشیانہ قہقہہ سنائی دیا' پھر چند لمحے بعد چھبتے ہوئے لہجے میں کہا گیا۔ "منگول' وحشی اور درندے ضرور ہو سکتے ہیں مگر بہادر ہرگز نہیں ہو سکتے۔ کیا کسی بوڑھے کو قتل کر دینا بہادری ہے؟ کیا شہر کیف

پر غاصبانہ قبضہ کر کے بے گناہ اور معصوم بچوں کو اپنے نیزوں میں پرو کر قہقہے لگانا بہادری ہے؟ مظلوم اور بے سہارا عورتوں کو اپنی ہوس کا شکار بنانے کے بعد انہیں قتل کر دینا بہادری ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! یہ بہادری نہیں، بزدلی ہے، وحشت و بربریت ہے، ظلم اور سفاکی ہے۔"

میں چاہتا تو اپنے سپاہیوں کو ہتھیار پھینکنے کا حکم دے سکتا تھا۔ اس طرح وقتی طور پر ان کی زندگی بچ سکتی تھی لیکن بھلا میں انہیں زندہ رہنے کی یہ عارضی مہلت بھی کیوں دیتا اس لیے میں نے مارکوف کی بات کے جواب میں کہا۔ "ظلم اور سفاکی کے معنی ہر ذہن میں مختلف ہیں۔ اگر تمہارا باپ اطاعت قبول کر لیتا تو یوں نہ مارا جاتا۔ تم اس پر شیر نہ ہونا کہ تم نے مجھے گھیر لیا ہے۔ جب تک میری ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے، میں مقابلہ کرتا رہوں گا۔ تم دوسرے منگول سرداروں کی طرح مجھے زندہ گرفتار نہ کر سکو گے۔" آخری جملہ میں نے دانستہ اور مصلحتاً" کہا تھا۔

ابھی میرے الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ میری سماعت سے بیک وقت کئی چیخیں ٹکرائیں۔ میں نے تیروں کی سنسناہٹ سنی تھی جو میرے عقب سے آئی تھی۔ مارکوف نے اچانک پوری احتیاط کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو سامنے سے بھی حملہ کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا اور میں اس کا مطلب سمجھتا تھا۔ وہ مجھے زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ میں آگے تھا اور سپاہی پیچھے! سامنے سے حملہ کرنے کی صورت میں پہلے میں ہی اس کے تیروں کا شکار ہوتا۔

"حملے کا جواب دو!" میں نے چیخ کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا اور پھر خود بھی کمان میں تیر چڑھایا۔

دشمن کی طرف پہلا تیر میں نے ہی چلایا تھا۔ میرے تیر چلاتے ہی سپاہیوں نے بھی پہاڑیوں کی طرف تیروں کی بوچھار کر دی تھی مگر وہی ہو رہا تھا جو میں چاہتا تھا۔ میرے سپاہیوں کے تیر چٹانوں اور پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر رائیگاں جا رہے تھے۔ دشمن ان کی زد سے محفوظ تھا۔

میں بے کھٹکے پہاڑیوں کی جانب تیر چلائے جا رہا تھا مگر میرے تیروں کے جواب میں تیر نہیں آ رہے تھے۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ مارکوف کے ساتھیوں کا نشانہ بڑا سچا تھا۔ میرے اطراف موجود کئی سپاہی ہلاک ہوئے کئی گھوڑوں کی پشتیں خالی ہوئیں مگر مجھے ایک معمولی سی خراش بھی نہیں آئی۔

مقابلہ جاری رہا، چیخیں گونجتی رہیں اور میرے سپاہیوں کی تعداد کم ہوتی رہی۔ آخر کار وہ لمحہ بھی آ گیا جب میرے سپاہیوں کے پاس تیر ختم ہو گئے۔ ان کی تعداد اب دو درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ مارکوف کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ہی چٹانوں نے مسلح افراد کو اگلنا شروع کر دیا۔ مارکوف کے ساتھی چاروں طرف سے مجھے اور میرے سپاہیوں کو گھیرے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ حلقہ لمحہ بہ لمحہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

"تلواریں سونت لو!" معاً" میں نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

میرے سپاہی مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ان کے لیے یقیناً" میرا سکون و استقلال حیرت انگیز تھا۔ سینکڑوں مسلح افراد کے مقابلے پر بھلا میں اور میرے سپاہی کیا کر سکتے تھے!

میں نے نیام سے تلوار نکال کر لہرائی تو میرے سپاہی بھی آخری مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے سوا ایک بھی منگول سپاہی زندہ رہ سکے۔ میں اسی لیے آخر وقت تک لڑنا چاہتا تھا حالانکہ اس مقابلے کے نتیجے سے میں ہی کیا میرا ہر سپاہی واقف تھا۔

کچھ وقت گزرا تھا کہ تلواروں سے تلواریں ٹکرانے لگیں۔ میں نے اس دراز قد سرخ و سفید نوجوان کو دیکھ لیا تھا جو اپنے ساتھ چند ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا تھا اور میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں جلد ہی اس کا مقصد سمجھ گیا اور اس کا مقصد پورا کر دیا۔ میں لڑتا ہوا اپنے ساتھیوں سے دانستہ الگ ہو گیا اور پھر مجھے مارکوف کے مخصوص دستے نے اپنے گھیرے میں لے

لیا۔

"دیکھ لو میں تمہیں زندہ گرفتار کر رہا ہوں۔" دراز قد نوجوان نے مجھے دور ہی سے مخاطب کیا۔ وہ یقیناً مارکوف ہی تھا اور بلاشبہ انتہائی پرکشش تھا۔

"ہاں میں ہار گیا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے کہے بغیر اپنی تلوار پھینک دی۔

لڑائی ختم ہو گئی۔ مجھے یہ جان کر افسوس ہوا کہ نصف درجن منگول سپاہی بھی میرے ساتھ زندہ پکڑ لیے گئے تھے۔ انہوں نے بھی میری ہی طرح تلواریں پھینک کر اپنی جان بچالی تھی۔

مجھے اور میرے زندہ بچ جانے والے سپاہیوں کو جلد ہی گھوڑوں کی پشت سے باندھ دیا گیا اور پھر مارکوف نے روانگی کا حکم دیا۔

اس پیالے نما میدان سے درے کے ذریعے نکل کر گھوڑے ایک جانب دوڑتے رہے۔ سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ کچھ دیر بعد ہی ایک اور درے سے گزر کر وہ قافلہ ایک بڑے سے میدان میں پہنچ گیا۔ اس میدان کے چاروں طرف بھی پہاڑیاں اور چٹانیں تھیں۔ مجھے توقع تھی کہ وہاں یورت ہوں گے مگر کچھ دیر بعد ہی پتا چل گیا کہ ان لوگوں کی رہائش بڑے بڑے غاروں میں تھی۔

جیسے ہی گھوڑے میدان میں جا کر رکے تھے میں نے اطراف کے غاروں سے بہت سی عورتوں کو نکل کر ان لوگوں کا استقبال کرتے دیکھا تھا۔ میں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ ان میں اکثریت منگول عورتوں کی تھی۔ منگول عورتوں کی وہاں موجودگی میرے لیے حیرت کا سبب نہیں تھی کیونکہ میں شہر کیف کے قلعے میں مقامی عورتوں کو منگول سرداروں کے تصرف میں دیکھ چکا تھا۔ مارکوف، منگولوں سے پورا پورا انتقام لے رہا تھا۔

مجھے اور میرے سپاہیوں کو گھوڑوں کی پشت سے کھول کر ایک بڑے سے غار میں پہنچا دیا گیا جس میں پہلے سے درجن بھر منگول قیدی موجود تھے جن کے پاؤں میں موٹے موٹے آہنی کڑے پڑے ہوئے تھے جو یقیناً کافی وزنی تھے۔ ایسا شاید اس لیے کیا گیا تھا کہ اگر وہ کسی طرح فرار ہونے کی کوشش کریں تو تیز نہ بھاگ سکیں۔ ان قیدیوں نے مجھے بجھے انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ جب میں اور دوسرے نووارد قیدی بیٹھ گئے تو انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ہم پر کیا گزری اور منگولوں کا کیا حال ہے! کیا وہ اسی طرح مارے جائیں گے! کیا کوئی ایسا منگول سردار پیدا نہیں ہوگا جو مارکوف کو نیچا دکھا سکے!

"کیا تم لوگوں نے یہاں سے فرار ہونے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ناممکن ہے۔" ایک قیدی نے جواب دیا۔ "اس غار کے باہر دن رات سخت پہرہ رہتا ہے اور یہاں ایسے ہی اور بہت سے غار ہیں جن میں منگول قیدی رہتے ہیں لیکن وہ کبھی ایک غار میں دو درجن سے زیادہ قیدی نہیں رکھتے حالانکہ اس غار میں بھی اتنی گنجائش ہے کہ یہاں دو درجن تو کیا چھ درجن قیدی رکھے جا سکتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا اور لاتعلق نظر آنے لگا۔ قیدی آپس میں باتیں کر رہے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ مارکوف تک یہ اطلاع کس طرح پہنچائی جائے کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں؟ مگر مجھے اس کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

کچھ وقت گزرا تھا کہ ایک مسلح سپاہی غار میں داخل ہوا۔ اس نے میرے قریب آ کر مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ کیا مجھے مارکوف نے بلایا ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" سپاہی نے جواب دیا۔ "تمہارے پاس اگر کوئی خنجر وغیرہ یا دوسرا ہتھیار ہو تو میرے حوالے کر دو!"

میرے پاس دو خنجر تھے جو میں اس کے حوالے کر دیے۔ سپاہی نے وہ خنجر اپنی پیٹی میں لگا لیے اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے غار سے نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے غار سے نکلا اور دیکھا کہ غار کے دہانے پر

نصف درجن مسلح سپاہی موجود ہیں جن کی وہاں موجودگی پر میں نے پہلے غور نہیں کیا تھا۔

وہاں غار میں ایک شہر آباد تھا۔ ہر طرف مسلح سپاہی آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے جو غالباً "فتح کی خوشی میں جشن منا رہے تھے۔

کچھ دور چل کر غاروں کے درمیان ایسا حصہ شروع ہوا جو نسبتاً "نیم تاریک نہیں تھا۔ میں نے واضح طور پر یہ محسوس کیا کہ وہاں پتھروں کو تراش کر راستہ بنایا گیا تھا۔ سپاہی مجھے لیے ہوئے اس راستے پر بڑھتا رہا۔

بلا آخر سپاہی مجھے ساتھ لیے ایک ایسے غار کے دہانے پر پہنچا جہاں درجن بھر مسلح سپاہی مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ سپاہی نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود اپنے ساتھیوں کے پاس رک گیا میں بے جھجک اس غار میں داخل ہو گیا۔

اندر جاتے ہی میں نے اپنے قدموں کے نیچے دبیز قالین محسوس کیا۔ اس غار میں کئی مشعلیں روشن تھیں جن کی وجہ سے غار پوری طرح روشن تھا۔ سامنے ہی تخت پر مارکوف بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت غار میں اس کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔

میں تخت کے سامنے پہنچ کر ادب سے جھکا اور پھر منگولوں کی روایات کے مطابق اظہار اطاعت کی خاطر اپنی پوری ٹوپی اتار دی۔ اس کے بعد اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی پیٹی بھی کھول کر مارکوف کے سامنے سر جھکا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ مارکوف منگولوں کے رسم و رواج سے آگاہ ہو گا اور میرے اظہار اطاعت کو سمجھ جائے گا۔ اس وقت میں نے اس کے چہرے پر حیرت دیکھی تھی۔ اس کے لیے یقیناً "یہ امر تعجب خیز تھا۔ ایک ایسا آدمی اور خود سر شخص جس نے آخری وقت تک ساری سے اس کا مقابلہ کیا تھا' اچانک کس طرح اس کے سامنے جھک گیا!

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' میں بول اٹھا۔ "بطریق خان اسرائیل کے بگھاتر بیٹے کو تعظیم دیتا ہے جو وحشی منگولوں کے لیے موت کا پیغام بن گیا ہے۔"

میری بات سن کر اس کے چہرے پر لمحے بھر کو حیرت کے آثار ابھرے' پھر اس نے کہا۔ "کیا تمہیں موت نے اتنا خوفزدہ کر دیا ہے کہ تم اپنے ہی ہم قوموں کو وحشی کہہ رہے ہو؟"

"میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں بھی تمہاری طرح اپنے سینے میں انتقام کی آگ لیے پھر رہا ہوں مگر تمہارا اور میرا طریقہ مختلف ہے۔" میں نے بے جھجک کہا۔ "تم کھلے عام ان کی مخالفت کر رہے ہو' ان سے مقابلہ کر رہے ہو کیونکہ تمہارے ساتھ دوسرے بھی ہیں مگر میں تنہا تھا اور تنہا ہوں اس لیے ان کے درمیان رہ کر انتقام لے رہا ہوں۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا' پھر بولا۔ "تم غالباً" اس علاقے میں نئے آئے ہو کیونکہ اس سے پہلے کبھی تمہارا نام نہیں سنا گیا؟"

"ہاں میں پہلے قراقرم میں تھا لیکن مغربی دشت میرے لیے نیا نہیں ہے۔ میں اس سے پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں۔ میں اس وقت موجود تھا جب انہوں نے تمہارے مظلوم باپ کو ہلاک کیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر تم منگول نہیں تو پھر کون ہو؟" مارکوف نے سوال کیا۔

میں نے جواب میں مختصراً" اسے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا لیکن دانستہ سولدہ کا ذکر نہیں کیا۔ میں بھلا اسے سولدہ کے بارے میں کس طرح بتاتا جبکہ ابھی خود سولدہ کے متعلق الجھن میں گرفتار تھا!

میں نے مارکوف کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ وہ میری سرگزشت سن کر متاثر ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کچھ الجھا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا جیسے تذبذب کا شکار ہو۔ میرے چپ ہونے کے بعد وہ کافی دیر خاموش رہا' پھر میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "اس میں شک نہیں کہ میں تمہاری داستان سن کر متاثر ہوا اور میں تمہاری ذہانت کا بھی اعتراف کرتا ہوں۔ تم نے دشمنوں کے درمیان رہ کر انہیں اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ میں اب تک اتنا نقصان نہیں پہنچا سکا۔ ممکن ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے' وہ سچ ہو

لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم جھوٹے نہیں ہو اور میرے ساتھ کوئی چال نہیں چل رہے؟"

"اس بات کے کئی ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں۔" میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "پہلا ثبوت تو یہی ہے کہ میں دانستہ اپنے ساتھ کم سپاہیوں کو لایا تاکہ مقابلے کی صورت میں تم باسانی مجھے زیر کر سکو اور۔"

"ٹھہرو!" مارکوف نے میری بات کاٹ دی۔ "اگر ایسا ہی تھا تو تم نے آخر وقت تک مقابلہ کیوں کیا؟"

"اس لیے کہ میرے ہمراہ منگول سپاہی زیادہ سے زیادہ تعداد میں قتل ہو سکیں بلکہ میری خواہش تو یہ تھی کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچ سکے۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"لیکن اس مقابلے میں خود تم بھی تو قتل کیے جا سکتے تھے؟"

"مجھے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔

"اس یقین کا سبب؟"

"میں روانگی سے قبل تمہارے بارے میں تمام معلومات حاصل کر چکا تھا اور مجھے علم تھا کہ تم منگول سرداروں کو زندہ گرفتار کرتے ہو۔" یہ کہہ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا کہ وہ میرے جواب سے مطمئن ہوا یا نہیں!"

"ہاں مجھے خود بھی اس پر حیرت تھی۔ میری نظر میں تم سراسر خودکشی پر آمادہ تھے۔" مارکوف بولا۔ "مگر یہ بھی کوئی مسلمہ ثبوت نہیں ہے۔" پھر چند لمحے کچھ سوچ کر کہا۔ "اگر میں تم سے کہوں کہ منگول قیدیوں کو قتل کر دو تو کیا آمادہ ہو جاؤ گے؟"

"یہ میرے لیے انتہائی خوشی کی بات ہو گی۔" میں نے بے جھجک کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔" مارکوف فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "اس طرح چند قیدیوں کا نقصان تو ضرور ہو گا جنہیں میں منگولوں پر حملہ کرتے ہوئے آگے آگے رکھتا ہوں مگر تمہاری طرف سے میں ضرور مطمئن ہو جاؤں گا۔"

میں نے مارکوف کی شرط قبول کر لی لیکن اس کے ساتھ میرے ذہن میں ایک خدشہ ابھرا۔ میرے خیال میں یہ بات میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی کہ مارکوف کے سوا کسی اور شخص کو میری حقیقت کا علم ہو سکے۔

"مجھے تمہاری ہر شرط قبول ہے لیکن میرا راز صرف تمہی تک رہے تو بہتر ہے۔" میں اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"یہ ناممکن ہے۔" مارکوف نے فوراً جواب دیا۔

"ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ میرے ساتھیوں کو تفصیلات کا علم نہ ہو لیکن ان کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ تم میرے وفادار ہو۔"

میں الجھن میں پڑ گیا مگر اس کی بات ماننا میری مجبوری تھی اور کسی حد تک وہ درست بھی کہہ رہا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر اس کے سامنے ایک اور تجویز رکھی۔ میں نے کہا۔ "یہ تو ممکن ہے کہ منگول قیدیوں کے کانوں تک یہ بات نہ پہنچے۔"

"مگر تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟" مارکوف کے لہجے سے شک کا اظہار ہو رہا تھا۔

"منگولوں پر حملہ کرتے ہوئے تم قیدیوں کو ساتھ ساتھ رکھتے ہو اور تمہارا یہ عمل جنگی حکمت عملی کے اعتبار سے عمدہ ہے لیکن اس طرح یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوئی قیدی جنگ کے دوران میں فرار ہو جائے۔" میں نے وہ بات کہہ دی جو میرے دل میں تھی۔

"اول تو اب تک ایسا نہیں ہوا کیونکہ قیدیوں پر جنگ کے دوران بھی کڑی نگرانی رکھی جاتی ہے مگر اس کے باوجود مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔" مارکوف میری بات کا جواب دیتے ہوئے اب مطمئن نظر آ رہا تھا اور اس کے لہجے سے شک کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

"میں اسی امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ چاہتا ہوں کہ منگول قیدیوں کو میری حقیقت کا علم نہ ہو۔" میں بولا۔ "رہے وہ قیدی جنہیں میرے ہاتھوں ہلاک ہونا ہے تو ان کا کچھ جاننا نہ جاننا بے معنی ہے۔ غالباً تم میری بات سمجھ رہے ہو!"

"ہاں!" مارکوف نے جواب دیا۔ "لیکن اس طرح تمہارے لیے ایک مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ وہ یہ کہ تمہیں قیدیوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔"

مارکوف کی بات سن کر میں کچھ دیر چپ رہا، پھر بولا۔ "منگول قیدیوں میں سے صرف وہی مجھ سے واقف ہیں جو میرے ساتھ آئے تھے اور ان میں سے صرف چند زندہ ہیں یا وہ درجن بھر قیدی جو اس غار میں تھے جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔ ان سب قیدیوں کے علاوہ کوئی مجھ سے واقف نہیں کہ میں کون ہوں! وجہ یہ کہ میں اس علاقے میں نیا آیا ہوں۔"

"تو گویا اگر ان سارے قیدیوں کو ہلاک کر دیا جائے تو تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔" مارکوف بولا۔

"ہاں!" میں نے سر ہلایا۔ وہ یقیناً ذہین تھا کیونکہ میرا مقصد سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی تھی۔ میں قدرے توقف سے جھجکتے ہوئے بولا۔ "اگر تم مجھے اجازت دو کہ میں ان سب کو قتل کر دوں تو میرا راز محفوظ ہو جائے گا اور مجھے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

"یہ معاملہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔" یہ کہہ کر مارکوف خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں ہے۔

"پھر؟" میں نے اسے خاموش دیکھ کر چند لمحے بعد کہا۔

"پھر یہ کہ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔" مارکوف بولا۔

"شاید کل تک میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔ اس وقت تک میں تمہیں قیدیوں کے غار میں رکھنے کی بجائے دوسرے غار میں رکھوں گا کیونکہ اب تمہارے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک نہیں ہونا چاہیے۔"

"جیسی تمہاری مرضی!" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد ہی میں مارکوف کے غار سے نکل کر ایک سپاہی کے ساتھ کسی طرف جا رہا تھا۔ اس سپاہی کو مارکوف نے حکم دیا تھا کہ میرے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کیا جائے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"ارے تو اب تک سو رہا ہے!" اختی نے کہا۔

میں انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے اختی کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت دوپہر سے زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ہاتھ منہ دھوئے اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

"کیا مجھے کھانے کے لیے نہیں پوچھے گا؟" مجھے کھانا کھاتے دیکھ کر اختی بولی۔

"آ تو بھی آ جا! مجھے کیا پتا تھا کہ تو بھوکی ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھا لیا۔

"میں اپنا کھانا بھی ساتھ لے آئی تھی کہ تیرے ساتھ ہی کھاؤں۔" اس نے بتایا اور گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر کھانے لگی۔

"ہاں اب بتا دوپہر تو کیا بتانے والی تھی؟" میں نے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"میں تجھے اپنے بارے میں بتانے والی تھی مگر میں نے سوچا کہ بتانے سے کیا فائدہ!"

"کیوں؟ میں بھی تیری طرح منگول ہی ہوں۔ مجھ سے اپنا دکھ نہیں کہے گی تو کس سے کہے گی!"

میری بات سن کر اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ شاید اس نے بہت دن بعد کسی سے ہمدردی کے بول سنے تھے۔

"یہاں تو کسی سردار کے ساتھ رہتی ہو گی؟" میں نے اس کے حسن کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی حیثیت کا اندازہ لگایا۔

"نہیں!" اس کی بھرائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

"کیا مطلب؟ کیا تجھے کسی عام سپاہی کو دے دیا گیا ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"نہیں!" اس بار بھی اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"پھر؟" میں مجسم سوال بن گیا۔

"کھانا تو کھا! تو نے کھانا کیوں چھوڑ دیا؟" وہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"تو بھی تو نہیں کھا رہی!" میں نے کہا۔

"اچھا کھا! میں بھی کھاتی ہوں' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا' پھر چند لمحے بعد میرے دوبارہ کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بولی۔ "یہاں میرے علاوہ جتنی بھی منگول لڑکیاں یا عورتیں ہیں' ان میں سے صرف چند کو چھوڑ کر بقیہ پر سب کا حق ہے۔ چاہے وہ سپاہی ہو یا سردار کوئی بھی کسی منگول عورت پر اپنا حق جتا سکتا ہے اور اسے اپنے ساتھ غار میں لے جا سکتا ہے۔ انکار کا مطلب موت ہے۔ کئی منگول عورتیں انکار کرنے کی وجہ سے قتل ہو چکی ہیں اب کوئی انکار نہیں کرتا؟"

"یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔" مجھے اختی کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ "ہاں وہ چند منگول عورتیں کون سی ہیں جن پر ہر شخص حق نہیں جتا سکتا؟ ان کے ساتھ یہ رعایت کیوں ہے؟"

"کیونکہ وہ صرف مارکوف کے لیے ہیں۔ وہ ایک الگ غار میں سوتی ہیں۔" اختی نے بتایا' پھر ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔ "مجھے یاد نہیں کہ اب تک میں کتنے غاروں میں سو چکی ہوں!"

کھانا کھانے ہی کے دوران اختی نے اپنی دکھ بھری داستان سنائی مگر اس کے باوجود میں اس داستان سے متاثر نہیں ہوا کیونکہ وہ بہرحال ایک منگول لڑکی تھی جس سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔

اختی کے باپ اور بڑے بھائی کو اس کے سامنے قتل کر دیا گیا تھا۔ صرف اس کی بوڑھی ماں کو آنسو بہانے کے لیے زندہ چھوڑا گیا تھا۔ اختی کو وہ اغوا کرا لائے تھے۔ اختی کی دوشیزگی پہلی بار انہیں غاروں میں ختم کی گئی تھی اور اس رات اختی اپنی ماں کو یاد کر کے بہت روئی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے اختی نے اسے شخص کو اپنے مرد کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا اور اپنی قسمت پر شاکر ہو گئی تھی لیکن جب دوسری رات اسے ایک اور شخص اپنے ہمراہ غار میں لے گیا تو اختی کو اپنی مجبوری و بے بسی کا احساس ہوا لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتی تھی!

"جب منگول عورتوں پر سب کا حق برابر ہے تو کیا وہ آپس میں ان کے حصول کی خاطر لڑتے نہیں؟" میں نے اختی سے پوچھا۔

"میں تیرا مطلب سمجھی نہیں۔" اختی نے کہا۔

"مطلب یہ کہ ایک ہی عورت پر ایک ہی رات میں دو مرد بھی تو اپنا حق جتا سکتے ہیں۔" میں نے وضاحت کی۔

"ایسا نہیں ہوتا۔" اختی نے بتایا۔ "پہلا حق اسی کو تسلیم کیا جاتا ہے جو پہلے ہاتھ تھام لے۔"

ہر چند کہ اختی نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور میں نے جان لیا تھا' وہ پامال کی جا چکی ہے مگر اس کے باوجود اس کا قرب میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں نے اس کی طلب کا اظہار کیا تو وہ میری آغوش میں آنے سے گریز نہیں کرے گی اور میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔

"تو تو پھر اپنا ہے' میں تو غیروں کے لیے اپنا سب کچھ لٹاتی رہی ہوں۔" اختی یہ کہتی ہوئی میری آغوش میں سمٹ گئی تھی۔

مجھے علم نہیں تھا کہ میری اس حرکت پر مارکوف کا کیا ردعمل ہو گا لیکن اتنا اندازہ ضرور تھا کہ اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

قرب کے معاملے میں اختی بڑی شدت پسند تھی یا اسے شدت پسند بنا دیا گیا تھا حالانکہ اس کی عمر کا یہ تقاضا نہیں تھا۔ اس بات کا اندازہ مجھے ابتدا ہی میں ہو گیا۔

وہ کسی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی اور میں کسی ماہر سپیرے کی طرح اسے قابو میں کر رہا تھا۔ کسی منگول لڑکی سے وہ میرا پہلا قریب تھا' پہلا مگر بھرپور قرب!

اس کے گرم گرم اور تیز سانس میرے ہونٹوں اور رخساروں سے ٹکرا کر جیسے میرے وجود کو گرم تپتے صحراؤں کا احساس دلا رہے تھے۔ صحرا جہاں دھوپ ہی دھوپ اور آگ ہی آگ تھی اور میرا سارا جسم اس آگ میں جل رہا تھا۔ لحہ بہ لحہ اس آگ کی تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے ہونٹ خشک ہوتے جا رہے تھے۔ پھر جیسے میں جھیل بیکال میں تیرتے تیرتے کسی

بھنور کی زد میں آگیا اور مجھے یوں لگا جیسے ڈوبتا جا رہا ہوں۔

"اختی!" میں نے ڈوبتے ہوئے اسے پکارا۔

"ہوں!" اس کی آواز مجھے کہیں بہت دور سے آتی سنائی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ڈوب رہی ہو۔

جب میں اور اختی اس بھنور سے نکلے تو مجھے فضا بڑی نکھری نکھری اور دھلی دھلی سی محسوس ہوئی۔ اس کا سب اختی بھی تھی جس پر عجیب سا نکھار آگیا تھا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اور تو یہاں سے بھاگ چلیں؟" اختی نے کچھ دیر بعد جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ ممکن ہے اختی؟" میں نے مصنوعی دلچسپی کا اظہار کیا۔

"شاید!" وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ "ٹھہر! میں ابھی دیکھ کر آتی ہوں۔"

چند لمحے بعد وہ دبے پاؤں غار سے نکل گئی۔

اختی چلی گئی اور میں تقدیر کے اس مذاق پر دل ہی دل میں ہنسنے لگا جو وہ اختی کے ساتھ کر رہی تھی۔ اس نے مجھے منگول سمجھ کر ہی یہ مشورہ دیا تھا مگر اسے کیا خبر تھی کہ میں خود اپنی مرضی سے وہاں آیا تھا اور اب مارکوف کا قیدی نہیں تھا! اسے کیا علم تھا کہ منگول نہیں بلکہ منگولوں کا دشمن ہوں! پھر بھی میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے!

کچھ دیر بعد وہ لوٹ آئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور سینے کا زیر و بم میرے جذبات کو دوبارہ بے قابو کیے دے رہا تھا۔ اس نے آتے ہی میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ "میں دیکھ آئی۔ میری توقع کے مطابق راستہ صاف ہے۔ آبھاگ چلیں!"

"میرا خیال ہے کہ یہاں سے فرار ہونا اتنا آسان نہیں ہو گا جتنا تو سمجھ رہی ہے۔ پہلے بیٹھ کر اطمینان سے مجھے بتا کہ تو کیا دیکھ کر آئی ہے؟ یہاں پہریدار بھی تو ہوں گے؟" میں نے اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

"پہریدار صرف ان غاروں کی طرف ہوتے ہیں جہاں قیدی ہیں۔" اس نے اپنے بولے پھولے سانس پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں مجھے ان غاروں کی بھول بھلیوں سے اس طرح نکال کر لے جاؤں گی کہ تجھے اور مجھے کوئی پہریدار نہیں دیکھ پائے گا۔"

"اگر ایسا ہی ہے جیسا تو کہتی ہے تو پھر خود اب تک یہاں سے کیوں نہیں بھاگ گئی؟" میں نے کہا۔

"مجھے یہاں سے نکل کر شہر تک پہنچنے کا راستہ معلوم نہیں تھا' پھر یہ کہ مجھے رات میں اکیلے ڈر بھی لگتا ہے ورنہ کچھ راتیں ایسی ضرور آتی ہیں کہ جب میں تنہا ہی کسی غار میں سوتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کچھ شرما سی گئی اور میں اس کی بات کا مطلب بالکل نہ سمجھ سکا۔

"کیا ان راتوں میں کوئی تیرے قرب کی آرزو نہیں کرتا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تو تو بس بالکل یوں ہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔ "تجھے کچھ پتا نہیں! ارے وہ تو ایک دن پہلے ہی مجھے یاد رکھنا پڑتا ہے کہ آئندہ شب کس کے غار میں جانا ہے!"

"پھر؟" میں اب بھی نہیں سمجھا۔ "پھر تو کیسے کہہ رہی ہے کہ کچھ راتیں تنہا سوتی ہے؟"

"بس سوتی ہوں اور سب ہی کو سونا پڑتا ہے۔ تجھے تجھے کیسے سمجھاؤں!" اختی کچھ جھینپی جھینپی اور پریشان سی دکھائی دینے لگی اور میں حیران تھا کہ اس میں جھینپنے یا پریشان ہونے کی کیا بات تھی!

"خیر اس بات کو چھوڑ!" میں اسے پریشان اور شرمندہ دیکھ کر بولا۔

"اگر تو مجھے نہیں سمجھا سکتی تو نہ سہی! ہاں میں تجھ سے یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں سے فرار ہونا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ اگر غاروں کے درمیان پہرہ نہیں ہے تو ان دروں پر یقیناً" پہرہ ہو گا جن کے ذریعے غاروں سے نکل کر شہر کی طرف جانا ہو گا۔"

"ممکن ہے تیرا خیال درست ہو لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے! اگر وہاں کوئی ہوا تو ہم بھاگ کر دوبارہ غاروں میں آ چھپیں گے۔" اس نے مشورہ دیا۔

میں اس کا مشورہ سن کر ہنس پڑا۔ اس نے بڑی بچکانہ بات کی تھی۔

"تو میری بات پر ہنس کیوں رہا ہے؟" وہ مجھے ہنستے دیکھ کر گھورتی ہوئی بولی۔

"اس لیے کہ تو نے بالکل بچوں جیسی بات کی ہے۔" میں نے کہا۔

"ذرا سوچ کہ ہم ان پہریداروں کی نظروں سے کس طرح بچ سکیں گے! پھر اگر مارکوف کو معلوم ہو گیا کہ ہم نے فرار ہونا چاہا تھا تو ہمارا کیا حشر ہو گا!"

وہ میری بات سن کر واقعی ڈر گئی اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ میں اب سنجیدگی کے ساتھ ایک امکان پر غور کر رہا تھا کہ کہیں مارکوف ہی نے تو میری آزمائش کے لیے اس لڑکی کو میرے پاس نہیں بھیجا تھا؟ ایسا ممکن تھا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اس لڑکی میں اتنی عقل نہیں تھی جو مجھ سے اپنے دلی جذبات کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب ہو جاتی۔ اگر مارکوف اسے میری آزمائش کے لیے استعمال کر رہا تھا تو وہ اس سے لاعلم ہی تھی۔ یوں بھی مجھے بھلا وہاں سے فرار ہونے میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی جہاں میں خود کوشش کر کے پہنچا تھا!

اختی کچھ دیر میرے پاس رہ کر مایوس مایوس سی رخصت ہو گئی۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس طرح کی پیشکش پر سنجیدگی سے غور کرتا اور فرار ہونے کے لیے پوری کوشش کرتا مگر وہ تو حالت ہی کچھ اور تھے۔

اختی چلی گئی تو میں سونے کی کوشش کرنے لگا مگر دن بھر سویا تھا اس لیے نیند نہیں آ رہی تھی۔

اختی کو گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ غار کے باہر مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ رات کے اس پہر میرے غار کی طرف آنے والا کون ہو سکتا تھا؟ میں نے سوچا۔

قدموں کی چاپ قریب آتی گئی۔ میں اضطراری کیفیت کے سبب اٹھ کر بیٹھ گیا۔

غار میں داخل ہونے والے کا چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ آنے والا وہی سپاہی تھا جو اسی دن صبح مجھے قیدیوں کے غار سے مارکوف کے غار تک لے گیا تھا۔

میں نے اسے سوالیہ نگاہ سے دیکھا تو وہ بولا۔

"میرے ساتھ چلو!"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"وہیں جہاں میرے ساتھ صبح گئے تھے۔" سپاہی نے جواب دیا۔

"کیا شہر کیف کا اصل حقدار اب تک جاگ رہا ہے؟" میں نے مارکوف کا ذکر احترام سے کیا کیونکہ سپاہی مجھ سے وہیں چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"ہاں تمہیں عظیم میخائل کے بہادر فرزند ہی نے طلب کیا ہے۔" سپاہی نے جواب دیا۔ "وہ ہمیشہ بیدار رہتا ہے اور کبھی نہیں سوتا۔"

سپاہی نے میری دانست میں احمقانہ سی بات کی تھی۔ بھلا کسی آدمی کے لیے ہمیشہ بیدار رہنا کس طرح ممکن ہے! مگر میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے ساتھ ہو لیا۔

کچھ دیر بعد ہی میں مارکوف کے غار میں داخل ہو رہا تھا۔ سپاہی حسب معمول باہر ہی رک گیا تھا۔ مارکوف اس وقت شراب سے شغل کر رہا تھا۔ مجھے غار میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے نگاہ اٹھائی اور بیٹھ جانے کے لیے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

جب میں تخت کے سامنے مودب بیٹھ گیا تو اس نے شربت کا ایک گھونٹ لے کر مجھے مخاطب کیا۔ "میرا خیال ہے کہ اس منگول لڑکی نے تمہارے سامنے جو تجویز پیش کی تھی، وہ مناسب تھی۔" یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے میرے جانب دیکھنے لگا۔

میں اس کی بات سن کر اچھل پڑا۔ اس کے جملے کا واضح مطلب یہی تھا کہ اختی اور میرے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی، وہ اس کے علم میں تھی۔ یقیناً اس کے کسی آدمی نے چھپ کر ہماری ساری گفتگو سنی تھی اور اسے بتا دی تھی۔ میں غور کرنے لگا کہ کہیں اختی سے گفتگو کرتے ہوئے میری زبان سے کوئی ایسی غیر ذمے دارانہ بات تو نہیں نکل گئی جس سے مارکوف شک میں پڑ گیا ہو!

"تم کس سوچ میں کھو گئے؟ میں نے جو کچھ کہا ہے وہی چاہتا ہوں۔" وہ مجھے خاموش دیکھ کر پھر بولا۔

"کیا مطلب؟" آخر کار مجھے بولنا ہی پڑا۔ "کیا تم

چاہتے ہو کہ میں فرار ہو جاؤں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں!" اس نے جواب دیا اور وہ منگول لڑکی بھی تمہارے ساتھ فرار ہو تاکہ دشمنوں کو تم پر کوئی شک نہ ہو سکے۔ میں نے کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہارا دشمنوں کے درمیان رہنا ہی ہمارے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔" مارکوف نے اپنی بات کی وضاحت میں کہا۔

میں نے اس کا مقصد سمجھ کر ٹھنڈا سانس لیا۔ کم از کم مجھے یہ تو یقین ہو ہی گیا تھا کہ وہ مجھ پر کسی طرح کا شک نہیں کر رہا مگر میرے لیے یہ بات الجھن کا سبب تھی کہ وہ مجھ سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا! یہی الجھن الفاظ کی صورت میں میری زبان پر بھی آ گئی۔

"دراصل مجھے اب تک یہ موقع نہیں مل سکا کہ میں قلعے پر کوئی بھرپور حملہ کر سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قلعے کے اندر میرا کوئی بااثر آدمی نہیں جو میری معاونت کر سکے۔" مارکوف جواب میں بولا۔ "میں بہت دن سے یہ خواب دیکھ رہا ہوں لیکن تمہاری وجہ سے یہ خواب مجھے حقیقت بنتا نظر آ رہا ہے۔"

"لیکن اگر میں قلعے میں واپس پہنچ گیا تو تم مجھ سے کس طرح رابطہ قائم کر سکو گے؟" میں نے الجھی ہوئی سی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں ان تمام باتوں پر پہلے ہی اچھی طرح غور و خوض کر چکا ہوں۔" مارکوف نے کہا۔ "کیا تم ان بد نصیب مقامی عورتوں کو بھول گئے جو منگول سرداروں کے تصرف میں ہیں! انہی میں سے چند بہادر عورتیں میری جاسوسہ ہیں۔ وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میرے لیے جاسوسی کرتی ہیں اور انہی کی وجہ سے مجھے قلعے میں ہونے والی ہر اہم بات کا پتا چل جاتا ہے۔ کیا مجھے خبر نہیں تھی کہ تم میری طرف آنے والے ہو! تم نے بھی شاید محسوس کر لیا ہو گا کہ میں تمہارا منتظر تھا۔"

"ہاں میں سمجھ گیا تھا کہ تم باخبر ہو چکے تھے اور اسی لیے میں مطمئن تھا۔" میں نے تائید کی، پھر قدرے توقف سے بولا۔ "لیکن میں ان عورتوں کو کس طرح پہچانوں گا کہ ان مقامی عورتوں میں سے کون تمہاری جاسوسہ ہیں؟"

"ان کے پاس میری شناخت ہو گی جو میں تمہیں بھی دوں گا۔" مارکوف نے بتایا۔

"لیکن کیا اس شناخت کا میرے پاس ہونا خطرناک ثابت نہ ہو گا؟" میں نے کہا۔

"نہیں!" اس نے جواب دیا۔ "شہر کیف اور اردگرد کے علاقوں میں عام طور پر عورت اور مرد ایسی انگوٹھیاں پہنتے ہیں لیکن....."

"بقول تمہارے اگر وہ انگوٹھیاں عام ہیں تو پھر انہیں شناخت کے طور پر کیوں استعمال کیا گیا ہے؟" میں نے مارکوف کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کوئی ایسی عورت بھی تو وہ انگوٹھی پہن سکتی ہے جو تمہاری جاسوسہ نہ ہو۔"

"مارکوف میری بات سن کر مسکرایا، پھر بولا "بظاہر وہ ایک عام سی انگوٹھی ہی ہو گی مگر جب تم اسے دیکھو گے تو غالباً" آسانی سے الگ شناخت کر لو گے۔"

"پھر تو میری جگہ کوئی دوسرا شخص بھی اس فرق کو محسوس کر سکتا ہے۔"

"تم بہت محتاط شخص ہو۔" وہ ہنس پڑا۔ "تم جو سمجھ رہے ہو ویسا نہیں ہے اور یہ بات اب میں تمہیں کل اس وقت بتاؤں گا جب وہ انگوٹھی دوں گا۔"

"تو کیا مجھے کل رات ہی یہاں سے فرار ہو جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!" مارکوف بولا۔ "میری نظر میں تمہارا یہاں زیادہ دن رکنا مناسب نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ "ہاں خوب یاد آیا کہ تمہارا وہ اندازہ قطعی درست تھا کہ دروں پر پہرہ رہتا ہے مگر کل رات اس پہرے میں نرمی کر دی جائے گی۔ اس لڑکی پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ تم نے اپنی جدوجہد ہی سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل کی ہے، تمہیں کچھ ہاتھ پیر بھی ہلانے ہوں گے۔"

"یعنی؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"یعنی یہ کہ تھوڑی سی لڑائی بھڑائی!" مارکوف ہنس

کر بولا۔

میں بھی ہنس پڑا اور بولا۔ "تم بہت تیز ہو۔" پھر مجھے ایک خیال آگیا اور میں نے پوچھا۔ "وہ میری آزمائش والے معاملے کا کیا ہوا؟"

"وہ اپنی جگہ بدستور قائم ہے۔" مارکوف نے کہا۔ "کل دن میں دو منگول قیدی تمہارے ہاتھوں ہلاک ہوں گے' زیادہ کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ ویسے تمہاری ایک آزمائش تو ہو بھی چکی ہے۔ اگر تمہارے دل میں کسی طرح کا کھوٹ ہوتا تو آج ہی رات فرار ہونے کی کوشش کرتے جبکہ بظاہر ہر راستہ صاف ہی تھا۔"

"احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے منگول قیدیوں کو اس بارے میں پتا نہیں چلنا چاہیے۔" میں بولا۔

"ایسا ہی ہوگا۔ میں اس سلسلے میں سوچ چکا ہوں۔ اب تم جاؤ اور سکون سے سو جاؤ!" مارکوف نے اپنے گلاس میں مزید شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔

میں جب کچھ دیر بعد مارکوف کے غار سے لوٹ کر پھر اسی غار میں پہنچ گیا جہاں مجھے ٹھہرایا گیا تھا تو میرے ذہن میں سوائے ایک الجھن کے کوئی اور الجھن نہیں تھی۔ وہ الجھن اس انگوٹھی کے بارے میں تھی جو بطور شناخت مجھے بھی پہننی تھی۔ میری نظر میں یہ ایک خطرناک بات تھی۔ کسی کو بھی اس انگوٹھی پر شک ہو جاتا یا اس کی حقیقت پتا چل جاتی تو میری زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ مارکوف نے اس وقت خوامخواہ مجھے تجسس میں چھوڑ دیا تھا اور میں نے کچھ جاننے کے لیے اس لیے اصرار نہیں کیا تھا کہ وہ مجھے ضرورت سے زیادہ شکی مزاج نہ سمجھے۔ بہرحال جو بھی تھا' مجھے وہ انگوٹھی تو پہننا ہی تھی۔ اسی الجھن میں نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن صبح ہی میرا بلاوا آگیا۔ اختی مجھے دودھ دے کر ہی گئی تھی کہ مارکوف کا قاصد آگیا۔ میں دودھ پی کر اس کے ساتھ ہو لیا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ مجھے مارکوف کے غار ہی میں لے جایا جا رہا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ مارکوف کا بھیجا ہوا سپاہی مجھے ایک اور بڑے غار میں لے گیا۔

اس غار میں مارکوف کے علاوہ دو افراد اور بھی تھے جو اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے اور غار کے پتھریلے فرش پر دو منگول قیدی بندھے ہوئے پڑے تھے۔ وہ منظر دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میری آزمائش کا وقت آگیا ہے۔

ان بدنصیب منگول قیدیوں کو غالباً خبر نہیں تھی کہ وہ بہت جلد زندگی کی سرحدیں عبور کرنے والے ہیں۔ مجھے ان کے چہروں پر حیرت و الجھن اور آنکھوں میں بے بسی نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں صرف میری آزمائش کے لیے موت کے گھاٹ اترنے والے تھے۔

مارکوف نے بغیر کچھ کہے اپنی نیام سے تلوار نکال کر میرے ہاتھ میں دے دی۔ اس لمحے میں نے اس کے ساتھیوں کو بہت چوکنا پایا۔ ان دونوں کے ہاتھ انتہائی تیزی کے ساتھ اپنی اپنی تلواروں کے قبضوں تک پہنچ گئے تھے اور میں اس کا مقصد اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ یہ کہ اگر میرے دل میں بدی آجائے تو وہ فوری طور پر اس کا تدارک کر سکیں یہ محسوس کر کے میں مسکرا دیا۔ میں مارکوف کے ساتھیوں کی حماقت پر مسکرایا تھا۔ اگر میرے دل میں واقعی بدی ہوتی اور میں مارکوف کو قتل ہی کرنا چاہتا تو وہ مجھے نہیں روک سکتے تھے۔ میں تلوار ہاتھ میں آتے ہی مارکوف پر حملہ کر سکتا تھا اور جب تک اس کے ساتھی اپنی تلواریں نکالتے' مارکوف کا کام تمام ہو جاتا۔

"تم مسکرا کیوں رہے ہو؟" مارکوف نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس یوں ہی! کچھ خاص بات نہیں۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں! تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ کوئی بات ضرور ہے۔" مارکوف نے مسکرانے کا سبب بتانے پر اصرار کیا۔

"دراصل میں تمہارے ساتھیوں کو چوکنا دیکھ کر مسکرایا تھا۔" میں نے کہا اور پھر جو کچھ دل میں تھا' بتا دیا۔

میری بات سنتے ہی مارکوف کے ساتھیوں نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ قبضوں پر سے ہٹا لیے تھے جیسے ان کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"میں تمہاری صاف گوئی سے خوش ہوا۔" مارکوف نے کہا' پھر ہنس کر بولا۔ "دراصل میرے ساتھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ جب میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتایا تھا تو یہ اصرار میرے ساتھ آگئے تھے۔ بہرحال مجھے ان پر فخر ہے اور یہی میرے دست و بازو ہیں۔"

"اگر اجازت ہو تو میں اپنا فرض پورا کروں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں!" مارکوف نے سر ہلایا۔

میں مارکوف کی اجازت ملتے ہی بدنصیب منگول قیدیوں کی جانب بڑھا جو غالباً" ابھی تک کچھ نہیں سمجھ پائے تھے لیکن ان کے چہروں سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے انہیں قریب پہنچ کر پہچان لیا۔ وہ انہی میں سے دو تھے جو میرے ساتھ آئے تھے اور زندہ بچ گئے تھے۔

مجھے یہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ بندھے ہوئے ہوں اور میں انہیں قتل کر دوں۔ میرے نظر میں یہ بزدلی تھی۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ باری باری انہیں کھول دیا جائے اور میں ان سے لڑ کر انہیں زیر کروں؟" میں نے مارکوف کی جانب مڑ کر کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا لیکن میں اس کھیل کو طول دینا نہیں چاہتا۔" مارکوف نے جواب دیا۔ "اس کے علاوہ یہ بھی کہ تمہاری قیمتی زندگی کو بھی داؤ پر نہیں لگانا چاہتا۔"

مارکوف کا لہجہ فیصلہ کن تھا اس لیے مجھے اپنے دل پر جبر کرنا پڑا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور ان میں سے ایک کی گردن پھر بھرپور وار کیا۔ اس کی گردن کٹ کر الگ جا پڑی۔ اسے چیخنے تک کی مہلت نہیں مل سکی تھی مگر دوسرا چیخ پڑا۔ "غدار! تو دشمن سے مل۔"

اس کا جملہ پورا نہیں ہو پایا تھا کہ میں نے اس کی زبان کو بھی ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔

اسی لمحے مارکوف کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے مخاطب تھا۔ "اب بتاؤ کہ میں ٹھیک ہی کہہ رہا تھا یا نہیں؟"

عظیم میخائل کا بہادر بیٹا مردم شناس ہے۔" ان میں سے ایک بولا اور دوسرے نے بھی تائید میں وہی الفاظ دہرائے۔

میں نے مارکوف کی خون آلود تلوار ایک مقتول کے کپڑے سے صاف کی' پھر اسے مارکوف کو پیش کرنے آگے بڑھا۔

میں تلوار لیے مارکوف کے قریب پہنچا تو وہ بولا۔ "یہ تلوار دوستی کی یادگار کے طور پر تم اپنے پاس ہی رکھو! ویسے بھی تمہیں آج رات اس کی ضرورت پڑے گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے تلوار کی نیام بھی اپنے کمر سے کھول لی اور میری طرف بڑھا دی۔

نیام لے کر میں احتراماً" اس کے سامنے جھکا' پھر تلوار اس میں ڈال کر کمر سے باندھ لی۔

"چلو میرے ساتھ! میں تمہیں دو انگوٹھی بھی دے دوں!" مارکوف نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں' مارکوف اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

مارکوف مجھے اپنے غار میں لے آیا اور پھر اس نے مجھے دو ایک سی انگوٹھیاں دے کر کہا۔ "بتاؤ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟"

میں نے اس سے وہ دونوں انگوٹھیاں لے لیں اور ان کا گہری نظر سے جائزہ لینے لگا۔ بظاہر وہ بالکل یکساں نظر آ رہی تھیں مگر کوئی نہ کوئی فرق ضرور تھا ورنہ مارکوف مجھ سے فرق بتانے کے لیے نہ کہتا۔ میں نے انگوٹھیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ میں کسی ایسے نشان یا علامت کی تلاش میں تھا جو ان انگوٹھیوں میں فرق ظاہر کر سکے۔ دونوں انگوٹھیوں میں سرخ یاقوت لگے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کوشش کے بعد ہی میں کامیاب ہو گیا۔

ایک انگوٹھی کے نچلے حصے میں سانپ کا پھن بنا ہوا

تھا۔ یہ حصہ انگوٹھی پہننے کے بعد چھپ جاتا۔ میں نے وہ انگوٹھی مارکوف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ شناخت کی انگوٹھی ہے کیونکہ۔"

"تم واقعی ذہین ہو بوغا!" اس نے انگوٹھی لے کر دیکھتے ہوئے کہا' پھر بولا۔ "لو اس انگوٹھی کو اپنی کسی انگلی میں ڈال لو! غالباً" اب تمہیں مطمئن ہو جانا چاہیے!"

"ہاں شناخت کا یہ طریقہ بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "جب تک انگوٹھی اتار کر نہ دیکھی جائے کوئی اس پر بنا ہوا نشان نہ دیکھ سکتا۔" یہ کہہ کر میں نے وہ انگوٹھی اپنے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں پہن لی' پھر بولا۔

"اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم شہر کیف کے قلعے پر کب حملہ کرنا چاہتے ہو اور اس سلسلے میں مجھ سے کیا مدد چاہتے ہو؟"

"اس سلسلے میں بھی میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔" مارکوف نے جواب دیا۔ "اس کی وجہ کچھ اور نہیں بلکہ یہ ہے کہ میں نے ابھی خود کچھ نہیں سوچا۔ میں کچھ سوچ کر' کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے مشورہ کروں گا۔ اس کے بعد جو طے پائے گا' اس پر عمل کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں تم سے جو کام لیا جائے گا' اس سے تمہیں قلعے ہی میں آگاہ کر دیا جائے گا۔"

"لیکن تم بہرحال یہ خیال رکھنا کہ وہ کام میری دسترس سے باہر نہ ہو تاکہ تمہیں مایوسی نہ ہو اور تم میری طرف سے بدظن بھی نہ ہو سکو۔" میں نے احتیاط کے پیش نظر کہا۔

"تمہاری پوری داستان سن کر اور کل سے اب تک تمہارے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد میں نے تمہاری صلاحیتوں کا پورا اندازہ لگا لیا ہے کہ تم کیا کر سکتے ہو اور کیا نہیں!" وہ مسکرا کر بولا۔ "تمہیں اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

کچھ دیر مزید گفت و شنید کے بعد مارکوف نے مجھے رخصت کر دیا۔ میں اپنے غار میں پہنچ کر مستقبل کے اندیشوں میں کھو گیا۔ نہ جانے مارکوف مجھ سے کیا کام لینے والا تھا اور وہ کام میرے بس میں ہو گا بھی یا نہیں؟ انہی سوچوں میں دوپہر ہو گئی اور اختی کھانا لے کر آ گئی۔

اختی کھانا رکھ کر میرے قریب بیٹھی تو میں نے اسے مدھم لہجے میں مخاطب کیا۔ "اختی! تو نے مجھ سے کل رات جو کچھ کہا تھا' اس پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہاں سے تیرا اور میرا فرار ہونا اتنا مشکل نہیں ہے۔"

وہ میری بات سن کر ایک دم کھل اٹھی۔ "وہ کیسے؟" اس نے کہا۔

"وہ ایسے کہ ہم ان غاروں سے تو بہرحال بخیریت نکل ہی جائیں گے' پھر اگر درے پر واقعی پہرہ ہوا تو پہرداروں سے نمٹا جا سکتا ہے ویسے مجھے یقین ہے کہ وہاں پہرہ نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔

"تو اکیلا ہو گا اور پہرداروں کی تعداد کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر وہ تعداد میں زیادہ ہوئے تو پھر تو اکیلا کیا کرے گا؟ ویسے تھوڑی بہت تلوار چلانی تو مجھے بھی آتی ہے جو میں نے اپنے بھائی سے سیکھی تھی مگر تلواریں کہاں سے آئیں گی؟" اختی فکرمند لہجے میں بولی۔

"تو اس کی فکر نہ کر! یہ دیکھ!" یہ کہہ کر میں نے اپنے بستر کا سرہانہ اٹھایا جہاں مارکوف کی دی ہوئی تلوار رکھی تھی۔

"تلوار!" وہ حیرت سے بولی۔ "یہ تیرے پاس کہاں سے آئی؟"

"آہستہ بول! کہیں کوئی سن نہ لے!" میں نے سرگوشی کی۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی اور پھر اسی وقت اس کی نگاہیں میرے بائیں ہاتھ میں موجود انگوٹھی پر پڑی۔ اس نے کہا۔ "کل تو شاید تیرے پاس یہ انگوٹھی نہیں تھی؟" اس کے لہجے میں شک سا تھا۔

"تو تو پاگل ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ارے کل میں نے اسے اس لیے چھپا دیا تھا کہ کہیں کوئی دیکھ کر چھین نہ لے۔ یہ انگوٹھی پہلے سے میرے پاس تھی۔"

"ہاں تو نے یہ نہیں بتایا کہ تیرے پاس تلوار کہاں

سے آگئی؟ یہاں تو کسی منگول قیدی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں چھوڑا جاتا۔ کیا انہوں نے تیری تلوار نہیں چھینی تھی؟" اختی نے پھر اپنا پہلا سوال دہرایا۔

اختی کے سوال کا میرے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا اس لیے میں اس کی غیر ضروری پوچھ گچھ پر کچھ جھنجلا سا گیا اور بولا۔ "تو فضول باتیں بہت کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں نے کسی نہ کسی طرح یہ تلوار چھپالی ہوگی۔ اس لیے میرے پاس ہے۔ اب مطلب کی بات کر اور فضول کرید بن چھوڑ! یہ بتا کہ تو میرے ساتھ آج رات کو فرار ہونے پر آمادہ ہے یا نہیں؟"

"سچی بات اگر پوچھتا ہے تو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"کل تو تو اتنی نہیں ڈر رہی تھی۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"کل میرے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ درے پر بھی پہرہ ہو سکتا ہے۔"

"تو کیا ہوا! میں جو تیرے ساتھ ہوں۔ کیا تجھے مجھ پر بھروسہ نہیں؟"

"تجھ پر نہیں تو اور کس پر بھروسہ کروں گی!" اس نے یہ کہہ کر محبت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھا۔

"تو پھر اپنے ذہن سے ہر خوف کو نکال کر آج رات میرے ساتھ بھاگ چل!"

کچھ دیر سمجھانے بجھانے کے بعد وہ راضی تو ہو گئی مگر اس کا خوف دور نہیں ہو سکا۔ میں نے کھانا کھالیا تو وہ برتن لے کر چلی گئی۔

پہلے مجھے شہر کیف کے بارے میں یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ وہاں صرف قدیم باشندے ہی رہتے تھے مگر اختی کی داستان سن کر اور شہر کے بارے میں اس سے تفصیلی باتیں کرنے کے بعد مجھے پتا چلا تھا کہ اب وہاں منگولوں نے اپنے ہم قوموں کو بھی بسانا شروع کر دیا تھا۔ شہر میں اکثریت قدیم باشندوں ہی کی تھی لیکن ان کے درمیان وہ منگول بھی تھے جو کسی نہ کسی طرح قلعے سے وابستہ تھے۔ اختی کا باپ سپاہی نہیں خادم تھا اور اس کا بھائی بھی قلعے کے ملازمین میں سے تھا مگر ان دونوں کے کاموں کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ شہر میں رہائش رکھ سکتے تھے حالانکہ وہ قلعے ہی میں رہتے تو انہیں زیادہ سہولت رہتی لیکن انہیں شہر میں رکھنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ اس طرح ایک تو ان لوگوں کے ذریعے قدیم باشندوں کی حرکات پر نظر رکھی جا سکتی تھی، دوسرے یہ کہ قدیم باشندے منظم ہو کر کوئی سازش نہیں کر سکتے تھے۔

رات ہونے سے قبل ایک بار پھر مجھے مارکوف نے بلوایا اور بتایا کہ میرے فرار کے لیے تمام راہیں ہموار کر دی گئی ہیں۔

اس وقت مجھے ایک خیال اور آیا۔ ان پہاڑیوں سے قلعے تک کا راستہ کافی طویل تھا۔ پیدل سفر کرنے کی صورت میں وہ کافی دشوار گزار ثابت ہوتا۔ یہ سوچ کر میں نے کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی طرح ایک گھوڑے کا بندوبست ہو جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اب تک مجھے یہاں غاروں کے درمیان ایک گھوڑا بھی نظر نہیں آیا۔"

میری بات سن کر مارکوف کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، پھر وہ بولا۔ "تمام گھوڑوں کو پہاڑیوں ہی کے درمیان ایک خفیہ جگہ رکھا جاتا ہے تاکہ باسانی کسی کی ان تک دسترس نہ ہو سکے۔ کیونکہ ہمارے درمیان ہر وقت منگول قیدی رہتے ہیں اس لیے ہمیں محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ویسے تم نے جس خواہش کا اظہار کیا ہے، اس کے بارے میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔ تمہیں واقعی بغیر گھوڑے کے سفر میں دشواری ہوگی۔ درے پر تمہارا ٹکراؤ جن دو پہریداروں سے ہوگا، وہ گھوڑوں پر ہی ہوں گے۔ عام حالت میں وہاں تقریباً" بارہ پہریدار ہوتے ہیں اور ان کے پاس گھوڑے نہیں ہوتے لیکن آج رات ایسا نہیں ہوگا۔ پہریداروں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ کچھ دیر مقابلہ کر کے فرار ہو جائیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ فرار ہونے سے قبل تم از کم ایک گھوڑا وہاں تمہارے لیے چھوڑ جائیں۔ اب یہ تمہاری ذہانت پر منحصر ہے کہ لڑتے ہوئے اس بات کا خیال رکھو کہ پہریداروں میں سے کوئی نہ ہو اور تمہیں

بھی کوئی زخم نہ آئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ منگول لڑکی کو کسی طرح کا شک نہ ہو۔"

"میں ان تمام باتوں کا پورا پورا خیال رکھنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا اور گھوڑا فراہم کرنے پر اس کے سامنے شکر گزاری کا اظہار کیا۔

رخصت ہونے سے قبل مارکوف نے مجھے گلے لگایا۔ اس نے گلے ملتے ہوئے گرمجوشی کا اظہار کیا تھا اور میں نے بھی جواباً" گرمجوشی ظاہر کی تھی۔ منگول دشمنی میرے اور اس کے درمیان قدر مشترک بن گئی تھی اس لیے ہماری دوستی مضبوط ہو گئی تھی۔

رات کو اختی کھانا لے کر آئی تو اس کے چہرے سے خوف اور گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے کھانا رکھ کر میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آج رات مجھے نہ جانے کیوں بہت ڈر لگ رہا ہے! ایسا کیوں نہ کریں کہ ہم آج رات کی بجائے کل فرار ہوں؟"

مجھے اس کی بزدلی اور بچپن پر غصہ آ گیا اور سخت لہجے میں بولا۔

"اختی! اگر تو ڈرتی ہے تو ہرگز میرے ساتھ نہ چل! میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا اور ہمیشہ یہ بات یاد رکھوں گا کہ کسی منگول لڑکی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ بزدل ہوتی ہے۔"

"بوغا! ایسی دل دکھانے والی باتیں نہ کر!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں کہہ تو رہی ہوں کہ کل رات تیرے ساتھ چلوں گی۔ تو یقین کیوں نہیں کرتا میری بات پر!"

"اس لیے کہ تو کل بھی اسی بزدلی کا ثبوت دے گی۔" میں تیز لہجے میں بولا۔

"اگر تو ایسا ہی سمجھ رہا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں آج رات ہی تیرے ساتھ چلوں گی' چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو!" اس کے لہجے سے غصے کا اظہار ہونے لگا۔ "تو مجھے بار بار بزدل کہہ رہا ہے۔ اگر میں بزدل ہوتی تو تجھے فرار کا مشورہ کیوں دیتی!"

لوہا گرم تھا اس لیے میں نے وہ موقع ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً" اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا کھانا بھی نہیں کھائے گا؟" وہ حیرت سے بولی۔

"نہیں!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ "میں اب وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آزادی بہرحال اس کھانے سے زیادہ قیمتی ہے۔"

"پہلے مجھے دیکھ تو آنے دے کہ راستہ صاف بھی ہے یا نہیں!"

اس نے کہا "کبھی کبھار رات کے وقت بھی اکا دکا سپاہی ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے جاتے ہیں۔"

میں جانتا تھا کہ کم از کم اس رات راستہ بالکل صاف تھا لیکن یہ بات اختی سے نہیں کہی جا سکتی تھی۔ مجبوراً" مجھے اختی کو غار سے باہر جا کر جائزہ لینے کی اجازت دینی پڑی۔

اختی کو گئے یا تو واقعی دیر ہو گئی تھی یا مجھے ہی ایک ایک لمحہ رینگتا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے اب بے چینی سی ہونے لگی تھی۔ میں اسی بے چینی کے عالم میں ٹہلتا ہوا غار کے دہانے تک پہنچ گیا اور اسی وقت میری سماعت سے پے در پے کئی چیخیں ٹکرائیں۔ اس کے بعد شور سا سنائی دیا پھر میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ ابھی میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا کہ غار سے نکل کر حقیقت حال معلوم کروں یا نہیں کہ معاً" ایک نسوانی چیخ گونجی۔ میں بغیر کچھ سوچے سمجھے غار سے باہر دوڑا کیونکہ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ نسوانی چیخ اختی کی ہو۔

میں غار سے کچھ دور ہی گیا تھا کہ میں نے اختی کو زخمی حالت میں زمین پر پڑا ہوا دیکھا۔ میں نے تیزی سے جھک کر اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور اسی وقت کئی مسلح افراد نے مجھے گھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔

"اسے لے کر اپنے غار میں چلو!" ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا' پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ "ان میں سے دو زندہ بچ کر نکل گئے ہیں مگر وہ زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتے۔ ہم انہیں جلد ہی پکڑ لیں گے' چلو!"

"ہوا کیا آخر؟ یہ ہنگامہ کیسا تھا؟" میں نے سوال کیا مگر ابھی میرا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ وہ سب میری بات کا

کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے سیدھے دوڑتے چلے گئے۔

جو کچھ ہوا تھا' خلاف توقع ہی تھا۔ میرے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا تھا لیکن میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہو گا! میں نے اختی کی طرف دیکھا جسے میں نے ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں اسے اٹھائے ہوئے غار کی طرف بڑھ گیا۔

غار میں پہنچ کر میں نے اسے زمین پر لٹا دیا اور یہ دیکھنے لگا کہ اسے کہاں چوٹ آئی تھی! میں نے دیکھا کہ اس کی بائیں پنڈلی پر ایک چھوٹا سا زخم تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ زخم ایسا نہیں تھا کہ وہ بے ہوش ہو جاتی۔ اس کی بے ہوشی کا سبب یقیناً" خوف ہی رہا ہو گا۔

میں نے اختی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اسے جلد ہی ہوش آ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"اختی' اختی! ہوش میں آ!" میں نے اس کا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"وہ' وہ کون تھا جس نے' جس نے اندھیرے میں مجھ پر حملہ کیا تھا؟" وہ خوفزدہ آواز میں بولی' اور پھر اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔

مجھے اس کے زخم کا خیال آ گیا۔ میں نے جلدی سے اس کے لباس سے کپڑا پھاڑا اور پھر پنڈلی کے زخم پر پٹی باندھ دی۔ خون بہنا پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔

پٹی باندھنے کے بعد میں اس سے مخاطب ہوا۔ "ہوا کیا تھا؟"

"میں غار کی طرف لوٹ رہی تھی کہ اچانک سامنے سے دو سائے دوڑتے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک نے مجھ پر حملہ کیا' پھر اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔" اختی نے بتایا اور کراہنے لگی۔

"اس سے پہلے تم نے کچھ شور بھی سنا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں میں وہی شور سن کر تیزی سے غار کی طرف آئی تھی مگر غار تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ دونوں مجھ سے آ ٹکرائے تھے۔" اختی نے جواب دیا' پھر خوفزدہ لہجے میں بولی۔ "کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ انہیں کسی طرح ہمارے فرار کا پتا چل گیا ہو؟"

"نہیں!" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ کچھ تو وہ غیر متوقع حالات اور کچھ اختی کی احمقانہ باتیں' دونوں نے مل کر مجھے سخت بیزار کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ خواہ مخواہ اس لڑکی کو ساتھ لے جانے کے لیے مارکوف سے حامی بھر لی۔ اگر میں تنہا بھی واپس چلا جاتا تو کون مجھ پر شک کرتا!

"کیا تو مجھ سے کچھ ناراض ہے؟" اختی نے غالباً" میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر کہا۔

"نہیں' میں تجھ سے نہیں اپنی قسمت سے ناراض ہوں۔" میں بدستور بیزاری سے بولا۔

ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ مارکوف کا پیغامبر آ گیا۔ اختی کو وہیں اس حال میں چھوڑ کر میں اس کے ساتھ چل دیا۔ میں جب اس کے پاس سے جا رہا تھا تو اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ غالباً" یہی سمجھ رہی تھی کہ مارکوف نے مجھے سزا دینے ہی کے لیے بلایا ہے۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کانپے تھے مگر میں اس کی طرف توجہ دیے بغیر آگے بڑھ گیا تھا۔

میں مارکوف کے غار میں پہنچا تو اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے بوغا کہ اب تم کل رات یہاں سے جاؤ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ وہ منگول لڑکی زخمی ہو گئی ہے۔"

"یہ ضروری تو نہیں کہ وہ کل تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے!" میں بولا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں اس لڑکی کو ساتھ نہ بھی لے جاؤں تو کوئی مجھ پر شک نہیں کرے گا۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔"

"یہ کمبخت منگول قیدیوں کو بھی آج رات ہی ہنگامہ کھڑا کر کے اپنی موت کو دعوت دینی تھی!" مارکوف غصے کے عالم میں بڑبڑایا۔

میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ ایک غار میں موجود تقریباً" ڈیڑھ درجن قیدی بیک وقت غار سے نکل کر نصف درجن پہریداروں پر ٹوٹ پڑے

تھے۔ قیدیوں میں سے نصف درجن تو موقع ہی پر ہلاک ہو گئے تھے اور پانچ شدید زخمی ہو کر گر پڑے تھے۔ بقیہ کو پکڑ لیا گیا تھا۔ ان میں سے دو غاروں کے باہر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر انہیں بھی گرفتار کیا جا چکا ہے۔

مارکوف نے جو بتایا تھا' وہی میں نے بھی سوچا تھا کہ وہ ہنگامہ منگول قیدیوں نے برپا کیا ہو گا۔

"پھر اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" مارکوف نے مجھ سے دریافت کیا۔

"اب کسی ظاہر داری کی ضرورت نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم میرے لیے گھوڑے کا بندوبست کر دو' میں آج ہی رات یہاں سے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔"

مارکوف نے میری بات مان لی اور پھر سب کچھ بہت آسانی سے ہو گیا۔ میں دوبارہ اس غار میں بھی نہیں گیا جہاں اختی زخمی حالت میں پڑی ہوئی تھی بلکہ روانہ ہونے تک مارکوف ہی کے غار میں رہا۔ مارکوف نے میرے لیے گھوڑے کا بندوبست کر دیا تھا اور اس کا ایک نائب مجھے اس درے تک چھوڑنے آیا تھا جہاں پہرہ رہتا تھا۔ مارکوف کے نائب نے پہرداروں کو بتا دیا تھا کہ اب منصوبہ بدل چکا ہے۔ مجھے فضول کی مار دھاڑ بھی نہیں کرنا پڑی اور میں مارکوف کے نائب سے رخصت ہو کر درے سے بحفاظت نکل گیا۔

راستے زیادہ پر پیچ نہیں تھے اور مجھے کچھ یاد بھی تھے اس لیے پہاڑوں سے نکل کر اس راہ تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی جو سیدھی شہر کی طرف جاتی تھی۔

میں جس وقت شہر میں داخل ہوا تو مجھے بظاہر ہر طرف سناٹا معلوم ہوا لیکن ابھی کچھ دور ہی چلا ہوں گا کہ میری سماعت سے ایک بھاری آواز ٹکرائی۔ کسی نے مجھے سخت لہجے میں رکنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔

چند لمحے بعد ہی مجھے مشعل بردار سپاہیوں کے ایک دستے نے گھیرے میں لے لیا۔

"تم کون ہو اور اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟" غالباً" اس دستے کا سردار تھا جس نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔ اس کے چہرے سے کرختگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"میں بطریق بوغا ہوں۔" میں نے بلا جھجک جواب دیا۔ "تم نے شاید میرا نام سنا ہو۔ میں وہی ہوں جو گزشتہ دن باغی مارکوف کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا تھا۔"

دستے کا سردار میری بات سن کر چونکا' پھر بولا۔ "مگر تمہارے ساتھ تو سپاہی بھی تھے وہ کیا ہوئے؟"

"میرا خیال ہے کہ میں تمہارے سامنے جواب د[illegible] نہیں ہوں۔" میرے لہجے میں چبھن تھی۔ "تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ مجھے قلعے کی طرف جانے دو اور میرا راستہ نہ روکو۔"

"مگر تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم نے خود کو جو ظاہر کیا ہے' وہی ہو۔ میں نے بطریق بوغا کو کبھی خود نہیں دیکھا اس لئے مجھے حق پہنچتا ہے کہ تم سے ثبوت طلب کروں۔" دستے کا سردار چڑ کر بولا۔

"اگر تمہیں مجھ پر شک ہے اور میری بات کا یقین نہیں تو مجھے گرفتار کر لو!" میں نے پر سکون لہجے میں کہا۔

وہ میری بات سن کر کچھ سٹپٹا گیا اور شرمندگی دور کرنے کے لیے بولا۔

"میں خود تمہارے ساتھ قلعے تک چلوں گا اور تصدیق کروں گا کہ تم بطریق بوغا ہی ہو' کوئی اور نہیں!"

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں' تم ساتھ چل سکتے ہو۔"

وہ اپنے بقیہ ساتھیوں کو وہیں رکنے کا اشارہ کر کے میرے ساتھ ہو لیا۔ میں' سپاہیوں کے اس دستے کی وہاں موجودگی کا سبب اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ شہر کی دوسری سمتوں میں بھی سخت پہرہ ہو گا۔ وہ مارکوف کے حملوں کا خوف ہی تھا جو منگولوں کو یوں چوکنا اور بیدار رکھتا تھا۔ توقع کے [illegible] رات میں بھی کئی جگہ مزید سپاہیوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔

کیونکہ میں شہر کیف میں نووارد تھا اس لیے قلعے کے محافظ بھی میری صورت سے آشنا نہیں تھے۔ رات کے اس پہر میں کسی کے لیے قلعے کا پھاٹک کھلنا آسان بات نہیں تھی۔ سوائے منگول سرداروں کو کسی کے لیے یہ اجازت نہیں تھی کہ پھاٹک بند ہو جانے کے بعد قلعے میں داخل ہو سکے یا قلعے سے باہر جا سکے۔ مجھے قبل از وقت اس قدر دشواریوں کا احساس نہ تھا ورنہ میں فرار ہونے کے لیے رات کے آخری پہر کا انتخاب کرتا اور اس وقت قلعے تک پہنچتا جب پھاٹک کھل چکا ہوتا۔

جب محافظ' پھاٹک کھولنے پر آمادہ نہ ہوئے تو مجبوراً" مجھے ابو نصار کا نام لینا ہی پڑا مگر صرف اس کا نام لینے سے بات نہیں بنی۔ ابو نصار کو خود پھاٹک تک آنا پڑا۔

ابو نصار حسب توقع مجھے دیکھ کر سخت حیران ہوا تھا۔ شہر میں متعین پہریداروں کا سردار' پھاٹک ہی سے رخصت ہو گیا مگر رخصت ہونے سے قبل اس نے مجھ سے معذرت ضرور کی تھی۔ ابو نصار کی حیثیت معمولی نہیں تھی اور اس نے مجھے شناخت کیا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ میں بھی کوئی کم رتبہ شخص نہیں تھا۔ میں پھاٹک سے ابو نصار کے ساتھ قلعے کی اندرونی سمت بڑھ گیا تھا۔

"اے ابو نصار! میں تجھ سے شرمندہ ہوں کہ میں نے رات کے اس پہر تجھے تکلیف دی۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تھا۔ "اگر محافظ مجھے قلعے میں داخل ہونے دیتے تو میں کبھی تجھے زحمت نہ دیتا۔"

"تکلیف یا زحمت کی کوئی بات نہیں بوغا!" ابو نصار نرمی سے بولا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اس کے سوا تیرے پاس کوئی اور راہ نہیں تھی۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

میں متوقع تھا کہ ابو نصار مجھ پر سوالوں کی بوچھار کر دے گا مگر مجھے اس وقت یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ اس نے نہ تو پھاٹک سے رہائشی حصے تک پہنچتے ہوئے کوئی سوال کیا اور نہ اس وقت کچھ پوچھا جب وہ اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ یہ محسوس کر کے مجھے نہ جانے کیوں اضطراب سا ہونے لگا۔

میرے اضطراب کو غالباً" ابو نصار نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ اپنے کمرے کے دروازے پر رکنے کے بعد بڑے عجیب سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "میں دیکھ رہا ہوں بوغا کہ تو مجھ سے کچھ کہنے کے لیے بے چین ہے مگر میرا مشورہ ہے کہ اس وقت تو سو جا کیونکہ تھکا ہو گا۔ یوں بھی تجھے تنہا دیکھ کر کچھ باتیں میں سمجھ چکا ہوں اور کچھ کا قیاس کر چکا ہوں اس لیے مجھے کوئی تجسس نہیں۔ رہیں تفصیلات تو وہ صبح بھی معلوم کی جا سکتی ہیں۔ جا اب آرام کر!"

ابو نصار کی شخصیت میرے لیے روز اول ہی سے عجیب اور پر اسرار سی رہی تھی۔ وہ عام لوگوں سے مختلف تھا۔ اکثر باتیں وہ بغیر کہے ہی سمجھ لیتا تھا اس لیے بعض اوقات مجھے اس سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس وقت بھی ابو نصار کا رویہ عام لوگوں سے مختلف تھا۔

میرا کمرہ ابو نصار کے برابر ہی تھا۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں کھانا کھا کر نہیں چلا تھا اس لیے مجھے کچھ بھوک سی محسوس ہو رہی تھی لیکن میں نے سونے کو ترجیح دی اور کچھ دیر کوشش کے بعد مجھے نیند آ ہی گئی۔

صبح مجھے بیدار کرنے والا ابو نصار ہی تھا اس نے مجھے دن چڑھے ہی جگایا تھا تاکہ میری نیند پوری ہو سکے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا تو وہ بولا۔ "برقائی خان کو تیری آمد سے مطلع کر دیا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اپنی داستان اسی کے سامنے بیان کرے تاکہ تجھے بار بار واقعات نہ دہرانے پڑیں۔ میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا اور وہیں تیری باتیں سنوں گا۔ جلدی سے کچھ کھا پی لے! میں نے خادموں سے کہہ دیا ہے' وہ تیرے لیے دودھ اور گوشت لا رہے ہوں گے۔ رات مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ تو بھوکا بھی ہو سکتا ہے ورنہ میرے کمرے میں کچھ سوکھا ہوا گوشت موجود تھا۔ کیونکہ برقائی خان آج ہی سرائے باتو کے لیے روانہ ہونے والا

ہے اس لیے تیرا اس سے اول وقت ہی مل لینا مناسب ہے ورنہ وہ سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو جائے گا۔"

"سرائے باتو؟" میں نے حیرت سے "وہ وہاں کیوں جا رہا ہے؟ کیا اسے باتو خان نے بلایا ہے؟"

"ہاں!" ابو نصار نے جواب دیا۔ "باتو خان بیمار ہو گیا ہے۔ کل شام ہی اس کا ایک قاصد یہ خبر لے کر آیا تھا۔ باتو خان نے برقائی خان کو فوراً بلایا ہے۔"

ابو نصار میرے بستر پر بیٹھ گیا اور میں ہاتھ منہ دھونے اٹھ گیا۔ جب میں دوبارہ کمرے میں آیا تو ایک خادم طشت میں گوشت اور دودھ کا بھرا ہوا برتن رکھ کر وہاں سے جا رہا تھا۔

شکم سیر ہونے کے بعد میں، ابو نصار کے ساتھ برقائی خان سے ملنے چل دیا۔

برقائی خان اس وقت تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ تین منگول سردار اور بھی بیٹھے تھے جن میں سے دو کو میں نے پہچان لیا کیونکہ پہلے ان سے مل چکا تھا یہ وہی تھے جن سے مجھے ابو نصار نے ملایا تھا اور میں نے ان سے مارکوف کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کی تھیں۔

میں نے اور ابو نصار نے باری باری برقائی خان کو تعظیم دی اور اشارہ پا کر قریب ہی بیٹھ گئے۔ مجھے دیکھ کر غالباً" برقائی خان کے چہرے پر اس لیے حیرت نہیں تھی کہ اسے میری آمد سے پہلے ہی مطلع کیا جا چکا تھا۔

"میں تیرے تنہا لوٹنے کا سبب جاننا چاہتا ہوں، بوغا!" برقائی خان نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"اے بگھاتر بھائی کے بگھاتر بھائی! میں تنہا لوٹنے پر سخت نادم ہوں اور اس پر بھی کہ اپنے ہمراہ جن بگھاتروں کو لے گیا تھا انہیں ساتھ نہ لا سکا۔ اس کے علاوہ میں اس پر بھی شرمندہ ہوں کہ باغی مارکوف کا سر تیرے حضور پیش نہ کر سکا۔" میں نے انتہائی عاجزی سے کہا۔

"میں سننا چاہتا ہوں کہ تجھ پر کیا بیتی؟ اور تیرے ساتھ جو سپاہی گئے تھے وہ کیا ہوئے؟" برقائی خان نے وہ سوال کیا جس کا میں منتظر تھا۔

میں نے ابتدا سے اسے سب کچھ بتا دیا مگر صرف وہیں تک صحیح صحیح بتایا جہاں تک بتانا چاہیے تھا۔ میں نے آخر میں پرجوش لہجے کے ساتھ کہا۔ "تیرا خادم فیصلہ کر چکا تھا کہ جب تک اس کی ترکش میں آخری تیر باقی ہے اور جب تک اس کے پاس ہتھیار ہیں، وہ لڑتا رہے گا۔ یہی ہوا بھی! تیرے خادم کو جب اس باغی نے گھیرے میں لیا تو اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ تیرے خادم کے ساتھ سینکڑوں دشمنوں کے مقابل صرف نصف درجن سپاہی بچے تھے مگر اس نے آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر بزدل دشمن اسے اپنے نرغے میں نہ لیتا اور گرفتار نہ کر لیتا تو تیرا خادم آخری دم تک ہی لڑتا رہتا۔" یہ کہہ کر میں نے چند لمحے توقف کیا، پھر دوبارہ بولنے لگا۔ "مجھے الگ غار میں قید کیا گیا تھا اور اس غار کے دہانے پر تقریباً" نصف درجن مسلح پہریدار موجود تھے۔ اس غار میں قید کیے جانے سے پہلے میرے تمام ہتھیار چھین لیے گئے تھے۔ رات ہوئی تو ہر طرف سناٹا چھا گیا لیکن ابھی رات زیادہ نہیں گزری تھی کہ میں نے ہنگامے کی آوازیں سنیں۔ میں دبے پاؤں غار کے دہانے تک پہنچا اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ کچھ منگول قیدی کسی غار سے نکل کر پہریداروں پر حملہ آور ہو گئے ہیں۔ وہ ہنگامہ انہی کا کھڑا کیا ہوا تھا۔ یہ باتیں مجھے غار کے دہانے پر موجود مسلح پہریداروں کی گفتگو سے معلوم ہوئی تھیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو ان کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ اب وہاں صرف دو پہریدار تھے۔ میں نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور ان پر ٹوٹ پڑا۔ میرا حملہ اچانک اور غیر متوقع تھا اس لیے وہ نہ سنبھل پائے۔ میں نے ان میں سے ایک کی تلوار چھین لی تھی، پھر وہ دونوں ہی میرے ہاتھوں مارے گئے۔" یہ کہہ کر میں پھر رکا اور ردعمل جاننے کے لیے چور نگاہ سے برقائی خان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

برقائی خان کے چہرے سے تجسس اور دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں چپ ہوا تو برقائی خان فوراً" ہی بول اٹھا۔ "چپ نہ ہو اور کہتا رہ!"

میں نے پھر جھوٹ گھڑنا شروع کر دیا۔ "ہنگامے ہی کے سبب میرے ہاتھوں قتل ہونے والے پہریداروں کی آخری چیخوں پر کسی نے شاید دھیان نہیں دیا اور میں غاروں سے نکل کر اس میدان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جسے چاروں طرف سے پہاڑیوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اس گھرے ہوئے میدان سے نکلنے کے صرف دو ہی راستے تھے۔ میدان کی مخالف سمتوں میں دو درے تھے جن میں سے میں نے ایک کا رخ کیا۔ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر میں درے تک پہنچ گیا۔ درے پر دو گھڑسوار مسلح پہریدار موجود تھے جن کے سائے مجھے قریب پہنچ کر واضح نظر آنے لگے تھے۔ میں نے انہیں اپنی طرف سے غافل پا کر حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک میرے ہاتھوں مارا گیا اور دوسرا زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ میں نے مرنے والے کے گھوڑے پر قبضہ کر لیا اور پھر تیزی کے ساتھ وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے شہر تک پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی کیونکہ میرے پاس باری موجود تھی۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

"بوغا! تو یقیناً" بگھاتر اور قسمت والا ہے۔" میرے خاموش ہوتے ہی برقائی خان بولا۔ "تیرے سوا آج تک کوئی منگول سپاہی یا کوئی سردار اس باغی کی قید سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"بوغا کی کامیابی کا بڑا سبب منگول قیدیوں کا ہنگامہ ہے اے عظیم برقائی!" ایک منگول سردار نے خیال آرائی کی۔ غالباً" اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ برقائی خان میری تعریف کرے وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ منگول سپاہی ہنگامہ نہ کرتے تو شاید بوغا کو فرار ہونے کا موقع نہ ملتا۔"

برقائی خان نے پلٹ کر اس منگول سردار کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا' پھر سخت لہجے میں کہا۔ "حسد نہ کر! سنا ہے جو دوسرے کی بگھاتری کو بھی کھلے دل سے تسلیم کر لے۔"

برقائی کی ڈانٹ کھا کر وہ منگول سردار شرمندہ سا ہو گیا اور اپنی خجالت مٹانے کے لیے بولا۔ "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا مجھے مجھے بوغا کی بگھاتری کا اعتراف۔"

"خاموش بیٹھ!" برقائی خان نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے پھر ڈانٹ دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بوغا! وہ سپاہی جو مارے گئے' میرے خیال سے ان کی قربانی بیکار نہیں گئی کیونکہ تو دشمن کے ٹھکانے سے آگاہ ہو گیا اور یہ بھی ایک بڑی کامیابی ہے۔ اب اس پر پوری قوت سے ضرب لگائی جا سکتی ہے۔" یہ کہہ کر برقائی خان تائید طلب انداز میں ابو نصار کی طرف دیکھنے لگا۔

میں' برقائی خاں کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔ یہ بات پہلے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی تھی کہ صورت حال یوں اچانک بدل جائے گی۔

"تیرا خیال ٹھیک ہے۔" ابو نصار نے تائید میں کہا' پھر بولا۔ "میں نے بوغا کا بیان سن کر ایک اور بات کا اندازہ لگایا ہے۔ ممکن ہے وہ بات درست ہی ہو۔" یہ کہہ کر شاید ابو نصار کچھ سوچنے لگا۔

"میں توجہ سے تیری بات سن رہا ہوں' بیان کر!" برقائی خان' ابو نصار کے چپ ہوتے ہی بولا۔

"بوغا نے بتایا ہے کہ جب یہ ایک ایسے میدان میں پہنچا جو پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا تو دشمن نے اسے نرغے میں لے لیا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ دشمن اس کی آمد کا پہلے ہی سے منتظر تھا۔" ابو نصار نے کہا۔

"ہاں اب تو کہہ رہا ہے تو مجھے بھی یہ خیال ہو رہا ہے۔" برقائی خان نے ابو نصار کی بات سے اتفاق کیا۔ "مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟"

گفتگو کا رخ جس طرف جا رہا تھا' اس کے بارے میں سوچ کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"کیا قلعے میں موجود مقامی عورتیں' مارکوف کے لیے جاسوسی نہیں کر سکتیں!" ابو نصار نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ممکن ہے۔"

"لیکن اے ابو نصار' یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مارکوف کے آدمی ہر وقت چوکنا و مستعد رہتے ہوں اور پہاڑوں کی طرف آنے والوں کے بارے میں مارکوف

کو فوراً" پتا چل جاتا ہو! کیا ایسا ممکن نہیں؟" میں نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے' ان کی توجہ اصل معاملے سے ہٹانا چاہی۔

"ممکن ہے تو ہی ٹھیک کہتا ہو بوغا لیکن آئندہ کے لیے احتیاط برتنا بہت ضروری ہے۔" ابو نصار نے میری بات کا جواب دیا۔

"اے ابو نصار! تو درست کہتا ہے۔ دور اندیشی کا تقاضا یہی ہے۔" برقائی خان نے کہا' پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ آج ہی دشمن پر کاری ضرب لگائی جائے' اس پر بھرپور حملہ ہو' پوری قوت کے ساتھ!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے برقائی خاں کا لہجہ پرجوش ہو گیا۔

وہاں موجود منگول سرداروں نے بھی برقائی خان کے خیال سے اتفاق کیا' پھر ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہم اپنے ساتھ اتنی تعداد میں سپاہی لے جائیں گے کہ اس پورے علاقے کو آسانی سے گھیرے میں لے لیں جہاں دشمن کا ٹھکانہ ہے۔"

"قطعی!" برقائی نے کہا۔ "حملہ پوری قوت سے ہونا چاہیے۔ میں اسے بار بوغا کو کم سپاہی لے کر جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اس مہم کا آغاز آج ہی ہونا چاہیے۔"

"مجھے عظیم برقائی کے حکم سے پورا اتفاق ہے لیکن میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ دشمن کو کم عقل نہ سمجھا جائے۔ دشمن آج تک اسی وجہ سے ہمارے قبضے میں نہیں آسکا کہ وہ بہت چوکنا اور محتاط ہے۔" میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"بوغا! تو جو کچھ کہنا چاہتا ہے' صاف صاف کہہ!" برقائی خان نے کہا۔

"اے عظیم برقائی! میں دشمن کو اتنا کم عقل نہیں سمجھتا کہ میرے فرار کے بعد بھی وہ اسی جگہ ٹکا رہے۔ کیا اسے یہ خطرہ نہیں ہو گا کہ میں اس پر دوبارہ بھی حملہ کر سکتا ہوں!"

میری بات میں وزن تھا اس لیے برقائی خان کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اب اس کے چہرے سے پہلے جیسے جوش کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ جب وہ بولا تو اس آواز میں بھی پہلے جیسی تیزی نہیں تھی۔

"میرا خیال ہے کہ دشمن کو اس قدر جلد حملے توقع ہرگز نہیں ہو گی۔"

برقائی نے کہا "یہ سوچ کر دشمن پر حملہ نہ کیا جا وہ اپنا ٹھکانہ بدل چکا ہو گا' ایک امکان کو نظرانداز ہے۔ کیا خبر اس کے ذہن میں یہ بات نہ آئی ہو اور آئی بھی ہو تو وہ فوری طور پر عمل نہ کر سکا ہو!"

میرا مقصد تو یہی تھا کہ مارکوف پر حملہ نہ کیا جا اور اگر ایسی صورت پیش ہی آجائے تو کم از کم مارکو اس حملے سے آگاہ ضرور ہو جائے لیکن اب میرے دامن بچانا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ کرنے سے پہلے پوری رازداری نے اور کام بگاڑ تھا۔ ابو نصار نے یقیناً" بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا تھا طے یہ ہوا کہ دوپہر ہوتے ہوتے تمام تیاریاں مکمل کر لی جائیں اور روانگی عمل میں آجائے۔ میرے ان تینوں سرداروں کو بھی جانا تھا جو اس وقت برقائی خان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ وہ کافی تجربے تھے اور بہت سی لڑائیوں میں حصہ لے چکے تھے برقائی خان کو بھی سرائے باتون کے لیے دوپہر تک روانہ ہونا تھا۔ وہ اپنے سامنے ہی ہمیں پہاڑوں طرف روانہ کرنا چاہتا تھا۔

جب میں' ابو نصار کے ہمراہ برقائی خان سے مل لوٹا تو فکرمند تھا۔ میں کسی بھی ایسی مقامی عورت واقف نہیں تھا جو قلعے میں رہ کر مارکوف کے جاسوسی کرتی ہو اس لیے مارکوف کو حملے سے آگاہ ممکن نہیں تھا۔ میرا ذہن اس مسئلے میں الجھا ہوا تھا مجھے کس طرح صورت حال سے نمٹنا چاہیے!

اپنے کمرے میں پہنچ کر کافی دیر سوچ بچار کے میرے ذہن میں صرف ایک ہی تدبیر آسکی۔ اس سوا کچھ اور ممکن نہیں تھا کہ میں اپنے ہمراہ منو سپاہیوں کو غلط راہوں پر بھٹکاتا پھروں کیونکہ کوئی مارکوف کے ٹھکانے سے واقف نہیں تھا۔ ان رہنمائی مجھے ہی کرنی تھی۔

میں دوپہر ہونے سے قبل ہی پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔ روانگی سے قبل مجھ سے ابونصار ملا۔ میں اسے اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو بیٹھو!" ابونصار مجھے ہاتھ کا اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "میں اس لیے آیا تھا کہ تمہیں بتا سکوں، برقائی خان کے ساتھ میں سرائے باتو نہیں جا رہا۔ میں اس کی واپسی تک یہیں رہوں گا۔ اس کے بعد میرا ارادہ کچھ دن کے لیے بغداد جانے کا ہے۔"

"بغداد!" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کیوں، تم بغداد کے ذکر پر کیوں چونک اٹھے؟" ابونصار نے کہا۔

اب بھلا میں اسے کیا بتاتا کہ میری نظر میں بغداد کی کتنی اہمیت تھی! وہ بغداد ہی تو تھا جہاں مجھے اپنے باپ کو تلاش کرنا تھا مگر میں نے اس سے کچھ اور ہی کہا۔ "مجھے بغداد دیکھنے کی بہت آرزو ہے کیونکہ میں نے اس کے بہت قصے سنے ہیں۔" پھر اس ذکر کو ٹالنے کے لیے بولا۔ "اے ابونصار! تو برقائی خان کے ساتھ سرائے باتو کیوں نہیں جا رہا؟"

"اس لیے کہ باتو خاں، مسلمانوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے دونوں بھائیوں کے درمیان کسی طرح کی تلخی ہو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ برقائی خان میرے خلاف کسی سے بھی ایک لفظ سننے کا روادار نہیں ہے۔" ابونصار نے بتایا۔ "میں تجھے اپنے یہاں رکنے کے بارے میں اس لیے بتانے آیا تھا کہ تو کوئی فکر نہ کرے اور اجنبی ماحول سے دل برداشتہ نہ ہو۔"

ابھی ابونصار کی بات ختم ہوئی تھی کہ وہ تینوں منگول سردار آ گئے جو میرے ساتھ جانے والے تھے۔ میں نے اخلاقاً خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔

ان میں سے ایک نے بتایا کہ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں میں اٹھ کھڑا ہوا اور ابونصار سے رخصت کی اجازت لی۔ اس نے مجھے دعا دے کر رخصت کیا۔

کچھ دیر بعد ہی میں، منگول سرداروں کے ہمراہ قلعے کی عمارت سے باہر پہنچ گیا اور سپاہیوں کی کثیر تعداد دیکھ

★ عورت کائنات کی حسین ترین تخلیق

لیکن .....

★ جس بدن کی وجہ سے وہ حسین ترین ہے اگر وہی بدن بدصورت ہو، تو اسے حسین کہلانے کا کوئی حق نہیں!

★ کیا آپ حسین کہلانا چاہتی ہیں؟

اگر "ہاں" _____ تو.....

یوگا اور نسوانی حسن

کا مطالعہ کیجیے

جس میں بدن کو سڈول، پرکشش، جوان اور فٹ رکھنے کے لیے آسان ترین اور چند منٹ روزانہ کی ورزش بمع تصاویر بیان کی گئی ہیں جو مردوں کے لیے بھی یکساں مفید ہیں۔

آج ہی براہ راست طلب کریں یا قریبی بک سٹال سے حاصل کریں۔

قیمت صرف -/25 روپے

-:- منگوانے کا پتہ -:-

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

کر دنگ رہ گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی زبردست جنگ کے لیے روانگی عمل میں آ رہی ہو۔ مارکوف کے ساتھ جو آدمی تھے' وہ ان سپاہیوں کے چوتھائی بھی نہیں تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر اس وقت ان سپاہیوں کی رہنمائی کے لیے میرے بجائے کوئی اور ہوتا تو وہ شاید مارکوف کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوتا۔

میں' منگول سرداروں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوا۔ میرے اور ان سرداروں کے گھوڑے آگے آگے تھے۔ قلعے کے صدر دروازے تک گھوڑوں کی رفتار آہستہ رہی لیکن قلعے کی حدود سے نکلتے ہی رفتار تیز ہو گئی۔

میں نے راستوں کے کنارے' حیرت [illegible] کھڑے ہوئے مقامی باشندوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے اور وہ حیرت زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ واضح طور پر خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔

شہر سے گزر کر میں نے اپنے گھوڑے کا رخ اس راستے کی طرف موڑ دیا جو پہاڑوں کی طرف جاتا تھا۔ منگول سردار اور سپاہی میری تقلید کر رہے تھے۔

میں نے پہاڑی سلسلے میں داخل ہوتے ہی اپنا گھوڑا روک لیا اور اس طرح اردگرد کا جائزہ لینے لگا جیسے راستے کا انتخاب کر رہا ہوں۔ مارکوف کے ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے مجھے سیدھا ہی چلنا چاہیے تھا اس لیے میں نے گھوڑے کو دائیں جانب کچھ فاصلے پر نظر آنے والے درے کی طرف موڑ دیا۔ منگول سردار اور سپاہی میرے پیچھے چل دیے۔

اس درے سے گزر کر میں نے ایک پہاڑی کا چکر کاٹا۔ راستہ دشوار گزار ضرور تھا مگر اسے عبور کیا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پہاڑی کا چکر کاٹنے کے بعد میں ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جو مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی جیسے میں وہاں پہلے بھی آ چکا تھا۔

ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ معاً ایک سپاہی چیخ اٹھا۔ وہ سپاہی میرے گھوڑے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ سپاہی ایک جانب ہاتھ اٹھا کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں نے بھی اس سمت دیکھا اور چونک پڑا۔

ایک درے کے قریب موجود چٹان پر ایک کٹا ہوا سر رکھا تھا۔ منگول سردار بھی اس کٹے ہوئے سر کو دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے جب اپنے گھوڑے اس طرف دوڑائے تو مجھے بھی ہوش آیا اور میں نے بھی اپنا گھوڑا ان کے پیچھے ڈال دیا۔

میں جب وہاں پہنچا تو ایک منگول سردار اپنے گھوڑے سے کود کر اس چٹان پر چڑھ رہا تھا۔

وہ سر ایک منگول سپاہی کا تھا لیکن میرے لیے چکرا دینے والی بات اس کی وہاں موجودگی تھی۔ کٹے ہوئے سر کی حالت سے پتا چل رہا تھا کہ اسے کٹے ہوئے طویل عرصہ نہیں گزرا۔ اس سے خون تو نہیں بہہ رہا تھا مگر اس کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اسے کاٹے ہوئے ایک دن سے زیادہ نہیں ہوا۔

منگول سرداروں کے چہرے طیش کی وجہ سے سرخ ہو گئے تھے۔

"ہم اس بھیڑیے کا سر بھی کاٹ کر اسی طرح قلعے کی دیوار پر سجائیں گے۔" ایک منگول سردار پھنکارا۔

سر کو دیکھ کر سپاہیوں میں بھی جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا اور وہ وحشیانہ نعرے لگانے لگے تھے۔ ایک سردار نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"دشمن یہاں سے زیادہ دور معلوم نہیں ہوتا۔" وہی منگول سردار بولا جس نے ہاتھ اٹھا کر سپاہیوں کو خاموش کیا تھا۔ "ہمیں اس درے کی دوسری طرف نکلنا چاہیے۔"

اب اس جگہ کچھ دیر ٹھہر کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ایک بار پھر صحیح راستے پر آ گیا ہوں اس لیے میں نے فوراً اس منگول سردار کی بات سے اختلاف کیا۔

"نہیں' یہ وہ راستہ نہیں ہے۔" میں بولا۔ "میں غلطی سے ادھر آ گیا ہوں۔"

"لیکن اس سر کی یہاں موجودگی تو یہی ظاہر کرتی ہے کہ دشمن نزدیک ہی کہیں موجود ہے اور ہمیں اس درے کا رخ کرنا چاہیے۔" منگول سردار نے بحث کی۔

"لیکن یہ دشمن کی کوئی چال بھی تو ہو سکتی ہے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "ذرا سوچو کہ دشمن کو کیا پڑی تھی کہ وہ ہمیں صحیح راہ پر لگانے کے لیے یہاں یہ سر رکھتا!"

ہر چند کہ میری بات میں وزن تھا مگر وہ سردار اور دوسرے منگول سردار میری بات سننے پر راضی نہیں تھے۔ دوسرا منگول سردار طیش کے عالم میں بولا۔ "اگر یہ دشمن کی کوئی چال بھی ہے تو ہم اس سے نہیں ڈرتے۔ ہم اس کے ٹکڑے اڑا ڈالیں گے۔"

"یہ نہ بھولو کہ تم لوگوں کو میری ماتحتی میں روانہ کیا گیا ہے اور تمہیں بہرحال میرا کہنا ماننا ہے۔" میں نے بات بگڑتے دیکھ کر سختی سے کہا۔

میری بات سن کر تینوں منگول سرداروں نے میری جانب حقارت بھری نظروں سے دیکھا' پھر وہ سردار چبھتے ہوئے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا جس نے برقائی خان کے سامنے بھی میری مخالفت کی تھی۔ "تمہیں یہاں آئے ابھی دو دن گزرے ہیں اور تم ہم پر اپنی برتری جتا رہے ہو! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عظیم برقائی خان نے کوئی ایسا لفظ اپنی زبان سے ادا نہیں کیا جس کا مطلب یہ نکلا جا سکے کہ ہمیں تمہارا حکم ماننا ہے۔"

اس منگول سردار کی تائید میں دوسرے بھی بولے اور یوں میں بے بس ہو گیا۔ یہ مجھے بھی یاد تھا کہ برقائی خان نے واقعی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔ ان لوگوں سے مزید بحث و تکرار فضول تھی اس لیے میں نے ہتھیار ڈال دیے لیکن اس کے باوجود یہ ضرور کہا کہ اگر ناکامی ہوئی تو اس کی ذمے داری انہی پر ہو گی۔

منگول سرداروں نے ناکامی کی صورت میں ذمے داری قبول کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا اور یوں وہ اس مہم کے سربراہ بن بیٹھے جسے میں اپنی سرکردگی میں سر کر رہا تھا۔ میں چاہتا تو بحث و تکرار کو بہانہ بنا کر وہیں سے لوٹ آتا مگر اس سرکی وہاں موجودگی نے خود میرے دل میں بھی تجسس پیدا کر دیا تھا اس لیے میں ان کے ساتھ ہی رہا۔

انہوں نے اس درے کا رخ کیا تھا جس میں جانے پر بضد تھے۔ وہ درہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور ایک چھوٹے سے میدان میں نکلا تھا جس کی اطراف میں چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان چٹانوں کے درمیان سے ہو کر آگے بڑھا جا سکتا تھا مگر چٹانوں کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر سب کو رک جانا پڑا۔

وہاں کچھ فاصلے سے دو چٹانوں پر دو کٹے ہوئے سر رکھے تھے۔ ان کی حالت بھی پہلے سر جیسی ہی تھی۔ ایک بار پھر سپاہیوں کو طیش آیا اور سردار واہی بتا ہی بکنے لگے۔

"میں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ہمیں اسی طرف چلنا چاہیے۔" وہ سردار بولا جس نے مجھ سے بحث کی تھی۔

"ہاں!" دوسرے سردار نے کہا۔ "ہمیں اس سمت اور آگے بڑھنا چاہیے۔"

سفر پھر شروع ہوا یہ سوچ سوچ کر میرا دل دھڑک رہا تھا کہ وہ صحیح راستے پر چل رہے تھے۔ اسی کے ساتھ رہ رہ کر مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی چکر ہے۔ مارکوف خوامخواہ تو خطرناک کھیل نہیں کھیل سکتا تھا! یقیناً" اس کا کوئی مقصد ہو گا مگر کیا' اس سے میں بے خبر تھا۔

یہ عین ممکن تھا کہ مارکوف ان کٹے ہوئے سروں کا سہارا لے کر اپنے دشمنوں کو ایک خاص مقام تک پہنچانا چاہتا ہو اور پھر وہاں وہ انہیں گھیر لے مگر شاید اس نے یہ نہیں سوچا ہو گا کہ دشمن اتنی بڑی تعداد میں حملہ آور ہوں گے۔ تعداد زیادہ ہونے سے مارکوف کے دشمنوں کو بہرحال اس پر برتری حاصل ہو سکتی تھی کیونکہ وہ بھاری جانی نقصان اٹھانے کے باوجود بھی تعداد میں اس سے زیادہ ہی رہتے اور اس کے گھیرے کو توڑ دیتے اس کے علاوہ میرے لیے یہ سب بھی ناقابل فہم ہی تھی کہ مارکوف کو دشمنوں کی آمد کے بارے میں کیسے خبر ہو گئی! ایک تو یہ کہ آخری وقت تک روانگی کو پوری طرح صیغہ راز میں رکھا گیا تھا' پھر اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ اس کا کوئی جاسوس اسے حقیقت حال سے

باخبر کر سکتا۔

میں انہی سوچوں میں گھرا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اب تک راستے میں نصف درجن سے زیادہ کٹے ہوئے سر مل چکے تھے۔ وہ سر جیسے مارکوف کے ٹھکانے تک رہنمائی کر رہے تھے۔ وہ جس قدر آگے بڑھتے جا رہے تھے ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

پھر تین سر اور ملے۔ اس کے بعد میں چونک اٹھا کیونکہ راستہ اچانک ہی بدل گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سامنے نظر آنے والی پہاڑیوں کے پیچھے وہ میدان تھا جس کی اطراف پہاڑ تھے اور انہی پہاڑوں میں وہ غار تھے جن میں مارکوف اور اس کے ساتھیوں کی رہائش تھی لیکن اب منگول سرداروں کا رخ مخالف سمت میں تھا کیونکہ ایک کٹا ہوا سر اسی سمت میں ملا تھا۔ میں نے یہ دیکھ کر ایک طویل سانس لیا۔

چٹانوں کے درمیان سے گزر کر میں ان کے ساتھ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے آگے بڑھنے کی کوئی راہ نہیں تھی کیونکہ سامنے ہی ایک پہاڑ نے راستہ روک لیا تھا اور اسی سے ملے ہوئے دوسرے پہاڑ تھے جنہوں نے تینوں سمتوں سے راہ روک دی تھی۔ پہاڑ ایسے تھے جن پر چڑھنا ممکن نہیں تھا لیکن ان لوگوں نے پہلے ان باتوں پر غور نہیں کیا کیونکہ ان سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے وہاں ایک اور ہولناک نظارہ موجود تھا۔

سامنے ہی تقریباً" درجن بھر لاشیں پڑی ہوئی تھیں جن کے سر غائب تھے۔ یقیناً" یہ وہی بدنصیب منگول تھے جن کے سروں نے وہاں تک رہنمائی کی تھی۔

منگول سرداروں کے چہروں سے غم و غصے کے ساتھ ہی الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ تلملا کر رہ گئے تھے اور غالباً" سوچ رہے تھے کہ اب کیا کریں! صرف ایک میں تھا جو انہیں صحیح راستے پر لگا سکتا تھا لیکن بھلا میں ایسا کیوں کرتا! انہوں نے ایک دوسرے کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ہم نے بطریق بوغا کی بات نہ مان کر یقیناً" غلطی کی تھی۔" آخر کار ایک منگول سردار نے اعتراف کیا۔

"دشمن نے ہمارے ساتھ ایک بھیانک مذاق کیا ہے اور ہم اب تک محض وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔"

"میں تم سے متفق ہوں۔" دوسرے سردار نے بھی تائید کی مگر تیسرا سردار خاموش رہا جس نے مجھ سے بحث کی تھی۔

"ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہے۔ اب تم ہماری رہنمائی کرو!" پہلے سردار نے مجھے مخاطب کیا۔

"اب یہ ناممکن ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں' اب کیا بات ہو گئی؟" منگول سردار کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"پہلی بات تو یہ کہ اب تم لوگ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے چکے ہو اور۔"

"مگر ہم تمہیں تمام اختیارات دینے پر راضی تو ہیں۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"لیکن اب میں اختیارات لینے کے حق میں نہیں ہوں۔" میں رکھائی سے بولا۔

"اس کی آخر کوئی تو وجہ ہو گی!" دوسرے سردار نے مداخلت کی۔

"ہاں وجہ ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اب راستہ بھول چکا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس وقت صحیح راستے سے کتنی دور پہنچ چکا ہوں!"

میری بات سن کر وہ خاموش ہو گئے پھر کچھ دیر بعد پہلا سردار دوبارہ بولا۔ "اس کا صرف ایک حل ہے کہ ہم پھر واپس ہوں اور از سر نو ابتدا سے سفر شروع کریں۔"

"یہ بھی اب ناممکن ہے کیونکہ ہمیں واپسی میں شام ہو جائے گی اور اندھیرا پھیلنے کے بعد میرے لیے بھی صحیح راہ تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا' پھر یہ کہ ایسا کرنا خطرناک بھی ہو گا۔ ہمارا دشمن اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے کیونکہ وہ ان راستوں سے ہماری نسبت زیادہ آگاہ ہے۔" میں نے عذر پیش کیا۔

"پھر کیا کیا جائے؟" منگول سردار کے لہجے میں بے

ی تھی۔

"سوائے اس کے کچھ اور ممکن نہیں کہ ہم واپسی کا سفر شروع کر دیں۔" میں نے پر سکون لہجے میں کہا۔

ان کی نظر میں بے منزل بھٹکنا لاحاصل ہی تھا حالانکہ وہ منزل کے بہت قریب پہنچ چکے تھے مگر بے خبر تھے۔ میرے عذر کے بعد اب ان کے لیے واپسی ہی کا راستہ تھا اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

شام ہوتے ہوتے جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو ہر طرف ایک قہر سا مچا ہوا تھا اور مارکوف کی حکمت عملی اب پوری طرح میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے یقیناً" اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا کہ مجھے اس کے ٹھکانے کی نشاندہی پر مجبور کیا جائے گا اور ٹھکانے کے بارے میں یقین ہونے کے بعد منگول اپنی پوری ممکنہ فوجی قوت سے اس پر حملہ کریں گے۔

مارکوف کے مخبروں نے لازماً" منگول سپاہیوں پر نظر رکھی ہو گی اور جیسے ہی منگول سپاہی ایک جانب سے پہاڑی سلسلے میں داخل ہوئے' مارکوف دوسری طرف سے شہر پر قہر بن کر ٹوٹ پڑا۔ اس نے پہاڑی سلسلے میں سپاہیوں کو الجھانے اور آگے بڑھاتے رہنے کے لیے بڑی خوب صورت چال چلی تھی تاکہ منگول سپاہی اسے پہاڑوں میں ڈھونڈتے پھریں اور وہ شہر میں تباہی پھیلاتا رہے۔

♥ ♡ ♡ ♥

مارکوف نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ ایک جانب تو اس نے مجھے رہا کر کے آئندہ کے لیے اپنی راہ ہموار کر لی تھی' دوسری جانب اس نے شہر پر حملہ کر کے منگولوں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ اگر انہوں نے آئندہ اس کی تلاش میں اپنی پوری ممکنہ فوجی قوت جھونک دی تو شہر غیر محفوظ ہو جائے گا۔

قلعے میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اگر بروقت قلعے کے دروازے بند نہ کر دیے جاتے تو قلعے پر مارکوف کا قبضہ ہو جاتا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ مارکوف کے مقابلے پر منگولوں کو قلعہ بند ہونا پڑا تھا۔ قلعے میں بھی خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ قلعے میں موجود سپاہیوں کی تعداد اتنی بہر حال نہیں تھی کہ وہ مارکوف کا مقابلہ کر سکتے اسی لیے انہوں نے قلعہ بند ہونے میں عافیت سمجھی تھی۔ سپاہیوں کی اکثریت پہاڑوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ کچھ سپاہیوں کو برقائی خان اپنے ہمراہ سرائے باتو لے گیا تھا اس لیے قلعے میں برائے نام ہی سپاہی رہ گئے تھے۔

ابو نصار بھی موجودہ صورت حال سے فکر مند تھا۔ اس نے مجھ سے پہاڑوں میں پیش آنے والے واقعات سنے' پھر بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر راز داری برتنے کے باوجود بھی مارکوف کو کس طرح صحیح صورت حال پتا چل گئی۔ حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی بڑے حملے کا منتظر تھا۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نے میرے فرار کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہو؟" میں گوشت کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولا کیونکہ میں اس وقت کھانا کھا رہا تھا۔

"ہاں یہی ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔" ابو نصار ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ "اسی لیے اس نے پہلے ہی تم لوگوں کو راہ سے بھٹکانے اور الجھائے رکھنے کا بندوبست کر دیا تھا۔"

"اگر منگول سردار اپنی من مانی نہ کرتے تو کم از کم مارکوف کے ٹھکانے کو ضرور تباہ و برباد کیا جا سکتا۔" میں نے ابو نصار کی نظر میں اپنی حیثیت صاف کرنے کی غرض سے کہا۔

"جو شخص اتنا دور اندیش اور چالاک ہو سکتا ہے' اس سے حماقت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔" ابو نصار بولا۔ "اس نے یقیناً" اپنے ٹھکانے کی حفاظت کے لیے بھی کوئی نہ کوئی ترکیب سوچی ہی ہو گی۔"

کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد ابو نصار اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اسے فکر تھی کہ جب برقائی خان کو وہ حالات معلوم ہوں گے تو کتنا برہم ہو گا! مارکوف نے اب تک اتنی ہمت نہیں کی تھی کہ دن دہاڑے شہر میں گھسا چلا آتا۔ یہ ایک طرح سے منگولوں کے منہ پر بھرپور طمانچہ تھا مگر میرے لیے وہی سب کچھ بڑا مسرت انگیز تھا۔ اپنے دشمنوں کی تباہی پر مجھے بہر حال خوشی

ہونے کا حق حاصل تھا۔ میں اس شب انہی مسرت خیز خیالوں میں گم ہو کر سو گیا۔

دوسرے دن جب میں دوپہر کا کھانا کھا کر قلعے کی سیر کی غرض سے تنہا نکلا تو میرا ذہن بہت ہلکا پھلکا تھا۔ میں ابھی اپنے کمرے کے سامنے موجود راہداری ہی میں تھا کہ سامنے سے ایک حسین و نوخیز مقامی لڑکی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا اور وہ اکہرے بدن کی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری جانب آتے آتے کچھ ٹھٹک سی گئی مگر اس کے قدم نہیں رکے۔ وہ میری طرف بڑھتی رہی اور میں اس کی طرف!

جب وہ میرے قریب پہنچی تو میں چونک پڑا۔ اس نے مدھم لہجے میں بڑا معنی خیز جملہ کہا تھا۔ "تمہارے ہاتھ میں موجود انگوٹھی بہت خوب صورت ہے۔"

میری نگاہ بے اختیار اس کے ہاتھ کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بھی بالکل ویسی ہی انگوٹھی پہنے ہوئے تھی۔ میں نے چند لمحے بعد جواباً "کہا۔ اور تم بھی تو بالکل ایسی ہی خوب صورت انگوٹھی پہنے ہو۔"

"اپنے کمرے میں چلو!" وہ سرگوشی میں بولی۔ "یہاں میں تمہیں اپنی شناخت نہیں دکھا سکتی۔"

اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ لڑکی مارکوف ہی کے لیے جاسوسی کرتی تھی اور اس کے پاس میرے لیے کوئی اہم پیغام موجود تھا۔

میں اسے کوئی جواب دیے بغیر اپنے کمرے کی طرف لوٹ گیا' اور جب میں کچھ دور چلا گیا تو اپنے پیچھے اس کے قدموں کی چاپ سنی میں نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ کھلا رہنے دیا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ کمرے میں آ گئی اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ دروازہ بند کرتے ہی اس نے تیزی سے اپنی انگوٹھی اتار کر میری جانب بڑھائی اور بولی۔ "پہلے یقین کر لو کہ میں وہی ہوں جو تمہیں سمجھنا چاہیے۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر انگوٹھی اس سے لے لی۔ اس کے نچلے حصے میں حسب توقع سانپ کا پھن بنا ہوا تھا۔ میں نے انگوٹھی دیکھ کر اسے واپس کی اور بولا۔ "کہو کیا پیغام ہے؟"

"میرے پاس بہت کم وقت ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "اس وقت تفصیلی بات نہیں ہو سکتی۔ میں رات کو کسی وقت تمہارے پاس آؤں گی تم جاگتے رہنا!"

"لیکن تم جس منگول سردار کے تصرف میں ہو' کیا وہ تمہیں آنے دے گا؟" میں نے پوچھا اور اس کے بھرپور بدن کا جائزہ لینے لگا۔ بلاشبہ وہ بہت حسین تھی اور وہ سردار یقیناً "خوش قسمت تھا جس نے اس کی راتیں صرف اپنے لیے مخصوص کر لی تھیں۔

وہ میری بات سن کر مسکرائی' پھر بولی۔ "میں جس کے پاس ہوں اس کے پاس مجھ جیسی اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ اس کے علاوہ اگر اسے آج رات میری طلب بھی ہوئی تو میں اس سے نمٹنا جانتی ہوں۔ اسے بلانوشی کا دعویٰ ہے اور حال یہ ہے کہ چوتھا جام چڑھا کر اسے اپنا ہوش نہیں رہتا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ تم سے دن میں ملنا اس لیے ضروری تھا کہ تمہیں اپنی طرف سے مطمئن کر سکوں اور رات کے وقت تمہیں بیدار کرنے کے لیے دروازہ نہ پیٹنا پڑے۔" یہ کہتے ہی اس نے دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر چلی گئی۔

اس دن مجھے وقت کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ جیسے تیسے رات ہوئی تو میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے کا دروازہ میں نے کھلا ہی رکھا تھا۔

مجھے توقع کے خلاف اس لڑکی کا بہت دیر انتظار کرنا پڑا۔ جب میرے کمرے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری تو میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

آنے والی وہی تھی اور اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ وہ یقیناً "پیے ہوئے تھی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ لگا دیا تھا۔

وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "مارکوف نے کہلوایا ہے کہ وہ تمہاری طرف سے پوری طرح مطمئن ہے۔ مارکوف کا مقصد قلعے پر شب خون مارنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے قلعے کے دروازے کھلے ہوئے ملیں۔ اس نے تم سے دریافت

کرایا ہے کہ کیا یہ ممکن۔"

ابھی اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ میں چونک اٹھا۔ میں نے ایک ہلکی سی آواز سنی تھی جو دریچے کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر تیزی سے پنجوں کے بل دوڑتا ہوا دریچے کی طرف لپکا۔ میں نے جلدی سے دریچہ کھولا اور اسی وقت میری سماعت سے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ٹکرائی۔ میں نے دریچے سے جھانک کر دیکھا تو ایک سایہ تیزی سے راہداری میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

*_*_*

شدید خطرے کا احساس ہوتے ہی میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ کوئی یقیناً" دریچے کے قریب کھڑا ہو کر کمرے میں ہونے والی گفتگو سن چکا تھا اور اب مجھے دریچہ کھولتے دیکھ کر فرار ہو رہا تھا۔ کسی کو یہ معلوم ہو جاتا کہ میں منگولوں کے باغی ماروکف سے مل چکا ہوں میری یقینی موت کا سبب بن سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرے جسم نے تیزی سے حرکت کی اور میں اچھل کر دریچے پر چڑھ گیا کیونکہ دروازہ کھول کر باہر جانے میں زیادہ وقت صرف ہوتا۔

دریچے سے کود کر میں راہداری میں آگیا' اور پھر تیزی سے اس سائے کی طرف لپکا جو میری نگاہ سے اوجھل ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی مگر مڑ کر دیکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا کیونکہ میری تمام تر توجہ اس سائے پر مرکوز تھی۔

کچھ فاصلے پر وہ راہداری دائیں جانب مڑتی تھی۔ میں نے اس سائے کو مڑتے دیکھا اور اسی کے ساتھ اپنے دوڑنے کی رفتار بڑھا دی۔ میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے اور یہ میرے حق میں بہتر ہی تھا کیونکہ میں پنجوں کے بل دوڑ رہا تھا۔ اس سے مجھے تیز دوڑنے میں بھی آسانی ہو رہی تھی اور میرے قدموں کی آواز بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

میں دوڑتا ہوا راہداری کے موڑ تک پہنچ گیا مگر یہ دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا کہ وہ تاریک تھی۔ اب میں اس سائے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں تیزی سے جھکا اور اپنا بایاں کان راہداری کے فرش سے لگا دیا۔ مجھے یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سایہ اسی سمت دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے قدموں کی دھمک واضح طور پر محسوس کی تھی۔

میں دوبارہ سیدھا ہوا اور دوڑنے لگا۔ مجھے ہر قیمت پر اس سائے کا تعاقب جاری رکھنا تھا۔ میری زندگی کا انحصار ہی اس پر تھا کہ میں اپنے راز کا تحفظ کروں اور اس شخص کی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں جو میرے راز سے آگاہ ہو چکا تھا۔

قرآنی عملیات برائے نجاتِ مشکلات

اسمائے حسنیٰ سے مشکلات کا حل
درود شریف سے مشکلات کا حل
کلمہ طیبہ سے مشکلات کا حل
نماز سے مشکلات کا حل
سورۃ فاتحہ سے مشکلات کا حل
سورۃ یٰسین سے مشکلات کا حل
سورۃ رحمٰن سے مشکلات کا حل
سورۃ مزمل سے مشکلات کا حل
چہار قل سے مشکلات کا حل
آیۃ الکرسی سے مشکلات کا حل

قیمت فی کتاب: 00-25 روپے

روبی پبلی کیشنز

دوسری منزل راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

میں نہ جانے کب تک تاریک اور نیم تاریک راہداری میں چکراتا پھرا مگر ناکام رہا۔ وہ سایہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا! بھاگتے بھاگتے میرا سانس پھول گیا تھا۔ میرے قدموں کی رفتار کم ہوتے ہوتے بالکل رک گئی اور میں اپنے بے قابو سانسوں کو اعتدال پر لانے کے لیے ستانے لگا۔

ابھی ستاتے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میری سماعت سے ایک گھٹی گھٹی سی نسوانی چیخ ٹکرائی جیسے کوئی دانستہ اپنی چیخ روک رہا ہو یا کوئی کسی کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ میں نے چونک کر سمت کا اندازہ لگایا۔ وہ چیخ میرے عقب سے سنائی دی تھی۔ میں تیزی سے پلٹا اور پھر میرے قدم آواز کی سمت اٹھنے لگے۔ ہلکی ہلکی دبی دبی سی چیخیں اب بھی ابھر رہی تھیں جو اس سمت میری رہنمائی کر رہی تھیں۔

میں اب دوڑنے کی بجائے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف بڑھ رہا تھا۔ راہداری نیم تاریک تھی کیونکہ اس راہداری میں بھی کافی کافی فاصلے سے مشعلیں روشن تھیں۔ رات کے اس پہر قلعے میں نہ جانے کیا کھیل کھیلا جا رہا تھا! وہ لمحے کچھ ایسے ہی تھے کہ میرے ذہن سے اس سائے کا خیال نکل گیا تھا جو میری زندگی کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔

میں رفتہ رفتہ نیم تاریکی سے نکل کر روشنی میں آتا جا رہا تھا کیونکہ راہداری کی دیوار میں پیوست مشعل مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

معاً گھٹی گھٹی نسوانی چیخوں کے درمیان نسبتاً ایک تیز چیخ فضا میں گونجی اور میں غیر ارادی طور پر اس سمت دوڑ پڑا جدھر سے چیخ سنائی دی تھی۔ ابھی میں مشعل کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک ایک قریبی کمرے کا دروازہ کھلا اور اس سے ایک بے لباس لڑکی چیختی ہوئی باہر آئی۔ وہ انتہائی بدحواسی کے عالم میں بھاگتی ہوئی میری طرف آئی جیسے موت اس کے تعاقب میں ہو' اور پھر وہ مجھ سے ٹکرا گئی۔ اگر میں فوراً ہی اسے اپنے بازوؤں میں نہ سمیٹ لیتا تو وہ مجھ سے ٹکرا کر گر گئی ہوتی۔

میں نے محسوس کیا کہ کہ اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے الگ ہونے کی بجائے میری کمر میں دونوں ہاتھ ڈال دیے اور چمٹ گئی۔

میں نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ وہ منگول نہیں تھی۔ وہ اب میرے سینے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لیے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور وہ سسک پڑی۔ اس کی پشت لہولہان تھی اور میرا ہاتھ خون میں سن گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس لڑکی سے کوئی سوال کر سکتا بھاری قدموں کی چاپ ابھری' اور پھر چند لمحے بعد ہی ایک شخص لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے کھلے دروازے سے باہر آیا۔ اس کے لڑکھڑانے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ انتہائی نشے میں تھا۔ کمرے کا دروازہ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں میں کھڑا ہوا تھا اور وہاں تک مشعل کی روشنی بھی پہنچ رہی تھی اسی لیے کمرے سے نکلنے والے کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں چونک پڑا تھا۔ اس کا چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا حالانکہ اب تک میں اس کے نام سے واقف نہیں تھا۔ اس شخص کی طرف لڑکی کی پشت تھی اور میرا چہرہ! اس شخص کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک کوڑا تھا جس کا دوسرا سرا راہداری کے فرش پر گھسٹ رہا تھا۔

قدموں کی چاپ سن کر لڑکی نے ایک بار مڑ کر دیکھا تھا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ مجھ سے چمٹ گئی تھی۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ اس کمرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہو گا! یہ اندازہ لگاتے ہی میرا خون کھول اٹھا تھا مگر وہ لڑکی پر کیوں ظلم ڈھا رہا تھا' یہ سوال میرے لیے حیران کن تھا۔

وہ شخص اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتا ہوا اپنے تلے قدموں سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے انتہائی غصے کا اظہار ہو رہا تھا اور یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید نشے کی زیادتی کے سبب وہ مجھے ٹھیک طرح پہچان نہیں سکا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ میرے قریب آکر رک گیا! پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ اس لڑکی کو چھوڑ دے؟"

"نہیں نہیں!" لڑکی ایک دم چیخ پڑی۔ "مجھے ـــــ مجھے اس کے حوالے نہ کرنا ورنہ ـــــ"

لڑکی کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا تھا کیونکہ اس شخص نے معاً" اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر لڑکی کے بڑے بڑے بالوں کو پکڑ لیا تھا اور لڑکی چیخ پڑی تھی۔

"جوان لڑکیوں کے گیسو لمبے اور عقل کوتاہ ہوتی ہے۔" اس شخص نے دانت پیستے ہوئے ایک منگول ضرب المثل دہرائی اور اسی کے ساتھ لڑکی کے بالوں کو جھٹکا دیا۔

لڑکی پھر تکلیف سے چیخ اٹھی اور میں بھی ضبط نہ کر سکا۔ میرا گھونسا پوری قوت سے اس کے منہ پر پڑا اور وہ شخص لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے اس کے ہاتھ سے لڑکی کے بال بھی چھوٹ گئے تھے۔

وہ لڑکھڑاتے ہی فوراً" سنبھل گیا تھا اور اسی کے ساتھ چمڑے کا کوڑا لہرایا تھا۔ میں کوڑے کی ضرب سے بچنے کے لیے لڑکی سمیت ایک طرف ہو گیا مگر اس کے باوجود نہ بچ سکا تھا۔ کوڑا میرے بائیں بازو پر پڑا تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ سے کوڑا پکڑنا چاہا مگر اس وقت تک وہ میری دسترس سے دور ہو چکا تھا۔

جب دوسری بار اس نے کوڑا لہرایا تو میں پہلے ہی سے تیار تھا۔ اس بار میں اس کی ضرب سے بچنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ جیسے ہی لہراتا ہوا کوڑا میرے قریب آیا، میں نے تیزی سے اسے پکڑ لیا اور اسی کے ساتھ پوری قوت سے کوڑے کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ شخص منہ کے بل زمین پر گرا اور کوڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

میں نے خود کو لڑکی کی گرفت سے آزاد کیا اور لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ اس کا جسم اب بے حس و حرکت تھا اور ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ غالباً" اس کا ماتھا راہداری کے فرش سے ٹکرایا تھا اور وہ بے ہوش

کیا آپ کو عدم تحفظ کا احساس ہے؟
کیا آپ میں قوت ارادی کی کمی واقع ہوئی ہے؟
کیا آپ نفسیاتی طور پر خود کو کمزور سمجھتے ہیں؟
ان سب مسائل سے نجات حاصل کرنے کیلئے

معظم جاوید کی تصنیف

جدید کراٹے
اور
بروس لی

کا مطالعہ کیجئے

-:- منگوانے کا پتہ -:-

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

ہو گیا تھا۔

لڑکی بھی اب آگے بڑھ کر میرے قریب آکھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے قریب اس کی موجودگی محسوس کی تو اس کا جائزہ لیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرش پر پڑے ہوئے شخص کو دیکھے جا رہی تھی۔

خوفزدہ ہونے کے باوجود مجھے اس کا چہرہ انتہائی پرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ شاید وہ اتنی ہی خوفزدہ تھی کہ اسے اپنی بے لباسی کا بھی ہوش نہیں تھا اور اس کی بے لباسی میرے ہوش اڑائے دے رہی تھی۔ اس وقت میری آنکھوں میں تھمز اور راحتی کے بے لباس جسم گھوم رہے تھے۔

میں نے اس وقت اس سے کچھ نہیں پوچھا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "چلو!"

"کہاں؟" اس کے ہونٹ یوں جیسے ہونٹ کانپے۔

"میرے ساتھ، میرے کمرے میں!" میں نے جواب دیا۔

"مگر..... مگر یہ..... یہ....." وہ ہکلائی اور زمین پر پڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے جب ہوش آئے گا تو اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا جائے گا۔" میں نے کہا۔

"میں..... میں اپنے کپ..... کپڑے لے آؤں۔" لڑکی کو پہلی بار اپنی بے لباسی کا خیال آیا اور وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر تیر کی طرح کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

چلتے ہوئے اس کے جسم کی حرکات کچھ ایسی تھیں کہ میں خود فراموشی کے سے عالم میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے میں کوئی حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے اس کھلے ہوئے دروازے کا فاصلہ جیسے درجنوں سالوں پر محیط ہو گیا اور میں درجنوں سالوں پتھر بنا ہوا وہیں کھڑا رہا۔ میرے حواس پر وہ نشیب و فراز چھائے رہے جنہوں نے مجھے خود سے بیگانہ کر دیا تھا۔ جسم کیا تھا، ایک تنی ہوئی کمان تھی، ایک ایسی کمان جسے پوری قوت سے کھینچ کر کسی طرح اسی حالت میں رکھا گیا ہو۔

پھر وہ درجنوں سال بیت گئے، پلک جھپکتے بیت گئے۔ وہ میری نظر سے اوجھل ہو گئی اور میں اچھل پڑا کیونکہ میں نے غالباً "اسی کی چیخ سنی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے اسے دروازے سے کمرے کے اندر گھسیٹ لیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا، کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔

میں لپک کر کمرے کے دروازے پر پہنچا اور دروازہ دھڑ دھڑا دیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دروازہ بدستور بند رہا۔ اندر موت کی سی خاموشی تھی۔ کیا اس کمرے میں بے ہوش ہو جانے والے کے علاوہ بھی کوئی شخص موجود تھا جس نے لڑکی کو اندر گھسیٹ کر دروازہ بند کیا تھا؟ میں سوچنے لگا۔ اگر ایسا ہی تھا تو وہ دوسرا شخص اس وقت باہر کیوں نہیں آیا جب بے ہوش ہو جانے والا مجھ سے نبرد آزما تھا؟ پھر یہ کہ اس نے اپنے بے ہوش ساتھی کی کوئی پروا کیوں نہیں کی جو راہداری میں پڑا ہوا تھا؟

میں کچھ دیر دروازہ کھلوانے کی کوشش کرتا رہا، پھر ناکام ہو کر واپسی کا فیصلہ کیا۔ مجھے اب اس لڑکی کا خیال بھی آگیا تھا جسے اپنے کمرے میں چھوڑ آیا تھا اور جو مارکوف کا پیغام لے کر آئے تھی۔

اپنے کمرے تک پہنچنے کے لیے مجھے کافی دقت پیش آئی کیونکہ میں راستہ بھول چکا تھا مگر اس سے پہلے میرے ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ میں نے ابو نصار کے کمرے کا دروازہ کھلا پایا۔ میں نے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ اس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ ابو نصار بیدار ہو گیا تھا۔ اسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں وہ ابو نصار ہی تو نہیں تھا جس نے میرا راز جان لیا تھا؟ لیکن اگر وہ ابو نصار ہی تھا تو اسے اس طرح بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا وہ مجھ سے یہ بات چھپانا چاہتا تھا کہ میرے راز سے واقف ہو چکا ہے؟ مگر کیوں؟ میرے دماغ میں سوالوں کی آندھیاں سی چلتی رہیں اور انہی آندھیوں کے حصار میں گردش کرتا ہوا میں اپنے

کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ میں نے کچھ سوچ کر دروازے پر دستک دینے سے پہلے دریچے کی طرف قدم بڑھائے۔

میں نے دریچے سے اندر جھانکا تو چکرا کر رہ گیا۔ کمرہ خالی تھا اور لڑکی غائب! میں نے ایک طویل سانس لیا' اور پھر مجھے یاد آیا کہ سائے کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ شاید وہ لڑکی بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے سے نکلی تھی مگر میں نے اپنے پیچھے اس کے قدموں آواز نہیں سنی تھی۔ پھر وہ کب اور کہاں گئی؟

کمرے کا دروازہ ایک ہلکے سے دباؤ سے کھلتا چلا گیا۔ وہ جاتے ہوئے دروازہ بھیڑ گئی ہوگی۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر سوچا اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔

میں بستر پر لیٹ گیا تو مجھے اس شخص کا خیال آیا جو میرے ہاتھوں زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ انہی تین فوجی سرداروں میں سے ایک تھا جو برقائی خاں کے حکم پر میرے ساتھ مارکوف کی تلاش میں گئے تھے۔ اسی سردار نے برقائی خاں کے سامنے اور بعد میں میری مخالفت کی تھی۔ وہ یقیناً" کینہ پرور اور حاسد آدمی تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے بھی مجھے پہچان لیا ہوگا۔ اس صورت میں وہ میری بے جا مداخلت پر مجھ سے بدلہ لے سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے نہ صرف اس لڑکی کو وقتی طور پر اس کے ظلم سے بچالیا تھا بلکہ اس پر ہاتھ بھی اٹھا بیٹھا تھا۔ وہ اس پھول جیسی نازک سی لڑکی کو کیوں زدوکوب کر رہا تھا' میں اس کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ ممکن ہے اس لڑکی نے اس سے بے وفائی کی ہو یا اور کوئی بات رہی ہو۔ بہرحال اسے اس قدر سفاکی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سوچتے سوچتے ایک بار پھر میرا ذہن اس سوال میں الجھ گیا کہ میرا راز کھل گیا تو کیا ہوگا؟ میں بار بار اپنے ذہن کو اس سوال سے گریز پر آمادہ کر رہا تھا مگر ہر بار گھوم پھر کے یہی سوال ذہن میں ابھر آتا تھا۔

مجھے بستر پر دراز ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں ایک دم اچھل کر بیٹھ گیا اور جب دوسری دستک ہوئی تو اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا اس سردار کو ہوش آگیا اور وہ مجھ سے انتقام لینے پہنچ گیا؟ میں نے سوچا۔ ایسا ممکن تو تھا۔ وہ یوں بھی نشے میں تھا اور نشے کے عالم میں آدمی زیادہ سوچتا سمجھتا نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے! یہ خیال آتے ہی میں نے تیزی سے جھک کر اپنے سرہانے رکھی ہوئی تلوار نیام سے نکال لی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"کون ہے؟" میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے سخت لہجے میں سوال کیا۔

"بوغا دروازہ کھول! میں ہوں ابو نصار!" دروازے کی دوسری جانب سے آواز آئی۔

ابو نصار کی آواز سن کر میں گھبرا گیا اور مجھے اتنا ہوش بھی نہ رہا کہ تلوار نیام میں رکھ کر دروازہ کھولتا تاکہ اسے کوئی شک نہ ہوتا۔ میں نے اس کی آواز سنتے ہی دروازہ کھول دیا تھا۔

ابو نصار کمرے میں داخل ہوا اور عجیب سی نگاہ سے میرے چہرے کی طرف دیکھا جس پر اسے یقیناً" بدحواسی نظر آئی ہوگی۔ پھر اس کی نگاہ میرے ہاتھ میں موجود تلوار پر پڑی۔

"تو شاید میری بجائے اس وقت کسی اور شخص کی آمد کا متوقع تھا۔ غالباً" اسی لیے تیرے ہاتھ میں تلوار نظر آرہی ہے۔" ابو نصار کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور وہ خلاف معمول مجھے چبھتی ہوئی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں..... نہیں تو..... اے ابو نصار!..... ایسی تو کوئی..... کوئی بات نہیں!" میں اس کی بات سن کر گڑبڑا گیا۔ میری حالت اس چور جیسی تھی جو عین موقع پر پکڑا گیا ہو۔

"تیرے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت اور تیرے چہرے کی لکنت دونوں سے پتا چل رہا ہے کہ تو سچ نہیں بول رہا اور سچ وہ ہے جو میں جان چکا ہوں۔" ابو نصار یہ کہتا ہوا بستر کی طرف بڑھ گیا۔

اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا کہ ابو نصار دل کا

بھید جان لیتا ہے۔ اپنی اس قوت کو اس نے کسی علم کا نام دیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے جو کچھ کہا تھا' غلط نہیں کہا تھا۔ میں اسی لیے خاموشی سے سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

"اپنی تلوار نیام میں رکھ دے بوغا!" ابو نصار نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بجو کا اب یہاں نہیں آئے گا۔ اگر میں اسے سمجھا بجھا کر اس کا غصہ ٹھنڈا نہ کر دیتا تو وہ اسی وقت تجھ پر چڑھ دوڑتا۔"

"بجو کا' کون بجو کا؟" میں بڑبڑاتا ہوا اس کے قریب بیٹھ گیا اور سرہانے سے نیام اٹھا کر اس میں تلوار رکھنے لگا۔

"وہی جسے تو نے زخمی کر دیا تھا اور راہداری میں بے ہوش پڑا ہوا چھوڑ آیا تھا۔" ابو نصار نے کہا' پھر بولا۔ "دوسروں کے معاملات میں مداخلت اچھی بات نہیں ہوتی بوغا!"

"مگر وہ اس بے گناہ لڑکی پر ظلم ـــــ"

"مجھے علم ہے۔" ابو نصار نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں ہی نہیں قلعے میں موجود بہت سے افراد ان تمام باتوں سے واقف ہیں۔ برقائی خاں بھی ایک بار اسے ان حرکتوں پر ڈانٹ چکا ہے۔ ان دنوں برقائی خاں قلعے میں نہیں اس لیے وہ بے لگام ہو گیا ہے لیکن اس کے سوا تجھے یا کسی اور کو یہ حق نہیں کہ اس کے ذاتی معاملات میں مداخلت کر سکے۔ وہ اپنی لونڈیوں کے ساتھ جو چاہے' جیسا چاہے کرے' اسے حق ہے۔ میں اس کے مرض سے واقف ہوں۔"

"مرض! اسے کیا مرض ہے اے ابو نصار؟" میں نے حیرت سے پوچھا "تیرا یہ جاننا ضروری نہیں ابو نصار بولا" مجھے تو یہ بتا کہ تو وہاں کیسے جا پہنچا تھا؟"

میں اس کا سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہا اور یہ سوچنے لگا کہ اسے کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں؟ اس دوران میں وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

"میں سو رہا تھا کہ اچانک مجھے دریچے پر آہٹ سنائی دی۔" میں نے آخر لب کشائی کی۔ "میں نے دریچہ کھول کر دیکھا تو کسی کو راہداری میں بھاگتے دیکھا۔ میں اس کے تعاقب میں دوڑا۔ میں اس شخص کو نہ پایا اور اس کی تلاش میں بھٹکتا ہوا اس راہداری تک پہنچ گیا جہاں بجو کا کی رہائش ہے۔"

میری بات سن کر ابو نصار نے ایک طویل سانس پھر بولا۔ "ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو جیسا تو نے کہا ہے یہ حقیقت ہے کہ جب تو اپنے کمرے میں تھا تو نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ لڑکی کون تھی تیرے بعد کمرے سے نکل کر مخالف سمت میں دوڑ چلی گئی تھی لیکن میں نے اتنا اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ منگول نہیں تھی۔"

"میرے ـــــ میرے کمرے سے نکل کر؟" میں نے اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لیے اظہار حیرت کیا ابو نصار نے مجھے غور سے دیکھا' پھر کہا۔ "بوغا! میں نہیں جاننا چاہتا کہ وہ کون تھی مگر تجھے اتنی نصیحت ضرور کروں گا کہ ان چکروں سے دور رہ!" یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ابو نصار چلا گیا اور میں دروازہ لگا کر پھر بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے ابو نصار سے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ اسے سب کچھ کیسے پتا چلا! اس کی گفتگو سے مجھے کم از کم یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ میں ـــ جس شخص کا تعاقب کیا تھا' وہ ابو نصار نہیں تھا ورنہ میرے کمرے سے نکلنے والی لڑکی کو نہ دیکھ پاتا۔ وہ لڑکی میرے بعد ہی کمرے سے نکلی تھی' اس وقت جب میں سائے کے تعاقب میں تھا۔ غالباً" اسی وقت ابو نصار نے اپنا دروازہ کھولا ہو گا۔ ایک طرف مجھے بھاگتے ہوئے دیکھ کر اور دوسری جانب اس لڑکی کو میرے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ کر ابو نصار کو تشویش میں مبتلا ہو جانا' تعجب خیز بات تھی۔ ابو نصار نے شاید اس لڑکی کا تعاقب کیا تھا کیونکہ مجھے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دی تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ ابو نصار اس لڑکی کو پکڑ پایا یا نہیں لیکن اتنا یقین ضرور تھا کہ اس لڑکی نے اسے کچھ نہیں بتایا ہو گا۔ میں اس سلسلے میں ابو نصار سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میں نے تو اپنے کمرے میں اس

لڑکی کی موجودگی ہی سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

اس شب میں اتنا فکر مند تھا کہ کافی دیر نیند' میری آنکھوں سے روٹھی رہی' اور پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ کسی آہٹ ہی سے کھلی تھی۔ کچھ دیر تو میں سمجھ ہی نہ پایا کہ جو کچھ دیکھ رہا تھا' وہ خواب تھا یا حقیقت! میں نے کسی کو دریچے سے اندر کودتے ہوئے دیکھا تھا' پھر پلٹ کر دریچہ بند کرتے دیکھتا رہا تھا۔

جب وہ دریچہ بند کر کے میرے بستر کی طرف بڑھ رہی تھی تو میرے ذہن سے نیند کا غبار چھٹ چکا تھا اور میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

"تم..... تم پھر آگئیں؟" میں نے حیرت سے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آہستہ بولو بوغا؟" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی۔

"لیکن اگر دریچہ بند ہوتا تو؟" میں نے کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ دریچہ کھلا ہوگا۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میرے اندازے بہت کم غلط ہوتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب آبیٹھی۔ "اگر ہونے سے پہلے تم دریچہ بند کر دیتے تو پھر مجبوراً" مجھے دروازے پر دستک دینے کا خطرہ مول لینا پڑتا کیونکہ مجھے علم تھا' تم فکر مند ہوگے۔ میرا آنا اس وقت بہت ضروری تھا۔"

"لیکن تم اس وقت یہاں سے کیوں نکل بھاگی تھیں؟" میں نے پوچھا۔ "تمہیں میری واپسی کا تو انتظار کرنا ہی چاہئے تھا۔"

"اگر میں ایسا کرتی تو ابونصار کی نظر میں آچکی ہوتی۔ پھر یہ کہ اس وقت میرا یہاں سے چلا جانا ہر طرح سودمند ثابت ہوا۔" اس نے جواب دیا۔

"تم ابونصار کے ہاتھ تو نہیں آئیں؟"

"نہیں!" اس نے جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ اس بوڑھے آدمی کو میرے پیچھے بھاگنا پڑا۔"

"تم نے مجھے اب تک اپنا نام نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"ناموں میں کیا رکھا ہے' تم مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہو۔"

"کیا تم اپنا نام بتانا نہیں چاہتیں؟"

"ایسی بات نہیں! تم سے اب کیا چھپانا!"

"یہ شاید اس لیے کہہ رہی ہو کہ میرے اور تمہارے مقاصد ایک ہیں۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر وہ آہستہ سے ہنس دی اور پھر اپنا نام بتا دیا۔ "میرا نام سیوری ہے۔"

اس کی ہنسی بھی اس کی طرح دلکش اور حسین تھی مگر اس وقت میرا ذہن ایک بار پھر متوقع خطرات کی طرف مبذول ہو گیا تھا۔

"سیوری! تم نے اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا کہ میں اسے پکڑ سکا یا نہیں جس نے اس کمرے میں ہونے والی گفتگو یقیناً" سن لی تھی؟" میں نے کہا۔

"شخص!" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تم شاید اسے کوئی مرد سمجھ رہے ہو۔"

"تو پھر؟ کیا وہ کوئی مرد نہیں تھا؟ اور تم..... تمہیں یہ بات کس طرح.....؟"

"میں تمہیں یہی بتانے تو آئی تھی۔ وہ کوئی مرد نہیں تھا ایک لڑکی تھی' بیوقوف لڑکی!" سیوری نے میری بات کاٹ کر کہا' پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی بتانے لگی۔ "وہ میری ہی طرح ایک مقامی لڑکی تھی جو مجھے یہاں بلانے آئی تھی مگر اس کی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ دروازے پر دستک دے سکتی۔ وہ تذبذب کے عالم میں دریچے کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ غالباً" اس کا ہاتھ دریچے سے ٹکرا گیا تھا اور جب اس نے دریچے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی تو بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ بھی اس کی بیوقوفی ہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ گھبرا گئی تھی۔"

"مگر اس لڑکی کو یہ کیسے معلوم تھا کہ تم میرے کمرے میں ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"میں خود اسے بتا کر آئی تھی تاکہ میری ضرورت پڑے تو وہ بروقت مجھے بلا سکے۔" سیوری نے جواب

دیا' پھر معنی خیز لہجے میں بولی۔ "اس کے ہاتھ میں بھی سانپ کے پھن والی انگوٹھی ہے۔"

"اچھا!" میں نے ایک طویل سانس لیا۔ سیوری کی بات سن کر میرے سینے سے جیسے کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔ میرے تمام خدشات بے معنی ثابت ہوئے تھے۔ جس لڑکی نے میرے کمرے میں ہونے والی باتیں سن لی تھیں' وہ خود مارکوف کے لیے جاسوسی کر رہی تھی۔ اس کے پاس بھی سانپ کے پھن والی انگوٹھی ہونے کا یہی مطلب تھا۔ میں اس لڑکی کی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود بھی میرے ذہن میں یہ تجسس ضرور تھا کہ وہ آخر سیوری کو کیوں بلانے آئی تھی! یقیناً" وہ کوئی اہم معاملہ ہی رہا ہو گا۔ یہی سوال میری زبان پر بھی آگیا۔

"فی الحال وقت کم ہے اور صبح ہونے والی ہے۔ میں تم سے کل رات تفصیلی گفتگو کروں گی۔" سیوری نے جواب دیا۔ "میں اس وقت صرف اس لیے آئی تھی کہ تمہیں حقیقت سے آگاہ کر سکوں تاکہ تم فکر مند نہ ہو۔ مارکوف کے پیغام سے متعلق بات بھی کل رات ہی کروں گی کیونکہ میری غیر موجودگی کو محسوس کی جا سکتا ہے اور میں اب کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی۔"

سیوری اٹھ کر کھڑی ہوئی اور میں خواہش کے باوجود اسے نہ روک سکا۔ میں اس سے بجو کا کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر جب اس کے پاس انتہائی اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے فی الحال وقت نہیں تھا تو بھلا وہ اس سلسلے میں کیا بات کرتی! یوں بھی اس کا حسین جسم میرے دل میں نئی نئی خواہشوں کو جنم دے رہا تھا اور میں چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر مزید بیٹھے' میں کچھ دیر مزید اس کی دید کروں مگر وہ چلی گئی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ میری ایک بڑی فکر کم کر گئی۔ میرے لیے یہ اطمینان بڑی بات تھی کہ کوئی میرے راز سے واقف نہیں ہو سکا۔

کچھ دیر گزری تھی کہ میری سماعت سے دل کشش اور آواز ٹکرانے لگی جو میں ہر روز سنتا تھا۔ وہ آواز ابو نصار کی تھی جو برابر والے کمرے سے آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ابو نصار حسب معمول اپنی صبح کی عبادت سے فارغ ہو کر وہ موٹی سی کتاب پڑھ رہا ہے جس میں اس کے مذہب کی باتیں لکھی ہیں۔ اب میں ان باتوں کو کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا اور وہ میرے دل میں گھر کرنے لگی تھیں کیونکہ میں بڑی حد تک عربی زبان بولنے اور سمجھنے لگا تھا۔ میں اب بھی ہر صبح ابو نصار سے درس لیتا تھا۔ ابو نصار میری دلچسپی اور شوق سے خوش بھی تھا اور حیران بھی! میں اس وقت تک سو نہیں سکا تھا اس لیے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ہی منہ ہاتھ دھو کر ابو نصار کے پاس پہنچ گیا۔ ابو نصار نے وہ کتاب میری طرف بڑھائی جو مجھے پڑھا رہا تھا۔ اس نے پچھلا سبق سنا اور نیا سبق دیا۔ میں حسب معمول کافی دیر تک اس کے کمرے میں رہا اور اس کے ساتھ ہی ناشتہ کر کے رخصت ہوا۔

میں جب ابو نصار کے کمرے سے نکلا تو ہر طرف دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ گزشتہ رات میں اپنے کمرے کی طرف لوٹتے ہوئے راستہ بھول گیا تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ دن کی روشنی میں اچھی طرح قلعے کے راستوں کو اپنے ذہن میں بٹھا لوں تاکہ اگر آئندہ' رات کے وقت کبھی کوئی ایسی صورت پیش آئے تو حالات سے نمٹ سکوں۔ میں نے پہلے ابو نصار کے ساتھ بھی قلعے کے اندرونی حصے کا جائزہ لیا تھا مگر اس وقت میرے گھومنے پھرنے کا مقصد یہ نہیں تھا اور نہ میں نے راستوں کو ذہن میں رکھا تھا۔ میں یہ سوچ کر یوں ہی ایک طرف چل دیا۔

میں کافی دیر قلعے میں گھومتا رہا' پھر قلعے کے درمیان بنے ہوئے ایک چھوٹے سے میدان کی طرف نکل گیا۔ وہاں مجھے میدان میں بھیڑ سی نظر آئی اور تجسس کے زیر اثر میرے قدم ادھر اٹھتے چلے گئے۔

وہاں لوگ حلقہ سا بنائے کھڑے ہوئے تھے۔ درمیان میں یقیناً" کوئی ایسا قابل دید منظر تھا جسے وہ سب ہی بڑی توجہ اور اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ میں جیسے ہی اس حلقے کے قریب پہنچا' ایک تیز نسوانی چیخ

فضا میں گونجی۔

میں تیزی سے لوگوں کے درمیان گھس گیا اور پھر میری آنکھوں نے بھی وہ منظر دیکھ لیا جو وہاں موجود دوسرے لوگوں کی دلچسپی کا سبب بنا ہوا تھا مگر اس منظر کا مجھ پر مختلف رد عمل ہوا۔ وہ منظر دیکھ کر میرا خون کھول گیا تھا۔

اس حلقے کے درمیان زمین پر پانچ مقامی لڑکیاں رسیوں سے جکڑی پڑی ہوئی تھیں اور ان کے جسموں پر برائے نام لباس تھا۔ ایک شخص ہاتھ میں کوڑا لیے ان پر مسلط تھا۔ وہ شخص اپنے لباس سے کوئی سپاہی نظر آ رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سپاہی کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور پھر ایک چیخ گونجی۔

"بتاؤ تم میں سے کس نے زہر ملایا تھا؟" سپاہی دھاڑا۔ "اگر تم نے زبان نہ کھولی تو میں تم سب کی کھال ادھیڑ دوں گا۔"

سپاہی کا ہاتھ چند لمحے کو رک گیا۔ شاید وہ جواب کا منتظر تھا مگر اس کے سوال کا کسی لڑکی نے جواب نہیں دیا۔ سپاہی کے چہرے سے غیض و غضب کا اظہار ہونے لگا اور پھر تو مجھے یوں لگا جیسے وہ پاگل ہو گیا۔ وہ بلا رکے لڑکیوں پر کوڑے برسانے لگا۔ پے در پے چیخیں ابھرتی رہیں مگر سپاہی کا ہاتھ نہ رکا۔

میری تمام تر توجہ لڑکیوں کی طرف تھی۔ ایک لڑکی کا جسم کوڑے کی ضرب سے گھوما اور اس کا چہرہ جو پہلے میری جانب تھا میری طرف ہو گیا۔ میں اچھل پڑا۔ سیوری تھی مگر یہ دیکھ کر مجھے انتہائی حیرت ہوئی کہ اس کے چہرے پر ذرا بھی تکلیف کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے بلکہ اسکے برعکس ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔ کوڑوں کی ضرب سے اس کی پشت لہولہان نظر آ رہی تھی۔ اسی وقت دوبارہ اس کے جسم پر کوڑا پڑا۔ میں اس کی چیخ سننے کا متوقع تھا مگر اس کے منہ سے چیخ کی بجائے ایک سسکاری سی نکلی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں سیوری کی حالت دیکھ کر کرب میں مبتلا ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی حیرت زدہ تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ آخر کس مٹی کی بنی ہوئی ہے؟ کیا کوئی عورت اتنے آہنی اعصاب کی مالک ہو سکتی ہے؟

معاً" میری دائیں جانب سے ایک آشنا سی آواز سنائی دی اور میں سیوری کی بجائے ادھر مڑ کر دیکھنے لگا تاکہ اپنے اندازے کی تصدیق کر سکوں۔ وہ بجو کا ہی تھا جو ایک ادھیڑ عمر اور درشت چہرے والے شخص کو کوئی مشورہ دے رہا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کے جسم پر بھی فوجی افسروں کا لباس تھا۔ بجو کا کو وہاں دیکھ کر میں چونکا بھی اور گزشتہ رات کا واقعہ یاد کر کے مجھے اس پر غصہ بھی آیا۔ اس کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ تمتما سا رہا تھا جس کا سبب میں نہ سمجھ سکا یوں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ انتہائی پرجوش اور جذباتی ہو۔

"ٹھہر جا!" اچانک ادھیڑ عمر فوجی افسر نے سپاہی کو حکم دیا۔

سپاہی کا ہاتھ رک گیا اور وہ ایک جانب کھڑا ہو گیا۔

"تو ان کی زبان نہیں کھلوا پائے گا۔" یہ کہتا ہوا ادھیڑ عمر شخص آگے بڑھا اور اسی دوران میں اس نے اپنی نیام سے تلوار نکال لی۔ پھر وہ رسیوں میں جکڑی ہوئی لڑکیوں کے قریب پہنچ کر گیا اور بولا۔ "بجو کا ٹھیک کہتا ہے۔ میں اب اسی کے مشورے پر عمل کروں گا۔"

اپنا جملہ مکمل کرتے ہی ادھیڑ عمر نے اپنے قریب کھڑی ہوئی ایک لڑکی کو گھورا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس لڑکی کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ادھیڑ عمر نے اپنی تلوار کی نوک زیریں جسم کے ایک نازک حصے پر رکھ دی تھی۔

"بول شراب میں زہر کس نے ملایا تھا؟ اگر تو خاموش رہی تو میں....." ادھیڑ عمر طیش کے عالم میں مغلظات بکنے لگا اور شاید اسی کے ساتھ اس نے تلوار پر دباؤ بڑھا دیا تھا کیونکہ لڑکی چیخنے لگی تھی۔

"مجھے..... مجھے نہیں معلوم!..... نہیں..... ایں..... ایں....."

لڑکی کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا کیونکہ ادھیڑ عمر نے اس کا انکار سنتے ہی اس کے جسم میں تلوار گھونپ دی تھی۔ لڑکی انتہائی دردناک آواز میں چیخی تھی اور اس

کے جسم سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ رسیوں میں جکڑے ہونے کے باوجود لڑکی کا جسم بری طرح تڑپ رہا تھا اور خون کے چھینٹے دوسری لڑکیوں پر بھی پڑ رہے تھے۔ کچھ دیر ہی میں اس کا جسم تڑپ تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ اب ادھیڑ عمر ایک اور لڑکی کو گھور رہا تھا۔ پھر وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس لڑکی کے پاس پہنچ ہی گیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی کریہہ آواز بلند ہوئی۔ "بول تو بھی اپنا یہی انجام چاہتی ہے یا زبان کھولنے پر آمادہ ہے؟"

سہمی ہوئی لڑکی نے ایک نظر اٹھا کر ادھیڑ عمر کو دیکھا' اور پھر میں نے اس لڑکی کے چہرے پر موجود تاثرات میں واضح تبدیلی محسوس کی۔ اب وہ خوفزدہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر وہ بولی تھی تو اس کی آواز میں بھی لرزش نہیں تھی۔

"شراب میں زہر میں نے ملایا تھا۔" معاً لڑکی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"مگر کیوں؟ تو نے ایسا کیوں کیا؟" ادھیڑ عمر چیخ پڑا۔

"اس لیے کہ مجھے تجھ سے نفرت ہے اور نہ صرف تجھ سے بلکہ ہر منگول درندے سے نفرت ہے۔" لڑکی بغیر رکے ایک جنون کے عالم میں بولے جا رہی تھی۔

"خاموش کتیا!" ادھیڑ عمر اتنی زور سے چیخا کہ اس کی آواز پھٹ گئی اور اسی کے ساتھ اس کی تلوار بلند ہوئی۔

ادھیڑ عمر نے ایک ہی وار میں اس لڑکی کا سر اڑا دیا تھا۔ لڑکی کی کٹی ہوئی گردن سے خون ابل ابل کر زمین پر بہہ رہا تھا۔ مجھ میں اب تاب نہیں تھی کہ مزید وہ ہولناک منظر دیکھ سکتا اس لیے واپسی کے لیے مڑا اور اسی وقت میری نگاہ بجوکا کی نگاہ سے ٹکرا گئی۔

"بوغا تو؟" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"ہاں بجوکا میں!" میں نے بھی بالکل اسی کے لہجے میں جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

میں بھیڑ سے نکل آیا تو دیکھا وہ میرے پیچھے آ رہا تھا۔ میں چوکنا ہو گیا اور اپنی رفتار کم کر دی تاکہ وہ آگے نکل جائے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آ گیا' اور پھ
دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بوغا! مرد بن اور میر
طرح بہادری کا ثبوت دے اور دوسروں کے شکار
ہاتھ ڈالنا مردانگی نہیں ہے۔ میں نے اپنے قوت با
سے وہ ہیرے حاصل کیے ہیں جن میں سے ایک
رات تیری رال ٹپک رہی تھی۔"

"زبان کو لگام دے بجوکا!" میں نے بھی ترکی
جواب دیا۔ "کیا تو بھول گیا کہ رات میرے ہاتھو
تیری کیا درگت بنی تھی؟" میں یہ کہتے ہوئے رک گیا

"اس وقت میں نشے میں تھا مگر اب نہیں ہوں او
اگر مجھے ابو انصار روک نہ دیتا تو میں رات ہی اپنی
عزتی کا بدلہ لے لیتا۔" وہ پھنکارا۔

میں اس وقت بجوکا سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لی
نہیں چاہتا تھا اس لیے اپنے غصے پر قابو پاتے ہو
بولا۔ "سن! مجھے تیرے ہیرے موتیوں سے کوئی دلچس
نہیں۔ وہ لڑکی خود مجھ سے آ کر لپٹ گئی تھی۔"

"تو اس کتیا کو دھکا دے کر خود سے الگ بھی کر سک
تھا مگر تو نے ایسا نہیں کیا تھا' آخر کیوں؟" اس کا انداز
جواب طلبی کا سا تھا۔

"تو اسے کیوں پیٹ رہا تھا؟ میں نے دیکھا تھا ک
اس کی پشت لہولہان تھی۔" میں نے کہا۔

"میری مرضی! تجھے کیا؟" وہ مجھے گھورتے ہو
بولا۔

"پھر اب تو کیا چاہتا ہے؟" مجھے پر غصہ آنے لگا۔

"میں تجھے ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر
رکا اور اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئ
پھر وہ دوبارہ بولا۔ "شہر میں اب بھی بہت سے مقامی
گھرانے موجود ہیں اور وہاں بڑی بڑی حسین لڑکیاں
ہیں۔ تو جوان ہے اور کسی بھی لڑکی کو حاصل کر سکتا
ہاں اس سے پہلے تجھے اس لڑکی کے دعویداروں کو ضرو
قتل کرنا پڑے گا کیونکہ قانون یہی ہے۔ اس وقت تک
تو کسی لڑکی پر اپنا حق نہیں جتا سکتا جب تک کہ اس
باپ' بھائی یا شوہر زندہ ہو مگر شاید تو ایسا نہ کر سکے کیونک

کام مردوں کے ہیں۔"

اس کا آخری فقرہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں کوشش کے باوجود ضبط نہ کر سکا۔ میرا ہاتھ تلوار کے قبضے پر پہنچ گیا۔ بجو کا نے بھی میرے تیور بھانپ لیے تھے اور چوکنا ہو گیا تھا۔ وہ شاید بات کو اس حد تک بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

"بوغا! یہ نہ بھول کہ رات میں نے ابو نصار کے کہنے پر تجھے معاف کر دیا تھا۔" بجو کا پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔ "مگر مجھے تو غصہ کیوں دلا رہا ہے میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں تو تجھے ایک اچھا مشورہ دے رہا تھا۔ نہیں مانتا تو نہ مان' تیری مرضی!" وہ بے غیرتی سے ہنسا۔

"مجھے تیرے مشوروں کی ضرورت نہیں!" میں اس کے ہنسنے پر برہم ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ دانستہ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ میں نے قدرے خفگی سے کہا۔ "آئندہ اگر تو نے مجھ سے ایسی باتیں کیں تو میں تجھے ہرگز معاف نہیں کروں گا۔"

"اور اگر تو نے بھی آئندہ میرے معاملات میں ٹانگ اڑائی تو پھر میں ابو نصار کا خیال بھی نہیں کروں گا' سمجھ گیا!" یہ کہتا ہوا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔

میں جب اپنے کمرے میں لوٹا تو میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ سیوری کا کردار میرے لیے بڑا پراسرار ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اب تک غیر معمولی ذہانت اور عیاری کا ثبوت دیا تھا' ایسی ذہانت اور بہادری جس کی توقع کسی عورت سے نہیں کی جا سکتی۔

وہ ادھیڑ عمر جس نے میرے سامنے دو لڑکیوں کو حلالی سے قتل کر دیا تھا' وہی ہو سکتا تھا جس کے شراب میں سیوری تھی۔ سیوری بھی دوسری لڑکیوں کے ساتھ وہاں رسیوں سے جکڑی پڑی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے۔ شراب میں زہر ملانے والا معاملہ بھی کسی حد تک میری سمجھ میں آ چکا تھا اس تفصیلی واقعات سے سیوری ہی مجھے آگاہ کر سکتی تھی۔ اس نے رات کو آنے کا وعدہ تو کیا تھا لیکن اب موجودہ حالات کے پیش نظر اس کا آنا شاید مشکل تھا کیونکہ میں نے اسے زخمی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ زخم ایسے نہیں تھے کہ ایک ہی دن میں مندمل ہو جاتے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر میں سو گیا کیونکہ گزشتہ رات کا بڑا حصہ میں نے جاگتے ہوئے گزارا تھا۔ میں اس وقت بیدار ہوا جب شام کے سائے اچھی طرح پھیل چکے تھے۔ مجھے بھوک محسوس ہوئی تو خادم سے ابلا ہوا گوشت منگوایا' پھر گھوڑی کا دودھ پی کر میں کمرے سے نکل گیا۔

اپنے کمرے سے باہر آ کر میں نے ابو نصار کے کمرے کی طرف دیکھا جو بند تھا۔ میرا ارادہ اس وقت قلعے کے پھاٹک کی طرف جانے کا تھا۔ میں یہ جائزہ لینا چاہتا تھا کہ وہاں کتنے پہریدار رہتے ہیں!

قلعے کے در و بام مشعلوں کی روشنی سے جگمگانے لگے تھے لیکن اس کے باوجود حسب معمول کچھ حصے نیم تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس وقت میں ایک نیم تاریک راہداری سے گزر رہا تھا۔

بس اچانک ہی مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی دبے پاؤں میرے عقب میں آ رہا ہو۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں تیزی سے پلٹا تھا اور اسی کے ساتھ اپنی تلوار بھی نیام سے نکال لی تھی لیکن مجھے دیر ہو گئی تھی۔ کسی نے مجھ پر عقب سے جست لگائی تھی اور میری گردن جکڑی تھی۔ وہ حملہ میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا اس لیے میں سنبھل نہ پایا اور حملہ آور سمیت پہلو کے بل زمین پر گرا۔ گرتے ہوئے تلوار بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی کیونکہ میں نے غیر ارادی طور پر گرتے ہوئے ہاتھ کا سہارا لینا چاہتا تھا۔ گرتے ہی میری نظر حملہ آور کے خنجر پر پڑی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں خنجر تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی کلائی اور بازو کے درمیان میری گردن پھنسی ہوئی تھی کسی بھی لمحے وہ میرے سینے میں خنجر اتار سکتا تھا۔ وہ لمحے ایسے نہیں تھے کہ میں حملہ آور کے بارے میں سوچ سکتا۔ وہ جو بھی تھا' بہر حال مجھے قتل کر دینا چاہتا تھا اور مجھے اپنی زندگی بچانی تھی۔

حملہ آور نے جب خنجر والا ہاتھ بلند کیا تو میں پوری قوت سے پلٹا۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق ہی نکلا۔ اب وہ میرے نیچے تھا اور میں اس کے اوپر! خنجر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ میری گردن اس کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی اور میرا ایک ہاتھ اس کی کلائی پر جم چکا تھا۔ کلائی پر گرفت کے سبب اب وہ خنجر میرے سینے میں پیوست نہیں کر سکتا تھا۔

جسمانی قوت میں وہ مجھ سے کم نہیں تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ مسلسل اس کوشش میں تھا کہ میری گرفت سے نکل جائے مگر میں نے اپنی دونوں ٹانگیں اس کی ٹانگوں میں پھنسالی تھیں۔

پھر معاً" اس نے اپنے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دے کر نیچے کیا جس سے میرا جسمانی توازن بگڑ گیا۔ وہ شاید اسی کا منتظر تھا۔ اس نے دوسرے ہی جھٹکے میں اپنی کلائی میری گرفت سے آزاد کرالی۔ وہ بڑا خطرناک لمحہ تھا۔ اگر مجھ سے ذرا سی بھی چوک ہو جاتی تو وہ اپنا کام کر گزرتا۔ میں ایک دم اچھل کر اس کے اوپر سے ہٹ گیا تھا اور اسی لیے میرا سینہ اس کے خنجر کی پہنچ سے دور ہو گیا تھا۔ میں اس کے متوقع حملے سے تو بچ گیا تھا لیکن اپنی ٹانگوں کو الگ نہ کر سکا تھا جو اس کی ٹانگوں میں الجھی ہوئی تھیں اس لیے اچھل کر الگ ہٹتے ہی میں منہ کے بل زمین پر گرا تھا۔ اس وقت میری تیزی ہی نے مجھے بچالیا۔ اگر میں فوراً" نہ اٹھ کھڑا ہوتا تو وہ میری پشت پر سوار ہو کر مجھے بس بس کر دیتا' اور پھر میں اس کے ہاتھوں قتل ہونے سے نہیں بچ سکتا تھا۔

یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ منہ کے بل گرتے ہی میرا ہاتھ اپنی تلوار سے ٹکرا گیا اور میں نے اٹھتے ہوئے تلوار کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

اب میرے ہاتھ میں تلوار تھی اور اس کے ہاتھ میں خنجر اور ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوئے تھے۔ وہ خنجر ہاتھ میں لیے تھوڑا جھکا ہوا کھڑا تھا اور اپنے دونوں پیر پھیلا رکھے تھے۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے مجھ پر چھلانگ لگا دے گا مگر میں نے اسے یہ موقع نہیں دیا۔ میں نے تلوار بلند کی اور اس کی طرف جھپٹا اور اگلی لمحے اس کے ہاتھ میں موجود خنجر قضا بن کر میری طرف لپکا۔ اگر میں اس پر حملہ آور ہونے کا ارادہ موقوف کر کے ایک دم بیٹھ نہ جاتا تو اس کا پھینکا ہوا خنجر میرے سینے میں اتر گیا ہوتا۔

اس نے غالباً" مجھے تیزی سے بیٹھتے دیکھ کر ہی سمجھ لیا تھا کہ اس کا وار ناکام ہو گیا ہے اسی لیے وہ میرے اٹھنے سے قبل ہی ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ نہتا ہو چکا تھا اور اب اس کے لیے یہی بہتر تھا کہ اپنی جان بچا کر بھاگ جائے مگر میں اسے اتنی آسانی سے کس طرح فرار ہونے دیتا! میں بھی اٹھ کر اس کے تعاقب میں بھاگا۔ میں اگر چاہتا تو پیچھے سے خنجر پھینک کر اسے موت کی نیند سلا سکتا تھا لیکن میرا ارادہ اسے زندہ پکڑنے کا تھا۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ مجھے قتل کرانے میں کسی شخص کا ہاتھ ہو سکتا تھا مگر میں اپنے قیاس کو یقین میں بدلنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی میں اور وہ قلعے کے ایک ایسے حصے میں پہنچ گئے جو ویران نہیں تھا اور وہاں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ وہاں ایک دوسرے کے پیچھے اس طرح بھاگنا قطعی مناسب نہیں تھا لیکن میں اسے کس طرح بچ کر نکل جانے دیتا!

توقع کے مطابق ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ لوگ بھی ہم دونوں کے پیچھے بھاگنے لگے۔ صورت حال ایسی تھی جس نے مجھے ظالم اور اسے مظلوم بنا دیا تھا کیونکہ وہ خالی ہاتھ تھا اور میرے ہاتھ میں تلوار تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے معاً" اس نے "بچاؤ' بچاؤ!" چیخنا شروع کر دیا۔

کچھ دیر بعد ہی لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور اسے بھی روک لیا۔ لوگ مجھ سے استفسار کر رہے تھے کہ میں اس کے پیچھے تلوار لے کر کیوں دوڑ رہا تھا! اور اس سے بھی پوچھ گچھ جاری تھی۔ وہ لوگوں کے درمیان مجھ سے کچھ فاصلے ہی پر موجود تھا۔

"میں..... قلعے کے پھاٹک کی طرف..... آ رہا تھا کہ اس نے..... اس نے اچانک مجھ پر حملہ کر دیا۔"

حملہ آور پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان لوگوں سے کہہ رہا تھا اور اس کی آواز میری سماعت میں زہر گھول رہی تھی۔

"یہ ـــــ یہ جھوٹا ہے ـــــ جھوٹا!" میں چیخ پڑا۔ "حملہ میں نے نہیں اس نے کیا تھا۔"

نہ کوئی اس کا گواہ تھا نہ میرا' پھر یہ فیصلہ کیسے ہوتا کہ کون جھوٹا ہے اور کون سچا! نتیجہ بیچ بچاؤ کی صورت میں نکلا۔ جب اسے کچھ لوگ اپنے ساتھ لے جا رہے تھے تاکہ میں دوبارہ اس پر حملہ نہ کردوں تو میں نے اس کی شکل دیکھی۔ وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا مگر شاید میں اس کے لیے اجنبی نہیں ورنہ وہ مجھ پر حملہ آور کیوں ہوتا!

وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے بچ تو نکلا تھا مگر اس کے بارے میں مجھے چند اہم معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ مجھے اس کا نام بھی معلوم ہوگیا تھا اور یہ بھی کہ وہ قلعے میں کہاں رہتا ہے! یہ باتیں مجھے ان لوگوں کی گفتگو سے معلوم ہوئی تھیں جو مجھے اور اسے گھیرے ہوئے تھے۔ ان کے لیے میں تو کسی حد تک اجنبی تھا مگر وہ مخلص نہیں اور اسی لیے ان کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ موقع ملتے ہی اس سے نمٹوں گا اور اس کی زبان کھلوا کر چھوڑوں گا کہ اسے کس نے میرے قتل پر مامور کیا تھا!

میری طبیعت مکدر ہو چکی تھی اس لیے میں قلعے کے پھاٹک کی بجائے واپس اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ واپسی میں میری ملاقات ابو نصار سے ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ اسے اپنے اوپر ہونے والے قاتلانہ حملے سے آگاہ کردوں۔ میں نے ایسا صرف احتیاطاً" کیا تھا۔

میری پوری بات سن کر ابو نصار کے چہرے سے ناخوشی کا اظہار ہونے لگا۔

"تیرا لہجہ بتا رہا ہے کہ اس وقت تو مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔" ابو نصار نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اور اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی تجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے جسے نظر انداز کردیا جائے۔"

"پھر ـــــ پھر کیا کیا جائے؟" میں نے کہا۔

"میں ابھی اسے بلواتا ہوں۔" ابو نصار نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں سختی تھی۔

اس دن سے پہلے مجھے ابو نصار کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا لیکن اس دن مجھے معلوم ہوا کہ برقائی خاں کے بعد قلعے میں اسی کا حکم چلتا تھا۔ میں نے ابو نصار کو حملہ آور کے نام اور ٹھکانے سے بھی آگاہ کردیا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے خادموں کے ذریعے دو گرز برداروں کو طلب کیا اور جب وہ آگئے تو انہیں حملہ آور کا نام اور پتہ بتا کر حکم دیا۔ "وہ جس حال میں اور جہاں ہو' اسے حراست میں لے لو' اور پھر یہاں لے آؤ!"

ابو نصار کو میں نے پہلی بار احکامات جاری کرتے سنا تھا اس لیے میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والے لفظ بھی قانون بن سکتے ہیں' مجھے اس کا اندازہ پہلے نہیں تھا۔

جب تک گرز بردار' حملہ آور کو نہ پکڑ لائے' کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

حملہ آور کے چہرے سے انتہائی گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا گرز بردار اس کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے۔

"تو شاید یہ جانتا ہو کہ میرے ایک اشارے پر بغیر کوئی وجہ بتائے تیری گردن ماری جاسکتی ہے۔" ابو نصار' حملہ آور سے سخت لہجے میں مخاطب ہوا۔ "اس لیے اگر تو اپنی زندگی بچانا چاہتا ہے تو بتادے کہ تجھے بوغا پر حملہ کرنے کے لیے کس نے اکسایا تھا؟"

ابھی حملہ آور کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ معاً" کمرے میں بجو کا داخل ہوا۔ اس کے سانس ہموار نہیں تھے جس سے پتا چل رہا تھا کہ وہ تقریباً" دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔

"اے ابو نصار! یہ کیا ظلم ہے؟" بجو کا اپنے سانسوں پر قابو پاتا ہوا بولا۔ "کل بوغا نے بے سبب مجھ پر حملہ کرکے مجھے زخمی کردیا اور آج اس نے میرے خاص دستے کے ایک سپاہی پر قاتلانہ حملہ کیا۔

یہ تیری شہہ پا کر شیر ہو گیا ہے اور سارے قلعے میں کسی منہ زور گھوڑے کی طرح دندناتا پھرتا ہے۔ اس کی بجائے کہ تو بوغا کو سرزنش کرتا تو نے میرے ہی آدمی کو پکڑوا لیا۔" بجوکا ایک جوش کے عالم میں بولتا رہا اور ابو نصار انتہائی تحمل سے اس کی بات سنتا رہا۔

جب بجوکا اپنی بات کہہ کر چپ ہو گیا تو ابو نصار کی پرسکون مگر سرد آواز بلند ہوئی۔ "بجوکا! پہلے اس بات کا جواب دے کہ تو بغیر اجازت میرے کمرے میں کیسے داخل ہوا؟ پھر یہ بتا کہ تجھے کس نے یہ حق دیا کہ تو مجھ سے جواب طلبی کر سکے؟"

ابو نصار کی سرد آواز سن کر بجوکا کا چہرہ اتر گیا۔ اس کے چہرے سے بے بسی کا اظہار ہو رہا تھا اور اس کا سر جھک گیا تھا۔

"اگر تو چاہتا ہے کہ میں تیری اس گستاخی کو معاف کر دوں تو یہاں سے چلا جا!" ابو نصار نے اسے خاموش دیکھ کر حکم دیا۔

بجوکا نے نگاہ اٹھائی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے معاف کر دے اے ابو نصار! مجھ سے غلطی ہوئی۔"

"معافی مجھ سے نہیں بوغا سے مانگ بجوکا!" ابو نصار نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"بوغا سے معافی!" بجوکا بڑبڑایا۔ "مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ تو نے ہی اس پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا۔" ابو نصار ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"یہ ـــــ یہ جھوٹا ہے۔" بجوکا نے حملہ آور کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے یہ حکم ہرگز نہیں دیا تھا۔ اگر اس نے یہ کہا ہے تو یقیناً" سزا کا مستحق ہے۔"

"اس نے ابھی کچھ نہیں کہا بجوکا!" ابو نصار نے کہا۔ "مگر مجھے یقین ہے کہ اس نے جو کچھ کیا، تیرے ہی حکم پر کیا تھا۔" یہ کہہ کر معاً" ابو نصار، حملہ آور کی طرف پلٹا۔ "بول اور میری بات کی تصدیق کر! جان لے کہ اگر تو نے سارے الزام اپنے سر لے لیا تو تجھے سزا ملے گی لیکن سچ بولا تو رہا کر دیا جائے گا۔"

حملہ آور نے نظر اٹھا کر بجوکا کی قہر آلود نگاہ دیکھ اور سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔

"یہ خوف نہ کھا کہ بعد میں بجوکا تجھے سچ بولنے سزا دے گا۔" ابو نصار پھر حملہ آور سے مخاطب ہوا "تجھے آج ہی کسی دوسرے فوجی سردار کی خدمت میں دے دیا جائے گا۔"

ابو نصار نے شاید حملہ آور کے دل کی بات کہہ دی تھی اس لیے اس نے فوراً" زبان کھول دی۔ اس نے میرے اور ابو نصار کے قیاسات کی تائید کر دی تھی بجوکا کا چہرہ خجالت سے سرخ ہو گیا اور سر جھک گیا۔

"بجوکا! اگر میں چاہوں تو تجھے اس جرم میں گرفتار کر کے قید کی سزا بھی دے سکتا ہوں اور چاہوں تو تجھے تیرے عہدے سے معزول بھی کر سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تجھے راہ راست پر آنے کے لیے آخری موقع دے رہا ہوں۔ پہلے بھی برقائی خاں کے کانوں تک تیری شکایتیں پہنچتی رہی ہیں مگر وہ میرے کہنے پر تجھے معاف کرتا آیا ہے لیکن اب اگر تو نے اپنی حرکتیں نہ چھوڑیں تو اپنی تباہی کا خود ذمے دار ہو گا۔" ابو نصار نے بجوکا کو تنبیہہ کی۔

جانے سے پہلے بجوکا نے مجھ سے معافی مانگی اور میں نے اسے معاف کر دیا کیونکہ ابو نصار کا ایما یہی تھا ورنہ میں تو یہ جاننے کے بعد سخت طیش میں آ گیا تھا کہ اس نے میرے قتل کا سامان کیا تھا۔

حملہ آور، بجوکا اور گرز بردار، ابو نصار کے کمرے سے چلے گئے تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بوغا! میں تجھ سے خوش ہوا کہ تو نے اسے معاف کر دیا۔ معاف کر دینے ہی میں بڑائی ہے۔"

پھر میں نے ابو نصار کے ساتھ ہی رات کا کھانا کھایا اور کچھ دیر بعد اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں پہنچ کر میری نگاہ کھلے ہوئے دریچے کی طرف اٹھی مگر میں نے اسے بند نہیں کیا، نہ جانے کیوں، نہ جانے کس امید پر! حالانکہ مجھے یقین تھا، سیوری وعدے کے مطابق نہیں آ سکے گی۔

میں بستر پر دراز ہوا تو سیوری کا حشر خیز حسین و گداز

جسم میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ اسی دن صبح میں نے سیوری کو نیم برہنگی کے عالم میں دیکھا تھا' اس وقت جب اس کے جسم پر کوڑے برسائے جا رہے تھے۔ اس وقت بھی جب میری پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں' میرے ذہن میں سیوری ہی کا خیال تھا۔

دن میں سو لینے کے باوجود بھی شاید میری نیند نہیں بھری تھی اس لیے میں گہری نیند سویا تھا۔ غالباً" یہی سبب تھا کہ مجھے نہ تو دریچے سے کود کر کمرے میں آنے والے کے بارے میں احساس ہوا اور نہ ہی میری آنکھ اس وقت تک کھلی جب تک کہ کسی نے میرا شانہ ہلا کر مجھے بیدار نہ کیا۔

آنکھ کھلتے ہی میری نگاہ جس چہرے پر پڑی' اس نے مجھے حیران کر دیا۔ سیوری مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے گھسیٹ لوں اور اپنے پہلو میں لٹا لوں۔ سوتے ہوئے بھی خواب میں اسی کا چہرہ میرے روبرو تھا اور اب بیدار ہو کر بھی مجھے اسی کا چہرہ نظر آیا تھا۔ سونے سے قبل بھی وہی حسین چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے خواب کی تعبیر مل گئی ہو۔

"تم یوں مجھے حیرت سے کیا دیکھے جا رہے ہو؟" اس کے یاقوتی لب ہلے۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ اب بھی خواب دیکھ رہا ہوں یا بیدار ہو چکا ہوں۔" میں بولا۔

"کیوں' کیا کوئی خواب دیکھ رہے تھے؟" وہ گنگنائی۔

"ہاں!" میں نے کہا۔ "اور اب اس کی تعبیر دیکھ رہا ہوں۔"

"تو دیکھو اور جی بھر کے دیکھو! کیونکہ آج کی رات ہماری ہے۔" اس نے ایک ادا سے کہا اور بیٹھ گئی۔

"کیونکہ کیا آج رات تمہیں اس بڈھے گدھ کا خوف نہیں؟" میں نے پوچھا۔

آج رات اسے اپنی منگول بیویوں میں سے کسی ایک پر گزارا کرنا پڑے گا۔" سیوری نے جواب دیا۔ "وہ ہماری طرف سے مطمئن رہے گا کیونکہ اس کی نظر میں ہم تینوں غیر منگول لڑکیاں اس قابل نہیں ہیں کہ اپنے پیروں پر بھی کھڑی ہو سکیں۔"

اس کی بات سن کر مجھے خیال آگیا کہ وہ شدید زخمی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے حیرت سے کہا۔ "تو کیا تم تینوں کے زخم مندمل ہو گئے؟ کیا تمہارے پاس کوئی ایسی دوا ہے جو زخموں کو فوراً" مندمل کر دیتی ہے؟"

وہ ہنس پڑی' پھر بولی۔ "تم غلط سمجھے! یہ اپنی اپنی قوت برداشت کی بات ہے۔ میری ساتھی لڑکیاں واقعی اس قابل نہیں کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔"

"پھر تمہارے زخم کیسے ٹھیک ہو گئے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نے یہ کب کہا ہے کہ میرے زخم ٹھیک ہو گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مڑی اور اپنی قمیض اٹھا کر مجھے اپنی ننگی پشت دکھائی۔

میں نے دیکھا کہ اس کی پشت کے زخم مندمل نہیں ہوئے تھے لیکن اسی کے ساتھ میری آنکھوں نے اور بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ اسے دیکھ کر میری رگوں میں جیسے آگ بہنے لگی تھی۔

"اب یقین آیا تمہیں؟" سیوری کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور اسی کے ساتھ وہ نظارہ میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا جس نے مجھے بے خود سا کر دیا تھا۔ اس نے اپنی قمیض گرا دی تھی۔

"اسی لیے مجھے آج تمہاری آمد کی توقع نہیں تھی۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے خیال آگیا تھا کہ سیوری سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سب سے پہلا سوال اسی سلسلے میں کیا کہ اسے اور اس کی ساتھی لڑکیوں کو کیوں زدوکوب کیا گیا تھا؟

"اس کا مطلب ہے کہ تم بھی وہاں موجود تھے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے ایک طویل سانس لے کر مجھے تفصیل سے آگاہ کیا۔ "دراصل اس بوڑھے کی زندگی کے دن ابھی پورے نہیں ہوئے ورنہ کل رات وہ زندہ نہ بچتا۔ عموماً" وہ لڑکیوں کو اپنے

ساتھ شراب پینے پر مجبور نہیں کرتا مگر اسے نہ جانے کل رات کیا سوجھی کہ خود شراب پینے سے پہلے اس نے وہ زہر آلود شراب میری اس ساتھی کو پینے کا حکم دیا جسے اس نے شب باشی کے لیے اپنے کمرے میں بلایا تھا اور....."

"تو کیا اس لڑکی کو علم نہیں تھا کہ شراب زہر آلود ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"معلوم تھا اور اسی لیے وہ شراب پیتے ہوئے ہچکچائی اور بہانہ کیا۔ بوڑھا شک میں پڑ گیا اور پھر اس نے زبردستی اسے زہر آلود شراب پلا دی۔ کچھ دیر بعد ہی میری ساتھی کا جسم اکڑنے لگا اور وہ مر گئی۔" سیوری نے بتایا۔ "اس کی غیر متوقع موت نے گزشتہ رات وہ ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا جس کی لپیٹ میں تم آ گئے۔ میری ساتھی لڑکیوں میں سے ایک مجھے بلانے یہاں دوڑ آئی تھی کیونکہ توقع تھی کہ بوڑھا اسی وقت ہم سب کو طلب کر کے باز پرس کرے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ بوڑھے نے صبح تک کے لیے خاموشی اختیار کر لی۔ اس کے بعد تو تمہیں علم ہی ہے کہ کیا ہوا!"

"کیا اسی لڑکی نے شراب میں زہر ملایا تھا جس نے اعتراف کیا تھا اور قتل کر دی گئی تھی؟" میں نے سیوری سے دریافت کیا۔ "کیا تم بھی اس بات سے واقف تھیں؟"

میری بات سن کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی، پھر بولی۔ "زہر کو اس نے نہیں ملایا تھا۔ وہ بڑی عجیب لڑکی تھی، عجیب اور ٹوٹ کر محبت کرنے والی! اس نے ہم سب کو بچانے کی خاطر جان بوجھ کر سارا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔"

"واقعی وہ بڑی عجیب اور بہادر لڑکی تھی۔ جان بوجھ کر دوسروں کی زندگی بچانے کے لیے موت کو گلے لگا لینا معمولی بات نہیں ہے۔" میں نے بھی سیوری کی تائید میں کہا۔

کچھ دیر سیوری خاموش رہی اور میں بھی! میں نے اس کی آنکھوں میں نمی محسوس کر لی تھی۔ وہ یقیناً اپنی ساتھیوں کی موت پر دکھی تھی۔

میں نے موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر مارکوف کا ذکر چھیڑ دیا اور بولا۔

"ہاں سیوری اب بتاؤ کہ مارکوف نے کیا پیغام بھیجا تھا؟"

"دراصل یہ چاہتا ہے کہ قلعے پر شب خون مارے اور یہاں قبضہ کر لے۔ اگر ایک بار یہ قلعہ اس کے قبضے میں آ گیا تو پھر اس کا خیال ہے کہ دوبارہ اس کے قبضے سے نہ نکل سکے گا۔ وہ اسی سلسلے میں تم سے مدد کا طلبگار ہے۔" سیوری نے جواب دیا۔

"اس نے مدد کی وضاحت بھی تو....."

"ہاں میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔" سیوری میری بات کاٹ کر بولی۔ "وہ چاہتا ہے کہ اسے کسی شب قلعے کا پھاٹک کھلا ہوا ملے۔ وقت اور دن کا تعین اس نے تم پر چھوڑ دیا ہے تاکہ تم اس سلسلے میں جائزہ لینے کے بعد اسے مطلع کرو۔"

"لیکن یہ کام تو تم میں سے کوئی بھی کر سکتا تھا کیونکہ تم بھی قلعے کے اندر ہی رہتی ہو۔" میں نے کہا۔

"اگر یہ کام اتنا ہی آسان ہوتا تو اب تک مارکوف کبھی کا قلعے پر قبضہ کر چکا ہوتا۔" سیوری بولی۔

"کیوں اس میں مشکل کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رات کے وقت اس حصے میں انتہائی سخت پہرہ ہوتا ہے۔ وہاں کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ قدم قدم پر وہاں مسلح محافظ موجود ہوتے ہیں۔" سیوری نے اپنی بات کی وضاحت میں کہا۔

"اچھا تو یہ معاملہ ہے۔" میں نے طویل سانس لیا، پھر بولا۔ "اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تم بتا رہی ہو تو پھر میں ہی پھاٹک تک پہنچنے میں کس طرح کامیاب ہو سکتا ہوں؟"

"پھاٹک تک پہنچنا تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا کیونکہ تمہاری حیثیت مختلف ہے۔ تمہیں ایک فوجی سردار کا درجہ حاصل ہے اور قلعے کے اس حصے میں رات کو بھی کوئی فوجی سردار آ جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دوں کہ فوجی سردار کے حکم پر قلعے کا

پھاٹک بھی کھولا جاسکتا ہے۔" سیوری نے مجھے سمجھایا۔

اب اس کی پوری بات میری سمجھ میں آگئی۔ اگر ایسا کرنے میں میرے لیے کوئی قباحت تھی تو صرف یہ کہ مارکوف قلعے پر قبضہ نہ کرپاتا تو میں کہیں کا نہ رہ جاتا۔ یہ بات بہرحال چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ قلعے کا پھاٹک میرے حکم پر کھولا گیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے لیے ایک قباحت یہ بھی تھی کہ ابھی قلعے کے محافظ اور پہریدار میری حیثیت سے آگاہ نہیں تھے۔ ان پر اپنی حیثیت کا اظہار کرنے کے لیے کوئی صورت پیدا کی جاسکتی تھی مگر اس کے لیے وقت درکار تھا۔

"ٹھیک ہے، میں جلد ہی اس سلسلے میں حالات کا جائزہ لے کر تمہیں آگاہ کردوں گا تاکہ تم مارکوف تک میرا پیغام بھجوادو۔" میں نے کچھ دیر بعد سیوری کو جواب دیا۔

"غالباً" تم اس سلسلے میں کوئی فوری قدم اس لیے نہیں اٹھانا چاہتے کہ یہاں اجنبی ہو اور تمہاری حیثیت سے کم لوگ واقف ہیں۔" سیوری نے میرے دل کی بات کہہ دی جس سے مجھے اس کی ذہانت کا اندازہ ہوگیا۔

"تو واقعی ذہین ہو۔" میں نے اعتراف کیا۔ "تم نے قطعی صحیح اندازہ لگایا۔" پھر مجھے یہ خیال آیا کہ وہ میرا پیغام مارکوف تک کیسے پہنچائے گی؟ اور یہ کہ مارکوف اس سے کس طرح رابطہ قائم رکھتا تھا؟ یہی سوال میری زبان پر بھی آگیا۔

"ہرچند کہ تمام باتیں مجھے نہیں بتانی چاہئیں لیکن جب مارکوف نے تم پر اعتماد کا اظہار کیا ہے تو پھر میں بھی تم پر اعتماد کا اظہار کرسکتی ہوں۔" یہ کہہ کر سیوری نے پیغام رسانی کا طریقہ بتایا۔

دراصل پیغام رسانی ان مقامی باشندوں کے ذریعے ہوتی تھی جو قلعے میں معمولی معمولی خدمتوں پر مامور تھے اور ان کی رہائش شہر میں تھی۔

"کبھی تمہارا کوئی پیغام پکڑا بھی تو جاسکتا تھا۔" میں نے خدشے کا اظہار کیا۔

"نہیں یہ ناممکن ہے۔" سیوری نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ہمارے پیغامات تحریری نہیں، زبانی ہوتے ہیں۔" سیوری نے بتایا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پیغام رساں کے علم میں بھی سب کچھ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں پھر بولا۔ "تمہارا کوئی پیغام رساں تم لوگوں کے لیے خطرناک بھی تو ہوسکتا ہے۔ غدار تو ہر قوم اور ہر نسل میں ہوتے ہیں۔"

"کیا وہ لوگ غداری کریں گے جن کی بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں دشمنوں کی آغوش میں ہیں؟ کیا وہ خطرناک ہوسکتے ہیں جن سے جینے کا حق چھین لیا گیا ہے؟ نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا بوغا!" سیوری ایک جوش کے عالم میں بولی۔

"ہاں کسی حد تک تمہاری بات درست ہے۔" میں نے اسے جذباتی دیکھ کر کہا۔ اس کی بات سن کر مجھے بجوکا یاد آگیا۔ وہ بھی تو انہی میں سے تھا جس نے مقامی لڑکیوں کو اپنی آغوش کی زینت بنا رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سیوری اس کے بارے میں ضرور سب کچھ جانتی ہوگی۔ جو بات مجھے ابونصار نے نہیں بتائی تھی اور ٹال گیا تھا، وہ سیوری بتاسکتی تھی۔ میں نے چند لمحے توقف کے بعد سیوری کو مخاطب کیا۔ "تم فوجی سردار بجوکا سے تو واقف ہی ہوگی۔"

"ہاں کیوں؟" سیوری خلاف توقع چونک کر بولی۔ میں نے اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ میں نے کسی حد تک صرف اتنا اندازہ ضرور لگایا تھا کہ جیسے وہ بجوکا کے ذکر پر خوش ہو۔

"کیوں، تم بجوکا کے ذکر پر چونک کیوں گئیں؟" میں نے اسے کریدنے کی غرض سے کہا۔

"بجوکا!" سیوری کے ہونٹوں سے ایک سسکاری سی ابل پڑی۔ "کاش اس بوڑھے گدھ کی بجائے میں بجوکا کے تصرف میں ہوتی۔"

میں سیوری کی زبان سے اپنے ایک دشمن کے

لیے یہ الفاظ سن کر حیرت میں رہ گیا اور مجھے غصہ بھی آیا۔ میں نے کسی قدر تلخ سے لہجے میں کہا۔ "کیوں کیا تم اس سے عشق کرتی ہو؟"

"نہیں!" اس نے جواب دیا۔ "معاملہ عشق کا نہیں، جسم کی ضرورت کا ہے۔"

"تو کیا تمہیں بجوکا کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا جو تمہاری جسمانی ضرورتیں پوری کر سکتا؟"

اس نے غالباً" میرے تلخ لہجے کو محسوس کر لیا اور ہنس کر بولی۔ "کہیں تمہیں اس سے رقابت تو محسوس نہیں ہونے لگی؟"

"میں کیوں اس سے رقابت محسوس کرتا!" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔ چاہے تم زبان سے اس بات کا اقرار نہ کرو۔" وہ بدستور خوش مزاجی سے بولی' پھر ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگی۔ "بات یہ ہے کہ بوغا کہ اس کی اور میری ضرورتیں مشترک ہیں۔"

"کیا تم ان ضرورتوں کی تشریح نہیں کرو گی؟" میں نے چڑ کر کہا اور دل ہی دل میں خود پر ملامت کرنے لگا کہ میں نے خواہ مخواہ بجوکا کا ذکر چھیڑ دیا۔

"بجوکا کو اس وقت تک قرب کی خواہش نہیں ہوتی جب تک وہ..... وہ..... اس کے ہاتھ میں..... ہاتھ میں کوڑا نہ ہوا اور..... اور وہ....." سیوری کی زبان لڑکھڑانے لگی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں' اور پھر وہ آنکھیں بند کیے خواب کے سے عالم میں بڑبڑانے لگی۔ "وہ کوڑے مار مار کر جسم کو..... لہولہان کر دیتا ہے' اور پھر..... پھر....." سیوری کے منہ سے سسکاریاں ابلنے لگیں۔

"مگر یہ تو درندگی ہے' سفاکی ہے' ظلم ہے۔" میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"ہاں مگر میرے لیے نہیں! میں..... میں یہی..... یہی چاہتی ہوں۔" وہ جھنجھوڑنے کے باوجود آنکھیں بند کیے بڑبڑاتی رہی۔ "کوئی مجھے ادھیڑ ڈالے' لہولہان کر دے' مجھے پیس ڈالے!"

"کیا تم پاگل ہو اور بجوکا بھی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"شاید..... شاید میں پاگل ہوں' پاگل!" یہ کہہ کر وہ ایک دم قہقہہ مار کر ہنس پڑی' پھر اس نے آنکھیں کھول کر قطعی خلاف توقع حرکت کی۔ اس نے زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور میں سکتے میں رہ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "اگر میں تمہارے منہ پر اس طرح تھپڑ مار دوں تو تم کیا کرو گے؟"

اس نے ایسی حرکت کی تھی کہ میں کوشش کے باوجود خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پوری قوت سے الٹا ہاتھ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ جواب میں اس نے مجھے ایک گندی سی گالی دی۔ میں اور بپھر گیا۔ وہ مجھ سے پٹتی رہی اور گالیاں بکتی رہی۔ وقفے وقفے سے وہ سسکاریاں بھی بھر رہی تھی جیسے وہ مجھ سے پٹ کر تکلیف کی بجائے راحت و لذت محسوس کر رہی ہو۔

پھر کچھ دیر بعد ہی اس نے ایک دم میری آغوش میں گر کر اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور سسکتی ہوئی بولی۔ "بوغا جانی! مجھے معاف کر دینا کہ تمہیں غصہ دلانے کے لئے میں نے گالیاں دیں۔ آؤ! آؤ اب..... اب مجھے سمیٹ لو اور..... اور مجھے اتنی زور سے..... اتنی زور سے بھینچو کہ میری ہڈیاں چٹخ جائیں۔"

میں اسے کچھ دیر حیران حیران سا اپنی آغوش میں پڑا ہوا دیکھتا رہا' اور پھر میرا وجود اس کے قرب کی خوشبو سے مہکنے لگا۔ میرا غصہ ختم ہو گیا اور مجھے اس کے کہے ہوئے کچھ دیر پہلے کے الفاظ یاد آنے لگے۔ جب وہ آنکھیں بند کیے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ میری سماعت میں اس کے الفاظ گونجنے لگے۔ کوئی مجھے ادھیڑ ڈالے' لہولہان کر دے' مجھے پیس ڈالے!

اور پھر میں نے وہی کیا جو اس کی آرزو تھی۔ میں نے اسے اس طرح برتا کہ اب تک کسی نہ برتا تھا' پوری وحشت' پوری شدت اور پوری درندگی کے ساتھ اور وہ اس درندگی میں میرا پورا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے بھی میرے جسم کو کئی جگہ سے زخمی کر دیا تھا۔ میں اب اس کے ساتھ قطعی کوئی رعایت

میں برت رہا تھا' یہ جاننے کے باوجود بھی کہ اس کی
ت کے زخموں سے خون بہنے لگا ہے۔ مجھے اس وقت
نا بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ اس کے زخموں سے بہتا
وا خون میرے بستر کو داغدار کر رہا ہے۔ مجھ پر تو جیسے
اب جنون سا طاری تھا کہ میں اسے واقعی پیس کے
ھ دوں۔

جب وحشتوں کے لمحے گزر گئے تو وہ نڈھال سی
ہ کر ایک طرف پڑ گئی جیسے اس کے جسم کی ساری
قت کسی نے نچوڑ لی ہو۔ میں بھی اس کے قریب ہی
ے سدھ پڑا ہوا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ مجھے
اعتراف ہے کہ اس شب میں نے لذتوں کی ایک نئی
یا دیکھی۔ وہ لذت' وہ بے خودی مجھے پہلے کبھی میسر
یں آئی تھی۔ وہ جوش ہی کچھ اور تھا' وحشت ہی کچھ
ور تھی جسے بیان کرنا ممکن نہیں۔

کچھ دیر بعد سیوری نے میری جانب کروٹ لی' پھر
رے گلے میں بانہیں ڈال کر آسودہ لہجے میں ایک
طویل سانس لیتی ہوئی جیسے گنگنائی۔ "آج..... آج کی
رات ایک طویل عرصے کے بعد....."

اور پھر سیوری نے اپنی داستان سنائی۔ اس کی
شادی کم عمری میں کر دی گئی تھی۔ اس کی ماں اسے جنم
ینے کے پانچ سال بعد ہی دنیا سے رخصت ہو گئی
تھی۔ باپ نے دوسری شادی کر لی تھی مگر اس سے کوئی
اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں شاید اسی لیے
اس سے بہت محبت کرتی تھی مگر سگا باپ بہت ظالم
تھا۔ وہ بچپن ہی سے اسے دھنتا آیا تھا۔ بارہ سال کی عمر
میں جب سیوری کی شادی ہوئی تو وہ مار پیٹ کی اتنی
عادی ہو چکی تھی کہ اس کے بغیر اسے اپنی زندگی خالی
خالی سی لگتی تھی۔ سیوری کی یہ خوش قسمتی تھی یا
بدقسمتی کہ اسے شوہر بھی ایسا ہی ملا' انتہائی غصہ ور اور
ظالم! شوہر نے باپ کی کمی کو پورا کر دیا تھا۔ سیوری کم
عمر تھی اور اس کا شوہر بھرپور جوان! شادی کے ابتدائی
دنوں میں اسی لیے سیوری اس کے قرب سے انکار
کرتی اور اس انکار پر اس کا شوہر اسے دھن کے رکھ
دیتا اور پھر بالجبر سیوری کو اپنی آغوش کی زینت بنا لیتا۔

پھر انکار کرنا سیوری کی عادت ہو گئی۔ وہ دانستہ انکار
کرتی اور پٹتی' پھر اس کا شوہر اسے پیس ڈالتا۔ بارہ
سال کی عمر سے بیس سال کی عمر تک سیوری اسی ماحول
میں رہی' اور پھر جب اس کا شوہر منگولوں کے ہاتھوں
مارا گیا تو اس کی تقدیر اسے قلعے میں لے آئی۔ وہ ایک
بوڑھے منگول سردار کے حصے میں آئی تھی جس نے
اس کے شوہر اور پانچ سالہ معصوم بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔

میں نے سیوری کی دکھ بھری داستان سنی اور ملال
کیا' پھر کچھ دیر بعد سیوری ہی نے میرے ذہن میں
پیدا ہونے والے ایک سوال کا خود بخود جواب دے
دیا۔ "میں نے ابتدا میں اس بوڑھے گدھ کو بھی غصہ
دلانا چاہا تھا تاکہ وہ مجھے زدوکوب کرے مگر غصے کے عالم
میں اس نے ہمیشہ ایک ہی سلوک کیا۔ وہ مجھے مار پیٹ
کر اپنی خوابگاہ سے نکال دیتا تھا۔ وہ رات بوڑھا کسی اور
لڑکی کے ساتھ گزارتا تھا اور میں رات بھر تڑپتی رہتی
تھی' انگاروں پر لوٹتی رہتی تھی۔ پھر میں نے اسے غصہ
دلانا چھوڑ دیا۔"

"مگر تم نے اسے زہر کیوں دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی کچھ دن پہلے مارکوف کی طرف سے ہمیں
اس کا حکم ملا تھا اس کا خیال ہے کہ اگر آہستہ آہستہ
کسی طرح تجربے کار منگول سرداروں کو ٹھکانے لگا دیا
جائے تو اس سے منگولوں کی قوت ٹوٹ جائے گی۔ اس
سے پہلے بھی دو منگول سرداروں کو زہر دے کر ہلاک کیا
جا چکا ہے لیکن ہم اس سلسلے میں بہت محتاط ہیں۔
دونوں سرداروں کی موت کے درمیان تین ماہ سے زیادہ
عرصہ ہے تاکہ یہ راز کھل نہ سکے۔" سیوری نے بتایا'
پھر اسے کچھ خیال آگیا اور بولی۔ "مجھے یہاں موجود
تمام منگول سرداروں کے بارے میں پوری تفصیلات
کا علم ہے۔ تم شاید مجھ سے بجوکا کے بارے میں کچھ
پوچھنا چاہتے تھے۔ کہو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں!" میں نے طویل سانس لیا۔ "بہت کچھ تو
اس کے بارے میں پتا چل گیا مگر اب بھی میرے ذہن
میں ایک الجھن باقی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے
گزشتہ رات کا پورا واقعہ سنایا' پھر بولا۔ "میری سمجھ

میں یہ بات نہیں آئی کہ اس لڑکی کو کس نے اندر گھسیٹ کر دروازہ بند کیا تھا جب کہ بجو کا باہر راہداری میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔"

میری بات سن کر سیوری کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی۔ "صرف ایک ہی بات ممکن ہے۔ اس لڑکی کو بجو کا کی منگول بیوی نے اندر گھسیٹ لیا ہو۔ وہ یوں بھی بڑی مردمار عورت ہے۔ منگول بیوی کے علاوہ بجو کا کے پاس تین اور غیر منگول لڑکیاں ہیں جو میری ہی ہم وطن ہیں۔ بجو کا کی منگول بیوی ان تینوں کے ساتھ بڑا برا سلوک کرتی ہے، ایسا سلوک جو لونڈیوں اور باندیوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔"

سیوری نے جس خیال کا اظہار کیا تھا، وہی ممکن بھی تھا۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا! معاً سیوری نے لیٹے لیٹے میرے شانے میں دانت گاڑ دیے۔ میرے منہ سے کراہ نکل گئی اور میں نے کہا۔ "کیا پھر پٹنا چاہتی ہو؟"

"ہاں!" وہ خوابیدہ سے لہجے میں بولی۔ "اور..... اور اس کے بعد....." اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس بار سیوری کو گندی گندی گالیاں نہیں بکنی پڑیں کیونکہ میں اس کی طلب اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ میں اسے اس وقت تک مارتا رہا جب تک کہ وہ سسکاریاں بھرتی ہوئی میری آغوش میں نہ گر گئی۔

"اب..... اب مجھے بجو کا کی کوئی تمنا نہیں..... کوئی تمنا نہیں بوغا!..... بوغا میری جان!" اس کے ہونٹ لرزے اور پھر اس نے مجھے اس طرح جکڑ لیا جیسے اسے خدشہ ہو کہ میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔

اس کا چہرہ جذبات کی آنچ سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایسی سرخی تھی جیسے اس نے بیک وقت ڈھیر ساری شراب چڑھالی ہو۔ اس کا بدن دہک رہا ہو۔

"پیس ڈال، مجھے پیس ڈال بوغا!" اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آرہی تھی اور میں جیسے اس کنویں میں اترتا جا رہا تھا، گہرائی میں، ان دیکھی گہرائی میں!

وہ سفر نہ جانے کتنی دیر جاری رہا، نہ جانے و
طویل سفر تھا! میں جب اس سفر سے پلٹا تو نڈھال تھ
میرے ہمسفر کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں
میں اور سیوری سفر کی تھکن سے چور چور ا
دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے پڑے رہ
میں چونکا اس وقت جب میری سماعت سے وہی
انگیز آواز ٹکرائی جو ہر روز علی الصبح ٹکراتی تھی
نصار کی وجد آفریں آواز!

"سیوری، سیوری!" میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیوں، کیا ہوا؟" وہ بھی گھبرا کر اٹھ گئی۔

"صبح ہو گئی، اب تم جاؤ! لوگ بیدار ہونے وا
ہوں گے۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی، اور پھر کچھ ہی
میں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

سیوری چلی گئی تو میں سوچنے لگا کہ حسب معم
ابو نصار کے پاس میرا جانا ضروری ہے ورنہ وہ ش
کر سکتا تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھا اور منہ ہا
دھونے کے لیے برتن میں پانی انڈیلنے لگا۔

"یہ تیرا چہرہ کیوں اترا اترا ہے بوغا؟" ابو نصار
مجھے دیکھتے ہی پوچھا تھا۔ "اور آنکھیں بھی سرخ ہور
ہیں۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں
میری حالت دیکھ کر بھانپ نہ لے! اس لیے میں
بہانہ کیا۔ "رات مجھے جانے کیوں نیند نہیں آئی!"

"اچھا تو پھر آج چھٹی کر اور جا کے سو جا! شاید ا
نیند آجائے۔" ابو نصار کے لہجے میں محبت تھی۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا
اپنے کمرے میں آکر میں یوں بستر پر گرا جیسے اب
اٹھ پاؤں گا۔ سیوری نے میرے سارے کس بل
نکال دیے تھے۔ اس نے جیسے میرے جسم کا جوڑ جو
ڈھیلا کر دیا تھا۔ اس کی شدتوں کا ساتھ دینا شاید
شخص کے بس کی بات بھی نہیں تھی اسی لیے تو وہ ا
تشنہ تھی۔ اس کی تشنگی نے ایک ہی شب میں سیرا

لی منزل پالی تھی اور اپنی محرومیوں کا حساب بے باق کرلیا تھا۔

میں دن بھر سوتا ہی رہا۔ درمیان میں ایک بار آنکھ کھلی بھی تو اٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں جب اپنے کمرے سے شکم سیر ہو کر نکلا تو ہر طرف مشعلیں روشن ہو چکی تھیں۔ باہر جانے سے قبل میں نے اپنا لباس بھی تبدیل کرلیا تھا۔ اب میرے جسم پر منگول سرداروں جیسی وردی تھی۔ یہ وہی وردی تھی جو مجھے اس وقت دی گئی تھی جب میں مارکوف کو پکڑنے پہاڑیوں کی سمت گیا تھا اور دانستہ قید ہو گیا تھا۔ میں نے وہ لباس جان بوجھ کر پہنا تھا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ قلعے میں موجود زیادہ سے زیادہ افراد میری حیثیت سے واقف ہو سکیں۔ یہ وردی اس وقت بھی میرے جسم پر تھی جب میں مارکوف کی قید سے بظاہر رہا ہو کر رات کے وقت قلعے کے پھاٹک پر پہنچا تھا۔ اصولاً" قلعے کے محافظوں کو میرے جسم پر ایک منگول سردار کی وردی دیکھ کر قلعے کا پھاٹک کھول دینا چاہئے تھا مگر انہوں نے خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ان کے لیے اجنبی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی دشمن بھی اس بھیس میں قلعے کے دروازے تک پہنچ سکتا ہے۔ کسی منگول سردار کو ہلاک کر کے اس کی وردی حاصل کرلینا کوئی ایسی ناممکن بات تو نہیں۔ میں اسی اجنبیت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ کئی بار ابو نصار بھی مجھ سے کہہ چکا تھا کہ میں وردی پہنا کروں مگر پہلے میں نے ایسا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

میرے قدم اس وقت قلعے کے پھاٹک ہی کی جانب اٹھ رہے تھے اور یہ وہی راستہ تھا جہاں گزشتہ شب مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ شاید گزشتہ شب مجھے اس مخصوص حصے کی طرف نہ جانے دیا جاتا کیونکہ میرے جسم پر وردی نہیں تھی۔ یہ بات رات ہی کو مجھے وردی سے معلوم ہوئی تھی کہ پھاٹک بند ہو جانے کے بعد کسی منگول سردار کے سوا ادھر کوئی نہیں جا سکتا تھا۔

میں چوکنا انداز میں ارد گرد کا جائزہ لیتا ہوا چل رہا تھا۔ اس روز میں نے بطور خاص یہ بات محسوس کی کہ راستے میں مجھے جو محافظ یا پہریدار ملا' اس نے میرا ادب کیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ادب میرا نہیں اس وردی کا تھا جو میرے جسم پر تھی۔

میں بہت جلد اس حصے تک پہنچ گیا جہاں قدم قدم پر مشہور محافظ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے ان میں سے کسی نے نہیں روکا۔ میں جس راہداری سے گزر رہا تھا اس کی ایک جانب قلعے کی فصیل تھی اور دوسری جانب اسلحہ خانے کی پچھلی دیوار! اوپر کھلا آسمان تھا۔ آخر وہ چوڑی راہداری چند سیڑھیوں پر ختم ہوئی جن پر چڑھ کر پھاٹک تک پہنچا جا سکتا تھا۔ پھاٹک بند تھا اور تقریباً" نصف درجن کلہاڑے بردار وہاں چوکنا کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں موجود محافظ اور دوسرے پہریدار مجھے دیکھ کر اور بھی مستعد نظر آنے لگے تھے۔ غالباً" وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں معائنہ کرنے آیا ہوں۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر کلہاڑے برداروں تک پہنچا اور وہ میری طرف متوجہ ہو گئے' پھر ان میں سے ایک مودب انداز اختیار کرتے ہوئے سر جھکا کر بولا۔

"اے معزز سردار! کیا تو اس وقت باہر جانے کا قصد رکھتا ہے؟"

"نہیں!" میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ میرا انداز قطعی افسرانہ تھا۔ "تو نے یہ کیسے سمجھا؟"

"تیرے سیڑھیاں چڑھنے سے!" اسی کلہاڑی بردار نے جھک کر کہا۔ "اگر تجھے باہر جانا نہ ہوتا تو سیڑھیاں چڑھ کر یہاں تک آنے کی زحمت کیوں اٹھاتا! اگر میں غلط سمجھا تو مجھے معاف کر دے؟"

میں نے کلہاڑی بردار کو یہی بتایا کہ وہاں معائنے کی غرض سے آیا تھا۔ میں کچھ دیر ان کلہاڑے برداروں سے باتیں کرتا رہا جن کا تعلق قلعے کے حفاظتی امور سے تھا مگر میرا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ مجھے پہچان لیں۔ میں نے انہیں اپنا نام بھی بتا دیا تھا۔

واپسی میں بھی میں نے کئی مسلح محافظوں سے رک کر باتیں کیں۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ افراد کی نظر میں آجاؤں اور وہ مجھے پہچاننے لگیں۔ کسی منگول

سردار کا اس طرح معمولی محافظوں سے گفتگو کرنا یاد رکھی جانے والی ہی بات تھی۔

اس مخصوص حصے کی حدود سے باہر آتے ہوئے میری نگاہ نے فصیل کا جائزہ لیا جو پھاٹک تک چلی گئی تھی۔ میں کچھ دیر وہاں ٹھہرا بھی! میں جہاں کھڑا ہوا تھا وہاں نیم تاریکی سی تھی اور دور تک سناٹا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر کسی طرح وہاں سے فصیل پر چڑھنے کے بعد سینے کے بل رینگتے ہوئے پھاٹک تک پہنچا جا سکے تو پھاٹک تک پہنچنے والا، صرف وہاں متعین کلہاڑے برداروں ہی کی نظروں میں آئے گا اور طویل راہداری میں قدم قدم پر موجود مسلح محافظ یا پہریدار اسے نہیں دیکھ سکیں گے۔

میں جب لوٹ کر اپنے کمرے میں پہنچا تو میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ رات گئے تک میں اسی معاملے پر سوچتا رہا۔ مجھے امید تھی کہ سیوری ضرور آئے گی اس لیے میں نے دریچہ کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا اس سلسلے میں سیوری سے بھی مشورہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ذہین تھی اور بہتر مشورہ دے سکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ مجھ سے زیادہ باخبر تھی۔ اس سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم اٹھانا خطرناک ہو سکتا تھا۔ انتظار کی ساعتیں ختم ہوئیں اور وہ آ گئی۔ میں اس وقت تک کوئی آہٹ نہ سن سکا تھا جب تک کہ وہ دریچے پر نہ چڑھ گئی تھی۔ وہ بہت محتاط تھی اور ننگے پیر آئی تھی تاکہ اس کے قدموں کی چاپ نہ ابھرے۔

وہ گزشتہ رات سے بھی زیادہ حسین اور تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔ غالباً وہ بھی میری طرح دن بھر سوتی رہی تھی۔

اس نے دریچے سے اترتے ہی اسے اندر سے بند کر دیا تھا اور اب میری جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہ میرے قریب آ بیٹھی، اتنی قریب کہ اس کے جسم سے میرا جسم مس ہو رہا تھا۔

"تم اب تک جاگ رہے ہو؟ کیا میرا انتظار کر رہے تھے؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلائی، پھر بولا۔ "میں نے آج پھاٹک اور اس مخصوص حصے کا جائزہ لیا اور میرے ذہن میں بہت سی باتیں آئیں۔ میں تم سے بھی مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"میرا مقصد یہ ہے کہ پھاٹک پر متعین کلہاڑے برداروں کے سوا اس شب میں کسی کی نظر میں نہ آؤں جس شب، مارکوف حملہ کرے۔" میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"مگر کیوں، تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟" وہ کسی قدر الجھن آمیز انداز میں بولی۔

"صرف احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے!" میں نے جواب دیا، پھر کہا۔ "سیوری! کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے صرف روشن پہلوؤں کو سامنے نہیں رکھنا چاہئے بلکہ تاریک پہلوؤں پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے۔ فرض کرو کہ مارکوف حملہ کرنے کے باوجود ناکام ہو جائے اور اسے شکست کھا کر فرار ہونا پڑے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا یہ بات چھپی رہ سکے گی کہ پھاٹک میرے حکم پر کھولا گیا تھا؟ پھر اس کے بعد کیا مجھے زندہ چھوڑا جا سکتا ہے؟"

میری بات میں وزن تھا اسی لیے سیوری سوچ میں پڑ گئی، پھر کچھ دیر بعد بولی۔ "مجھے اعتراف ہے کہ تم بہت دور اندیش ہو لیکن وہ کلہاڑی بردار تو بہرحال اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ انہوں نے تمہارے حکم پر پھاٹک کھولا تھا۔"

"ہاں مگر صرف اس صورت میں جب وہ زندہ بچ سکیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں اس سلسلے میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔ اول تو میں ہی یہ کوشش کروں گا کہ ان میں کوئی زندہ نہ بچے اور اگر کوئی پھر بھی زندہ بچ گیا تو اس سلسلے میں مارکوف کو پہلے سے مطلع کیا جا سکتا ہے۔ وہ قلعے میں داخل ہوتے ہی پہلے ان

لاڑی برداروں کو ختم کردے گا۔"

"یہ ذرا مشکل معاملہ ہے۔" سیوری نے میرے
ال سے اختلاف کیا۔ "تمہیں پتا ہی چل گیا ہوگا کہ
الک پر ایک وقت میں کم سے کم نصف درجن
لاڑی بردار ضرور ہوتے ہیں۔ تم تنہا ہونے کے
ان سے کس طرح نمٹ سکو گے؟ اول تو یہی
ناک قدم ہوگا لیکن بالفرض اس بات کو قابل عمل
یم بھی کرلیا جائے تو ضروری نہیں کہ پھاٹک کھلتے
فورا" مارکوف قلعے میں داخل ہوجائے۔ پھر یہ بھی تو
ان ہے کہ کوئی کلہاڑے بردار بچ کر نکلنے میں کامیاب
جائے۔ ویسے ان کلہاڑے برداروں سے نمٹنے کی
ئی اور صورت بھی سوچی جاسکتی ہے لیکن اصل
لہ تو کسی کی نظر میں آئے بغیر ان تک پہنچنا ہے جو
رے خیال میں ناممکن ہے۔ تم نے یقیناً" اس سلسلے
ں کچھ نہ کچھ سوچا ہوگا۔" یہ کہہ کر سیوری خاموش
ئی۔

میں نے اسے فصیل پر چڑھ کر پھاٹک تک پہنچنے
ے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی لکڑی کی
ڑھی مل جائے تو فصیل پر چڑھا جاسکتا ہے۔"

"لکڑی کی سیڑھی تو خیر مل جائے گی مگر یہ ممکن
یں کہ تم پہریداروں کی نظر سے بچ سکو۔" سیوری
ولا۔

"کیوں؟ میں نے خود وہاں کا جائزہ لیا تھا۔ وہ جگہ
لی محفوظ ہے، نیم تاریک اور سنسان!"

"تم اگر اوپر نظر اٹھا کر دیکھتے تو کچھ فاصلے پر ہی
یں فصیل کا برج نظر آجاتا جہاں ہر وقت پہریدار
تے ہیں۔ فصیل پر چڑھنے کی صورت میں تم ان کی
ظر سے نہیں بچ سکو گے۔ اس کے علاوہ تم نے شاید یہ
ی نہیں سوچا کہ فصیل پر سینے کے بل رینگتے ہوئے
ا تم کسی نظر میں آئے بغیر پھاٹک تک پہنچ بھی گئے تو
صیل سے نیچے کیسے اترو گے؟ اگر یہ بھی مان لیا جائے
ا بلندی کے باوجود فصیل سے نیچے کود جاؤ گے تو کیا
لاڑے بردار فورا" ہی بغیر کچھ سوچے سمجھے تمہارے
م کے ٹکڑے نہ کردیں گے؟" سیوری نے کہا۔

"مگر میرے جسم پر جو وردی ہوگی، کیا اسے دیکھنے
کے باوجود وہ مجھ پر حملہ کردیں گے؟" میں شکست
خوردہ سے لہجے میں بولا۔

"رات کے وقت وہ اس طرح کسی کو فصیل سے
کودتے دیکھ کر وردی پر غور نہیں کریں گے۔ بھلا کسی
منگول سردار کو اس طرح فصیل سے کود کر وہاں پہنچنے
کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے!" سیوری نے اپنی
بات کے حق میں دلیل دی۔

اس کی دلیل مضبوط تھی۔ مجھے خاموش ہونا پڑا، پھر
میں سوچ میں ڈوب گیا۔

"سارا جھگڑا اس بات سے پیدا ہوا ہے کہ تم
پہریداروں کی نظر میں نہیں آنا چاہتے۔" سیوری مجھے
خاموش اور فکر مند دیکھ کر بولی۔ "اگر تم اپنے ذہن
سے یہ خدشہ نکال دو کہ مارکوف ناکام بھی ہوسکتا ہے تو
پھر کوئی خطرہ مول لینے یا ہنگامہ کھڑا کرنے کی ضرورت
نہیں۔"

"ہنگامہ! میں بڑبڑایا اور جیسے اس ایک لفظ نے
میرے ذہن میں روشنی کردی۔ میں چند لمحے بعد
سیوری سے مخاطب ہوا۔ "اگر قلعے کے اندر اس
وقت کوئی ایسا ہنگامہ ہوجائے کہ تمام پہریدار ادھر دوڑ
پڑیں تو بات بن سکتی ہے۔"

"ہاں یہ ممکن ہے۔" سیوری نے میری تائید میں
کہا۔ "لیکن وہ کیا ہنگامہ ہو کہ پہریدار اپنی جگہ
چھوڑنے پر مجبور ہوجائیں؟" یہ کہہ کر سیوری بھی
سوچ میں پڑ گئی، پھر کچھ دیر سرہلاتی ہوئی خود کلامی کے
سے انداز میں بولی۔ "ہاں یہی ایک صورت ممکن ہے
اور آسان بھی!"

"قلعے کے کسی حصے میں آگ لگادی جائے اور آگ
اتنی تیز ہو کہ اس پر فوری قابو ممکن نہ ہو۔" سیوری
نے جواب دیا، پھر چند لمحے توقف کے بعد بولی۔ "اور
آگ لگانے کے لیے ذخیرہ خانہ مناسب ہے۔ وہاں
مشعلوں کے لیے بڑی تعداد میں پگھلی ہوئی چربی رکھی
جاتی ہے۔ اگر چربی آگ پکڑ لے گی تو اسے بجھانا
آسان نہ ہوگا۔"

میں نے سیوری کے خیال سے اتفاق کیا' پھر بولا۔
"تو پھر یہ ذمے داری تمہیں قبول کرنی ہوگی۔"
"ٹھیک ہے۔" اس نے رضامندی ظاہر کی' پھر کہا
"لیکن ابھی کلہاڑے برداروں کا مسئلہ اپنی جگہ ہے۔ وہ بہرحال اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے۔ یوں بھی ذخیرہ خانہ' پھاٹک سے کافی دور ہے۔"
"تم زہر تو مہیا کر ہی سکتی ہو۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سیوری سے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں پھر بولا۔ "کیا ان کلہاڑے برداروں کو شراب میں زہر ملا کر نہیں دیا جا سکتا؟"
"ممکن تو ہے مگر پہرہ دیتے ہوئے شراب نوشی ممنوع ہے۔ پھر یہ کہ ان تک شراب پہنچائے گا کون؟" سیوری نے دریافت کیا۔
"زہر آلود شراب کا برتن میں خود اپنے ساتھ چھپا کر لے جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "اور جب میں خود انہیں شراب پینے کی اجازت دوں گا تو وہ یہ بات فراموش کر دیں گے کہ پہرہ دیتے ہوئے شراب نوشی ممنوع ہے۔ میں ان پر یہ ظاہر کروں گا جیسے ان کی فرض شناسی سے خوش ہو کر بطور انعام انہیں شراب بخش رہا ہوں۔"
"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" سیوری تائید میں بولی۔
اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میں برج میں موجود پہرداروں کی طرف سے فکرمند تھا۔ وہ مارکوف کو دور ہی سے قلعے کی طرف آتا ہوا دیکھ سکتے تھے' اور پھر جب تک مارکوف قلعے کے پھاٹک تک پہنچتا' وہ اہل قلعہ کو ہوشیار کر سکتے تھے۔ اپنے اسی خدشے کا اظہار میں نے سیوری سے بھی کیا۔
"ان کا بندوبست بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔" سیوری نے جواب دیا۔ "میں اس سلسلے میں سوچ چکی ہوں۔ قلعے کی دونوں سمتوں میں موجود برجوں کے دروازے نیچے سے بند کر دیئے جائیں گے تاکہ پہردار باہر آ کر دوسروں کو خطرے سے باخبر نہ کر سکیں۔"
"مگر وہ دروازہ بند ہونے کے بعد برج پر کھڑے ہو کر چیخ بھی تو سکتے ہیں۔ وہ سب چیخ چیخ کر نیچے موجود لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں اور ان سے دروازہ کھولنے کے لیے کہہ سکتے ہیں۔" میں نے ایک اور ممکنہ خدشے کا اظہار کیا۔
"لیکن تم شاید یہ بھول گئے کہ اس وقت پہردار نیچے موجود نہیں ہوں گے۔" سیوری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ پہلے ہی بجھانے جا چکے ہوں گے۔"
سیوری کی بات سن کر میں نے ایک طویل سانس لیا۔ خطرے سے بچنے کی راہ نکل ہی آئی تھی۔ میں نے اپنے ذہن کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تو پہلی بار مجھے سیوری کے قرب کا خیال آیا۔
"کیا آج مار نہیں کھاؤ گی؟" میں نے شوخ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔
"نہیں!" اس نے خلاف توقع شرما کر گردن جھکا لی۔
"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔
"کچھ دن مار کھانے کے لیے نہیں ہوتے۔" اس نے نظر جھکائے ہوئے جواب دیا۔
مجھے اس وقت اختی یاد آ گئی۔ اس نے بھی کچھ اسی طرح کی عجیب بات کہی تھی۔ میں نے سیوری سے وضاحت چاہی مگر وہ بات ٹال گئی۔
"یہ بتاؤ یوغا کہ اب کون سا دن مقرر کیا جائے؟ بہتر یہ ہے کہ برقائی خان کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی قلعے پر قبضہ ہو جائے۔ میں مارکوف کو کب جواب بھیجوں؟" میں نے جواب دیا۔
تو پھر ٹھیک ہے' میں کل رات کی بجائے پرسوں رات آؤں گی۔ اسکے بعد کوئی دن مقرر کر لیں گے۔"
یہ کہہ کر سیوری اٹھ کھڑی ہوئی۔
دل تو نہیں چاہتا تھا کہ میں اسے جانے کی اجازت دے دیتا مگر مجبوری تھی۔ کوئی ایسی بات یقیناً" تھی جس سے میں ناآشنا تھا اور جو قرب میں مانع تھی ورنہ سیوری یوں نہ چلی جاتی۔ سیوری کی آمد کے بعد میں ذہنی طور پر اس سے قرب پر آمادہ ہو چکا تھا اس لیے وہ چلی بھی گئی تو کافی دیر مجھے نیند نہ آ سکی۔
پورے دو دن میں نے قلعے کا اچھی طرح جائزہ لینے

ں گزارے' اور جس شب سیوری مجھ سے ملی' میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ جو کچھ سوچ لیا گیا' وہی مناسب ہے۔

اس شب دونوں برجوں کے دروازے بند کرنے کی ذمہ داری بھی میں نے سیوری کے سپرد کردی۔ سیوری اس سلسلے میں اپنی ہم وطن لڑکیوں سے کام لے سکتی تھی۔

میرے کہنے پر مارکوف کو یہ پیغام روانہ کردیا گیا وہ دو روز بعد ٹھیک نصف شب کے وقت قلعے کے دروازے تک پہنچ جائے! اسے پھاٹک کھلا ہوا ملے گا۔

میرے اور سیوری کے درمیان طے پایا تھا کہ مقررہ شب میں ذخیرہ خانے میں آگ لگنے کے کچھ دیر بعد ہی پھاٹک کی طرف روانہ ہوجاؤں مگر مخصوص وقت میں داخل ہونے سے پہلے اطمینان کرلوں کہ پہریدار وہاں سے جاچکے ہیں۔ سیوری نے بتایا تھا کہ ذخیرہ خانے میں آگ لگنے کے بعد ہی دونوں برجوں کے دروازے بند کردیئے جائیں گے۔ اس دوران میں سیوری نے مجھے زہر بھی فراہم کردیا تھا جو میں نے شراب میں ملا دیا اور وہ زہریلی شراب ایک ایسی چھوٹی سی صراحی میں ڈال کر رکھ دی تھی جسے باآسانی لباس میں چھپایا جاسکتا تھا۔

اس دوران میں مجھے ایک اور خطرناک واقعہ پیش آیا۔ اگر بروقت ابو نصار مجھے نہ بچالیتا تو میں زندگی کی سرحدیں عبور کرچکا ہوتا۔ دشمن نے بہرحال بھرپور وار کیا تھا۔ یہ اس روز کا واقعہ ہے جس کی دوسری شب مارکوف کو حملہ کرنا تھا۔

واقعہ یہ ہوا کہ میں سرشام حسب دستور قلعے کا جائزہ لے کر اپنے کمرے میں لوٹا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کمرے میں موت گھات لگائے بیٹھی ہے۔ میں نے جوتے اتارے اور اپنے بستر کی طرف بڑھا۔ اسی وقت معاً میری نگاہ بستر کی چادر پر پڑی اور میں اچھل پڑا۔ چادر پر ایک سیاہ سانپ پھن کاڑھے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ نیام سے تلوار نکالی اور قدم آگے بڑھا کر سانپ پر حملہ کیا مگر عین اسی لمحے سانپ نے اپنا سر جھکا لیا اور میرا وار خالی گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس پر دوبارہ حملہ کرسکتا اس نے میرے دائیں پیر کے انگوٹھے کو ڈس لیا۔ میرے منہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی۔ ڈسنے سے اتنی تکلیف بہرحال نہیں ہوئی تھی کہ میں چیخ پڑتا' وہ چیخ دہشت کے سبب میرے منہ سے نکلی تھی' موت کی دہشت!

سانپ مجھے ڈستے ہی نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا اور میں اپنا انگوٹھا پکڑے ہوئے چیخے جارہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں! مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا لگ رہا تھا۔

"کیا ہوا بوغا' کیا ہوا؟ دروازہ کھول!" معاً ابو نصار کی تیز آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور اسی کے ساتھ ساتھ دروازہ پیٹا جانے لگا۔

میں لنگڑاتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا اور دروازہ کھول دیا' پھر وہیں بیٹھ گیا۔

"مجھے سانپ نے..... سانپ نے کاٹ لیا....."

"کہاں" کس جگہ کاٹا ہے؟" ابو نصار نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔

"یہاں!" میں نے پیر کے انگوٹھے کی طرف اشارہ کیا جو نیلا پڑتا جارہا تھا۔

ابو نصار نے کمرے میں نظر دوڑائی' اور پھر مجھ سے بغیر کچھ کہے الٹے پاؤں بھاگا۔ اسے لوٹ کر آنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی صندوقچی تھی اور دوسرے ہاتھ میں رسی! وہ میرے قریب بیٹھ گیا' پھر اس نے وہ رسی کس کے میرے گھٹنے کے نیچے باندھ دی۔ اس نے رسی اتنی سختی سے باندھی تھی کہ دوران خون رک گیا تھا۔ رسی باندھتے ہی اس نے اپنی کمر سے بندھا ہوا خنجر نکالا اور میرا انگوٹھا چیر دیا' پھر مجھ سے بولا۔ "گھبرا مت بوغا! کچھ نہیں ہوگا۔"

میں نے تکلیف کی شدت سے ہونٹ بھینچ لیے۔ چیرا لگنے سے مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ انگوٹھے

سے اب گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔

ابو نصار نے جلدی سے اپنی صندوقچی کھولی اور اس میں سے ایک پڑیا نکال لی جس میں کوئی سفوف تھا۔ وہ سفوف اس نے مجھے پانی میں گھول کر پلا دیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ میرے پاس سانپ کے زہر کا تریاق موجود تھا۔ اب تیری زندگی کو کوئی خطرہ نہیں بوغا!" ابو نصار نے پھر کہا۔

کچھ دیر بعد ہی ابو نصار مجھے خادموں کے ذریعے اٹھوا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس نے خادموں کو حکم دیا تھا کہ وہ میرے کمرے کی اچھی طرح تلاشی لیں مگر جو کنا ہو کر کیونکہ وہاں سانپ بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے ابو نصار کے کمرے میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ غنودگی محسوس ہونے لگی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"بوغا، بوغا!" معاً ابو نصار نے مجھے پکارا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ بولا۔ "تجھے آج رات بالکل نہیں سونا! اگر تو سو گیا تو تریاق بیکار ہو جائے گا۔ تیرا چوبیس گھنٹے جاگنا ضروری ہے۔ اس کے بعد تو سو سکتا ہے۔"

میں یہ سن کر گھبرا گیا اور غنودگی سے بچنے کے لئے ابو نصار سے باتیں کرنے لگا۔

"اے ابو نصار! مجھے شک ہے کہ میرے کمرے میں دانستہ کسی نے سانپ چھوڑا تھا۔" میں نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کیونکہ اس سے قبل یہاں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔" ابو نصار نے میری بات سے اتفاق کیا۔ "میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے لیکن بغیر کسی ثبوت کے اسے مورد الزام ٹھہرانا انصاف کے خلاف ہے۔"

"غالباً" تیرا شک بجو کا ہے۔" میں بولا۔

"ہاں! وہ بڑا کینہ پرور شخص ہے۔ پھر یہ کہ اس کے سوا قلعے میں تیری کسی سے دشمنی بھی نہیں رہی۔"

وہ رات بڑی مشکل سے گزری۔ مجھ پر بار بار شدید نیند نے حملہ کیا اور بار بار ابو نصار مجھے سونے سے روکتا رہا۔ اس نے کئی بار میرے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے بھی مارے۔

صبح ہوئی تو اس نے میرے انگوٹھے کے زخم پر لا کر پٹی باندھ دی۔ وہ بھی رات بھر میرے ساتھ جا رہا تھا۔ ابو نصار نے صبح کی عبادت سے فارغ ہو جب اپنی کتاب کھولی اور پڑھنے لگا تو ایک پھر مجھے آنے لگی حالانکہ اس نے عبادت کرنے سے قبل کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ میں لمحے بھر کو بھی آنکھیں کر ں۔ میں نیند سے بچنے کی جدوجہد کرنے لگا کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے آنکھیں بند کرتے ہو سوچا تھا کہ سوؤں گا نہیں، صرف آنکھیں بند کئے رہوں گا۔ آنکھیں بند کرنے سے مجھے بہت سکو محسوس ہوا، اور پھر میرا ذہن نیند کی وادیوں میں بھ ہی والا تھا کہ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں میرے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑے تھے۔

"میں نے تجھ سے کہا تھا کہ سونا نہیں ہے!" نصار نے مجھے ڈانٹا، پھر کپڑے سے میرا منہ پونچھنے لگا

وہ دن بھی بڑی مشکل سے گزرا اور شام ہوئی، چوبیس گھنٹے پورے ہو گئے۔ ابو نصار نے میرے پا سے رسی کھول دی اور بولا۔ "تجھے نئی زندگی مبارک بوغا! اگر تو اس دوران سو جاتا تو پھر تیری آنکھ کبھی کھل پاتی مگر جسے خدا بچانا چاہے اسے کون مار سکتا! اب تو اٹھ کر بیٹھ جا!"

میں نے اس کے کہے پر عمل کیا۔ پاؤں میں سخ سنسناہٹ ہو رہی تھی جو غالباً" دوران خون دوبارہ ہو ہونے کے سبب تھی۔

"میرا خیال ہے کہ کچھ دیر بعد تو خود اس قا ہو جائے گا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے اور ا کمرے تک چل کر جا سکے۔ اب تو سو سکتا ہے۔" نصار نے پھر کہا۔

کچھ دیر بعد میں واقعی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ منع کر کے باوجود ابو نصار نے مجھے سہارا دے کر میر کمرے میں پہنچایا کیونکہ انگوٹھے میں زخم ہونے سبب میں لنگڑا کر چل رہا تھا۔

"اے ابو نصار! تو اب جا کر سو جا! تجھے بھی نا

میری وجہ سے جاگنا پڑا۔" میں نے اپنے بستر پر دراز ہو کر کہا۔

تو اٹھ کر اندر سے دروازہ تو لگا لے!" ابو نصار۔

میں نے بمشکل اٹھ کر دروازہ بند کیا اور بستر پر آکر دراز ہو گیا' پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں لیکن اس سے پہلے کہ میں سو جاتا ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ یہ وہی شب تھی جب مارکوف کو قلعے پر حملہ کرنا تھا۔ میں گھبرا کر ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اگر میں سو گیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ میں نے سوچا۔ مجھے آج کی رات بہت اہم کام انجام دینا ہے۔

میری آنکھوں سے آگ سی نکل رہی تھی اور میں جاگ رہا تھا۔ میں نے نیند سے بچنے کے لیے بار بار اپنی کلائیوں اور بازوؤں پر کاٹا اور انہیں زخمی کر لیا۔ اب میرے پاس ابو نصار بھی نہیں تھا جو مجھے سونے سے روک سکتا۔ میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا مگر اس کے باوجود میری سماعت متوقع ہنگامے کی آوازیں سننے کے لیے بے چین تھی' وہ ہنگامہ جو قلعے کے ذخیرہ خانے میں آگ لگتے ہی برپا ہونا تھا۔ مجھے اس کے بعد ہی اپنے کمرے سے نکلنا تھا۔

وقت جیسے اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا یا مجھے ہی ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کب تک میں ہنگامہ برپا ہونے کا انتظار کرتا رہا' اور پھر اچانک اونگھتے اونگھتے اچھل پڑا۔ کیا کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا ہے؟ میں نے سوچا۔ اسی وقت دوسری بار دستک ہوئی۔ میرے دروازے پر کوئی نہیں تھا۔ غالباً" ابو نصار کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا مگر کیوں؟ میرے اونگھتے ہوئے ذہن نے سوچا اور کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا۔

چند لمحے بعد ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی' پھر یکے بعد دیگرے کسی شخص اور ابو نصار کی آوازیں سنائی دیں مگر میں وہ باتیں نہ سن پایا جو کسی شخص اور ابو نصار کے درمیان ہوئیں۔ اس کے بعد ہی میں نے دور ہوتے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ مجھے دوبارہ دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں آئی تھی۔ میں سخت الجھن میں پڑ گیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا' باہر جا کر حقیقت حال معلوم کروں کہ اچانک ہنگامہ برپا ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ ذخیرہ خانہ میرے کمرے سے زیادہ دور نہیں تھا۔

وقت آگیا۔ میں نے سوچا اور زہر آلود شراب کی صراحی اپنے لباس میں چھپا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں دروازہ کھول کر باہر آیا تو یہ دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ ابو نصار کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ابو نصار غائب تھا۔ میں لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا تو مجھے ہر طرف سے شور اور ہنگامے کی آوازیں سنائی دیں۔

اور پھر جب میں ذخیرہ خانے کے قریب پہنچا تو میری ہمت جواب دے گئی۔ ذخیرہ خانے میں آگ نہیں لگی تھی۔ پھر یہ شور کیسا ہے' یہ ہنگامہ کیوں برپا ہے؟ میں نے سوچا۔ اسی وقت مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ انتہائی تیزی کے ساتھ میرے قریب سے بھاگتا ہوا گزرا۔ میں نے چاہا کہ سپاہیوں کو آواز دے کر روک لوں اور ان سے حقیقت حال دریافت کروں مگر اس وقت تک وہ دور نکل چکے تھے۔

نیند سے بوجھل ذہن اور لڑکھڑاتے قدموں کے باوجود میں قلعے کے اس مخصوص حصے کی طرف بڑھ رہا تھا جس سے گزر کر پھاٹک تک پہنچا جا سکتا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی مجھے ایک ایک قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا مگر میں اس مخصوص حصے کی طویل راہداری تک پہنچ ہی گیا۔ خلاف توقع راہداری سنسان پڑی ہوئی تھی اور دور تک کوئی پہریدار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کہیں آخری وقت میں کسی وجہ سے سیوری نے پہریداروں کو وہاں سے ہٹانے کی کوئی اور بہتر تدبیر تو نہیں سوچ لی؟ میرے ذہن میں خیال آیا مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور اگر ایسا کیا تھا تو مجھے آگاہ ضرور کرنا چاہیے تھا۔ میں یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک عقب سے بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بہت سے مسلح سپاہی اسی سمت بھاگے چلے آرہے تھے اور ان کی رفتار بہت تیز تھی۔

میں ایک دم لڑکھڑاتا ہوا راہداری کے درمیان میں آگیا اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخا۔ "ٹھہرو' رک

جاؤ!"

ان کی تعداد اتنی تھی کہ راہداری بھر گئی تھی اور اب وہ بھاگتے ہوئے میرے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔

رکتے رکتے ایک سپاہی مجھ سے ٹکرا گیا اور میں لہرا کر گر پڑا۔ اسی وقت ایک اور سپاہی کے پاؤں نے میرا زخمی انگوٹھا کچل ڈالا۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور درد کی ایک تیز لہر میرے وجود میں تیر گئی۔ پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

مجھ کچھ یوں محسوس ہوا کہ میں صحرا کے تپتے ریت پر پڑا ہوں۔ اور پھر یوں لگا کہ بارش سی ہونے لگی۔ یہ خواب ہے کہ حقیقت؟ میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ پانی کی بوچھار نے مجھے ٹھنڈک کا احساس دلایا۔ میں کہاں ہوں؟ شاید میں نے کہنا چاہا مگر میرے ہونٹوں سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

"بوغا۔ بوغا!" کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ اس نے غالباً میرے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھ لئے تھے۔

اور پھر میرا ذہن بیدار ہونے لگا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ میں کہاں اور کن حالات میں تھا! میں نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھولتے ہی میری نگاہ سیوری کے چہرے پر پڑی وہ بدحواس سی نظر آ رہی تھی۔

"تمہیں ہوش آ گیا بوغا! اب میں جا رہی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سیوری!" میں نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور اسی وقت میرے زخمی انگوٹھے میں ٹیس اٹھی میں کراہ اٹھا۔

"تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے، آرام کرو! اس وقت میرا یہاں مزید رکنا خطرناک ہو سکتا ہے۔" سیوری نے کہا۔

"لیکن..... لیکن میں تو اسی راہداری....."

"ہاں تم اسی راہداری میں بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔" سیوری نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہاں سے میں ہی تمہیں اٹھا کر یہاں لائی تھی۔"

"مگر یہ سب ہوا کیا؟" میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال مجھے کچھ زیادہ علم نہیں۔ بہرحال کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔"

"تم نے ذخیرہ خانے میں آگ کیوں نہیں لگائی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے بوغا!" وہ جلدی سے بولی۔ "اس وقت مجھے جانے دو۔!"

میں کوشش کے باوجود نہ اسے روک سکا اور نہ کچھ معلوم کر سکا سیوری مجھے جھنجلاہٹ میں مبتلا چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ مجھے اس وقت سیوری ہی پر نہیں، خود پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ آخر مجھے کیا ہو گیا تھا! کیا میں اتنا ہی مجبور و بے بس ہو کے رہ گیا تھا کہ خود سے کچھ بھی معلوم نہ کر سکوں! نہیں بوغا، تو اتنا کمزور نہیں جتنا تو نے خود کو سمجھ لیا ہے۔ میرے کان میں جیسے کسی نے سرگوشی کی اور میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے ان سپاہیوں پر بھی سخت غصہ آ رہا تھا جو مجھے راہداری میں بے ہوش پڑا ہوا چھوڑ گئے تھے۔ کیا وہ اتنے ہی بدحواس تھے کہ انہیں میرے جسم پر موجود لباس بھی نظر نہیں آیا تھا؟ میں بہرحال ایک منگول سردار کے لباس میں تھا۔ کیا ان بدحواسوں نے میرے لباس پر بھی غور نہیں کیا تھا؟ میں یہی سوچتا رہا اور غصے سے کھولتا ہوا دروازے کی جانب بڑھتا رہا۔

تکلیف کے احساس پر اس وقت غصے اور جوش کا احساس غالب آ گیا تھا۔ اس لیے میں لنگڑا کر چلنے اور کراہنے کے باوجود اپنے کمرے سے نکل آیا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا! ں کمرے سے باہر آیا تو میری نظر خود بخود ابو نصار کے ہ کی طرف اٹھی۔ کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا ا اور ابو نصار وہاں نہیں تھا۔ ہنگامے اور شور کی وازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں مگر اب ان میں لی سی شدت نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہنگامہ رو ہونے والا ہے۔ میں نے ہنگامے کی آوازوں سے ندازہ لگایا کہ ان کا ہر مرکز قلعے کا صدر دروازہ تھا اسی لیے میرے قدم اسی سمت اٹھنے لگے۔ زہریلی شراب کا رتن اب بھی میرے ڈھیلے ڈھالے لباس میں چھپا ہوا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اب اسے استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

میں کچھ دیر بعد ہی ایک بار پھر اس راہداری میں پہنچ گیا جہاں بے ہوش ہو کر گرا تھا۔ وہ راہداری اب بھی خالی پڑی تھی۔

مجھے دور ہی سے قلعے کا دروازہ نظر آگیا تھا جہاں لاتعداد جلتی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں مسلح سپاہیوں کے تمتماتے چہرے نظر آرہے تھے۔ قلعے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور یہ بات میرے لیے تعجب خیز تھی۔ روشن مشعلیں دروازے کے باہر بھی دور تک نظر آرہی تھیں۔

عورت کتنی ہی ذہین اور بہادر ہو، بہرحال عورت ہوتی ہے، بے وقوف اور جلد دھوکا کھا جانے والی اور کمزور بھی ایک عورت تھی جس پر مجھے غصہ آرہا تھا۔ اس بے وقوف عورت کو اپنے لوگوں، اپنے ہم قوموں پر اندھا اعتماد تھا۔ میری سماعت میں اس وقت کمزوری کے کہے ہوئے لفظ گونج رہے تھے۔ کیا وہ لوگ غداری کریں گے جن کی بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں، ان لوگوں کی آغوش میں ہیں؟ کیا وہ خطرناک ہو سکتے ہیں جن سے جینے کا حق چھین لیا گیا ہے؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا بوغا!

"احمق کہیں کی!" میں بڑبڑایا۔

اگر غدار وہ نہیں تھے تو پھر کون تھا؟ پھر وہ کون تھا جس نے منگولوں کو مارکوف کے متوقع حملے سے باخبر کر دیا تھا؟

میں نے اس وقت قلعے کا دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ منگول بروقت چوکنا ہو گئے تھے۔ ان حالات میں اس کے سوا کچھ اور سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ سیوری کے ہم قوموں میں سے کسی ایک نے غداری کی ہے مگر میرے قیاسات غلط تھے۔ حالات و واقعات اس طرح پیش نہیں آئے تھے جس طرح میں نے سمجھا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔

میں لنگڑاتا ہوا سپاہیوں کے ہجوم تک پہنچ گیا۔ میں ان کے قریب پہنچا تو وہ ادھر ادھر سمٹ گئے تاکہ مجھے آگے بڑھنے میں دشواری نہ ہو۔ وہ یقیناً میرے جسم پر موجود لباس کا احترام کر رہے تھے۔ میرا نہیں! مجھے وہ وقت یاد آیا جب انہی کے ساتھی مجھے راہداری میں بے ہوش پڑا چھوڑ گئے تھے۔ میں ان پر قہر آلود نگاہ ڈالتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

سپاہیوں کے ہٹنے سے درمیان میں جو راستہ سا بن گیا تھا اس کے اختتام پر مجھے ایک آشنا چہرہ نظر آرہا

فرمائش

ایک خاتون ملبوسات کی دکان میں داخل ہوئیں اور فٹ پاتھ سے نظر آنے والے بڑے سے شوکیس کی طرف اشارا کرتے ہوئے بولیں۔

"آپ میرے لیے تھوڑی سی زحمت کریں گے، شوکیس میں لٹکا ہوا وہ غرارہ سوٹ نکال دیجیے۔"

"ضرور۔ ضرور" سیلز مین نے مستعدی سے کہا اور ایک عرصے سے شوکیس میں لٹکا ہوا غرارہ سوٹ نکال لایا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس سوٹ کا کوئی گاہک تو آیا۔

خاتون دکان سے رخصت ہوتے ہوئے بولیں۔

"بہت بہت شکریہ۔ اسے لپیٹ کر اندر رکھ دیجیے میں روزانہ فٹ پاتھ سے گزرتی تھی تو اسے دیکھ کر دل جلتا تھا۔"

تھا۔ وہ آشنا چہرہ ابو نصار کا تھا جس کے قریب ایک منگول سردار کھڑا ہوا تھا۔ ابو نصار اور وہ منگول سردار دروازے کے دائیں جانب کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے اور میرے درمیان خاصا فاصلہ تھا مگر شعلوں کی تیز روشنی میں وہ دونوں مجھے واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ مجھے ادھر آتا دیکھ کر سپاہی شاید یہی سمجھے تھے کہ میں ابو نصار تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ جس طرح ابو نصار مجھے دور ہی سے نظر آگیا تھا' اسی طرح اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب ابو نصار نے میری طرف اشارہ کر کے اپنے قریب کھڑے ہوئے سردار سے کچھ کہا۔ منگول سردار نے ابو نصار کی بات سن کر قریب ہی موجود سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

دو سپاہی تیزی سے میری جانب آئے۔ میں فوراً ہی کچھ نہ سمجھ پایا کہ وہ میری طرف کیوں بڑھے چلے آرہے ہیں۔ لیکن جب قریب پہنچ کر انہوں نے مجھے دائیں بائیں سے سہارا دیا تو میں سب کچھ سمجھ گیا۔ ابو نصار نے یقیناً "مجھے لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھتا دیکھ کر ہی ان سپاہیوں کو بھیجا تھا تاکہ وہ مجھے سنبھال لیں اور اس تک پہنچنے میں مدد کریں۔

سپاہی مجھے سہارا دیے ہوئے ابو نصار تک لے گئے۔ مجھے ابو نصار کے چہرے پر الجھن سی نظر آرہی تھی۔ وہ میرے قریب پہنچتے ہی مجھ سے مخاطب ہوا۔

"بونا! تو یہاں کیوں آگیا؟ تجھے تو اس وقت بہت گہری نیند سونا چاہئے تھا۔ ہنگامے سے تیری آنکھ کیسے کھل گئی؟"

"ہنگامہ ہی اتنا تھا کہ میں بیدار ہوگیا۔" میں نے جواب دیا' پھر فوراً" ہی سوال کیا۔ "لیکن..... لیکن اے ابو نصار! یہ ہنگامہ تھا کیسا؟"

"مارکوف!" ابو نصار نے ایک طویل سانس لیا۔ "اس نے شہر پر شب خون مارا ہے۔"

"شہر پر؟" میں بڑبڑایا

"ہاں شہر پر!" ابو نصار نے کہا۔ "وہ یہاں تک بھی پہنچ سکتا تھا لیکن اب اسے شہر ہی میں روک دیا گیا ہے۔ آج کی شب شاید اس باغی کے لیے آخری ثابت

شاعر مشرق

علامہ اقبال رح

کے شعری مجموعے

بانگ درا	36 روپے
بال جبریل	30 روپے
ضرب کلیم	30 روپے
کلیات اقبال	90 روپے

عمدہ کاغذ۔ اعلیٰ طباعت

آج ہی طلب فرمائیں

منگوانے کا پتہ:۔

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

ہو۔"

اگر میرا دل صاف اور ضمیر مطمئن ہوتا تو یقیناً" میں وہ بات براہ راست پوچھ لیتا جسے پوچھتے جھجک رہا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ منگولوں کو مارکوف کے حملے کی خبر کیسے معلوم ہوگئی! مگر میری زبان پر یہ بات نہ آسکی۔ میں قلعے کے باہر تک پھیلے ہوئے مسلح اور مستعد سپاہیوں کو دیکھنے لگا۔ وہ اس طرح چوکنا تھے جیسے کسی بھی لمحے انہیں دشمن پر جھپٹ پڑنے کا حکم دیا جانے والا ہو۔

ابو نصار مجھ سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ منگول سردار اس سے مخاطب ہوگیا۔ "اے ابو نصار! منگرال اور بجوکا کو گئے بڑی دیر ہوگئی اگر تیرا حکم ہو تو میں بھی....."

"نہیں!" ابو نصار نے منگول سردار کی بات کاٹ دی۔ "میں نے تجھے کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہاں روکا ہے۔ کیا تیری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی کہ مارکوف، بجوکا اور منگرال کا دھوکا دے کر قلعے کا رخ بھی کر سکتا ہے!"

"تو ٹھیک کہتا ہے اے ابو نصار!" منگول سردار ادب سے بولا۔

"بوغا! تو جا کر سو....."

ابو نصار کا جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ منگول سردار نے ایک بار پھر اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ وہ ایک سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ کر رہا تھا "وہ..... اے ابو نصار! وہ دیکھ!..... وہ یقیناً" مشعلیں ہیں۔ بجوکا اور منگرال واپس آرہے ہیں۔" منگول سردار نے کہا۔

"ممکن ہے تیرا خیال درست ہو۔" ابو نصار نے اس سمت دیکھتے ہوئے کہا جدھر منگول سردار نے اشارہ کیا تھا۔ "مگر یہ بھی ممکن ہے کہ تیرا خیال غلط ہو اور آنے والے دوست کی بجائے دشمن ہوں۔"

ابو نصار کا اشارہ پاتے ہی منگول سردار نے سپاہیوں کو پوری طرح تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ سپاہی ایک آہنی دیوار کی طرح قلعے کے دروازے پر جم گئے۔ جو باقی قلعے میں تھے، وہ بھی منگول سردار کا حکم سن کر باہر پہنچ گئے، پھر خود منگول سردار بھی ان کے درمیان پہنچ گیا۔ یہ سب کچھ انتہائی تیزی کے ساتھ ہوا۔ اب اگر آنے والے دشمن بھی ہوتے تو ان سے باآسانی سے نمٹا جا سکتا تھا۔ ابو نصار اور میں قلعے کے دروازے پر تنہا رہ گئے۔

ابو نصار اور میں، دونوں ہی ان مشعلوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھے جو لحہ بہ لحہ قریب ہوتی جارہی تھیں۔ غالباً" اسی لیے ابو نصار نے دوبارہ مجھ سے یہ نہیں کہا کہ جا کر سو جاؤں۔ اس کی تمام وجہ آنے والوں کی طرف تھی جو دوست بھی ہوسکتے اور دشمن بھی!

پھر وہ لحہ بھی آیا جب میرا اضطراب اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور میں یہ بھی بھول گیا کہ میرے برابر ابو نصار کھڑا ہوا ہے۔ وہ منظر جو میری آنکھوں نے دیکھا تھا، اتنا ہی چونکا دینے والا اور غیر یقینی تھا کہ میں بے اختیار ہوگیا۔

"یہ..... یہ کیا ہوا؟ کیا ہوا یہ؟" میرے ہونٹ غیر ارادی طور پر حرکت میں آگئے۔ "بوغا! کیا کہہ رہا ہے؟" ابو نصار کی آواز سن کر مجھے جیسے ہوش آگیا۔

"کچھ..... کچھ نہیں اے ابو نصار!" میں جلدی سے بولا۔ "وہ..... وہ باغی آخر..... آخر اپنی سزا کو پہنچ ہی گیا۔ تو نے صحیح کہا تھا کہ یہ شب اس باغی کے لیے آخری ثابت ہوگی۔"

ابو نصار نے میری بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اس لیے میں دوبارہ وہ ہولناک منظر دیکھنے لگا جس نے میرے ہوش و حواس گم کردیئے تھے۔ وہ منظر اب پہلے سے بھی واضح نظر آنے لگا تھا کیونکہ آنے والے مزید قریب آگئے تھے اتنے قریب کہ مشعلوں کی روشنی میں ان کے چہرے دیکھ کر انہیں پہچانا جا سکتا تھا۔

سب سے آگے گھوڑے پر سوار شخص بجوکا تھا جس کے دائیں ہاتھ میں ایک نیزہ تھا اور وہ نیزہ ایک انسانی سر میں پیوست تھا۔ بجوکا کے گھوڑے کی زین سے ایک رسی بندھی ہوئی تھی جس کے دوسرے سرے سے ایک سر بریدہ جسم بندھا ہوا تھا جو زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ میری جگہ اگر کوئی دوسرا شخص بھی

ہوتا تو وہی اندازہ لگاتا جو میں نے لگایا تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ وہ کٹا ہوا سر مارکوف ہی کا ہو سکتا تھا اور سر بریدہ جسم بھی اسی کا!

زمین پر گھسٹتے ہوئے جسم کے بعد قیدیوں کا غول تھا۔ تمام قیدی رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور ان کے صرف پیر آزاد تھے تاکہ وہ خود چل سکیں۔ ان قیدیوں کو ایک دائرے کی صورت میں مسلح گھوڑ سواروں نے گھیر رکھا تھا۔ گھوڑ سواروں کے نیزے قیدیوں کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ قیدیوں کے ساتھ ساتھ ہی سپاہیوں سے ذرا ہٹ کر دوسرا منگول سردار منگرل اپنے گھوڑے پر سوار چلا آرہا تھا۔ اس کے بعد مشعل بردار سپاہیوں کے پرے کے پرے تھے۔

بجوکا میرا دشمن تھا اور مارکوف میرا دوست! ایک دشمن کے ہاتھوں میرا ایک دوست قتل ہو چکا تھا مگر حالات ایسے تھے جنہوں نے دوستی اور دشمنی کا مفہوم بدل کے رکھ دیا تھا۔ وہ منظر دیکھ کر میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے تھے مگر ظاہر ہے کہ میں لب کشائی نہیں کر سکتا تھا۔

آنے والے کچھ اور قریب آگئے۔ پھر اچانک ہی ساری فضا نعروں سے گونج اٹھی' سپاہی سردار بجوکا کے حق میں نعرے لگا رہے تھے اور وہ نعرے سن کر میرا خون کھول رہا تھا۔ میرے دشمن کی اس لیے مدح سرائی ہو رہی ہے کہ اس نے منگولوں کے ایک باغی مارکوف کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے سوچا۔

کسی نے سوچا بھی نہ ہو گا کہ شہر کیف کے رئیس اعظم میخائیل کا بیٹا مارکوف یوں مارا جائے گا۔ وہ مارکوف جس نے کم طاقت ہونے کے باوجود منگولوں کی ناک میں نکیل ڈال دی تھی' مارا جا چکا تھا۔

مجھے اس وقت مارکوف کا باپ میخائیل یاد آیا جسے میرے سامنے ہلاک کیا گیا تھا۔ میری آنکھوں میں اس کی موت کا منظر گھوم گیا۔ زمین پر چت لٹا کر اس کے سینے پر بائیں جانب گھونسے مارے گئے تھے تاکہ گھونسوں کی ضرب سے اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے۔ اسے اس طرح کیوں مارا گیا تھا؟ معاً میرے ذہن میں سوال ابھرا۔

اور پھر میں نے اپنے سوال کا جواب پالیا' وہ جواب جو میرے دشمن بجوکا کے لیے موت کا پیغام ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ بجوکا نے مارکوف کا خون بہا کر چنگیز خان کے بنائے ہوئے ایک قانون کی کھلی خلاف ورزی کی تھی۔ یاسائے چنگیزی کے مطابق شاہی خاندان کے کسی شخص کا خون بہانا ممنوع تھا خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو' اور یاسا کے کسی قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کی سزا موت تھی۔

وہ لمحے اتنی ہی مسرت و انبساط کے تھے کہ کسی کے ذہن میں وہ بات نہ آئی ہو گی جو میرے ذہن میں آگئی تھی۔ وہ سب تو اس پر خوش ہو رہے تھے کہ منگولوں کو ایک ایسے شخص سے نجات مل گئی جس نے ان کی نیند حرام کر دی تھی۔ وہ بجوکا کو نجات دہندہ سمجھ رہے تھے اور اسی لیے اس کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ وہ نعرے جو میری سماعت میں زہر بن کر اتر رہے تھے۔

اور پھر آخر کار میرے اندر کا زہر میری زبان پر آگیا۔ میں نے ابو نصار کو مخاطب کیا تھا۔ "اے ابو نصار! تو یقیناً" یاسائے چنگیزی سے واقف ہو گا۔"

میری بات سن کر ابو نصار نے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولا "ہاں' مگر اس وقت تجھے یاسا کی یاد کیوں آگئی؟"

"بجوکا نے مارکوف کو قتل کر کے' اس کا خون بہا کر یاسا کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ مارکوف منگولوں کا دشمن ہونے کے باوجود ایک شاہی خاندان کا فرد تھا۔" میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

ابو نصار نے مجھے عجیب سی نگاہ سے دیکھا' پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور بولا۔ "تو بہت ذہین ہے بوغا! تو نے آخر کار بجوکا سے انتقام لے ہی لیا۔"

"انتقام!" ..... نہیں تو..... میں....."

"تو کچھ بھی کہہ مگر تیرے دل میں یہی ہے۔" ابو نصار میری بات کاٹ کر بولا' پھر اس نے باآواز بلند اس منگول سردار کو پکارا جو قلعے کے باہر سپاہیوں کے

درمیان اس طرح گھوڑے پر سوار کھڑا ہوا تھا جیسے بجوکا کا استقبال کرنے وہاں موجود ہو۔

منگول سردار نے پلٹ کر دیکھا' اور پھر وہ اپنے گھوڑے سے کود کر کچھ ہی دیر بعد میں ابونصار تک پہنچ گیا۔

"میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ بجوکا کو گرفتار کرلے اور مارکوف کا سر قلعے کے دروازے پر ٹانگ دے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔" ابونصار نے بارعب لہجے میں حکم دیا۔

منگول سردار' ابونصار کا حکم سن کر لمحے بھر کو حیرت زدہ سا رہ گیا۔

"جا اور جلدی کر!" ابونصار نے منگول سردار کو خاموش کھڑا ہوا دیکھ کر پھر کہا۔ "اس سے پہلے کہ بجوکا قلعے میں داخل ہوا' اسے باندھ لے! بجوکا نے مارکوف کا خون بہا کر جد عظیم کے حکم سے انحراف کیا ہے کیونکہ مارکوف دشمن ہونے کے باوجود شاہی خاندان کا فرد تھا۔ اس کھلی نافرمانی کے جرم میں بجوکا کو اسی وقت موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا ہے مگر میں اس کا فیصلہ برقائی خاں پر چھوڑتا ہوں۔ بجوکا کو اس وقت سزائے موت دی جائے گی جب برقائی خاں لوٹ آئے گا۔ یاد رکھنا کہ بجوکا سزائے موت پانے والا ہے' اس لیے اس کے ساتھ کوئی رعایتی سلوک نہ کیا جائے۔"

منگول سردار پر اب سب کچھ واضح ہوچکا تھا۔ وہ ابونصار کی بات ختم ہوتے ہی تیر کی طرح دروازے سے نکل کر اپنے گھوڑے کی طرف گیا۔

گھوڑے پر سوار ہوتے ہی اس نے باآواز بلند سپاہیوں کو آگے بڑھنے اور بجوکا کو نرغے میں لینے کا حکم دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

بازی پلٹ چکی تھی اور میرا دشمن اس سے بے خبر تھا۔ وہ گردن اکڑائے گھوڑے پر سوار اس طرح چلا آرہا تھا جیسے کسی شہر کو فتح کرکے آرہا ہو قلعے سے اب اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔

منگول سردار' سپاہیوں کو لے کر نیم دائرے کی صورت میں بجوکا کی جانب بڑھا۔ بجوکا کوئی ناتجربے کار نہیں تھا جو اپنی طرف بڑھتے ہوئے سپاہیوں کا اندازہ نہ بھانپ لیتا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ پھر بلند آواز میں کچھ کہا۔ منگول سردار اب اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ فاصلہ ہونے کے سبب میں وہ الفاظ نہ سن سکا جو بجوکا نے کہے تھے اور جواب میں منگول سردار نے جو کچھ کہا تھا وہ بھی میں نہ سن پایا۔

اس وقت ہر طرف موت کا سا سکوت چھا گیا تھا جب منگول سردار نے بجوکا کے ہاتھ سے وہ نیزہ لیا جس میں مارکوف کا سر پیوست تھا۔

بجوکا کو گھوڑے سے اتار کر رسیوں میں جکڑ دیا گیا۔ اس وقت نہ جانے بجوکا کیوں چیخنے لگا حالانکہ اس سے پہلے وہ بالکل خاموش رہا تھا شاید اس کے چیخنے چلانے کا سبب یہ تھا کہ اب خود اسے بھی اپنی متوقع موت کا یقین آگیا تھا۔

بجوکا چیختا رہا اور سپاہی اسے گھسیٹتے ہوئے قلعے کی طرف لے آئے۔

"میں نے اسے جان بوجھ کر قتل نہیں کیا' وہ لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ میں بے قصور ہوں' بے قصور ہوں۔" بجوکا ابونصار کی طرف دیکھ کر چیخا مگر ابونصار نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

جب سپاہی بجوکا کو لیے ابونصار کے قریب سے گزرے تو ایک بار پھر بجوکا نے ابونصار سے فریاد کی۔

"بہادروں کی طرح اپنی تقدیر کے فیصلے کو قبول کر بجوکا!" ابونصار نے باآواز بلند کہا۔ "واویلا نہ مچا! مجھے مجبور نہ کر میں تیری سزا پر ابھی عمل درآمد کرادوں اور برقائی خان کی واپسی کا بھی انتظار نہ کروں۔"

ابونصار کے الفاظ سن کر بجوکا ایک دم خاموش ہوگیا اور سر جھکائے ہوئے سپاہیوں کے ہمراہ قلعے میں چلا گیا۔ ابونصار کی رحم دلی نے اسے زندگی کے جو لمحات بخش دیئے تھے' وہ انہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔

بجوکا کے جاتے ہی میری نگاہ اس منگول سردار پر پڑی جس نے ابونصار کے حکم پر بجوکا کو گرفتار کیا تھا اور اب قلعے کے دروازے پر چڑھنے کے لیے سیڑھی پر

قدم رکھ رہا تھا۔ وہ اب ابو نصار کے دوسرے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ اس نے کٹے ہوئے سر کو نیزے سے نکال کر اب اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس نے سر کے بڑے بڑے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اسے لٹکایا ہوا تھا۔ معاً" اس نے ایک مشعل بردار سپاہی کو قریب آنے کا اشارہ کیا اور خود سیڑھی سے اتر کر پہلے سپاہی کو سیڑھی پر چڑھنے کا حکم دیا۔ منگول سردار زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اس لیے میں اس کی ایک ایک حرکت واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب مشعل کی روشنی کٹے ہوئے سر پر پڑی اور میں تقریباً" اچھل پڑا۔ وہ کٹا ہوا سر مارکوف کا نہیں تھا۔ ابو نصار بھی اسی طرف متوجہ تھا اس لیے شاید اس نے میری کیفیت کو محسوس نہ کیا۔

مارکوف کی بجائے کسی اور شخص کو مارکوف جان کر اسے قتل کیا جانا بڑی عجیب سی بات تھی مگر یہ عجیب بات بہت جلد میری سمجھ میں آگئی۔ اس کا مطلب صرف اور صرف یہی ہو سکتا تھا کہ منگول، مارکوف کو نہیں پہچانتے۔ میری نظر میں یہ بھی حیرت انگیز بات تھی کہ مارکوف کو شناخت کیے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

اس وقت میرا کہا ہوا ایک جملہ میرے دشمن بجوکا کی زندگی یا موت کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ اگر میں کہہ دیتا کہ مقتول مارکوف نہیں تو میری بات کو جھٹلانے والا کوئی نہیں تھا کیونکہ میں مارکوف کی قید میں رہا تھا۔ میں وہ واحد شخص تھا جو اس کی قید سے نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ میں مارکوف کو شناخت کر سکتا تھا مگر اس وقت میں انتہائی تذبذب کا شکار تھا۔ میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے!

میں سوچ رہا تھا کہ اس نوجوان کو مارکوف کیوں سمجھ لیا گیا جس کا کٹا ہوا سر قلعے کے دروازے پر لٹکایا جا رہا تھا؟ کیا یہ مارکوف کی کوئی چال تھی؟ یہ غلط فہمی کس طرح پیدا کی گئی اور خود مارکوف کہاں ہے؟ کیا وہ بچ کر نکل گیا؟

میرا ذہن انہی سوالوں میں الجھا ہوا تھا کہ سپاہی قیدیوں کے غول کو جانوروں کی طرح ہانکتے ہوئے قلعے کے دروازے میں داخل ہوئے میں اور ابو نصار ایک طرف ہو گئے۔

اور پھر میں نے انہی قیدیوں میں ایک ایسے قیدی کو دیکھا کہ اگر اپنے جذبات پر فوراً" قابو نہ پا لیتا تو چیخ پڑتا اور ایک زندگی کا چراغ اسی لمحے گل کر دیا جاتا۔ وہ مارکوف ہی تھا جو عام قیدیوں کے درمیان دھکے کھاتا ہوا سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ میں نے دانستہ اس کی طرف سے نگاہ پھیر لی۔

تقدیر نے مارکوف کے ساتھ عجیب مذاق کیا تھا اور میرے ساتھ بھی! میری خاموشی بھی جرم تھی اور لب کشائی بھی! لیکن اس وقت مجھے خاموشی ہی میں عافیت نظر آئی۔

مجھے اب نصار کی قربت سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں وہ میرے چہرے سے میرے دل کا بھید نہ جان لے!

"اے ابو نصار! میں تھکن محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"میں تو تجھ سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ تجھے سو جانا چاہیے۔" ابو نصار نے جواب میں کہا، پھر دو سپاہیوں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"کیا تو ساتھ نہیں چلے گا؟" میں نے پوچھا۔

"میں قلعے کا دروازہ بند کرا کے آؤں گا، اس وقت جب تمام سپاہی قلعے میں آجائیں گے۔" ابو نصار نے کہا۔

سپاہی قریب آگئے تو ابو نصار نے انہیں حکم دیا کہ وہ مجھے سہارا دے کر میرے کمرے تک پہنچا دیں۔

سپاہی جب مجھے میرے کمرے میں پہنچا کر چلے گئے تو میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا، پھر میری نگاہ دریچے کی طرف اٹھی جو اندر سے بند تھا۔ میں نے دریچے تک پہنچ کر اس کی کنڈی کھول دی۔ ہر چند کہ مجھے اس شب سیوری کے آنے کی امید نہیں تھی مگر میں امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں اس شب بہت نڈھال نڈھال سا تھا اور

مسلسل بے خوابی کے سبب میری آنکھوں سے آگ
ں نکل رہی تھی اس لیے بستر پر گرتے ہی نیند نے
دبوچ لیا۔

میں جاگا اس وقت جب کوئی میرا شانہ پکڑ کر زور
زور سے ہلا رہا تھا۔ میں بہت گہری نیند سویا تھا اس لیے
مجھے اپنے حواس مجتمع کرنے میں کچھ دیر لگی۔ جب
میرا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا تو میں نے سیوری کو
پہچان لیا۔ اس کی آمد میرے لیے خلاف توقع تھی۔

"تم؟ میں نے اسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا اور
اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "بوغا!" میں تمہیں ایک بہت اہم بات
سے آگاہ کرنے آئی ہوں۔" سیوری میرے قریب
بیٹھتے ہوئے بولی۔ اسکے چہرے سے گھبراہٹ کا اظہار
ہو رہا تھا۔

"اہم بات؟" میں نے کہا۔

"ہاں! اہم بات!" اس نے تیزی سے کہا۔ اس کے
انداز و اطوار سے جلد بازی مترشح تھی جیسے وہ میرے
کمرے میں زیادہ دیر نہ رکنا چاہتی ہو۔ چند لمحے توقف
کے بعد اس نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا۔ "تمہیں
غالباً" کل صبح شناخت کی خاطر قلعے کے دروازے پر لٹکا
ہوا وہ سر دکھایا جائے جو مارکوف کا نہیں ہے۔ تمہیں
جھوٹ نہیں بولنا۔ بس میں یہی کہنے آئی تھی۔"

"میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔" میں اس
کی بات سن کر الجھ گیا۔

"تم شاید اس بوڑھے منگول سردار کو جانتے ہو'
وہی جو میرا حقدار بنا ہوا ہے۔ اس کا نام توچی ہے۔
توچی بھی مارکوف کو پہچانتا ہے۔ جب اس شہر پر قبضہ کیا
گیا تھا۔ تو منگول حملہ آوروں میں وہ بھی تھا اور
مارکوف اسی کی قید سے نکل کر بھاگا تھا۔ اس بات کا
امکان ہے کہ مارکوف کی شناخت کے لیے توچی سے
بھی کہا جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ تو جھوٹا نہ پڑے۔"

"کیا توچی کے علاوہ قلعے میں اور کوئی منگول سردار
مارکوف کو نہیں پہچانتا؟" میں نے پوچھا۔

"مارکوف کو دو منگول سردار اور شناخت کر سکتے تھے
لیکن وہ دونوں برقائی خان کے ساتھ سرائے باتو گئے
ہوئے ہیں۔" سیوری نے جواب دیا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ مارکوف عام قیدیوں کے
ساتھ گرفتار کیا جا چکا ہے؟" میں نے کہا۔

میری بات سن کر سیوری کے چہرے کا رنگ اڑ
گیا۔ وہ بدحواس سی ہو کر بولی۔ "کیا تم..... تم سچ کہہ
رہے ہو؟ مگر..... مگر..... یہ کیسے ہوا؟"

"اندھا اعتماد یہی دن دکھاتا ہے۔" میں نے تلخی
سے کہا۔

"اندھا اعتماد؟ میں تمہاری بات بھی نہیں
سمجھی۔" سیوری حیران سی ہو کر بولی۔

"ظاہر ہے تمہارے ہی ہم قوموں میں سے کسی
نے غداری کی ہے ورنہ قبل از وقت منگول' مارکوف
کے حملے سے کس طرح باخبر ہو جاتے۔" میں نے
بدستور تلخ لہجے میں کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اب تک حالات
سے قطعی لاعلم رہے ہو۔" سیوری نے طویل سانس
لیا۔ پھر بولی۔ "تم نے میرے ہم قوموں کو بڑی آسانی
سے غدار کہہ دیا حالانکہ حقیقت وہ نہیں جو تم سمجھ
رہے ہو۔"

پھر سیوری نے مجھے مختصراً" بتایا کہ حالات کس
طرح پیش آئے تھے۔ یہ میرے علم میں بھی تھا کہ شہر
کی حفاظت کے لیے فوجی دستے رات بھر گشت کرتے
تھے۔ اسے مارکوف کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا تھا کہ ایک
تومان باشی (دستے کا سردار) کسی طرح مارکوف کو نرغے
سے نکال کر قلعے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وقت
مقررہ سے پہلے قلعے میں ہنگامہ برپا دیکھ کر سیوری کا
طے شدہ منصوبے پر عمل کرنا بی کار ہی تھا۔ سیوری
سے تمام حقیقت جان کر مجھے وہ ساعتیں یاد آئیں
جب میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ تو سپاہیوں کے دستے اسی
لیے قلعے کے دروازے کی طرف دوڑے چلے آ رہے
تھے! میں نے سوچا۔

"تو حقیقت یہ تھی!" سیوری چپ ہو گئی تو میں نے
ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"اور اس سے بھی تلخ حقیقت وہ ہے جو تم نے مجھے

بتائی ہے کہ مارکوف قیدی بنالیا گیا ہے۔"

"سیوری! کیا یہ ممکن نہیں کہ توچی کو راستے سے ہٹادیا جائے؟" میں کچھ سوچ کر بولا۔

"تمہیں شاید علم نہیں کہ صبح ہونے والی ہے اور صبح ہوتے ہی یقیناً" مارکوف کو شناخت کرنے کے لیے ابونصار، توچی کو بلائے گا۔" سیوری نے جواب دیا۔

"میں نے ہنگامے کے دوران میں توچی کو نہیں دیکھا۔ کیا وہ اپنی رہائش گاہ سے نہیں نکلا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اب بوڑھا ہوگیا ہے اس لیے ہنگاموں سے بچتا ہے۔ وہ ان دنوں کچھ بیمار بھی ہے مگر اپنی بیماری کو چھپاتا ہے۔" سیوری نے کہا۔

"کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ نہیں چاہتا کہ شامان اسے گھیر لیں۔ وہ شامانوں سے بہت ڈرتا ہے۔" سیوری نے جواب دیا۔

"تو کیا یہاں قلعے میں بھی شامان ہیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں!" سیوری بولی۔ "شاید اب تک تمہارا کسی شامان سے واسطہ نہیں پڑا۔"

میں سیوری کی بات سن کر ہنس پڑا۔ مجھے اس وقت شامان بغورچی یاد آگیا تھا جس سے کئی بار میرے بھیجے ہوچکے تھے مگر سیوری میرے ماضی سے بے خبر تھی اور میں اسے کچھ بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"تم ہنس کیوں پڑے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"کچھ نہیں! بس یوں ہی تمہارے بھولپن پر ہنسی آگئی۔" میں نے کہا، پھر بات کا رخ بدلنے کے لیے بولا۔ "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر توچی کا قصہ پاک کردیا جائے تو وقتی طور پر ہی سہی ہم خطرے سے بچ سکتے ہیں۔ تم نے شاید ایک بات پر غور نہیں کیا۔ اگر توچی نے اس بات کی تصدیق کردی کہ قتل ہونے والا مارکوف نہیں کوئی اور ہے تو مارکوف کی تلاش ہوگی۔ اس تلاش کے دائرے میں وہ قیدی بھی آجائیں گے جن کے درمیان مارکوف موجود ہے۔"

میری بات سن کر سیوری کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہونے لگا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

"یہ ناممکن ہے، ناممکن!"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"توچی کا قتل!" اس نے جواب دیا۔ "اس کی خوابگاہ کے گرد سخت پہرہ ہوتا ہے۔ رات کے وقت بغیر اس کی اجازت کے بغیر کوئی وہاں نہیں جاسکتا مگر۔۔۔ مگر کوئی راہ تو نکالنا ہی پڑے گی۔" یہ کہتی ہوئی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا جارہی ہو؟"

"ہاں! میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے یہاں آتے جاتے دیکھ سکے۔ تمہارے اور میرے لیے یہی مناسب ہے۔ یوں بھی اب صبح قریب ہے۔" یہ کہتی ہوئی وہ دریچے کی طرف بڑھی۔

"اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈال دینا!" میں نے کہا۔

"ایک میری زندگی کیا اہمیت رکھتی ہے بونا! اگر مارکوف کی زندگی بچ جائے تو مجھ جیسی سینکڑوں لڑکیاں اس پر قربان کی جاسکتی ہیں کیونکہ وہ ہماری امیدوں کا آخری سہارا ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے سیوری کی آواز بھرا سی گئی۔

"اگر زندہ رہی تو کل رات!" اس نے جواب دیا اور دریچے پر چڑھ گئی۔

میں بستر پر آکر لیٹا تو تھکن نے دوبارہ میری آنکھوں میں نیند کے جال بننا شروع کردیئے حالانکہ سیوری مجھے بتا چکی تھی کہ صبح ہونے والی ہے۔

ابھی میں پوری طرح نیند کی پناہ میں نہ جاپایا تھا کہ میری سماعت سے ابونصار کی سحر آفریں آواز ٹکرانے لگی۔ وہ مصروف عبادت تھا میں اس کے قرآن پڑھنے کو بھی اس کی عبادت کا حصہ سمجھتا تھا۔ عربی پڑھنے کے سبب اب کچھ کچھ میں ان لفظوں کا مطلب بھی سمجھنے لگا تھا جو ابونصار اپنی عبادت کے دوران میں ادا کرتا تھا۔ اس وقت ابونصار جو کچھ پڑھ رہا تھا، اس سن کر میرے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ

لمحے کچھ ایسے ہی تھے کہ میں اس کے کہے ہوئے لفظ سن کر خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے ان الفاظ سے جو کچھ اخذ کیا وہ یہ تھا۔

تو جس شخص کا اعتبار کر لیا گیا ہے کہ دوسرے کا حق پورا کر دے اور اپنے پروردگار سے ڈرے اور گواہی کو نہ چھپائے۔ جو شخص گواہی کو چھپائے گا یعنی جھوٹی گواہی دے گا' اس کا دل گنہگار ہو گا۔ اللہ اس کے کیے ہوئے کاموں کو خوب جانتا ہے۔

ابو نصار کیا پڑھ رہا ہے؟ کیا وہ میرے دل کا بھید پا گیا؟ میں نے سوچا۔ مجھے اس وقت یوں لگا جیسے ابو نصار نے جو کچھ پڑھا' وہ میرے لیے تھا۔ ایک عجیب سے خوف نے نیند کو کوسوں دور بھگا دیا اور میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔

مجھے اس صبح ابو نصار کے پاس جاتے ہوئے کچھ خوف سا لگا مگر اس کے باوجود اس کی آواز' پرکشش آواز مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی میں اس کے روبرو تھا۔ وہ اس وقت ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں' ہاں ہونٹ ضرور حرکت کر رہے تھے مگر ان سے کوئی آواز بلند نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا' سکون کی سی کیفیت! جس کا مشاہدہ میں پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔

دعا مانگ کر اس نے آنکھیں کھولیں اور قرآن کو خوبصورت جزدان میں لپیٹ کر ایک بلند جگہ رکھ دیا' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بوغا! اب تیرے انگوٹھے کا زخم کیسا ہے؟"

"ابھی تکلیف باقی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آ میں دوا لگا کر پٹی بدل دوں۔" وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اور دائیں جانب رکھی ہوئی لکڑی کی صندوقچی اپنی طرف کھسکا لی۔

ابو نصار میرے زخم پر پٹی باندھ کر فارغ ہوا تھا کہ ایک خادم کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی مودب لہجے میں بولا۔ "اے ابو نصار! توچی آیا ہے اور تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"اسے آنے دے!" ابو نصار نے پرسکون آواز میں جواب دیا اور صندوقچی بند کرنے لگا۔

خادم کمرے سے چلا گیا اور میں توچی کا نام سن کر کچھ گھبرا سا گیا۔ آخر وہ ابو نصار سے کیوں ملنے آیا ہے؟ اس کا آنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد ہی توچی کمرے میں داخل ہوا اور ابو نصار کا اشارہ پا کر ایک طرف مودب بیٹھ گیا۔ جب ابو نصار نے اس کی طرف سوالیہ نگاہ اٹھائی تو وہ بولا۔ "قلعے کے دروازے پر جو سرلٹک رہا ہے' وہ مارکوف کا نہیں۔ میں ابھی وہیں سے آ رہا ہوں مجھے نیچے سے دیکھ کر ہی کچھ شک ہو گیا تھا۔ سو میں سیڑھی لگوا کر چڑھا اور قریب سے دیکھا۔"

"توچی! کیا تجھے اس بات پر پورا یقین ہے؟" ابو نصار نے پوچھا۔

"ہاں اے ابو نصار! بالکل اس طرح جیسے اس وقت صبح ہے۔" توچی نے جواب دیا۔

ابو نصار نے میری طرف نگاہ اٹھائی' پھر کہا۔ "بوغا! کیا توچی ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

میں پہلے ہی اس سوال کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا اس لیے بغیر کسی جھجھک کے بولا۔ "رات میں اس سر کو قریب سے نہیں دیکھ سکا۔ ممکن ہے کہ توچی کا خیال صحیح ہو لیکن اس وقت تک کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا جب تک میں بھی اسے قریب سے نہ دیکھ لوں۔"

میری بات سن کر ابو نصار نے ایک طویل سانس لیا' پھر بولا۔ "رات اور دن میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ تو نے اس وقت توجہ نہ دی ہو۔ تو توچی کے ساتھ چلا جا اور دروازے پر چڑھ کر دیکھ کہ وہ کس کا سر ہے کیونکہ تو اس کی قید میں رہ چکا ہے۔"

ابو نصار کا حکم سن کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ توچی بھی میرے ساتھ ہی اٹھا۔

اور پھر میں نے اس بات کی تصدیق کر دی جو بغیر قلعے کے دروازے پر چڑھے کی جا سکتی تھی۔

توچی اور میں' ابو نصار کے کمرے میں لوٹ آئے

تھے اور اب ابو نصار کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"توچی!" کچھ دیر بعد ابو نصار کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ "گزشتہ شب میں نے بجوکا کو اس جرم میں گرفتار کرا دیا تھا کہ وہ یاسا کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا تھا لیکن اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ میں اب اس کی رہائی کا حکم دے رہا ہوں۔ تو جا اور اسے قید خانے سے نکال کر میرے پاس لے آ! ممکن ہے کہ مجھے تیری ضرورت بھی پڑے اس لیے تو بھی اس کے ساتھ آنا' منگرال اور دوسرے منگول سرداروں کو بھی میرا حکم پہنچا دے کہ وہ فوراً" میرے پاس پہنچ جائیں۔ میں الجھے ہوئے مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"

ابو نصار کا حکم سن کر توچی نے ادب سے سر جھکایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ توچی کے جاتے ہی ابو نصار بھی اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ غالباً" اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کے لیے غور و فکر کر رہا تھا۔

بجوکا کو قید کیے جانے سے مجھے جو خوشی ہوئی تھی' وہ خاک میں مل گئی تھی کیونکہ وہ ایک بار پھر آزاد ہونے والا تھا۔ وہ' میرا دشمن موت کے حصار سے باہر آ گیا تھا اور میرا دوست مارکوف اس حصار میں داخل ہو چکا تھا۔ مارکوف کے لیے کوئی بھی آنے والا لمحہ فیصلہ کن ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ وہ بہر حال منگولوں کی قید میں تھا۔

بہت دیر میں خاموش بیٹھا رہا اور ابو نصار بھی خاموشی کے ساتھ ٹہلتا رہا' پھر غالباً" وہ مجھے مخاطب کرنے کے لیے میری طرف مڑا اور اسی وقت ایک خادم کمرے میں داخل ہوا۔

اس سے پہلے کہ ابو نصار' خادم سے اس کی آمد کا مقصد پوچھتا' خادم تیزی سے بولا۔ "اے ابو نصار! سردار توچی کو قتل کر دیا گیا۔"

ابو نصار چونک پڑا اور میری بھی یہی حالت ہوئی۔

"کیا تجھے تفصیل کا علم ہے؟" ابو نصار نے پوچھا۔ اس وقت بھی ابو نصار کا لہجہ حیرت انگیز طور پر پرسکون تھا۔

"ہاں اے ابو نصار!" خادم نے جھک کر کہا۔

"تو پھر بیان کر!" ابو نصار نے حکم دیا۔

"سردار توچی اور سردار بجوکا قید خانے کے میدان سے آ رہے تھے کہ خود توچی کی ایک لونڈی نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس لونڈی کے پاس زہر میں بجھا ایک خنجر تھا جو اس نے سردار توچی کے سینے میں اتار دیا' پھر اس سے پہلے کہ سردار بجوکا اس لونڈی کو پکڑتا' لونڈی نے اپنے سینے میں بھی وہی خنجر اتار لیا۔ سردار توچی اور اس لونڈی کی لاشیں فوراً" ہی نیلی پڑ گئی تھیں جس سے پتا چلا کہ وہ خنجر زہر میں بجھا ہوا تھا۔" خادم تفصیل بتا کر چپ ہو گیا۔

"بجوکا کہاں ہے؟" ابو نصار نے سوال کیا۔

"اسی نے مجھے تیرے پاس بھیجا تھا کہ میں تجھے حالات سے باخبر کر دوں۔ سردار بجوکا نے کہلوایا ہے کہ وہ لاشیں اٹھوا کر ابھی تیرے پاس پہنچنے والا ہے۔" خادم نے جواب دیا۔

ابو نصار کا اشارہ پا کر خادم چلا گیا اور ابو نصار خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑانے لگا۔ "یہ سب کچھ کسی سازش کے تحت ہو رہا ہے' کوئی گہری سازش!"

ابو نصار کی بات سن کر میرا دل دھڑک اٹھا کیونکہ وہ ایک صحیح نتیجے تک پہنچ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں اس وقت سیوری کا حسین و معصوم چہرہ گھوم رہا تھا۔ آخر اس نے توچی سے اپنے شوہر اور اپنے پانچ سالہ معصوم بیٹے کے قتل کا انتقام لے ہی لیا۔ آخر اس نے اپنی جان دے کر وہ فرض ادا کر ہی دیا جس کی خاطر وہ زندہ تھی۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ ہر چند کہ خادم نے سیوری کا نام نہیں لیا تھا لیکن اس سے میری جو گفتگو ہوئی تھی' اس کی روشنی میں مجھے یقین تھا کہ توچی کو قتل کرنے والی وہی تھی اور بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ سیوری نے اپنا نذرانہ جاں پیش کر کے وقتی طور پر ہی سہی' مارکوف کو ایک یقینی موت سے بچا لیا تھا۔ برقائی خاں کے ساتھ جو دو منگول سردار گئے تھے' وہی مارکوف کو شناخت کر سکتے

لیے' ان کی واپسی تک مارکوف بہرحال محفوظ تھا۔ اس دوران میں اگر کسی طرح اس کے فرار کی راہ ہموار ہو جاتی تو وہ زندہ بچ سکتا تھا۔ اس کی زندگی کا مطلب یہی ہوتا کہ منگولوں کا ایک قوی دشمن برقرار رہتا۔ میرے اور اس کے درمیان دوستی کی بنیاد ہی یہی تھی کہ ہم دونوں کے مقاصد ایک تھے' منگولوں کی تباہی اور انتقام!

میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ معاً" چونک اٹھا۔ ابو نصار نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ "اس وقت توچی کا قتل کوئی سوچی سمجھی سازش کے تحت بھی ہو سکتا ہے اور اتفاق سے بھی! اس میں کوئی شک نہیں کہ مقامی لوگ منگولوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے دلوں سے منگولوں کی نفرت نہیں نکالی جا سکتی۔ برقائی خان نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ کیوں نہ تمام مقامی آبادی کو قتل کر دیا جائے تاکہ روز روز کا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ یہ ایک حل ضرور تھا مگر بڑا سفاکانہ! میں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا لیکن شاید اب وہ جب لوٹے تو دوبارہ اپنی وہی بات دہرائے۔ ممکن ہے کہ توچی کے قتل کا سبب یہی نفرت ہو لیکن موجودہ حالات میں اس کا مارا جانا بڑا معنی خیز سا لگتا ہے۔ توچی اور تیرے سوا اس وقت قلعے میں کوئی ایسا شخص نہیں جو مارکوف کو پہچانتا ہو۔ توچی کو قتل کیا جا چکا ہے اور صرف تو ہے جو مارکوف کو شناخت کر سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مجھے اب تیری طرف سے بھی فکر ہو گئی ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ توچی کو کسی سازش کے تحت قتل کیا گیا ہے تو پھر تیری زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس کا کوئی حل سوچنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر ابو نصار خاموش ہو گیا۔

"اے ابو نصار! مجھے تیری اس بات سے اتفاق ہے کہ توچی کا قتل نفرت کے سبب ہوا ہے لیکن میرا دماغ یہ بات تسلیم نہیں کر پا رہا کہ اس کے پیچھے کوئی سازش ہے۔" میں نے اپنا دفاع کرنے کی خاطر کہا۔

"ممکن ہے تو ٹھیک کہہ رہا ہو مگر اس بات کا صحیح فیصلہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب میں بجوکا اور منگرال سے تفصیل کے ساتھ وہ واقعات سن لوں جن کے سبب کسی دوسرے شخص کو مارکوف سمجھ لیا گیا۔" ابو نصار بولا۔

خود میرے لیے بھی یہ بات الجھن کا سبب بنی ہوئی تھی اس لیے میں نے ابو نصار کی بات سے اتفاق کیا۔ اب بجوکا منگرال اور دوسرے منگول سرداروں کا انتظار تھا۔

انتظار زیادہ طویل ثابت نہ ہوا' کچھ دیر بعد ہی بجوکا اور منگرال کے علاوہ سات منگول سردار' ابو نصار کے کمرے میں پہنچ گئے۔

گفتگو کا آغاز ابو نصار نے کیا۔ وہ بجوکا اور منگرال سے مخاطب تھا۔ "بتاؤ کہ جب تم سپاہیوں کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے تو وہاں کیا صورت تھی؟"

"اے ابو نصار! میں نے بجوکا سے کہا کہ پہلے ہم سارے شہر کو گھیرے میں لے لیں تاکہ دشمن کسی طرف سے بچ کر نہ نکل سکے۔ بجوکا نے میری بات سے اتفاق کیا' اور پھر ہم شکار کے حلقے کی طرح سمٹتے چلے گئے۔ ہم نے مارکوف اور اس کے ساتھیوں کو اس طرح نرغے میں لے لیا جیسے شکار کے دوران میں جانوروں کو گھیر لیا جاتا ہے۔" منگرال بڑی تفصیل کے ساتھ پیش آنے والے واقعات بیان کر رہا تھا۔

"اے منگرال! غیر ضروری تفصیل سے گریز کر!" ابو نصار نے اسے درمیان میں ٹوکا۔

جواب میں منگرال نے ادب سے سر جھکایا' پھر بولا۔ "ہم نے ان میں سے کسی ایک کو بھی حلقے سے بچ کر نہیں نکلنے دیا۔ اس حلقے میں ہمارے وہ سپاہی بھی تھے جو پہلے سے لڑ رہے تھے۔"

"تیری مراد ان فوجی دستوں سے ہے جو شہر میں گشت پر تھے؟" ابو نصار نے وضاحت چاہی۔

منگرال نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جب تو اور بجوکا' دونوں میں سے کوئی مارکوف کو نہیں پہچانتا تھا تو پھر تم نے کس طرح اس شخص کو مارکوف سمجھ لیا جو مارکوف نہیں تھا؟" ابو نصار نے سوال کیا۔

"اس لیے اے ابو نصار کہ ہم نے اسی کو باغیوں کی رہنمائی کرتے دیکھا تھا۔" منگرال نے جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر ابو نصار سوچ میں پڑ گیا۔ بات بھی سوچنے کی تھی کہ مارکوف کی بجائے کوئی اور شخص باغیوں کا رہنما کیسے بن گیا تھا!

"صرف دو امکانات ہیں۔" کچھ دیر بعد ابو نصار نے کہا۔ "پہلا امکان یہ کہ کسی سبب باغیوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا اور انہوں نے مارکوف کی بجائے کسی دوسرے کو اپنا رہنما بنا لیا اور....." ابو نصار کچھ کہتے کہتے رک گیا' پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ "نہیں' ایسا ممکن نہیں۔" اس نے خود ہی اپنے خیال کی تردید کرتے ہوئے وہاں موجود سرداروں پر نگاہ ڈالی۔ "مارکوف کے سوا باغی شاہی خاندان کا کوئی فرد زندہ نہیں بچا تھا۔ مارکوف کی موجودگی میں وہ کسی اور کو اپنا رہنما نہیں بنا سکتے تھے۔ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ مارکوف بیمار ہو اور یہی دوسرا امکان زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔"

"کیا یہ ممکن نہیں اے ابو نصار کہ مارکوف نے محاصرہ ہونے کے بعد اپنی جان بچانے کی خاطر اس مقتول شخص کو اپنی جگہ دے دی ہو؟ بجو کا پہلی بار بولا اور میرا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے بڑی خطرناک بات کہی تھی کیونکہ میرا ذہن بھی اسی نتیجے پر پہنچ رہا تھا۔

"ممکن ہے تیرا خیال درست ہو بجو کا! مگر ایسا ہی ہوتا' جیسا تو نے کہا ہے تو تیری غلطی یا غلط فہمی پر تجھے ضرور ٹوکا جاتا۔" ابو نصار بولا۔

"مگر مجھے ٹوکتا کون؟" بجو کا نے کہا۔ "مارکوف کو صرف چند ہی افراد پہچانتے ہیں جن میں سے کوئی اس وقت میرے ساتھ نہیں تھا۔"

"مارکوف کی پہلی جھڑپ اس فوجی دستے سے ہوئی تھی جو شہر میں پہرے پر تھا۔ کیا وہ اس تبدیلی کو محسوس نہ کر پاتے کہ باغیوں کا رہنما بدل گیا ہے؟"

ابو نصار کی دلیل مضبوط تھی مگر اس کے باوجود بجو کا بولا۔ "مارکوف سے ہمارے سپاہیوں کی متعدد جھڑپیں ہو چکی ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے سپاہی اسے نہیں پہچانتے کیونکہ انہوں نے کبھی مارکوف کو قریب سے نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ مارکوف دانستہ خود ہمارے سپاہیوں کی نگاہوں سے بچاتا رہا ہے۔"

بجو کا چپ ہوا تو ایک اور منگول سردار اس کی تائید میں بولا۔ "اے ابو نصار! ممکن ہے کہ مارکوف ہمیں دھوکا دینے کے لیے ہمیشہ یہی چال چلتا رہا ہو۔"

بجو کا اور دوسرے منگول سردار کی باتیں ایسی نہیں تھی کہ ابو نصار انہیں نظر انداز کر دیتا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا' اور پھر شاید اس کا ذہن اس نتیجے تک پہنچ گیا جہاں تک نہیں پہنچنا چاہئے تھا۔ اس نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ مارکوف کو ان باغیوں کے درمیان ہونا چاہیے جو ہماری قید میں ہیں۔"

"یا جو لڑائی کے درمیان مارے جا چکے ہیں۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔

ابو نصار نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا "بوغا ٹھیک کہتا ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ حملے کے دوران میں مارکوف بھی موجود تھا اور خود کو چھپانے کے لیے اس نے کسی اور کو کمان دے دی تھی تو صرف یہی دو صورتیں ممکن ہیں' وہ مارا گیا یا ہماری قید میں ہے۔ اس یقین کا سبب یہ ہے کہ کسی کو بھی حلقے سے بچ کر نہیں نکلنے دیا گیا۔" یہ کہہ کر وہ منگرال سے مخاطب ہوا۔ "لڑائی کے دوران میں جو باغی مارے گئے ان کی لاشیں غالباً" وہیں چھوڑ دی گئی ہوں گی؟"

"ہاں اے ابو نصار!" منگرال نے جواب دیا۔ "مگر ہم جب شہر سے چلے تھے تو وہاں متعین فوجی دستوں کو یہ حکم دیا تھا کہ باغیوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔"

تو ان لاشوں کو اکٹھا کر کے کسی بڑے سے گڑھے میں دبا دیا گیا ہو گا۔" ابو نصار کا انداز خود کلامی کا سا تھا' پھر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "مارکوف یا تو ان لاشوں کے درمیان ہو گا یا ہماری قید میں! پہلے یہ ضروری ہے کہ اسے قیدیوں میں تلاش کیا جائے۔ اگر وہ ان میں نہ ملے تو اس گڑھے کو کھودا جا سکتا ہے جس میں لاشیں دبائی گئی ہیں۔ مارکوف کی شناخت بوغا کرے گا کیونکہ

اسے پہچانتا ہے۔"

آخر وہ خطرہ پیش ہی آگیا جس سے بچنے کی خاطر میں نے ابو نصار کے ذہن کو دوسری جانب لگانا چاہا تھا مگر اس نے میرے لیے پھر مشکل کھڑی کردی تھی۔

پھر اسی مجلس میں ابو نصار نے ایک اور حکم جاری کیا جس پر فوراً" عمل درآمد ہونا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ حکم ثانی تمام مقامی عورتوں اور لڑکیوں کو قید کردیا جائے خواہ وہ کسی کے تصرف میں ہوں۔ اسی حکم کی دوسری شق یہ تھی کہ کسی مقامی شخص یا عورت کو قلعے میں داخل نہ ہونے دیا جائے اور ان کی جگہ منگول سپاہیوں سے خدمت لی جائے۔

ابو نصار کا حکم وہاں موجود سرداروں میں سے غالباً" کسی کے لیے قابل قبول نہیں تھا مگر ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ حکم سے سرتابی کرسکتے۔ ناگواری کا سبب ظاہر تھا۔ وہ بھلا اپنی خوشی سے اس پر کیسے آمادہ ہوجاتے کہ ان کی آغوش حسین جسموں سے خالی رہے۔ مگر قہراً" وجبراً" انہیں ابو نصار کے حکم سے اتفاق کرنا ہی پڑا۔

ابو نصار جیسا شخص بھلا وہ بات کیسے محسوس نہ کرتا جو میں نے سمجھ لی تھی۔ اس نے شاید سرداروں کو مطمئن کرنے ہی کی غرض سے انہیں مخاطب کیا۔ "قیدیوں کو قتل کیا جاچکا ہے اور اس قتل کے پیچھے کوئی سازش بھی ہوسکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مارکوف کو مارنے والے دوسرے فرد کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے۔ جب تک مارکوف کا معاملہ نہیں نمٹ جاتا، یہ حکم برقرار رہے گا۔ ممکن ہے آج ہی ہم کسی فیصلے پر پہنچ جائیں۔"

منگول سرداروں نے غالباً" اس بات پر غور نہیں کیا تھا اس لیے ابو نصار کی بات سن کر ان کے چہروں سے ناگواری کا اظہار ختم ہوگیا۔ اس کے بعد مجلس برخاست کردی گئی مگر ابو نصار نے مجھے اپنے پاس سے نہیں جانے دیا۔

پھر اس دن مجھے باہر جانے کی اس وقت اجازت ملی جب ابو نصار کے حکم پر عمل کیا جاچکا تھا۔ مجھے منگرال اور ایک دوسرے منگول سردار کے ہمراہ قلعے میں موجود قید خانے جانے کا حکم ملا تاکہ میں مارکوف کو شناخت کرسکوں۔ دوسری جانب ابو نصار نے بجوکا کو شہر کی طرف بھیجا تاکہ وہ اس گڑھے سے لاشیں نکلوا سکے جس میں باغیوں کو بے گور و کفن دبا دیا گیا تھا۔

منگرال اور دوسرے منگول سردار کے ہمراہ میں قید خانے کی طرف روانہ ہوا تو میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ ہمارے ہمراہ سپاہیوں کے دو مسلح دستے بھی تھے۔ یہ تو ظاہر تھا کہ میں مارکوف کی نشاندہی کرکے اسے ان درندوں کے حوالے نہیں کرسکتا تھا لیکن اس صورت میں بہرحال میرے لیے خطرہ تھا۔ اگر کسی طرح یہ بات کھل جاتی تو مجھے بھی منگول دشمنوں ہی میں شمار کیا جاتا جو میں کسی صورت نہیں چاہتا تھا۔

میں ابھی تذبذب ہی کا شکار تھا کہ قلعے میں موجود اس وسیع و عریض میدان تک پہنچ گیا جسے قید خانے کا نام دیا گیا تھا۔ قید خانہ دیکھ کر میری آنکھوں میں منگولوں کا دارالحکومت قراقرم گھوم گیا۔ وہاں بھی ایک ایسا ہی قید خانہ تھا۔ وہ قید خانہ جہاں میں نے موت سے آنکھیں چار کی تھیں اور وہ جس کے ایک گڑھے میں میری ماں نے دم توڑا تھا۔ یہ خیالات آتے ہی جیسے میرے سارے زخم ہرے ہوگئے۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی ابھی میری زخمی ماں نے میرے بازوؤں میں دم توڑا ہے۔

وہاں بھی کچھ کچھ فاصلے سے متعدد گڑھے بنے ہوئے تھے جن میں قیدیوں کو رکھا گیا تھا۔ گڑھوں پر سلاخوں کے کے جال رکھے ہوئے تھے۔ ہر گڑھے کے قریب ایک مسلح سپاہی موجود تھا۔

گڑھوں میں اوپر سے جھانک کر قیدیوں کے چہرے دیکھ لینا ممکن نہیں تھا۔ یہ بات میرے علاوہ غالباً" منگرال نے بھی محسوس کرلی تھی اسی لیے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے بوغا! قیدیوں کی تعداد زیادہ ہے اور انہیں بہت سے گڑھوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک گڑھے میں حالانکہ صرف چھ قیدی رکھے جانے چاہئیں تاکہ وہ ایک دوسرے کے کندھوں پر سوار ہوکر

بھی گڑھے پر ڈھکے ہوئے جال تک نہ پہنچ سکیں لیکن قیدیوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے فی الحال اس احتیاط پر پورا عمل نہیں کیا جاسکا۔ جب تک نئے گڑھے نہ کھود لیے جائیں یہی صورت رہے گی۔ ہم نے ابو نصار سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر وہ کہے تو قیدیوں کو قتل کردیا جائے مگر وہ نہ مانا۔ اس کا کہنا ہے کہ قیدیوں کا فیصلہ' برقائی خاں کے آنے پر ہوگا۔ بہرحال شناخت کے لیے ضروری ہے کہ قیدیوں کو گڑھوں سے نکالا جائے۔ ہم تمام قیدیوں کو ایک ساتھ نہیں بلکہ باری باری نکالیں گے۔ تو سمجھ گیا میری بات؟"

"نہیں!" میں نے بے خیالی میں کہہ دیا کیونکہ میرا ذہن کہیں اور ہی پہنچ گیا تھا۔ منگرال کی بات نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ قیدیوں کو زیادہ تعداد میں گڑھوں کے اندر رکھا جانا میرے حق میں تھا۔

"تو کیا نہیں سمجھا بوغا؟" منگرال نے میری بات سن کر سوال کیا۔

میں اب اپنے خیالوں کے حصار سے باہر آگیا تھا اس لیے فوراً سنبھل کر بولا۔ "باری باری سے تیری کیا مراد ہے؟ میرے خیال سے اس طرح شناخت ممکن نہیں۔"

"تو کیا تو یہ چاہتا ہے بوغا کہ سارے قیدیوں کو گڑھوں سے ایک ساتھ نکال لیا جائے؟" منگرال نے پوچھا' پھر میرا جواب سنے بغیر ہی دوبارہ خود بول اٹھا۔ "یہ ممکن تو ہے مگر خطرناک بھی ہے کیونکہ انہیں گڑھوں میں ڈالنے سے پہلے ان کے جسم رسیوں کی گرفت سے آزاد کیے جاچکے تھے' انہیں اپنی موت کا یقین ہوچکا ہے' اور جب موت یقینی نظر آتی ہے تو پھر آدمی اپنی جان بچانے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ سب مل کر کوئی ہنگامہ کھڑا کرسکتے ہیں۔ اس متوقع ہنگامے کو روکنے کے بھی انتظامات ہوسکتے ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ایسے حالات ہی پیدا نہ کیے جائیں تو بہتر ہے۔" یہ کہہ کر منگرال خاموش ہوگیا۔

اس وقت عجیب سی صورت حال ہوگئی تھی۔ منگرال کچھ سمجھ رہا تھا اور میں کچھ! میں نے اپنی بات کی وضاحت میں کہا۔ "اگر ایک قیدی کو گڑھے سے نکالا گیا' اور پھر اسے دوبارہ گڑھے ہی میں ڈال کر دوسرے قیدی کو نکالا گیا تو اس طرح قیدی ہمیں دھوکا بھی دے سکتے ہیں۔ ایک قیدی دوبار بھی باہر آسکتا ہے۔"

"تو شاید میری بات نہیں سمجھا بوغا!" منگرال نے کہا۔ "باری باری سے میری مراد گڑھوں سے تھی' قیدیوں سے نہیں۔ ہم ایک گڑھے کے سارے قیدیوں کو نکال کر تجھے دکھائیں گے' پھر دوسرے گڑھے کی طرف متوجہ ہوں گے۔"

میں نے منگرال کی بات سن کر طویل سانس لیا اور بولا۔ "ٹھیک ہے۔"

پھر کام کا آغاز ہوا۔ منگرال کا حکم پاکر ایک گڑھے کا سلاخوں دار جال ہٹایا گیا اور گڑھے میں رسی لٹکادی گئی۔ قیدیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ رسی کے ذریعے گڑھے سے باہر آجائیں۔

"ہم اوپر نہیں آئیں گے۔" گڑھے سے قیدیوں کا شور بلند ہوا۔

"کیوں؟" چیخ کر پوچھا گیا مگر جواب میں پھر وہی جملہ دہرایا گیا۔ منگرال اور دوسرے منگول سردار کے چہروں سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

"شاید وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ انہیں گڑھے سے نکال کر قتل کردیا جائے گا۔" میں نے منگرال سے وہ بات کہی جو ذہن میں آئی۔

منگرال نے میرے خیال کی تائید میں سر ہلایا اور آگے جاکر گڑھے میں جھانکا' پھر اس کی بلند آواز سنائی دی۔ وہ قیدیوں سے مخاطب تھا۔ "تمہیں ہلاک نہیں کیا جائے گا' باہر آجاؤ!"

"ہم منگولوں کی زبان پر اعتبار نہیں کرتے کیونکہ وہ جھوٹے ہوتے ہیں۔" جواب میں گڑھے سے ایک کرخت آواز ابھری۔

"خاموش!" منگرال اتنی زور سے چیخا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔ اسے قیدی کی بات سن کر غصہ آگیا

تھا۔ وہ ایک دم سیدھا ہوا اور پلٹ کر قریب کھڑے ہوئے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "کھولتا ہوا پانی لاؤ!"

"ٹھہرو!" میں آگے بڑھا اور منگرال کے قریب پہنچ گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ منگرال کیا چاہتا تھا! وہ گڑھے میں موجود قیدیوں پر کھولتا ہوا پانی ڈلوا کر انہیں گڑھے سے نکلنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

سپاہی گومگو کے عالم میں اپنی جگہ کھڑے رہے۔ منگرال نے انہیں کھولتا ہوا پانی لانے کا حکم دیا تھا اور میں نے انہیں روک دیا تھا۔ منگرال کی اور میری حیثیت ان کی نگاہوں میں برابر ہی تھی۔ وہ بھی منگول سردار تھا اور میں بھی! وہ شاید فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کس کے حکم کی تعمیل کریں!

میں نے جب منگرال کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس پر حیرت کے آثار نظر آئے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے اس بات کی وضاحت چاہتا ہو کہ میں نے سپاہیوں کو کیوں روک دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا، میں بول اٹھا۔ "قیدیوں پر کھولتا ہوا پانی ڈالنا مناسب نہیں۔"

"کیوں؟" اس کے لہجے سے الجھن اور کسی قدر غصے کا اظہار ہو رہا تھا اور غصے کا سبب ظاہر تھا۔ قیدیوں نے منگولوں کو جھوٹا کہا تھا۔

"منگرال! تو شاید بھول گیا کہ میں تیرے ساتھ کیوں بھیجا گیا ہوں!" میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ "اگر تو نے قیدیوں پر کھولتا ہوا پانی ڈلوایا تو مارکوف کی شناخت کیسے ہو سکے گی؟ کیا ان کے چہرے محفوظ رہ سکیں گے؟ کیا ان پر آبلے نہ پڑ جائیں گے؟"

میری بات میں وزن تھا اس لیے منگرال کے چہرے پر موجود الجھن بڑھ گئی، پھر وہ بولا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے بہ مجبوری اسے کوئی بات ماننی پڑ رہی ہو۔ "بوغا! تو ٹھیک کہتا ہے مگر انہیں کیسے باہر لایا جائے؟"

"ہاں یہ مسئلہ بہرحال ہے۔" میں نے کہا، پھر بولا۔ "میں کوشش کرتا ہوں۔"

پھر میں نے لاکھ چاہا کہ قیدی میری بات مان کر گڑھے سے نکل آئیں مگر وہ آمادہ نہ ہوئے۔ ان کا بس ایک ہی جواب تھا، انکار! میں نے آخری حربہ استعمال کیا۔ "کیا تم اس گڑھے میں رہ کر موت سے بچ سکتے ہو؟ کیا یہ گڑھا تمہارے لیے موت کا گڑھا نہیں بنایا جا سکتا؟ کیا تمہارے جسموں کو تیروں سے چھید کر چھلنی نہیں کیا جا سکتا؟ کیا تمہیں اس گڑھے ہی میں بھوکا پیاسا نہیں مارا جا سکتا؟ بولو، جواب دو۔" اگر تم ہمیں قتل نہیں کرنا چاہتے تو پھر یہاں سے کیوں نکال رہے ہو؟ میری بات کے جواب میں سوال کیا گیا۔

"تمہیں ہم سے کوئی سوال کرنے کا حق نہیں کیونکہ تم ہمارے قیدی ہو۔" منگرال ایک دم پھر آپے سے باہر ہو کر چیخ پڑا۔

"تو پھر تم سے جو ہو سکے کرو! ہمیں یہیں قتل کر دو مگر ہم باہر نہیں آئیں گے۔" گڑھے سے بلند ہونے والی کرخت آواز نے فیصلہ سنا دیا۔

ممکن تھا کہ میں کسی طرح قیدیوں کو گڑھے سے باہر آنے پر راضی کر لیتا مگر منگرال کے غصے نے کام بگاڑ دیا تھا۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔

"اب؟" منگرال نے سوال کیا۔ اس کا سوال معنی خیز تھا اور میں اس کے معنی سمجھ گیا۔

"جو چاہے کر! مجھ کوئی اعتراض نہیں۔"

اور پھر جو کچھ ہوا وہ بہت ہولناک تھا۔ منگرال کے حکم پر اس گڑھے میں کھولتا ہوا پانی پھینکا گیا تھا۔ گڑھے سے بڑی دلدوز چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ دوسرے گڑھوں میں جو قیدی موجود تھے، وہ اس سے بے خبر تھے کہ ان کے ساتھیوں پر کیا ظلم ڈھایا جا رہا تھا! اور ظلم ڈھائے جانے کا سبب کیا تھا! انہوں نے صرف چیخیں ہی سنی ہوں گی، بھیانک چیخیں! میں صرف تصور ہی کر سکتا تھا کہ اس گڑھے میں موجود قیدیوں پر کیا گزری ہوگی! اور یہ تصور ہی میرے لیے بڑا روح فرسا تھا۔

اپنے ساتھیوں کی چیخیں سن کر دوسرے گڑھوں میں پڑے ہوئے قیدی بھی چیخنے چلانے لگے تھے۔ وہ اس طرح اپنے غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ لمحے بھر

وہ مجھے یوں لگا جیسے تمام گڑھوں میں کھولتا ہوا پانی پھینکا جا رہا ہو اور سارے قیدی چیخ رہے ہوں۔ سارا میدان چیخوں سے گونج رہا تھا اور سپاہی گڑھے میں کھولتا ہوا پانی پھینک رہے تھے۔

"ٹھہرو..... ٹھہرو!..... ٹھہر جاؤ!" چیخوں اور کراہوں کے درمیان گڑھے سے ایک گونجدار آواز بلند ہوئی۔

منگرال نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے اپنے وحشیانہ فیصلے کی داد طلب کر رہا ہو۔ اسی کے ساتھ اس نے سپاہیوں کو پانی پھینکنے سے رک جانے کا اشارہ کیا۔ سپاہیوں کے ہاتھ رک گئے۔

بات بہت سیدھی سی تھی جو میری سمجھ میں فوراً آگئی۔ گڑھے سے بلند ہونے والی آواز، شکست کی آواز تھی۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ جان کر دکھ سا محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے دوستوں نے دشمنوں کے سامنے سپر ڈال دی ہو۔ میں اپنا خون جلانے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔

اس گڑھے میں موجود سپاہی باہر آنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ان کی تعداد گیارہ تھی اور انہیں گڑھے میں رسی ڈال کر باری باری نکالا گیا تھا۔ سپاہیوں نے انہیں گھیرے میں لی رکھا تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان کے جسموں پر بڑے بڑے آبلے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے چہروں پر بھی آبلے تھے اور یہی وہ نکتہ تھا جو میرے لیے سود مند تھا۔ اس سے پہلے کہ منگرال مجھ سے ان کی شناخت کی لیے کہتا، میں سپاہیوں کے حلقے میں داخل ہو گیا۔ ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو قوت برداشت کا مظاہرہ کر رہے تھے ورنہ زیادہ تر بری طرح کراہ رہے تھے۔ کیونکہ میں خود یہ جاننا چاہتا تھا کہ مارکوف کس گڑھے میں ہے اس لیے قیدیوں کا بغور جائزہ لینا ضروری تھا۔ میں نے ایک ایک چہرہ بہت غور سے دیکھا مگر ان چہروں میں مارکوف کا چہرہ نہیں تھا۔ میں اپنا اطمینان کرنے کے بعد حلقے سے باہر آگیا۔

"ان میں سے کوئی مارکوف نہیں ہے۔" میں نے منگرال کی سوالیہ نگاہ کا جواب دیا۔

میری بات سن کر منگرال کا چہرہ کچھ بجھ سا گیا۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "بونا! یہ تو بڑا مشکل معاملہ ہے۔ ایک ہی گڑھے کے قیدیوں کو باہر لانے میں اتنا وقت لگ گیا۔ اگر ہم نے سارے گڑھوں کے قیدیوں کو باری باری نکالا تو شاید دن بھر لگ جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو گا۔" میں نے منگرال کی بات کے جواب میں کہا۔ "دوسرے گڑھوں میں موجود قیدی کم از کم یہ تو سمجھ ہی چکے ہیں کہ حکم عدولی کا انجام غلط بھی ہو سکتا ہے۔ کیا تو نے ان کی چیخ و پکار نہیں سنی؟"

"شاید تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔" منگرال محتاط انداز میں بولا، پھر اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ان گیارہ قیدیوں کو دوبارہ اسی گڑھے میں ڈال دیں۔

اور پھر وہی ہوا جو میں نے سوچا اور کہا تھا۔ دوسرے گڑھے کے قیدیوں نے باہر آنے میں کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔

وہ شاید آٹھواں یا نواں گڑھا تھا جس میں مارکوف تھا۔ میں نے اسے واضح طور پر پہچان لیا تھا۔ شناخت کے دوران میں میرا ذہن تیزی سے کام کرتا رہا تھا اور میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے!

جب اس گڑھے کے قیدی ایک ایک کر کے نکالے جا رہے تھے تو اسی وقت میں نے ایک خاص بات محسوس کر لی تھی۔ اس گڑھے سے نکالے جانے والے تمام قیدیوں کے چہروں پر مٹی ملی ہوئی تھی اور سر کے بال بھی خاک میں اٹے ہوئے تھے۔ یہی وہ پہلی بات تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔ ایک کوشش ناکام، اس سے زیادہ کچھ نہیں! مارکوف نے اپنی دانست میں یہ کوشش کی تھی کہ اسے پہچانا جا سکے۔ صرف چہرے سے مٹی مل لینے اور سر میں خاک ڈال لینے سے یہ ممکن نہیں کہ آدمی پہچانا نہ جائے اگر اس وقت میری جگہ توچی ہوتا تو وہ بھی مارکوف کو پہچان لیتا مگر توچی، سیوری کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔

اس گڑھے سے پہلے جن گڑھوں کے قیدیوں کو نکالا گیا تھا انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس صورت حل کو

نظر رکھتے ہوئے مارکوف نے غلطی کی تھی اور اسی غلطی نے نہ صرف مجھے بلکہ ان دونوں منگول سرداروں کو بھی شبہے میں مبتلا کر دیا تھا جو میرے ساتھ تھے۔

"بوغا! تو نے کوئی خاص بات محسوس کی؟" منگرال نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "اس گڑھے کے قیدی دانستہ اپنے چہرے چھپانا چاہتے ہیں۔"

میں نے غالباً "منگرال کے دل کی بات کہہ دی تھی اس لیے اس نے مجھے ستائش آمیز نگاہ سے دیکھا' پھر بولا۔ "تو یوں ہی ابونصار کا چیتا نہیں بلکہ واقعی ذہین ہے۔"

"چہرے پر مٹی مل لینے سے مارکوف خود کو میری نظر سے نہ چھپا سکے گا۔ تو اطمینان رکھ!" میں نے منگرال کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا' پھر سپاہیوں کے حلقے کی طرف بڑھ گیا جو اس گڑھے سے نکالے جانے والے قیدیوں کو گھیرے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔ وہ شانے سے شانہ بھڑائے اور حلقہ بنائے مستعد کھڑے تھے تاکہ اگر کوئی قیدی بھاگنا چاہے تو اسی وقت اسے قتل کر دیں۔ بالکل گرتائی کا سا سماں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس حلقے میں کسی جانور کو شکار کرنے جا رہا ہوں۔

مجھے قریب آتا دیکھ کر سپاہیوں نے تھوڑی سی جگہ دی تاکہ میں حلقے میں داخل ہو سکوں۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا' اس کے لیے ضروری تھا کہ حلقہ زیادہ تنگ نہ ہو۔ میں نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ حلقے ہی کی صورت میں پیچھے ہٹ جائیں اور اسی کے ساتھ اپنی تلوار نیام سے نکال لی۔ میں نے تلوار صرف اس لیے نکالی تھی کہ سپاہی میری طرف سے فکرمند نہ ہے منگول جب شکار کھیلتے تھے تو جانوروں کو ہانکا لگا کر گھیرے میں لے لیتے تھے' پھر اس گھیرے کو تنگ کرتے چلے جاتے تھے' اس طرح کہ کوئی جانور یا درندہ گھیرے سے نہ نکل سکے۔ اس مختصر اور تنگ حلقے کو منگول گرتائی کہتے تھے۔

میں نے گنا کہ ان قیدیوں کی تعداد ایک درجن سے اوپر تھی۔ ان سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔

میں ان کی طرف بڑھا۔ ان سب ہی کی نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں اور میں اس کا سبب جانتا تھا۔ وہ بہر حال اس سے لاعلم تھے کہ انہیں گڑھے سے نکلنے پر کیوں مجبور کیا گیا ہے! اس کے علاوہ میرے ہاتھ میں موجود تلوار بھی ان کے لیے یقیناً "تشویش کا باعث رہی ہوگی۔

میں نے قطار کی دائیں جانب سے قیدیوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میں پہلی ہی نظر میں یہ دیکھ چکا تھا کہ مارکوف دائیں جانب سے چوتھا ہے۔ مجھے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے تھے۔ اس تذبذب کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے اپنے روبرو دیکھ کر الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔

مارکوف سے پہلے قطار میں تین قیدی کھڑے تھے۔ میں ان میں سے ہر ایک کے پاس کچھ دیر رکا اور ان کے چہروں کا بھرپور جائزہ لیا۔ وجہ یہ کہ جب میں مارکوف کے پاس رکوں تو میرے اس عمل کو غیر معمولی نہ سمجھا جائے۔ میں اپنی حرکات و سکنات سے اب تک یہی ظاہر کرتا آیا تھا کہ بہر قیمت مارکوف کو ڈھونڈ نکالنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ میرے دشمنوں یعنی منگولوں کو مجھ پر کسی قسم کا شبہہ نہ ہو۔

آخر کار وہ لمحہ آ ہی گیا کہ میں مارکوف کے بالکل سامنے پہنچ کر رک گیا' اور پھر مجھے جو کچھ اس سے کہنا تھا' اس سے کہہ دینے میں دیر نہیں کی۔

"مارکوف!" میں نے اس کے بالکل قریب ہو کر سرگوشی کی۔ "گڑھے کی گہرائی اتنی ہے کہ اگر دس آدمی ایک دوسرے کے کاندھوں پر سوار ہو جائیں تو دسویں آدمی کا ہاتھ سلاخوں دار جال تک پہنچ سکتا ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔"

"ناممکن!" مارکوف کے ہونٹ ہلے۔ "ایک آدمی دس آدمیوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہر گڑھے کے باہر مسلح سپاہی رہتا ہے۔ اس

طرح فرار ممکن نہیں۔"

مارکوف کی بات نے مجھے چکرا دیا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ "تمہارا فرار بہرحال ضروری ہے۔ آج رات سو نا مت! میں کچھ اور تدبیر سوچوں گا۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا اور دوسرے قیدی کے قریب جا کھڑا ہوا۔

میں دوسرے قیدی کے سامنے پہنچ کر یونہی ہونٹ ہلانے لگا۔ دور سے دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ میں قیدی سے کچھ پوچھ رہا ہوں حالانکہ میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی اور میں صرف ہونٹ ہلا رہا تھا۔ وہ قیدی کیونکہ مارکوف اور میرے درمیان ہونے والی سرگوشیاں سن چکا تھا اس لیے میرے ہونٹ ہلانے پر زیادہ حیرت زدہ نہ ہوا۔ وہ غالباً" صورت حال سمجھ گیا تھا اور اسی لیے خود بھی ہونٹ ہلانے لگا تھا جیسے میری کسی بات کا جواب دے رہا ہو۔ میں یہی عمل دہراتا ہوا قطار کے آخری آدمی تک پہنچ گیا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی میں حلقے سے باہر آگیا۔ منگرال اور دوسرا منگول سردار حلقے کے باہر تھے۔ اب میں نے اپنی تلوار نیام میں رکھ لی تھی۔

"کیا ہوا؟" دوسرا منگول سردار مجھے قریب آتا دیکھ کر دور ہی سے بولا۔ "کیا وہ اس گڑھے میں بھی نہیں؟"

"نہیں!" میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

ہم منگول سردار اور منگرال کے چہروں سے مایوسی کا اظہار ہونے لگا، پھر منگرال بولا۔ "ابھی تو ہم نصف گڑھوں کے قیدیوں کو بھی نہیں دیکھ پائے بوغا!" اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"تو کیا ہوا؟" میں لاپروائی سے بولا۔ "دن ختم ہونے سے پہلے پہلے ہم اپنا کام نمٹا لیں گے اور مجھے یقین ہے کہ ہمیں ناکامی نہیں ہوگی۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ مارکوف مارا جا چکا ہو!" منگول سردار بولا اور منگرال نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

"لیکن یہ سوچ کر ہم اپنا کام ہرگز ادھورا نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میں قطعی یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح مجھ پر کوئی الزام آئے۔ منگرال اور دوسرے منگول سردار کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ اکتاہٹ کا شکار ہو چکے تھے۔

"ان قیدیوں کو گڑھے میں اتار دو!" منگرال نے میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر بلند آواز میں سپاہیوں کو حکم دیا، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بجو کا شہر کی طرف گیا ہے اور اب تک اس نے گڑھے سے ان باغیوں کی لاشیں نکلوالی ہوں گی جو لڑتے ہوئے مارے جا چکے ہیں۔"

"پھر؟" میں نے کہا۔

"تو پہلے ان لاشوں ہی کو کیوں نہ دیکھ لے بوغا!" منگرال بولا۔ ممکن ہے ان میں مارکوف کی لاش بھی مل جائے اور بقیہ گڑھوں میں موجود قیدیوں کو نہ نکالنا پڑے۔ کم سے کم اس طرح یہ تو ہوگا کہ ہمارا دھیان صرف ایک طرف ہوگا۔"

"تیری تجویز مناسب ہے۔" میں نے دانستہ منگرال کی بات سے اتفاق کیا۔ "یوں بھی اب دوپہر ہو رہی ہے۔ میری ہی طرح تو بھی بھوکا ہوگا۔"

منگرال خوش ہو گیا اور دوسرا منگول سردار بھی!

"تو پھر اب واپس چلیں؟" منگرال بولا۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "مگر جانے سے پہلے اس گڑھے پر کوئی نشانی لگوا دے تاکہ اگر ہمیں دوبارہ ضرورت پڑے تو یہیں سے دوبارہ اپنے کام کا آغاز کر سکیں۔"

اس دوران میں اس گڑھے کے تمام قیدیوں کو رسی کے ذریعے نیچے اتارا جا چکا تھا۔ منگرال کے حکم پر سپاہیوں نے اس گڑھے کے کنارے ایک لکڑی کا چھوٹا سا ڈنڈا زمین میں گاڑ کر اس پر سیاہ کپڑا باندھ دیا، پھر جن گڑھوں کے قیدیوں کو نکال کر دیکھا جا چکا تھا، ان کے برابر زمین میں نیزے گاڑ دیئے گئے۔ دوبارہ کام کا آغاز کرنے کے لیے یہ نشانیاں کافی تھیں۔

طے یہ ہوا کہ کھانے سے فراغت پا کر ابو نصار کو صورت حال سے آگاہ کیا جائے' پھر اس کی اجازت سے شہر کی طرف روانگی ہوگی۔

جب میں دونوں منگول سرداروں سے رخصت ہو کر اپنے کمرے کی طرف لوٹا تو ابو نصار کے ایک خادم نے مجھے اطلاع دی کہ ابو نصار میرا منتظر ہے میں اپنے کمرے میں جانے سے رک گیا اور ابو نصار کے خادم سے کہا کہ وہ میری آمد سے ابو نصار کو مطلع کرے۔ خادم کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا' پھر الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ اس نے بتایا کہ ابو نصار کھانا کھانے بیٹھ رہا ہے اور مجھے فوراً" طلب کیا ہے۔

میں ابو نصار کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا اور کھانا کھانے لگا۔ میں نے اس سے پہلے بھی کبھی ابو نصار کے دسترخوان پر کسی قسم کی شراب نہیں دیکھی تھی اور نہ اس وقت شراب موجود تھی۔ میں نے پہلے بھی کئی بار سوچا تھا کہ اس سلسلے میں ابو نصار سے کبھی پوچھوں گا۔ اس وقت میرا دل چاہا کہ وہ بات پوچھ ہی لوں جو میرے ذہن میں بہت دن سے چبھ رہی تھی مگر میں نے کچھ نہیں پوچھا کیونکہ مجھے علم تھا کہ کھانے کے دوران میں گفتگو کرنا ابو نصار کو پسند نہیں۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ کھانا کھاتا رہا' اور جب کھانا کھا چکا تو مجھ سے پہلے ابو نصار بول اٹھا۔

"بوغا! تیرے انگوٹھے کا زخم اب کیسا ہے؟" ابو نصار نے دریافت کیا۔

"پہلے سے ٹھیک ہے مگر اب بھی دکھن بہر حال ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں تیرے زخم پر اور مرہم لگا دوں۔"

زخم پر مرہم لگا کر پٹی باندھنے کے بعد اس نے مجھ سے مارکوف کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد شہر جانے کی اجازت چاہی۔

"بہتر تو یہ تھا کہ پہلے ایک کام پوری طرح نمٹا لیا جاتا مگر تو چاہتا ہے تو ایسا ہی کر لے جیسا سوچا ہے۔" ابو نصار نے جواب دیا۔

میں ابو نصار کی اجازت لے کر اس کے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ دونوں منگول سردار اسی طرف آتے دکھائی دیے جن میں سے ایک منگرال تھا اور دوسرے کا نام بھی اب میں جان چکا تھا۔ اس کا نام یوشا تھا۔ میں ان دونوں کے انتظار میں وہیں رک گیا۔

منگرال اور یوشا قریب پہنچے تو میں نے انہیں بتایا کہ ابو نصار سے شہر جانے کی اجازت لی جا چکی ہے۔ وہ دونوں میرے ساتھ سوار ہو کر شہر کی جانب جا رہے تھے۔ میں نے دانستہ اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر رکھی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت گزر سکے۔ اس پر منگرال اور یوشا نے استفسار بھی کیا تھا جسے میں باتوں میں ٹال گیا تھا۔

وہ گڑھا شہری آبادی کی دوسری جانب تھا جس میں لاشیں دبائی گئی تھیں' یہ بات شہر میں داخل ہوتے ہی ان سپاہیوں سے معلوم ہو گئی تھی جو گشت پر تھے۔ عموماً" دن کے وقت گشت کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن حالات غیر معمولی تھے اور شہر کی فضا کشیدہ تھی اس لیے دن کے وقت بھی سپاہی گشت پر تھے تاکہ مقامی باشندے کوئی گڑبڑ نہ پھیلا سکیں۔

ہم اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے شہر کے درمیان سے گزرے۔ اور پھر اس وسیع میدان تک پہنچ گئے جہاں بجوکا موجود تھا۔ بجوکا کے ہمراہ سپاہیوں کے کئی دستے تھے۔

ہم نے اپنے گھوڑے اس جگہ روکے جہاں بجوکا' سپاہیوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ ہمیں قریب آتے دیکھ کر وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اس وقت واضح طور پر یہ بات محسوس کی کہ مجھے دیکھ کر بجوکا خوش نہیں ہوا۔ اس کے چہرے پر کبیدگی کے اثرات نمودار ہو گئے تھے۔

ہم تینوں گھوڑے سے اترے تو بجوکا میری بجائے منگرال سے مخاطب ہوا۔ "کیا وہ باغی' قیدیوں میں نہیں ملا؟" اس کا اشارہ مارکوف کی طرف تھا۔

جواب میں منگرال نے اسے صورت حال سے

آگاہ کیا۔

"اگر تم لوگ اور کچھ دیر نہ آتے تو میں یہاں سے روانہ ہو جاتا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو لاشیں پڑی ہیں۔"

کچھ فاصلے ہی پر بڑا سا گڑھا نظر آیا جس کے کنارے لاشیں اس طرح ڈھیر کر دی گئی تھیں جیسے مرنے والے انسان نہیں جانور تھے۔ میں کسی سے کچھ کہے بغیر اس طرف بڑھ گیا۔ یوشا بجو کا کے پاس ہی کھڑا رہا مگر منگرال نے میری تقلید کی۔

وہ بڑا ہولناک منظر تھا۔ لاشیں ایک دوسرے پر ڈھیر تھیں۔ ایک جانب مجھے سروں کا چھوٹا سا ڈھیر بھی نظر آیا۔ وہ سر غالباً" اس لیے ڈھیر کی صورت میں علیحدہ رکھ دیئے گئے تھے تاکہ شناخت کے دوران میں زیادہ دشواری نہ ہو۔

لاشیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ مرنے والوں کی موت کے مختلف اسباب تھے۔ کسی کے سینے میں چھید تھا تو کسی کا سر تن سے جدا تھا۔ کسی کا پیٹ پھٹ گیا تھا تو کسی کے سر پر گہرا زخم تھا۔

مجھے ان لاشوں میں مارکوف کی لاش کو شناخت نہیں کرنا تھا بلکہ وقت گزارنا تھا اس لیے میں نے پہلے سروں کے ڈھیر پر توجہ دی اور ایک ایک چہرے کو اس طرح دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کچھ چہرے زخموں کے سبب اس حد تک مسخ تھے کہ چہرے کے نقوش بگڑ گئے تھے اور یہ بات میرے حق میں تھی۔ میں بہت آسانی سے خود کو شک و شبہے سے بالاتر ثابت کر سکتا تھا۔

سپاہیوں نے میرے حکم پر تمام لاشوں کو قطار در قطار ڈال دیا۔ اس میں بھی کافی وقت لگا۔ اس دوران میں بجو کا قلعے کی طرف لوٹ گیا اور یوشا میرے پاس آگیا۔

آخر کار میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا۔ میں نے شناخت کا کام اس وقت ختم کیا جب سورج اپنی بیوی کی آغوش میں گرنے والا تھا۔ میرا مقصد ہی یہ تھا کہ کسی طرح وہ دن گزر جائے اور بقیہ گڑھوں میں موجود قیدیوں کی شناخت دوبارہ شروع نہ ہو سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو مارکوف کے گڑھے پر جو نشانی لگائی گئی تھی، وہ ہٹا دی جاتی۔ مجھے کچھ کر گزرنے کے لیے رات کا انتظار تھا اور رات ہونے والی تھی۔

"لاشوں کو دوبارہ گڑھے میں ڈال کر مٹی سے ڈھک دیا جائے۔" میں نے سپاہیوں کو با آواز بلند حکم دیا۔

منگرال اور یوشا نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ مارکوف کی لاش مل جاتی تو میں انہیں آگاہ کر دیتا۔

قلعے کی طرف واپسی ہوئی تو یوشا نے راستے میں اپنے گھوڑے کی رفتار کم کی اور میرے قریب آگیا۔

"یوغا! کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کا چہرہ مسخ....."

"قطعی!" میں یوشا کی بات کاٹ کر بولا۔ "ایسا بالکل ہے کہ چہرہ بگڑ جانے کے سبب مارکوف کی لاش نہ پہچانی جا سکی ہو۔"

"پھر تو کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ مارکوف زندہ ہے یا مر گیا!" یوشا بولا۔

"یہ نہ بھول کہ ابھی زندہ قیدیوں کی شناخت کا کام باقی ہے۔ ممکن ہے مارکوف انہی میں ہو۔ میں نے کہا۔

"لیکن اب تو یہ کام کل ہی شروع کیا جا سکتا ہے۔" یوشا میری جانب دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس کے بعد یوشا خاموش ہو گیا۔ منگرال کا گھوڑا ہم دونوں سے آگے دوڑ رہا تھا۔

جب میں، منگرال اور یوشا کے ہمراہ قلعے میں داخل ہوا تو مشعلیں جلائی جا چکی تھیں۔ دونوں منگول سردار اپنی کارکردگی ظاہر کرنے کی غرض سے میرے ساتھ ہی ابو نصار کے کمرے کی جانب بڑھے۔ میں نے انہیں ٹالنا چاہا مگر نہ ٹلے۔

ابو نصار نے اس بات سے اتفاق کیا کہ بقیہ کام دوسرے دن شروع کیا جائے کیونکہ اس کے لیے رات کا وقت بہرحال مناسب نہیں تھا۔ اس سے قطع نظر ابو نصار کو یہ خیال بھی رہا ہو گا کہ ہم کافی تھک چکے

تھے جس کا اظہار غالباً" ہمارے چہروں سے بھی ہو رہا تھا۔

دونوں منگول سردار چلے گئے تو ابو نصار نے مجھ سے کبھی آرام کرنے کے لیے کہا۔

میں ابو نصار سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر پر دراز ہونے کے بعد میں اپنے آئندہ اقدامات کے بارے میں غور کرنے لگا۔

قلعے میں جہاں جہاں منگول سردار قیام پذیر تھے' وہاں روز و شب' خادم متعین رہتے تھے جنہیں بوقت ضرورت طلب کیا جا سکتا تھا لیکن وہ کسی بھی معاملے میں مداخلت کے مجاز نہیں ہوتے تھے۔ ان کے اوقات کار مقرر تھے اور اسی نسبت سے جائے قیام بھی! عمر اور تجربے کی بنیاد پر منگول سرداروں کو مراعات حاصل ہوتی تھیں اسی لیے جو منگول سردار بوڑھے تھے' ان کے پاس خادموں کی تعداد زیادہ تھی۔ میری حیثیت بھی منگول سردار کی تھی اس لیے مجھے بھی دو خادم دیے گئے تھے جن کا قیام میرے کمرے کے برابر ہی تھا۔ میرے کمرے کی ایک جانب ابو نصار کا کمرہ تھا اور دوسری جانب خادموں کا! خادم اس وقت تک کمرے کے باہر موجود رہنے کے لیے پابند تھے جب تک میں بیدار رہوں لیکن ضرورت پڑنے پر میں انہیں کسی بھی وقت طلب کر سکتا تھا۔

ابو نصار کی حیثیت کیونکہ برقائی خاں کے بعد سب سے افضل تھی۔ اس لیے وہ جتنے چاہے خادم رکھ سکتا تھا مگر میں نے زیادہ تر صرف ایک ہی خادم کو اس کی خدمت میں دیکھا تھا جو ابو نصار کے کمرے کی دوسری جانب ایک اور کمرے میں رہتا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ ابو نصار بوقت ضرورت جتنے خادم چاہتا طلب کر سکتا تھا۔

منگول سرداروں کے لیے مطبخ سے کھانا لانا اور ان کی دیگر ضروریات کا خیال رکھنا' خادموں ہی کے سپرد تھا۔ خادموں کی حیثیت تقریباً" غلاموں جیسی تھی۔ وہ کسی بھی منگول سردار کے حکم سے سرتابی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے اپنی خدمت میں مامور دونوں خادموں کو حکم دیا تھا کہ مجھے رات کا کھانا کھلا کر بغیر میرے طلب کیے اپنے کمرے سے نہ نکلیں۔ یہ حکم میں نے اس وقت دیا تھا جب مارکوف سے سازباز کر کے لوٹا تھا۔ میرے حکم کا مقصد یہ تھا کہ خادم میری ان سرگرمیوں سے آگاہ نہ ہو سکیں جو صرف رات کے وقت ہی ممکن تھیں۔ یوں بھی خادموں کو اجازت نہیں تھی کہ وہ رات کے وقت بغیر حکم باہر گھوم سکیں۔ رات کو صرف ان سپاہیوں کو قلعے میں گشت لگانے یا کسی جگہ تعینات رہنے کی اجازت تھی جن کے سپرد قلعے کی حفاظت تھی۔

ابو نصار عموماً" دیر سے سوتا تھا اس لیے اس کا خادم دروازے پر مستعد کھڑا رہتا تھا اور اسی وقت اپنے کمرے میں جا کر سوتا تھا جب ابو نصار سے اجازت مل جاتی تھی۔ مجھے قلعے میں رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن میں نے گہری نظر سے ماحول کا جائزہ لیا تھا۔ اس لیے تمام باتیں اپنے ذہن میں محفوظ کرتا رہا تھا کہ کیا خبر کب کس طرح کے حالات سے نمٹنا پڑے!

میں نے دن بھر مارکوف کی رہائی کے متعلق ہی سوچا تھا اور میرا ذہن ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں جو کچھ سوچا تھا' اسے مدنظر رکھتے ہوئے ابو نصار کے خادم سے ایک اہم کام لیا جا سکتا تھا۔ مجھے اگر انتظار تھا تو صرف یہ کہ رات کچھ اور گزر جائے۔

مارکوف کی رہائی کے متعلق سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اور بات بھی آئی تھی کہ اب مزید قلعے میں پڑے رہنا میرے لیے بے سود ہے۔ مجھے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے مارکوف کی طرح زندگی گزارنی چاہیے۔ مجھے مارکوف کے ساتھ رہنا چاہیے کیونکہ میرے اور اس کے مقاصد تقریباً" ایک ہیں۔ پہلے میں نے جو فیصلہ کیا تھا کہ منگولوں کے درمیان رہ کر ان سے انتقام لوں اب اس فیصلے میں کچھ ترمیم ضروری تھی۔ فیصلے میں ترمیم کے باوجود بھی میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا شمار منگول دشمنوں میں ہو میں اسی لیے ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا تھا کہ جو کچھ بھی ہو

اسے وقت کا تقاضا سمجھا جائے اور میں کھل کر سامنے نہ آپاؤں۔ ایک جانب مجھے منگول سمجھا جا رہا ہے اور دوسری جانب میں منگولوں کی جڑیں کھوکھلی کرتا رہوں۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا۔ وہ مشکل تو ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔

مگر سوچنے میں کافی دیر گزر گئی اور وہ وقت آگیا جس کا مجھے انتظار تھا تو میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ ابو نصار کا خادم اپنے کمرے میں چلا جائے۔ ایسی صورت میں مجھے اس کے دروازے پر دستک دینا پڑتی جو مصلحتاً" میں نہیں چاہتا تھا۔

میں نے باآہستگی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ابو نصار کا خادم اس کے دروازے پر موجود تھا اور حسب معمول ابو نصار کا دروازہ بند تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ابو نصار ابھی سویا نہیں۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر دروازے پر کھڑا ہو گیا' اور جب چند لمحے بعد ہی ابو نصار کے خادم کی نگاہ میری جانب اٹھی تو میں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

خادم تیزی سے میرے قریب پہنچا اور مودب کھڑا ہو گیا۔

"مجھے ابو نصار نے حکم دیا تھا کہ جب کچھ رات گزر جائے تو قید خانے کے تمام محافظوں کو اس کے حضور پیش کروں۔" میں نے ابو نصار کے خادم کو مخاطب کیا۔ میری آواز اتنی دھیمی تھی کہ اس پر سرگوشی کا گمان کیا جا سکتا تھا۔ ذرا توقف کے بعد پھر بولا "تو قید خانے کے میدان میں جا اور محافظوں کو ابو نصار کا حکم سنا کہ ان سب کو فوراً" طلب کیا گیا ہے لیکن یاد رکھ تجھے راستے میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کرنا۔" یہ کہہ کر خادم کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

میری بات سن کر خادم نے ادب سے سر جھکایا اور بولا۔ "حکم کی تعمیل ہو گی۔"

"میں! ابو نصار کے پاس جا رہا ہوں۔ تو محافظوں کو ابو نصار کا حکم سنا کر۔

وہاں رکے گا نہیں بلکہ فوراً" لوٹ آئے گا۔ جب محافظ آجائیں تو انہیں راہداری میں قطار بنا کر کھڑا کیا جائے گا۔ تو یہ بات بھی انہیں بتا دے گا۔ جب وہ قطار بنا کر کھڑے ہو جائیں تو تجھ پر لازم ہے کہ تو ابو نصار کو ان کی آمد سے مطلع کرے' سمجھ گیا؟" میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے پوچھا۔

خادم نے اثبات میں سر ہلایا' اور پھر میرا اشارہ پا کر روانہ ہو گیا۔ میں اس وقت تک اپنی جگہ کھڑا رہا جب تک خادم میری نگاہ سے اوجھل نہ ہو گیا۔

قید خانے کا میدان قلعے کی پچھلی سمت میں تھا اور میرے کمرے سے اس کا فاصلہ کافی تھا اس لیے خادم کی فوری واپسی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود بھی میں پوری طرح چوکنا رہنا چاہتا تھا۔ میری ذرا سی غلطی سارا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔

میں نے آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور دبے پاؤں ابو نصار کے کمرے کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ابو نصار کے کمرے کا دریچہ بھی بند تھا ورنہ میں اس کی نگاہ سے بچنے کے لیے وہاں سے جھک کر گزر جاتا یا دوسری جانب سے جاتا۔

تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میں نے وہ راہداری عبور کی اور دائیں جانب دوسری راہدی میں مڑ گیا۔

مختلف راہداریوں سے گزرتا ہوا آخر میں اس مقام تک پہنچ ہی گیا جس کے بارے میں پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ وہ جگہ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہاں تقریباً" تاریکی رہتی تھی کیونکہ مشعلیں کافی کافی فاصلے پر تھیں۔ وہ قلعے کا رہائشی حصہ بھی نہیں تھا جو مجھے کسی کی مداخلت کا خطرہ ہوتا اس کے علاوہ یہ کہ وہ جگہ قلعے کی پچھلی سمت میں تھی اور قید خانے کے میدان سے قریب تھی۔ ابو نصار کا خادم واپسی میں ادھر ہی سے گزرتا اور وہ محافظ بھی جو قید خانے کی حفاظت پر مامور تھے کیونکہ ابو نصار کے کمرے تک پہنچنے کا مختصر راستہ وہی تھا۔ میں وہاں موجود ایک ستون کی آڑ میں چھپ گیا تاکہ ادھر سے گزرنے والوں کو میرا ہیولا بھی نظر نہ آسکے۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جیسے ہی میری

عت سے قدموں کی چاپ ٹکرائی' میں نے کمر کے رد بندھی ہوئی پیٹی سے خنجر نکال لیا۔ کچھ دیر وہاں لھڑا رہنے کے سبب میری آنکھیں اندھیرے کی عادی وگئی تھیں۔ میں نے نیم تاریکی کے باوجود ابو نصار کے ادم کو اس کے ازخرام سے پہچان لیا۔ وہ مجھ سے دو بزے کے فاصلے پر تھا۔ پھر جیسے ہی وہ ستون کے قریب پہنچا' میں اس پر جھپٹ پڑا۔ میں نے خاص طور پر یہ خیال رکھا تھا کہ وہ چیخ نہ پائے کیونکہ رات کے سناٹے میں اس کی چیخ دور تک سنائی دیتی۔ میرے بائیں ہاتھ کی کلائی اور بازو کے درمیان اس کی گردن تھی اور دائیں ہاتھ میں خنجر تھا جو اس کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا' بائیں جانب!

ابو نصار کا خادم میری گرفت میں کچھ دیر تڑپا' پھر اس کا جسم ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔ میں نے اس کا جسم گھسیٹ کر ستون کی آڑ میں کر لیا' اور پھر اس کے لباس سے خون آلود خنجر پونچھ کر کمر کی پیٹی میں لگا لیا۔

ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ بیک وقت بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی جو میرے لیے خلاف توقع نہیں تھی۔ میں دم سادھے ستون کی آڑ میں کھڑا رہا۔ قدموں کی چاپ قریب آتی گئی' اور پھر محافظوں کے ہیولے ستون سے کچھ فاصلے پر نظر آئے۔ تمام محافظ تیز تیز قدم اٹھائے ہوئے میرے سامنے سے گزر گئے مگر میں کچھ دیر ستون کی آڑ سے نکل کر تقریباً" دوڑتا ہوا وہ راہداری عبور کر گیا۔ اس راہداری کا اختتام قید خانے کے میدان پر ہوا۔

میدان پر تاریکی چھائی ہوئی تھی جو میرے لیے خلاف توقع تھی۔ مجھے علم تھا کہ محافظوں کے پاس مشعلیں بھی ہوتی ہیں۔ جب میں نے محافظوں کو بغیر مشعلوں کے راہداری سے گزرتے دیکھا تھا تو یہی سمجھا تھا کہ وہ اپنی مشعلیں قید خانے کے میدان ہی میں چھوڑ آئے ہوں گے۔

پہلے گڑھے کے قریب پہنچ کر ہی میں سمجھ گیا کہ وہاں تاریکی کیوں تھی! گڑھے کے پاس ہی مجھے ایک بجھی ہوئی مشعل مل گئی تھی جس کے قریب رسی کا لچھا پڑا تھا یہی ہو سکتا تھا کہ محافظ احتیاطاً" اپنی اپنی مشعلیں بجھا گئے تھے۔

تاریکی کے سبب مجھے کچھ دقت تو ہوئی مگر آخر کار میں نے وہ گڑھا ڈھونڈ ہی لیا جس میں مارکوف کو ہونا چاہئے تھا۔ یہ یقین مجھے اس طرح بھی ہوا کہ اس سے آگے جو گڑھا تھا اس پر کوئی نشانی موجود نہیں تھی۔ یقین ہونے کے باوجود بھی میں اس گڑھے کے قریب بیٹھ گیا اور بلند آواز میں مارکوف کو پکارا۔

"بوغا!" دوسری بار پکارے جانے کے بعد ہی گڑھے کی گہرائی سے ایک آواز سنائی دی اور وہ آواز مارکوف ہی کی تھی۔

"میں سلاخوں دار جال ہٹا کر رسی نیچے پھینک رہا ہوں۔ تم اوپر آجاؤ مارکوف!" میں نے گڑھے کی طرف جھکتے ہوئے کہا' اور پھر گڑھے کے اوپر سے جال کو گھسیٹنے لگا۔

سلاخوں دار جال کافی بھاری ثابت ہوا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے گڑھے سے ہٹا ہی دیا۔ میں دن کے وقت خود دیکھ چکا تھا کہ اس جال کو کم سے کم چار سپاہی مل کر گڑھے کے اوپر سے ہٹاتے تھے۔

جیسے ہی سلاخوں دار جال گڑھے کے اوپر سے ہٹا' میں نے قریب ہی پڑا ہوا رسی کا لچھا کھولا اور اس کا ایک سرا گڑھے میں ڈال دیا' پھر میں رسی کو اس وقت تک ڈھیل دیتا رہا جب تک گڑھے سے مارکوف کی آواز سنائی نہ دی۔

"کیا تم تنہا ہو؟" مارکوف کی آواز آئی۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "اگر اسی کا سرا تم تک پہنچ گیا ہے تو اسے اپنی کمر سے باندھ لو!"

"اچھا!" مارکوف کی آواز سنائی دی۔ میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد ہی گڑھے سے پھر آواز ابھری۔ "میں نے رسی باندھ لی' کھینچو!"

مارکوف کو اوپر کھینچتے ہوئے میرا جسم پسینے پسینے ہو گیا اور سانس بھی پھولنے لگا مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔

مارکوف گڑھے سے باہر آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔

"بوغا! تم نے ثابت کر دیا کہ....."

"وقت کم ہے، جلدی کرو!" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "محافظ کسی بھی لمحے لوٹ کر آسکتے ہیں۔ ہمیں دوسروں کو بھی گڑھوں سے نکالنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے رسی کو دوبارہ گڑھے میں ڈال دیا

"مگر محافظ کہاں گئے؟ مارکوف کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔" میں جلدی سے بولا۔ "تم اپنے جتنے ساتھیوں کو بچا کر یہاں سے نکال لے جاؤ اتنا ہی بہتر ہے۔ یہاں سے قلعے کی پچھلی دیوار زیادہ دور نہیں۔ رسیوں کے ذریعے کمندیں ڈال کر تم لوگ فرار ہو جاؤ!"

اس کے بعد مارکوف نے کچھ نہیں پوچھا اور زبردستی میرے ہاتھ سے رسی لے لی اور بولا۔ "تم یہاں سے بھاگ جاؤ اور بقیہ کام مجھ پر چھوڑ دو!"

"جب ایسا موقع آئے گا، میں بھاگ جاؤں گا۔ تم بے فکر رہو۔" میں نے کہا۔ "مگر اب میں مزید یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ ممکن ہے کہ میں آج ہی رات تم تک پہنچ جاؤں۔" یہ کہہ کر میں وہاں رکا نہیں اور دوسرے گڑھے کے اوپر ڈھکا ہوا جال ہٹانے کے لیے اس طرف بڑھ گیا۔

جتنے قیدی جلد سے جلد گڑھوں سے باہر آجاتے اتنا ہی کام آسان ہو جاتا۔

مجھے امید نہیں تھی کہ مارکوف اور اس کے ساتھی اتنی تیزی کا ثبوت دیں گے۔ انہوں نے بہت جلدی کئی گڑھے خالی کر دیے۔ اب مارکوف صرف نگرانی کر رہا تھا۔ میری آنکھیں کیونکہ اب اندھیرے کی کافی عادی ہو چکی تھیں اس لیے لوگوں کی نقل و حرکت مجھے نظر آرہی تھی۔ مجھے اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ محافظوں کی واپسی میں غیر معمولی تاخیر نہیں ہوگی بلکہ جب ابو نصار انہیں یہ بتائے گا کہ اس نے انہیں طلب نہیں کیا تو وہ کسی سازش کی بو پا جائیں گے۔ خود ابو نصار انہیں جلد سے جلد قید خانے کے میدان کی طرف جانے کا حکم دے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی امکان تھا کہ ابو نصار قلعے میں موجود دیگر محافظوں کو بھی قید خانے کی طرف بھیج دے۔ ایسی صورت میں نہتے قیدیوں کا مسلح محافظوں سے نمٹنا قطعی ممکن نہ ہوتا۔ میرے اندازے کے مطابق محافظ اب آنے والے تھے۔ یہ سوچ کر میں تیزی سے مارکوف کی طرف بڑھا جو چند قدم کے فاصلے ہی پر کھڑا ہوا تھا۔

"مارکوف!" میں نے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔ "اب مزید وقت نہیں کہ تم یہاں رک سکو۔ میرا مشورہ ہے کہ تمہارے جتنے ساتھی گڑھوں سے باہر آچکے ہیں، انہیں ساتھ لے کر فوراً یہاں سے فرار ہو جاؤ! مخاطب اب لوٹنے ہی والے ہوں گے۔"

"مگر..... مگر میں اپنے لوگوں کو دشمنوں کی قید میں چھوڑ کر..... اگر تم اس چکر میں پڑے تو ان لوگوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی جو گڑھوں سے باہر آچکے ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

اس کی سمجھ میں میری بات آئی یا نہیں، مجھے پتا نہیں چلا لیکن میرے بضد ہونے پر وہ فرار کے لیے آمادہ ہو گیا۔ میں اس دوران میں پہلے ہی اسے بتا چکا تھا کہ محافظ کہاں گئے ہیں اور انہیں کس طرح قید خانے کے میدان سے ہٹنے سے پر مجبور کیا گیا ہے!

ادھر مارکوف اور اس کے ساتھیوں نے قلعے کی پچھلی دیوار کے کنگروں پر کمندیں پھینکیں اور ادھر میں تیزی کے ساتھ اس راہداری کی طرف دوڑا جس سے گزر کر میدان میں پہنچا تھا۔ راہداری میں داخل ہوتے ہی مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے گئی تھیں اس کا مطلب تھا کہ میں نے قطعی درست اندازہ قائم کیا تھا۔

میں دوڑتا ہوا اس جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں پہلے چھپا تھا۔ نیم تاریکی پھر میرے کام آئی۔ محافظ دوڑتے ہوئے اس ستون کے سامنے سے گزرنے لگے جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ جلدی اور گھبراہٹ کے سبب میں ابو نصار کے خادم کی لاش پر کھڑا ہو گیا تھا جسے قتل کر کے وہاں ڈال گیا تھا۔ میں

نے واضح طور پر یہ بات محسوس کی کہ محافظوں کی تعداد پہلے کی نسبت اب زیادہ تھی اور ان میں سے بہت سوں کے پاس مشعلیں بھی تھیں۔ محافظوں کے اور میرے درمیان صرف دو نیزوں کا فیصلہ تھا۔ میرا دل اس وقت تیزی سے دھڑک اٹھتا تھا جب کوئی مشعل بردار محافظ میرے سامنے سے بھاگتا ہوا گزرتا تھا۔ مشعل کی روشنی ابو نصار کے خادم کی لاش تک پہنچ جاتی تھی۔ لاش کا نصف حصہ ستون کے پیچھے تھا اور نصف باہر! اگر اس وقت ان میں سے کسی کی بھی نگاہ لاش پر پڑ جاتی تو مجھے وہاں اپنی موجودگی کا سبب ظاہر کرنا مشکل ہو جاتا۔ وہ لاش پر نظر پڑتے ہی ستون کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے' اور پھر میرے لیے کوئی راہ معتبر نہ ہوتی۔ ایک منگول سردار کی حیثیت سے وہ مجھے گرفتار تو نہ کر سکتے مگر معاملہ ابو نصار تک ضرور جاتا اور ابو نصار کے سامنے جھوٹ گھڑتے ہوئے مجھے خوف آتا تھا۔ میں وہاں اپنی موجودگی کا کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور پیش کر دیتا مگر ابو نصار شاید میرا جھوٹ پکڑ لیتا۔ پھر کیا ہوتا' کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا!

ایک جانب میں اپنی طرف سے فکر مند تھا تو دوسری جانب مجھے مارکوف اور اس کے ساتھیوں کی فکر تھی۔

اور پھر خطرے کے لمحات گزر ہی گئے۔ جیسے ہی آخری محافظ مشعل اٹھائے کچھ دور گیا' میں ستون کی آڑ سے نکل کر قلعے کے اندرونی حصے کی طرف بھاگا مگر ایسا کرتے ہوئے میں نے جلد بازی کا ثبوت دیا۔ مشعل بردار محافظ نے غالباً" میرے قدموں کی چاپ سن لی تھی اور ایک دم چیخ پڑا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بتا رہا تھا کہ کوئی ستون کی آڑ سے نکل کر بھاگا ہے۔ یہ سنتے ہی میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی قلعے کا ایک ایک راستہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ اب میرا رخ قلعے کے صدر دروازے کی طرف تھا۔

مجھے کچھ دور دوڑ کر ہی احساس ہو گیا تھا کہ کچھ محافظ میرے تعاقب میں بھی ہیں مگر میں انہیں جل دے کر نکل گیا۔

اب ہر جانب سے شور اور ہنگامے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں نے دانستہ ان راستوں سے اجتناب کیا تھا جن سے گزر کر قید خانے کے میدان میں پہنچا جا سکتا تھا۔ اس احتیاط کا سبب یہ تھا کہ اگر ابو نصار نے قلعے کے بقیہ محافظوں کو بھی قید خانے کی طرف جانے کا حکم دیا تو ان سے میری مڈبھیڑ نہ ہو۔

میں آخر اس راہداری تک پہنچ ہی گیا جو قلعے کے پھاٹک کی طرف جاتی تھی۔ دوڑنے کے سبب میرے انگوٹھے کا زخم تکلیف دینے لگا تھا مگر اتنی نہیں کہ میرے لیے ناقابل برداشت ہوتی۔ یہ قلعے کی وہ راہداری تھی جس میں رات کے وقت کوئی منگول سردار کے سوا کوئی دوسرا داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

راہداری میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کر لیا کہ وہاں محافظوں کی تعداد نصف سے بھی کم ہے۔ وہاں عام حالات میں جتنے محافظ ہوتے تھے۔ اتنے نہیں تھے۔

"میرے پیچھے آؤ۔" میں راہداری میں داخل ہوتے ہی چیخا تھا اور وہاں موجود محافظ میرے ساتھ دوڑنے لگے تھے۔

قلعے کے پھاٹک کے قریب ایک چھوٹا سا اصطبل بھی تھا تاکہ ہنگامی حالات میں وہاں سے گھوڑے حاصل کیے جا سکیں۔ اصطبل کے قریب پہنچتے ہی میں رک گیا۔ قلعے کا پھاٹک سامنے ہی تھا' جہاں کلہاڑے بردار نظر آ رہے تھے۔

"اصطبل میں جتنے گھوڑے ہیں نکال لاؤ!" میں نے محافظوں کو حکم دیا اور پھاٹک کی طرف دوڑا۔ میرا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا اس لیے میں کلہاڑے بردار محافظوں کے پاس پہنچ کر کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا اور اپنے سانس پر قابو پایا۔ کلہاڑے بردار محافظ مجھے حیرت سے دیکھتے رہے مگر ان میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ مجھ سے کوئی سوال کر سکتے۔ کچھ دیر بعد میں ہی ان سے مخاطب ہوا اور پھاٹک کھولنے کا حکم دیا۔ اسی دوران میں محافظ اصطبل سے گھوڑے لے کر آ گئے۔ ادھر پھاٹک کھلا اور ادھر میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ میں

نے محافظوں کو بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا اور ان کا انتظار کیے بغیر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

میرا گھوڑا ایک ہی جست میں پھاٹک کی سیڑھیاں عبور کر کے اوپر پہنچ گیا' اور پھر دوڑتا ہوا' تیر کی طرح دوسری جست لگا کر قلعے سے باہر آ گیا۔ قلعے کے محافظ غالباً" اتنا تو سمجھ چکے تھے کہ حالات غیر معمولی ہیں مگر وہ تفصیل سے بے خبر تھے۔ انہوں نے میری تقلید میں دیر نہیں کی۔ میرا گھوڑا پھاٹک سے نکلا ہی تھا کہ وہ بھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے مجھ تک پہنچ گئے۔

اب تک سب کچھ وہی ہوا تھا جو میں نے سوچا تھا مگر ایک بات پہلے سے نہیں سوچی تھی کہ محافظوں کے پاس مشعلیں بھی ہوں گی۔ میرے ساتھ جتنے محافظ تھے' ان سب ہی کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر محافظوں کو جل دے جاؤں گا لیکن مشعلوں کی موجودگی نے کھیل بگاڑ دیا تھا۔ اب میں آسانی کے ساتھ محافظوں سے جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔

میرے گھوڑے کا رخ شہر کی طرف تھا اور اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ مجھے ہر حال میں محافظوں کو جل دے کر نکلنا تھا۔

گھوڑے تیز رفتاری سے قلعے اور شہر کے درمیان فاصلے کو عبور کرتے رہے۔ میں شہر کی اطراف موجود پہاڑی سلسلے میں کسی اور طرف سے بھی داخل ہو سکتا تھا لیکن یہ خطرہ مول لینا میرے حق میں غلط بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ میں وہی راستہ اپنانا چاہتا تھا جو پہلے سے دیکھا بھالا تھا۔

شہر میں داخل ہوتے ہی میں نے احتیاطاً" ایک محافظ سے مشعل لے لی تھی۔ شہر کی حفاظت کے لیے جو مسلح دستے متعین تھے' ان سے توقع کے مطابق جلد ہی مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔ دو تو مان باشی اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے میرے ساتھ چلنے لگے۔

"مارکوف کے کچھ ساتھیوں نے قلعے سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔" میں نے ان دونوں تومان باشیوں کو باآواز بلند بتایا۔ "پوری طرح چوکنا رہو! میں ان کی تلاش میں پہاڑیوں کی طرف جا رہا ہوں۔" یہ حکم دیتے ہی میں نے دوبارہ اپنے گھوڑے کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور اس کی پسلیوں پر اپنے گھٹنوں کا دباؤ بڑھایا۔

میرے ساتھ محافظوں کی زیادہ تعداد نہیں تھی' بمشکل دو دستے رہے ہوں گے مگر میں نے دونوں تومان باشیوں کو یہ مشورہ دینے کا موقع نہیں دیا تھا کہ کچھ اور مسلح دستوں کو ساتھ لے لوں۔ میرے ساتھ جتنے کم سے کم محافظ ہوتے میرے حق میں اتنا ہی اچھا تھا۔

شہر سے نکل کر میں اس راستے پر ہو لیا جو پہاڑوں کی طرف جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مارکوف اور اس کے ساتھی اگر قلعے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو وہ شہر کا رخ نہیں کریں گے۔ یہ بات بہرحال مارکوف کے علم میں بھی تھی کہ شہر میں سپاہیوں کے مسلح دستے موجود رہتے ہیں اور اس طرف کا رخ کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میں مطمئن سا تو ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود ذہن میں ایک سوال کی چبھن سی تھی۔ سوال یہ تھا کہ اگر قلعے تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ بھی موجود تھا تو گزشتہ شب مارکوف نے وہی راستہ کیوں نہیں اپنایا اور اس نے شہر سے گزرنے کا خطرہ کیوں مول لیا؟ میرے پاس اپنے ذہن میں چبھنے والے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر مارکوف اور اس کے ساتھی مسلح ہوتے تو شاید میں ان کی طرف سے اتنا فکرمند نہ ہوتا۔ اب میں اس پر بھی پچھتا رہا تھا کہ شہر میں موجود دستوں کو کیوں چوکنا کر دیا! یہ بات مارکوف کے لیے مزید خطرناک ہو سکتی تھی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا! جو ہونا تھا' وہ ہو چکا تھا' مارکوف اور اس کے ساتھی نہتے بھی تھے اور ان کے پاس گھوڑے بھی نہیں تھے۔ مسلح گھڑسوار سپاہی ان کے پیچھے لگ گئے ہوں گے تو ان کا بچنا محال ہے۔ میں نے سوچا اور فکرمند ہو گیا۔ اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ میں نے مارکوف کی رہائی

کے بارے میں جو تدبیر کی تھی اس میں جلد بازی کے سبب بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں۔ اگر میں پہلے ہی اس تدبیر پر خوب غور و خوض کر لیتا یا مجھے سوچنے کا مزید وقت مل جاتا تو شاید مارکوف اور اس کے ساتھیوں کی زندگی خطرے سے دوچار نہ ہوتی۔ میں ان تمام باتوں پر غور کرتا رہا اور میرا گھوڑا تیز رفتاری سے پہاڑوں کی طرف بڑھتا رہا۔

مجھے یقین تھا کہ اگر میں پہاڑوں کے درمیان پہنچ کر کسی طرح محافظوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا تو مارکوف کا ٹھکانا تلاش کر ہی لوں گا۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ علم بھی تھا کہ میں مارکوف سے پہلے اس کے ٹھکانے تک پہنچ جاؤں گا کیونکہ میں گھوڑے پر سوار تھا اور مارکوف کو وہاں تک پیدل پہنچنا تھا۔ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے، مارکوف کی طرف سے میرا مایوس ہو جانا فطری تھا۔ یہی سبب تھا کہ مجھ میں پہلے جیسا جوش باقی نہیں رہا تھا۔

پھر وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جب میرا گھوڑا پہاڑوں کے درمیان داخل ہوا سناٹے میں دور دور تک گھوڑوں کی ٹاپیں گونج رہی تھیں۔ مجھے اسی پہاڑی سلسلے کی بھول بھلیوں سے فائدہ اٹھا کر محافظوں سے الگ ہونا تھا۔ ممکن تھا کچھ دیر تک تو مجھے تلاش کرتے، پھر مایوس ہو کر لوٹ جاتے، اور میں یہی چاہتا بھی تھا۔ اگر ایسا مقصود نہ ہوتا تو میں انہیں اپنے ساتھ کیوں لاتا! بعد میں کوئی بھی بہانہ گھڑا جا سکتا تھا، ایسا جھوٹ جو قابل یقین معلوم ہو! میں نے یہ تمام احتیاط اس لیے برتی تھی کہ میرے لیے واپسی کے راستے ہر وقت کھلے رہیں۔ اگر میں دوبارہ منگولوں کے درمیان رہ کر ان سے انتقام لینے کا فیصلہ کروں تو کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ مجھے منگول ہی اچھا لگتے اور مجھ پر پورا اعتماد کیا جائے۔ محافظ مایوس ہونے کے بعد یہی کہانی سناتے کہ میں مارکوف کی تلاش میں نکلا تھا اور پہاڑوں کے درمیان ان سے بچھڑ گیا۔

میں قدم اٹھا چکا تھا اور اب واپسی کا سوال نہیں تھا۔ صرف یہ سوچ کر کہ مارکوف شاید منگولوں سے بچ

دنیا بھر کی خوفناک، دہشتناک اور پراسرار کہانیاں

ایسی کہانیاں جن کو پڑھ کر آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ آپ کو یوں محسوس ہو گا کہ آپ کے کمرے کے باہر کوئی دبے پاؤں چل رہا ہے۔ اگر آپ گھر میں اکیلے ہیں تو یقیناً خوف سے چلانا شروع کر دیں گے۔ یا ہو سکتا ہے کہ آپ کی گھگی بندھ جائے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس سے قبل آپ نے یقیناً ایسی کتابیں نہیں پڑھی ہوں گی۔

خوفناک کہانیاں	40/-
پراسرار کہانیاں	40/-
ہیبت ناک کہانیاں	40/-
سنسنی خیز کہانیاں	40/-
آسیبی کہانیاں	40/-
ڈراؤنی کہانیاں	40/-
دہشتناک کہانیاں	40/-
دیومالائی کہانیاں	40/-
بھوت کہانیاں	40/-
وحشت ناک کہانیاں	40/-
آدم خوروں کی کہانیاں	40/-
خون آشام لڑکیاں	40/-

-:- منگوانے کا پتہ -:-

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

کر نہ نکلنے پائے۔ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے نہیں رک سکتا تھا۔ بعد میں جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا' میں نے سوچا۔ پہلے محافظوں سے تو گلوخلاصی ہو۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے گھوڑے کا رخ ایک ایسے پہاڑی درے کی طرف کر دیا جس سے پہلے بھی گزر چکا تھا۔ وہ درہ تنگ تھا۔ اس میں بیک وقت صرف دو گھوڑے برابر چل سکتے تھے۔ درے کے بعد دائیں اور بائیں جانب غاروں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن کے درمیان چھوٹی بڑی چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان چٹانوں اور غاروں کے درمیان اونچے نیچے چھوٹے چھوٹے راستوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ میں درے سے نکل کر اسی طرف جانا چاہتا تھا تاکہ با آسانی محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکوں۔

درہ عبور کر کے میں نے بائیں جانب کے غاروں کا رخ کیا۔ میں جب بجو کا اور دوسرے منگول سرداروں کے ساتھ مارکوف کی تلاش میں آیا تھا تو اس طرف سے بھی گزرا تھا۔

میرا گھوڑا چٹانوں اور غاروں کے درمیان ایک ناہموار سے راستے پر چل رہا تھا کہ اچانک میں نے ایک غار کے دہانے سے شعلہ سا لپکتا دیکھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ محافظوں کے گھوڑے بھی میرے پیچھے رک گئے۔ میں نے اس لمحے اپنے دل میں ایک عجیب سا خوف محسوس کیا۔ میری نگاہ اسی طرف جمی ہوئی تھی جہاں شعلہ لپکا تھا۔ وہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ بمشکل اتنی دور تھا کہ میرا گھوڑا ایک ہی جست میں وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ معاً ایک دھماکا ہوا اور یوں لگا جیسے دن نکل آیا ہو۔ ہر طرف تیز روشنی پھیل گئی' اتنی تیز کہ میں نے آنکھیں میچ لیں۔ اسی کے ساتھ بیک وقت کئی چیخیں بلند ہوئیں اور انہی چیخوں کے درمیان ایک بھیانک قہقہہ سنائی دیا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں کھول دیں اور اسی لمحے محافظ خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھے۔

"ٹھہرو!" میں گھبرا کر چیخ اٹھا مگر محافظ بھلا کب رکنے والے تھے۔

"منحوس کیلتیں ہمارے جسموں میں گھس جائیں گی' ہم نہیں رکیں گے۔" ایک محافظ نے بھاگتے بھاگتے با آواز بلند جواب دیا۔

محافظ نے جو کچھ کہا تھا وہی خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا کہاں میں محافظوں کو جل دے کر نکلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور کہاں اب انہیں رکنے کے لیے کہہ رہا تھا تاکہ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر نہ چلے جائیں۔

میں جہاں پھنسا ہوا تھا' وہاں سے اپنے گھوڑے کو موڑ کر واپس نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا گھوڑا اگر الٹے قدموں واپس ہوتا تو اس تنگ راستے سے نکلنا ممکن تھا لیکن میرے اوسان بحال ہی کب تھے جو ایسا کر سکتا۔ محافظوں کے گھوڑے میرے پیچھے تھے اور اس تنگ راستے میں داخل نہیں ہو سکے تھے اس لیے وہ فرار ہو گئے تھے۔

بچپن سے جوانی تک میں نے منحوس کیلتوں (روحوں) کے جو قصے سنے تھے وہ میرے ذہن میں تازہ ہو رہے تھے اور میرا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ گھوڑے کی پشت سے کود کر بھاگ جاؤں۔

ابھی مجھے بھاگتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں کہ معاً میں گھوڑے کی پشت پر اچھل پڑا۔ روشنی کا وہ گولا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر گر پڑا تھا جسے میں سورج سمجھ رہا تھا۔ اس کے زمین پر گرتے ہی ہر طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ میں خوفزدہ ہو کر چیخ پڑا۔ ابھی میری چیخ معدوم ہی ہوئی تھی کہ پھر بھیانک قہقہہ گونج اٹھا جو ایک بار پہلے بھی چیخوں کے درمیان سنائی دیا تھا۔ وہ بھیانک قہقہہ کسی مرد کا ہی تھا لیکن میرے لیے قطعی اجنبی منحوس کیلتوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے سوچا اور میری گھگھی بندھ گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

مارکوف کا حملہ ناکام ہوا اور اسے گرفتار کرلیا گیا لیکن قلعے میں مارکوف کو پہچاننے والا میرے سوا صرف ایک بوڑھا تھا سیوری نے بوڑھے توبی کو زہر میں بجھے خنجر کے وار سے ہلاک کردیا اور خود بھی ماری گئی۔ میں نے مارکوف کو قیدیوں کے درمیان دیکھ کر پہچاننے سے انکار کردیا۔ اور ایک رات میں نے اسے اس کے ساتھیوں سمیت قید خانے سے فرار کرادیا اور پہرے داروں کو گمراہ کرنے کے لیے سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر پہاڑوں کی طرف چلا گیا ایک جگہ اچانک ایک غار کے دھانے سے ایک شعلہ سا لپکا اور دھماکے سے تیز روشنی پھیل گئی میرے ساتھ آنے والے سپاہی چیختے ہوئے بھاگ گئے اسی وقت ایک بھیانک قہقہہ فضا میں گونجا مجھے منحوس کیلتوں کا خیال آیا اور میری گھگھی بندھ گئی۔

× × × ×

تاریکی کے درمیان معاً" پھر ایک شعلہ سا چمکا مگر یہ شعلہ قطعی مختلف تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے شعلے کو کسی شے میں قید کردیا گیا ہو۔ پھر جب وہ شعلہ تاریکی میں پھڑپھڑاتا ہوا میرے جسم پر پڑا تو میں دوبارہ چیخ پڑا۔ روشنی کا ایک دائرہ سا میرے بدن پر حرکت کررہا تھا اور پھر وہ دائرہ میرے سینے پر حرکت کرتا ہوا ایک دم چہرے تک پہنچ گیا۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں نے گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔

"بوغا!" اچانک میری سماعت سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی اور مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کیونکہ وہ نسوانی آواز میں ہزاروں آوازوں میں الگ پہچان سکتا تھا۔

وہ آواز سولدہ کی تھی۔

چند لمحے تو مجھے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا اور میں اس حالت میں تھا اسی حالت میں رہا مگر جب اس نے مجھے دوبارہ پکارا تو یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ سولدہ ہی ہے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔ روشنی کا دائرہ اب میرے چہرے پر نہیں تھا بلکہ گھوڑے کے قدم پر پڑ رہا تھا۔

چند قدم کے فاصلے پر میں نے ایک شعلے کو حرکت کرتے دیکھا جو میری ہی طرف آرہا تھا۔ اسی شعلے کی روشنی میرے گھوڑے پر پڑ رہی تھی۔ شعلے کے پیچھے مجھے ایک ہیولا حرکت کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

"ڈرمت اور گھوڑے سے اتر آبوغا!" سولدہ کی آواز پھر میری سماعت سے ٹکرائی۔

اب میرے حواس رفتہ رفتہ اعتدال پر آنے لگے تھے۔ وہاں سولدہ کی موجودگی نے میرے دل سے تمام خوف نکال دیا تھا۔ اس کی موجودگی میں کوئی منحوس کیلت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی کیونکہ سولدہ خود بڑی پراسرار قوتوں کی مالک تھی جن کا مجھے خود تجربہ ہوچکا تھا۔

جب میں گھوڑے سے اتر رہا تھا تو سولدہ میرے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے مجھے گھوڑے سے اترنے میں مدد دی۔

"میں تو سوچ رہی تھی کہ تجھے تلاش کرنے میں مجھے کافی وقت لگے گا مگر یہ اچھا ہوا کہ تو خود ہی مجھ سے آ ٹکرایا۔" سولدہ نے کہا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

سولدہ کے جسمانی لمس نے میرے جسم میں بجلیاں سی دوڑادیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد یہ موقع نصیب ہوا تھا۔ میری حالت ایسی تھی کہ بہت کچھ بولنے کی خواہش کے باوجود کچھ نہیں بول پا رہا تھا۔

"اپنے گھوڑے کی لگام تھام لے اور میرے ساتھ چل!" سولدہ نے مجھے پھر مخاطب کیا۔

"کہاں؟" میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلا۔

"اس غار میں جہاں میں کل سے رہ رہی ہوں۔" سولدہ نے جواب دیا۔

اس وقت میں نے سولدہ سے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ میں اپنے گھوڑے کی لگام تھامے اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اب بھی کوئی لمبی سی چیز موجود تھی جس سے روشنی نکل کر سامنے راستے پر پڑ رہی تھی۔ میرے لیے یہ بڑی عجیب اور پراسرار بات تھی کہ وہ روشنی محدود تھی۔ شاید سولدہ نے اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے اس روشنی کی حدود مقرر کردی

تھی۔

سولدہ مجھے اپنے ہمراہ جس غار میں لے گئی' وہ مجھے بالکل اس غار کی طرح لگا جیسا بورخان قالدون پر تھا اور جہاں سولدہ مجھے پہلی مرتبہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

میں نے اپنا گھوڑا غار کے باہر ایک بڑے سے پتھر سے باندھ دیا تھا اور خود سولدہ کے ساتھ غار میں چلا گیا تھا جس میں مدھم مدھم سی روشنی تھی۔ غار میں وہی متحرک مشعل روشن تھی جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

ایک جانب غار کے فرش پر گدا بچھا ہوا تھا' ویسا ہی گدا جس پر بیٹھ کر میں اچھل سکتا تھا۔

غار میں داخل ہوتے ہی وہ شعلہ بجھ گیا تھا جو لمبی سی کسی شے میں سولدہ نے قید کیا ہوا تھا۔ غار کے اندر میں نے اور بھی بہت سا سامان دیکھا جو میرے لیے بالکل نیا تھا۔ غار کا اندرونی حصہ نیم تاریک تھا اور وہاں بھی کچھ سامان پڑا تھا۔

سولدہ گدے پر بیٹھ گئی اور مجھے بھی ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا' پھر بولی۔ "دیکھ میں نے اپنا وعدہ وفا کیا۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ مغربی دشت میں پہنچ کر تجھ سے ضرور ملوں گی اور دیکھ لے کہ تو میرے سامنے ہے۔"

"مگر تو ہمیشہ مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔" میرا لہجہ شکایتی تھا۔

"خیر یہ بتا کہ تو ادھر رات کے وقت کیوں آیا تھا؟" اس نے میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جسے میں کوئی معنی نہ پہنا سکا۔

جواب میں' میں نے اسے مختصراً" تمام حالات بتا دیے اور یہ بھی کہ اس وقت میرا کیا ارادہ تھا! آخر میں' میں نے اس سے سوال کیا۔ "اب تو بتا کہ میں نے صحیح کیا۔ کیا تھا یا غلط؟"

"تو شاید یہ بھول گیا کہ میں نے تجھ سے کیا کہا تھا۔" سولدہ بولی۔

"تو منگولوں کے درمیان ہی رہ کر بہتر طور پر اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا۔"

"لیکن موجودہ حالات میں میرا وہاں رہنا بے سود تھا۔" میں نے کہا۔

"حالات ہمیشہ ہی تو ایک سے نہیں رہتے۔" سولدہ بولی۔ "ویسے تیرے دل کو جس طرح قرار آ سکے تیرے انتقام کی آگ جس طرح بہتر طور پر سرد ہو سکے ہی بہتر جان سکتا ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تیری زندگی خطرے میں نہ پڑے۔"

سولدہ نے جس طرح اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا اس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے کہا "اگر تو مجھے خطروں سے نہ بچاتی اور مجھے عقل نہ دیتی شاید اس وقت میں زندہ نہ ہوتا۔"

میری بات سن کر وہ زور سے ہنس پڑی' پھر بولی۔ "بہت بھولا ہے اور تیرے اسی بھولپن کو میں پسند کرتی ہوں۔ میں مختلف زمانوں میں مختلف نوجوانوں سے ملتی رہی ہوں مگر مجھے اعتراف ہے کہ تو ان سب سے مختلف ہے!"

"کیا میری ہی طرح تو اوروں کو بھی چاہتی ہے؟" میں نے بے ساختہ سوال کیا کیونکہ اس کی بات سن کر میں نے اپنے دل میں رقابت محسوس کی تھی۔

"میں نے تجھ سے یہ کب کہا ہے کہ میں تجھے چاہتی ہوں!" وہ مسکرا کر بولی۔

"تو کیا واقعی مجھے نہیں چاہتی؟" میرے دل پر چوٹ سی پڑی۔

"یہ میں تجھے کیوں بتاؤں!" وہ بدستور مسکرا رہی۔

میرے دل میں رقابت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ مجھے اس وقت وہ مردانہ قہقہہ یاد آ گیا جو میں کسی منحوس کیلت کا قہقہہ سمجھا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ سولدہ اس بار تنہا نہیں آئی۔ اس کے ساتھ کوئی مرد بھی ہے جسے اس نے کہیں چھپا دیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اس سے پوچھا۔ "تو اس بار اپنے ساتھ کسی اور کو بھی لائی ہے؟"

"کسی اور کو!" سولدہ نے حیرت سے کہا' پھر خود ہی بولی۔

"نہیں تو! تجھے یہ خیال کیوں آیا؟"

"اس لیے کہ میں نے خود اپنے کانوں سے اس کی آواز سنی تھی۔ وہ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔" میں نے کہہ دیا۔

"تو اسے بلاؤں؟" سولدہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔

"نہیں' مجھے اس سے نہیں ملنا!" میرے لہجے میں سختی سی آگئی۔ اس وقت میرے ذہن سے شاید یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ وہ سولدہ (روح) ہے اور میں ایک معمولی انسان! اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اس سے سخت لہجے میں گفتگو کا تصور بھی نہ کر پاتا۔ میں اس وقت سولدہ سے بالکل اس طرح بات کر رہا تھا جیسے وہ دشت ہی کی کوئی لڑکی ہو۔ مجھے اب سولدہ پر غصہ آرہا تھا۔

"تیرے چہرے سے پتا چل رہا ہے کہ تو شاید میری کسی بات پر ناراض ہو گیا ہے۔" سولدہ بدستور خوشگوار لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"نہیں!" میں نے جبڑے بھینچ کر جواب دیا۔

"مجھے کیا حق ہے کہ میں تجھ پر خفا ہو سکوں۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔ "مگر میں تجھے اس سے ضرور ملواؤں گی جس کی آواز تو نے سنی تھی۔"

"اگر وہ یہاں آیا تو میں چلا جاؤں گا۔" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کیوں تم کیا تو اس سے ڈرتا ہے؟"

سولدہ کی بات پر میں مزید چڑ گیا اور بے خوفی سے بولا۔ "نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تو ایسا سمجھتی ہے تو بلا لے اسے!"

"اگر ایسا ہی ہے جیسا تو کہہ رہا ہے تو پھر اس کی آواز سن کر ڈر کیوں گیا تھا؟"

"میں اسے کوئی منحوس کیلت سمجھا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ تیرے ساتھ آیا ہے۔" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"اچھا اب تو نے بہت خون جلا لیا' اب اس ذکر کو چھوڑ اور یہ بتا کہ تجھے وہ دن یاد ہے جب تو شیر کی دہاڑ سن کر ڈر گیا تھا؟" سولدہ نرمی سے بولی۔

"وہی شیر جسے تو نے ایک ایسے ہی ڈبے میں بند کر لیا تھا جیسا سامنے رکھا ہوا ہے۔" میں نے دائیں جانب رکھے ہوئے ایک عجیب سے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں وہی!" سولدہ یہ کہہ کر مسکرائی۔ "میں نے اس شیر کی طرح قہقہہ لگانے والے کو بھی اس ڈبے میں بند کر رکھا ہے اور اس کے ساتھ دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی جن کی چیخیں تم نے سنی ہوں گی۔"

"اتنے سے ڈبے میں اتنے سارے لوگ بند نہیں کیے جا سکتے۔" میں نے بے یقینی کے عالم میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر وہ شیر اس ڈبے میں کیسے بند ہو گیا تھا؟" سولدہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

میں چکرا گیا اور بولا "مجھے کیا معلوم! تو نے شیر پر جادو کر دیا ہو گا۔"

"میں شیر پر جادو کر کے اسے ڈبے میں بند کر سکتی ہوں تو کیا اس میں آدمیوں کو بند نہیں کر سکتی؟"

"تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں' بالکل نہیں آتیں۔" میں جھنجلا سا گیا۔

"اچھا تو پھر سنبھل کر بیٹھ جا' اب مت ڈرنا!" یہ کہہ کر وہ ڈبے کی طرف کھسکی۔

میں کچھ نہ جاننے کے باوجود واقعی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سولدہ یقیناً" کوئی جادو دکھانے والی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ ڈبے کی طرف بڑھتے دیکھا' اور پھر اس نے ڈبے کا کوئی حصہ دبایا جس سے عجیب سی آوازیں نکلنی لگیں۔ یہ آوازیں کچھ دیر سنائی دیتی رہیں' پھر اس نے ڈبے کے اس حصے سے انگلی اٹھالی اور دوسری جگہ دباؤ ڈالا۔ میں حالانکہ پہلے ہی سے کسی غیر متوقع بات کے لیے تیار تھا مگر اس کے باوجود اچھل پڑا۔

اچانک ہی غار میں بھیانک چیخیں گونجنے لگی تھیں اور انہی چیخوں کے درمیان ایک مردانہ قہقہہ سنائی

دینے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی سولدہ کا ہاتھ پھر اس ڈبے کی جانب بڑھا اور اسی کے ساتھ وہ چیخیں اور قہقہے نہ جانے کہاں غائب ہو گئے' پھر وہ میری جانب پلٹی۔ "اب تجھے میری بات پر یقین آیا؟"

"مگر..... مگر تو نے انہیں کس طرح اس ڈبے میں بند کر لیا؟" میں ہکلانے لگا۔

"میں تجھے بھی اس میں بند کر سکتی ہوں۔" سولدہ نے اس طرح کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ "بول بند ہو گا؟"

"مم..... مجھے..... مجھے! نہیں' بالکل نہیں!" میں گھبرا گیا۔

"کیوں' ڈر گیا نا!" وہ یہ کہہ کر ہنس پڑی' پھر ہنسانے لگی۔ "اس میں صرف آوازیں قید کی جاتی ہیں' جانور یا آدمی نہیں!"

"آوازیں قید کی جاتی ہیں!" مجھے سولدہ کی بات پر اور بھی حیرت ہوئی۔

"ہاں صرف آوازیں!" اس نے جواب دیا۔ "شاید میں نے اس کے بارے میں پہلے بھی تجھے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا تھا۔ تو شاید بھول گیا!"

پھر مجھے سولدہ کے یاد دلانے پر سب کچھ یاد آ گیا۔ میں زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ "ارے تو تو اس میں ایک دفعہ میری آواز قید بھی کر چکی ہے۔"

مجھے گزشتہ تمام باتیں یاد آنے پر عجیب سی خوشی ہو رہی تھی۔ سولدہ بھی میرے ساتھ ہنسنے لگی تھی۔ رقابتوں کا غبار چھٹ چکا تھا اور اب مجھے سولدہ بہت اچھی لگنے لگی تھی۔

"مرد کسی بھی زمانے کا ہو عورت کے معاملے میں بڑا شکی اور حاسد ہوتا ہے اور تو بھی مرد ہے بوغا!" سولدہ نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"مگر..... مگر تو..... تو میری عورت میری عورت۔" میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا اور شدت جذبات سے میری گویائی سلب ہو گئی۔

"ہاں کہہ نا! کیا کہنا چاہتا ہے؟" سولدہ نے مجھے ترغیب دی۔

"میں جو سوچتا ہوں شاید شاید وہ کبھی بھی پورا نہ ہو سکے۔"

"وہی تو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ تو کیا سوچتا ہے؟"

"تو تو سب جانتی ہے' سب!"

"مگر میں تیری زبان سے سننا چاہتی ہوں۔" وہ میرے مزید قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دی تھیں اور میں ان آنکھوں کی گہرائی میں اپنے وجود کو ڈوبتا محسوس کر رہا تھا۔

"میں تجھے..... تجھے سولدہ..... اپنی عورت اپنی عورت بنانا چاہتا ہوں۔" میں نے نہ جانے کس طرح وہ بات کہہ دی جو میرے دل میں تھی۔

"تو تجھے روکا کس نے ہے بوغا؟" اس کی آواز مجھے کہیں بہت دور سے آتی سنائی دی۔

اور پھر مجھے نہیں معلوم کہ نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ میں نے اسے گھسیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"سولدہ..... میری سولدہ!" میرے ہونٹ کانپنے لگے۔

پھر میں نے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر نمی سی محسوس کی' اس کے لمس کی نمی! اس کے بعد یا تو مجھے کچھ ہوش نہیں رہا یا پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا! ہاں میں نے کچھ دیر بعد اپنے وجود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔

جب دوبارہ میرے حواس بحال ہوئے تھے تو میں نے اسے اپنے قریب ہی دراز پایا تھا۔ وہ میرے زانو پر سر رکھے ہوئے لیٹی تھی۔

"سولدہ! کیا تو پھر مجھے تنہا چھوڑ جائے گی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"بوغا! تنہائی تیرا مقدر بھی ہے اور میرا بھی!" اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا تھا۔

"مگر کیوں' آخر کیوں؟ ہم ایک نہیں ہو سکتے؟"

"کیا تو میرے دشمنوں کو بھول گیا؟"

"لیکن وہ تیرے دشمن کیوں ہو گئے ہیں؟ اور کون

لوگ ہیں وہ!"

"یہ بتانے کے لیے مجھے اپنے بارے میں تجھے سب کچھ بتانا پڑے گا اور۔۔۔"

"تو پھر بتا دے نا!" میں نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔

"میں تجھے سب کچھ بتا دوں مگر نہیں بتانا چاہتی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ تو ان باتوں کو نہیں سمجھ پائے گا۔" اس نے پھر طویل سانس لیا۔

"تو بتا تو سہی! میں تیری باتیں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے ضد کی۔

وہ بغیر کوئی جواب دیے اٹھ کر بیٹھ گئی اور مجھے عجیب سی نظر سے دیکھنے لگی۔ چند لمحے بعد اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ "بوغا! میں جو بھی ہوں، اسے سمجھانے کے لیے، اور اس طرح سمجھانے کے لیے کہ تو بھی سمجھ سکے، بڑی فرصت کی ضرورت ہے۔ فی الحال شاید مجھے اتنی مہلت نہ مل سکے۔ کچھ خبر نہیں کہ کس لمحے میرے دشمن مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں آ پہنچیں اور مجھے فوراً یہاں سے فرار ہونا پڑے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کبھی تیری زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے جس کا امکان ہے اس لیے ان ساری باتوں کو اس وقت تک کے لیے اٹھا رکھ جب میں اپنے دشمنوں پر قابو پا لوں۔"

"لیکن وہ وقت کب آئے گا؟" میں نے سوال کیا۔

"بہت جلد!" اس نے جواب دیا۔ "اب زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ حالات اب میرے حق میں پلٹا کھا رہے ہیں۔"

"اگر تو یہ کہتی ہے تو میں تجھے زیادہ مجبور نہیں کروں گا مگر یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اس کے بعد۔۔۔ اس کے بعد تو۔۔۔ تو میری ہو جائے گی؟"

"میں اب بھی تیری ہوں اور اس وقت بھی تیری رہوں گی لیکن میرے تیرے درمیان وقت کی دیوار حائل ہے اور۔" سولدہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"وقت کی دیوار؟" میں نے کہا۔ "میں تیری بات نہیں سمجھا!"

"اور تو سمجھ بھی نہیں سکے گا اس لیے فی الحال اپنا دماغ ان باتوں میں نہ الجھا! جب میں تجھے اپنے بارے میں بتا دوں گی تو پھر شاید بات بات پر سوال نہیں کرے گا۔" سولدہ بہت دیر بعد مسکرائی، یوں جیسے صحرا میں پھول کھل اٹھے ہوں۔

"تیری باتیں سمجھنا واقعی میرے لیے مشکل ہے۔" میں نے اعتراف کیا، پھر پوچھا۔ "یہ بتا کہ اب کچھ دن تو میرے ساتھ رہے گی؟"

"پھر وہی سوال!" سولدہ بولی "مجھے کچھ خبر نہیں کہ کب تک یہاں رہ سکوں گی۔ ممکن ہے کئی راتیں یہاں رہ سکوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ صبح ہونے سے پہلے ہی مجھے فرار ہونا پڑے۔"

"تو کل یہاں آئی تھی، جیسا کہ تو نے بتایا تھا۔ کل سے اب تک تیرے دشمن یہاں نہیں پہنچ سکے۔ کیا خبر وہ اس بار تجھے ڈھونڈ ہی نہ پائیں!"

"یہ ناممکن ہے!" وہ ہنس کر بولی۔ "انہیں دیر ضرور ہو سکتی ہے لیکن وہ یہاں تک پہنچ ضرور جائیں گے۔"

"تو انہیں ڈرا کر بھگا نہیں سکتی؟ جس طرح میرے ہمراہ جو سپاہی تھے، وہ بھاگ کھڑے ہوئے؟" میں نے اس سے کہا۔

وہ میری بات سن کر زور سے ہنس پڑی اور کافی دیر تک ہنستی رہی۔ میں اسے حیرت سے دیکھتا رہا کہ میں نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے جو وہ یوں ہنسے جا رہی ہے!

"تو ہنسے کیوں جا رہی ہے؟ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی؟"

کچھ دیر بعد اس نے اپنی ہنسی پر قابو پا کر کہا۔ "تو نے بات ہی ایسی کہی تھی کہ میں اپنی ہنسی نہ روک سکی اور اس میں تیرا کوئی قصور نہیں کیونکہ تو نہ میرے بارے میں کچھ جانتا ہے نہ میرے دشمنوں کے بارے میں!"

پھر وہ سنجیدہ نظر آنے لگی اور چند لمحے توقف کے بعد بولی۔ "میرے دشمن بھی میری طرح پراسرار قوتوں کے مالک ہیں، سمجھا! انہیں ان چٹکلوں سے نہیں ڈرایا جا سکتا!"

"لیکن تو نے ہی مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ تجھے کوئی پراسرار قوت حاصل ہے۔ اور اب تو بالکل الٹ بات کر رہی ہے۔" میں نے اعتراض کیا۔

"پراسرار قوتوں کی بات میں نے اس لیے کی ہے کہ تو آسانی سے صورت حال کو سمجھ جائے۔" سولدہ نے وضاحت کی۔

"اچھا تو جان!" میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا' پھر پوچھا۔ "وہ سورج تو نے ہی! بنایا تھا جو میرے پاس آکر گرا تھا اور اس سے دن کی طرح اجالا پھیل گیا تھا؟"

"سورج!" یہ کہہ کر وہ پھر ہنس پڑی' پھر بولی۔ "وہ سورج نہیں روشنی کا گولا تھا۔"

"وہ روشنی کا گولا تو نے شاید اسی لیے چھوڑا ہو گا کہ جو لوگ اس غار کی طرف آ رہے ہیں' ڈر کر بھاگ جائیں!"

"ہاں!" سولدہ نے کہا۔ اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ تو نہ بھاگ سکا۔"

"میں بھی نہ رکتا' اگر بھاگنے کا راستہ ہوتا!" میں نے اعتراف کیا۔

"میں غار میں تھی کہ مجھے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں جو قریب آتی جا رہی تھیں۔" سولدہ مجھے حقیقت سے آگاہ کرنے لگی۔

"میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس غار تک پہنچ جائے۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان میں تو بھی ہو گا۔ میں نے انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے پہلے روشنی کا گولا چھوڑا' پھر اس ڈبے میں محفوظ آوازیں سنائیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے بعد کوئی شخص وہاں نہ رک پائے گا مگر پھر بھی میں اپنا اطمینان کرنے کی غرض سے باہر گئی۔ یہ عین ممکن تھا کہ ادھر آنے والوں میں سے کوئی اس قدر خوفزدہ ہو جاتا کہ بیہوش ہو کر وہیں گر پڑتا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ ادھر ادھر بھٹکتا ہوا اس غار تک پہنچ سکتا تھا جو میں نہیں چاہتی تھی۔ باہر جا کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا تو مجھے تو مل گیا۔" یہ کہہ کر سولدہ چپ ہو گئی۔

میں تمام باتیں سمجھ گیا۔ کچھ دیر غار میں خاموشی رہی۔ میں یک ٹک سولدہ کو دیکھے جا رہا تھا جیسے اس کا چہرہ اپنے صفحہ ذہن پر محفوظ کر لینا چاہتا ہوں۔ کیا خبر وہ کب بچھڑ جائے' اور پھر کب ملے!

"یوں مجھے کیا دیکھے جا رہا ہے؟" آخر سولدہ بول اٹھی۔

جو کچھ میرے دل میں تھا' میں نے کہہ دیا' پھر بغیر رکے بولا۔

"اب یہ بتا کہ مجھے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے؟ میں تجھے تمام حالات بتا چکا ہوں۔ مجھے مشورہ دے کہ میں کیا کروں؟ میں مارکوف کے ساتھ رہوں یا قلعے کی طرف لوٹ جاؤں؟ لیکن اس وقت تک میں کہیں نہیں جاؤں گا جب تک تو یہاں موجود ہے۔"

"میں تجھے بتا چکی ہوں بوغا کہ میری یہاں موجودگی غیر یقینی ہے اس لیے میں نہیں چاہتی کہ تو یہاں رکے لیکن یہ طے ہے کہ میں تیری طرف سے طویل عرصے کے لیے غافل نہیں رہوں گی۔ میں یہاں آتی جاتی رہوں گی۔" سولدہ سمجھانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ "مجھے تیرے جذبات کا بخوبی اندازہ ہے مگر تجھے میرے حالات کا اندازہ نہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں' وہ تیرے اور میرے دونوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔"

سولدہ کی بات پر میرا دل بجھ سا گیا جس کا اندازہ شاید اسے بھی ہو گیا۔ وہ کچھ دیر مجھے مزید سمجھاتی رہی۔

"مگر تو نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا کہ مجھے کس طرف رخ کرنا چاہیے؟" میں نے کچھ دیر بعد پھر اپنا پہلا سوال دہرایا۔

"تیری جذباتی کیفیت دیکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ تو کچھ دن مارکوف کے ساتھ رہے مگر اس کے بعد تجھے بہرحال قلعے کی طرف ہی لوٹنا ہے۔" سولدہ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' میں تیرے مشورے ہی پر عمل کروں گا۔ میں نے مضبوط لہجے میں کہا "تیرے مشورے

اب تک میرے لیے مفید ثابت ہوتے رہے ہیں۔"

پھر کچھ دیر بعد سولدہ مجھے رخصت کر رہی تھی۔ وہ مجھے غاروں کے اس سلسلے سے باہر تک چھوڑنے آئی۔ میں نے اس راستے کو ذہن نشین کر لیا تاکہ اگر کبھی اس غار تک آنا پڑے تو با آسانی آسکوں۔

غاروں کے سلسلے سے نکل کر جب میں گھوڑے پر سوار ہوا تو میری نگاہ سولدہ کے ہیولے پر جمی ہوئی تھی کیونکہ اطراف میں تاریکی تھی۔

"اچھا اب جاؤ نا!" سولدہ نے رخصتی انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ "نیلا جادوانی آسمان تیری حفاظت کرے۔"

مجھے اس وقت یوں لگا جیسے سولدہ کی بجائے دشت میں رہنے والی کوئی لڑکی مجھے رخصت کر رہی ہو۔ میں نے سوچا، کاش سولدہ، سولدہ نہ ہوتی اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

میرے گھوڑے کا رخ اب اس سمت میں تھا جدھر مارکوف کا ٹھکانا ہونا چاہیے تھا مگر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں راستہ بھول چکا ہوں۔ کچھ دیر میں پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں چکراتا رہا، پھر سوچا کہ لوٹ جاؤں۔ رات بھر بے سبب بھٹکنے سے بہر حال یہ بہتر تھا۔ میں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔

میرا ارادہ یہ تھا کہ اب قلعے ہی کی طرف لوٹ جاؤں۔ مارکوف تک پہنچنے کے لیے کوئی اور موقع بھی مل سکتا تھا مگر میں اپنے ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ ہوا یہ کہ واپسی میں مجھے ایک ایسا مقام نظر آ گیا جہاں سے مارکوف کے ٹھکانے تک پہنچنے کا راستہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ میرا ارادہ دوبارہ بدل گیا اور ذہن میں یہ تجسس دوبارہ جاگ اٹھا کہ مارکوف اپنے ٹھکانے تک پہنچ سکا یا نہیں اور اس پر کیا گزری! میں نے اپنے گھوڑے کی باگیں موڑ دیں۔

سولدہ سے مشورہ کرنے کے بعد اب میرے اس ارادے میں زیادہ پختگی نہیں رہی تھی کہ میں مارکوف کے ساتھ رہوں۔ اس کے ساتھ رہ کر میں وقتی طور پر تو اپنے جذبات کے دہکتے ہوئے الاؤ کو کسی حد تک سرد کر سکتا تھا مگر اصل مقصد منگولوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنا اور انہیں تباہی سے ہمکنار کرنا تھا۔

سولدہ سے ملاقات ہونے کے سبب اب حالات نے نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ سولدہ سے رخصت ہونے کے بعد اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ میں اس سے بہت سی کام کی باتیں معلوم کر سکتا تھا جو آئندہ میرے کام آتیں مگر زیادہ تر وقت تو اس کے قرب کی خوشبو اور سرشاری میں گزر گیا تھا۔

میں انہی خیالات کے حصار میں گردش کرتا ہوا بڑھتا رہا، اور پھر اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں مارکوف کے مسلح محافظ پہرہ دیتے تھے۔

وہاں اس وقت کوئی محافظ نہیں تھا جس پر مجھے زیادہ تشویش نہیں ہوئی۔ مجھے علم تھا کہ اس کے زیادہ تر ساتھی گڑھوں ہی میں رہ گئے ہوں گے۔ کچھ مارے جا چکے تھے۔ مارکوف بہت کم ساتھیوں کے ساتھ قلعے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکا ہو گا اس صورت میں فوری طور پر وہاں پہرا بٹھایا جانا غالباً" ضروری نہ سمجھا گیا ہو گا۔

میں وہ درہ عبور کر کے میدان میں پہنچا، اور پھر بائیں جانب غاروں کے سلسلے کی طرف بڑھ گیا۔ ہر طرف تاریکی تھی اور گہرا سناٹا! سناٹے میں میرے گھوڑے کی ٹاپوں کی سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں غاروں کے قریب پہنچا۔ وہاں زندگی کے آثار مفقود تھے۔ میں گھوڑے سے اتر گیا۔ اب میرے ذہن میں اندیشے پیدا ہونے لگے تھے۔ غاروں کے درمیان روشنی کی معمولی سی رمق بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کیا مارکوف اور اس کے ساتھی مارے گئے؟ میں نے سوچا۔ کیا انہیں شہر میں موجود فوجی دستوں نے گرفتار کر لیا؟

میں نے گھوڑے کی لگام تھام لی تھی اور میرے قدم آگے کی طرف اٹھ رہے تھے، غیر ارادی طور پر اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔

معاً" میری پشت پر کوئی چیز چبھی اور اس کے ساتھ

ایک بھاری آواز سنائی دی۔ "اجنبی! تمہاری پشت پر تلوار کی نوک رکھی ہوئی ہے' رک جاؤ! میرے ہاتھ کی معمولی سی حرکت تمہاری زندگی کا چراغ گل کر سکتی ہے اس لیے میں جو کہہ رہا ہوں' اس پر عمل کرو!"

"کون ہو تم؟" میں نے رکتے ہی بے خوف لہجے میں پوچھا۔

"یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں اور تمہیں میرے سوال کا جواب دینا پڑے گا ورنہ....." جملہ ادھورا چھوڑ دیا گیا اور میری پشت پر تلوار کی نوک کا دباؤ بڑھ گیا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہاں موجود ہونے والا شخص' مارکوف کا کوئی ساتھی ہی ہو سکتا تھا جو اندھیرا ہونے کے سبب مجھے نہ پہچان سکا تھا۔ وہ محافظوں ہی میں سے کوئی ہو سکتا تھا لیکن اس کے باوجود اس شخص کا رویہ میرے لیے ناقابل فہم تھا۔

"میرا نام بطریق بوغا ہے۔" میں نے بے جھجک اسے اپنا نام بتا دیا' اور پھر بولا۔ "اب تم میری پشت سے تلوار کی نوک ہٹا لو اور یہ بتاؤ کہ مارکوف کہاں ہے؟"

جواب میں کچھ دیر خاموشی رہی' پھر وہی بھاری آواز سنائی دی۔ "کیا تم تنہا ہو؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "اور میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ غیر ضروری سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا تمہیں میرے ساتھ کوئی اور بھی نظر آ رہا ہے؟"

"ضروری تو نہیں کہ تم اپنے ساتھیوں کو یہاں تک لے کر آتے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ تم بطریق بوغا ہی ہوتے۔ اپنے ساتھیوں کو تم درے بھی چھوڑ کر یہاں آ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ کہ....."

"تم نے ابھی تک میری پشت سے تلوار کی نوک نہیں ہٹائی!" میرے لہجے میں سختی تھی۔

"ہاں!" بڑے مطمئن انداز میں کہا گیا۔ "جب تک مجھے یقین نہ آ جائے کہ تم وہی ہو جو ظاہر کر رہے ہو' میں تلوار کی نوک نہیں ہٹاؤں گا۔"

مجھے اب وہ غیر ضروری سوال جواب کھلنے لگے تھے اس لیے میں نے جھنجلا کر کہا۔ "تم اس سلسلے میں کیا ثبوت چاہتے ہو؟"

"میں تم سے صرف ایک سوال کروں گا۔ اگر تم نے اس کا صحیح جواب دے دیا تو میں تمہاری بات کا یقین کر لوں گا؟"

"سوال کرو!" میں درشت لہجے میں بولا۔

"منگولوں سے لڑائی کے دوران' مارکوف کے ماتھے پر تلوار کا ایک گہرا زخم لگا تھا جس کا نشان اب تک باقی ہے۔ بتاؤ کہ زخم کا وہ نشان ماتھے پر دائیں جانب ہے یا بائیں جانب؟" سوال کیا گیا۔

میں اس کے سوال پر زیر لب مسکرایا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' آدمی ذہین تھا۔ اس نے بڑی ذہانت سے سوال کیا تھا کیونکہ اس سوال کا جواب صرف وہی شخص دے سکتا تھا جس نے مارکوف کو قریب سے دیکھا ہو۔ میں نے چند لمحے توقف کے بعد پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "مارکوف کی پیشانی چوڑی' روشن اور صاف ہے۔ اس پر زخم کا کوئی نشان نہیں!"

میرا جملہ پورا ہوتے ہی پشت کی چبھن ختم ہو گئی۔ میری پشت سے تلوار کی نوک ہٹائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ اس شخص کی آواز سنائی دی تھی۔ "میں معافی چاہتا ہوں کہ تمہیں میں نے زحمت دی مگر مارکوف کا یہی حکم تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ میرے برابر آ کھڑا ہوا۔

خیر تمہارا جو فرض تھا تم نے پورا کیا' مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ مارکوف یہاں تم لوگوں کے ساتھ بہ خیریت پہنچ گیا؟"

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔ "مگر وہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ اسی لیے مجھے یہاں چھوڑ گیا تھا کہ اگر تم آ جاؤ تو میں تمہیں لے کر وہاں تک پہنچ سکوں جہاں وہ موجود ہے۔"

"کیا وہ کہیں تنہا گیا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں! وہ اپنے ہمراہ میرے سوا تمام ہی ساتھیوں کو لے گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ جگہ اب اس کے خیال میں زیادہ محفوظ نہیں رہی تھی۔ یہاں اب کوئی نہیں۔ وہ اب سے کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے روانہ ہوا ہے۔"

تو پھر مجھے اس کے پاس لے چلو!" میں نے مزید کوئی سوال کیے بغیر اس سے کہا۔

کچھ دیر بعد ہی میں 'مارکوف کے ساتھی کو ساتھ لیے پہاڑی سلسلے میں ایک جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ بھی میرے گھوڑے ہی کی پشت پر پیچھے بیٹھ گیا تھا کیونکہ اس کے پاس گھوڑا نہیں تھا۔

اگر میں نہ آتا تو پھر تمہیں پیدل ہی وہاں تک پہنچنا پڑتا جہاں مارکوف گیا ہے!" میں نے مارکوف کے ساتھی کو مخاطب کیا۔

"ہاں!" وہ بولا۔ "وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ مجھے زیادہ پریشانی نہ ہوتی۔ میں صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاتا۔"

تین چار چھوٹے چھوٹے میدانوں اور پہاڑی دروں کو عبور کرنے کے بعد منزل آ گئی۔ مارکوف کے ساتھی نے مجھے گھوڑا روکنے کا اشارہ کیا اور میں نے لگام کھینچ لیں۔

"یہاں بھی دور دور تک سناٹا ہی ہے۔" میں نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" اس نے جواب دیا اور دائیں جانب ہاتھ اٹھاتا ہوا بولا۔ "یہ ہمارا عارضی ٹھکانا ہے۔ راستہ دشوار گزار ہے۔ ہمیں کچھ دور پیدل چلنا پڑے گا' گھوڑے کی لگام تھام کر! کچھ دور اندر جا کر غاروں کا وہ سلسلہ ہے جہاں مارکوف ہو گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ پہلے بھی ان غاروں میں رہ چکے ہو؟" میں نے اپنے گھوڑے کی لگام تھامتے ہوئے کہا اور اس سمت بڑھنے لگا جدھر مارکوف کا ساتھی جا رہا تھا۔

"تمہارا خیال درست ہے۔" اس نے میری تائید میں کہا۔

"لیکن ایسا صرف ہنگامی حالات میں ہوتا ہے۔ جب منگول ہماری تلاش میں ان پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں اور ہم ان سے جنگ کرنا نہیں چاہتے۔ ایسے مواقع ہر چند کم آئے ہیں مگر آئے ضرور ہیں۔ ایسا صرف اسی وقت کیا گیا ہے جب منگول بہت بڑی طاقت کے ساتھ پہاڑوں میں گھس آئے ہوں۔"

"ہوں!" میں نے ہنکارا بھرا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

مارکوف واقعی ایک ذہین شخص تھا۔ مجھے اس کے بارے میں جتنی معلومات حاصل ہوتی جا رہی تھیں' میرے دل میں اس کی اتنی ہی قدر بڑھتی جا رہی تھی۔ وقت اور حالات کی چکی میں پس کر وہ کچھ سے کچھ بن گیا تھا ورنہ وہ یقیناً" اس قابل تھا کہ حکومت کرتا۔ وہ بہادر بھی تھا اور ذہین بھی! اور ایک حکمران میں یہی دو صفات لازمی ہیں' ذہانت اور بہادری! میں اسے راہ راست پر سمجھ رہا تھا۔ منگولوں کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ مارکوف کے باپ سے زبردستی حکومت چھین لیتے اور مارکوف کے ہم وطنوں کو غلام بنا لیتے۔

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا' مارکوف کے ساتھی کی رہنمائی میں بڑھتا رہا۔ چھوٹی بڑی چٹانوں کے درمیان وہ اونچا نیچا اور قطعی ناہموار راستہ واقعی۔ اس قابل نہیں تھا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر ادھر سے گزرا جا سکتا۔ مارکوف کے ساتھی نے غلط نہیں کہا تھا۔

کچھ دور چل کر اندھیرے میں دو ہیولے سے نظر آئے جو زیادہ فاصلے پر نہیں تھے' اور پھر اچانک ہی دونوں ہیولے دو قریبی چٹانوں کے پیچھے جا کر غائب ہو گئے۔

"منگول!" معاً" سناٹے میں ایک آواز گونجی اور میں چونک پڑا۔

"دشمن!" دوسری آواز گونجی' میرے قریب سے! مارکوف کے اس ساتھی نے یہ لفظ ادا کیا تھا جو میرے ساتھ چل رہا تھا۔

پہلی آواز چٹانوں کے پیچھے سے آئی تھی۔ مارکوف

کے ساتھی نے اسی آواز کا جواب دیا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ دونوں ہیولے پھر چٹانوں کی آڑ سے نکل آئے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے مارکوف کے ساتھی سے پوچھا۔

"دوست اور دشمن کو پہچاننے کا ذریعہ!" مارکوف کے ساتھی نے جواب دیا۔ "اگر میں ان کی بات کے جواب میں دشمن 'نہ کہتا تو وہ چٹانوں کی آڑ سے نہ نکلتے' اور پھر اندھیرے میں دو خنجر ہم دونوں کے سینوں میں پیوست ہو جاتے۔"

مارکوف کا ساتھی مجھے ساتھ لیے ان ہیولوں کے قریب پہنچ گیا۔

"تو لوٹ آیا آرق؟" ایک ہیولے نے مارکوف کے ساتھی کو مخاطب کیا تو میں پہلی بار اس کا نام جان سکا۔

"ہاں!" آرق نے جواب دیا۔ "اور میں اپنے ساتھ 'اپنے محسن کو بھی لایا ہوں۔ میرے ساتھ بطریق بوغا ہے۔"

آرق مجھے ساتھ لیے بائیں جانب مڑا۔ ادھر کچھ فاصلے پر مدھم مدھم سی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ جنہیں باہر میدان یا درے سے دیکھا جانا یقیناً "ممکن نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ پناہ گاہ ہر طرح محفوظ تھی۔ اگر میں آرق کی رہنمائی میں وہاں تک نہ پہنچتا تو اس ناہموار اور دشوار گزار راستے میں داخل ہونے کا تصور بھی نہ کرتا اور یوں اس پناہ گاہ تک نہ پہنچ سکتا۔

وہ غاروں کا ایک سلسلہ تھا جن کے درمیان بہت کم جگہ تھی۔ غار ایک دوسرے سے ملے ہوئے سے تھے۔ ان میں سے چند غاروں کے اندر روشنی تھی اور بقیہ تاریک پڑے تھے۔ میں نے ان غاروں کو گننا شروع کر دیا تھا۔

ساتواں غار بھی روشن تھا۔ آرق آگے آگے تھا اور میں اس کے پیچھے! وہ غار کے دہانے میں داخل ہوا۔ دہانے ہی پر دو نیزے بردار موجود تھے جنہوں نے آرق کو دیکھ کر اندر جانے کا راستہ دے دیا۔

سامنے ہی غار کے فرش پر کپڑا بچھا ہوا تھا۔ جس پر مارکوف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھایا 'اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ لپک کر میری جانب آیا اور اپنے دونوں بازو کھول دیے۔ مارکوف نے مجھے سینے سے لگا کر بھینچا' پھر الگ ہو کر بولا۔ "مجھے یقین تھا بوغا کہ تم آؤ گے۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا ورنہ اب تک سو گیا ہوتا۔ میں تمہاری ہی خاطر آرق کو وہاں چھوڑ آیا تھا۔"

مارکوف مجھ سے بات کرتا ہوا' میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بڑھا اور مجھے اپنے ساتھ اس موٹے سے کپڑے پر بٹھا لیا جو زمین پر بچھا ہوا تھا۔

"آرق! تو چاہے تو اب جا کر سو جا!" مارکوف نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

"بہتر ہے!" آرق نے ادب سے سر جھکایا اور الٹے پاؤں چلتا ہوا غار سے نکل گیا۔

غار میں اب میرے اور مارکوف کے علاوہ کوئی نہیں تھا دونوں نیزے بردار غار کے دہانے پر تھے جو وہاں سے اتنی دور تھا کہ وہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو شاید ہی سن سکتے۔

"مارکوف! تمہیں زندہ و سلامت دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہو رہی ہے۔" میں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا پھر بولا۔ "شہر میں یقیناً" تمہیں سخت مشکل کا سامنا ہوا ہو گا!"

"شہر میں!" مارکوف کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں شہر میں!" میں نے کہا۔ "میں بہت فکر مند تھا کیونکہ نادانستگی میں مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔"

"وہ کیا؟" مارکوف نے میری بات میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں نے شہر میں موجود فوجی دستوں کو تمہارے فرار کے متعلق بتا دیا تھا۔ دراصل اس وقت صورت حال ایسی ہی تھی۔ مجھے رات کے اس پہر میں قلعے سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی جواز پیش کرنا تھا۔ میں نے

انہیں بتایا تھا کہ تمہارے تعاقب میں جا رہا ہوں۔ اس وقت میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ پہاڑیوں میں اپنی جائے پناہ تک پہنچنے کے لیے تمہیں شہر ہی سے گزرنا پڑے گا۔" میں نے اپنی صفائی پیش کر دی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مارکوف کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، پھر اس نے کہا۔ "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میرا شہر سے گزرنا ضروری ہے؟"

"اس لیے کہ اگر قلعے سے پہاڑوں تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ بھی ہوتا تو تم اس رات وہی راستہ اختیار کرتے جب تم نے قلعے پر حملہ کیا تھا۔" میں نے اپنی بات کی وضاحت میں دلیل پیش کی۔

"لیکن تم یہ بھول گئے کہ جس شب میں نے قلعے پر حملہ کیا تھا، میں اور میرے ساتھی گھوڑوں پر سوار تھے اور فرار کے وقت ہمارے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔" مارکوف معنی خیز لہجے میں بولا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے!" میں اس کی بات نہ سمجھ پایا۔

"فرق پڑتا ہے۔" مارکوف بولا۔ "تمہیں علم ہے کہ پہاڑوں نے قلعے اور شہر کو تین اطراف سے گھیر رکھا ہے لیکن سوائے ایک راستے کے کوئی ایسا راستہ پہاڑوں اور آبادی کے درمیان نہیں ہے جو گھوڑوں کے لیے قابل استعمال ہو قلعے پر حملہ کرنے کے لیے وہ راستہ ناگزیر ہے۔ تم غالباً میری بات سمجھ رہے ہو!" مارکوف نے میری جانب دیکھ کر تائید چاہی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مارکوف نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔ "پہاڑوں کے درمیان بہت سے ایسے دشوار گزار راستے ہیں جنہیں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر عبور نہیں کیا جا سکتا۔ فرار ہوتے وقت چونکہ ہمارے پاس گھوڑے نہیں تھے اس لیے ہم نے شہر کی طرف جانے کی بجائے انہی راستوں کو اپنایا۔ وہ راستے دشوار گزار ضرور ہیں مگر ناقابل عبور نہیں۔ یوں بھی بغیر سواری اور بغیر ہتھیار کے شہر کا رخ کرنا موت کو دعوت دینا ہی تھا۔ پھر یہ کہ ان دشوار گزار راستوں سے ہو کر میں بہت کم وقت میں اپنے پرانے ٹھکانے تک پہنچ گیا اور اس طرح ایک طویل چکر کاٹنے سے بچ گیا۔"

اب مارکوف کی بات پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے مزید کسی سوال کی گنجائش نہیں تھی۔ کچھ دیر کے لیے غار میں خاموشی چھا گئی۔

پھر اس خاموشی کو مارکوف ہی کی آواز نے توڑا۔ "مجھے بہت دکھ ہے کہ میں اپنے جاں نثاروں کو موت کے منہ میں چھوڑ آیا۔" اس کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔ "لیکن میں ان کا انتقام ضرور لوں گا۔"

"یقیناً"! میں نے بھی اس کی آواز میں آواز ملائی۔

"میرے خیال میں اگر تم وہیں قلعے میں رہتے تو زیادہ بہتر تھا۔" چند لمحے بعد مارکوف بولا۔ "لیکن اگر تم میرے ہی ساتھ رہنا چاہتے ہو تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

"فی الحال میرا قلعے میں رہنا قطعی بے سود ثابت ہوتا۔" میں نے جواب دیا، پھر مارکوف کو ان باتوں سے آگاہ کرنے لگا جو اس کے علم میں نہیں تھیں اور میں نے سوچی تھیں۔

"تم نے یہ بہت اچھا کیا کہ واپسی کا راستہ کھلا رکھا!" مارکوف میری طرف ستائشی انداز میں دیکھتا ہوا بولا۔ "تم بہت ذہین ہو بونا!"

"تم اپنے ساتھ بہت کم لوگوں کو لے کر فرار ہو سکے ہو گے۔" میں اس کی بات نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے۔"

"کیا تمہارا تعاقب کیا گیا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔ "مگر اس وقت تک میں اپنے ساتھیوں کو لے کر بہت دور نکل چکا تھا اور پہاڑ وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ انہوں نے پہاڑوں میں گھسنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً "عارضی طور پر پرانا ٹھکانا فوراً" ہی چھوڑ دیا۔ اگر کسی نے تعاقب بھی کیا ہو تو وہ مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ پرانا ٹھکانا چھوڑنے سے قبل میں نے اطراف کا

بھرپور جائزہ لے لیا تھا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تمہارے ساتھ بہت کم لوگ رہ گئے ہیں!" میں بولا، پھر بغیر رکے کہا۔ "ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ تم اب اس حیثیت میں نہیں رہے کہ منگولوں پر حملہ کر سکو۔ تمہیں بہرحال مدافعت کی جنگ لڑنا پڑے گی۔"

"صرف کچھ دن!" مارکوف پر عزم لہجے میں بولا۔ "تم شاید واقف نہ ہو کہ اگر میں اپنے ان ہم قوموں کے نام یہ حکم جاری کر دوں کہ وہ پہاڑوں میں مجھ سے آملیں جو اس وقت آبادیوں میں ہیں تو وہ مجھ تک پہنچنے میں دیر نہیں کریں گے۔ شہر کیف کے علاوہ بھی اردگرد بہت سی مقامی آبادیاں ہیں جن پر منگولوں کا قبضہ ہے۔ میری قوت کا راز وہی آبادیاں ہیں۔ وہاں سے اکثر میں افرادی قوت حاصل کرتا رہتا ہوں اور اب بھی ایسا ہی کروں گا۔"

"ہتھیار، اسلحہ اور خوراک؟" میں نے سوال کیا۔

"جس طرح یہ تمام اشیا پہلے حاصل کی جاتی رہی ہیں، آئندہ بھی حاصل کی جائیں گی۔" مارکوف نے جواب دیا۔

"یقیناً" تمہارا ہدف منگول بنتے ہوں گے۔" میں نے ایک نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے قطعی ٹھیک سوچا۔" مارکوف ہنس پڑا "تم بہت جلد بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہو۔"

پھر مارکوف نے اسی غار میں میرے سونے کا بندوبست بھی کر دیا اور یقیناً" یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ اس طرح اس نے مجھ پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا تھا اور اپنے ساتھیوں پر بھی یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ مجھ پر کس قدر بھروسا کرتا ہے۔

کافی دیر تک میں اور مارکوف باتیں کرتے رہے اور پھر سو گئے تھے۔ جب ہم سوئے تھے تو صبح ہونے والی تھی اس لیے دن چڑھے تک سوتے رہے اور ہمیں کسی نے بیدار نہیں کیا۔ مارکوف بھی غالباً" خود ہی بیدار ہوا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تھی تو میں نے غار میں خود کو تنہا پایا تھا۔ میں اٹھ کر غار کے دہانے تک گیا جہاں نیزے بردار موجود تھے۔ ان سے پتا چلا کہ کچھ دیر قبل ہی مارکوف غار سے نکلا تھا۔ وہ میرے لیے پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں بیدار ہو کر اس کا انتظار کروں۔ نیزے بردار مجھے اس کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے تھے کہ وہ کہاں گیا ہے!

میں پھر بستر پر آکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی نیزہ برداروں میں سے ایک میرے سامنے کھانا رکھ گیا جو بھنے ہوئے گوشت پر مشتمل تھا۔ ذائقے سے میں نے جانا کہ وہ گوشت کسی پہاڑی بکرے کا تھا جسے نمک لگا کر آگ پر بھونا گیا تھا۔ غالباً" اسے شکار کیا گیا تھا۔

میں کھانے سے فارغ ہوا تھا کہ مارکوف آگیا اور میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"کہاں گئے تھے تم؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اپنے ساتھیوں کی خبر گیری کرنے!" مارکوف نے جواب دیا۔ "اس کے علاوہ میں نے اپنے کچھ آدمیوں کو پیغام دے کر آبادیوں کی طرف بھی بھیجا ہے۔ آج رات اور زیادہ سے زیادہ کل تک بہت سے لوگ ہتھیاروں سمیت یہاں پہنچ جائیں گے۔"

اس کے بعد مارکوف نے بھی کھانا کھایا، پھر وہ مجھے ساتھ لیے غار سے نکلا۔ میں نے اردگرد کا علاقہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اب مجھے کچھ دن اس کے ساتھ ہی رہنا تھا اس لیے میں دن کی روشنی میں ان تمام راستوں کو دیکھ لینا چاہتا تھا۔

مارکوف کے ہمراہ میں کافی دیر پہاڑوں میں گھومتا رہا اور راستوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کرتا رہا، پھر غاروں کی طرف لوٹ آیا۔ میں نے مارکوف کو بھی بتا دیا تھا کہ میرا مقصد کیا ہے!

پھر دوسرے دن صبح میں تنہا غاروں کے سلسلے سے نکلا اور کافی دور تک جا کر لوٹا۔ جب میں واپس ہوا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ مارکوف اس وقت غار میں تنہا نہیں تھا۔ آرق کے علاوہ مجھے وہاں کچھ اجنبی چہرے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد مجھے ان اجنبیوں کے بارے میں معلوم

ہو گیا کہ وہ کون تھے! مارکوف کے بھیجے ہوئے قاصد لوٹ آئے تھے اور وہ بڑی تعداد میں اپنے ہمراہ مقامی باشندوں کو لائے تھے جو مسلح بھی تھے اور مارکوف کے ایک اشارے پر اپنی جان بھی قربان کر سکتے تھے۔ غار میں موجود افراد انہی افراد کی نمائندگی کرنے مارکوف سے ملنے آئے تھے۔ میں نے مارکوف اور ان افراد کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ مارکوف کا کتنا احترام کرتے ہیں!

اسی دن مارکوف نے اپنے ساتھیوں کو پرانے ٹھکانے کی طرف مراجعت کا حکم دیا کیونکہ موجودہ ٹھکانے میں اب اتنی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اس کے تمام ساتھی سکون و اطمینان سے رہ سکتے۔ مارکوف کے ساتھیوں کی تعداد اب تقریباً" پھر اتنی ہی ہو چکی تھی جتنی پہلے تھی۔ اب ایسا کوئی خطرہ بھی درپیش نہیں تھا جو وہاں چھپا جاتا۔ ہنگامی حالات میں تو وہاں کسی طرح رہائش اختیار کی جا سکتی تھی مگر مستقل طور پر نہیں۔

دن ڈوبنے سے قبل ہی وہ غار پھر سے آباد ہو گئے جو عارضی طور پر ویران ہو گئے تھے۔ میری رہائش کا بندوبست ایک ایسے غار میں کیا گیا جو مارکوف کے غار سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ مجھے یہ خصوصی اہمیت صرف اس لیے حاصل ہوئی تھی کہ مارکوف نے اپنے ساتھیوں کے سامنے مجھے اپنا دوست کہا تھا اس لیے میری حیثیت اس کے ساتھیوں سے بلند تھی میرے غار میں بھی وہی سامان آرائش تھا جو مارکوف کے غار میں تھا۔

اس شب مارکوف نے مجھے اپنے غار میں بلوایا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کے غار میں پہنچا تو وہاں آرق بھی تھا۔ مارکوف نے مجھے اپنے قریب قالین پر بٹھا لیا۔

"بھائی! آبادیوں سے آنے والوں نے ایک اہم اطلاع دی ہے اسی سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے میں نے تمہیں بلایا ہے۔" مارکوف مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کہو!" میں بولا۔

"شہر کیف سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ اس آبادی سے بھی کچھ مقامی لوگ یہاں آتے ہیں۔ ان سے پتا چلا ہے کہ وہاں منگول سپاہیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر ان کے پاس اسلحہ بہت ہے۔" مارکوف معنی خیز لہجے میں کہنے لگا۔

"اور تم اس اسلحہ پر ہاتھ صاف کرنا چاہتے ہو! یہی بات ہے؟" میں مسکرا کر بولا۔

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ یہ معرکہ تم سر کرو! آرق تمہارے ساتھ ہو گا۔"

میں اس کی تجویز پر خوش ہو گیا اور میں نے اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔ "مارکوف! تم مجھے یہ موقع دے کر میرے لیے مسرت کے لمحے فراہم کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری تجویز قبول ہے۔ جانا کب ہے؟"

"آج ہی رات!" مارکوف نے بتایا۔ "تمام تیاریاں ہو چکی ہیں۔ آرق مجھ سے اجازت لے کر روانہ ہونے والا تھا کہ مجھے تمہارا خیال آ گیا۔ معاملہ زیادہ بڑا نہیں ورنہ میں خود چلتا۔"

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔" میں نے فوراً" کہا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "کیا اس آبادی تک پہنچنے کے لیے شہر کیف سے بھی گزرنا ہو گا؟"

"نہیں!" مارکوف بولا۔ "وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرا رستہ بھی پہاڑوں تک جاتا ہے۔ ہر چند کہ اس طرح فاصلہ بڑھ جائے گا مگر خطرہ مول لینے سے کیا فائدہ!"

مجھے اس وقت عجیب سی خوشی ہو رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں منگولوں کے خلاف کھل کر کوئی قدم اٹھا رہا تھا اور تنہا نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ہی آرق اور میں، مارکوف کے غار سے نکل آئے۔ آرق نے مجھے اسلحہ خانے سے لا کر بہترین ہتھیار فراہم کیے۔ اسلحہ خانہ ایک غار کے اندر ہی تھا جس میں تلواریں، نیزے، بھالے، ڈھالیں، زرہ بکتر اور دوسرے ہتھیار موجود تھے۔ ہاں اصطبل میں گھوڑوں کی کمی ضرور تھی۔ اس

کمی کو آرق نے اس طرح پورا کیا کہ ایک ایک گھوڑے کی پشت پر دو دو افراد کو بٹھا دیا تھا۔ گھوڑوں کی کمی اس لیے ہو گئی تھی کہ شہر کیف اور قلعے پر حملے کے دوران مارکوف اور اس کے ساتھی قید کر لیے گئے تھے۔ اصطبل میں جو گھوڑے تھے، وہ ان نئے آنے والوں کے تھے جو مختلف آبادیوں سے وہاں پہنچے تھے۔ صرف دو گھوڑے ایسے تھے جن پر دو سوار نہیں تھا اور یہ دونوں گھوڑے میرے اور آرق کے تھے۔

اس آبادی پر شب خون مارنے کے لیے مارکوف نے اپنے تمام ساتھی، میرے اور آرق کے ہمراہ نہیں کیے تھے بلکہ ہمارے ساتھ نصف تعداد تھی۔ نصف افراد غاروں ہی میں رہ گئے تھے۔ مشعلوں کی تعداد دانستہ کم رکھی گئی تھی۔ ہمارے ساتھ صرف درجن بھر مشعل بردار تھے جن میں سے نصف آگے آگے چل رہے تھے، کچھ درمیان میں ادھر ادھر اور کچھ پیچھے! نصف مشعل بردار تین گھوڑوں پر اس لیے آگے آگے چل رہے تھے کہ راستہ دکھائی دیتا رہے۔ ان کے پیچھے میرے اور آرق کے گھوڑے تھے، پھر بقیہ افراد کے گھوڑے!

غاروں سے نکل کر میدان میں آتے ہی آرق نے صف بندی کر دی تھی۔ گھوڑوں کا رخ پہاڑوں کی پچھلی سمت میں تھا۔ اسی سمت سے چکر کاٹ کر اور شہر کیف کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہمیں اپنی منزل کی طرف بڑھنا تھا۔

پہاڑوں کے درمیان سفر پوری تیز رفتاری سے جاری تھا تاکہ صبح ہونے سے قبل واپسی ہو جائے۔ روانگی سے قبل، آرق نے مجھے تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ آبادی آرق کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی وہاں ایک بار جا چکا تھا۔ اس دوران میں، میں یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ آرق کی حیثیت مارکوف کے دائیں بازو کی ہے۔

گھوڑوں کی ٹاپیں گونجتی رہیں اور ہم پہاڑوں سے نکل آئے۔ پھر پہاڑوں کے پیچھے پیچھے ایک لمبا چکر کاٹا گیا۔ اس کے بعد گھوڑے ایک کچی سڑک پر دوڑنے لگے۔

وہ لمحے میرے لیے بڑے مسرت و انبساط کے تھے جب میری سماعت سے منگول سپاہیوں کی چیخیں ٹکرائیں۔

وہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی جس کے اطراف منگول سپاہیوں نے اپنے یورت نصب کر رکھے تھے۔ ہم بس اچانک ہی ان پر جا پڑے تھے۔ یورتوں کی تعداد دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ یقیناً" اندازہ لگانے والوں سے غلطی ہوئی تھی۔ منگول سپاہیوں کی تعداد کم نہیں تھی جس کا اندازہ یورتوں کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

یورتوں کے درمیان لازماً" پہریدار بھی رہے ہوں گے جو ہمیں آتا دیکھ کر ہی چیخ پڑے تھے مگر اس سے پہلے کہ منگول سپاہی پوری طرح بیدار اور مسلح ہو کر ہمارے مقابلے پر آ سکتے، ان پر ہم نے حملہ کر دیا تھا۔

یورتوں میں آگ لگائی جا رہی تھی اور جلتے ہوئے یورتوں سے منگول سپاہی اپنی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے ہوں گے۔

رات کے سناٹے میں چیخیں گونجتی رہیں، قتل عام جاری رہا۔ کچھ منگول سپاہیوں نے بھاگنے کی خاطر مزاحمت بھی کی مگر انہیں سختی سے کچل دیا گیا۔ چیخ و پکار سن کر مقامی آبادی بیدار ہو گئی، اور جب مقامی باشندوں کو پتا چلا کہ حملہ آور کون ہیں تو وہ مارکوف کے حق میں نعرے لگانے لگے۔

منگول سپاہی اپنے پیچھے آگ، دھواں اور لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ آرق کے کہنے پر ان کا تعاقب نہیں کیا گیا ورنہ میں یہی چاہتا تھا کہ ان میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ جا پائے۔ آرق نے کہا تھا کہ اس طرح خود ہمارے ساتھی ہم سے بچھڑ جائیں گے۔ اس کے علاوہ اس نے تعاقب نہ کیے جانے کے حق میں ایک اور مضبوط دلیل دی تھی جسے سن کر میں نے اس کی بات مان لی تھی۔ دلیل یہ تھی کہ دشمنوں کا تعاقب کرنے سے شب خون مارنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ شب خون مارنے کا مقصد اسلحہ حاصل کرنا تھا

اور اس کے علاوہ گھوڑے وغیرہ بھی! فرار ہونے والوں کا تعاقب کیا جاتا تو اس میں کافی وقت ضائع ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں فرار ہونے والا کوئی نہ کوئی سپاہی شہر کیف پہنچ کر منگولوں کو شب خون مارے جانے سے آگاہ کر سکتا تھا کیونکہ شہر کیف وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں منگول سپاہی بڑی تعداد میں موجود رہتے تھے۔ ایسی صورت میں یہی بہتر تھا کہ مال غنیمت سمیٹ کر وہاں سے فوراً" روانگی ہو جاتی۔ قہرو جبراً" میں نے آرق کی دلیل تسلیم کر لی تھی ورنہ میرا لہو تو جوش پر تھا۔ مجھے پہلی بار یہ موقع نصیب ہوا تھا کہ منگولوں کے قتل عام میں شریک ہو سکوں' ان کے قتل عام میں جو وحشی تھے' درندے تھے' انسان دشمن تھے۔

جب ہم اس آبادی سے روانہ ہوئے تو ہمارے ساتھ بہت سا مال غنیمت تھا جس میں اسلحہ بھی تھا اور بڑی تعداد میں گھوڑے بھی! اب ہمارے ہر آدمی کے پاس گھوڑا تھا۔ اس کے باوجود بھی کافی تعداد میں گھوڑے بچ گئے تھے جنہیں ہم نے ساتھ لے لیا تھا۔ تقریباً" ہر شخص کے ساتھ ایک گھوڑا بھی تھا جس کی پشت خالی تھی۔ انہی میں سے کچھ گھوڑوں پر اسلحہ باندھ لیا گیا تھا۔

واپسی اس سے بھی تیز رفتاری کے ساتھ ہوئی اس تیز رفتاری سے ہم اس آبادی تک پہنچے تھے۔

اس وقت پہاڑ نعروں سے گونج اٹھے جب ہم کامیاب و کامران ٹھکانے تک پہنچ گئے۔ مارکوف بھی فتح کی خبر سن کر اپنے غار سے نکل آیا تھا اور اس نے مجھے سینے سے لگایا تھا۔

"بوغا!" پہلی کامیابی تمہیں مبارک ہو!" مارکوف نے مجھ سے کہا' پھر میرے قریب کھڑے ہوئے آرق کی پیٹھ تھپکی۔

"یہ رات میری زندگی کی یادگار راتوں میں سے ہے۔ میں اس رات کا نشہ نہیں بھول سکتا۔" میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "دشمن کا خون بہانے میں جو نشہ ہے' وہ شاید حنا کی بہترین شراب میں بھی نہیں۔ مارکوف! میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے مجھے یہ موقع دیا۔"

"اگر تم ہمارے ساتھ رہے تو ایسے مواقع بار بار آئیں گے۔" مارکوف مسکرا کر بولا۔ "غالباً" صبح ہونے والی ہے اب تم سو جاؤ! باقی باتیں دن میں ہوں گی۔" یہ کہہ کر مارکوف اپنے غار کی طرف چلا گیا۔

میں بھی کچھ دیر آرق کے ساتھ رہ کر اپنے غار میں سونے چلا گیا۔ خوشی کے سبب' تھکن کے باوجود نیند میری آنکھوں سے بہت دور تھی۔ آرق کو اسلحہ خانے کے غار میں چھوڑ کر میں اس سے رخصت ہو گیا۔ وہ لوٹے ہوئے اسلحہ کو گھوڑوں کی پشت سے اتروا کر اسلحہ خانے میں ترتیب سے رکھوا رہا تھا۔

پہاڑوں کے درمیان مارکوف نے ایک دنیا آباد کر رکھی تھی۔ ایک غار کھانے پکانے کے لیے مخصوص تھا۔ خوراک کا زیادہ تر انحصار شکار پر تھا اور اس کے لیے بھی افراد مخصوص تھے جو اپنے ساتھیوں کے لیے پہاڑی جانور شکار کر کے لاتے تھے۔ پانی پہاڑی چشموں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ تمام کاموں میں ایک نظم و ضبط تھا۔ ان تمام باتوں کا اندازہ مجھے ان لوگوں کے ساتھ مزید دو دن گزار کر ہوا۔

تیسرے دن صبح میں اور مارکوف چہل قدمی کرتے ہوئے' ان غاروں سے کافی دور نکل گئے۔ مارکوف چاہتا تھا کہ نوواردوں کو لڑائی کی تربیت دی جائے اور یہ کام میں اپنے ذمے لے لوں۔ نوواردبا قاعدہ فن حرب و ضرب سے واقف نہیں تھے اور یہ ضروری تھا کہ ان کی تربیت ہو۔ مارکوف اسی سلسلے میں اس وقت مجھ سے گفتگو کر رہا تھا۔ میں اور وہ باتیں کرتے ہوئے ایک چٹان پر چڑھ گئے تھے۔ اس چٹان پر چڑھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اطراف پر نظر رکھی جا سکے۔ مارکوف ہر وقت منگولوں کی طرف سے چوکنا رہتا تھا کہ کیا خبر وہ کب پہاڑوں پر یلغار کر دیں۔

پتھر پر بیٹھنے کے بعد ابھی مارکوف نے گفتگو کا آغاز ہی کیا تھا کہ میں چونک پڑا۔ میں نے گہرائی میں کچھ فاصلے پر تین افراد کو دیکھا تھا جو اسی سمت چڑھتے چلے آ رہے تھے۔

سولدہ کے دشمن! میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میرے جسم کے سارے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ میں انہیں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں وہی عجیب و غریب ساخت کی اشیاء تھیں وہی لوہے کی لمبی لمبی سی نالیاں! ان کے جسموں پر موجود لباس بھی عجیب تھا اسی لیے میں نے انہیں فوراً پہچان لیا تھا۔

کچھ دیر کے لیے تو جیسے میرے حواس گم ہو گئے، پھر مجھے خطرے کا احساس ہوا میں اور مارکوف چٹان کے کنارے بیٹھے تھے۔ مارکوف کی نگاہ ادھر نہیں تھی اس لیے شاید وہ ان اجنبیوں کو نہیں دیکھ پایا تھا اور مسلسل بولے جا رہا تھا۔ شاید اسے بھی یہ احساس ہو کہ میں اس کی بات پر توجہ نہیں دے رہا اور ایک ہی سمت دیکھے جا رہا ہوں۔ ابھی وہ شاید مجھ سے اس سلسلے میں استفسار ہی کرنے والا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"دشمن۔۔۔ دشمن! لیٹ جاؤ، اوندھے لیٹ جاؤ!" میں نے مارکوف کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔

"کہاں، کدھر؟" مارکوف کے لہجے میں شدید حیرت تھی، پھر اس نے خود ہی ان اجنبیوں کو دیکھ لیا کیونکہ میں اب تک ادھر ہی دیکھے جا رہا تھا اور مجھے بھی اس بات کا احساس ہو گیا۔

"وہ بہت خطرناک پراسرار قوتوں کے مالک ہیں اور وہ سولداؤں کے دیس سے آئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی نظر ہم پر پڑ جائے، لیٹ جاؤ!" میں نے تیزی سے کہا اور سینے کے بل چٹان پر لیٹ گیا۔

مارکوف نے بھی میری تقلید کی تھی۔ وہ غالباً" میری پوری بات تو نہ سمجھ سکا ہو گا مگر ان اجنبیوں کے جسموں پر موجود عجیب و غریب لباس نے یقیناً" اسے الجھن میں ڈال دیا ہو گا۔

"بوغا! تمہیں یہ کیسے معلوم ہے کہ وہ سولداؤں کے دیس سے آئے ہیں؟" مارکوف نے پوچھا۔

"آہستہ بولو! وہ اب قریب آتے جا رہے ہیں۔" میں نے مارکوف کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ "وہ ہماری آوازیں سن کر اس طرف بھی متوجہ ہو سکتے ہیں اور پھر اگر ایسا ہو گیا تو۔۔۔ تو کچھ نہیں کہہ جا سکتا کہ کیا ہو گا؟"

"تم ان سے بہت خوفزدہ ہو حالانکہ وہ صرف تین ہی ہیں۔ اگر انہوں نے ہمیں دیکھ بھی لیا اور ہم سے لڑنے بھی لگے تو شاید ہم ان سے کمزور نہیں پڑیں گے۔" مارکوف پر عزم لہجے میں بولا مگر اس کی آواز اس بار بلند نہیں تھی۔

"تم نہیں جانتے مارکوف، نہیں جانتے! ان سے سولدائیں بھی ڈرتی ہیں کیونکہ وہ۔۔۔ وہ بڑی پراسرار قوتوں کے مالک ہیں۔" میں نے مارکوف کو سمجھانا چاہا۔

"تمہاری باتوں سے پتا چل رہا ہے جیسے تم انہیں پہلے سے جانتے ہو!" مارکوف نے کہا۔

"ہاں!" میں نے سر ہلایا۔

"مگر کیسے؟" اس نے سوال کیا۔

"یہ میں پھر کبھی فرصت میں بتاؤں گا۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔"

"اگر وہ اتنے ہی خطرناک ہیں تو ان پر بے خبری میں حملہ کر کے انہیں ختم کیوں نہ کر دیا جائے؟ وہ اس چٹان کے نیچے سے ہی تو گزریں گے۔"

مارکوف کی بات سن کر میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ میں نے سوچا اور پھر مجھ پر خوف غالب آنے لگا۔ مجھے علم تھا کہ ان اجنبیوں کے سامنے سولدہ بھی نہیں ٹک پاتی تھی اور فرار ہو جاتی تھی۔ یقیناً" ان کے پاس ایسی پراسرار قوتیں ہوں گی کہ سولدہ کی قوتیں ان کے سامنے ماند پڑ جاتی ہوں گی۔

"نہیں!" میں نے ایک دم مارکوف سے کہا۔ "ان کے پاس جادوئی ہتھیار ہوتے ہیں۔ ہم دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"لیکن تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہم انہیں اتنا موقع ہی نہیں دیں گے کہ وہ اپنے ہتھیار استعمال کر سکیں۔" مارکوف نے دلیل پیش کی اور اس کی دلیل بڑی مضبوط تھی۔

مجھے علم تھا کہ سولدہ کے دشمن اسی کی تلاش میں

وہاں تک پہنچے ہوں لیکن میں اس سے بے خبر تھا کہ سولدہ ان پہاڑوں میں اب بھی موجود ہے یا نہیں! اب تک سولدہ ہی میرے کام آتی رہی تھی اور میں اس کے کسی کام نہ آسکا تھا۔ یہ ایک سنہری موقع تھا کہ میں اس کے کام آسکتا۔ یہ سوچ کر میرا دل بے قابو ہونے لگا۔ خوف پر اب جوش غالب آگیا تھا اس لیے میں نے مارکوف کی بات مان لی۔

ہم دونوں کے پاس ہتھیاروں کی صورت میں اس وقت تلواریں تھیں اور خنجر!

"ہم دونوں بیک وقت خنجر پھینکیں گے اور پہلے ہی حملے میں ان میں سے دو کو شکار کرلیں گے۔" مارکوف نے تجویز پیش کی۔

پھر وہ مزید کچھ کہنے والا تھا کہ میں بول اٹھا۔ "اور تیسرا شخص؟ اس کا کیا ہوگا؟"

"تیسرا شخص اپنے دو ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر گھبرا جائے گا" ان کی طرف متوجہ ہوگا اور اس سے فائدہ اٹھا کر تیسرے کو بھی شکار کرلیا جائے گا' میرے پاس ایک میں دو خنجر ہیں۔" مارکوف نے جواب دیا۔

"اس میں خطرہ ہے۔ اگر نشانہ ذرا بھی خطا ہوگیا یا تیسرا شخص ہماری توقع کے مطابق اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ نہ ہوا تو پھر ہم نہیں بچ سکیں گے۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا کیا جائے؟" مارکوف کے لہجے میں کسی قدر جھنجلاہٹ آگئی۔

یہی سوال میرے ذہن میں بھی تھا۔ کیا کیا جائے کہ کوئی خطرہ پیش نہ آئے۔ اگر ان کی تعداد تین نہ ہوتی اور دو ہی ہوتے تو میں شاید اس قدر فکر مند نہ ہوتا۔ میں نے دشمنوں کی طرف دیکھا۔ اب وہ مزید قریب آ گئے تھے اور کچھ دیر بعد اس چٹان کے نیچے سے گزرنے والے تھے جس پر میں اور مارکوف موجود تھے۔ میں نے چاروں طرف نگاہ سے اطراف کا جائزہ لیا' اور پھر مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

"مارکوف! ہم ان پر بھاری بھاری پتھر لڑھکائیں گے" میں نے تیزی سے سرگوشی کی۔ "جیسے ہی وہ چٹان کے نیچے پہنچیں گے ہم ان کے سروں پر بھاری پتھر دے ماریں گے۔"

مارکوف نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ ہمارے اردگرد چھوٹے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ چند لمحوں بعد ہی میرے اور مارکوف کے ہاتھوں میں دو بھاری بھاری پتھر تھے' اتنے بھاری کہ ہم انہیں بمشکل سنبھال پا رہے تھے۔

اور پھر وہ لمحہ آہی گیا' خطرناک لمحہ! دشمن آپس میں باتیں کرتے ہوئے اس چٹان کے بالکل نیچے پہنچ گئے۔ ان کی زبان عجیب تھی جو میرے لیے قطعی ناقابل فہم تھی۔ اب صرف چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ وہ ہمارے نشانے پر آجاتے۔ میں نے اپنا سانس بھی روک لیا تھا۔ مجھے اپنے دل کے دھڑکنے کی دھمک سر میں سنائی دے رہی تھی اور کنپٹیاں جیسے پھٹنے کے قریب تھیں۔

میں اور مارکوف سرک کر چٹان کے بالکل کنارے پر پہنچ گئے تھے تاکہ دشمن پر نظر رہے۔ میری نگاہ ان اجنبی چہروں پر جمی ہوئی تھی' دشمن چہروں پر!

وہ پرجوش انداز میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے اور اپنی گفتگو میں اتنے محو تھے کہ اردگرد کے ماحول سے قطعی بے نیاز نظر آرہے تھے۔

دشمنوں کے قدم بڑھتے رہے' اپنی موت کی طرف! اور پھر وہ ہماری زد پر آگئے۔ مارکوف نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف! دوسرے ہی لمحے دو بھاری پتھر ان پر گرنے لگے اور عین اسی لمحے ان میں سے ایک لڑکھڑا کر دور جا گرا۔ وہ باتوں میں اتنا محو تھا کہ سامنے پڑا ہوا پتھر نہ دیکھ سکا اور اس کا پیر پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔

دشمنوں میں سے دو شکار ہوگئے تھے۔ ان کے سر پھٹ گئے تھے اور بھیجہ بہنے لگا تھا مگر تیسرا حیرت انگیز طور پر بچ گیا تھا۔ اگر وہ عین موقع پر لڑکھڑا کر دور نہ جا گرتا تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو اس کے دو ساتھیوں کا ہوا تھا۔

پھر میں صرف اتنا دیکھ پایا تھا کہ تیسرے شخص نے

کالے لوہے سے بنی ہوئی سوراخ دار سلاخ چٹان کی طرف اٹھائی تھی۔ جادوئی ہتھیار! میں نے سوچا تھا' اور پھر مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ چٹان ہوا میں اڑنے لگی ہو۔ اس کے بعد میرے ہوش و حواس جواب دے گئے تھے۔

ہوش آتے ہی میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے جسم کو دہکتے ہوئے لوہے سے داغا جا رہا ہو۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

میں نے دیکھا کہ میرا آدھے سے زیادہ جسم چھوٹے بڑے پتھروں میں دبا ہوا تھا۔ صرف میرا سر اور سینہ ان پتھروں سے باہر تھا۔ میں نے تکلیف و اذیت کو برداشت کرنے کی غرض سے دونوں ہونٹ سختی سے بھینچ لیے اور اطراف میں نگاہ دوڑائی۔

میرے اطراف میں دور تک چھوٹے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے گزرے ہوئے لمحے یاد آئے' بے ہوشی سے قبل کے لمحے! اسی کے ساتھ مجھ پر خوف غالب آنے لگا۔ میں نے اور مارکوف نے سولدہ کے دشمنوں پر حملہ کیا تھا جن میں سے ایک زندہ بچ گیا تھا۔ مجھے یاد آنے لگا۔ اس نے ہم پر اپنے جادوئی ہتھیار سے حملہ کیا تھا' مجھے یاد نہ آسکا۔ اس کے بعد شاید میں ہوش کھو بیٹھا تھا مگر نہیں' میں نے چٹان کو ہوا میں اڑتے ہوئے بھی محسوس کیا تھا۔

وہ چٹان کہاں گئی؟ میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ مجھے مارکوف کا خیال آیا۔ میں نے اپنی دونوں کہنیاں زمین پر ٹکا دیں اور ان کے زور پر اپنے جسم کو پتھروں کے اندر گھسٹنے لگا۔ اس کوشش میں کئی بار میرے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ میں کافی دیر بعد اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکا۔ پھر میں نے دیکھا کہ میرے جسم کا نچلا حصہ زخم زخم تھا۔ میں بمشکل اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکا۔

میں لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف بڑھا۔ مجھے اب مارکوف کی تلاش تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میری طرح کہیں پتھروں میں دبا پڑا ہو گا اور اسے شاید ابھی ہوش نہیں آیا ہو گا۔

دور تک پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ میں ا
پتھروں کے درمیان کراہتا ہوا بڑھتا رہا' کبھی ادھر ا
کبھی ادھر! زخمی ہونے کے سبب مجھے اپنے جسم
سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے
میرے پیروں میں جان ہی نہ رہی ہو۔

میں نے ایک جانب چلتے چلتے مڑ کر دیکھا تو پشت
اسی پہاڑی درے کو پایا جس سے گزر کر میں او
مارکوف وہاں پہنچے تھے' پھر ایک چٹان پر چڑھ گئے
جواب کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ چٹان کے غائب
ہونے اور دور تک بکھرے ہوئے بڑے بڑے ا
چھوٹے چھوٹے پتھروں کو دیکھ کر میں یہی اندازہ لگا
کہ دشمن نے جادو کے زور سے اس چٹان کو ریزہ ر
کر دیا تھا۔

مگر دشمن کہاں گیا؟ اس سوال نے مجھے پھر خوفزدہ
دیا۔ میں نے دور دور تک نگاہ دوڑائی مگر مجھے کوئی نظ
آسکا وہ چلا گیا ہو گا' اپنے دیس لوٹ گیا ہو گا! میں
اپنے دل کو سمجھایا' اور پھر ایک بار مارکوف کو تلا
کرنے لگا۔

جب مجھے مارکوف کو تلاش کرتے ہوئے کافی دیر
گئی تو میں مایوس ہونے لگا۔ یوں بھی اب میری ہم
جواب دینے لگی تھی۔ میں ایک بڑے سے پتھر پر
گیا' اور پھر اپنے زخموں کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے
ہی نظر میں اندازہ کر لیا کہ زخم زیادہ گہرے اور خطرنا
نہیں تھے۔ بائیں پیر کی پنڈلی کا گوشت دو جگہ
پھٹ گیا تھا اور دائیں پیر کا گھٹنا سوجا ہوا تھا۔ اس
علاوہ رانوں اور کولھوں پر چھوٹے چھوٹے زخم تھے
پیٹ کی کھال بھی کئی جگہ سے چھل گئی تھی
خراشیں تو خیر متعدد رہی ہوں گی مگر انہیں میں کہ
کہاں دیکھتا! پیٹ سے نیچے پیروں کی انگلیوں تک
خراشیں ہی خراشیں تھیں۔

کیا مجھے اب مارکوف کے ساتھیوں تک پہ
چاہیے اور انہیں اس حادثے سے مطلع کرنا چاہیے
میں نے سوچا۔ ممکن ہے کہ وہ مارکوف کو تلاش
سکیں۔ مگر میں ان سے کہوں گا کیا؟ کیا وہ میری باتوں

یقین کرلیں گے کہ میں نے اور مارکوف نے چند ایسے انسانوں پر حملہ کردیا تھا جو پراسرار قوتوں کے مالک تھے اور اگر وہ بھی مارکوف کو تلاش نہ کرپائے تو کیا ہوگا؟ پھر میرے ذہن میں ایک اور نیا خیال آیا کہیں مارکوف کو دشمن نے اپنے ساتھ نہیں لے گیا؟ مگر اس خیال کو خود میں نے ہی ذہن سے جھٹک دیا۔ بھلا دشمن کو اس سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی جو اسے ساتھ لے جاتا! دشمن اسے صرف ہلاک ہی کرسکتا تھا اور اس نے کردیا" یہ کوشش کی تھی۔ میں خود دشمن کے وار سے بچ گیا تھا اس لیے سوچ رہا تھا کہ مارکوف بھی بچ گیا ہوگا۔

میرا ذہن کوئی فیصلہ نہ کرپایا تو میں اضطراب کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت میری نگاہ پتھروں کے درمیان سے جھانکتی ہوئی دو انسانی انگلیوں پر پڑی۔ فاصلہ چند قدم کا تھا۔ میں لپک کر وہاں پہنچ گیا۔

میں اسی جگہ بیٹھ گیا اور تیزی کے ساتھ چھوٹے بڑے پتھروں کو ادھر ادھر پھینکنے لگا۔ کچھ دیر ہی میں پورا ہاتھ پتھروں سے باہر آگیا میں کانپ اٹھا۔ وہ ہاتھ بالکل سفید تھا' موت کی طرح سرد!

پھر تو مجھ پر جیسے دیوانگی سی طاری ہوگئی۔ میں اپنے ہاتھوں کو بھول گیا۔ میرے دونوں ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہے تھے۔

پھر ہٹے تو میں نے دیکھا کہ کوئی اوندھے منہ زمین پر پڑا ہوا ہے اس کا چہرہ میری جانب نہیں تھا۔ میں نے زور لگا کر اسے سیدھا کردیا۔ اس کا چہرہ مٹی میں بھرا ہوا تھا اس کے باوجود اسے پہچاننے میں دقت نہ ہوئی۔ وہ مارکوف ہی تھا۔ میں اس پر جھک گیا اور اپنا کان اس کے سینے پر رکھ دیا۔

اور پھر میری آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ مارکوف مرچکا تھا' وہ مارکوف مرچکا تھا جسے مارنے کے خواب دیکھتے تھے۔ وہ مرچکا تھا جو دوسروں کی زندگی کے لیے جنگ کررہا تھا۔

نہیں نہ جانے کتنی دیر اسی حالت میں وہیں بیٹھا رہا۔ میرا ذہن خالی خالی سا تھا۔ مجھے مارکوف کی موت کا یقین نہیں آرہا تھا حالانکہ وہ مردہ حالت میں میرے سامنے پڑا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ مجھ سے سرگوشیاں کررہا تھا۔ خود اس نے بھی نہ سوچا ہوگا کہ اس کی موت اتنی قریب ہے اور وہ اپنی موت کا سامان کررہا ہے۔ یہ کتنی عجیب سی بات تھی کہ انہی پہاڑوں کے درمیان ایسے لوگ آباد تھے جو مارکوف کے ایک اشارے پر اپنی جان قربان کرسکتے تھے مگر اب اشارہ کرنے والا جاچکا تھا اور اس کے اشاروں کو سمجھنے والے اس بات سے بے خبر تھے۔

میں اسی طرح سر جھکائے سوچ میں گم تھا کہ معاً میں نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ جب میں نے سر اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا تو بس دیکھتا رہ گیا۔ میری طرف بڑھنے والی سولدہ تھی۔

"بوغا تو؟" سولدہ دور ہی سے با آواز بلند بولی۔ اس کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں میں جادوئی ہتھیار تھامے ہوئی تھی۔ یہی ہتھیار میں اس کے پاس پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

"تو یہاں کیا کررہا ہے؟" وہ میرے قریب آگئی اور پھر اس کی نگاہ مارکوف کی لاش پر پڑی۔ اس نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کس کی لاش ہے؟"

"یہ مارکوف ہے جو مرچکا ہے۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا' پھر مجھے خیال آیا کہ سولدہ وہاں کیسے پہنچ گئی اور یہ کہ وہ اپنے دشمنوں کی آمد سے باخبر ہے یا نہیں؟ بظاہر تو یہی پتا چل رہا تھا کہ وہ ہوشیار ہوچکی ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں جادوئی ہتھیار نظر آرہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھ سکتا یا کہہ سکتا' وہ بول اٹھی۔ "جلدی بتا بوغا کہ تو کس پریشانی میں ہے اور یہ شخص کیسے مرگیا؟ میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکوں گی کیونکہ میرے دشمن یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔"

جواب میں مختصراً" میں نے سولدہ کو جو کچھ بتایا'

اسے سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ مجھے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے میں کوئی عجیب شے ہوں۔

"بوغا' بوغا تو اس حد تک بڑھ سکتا ہے' اس حد تک! میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔" شدت جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "تو' تو تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تو نے کتنا خطرناک قدم اٹھایا ہے۔ تو جلد سے جلد یہاں سے بھاگ جا! بھاگ جا یہاں سے! کیونکہ وہ جو اکیلا رہ گیا تھا' اپنے ساتھیوں کو لے کر یہاں کسی بھی وقت پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بعد یہاں کیا تباہی آئے' کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ انہیں پتا چل گیا ہے کہ میں یہاں ہوں اس لیے وہ میری تلاش میں یہاں کا چپہ چپہ چھان ماریں گے۔ میں بھی اب زیادہ یہاں نہیں رک سکوں گی۔"

"مگر تو ادھر کیسے نکل آئی تھی؟" میں نے اس کے خاموش ہوتے ہی سوال کر دیا۔

"جس وقت وہ یہاں پہنچے' میں غار سے باہر تھی۔" سولدہ جلدی جلدی بتانے لگی۔ "وہ میری تلاش میں باہر چلے گئے اور اسی دوران میں' میں اپنے غار تک پہنچ گئی۔ وہاں میرا سارا سامان ٹوٹا پھوٹا پڑا تھا جس سے میں سمجھ گئی کہ میرے دشمنوں نے مجھے تلاش کر لیا ہے۔ اس بار میں ان سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتی تھی اور انہی کو ڈھونڈ رہی تھی کہ تو مل گیا۔" یہ کہہ کر سولدہ نے کچھ دیر سوچا' پھر بولی۔ "میں تیرے لیے ایک گھوڑے کا بندوبست کیے دیتی ہوں' تو یہاں سے فرار ہو جا اور سن' اپنے ساتھ تو مارکوف کی لاش بھی لے جائے گا۔"

"مگر کیوں؟" مجھے سولدہ کی بات پر حیرت ہوئی۔

"یہ وقت تفصیلات میں جانے کا نہیں! مارکوف مر چکا ہے اور تو اس کی موت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔" سولدہ نے کہا۔ "تجھے اب پھر منگولوں ہی کے درمیان رہنا ہے۔ مارکوف کی موت تیرا کارنامہ سمجھی جائے گی اور منگول تجھے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگیں گے۔"

میں سولدہ کی بات سن کر چکرا گیا۔ میں نے کہا۔

"مگر۔ مگر میں ان سے کیا کہوں گا؟"

"تو کوئی بھی کہانی گھڑ سکتا ہے۔ اس وقت تیرے حواس ٹھیک نہیں لیکن جب تو پہاڑوں سے نکل کر ش کی طرف جا رہا ہو گا تو بہت سی باتیں خود بخود تیرے ذہن میں آتی چلی جائیں گی۔ میں جانتی ہوں کہ تو کن ذہن نہیں۔ اچھا تو میں تیرے لیے گھوڑا لے کر آتی ہوں۔" سولدہ بولی۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سنائی دی اور پھر وہ غائب ہو گئی۔

مارکوف' میرا دوست خاک و خون میں لپٹا' زمین پر پڑا ہوا ہمیشگی کی نیند سو رہا تھا اور میں اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ مرنے کے بعد بھی اس کا چہرہ نہیں بگڑا تھا۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہو اور ابھی میں آوازوں کا تو جاگ اٹھے گا۔"

دوستی اور لگاؤ کے لیے طویل مدت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ساری عمر ایک ساتھ گزار کر بھی لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی رہتے ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ کچھ دیر کی رفاقت بھی بعض اوقات عمر بھر کے ساتھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس وقت کچھ میرے یہی احساسات تھے۔ ہر چند کہ میں نے مارکوف کے ساتھ طویل عرصہ نہیں گزارا تھا مگر اس کے باوجود میں اس سے بڑی قربت محسوس کرنے لگا تھا۔ شاید اس قربت کا سبب یہ تھا کہ میرا اور اس کا دشمن ایک تھا۔ ہم دونوں ہی کے سینے انتقام کی آگ سے جل رہے تھے۔

معاً میری سماعت میں سولدہ کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ "مارکوف مر چکا ہے اور تو اس کی موت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

کیا میں اپنے دوست کے خون کی قیمت وصول کروں؟ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ منگول اس کی لاش کو بے حرمت کریں گے' پامال کریں گے اور اس کا سر کاٹ کر قلعے کے دروازے پر ٹانگ دیں گے۔ کیا میں یہ سب کچھ برداشت کر سکوں گا' کیا مجھے یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا؟ اور پھر

میرے اندر ہی سے جیسے کوئی میرے سوالوں کا جواب دینے لگا' مجھے سمجھانے لگا اور میرے ذہن پر مصلحت کے پردے ڈالنے لگا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ مارکوف کی روح اس کے بدن کو خالی کر کے جا چکی ہے۔ یہ جو تیرے سامنے پڑا ہے' یہ مارکوف نہیں مٹی ہے جس کا مقدر مٹی ہی میں مل جانا ہے اور ایک دن سبھی مٹی میں مل جاتے ہیں جیسے تیری ماں مٹی میں مل گئی اور کوئی نہ روک سکا۔

"ہاں میری ماں مٹی میں مل گئی اور میں نہ روک سکا۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا' اور پھر میری آواز لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی چلی گئی۔ "مگر میں اپنی ماں کا انتقام لے رہا ہوں اور اس وقت تک انتقام لیتا رہوں گا۔۔۔"

اچانک ہی گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں اور میں چونک پڑا۔ آوازیں دائیں جانب سے آ رہی تھیں۔ میں نے ادھر مڑ کر دیکھا۔ سولدہ گھوڑے پر بیٹھی ہوئی اسے سرپٹ دوڑاتی میری طرف آ رہی تھی۔ فاصلہ ہونے کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا تھا کیونکہ اس کے دراز گیسو شانوں پر لہرا رہے تھے اور ہوا ان سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی سولدہ میرے قریب آ کر گھوڑے سے کود پڑی۔

"بوغا! جلدی کر کہ وقت بہت کم ہے۔" سولدہ نے مجھے مخاطب کیا۔ "مارکوف کی لاش کو گھوڑے کی پشت پر ڈال کر تو بھی اس پر سوار ہو جا!"

"مگر سولدہ' مارکوف میرا دوست تھا اور میں اپنے دوست۔۔۔۔۔"

"بوغا!" سولدہ نے میری بات کاٹ دی۔ "جذبات کو عقل پر حاوی نہ آنے دے۔ تو جو کہنا چاہتا ہے' میں جانتی ہوں۔ فی الحال وہی کر جو میں تجھ سے کہہ رہی ہوں کہ یہی تیرے حق میں بہتر ہے۔ اس بات کی اہمیت کا احساس تجھے بعد میں ہو گا۔ میں اب مزید یہاں رک کر تیری اور اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ میں کوشش کروں گی کہ اپنے دشمنوں کو یہاں نہ پہنچنے دوں اور انہیں اپنے پیچھے لگا کر کہیں اور لے جاؤں تاکہ تو بخیریت یہاں سے نکل جائے لیکن ضروری نہیں کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی جاؤں۔ یوگدو تیری حفاظت کرے۔ میں تیری طرف سے غافل نہیں رہوں گی اور جلد تجھ سے ملوں گی۔"

ان الفاظ کے ختم ہوتے ہی لوہے سے لوہا ٹکرایا' میں نے سنا اور یہ دیکھا کہ سولدہ اس جگہ نہیں جہاں لمحہ بھر پہلے کھڑی تھی۔

میں اب تک سولدہ کے مشوروں پر عمل کرتا آیا تھا اور اس نے مجھے کبھی غلط مشورہ نہیں دیا تھا۔ اس کی باتیں بڑی دور رس ہوتی تھیں۔ آخر کار میں نے اس کا مشورہ قبول کر ہی لیا۔ یوں بھی مارکوف کی لاش کو وہاں مردہ خور پرندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا جانا لاحاصل ہی تھا۔

میں نے مارکوف کی لاش گھوڑے کی پشت پر ڈال لی تھی۔ اس کے پاؤں ایک جانب لٹک رہے تھے' سر اور ہاتھ دوسری جانب! اب میرے حواس کسی قدر قابو میں آ چکے تھے اور اسی کے ساتھ میرے دل میں خطرے کا احساس جاگنے لگا تھا۔ سولدہ نے بتایا تھا کہ اس کے دشمن کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ان کے دو ساتھی مار۔۔۔ جا چکے تھے اور اس صورت میں وہ مزید خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ میں یہ سوچ کر تیزی سے گھوڑے پر چڑھا اور لگامیں تھام کر اسے دوڑا دیا۔

کچھ دیر بھٹک کر میں صحیح راستے تک پہنچ گیا' اور پھر میرا رخ شہر کیف کی طرف ہو گیا۔

جب میں شہر کیف میں داخل ہوا تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ شہر میں متعین فوجی دستوں نے مجھے روکا' اور پھر پہچان کر راستہ دے دیا۔ مارکوف کی موت سے میں اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اپنے زخموں کو بھول گیا تھا لیکن اب خطرے کی حدود سے نکل آنے کے بعد تکلیف کا احساس دوبارہ جاگ اٹھا تھا۔ میں بخیریت پہاڑوں سے نکل کر شہر تک پہنچ گیا تھا' اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ سولدہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے دشمنوں کو پہاڑوں کی طرف نہیں آنے دیا تھا۔

مجھے زخمی و بے حال پا کر اور میرے ساتھ ایک لاش دیکھ کر شہر میں موجود سپاہی حیران حیران سے تو ضرور نظر آئے تھے مگر ان کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ مجھ سے کچھ پوچھ سکتے۔ میں نے بھی انہیں کچھ بتانا غیر ضروری سمجھا تھا اور شہر میں رکے بغیر قلعے کا رخ کیا تھا۔

قلعے کی طرف جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ میں کئی دن کے بعد لوٹ رہا ہوں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میرے ساتھ جو سپاہی پہاڑوں کی طرف گئے تھے' وہ وہاں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے قلعے میں واپس پہنچ کر عجیب عجیب واقعات بیان کیے ہوں گے کہ کس طرح مجھے منحوس کیلتوں نے گھیر لیا تھا۔

میرا ذہن وہ کہانی گھڑنے میں مصروف ہو گیا جو مجھے قلعے میں پہنچ کر سنانی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کہانی میں مجھے سولدہ کے ذکر سے گریز کرنا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔

قلعے تک پہنچتے پہنچتے میں پوری کہانی گھڑ چکا تھا۔

جب میرا گھوڑا قلعے کے دروازے سے اندر پہنچا تو مجھے محافظوں نے گھیر لیا۔ وہ مجھے دیکھ کر انتہائی پرجوش نظر آ رہے تھے۔

"بوغا زندہ ہے' بوغا زندہ ہے۔" ایک محافظ خوشی سے چیخ اٹھا تو فوراً" میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے مردہ تصور کر چکے تھے اور شاید ان کے پاس مجھے مردہ سمجھنے کا جواز بھی تھا۔ بھلا منحوس کیلتوں کے قہر سے کوئی بچ سکتا ہے جو میں بچ جاتا! انہیں کیا خبر تھی کہ میں منحوس کیلتوں کے قبضے میں نہیں تھا۔

میں نے گھوڑے سے اتر کر اس کی لگام تھام لی۔ اسی وقت ایک تومان باشی نے گھوڑے کی پشت پر موجود مارکوف کی لاش پر نگاہ ڈالی اور پوچھا۔ "یہ کس کی لاش ہے؟"

"منگولوں کے باغی مارکوف کی لاش!" میں نے با آواز بلند جواب دیا تاکہ وہاں موجود دوسرے افراد بھی یہ بات سن لیں۔

پھر کیا تھا' محافظوں نے جیسے سارا قلعہ سر پر اٹھا لیا۔ وہ میرے حق میں نعرے لگا رہے تھے اور خوشی سے رقص کر رہے تھے۔

میں محافظوں کے جلوے میں گھوڑے کی لگام تھامے بڑھ رہا تھا۔ ان پر خوشی اس قدر غالب تھی کہ انہوں نے میرے زخمی ہونے کو بھی نظرانداز کر دیا تھا حالانکہ میرے لباس پر جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ میں مارکوف کی لاش کو سیدھا ابونصار کے پاس لے جانا چاہتا تھا اس لیے میں نے گھوڑے کو قلعے کے دروازے ہی پر نہیں چھوڑا تھا۔ میں یہ کام خود اپنے ہاتھوں انجام دینا چاہتا تھا ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ میں لاش کو محافظوں کے سپرد کر دیتا۔

ابونصار کے کمرے تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ گزشتہ روز برقائی خان بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ سرائے باتو سے لوٹ آیا تھا کیونکہ اب اس کے بڑے بھائی باتو خاں کی طبیعت کچھ سنبھل چکی تھی۔ یہ باتیں مجھے ان دو تومان باشیوں سے معلوم ہوئی تھیں جو میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور مجھ سے باتیں کرتے جا رہے تھے۔

شور اور ہنگامہ اس قدر تھا کہ حقیقت حال جاننے کے لیے برقائی خان کے قشق سے متعلق محافظ بھی راستے ہی میں مجھ تک پہنچ گئے تھے۔ پھر وہ حقیقت حال جان کر فوراً" ہی واپس بھی ہو گئے تھے۔ انہیں غالباً" خود برقائی خان نے بھیجا تھا۔ نعروں کی آوازیں یقیناً" قلعے کے اس مخصوص حصے تک بھی پہنچی ہوں گی جہاں برقائی خاں کی رہائش تھی۔

ابھی میں اس راہداری میں مڑا ہی تھا جس میں میرا اور ابونصار کا کمرہ تھا کہ سامنے سے خود ابونصار آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے بھی شاید میری آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ محافظوں نے اسے قریب آتا دیکھ کر راستہ دے دیا اور پھر وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر متانت اور سنجیدگی تھی میں رک گیا۔

"بوغا! تو زخمی نظر آ رہا ہے۔" ابونصار نے کہا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ہاں اے ابو نصار! میں زخمی ہوں مگر زیادہ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں چاہتا تھا کہ تجھے پہلے برقائی خان کے پاس لے جاتا۔"

ابو نصار بولا۔ "تو اس کے باغی کی لاش خود اس کے قدموں میں ڈالتا مگر اب کچھ دیر توقف کرنا پڑے گا۔ اب یہ ضروری ہے کہ پہلے تیرے زخموں کی مرہم پٹی کر دی جائے اور تو لباس بھی تبدیل کر لے۔ آ میرے ساتھ!" ابو نصار یہ کہہ کر مڑا' پھر اس نے محافظوں کو لوٹ جانے کا حکم دیا۔

وہاں صرف چند خادم رہ گئے۔ ابو نصار نے ایک خادم کو اشارہ کیا جس نے میرے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ ابو نصار مجھے اپنے ساتھ لیے کمرے کی طرف بڑھا۔

"جب تو قلعے میں داخل ہوا تھا' اسی وقت مجھے خبر پہنچا دی گئی تھی کہ تو آ گیا ہے' پھر کچھ دیر بعد ہی یہ اطلاع ملی کہ تو مارکوف کی لاش لے کر آیا ہے۔ میں اسی لیے اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تو سیدھا میرے پاس پہنچے گا۔"

"ہاں میرا یہی ارادہ تھا۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد ہی ابو نصار مجھے لے کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ خادم جو میرے گھوڑے کے ساتھ آ رہے تھے' باہر ہی رہ گئے۔

ابو نصار نے مجھے اپنے بستر پر لٹا دیا' پھر وہ میرے زخم دیکھنے لگا۔

"تیرے جسم پر تو بہت زخم آئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے تو کسی چیز کے نیچے دب گیا تھا۔ یہ زخم تلوار یا خنجر کے تو معلوم نہیں ہوتے۔" ابو نصار میرے زخموں کو گیلے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

زخموں کو چھیڑا جانے لگا تو میرے منہ سے کراہیں نکلنے لگیں۔ میں نے اس وقت صرف اتنا کہا۔ "یہ ایک لمبی کہانی ہے جو آہ! میں تجھے تفصیل سے سناؤں گا آہ!" میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ابو نصار اب میرے زخموں پر کوئی دوا لگا رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے زخموں میں مرچیں بھر دی گئی ہوں۔

"بس کچھ دیر برداشت کر لے' پھر ٹھنڈک پڑ جائے گی۔" ابو نصار اپنے کام میں مصروف رہا۔

اسی وقت ایک خادم کمرے میں داخل ہوا۔ ابو نصار نے قدموں کی چاپ سن کر ادھر دیکھا۔

"برقائی خاں کا خادم خاص کوئی پیغام لے کر آیا ہے اور تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔" خادم نے ابو نصار کو بتایا۔

"اسے اندر آنے دے!" ابو نصار نے کہا اور میرے پنڈلی کے زخم پر پٹی باندھنے لگا۔ اس کے بعد ابو نصار نے قریب پڑی ہوئی ایک چادر میرے جسم پر ڈال دی کیونکہ میرا زیریں جسم بے لباس تھا۔

چند لمحے بعد ہی برقائی خان کا خادم کمرے میں داخل ہوا اور ابو نصار کے سامنے ادب سے جھک کر بولا۔ "اے ابو نصار! برقائی خان تجھ سے اور بوغا سے ملنے کا خواہشمند ہے۔"

"اس سے کہنا کہ ہم کچھ دیر بعد اس تک پہنچ جائیں گے اور بتا دینا کہ بوغا زخمی ہے۔ میں اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہا ہوں۔" ابو نصار نے جواب دیا۔

برقائی خان کا خادم پھر ایک بار ادب سے جھکا اور رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی ابو نصار پھر میرے زخموں پر مرہم لگانے لگا۔

جب ابو نصار اپنے کام سے فارغ ہو گیا تو میں نے اٹھنا چاہا مگر اس نے مجھے مزید کچھ دیر لیٹے رہنے کے لیے کہا۔ کچھ دیر بعد ہی میرے زخموں میں ٹھنڈک سی اترنے لگی۔ ابو نصار نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس نے میرے زخموں پر جو دوا لگائی تھی' وہ واقعی تیز اثر تھی۔

میں بستر پر پڑا ہوا لمبے لمبے سانس لیتا رہا اور ابو نصار مجھے محبت بھری نگاہ سے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد خود اس نے کہا۔

"اب تو اٹھ کر کھڑا ہو جا!"

میں اپنا لباس درست کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب جا کر اپنے کمرے میں لباس بھی تبدیل کر آ!" ابو نصار بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ اب زخموں کی

تکلیف تیرے لیے ناقابل برداشت نہ ہوگی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے کمرے سے نکل گیا۔ میں لباس تبدیل کر کے اپنے کمرے سے نکلا تو ابو نصار راہداری میں میرا منتظر تھا۔ قریب ہی میرا گھوڑا موجود تھا جس پر مارکوف کی لاش تھی۔ گھوڑے کے قریب ہی دو خادم موجود تھے۔

"اب تو اپنے گھوڑے کی لگام تھام لے اور برقائی خان کی طرف چل!" ابو نصار نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے بڑھ کر گھوڑے کی لگام تھام لی۔ اسی وقت میری نگاہ مارکوف کے مردہ چہرے پر پڑی۔ میرے وجود میں دکھ کی ایک لہر اٹھی۔ میں خود اپنے دوست کی لاش کو بے حرمت کیے جانے کے لیے لے جا رہا تھا۔ حالات کا جبر بھی عجیب چیز ہے جو دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست ثابت کر دیتا ہے۔ میں نے سوچا اور بوجھل بوجھل قدموں سے قدم اٹھاتا ہوا ابو نصار کے پیچھے چلنے لگا۔

آگے آگے ابو نصار تھا' اس کے پیچھے میں گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے چل رہا تھا' اور پھر دو خادم تھے۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے جیسے سارا قلعہ ہی امنڈ پڑا تھا کیونکہ انہیں علم ہو چکا تھا کہ مارکوف مارا جا چکا ہے اور اس کی لاش برقائی خان کے پاس لے جائی جا رہی ہے۔ لوگ ساتھ ساتھ آگے پیچھے ضرور چل رہے تھے مگر ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ قریب آسکتے۔ وہ سب ہی ابو نصار کا احترام کرتے تھے۔

ابھی کچھ فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ میں نے ایک شخص کو تیزی سے قریب آتے دیکھا اور اسے پہچان لیا۔ وہ سردار بجوکا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے نفرت سی محسوس ہوئی۔

وہ قریب آگیا اور مجھ سے کچھ کہنے کی بجائے مارکوف کے مردہ چہرے کو غور سے دیکھنے لگا' پھر اس نے ایک ایسی حرکت کی کہ میرا خون کھول اٹھا۔ اس نے مارکوف کے مردہ چہرے پر تھوک دیا تھا۔

"بجوکا!" میں چیخ پڑا۔

میرے چیخنے پر ابو نصار نے بھی مڑ کر دیکھا۔ بجوکا بے حیائی سے ہنسنے لگا تھا۔

"کیا ہوا؟" ابو نصار نے پوچھا۔ "تو چیخا کیوں تھا؟"

"اس نے لاش کے چہرے پر تھوکا ہے۔" میں نے بجوکا کی طرف اشارہ کر کے غصے سے کہا۔

"تو کیا ہوا؟" بجوکا' ابو نصار کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ڈھٹائی سے بولا۔

ابو نصار نے اسے تیز نگاہ سے دیکھا' پھر بھاری آواز میں کہا۔ "لاش چاہے دشمن کی ہو' اس کی اس طرح بے حرمتی گناہ ہے۔ تجھے یہ حق نہیں تھا بجوکا!"

"مگر اے ابو نصار میں....."

"کچھ نہیں' میں کچھ نہیں سنوں گا۔" ابو نصار نے بجوکا کی بات کاٹ دی' پھر سخت لہجے میں اسے حکم دیا۔ "لاش کا چہرہ اپنے لباس سے صاف کر! یہ میرا حکم ہے۔ تو نے میری موجودگی میں بے ادبی کی ہے۔"

بجوکا نے ابو نصار کا حکم سن کر برا سا منہ بنایا۔ اسے یہ حکم یقیناً" گراں گزرا ہوگا مگر وہ حکم سے روگردانی کی ہمت نہ کر سکا۔ اسے تعمیل حکم کرنا ہی پڑی اور پھر وہ وہیں سے لوٹ گیا۔

وہ لوگ جو دور کھڑے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے' بے ہنگم آوازوں میں چیخنے لگے۔ انہوں نے یقیناً" پہلے بجوکا کو لاش کے چہرے پر تھوکتے ہوئے دیکھا ہوگا' پھر لاش کا چہرہ اپنے دامن سے صاف کرتے بھی دیکھا ہوگا۔ فاصلہ ہونے کے سبب وہ کچھ سن تو نہ پائے ہوں گے مگر ضرور محسوس کر لیا ہوگا کہ بجوکا کو بے عزت کر دیا گیا تھا۔ لوگوں کے چیخنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ بجوکا کی بے عزتی پر خوشی کا اظہار کر رہے ہوں۔

ابو نصار نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش کر دیا تھا اور پھر دوبارہ مجھے بڑھنے کا اشارہ کیا تھا کیونکہ بجوکا کے آتے ہی میں رک گیا تھا۔

مختلف راہداریوں اور چھوٹے بڑے میدانوں سے گزر کر ہم قلعے کے اس حصے میں داخل ہوئے جو برقائی خاں اور خاندان زریں کے دوسرے افراد کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کلہاڑے بردار محافظ موجود تھے۔ وہاں میں پہلے بھی آ

چکا تھا۔ قلعے کے اس حصے میں ابونصار کے سوا کوئی اور برقائی خاں کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ منگولوں کی یہی شان و شوکت اور جاہ و حشم دیکھ کر میرا دل کڑھتا تھا۔

برقائی خاں جس بڑے کمرے کے اندر موجود تھا' اس کے دروازے پر پہنچ کر ابونصار رک گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کیا تو خود لاش کو اپنے ہاتھوں پر سنبھال سکے گا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر اس کے باوجود ابونصار نے دروازے پر موجود کلہاڑے برداروں کو حکم دیا کہ وہ گھوڑے سے لاش اتارنے میں میری مدد کریں۔

گھوڑے سے لاش اتار لی گئی جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ مارکوف کا جسم زیادہ بھاری نہیں تھا مگر اس وقت کیونکہ میں زخمی بھی تھا اس لیے مجھے لاش اٹھانے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔

مارکوف کی لاش کو کلہاڑے بردار بھی اٹھا کر اندر پہنچا سکتے تھے مگر میں ابونصار کا مقصد سمجھ رہا تھا اس لیے تعمیل حکم کرتے ہوئے میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ یقیناً" یہی چاہتا تھا کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے مارکوف کی لاش کو برقائی خان کے قدموں میں ڈال دوں۔ مجھے ابونصار ہی کی خواہش اور ایما پر مغربی دشت لایا گیا تھا۔ اس طرح غالباً" ابونصار یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس کا انتخاب غلط نہیں تھا اور وہ کام جو کوئی منگول سردار انجام نہ دے پایا' میں نے انجام دے دیا۔

کلہاڑے برداروں نے دروازہ کھولا' ابونصار کمرے میں داخل ہوا' پھر اس کے پیچھے مارکوف کی لاش ہاتھوں پر اٹھائے' میں بڑھا۔

سامنے ہی برقائی خاں اپنی مسند پر بیٹھا ہوا تھا اور مسند کے نیچے دائیں بائیں دو منگول سردار موجود تھے جنہیں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ دونوں ہی برقائی خاں کے ساتھ سرائے باتو گئے تھے۔

ابونصار کے احترام میں برقائی خاں اپنی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا اور نیچے اتر آیا۔ دونوں منگول سردار بھی احتراماً" کھڑے ہو گئے تھے۔

میں بڑھا اور مارکوف کی لاش برقائی خاں کے قدموں میں رکھ دی' پھر سیدھا کھڑا ہو کر ادب سے سر جھکانے کے بعد بولا۔ "اے بگھاتر بھائی کے بگھاتر بھائی! تیرے باغی کی لاش تیرے قدموں میں ہے۔"

برقائی خاں نے دونوں منگول سرداروں کو اشارہ کیا' پھر حکم دیا۔ "اسے شناخت کرو!"

حکم کی تعمیل میں دونوں منگول سردار لاش پر جھک گئے اور چہرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ پھر وہ دونوں ہی سیدھے کھڑے ہو گئے اور بیک زبان تصدیق کی کہ وہ لاش منگولوں کے باغی مارکوف ہی کی ہے۔

"تجھے مبارک ہو برقائی خان کہ تیرے دشمن کی لاش تیرے سامنے ہے۔" ابونصار بولا۔

برقائی خاں کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ چند لمحے خاموشی رہی' پھر برقائی خاں دونوں منگول سرداروں سے مخاطب ہوا۔ "اس کی لاش یہاں سے لے جاؤ اور اس کا سر کاٹ کر قلعے کے دروازے پر ٹانگ دو! سر کاٹنے کے بعد لاش پر گھوڑے دوڑاؤ اور اس وقت تک' جب تک یہ بالکل پامال نہ ہو جائے۔"

"برقائی خان!" ابونصار اس کے چپ ہوتے ہی بول اٹھا۔ "لاش کی بے حرمتی گناہ ہے۔ صرف اتنا کافی ہے کہ عبرت کے لیے اس کا سر کاٹ کر لٹکا دیا جائے۔"

برقائی خان چند لمحے خاموش رہا۔ اس کے چہرے سے تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تو جو کہتا ہے' ٹھیک کہتا ہے۔ وہی ہو گا جو تیری مرضی ہے۔" برقائی خاں نے کہا مگر اب اس کی آواز میں پہلا سا جوش نہیں تھا۔

پھر برقائی خاں نے حکم دیا کہ سر کاٹ کر' لاش کو دفن کر دیا جائے۔

"میں تیرے فیصلے پر خوش ہوا برقائی خاں!" ابونصار نے مسرت کا اظہار کیا۔

منگول سردار' مارکوف کی لاش اٹھوا کر لے گئے۔

اب کمرے میں برقائی خاں کے علاوہ صرف میں اور ابونصار رہ گئے۔ برقائی خاں دوبارہ اپنی مسند پر جا بیٹھا۔ میں اور ابونصار مسند کے نیچے دائیں جانب بیٹھ گئے تھے۔

"اے ابونصار! میں چاہتا ہوں کہ اس خوشی کے موقع پر بوغا کو کوئی ایسا انعام دوں جو آج تک کسی کو نہیں دیا۔" برقائی خاں بولا۔

"ہاں، بوغا کسی ایسے ہی انعام کا مستحق ہے۔" ابونصار نے تائید کی۔

"میرے لیے اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے کہ مغربی دشت کے آقا کا بکھاتر بھائی مجھ سے خوش ہے۔" میں نے مودب لہجے میں سر جھکا کر کہا۔

"تو درمیان میں نہ بول!" برقائی خاں بولا مگر اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی۔ "یہ میرا اور ابونصار کا معاملہ ہے۔" چند لمحے توقف کے بعد برقائی خان نے پھر کہا۔ "میں نے اسی وقت انعام کے بارے میں سوچ لیا تھا جب مجھے اطلاع ملی تھی کہ بوغا، مارکوف کی لاش لے کر آیا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنے حرم کی سب سے خوب صورت لونڈی، بوغا کو بخش دوں گا کیونکہ میں نے آج تک کسی منگول سردار کو یہ انعام نہیں دیا۔ اے ابونصار! بتا کیا میں نے ٹھیک سوچا تھا؟"

"ہاں اس سے بڑا انعام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ انعام اب تک صرف خاندان زریں کے افراد تک محدود تھا۔ یہ تیری وسیع النظری ہے کہ تو بوغا کو اس انعام سے نواز رہا ہے۔"

ابونصار کی بات سن کر میری آنکھوں میں تھمرو گھومنے لگی، حسین و پرہوس تھمرو جسے برقائی خاں نے اپنے حرم میں ڈال لیا تھا، اور پھر جسے بعد میں منگو خاں کو نذر کر دیا تھا۔ وہی تھمرو، وہی قاتل، وہی مجسم ہوس جس نے مجھے شکار کر لیا تھا اور وہی جو ملکہ روسودان کی بیٹی تھی۔ وہ نہ جانے اب کہاں ہو گی؟ میں سوچنے لگا۔

میں اس وقت اپنے خیالوں سے چونکا جب برقائی خاں نے مجھے مخاطب کیا۔ "بوغا! کیا تجھے ہمارا انعام پسند آیا؟"

میں احترام و عقیدت کے اظہار میں جھکا اور بولا۔ "تو نے میری عزت بڑھائی ہے، یوگدو تیری عزت بڑھائے۔"

اب یہ بتا کہ تو نے اس باغی کو کیسے نیچا دکھایا؟" برقائی خاں نے سوال کیا اور ابونصار بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی یقیناً "یہ بات جاننا چاہتا تھا۔

میں پہلے ہی اس سوال کا منتظر تھا اس لیے فوراً "وہ من گھڑت کہانی سنانے لگا جو میں نے قلعے کی طرف آتے ہوئے سوچ لی تھی۔ میں نے اس شب سے اپنی کہانی کا آغاز کیا جس شب مارکوف اور اس کے کچھ ساتھیوں کو قلعے سے فرار کرایا تھا۔

میں نے بتایا کہ اس شب میں کھانا کھا کر چہل قدمی کی غرض سے نکلا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا قید خانے کے میدان کی طرف جا نکلا اور وہاں میں نے اندھیرے میں چند سائے متحرک دیکھے۔ میں نے محافظوں کو آوازیں دیں مگر وہاں کوئی محافظ نہیں تھا۔ میدان میں مشعلیں روشن ہونا چاہیے تھیں جو نہیں تھیں۔ میں یہ دیکھ کر کھٹک گیا۔ پھر میں نے تاریکی ہی میں ان سایوں کو کمندیں ڈال کر قلعے کی دیوار پر چڑھتے دیکھا اور سمجھ گیا کہ قیدی فرار ہو رہے ہیں۔ میں بھاگتا ہوا قلعے کے دروازے تک پہنچا اور وہاں سے محافظوں کو ساتھ لے کر قلعے سے نکلا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ قیدی، فرار ہونے کے لیے شہر ہی کی طرف جائیں گے مگر بعد میں پتا چلا کہ انہوں نے فرار کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ میں شہر تک پہنچ گیا مگر فرار ہونے والوں کو نہ پا سکا۔ میں سمجھا کہ شاید وہ پہاڑوں کا رخ کر چکے ہیں۔ میں نے اسی لیے خود بھی پہاڑوں کا رخ کیا۔ وہاں ایک مقام پر میرے ساتھ موجود سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے کیونکہ وہ یہ سمجھے تھے کہ انہیں منحوس کیلتوں نے گھیر لیا ہے اور ایسا تھا بھی! خود میں بھی خوفزدہ ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں بھی وہاں سے بھاگا اور جلد بازی کے سبب راستہ بھول گیا۔ میں پہاڑوں کے درمیان چکراتا پھر رہا تھا کہ مارکوف کے

ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ مجھے مارکوف کے پاس لے گئے جو قلعے سے فرار ہو کر پہاڑوں میں پہنچ چکا تھا۔ مارکوف نے مجھے ایک غار میں قید کرا دیا جہاں میں کئی دن قید رہا اور پھر مجھے فرار کا موقع مل گیا۔ آج صبح ہونے سے کچھ قبل اس نے ان دو محافظوں کو قتل کر دیا جو غار پر پہرہ دیتے تھے۔ پھر مجھے ایک گھوڑا نظر آ گیا جو انہی محافظوں میں سے کسی کا تھا۔ میں نے محافظوں کو قتل کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ چیخ نہ سکیں تاکہ ان کے ساتھی بیدار نہ ہو جائیں۔ مارکوف کے ساتھی بے خبر سوتے رہے اور میں وہاں سے بھاگ نکلا مگر میں اس بات سے بے خبر تھا کہ راستے میں میرا ٹکراؤ مارکوف سے ہو جائے گا۔ مارکوف صبح دم غالباً" چہل قدمی کا عادی تھا اور اسی غرض سے نکلا تھا۔ میں غاروں سے کافی دور نکل آیا تا کہ اچانک ایک چٹان سے رسی کا پھندا اڑتا ہوا سا آیا اور میری کمر میں آ کر پھنس گیا' پھر میرے جسم کو جھٹکا لگا اور میں گھوڑے سے نیچے آ رہا۔ میں نے گرتے ہی خنجر سے رسی کو کاٹ دیا تھا۔ چٹان سے مجھ پر رسی کا پھندا پھینکنے والا مارکوف تھا جو چٹان سے اتر کر میرے مقابلے پر آ گیا۔ میں اور وہ کافی دیر تک ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے لڑتے رہے' پھر ایسی صورت پیش آئی کہ اس کی تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے میری طرف ایک بڑا سا پتھر لڑھکایا۔ میں اس کے نیچے دب گیا مگر جلد ہی اٹھ کھڑا ہوا اور مارکوف پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اپنی تلوار اٹھانے کے لیے جھکا تھا۔ میں اور وہ گتھم گتھا ہو گئے۔ اسی دوران میں مجھے خیال آیا کہ میں مارکوف کا خون بہا کر یا سائے چنگیزی کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ چھلانگ لگانے کے بعد اس سے نبرد آزما ہوتے وقت میری تلوار بھی گر چکی تھی۔ مارکوف اور میں دونوں ہی یہ کوشش کر رہے تھے کہ ہم میں سے کسی کو خنجر نکالنے کا موقع نہ ملے اور ہم دونوں ہی اس کوشش میں کامیاب رہے۔ جسمانی طور پر میں نے خود کو اس سے بہتر پایا اور میں اس پر حاوی آنے لگا۔ جب وہ تقریباً" نڈھال ہو کر گر پڑا تو میں نے اس کے سینے پر بائیں جانب گھونسوں کی بارش کر دی تاکہ اس کا دل دھڑکنا بند کر دے۔ پھر یہی ہوا کچھ دیر بعد ہی وہ مر گیا اور اس کا خون بھی نہ بہا! زخمی ہونے اور خون بہنے کے سبب میری حالت بھی غیر ہو چکی تھی۔ میں وہیں زمین پر لیٹ گیا اور پھر نہ جانے کب تک لیٹا رہا۔ میں شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب میرے حواس بحال ہوئے اور ہوش آیا تو ہر طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں ہمت کر کے اٹھا اور گھوڑے کو تلاش کیا جو کچھ دور ایک درے کے قریب مل گیا۔ پھر میں مارکوف کی لاش کو گھوڑے پر ڈال کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں اپنی من گھڑت کہانی سنا کر چپ ہو گیا۔ کہانی سناتے ہوئے میں نے اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کر دی تھیں۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ ابونصار نے کہا تھا' میرے جسم پر تلوار یا خنجر کا کوئی زخم نہیں۔ مجھے بہرحال اس بات کا خیال رکھنا تھا تاکہ مجھ پر کسی قسم کا شبہ نہ کیا جا سکے۔

میں نے محسوس کیا کہ میری کہانی سن کر ابونصار اور برقائی خان دونوں ہی بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے درمیان میں کوئی سوال نہیں کیا تھا حالانکہ میری کہانی میں بہت سی کمزوریاں تھیں۔ یہی بات ناقابل یقین سی تھی کہ میں مارکوف کے ساتھیوں کو قتل کر کے باآسانی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا مگر انہوں نے میری تمام باتوں پر یقین کر لیا تھا' جس کا اظہار ان کے چہروں سے بھی ہو رہا تھا۔ کہانی کی کمزوریوں کو غالباً" انہوں نے میری بہادری پر محمول کیا تھا۔

"اس میں شک نہیں کہ بوغا ذہین اور بہادر ہے مگر اس کے واقعات سن کر یہ بھی پتا چلتا ہے کہ قدرت اس کے ساتھ تھی۔" ابونصار نے اظہار خیال کیا۔

"مارکوف کی قید سے اب تک کوئی منگول سردار فرار نہ ہو سکا تھا مگر بوغا دوبارہ اس کی قید سے نکلا اور دوسری بار تو دشمن کی لاش بھی ساتھ لایا۔ آج رات اسے اس کی بھلائی کا انعام مل جائے گا اور تب یہ

جانے گا کہ انعام کسے کہتے ہیں!" برقائی خاں بھی بولا۔

کچھ دیر بعد برقائی خاں نے مجھے اور ابونصار کو رخصت کر دیا۔ ابونصار جب مجھے وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں لے کر پہنچا تو میں کچھ خوفزدہ سا ہو گیا کہ کہیں اس نے میرا جھوٹ تو نہیں پکڑ لیا! مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ مجھ سے ایک اور بات کرنا چاہتا تھا۔

"بوغا! جن منگول سرداروں کے پاس لونڈیاں ہیں یا شادی شدہ ہیں' ان کی رہائش قلعے کے ایک مخصوص حصے میں ہے۔" ابونصار مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ان کی الگ رہائش کا سبب یہ ہے کہ صرف ایک کمرہ ان کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔ اس حصے میں کمروں کی درمیانی دیواروں کو توڑ کر دروازے لگوا دیے گئے ہیں۔ کسی سردار کے پاس تین کمرے ہیں' کسی کے پاس چار اور کسی کی رہائش دو کمروں میں ہے۔ کمروں کی تعداد کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے ساتھ کتنے افراد ہیں! اب برقائی خان نے تجھے ایک لونڈی بخش دی ہے۔ تو کیا تو صرف ایک کمرے میں اس کے ساتھ گزارا کر سکے گا؟"

"اے ابونصار! میری خواہش ہے کہ میں تجھ سے قریب ہی رہوں' میں اس لونڈی کے ساتھ ایک کمرے میں بھی گزارا کر سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

میرا جواب سن کر ابونصار نے مجھے محبت آمیز نگاہ سے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "میں سمجھ رہا تھا کہ شاید اب تو مجھ سے الگ رہنا پسند کرے مگر میں غلط سوچ رہا تھا۔ ہر نوجوان ایک جیسا نہیں ہوتا۔" ابونصار بولا۔

جب سے میں قلعے میں آیا تھا میرے دل میں تجسس تھا کہ میرے جانے کے بعد کیا ہوا! مگر مجھے ابھی تک موقع نہیں مل سکا تھا کہ اس سلسلے میں کچھ معلوم کر سکتا۔ مجھے یہ موقع غنیمت نظر آیا۔ میں نے اصلی بات چھیڑنے کے لیے راہ ہموار کرنے کی غرض سے کہا۔ "اے ابونصار! مارکوف کے ان ساتھیوں کا کیا ہوا جو قلعے سے فرار نہ ہو سکے تھے اور گڑھوں ہی میں رہ گئے تھے؟"

ابونصار میری بات سن کر خلاف توقع چونک پڑا' پھر بولا۔ "بوغا! تجھے یہ کیسے پتا چلا کہ مارکوف کے تمام ساتھی فرار نہیں ہو سکے تھے؟"

میں ابونصار کے سوال پر پہلے تو چکرا گیا مگر پھر بہت جلد خود پر قابو پا لیا اور کہا۔ "کیا تو بھول گیا اے ابونصار کہ میں نے انہیں فرار ہوتے وقت دیکھا تھا۔ ان کی تعداد میرے اندازے کے مطابق زیادہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ میں نے قید کے دوران میں بھی سنا تھا کہ مارکوف قلعے سے صرف اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو سکا تھا۔" اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں نے ابونصار کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے سے اب اطمینان کا اظہار ہونے لگا تھا۔

"بوغا! دراصل ایک معما ایسا ہے جو اب تک حل نہیں ہو سکا۔" ابونصار ایک طویل سانس لے کر بولا' پھر اس نے اپنے خادم کے قتل کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "اس کی لاش ایک راہداری میں ملی تھی' ایک ستون کے پیچھے! اسے کس نے اور کیوں قتل کیا' آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کا قتل کسی سازش کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر ابونصار نے وہ باتیں جو پہلے ہی میرے علم میں تھیں بتائیں۔ کیونکہ ابونصار جس سازش کی طرف اشارہ کر رہا تھا' وہ میرے ذہن کی پیداوار تھی۔ ابونصار کہہ رہا تھا۔ "اسے کسی نے صرف اس لیے قتل کیا ہو گا کہ سازش پر پردہ پڑا رہے۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آ سکی کہ اس نے قید خانے کے محافظوں سے جھوٹ کیوں بولا! اس نے محافظوں سے یہ کیوں کہا کہ میں ان سب کو بلا رہا ہوں! پھر وہ قتل کر دیا گیا۔ اسی شب محافظوں کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر کوئی فرد وہاں پہنچا' بہت سے افراد قید خانے کے میدان تک پہنچ گئے اور انہوں نے قیدیوں کو گڑھوں سے نکلنے میں مدد دی۔"

"تو یہ بات اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتا ہے کہ کوئی فرد قید خانے کے میدان تک پہنچا یا بہت سے

افراد نے قیدیوں کو فرار ہونے میں مدد دی؟" میں نے ابونصار کو ٹٹولا۔

"اس لیے کہ مارکوف اور اس کے ساتھی خود چاہتے تو ان گڑھوں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ جب تک کوئی گڑھوں پر رکھے ہوئے لوہے کے جال نہ ہٹاتا یا کسی طرح انہیں گڑھوں سے نکلنے میں مدد نہ دیتا' وہ فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے بعد میں خود ان گڑھوں کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔" ابونصار نے کہا۔ "میرا خیال یہ ہے کہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت محافظوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا اور اس کے لیے سازش کرنے والوں نے میرے خادم کو استعمال کیا' پھر مارکوف اور اس کے ساتھیوں کو فرار کرانے میں مدد دی گئی گزرے ہوئے حالات ان باتوں کے گواہ ہیں۔ معما صرف یہ ہے کہ سازشی کون تھے یا تھا؟"

"اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے ابونصار کے خاموش ہوتے ہی کہا۔ "قید خانے کے میدان میں اس وقت تاریکی تھی جب میں نے مارکوف اور اس کے ساتھیوں کو فرار ہوتے دیکھا تھا۔ ممکن ہے کہ اس وقت میدان میں وہ سازشی بھی کہیں موجود رہے ہوں۔" میں نے ابونصار کے ذہن کو دوسروں کی راہ پر ڈالنا چاہا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے۔ یقیناً" اس وقت وہ سازشی وہاں رہے ہوں گے لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ اتنی جلدی غائب بھی ہو گئے کیونکہ محافظوں کا بھی یہی بیان ہے کہ جب وہ میرے حکم پر دوڑتے ہوئے واپس وہاں پہنچے تو انہوں نے قیدیوں کو کمندیں ڈال کر فرار ہوتے دیکھا تھا۔ بہرحال جو بھی ہوا ہو' اب تو یہ قصہ ہی ختم ہو چکا ہے۔" ابونصار طویل سانس لے کر بولا۔

"مارکوف کی موت کے بعد اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ وہ یہاں کے شاہی خاندان کا آخری فرد تھا جو زندہ بچ گیا تھا۔ اب مقامی باشندے کسی کے لیے نہیں لڑ سکتے اور نہ سازشیں کر سکتے ہیں۔"

"تو کیا اب مارکوف کے ان ساتھیوں کو بھی رہا کر دیا جائے گا جو قید میں ہیں؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پھر وہی سوال کیا جس سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

"وہ سب کل رات ہی رہا کر دیے گئے تھے۔" ابونصار عجیب سے لہجے میں بولا۔

مجھے ابونصار کی بات سن کر سخت حیرت ہوئی مگر میں کچھ بولا نہیں کیونکہ ابونصار کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ابھی کچھ اور کہنے والا ہے اور وہی ہوا ابھی!

گزشتہ روز جب برقائی خاں یہاں پہنچا تھا اور اسے حالات سے مطلع کیا گیا تھا تو اس نے پہلا حکم یہی دیا تھا کہ مارکوف کے ساتھیوں کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیا جائے۔ سو وہ آزاد ہو گئے' رہا کر دیے گئے۔" یہ کہہ کر ابونصار خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ افسردہ سا نظر آنے لگا تھا۔

پھر مجھے ایک بات کا اور خیال آیا جو مجھے ابونصار سے دریافت کرنا تھی۔ جب میں اس کے ہمراہ برقائی خاں سے ملنے جا رہا تھا تو قلعے میں مقامی باشندوں کو بھی دیکھا تھا حالانکہ پہلے ابونصار نے قلعے میں ان کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی تھی۔

"مقامی باشندوں کے متعلق تو نے جو حکم لگایا تھا' کیا وہ واپس لے لیا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ حکم وقتی تھا اور صرف تیری حفاظت کے لیے!" ابونصار نے جواب دیا۔ "جب تو قلعے سے چلا گیا اور پہاڑوں میں تلاش بسیار کے باوجود بھی نہ ملا تو مجھے مزید تصور کر لیا گیا۔ اس کے بعد وہ حکم بے معنی ہو کر رہ گیا تھا اس لیے میں نے واپس لے لیا۔"

"تو کیا مجھے پہاڑوں میں تلاش بھی کرایا گیا تھا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں!" ابونصار نے اثبات میں سر ہلایا۔ "سپاہی تجھے جہاں چھوڑ کر بھاگ آئے تھے' دوسرے دن پھر وہیں پہنچے تھے مگر ظاہر ہے کہ تو وہاں سے جا چکا تھا اور مارکوف کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ پھر تو انہیں وہاں کس طرح ملتا! اچھا اب جا اور آرام کر! یوں بھی اب رات ہونے والی ہے۔ تجھے کچھ دن آرام کی ضرورت ہے کیونکہ تو زخمی ہے۔ میں کل صبح پھر تیرے زخموں پر دوا لگا دوں گا۔"

میں اب خود بھی آرام کی ضرورت محسوس کر رہا تھا اس لیے ابونصار کا اشارہ پاتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے میرے ذہن میں اس انعام کا خیال بھی تھا جو اس شب مجھے برقائی خان کی طرف سے ملنے والا تھا' انعام یعنی اس کے حرم کی سب سے خوب صورت لونڈی! اس انعام کی پزیرائی میں بھی مجھے اس شب کا کچھ حصہ بیدار رہ کر گزارنا تھا اس لیے ضروری تھا کہ میں کچھ دیر آرام کر لیتا۔

میں ابونصار کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ پہلے ہی کی طرح میرے دونوں خادم کمرے کے دروازے پر موجود تھے۔ وہ مجھے اپنی جانب آتا دیکھ کر مودب و مستعد نظر آنے لگے۔ میں نے قریب پہنچ کر ان میں سے ایک کو کھانا اور ساتھ ہی چاول کی شراب لانے کا حکم دیا' پھر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں بستر پر دراز ہونے والا تھا کہ میری نگاہ شراب کے ایک برتن پر پڑی جو ایک طرف دیوار کے قریب رکھا ہوا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ اس برتن میں وہی زہریلی شراب تھی جو میں کلہاڑے برداروں کو پلانا چاہتا تھا مگر حالات نے کچھ اور ہی رخ اختیار کر لیا تھا۔ میں اس زہریلی شراب سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا تھا۔ اب اس زہریلی شراب کا میرے کمرے میں موجود رہنا خطرناک تھا کیونکہ اس کمرے کی تنہائی کو آباد کرنے والی ایک اور ہستی بھی اسی شب آنے والی تھی۔ مجھے شراب کا وہ برتن دیکھ کر سیوری یاد آگئی جس نے مجھے کبھی اپنے قرب سے ہمکنار کیا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھ کر وہ برتن ہاتھ میں لے لیا' پھر خادم کو آواز دی۔

"اسے لے جا کر کہیں پھینک دے!" خادم کمرے میں آگیا تو میں نے اسے حکم دیا۔

خادم نے شراب کا برتن لیا اور چلا گیا۔

دوسرا خادم کچھ دیر بعد ہی مطبخ سے کھانا اور شراب لے کر آگیا۔

میں نے کھانا کھانے کے بعد شراب کے چند گھونٹ ہی لیے تھے کہ میرا ایک خادم کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ برقائی خاں کے قشق کا تومان باشی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ خادم نے یہ اطلاع بھی دی کہ تومان باشی کے ساتھ ایک حسین عورت بھی ہے۔

"ان دونوں کو ہی اندر آنے دو!" میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

خادم الٹے پاؤں لوٹ گیا' اور پھر چند ہی لمحے بعد جیسے میرا کمرہ روشن ہو گیا' مزید روشن! تومان باشی کے ساتھ آنے والی عورت بے حد حسین تھی۔ میں سمجھ گیا کہ میرا انعام مجھ تک پہنچ گیا ہے اور یہ کہ برقائی خاں نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس عورت کے چہرے سے جیسے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس کی نگاہ نیچی تھی اور وہ میرے سامنے مودب کھڑی ہوئی تھی۔ وہ شاید اس عورت کے حسن کا سحر ہی تھا کہ میں کوشش کے باوجود چند لمحے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میں چونکا اس وقت جب مجھے تومان باشی نے مخاطب کیا۔ "مجھے برقائی خاں نے حکم دیا تھا کہ تیرے انعام کو بحفاظت تجھ تک پہنچا دوں۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا' اب مجھے جانے کی اجازت دے۔"

میں پھر بھی کچھ نہ بول سکا اور سر کے اشارے سے تومان باشی کو جانے کی اجازت دے دی۔

تومان باشی چلا گیا اور کمرے کا دروازہ بھی بند ہو گیا مگر میں اس عورت کو دیکھتا ہی رہا۔ ہر چند کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑی دکھائی دے رہی تھی لیکن تھی بڑی بھرپور! میں نے پہلے بھی کئی حسین عورتیں دیکھی تھیں مگر وہ ان سب سے مختلف تھی جو نہ تیھمرو میں تھی' نہ اس کی ماں ملکہ روسودان میں' نہ اختی میں اور نہ سیوری میں! اسے بس دیکھے جانے کو جی چاہتا تھا۔ دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی کہ گھسیٹ کر قریب بٹھا لیا جائے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اگر میں نے اسے چھو لیا تو تمام سحر ٹوٹ جائے گا۔ وہ ابھی تک اسی طرح کھڑی ہوئی تھی اور میں نے اس سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ برقائی خاں کی بجائے آج سے
مجھ پر تیرا حق ہے۔" میں نے پہلی بار اس کی آواز سنی
اس میں بڑی مٹھاس تھی۔ "کیا تو مجھ پر اپنا حق نہیں
جتائے گا اور مجھے اپنی خدمت کا موقع نہیں دے گا؟"
"بیٹھ جا، میرے قریب آکر بیٹھ جا!" میں بمشکل اتنا
ہی کہہ سکا۔
وہ میرے قریب آبیٹھی۔ اب اس کا چہرہ میرے رو
برو نہیں تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ میں نے بہت جلد
اپنے حواس پر قابو پالیا۔
"تیرا نام کیا ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر
سوال کیا۔
"نسطری!" اس نے جواب دیا۔
"تیرے چہرے کے نقوش سے پتا چلتا ہے کہ تو
منگول نہیں اور مغربی دشت ہی کے کسی شہر کی ہے۔"
"تیرا خیال درست ہے بوغا!" اس نے کہا۔
"تو میرا نام بھی جانتی ہے!" میں حیرت سے بولا۔
"یہاں بھیجے جانے سے پہلے مجھے تیرا نام بتا دیا گیا
تھا۔" یہ کہہ کر اس نے شراب کے برتن کی طرف
ہاتھ بڑھایا۔
"کیا تو بھی شراب پیے گی؟"
"نہیں! تجھے اپنے ہاتھ سے پلاؤں گی۔" اس نے
پیالے میں شراب انڈیلتے ہوئے جواب دیا۔
میں نے اب تک صرف چند گھونٹ پی تھی۔ پیالہ
ابھی نصف بھی خالی نہ ہوا تھا کہ اس نے دوبارہ لبریز کر
دیا۔ مجھے اس وقت قطعی نشہ نہیں ہوا تھا مگر اس کی بات
سن کر یوں لگا جیسے میں ڈھیر ساری شراب پی گیا ہوں۔
ابھی تک میں نے کسی عورت کے ہاتھ سے نہیں پی
تھی اسی لیے مجھے یہ بات بڑی لذت انگیز محسوس
ہوئی۔
پھر یوں ہوا کہ وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے پلائے گئی
اور میں پیے گیا، اس کی آنکھوں سے بھی اور اس کے
ہاتھوں سے بھی! نشہ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ نشے نے
مجھ میں بیباکی پیدا کر دی تھی اور اب مجھ میں پہلے جیسی
جھجک نہیں رہی تھی۔ اب میرا دل چاہنے لگا تھا کہ میں
اسے پوری طرح برتوں مگر پیالہ خالی ہوتے ہی وہ دوبارہ
اسے بھر کر میرے ہونٹوں سے لگا دیتی تھی۔
"بس کر..... بس!" میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے
بمشکل کہا کیونکہ نشے کی زیادتی کے سبب میری زبان
لڑکھڑا رہی تھی۔
"ابھی تو نے پی ہی کتنی ہے بوغا!" وہ پھر میرے
ہونٹوں کی طرف پیالہ بڑھانے لگی۔
"نن..... نہیں..... نہیں!..... میں اب نہیں پیوں
گا....." میں نے اس کا نام لینا چاہا مگر یاد نہ آسکا۔ "آ
اب سو..... سو جائیں!" یہ کہہ کر میں نے اپنا دایاں ہاتھ
اس کی کمر میں ڈالنا چاہا۔
میں نے دیکھا کہ اس نے شراب کا پیالہ رکھ دیا اور
پھر اس نے اچانک ہی خلاف توقع مجھے دھکا دیا تھا۔
نشے کے سبب میں اپنا جسم نہ سنبھال پایا اور ایک
طرف لڑھک گیا۔ شراب میرے حواس پر پوری طرح
قبضہ جما چکی تھی اور میرا سر گھوم رہا تھا۔ میرے لڑھکتے
ہی اس نے میری کمر سے خنجر کھینچ لیا تھا۔
"تو مارکوف کا قاتل ہے، ہماری آخری امید کا قاتل
!" مجھے اس کی آواز اس طرح سنائی دے رہی تھی جیسے
کہیں بہت دور سے آرہی ہو۔ "میں جانتی ہوں کہ
مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا مگر اس کے باوجود
میں تجھے ضرور قتل کروں گی۔" یہ کہتے ہی وہ مجھ پر
جھپٹ پڑی۔
میری آنکھوں میں موت ناچ گئی۔ میں نے اس کا
ہاتھ اٹھتے دیکھا اور اس کے حملے سے بچنے کی خاطر اپنا
ہاتھ آگے بڑھایا۔ خنجر میری کلائی کے گوشت میں اتر
گیا اور اسی کے ساتھ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔
اس نے تیزی سے خنجر کھینچ لیا۔ میں نے اٹھنا چاہا مگر
نہ اٹھ سکا۔ وہ مجھ پر چھائی ہوئی تھی۔ میں نے خنجر کو پھر
بلند ہوتے دیکھا۔ اس بار خنجر کا رخ میرے سینے کے
بائیں جانب تھا۔ میرے دائیں ہاتھ کی کلائی سے خون
بہہ رہا تھا اور موت مجھ سے بہت قریب تر تھی۔

موت کو خود سے اس قدر قریب دیکھ کر نشے کے باوجود میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے' شاید یہی سبب تھا کہ فیصلہ کن لمحے آنے سے پہلے مجھے کچھ ہوش آگیا۔ پھر اس سے پہلے کہ خنجر کی نوک میرے سینے تک پہنچ جاتی میرے بائیں ہاتھ کی گرفت میں اس کی کلائی آ گئی۔ میں نے آہستہ آہستہ زور لگا کر اس کی کلائی کو اٹھانا شروع کیا۔ لمحہ لمحہ میرے سینے اور خنجر کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔

اسی وقت معاً" ابونصار کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ میں نے پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ اس کے چند لمحے بعد ہی کمرے کا دروازہ کھلا مگر میں نے اس طرف نہیں دیکھا کیونکہ میری نگاہ خنجر کی نوک پر جمی ہوئی تھی۔

میرے کمرے میں داخل ہونے والا ابونصار ہی تھا جو غالباً" اندر آتے ہی صورت حال کی نزاکت کو سمجھ گیا۔ میں نے اسے جھپٹ کر نسطوری کے دراز گیسو پکڑتے ہوئے دیکھا اور پھر اس نے ایک جھٹکے سے نسطوری کو پیچھے کی طرف گھسیٹ لیا۔ اس وقت نسطوری کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ نسطوری جیسے ہی ایک طرف گری' ابونصار کے پیر کی ٹھوکر اس کی کلائی پر پڑی۔ نسطوری کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ کر دور جا گرا اور وہ دوبارہ چیخ اٹھی۔

میں دونوں کہنیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس بار بہت سے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وہ تین مسلح محافظ تھے جو دوڑتے ہوئے' میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ غالباً" پے در پے کئی چیخیں سن کر ادھر دوڑے تھے۔

نسطوری ایک طرف فرش پر پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔ اس کی کلائی پر شاید ابونصار کی بھرپور ٹھوکر پڑی تھی۔

"اسے یہاں سے لے جاؤ اور سخت پہرے میں رکھو!" ابونصار نے محافظوں کو حکم دیا۔ "اس کا فیصلہ کل صبح خود برقائی خاں کرے گا۔"

ابونصار کا حکم سن کر محافظوں نے نسطوری کو جکڑ لیا۔

"رحم' رحم اے ابونصار!" نسطوری گڑگڑائی۔

"رحم کو آواز نہ دے!" ابونصار سخت لہجے میں بولا۔ "رحم ظالموں پر نہیں مظلوموں پر کیا جاتا ہے اور تو ایک بے گناہ کا خون بہا کر ظلم کی مرتکب ہو رہی تھی۔"

"ظالم منگول ہیں یا ہم جنہوں نے ہماری زمین پر قبضہ۔۔۔"

"خاموش ہو جا!" ابونصار نے نسطوری کی بات کاٹ دی' پھر محافظوں کو اشارہ کیا۔ "لے جاؤ اسے!"

یہ کہہ کر ابونصار نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

نسطوری چیختی چلاتی رہی اور محافظ اسے گھسیٹ کر وہاں سے لے گئے۔ میں اب اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ چکا تھا اور میرا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔

"اگر تیرے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہوتا تو شاید تجھے نہ بچایا جا سکتا۔" ابونصار مجھ سے مخاطب ہوا' پھر کسی قدر توقف سے بولا۔ "مگر یہ سب ہو کیسے گیا؟ وہ تجھ پر کس طرح حاوی آ گئی؟ کیا تو نے نشہ کیا تھا؟ تیری آنکھیں سرخ نظر آ رہی ہیں!"

میں نے جواب میں ابونصار کو سب کچھ بتا دیا۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے بھی میری زبان لڑکھڑا رہی تھی مگر اس کے باوجود میں نے اسے کسی نہ کسی طرح سارے حالات بتا دیے۔

"تیری باتیں سن کر ایک الجھن پیدا ہو گئی۔" ابونصار بولا۔ "اگر وہ مارکوف سے ملی ہوئی تھی تو اس نے اب تک برقائی خاں کو کیسے بخش دیا تھا! وہ اسے بھی تو ہلاک کر سکتی تھی۔ اسے موقع تو ملا ہی ہو گا!"

"برقائی خاں کو قتل کر کے وہ کسی صورت زندہ نہیں بچ سکتی تھی جب کہ مجھے قتل کرنے کے بعد وہ یہاں سے فرار بھی ہو سکتی تھی۔" میں نے کہا۔ اب میں بڑی حد تک اپنے نشے سے بوجھل ذہن پر قابو پا

پکا تھا۔

"تو غالباً" یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ مرنے سے ڈرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں۔ اگر اسے اپنی موت کا اتنا ہی ڈر ہوتا تو تجھ پر قاتلانہ حملہ نہ کرتی۔" ابونصار نے میرے خیال کو رد کر دیا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ مارکوف سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہ رہا ہو!" میں نے کہا۔

"ممکن ہے کہ تیرا خیال درست ہو اور تیرے اوپر قاتلانہ حملہ محض انتقامی جذبہ رہا ہو۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ مارکوف کو تو نے قتل کیا ہے۔ قلعے میں موجود تمام ہی افراد اس سے واقف ہو چکے ہیں۔ اسے بھی پتا چل گیا ہو گا اور جب اسے یہ بتایا گیا ہو گا کہ اسے بطور انعام تیرے سپرد کیا جا رہا ہے تو اس نے تیرے قتل کا منصوبہ سوچ لیا ہو گا لیکن یہ سب کچھ یقینی نہیں۔ ممکن ہے کہ اصل بات کچھ اور ہو۔" یہ کہہ کر ابونصار کچھ دیر خاموش رہا' پھر خود ہی بولا۔

"اچھا تو اب سو جا! میں چلتا ہوں۔"

ابونصار دروازے کی طرف بڑھا اور مجھے دروازہ بند کرنے کے لیے کہا۔

میں نے دروازہ بند کیا' پھر دریچے کی طرف دیکھا جو اندر سے بند تھا۔ اس کے بعد میں بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سو جانا چاہا مگر نشے کے باوجود مجھے فوراً نیند نہ آ سکی۔

حالات نے اب ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ نسطوری کے قاتلانہ حملے نے میرے دل میں نئے شبہے اور اندیشے پیدا کر دیے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ حالات نے مجھے مارکوف کا قاتل ثابت کر دیا تھا جب کہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ نسطوری کا مارکوف سے براہ راست تعلق رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن یہ طے تھا کہ وہ محب وطن تھی اور اسے مارکوف سے قلبی لگاؤ تھا۔ جو پہلا خطرہ میرے ذہن میں بیدار ہوا وہ یہ تھا کہ اب مقامی باشندے میری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ وہ اپنی زندگی کی پروا کیے بغیر مجھے قتل کرنا چاہیں گے جیسا کہ نسطوری نے کیا۔ میرے لیے اب ایک نیا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ مارکوف کے وہ ساتھی جو پہاڑوں میں آباد تھے' وہ بھی مجھے غدار اور مارکوف کا قاتل ہی سمجھیں گے۔ مارکوف کی موت کے بعد اب ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا' اور پھر نہ جانے کب میں سو گیا۔

صبح میں بیدار ہوا تو ایک اور حادثہ میرا منتظر تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ ناشتہ کر کے ابونصار کے کمرے میں چلا جاؤں۔ یہ سوچ کر میں نے دروازہ کھولا کہ خادموں کو ناشتہ لانے کے لیے کہوں مگر وہ دونوں ہی غائب تھے جب کہ انہیں اس وقت تک وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے ان کی لاپروائی پر غصہ آیا اور کمرے سے نکلا تاکہ انہیں ڈانٹ سکوں۔ ان کا قیام برابر والے کمرے ہی میں تھا جس کا دروازہ اب تک بند تھا۔ گویا وہ اب تک سو رہے ہیں! میں نے غصے سے سوچا اور اس طرف بڑھا۔

میں نے پہلے ان کے دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دی' پھر جب دروازہ نہ کھلا تو اسے زور زور سے پیٹنے لگا۔ ان کے کمرے کا دریچہ کھلا ہوا تھا۔ میں غصے کے عالم میں بڑھا اور دریچے سے اندر جھانکا۔

دریچے سے جھانکتے ہی میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا کہ وہ بروقت کیوں بیدار نہ ہو سکے تھے اور انہوں نے دروازہ کیوں نہیں کھولا تھا!

وہ دونوں کمرے کے فرش پر بے سدھ پڑے تھے اور ان کے منہ سے جھاگ بہہ رہے تھے' ان کے قریب ہی فرش پر شراب کا ایک برتن اور دو پیالے رکھے ہوئے تھے۔ وہاں شراب کا وہی برتن رکھا ہوا تھا جو گزشتہ شب میں نے اپنے ایک خادم کو دیا تھا کہ اسے پھینک آئے۔ یہ وہی برتن تھا جس میں زہریلی شراب تھی۔ خادم اسے پھینکنے کی بجائے اپنے کمرے میں رکھ آیا ہو گا۔ میں نے سوچا۔ پھر جب رات کو وہ دونوں اپنے کمرے میں پہنچے ہوں گے تو مفت کی شراب اڑانے بیٹھ گئے ہوں گے۔

شراب کا وہ برتن خادموں کے کمرے میں پایا جانا غلط تھا۔ اس ساخت کے مخصوص برتن صرف منگول

سرداروں کے استعمال میں رہتے تھے۔ پھر یہ کہ اس میں زہریلی شراب بھی ہو سکتی تھی' یہ امکان تھا کہ وہ دونوں اس میں سے زیادہ شراب نہ پی سکے ہوں۔ وہ دونوں میرے خادم تھے اس لیے یہی سمجھا جاتا کہ زہریلی شراب کا وہ برتن انہوں نے میرے کمرے ہی سے چرایا ہو گا۔ یہ بات سامنے آنا میرے حق میں بہرحال بہتر نہیں تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے خادم کو شراب کا برتن دینے کی بجائے زہریلی شراب خود ہی موری میں کیوں نہ بہادی!

میں نے چند ہی لمحوں میں ان تمام باتوں پر غور کر لیا۔ صبح دم راہداری میں آمد و رفت نہیں تھی۔ ابونصار کا کوئی خادم بھی اس کے کمرے سے باہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید ابونصار نے انہیں کسی کام سے بھیجا ہو گا۔ موقع غنیمت جان کر میں دریچے پر چڑھ گیا۔

خادموں کے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے شراب کا برتن اٹھا لیا۔ اس میں واقعی شراب موجود تھی۔ میں نے غلط نہیں سوچا تھا۔ شراب کے دونوں پیالے بالکل خالی تھے۔

میں نے شراب' موری میں بہادی' پھر دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

شراب کا برتن اپنے کمرے میں رکھنے کے بعد میں پھر کمرے سے نکلا۔

جب میں ابونصار کے کمرے میں پہنچا تو وہ مصروف عبادت تھا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ خادموں کے بارے میں ابونصار کو کچھ بتاؤں یا نہیں! پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اسے بتانا ہی بہتر ہے۔

میں جانتا تھا کہ ابونصار عبادت کے دوران نہیں بولتا اس لیے اس وقت خاموش رہا جب تک وہ فارغ نہ ہو گیا۔

"تیرے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہو رہا ہے۔" ابونصار نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اے ابونصار! بات کچھ ایسی ہی ہے۔" میں نے طویل سانس لیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے شفقت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"میرے دونوں خادم مر چکے ہیں۔" میں نے بتایا۔

"انہیں دیکھ کر یہ پتا چلتا ہے کہ انہیں زہر دیا گیا ہے کیونکہ ان کے منہ سے جھاگ بہہ رہے ہیں۔"

"مجھے پوری بات بتا!" ابونصار نے کہا۔

"جب میں نے ان دونوں کو حسب معمول کمرے کے باہر نہ پایا تو مجھے ان پر غصہ آیا۔ میں نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ جب دروازہ نہ کھلا تو میں نے دریچے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ دونوں کمرے کے فرش پر بے سدھ پڑے تھے اور ان کے منہ سے جھاگ بہہ رہے تھے۔ میں دریچے سے کمرے میں کودا۔ قریب جا کر دیکھا تو وہ مردہ تھے۔ پھر میں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

"پے در پے عجیب واقعات ہو رہے ہیں۔" ابونصار خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا چکر ہے! میرے خادم کا پراسرار قتل اور قاتل لاپتا! اس کے بعد اب تیرے خادموں کو زہر دیا گیا ہے' پھر یہ کہ گزشتہ شب تجھ پر قاتلانہ حملہ بھی ہو چکا ہے۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا لیکن اب حالات میں وہ قدم شاید مناسب نہیں ہو گا۔"

"تو نے کیا سوچا تھا اے ابونصار؟" میں نے اس بات میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

ابھی وہ میری بات کا جواب بھی نہ دے پایا تھا کہ اس کا ایک خادم ناشتہ لے آیا۔ وہ ناشتہ رکھ کر جانے والا تھا کہ ابونصار نے اسے مخاطب کیا۔ "بوغا۔ دونوں خادموں کی لاشیں' ان کے کمرے میں پڑی ہیں۔ انہیں کسی نے زہر دے دیا ہے یا انہوں نے ہی زہر کھا لیا ہے' ان کی لاشیں وہاں سے اٹھوا جائیں اور دو نئے خادموں کو ان کی جگہ بھیج جائے۔"

"کیا تو ان لاشوں کو نہیں دیکھے گا اے ابونصار" میں نے کہا کیونکہ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ خادموں

کمرے میں ضرور جائے گا۔

"انہیں دیکھنے سے حاصل بھی کیا ہے! تو نے ان کی کیفیت بیان کی ہے' اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ ان کی موت زہر ہی سے ہوئی ہے۔" ابونصار نے جواب دیا اور اسی کے ساتھ خادم کو جانے کا اشارہ کیا۔ میری بات سن کر رک گیا تھا۔

خادم چلا گیا تو میں نے اپنا پہلا سوال پھر دہرایا کہ ان نے کیا سوچا تھا؟

"آ پہلے کچھ کھا پی لے! باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔" ابونصار نے کھانے کا طباق اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

ناشتے میں ابلا ہوا گوشت اور گھوڑی کا دودھ تھا۔ دونوں چیزیں اتنی تھیں کہ ابونصار اور میں سیر ہو گئے۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد مجھے پھر اپنا سوال دہرانا پڑا۔ ابونصار خود میرے سوال کا جواب دینے لگا۔ اس نے کہا۔ "میں نے عام معافی کے بارے میں سوچا تھا۔"

"عام معافی!" میں اس کی بات نہ سمجھ پایا۔

"میں نے سوچا تھا کہ میں برقائی سے کہوں گا کہ وہ مقامی باشندوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دے۔" ابونصار وضاحت کرنے لگا۔ "دراصل مارکوف کی موت کے بعد اب یہ مسئلہ میری نظر میں اہمیت کا حامل نہیں رہا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مارکوف کے اہلِ وطن اور منگولوں کے درمیان جو نفرت کی دیوار حائل ہے' اسے گرا دیا جائے۔ مارکوف کے وہ ساتھی جو پہاڑوں میں روپوش ہیں' آبادیوں کی طرف لوٹ آئیں اور ایسا اسی وقت ممکن ہے جب عام معافی کا اعلان کر دیا جائے۔"

"تو پھر سوچنا کیا ہے اور اب تیری رائے کیوں بدل رہی ہے؟" میں بولا۔

"حالات کے پیشِ نظر!" ابونصار نے جواب دیا۔ "مارکوف مر گیا مگر ابھی تک سازشیں جاری ہیں۔"

"یہ ساری باتیں وقتی بھی ہو سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے اب کسی اور طرف سے نہیں' صرف تیری جانب سے فکر ہے۔ میں انہیں یہ موقع نہیں دینا چاہتا کہ وہ مارکوف کے قتل کا انتقام لے سکیں۔" ابونصار بولا۔

ابونصار کا ذہن بھی اسی راہ پر لگ گیا تھا جس تک میرا ذہن گزشتہ رات ہی پہنچ چکا تھا۔ مقامی باشندے منگولوں کے دشمن تھے اور میں بھی مگر میں بظاہر منگولوں کے ساتھ تھا اس لیے ان کی نفرت کا مستحق ٹھہرا تھا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ وہ مجھے غدار سمجھ سکتے تھے مگر میرے دل میں بہرحال ان کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ میں نے اسی لیے ابونصار کو عام معافی کا حکم دے جانے پر ہموار کرنا چاہا۔

"فی الحال اس ذکر کو چھوڑ!" ابونصار میری بات سن کر بولا۔

"صرف میری خاطر تو اپنے خیالوں کو نہ بدل" میں نے مزید کہا۔

"اگر تو میری طرف سے اتنا ہی فکر مند ہے تو میری حفاظت کا بندوبست کر دے۔"

"لیکن تجھے ہر وقت تو کمرے میں بند نہیں رکھا جا سکتا اور تجھ پر پہرہ نہیں بٹھایا جا سکتا۔ یہ تو ایک طرح کی قید سی ہو جائے گی۔" ابونصار نے کہا۔

"لیکن کمرے ہی میں قید رہنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں بولا۔

"کیا تو بھول گیا کہ قلعے میں بھی ہر وقت مقامی باشندے رہتے ہیں! کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کون کب اپنی جان کی پروا کیے بغیر تجھ پر قاتلانہ حملہ کر دے!" ابونصار نے اپنی بات کی وضاحت میں کہا۔

"میں خود بھی تو چوکنا رہ سکتا ہوں۔"

"خیر یہ مسئلہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو میں برقائی خاں سے ملنے جا رہا ہوں' بعد میں مجھ سے آ کر بات ہو گی۔ میری واپسی تک تو یہیں رہ اور باہر نہ جا!" ابونصار اٹھتا ہوا بولا۔

ابونصار چلا گیا اور میں اس کے کمرے میں تنہا رہ گیا۔ اس نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا' وہ غلط

نہیں تھے۔ میری زندگی کو واقعی خطرہ ہو سکتا تھا مگر یہ خود غرضی ہوتی کہ میں خود اپنے ہی دوستوں کی زندگی اجیرن کر دیتا۔ ابونصار کے اختیارات سے اب میں اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ اس کے لیے یہ مشکل نہیں تھا کہ وہ دوبارہ مقامی باشندوں پر پابندیاں لگوا دیتا اور وہ قلعے میں داخل نہ ہو پاتے۔

ابونصار یقیناً" ایک نیک دل شخص تھا جو مقامی باشندوں کو عام معافی دیے جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس طرح مقامی باشندوں کو بہت سی مراعات حاصل ہو سکتی تھیں۔ عام معافی کے بعد ان کی حیثیت غلاموں جیسے نہ رہتی اور زندگی ان کے لیے نسبتاً" آسان ہو جاتی۔ میں اپنے خیالوں میں گم تھا کہ ایک خادم کے قدموں کی چاپ گونجی۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہ اٹھائی۔ اس نے احتراماً" جھک کر بتایا کہ برقائی خاں نے مجھے طلب کیا ہے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ دیر بعد ہی برقائی خاں کے روبرو موجود تھا۔ اس کی مسند کے قریب ہی دائیں جانب ابونصار بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ برقائی خاں کے پاس کوئی نہیں تھا۔

"مجھے دکھ ہے بوغا کہ میں نے تجھے انعام میں موت دینا چاہی۔" برقائی خاں نے مجھے مخاطب کیا۔

"اے بگھاتر بھائی کے بگھاتر بھائی! تو ملول نہ ہو۔ تیرے خادم نے گزشتہ روز بھی یہی عرض کیا تھا کہ اسے تیری خوشنودی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔" میں برقائی خاں کے چپ ہوتے ہی بولا۔

"نہیں، صرف میری خوشنودی تیرا انعام!" برقائی خاں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "بول، تو خود اپنے منہ سے بول کہ تجھے کیا چاہیے؟"

میرے جی میں آیا کہہ دوں کہ مجھے تمام خاندان زریں کے سر چاہیں مگر مجھے ابھی زندہ رہنا تھا اس لیے اپنے دل کی بات زبان پر نہ لایا۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ یہ بھی تو انتقام ہی کی ایک صورت ہے! میں نے سوچا اور کہا۔

"مغربی دشت کے آقا کا بھائی اگر اسی طرح خوش ہو سکتا ہے کہ میں اس کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کروں تو مجھے تعمیل حکم سے انکار نہیں۔"

میرا جواب سن کر ابونصار نے مجھے حیرت سے دیکھا اور اس وقت برقائی خاں کی بھاری آواز بلند ہوئی۔ "مانگ کیا مانگتا ہے۔ تو میرے دل کو تنگ نہ پائے گا۔"

"تو اپنی خوشی کی خاطر مجھے کوئی دوسری لونڈی بخش دے مگر وہ لونڈی منگول ہو۔" میں نے ہمت کر کے یہ بات کہہ دی جسے کہتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

"منگول لونڈی!" برقائی خاں بڑبڑایا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر بلند آواز میں بولا۔ "اب تک خاندان زریں کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں دیا گیا تھا کہ وہ کسی منگول عورت کو لونڈی بنا کر رکھ سکے لیکن اگر تو یہی چاہتا ہے تو پھر تیری خواہش ضرور پوری ہو گی۔ قانون تو وہی ہے جو میری زبان سے نکلے۔"

"بوغا! کیا یہ ممکن نہیں کہ تو اسے لونڈی بنانے کی بجائے اپنی بیوی بنا لے؟" ابونصار نے پہلی بار درمیان میں مداخلت کی۔ "بات تو ایک ہی ہے، تو چاہے اسے لونڈی بنا کر رکھ یا اپنی بیوی بنا کر! اگر تو اسے اپنی بیوی بنا لے گا تو قانون بھی برقرار رہے گا۔"

ابونصار کی بات سن کر میرے دل میں نفرت کی ایک لہر سی اٹھی۔ منگول عورت اور میری بیوی! میں نے حقارت سے سوچا۔ بیوی اور لونڈی کے فرق کو میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ابونصار غالباً" یہ چاہتا تھا کہ میری خواہش بھی پوری ہو جائے اور برقائی خاں بھی خوش رہے مگر مجھے یہ منظور نہیں تھا۔

"اے ابونصار! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے انعام نہیں چاہیے مگر بگھاتر بھائی کا بگھاتر بھائی اسی طرح خوش ہو سکتا تھا اسی لیے میں نے اپنی خواہش بیان کر دی۔ اگر میں کسی منگول عورت کو بیوی بنانا چاہتا تو اب تک ایسا ہو جاتا لیکن ابھی میں یہ نہیں چاہتا۔ لونڈی تو کبھی بھی چھوڑی جا سکتی ہے مگر تو جانتا ہے کہ بیوی۔۔۔"

"بوغا ٹھیک کہہ رہا ہے۔" برقائی خاں نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "اے ابونصار! اسے شرمندہ نہ کر!"

"میرا مقصد اسے شرمندہ کرنا نہیں تھا۔" ابونصار بولا۔ "اگر بوغا یہی چاہتا ہے اور تو اس کی خواہش پوری کرنے پر راضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"تو پھر آج رات تجھے تیرا انعام مل جائے گا۔" برقائی خاں نے فیصلہ سنا دیا۔

ابونصار بھی میرے ساتھ ہی اٹھ گیا اور بولا۔ "میں بھی چلتا ہوں تاکہ تیرے حکم کی تعمیل کرا سکوں۔ تو نے نسطوری کے بارے میں دیا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" برقائی خاں جواب میں بولا۔ "جب اسے سزا دی جا رہی ہو تو قلعے میں موجود تمام مقامی عورتیں وہاں ضرور جمع کی جائیں تاکہ وہ عبرت پکڑیں۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" ابونصار نے یہ کہہ کر قدم بڑھائے۔

میں ابونصار کے پیچھے پیچھے برقائی خاں کے کمرے سے نکلا۔ جب قلعے کا وہ مخصوص حصہ ختم ہو گیا جو برقائی خاں کے استعمال میں تھا تو میں نے ابونصار سے پوچھا۔ "نسطوری کو کیا سزا سنائی گئی ہے اے ابونصار؟"

"سزائے موت!" ابونصار نے طویل سانس لے کر جواب دیا' پھر خود ہی بولا۔ "اب سے کچھ دیر قبل اس کے بارے میں جو ذہنی الجھن تھی' وہ برقائی خاں سے بات کر کے ختم ہو گئی۔" یہ کہہ کر مجھے ابونصار' نسطوری کے بارے میں بتانے لگا۔

جس دن برقائی خاں' سرائے باتو کے لیے روانہ ہوا تھا' اسی دن ایک منگول سردار نے نسطوری کو اس کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ منگول سردار کا مقصد محض برقائی خاں کی خوشنودی تھا۔ وہ منگول سردار نسطوری کے شوہر کو قتل کر کے اسے اٹھا لایا تھا۔ نسطوری غیر معمولی طور پر حسین عورت تھی اس لیے منگول سردار نے اسے برقائی خاں کو دینے کا فیصلہ کیا۔ برقائی خاں کو بھی نسطوری بہت پسند آئی کیونکہ اس کے حرم میں کوئی بھی لونڈی نسطوری سے زیادہ حسین نہیں تھی۔ سرائے باتو جانے کے سبب برقائی خاں کو نسطوری سے قرب کا موقع نہیں مل سکا۔ پھر جب وہ سرائے باتو سے لوٹ کر آیا تو طویل سفر نے اسے تھکا دیا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ واپس آنے کے بعد دوسری شب نسطوری کے حسن سے فیضاب ہوتا مگر دوسری شب نسطوری کو اس نے تیرے پاس بھیج دیا اور یوں وہ شاید نسطوری کے ممکنہ قاتلانہ حملے سے بچ گیا۔ نسطوری شہر کیف ہی کی رہنے والی تھی۔ اس کا شوہر اسے گھر سے باہر نہیں جانے دیتا تھا تاکہ کسی منگول سپاہی یا سردار کی نظر اس پر نہ پڑ جائے مگر ایک دن تمام احتیاطیں دھری رہ گئیں۔ ایک منگول سپاہی نے نسطوری کے شوہر کو اپنا حکم نہ ماننے پر اتنا زدوکوب کیا کہ وہ شدید زخمی ہو گیا۔ نسطوری اپنے شوہر سے محبت کرتی تھی۔ جب اسے اپنے شوہر کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ اپنے گھر سے نکلے بغیر نہ رہ سکی۔ جب وہ اپنے زخمی شوہر کو سہارا دیے ہوئے گھر کی طرف لوٹ رہی تھی تو ایک منگول سردار کی نظر میں آ گئی۔ منگول سردار اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کی طرف جھپٹا۔ نسطوری سہم کر رک گئی' اور پھر منگول سردار نے اس کے شوہر کو اسی کے سامنے قتل کر دیا' پھر نسطوری کو گھسیٹ کر گھوڑے پر ڈال لیا۔

نسطوری کے بارے میں تمام معلومات اس منگول سردار سے حاصل ہوئی تھیں جو اسے اٹھا کر لایا تھا۔ برقائی خاں نے ابونصار کے سامنے اسے بلوا کر سب کچھ پوچھا تھا۔

مظلوم پر مزید ظلم ہونے والا تھا اور روکنے والا کوئی نہ تھا' میں بھی نہیں! میں بھی بھلا کس طرح اسے بچا سکتا تھا جسے سزائے موت سنا دی گئی تھی!

میں جب! ابونصار کے ہمراہ اپنے کمرے تک پہنچا تو اس کے دروازے پر دو نئے خادموں کو مستعد پایا۔ ابونصار نے جو حکم دیا تھا' اس پر عمل درآمد ہو چکا تھا۔ غالباً" پرابر والے کمرے سے خادموں کی لاشیں بھی ہٹا لی گئی تھیں۔

وہ جس نے غلط فہمی کے سبب مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا' میں اسے بے گناہ سمجھ رہا تھا اس لیے میرے دل پر

ایک بوجھ سا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر ابونصار سے رخصت کی اجازت چاہی اور اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ رخصت ہونے سے قبل ابونصار نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں اس وقت تک کمرے سے نہ نکلوں جب تک وہ میری حفاظت کا مزید بندوبست نہ کر دے۔

میں کچھ دیر آرام کر کے اپنے کشیدہ اعصاب کو سکون دینا چاہتا تھا اس لیے آنکھیں بند کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔

میں نہ جانے کتنی دیر اسی طرح لیٹا رہا' آنکھیں بند کیے! مختلف خیالات میرے ذہن میں چکراتے رہے۔ میں نے اس وقت ہی آنکھیں کھولیں جب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرے کمرے میں ایک خادم داخل ہو رہا تھا۔

"تجھے ابونصار یاد کر رہا ہے۔" خادم نے بتایا اور لوٹ گیا۔

میں بستر سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر آیا۔ خادموں کے علاوہ کمرے کے دروازے پر نصف درجن مسلح سپاہی نظر آئے جنہیں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ مسلح سپاہیوں نے شاید میری حیرت کو محسوس کر لیا۔

"ابونصار نے ہمارے سپرد یہ کام کیا ہے کہ ہم تیری حفاظت کریں۔" ان مسلح سپاہیوں میں سے ایک نے بتایا۔ "ہمیں حکم ملا ہے کہ جب بھی تو اپنے کمرے سے نکلے ہم تیرے ساتھ رہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا اور ابونصار کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ مسلح سپاہی میرے آگے پیچھے اور دائیں بائیں ہو لیے۔ پھر جب میں ابونصار کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ دروازے پر رک گئے۔

میں اندر پہنچا تو ابونصار کو ایک لمبا سا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتے دیکھا۔ یہ لباس وہ عموماً" اسی وقت پہنتا تھا جب اپنے کمرے سے نکلتا تھا۔

"کہاں کی تیاری ہے اے ابونصار؟" میں نے پوچھا۔ اور تو نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"کیا تو اپنی آنکھوں سے اس کا انجام نہ دیکھے گا جس نے تجھے ہلاک کرنا چاہا تھا۔" ابونصار بولا۔

"ہاں ہاں! کیوں نہیں کیوں نہیں اے ابونصار!"

میں ایک دم نسطوری کے ذکر پر کچھ گڑبڑا سا گیا۔ میرے دل کو ابونصار کی بات سن کر دھکا سا لگا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی میں ابونصار کے ہمراہ قلعے میں موجود اس چھوٹے سے میدان تک پہنچ گیا جہاں ایک بار پہلے بھی آ چکا تھا۔ وہ میدان شاید اسی لیے مخصوص تھا۔ وہیں میں نے سیوری پر تشدد ہوتے دیکھا تھا اس وقت جب اس نے سردار توچی کی شراب میں زہر ملا تھا۔

سزا پر عمل درآمد کرانے کی ذمہ داری غالباً" ابونصار کو سونپی گئی تھی اور وہ اسی لیے وہاں پہنچا تھا۔ مجھے شاید اس لیے اس نے ساتھ لیا تھا کہ اپنے اوپر قاتلانہ حملے کا انجام دیکھ کر مطمئن ہو سکوں۔

وہاں اس وقت مجھے منگولوں سے زیادہ مقامی باشندے نظر آ رہے تھے جن میں زیادہ تعداد حسین عورتوں کی تھی' وہ حسین عورتیں جو منگول سردار کے تصرف میں تھیں۔ وہاں ان کی موجودگی کا سبب مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا۔ انہیں نسطوری کا انجام دکھانے کے لیے وہاں لایا گیا تھا تاکہ وہ عبرت پکڑیں۔

جب ابونصار مجھے لیے وہاں پہنچا تو لوگ احتراماً" ادھر ادھر ہٹ گئے تھے۔ اس طرح ابونصار کو اور مجھے آگے جانے کا راستہ مل گیا تھا۔

دائرے کے درمیان ایک لحیم شحیم منگول' ہاتھ میں کلہاڑا اٹھائے کھڑا ہوا تھا اور اس کے سامنے زمین پر رسیوں سے بندھی ایک عورت پڑی ہوئی تھی۔ وہ عورت نسطوری کے سوا اور کون ہو سکتی تھی! اس کا جسم بے لباس تھا مگر وہ اس طرح سمٹی سمٹائی پڑی ہوئی تھی کہ جسم کے وہ حصے چھپ گئے تھے جنہیں ہر عورت چھپانا چاہتی ہے۔ اس کا چہرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ چہرہ دراز گیسوؤں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں اس طرح وہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جیسے مجھے

کوئی بھیانک خواب نظر آرہا ہو۔ مقامی باشندوں کے چہرے اترے ہوئے تھے جن سے اندرونی کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔

معاً" میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے ابونصار کے دائیں ہاتھ کو بلند ہوتے دیکھا۔ اسی کے ساتھ جیسے خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہاں موجود منگول جوش کے عالم میں چیخنے چلانے لگے۔ ابونصار کا ہاتھ بلند ہوتے ہی میں نے کلہاڑے بردار منگول کو جھکتے دیکھا تھا۔ اس نے کلہاڑا زمین پر رکھ دیا تھا اور نسطوری کے جسم پر موجود رسیاں کھولنے لگا تھا۔

چند لمحے بعد ہی کلہاڑا بردار سیدھا کھڑا ہو گیا۔ رسی اب ایک طرف پڑی تھی اور اس نے دوبارہ کلہاڑا اٹھا لیا تھا۔ کلہاڑا بردار نے شاید نسطوری سے کچھ کہا تھا جو فاصلہ ہونے کے سبب میں نہ سن سکا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ کلہاڑا بردار منگول کی بات سن کر نسطوری اٹھ کر دوزانو بیٹھ گئی تھی۔

اس کے بعد کلہاڑا بردار نسطوری کے سامنے پہنچ گیا' اور پھر اس نے جھک کر نسطوری کے دراز گیسو اپنے بائیں ہاتھ میں جکڑ لیے۔ وحشی منگول گلا پھاڑ کر چیخنے لگے۔ وہ اس طرح اپنی انتہائی مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔

اسی وقت کلہاڑے بردار نے ابونصار کی طرف نگاہ اٹھائی۔ ابونصار کا ہاتھ ایک بار پھر بلند ہوا اور اسی کے ساتھ کلہاڑے بردار کا ہاتھ بھی اٹھا' وہ ہاتھ جس میں کلہاڑا تھا۔ میری نگاہ کلہاڑے کے تیز اور چوڑے پھل پر جمی ہوئی تھی۔ کلہاڑا انتہائی بلند ہو کر پوری قوت اور تیزی سے نیچے آیا۔ اس کا نشانہ نسطوری کی نازک کمر تھی۔

پہلے ایک تیز آواز ہوئی' پھر ایک دلدوز چیخ سنائی دی جو منگولوں کی چیخ و پکار سے بھی تیز تھی۔ میں نے کلہاڑے کا پھل نسطوری کی کمر پر گرتے' اور پھر کمر کے دو ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ اسی کے ساتھ خون کا فوارہ سا ابل پڑا۔ وہ منظر اتنا ہی متاثر کن تھا کہ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس بے گناہ اور مظلوم کے جسم کو تڑپتے ہوئے دیکھ سکتا۔ ہاں وہ میری نظر میں بے گناہ اور مظلوم ہی تھی جس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔

پھر میں نے اسی وقت آنکھیں کھولیں جب ابونصار نے مجھ سے چلنے کے لیے کہا۔ منگولوں کا اظہار مسرت اب تک جاری تھا مگر میں نے پھر دوبارہ دائرے کے درمیان نہیں دیکھا اور وہاں سے نکل آیا۔

وہ تمام دن میں نے اپنے کمرے میں پڑے ہوئے ہی گزارا' یوں بھی مجھے ابھی آرام کی ضرورت تھی کیونکہ میرے زخم مندمل نہیں ہوئے تھے۔ میں بار بار اس ہولناک منظر کو بھولنے کی کوشش کرتا اور وہ میری آنکھوں میں گھومنے لگتا۔

میں رات کا کھانا کھا کر فارغ ہوا تھا کہ خادم نے اسی تومان باشی کے آنے کی اطلاع دی جو گزشتہ شب نسطوری کو میرے پاس لے کر آیا تھا۔ خادم سے پتا لگا کہ آج بھی اس کے ہمراہ ایک حسین چہرہ ہے۔ خادم سے یہ اطلاع پا کر مجھے برقائی خاں کا وعدہ یاد آگیا اور اسی کے ساتھ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اسے فوراً" اندر بھیج!" میں نے خادم کو پرجوش آواز میں حکم دیا اور ٹہلنے لگا۔

آنے والی منگول ہی ہو گی۔ میں سوچنے لگا اور میرے لہو کی گردش تیز ہونے لگی۔ مجھے وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں جو میں نے صبح سوچی تھیں۔

کمرے کا دروازہ کھلا تو میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ تومان باشی ایک نوعمر نوجوان منگول لڑکی کو ساتھ لیے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے لڑکی کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ یقیناً" خوب صورت تھی مگر اس وقت تو میرے ذہن پر کوئی اور ہی دھن سوار تھی۔

تومان باشی میرے قریب پہنچ کر جھکا اور بولا۔

"برقائی خاں کی طرف سے تیرے لیے!" یہ کہہ کر اس نے لڑکی کا بازو تھاما اور اسے میرے روبرو کر دیا۔

"اس سے کہنا کہ بوغا اس کا انعام پا کر خوش ہوا۔" میں سپاٹ لہجے میں بولا۔

تو مان باشی سر جھکا کر لوٹ گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک گیا اور اسے اندر سے بند کر دیا۔

میں دروازہ بند کر کے لوٹا تو وہ لڑکی میرے بستر پر بیٹھ چکی تھی۔

"بے ادب!" میں چیخ پڑا۔ "تجھ سے کس نے کہا کہ بستر پر بیٹھ جا!"

لڑکی حیران حیران سی میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نمی سی آ گئی تھی۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچا، پھر اس کے لمبے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر چیخا۔ "کھڑی ہو جا!" اسی کے ساتھ میں نے بالوں کو جھٹکا دیا۔

وہ کراہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو بھی نظر آ رہے تھے۔ شاید اس سے پہلے کبھی اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا گیا تھا۔

وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی تو میں بستر پر بیٹھ گیا، پھر حقارت آمیز لہجے میں بولا۔ "یہ نہ بھول کہ تو میری لونڈی ہے، مجھے حق ہے کہ میں تجھے جس طرح چاہوں رکھوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ "کیا نام ہے تیرا؟"

"جاویقہ!" یہ کہہ کر اس نے سسکی لی۔

"شراب کا برتن اٹھا اور پیالے میں شراب انڈیل کر دے۔" میں نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں حکم دیا۔

وہ کانپتے ہوئے قدموں سے بڑھی اور پھر کونے میں رکھے ہوئے شراب کے برتن کو اٹھانا چاہا مگر شاید وہ میرے رویے سے اس قدر بدحواس ہو گئی تھی کہ شراب کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

یہ دیکھ کر میں تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور لپک کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے اسے ایک گندی سی گالی دی، اور پھر میری بھرپور ٹھوکر اس کے جسم پر پڑی۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر ایک طرف لڑھک گئی اور کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح میری طرف دیکھنے لگی۔

"اٹھ کر بیٹھ!" یہ کہتے ہوئے میں نے دوبارہ ٹھوکر مارنے کے لیے پاؤں اٹھایا۔

وہ ٹھوکر کی ضرب سے بچنے کے لیے ایک دم اٹھ بیٹھی اور شراب کا برتن اٹھانے لگی۔ میرا جی چاہا کہ دوبارہ اسے ٹھوکر مار کر گرا دوں مگر نہ جانے کیوں میں نے ایسا نہیں کیا اور بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔

وہ ڈری ڈری سہمی سی شراب کا برتن اور پیالہ اٹھائے قریب آ گئی۔

"برتن اور پیالہ نیچے رکھ دے!" میں گرجا۔

اس نے تعمیل حکم کی، پھر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"میں نے تجھے کچھ اور بھی تو حکم دیا تھا؟"

"کک... کیا... مجھے... مجھے یاد نہیں... آ..." وہ ہکلانے لگی۔

میں نے جواب میں پھر گالی دی اور دہاڑا۔ "شراب انڈیل پیالے میں!"

وہ میرے سامنے اکڑوں بیٹھ کر پیالے میں شراب انڈیلنے لگی۔ شراب کے برتن کا ڈھکنا اس نے بستر پر رکھ دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ شراب انڈیلتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر وہی ہوا جس کا میں منتظر تھا۔ شراب پیالے سے چھلک گئی اور اسی کے ساتھ میرا دایاں ہاتھ اس کے رخسار پر پڑا۔ تھپڑ کھا کر اس نے اپنا جسمانی توازن برقرار رکھنا چاہا مگر ناکام رہی۔ شراب کا پیالہ اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ میرے قریب بستر پر آ پڑی۔ شراب کمرے کے فرش پر بہنے لگی تھی۔

پھر تو جیسے مجھ پر جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ تھپڑ، گھونسے اور لاتیں کھاتی رہی، روتی رہی، چیختی رہی اور پٹتی رہی۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب اس کی سسکیاں اور چیخیں اچانک بند ہو گئیں۔ میں نے ہاتھ روک لیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا جس سے خون رس رہا تھا۔ رخسار پر میری انگلیوں کے نشان تھے اور لباس جگہ جگہ سے بے حجاب ہو گیا تھا جس سے اس کی گلابی رنگت جھانک رہی تھی۔

اس کی عمر بمشکل سولہ سال رہی ہوگی۔ برقائی خاں نے میرے لیے اس بار بھی اپنے حرم کی بہترین اور حسین لڑکی بھیجی تھی۔ مگر میرے وجود میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ نے مجھے اتنی مہلت ہی نہیں دی تھی کہ میں اس کے حسن کو محسوس کر سکتا یا برت سکتا۔

میں نے اسے اپنے بستر سے گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دیا اور شراب نوشی کرنے لگا۔

اسے شاید کچھ دیر بعد ہوش آگیا تھا اور وہ کراہنے لگی مگر میں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی اور شراب پیتا رہا۔ اس میں غالباً" اب اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ مجھے مخاطب کر سکتی۔ وہ اسی طرح کمرے کے فرش پر پڑی رہی' اور پھر نہ جانے کب وہیں سو گئی۔

اس شب میں نے لذت اندوزی کی بجائے غافل ہونے کے لیے شراب پی اور پھر غافل ہو گیا۔ لڑکی کی چیخ و پکار یقیناً" کمرے سے باہر بھی گئی ہوگی مگر خادموں یا میرے محافظوں نے مداخلت نہیں کی تھی اور انہیں یہ حق تھا بھی نہیں! یا شاید وہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیے جانے کے بعد وہاں سے چلے گئے ہوں گے۔

صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے کمرے کو عجب حال میں پایا پھر ایک ایک کر کے مجھے گزشتہ شب کی تمام باتیں یاد آگئیں۔ وہ لڑکی ابھی تک اسی جگہ پڑی ہوئی سو رہی تھی۔

میں بستر سے اٹھا اور لڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے اسے ٹھوکر مار کر جگایا تو وہ چیخ پڑی' پھر مجھے اپنے قریب دیکھ کر ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"کمرے کی حالت درست کر!" میں نے اسے حکم دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھول کر میں نے خادموں کو ناشتہ لانے کا حکم دیا۔ برابر والے کمرے سے ابو نصار کی آواز آرہی تھی۔ وہ مصروف عبادت تھا۔ مجھے دروازے پر مسلح محافظ بھی نظر آئے۔

"کیا تم سب رات بھر یہیں رہے تھے؟" میں نے محافظوں سے پوچھا۔

گھر بیٹھے عملی کنگ فو سیکھیے

کنگ فو جیسے جائنز فن پر ایک مستند اور شاندار کتاب

جس میں بنیادی مراحل سے لے کر مہارت تک تفصیلی مضامین شامل ہیں۔

پاکستان میں چھپنے والی کتب میں ایک اہم اضافہ

جسے آپ کیلئے معظم جاوید نے تحریر کیا ہے۔

آسان پریکٹیکل کنگ فو

تصاویر کے ساتھ

قیمت صرف -/36 روپے

-:- منگوانے کا پتہ -:-

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

"نہیں!" ایک محافظ نے جواب دیا۔ "جب تیرے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا تھا تو ہم چلے گئے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور کمرے میں لوٹ گیا۔

لڑکی جلدی جلدی کمرے کا سامان درست کر رہی تھی۔ اس کے انداز و اطوار سے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ سخت خوفزدہ ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر لمحے بھر کو میرے دل میں اس کے لیے رحم کا جذبہ پیدا ہوا مگر اسی لمحے میری آنکھوں میں اپنی ماں کے دوسرے شوہر چنکائی کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ ظالم بھی تو میری ماں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرتا تھا۔ اگر میں اس منگول لڑکی کے ساتھ ویسا ہی سلوک کر رہا تھا تو کیا بے جا تھا!

ناشتہ میں نے تنہا کیا اور کوشش کی کہ لڑکی کے لیے کم سے کم بچے' جیسا کہ چنکائی' میری ماں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔

"لے اب تو اپنا جہنم بھر لے!" میں نے کھانے کے برتن لڑکی کی طرف سرکاتے ہوئے کہا جو قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ ناشتہ کرنے لگی اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی میں کمرے کے دروازے تک نہ پہنچ پایا تھا کہ میرا ایک خادم کمرے میں داخل ہوا۔ میرے قدم رک گئے۔

"برقائی خاں کا خادم تیرے لیے کوئی پیغام لایا ہے۔" خادم نے ادب سے جھک کر بتایا۔

"اسے اندر آنے دے!" یہ کہہ کر میں پلٹا۔

چند لمحے بعد ہی برقائی خاں کا خادم میرے سامنے کھڑا ہوا کہہ رہا تھا۔ "صبح دم ہی خان بالغ (قراقرم) سے ایک قاصد آیا تھا اور اس کے پاس طلائی لوح تھی۔ وہ قاصد برقائی خاں سے ملا اور پھر برقائی خاں نے مجھے تیرے پاس یہ کہنے بھیجا کہ میں تجھے بلا لاؤں کیونکہ وہ جو پیغام لے کر آیا ہے' تجھ سے ہی متعلق ہے۔"

کسی قاصد کا قراقرم سے طلائی لوح لے کر آنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ خاقان منگول خاں کا پیغام لایا تھا۔ میں غیر متوقع اطلاع پا کر وقتی طور پر کچھ گھبرا سا گیا۔ میری آنکھوں میں لامہ نامو کا چہرہ گھوم گیا۔ کیا اس نے میرا راز فاش کر دیا؟ میں نے سوچا اور میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

"کیا میں برقائی خاں سے کہہ دوں کہ تو آ رہا ہے؟" خادم نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر مخاطب کیا۔

"ہاں ... ہاں اس سے کہہ دے کہ میں آ رہا ہوں۔" میں جلدی سے بولا۔

خادم واپس چلا گیا اور میں گومگو کے عالم میں وہیں کھڑا رہا۔ بس ایک لامہ نامو تھا۔ جو قراقرم میں ایسا شخص تھا خاقان منگو خان نے اسے سلطنت کے تمام مذہبی امور کا نگراں بنا دیا تھا۔ وہ بڑی پراسرار قوتوں کا مالک تھا جس کا تجربہ خود مجھے بھی ہو چکا تھا۔ اگر میرے دل کے لیے کوئی بات سکون کی تھی تو یہ کہ لامہ نامو بھلا ایسا کیوں کرنے لگا! اگر اسے یہی کرنا ہوتا تو پھر وہ پہلے ہی میرا راز فاش کر چکا ہوتا۔ انتہائی فکر مند ہونے کے باوجود میرے دل میں یہ تجسس بھی تھا کہ فوراً مجھے یہ معلوم ہو جائے' قراقرم سے میرے لیے کیا پیغام بھیجا گیا ہے اور کیوں! یہی سبب تھا کہ کچھ دیر بعد ہی میں تیزی کے ساتھ قلعے کے اس حصے کی طرف جا رہا تھا جہاں برقائی خاں کی رہائش تھی میں اس قدر جلدی میں تھا کہ ابو نصار سے بھی نہیں ملا تھا۔ مسلح محافظ' میرے ساتھ ہو لیے تھے۔

قلعے کے اس مخصوص حصے میں داخلے سے پہلے میرے مسلح محافظوں کو روک دیا گیا۔ کوئی سردار تھی اپنے ساتھ ذاتی محافظوں کو لے کر اس حصے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں داخلے کی اجازت صرف ان افراد کو تھی جن کا تعلق خاندان زریں سے ہو یا انہیں برقائی خاں نے طلب کیا ہو یا ملاقات کی اجازت دے دی ہو۔ ان افراد کے علاوہ وہاں فقط برقائی خاں کے قشق سے متعلق افراد آ جا سکتے تھے یا ذاتی خادم و خادمائیں! میں یہ بات سمجھ چکا تھا اس لیے مجھے اپنے مسلح محافظوں کے روکے جانے پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔

میں برقائی خاں کے کمرے تک پہنچا تو پتا چلا کہ
ماڑے برداروں کو پہلے ہی میری آمد سے مطلع کیا جا
تھا۔ انہوں نے میرے لیے فوراً" دروازہ کھول دیا۔
برقائی خاں اس وقت کمرے میں تنہا تھا۔ میں نے
عدے کے مطابق جھک کر آداب پورے کیے۔
"بوغا! خاقان منگو کا قاصد پیغام لے کر آیا ہے کہ
تجھے فوراً" کام بالو (خاقانوں کا شہر) بھیج دیا جائے۔
اقان تیرا منتظر ہے۔" برقائی خاں نے بتایا۔
"کیا خاقان نے طلبی کا سبب نہیں لکھا اے عظیم
رقائی؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔
"نہیں!" برقائی خاں نے جواب دیا۔ "پیغام بہت
تصر ہے اور اس میں صرف یہی لکھا ہے۔ میں خود
سوچ رہا تھا کہ تجھ سے پوچھوں گا' اس طلبی کی کیا وجہ
ہو سکتی ہے مگر یوں لگتا ہے' تو بھی کوئی اندازہ نہیں لگا
سکا۔"
"ہاں اے عظیم برقائی! میں کوئی اندازہ نہیں لگا
سکا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔
"تو پھر تو آج ہی روانہ ہو جا!" برقائی خاں بولا۔
"بات کوئی اہم ہی ہو گی جو خود خاقان نے تیری طلبی کا
حکم دیا ہے۔"
"میں خود تجھ سے اجازت مانگتا اے بگھاتر برقائی
!" میں نے کہا۔ "اب خود تیرا بھی یہی حکم ہے تو میں
آج ہی قراقرم کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔"
"میں کل ہی سوچ رہا تھا کہ ایک باغی مارا جا چکا ہے'
اسی خوشی میں کوئی اخودور (تقریب) کروں اور اس میں
تو بھی ہو پر اب چھوڑ پھر کبھی سہی! جب تو ہی اخودور
میں نہ ہو گا تو مزا نہیں آئے گا۔" برقائی خاں نے
بتایا۔
"تو بہت عظیم ہے برقائی کہ تو نے ایسا سوچا۔" میں
ادب سے جھک کر بولا' اور پھر رخصت کی اجازت
چاہی۔
میں برقائی خاں سے مل آیا مگر میری ذہنی الجھن
بدستور قائم رہی قراقرم سے طلبی کا مقصد میری سمجھ
میں نہیں آسکا تھا۔ میں واپسی میں ابونصار سے بھی ملا

خود کو عددوں کی روشنی میں پرکھیئے!!!

علم الاعداد پر ایک منفرد اور جامع کتاب

علم الاعداد اور آپ کی شخصیت

مرتب: علیم اقبال

اس کتاب میں آپ کی شخصیت اور دیگر پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آپ اپنے منفی پہلوؤں پر غور کر کے انہیں ختم اور خوبیوں کو ابھار سکتے ہیں۔ آپ اس علم کی بدولت دوسروں کی شخصیت کے پراسرار گوشے جان سکتے ہیں۔ اعداد آپ کی صحت، محبت اور دولت پر کیا اثرات مرتب کرتے ہیں؟

اس کتاب کے مطالعے سے آپ اپنے مستقبل میں جھانک سکتے ہیں!!!

یہ کتاب آپ کی بہترین دوست اور رفیق ثابت ہو گی۔

224 صفحات عمدہ طباعت قیمت:-/80 روپے

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا منی آرڈر بھیج کر براہ راست منگوائیں

(ایک کتاب منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہو گا)

منگوانے کا پتہ:

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اُردو بازار لاہور

مگر وہ بھی مجھے تسلی دینے کے سوا کوئی قیاس آرائی نہ کر سکا۔ وہ میرے لہجے ہی سے بھانپ گیا تھا کہ میں بہت فکر مند ہوں۔ میں اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو مجھے اندر سے سسکیوں کی آواز سنائی دی جن کے درمیان کچھ کہا بھی جا رہا تھا۔ میرے قدم رک گئے اور میں نے دروازے سے کان لگا دیے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ منگول لڑکی جادیقہ کس سے باتیں کر رہی ہے جسے میں تنہا کمرے میں چھوڑ گیا تھا؟ خادموں اور محافظوں کو میں نے ہاتھ کے اشارے سے پیچھے ہٹا دیا تھا۔

"اے یوگدو! آسمانی روح میں بوران (شمال کی کالی آندھی) میں گھر گئی ہوں۔ مجھے بچا اور اولوس (لشکر) لے کر آ! میں تیری کبت کا (چوڑی بیل گاڑی جس پر خیمہ نصب ہو) کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ سننے کے لیے بے چین ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ جادیقہ میرے ظلم و ستم سے تنگ آ کر آسمان سے پناہ مانگ رہی تھی اور کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو جادیقہ کو دو زانو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھ پر نظر پڑتے ہی سہم گئی تھی اور اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔

"میں خان بالیغ چل رہا ہوں اور تو بھی میرے ساتھ ہی چلے گی کیونکہ تو میری لونڈی ہے۔ تجھ پر میرا حق ہے۔" میں نے حکم سنایا اور اس نے سر جھکا لیا۔ میں پھر سخت لہجے میں بولا۔ "سن! میں بوران نہیں ہوں جو تو یوگدو سے التجائیں کرے، سمجھی!"

میری بات سن کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور ہونٹ کانپنے لگے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

اسی دن دوپہر تک میری روانگی عمل میں آئی۔ مجھے ابونصار سے بچھڑنے کا بہت دکھ تھا۔ ابونصار نے میرے ساتھ ایک محافظ دستہ کر دیا تھا تاکہ راستے میں مجھے کوئی تکلیف نہ ہو۔

جب میں مغربی دشت سے قراقرم کے لیے روانہ ہوا تو چوہے کا سال شروع ہو گیا تھا۔ یہ منگولوں کی جنتری کا پہلا سال تھا۔ خنزیر کے سال میں منگو خان خاقان بنا تھا اور اسے بھورے نمدے کی مسند پر بیٹھے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔

میں اپنے گھوڑے پر تنہا بیٹھا تھا اور جادیقہ کو دوسرے گھوڑے پر بٹھایا تھا۔ ہر چند کہ وہ اچھی گھوڑ سوار نہیں تھی اور اس نے یہ کہا بھی تھا کہ وہ اتنے طویل سفر میں گھوڑی کی پیٹھ پر بیٹھ کر نہ جا سکے گی مگر میں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرے تھے۔ اس گھوڑا میرے گھوڑے کے پیچھے تھا اور اس کے بعد محافظ دستے کے سپاہی تھے۔ قلعے سے نکل کر میں شہر کیف پہنچا، پھر شاہینوں کی جھیل کا رخ کیا۔ وہاں تک پہنچنے سے پہلے راستے میں کئی چھوٹی آبادیاں پڑیں اور بھی ایک چھوٹی سی آبادی تھی جہاں میں نے قلعے سے چل کر پہلی بار گھوڑا روکا۔

مجھے وہاں ایک میدان میں منگول سپاہی نظر آئے تھے جو مقامی باشندوں کو بری طرح زدوکوب کر رہے تھے۔ ان سپاہیوں کے ہمراہ مجھے دو باش قاش (محصول جمع کرنے والے بھی نظر آ رہے تھے) جنہیں میں نے ان کے مخصوص لباس سے پہچانا تھا۔

میں اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ سپاہیوں کے ہاتھوں میں کوڑے تھے جو وہ چند بدنصیبوں پر برسا رہے تھے۔ کوڑے کھانے والوں میں ایک شخص بہت بوڑھا تھا اور اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر سپاہیوں کے ہاتھ رک گئے کیونکہ میرے جسم پر ایک منگول سردار کا لباس تھا۔

باش قاشوں کو وہاں دیکھ کر میں سمجھ چکا تھا کہ کچھ معاملہ ہے! اس آبادی کے رہنے والوں نے یقیناً محصول ادا نہیں کیا ہو گا۔ اسی سبب ان پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ میں نے اسی لیے سپاہیوں سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیوں مار پیٹ کر رہے ہیں! میں نے قریب پہنچتے ہی بغیر کچھ کہے پوچھے با آواز بلند حکم دیا۔ "ان لوگوں کو چھوڑ دو اور انہیں ان کے گھر جانے دو!"

"مگر اے سردار!" ان میں ایک باش قاش نے کچھ

کہنا چاہا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔"

"یہ میرا حکم ہے۔" میں گرجا۔

زخمی بوڑھا دوڑ کر میرے گھوڑے کے قریب پہنچا اور اس کے دونوں پیر باری باری چوم لیے، پھر وہ آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ اس طرح کانپ رہے تھے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو مگر شدت جذبات کے سبب نہ کہہ پا رہا ہو۔

میں نے اس کی بات سنے بغیر اپنے گھوڑے کی لگام ہلائی اور واپس ہو گیا۔ سپاہی مجھے حیرت سے دیکھتے رہ گئے تھے۔ یہ ان کی زندگی کا شاید پہلا تجربہ رہا ہو گا کہ کسی منگول سردار نے مقامی باشندوں کو زدوکوب ہونے سے بچایا ہو۔

محافظ دستہ کچھ پہلے ہی میرے اشارے پر رک گیا تھا اور میں تنہا سپاہیوں تک پہنچا تھا۔ محافظ دستے کے ساتھ ہی جادیقہ بھی رک گئی تھی۔ محافظ دستہ کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس تک پہنچ گیا تو دوبارہ سفر کا آغاز ہوا۔

اس سے پہلے کہ سورج اپنی بیوی کی آغوش میں جا گرتا، میں کسی یام (سرائے) تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسی لیے تیز رفتاری کا ثبوت دیا۔ جادیقہ بمشکل اس تیز رفتاری کی متحمل ہو رہی تھی اور یہ دیکھ کر مجھے عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

قراقرم کے لیے یہ میرا پہلا سفر نہیں تھا اس لیے میں بخوبی واقف تھا کہ راستے میں کہاں کہاں یام ہیں اور کتنے فاصلے پر ہیں!

میرا گھوڑا اس وقت ایک میدان میں دوڑ رہا تھا۔ سامنے ایک پہاڑی درہ تھا جسے عبور کر کے میں شاہینوں کی جھیل کے کنارے پہنچ جاتا، پھر کچھ مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک یام کے یورت (خیمے) نظر آجاتے۔ اس یام میں رات بھر قیام کیا جا سکتا تھا۔

میرا گھوڑا آخر کار اس درے میں داخل ہوا جہاں دشمن گھات لگائے بیٹھا تھا اور میں اس کے وجود سے قطعی بے خبر تھا۔ وہ درہ خاصا چوڑا تھا۔ ابھی میں نصف درہ ہی عبور کر پایا تھا کہ میری سماعت سے ایک وحشیانہ قہقہہ ٹکرایا، اور پھر میں نے چند گھوڑ سواروں کو پرجوش انداز میں اپنی طرف آتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے تھے جنہیں لہراتے ہوئے وہ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ میرے دوست نہیں، دشمن ہی ہو سکتے تھے۔ مخالف سمت سے آنے کے سبب سارا درہ انہوں نے گھیر لیا تھا اور یہ گنجائش نہیں رہی تھی کہ میں اپنا گھوڑا بچا کر لے جاتا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔

"ان پر تیر برساؤ!" میں نے چیخ کر حکم دیا اور اپنے کاندھے سے لٹکی ہوئی کمان اتاری۔

اسی وقت پیچھے سے بھی ویسا ہی شور بلند ہوا میں نے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے سے بھی چند گھوڑ سوار دوڑے چلے آرہے تھے۔ میں چکرا کر رہ گیا۔ گویا دشمن مجھے ہر دو طرف سے گھیر چکا ہے۔ میں نے سوچا، مگر دشمن کون ہے؟ یہ سوچتے ہوئے میں نے ترکش سے تیر نکال کر کمان پر چڑھایا، اور پھر قریب آنے والے ایک گھوڑ سوار کے سینے کا نشانہ لیا۔

میرا چھوڑا ہوا تیر اس گھوڑ سوار کے سینے میں پیوست ہو گیا اور وہ گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ اسی کے ساتھ میں چیخا۔ "نصف سپاہی اپنے گھوڑے کا رخ بدل کر مخالف سمت تیر چلائیں!"

مجھے پہلے اپنے دشمنوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو پایا تھا مگر اب پتا چل چکا تھا کہ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ اب پورا درہ ان سے بھر گیا تھا اور درمیان میں، میں تھا۔ ایک دستے میں دس سپاہی ہوتے ہیں۔ پانچ سپاہی میرے ساتھ سامنے کے رخ پر تیر برسا رہے تھے اور پانچ نے میرے حکم پر اپنے گھوڑوں کا رخ بدل کر مخالف سمت میں تیر برسانے شروع کر دیے تھے۔

ہر چند کہ میں جانتا تھا کہ دشمنوں کے مقابل زیادہ دیر نہ ٹھہر پاؤں گا مقابلے کے سوا چارہ بھی کیا تھا! میں بری طرح گھر گیا تھا۔ اب دشمن نے بھی جواب میں تیر برسانے شروع کر دیے تھے۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ کب کوئی تیر فضا کا سینہ چیرتا ہوا آتا اور میرے جسم میں

پیوست ہو جاتا۔

جادیقہ کی زندگی میں یہ شاید پہلا موقع ہو گا کہ اس نے موت کو اتنے قریب دیکھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ وہ زور زور سے رونے لگی تھی۔ مجھے اس کے رونے پر سخت غصہ آرہا تھا۔

"چپ ہو جا!" میں پلٹ کر چیخا کیونکہ اس نے خوفزدہ ہو کر اپنا گھوڑا میرے گھوڑے کے بالکل پیچھے کر لیا تھا۔ "اگر اب تو روئی تو میں خود تجھے قتل کر دوں گا۔"

ابھی میرا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ ایک تیر میرے بائیں بازو میں پیوست ہو گیا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے دائیں ہاتھ سے زور لگا کر اس تیر کو اپنے بازو سے کھینچنا چاہا اور پھر چیخ پڑا۔ تیر گوشت پھاڑ کر دوسری طرف نکل گیا تھا اور واپس کھینچتے ہوئے اس کا نوکیلا سرا دوبارہ میرے گوشت میں پھنس گیا تھا۔ میں نے تکلیف کی شدت سے ہونٹ بھینچ لیے اور تیر کھینچنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی وقت یکے بعد دیگرے دو چیخیں بلند ہوئیں' ایک میرے برابر سے اور دوسری چیخ پیچھے سے۔ میرے دو سپاہی دشمنوں کے چلائے ہوئے تیروں کا نشانہ بن گئے تھے۔

میں نے ہمت کر کے زخمی بازو اٹھایا۔ تیر اس میں اب تک پیوست تھا اور خون سے میری آستین تر تھی۔ دشمن اب بہت قریب آگیا تھا۔ میں نے کمان میں تیر چڑھایا' پھر اس سے پہلے کہ میں تیر چلا سکتا' سامنے سے ایک بلند آواز سنائی دی۔ "بونا! تو بچ نہیں سکتا غدار! تیر کمان پھینک دے تاکہ میں تجھے زندہ پکڑ سکوں۔"

وہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی مگر میں فوری طور پر نہ پہچان سکا کہ بولنے والا کون تھا! میں نے کہے ہوئے لفظوں پر غور کیا۔ غدار! مجھے غدار کون کہہ سکتا ہے؟ میں نے سوچا' اور پھر میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ وہ آواز یقیناً "آرق کی تھی' مارکوف کے دائیں بازو آرق کی آواز! اسی آرق کی آواز جس کے ساتھ میں نے ایک معرکہ سر کیا تھا۔

تو آرق بھی میری طرف سے غلط فہمی میں مبتلا ہے؟ میں نے سوچا اور فیصلہ کیا کہ مجھے اس کے حکم پر تیر کمان پھینک دینے چاہئیں۔ اگر میں مقابلہ کرتا رہتا تو موت یقینی تھی۔ دوسری صورت میں یہ امکان تھا کہ میں آرق کی غلط فہمی کسی طرح دور کر دوں۔

جب میں نے اپنے فیصلے پر عمل کیا تو اس وقت تک میرے مزید تین سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ آرق چاہتا تو شاید میرے جسم کو بھی تیروں سے چھلنی کرا دیتا مگر وہ مجھے زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا تاکہ سسکا سکا کر مار سکے۔ وہ تیر جو میرے بازو میں لگا تھا' وہ بھی براہ راست شاید مجھ پر نہ چلایا گیا ہو گا۔ تیر کمان پھینک کر میں نے پیچھے کی طرف دیکھا کیونکہ اب جادیقہ کے رونے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ گھوڑے کی پشت پر اوندھی پڑی تھی۔ یا تو خوف سے اس کی حرکت قلب بند ہو گئی تھی یا اس پر بے ہوشی طاری تھی۔

تیر کمان پھینکنے کا یہی مطلب تھا کہ میں اپنی شکست قبول کر چکا ہوں۔ میری تقلید میں محافظ دستے کے بقیہ پانچ سپاہیوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی دشمنوں نے ہمیں نرغے میں لے لیا' اور پھر ہمیں ہمارے ہی گھوڑوں کی پشت سے باندھ دیا گیا۔ اس وقت میں نے آرق سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی کے ساتھ رسیوں میں جکڑ گیا۔ جادیقہ کو بھی اسی حالت میں باندھ لیا گیا تھا۔ وہ شاید صرف بے ہوش ہوئی تھی ورنہ آرق کے ساتھ اسے ساتھ نہ لیتے۔

آرق کے ساتھی ہمارے گھوڑوں کو ہانک کر درختوں سے باہر لے آئے' اور پھر واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ آرق کی منزل کہاں ہے!

اپنی شکست تسلیم کر کے وقتی طور پر تو میں ایک یقینی موت سے بچ گیا تھا لیکن اب ذہن میں یہ کھچڑی پک رہی تھی کہ میں آرق کو کس طرح مطمئن کر سکوں کہ میں آرق کو بتاتا بھی کیا! اگر میں اسے حقیقت سے آگاہ بھی کر دیتا تو وہ بھلا میری باتوں کا یقین کیسے کر سکتا

ہند کہ میرے بازو میں ابھی تک تیر پیوست تھا جو
تکلیف دے رہا تھا مگر موت کے خوف نے مجھے
کے باوجود کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آرق کے
لیوں نے مجھے اسی حالت میں گھوڑے کی پشت پر
دیا تھا۔

سورج اپنی بیوی کی آغوش میں گرنے ہی والا تھا کہ
پہاڑی سلسلہ نظر آنے لگا جو شہر کیف کے تین
طرف میں پھیلایا ہوا تھا۔ مجھے پہلے سے علم تھا کہ
ل کی منزل وہی پہاڑی سلسلہ ہو گا۔ آرق اس
ای سلسلے میں پیچھے کی طرف سے داخل ہوا تھا۔

آرق کا گھوڑا مختلف پہاڑی دروں اور چھوٹے
ے میدانوں سے گزرتا رہا۔ بقیہ افراد کے گھوڑے
ں کے پیچھے تھے۔

جب ایک چھوٹا اور تنگ سا پہاڑی درہ عبور کر کے
ے رکے تو ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ مجھے
ے کی پشت سے کھول کر دوبارہ رسیوں میں جکڑ
یا مگر میرے دونوں پیروں کو نہیں باندھا گیا تاکہ میں
چل سکوں۔ یہی ان سپاہیوں کے ساتھ کیا گیا جو
رے ساتھ تھے۔ میں نے جادیقہ کو بھی اپنے ساتھ
دیکھا۔ اسے غالبا" سفر کے دوران ہی میں ہوش آ
تھا۔ اس کا چہرہ خوف کے سبب زرد نظر آ رہا تھا۔

مجھے یہ محسوس کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ
ماروں کا وہ سلسلہ میرے لیے قطعی نیا تھا۔ پہاڑوں
درمیان آرق نے ایک نیا ہی ٹھکانا تلاش کیا تھا۔
اس کا مطلب بھی سمجھ گیا۔ مارکوف کی موت کے
دونوں ٹھکانے آرق کی نظر میں غیر محفوظ ہو گئے
کے جہاں پہلے رہائش تھی۔ آرق یقیناً" مارکوف
موت کا ذمہ دار مجھے ہی سمجھ رہا تھا یعنی میں اس کی
میں غدار تھا۔ مجھے ان دونوں ہی ٹھکانوں کا علم تھا
مستقل یا عارضی طور پر رہتے تھے۔ اس
میں ان کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ کوئی نیا ٹھکانہ
لرتے۔

کسی نے پیچھے سے دھکا دیا تو میں چونکا۔ مجھے
قدم اٹھانے کے لیے کہا جا رہا تھا۔ مجھ سمیت تمام
قیدیوں کو ایک بڑے سے غار میں لے جایا گیا جس میں
دو مشعلیں روشن تھیں۔ ہمارے ساتھ مسلح افراد تھے
جن کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں نظر آ رہی تھیں۔

اس غار میں آرق تھا اور اس کے ہمراہ ایک دوسرا
شخص! وہ دوسرا شخص بھی مقامی باشندہ ہی دکھائی دے
رہا تھا۔ اس شخص کو میں نے پہلے بھی آرق کے ساتھ
دیکھا تھا۔ وہ غالبا" آرق کا نائب تھا۔ مارکوف کی زندگی
میں جو حیثیت آرق کی تھی، غالبا" اب وہی حیثیت
اس شخص کی تھی کیونکہ آرق نے ایک طرح سے
مارکوف کی جگہ سنبھال لی تھی۔

جب میں غار میں داخل ہوا تو آرق نے مجھے بڑی
کینہ توز نگاہ سے گھورا، پھر جب میں اس کے قریب
لے جایا گیا تو وہ انتہائی حقارت آمیز لہجے میں بولا۔ "تو
سمجھتا تھا کہ غداری کر کے یہاں سے فرار ہونے میں
کامیاب ہو جائے گا مگر دیکھ لے کہ تو جکڑ لیا گیا۔ میں
نے مارکوف کے مرنے کی خبر سن کر جو عہد کیا تھا، وہ پورا
کیا۔"

"آرق! تو غلط فہمی کا شکار ہے۔" میں نے ہمت کر
کے کہہ دیا۔

میری بات سن کر وہ وحشیانہ انداز میں ہنس پڑا، پھر
دانت پیس کر بولا۔ "سن بوغا! میں میخائیل کا سادہ لوح
بیٹا مارکوف نہیں ہوں جو تیرے فریب میں آ جاؤں گا۔
میں تو اس سے بھی کہتا تھا کہ تجھ پر اعتماد نہ کرے مگر وہ
نہ مانا اور اور وہ ہمیں تنہا چھوڑ گیا۔ اب ہماری زندگی کا
مقصد انتقام اور صرف انتقام ہے۔ ہم منگولوں سے
اس وقت تک مارکوف کی موت کا بدلہ لیتے رہیں گے
جب تک زندہ ہیں۔ اب ہمارے مرنے اور جینے کا
مفہوم بدل چکا ہے۔ پہلے ہم مارکوف کو برسر اقتدار
لانے کے لیے لڑ رہے تھے مگر اب صرف انتقام کی
خاطر لڑیں گے۔"

"اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟" میں نے اس کے چپ
ہوتے ہی کہا۔

"ہماری موت!" اس نے بڑے اطمینان سے
جواب دیا۔ "لیکن یہ یاد رکھ بوغا کہ ہم میں سے ہر

شخص' ایک کے بدلے میں چوگنے منگولوں کو قتل کر کے مرے گا اور یہ بھی سن لے کہ۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی نگاہ میرے بائیں بازو پر جمی ہوئی تھی۔ جس میں تیر پیوست تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔

"ارے تیرے بازو میں تیر ابھی تک گھسا ہوا ہے۔" بظاہر اس کا لہجہ ہمدردانہ لگ رہا تھا مگر میں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہا ہے۔

معاً" اس کا ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے میرے بازو میں پیوست تیر کو ایک جھٹکا دیا۔ میرے منہ سے ضبط کی کوشش کے باوجود ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"مارکوف کا دوست اور اس حال میں۔" اس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔" بڑا افسوس ہو رہا ہے تیری حالت دیکھ کر!" یہ کہتے ہی اس نے دوبارہ تیر پکڑ کر کھینچا۔

میں چیخ پڑا کیونکہ تیر میرے بازو کے گوشت کو چیرتا ہوا نکل گیا تھا۔ آرق نے خون آلود تیر کو ایک طرف پھینک دیا اور میرے بازو سے خون ٹپکنے لگا۔ میں نے اپنے دونوں ہونٹ بھینچ لیے۔

اسی وقت میری سماعت سے آرق کی آواز پھر ٹکرائی۔ وہ ایک طرف انگلی اٹھا کر کہہ رہا تھا۔" یہ لڑکی' منگول لڑکی شاید تیری بیوی ہے یا محبوبہ!"

میں خاموش رہا۔ اس نے اپنا سوال پھر دہرایا تو میں غصے اور نفرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔

"میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں' کوئی نہیں۔"

"ہوں!" آرق ہنکارا بھر کے ہنس پڑا' پھر بولا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ضرور اس سے تیرا کوئی رشتہ ہے اور تو اسے بچانا چاہتا ہے۔"

"اگر تو یہی سمجھ رہا ہے تو سمجھتا رہ!" میں کراہ کر بولا۔

"اس لڑکی کو پچھاڑو اور اس کے سامنے گلے پر خنجر پھیر دو!" آرق نے اپنے مسلح ساتھیوں کو حکم دیا۔

"نن' نہیں' نہیں!" جادیقہ چیخ پڑی۔" یہ ٹھیک کہہ۔" وہ اپنا جملہ پورا نہیں کر سکی۔ شاید خوف کے سبب اس کا گلا خشک ہو گیا تھا اور آواز نہیں نکل رہی تھی۔

آرق کے مسلح ساتھیوں نے جادیقہ کو کسی جانور کی طرح غار کے پتھریلے فرش پر گرا لیا' اور پھر ان میں سے ایک نے جادیقہ کی ٹھوڑی اوپر اٹھا دی اور دوسرے نے اس کے گلے پر تیز خنجر کی دھار رکھ دی۔

میری نگاہ جادیقہ کی گردن سے ابلتے ہوئے خون پر جمی ہوئی تھی۔ اس وقت میں عجیب سے احساس کا شکار تھا۔ ایک طرف میرے دل میں جادیقہ کے نفرت کے جذبات تھے اور دوسری طرف اسے ہلاک ہوتے دیکھ کر مجھے دکھ سا ہو رہا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر اس لڑکی کا کیا قصور تھا؟ کیا اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ منگول تھی اور اس قصور میں قتل کر دی گئی تھی؟ میں نے اس طرف سے نگاہ ہٹالی کیونکہ اس کا جسم بری طرح تڑپ رہا تھا اور اس کے ہوئے نرخرے سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

میری نظر آرق پر پڑی جو مجھے ہی گھور رہا تھا۔ نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر کہا۔" کیوں منظر ہے؟ کیا اب مزید دیکھنے کی تاب نہیں؟ اب دے کہ یہ تیری کون تھی؟"

"اب تو یہ جان کر کیا کر۔۔۔۔۔"

"اچھا نہ بتا!" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔" حیران تو ہو گا کہ مجھے تیرے فرار کا علم کس طرح گیا؟"

"اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے!" میں بازو کی تکلیف برداشت کرتے ہوئے کہا۔" کیا علم نہیں کہ قلعے میں بھی۔۔۔۔ آہ قلعے میں تم لوگوں کے لیے جاسوسی کرنے والے موجود ہیں۔"

میری بات سن کر آرق چونک سا گیا مگر بولا نہیں۔

اسے خاموش دیکھ کر مجھ میں مزید گفتگو کرنے کی ہمت پیدا ہوئی۔ مجھے بہرحال اس کی غلط فہمی تو دور کرنی ہی تھی۔ میں نے کہا۔

ارق! کیا تو وہ رات بھول گیا جب مارکوف اور
کے ساتھیوں کو میں نے قلعے کے قید خانے سے
رایا تھا؟ کیا اس رات تو بھی مارکوف کے ساتھ نہ

کہنا کیا چاہتا ہے؟" وہ بگڑ کر بولا۔
صرف یہ کہ تو اور تیرے ہم وطن میری طرف
یک بڑی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔" میں نے
رسائی۔ ہر چند کہ اس وقت قیدیوں کی حیثیت
س غار میں منگول سپاہی بھی موجود تھے مگر مجھے
کوئی پروا نہیں تھی۔ اگر میں آرق کو یہ یقین
میں کامیاب ہو جاتا کہ مارکوف کو میں نے قتل
کیا تو ان سپاہیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر
ن پر میری حقیقت عیاں ہو رہی تھی۔
ڈ پھر کوئی چال چل رہا ہے' میرے ساتھ بھی تو
ی فریب دینا چاہتا ہے۔" آرق پرجوش انداز
لا۔
سوچ کہ اگر میں مارکوف کا دشمن ہوتا تو اسے
کے منہ سے کیوں نکالتا؟" میں نے لوہا گرم دیکھ
ب اور ضرب لگائی۔
تو پھر تو نے اسے دھوکا دے کر کیوں قتل کیا؟ اور
ں لاش قلعے لے گیا؟" آرق غصے سے پھنکارا۔
میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ وہ۔۔۔۔"
تو جھوٹا ہے۔" آرق میری بات کاٹ کر دہاڑا۔
میں چاہتا ہو گا کہ سردار بکو کا عزت پائے اور اسے
ت سے نوازا جائے کیونکہ اس نے مارکوف کو اور
پکڑا تھا۔"
کیا صرف اتنی سی بات کی خاطر ایک دشمن کو فرار
ے کا موقع دیا جا سکتا ہے؟" میں بولا۔
تو خود بھی تو اسی رات پیچھے پیچھے یہاں آ گیا تھا' اور
آخر کار تو اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہوا۔"
ں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا' پھر وہ چند لمحے
ے کے بعد سخت لہجے میں بولا۔
میں جانتا ہوں کہ تو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا
اور تیرے دل میں جو ہوتا ہے' وہ ظاہر نہیں ہونے
دیتا۔ جان لے اور اچھی طرح جان لے کہ میں تیرے
فریب میں نہیں آؤں گا۔"
"آرق! کیا تو یہ سننا بھی نہ چاہے گا کہ مارکوف
کیوں' کب کیسے اور کن حالات میں مارا گیا؟" میں
نے اس کے غصے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ میں
اس دوران سوچ چکا تھا کہ سولدہ کے ذکر کو چھوڑ کر
سب کچھ بتا دوں گا۔ سولدہ کے دشمنوں کو میں اپنے
لیے قطعی اجنبی بتا سکتا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ خود انہوں
نے ہی مجھے اور مارکوف کو چھیڑا تھا۔ یہ اس لیے
ضروری تھا کہ سولدہ کا ذکر نہ آنے پائے۔ اگر میں اس
کا ذکر کرتا بھی تو بھلا کس طرح کسی کو اس کے وجود کو
یقین دلا سکتا تھا جب کہ خود میں بھی اسے پوری طرح
نہیں سمجھ پایا تھا۔
میری بات سن کر آرق چند لمحے مجھے گھورتا رہا' پھر
بولا۔
"ہر چند کہ میں جانتا ہوں تو جھوٹ بولے گا مگر میں
تیری کہانی ضرور سنوں گا تاکہ تجھے مرنے سے پہلے یہ
دکھ نہ ہو کہ اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکا۔"
میں نے کچھ دیر پہلے جو سوچا تھا' سب کچھ کہہ دیا۔
"وہ اجنبی کون تھے؟" آرق نے سوال کیا۔
"میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔" میں نے
جواب دیا۔ "لیکن وہ دشت کے رہنے والے ہرگز
نہیں تھے۔"
"اگر تیری کہانی سچ مان لی جائے تو تیرے پاس اس
بات کا کیا جواب ہے کہ تو مارکوف کی لاش لے کر ہم
تک کیوں نہیں پہنچا؟ پھر یہ کہ تو نے زخمی ہونے کے
باوجود قلعے تک کا سفر کس طرح طے کیا' تیرے پاس
سواری کہاں سے آ گئی؟ اطلاع کے مطابق جب تو قلعے
میں پہنچا تو گھوڑے پر سوار تھا۔ کیا تو نے پہلے ہی سے
وہیں کہیں ایک گھوڑا نہیں چھپا دیا تھا۔" آرق پے
در پے سوال کر گیا۔
"میں مارکوف کی لاش اس لیے غاروں میں اٹھا کر
نہیں لے گیا کہ تم لوگ میری بات پر یقین نہیں کرو
گے جیسا کہ اب ظاہر ہو رہا ہے۔" میں نے آرق کے

پہلے سوال کا جواب دیا۔ اب میرے بازو سے خود بخود خون بہنا بند ہو گیا تھا مگر زخم میں بدستور تکلیف تھی اور خون بہنے کے سبب میں کمزوری بھی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے آرق کے دوسرے سوال کا جواب دیا' بقیہ سوالات اسی ایک سوال سے متعلق تھے۔ "وہ گھوڑا انہیں پراسرار دشمنوں میں سے کسی ایک کا تھا جنہوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ میں نے اس گھوڑے کو وہیں بھٹکتے ہوئے پایا تھا اور اسی پر بیٹھ کر قلعے کی طرف گیا تھا۔"

آرق کے چہرے سے اب تذبذب کا اظہار ہونے لگا تھا۔ جب وہ کچھ دیر بعد بولا تو اس کے لہجے میں پہلے جیسی سختی نہیں رہی تھی۔

"تو کچھ بھی کہہ اور کوئی بھی دلیل دے مگر موت سے نہیں بچے گا۔" آرق بولا۔ "تو خود اپنی زبان سے مارکوف کے قتل کا اعتراف کر نہ کر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

پھر آرق نے اپنے ساتھیوں کو میرے بارے میں جو حکم دیا' اسے سن کر میری کچھ جان میں جان آئی کیونکہ اگر وہ چاہتا تو مجھے اسی وقت قتل کرا سکتا تھا۔

آرق کے ساتھی مجھے گھسیٹتے ہوئے غار سے باہر لے گئے اور پھر انہوں نے غاروں سے باہر ہی اندھیرے اور سردی میں میرے "قیام" کا بندوبست کر دیا۔

انہوں نے کچھ کچھ فاصلے پر چار بڑی بڑی لوہے کی میخیں زمین میں گاڑ دیں' پھر میرے جسم سے رسیاں کھول کر اسے زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اس کے بعد مجھے ٹھنڈی پتھریلی زمین پر چت لٹا کر' زنجیروں کے سرے مضبوطی سے ان چاروں میخوں میں باندھ دیے۔

کچھ دیر بعد ہی وہ مجھے تنہا چھوڑ گئے۔ وہاں اندھیرا تھا اور انتہائی سردی! میرے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں میں لوہے کی زنجیر کے حلقے تھے۔ انہوں نے میرے جسم کو اس طرح کسا تھا کہ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھ پیروں کے جوڑ نکل جائیں گے۔ بازو کا زخم سردی سے اکڑ کر میرے لیے مزید تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ میرے دونوں طرف کچھ کچھ فاصلے پر غاروں کے دہانے نظر آ رہے تھے جن میں سے ایک تاریک تھے اور کچھ میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ آرق کے ساتھی مجھے وہاں یوں تنہا نہیں چھوڑ گئے ہوں گے۔ وہ یقیناً" کسی قریبی غار میں ہوں گے اور میری نگرانی کر رہے ہوں گے۔ منگول قیدیوں کے بارے میں مجھے یقین سا تھا کہ انہیں ہلاک کر دیا گیا ہو گا۔

تقدیر میرے ساتھ عجیب کھیل کھیل رہی تھی۔ میرے دوست تھے وہ دشمن بن گئے تھے اور جو حقیقی دشمن تھے مجھے اپنا دوست سمجھ رہے تھے۔ ساری رات میں سردی میں ٹھٹھرتا رہا۔ نیند تو خیر کیا آنی تھی ہاں کبھی کبھار ذہن پر غشی کا سا حملہ ضرور ہوا۔ سردی بھوک پیاس اور زخم کی تکلیف نے مجھے ایک رات میں نڈھال کر دیا۔

صبح ہوئی تو غار جیسے جاگ اٹھے۔ میرے گرد لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ وہ میری طرف تھوک کر اپنی نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں' جل رہا تھا اور سینہ جل رہا تھا مگر کون تھا وہاں جو میرے سلگتے ہوئے وجود پر شبنم بن کر برستا۔ مجھے اس وقت سولدہ یاد آ رہی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں ہو گی اور اس نے میری حالت کی خبر بھی ہو گی یا نہیں؟ اس نے کہا تھا کہ میری طرف سے غافل نہیں رہے گی۔ کیا اس نے ٹھیک کہا تھا؟ میں غنودہ ذہن سے سوچتا رہا۔

میرے اطراف سے لوگوں کا ہجوم رفتہ رفتہ چھٹنے لگا۔ اب سورج کی کرنیں براہ راست میری آنکھوں پر چبھنے لگی تھیں۔ ابتدا میں تو مجھے سورج کی گرمی سے سکون سا محسوس ہوا مگر کچھ وقت گزر جانے کے بعد سورج کی تپش مجھے ناگوار ہونے لگی۔ اسی وقت میں نے اپنی جانب قدموں کی چاپ بڑھتے ہوئے محسوس کی میں نے سر گھما کر دیکھا۔ آرق چلا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو افراد اور بھی تھے اور مجھے ان کے ہاتھوں میں چمڑے کے کوڑے نظر آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میرا جسم تن سا گیا۔

آرق نے قریب آکر میری پسلیوں پر ٹھوکر لگائی' پھر بولا۔ "تو سمجھ رہا ہوگا کہ شاید میں تیری باتوں میں آگیا۔ تو سن کہ ایسا نہیں۔ میں تجھے قتل ضرور کروں گا مگر اس سے پہلے نہیں جب تک تو خود اپنی زبان سے نہ کہے کہ تجھے قتل کردیا جائے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔

دوسرے ہی لمحے میرے جسم پر کوڑے برسنے لگے۔ وہ دونوں بیک وقت مجھ پر کوڑے برسا رہے تھے اور آرق قریب کھڑا ہوا تماشا دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر' ہاں بس کچھ دیر تو میں نے اپنی چیخوں کو قابو میں رکھا مگر پھر برداشت نہ کرسکا۔

نہ جانے کب تک مجھ پر کوڑے برستے رہے اور نہ جانے کب تک میں چیختا رہا' مجھے یاد نہیں۔ ہاں اتنا احساس ضرور ہے کہ چیختے چیختے میرا گلا خشک ہوگیا تھا اور میں نے پانی مانگنا چاہا تھا مگر شاید میرے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ پھر میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔

ہوش آیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں دہکتے ہوئے انگاروں پر لیٹا ہوا ہوں۔ میں جن پتھروں پر بندھا پڑا تھا' وہ سورج کی تپش سے انگاروں کی طرح دہک رہے تھے اور میرا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ میرے جسم پر موجود لباس دھجیوں میں تبدیل ہوگیا تھا۔

میرے ہونٹوں سے اب پھر کراہیں اور سسکیاں بلند ہونے لگی تھیں۔ ہوش میں آنے کے بعد مجھے فوری طور پر یہ احساس ہی نہ ہوسکا کہ کوئی میرے قریب کھڑا ہوا تھا۔ میں اس کی موجودگی سے اس وقت باخبر ہوا جب وہ غاروں کی طرف بڑھا۔ میں اپنے قریب اس کی موجودگی کا مقصد نہ سمجھ سکا' پھر یہ کہ وہ میرے ہوش میں آتے ہی وہاں سے کیوں چلا گیا تھا' یہ بھی عجیب سی بات تھی۔ نہ جانے وہ کون تھا! میں نے صرف اس کی پشت دیکھی تھی۔

تو مجھے یوں ہلاک کیا جائے گا! میں نے سوچا' بھوکا پیاسا رکھ کر' اذیتیں دے کر! کیا جینے کی کوئی راہ نہیں؟ یہ سوچتے ہوئے میں نے سخت تکلیف کے باوجود اپنے دونوں ہاتھوں پر زور دیا اور چیخ اٹھا۔ لوہے کے حلقے میری کلائیوں کے جوڑ میں گڑنے لگے تھے اور مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے دونوں ہاتھ جوڑوں سے نکل جائیں گے۔ میں نے دونوں ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔ میں اپنے جسم کو معمولی سی جنبش دیتے ہوئے بھی تکلیف محسوس کر رہا تھا اور یوں بھی مجھے اس طرح باندھا گیا تھا کہ نہ میں کروٹ لے سکتا تھا' نہ اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ کیا یونہی مرنا مقدر ہے؟ میں نے سوچا اور آنکھیں بند کرلیں۔ کوڑوں کی ضربوں سے میرے سینے' پیٹ اور ٹانگوں کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑ گئی تھی اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔ نقاہت اور تکلیف کے سبب مجھے چکر سے آرہے تھے۔ میں اس وقت چونکا جب قریب ہی بہت سے قدموں کی چاپ ابھری۔

میں نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور مجھے آرق کا چہرہ نظر آیا۔ پھر جب میں نے منگول سپاہیوں کو آرق کے ساتھیوں کے نرغے میں دیکھا تو چونک اٹھا۔ انہیں زندہ دیکھ کر مجھے حیرت ہونی چاہیے تھی۔

"بوغا! کل رات تو نے مجھے جو کہانی سنائی تھی' وہ ان منگول سپاہیوں نے بھی سنی تھی۔" آرق عجیب سے لہجے میں بولا۔ "تو نے کہا تھا کہ مارکوف تیرے ہاتھوں نہیں مارا گیا اور تو اس کا دوست تھا۔ بول کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔؟"

میں خاموش رہا کیونکہ اس کی بات میرے پلے نہیں پڑی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔!

مجھے خاموش دیکھ کر وہ ہنسا' پھر بولا۔ "میں نے سوچا ہے کہ ان سپاہیوں کو آزاد کردوں۔ یہ قلعے میں پہنچ کر وہ کہانی سنادیں گے جو انہوں نے یہاں تیری زبانی سنی ہے۔ میں نے ٹھیک ہی سوچا ہے نا۔؟"

میں اس کی بات سن کر کانپ اٹھا۔ وہ میرا مستقبل تاریک کرنے کی باتیں کر رہا تھا۔ اب میں اس عیار کا مقصد اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

"نہیں!" میں نے چیخ کر کہا' مگر صرف اپنی دانست میں! نقاہت کے سبب میری آواز بلند نہ ہوسکی تھی۔

"کیوں' کیا ڈر گیا؟" آرق یہ کہہ کر ہنس پڑا۔

"ہاں میں ڈر رہا ہوں مگر تیرے انجام سے!" میں

نے بمشکل کہا۔

"کیا کہہ رہا ہے تو؟ مجھے تیری آواز سنائی نہیں دے رہی۔" آرق یہ کہہ کر میرے چہرے کی طرف جھکا۔

میں نے زور لگا کر اپنی بات دہرا دی۔ پھر خشک ہونٹوں پر سوکھی زبان پھیرتے ہوئے پانی مانگا۔

"ان چیزوں کی طلب نہ کر جو اب تیرے مقدر میں نہیں۔" آرق نے حقارت سے کہا' پھر بولا۔ "تو نے ابھی یہ کہا کہ تو میرے انجام سے ڈرتا ہے۔؟"

"تو شاید اپنی عقل کھو بیٹھا ہے جو ان منگول سپاہیوں کو رہا کر دیا ہے۔" میں نے حتی الامکان بلند آواز میں کہا۔ "کیا اس طرح منگولوں کو تیرے اس ٹھکانے کا علم نہ ہو جائے گا اور کیا وہ تجھے یہاں آنہ لیں گے۔"

"تو بہت بھولا ہے اس لیے آرق کو نہیں سمجھ سکتا۔" وہ یہ کہہ کر نفرت انگیز انداز میں ہنس پڑا' پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر حکم دیا۔ "ان منگولوں کو رہا کر دو۔!"

جب آرق نے یہ الفاظ ادا کیے تو مجھے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سپاہیوں کے جسموں کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کر دیا گیا۔

"بھاگو' اگر زندگی چاہتے ہو تو بھاگو!" آرق چیخا اور اسی کے ساتھ پانچوں منگول سپاہی اس طرح بھاگ کھڑے ہوئے جیسے موت کے منہ سے نکل کر بھاگ رہے ہوں اور حقیقت بھی یہی تھی وہ موت کے منہ ہی میں تو تھے۔

میری دنیا جیسے تاریک ہو گئی۔ میں نے ڈوبتے دل کو سنبھالا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آرق نے میری راہیں مسدود کر دی تھیں۔ اگر اب میں زندہ بھی بچ جاتا تو دوبارہ منگولوں کے درمیان واپس نہیں جا سکتا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ آرق ان منگول سپاہیوں کو رہا کرنے کے بعد یہ ٹھکانا یقیناً "چھوڑ دے گا مگر میں غلط سوچ رہا تھا مجھے چند لمحوں بعد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ آرق مجھ سے کھیل رہا تھا۔ وہ جسمانی اذیت کے ساتھ مجھے ذہنی اذیت بھی پہنچا رہا تھا۔

یکے بعد دیگرے میں نے کئی چیخیں سنیں اور آنکھیں کھول دیں۔ میں نے بھاگتے ہوئے منگول سپاہیوں میں سے تین کو زمین پر گر کر تڑپتے ہوئے دیکھا۔ ان کے سینوں میں تیر پیوست ہو گئے تھے۔ ان میں سے دو اپنی جگہ کھڑے اس طرح لہرا رہے تھے جیسے بس گرنے ہی والے ہوں۔ ان کی پشت میری طرف تھی اس لیے میں یہ نہ دیکھ پایا کہ وہ اپنے سینے کیوں تھامے ہوئے تھے لیکن جب وہ پلٹے تو مجھے ان کے سینوں میں خنجر پیوست نظر آئے۔ ان سے کچھ فاصلے ہی پر ایک غار کے سامنے آرق کے کچھ ساتھی نظر آ رہے تھے۔ غالباً "انہوں نے ہی بھاگنے والوں کو شکار کیا تھا۔ قیدیوں کو رہائی کی امید دلا کر' انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔ شاید اسی لیے آرق نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اسے نہیں سمجھ سکتا۔ جن دو منگولوں کو خنجر پھینک کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی' وہ اب زمین پر گر چکے تھے اور آرق قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ وہ قہقہے لگاتا ایک دم چیخ اٹھا۔

میں نے آرق کی طرف نگاہ اٹھائی تو اسے سینہ تھامے دیکھا۔ اس کے سینے میں خنجر گھسا ہوا تھا۔ غالباً "ان مرنے والوں یا شاید زخمیوں میں سے کسی نے اس کی طرف خنجر پھینکا تھا اور آرق بے خبری میں اس کا شکار ہو گیا تھا۔

پھر میں نے آرق کے کچھ ساتھیوں کو زخمی منگولوں کی طرف دوڑتے دیکھا۔ انہوں نے تلواریں نکالیں اور زخمیوں کی گردنیں اڑا دیں جو اچھل کر دور جا گریں۔ آرق کے کچھ ساتھی اسے سنبھالے ہوئے غار کی طرف لے گئے۔ اس کے سینے میں خنجر گھسا ہوا تھا اور لباس خون سے بھیگ رہا تھا۔ آرق کو وہ موت کا تماشا بہت مہنگا پڑا تھا۔

میں پھر وہاں تنہا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد پیاس کی شدت بڑھنے لگی اور میرے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ دھوپ' تیز دھوپ میرے زخموں میں مرچیں بھر رہی تھی۔ مجھ پر نیم بے ہوشی سی طاری ہو گئی اور پھر اسی حالت میں پڑے پڑے دن گزر گیا۔

ٹھنڈک کے احساس نے میرے حواس کو کچھ دیر کے لیے بیدار کیا' اور پھر دوبارہ میں غفلت کا شکار ہونے لگا۔ اب میں اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہونے لگا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کاش اس موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا کیے جانے کی بجائے آرق مجھے فوراً" قتل کر دیتا۔ اس نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ مجھے اس وقت تک قتل نہیں کیا جائے گا جب تک میں خود اپنے قتل ہونے کے لیے نہیں کہوں گا اور اب میں قتل ہونا چاہتا تھا۔

"میں قتل ہونا چاہتا ہوں! قتل کر دے' مجھے قتل کر دے آرق!" میں شاید چیخا تھا مگر میری آواز ہونٹوں ہی میں رہ گئی تھی۔

نہ جانے وہ شخص زندہ بھی تھا یا نہیں جسے میں پکار رہا تھا! میں نے اس کے سینے میں دستے تک خنجر پیوست دیکھا تھا۔ مرنے والے نے غالباً" پوری قوت سے اس کی طرف خنجر پھینکا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد ہی پھر اپنے ذہن پر غبار سا چھاتا ہوا محسوس کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا دل ڈوب رہا ہو اور میری موت مجھ سے قریب آگئی ہو۔ ہر طرف اندھیرا تھا اور میں موت کے قدموں کی آہٹیں سن رہا تھا جو لحہ بہ لحہ میرے قریب آتی جا رہی تھیں' پھر وہ آہٹیں جیسے میرے قریب آکر رک گئیں اور میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔

مجھے علم نہیں کہ میں کب تک اسی عالم میں رہا۔ ہاں مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ ہوش اور بے ہوشی کی ملی جلی کیفیت کے درمیان میں نے اپنے قریب ایک مانوس سی خوشبو محسوس کی تھی' اور پھر میرے ہونٹوں پر نمی سی لگی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ اور وقفے وقفے سے مجھے یقین سا آنے لگا کہ میں زندہ ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے آنکھیں کھولنا چاہی تھیں۔ اسی وقت میری سماعت میں شہد سا گھل گیا تھا۔ مجھے ایک مانوس آواز سنائی دی۔ وہ آواز جو میرے لیے زندگی کا پیغام تھی۔ ہاں وہ آواز سولدہ کی تھی اور سولدہ ہی مجھے پکار رہی تھی۔

سولدہ آخر کار مجھے بچانے آہی گئی۔ اب میں زنجیروں کی قید سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں نے سوچا اور آنکھیں کھول دیں۔

"سو... سول... سولدہ!... تو مجھے... مجھے یہاں سے بچا کر لے... لے جائے گی نا... تو... مجھے... مجھے مرنے نہیں دے گی سولدہ۔؟" میرے ہونٹ ہلے اور اس پار ان سے الفاظ بھی ادا ہوئے۔

"بوغا! تو اب آرق کی قید میں نہیں' میرے پاس ہے۔ تجھے اس کی قید سے رہا ہوئے پورا ایک دن اور ایک رات ہو چکی ہے اور..."

سولدہ کے بقیہ الفاظ سننے سے پہلے ہی مجھ پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ شاید اس نے مجھے دوبارہ آنکھیں بند کرتے دیکھ کر آوازیں بھی دی تھیں مگر میں کوئی جواب نہ دے سکا تھا۔

مجھے پھر نہ جانے کب ہوش آیا۔ جب میرے حواس پوری طرح بیدار ہوئے تو میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ میں ایک غار میں تھا اور تنہا تھا۔ اس غار میں مجھے سولدہ کا عجیب و پراسرار سامان بھی نظر آرہا تھا مگر اس وقت سولدہ وہاں نہیں تھی۔ میں نے اپنے جسم کی طرف توجہ دی۔ میرے بازو کے زخم پر ایک صاف ستھری پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ سینے' پیٹ اور ٹانگوں پر بھی جگہ جگہ کوئی دوا سی چپکی ہوئی تھی۔ اس وقت میرے جسم پر ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا سا لباس تھا جیسا میں نے سولدہ کے دشمنوں کو پہنے دیکھا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر حجاب سا آیا کہ مجھے وہ لباس سولدہ نے پہنایا ہوگا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا تو اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا مگر میرا سر چکرانے لگا۔ میں دوبارہ لیٹ گیا۔ میں اس وقت سولدہ کے جادوئی گدے پر لیٹا ہوا تھا جو انتہائی نرم اور گداز تھا بالکل سولدہ کی طرح میں اس گدے پر بیٹھ کر اچھلنا چاہتا تھا مگر اس وقت اپنی خواہش پوری نہ کر سکا۔

اسی وقت غار کے دہانے پر قدموں کی چاپ گونجی' اور پھر سولدہ آتی دکھائی دی۔ غار میں سولدہ کی متحرک مشعل روشن تھی جسے میں پہلے بھی کئی بار اس کے پاس دیکھ چکا تھا۔ میں نے اسے آتے ہوئے دیکھ کر

دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹا رہ بوغا! لیٹا رہ۔!" سولدہ دور ہی سے ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "میں خود تیرے پاس آ رہی ہوں۔"

چند لمحے بعد ہی وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی' پھر اس نے قریب ہی رکھا ہوا ایک چھوٹا سا لوہے کا صندوقچہ اپنی طرف کھسکایا۔ میں اسے بغور دیکھتا رہا۔ وہ صندوقچے سے کچھ نکال رہی تھی اور میری طرف متوجہ نہیں تھی۔

"سولدہ!" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"بس کچھ دیر خاموش رہ بوغا۔!" اس نے میری طرف دیکھے بغیر صندوقچی سے ایک عجیب سی نوکدار چیز نکالی' پھر مجھ سے بولی۔ "لا اپنا دایاں بازو ادھر کر۔" اس نے یہ کہتے ہوئے اس نوکدار چیز کا سرا دبایا۔ نوک سے پانی جیسے چند قطرے گرے۔ وہ پانی اس عجیب چیز میں بھرا ہوا تھا۔ سولدہ نے اس کی نوک کو کسی چیز سے صاف کیا۔

"تو کیا..... کیا کر رہی ہے یہ۔؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنا بازو اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اس میں دوا ہے' طاقت کی دوا۔!" سولدہ نے نوکدار چیز ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ دوا میں تیرے جسم میں داخل کروں گی۔ تجھے بس ذرا سی تکلیف ہو گی جسے برداشت کر لینا۔!"

"اچھا!" میں نے سر ہلایا' پھر بولا۔ "تو مجھے یہ دوا پلا کیوں نہ دے۔!"

"یہ پلانے کی دوا نہیں ہے۔" وہ مسکرا کر بولی اور پھر میرے لباس کی آستین الٹنے لگی۔

میں خاموشی سے اس کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے میرا بازو ننگا کر کے اس پر کوئی دوا لگائی' پھر وہ نوکدار چیز میرے گوشت میں اتار دی۔

"آہ!" میرے منہ سے نکلا اور میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

اس نے وہ ساری دوا میرے جسم میں اتار دی اور پھر وہ نوکدار چیز باہر کھینچ لی۔ اس چیز کو دھو کر صندوقچے میں رکھنے کے بعد سولدہ نے اس میں سے دو خوبصورت سی چھوٹی چھوٹی رنگین گولیاں نکالیں اور مجھ سے بولی۔ "انہیں منہ میں رکھ لے! میں پانی دیتی ہوں۔ تجھے یہ گولیاں چبانی نہیں نگلنی ہیں۔"

میں نے اس سے گولیاں لے کر منہ میں ڈال لیں' پھر اس نے ایک ہلکے پھلکے خوبصورت برتن میں ٹھنڈا پانی دیا جسے میں پی گیا اور اسی کے ساتھ دونوں گولیاں بھی نگل گیا۔

پھر میں نے سولدہ کو بتایا کہ مجھے قراقرم سے طلب کیا گیا تھا اور میں وہیں جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اسے تمام گزشتہ حالات و واقعات سے بھی مطلع کر دیا' پھر آخر میں بولا۔ "میں فکر مند ہوں کہ مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے۔ کیا تو اپنی پراسرار قوتوں سے کام لے کر مجھے نہیں بتا سکتی کہ مجھے کیوں بلایا گیا ہے۔؟"

"منگولوں کی جنتری کے مطابق غالباً" یہ چوہے کا سال ہے۔!"

سولدہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

"ہاں!" میں نے تصدیق کی۔

"تو پھر جیسا کہ مجھے یاد پڑتا ہے' وہی بات ہے۔ تیری طلبی کا یہی مقصد ہو سکتا ہے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا مقصد؟" میں نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہاں کل تجھے کچھ ضرور بتا سکوں گی۔" اس نے جواب دیا' پھر اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے بتایا کہ آرق مر چکا ہے اور اس کی موت کے بعد اب باغیوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ برقائی خاں کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہو چکا ہے اور باغی اب پہاڑوں سے نکل کر آبادیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ سولدہ نے یہ بھی بتایا کہ وہ میری طرف سے فکر مند تھی۔ اسے بھی باغیوں کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ مارکوف کی موت کے بعد میری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ سولدہ اسی لیے ان پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اسی غرض سے وہ بار بار پہاڑوں کے چکر کاٹ رہی تھی۔ جس

شب میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا' اسی شب آرق کی حالت خراب ہوگئی تھی اور اس کے تمام ساتھی اسی کے پاس جمع تھے اس لیے سولدہ کو مجھے وہاں سے لانے میں کوئی قباحت نہیں ہوئی۔ مجھے اس کی یہ بات سن کر حیرت ہوئی تھی کہ وہ مجھ جیسے تن و توش کے شخص کو تن تنہا گھوڑے کی پشت پر ڈال کر لے آئی تھی مگر وہ سولدہ تھی۔ وہ ایسا کر سکتی تھی۔

میں نے سولدہ سے اس کے دشمنوں کا حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ کچھ دنوں کے لیے وہ انہیں چکر دینے میں کامیاب ہوگئی ہے اور اب زیادہ فکر کی بات نہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود اپنے کئی دشمنوں کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو چکی ہے جس کے سبب اب دشمن اس سے کچھ خوف کھانے لگے ہیں اور دور دور رہنے لگے ہیں۔

"دشمن اس وقت سے مزید خوفزدہ ہو گئے ہیں جب تو نے ان پر حملہ کیا تھا۔" سولدہ بتا رہی تھی۔ "نہیں یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ مختلف زمانوں میں جو میرے دوست ہیں' وہ میری مدد کر رہے ہیں۔"

مجھے سولدہ کی زبان سے یہ بات سن کر عجیب سی خوشی کا احساس ہوا اور میں نے خود پر فخر سا محسوس کیا کہ میں بھی اس کے کام آسکتا ہوں۔

سولدہ سے باتیں کرتے کرتے مجھے غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ "مجھے نیند آرہی ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

"ہاں' یہ اس دوا کا اثر ہے جو میں نے تیرے جسم میں اتاری تھی۔ تو سوجا اور میں بھی کچھ دیر آرام کر لیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ میرے قریب ہی لیٹ گئی۔

میں نے اس کی طرف کروٹ لے لی۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے سر کے نیچے رکھ دیا۔ اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی مخصوص خوشبو مجھے اپنے سانسوں میں اترتی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور پھر نہ جانے کب سو گیا!

آنکھ کھلی تو میں حیران رہ گیا۔ نہ وہ غار تھا' نہ سولدہ اور نہ میرے جسم پر وہ لباس جو میں پہنے ہوئے تھا۔ میں نے خود کو ایک چٹان کے سائے میں پڑا ہوا دیکھا۔ میرے نیچے نرم گدے کی بجائے پتھریلی زمین تھی اور قریب ہی ایک بڑے سے پتھر سے گھوڑا بندھا ہوا تھا۔

کیا وہ سب کچھ خواب تھا جو میں نے دیکھا تھا؟ سولدہ کہاں گئی؟ اس غار سے میں وہاں کیسے آگیا؟ اور گھوڑا کہاں سے آگیا؟ میرے ذہن میں بے شمار سوالات گردش کر رہے تھے مگر کافی دیر سوچنے کے بعد بھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ یہ بھی سولدہ کی کسی پراسرار قوت کا کرشمہ ہے۔

میں نے اطراف کا جائزہ لیا تو وہ جگہ مجھے اجنبی محسوس نہیں ہوئی۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک کچی سی سڑک نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر ہی میں مجھے یاد آگیا کہ وہ کچی سڑک کدھر جاتی ہے! میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے جسم پر اب دشت میں رہنے والوں کا لباس تھا۔ وہ کچی سڑک شہر کیف کی طرف جاتی تھی۔ میں نے اپنی جسمانی حالت دیکھی تو خود کو اس قابل نہ پایا کہ دوبارہ فوراً ہی تن تنہا قراقرم کا رخ کر سکتا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے شہر کیف پہنچ کر قراقرم کی بجائے قلعے کا رخ کرنا چاہیے۔ میں اس وقت تک قراقرم کا طویل سفر نہیں کر سکتا تھا جب تک اس قابل نہ ہو جاتا۔

قلعے پہنچ کر میں باآسانی اپنی واپسی کا سبب بیان کر سکتا تھا اور اپنی بات کے ثبوت میں جسم پر موجود زخم دکھا سکتا تھا۔ ہاں اگر میرے لیے کوئی قباحت تھی تو صرف یہ کہ مجھے آرق کی قید سے رہائی کی کوئی کہانی گھڑنی تھی تاکہ سولدہ کا ذکر نہ آتا۔ قلعے پہنچ کر مقامی باشندوں کی جانب سے میرے لیے خطرہ ہو سکتا تھا مگر اس کا باآسانی سدباب ممکن تھا۔ میری حفاظت کے انتظامات کیے جا سکتے تھے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کیف کی طرف چل دیا۔

اس وقت دن ڈھل رہا تھا جب میں قلعے پہنچا۔ اب میں قلعے والوں کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ مجھے تنہا

قلعے کے پاس آتے دیکھ کر ان کے چہروں پر حیرت نظر آئی تھی کیونکہ ان کے علم میں تھا کہ میں قراقرم کے لیے روانہ ہوا تھا۔

میں نے ایک توماں باشی سے ابونصار کے بارے میں پوچھا کہ وہ اپنے کمرے ہی میں ہے یا برقائی خاں کے پاس ہے۔!

"وہ تو گزشتہ صبح ہی یہاں سے جا چکا ہے۔" توماں باشی نے بتایا۔

"کہاں۔؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے زیادہ تفصیل کا علم تو نہیں' ہاں اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ کسی دور دراز سفر پر گیا ہے۔" توماں باشی نے جواب دیا۔

"اور عظیم برقائی؟ کیا وہ بھی ساتھ گیا ہے۔؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں' وہ قلعے ہی میں ہے۔"

توماں باشی کی بات سن کر میں نے ایک طویل سانس لیا۔ ابونصار کی وہاں غیر موجودگی نے مجھے کچھ دیر کے لیے پریشان سا کر دیا۔ وہ کہاں گیا ہے' اس سلسلے میں برقائی خاں ہی بہتر بتا سکتا تھا۔ یوں بھی مجھے اس سے ملنا ہی چاہیے تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اسی سے مل لوں۔

میں نے گھوڑے کو پھاٹک پر ہی چھوڑ دیا اور قلعے کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔

برقائی خاں نے مجھے فوراً" ہی ملاقات کی اجازت دے دی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر سخت حیران ہوا تھا۔ میں نے اسے تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے آخر میں کہا۔ "میں موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا اور مسلسل ان زنجیروں کو کھینچ رہا تھا جن سے مجھے باندھا گیا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح کوئی میخ زمین سے نکل جائے تو پھر میں اپنے جسم کو آزاد کرا سکوں گا۔ آخر کار میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔ پھر میں کچھ خورد و نوش کا سامان اور ایک گھوڑا وہاں سے چرا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ آرق کے تمام ساتھی ایک ہی جگہ جمع تھے کیونکہ آرق مر چکا تھا اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہتے تھے اس لیے مجھے فرار ہونے میں آسانی رہی۔ انہی غاروں میں سے ایک دواؤں کی صندوقچی میرے ہاتھ آ گئی تھی۔ اس وقت میری حالت اس قابل نہیں تھی کہ شہر کا رخ کر سکتا۔ میں کسی طرح وہاں سے فرار ہو کر انہی پہاڑوں کے درمیان ایک غار میں چھپ گیا۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ دشمن میرے فرار سے آگاہ ہونے کے بعد مجھے تلاش کریں گے اس لیے میں کئی دن اس غار میں چھپا رہا اور اس دوران خورد و نوش کا سامان ختم ہو گیا تو مجبوراً" میں اس غار سے نکلا۔ پھر میں نے واپسی کا قصد کیا کیونکہ میری حالت اب بھی اس قابل نہیں تھی کہ قراقرم کا طویل سفر کر سکتا۔ اب میں تجھ سے یہ اجازت چاہتا ہوں کہ مجھے چند دن قلعے میں رہنے دے تاکہ میں جسمانی طور پر بالکل صحت مند ہو جاؤں تو قراقرم کا رخ کروں۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

"بوغا! تیری باتیں سن کر مجھے ہمیشہ حیرت ہوئی ہے۔" برقائی خاں طویل سانس لے کر بولا۔ "اور اب بھی تو نے جو کچھ بتایا ہے' وہ بہت حیرت انگیز ہے۔ اگر تو خود مجھ سے یہ باتیں بیان نہ کرتا اور مجھے اپنے سامنے زندہ سلامت نہ نظر آتا تو شاید میں ان باتوں پر یقین نہ کرتا۔ بے شک تو انتہائی بہادر بھی ہے اور ذہین بھی۔!" یہ کہہ کر وہ چند لمحے کو رکا' پھر کہا۔ "ابونصار کے مشورے پر میں نے عام معافی کا اعلان کرا دیا تھا لیکن اب تیری باتیں سن کر میں سوچتا ہوں کہ ایسا غلط ہوا۔ ضرورت معافی کی نہیں' قتل عام کی تھی۔ میں اب اپنا پہلا حکم واپس لے کر قتل عام کا حکم دوں گا۔ تمام مقامی باشندوں کو قتل کر دیا جائے تاکہ آئندہ کسی سازش کا امکان ہی نہ رہے۔" آخری جملے ادا کرتے ہوئے برقائی خاں کے لہجے میں منگولوں کی مخصوص درندگی جھلکنے لگی تھی۔

میں یہ دیکھ کر کانپ اٹھا' پھر ہمت کر کے بولا۔ "اے بگھاتر برقائی! یہ تیری شان کے خلاف ہے کہ تو اپنی زبان پر قائم نہ رہے۔"

"کیا کہنا چاہتا ہے تو۔؟" اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اس کے لہجے کی سختی برقرار تھی۔

"یہ کہ عام معافی کا حکم واپس نہ لے۔!" میں نے وہ بات کہہ ہی دی جو دل میں تھی۔

"تو بہت عجیب اور فراخ دل ہے بوغا! آخر شاگرد کس کا ہے۔!" برقائی خاں ہنس پڑا۔ "اگر تیری جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی دشمنوں کی سفارش نہ کرتا' ان کے لیے جنہوں نے تجھے کئی بار قتل کرنا چاہا اور ان کے لیے جو اب بھی تیری جان کے دشمن ہو سکتے ہیں لیکن اگر تو یہی چاہتا ہے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ ہاں میں تیری زندگی کی خاطر یہ حکم ضرور دوں گا کہ تو قلعے کے اسی حصے میں رہ جہاں میں رہتا ہوں۔ یہاں کوئی غیر منگول نہیں آسکتا۔"

"تیرے حکم کی تعمیل ہوگی اے بگھاتر برقائی۔؟" میں ادب سے جھک کر بولا۔

پھر برقائی کے حکم پر قلعے کے اسی حصے میں میری رہائش کا بندوبست ہو گیا۔ میں اب مطمئن تھا۔ اسی دن برقائی خاں نے ایک قاصد کو قراقرم روانہ کر دیا کہ بوغا بیمار ہو گیا ہے مگر جلد ہی روانہ ہونے والا ہے۔

مکمل درجن بھر دن آرام کرکے میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ میرے زخم مندمل ہو چکے تھے اور جسمانی توانائی بھی بحال ہو گئی تھی۔ مجھ سے پہلے کسی بھی منگول سردار کو یہ اعزاز نصیب نہیں ہوا تھا کہ قلعے کے اس حصے میں رہ سکتا جو صرف خاندان زریں کے افراد کی خاطر مخصوص تھا۔ وہاں میری پوری طرح دیکھ بھال ہوئی۔ صبح و شام جراح آتے رہے اور میرے زخموں پر دوا لگاتے رہے۔ اس کے علاوہ میری خوراک پر بھی خصوصی توجہ دی گئی تاکہ جسمانی توانائی جلد سے جلد بحال ہو سکے۔

میں اس دوران ایک بار پھر برقائی خاں سے ملا تاکہ اس سے ابونصار کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کہاں گیا ہے! مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس نے کہا تھا کہ خود ابونصار اس بات کو راز میں رکھنا چاہتا تھا اور اس نے برقائی خاں کے سوا کسی کو نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ مجھے برقائی خاں کے لہجے سے پتا چل گیا تھا کہ وہ دریافت کرنے کے باوجود کچھ نہیں بتائے گا اس لیے میں نے اصرار نہیں کیا۔

پھر میں ایک صبح برقائی خاں سے اجازت لے کر دوبارہ قراقرم کے لیے روانہ ہوا۔ اس بار میری حفاظت کی خاطر برقائی خاں نے نصف درجن دستے میرے ساتھ کر دیے تھے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ اتنے افراد کی ضرورت نہیں مگر اس نے میری بات نہیں مانی تھی۔ ساتھ میں سامان خورد و نوش بھی کافی تھا اور اس نے مجھے اس بار طلائی لوح بھی دی تھی تاکہ دوران سفر مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہر طرح کی سہولت میسر آسکے۔

جب میں پہلے قراقرم کے لیے روانہ ہوا تھا تو میرے ذہن میں صرف ایک یہی سوال تھا کہ میری طلبی کا کیا مقصد ہے لیکن اس بار کئی اور سوال میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ سولدہ اچانک کہاں چلی گئی؟ اس نے مجھ سے یہ تصدیق کیوں چاہی تھی کہ وہ چوہے کا سال ہے؟ ابونصار کس طویل سفر پر روانہ ہوا ہے؟ اس سفر کا مقصد کیا ہے۔؟

آرق کی موت کے بعد مارکوف کے ساتھیوں کا شیرازہ بکھر گیا تھا اسی لیے اب مجھے ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن نہ جاننے کے باوجود بھی میں بہت چوکنا تھا۔

جب مجھے طاقت کا پہاڑ بورخان قالدون نظر آنے لگا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ یہ وہ جگہ تھی' وہ علاقہ تھا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ خاقان کے شہر کی حدود شروع ہو گئی تھی۔ شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ ہمارے گھوڑوں کی رفتار بہت تیز تھی۔ میرے ہمراہ جو فوجی دستے تھے' وہ پوری طرح میرے گھوڑے کی تیز رفتاری کا ساتھ دے رہے تھے۔

گھوڑے جب تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے آبادی میں داخل ہوئے تو مجھے ایک عجیب سی اداسی اور سوگواری کا سا احساس ہوا۔ الاؤ روشن تھے مگر ان کے اطراف لوگ موجود نہیں تھے اور نہ اکتارا بجا کر گانے والے کہیں نظر آرہے تھے۔ شام کے وقت

قراقرم جس طرح زندہ و بیدار نظر آتا تھا' اس شام نہ تھا۔ میں اس اداسی کو کوئی معنی نہیں پہنا سکا۔ میری طلبی کے سلسلے میں خاقان منگو کا حکم نامہ پہنچا تھا اس لیے قانون کے مطابق قراقرم پہنچتے ہی مجھے اسی کے سامنے حاضر ہونا تھا۔ میں نے اسی لیے اپنے گھوڑے کا رخ خاقان کے محل کی جانب کر دیا۔

پورتوں کے درمیان میں نے راستے میں لوگوں کے بجھے بجھے سے چہرے دیکھے اور میرا ذہن مزید الجھ گیا۔ لوگ کیوں اداس ہیں؟ آخر کار قراقرم پر کیا گزر گئی ہے؟ میں سوچتا رہا اور اسی سوچ میں خاقان کے محل پہنچ گیا۔

محل کے صدر دروازے پر حسب معمول کلہاڑے بردار موجود تھے۔ میرے ہمراہ جو فوجی دستے تھے وہ قطار باندھ کر میرے پیچھے کھڑے ہو گئے اور میں اپنے گھوڑے سے اتر کر صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے اسی دوران میں اپنے چہرے پر بندھا ہوا کپڑا کھول دیا تھا۔

میں جب کلہاڑے برداروں کے قریب پہنچا تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

"عظیم بیگی کا چیتا آگیا۔" ایک کلہاڑے بردار نے کہا اور ادب سے میرے سامنے جھکا۔

دوسرا کلہاڑے بردار کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں بول اٹھا۔ "خاقان کو خبر کرو کہ اس کا خادم بوغا اس کے حکم پر حاضر ہو گیا ہے۔"

ایک کلہاڑے بردار تیزی سے اندر گیا اور وہاں موجود دوسرے میرے اطراف جمع ہو گئے۔ ان کے چہروں سے پتا چل رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر کہتے ہوئے جھجک رہے ہوں۔ میں نے ان سے ایک کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "یقیناً" کوئی ایسی بات ہے جو تم لوگ مجھے بتانا چاہتے ہو۔"

"ہاں!" کلہاڑے بردار نے جواب دیا' پھر بولا۔ "مگر۔۔۔ مگر ہم۔۔۔ ہم اتنا حوصلہ کہاں سے لائیں۔!"

"کیا وہ کوئی دکھ کی بات ہے۔؟" میں نے سوال کیا۔

کلہاڑے بردار نے اثبات میں سر ہلایا' پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "چار بگھاتر بیٹوں کی ماں اپنے چاروں بیٹوں کو چھوڑ کر بوگدو کے پاس چلی گئی۔"

یہ خبر سن کر کہ سرقوشنی بیگی مر گئی' میرے ذہن کو دھچکا سا لگا۔ ہر چند کہ مجھے وحشی منگولوں کی اس عظیم المرتبت عورت سے قطعی محبت نہیں تھی مگر وہ اطلاع میرے لیے قطعی غیر متوقع تھی اس لیے کچھ دیر کے لیے میں گم سم سا ہو کر رہ گیا۔ اب میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ قراقرم کیوں اداس تھا۔!

"ایسا۔۔۔ ایسا کیا ہوا۔؟" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"بس یوں سمجھ اے بوغا کہ چوہے کا سال لگے دو درجن دن گزرے تھے۔" اسی کلہاڑے بردار نے جواب دیا۔

چوہے کا سال! میرے ذہن میں گونجا۔ سولدہ نے بھی تو مجھ سے یہی کہا تھا۔ تو کیا اسے سرقوشنی بیگی کے مرنے کی خبر ہو گئی تھی؟ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے شام تک بتا دے گی کہ میری طلبی کا مقصد کیا ہے۔ کیا میری طلبی کا مقصد سرقوشنی بیگی کی موت سے وابستہ تھا۔؟ میں سوچ رہا تھا' لیکن اس وقت تک تو وہ مری نہیں ہو گی کیونکہ مغربی دشت سے قراقرم پہنچتے ہوئے مجھے تقریباً" نصف سال سے کچھ کم لگا تھا۔ اس وقت چوہے کا سال شروع ہی ہوا تھا اور اب نصف سال ختم ہونے کو تھا۔

میں اس وقت تک خیالوں میں کھویا رہا جب تک وہ کلہاڑے بردار واپس نہ آگیا جو محل کے اندر منگو خاں کو میری آمد کی اطلاع دینے گیا تھا۔

"اے عظیم بیگی کے چیتے! خاقان آج سر شام ہی اپنے حرم میں چلا گیا اور حکم دے گیا کہ وہ کسی سے نہیں ملے گا۔" کلہاڑے بردار نے بتایا۔

"پھر؟" میں نے پوچھا کیونکہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کلہاڑے بردار کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے۔

"میقاز آرہا ہے۔"

"کون میقاز۔؟"

"محل کا نیا نگراں۔!" کلہاڑے بردار نے جواب دیا۔ "میں نے اسے تیری آمد سے مطلع کر دیا ہے۔"

کلہاڑے بردار کی بات سن کر مجھے محل کا سابق نگراں زقورا یاد آگیا۔ وہ زقورا جو منگو خاں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا اور وہ جس کے بیٹے سقیت کے ہمراہ تھمرو، محل سے فرار ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی ایک طویل القامت بوڑھا میرے سامنے موجود تھا۔ یہی محل کا نیا نگراں میقاز تھا۔

"میں عظیم خاقان کی طرف سے عظیم بوغا کی خدمت میں حاضر ہوں۔" میقاز نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا، پھر بولا۔ "عظیم خاقان نے مجھے حکم دیا تھا کہ جب بھی اور جس وقت بھی تو محل پہنچے تجھے عزت و احترام کے ساتھ محل ہی میں ٹھہرایا جائے۔ سو میرے ساتھ چل! میں تجھے تیرے کمرے تک پہنچا دوں۔"

"میرے ساتھ مغربی دشت سے آنے والے محافظ دستے بھی ہیں۔" میں نے مڑ کر کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے فوجی دستوں کی طرف اشارہ کیا۔

"انہیں یورتوں میں ٹھہرا دیا جائے گا۔" جواب ملا، پھر وہاں موجود دو کلہاڑے برداروں کو اس سلسلے میں احکامات دے کر اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

مجھے گمان بھی نہ تھا کہ قراقرم پہنچ کر میری اتنی پزیرائی ہوگی اور مجھے خاقان منگو خاں کے محل میں ٹھہرایا جائے گا۔

میقاز ادب کے ساتھ میرے آگے آگے چلتا رہا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ سرقوشنی بیگی کس طرح اچانک مر گئی! یہ سوچ کر میں نے تیز قدم کیے اور میقاز کے قریب پہنچ گیا۔

"اے میقاز! کیا بتائے گا کہ الاؤ کی رکھوالی یوں اچانک روٹھ کر کیوں چلی گئی۔؟" میں نے محل کے نگراں کو مخاطب کیا۔

"وہ اچانک نہیں گئی۔" میقاز نے جواب دیا۔ "اپنی موت سے پہلے وہ کافی دن بیمار رہی تھی۔ اس کے جسم میں منحوس کیلتیں گھس گئی تھیں۔ شامانوں نے بہت کوشش کی مگر منحوس کیلتیں اس کے جسم سے نہ نکل سکیں اور پھر ایک رات کیلتیں اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔"

مجھے اس وقت لامہ نامو کا خیال آیا جو پراسرار قوتوں کا مالک تھا اور جسے خاقان منگو خاں نے سلطنت کا مذہبی پیشوا مقرر کیا تھا۔

"کیا لامہ نامو بھی اسے موت کے منہ سے نہ بچا سکا۔؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں اے عظیم بوغا! وہ بھی ناکام رہا حالانکہ اس نے خاقان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ عظیم بیگی کو منحوس کیلتوں کے نرغے سے نکال لائے گا اور شاید اسی لیے خاقان اس سے ناراض ہو گیا۔ خاقان نے اسے عہدے سے ہٹا دیا۔" میقاز نے بتایا۔

"اب وہ کہاں ہے۔؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ قراقرم چھوڑ کے جا چکا ہے۔" میقاز نے جواب دیا۔

لامہ نامو کے زوال کی خبر میرے لیے انتہائی مسرت انگیز تھی۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ حیرت بھی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب کیوں نہ ہو سکا۔؟ وہ تو بڑی پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ اسے برف کی آندھی کا رخ بدلتے ہوئے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی پراسرار قوتوں کا خود مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر میرے دل کا حال جان لیا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ تو پھر وہ سرقوشنی بیگی کو مرنے سے کیوں نہ بچا سکا۔؟

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا اس کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا جو پہلے ہی میرے لیے مخصوص کیا جا چکا تھا۔

محل کے نگراں میقاز نے فوراً دو خادموں کو میرے پاس بھیج دیا تھا۔ ان خادموں نے خود اپنے ہاتھوں سے وہ بڑی سی گرد آلود چادر جسم سے اتاری جو ہوا اور گرد سے بچنے کے لیے میرے جسم سے لپٹی ہوئی تھی۔ مجھے پہننے کو نئے کپڑے ملے اور پھر کھانے میں لذیذ ابلا ہوا گوشت دیا گیا۔ میں نے سیر ہو کر گوشت

کھایا' گھوڑی کا دودھ پیا' چاول کی عمدہ شراب پی اور سو گیا۔

صبح جب میں ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا تو ایک خادم نے اطلاع دی کہ خاقان نے مجھے طلب کیا ہے۔

میں اس کمرے میں پہلے بھی آ چکا تھا جہاں خاقان منگو اپنے مہمانوں سے ملتا تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو خاقان موجود تھا۔ میں نے اپنی سمور کی ٹوپی اتار کر اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی پیٹی کھول کر اسے تعظیم دی' پھر جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا جس پر اداسی نظر آ رہی تھی۔

"تجھے یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی بوغا۔!" خاقان منگو کی بھاری آواز بلند ہوئی۔ "تجھے چاہنے والی چلی گئی۔ اگر تو یہاں ہوتا تو شاید اسے بچا سکتا۔ وہ آخری وقت تک تجھے یاد کرتی رہی۔ اس نے تیرا بہت انتظار کیا۔ وہ کہتی تھی کہ تو اسے بچا لے گا مگر تو بہت دور تھا۔ مرنے سے کچھ دن پہلے ایک صبح اس نے مجھے بلوایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اگر وہ مر جائے تو میں تجھے اسی طرح سمجھوں جس طرح قبلائی' ہلاکو اور اداق کو سمجھتا ہوں۔ سو' سن کہ میں اس کا حکم نہ ٹالوں گا۔ ہر چند کہ تو ہمارے خاندان سے نہیں مگر تجھے وہی مراعات حاصل ہوں گی جو ہلاکو خان کو ہیں' قبلائی خان کو ہیں اور اداق بوغا کو ہیں۔ تو چاہے تو میرے ساتھ رہ' چاہے الگ۔ وہ محل اب خالی ہے۔ جہاں چار بگھاتر بیٹوں کی ماں رہتی تھی۔ اگر تیری مرضی ہو تو وہاں رہائش اختیار کر لے۔ بول تو کیا چاہتا ہے اے میرے منہ بولے بھائی۔؟"

میں خاقان منگو خاں کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا اور فوراً" کچھ نہ کہہ سکا میں اپنی قسمت پر ناز کر رہا تھا کہ اس وقت قراقرم میں نہ ہوا' جب سرقوشنی بیگی بیمار تھی۔ ظاہر ہے کہ میں بھی اسے مرنے سے نہیں بچا سکتا تھا۔ جب لامہ نامو جیسا شخص اس کوشش میں ناکام رہا تھا تو میری کیا حیثیت تھی! میرے پاس تو کوئی پراسرار قوت بھی نہیں تھی۔

"تو چپ کیوں ہے اے میرے منہ بولے بھائی۔؟" مجھے خاموش دیکھ کر خاقان منگو خاں نے کہا۔ "آ میرے قریب آ کر بیٹھ جا۔!"

میں نے قدم بڑھائے اور ادب سے اس کے پاس دوزانو بیٹھ گیا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے چہرے سے غم و اندوہ کا اظہار ہو۔ مجھے علم نہیں کہ میں اس میں کامیاب ہو سکا یا نہیں لیکن جب بولا تو میری آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔

"اے الاؤ کی رکھوالی کے بڑے بیٹے اور اے آبائی پرچم کے رکھوالے! تیرے خادم کے لیے یہی بات بڑے فخر کی ہے کہ تو نے اسے منہ بولا بھائی کہا۔ تیرے خادم کو ملال ہے کہ وہ بروقت یہاں نہ پہنچ سکا۔" میں نے کہا۔ "تیرے خادم کو تیری خوشنودی کے سوا کچھ نہیں چاہیے! تو جہاں کہے گا' وہ رہ لے گا۔"

"تو پھر میرے ہی ساتھ رہ۔!" منگو خاں نے حکم سنایا۔ "میں کئی دن سے دربار کی یورت میں نہیں گیا مگر اب تو آ گیا ہے' اس خوشی میں آج وہاں ضرور جاؤں گا اور تو بھی میرے ساتھ چلے گا۔ مجھے آج کئی اہم فیصلے بھی کرنے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے خلیفہ بغداد کو جو خط لکھا تھا اس کا جواب لے کر بھی خلیفہ کا قاصد آیا ہے مگر میں اس سے بھی نہیں مل سکا۔ آج اسے بھی دربار میں بلوا لوں گا۔"

"مجھے تیرا حکم منظور ہے اے عظیم خاقان!" میں نے جھک کر کہا۔

کچھ دیر بعد خاقان منگو مجھے مزید آرام کرنے کا مشورہ دے کر اٹھ کھڑا ہوا اور میں اپنے کمرے کی طرف چل دیا جس کا راستہ میں نے وہاں آتے ہوئے ذہن میں محفوظ رکھا تھا۔

مجھے علم تھا کہ منگو خاں شام کے وقت دربار کے یورت میں جاتا تھا اس لیے میں دوپہر کا کھانا کھا کر سو گیا۔ طویل سفر کی تھکن بھی پوری طرح نہیں اتری تھی۔

میں شام کو سو کر اٹھا تو خادموں نے پہننے کے لیے مجھے ایک اور مخصوص لباس دیا۔ لباس ہی کے ساتھ بہترین ہتھیار بھی تھے۔ یہ لباس خود خاقان منگو نے میرے لیے بھجوایا تھا۔ اس طرح کا لباس میں نے اب

تک صرف خاندان زرین کے نوبانوں (شہزادوں) کو بنے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے لباس تبدیل کرلیا' ہتھیار سجائے اور پھر مجھے خاقان منگو نے طلب کرلیا۔ وہ مہمان خانے کے کمرے میں میرے آنے کا منتظر تھا۔ جب میں وہاں پہنچ گیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کمرے سے نکلا۔

دائیں' بائیں اور پیچھے خاقان کا قشق (محافظ دستہ) چل رہا تھا اور میں خاقان منگو کے ساتھ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت میری انا کو بڑی تسکین مل رہی تھی۔ کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا کہ مجھے برابری کا درجہ دیا جائے گا۔ میں تقدیر کی اس ستم ظریفی پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔

محل سے نکلتے ہی مجھے اور منگو خاں کو بہترین گھوڑے پیش کیے گئے۔ منگو خاں گھوڑے پر سوار ہوگیا تو میں بھی گھوڑے پر چڑھا' پھر قشق کے مسلح سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کو بڑھایا۔

میں جس وقت منگو خاں کے ہمراہ دربار کے یورت میں داخل ہوا تو دربار نعروں سے گونج اٹھا۔ منگو خاں کی مسند کے قریب ہی ایک جگہ خالی تھی جس کے برابر ہلاکو خاں بیٹھا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے سامنے ہی مخالف سمت میں قبلائی خاں اور اویق بوغا بیٹھے ہوئے تھے۔ بقیہ افراد درجہ بہ درجہ پیچھے بیٹھے تھے۔

خاقان منگو نے مجھے ہلاکو خاں کے برابر خالی جگہ پر بیٹھنے کا حکم دیا اور خود درمیان میں بھورے نمدے کی مسند پر جا بیٹھا۔

خاقان منگو نے دایاں ہاتھ بلند کیا۔ یہ دربار شروع ہونے کا اشارہ تھا۔ اس کے بعد قبلائی خاں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ اس نے چین کے اس علاقے کا کوئی حاکم مقرر کیے جانے کے لیے کہا جو اب تک منگولوں کے قبضے میں آچکا تھا۔

خاقان منگو خاں نے ایک بوڑھے ترک محمود یلواچ کو حاکم مقرر کیے جانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد خود ہی وسط ایشیاء کا حاکم محمود یلواچ کے بیٹے کو مقرر کیا۔ محمود یلواچ اور اس کا جوان بیٹا مسند کے سامنے پہنچے۔ دونوں نے خاقان کے سامنے سر خم کیا اور اپنے تقرر پر وفاداری کا یقین دلایا۔ اس کے بعد محمود یلواچ نے کہا۔ "اے عظیم خاقان! ہماری مدد کے لیے عالم فاضل اشخاص کا تقرر بھی کیا جائے۔"

"یہ عالم فاضل لوگ کیا ہوتے ہیں۔؟" منگو خاں حیرت سے بولا۔ "یہ بطور طبیب کام آتے ہیں یا ساحر ہوتے ہیں۔؟"

"اے عظیم خاقان! یہ لوگ طبیبوں اور ساحروں سے بھی زیادہ کام آسکتے ہیں۔" محمود یلواچ نے ادب سے جواب دیا۔

"تو پھر میں تم دونوں باپ بیٹوں کو اجازت دیتا ہوں کہ خود ایسے لوگوں کا تقرر کرسکتے ہو۔" منگو خاں بولا' پھر قدرے توقف کے بعد کہا۔ "کیا تو نے محاصل کی فہرستیں تیار کیں' اگر تیار کرلی ہیں تو بتا۔!"

محمود یلواچ نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس سے کاغذات کا ایک پلندا نکالا اور اس میں سے ایک کاغذ پڑھنے لگا۔

جب وہ محصول کی شرح بتا چکا تو منگو خاں بولا۔ "یہ بہت زیادہ ہے۔ میں چین اور ترکستان کے علاقوں میں محصول کم کیے جانے کا حکم دیتا ہوں اس لیے کہ یہ علاقے اتنے مالدار و زرخیز نہیں! جہاں اب تک سو جانور محصول میں لیے جاتے رہے ہیں وہاں اب ایک جانور کم کردیا جائے اور اسی مقدار سے چاندی کا محصول بھی کم کردیا جائے۔ مجھے اپنا خزانہ بھرنے کی اتنی آرزو نہیں جتنی اپنی رعایا کے خوشحال ہونے کی تمنا ہے۔"

"تعمیل حکم ہوگی اے عظیم خاقان!" محمود یلواچ نے سر جھکا کر کہا۔ پھر وہ اور اس کا جوان بیٹا اپنی جگہوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

خلیفہ بغداد کے قاصد کو پیش کیا جائے!" منگو خاں نے آواز بلند حکم دیا۔

اس کے کچھ دیر بعد ہی دربار کے یورت میں ایک شخص کو لایا گیا جس کے جسم پر موجود لباس کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے دور سے بالکل

ابونصار معلوم ہوا مگر جب وہ آگے آیا تو کوئی اور تھا۔ اس کے جسم پر ویسا ہی لباس تھا جیسا ابونصار پہنتا تھا اور چہرے پر داڑھی بھی تھی۔

اس شخص نے مسند کے سامنے پہنچ کر نہ اپنی ٹوپی اتاری' نہ جھکا اور نہ کمر کے گرد بندھا ہوا ازار بند کھولا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ میں نے خاقان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات دیکھے۔

پھر اس سے پہلے کہ خلیفہ بغداد کا قاصد کچھ کہتا' خاقان منگو خاں نے اسے سخت اور درشت لہجے میں مخاطب کیا۔ "میں نے تیرے خلیفہ کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی اپنے ہتھیار تلف کر کے اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ ہماری حاکمیت قبول کرتے ہیں بول تو ہمارے پیغام کا کیا جواب لایا ہے۔؟"

"ہم اس وقت ہتھیار ڈالیں گے جب تم اپنے گھوڑوں کے سم نکال دو گے۔" خلیفہ بغداد کے قاصد نے جواب دیا اور اس کا جواب سن کر منگو خاں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

سارے دربار پر سناٹا چھا گیا۔

پھر اس سناٹے کو منگو خاں کی آواز ہی نے توڑا۔ وہ سخت اور برہم لہجے میں بولا "تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ امن نہیں چاہتا۔ وہ منگولوں کی بربری کے خواب دیکھ رہا ہے اور نہیں جانتا کہ جس طرح نیلے جاودانی آسمان پر ایک ہستی کی حکومت ہے' اسی طرح روئے زمین پر صرف ایک فرمانروا باقی رہے گا۔ جا اور اپنے خلیفہ سے کہہ دے کہ وہ اس دن کا انتظار کرے جب ہمارے گھوڑے اس کے محل میں گھس جائیں!"

منگو خان اتنا برہم ہو گیا تھا کہ اس نے فوراً" ہی دربار برخاست ہونے کا اعلان کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

خاقان منگو خان کھڑا ہو گیا تو اہل دربار بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی وقت میری نگاہ ایک چہرے سے ٹکرائی اور میرے سارے جسم میں سنسناہٹ کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ چہرہ شامان بغورچی کا تھا۔ شامان بغورچی' میرا دشمن جاں جو اس وقت فرار ہو گیا تھا جب میں نے اپنی ماں کے دوسرے شوہر چنکائی کو ہلاک کیا تھا۔ وہ دربار کے یورت میں بہت پیچھے ایک جگہ کھڑا ہوا تھا اور اس کی نگاہ بھی میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

شامان بغورچی اس طرح اچانک سامنے آیا تھا کہ میں دنگ رہ گیا تھا۔ میرا ذہن یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ مجھے فوری طور پر کیا کرنا چاہیے! دربار کے یورت میں اس کی موجودگی میرے لیے بڑی حیران کن تھی۔ دربار میں موجود دوسرے شامانوں کے ساتھ وہ اسی کردفر کے ساتھ کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا جس طرح پہلے دکھائی دیتا تھا۔

میں اسے دیکھ کر اتنا ہی بدحواس ہو گیا تھا کہ مجھے یہ احساس نہ ہو سکا' منگو خاں نے کب واپسی کا اشارہ کیا اور آگے چل دیا۔ میں چونکا اس وقت جب مجھے ایک تومان باشی نے مخاطب کیا۔

"اے بوغا! کیا تو خاقان کے ساتھ محل واپس نہ چلے گا؟" تومان باشی نے کہا تھا۔

"آں۔۔۔ ہاں۔" میں چونک کر بولا تھا' اور پھر تومان

ل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔
ل پہنچ کر بھی میرے ذہن سے بغورچی کا خیال نہ
ں سکا۔ جب سرقوشنی بیگی زندہ تھی اور میں قراقرم
ں تھا تو چنکائی اور بغورچی پر غداری کا الزام لگایا گیا
۔ ان دونوں پر میں نے الزام لگایا تھا کہ وہ قوبلق کی
ا اوغول غانمش اور ملکہ تورا کینہ سے ملے ہوئے
ے۔ ان دونوں میں سے چنکائی مارا گیا تھا مگر بغورچی
ار ہو گیا تھا۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ بغورچی
ارہ قراقرم میں آنے کی جرات کرتا؟ اگر وہ آ بھی گیا
تو اسے آزاد کس طرح چھوڑ دیا گیا تھا؟ کیا یہ بات
لا دی گئی تھی کہ وہ غدار تھا؟ میرے ذہن میں پے
پے سوالات گردش کرتے رہے اور آخر کار میں اس
چ پر پہنچا کہ یقیناً "شامان بغورچی نے اپنی پراسرار
توں سے کام لے کر منگول حکمرانوں کے ذہن سے یہ
ت نکال دی تھی کہ وہ غدار تھا۔ اگر ایسا ہی تھا جیسا
ں سوچ رہا تھا تو پھر اس سے نمٹنا میرے لیے زیادہ
شکل نہیں تھا۔ میرے ایک اشارے پر اسے گرفتار
یا جا سکتا تھا' کیونکہ شامان بغورچی میرے ذہن سے
بات نہیں نکال سکا تھا کہ وہ میرا دشمن ہے۔ میں
ں شب یہ فیصلہ کر کے سویا کہ دوسرے دن صبح ہی
ں سلسلے میں منگوخاں سے بات کروں گا۔
صبح میں ناشتہ کر کے فارغ ہوا تھا کہ خاقان منگو کا
یک خادم میرے کمرے میں آیا۔
"خاقان' شکار کھیلنے جا رہا ہے اور اس کی خواہش
ہے کہ تو بھی اس کے ساتھ ہو۔" خادم نے منگوخان کا
یغام دیا جو میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔
"اس سے کہہ دے کہ اس کا خادم تیار ہو کر آ رہا
ہے۔" میں نے خادم کو جواب دیا۔
خادم چلا گیا تو میں نے لباس تبدیل کیا اور ہتھیار
لگائے۔ میں نے سوچا کہ شکار ہی کے دوران' میں اس
سے شامان بغورچی کے بارے میں گفتگو کر لوں گا۔
میں کمرے سے نکلا ہی تھا کہ منگوخاں کا ایک خادم
ادھر آتا دکھائی دیا۔ میں رک گیا۔ اس خادم نے قریب
آ کر بتایا کہ منگوخاں محل کے صدر دروازے کی طرف
روانہ ہو چکا ہے اور اب میں بھی ادھر ہی جاؤں۔
میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا محل کے صدر دروازے
کی طرف بڑھا۔
جب میں صدر دروازے تک پہنچا تو خاقان منگو
خاں کچھ اور منگول سرداروں کے ہمراہ وہاں موجود تھا۔
میں نے کئی منگول سرداروں کے پاس بوراغوت
(شہباز) دیکھے۔ خود منگوخاں کے بائیں ہاتھ پر بھی
ایک بڑا سا بوراغوت بیٹھا تھا۔ منگوخاں مجھے دیکھ کر
مسکرایا۔
"آج میں اپنے بوراغوتوں کے ذریعے بارہ
سنگھوں کا شکار کروں گا۔" منگوخاں نے مجھے بتایا۔
"تو نے ایسا شکار شاید کبھی نہ دیکھا ہو۔"
"تو ٹھیک کہتا ہے اے عظیم خاقان!" میں ادب
سے جھک کر بولا۔ "یہ میری عزت افزائی ہے کہ تو مجھے
اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔"
صدر دروازے کے سامنے مشکی گھوڑے نظر
آ رہے تھے۔ پہلے منگوخاں ایک بہترین گھوڑے پر
سوار ہوا' پھر میں! اس کے بعد بقیہ منگول سردار
گھوڑوں پر چڑھے۔ میرا گھوڑا منگوخاں کے گھوڑے
سے بہت نزدیک تھا۔
ابھی روانگی ہونے ہی والی تھی کہ سامنے کی سمت
کافی فاصلے پر گرد و غبار اڑتا نظر آیا۔ منگوخاں اپنے
گھوڑے کو ایڑ لگاتے لگاتے رک گیا۔
"یہ کون لوگ ادھر آ رہے ہیں؟" منگوخاں خود
کلامی کے سے انداز میں بولا۔
میری نگاہ بھی اسی طرف جمی ہوئی تھی۔ اب
گرد و غبار کا پردہ کچھ ہلکا ہو گیا تھا اور کچھ گھوڑ سوار نظر
آنے لگے تھے جو تیزی سے محل کی طرف آ رہے
تھے۔
کچھ دیر بعد ہی وہ لوگ کافی قریب آ گئے۔ آگے
آگے دو گھوڑ سوار تھے جن میں سے ایک کو میں نے
اس کی وضع قطع کے سبب' فاصلہ ہونے کے باوجود
پہچان لیا۔ وہ شامان بغورچی تھا۔
شامان بغورچی؟ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

میں نے کل شام ہی تو اسے دربار کے یورت میں دیکھا تھا۔ پھر وہ صبح ہی صبح کہاں سے آرہا ہے؟ وہ کسی سفر پر کب روانہ ہوا تھا؟ پھر یہ کہ اس کی آمد کا مقصد کیا ہے؟ یہ تو ظاہر ہی تھا کہ وہ منگوخاں سے ملنے ہی آرہا تھا مگر کیوں؟ اور اس کے ساتھ کون لوگ تھے؟

جب تک شامان بغورچی اور اس کے ساتھی گھوڑا سوار قریب نہ آگئے' میرے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے جاگتے رہے۔

قریب آکر شامان بغورچی اپنے گھوڑے سے کودا اور منگوخاں کے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ گھوڑے کے سامنے پہنچ کر وہ گھٹنوں کے بل ریت پر بیٹھ گیا۔

"اے عظیم خاقان! بغورچی نے اپنا عہد پورا کیا۔" شامان بغورچی بلند آواز میں منگوخاں سے مخاطب ہوا۔ "تیرے مجرم حاضر ہیں۔"

"کیا تو خود انہیں گرفتار کر کے لایا ہے؟ کل تو میں نے تجھے دربار کے یورت میں دیکھا تھا۔" خاقان منگوخاں نے کہا۔

"نہیں اے عظیم خاقان! میں قراقرم ہی میں تھا۔" شامان بغورچی نے جواب دیا' پھر بولا۔ "جب سپاہی مجرموں کو گرفتار کر کے قراقرم کی طرف لا رہے تھے تو میں نے نیلے جادوائی آسمان کی سرگوشیاں سنیں۔ مجھے یوگدو نے سرگوشیوں میں بتادیا کہ سپاہی یہاں پہنچنے والے ہیں سو میں اپنے یورت سے نکل کر کالی دیواروں کے باہر پہنچ گیا اور پھر سپاہیوں سمیت تجھ تک آگیا۔"

میں بہت غور سے بغورچی کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا معاملہ ہے! میں نے دیکھا کہ بغورچی نے گھوڑ سوار سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی گھوڑ سوار سپاہی دو گھوڑوں کو ہانکتے ہوئے قریب لائے جن کی پشتوں سے دو جسم بندھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر خاقان منگو نے ایک وحشیانہ قہقہہ بلند کیا۔

"میں شکار ہی کھیلنے جا رہا تھا۔" منگوخاں ہنس کر بولا۔ "اے بغورچی تو بھی میرے لیے شکار گھیر لایا۔ چل اب یوں ہی سہی!"

وہ دونوں گھوڑے مجھ سے ذرا فاصلے پر تھے جن انسانی جسم بندھے ہوئے تھے اس لیے میں فوری طور پر یہ نہ دیکھ پایا کہ وہ کون لوگ ہیں!

منگوخاں کے حکم پر ایک گھوڑے کی پشت سے بندھے ہوئے جسم کو کھولا جانے لگا۔

وہ ایک نوجوان منگول تھا۔ میں نے پہلی بار اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ وہ چند قدم آگے آیا اور بغورچی ہی کی طرح اس نے اپنے دونوں گھٹنے ریت پر ٹیک دیے' پھر دونوں ہاتھ اٹھانے کے بعد' سر جھکا کر گڑگڑایا۔ "رحم اے عظیم خاقان' رحم!"

"تو خوش نصیب ہے کہ تیرا باپ بھی میرے ہاتھوں قتل ہوا اور اب تجھے بھی میں ہی ہلاک کروں گا۔" منگوخاں سفاکانہ لہجے میں بولا۔

"اے عظیم خاقان! مجھے اس عورت نے ورغلایا تھا۔" منگول نوجوان نے اس گھوڑے کی طرف اشارہ کیا جس پر اب بھی کوئی انسانی جسم بندھا ہوا تھا۔

"اور تو یہ بھول گیا تھا کہ خاقان کا قہر تجھے جینے نہ دے گا۔" منگوخاں کا لہجہ تیز اور بھاری تھا۔ "اٹھ کر کھڑا ہو اور اپنی موت کو بہادروں کی طرح قبول کر!" اپنا جملہ پورا کرتے ہی منگوخاں نے بائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے بوراغوت کو اڑا دیا۔

بوراغوت اڑتا ہوا' منگول نوجوان کی طرف جھپٹا۔ وہ منظر بڑا ہولناک تھا جب بوراغوت اس نوجوان کے چہرے پر پنجے گاڑے' اس کی دونوں آنکھوں پر اپنی تیز اور نوکیلی چونچ سے حملہ کر رہا تھا۔ منگول نوجوان اس طرح چیخ رہا تھا جیسے اس سے سینکڑوں منحوس کیلیں لپٹ گئی ہوں۔

جب بوراغوت اپنے پر پھڑپھڑاتا ہوا پلٹا تو وہ منگول نوجوان اپنی دونوں آنکھوں سے محروم ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ گڑھے نظر آرہے تھے جن سے خون بہہ رہا تھا۔ نوجوان نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور اس کا جسم اس طرح لہرانے لگا جیسے بس

نے ہی والا ہو۔
کہ اس سے پہلے کہ وہ ریت پر گر جاتا' ایک تیر
تا ہوا اس کی طرف بڑھا اور یہ تیر منگو خاں نے
تھا۔
تیر' منگول نوجوان کے سینے کی پسلیاں توڑتا ہوا اندر
گیا۔ نوجوان آخری بار چیخ بھی نہ سکا اور
ھے منہ ریت پر گر پڑا۔ تیر' جسم کے بوجھ کی وجہ
نوجوان کی پشت سے نکل گیا۔
منگو خاں کے اشارے پر اس منگول نوجوان کی
کو سپاہی گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ اس کے بعد
خاں نے دوسرے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔
ے بھی کھولو اور سمور لاؤ اس کے جسم کو موٹے
میں کس کر باندھ دو تاکہ اس کے جسم کو گھوڑوں
روند دیا جائے اور اس کا خون نہ بہے! میں جد اعظم
تائے ہوئے قانون سے انحراف نہیں کروں گا۔
کا تعلق ایک شاہی خاندان سے ہے اور میں یہ
نہیں بھولا۔"
جب دوسرے گھوڑے کی پشت سے انسانی جسم
ولا گیا تو جیسے میرا سانس رک گیا۔ وہ تھمرو تھی'
دسوان کی بیٹی تھمرو! حسین تھمرو' بے وفا
رو' ہوس کار تھمرو! آخر وہ اپنے انجام کو پہنچ ہی
میں نے سوچا۔ تو کیا مرنے والا منگول نوجوان
تھا؟ زقورا کا بیٹا سقیف جس کے ساتھ
رو محل سے فرار ہوئی تھی؟ وہ سقیف کے سوا اور
ہو سکتا تھا! مجھے خاقان منگو کا وہ فقرہ یاد آیا جو اس
مرنے والے سے کہا تھا۔ تو خوش نصیب ہے کہ
اب بھی میرے ہاتھوں قتل ہوا۔۔۔ ہاں محل کا
گراں زقورا' منگو خاں کے ہاتھوں ہی مارا گیا
ھے سب، کچھ یاد آگیا۔
کہ اس معاملے سے بغورچی کا کیا تعلق ہے؟ میں
نے کے باوجود کچھ نہ سمجھ سکا۔ میں نے بغورچی کی
ف نگاہ اٹھائی جو اب سیدھا کھڑا ہو گیا تھا اور ادب
سر جھکائے ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد
نے تھمرو کی طرف دیکھا۔ سقیف کی طرح

بارہ برجوں پر ایک مکمل اور مفصل کتاب

قیمت -/80 روپے

برجوں کی حکومت

مرتب: علیم اقبال (مکمل زائچوں کے ساتھ)

اس کتاب میں برجوں کے بارہ گھروں کے ثمرات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے

آپ کی شخصیت، دولت، تعلیم، خاندان، اولاد، امراض، محبت، عمر، قسمت، دوستی اور کاروبار پر ستارے کیا اثرات مرتب کرتے ہیں؟

اس کے علاوہ آپ کی شخصیت کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اس سے پہلے آپ نے ایسی جامع کتاب کبھی نہیں پڑھی ہوگی۔

اس کتاب کی مدد سے آپ اپنی روزمرہ زندگی کی مشکلات کے لیے خود کو تیار کر سکتے ہیں، اور آئندہ زندگی کے لیے بہترین لائحہ عمل تشکیل دے سکتے ہیں۔ 272 صفحات عمدہ کاغذ اعلیٰ طباعت

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا منی آرڈر بھیج کر براہ راست منگوائیں

(ایک کتاب منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا)

منگوانے کا پتہ:

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اُردو بازار لاہور

تھمرو کے چہرے سے کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہو رہا تھا بلکہ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ معاً میں نے اس کے ہونٹوں کو حرکت کرتے دیکھا۔

تھمرو' خاقان منگو خاں سے مخاطب تھی اور اس کی آواز میں ذرا سی بھی لرزش نہیں تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "اے عظیم خاقان! میں نے اپنی ماں سے سنا تھا کہ بہت سی قومیں ایسی ہیں جو مرنے والے کی آخری خواہش پوچھتی ہیں اور اسے پورا بھی کرتی ہیں۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں مگر اپنی آخری خواہش بیان کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تو میری آخری خواہش پوری کرے گا؟"

"جد اعظم (چنگیز خاں) نے اپنی یاسا (قانون) میں کوئی ایسی بات نہیں کہی۔ سو ایسا کرنا یاسا کے خلاف ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔" منگو خاں حقارت آمیز لہجے میں بولا۔

"تو میری خواہش پوری کر یا نہ کر! تیرے اختیار میں ہے مگر میں اپنی خواہش بیان ضرور کروں گی اے عظیم خاقان!" تھمرو کے لہجے میں بے باکی اور معنویت تھی۔

منگو خاں کے چہرے سے غصے اور الجھن کا اظہار ہونے لگا' پھر وہ برہم لہجے میں بولا۔ "اپنی زبان بند رکھ! میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔"

"کیا تو یہ بھی نہیں سنے گا کہ تھمرو تجھے چاہتی ہے اور اس کی آرزو ہے کہ مرنے سے قبل صرف ایک بار اسے تیرا قرب میسر ـــــ۔"

"خاموش ہو جا ذلیل کتیا!" منگو خاں چیخ اٹھا۔

مگر تھمرو پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ کہتی رہی۔ "تیرے بھائی برقائی نے مجھے جو تحفہ دیا تھا تو نے اسے قبول کر لیا تھا مگر اس کے باوجود تو نے مجھے پیاسا رکھا۔ اور ـــــ۔"

"اس کی زبان کاٹ لی جائے!" منگو خاں دوبارہ تھمرو کی بات کاٹ کر دہاڑا۔

اس کا حکم سنتے ہی سپاہی' تھمرو کی طرف جھپٹے۔

تھمرو اس وقت مجنونانہ انداز میں قہقہے لگانے
موت کو قریب دیکھ کر شاید وہ اپنا ذہنی توازن کھو
تھی۔

اسی وقت کچھ سپاہی سمور کی بڑی بڑی چادریں
آئے مگر تھمرو کو ان چادروں میں لپیٹے جانے
قبل اس کی زبان کاٹ لی گئی تھی کیونکہ یہ خاقان
تھا۔ تھمرو اس وقت بڑے بھیانک انداز میں
تھی جب اس کی زبان کاٹی گئی تھی۔ جو سپاہی
اس کی زبان کاٹ رہا تھا اس کی پشت میری جانب
اس لیے وہ ہولناک منظر اپنی آنکھوں سے نہ د
تھا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا تھا کہ سپاہیوں
تھمرو کو ریت پر گرا لیا تھا' پھر ایک سپاہی نے
تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے تھمرو کا جسم رسیوں میں
سمور کی موٹی چادروں میں لپیٹ دیا گیا۔ جب
سمور کی چادروں میں لپیٹا جا رہا تھا تو میں نے آخ
اسے دیکھا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا
خون بہنے کے سبب اس کا حسین چہرہ انتہائی ب
لگ رہا تھا۔

منگو خاں کے چہرے سے اب تک انتہائی
اظہار ہو رہا تھا۔ تھمرو نے اس کے سامنے
کھول کر بہرحال گستاخی کی تھی۔ خود میں نے اس
کسی کو خاقان کے سامنے اس طرح بے باکی
کرتے نہیں سنا تھا۔

تھمرو کو سمور کی چادروں میں باندھ کر منگ
کے سامنے ریت پر ڈال دیا گیا۔

"اسے گھوڑوں سے روندو!" منگو خاں نے
اپنے ہمراہ موجود منگول سرداروں کو مخاطب کیا
اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

پہلے منگو خاں کا گھوڑا' تھمرو کے جسم ک
ہوا گزرا' پھر میرا اور اس کے بعد بقیہ منگول س
کے گھوڑے جھپٹے۔

مجھے علم نہیں کہ تھمرو مرنے سے پہلے
یا نہیں کیونکہ اس کی چیخیں میری سماعت

لڑائی تھیں۔ شاید اس کی چیخیں سمور کی موٹی پاوروں ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ نہ جانے منگوخاں نے غصے میں کتنی بار تھمرو کے جسم کو اپنے گھوڑے کی ٹاپوں سے روندا اور نہ جانے کتنی مرتبہ مجھے اس کی تقلید کرنا پڑی' مجھے یاد نہیں۔

بغورچی اور دوسرے سپاہی دور کھڑے ہوئے وہ ولناک تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب کافی دیر بعد منگوخاں کو یہ احساس ہوا کہ وہ بیکار ہی گھوڑا بھگا بھگا کر تھک رہا ہے اور تھمرو ہلاک ہو چکی ہے تو اس نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ پھر منگوخاں نے بغورچی یا سپاہیوں سے مخاطب ہوئے بغیر منگول سرداروں کو اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے اپنے گھوڑے اس کے گھوڑے کے پیچھے ڈال لیے۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس خود سر اور حسین عورت تھمرو کا یہ انجام ہوگا۔ جو کچھ گزرا تھا' مجھے ایک خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ میں واقعات و حالات سے اتنا اندازہ تو لگا ہی چکا تھا کہ تھمرو اور سقیف کی گرفتاری میں شامان بغورچی کا ہاتھ تھا لیکن تفصیلات سے میں بے خبر تھا۔ میرے لیے قراقرم میں بغورچی کی موجودگی تعجب خیز تھی۔ اب تھمرو کے انجام نے مجھے اور بھی فکر مند کر دیا تھا۔ شامان بغورچی یقیناً اپنی پراسرار قوتوں سے کام لے کر خاقان منگو کو شیشے میں اتار رہا تھا۔ اگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا تو میرے لیے خطرہ ہی خطرہ تھا۔ اس کانٹے کو نکالنا میرے لیے ضروری تھا کیونکہ وہ کبھی بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس نے میرے ہاتھوں ماضی میں جو شکستیں کھائی تھیں' وہ بھلا انہیں کس طرح فراموش کر سکتا تھا۔

شامان بغورچی سے میں پہلے جتنا خوفزدہ رہتا تھا' اب نہیں تھا۔ پہلے میں معتوب تھا اور اب خاقان منگو کا منہ بولا بھائی! پہلے بے سہارا و بے بس تھا مگر اب ایسا نہیں تھا مگر اس کے باوجود اس کے پاس پراسرار قوتیں تھیں۔ جب تک میرا گھوڑا قراقرم کی سیاہ دیواروں کے باہر نہ چلا گیا' میں انہی خیالوں میں غرق رہا۔

اب سامنے کھلا میدان تھا جس کی ایک جانب طاقت کا پہاڑ بورخان قالدون تھا اور دوسری جانب دشت!

منگوخاں' دشت میں اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا بہت آگے نکل گیا۔ وہ شکار کی تلاش میں تھا۔ پھر شکار نظر آ ہی گیا۔ وہ بارہ سنگھوں کا ایک گلا تھا۔ منگوخاں نے اپنے بائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے بوراغوت کو اڑایا اور اسی کے ساتھ دوسرے منگول سرداروں نے بھی اپنے اپنے بوراغوت اڑائے۔ ہرن' بدک کر چوکڑیاں بھرنے لگے۔

کچھ دیر بعد ہی بوراغوت ہرنوں کے اطراف پھڑپھڑا کر جھپٹے۔ کچھ ہرن گلے سے جدا ہو کر ایک سمت بھاگے۔ منگوخان اور منگول سرداروں نے ان کا پیچھا کیا' اور پھر آخر کار انہیں تیروں سے چھید ڈالا۔

میرا ذہن کیونکہ بہت الجھا ہوا تھا اس لیے میں زیادہ پرجوش نہیں رہا۔ دوپہر ہونے تک تقریباً" درجن بھر ہرن شکار کیے جا چکے تھے۔

دوپہر کے بعد واپسی ہوئی۔ شکار کے دوران میں مجھے اتنا موقع نہیں مل سکا تھا کہ منگوخاں سے بغورچی کے بارے میں گفتگو کر سکتا اور واپسی میں بھی اس کا موقع نہیں ملا کیونکہ واپسی کا سفر تیز رفتاری سے طے کیا گیا تھا۔ گھوڑوں کی تیز رفتاری کے سبب منگوخاں سے بات کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ محل پہنچ کر اس سے بات کروں گا۔

دوپہر کے کھانے میں اس وجہ سے دیر ہوئی کہ خاقان منگو' شکار کیے ہوئے ہرن ہی کھانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ شکار میں جو لوگ گئے تھے' انہیں بھی اسی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانا تھا۔

ضیافت کے کمرے میں مجھ سمیت وہ سب افراد موجود تھے جو منگوخاں کے ساتھ شکار میں شامل تھے۔ ایک ہرن کی کھال اتار کر سالم ابال لیا گیا تھا۔ اس کی آنتیں اور اوجڑی وغیرہ بھی نکال دی گئی تھی۔ اس کے

گوشت سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ضیافت میں پہل خاقان منگو خاں نے کی۔

"ضیافت میں شاماں بغورچی بھی ہوتا تو خوش ہوتا۔" منگو خاں گوشت چباتے ہوئے بولا۔ "اس نے واقعی ایک کارنامہ انجام دیا ہے اور وہ انعام کا مستحق ہے۔ یہ ضیافت بھی اس کے لیے انعام سے کم نہ ہوگی۔"

ایک منگول سردار نے خاقان منگو کی تائید میں کہا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے اے عظیم خاقان! شاماں بغورچی یوگدو کی سرگوشیاں سننے کا اہل ہے۔"

شاماں بغورچی کی تعریف سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ گویا میں نے جو سوچا تھا' ٹھیک ہی تھا۔ شاماں بغورچی دوبارہ اعتماد بحال کر چکا تھا مگر ایسا کس طرح ہوا' یہ سوال میرے لیے تجسس کا سبب بنا ہوا تھا۔ میں چاہتا تو یہی تھا کہ تنہائی میں بغورچی کے متعلق خاقان منگو سے بات کروں مگر اب میں اپنے تجسس کو مزید نہیں دبا سکتا تھا۔

"اے عظیم خاقان!" میں نے منگو خاں کو مخاطب کیا۔ "کیا تو مجھے بتائے گا کہ ایک غدار کو تیرے دربار میں کس طرح جگہ مل گئی؟" میں نے کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ سخت نہ ہونے پائے مگر شاید میں اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

خاقان منگو خاں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ اس نے غالباً "میرے لہجے کی تلخی محسوس کر لی تھی۔

"غدار؟" خاقان منگو خاں کے لہجے سے بھی حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے بوغا؟ تو کس غدار کی بات کر رہا ہے؟"

"میں شاماں بغورچی کی بات کر رہا ہوں اے خاقان!" میں نے اپنے تلخ لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "کیا تو بھول گیا کہ وہ قویق کے ساتھیوں میں سے تھا؟"

"نہیں' مجھے سب کچھ یاد ہے بوغا مگر اب' اب میں وہ سب باتیں بھلا دینا چاہتا ہوں۔" خاقان منگو بولا۔ "تو را کینہ اور اوغول غمائش اپنے انجام کو پہنچیں۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب پرانی باتیں اور پرانے زخم تازہ کرنے سے کیا حاصل!"

"لیکن اے عظیم خاقان! غدار تو غدار ہی رہتے ہیں اور انہیں غداری کی سزا ضرور ملنی چاہیے چاہے کتنا ہی عرصہ کیوں نہ گزر جائے۔" میں مضبوط اور پرجوش لہجے میں بولا۔

"سن بوغا! تو ٹھیک کہتا ہے۔" منگو خاں نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں بھی تیرے خیال سے متفق ہوں کہ غداروں کو سزا ضرور ملنی چاہیے۔ میں بھی ایسا ہی کرتا مگر وہ جو عظیم بیگی' بڑی مہربان اور درگزر کرنے والی تھی' ہاں وہی جو چار بگھا تربیتوں کی عظیم ماں تھی جب اسی نے شاماں بغورچی کی تمام خطائیں معاف کر دیں تو پھر میں اسے کس طرح سزا دے سکتا تھا دے سکتا ہوں!"

منگو خاں کی بات سن کر میں چکرا گیا۔ یہ اطلاع میرے لیے واقعی حیرت انگیز تھی کہ سرقوشنی بیگی۔ اس کی خطائیں معاف کر دی تھیں۔ میں تفصیل جاننا چاہتا تھا مگر میرے کچھ کہنے سے قبل ہی منگو خاں خود تفصیل بیان کرنے لگا۔

"وہ جب بیمار ہوئی تو شامانوں نے اس سے کہا کہ اگر شامانوں کا شاماں بغورچی اس کا علاج کرے تو یقیناً" وہ صحت یاب ہو جائے گی۔" منگو خاں کہہ رہا تھا۔ "بغورچی کیونکہ معتوب تھا اس لیے فرار تھا اسے دوبارہ قراقرم بلانے کا طریقہ یہی تھا کہ اس کی معافی کا اعلان کر دیا جاتا۔ اپنی موت سے دو دن قبل الاؤ کی رکھوالی نے شامانوں کی بات مان لی۔ اس کے حکم پر شاماں بغورچی کی معافی کا اعلان کر دیا گیا مگر جب اعلان ہوا تو بغورچی قراقرم سے بہت دور تھا۔ اس نے اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے اپنی معافی کا علم ہو گیا اور وہ قراقرم کے لیے روانہ ہو گیا لیکن وہ تیسرے دن قراقرم پہنچ سکا۔ عظیم بیگی ایک دن قبل مر چکی تھی اگر وہ شاماں بغورچی کی معافی کا اعلان نہ کرا جاتی تو اسے یقیناً" گرفتار کر لیا جاتا۔ پھر دوسرے دن بغورچی مجھ سے ملا اور بتایا کہ تھمرو' سقیف کے ساتھ کہا

ہوئی ہے! بغورچی نے مجھ سے کہا تھا کہ اس نے
د کی سرگوشیاں سنی ہیں اور وہ سرگوشیاں سن کر ہی
ے پاس آیا ہے۔ اسی دن تھمرو اور سقیف کو
تار کرنے کے لیے سپاہیوں کا ایک دستہ اس طرف
دیا گیا جس کی نشاندہی شامان بغورچی نے کی تھی۔
تو نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لیا کہ شامان
چی نے سچ کہا تھا۔ یہ کہہ کر منگو خاں خاموش
یا۔

اب تمام معاملہ میری سمجھ میں آچکا تھا۔ اس میں
ی شک نہیں کہ میں شامان بغورچی کی معافی کو بھی
ی کی پراسرار قوتوں کا کمال سمجھ رہا تھا۔ بہرحال جو
ی تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ اب میں شامان بغورچی
راستے سے ہٹانے کے لیے اپنے اختیارات
ستعمال نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس سے نمٹنے کے لیے
ب کوئی اور ہی راہ ڈھونڈنا تھی۔

اسی ضیافت میں منگو خاں نے مجھے بتایا کہ شام کے
ت وہ اپنے تمام بھائیوں کو محل میں بلوا رہا ہے تاکہ
ہ اہم فیصلے کیے جا سکیں۔ اس نے کہا تھا کہ میں بھی
ں وقت موجود رہوں۔

ضیافت ختم ہوئی تو میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔
ار کی بے جا بھاگ دوڑ نے مجھے تھکا دیا تھا اس لیے
ں کچھ دیر سو گیا۔ شام کے وقت مجھے ایک خادم ہی
نے بیدار کیا۔ مجھے خاقان منگو نے اس کمرے میں
لب کیا تھا جہاں وہ مہمانوں سے ملتا تھا۔

میں جب لباس تبدیل کر کے مہمانوں کے کمرے
ں پہنچا تو وہاں ہلاکو خاں اور ادلق بوغا پہلے سے موجود
ھے۔ قبلائی خاں اور منگو خاں ابھی نہیں آئے تھے۔
ہلاکو خاں نے حسب عادت خوش مزاجی کا اظہار کیا اور
ھے اپنے قریب بٹھا لیا' پھر مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں
رنے لگا۔ اس کے علم میں تھا کہ کبھی مجھے ملکہ
ہ سودان کے پاس بھیجا گیا تھا۔

"بوغا! تجھے اس عورت رہ سودان نے کیسے چھوڑ
یا؟" وہ مجھے چھیڑنے لگا۔ "میں نے تو سنا تھا کہ وہ
مردوں کی شکاری تھی۔ پھر بھلا تو شکار ہونے سے کس
طرح بچ گیا؟"

"اگر وہ مجھے شکار کر لیتی تو پھر اس وقت تو مجھ سے
بات نہ کر رہا ہوتا۔" میں نے خجالت سے بچنے کے لیے
اپنی صفائی پیش کی۔ "کیا تجھے خبر نہیں کہ وہ عورت جسے
اپنی ہوس کا نشانہ بنا لیتی تھی' اسے زندہ نہیں چھوڑتی
تھی۔"

"اچھا!" اس نے اس طرح کہا جیسے میرا مذاق اڑا
رہا ہو' پھر وہ خود ہی ہنس پڑا۔ اس کے بعد بولا۔ "اس کی
بیٹی تھمرو بھی تو تھی۔ وہ تو تجھے پسند آئی ہی ہوگی۔ سنا
ہے کہ آج اسے خاقان نے پورے اعزاز کے ساتھ
ہلاک کر دیا کیونکہ اس کا تعلق ایک شاہی خاندان سے
تھا۔"

ممکن ہے کہ ہلاکو خاں مجھے مزید چھیڑتا رہتا مگر اسی
وقت اس کا بڑا بھائی قبلائی خاں وہاں پہنچ گیا۔ ادلق
بوغا کی موجودگی میں تو ہلاکو خاں مجھے چھیڑنے سے نہیں
چوکا تھا مگر جب قبلائی خاں وہاں آگیا تو وہ دوسری
باتیں کرنے لگا۔

ہلاکو خاں سے ایک بار میں لڑ بھی چکا تھا اور اس
دوران میں مجھے اس کی طبیعت کے تضاد کا اچھی طرح
اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ عجیب طبیعت اور مزاج کا مالک تھا۔
کبھی وہ ایک مسخرا معلوم ہوتا اور کبھی انتہائی سفاک!
میں اسی لیے اس سے کچھ خوف سا کھاتا تھا۔ اگر اس
وقت سرقوشنی زندہ نہ ہوتی جب ہلاکو خاں مجھ سے لڑا
تھا تو میں اپنی زندگی گنوا چکا ہوتا۔ کسی جاندار کو مار کر وہ
اس طرح خوش ہوتا تھا جیسے کوئی بچہ اپنی پسندیدہ شے
مل جانے پر خوش ہوتا ہے۔ اس وقت وہ بالکل بچوں
کی طرح خوش نظر آنے لگتا تھا۔

منگو خاں اور اس کے تینوں بھائیوں کو سرقوشنی
بیگی نے تعلیم دی تھی مگر چاروں کی طبیعتوں میں
اختلاف تھا۔ وہ سب اپنے بڑے بھائی منگو خاں کے
مطیع و منقاد تھے لیکن ہر ایک کی اپنی رائے الگ تھی۔
ہلاکو خاں خوش مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ جنگجو
طبیعت کا مالک تھا اور اپنی بیوی دوقوز کے زیر اثر تھا۔
ہلاکو خاں سے شادی ہونے سے قبل وہ اس کی سوتیلی

ماں تھی۔ دو قوز کرائت قبیلے کی ہونے کے سبب قبائلی قانون سے خوب واقف تھی وہ نسطوری عیسائیوں کے ساتھ عبادت کرتی تھی۔

قبلائی خاں کو چینی طور طریقے پسند تھے اور اس کی فطرت نرم تھی۔ اسے نادر جواہرات جمع کرنے کا شوق تھا اور وہ باغوں میں وقت گزارنا پسند کرتا تھا۔ وہ عظیم چینی لن یا (شمس العلماء) یاؤ چاؤ کے مشوروں پر عمل کرتا تھا۔ یہ وہی لن یا تھا جس نے ایک بار میری جان بچائی تھی اور مجھے پہلی بار سرقوشنی بیگی سے ملوایا تھا۔

تینوں بھائیوں میں سب سے چھوٹے اویق بوغا کو منگوخاں شاید زیادہ چاہتا تھا کیونکہ میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ اویق یوغا میں اپنے باپ تولوئی کی سی بے جگری تھی اور اسے اپنے بزرگوں کی دشت نوردی کی زندگی بہت پسند تھی۔

منگوخاں چاروں بھائیوں میں عجیب فطرت کا مالک تھا۔ اس کی روح منگول تھی لیکن اس نے بیرونی دنیا کی حکمت بھی سیکھ لی تھی۔ وہ سختی سے خانہ بدوشوں کے قانون یا سائے چنگیزی کا پابند تھا۔ وہ اٹل اور مستقل مزاج تھا اور اسے وہ صبر و تحمل نصیب تھا جو خانہ بدوشوں کا خاصہ ہے۔ اس نے خود پر سخت نظم و ضبط عائد کرلیا تھا۔ بوڑھے منگول اسے دیکھ کر کہتے تھے کہ ایسا ہی سخت نظم و ضبط چنگیز خاں کا تھا۔

دنیا کی دوسری قوموں کو اس بات کا اندازہ بہت بعد میں ہوا کہ دنیا کا بڑا حصہ چنگیز خاں سے زیادہ منگوخاں کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ فاتح کا پوتا تھا اور اس کا واسطہ اب تک صرف فتح و ظفر سے پڑا تھا۔ اس نے اپنے باپ تولوئی کے ساتھ میدان جنگ کی صعوبتیں برداشت نہیں کی تھیں مگر وہ ان صعوبتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

کوئی فرد واحد منگوخاں کو متاثر نہیں کرسکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ سب پر اس طرح حاوی نہیں تھا جس طرح دو پشت پہلے کے منگول تھے جو زیادہ تر یورتوں میں رہتے تھے چاہے ان کا تعلق خاندان زریں ہی سے کیوں نہ ہو۔ منگوخاں غور سے سب کے مشورے سنتا تھا، پھر اپنی رائے قائم کرتا تھا۔

چنگیز خاں کے چاروں بیٹوں کی طرح تولوئی کے چاروں بیٹے منگول قوم کے سردار بن گئے تھے لیکن بیٹوں اور پوتوں والی پشت کے درمیانی عرصے میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوگئی تھی۔ وہ یہ کہ ان کا عم زاد سائیں خاں مغرب کا تن تنہا مطلق العنان حکمران اور اس کا پایہ تخت قراقرم کے زریں دیوان سے ہزار میل دور تھا۔ منگوخاں کو برسر اقتدار لانے میں سائیں خاں کا بہت ہاتھ تھا اس لیے منگوخاں نے اسے ڈھیل دے کر گویا احسان کا بدلہ چکا دیا تھا۔

منگوخاں کے تینوں بھائیوں کو کسی طرح حکومت یا طاقت کا دعویٰ نہیں تھا۔ وہ تینوں ہی اپنے بڑے بھائی کی بہت عزت کرتے تھے جو خاقان تھا۔ منگوخاں اکیلا، بوڑھے منگولوں کی وفاداری کا ملجا تھا جو اب بھی آپس میں چنگیز خاں کی سولدہ کا ذکر کرتے تھے۔

ان چاروں بھائیوں اور سائیں خاں کے علاوہ خاندان زریں محض ایک سایہ سا بن کر رہ گیا تھا۔ دوران میں چونکہ بے شمار بچے پیدا ہوگئے تھے اس چند ہی سال میں خاندان کی تعداد چند سو سے بڑھ کر ہزار ہوگئی تھی جس میں پوتے اور پڑپوتے سب شامل تھے۔ وہ سب خزانے کے وظیفہ خوار تھے۔ اس کے علاوہ منگوخاں نے اس دوران میں قائدو اور اونغ کے خاندان کے باقی ماندہ افراد کو جلاوطن کرکے وسط ایشیا بھیج دیا تھا جہاں وہ خاندانی مشاورت سے رہتے تھے۔

اس تمام صورت حال میں منگوخاں کے تینوں بھائیوں کے سوا اور کوئی ایسا نہ تھا جسے کسی اہم مشاورت میں بلا جاسکتا۔ مجھے اس مجلس میں صرف اس لیے بلایا گیا تھا کہ منگوخاں نے مجھے اپنی سرقوشنی بیگی کے ایما پر منہ بولا بھائی بنالیا تھا۔

اس مجلس مشاورت میں شریک ہونے سے مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا اور میں بے خبر کہ اس مجلس میں بہت سی قوموں کی تقدیر کا فیصلہ

ہے۔

قبلائی خاں کو وہاں پہنچے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ خاقان منگو خاں بھی وہاں آگیا۔ اس کے تینوں بھائیوں کے علاوہ میں نے بھی اسے تعظیم دی' پھر جب وہ اپنی مسند پر بیٹھ گیا تو ہم سب بھی اس کے سامنے دوزانو بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد ہی منگو خاں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"تمہیں علم ہے کہ میں نے خلیفہ کے قاصد سے کیا کہا ہے! ہوگا وہی جو کہا گیا ہے مگر تم کیا کہتے ہو۔" وہ بیک وقت سب ہی سے مخاطب تھا۔

پہل ہلاکو خاں نے کی۔ "اے میرے عظیم بھائی اور عظیم خاقان! تو نے جو کچھ کہا' وہ ہم نے کہا۔ تیری زبان ہماری زبان ہے۔ یقین کر کہ ہمارے گھوڑے اس کے محل ہی میں گھس کر دم لیں گے اور تیرے کہے ہوئے لفظ سچ ہوں گے۔"

"تو کیا کہتا ہے سچین (ذہین) قبلائی۔" خاقان منگو اپنے دوسرے بھائی سے مخاطب ہوا۔

قبلائی خاں چند لمحے خاموش رہا' پھر بولا۔ "اس کے لیے ہم میں سے ایک بہت ہے اور تو نے بھی شاید یہی سوچا ہوگا اے خاقان' اے میرے بڑے بھائی!"

"ہاں سچین! تو نے ٹھیک کہا۔" منگو خاں نے تائید کی' پھر چند لمحے توقف کے بعد سنجیدگی سے بولا۔ "اس میں شک نہیں کہ جد اعظم (چنگیز خاں) نے دنیا کا ایک بڑا حصہ فتح کیا تھا مگر اسے یوگدو نے اپنے پاس بلا لیا اور یوں اس کا کام ادھورا رہ گیا۔ اب ہم اس قابل ہیں کہ اس کے ادھورے کام کو پورا کریں۔ جس طرح آسمان ایک ہے' اسی طرح روئے زمین پر صرف ایک فرمانروا ہوگا۔ ہم پر فرض ہے کہ معلوم دنیا کی تسخیر کا کام مکمل کریں۔ یہ سلطنتیں بہت دور دراز فاصلوں پر ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ایک سمت تم میں سے ایک جائے اور میں رعایا پر دادگستری کرنے کے لیے خود مرکز سلطنت میں رہوں۔"

منگو خاں کیونکہ مجھے بھی اپنے بھائیوں ہی میں شمار کر رہا تھا اس لیے میرا فکر مند ہونا لازمی تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے بھی تن تنہا اولوس (لشکر) لے کر کسی ملک کو فتح کرنے نہ بھیج دے۔ یہ بات میرے ذہن ہی میں نہیں' سچین قبلائی کے ذہن میں بھی آئی تھی اسی لیے تو اس نے میرے استفسار سے قبل ہی منگو خاں سے پوچھ لیا تھا۔ "اے بڑے بھائی اور اے خاقان! ہم سب ہی کو خبر ہے کہ بطریق بوغا ہمارا منہ بولا بھائی ہے۔ کیا تو اسے بھی کسی سمت بھیجے گا۔"

"نہیں!" منگو خاں نے قبلائی خاں کے سوال کا جواب دیا۔ "اسے جنگ کا اتنا تجربہ نہیں ہے۔ میں اسے تم میں سے کسی ایک کے ساتھ کردوں گا تاکہ یہ جنگ کا تجربہ کر سکے۔"

"تو پھر ہمیں بتا کہ ہم میں سے کس کو کدھر جانا ہے۔" اویق بوغا پہلی بار بولا۔ "تو ہمیں اپنا فرمانبردار پائے گا اے عظیم بھائی اور اے بھورے نمدے کی مسند پر بیٹھنے والے!"

"ہمیں تسخیر کے لیے ایک سمت خالی چھوڑنی ہے۔" منگو خاں کچھ سوچ کر بولا۔

"کون سی سمت اور کیوں اے خاقان۔" ہلاکو نے چونک کر کہا۔

"مغربی دشت کی سمت اور اس کا وہ علاقہ جو اس کے بعد پڑتا ہے۔ اب یہ باتو خاں کا حصہ ہے۔" منگو خاں نے جواب دیا۔ "پھر یہ کہ ادھر عیسائی آباد ہیں جنہیں فی الحال میں نہیں چھیڑنا چاہتا۔"

"میں تیری مصلحت سمجھ گیا' الاؤ کی رکھوالی کے بڑے بیٹے اور اے میرے بڑے بھائی!" قبلائی خاں زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"بتا کہ تو نے کیا سمجھا۔" خاقان منگو خاں بھی مسکرایا۔

"یہ کہ ہمارا پہلا نشانہ خلیفہ ہے اور خلیفہ' عیسائیوں سے لڑ رہا ہے۔ ان کے درمیان دشمنی ہے اور ہمیں اس دشمنی سے فائدہ ہوگا۔ عیسائیوں کے اردو ہماری مدد کریں گے۔ بول اے میرے عظیم بھائی! کیا میں غلط سمجھا۔" قبلائی خاں نے کہا۔

"اے قبلائی' اے میرے بھائی! تجھے اسی لیے

سوچیں کہا جاتا ہے کہ تو بہت جلد بات کی تہ کو پالیتا ہے۔" منگو خاں نے اپنے بھائی کی تعریف کی' پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "اس طرف جو اولوس (لشکر) بھیجا جائے' وہ تعداد میں کافی ہو اور اس مخصوص اولوس کے لیے دس میں سے دو آدمی ضرور بھرتی کیے جائیں۔"

"پر یہ بڑا اولوس لے کر ادھر کون جائے گا' ہم میں سے کون۔" اویق بوغا پھر بولا۔

"ہلاکو' ادھر ہلاکو جائے گا اور بطریق بوغا اس کے ساتھ ہوگا تاکہ اس بڑے اولوس کو دو حصوں میں بانٹا جاسکے۔" خاقان منگو خاں نے فیصلہ سنا دیا۔

منگو خاں کا فیصلہ سن کر میں دم بخود رہ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جس شخص سے میں سب سے زیادہ خوفزدہ رہتا ہوں' مجھے اس کے ساتھ بھیجا جائے گا مگر خاقان منگو کے فیصلے سے انکار کا حق خود اس کے سگے بھائیوں کو نہیں تھا۔

اس کے بعد قبلائی خاں کے لیے حکم ہوا کہ وہ جنوبی خطہ (جنوبی چین) میں سنگ سلطنت پر حملہ کرے جسے اب تک وحشی منگولوں نے نہیں چھیڑا تھا۔ اس سلطنت کو فتح کرنے کے بعد پورا خطہ (چین) منگولوں کے قبضے میں آجاتا۔

اویق بوغا کو شمالی ہند کے پہاڑوں سے لاہور کے راستے کوریا کی طرف جانے کا حکم ملا۔

منسوخاں قوموں کی قسمت کے فیصلے سناتا رہا اور اس کے بھائی تائید کرتے رہے۔ آخر میں اس نے فرداً" فرداً" سب کو سمجھانا شروع کیا کہ کسے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے! مجھے اب صرف اس سمت سے دلچسپی رہ گئی تھی جدھر ہلاکو خاں کو جانا تھا کیونکہ مجھے اسی کے ہمراہ جانے کا حکم ملا تھا۔ میں اسی لیے اس وقت پوری طرح ہمہ تن گوش ہو گیا جب منگو خاں' ہلاکو سے مخاطب ہوا۔ "سن اے میرے بکھاتر بھائی! تجھے راستے میں حسن بن صباح کے فدائیوں کا خاتمہ بھی کرنا ہے۔ جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق یہ لوگ ایران سے لے کر لبنان تک کوہستانوں کے سنگین قلعوں پر قابض ہیں۔ اب تک کوئی ان کا قلع قمع نہیں کرسکا۔ تجھے میرا حکم ہے کہ مغرب کی طرف بڑھتا چلا جا! بغداد کو فتح کرکے وہاں نہ ٹھہر بلکہ مسلمانوں کی طاقت کے آخری قلعے مصر کو بھی تسخیر کرلے!"

"تیرا حکم پورا ہوگا اے عظیم خاقان!" ہلاکو خاں پرجوش لہجے میں بولا۔ "تیرا بھائی اپنے پیچھے جلتے ہوئے شہروں اور دھوئیں کے سوا کچھ نہ چھوڑے گا۔"

کچھ دیر بعد وہ مجلس مشاورت ختم ہوئی اور ختا کی لونگیں ملی ہوئی شراب کا دور چلا۔

جب میں شراب کے نشے میں دھت اپنے کمرے میں پہنچا تو نشے کے باوجود میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ دنیا پر ایک بڑی تباہی آنے والی تھی اور دنیا اس سے بے خبر تھی۔ پھر میرے ذہن میں معاً" روشنی سی ہوگئی۔ بغداد' بغداد' بغداد! کسی نے جیسے میرے وجود میں سرگوشی کی۔ ہلاکو خاں' بغداد کی طرف جارہا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ جانے پر مجبور کردیا گیا تھا۔

بغداد وہی تو تھا جہاں اپنے باپ شعبان لطفی کی تلاش میں مجھے ایک نہ ایک دن جانا تھا۔ اسی کی تلاش میں' جس کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ وہی بغداد جس کے بارے میں' ابونصار سے میں نے بہت سی باتیں دریافت کی تھیں۔ خود ابوانصار بھی تو وہیں سے آیا تھا۔ اسی بہانے سہی میں بغداد تو پہنچ جاؤں گا۔ میں نے سوچا اور میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ پھر مجھے سولدہ یاد آئی۔ کیا اسے میری روانگی کا پتا چل جائے گا؟ میرے ذہن میں یہ خیال دیر تک چکراتا رہا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے سب کچھ معلوم کرلے گی' مجھے فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ پھر اچانک ہی نہ جانے کیا ہوا کہ میرا دل گھبرانے لگا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سوچا کہ شاید کثرت شراب نوشی کے سبب ایسا ہے مگر کچھ دیر بعد ہی اس کمرے میں مجھے عجیب سی گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ میں نے اٹھ کر کمرے کے سارے دریچے کھول دیے' پھر بھی

گھٹن کم نہ ہوئی تو دروازہ بھی کھول دیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ گھٹن کا احساس بدستور تھا اور اب اس میں ایک عجیب سے خوف کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے مزید اس کمرے میں رہا تو کمرے کی چھت مجھ پر گر پڑے گی۔

مجھے نشہ ہو گیا ہے' میں نشے میں ہوں! میں نے اپنے دل کو سمجھانا چاہا مگر آخر کب تک! کچھ دیر ہی میں میری یہ حالت ہو گئی کہ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ میں نے کمرے سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔

کمرے سے نکل کر میں راہداری میں آیا اور پھر جیسے میرے قدم خود بخود ایک طرف اٹھنے لگے۔ راستے میں مجھے محل کے محافظوں نے دیکھا اور تعظیم سے سر جھکا کر ایک طرف ہو گئے۔

مجھے یاد نہیں کہ میں کس طرح محل کے صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ میرے دل میں لحہ بہ لحہ یہ خواہش شدید ہوتی جا رہی تھی کہ میں محل سے نکل کر کھلی فضا میں پہنچ جاؤں۔ محل کے در و دیوار جیسے مجھے بھینچے ڈال رہے تھے۔

محل کا صدر دروازہ ابھی بند نہیں کیا گیا تھا اور غالباً اسی کو بند کرانے کے لیے وہاں محل کا نگراں میقاز موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی تعظیم دی۔ پھر جب میرے قدم صدر دروازہ عبور کر کے باہر جانے کے لیے اٹھے تو مجھے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے مگر شاید اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے رات کے اس پہر باہر جانے کا سبب دریافت کر سکتا۔ میں اس کے قریب سے گزرا چلا گیا۔

محل سے باہر آ کر مجھے کچھ دیر سکون کا سا احساس ہوا' پھر وہی کیفیت طاری ہونے لگی' گھبراہٹ اور خوف کی ملی جلی کیفیت! مجھے محل سے دور ہو جانا چاہیے' اتنی دور کہ یہ مجھے نظر بھی نہ آئے۔ میں نے سوچا اور تیزی سے ایک طرف بڑھ گیا۔

میرے قدم تیزی سے اٹھتے رہے' اٹھتے رہے اور میں بستی کے یورتوں کو پیچھے چھوڑ کر کالی دیواروں کی طرف بڑھتا رہا۔

مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں نے ایک جگہ رک کر سوچا۔ مجھے قرار کیوں نہیں؟ بچپن سے آغاز جوانی تک مجھ پر کئی بار ایسی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ جب بھی میں بے قراری محسوس کرتا تھا تو میری ایک ہی منزل ہوتی تھی۔ وہاں پہنچ کر میری بے قراریوں کو قرار آ جاتا تھا۔ اس شب بھی اسی لیے میرے قدم اسی سمت اٹھے۔

طاقت کا پہاڑ بورخان قالدون! میرے ذہن میں بار بار یہی گونج سی اٹھتی تھی۔ بورخان قالدون جس کی ڈھلانوں پر چرواہے سر شام اکتارا بجاتے تھے اور اپنے ریوڑ چراتے تھے۔ بورخان قالدون جہاں میری تنہائیاں آباد ہو جاتی تھیں اور جہاں میرے بے قرار دل کو قرار آ جاتا تھا۔ اس جگہ سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ میں نے بوڑھے منگولوں سے سنا تھا کہ جب چنگیز خاں کے سامنے کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو وہ بھی طاقت کے پہاڑ پر چڑھ جاتا تھا' پھر جب وہ پہاڑ سے اترتا تھا تو حکم جاری کرتا تھا۔ بوڑھے منگولوں کا خیال تھا کہ چنگیز خاں اس پہاڑ پر چڑھ کر نیلے جاودانی آسمان کی روح سے باتیں کیا کرتا تھا اور اس کے مشورے سنتا تھا۔ اسی پہاڑ کے دامن میں اب بھی چنگیز خاں سویا ہوا تھا اور اس کی قبر پر جنگ کا پرچم بدستور لہرا رہا تھا۔ یہ وہی بورخان قالدون تھا جس کے ایک غار میں پہلی بار میں نے سولدہ کو دیکھا تھا اور خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھا تھا۔ اس شب میں اپنی بے قراریوں سے مجبور ہو کر سکون دل کی خاطر اسی پہاڑ کی طرف چلا جا رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے قدم خود بخود ادھر اٹھ رہے ہوں۔

رات کی تاریکی میں طاقت کا پہاڑ' دور سے کسی عفریت کے ہیولے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی رات کے وقت وہاں آنے کی ہمت نہیں کی تھی اور نہ ہی رات کو کوئی اس طرف جاتا تھا مگر اب ادھر جاتے ہوئے میرے دل میں کوئی خوف نہیں تھا' نہ جانے کیوں! میں خود بھی اپنی بے خوفی پر حیران تھا کہ آخر مجھے ہو کیا گیا ہے؟

میں جس قدر پہاڑ کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا میری رفتار میں تیزی آتی جا رہی تھی، یوں جیسے کوئی انجانی قوت پہاڑ کی طرف کھینچ رہی ہو۔

اور پھر میں پہاڑ کے دامن میں پہنچ ہی گیا۔ میں نے پہاڑ پر چڑھنے سے پہلے رکنا چاہا تھا مگر خود پر قابو نہ پا سکا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اس وقت پہاڑ پر نہیں چڑھنا چاہیے مگر اس کے باوجود میرے قدم اٹھے جا رہے تھے جیسے میں اپنے بس میں نہ ہوں، مجھے خود پر قابو نہ ہو۔

معاً میری نگاہ بلندی کی طرف اٹھی اور میں ٹھٹک کر رک گیا۔ تاریکی میں روشنی کی وہ ننھی سی لکیریں واضح نظر آ رہی تھیں جو ایک غار کے دہانے سے باہر آ رہی تھیں۔ کیا اس غار میں کوئی ہے؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا اور اسی کے ساتھ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس غار تک پہنچوں۔ میرے قدم پھر تیزی سے اٹھنے لگے۔ عام حالات میں شاید میں اتنی ہمت نہ کرتا مگر اس وقت تو میرے دل سے جیسے ہر خوف نکل گیا تھا۔

پھر میں اس غار کے دہانے تک پہنچ ہی گیا۔ میں نے وہاں رک کر اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ غار کے دہانے سے اندر چلا گیا۔ پھر اندر پہنچتے ہی جیسے میں سب کچھ سمجھ گیا۔

سامنے ہی ایک بڑے سے پتھر پر شامان بغورچی اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبدا رہا تھا۔ اس کے سر سے کچھ فاصلے پر غار کی دیوار میں ایک مشعل پیوست تھی۔ تو مجھے یہاں تک کھینچ کر بلانے والا شامان بغورچی ہے! میں نے سوچا اور میرے دل میں نفرت کی ایک لہر سی پیدا ہوئی۔

اسی وقت شامان بغورچی کی بھاری آواز سے غار گونج اٹھا۔ "میں یہاں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ تو آ گیا بوغا!" یہ کہہ کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"تو نے بوغا کو نہیں، اپنی موت کو یہاں بلایا ہے بغورچی!" میں پھٹ پڑا۔

شامان بغورچی میری بات سن کر بڑی زور سے ہنس پڑا، پھر کچھ دیر بعد بولا۔ "تجھے وہ دن یاد ہے بوغا، جب میں پہلی بار تجھے اس پہاڑ پر لے کر آیا تھا اور تو ڈر کر بھاگ اٹھا تھا؟"

"ہاں مجھے یاد ہے کہ تو اپنی تمام پراسرار قوتوں کے باوجود بھی سولدہ کو نہ روک سکا تھا۔" میں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے بوغا، مگر اب نیلے جاودانی آسمان کی عظیم روح نے مجھے مزید قوتیں عطا کر دی ہیں تاکہ میں اس سولدہ کو اسیر کر سکوں یقین کر کہ اب وہ میرے چنگل سے نہیں نکل پائے گی۔" بغورچی پرجوش لہجے میں بولا۔ "سن بوغا! اگر اب بھی تو اس پر آمادہ ہو جائے کہ سولدہ کو قابو میں کرنے کے لیے میرا ساتھ دے تو پھر اس طرح مجھے مزید جو قوتیں حاصل ہو جائیں گی، ان کے راز میں تجھے بھی بتا دوں گا۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"مجھے تیری کوئی بات منظور نہیں!" میں نے نفرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"پھر سوچ لے!" بغورچی کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

"سوچ لیا!" میں بولا۔

"میرے پاس دوسرا راستہ بھی ہے۔ مجھے مجبور نہ کر کہ میں وہ دوسرا راستہ اختیار کروں۔" بغورچی کے لہجے میں دھمکی تھی۔ "میں اگر چاہتا تو اب تک تجھے ختم کرا چکا ہوتا لیکن میں نے تجھے صرف اس لیے زندہ رہنے دیا کہ میں تیرے ذریعے اس سولدہ پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ میں اسے ہر قیمت پر اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے دھمکیاں نہ دے بغورچی! میں تیری باتوں میں نہیں آؤں گا۔" میں بے خوفی سے بولا۔ "اور یہ بھی نہ بھول کہ میں خاقان منگوخاں کا منہ بولا بھائی ہوں۔ میرے ایک اشارے پر تجھے کسی چیونٹی کی طرح مسل کر پھینک دیا جائے گا۔"

"بکواس نہ کر اور بڑ نہ مار! شامان بغورچی کوئی چیونٹی نہیں جو مسل دیا جائے۔" بغورچی کے لہجے میں آگ تھی۔ "اگر تیرے بس میں یہ ہوتا تو ایسا کر گزرتا۔ پھر

کہ تو اس وقت تک یہاں سے واپس ہی نہیں سکتا' جب تک بغورچی نہ چاہے۔"

"تو مجھے نہیں روک سکتا!" میں نے کہنے کو تو کہہ دیا میں خود اپنے لہجے کی بے بسی سے واقف تھا۔

"تو پھر ایسا کر کہ اب اپنی جگہ سے ہل کر ہی دکھا ے' جانا تو بڑی بات ہے۔"

شامان بغورچی کا جملہ پورا ہوتے ہی مجھے اپنے جسم ں ایک عجیب سی سنسناہٹ کا احساس ہوا تھا' اور پھر ں لگا تھا جیسے میرا سارا جسم سن ہو گیا ہے۔ میں نے پنے جسم کو حرکت دینا چاہی اور ناکام رہا۔

شاید میری کیفیت بغورچی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ ہ چند قدم آگے آیا' اور پھر قہقہے لگانے لگا۔ وہ میری بے بسی پر قہقہے لگا رہا تھا اور میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔

"میں اگر چاہوں تو تیری زبان بھی حرکت نہ کر سکے اور تو کچھ سن بھی نہ سکے۔ تجھے آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود کچھ نظر نہ آئے مگر میں نے ابھی ایسا نہیں کیا۔ ابھی میں نے تجھے صرف یہ دکھایا ہے کہ تو میری مرضی کے خلاف اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتا۔" شامان بغورچی فخریہ لہجے میں بولا۔

"تو مجھے یوں بے بس کر کے اپنی بات نہیں منوا سکے گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے اب تجھ سے اپنی بات منوانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ آخری موقع تھا جو میں نے ابھی کچھ دیر پہلے دینا چاہا تھا مگر تو بے عقل تھا۔ تو نے وہ سنہری موقع کھو دیا۔ اگر تو اس موقع سے فائدہ اٹھا لیتا تو زندہ بھی رہتا لیکن اب میں تجھ سے کام نکال کر تجھے قتل کر دوں گا تاکہ تو میرے لیے مستقبل میں خطرہ نہ بن سکے اور تیری زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے۔"

بغورچی کی بات سن کر میرا چکرا جانا فطری تھا۔ وہ آخر مجھے بے بس کر کے اپنا کیا کام نکالنا چاہتا تھا؟

"تو آخر چاہتا کیا ہے؟" نہ جانے کیسے یہ سوال میری زبان پر آگیا۔

"وہی جو روز اول چاہتا تھا۔" وہ اپنے گول گول دیدے گھما کر عیاری سے بولا۔ "میں سولدہ کو قابو میں کروں گا اور اب مجھے ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔"

"پھر اس میں میرا کیا بیچ! میں نے تجھے کب منع کیا ہے کہ ایسا نہ کر!" میری آواز میں شکستگی عود کر آئی تھی۔ "پھر مجھے قتل کر کے تجھے کیا مل جائے گا؟"

"میں نے اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے پتا چلایا ہے کہ وہ سولدہ تجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ اسے صرف تیرے ہی ذریعے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ یا تو تیری مرضی سے یا تجھے استعمال کر کے!"

"استعمال کر کے!" میں بڑبڑایا۔ "استعمال کرنے سے تیرا کیا مطلب ہے؟"

بغورچی میری حالت پر ہنس پڑا۔ "سن!" وہ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "اب تیرے کچھ جاننے نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تجھے بہرحال میرے ہاتھوں قتل ہو جانا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "میں تجھ پر تشدد کروں گا' اتنا تشدد کہ تیری محبوبہ تجھے میرے ظلم سے بچانے کے لیے یہاں آنے پر مجبور ہو جائے۔ پھر جب وہ یہاں آجائے گی تو بچ کر نہ جا سکے گی۔ میں اسے پھانسنے کے لیے تجھے چارے کے طور پر استعمال کروں گا۔ اب سمجھ گیا!"

بغورچی نے اس بار سولدہ کو قابو میں کرنے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا' وہ میرے خیال میں غلط نہیں تھا۔ اس نے جو دعوے کیے تھے' انہیں سن کر میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا ممکن ہے کہ اس نے اب اتنی قوتیں حاصل کر لی ہوں جو سولدہ کی قوتوں سے کہیں زیادہ ہوں۔

مجھے مشکل میں گرفتار دیکھ کر سولدہ کا وہاں پہنچ جانا کوئی تعجب خیز نہ ہوتا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ میری طرف سے غافل نہیں رہے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں سولدہ کو ایک پراسرار عورت سمجھنے کے باوجود اس کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ میں خود جاں سے گزرنا قبول کر سکتا تھا مگر سولدہ کے اوپر

کوئی آنچ آئے' یہ منظور نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس صورت حال سے نمٹنے کی کوئی صورت سوچنے لگا۔ میں نے کچھ دیر خاموش رہ کر بغورچی کو پھر مخاطب کیا۔

"اے عظیم شامان! مجھے تیری پہلی شرط قبول ہے۔ میں سولدہ کو قابو میں کرنے کے لیے تیری ہر بات مانوں گا۔"

میری بات سن کر وہ قریب آگیا' پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا ہو۔

"تیرے دل میں کیا ہے؟ بیان کر!" بغورچی کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

میں نے چاہا کہ جو سوچا ہے' اسے نہ بتاؤں مگر میرے ہونٹ جیسے خود بخود حرکت کرنے لگے۔ "میں اس طرح تجھے دھوکا دے کر ایک تو یقینی موت سے بچ جاؤں گا' دوسرے موقع ملتے ہی تیری طرف سے سولدہ کو ہوشیار کر دوں گا۔"

"سولدہ اب تجھ سے کب اور کہاں ملنے آئے گی؟" بغورچی نے میرا جواب سن کر دوسرا سوال کیا۔

"وقت اور مقام طے نہیں۔" میرے ہونٹ پھر حرکت میں آگئے۔ "اس نے کہا تھا کہ وہ میری طرف سے غافل نہیں رہے گی۔"

"وہ تجھ سے آخری بار کب اور کہاں ملی تھی؟" شامان بغورچی نے پوچھا۔ وہ اب بھی براہ راست میری آنکھوں میں دیکھے جا رہا تھا اور ایک بار بھی پلک نہیں جھپکائی تھی۔

"وہ مجھ سے اسی سال مغربی دشت میں ملی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"مغربی دشت میں!" بغورچی حیرت سے بڑبڑایا۔ "تو وہ۔۔۔ وہ بھی پہنچ گئی۔۔۔ وہاں بھی!" بڑبڑاتے ہوئے اس کی پلکیں لمحے بھر کو جھپک گئیں اور اسی کے ساتھ میرے ذہن کو پھر جھٹکا سا لگا۔

یہ میں نے کیا کیا؟ میں نے سوچا۔ مجھے بغورچی کو یہ باتیں نہیں بتانی چاہیے تھیں مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تجھ سے ملتی رہتی ہے۔" شامان بغورچی نے میری طرف دیکھتے ہو[illegible] مگر میں نے اس سے اپنی نگاہ نہ ملنے دی۔

میں نے اپنی نگاہ جھکا لی تھی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہتا ہے۔ جس [illegible] بعد میں جھوٹ نہیں بول سکوں گا۔

"نگاہ اٹھا بوغا!" بغورچی کے لہجے میں حکم تھا۔ یقیناً میری چالاکی سے واقف ہو گیا تھا۔

اگر میں اس سے نگاہ نہ ملاؤں تو گویا وہ مجھے سچ بو[illegible] پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں نے سوچا اور بولا [illegible] "بغورچی! میں جانتا ہوں کہ تو وہی کرے گا جو تیر[illegible] دل میں ہے اس لیے ضروری نہیں کہ میں تیری [illegible] بات مانوں۔"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ عجیب سے لہجے [illegible] بولا۔ "ابھی تجھے اندازہ نہیں کہ بغورچی ہے کہ [illegible] میرے ڈھیل دینے سے تو شیر ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر [illegible] پلٹا اور دوبارہ اس بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا جہاں [illegible] بیٹھا تھا۔

وہ مجھ سے دور ہو گیا تو میں نے سکون سا محسو[illegible] کیا۔ میں نے دیکھا کہ پتھر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنے [illegible] بعد اس نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں' پھر اس [illegible] ہونٹ حرکت کرنے لگے مگر میں نے اس کے ہونٹو[illegible] سے کوئی آواز بلند ہوتے نہ سنی۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹو[illegible] میں کچھ بدبدا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھ پر خوف سا طار[illegible] ہونے لگا۔ وہ یقیناً "اپنی کسی پراسرار قوت کو بروئے [illegible] لانا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد مجھے کسی عذاب ہی م[illegible] گرفتار کرنا ہو سکتا تھا۔

ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ مجھے اپنے تمام جسم م[illegible] خارش سی محسوس ہوئی' ہاتھ پیروں میں' پشت اور [illegible] پر! میں جانتا تھا کہ اپنی مرضی سے ہاتھ بھی نہیں ہلا[illegible] مگر اس کے باوجود میں نے کوشش کی کہ ہاتھ اٹھا کر [illegible] کھجا سکوں۔

میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں او[illegible] لحہ بہ لحہ خارش بڑھتی جا رہی تھی۔ خارش بھی روحا[illegible] اذیت کا سبب بن سکتی ہے' اس کا اندازہ مجھے پہلے نہیں

تھا۔

کچھ دیر بعد ہی میں چیخ اٹھا۔ "بغورچی!" مگر وہ مجھ سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن تھا۔ غصے کے عالم میں، میں نے اسے گندی گندی گالیاں بکنا شروع کر دیں مگر اس کے باوجود اس کے ہونٹوں کی حرکت بند نہ ہوئی اور نہ ہی اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔

میں نہ جانے کب تک چیختا رہا اور اسے گالیاں دیتا رہا، اور پھر نہ جانے کب اور کتنی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ خارش بدستور تھی مگر اب اس میں شدت کم ہو گئی تھی۔

"مجھے نہ پکار، سولدہ کو پکار بوغا!" وہ با آواز بلند بولا۔ "تجھے میرے عذابوں سے اسی وقت نجات ملے گی جب وہ یہاں پہنچ جائے گی۔"

"میرے۔۔۔ میرے جسم کو آزاد کر دے بغورچی!۔۔۔ میں۔۔۔ میں یہاں سے نہیں بھاگوں گا، یقین کر نہیں بھاگوں گا۔۔۔ مجھے اپنا جسم کھجا لینے دے بغورچی، کھجا لینے دے!" میرے لہجے میں التجا تھی۔

"ہرچند کہ مجھے تیرے وعدے پر اعتبار نہیں مگر تو میرے بس میں ہے۔ تو چاہے بھی تو یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے رکا، پھر بولا۔ "اب تیرا جسم آزاد ہے۔"

بغورچی مجھ سے عجیب پراسرار کھیل کھیل رہا تھا جس سے مجھے اب شدید خوف محسوس ہونے لگا۔ اس کا جملہ پورا ہوتے ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو حرکت دینا چاہی تھی تاکہ اس کے کہے ہوئے لفظوں کی سچائی پرکھ سکوں۔ پھر مجھے سخت تعجب ہوا کہ اس کا کہا پورا ہو گیا۔ میرے ہاتھ حرکت کرنے لگے تھے۔ کیا کسی کے صرف کہہ دینے سے جسم بے حرکت ہو سکتا ہے، اور پھر دوبارہ حرکت میں آ سکتا ہے؟ میرے ذہن میں خیال آیا، اور پھر میں اپنے خارش زدہ جسم کو بری طرح کھجانے لگا۔

میرے ناخنوں سے جسم پر جگہ جگہ خراشیں پڑ گئیں اور جلد سے خون جھلکنے لگا مگر خارش اتنی تھی کہ میں پھر بھی کھجائے ہی جا رہا تھا جہاں جہاں جسم پر خراشیں پڑی تھیں، ان میں آگ سی بھر گئی تھی۔ اس وقت مجھے جسم کھجانے ہی سے فرصت نہیں تھی تو فرار ہونے کے بارے میں کیا سوچتا! کچھ دیر بعد جب جسم کو ذرا سکون ملا تو میں ایک دم غار کے دہانے کی طرف پلٹا جو مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں ابھی چند قدم ہی بھاگا ہوں گا کہ یوں لگا جیسے کسی نے میرے پاؤں میں رسی ڈال دی ہو۔ میں منہ کے بل زمین پر گرنے لگا تو ہاتھ بڑھا دیے۔

گرنے سے میری دونوں ہتھیلیاں اور کہنیاں زخمی ہو گئیں۔ بائیں ہاتھ کی کہنی سے خون بھی بہنے لگا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تو نہ بھاگ سکے گا مگر نہ مانا۔" یہ کہہ کر بغورچی ہنس پڑا، پھر سخت لہجے میں بولا۔ "اٹھ کر کھڑا ہو جا! میں جانتا ہوں کہ تو اپنی حرکت سے باز نہیں آئے گا۔ تجھے ابھی مزید سزا کی ضرورت ہے لیکن یاد رکھ کہ اس بار تو مجھے نہیں، سولدہ کو پکارے گا کیونکہ تجھے اسی وقت نجات مل سکتی ہے جب وہ یہاں آ جائے۔"

میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور ایک بار پھر دہانے کی طرف بڑھنا چاہا۔ اس غار میں موجود رہنے کا مطلب اور جدوجہد ترک کر دینے کے یہی معنی تھے کہ میں خود کو بغورچی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔ بھلا جان بوجھ کر کون موت کے منہ میں رہنا چاہتا ہے جو میں رہنا قبول کر لیتا! میں اسی لیے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا مگر وہ عیار یقیناً میری طرف سے غافل نہیں تھا۔ جیسے ہی میں نے اٹھ کر بھاگنا چاہا، اس نے میری دائیں ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی اور میں پھر اوندھے منہ گر پڑا۔

"وقت سے پہلے مرنے کی کوشش نہ کر بوغا!" وہ میری ٹانگ چھوڑ کر غرایا۔ اسی کے ساتھ اس کے پاؤں کی ٹھوکر میرے کولھے پر پڑی اور میں بلبلا کر اٹھ بیٹھا۔

پھر میں اسی طرح وہیں بیٹھا رہ گیا۔ اس نے ایک بار پھر میرے جسم کو بے حرکت بنا دیا تھا۔ یہ محسوس کرتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔ اب میں پوری طرح اس کے قبضے میں تھا۔ میں بے بس ہو چکا تھا۔ وہ اب مجھ پر

جو ستم ڈھاتا، مجھے برداشت کرنا پڑتا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہ دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میرے جسم میں اس تصور ہی سے خارش ہونے لگی کہ ابھی کچھ دیر بعد وہ مجھے اس عذاب میں گرفتار کرنے والا ہے۔

دوبارہ وہ نہ ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ میرے جسم میں خارش پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا کہ شاید اس بار اس کی پراسرار قوت کام نہیں کر رہی مگر ایسا نہیں تھا۔ پہلے میں سمجھا کہ شاید وہ چبھن ان پتھروں کی ہو گی جو میرے نیچے دبے ہوئے ہیں لیکن جب وہی چبھن رفتہ رفتہ میرے سارے جسم میں پھیلنے لگی تو مجھے تکلیف محسوس ہونے لگی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خنجر کی نوک سے میرے سارے جسم پر چرکے لگا رہا ہے۔ پہلے میں اس تکلیف کو برداشت کرتا رہا، پھر جب ہاتھوں اور پیروں کے ناخنوں میں بھی یہی چبھن بڑھی تو میں نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ مجھے اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ تکلیف و اذیت کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ میں اسی لیے سختی سے ہونٹ بھینچے رہا۔ میں نے سوچا کہ چیخوں گا نہیں لیکن کب تک! آخر میری قوت برداشت جواب دے گئی۔

بغورچی سے رحم کی بھیک طلب کرنا فضول تھا اور میں سولدہ کو بھی مدد کے لیے پکار کر خطرے سے دوچار کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ بغورچی کا مقصد یہی تھا۔ میں اسی لیے چیخے جا رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ چاہے میری جان چلی جائے، سولدہ کو نہیں پکاروں گا اس لیے کہ مجھے یقین تھا، سولدہ اپنے وجود کو خطرے میں ڈال کر میری مدد کے لیے پہنچ جاتی۔ اگر مجھے کوئی فکر تھی تو صرف یہ کہ کہیں سولدہ خود مجھے تلاش کرتی ہوئی نہ پہنچ جائے اور یوں بغورچی کے جال میں نہ آ پھنسے۔

مجھ سے ایک بڑی غلط ہو چکی تھی کہ میں نے بغورچی کو پہل کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا اور اب اس غلطی کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ اگر میں پہل کرتا تو شاید یہ نوبت نہ آپاتی لیکن مجھے اس کا موقع ہی کب ملا تھا!

چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا اور مجھ پر نیم بے ہوشی سی طاری ہونے لگی تو بغورچی نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

"تو مجھ سے ضد کرے گا بوغا!" وہ پھنکارا۔ "تو سولدہ کو نہیں پکارے گا۔"

"نہیں، نہیں!" میں چیخ پڑا مگر یہ صرف میرا خیال تھا۔ میری آواز صرف اتنی بلند ہو سکی تھی کہ بغورچی تک پہنچ سکے۔ "تو مجھے مار ڈال، قتل کر دے مگر۔۔۔ مگر میں یہاں سولدہ کو نہیں بلاؤں گا، اسے۔۔۔ اسے نہیں پکاروں گا۔"

جب سے بغورچی نے آنکھیں کھولی تھیں، میرے جسم پر چرکے لگنا بند ہو گئے تھے لیکن تکلیف بدستور برقرار تھی اسی لیے مجھ میں اتنی سکت پیدا ہو گئی تھی کہ اس سے بات کر سکوں۔

"میں بھی دیکھتا ہوں کہ تو اسے کب تک نہیں پکارے گا اور تجھ میں کتنی قوت برداشت ہے!" یہ کہہ کر بغورچی نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

چند لمحے بعد ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا گیا ہو حالانکہ میرے اطراف آگ نہیں تھی۔ میرا وجود جیسے کسی نادیدہ آگ سے جلنے لگا، پھر نہ جانے کب میرے حواس جواب دے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے بے ہوش ہونے سے قبل ایک بار بھی سولدہ کو نہیں پکارا تھا۔

مجھے جب دوبارہ ہوش آیا تو یوں لگا جیسے کوئی میرے جسم کو ٹھنڈے پانی میں غوطے دے رہا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور حیران رہ گیا۔ میرا جسم اسی غار کے پتھروں پر پڑا تھا اور میرے سرہانے بغورچی کھڑا ہوا تھا۔ بغورچی نے مجھے مخاطب نہیں کیا کیونکہ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبدا رہا تھا۔

رفتہ رفتہ ٹھنڈک کا احساس بڑھتا گیا اور پھر کچھ دیر ہی میں میرا جسم بری طرح کانپنے لگا۔ وہ ٹھنڈک جیسے

ری ہڈیوں میں اتری جا رہی تھی۔ پھر میرا جسم اکڑنے ا۔

"پکار' سولدہ کو پکار!" میرے کان میں جیسے بغورچی نے سرگوشی کی۔ "وہی تجھے اس عذاب سے نجات دلا لتی ہے۔" اور پھر یہ سرگوشی مسلسل ہونے لگی۔

بغورچی میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ ب بھی حرکت کر رہے تھے۔ پھر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اس بار میں اس سے نظر نہ چرا سکا۔

"پکار' مدد کے لیے سولدہ کو پکار!" بغورچی کی آواز جھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"سس... سولد... سولدہ!" میرے ہونٹوں کو رکت ہوئی' اور پھر میں اسے زور زور سے پکارنے لگا۔

بغورچی کے حکم پر نہ جانے کتنی دیر سولدہ کو پکارتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے مگر میں اپنے بس میں کب تھا۔ مجھے اپنے اوپر اختیار ہی کب تھا! میں تو بغورچی کے سحر میں گرفتار تھا۔ میں چاہتا بھی تو اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

پھر جب کافی دیر ہو گئی اور میری پکار پر سولدہ نہ آئی تو بغورچی بڑبڑایا۔ "وہ شاید ابھی تک مغربی دشت میں ہے ورنہ اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری جانب سے نگاہ بھی پھیر لی تھی۔ اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

بغورچی کے نگاہ پھیرتے ہی میں جیسے اس کی آنکھوں کے سحر سے آزاد ہو گیا تھا۔ پہلے ہی کی طرح میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ ابھی کچھ دیر قبل میں بغورچی کے حکم پر سولدہ کو پکار چکا ہوں۔ سولدہ میری پکار سن کر وہاں کہیں پہنچی تھی' یہ دیکھ کر مجھے خوشی سی ہو رہی تھی۔ اس کے نہ آنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یا تو وہ اپنے دشمنوں سے برسرِ پیکار ہو گی یا پھر اس نے اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے پتا چلا لیا ہو گا کہ بغورچی اس کے لیے جال بچھائے بیٹھا ہے۔

اس غار میں میرے لیے روز شب کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مجھے علم نہیں کہ میں نے وہاں کتنی راتیں اور کتنے دن گزارے لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ بغورچی اس دوران میں نہ خود سویا اور نہ اس نے مجھے سونے دیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ مجھ پر بے ہوشی کے مختصر اور طویل دورے پڑتے رہے کیونکہ بغورچی مجھ پر اس امید میں تشدد کیے جا رہا تھا کہ کبھی تو میری محبوبہ یعنی سولدہ کو مجھ پر رحم آئے گا اور وہاں پہنچ جائے گی۔ اس دوران میں بغورچی نے مجھے بمشکل دو تین بار خوراک فراہم کی تھی۔ وہ بھی اس غرض سے کہ میں مر نہ جاؤں۔ وہ اس وقت تک مجھے بہرحال زندہ رکھنا چاہتا تھا جب تک سولدہ کو قابو میں نہ کر لیتا۔

میری حالت اس شخص کی سی ہو گئی تھی جو عالم نزاع میں ہو۔ میری زندگی اور موت کے درمیان بہت نازک اور کمزور سا رشتہ برقرار رہ گیا تھا اور میں ہوش اور بے ہوشی کی ملی جلی سی کیفیت میں بغورچی کے حکم پر سولدہ کو پکارتا رہتا تھا۔

پھر وہ نہ جانے دن تھا کہ رات' اچانک میں نے غار میں ایک مانوس سی خوشبو محسوس کی اور آنکھیں کھول دیں۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی میں نے سولدہ کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تھا۔ اسی وقت مجھے بغورچی کا خیال آیا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ گویا سولدہ اس کے جال میں آ ہی پھنسی۔ میں نے سوچا اور نظر پھیر کر اس کی طرف دیکھا جہاں بڑے پتھر پر بغورچی آلتی پالتی مارے بیٹھا رہتا تھا۔

میں نے بغورچی کو اس جگہ کھڑا ہوئے دیکھا۔ اس کے ہونٹ تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور کھلی ہوئی سرخ آنکھیں سولدہ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

معاً میری سماعت سے سولدہ کی آواز ٹکرائی۔ وہ شامان بغورچی سے مخاطب تھی اور اس کے لہجے سے انتہائی غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ "اے شامان! ہوش میں آ اور سن کہ میں کوئی سولدہ نہیں ہوں۔ میں نے اب تک تجھے صرف اس لیے نظرانداز کیا کہ میں بے جا

دشمنی کی قائل نہیں۔ میں مختلف عہدوں میں اپنے دوست بناتی ہوں' دشمن نہیں لیکن توحد سے گزر گیا اور تو نے میرے دوست بوغا کی یہ حالت بنادی جب کہ بوغا قطعی بے قصور۔۔۔"

اچانک ہی غار میں ایک زناٹا سا گونجا اور سولدہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ میں نے ایک شعلہ سا سولدہ کی طرف لپکتے دیکھا' وہ شعلہ سولدہ کے گرد گردش کرنے لگا۔ اسی کے ساتھ شامان بغورچی کا کریہہ قہقہہ سنائی دیا۔

"آخر آج میں نے تجھے قید کر ہی لیا۔" شامان بغورچی یہ کہہ کر پھر ہنس پڑا' پھر بولا۔ "اب اگر تو چاہے بھی تو اس شعلے کے حصار سے نہیں نکل سکتی۔ میں چاہوں تو یہ حصار اتنا تنگ ہو سکتا ہے کہ تیرا وجود اس کی لپیٹ میں آجائے اور تو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے مگر میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ مجھے تجھ سے بہت سے کام لینے ہیں' تجھے اپنا حکم ماننے پر مجبور کرنا ہے۔"

مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا اور خوف بھی محسوس ہوا کہ بغورچی کی بات سن کر سولدہ کے چہرے سے بوکھلاہٹ کا اظہار ہونے لگا تھا مگر ایسا صرف چند لمحے کے لیے ہوا۔ سولدہ کے چہرے پر مجھے پھر سکون و اطمینان نظر آنے لگا۔

میں نے سولدہ کو جادوئی ہتھیار نکالتے دیکھا جسے میں پہلے ہی اس کے پاس دیکھ چکا تھا۔ اس نے ہتھیار کا رخ بغورچی کی طرف کیا اور سخت لہجے میں بولی۔ "میں نہیں چاہتی تھی کہ تجھے ختم کروں لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

سولدہ کے الفاظ ختم ہوتے ہی میں نے ہلکا سا دھماکا سنا' پھر شامان بغورچی کا قہقہہ!

"اس حصار سے نہ تو باہر آسکتی ہے اور نہ تیری پھینکی ہوئی کوئی چیز!" شامان بغورچی نے کہا۔ "حماقت چھوڑ دے اور میری اطاعت قبول کرلے کیونکہ اسی میں۔۔۔"

ابھی شامان بغورچی کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ میں نے لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سنی اور اسی کے ساتھ سولدہ کی آواز آئی۔ "تو احمق اور بے وقوف ہے۔ تو مجھے نہیں روک سکتا۔"

دوسرے ہی لمحے میں نے سولدہ کو غائب ہوتے دیکھا۔ شعلے کا حصار اپنی جگہ موجود تھا مگر اس میں سے سولدہ غائب ہو چکی تھی۔

میں نے شامان بغورچی کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی دیکھیں' پھر اسے بڑبڑاتے سنا۔ "بھاگ گئی' بھاگ گئی!"

سولدہ کے فرار کا مطلب میری نظر میں یہی تھا کہ شامان بغورچی کی پراسرار قوتوں کے سامنے نہ ٹک سکی تھی۔ اب کیا ہوگا؟ میرا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ اگر سولدہ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی تو پھر مجھے یقینی موت سے کون بچا سکتا ہے۔ تکلیف و اذیت کے سبب میں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اب مجھے صرف اپنی موت کا انتظار تھا کیونکہ میں زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ بھلا میں کب تک بغورچی کا تشدد سہہ سکتا تھا۔ اس تشدد سے تو بہتر تھا کہ مجھے موت آجاتی۔ بغورچی مجھے مرنے بھی تو نہیں دے رہا تھا۔

"بوغا!" بغورچی نے مجھے اچانک پکارا تو میں چونک اٹھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "اسے پکار' اسے! ورنہ میں۔۔۔ میں اس کی جگہ تجھے جلا ڈالوں گا۔"

مجھے یقین نہیں تھا کہ اب سولدہ دوبارہ وہاں آئے گی کیونکہ اب وہ اچھی طرح سمجھ چکی ہوگی کہ بغورچی سے نمٹنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ فرار کیوں ہوتی۔ اس صورت میں اسے پکارنا' پکارنا برابر تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے میری حالت دیکھ چکی تھی۔ اگر وہ مجھے بچا سکتی تو اس طرح اپنی جان کو وہاں سے نہ بھاگتی۔ اگر میں بغورچی کا حکم نہ مانتا تو یہ ممکن تھا کہ وہ مجھے کسی نئے عذاب میں گرفتار کر دیتا۔ پھر یہ کہ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی مجھے اپنا حکم ماننے پر مجبور کر سکتا تھا اس لیے میں نے فوراً اس کے حکم پر سولدہ کو پکارنا شروع کر دیا۔

نہ جانے میں کتنی دیر سولدہ کو پکارتا رہا۔ حالانکہ

میں اپنی پوری قوت سے سولدہ کو پکار رہا تھا تاکہ بغورچی کی میری آواز سن لے مگر اس کے باوجود وہ مجھے تاکید کر رہا تھا کہ میں اور زور سے سولدہ کو پکاروں۔ وجہ یہ تھی کہ نقاہت کے سبب میری آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے غار میں ایک سورج کا گولا سا دیکھا۔ غار میں جیسے دن نکل آیا تھا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا تھا کہ غار کے دہانے سے ایک دودھیا گولا سا اندر آیا تھا' اس کے بعد غار میں تیز روشنی بھر گئی تھی۔ چمک اتنی تھی کہ اس سے بچنے کے لیے میں نے اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھنا چاہے مگر ناکام رہا۔ میرا جسم ابھی تک بے حس تھا۔ میں نے یہ محسوس کرتے ہی اپنی کوشش ترک کردی۔ اپنی آنکھیں میں پہلے ہی بند کر چکا تھا مگر وہ روشنی اس کے باوجود میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ میں اس وقت کچھ نہ سمجھ پایا تھا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا' پھر اس وقت تو میں اچھل ہی پڑا جب میں نے غار میں دھماکا سا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو وہ روشنی کا گولا مجھ سے کچھ فاصلے پر گر کر بجھ رہا تھا اور سامنے ہی اس گولے سے پتھر پر گوشت کے لوتھڑے سے پڑے ہوئے تھے جہاں میں نے کچھ دیر قبل شامان بغورچی کو دیکھا تھا۔ غار میں صرف میں تھا اور شامان بغورچی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا!

"بوغا' بوغا!" ایک آشنا آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے مڑ کر غار کے دہانے کی طرف دیکھنا چاہا اور حیران رہ گیا۔ نظر کے ساتھ ساتھ میرا جسم بھی حرکت کرنے لگا تھا۔

مجھے غار کے دہانے سے سولدہ اندر آتی دکھائی دی۔ میں نے یہ محسوس کرنے کے بعد کہ اب میرا جسم بے حرکت نہیں' اٹھنا چاہا مگر ناکام رہا۔ میں کچھ اٹھا' اور پھر نڈھال ہو کر پتھروں پر گر گیا۔ اس دوران میں سولدہ میرے قریب پہنچ گئی۔

"مجھے افسوس ہے بوغا کہ تجھے میری وجہ سے زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا رہنا پڑا۔" وہ میرے قریب ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی بولی۔

"سولدہ۔۔۔ سولدہ! وہ۔۔۔ وہ شامان۔۔۔ شامان بغورچی۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ غائب ہو گیا ہے۔ کہیں وہ پھر نہ آجائے۔۔۔ تو۔۔۔ تو بھاگ جا' بھاگ جا یہاں سے! میری۔۔۔ میری پروا نہ کر۔۔۔ تو۔۔۔"

"بوغا! اب وہ ایسی جگہ پہنچ چکا ہے جہاں سے کبھی نہیں آسکتا۔" سولدہ میری بات کاٹ کر بولی۔

"کہاں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ تو اپنی اپنی سوچ ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "اس سلسلے میں مختلف قوموں کے مختلف خیالات رہے ہیں مگر میں ان سب باتوں کو نہیں مانتی۔ جو ختم ہو گیا' ختم ہو گیا۔"

اب میں کچھ کچھ اس کی بات سمجھنے لگا تھا لیکن مجھے حیرانی یہ تھی کہ بغورچی گیا کہاں اور جہاں وہ کھڑا تھا' وہاں گوشت کے لوتھڑے کہاں سے آگئے۔

"کیا وہ مر گیا؟" میں نے بمشکل سوال کیا کیونکہ اب مجھے بولنے میں نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں!" سولدہ نے جواب دیا۔

"تو پھر اس کی لاش کہاں گئی؟ کیا تو نے اپنے جادو کے زور سے اس کی لاش بھی غائب۔۔۔"

"اس کی لاش کے چیتھڑے اڑ گئے۔" سولدہ سپاٹ سے لہجے میں میری بات کاٹ کر بولی' پھر اس نے غار میں موجود پڑے سے پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تجھے وہاں گوشت کے لوتھڑے پڑے ہوئے نظر نہیں آرہے؟ اور اس پتھر کے اطراف بھی خون پھیلا ہوا دکھائی نہیں دے رہا؟"

میں نے سولدہ کے کہنے پر پھر ادھر نگاہ اٹھائی اور غور سے دیکھا۔ پتھر پر گوشت کے بڑے لوتھڑوں کے علاوہ اردگرد بھی گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھیلے نظر آرہے تھے۔ میں نے غار کی چھت پر بھی ایک آدھ گوشت کا ٹکڑا چپکا ہوا دیکھا اور لرز کر رہ گیا۔ میں نے اب تک کسی کی لاش کو اتنے ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

ضرورت نہیں! میری پوری بات سن لے! میں کل رات پھر آؤں گی۔ اگر اس دوران میں تیری آنکھ کھلے تو کھانا کھا لینا جو تجھے یہیں اپنے سرہانے رکھا ہوا مل جائے گا' اس ڈبے میں!" سولدہ نے ایک عجیب سے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

"تو..... تو ملنے ضرور آئے گی؟" میں نے بمشکل کہا۔

"ہاں ضرور!" اس نے سرہلاتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ "اب بالکل خاموش رہ!"

پھر سولدہ نے میرا لباس اتار دیا اور سارے جسم پر کوئی دوا ملی۔ مجھے بے حد شرم محسوس ہوئی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بعد سولدہ نے میرے جسم پر ایک چادر ڈال دی اور کسی ڈبے سے کچھ نکالنے لگی۔ یہ ویسی ہی رنگ برنگی گولیاں تھیں جیسی ایک بار پہلے بھی وہ مجھے کھلا چکی تھی۔

جب میں نے پانی سے وہ گولیاں نگل لیں تو سولدہ نے مجھ سے کہا۔ "اچھا اب میں چلی!" یہ کہہ کر اس نے اپنے سرخ ہونٹ میری پیشانی پر رکھ دیے

اس کے لمس کی خوشبو نے مجھے دیوانہ سا کر دیا۔ وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی اور میرے چہرے کے گرد اس کی سنہری زلفیں سایہ کیے ہوئے تھیں۔ میرا جی چاہا کہ اسے اپنے سینے سے لگا لوں۔ میں نے ہاتھ بڑھائے اور اسی وقت لوہے سے لوہا ٹکرایا۔ سولدہ میری آغوش سے غائب ہو گئی۔ میرے ہاتھ اٹھے ہی رہ گئے۔

سولدہ کو گئے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور پھر میں ایک میٹھی نیند سو گیا۔

میں سو کر اٹھا تو خود کو پہلے سے بہتر پایا۔ میرے جسم کی تکلیف جیسے کسی نے نچوڑ لی تھی سولدہ نے جو دوا میرے سارے جسم پر ملی تھی' وہ یقیناً" حیرت انگیز تھی۔ میں نے سینے سے چادر ہٹا کر اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ جہاں جہاں خراشیں تھیں اور ان سے خون رس رہا تھا' وہاں اب کھرنڈ نظر آ رہے تھے۔ میں نے کہنی کا زخم دیکھا تو اسے بھی ٹھیک پایا۔

مجھے اس وقت شدید بھوک لگ رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ قریب ہی میرا لباس پڑا تھا مگر میں نے اسے نہیں پہنا۔ یہ سوچ کر کہ شاید سولدہ پھر میرے جسم سے دوا ملے اور اسے میرا لباس اتارنا پڑے۔ یا لباس اتراتے یا اتروا تے ہوئے خوامخواہ شرمندہ ہوتی۔ میں نے چادر کو جسم سے لپیٹ لیا۔ سولدہ کو ہی گئی تھی کہ بھوک لگے تو میں سرہانے رکھے ہو... برتن سے کھانا نکال لوں۔ میں نے اس برتن کی طرف ہاتھ بڑھایا جس کے قریب ہی ایک عجیب سے... برتن میں پانی بھرا رکھا تھا۔ میں نے کھانے کے برتن ڈھکنا اٹھایا۔ اس میں بھنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے کچھ دیر ہی میں سارا برتن خالی کر دیا' پھر پانی کا شفاف اور لمبا برتن منہ سے لگا لیا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر سوتا رہا تھا... پیٹ میں کھانا پہنچا تو مجھ پر پھر غنودگی سی طاری ہو... لگی۔ میں نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور کچھ بعد ہی غافل ہو گیا۔

سوتے ہوئے معاً" مجھے یوں لگا جیسے میں تنہا نہیں... ہوں۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ سو... میرے قریب ہی لیٹی ہوئی تھی' میری طرف کروٹ لیے ہوئے! اس کی بائیں ٹانگ میرے اوپر رکھی ہو... تھی۔

"تو کب آئی؟" میں نے غنودہ لہجے میں سولدہ... پوچھا۔

"کافی دیر ہو گئی۔" سولدہ نے جواب دیا۔ "مگر... نے تجھے خود سے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ اب... حال ہے تیرا؟"

"پہلے سے بہت ٹھیک ہوں۔" میں بولا۔ "... وقت رات ہی ہو گی کیونکہ تو نے رات کے وقت... آنے کو کہا تھا۔"

"ہاں!" اس نے تائید کی۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں بہت دیر سوتا رہا!" ... نے حیرت سے کہا۔

"اس لیے کہ میں نے تجھے نیند کی گولی دی تھی...

سولدہ نے مسکرا کر بتایا۔

"نیند کی گولی!" مجھے اس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ "کیا نیند کو بھی گولی میں بند کیا جا سکتا ہے؟"

"ہاں!" وہ یہ کہہ کر ہنس پڑی۔ "تجھے آرام کی سخت ضرورت تھی مگر تیری جسمانی تکلیف تجھے آرام نہ کرنے دیتی۔ میں نے اسی لیے تجھے نیند کی گولی کھلائی تھی۔"

"اچھا یہ بتا کہ تو تھی کہاں؟" میں اس کے مزید قریب کھسکتے ہوئے بولا۔ "بغورچی کے حکم پر مجبور ہو کر میں نے تجھے بار بار پکارا۔ کیا تو نے میری پکار نہیں سنی؟"

"پہلے یہ بتا کہ تجھ پر گزری کیا اور تو اس کے قبضے میں کیسے آ گیا؟" سولدہ نے کہا۔ "تجھے تو اس کی طرف سے چوکنا رہنا چاہیے تھا۔"

میں نے جواب میں اسے تمام باتیں بتا دیں اور آخر میں پھر اپنا سوال دہرایا کہ وہ میری پکار سن کر فوراً کیوں نہیں آئی؟

"میں نے تیری پکار سنی ہی نہیں تو پھر کس طرح تجھ تک پہنچ جاتی؟" سولدہ بولی۔

مجھے سولدہ کی بات سن کر سخت حیرت ہوئی۔ کیا وہ سچ کہہ رہی تھی؟ میں نے سوچا مگر اسے مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔

"پھر بعد میں تو کس طرح مجھ تک پہنچ گئی اور تجھے کیسے پتا چلا کہ میں اس غار میں ہوں؟" میں نے کہا۔

"تجھے یاد ہو گا کہ میں نے تجھ سے کہا تھا' تیری طرف سے غافل نہیں رہوں گی۔" سولدہ بولی۔ "تجھ سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے اس لیے مجھے خیال آیا کہ ملاقات کر لی جائے۔ تجھ سے ملاقات قراقرم ہی میں ممکن تھی کیونکہ میرے علم میں تھا کہ تو یہاں ہے۔ میں نے تجھے تلاش کیا اور پتا چلا کہ تو پراسرار طور پر ایک شب خاقان منگو خاں کے محل سے غائب ہو چکا ہے اور اب تیرا کوئی پتا نہیں۔ پورے قراقرم میں تیری گمشدگی کا چرچا ہے۔ محل کے نگراں کا بیان لوگ دہراتے پھرتے ہیں کہ اس نے تجھے ایک شب محل سے نکلتے دیکھا تھا' اس کے بعد تیرا کچھ پتا نہیں چلا۔ دور دور تک تیری تلاش کرائی گئی مگر سپاہی مایوس ہی لوٹے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں تو شامان بغورچی کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو کیونکہ میں نے بستی میں یہ بھی سنا تھا کہ بغورچی بھی غائب ہے۔ پھر میں اسی نتیجے پر پہنچی کہ تو اسی پہاڑ کے کسی غار میں قید کر دیا گیا ہے۔ میں نے تیری تلاش کی' اور پھر تجھے پا لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا' اس سے تو تو اچھی طرح واقف ہے۔" یہ کہہ کر سولدہ نے انگڑائی لی اور بولی۔ "اچھا اب مجھے نیند آ رہی ہے مگر سونے سے پہلے میں تیرے جسم پر دوا ملوں گی اور تجھے دوا کھلاؤں گی بھی!"

"ابھی نہ سو!" میں جلدی سے بولا۔ "ابھی مجھے تجھ سے بہت سی باتیں پوچھنا ہیں۔"

"باز نہیں آئے گا؟" اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔

"نہیں!" میں نے کہا اور جواباً مسکرایا۔ "پہلے تو یہ بتا کہ تو بستی میں کیسے پہنچ گئی؟ وہاں تجھے اس عجیب لباس میں دیکھ کر کسی کو حیرت نہیں ہوئی؟"

"میں اس وقت منگول عورتوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھی۔" سولدہ نے بتایا۔

یہ سن کر میں نے ایک طویل سانس لیا' پھر بولا۔ "تو اپنی زبان سے تو اس بات کا اقرار نہیں کرتی مگر میں جانتا ہوں کہ تیرے پاس بڑی پراسرار قوتیں ہیں۔ میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آ سکی کہ تیرے پاس پراسرار قوتیں ہونے کے باوجود یہ کیسے ممکن ہوا کہ تو میری پکار نہ سن سکی؟"

"اگر واقعی بقول تیرے' میرے پاس پراسرار قوتیں ہوتیں تو میں تیری پکار ضرور سن لیتی۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ میرے پاس کوئی پراسرار قوت نہیں۔"

"تو تو بس ایسی چکرا دینے والی باتیں کرتی ہے کہ دماغ الجھ کر رہ جاتا ہے" میں بولا "اچھا خیر یہ بتا کہ پہلے تو بغورچی کے مقابلے سے کیوں بھاگ گئی تھی؟"

"اس لیے کہ شامان بغورچی کے پاس واقعی

پراسرار قوتیں تھیں اور اس نے مجھے وقتی طور پر قطعی بے بس کر دیا تھا۔"

"پھر تو نے اسے کس طرح ٹھکانے لگا دیا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر!" سولدہ نے جواب دیا۔

"میں نے اس پر بے خبری میں حملہ کیا تھا تاکہ وہ پہل نہ کر سکے۔"

"وہ چھوٹا سا سورج تو نے ہی غار میں پھینکا تھا جس سے دن کا سا اجالا ہو گیا تھا؟"

"وہ سورج نہیں، روشنی کا گولا تھا۔" سولدہ ہنس کر بولی۔ "میں تجھے اس کے بارے میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ تو پہلے بھی تو روشنی کا یہ گولا دیکھ چکا ہے۔"

"ہاں مجھے یاد آ گیا۔" میں نے کہا۔ "شریف کے پہاڑوں میں تو نے وہ گولا چھوڑا تھا۔ اس وقت جب میں مارکوف کی تلاش میں جا رہا تھا۔"

"ہاں!" سولدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں نے شامان بغورچی کو بدحواس کرنے کے لیے روشنی کا گولا غار میں پھینکا تھا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر مجھ پر کوئی وار کرتا، میں نے اسے ختم کر دیا۔"

سولدہ خاموش ہو گئی تو میں نے اسے اپنے آئندہ اقدامات سے آگاہ کیا اور مشورہ چاہا کہ مجھے ان حالات میں کیا کرنا چاہیے!

"تو ہلاکو خاں کے ساتھ چلا جا۔" اس نے میری ساری باتیں سن کر کہا۔ "تاریخ کا دھارا اب مڑنے والا ہے۔ تیری دلی آرزو پوری ہونے والی ہے۔"

"یعنی منگولوں کی طاقت ٹوٹنے والی ہے؟" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

"ابھی تو خیر نہیں لیکن اس کا آغاز ہونے والا ہے۔ ان میں نفاق پیدا ہو جائے گا اور وہ آپس میں لڑیں گے۔" سولدہ نے بتایا۔

"صاف صاف بتا کہ کون کس سے برسرپیکار ہو گا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"پہلا معرکہ ہلاکو خاں اور برقائی خاں کے مابین ہو گا۔"

"کیا واقعی؟" میں سولدہ کی بات سن کر اچھل پڑا۔ "بظاہر تو ایسے آثار نہیں ہیں۔"

"کیا تجھے نہیں معلوم کہ برقائی خاں مسلمان ہو چکا ہے؟" سولدہ نے کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔" میں بولا۔

"نفاق کا سبب یہی بنے گا۔" سولدہ نے بتایا۔

"وہ کیسے؟"

"تجھے علم ہے کہ ہلاکو خاں، خلیفہ بغداد سے برسرپیکار ہونے جا رہا ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے برقائی خاں، خلیفہ کا احترام کرتا ہے۔ اس کے اور خلیفہ کے درمیان مراسم ہیں۔ ایسی صورت میں برقائی خاں کا ہلاکو سے لڑنا، سمجھ میں آنے والی بات ہے۔"

"لیکن ابھی تو سائیں باتو خاں زندہ ہے اور برقائی خاں خود مختار نہیں وہ اپنے بھائی باتو خاں کی مرضی کے خلاف کوئی قدم کیسے اٹھا سکتا ہے جب کہ خاقان منگو اور باتو خاں کے درمیان اچھے تعلقات ہیں۔ وہ باتو خاں ہی تو تھا جس کی کوششوں اور اثر کے سبب منگو خاں، خاقان بنا!" میں نے کہا۔

"جو ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا اور تیرے سامنے آ جائے گا۔ تو خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لے گا اس لیے مزید اس مسئلے پر گفتگو کر کے اپنا اور میرا دماغ نہ ٹھکا!" سولدہ بولی پھر کہا۔ "اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ کچھ دیر سو لوں کیونکہ صبح ہی مجھے یہاں سے چلا جانا ہے۔"

"کیا، کیا کہہ رہی ہے تو؟" میں پریشان سا ہو کر بولا۔ "اتنے دن بعد تو تو ملتی ہے، پھر بھی تجھے جانے کی جلدی رہتی ہے۔ میں تجھے اس بار اتنی جلدی نہیں جانے دوں گا۔"

"بچوں جیسی باتیں نہ کر بونا!" سولدہ بولی۔ "حالات کچھ ایسے ہی ہیں کہ میں مزید یہاں نہیں رک سکتی۔ کل تو ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر تو قرا قرم پہنچ جانا!"

گیا تھا۔ ضیافت کے یورت میں پہلے ہی سے ہلاکو خاں پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ میں بھی تھا اور قط بوغا بھی! اس کے علاوہ دوسرے مسلح منگول سردار بھی بڑی تعداد میں تھے۔

پھر کچھ دیر بعد اطلاع ملی کہ شیخ الجبل ضیافت کے یورت کی طرف آرہا ہے اور اس کے ہمراہ اس کا قشق بھی ہے۔ قشق کے علاوہ وہ اپنے ساتھ قلعے دار اور دوسرے اہم ارکان سلطنت کو بھی لایا تھا جن کی تعداد درجن بھر تھی۔

ہلاکو خاں نے مجھے اور قط بوغا کو اشارہ کیا کہ یورت کے در پر شیخ الجبل اور اس کے ساتھیوں کا استقبال کریں، پھر انہیں پہلے سے مقررہ جگہوں پر بٹھائیں۔

ہلاکو خاں، ضیافت کے یورت میں ایک اونچی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ شیخ الجبل یورت میں داخل ہوتے ہی سیدھا مسند کے سامنے پہنچا اور منگولوں کے دستور کے مطابق اس نے اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی پیٹی کھول دی، پھر اپنا زریں تاج اتار کر ہلاکو خاں کے قدموں میں رکھ دیا اور اس کے سامنے تین بار جھکا؟ شیخ الجبل کے پیچھے ہی وہ سفیر کھڑا ہوا تھا جو پہلے اس کا پیغام لے کر آیا تھا۔ وہ ترجمان کے فرائض ادا کر رہا تھا۔

"میں عظیم قوم کے عظیم اور باجبروت خاقان کے بھائی کو خوش آمدید کہتا ہوں" یہ کہہ کر وہ اپنا زریں تاج اٹھانے کے لیے جھکنے لگا۔ ترجمان نے شیخ کے الفاظ دہرائے۔

"ارے میرے قدموں ہی میں پڑا رہنے دے کہ یہ جگہ اس تاج کے لیے مناسب ہے۔" ہلاکو خاں بھائی اور گونجدار آواز میں شیخ الجبل سے مخاطب ہوا۔

ترجمان نے شیخ کو ہلاکو خاں کے الفاظ سے آگاہ کیا۔

میں نے شیخ الجبل کے سرخ و سفید چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے۔ اس کے دراز گیسو شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں جو اس بات کی دلیل تھی کہ وہ نشے کا عادی ہے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس کی عیاشی کے غماز تھے۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی خوبصورت داڑھی تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک مت اثر کن شخصیت کا مالک تھا مگر وہ اپنی شخصیت سے ہلاکو خاں کو متاثر نہ کر سکا بلکہ خود ہلاکو خاں کی شخصیت سے متاثر نظر آرہا تھا۔

شیخ الجبل بھی حیرت زدہ ہی کھڑا تھا کہ ہلاکو خاں نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے شیخ کو مخاطب کیا "آیئے! اپنی جگہ بیٹھ جایئے!"

ترجمان نے شیخ سے میرے الفاظ دہرائے، شیخ نے میری طرف دیکھا اور میں نے اسے ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

ضیافت شروع ہوئی پھر ضیافت ہی کے دوران میں ہلاکو خاں نے شیخ الجبل کو مخاطب کیا "عظیم خاقان اور میرا بھائی، مشہور ماہر نجوم نصیر الدین طوسی سے ملنا چاہتا ہے۔ کیا تو خاقان کی خواہش کا احترام نہ کرے گا، اور اسے قراقرم نہ بھیجے گا؟"

ترجمان کے ذریعے ہلاکو خاں کی بات سن کر اسی کے توسط سے شیخ الجبل نے جواب دیا "وہ بزدل تھا جو بھاگ کھڑا ہوا، اگر آج وہ ہوتا تو دیکھتا کہ اس نے ستاروں کی چال دیکھ کر جو کچھ معلوم کیا تھا اور مجھے بتایا تھا، بالکل غلط تھا" پھر شیخ نے بتایا کہ نصیر الدین طوسی چھ ماہ قبل ہی اس کی ملازمت چھوڑ کر جا چکا ہے۔

"وہ کہاں گیا ہے؟ اور کہاں مل سکے گا؟" ہلاکو خاں نے سوال کیا۔

"کچھ خبر نہیں! وہ کچھ بتا کر نہیں گیا۔" شیخ الجبل نے جواب دیا۔

ہلاکو اور شیخ کے درمیان گفتگو ترجمان کے ذریعے ہو رہی تھی کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کی زبانوں سے ناآشنا تھے۔

کچھ دیر توقف کے بعد ہلاکو نے۔ شیخ الجبل کو پھر مخاطب کیا۔

"میں تیرے اردو کے اہم اہم سرداروں کو بھی انعام و اکرام سے نوازنا چاہتا ہوں۔ ان کی فہرست بنا کر دے کہ میں انہیں بھی یہاں بلوا سکوں۔ تو اپنے ہاتھ سے ان کے لیے حکم لکھ کہ وہ یہاں انعام لینے پہنچیں

شیخ الجبل کے چہرے سے اطمینان اور خوشی کا اظہار ہونے لگا۔ اس نے اپنے قلعے دار کو فہرست بنانے کا حکم دیا۔ اس دوران میں ضیافت بھی ختم ہو چکی تھی۔ شیخ الجبل کے قلعے دار اور دوسرے اراکین سلطنت نے جلد ہی فہرست تیار کر کے شیخ کے سامنے رکھ دی۔ شیخ نے اپنے ہاتھ سے اس پر حکم لکھا' پھر اپنے دائیں ہاتھ میں موجود انگوٹھی کی مہر بھی اس پر ثبت کر دی۔

ہلاکو خاں نے قط بوغا کو اشارہ کیا جس نے شیخ کے ہاتھ سے وہ فہرست لے لی اور خاموشی کے ساتھ یورت سے نکل گیا۔

ادھر قط بوغا' یورت سے نکلا ادھر معاً" ہلاکو خاں اپنی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ مخصوص انداز میں بلند کیا اور اسی کے ساتھ مسند پر پڑے ہوئے شیخ الجبل کے زریں تاج کو ٹھوکر ماری۔

شیخ الجبل کا زریں تاج لڑھک کر اس کے قریب گرا کیونکہ وہ ہلاکو خاں کی مسند کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ شیخ نے حیرت کے ساتھ ہلاکو خاں کو تلوار نکالتے دیکھا' اور پھر اسی وقت ضیافت کا یورت پے در پے چیخوں سے گونجنے لگا۔ اسی کے ساتھ ہلاکو خاں وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے لگا۔

منگول سرداروں نے بیک وقت شیخ الجبل کے تمام ساتھیوں کے سینے اپنی تلواروں سے چھید ڈالے تھے۔ میرے سپرد شیخ الجبل تھا میں نے اپنی تلوار کی نوک اس کے حلق پر رکھ دی تھی اور شیخ الجبل کسی بت کی طرح ساکت بیٹھا رہ گیا تھا۔ ہلاکو خاں نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں شیخ کو قتل نہ کروں اور نہ ہی گردن میں رسی ڈال کر اس کا گلا گھونٹوں!

شیخ الجبل کے تمام ساتھی قتل کر دیے گئے اور خود اسے رسیوں میں جکڑ لیا گیا۔ وہ سازش اپنے اختتام کو پہنچی جس کا خاکہ پہلی بار ہلاکو خاں کی بیوی دوقوز خاتون کے ذہن میں ابھرا تھا۔

ہلاکو خاں مجھے اور منگول سرداروں کو ساتھ لے کر ضیافت کے یورت سے نکلا۔ شیخ الجبل کو ہلاکو خاں کے قشق نے سنبھال لیا تھا۔

ہلاکو خاں گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کی تقلید میں' میں اور دوسرے منگول سردار بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر چڑھے۔ ہلاکو خاں کے گھوڑے کا رخ قلعے کے دروازے کی طرف تھا۔

تمام یورت خالی پڑے تھے۔ قط بوغا' ہلاکو خاں کی ہدایت کے مطابق قلعے پر ہلا بول چکا تھا۔

ابھی قلعے کا دروازہ دور تھا کہ ایک گھوڑ سوار دوڑتا ہوا قریب پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ قلعے کے دروازے پر منگول قابض ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے یہ خبر بھی دی کہ شیخ الجبل کے اردو کے تمام اہم عہدیدار گرفتار کیے جا چکے ہیں' وہی جن کی فہرست قط بوغا کو دے کر قلعے کی طرف بھیجا گیا تھا۔

اردو کے عہدیداروں کی غیر موجودگی میں بھلا شیخ الجبل کے سپاہی کیا لڑتے! ان کے حوصلے بہت جلد پست ہو گئے اور منگول قلعے میں داخل ہو گئے۔

جب ہلاکو خاں قلعے میں داخل ہوا تو شیخ الجبل کے سپاہی ہتھیار ڈال چکے تھے۔ ہلاکو خاں اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا قلعے میں موجود محل کی طرف بڑھا۔

اور پھر الموط کی مصنوعی بہشت کو تہس نہس کر ڈالا گیا۔ وہیں ایران کی حسین ترین عورتیں ملیں جن پر منگول اس طرح جھپٹے جیسے شہباز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔

محل ہی میں ایک بہت بڑا کتب خانہ ملا جسے ہلاکو کے حکم پر نذر آتش کر دیا۔ ہلاکو کے خیال میں وہ سب سحر کی کتابیں تھیں۔

محل ہی میں ایک بہت بڑا کتب خانہ ملا جسے ہلاکو کے حکم پر نذر آتش کر دیا گیا۔ ہلاکو کے خیال میں وہ سب سحر کی کتابیں تھیں۔

پھر ہلاکو' محل میں اس سنہرے تخت پر بیٹھا جس پر کبھی شیخ الجبل حسن بن صباح بیٹھا کرتا ہو گا۔ اس نے حکم دیا کہ مفتوح اردو کے سرداروں کو باری باری اس کے حضور میں پیش کیا جائے تاکہ وہ حسب وعدہ

ئیں اکرام و انعام سے نوازے۔

پھر عہدیداروں کو ہلاکو خاں کے سامنے پیش کیا
انے لگا اور وہ انہیں "انعام" سے نوازے جانے کا
حکم دیتا رہا۔ عہدیداروں کے سر کاٹے جاتے رہے اور
لاکو حسب عادت یہ منظر دیکھ کر قہقہے لگاتا رہا۔

جب اردو کے افسران قتل کیے جا چکے تو ہلاکو خاں'
قلعے سے نکلا۔ محل سے باہر آکر اس نے حکم جاری
کیا۔ "قلعے میں موجود تمام زندہ مردوں' عورتوں اور
چوں کو تین گروہوں میں بانٹ دو!" جب اس کے پہلے
حکم کی تعمیل ہو چکی تو اس نے دوسرا حکم دیا۔ "مردوں
کو زمین پر لٹا دو' اس طرح کہ ان کے ہاتھ پشت پر
بندھے ہوں۔"

اس حکم کی بھی تعمیل ہو گئی تو ہلاکو خاں نے ان
قیدیوں کو منگول سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔

ہلاکو خاں کا اشارہ پاتے ہی منگول سپاہی ان قیدیوں
پر ٹوٹ پڑے۔

کچھ دیر بعد محل کے سامنے والے میدان میں خون
ہی خون پھیلا ہوا تھا اور لاشیں تھیں۔ ہلاکو کے حکم
سے صرف چند سو افراد کو زندہ چھوڑا گیا تھا۔ وہ لوگ
کاریگر تھے جن کی منگول اردو کو ضرورت تھی۔

محل اور قلعے میں موجود تمام مال و دولت لوٹ لیا
گیا۔ پھر ہلاکو خاں کو ایک اور کھیل سوجھا۔ اس نے
حکم دیا کہ خوب صورت عورتوں کو الگ کر لیا جائے
اور اسی طرح خوب صورت بچوں کو! خوب صورت
بچوں کو اس نے غلام بنا کر رکھے جانے کا حکم دیا اور
خوب صورت عورتوں کو حسب معمول منگول
سرداروں اور خود اپنے لیے مخصوص کر لیا۔

پہلا انتخاب خود اس نے کیا۔ وہ قہقہے لگاتا ہوا
عورتوں کے درمیان گھس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ
حسین و نوخیز عورتوں کو اس طرح ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا
تھا جیسے جانوروں کو دیکھتے ہیں۔

ہلاکو خاں باری باری سات حسین عورتوں کو ان
کے بال پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اس مجمعے سے باہر لایا۔ وہ
عورتیں کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح کانپ رہی تھیں اور

کیا آپ کو عدم تحفظ کا احساس ہے؟

کیا آپ میں قوت ارادی کی کمی واقع ہوئی ہے؟

کیا آپ نفسیاتی طور پر خود کو کمزور سمجھتے ہیں؟

ان سب مسائل سے نجات حاصل کرنے کیلئے

معظم جاوید کی تصنیف

جدید کراٹے
اور
بروس لی

کا مطالعہ کیجئے

-:- منگوانے کا پتہ -:-

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

ہلا لو رور زور سے ہنس رہا تھا۔

بدصورت عورتوں، بچوں اور بوڑھیوں کو ایک طرف الگ کر دیا گیا تھا۔

"بوغا! میرے بعد اب تیرا حق ہے۔" ہلا کوخاں میرے قریب آ کر بولا۔ "جا اور بھیڑوں کے گلے میں گھس پڑا! یہ سمجھ لے کہ ضروری نہیں جس بھیڑ پر زیادہ اون ہو، وہ زیادہ لذیز ہو۔" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا۔

"نہیں!" میں بمشکل کہہ سکا۔

"کیوں؟" ہلا کو میری بات سن کر حیران ہوا۔

"مجھے ـــ مجھے کوئی عورت ـــ کوئی عورت نہیں چاہیے!" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا تو مرد نہیں؟" ہلا کوخاں کے لہجے میں تمسخر تھا۔

میں نے بمشکل ہلا کوخاں سے جان چھڑائی اور اس نے سپہ سالار قط بوغا کو عورتوں کے جھمگٹ میں گھسنے کا اشارہ کیا۔

اس دن سے پہلے میری آنکھوں نے کبھی اتنی درندگی، اتنی سفاکی اور اتنی بے رحمی کے مظاہرے نہیں دیکھے تھے۔ میں نے یوں انسانی خون بہتے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اس سے پہلے منگولوں کی درندگی کا صرف اندازہ ہی اندازہ تھا لیکن اب میں اپنی آنکھوں سے ان کی وحشت و بربریت کے مظاہرے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ان مظلوموں پر رحم آ رہا تھا جو منگولوں کے ظلم کا نشانہ بن رہے تھے۔ ایسی صورت میں بھلا میں کس طرح ان مجبور و بے بس عورتوں کی کمزوری و بے بسی سے فائدہ اٹھا سکتا تھا! اس وقت میرے جذبات ہی کچھ اور تھے۔ میرا دل مظلوموں کے لیے رو رہا تھا اور میں انتہائی بے بسی محسوس کر رہا تھا کہ ان کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔

عورتوں کی تعداد مقتول مردوں سے بھی زیادہ تھی۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ مرنے والے بے حد عیاش تھے اور ان میں سے ہر ایک کے پاس کئی کئی عورتیں تھیں۔ ان میں زیادہ تعداد خوب صورت عورتوں کی تھی اسی لیے منگول سرداروں کے انتخاب کے بعد بھی عورتیں بچ گئیں۔ پھر ہلا کوخاں کے حکم سے عام سپا ان عورتوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی وحشت کا عالم یہ کہ وہ اس طرح عورتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے رہے تھے جیسے وہ عورتیں نہ ہوں، ان کی سواری جانور ہوں۔ ان میں سے کچھ نے عورتوں کو وہیں ز پر گرا لیا اور ان کے جسموں پر موجود لباس کو چیتھڑ میں تبدیل کر دیا، پھر بے غیرتی کا مظاہرہ کرنے لگے۔

عورتیں چیخ رہی تھیں اور ہلا کوخاں، محل چبوترے پر کھڑا ہوا قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کی نظر میں کوئی معیوب بات نہیں تھی کہ عام سپاہی خود اس سامنے اپنی ہوس کو تسکین پہنچا رہے تھے۔

یہ وحشیانہ کھیل ختم ہوا تو ہلا کوخاں کی بلند آ ابھری۔ اس نے خوب صورت بچوں کے انتخاب حکم دیا۔ تعمیل حکم ہو گئی تو بقیہ تمام عورتوں اور بچو قطار در قطار کھڑا ہونے پر مجبور کیا گیا۔ پھر اس میں پہلی قطار کو اس نے ایک طرف الگ کھڑا کرنے کا دیا۔

"اب نشانے بازی کی مشق ہو گی۔" ہلا کوخاں یہ کہتے ہوئے اپنے شانے سے کمان اتاری۔ "پہلا میں چلاؤں گا۔ تیرے سینے کے بالکل وسط میں پیو ہونا چاہیے۔"

ہلا کوخاں نے کمان پر تیر چڑھایا اور سامنے مو قطار میں ایک عورت کا نشانہ لیا۔ اس عورت نے ا جانب تیر کا رخ دیکھا تو بھاگ اٹھی اور دوسرے لمحے بیک وقت کئی تیر اس کے جسم میں پیوست گئے۔ وہ عورت فوراً ہی لہولہان ہو کر زمین پر گر اور بغیر تڑپے ٹھنڈی ہو گئی۔ سپاہی پہلے سے مس کھڑے تھے کیونکہ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ عور بھاگ کھڑی ہوں گی۔

"اگر اب تم میں سے کوئی اپنی جگہ سے ہلا تو اس بھی یہی حشر ہو گا۔" سپہ سالار قط بوغا نے چی عورتوں اور بچوں کو مخاطب کیا۔ بچے اتنا رو چکے تھے ان کے گلے بیٹھ گئے تھے اور اب شاید ان میں رو کی سکت نہیں رہی تھی۔

ہلاکو خاں کے چہرے سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔
اس نے دوبارہ کمان سیدھی کی اور میرا دل کانپ کر رہ گیا۔ وہ اب ایک پانچ سالہ معصوم بچے کا نشانہ لے رہا تھا جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عورت کی لاش کو دیکھ رہا تھا جو کچھ دیر پہلے تیروں سے چھلنی کی گئی تھی۔ وہ بچہ اسی عورت کے برابر کھڑا ہوا تھا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی کہ مرنے والی اس کی ماں ہی ہوگی کیونکہ مصیبت کے وقت ماں اپنے بچے کو آنکھوں سے دور نہیں رکھتی۔
ہلاکو خاں کی کمان سے تیر نکلا اور چشم زدن میں اس معصوم کے سینے سے پار ہو گیا۔ وہ بچہ اوندھے منہ زمین پر آ رہا اور ہلاکو کا قہقہہ سفاک اور درندگی آمیز قہقہہ سنائی دیا۔ ہلاکو کی بائیں جانب قط بوغا کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس سے مخاطب ہوا۔ "تو وہ عورت دیکھ رہا ہے بڑے سینے والی؟" ہلاکو نے ایک طرف انگلی اٹھائی۔
قط بوغا نے اس طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
"کیا تو بار بار اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ سکتا ہے؟" ہلاکو بولا۔
"حکم دے! تیرا خادم تجھے مایوس نہیں کرے گا۔" قط بوغا نے ادب سے جھک کر کہا۔
"تو پھر ثابت کر کہ تیرا نشانہ سچا ہے۔" ہلاکو خاں نے حکم دیا۔
قط بوغا نے اپنی ترکش سے دو تیر نکالے اور چند لمحوں کے فرق سے قطار کی طرف پھینکے۔ یکے بعد دیگرے کئی بھیانک چیخیں گونجیں اور وہ عورت زمین پر گر پڑی جس کی طرف ہلاکو خاں نے اشارہ کیا تھا۔ اس کے دونوں آنکھوں میں تیر پیوست ہو چکے تھے۔
"تیرا نشانہ واقعی سچا ہے۔" ہلاکو خاں نے قط بوغا کی پشت پر ہاتھ مارا' پھر وہ میری طرف پلٹا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "تجھے بھی کچھ مزہ آ رہا ہے یا نہیں! تو نشانہ نہیں دکھائے گا؟"
"میرا نشانہ اتنا سچا نہیں!" میں نے جھوٹ بولا۔
"تو خود اپنے منہ سے اپنی نااہلی کا اعتراف کر رہا

خواتین بہنوں کے لیے کھانا پکانے کی خوبصورت اور معیاری کتابیں جن کے بغیر آپ کی کچن لائبریری مکمل نہیں۔ منفرد اور اعلیٰ کھانوں کی تراکیب سے مزین بہترین کتابیں

آپ کا دسترخوان	150/-
چائنز کھانے اور سوپ	100/-
کوکب کا دسترخوان	75/-
ثناء کا دسترخوان	75/-
لذیز کھانے	75/-
کچن بک	24/-
انڈین کھانے	24/-
اچار' مربے' چٹنیاں	24/-

آج ہی اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے منگوائیں۔

-:- منگوانے کا پتہ -:-

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

ہے۔" ہلاکو نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ "شاید تو صرف آسمانوں کی سرگوشیاں ہی سن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تو نے آج تک کسی عورت کی سرگوشی نہیں سنی' اس وقت جب وہ سینے سے لگی ہو۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔

پھر ہلاکو خاں کے حکم پر ان بدنصیب عورتوں اور بچوں کے جسموں کے مختلف حصوں کو منگول سرداروں نے ہدف بنایا اور ہلاکو کے حلق سے قہقہے ابلتے رہے۔ میں چیخیں سنتا رہا اور لرزتا رہا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں ایسا ہولناک منظر بھی دیکھوں گا۔ میں نے اس دوران میں کئی بار اپنی آنکھیں بند کیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لوں مگر مجبور تھا کیونکہ میں ایسا کرتا تو ہلاکو خاں میرا بہت مذاق اڑاتا۔

مجھے یاد نہیں کہ وہ وحشیانہ کھیل کب تک جاری رہا اور کب ختم ہوا۔ میں تو جیسے اپنی جگہ پتھر بن کر رہ گیا تھا۔ میں چونکا اس وقت جب ہلاکو خاں نے پورے قلعے میں آگ لگانے کا حکم دیا اور خود محل کے چبوترے سے نیچے اترنے لگا۔

قلعے میں آگ لگا دی گئی اور وحشی منگول باہر آ گئے۔ وہ اپنے اپنے پورتوں کی طرف بڑھنے والے تھے کہ ہلاکو خاں نے انہیں وہیں جلتے ہوئے قلعے کے سامنے رکنے کا حکم دیا۔

میں اس وقت ہلاکو خاں کے حکم کا مطلب سمجھا جب جلتے ہوئے قلعے کے دروازے سے عورتیں' مرد اور بچے چیختے ہوئے نکلے۔

"انہیں چھید ڈالو!" ہلاکو خاں چیخا۔

سنسناتے ہوئے تیر بھاگنے والوں کو چھیدنے لگے۔ ان میں سے کچھ کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ صرف کچھ دیر رہا۔

میں حیران تھا کہ جب قلعے کے تمام زندہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا تو وہ لوگ کہاں سے آ گئے! صرف یہی ممکن تھا کہ وہ نالیوں' تہ خانوں اور دوسری محفوظ جگہوں میں چھپ گئے ہوں۔ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ جب آگ لگائی گئی تو وہ نکل کر بھاگے ہوں۔

وہ رات میری زندگی کی بڑی بھیانک رات تھی۔ میں اس رات کوشش کے باوجود نہ سو سکا۔ میرے کانوں میں بے گناہ عورتوں اور معصوم بچوں کی آخری چیخیں گونجتی رہیں۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھومتے رہے جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

دوسرے دن صبح ہلاکو خاں نے شیخ الجبل حسن بن صباح کو قراقرم روانہ کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ خاقان منگو خاں اس عجیب و غریب شخص کو دیکھ کر خوش ہو گا۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنی اب تک کی کارگزاریوں سے بھی خاقان کو مطلع کیا اور یہ پیغام بھی بھیجا کہ مشہور ماہر نجوم نصیرالدین طوسی خوف کھا کر پہلے ہی کہیں فرار ہو گیا ہے۔ اگر ممکن ہوا تو وہ نصیرالدین طوسی کو تلاش کر کے اس کے پاس روانہ کر دے گا۔ بعد میں یہ ہوا کہ منگو خاں نے ہلاکو خاں کو پیغام بھیجا جس میں اس نے لکھا تھا' اسے شیخ الجبل کو دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں تھی اس لیے عام آدمیوں کی طرح اسے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔

اسی دن ہلاکو خاں نے کوچ کا حکم دیا۔ پھر شیخ الجبل کے بقیہ تمام قلعوں کو بھی مسمار کر دیا گیا اور وہی کہانی دہرائی گئی جس کا آغاز الموت میں ہوا تھا۔

اس کے بعد ہلاکو خاں نے ہمدان کا رخ کیا۔ ہلاکو خاں کو علم تھا کہ اہل ہمدان' برقائی خاں اور اس کے بڑے بھائی سائیں باتو کے حامی ہیں۔

ہلاکو نے اہل ہمدان کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ وہ اپنے پیچھے بھڑکتے ہوئے شعلے اور دھوئیں کے بادل چھوڑ کر دشت قبچاق کی طرف بڑھا۔

ہلاکو منزل بہ منزل بڑھتا جا رہا تھا کہ اسے اچانک رک جانا پڑا۔ اسے جو اطلاع ملی تھی' وہ اتنی ہی تشویشناک تھی کہ اس نے مجلس مشاورت طلب کر لی۔

لشکر دشت میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ دن بھر سفر کیا جاتا تھا اور رات کے وقت پڑاؤ مگر اس دن سورج

اوبنے سے پہلے ہی پڑاؤ کر لیا گیا تھا کیونکہ اب رکنا ضروری ہو گیا تھا۔ مخبروں نے راستے ہی میں یہ اطلاع دے دی تھی کہ برقائی خاں اپنا بڑا اولوس لے کر تیزی کے ساتھ ہلاکو خاں کی طرف بڑھ رہا ہے۔

یہ اطلاع ملتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ سولدہ کی پیش گوئی پوری ہو گئی تھی اور وہ وقت آ گیا تھا جب وحشی منگول آپس ہی میں لڑ مریں۔

مشاورت کے یورت میں حسب معمول اس شام بھی تمام اہم عہدیدار موجود تھے اور ہلاکو خاں کی بیوی دوقوز خاتون بھی مسند پر اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔

ہلاکو خاں کے چہرے سے کسی قسم کی تشویش یا فکر کی بجائے جوش اور غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بار بار غیر ارادی طور پر اپنی تلوار کے قبضے پر چلا جاتا تھا۔ وہ اس قدر غصے میں تھا کہ کچھ دیر وہ بول ہی نہ سکا اور گفتگو کا آغاز اس کی بیوی دوقوز نے کیا۔

"آپس میں لڑنا گھر کے چولھے کی آگ کو خود ہی بجھانا ہے۔" دوقوز نے کہا۔ "میری نظر میں جد عظیم کے اس قول کی بہت اہمیت ہے۔ سو اگر کوئی صورت نکل آئے تو برقائی سے جنگ نہ ہو۔"

"خاموش ہو جا دوقوز!" ہلاکو خاں نے طیش کے عالم میں دوقوز کی بات کاٹ دی۔ "تیرا شوہر بزدل نہیں تو پھر تو کیوں ایسی باتیں کرتی ہے؟"

"کیا تو یاسا کو نہ مانے گا؟" دوقوز نے اسی طرح پرسکون لہجے میں کہا۔

"میں نے یاسا کا قانون نہیں توڑا۔" ہلاکو خاں بلند آواز میں بولا۔ "پہل برقائی نے کی ہے اور وہی مجرم ہے۔ پھر تو مجھ سے کیا پوچھتی ہے؟"

"اگر برقائی نے ایسا کیا ہے یا کرنے والا ہے تو غلط ہے۔ وہ غلطی پر ہے اور میں نہیں چاہتی کہ تو بھی یہی غلطی کرے۔"

"تو کیا میں اس کے مقابلے سے بھاگ جاؤں؟" ہلاکو اپنی بیوی کی طرف مڑ کر بولا۔

"نہیں، میں تجھے بزدلی کی تلقین نہیں کر رہی۔" دوقوز نے کہا۔

"پھر بتا کہ کیا کیا جائے؟" ہلاکو خاں نے سوال کیا۔

"مصالحت!" دوقوز نرم لہجے میں بولی۔ "مصالحت کی راہ ہموار کرنے کے لیے اسی وقت کسی قاصد کو پیغام دے کر برقائی خاں کے پاس بھیجا جا سکتا ہے۔"

"اس میں بھی ذلت ہے۔" ہلاکو نے درشت لہجے میں کہا۔ "وہ یہ سمجھے گا کہ میں اس سے ڈر گیا ہوں اور اسی لیے مصالحت چاہتا ہوں۔ آخر میں نے اس کا بگاڑا کیا تھا جو وہ مجھ پر اپنا اولوس لے کر چڑھ دوڑا!"

"کیا تو نے ہمدان کو تباہ و برباد نہیں کیا؟" دوقوز بولی۔

"وہ سرکش تھے اور ان کی سزا یہی تھی کہ میں انہیں ذلیل کرتا۔"

ہلاکو خاں اس وقت اتنے غصے میں تھا کہ اس نے پہلی بار اپنی بیوی دوقوز کے مشورے کو ٹھکرا دیا۔ اس نے سرداروں کو حکم دیا کہ پوری قوت و طاقت کے ساتھ بڑھیں اور برقائی خاں کے اولوس سے ٹکرا جائیں۔ منگول سرداروں میں سے کسی کو اتنی جرات نہ ہوئی کہ لب کشائی کر سکتا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ہلاکو خاں کا اردو آندھی اور طوفان کی طرح دشت میں اس طرف بڑھا جدھر سے برقائی خاں اپنا اولوس لے کر آ رہا تھا۔

پھر وہ شام آئی جب مخالف اولوس ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ ہلاکو خاں نے پڑاؤ کا حکم دیا اور کچھ مخبروں کو آگے بھیجا کہ دشمن کے اردو کی خبر لائیں۔

معلوم ہوا کہ برقائی خاں نے بھی اپنے اولوس کو

کراچی میں،

ایک انجینئر گلگت کے علاقے میں سڑک بنانے کے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ برف گر رہی تھی۔ درجہ حرارت صفر سے بھی دس درجے کم تھا۔

یکایک انجینئر نے اپنے افسر سے کہا کہ اسے اپنا کوٹ لینے کے لیے جانا ہے۔

افسر نے پوچھا: "کوٹ آپ کہاں چھوڑ آئے!"

پڑاؤ کا حکم دیا ہے اور وہ ہلاکو کے اردو کی نقل و حرکت پر برابر نظر رکھے ہوئے ہے۔ غالباً" دونوں ہی فریق دوسرے دن صبح جنگ کا آغاز کرنا چاہتے تھے لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔

ہلاکو خاں نے کچھ رات ڈھلے دشمن کے لشکر پر شب خون مارنے کا فیصلہ کیا۔ حملے کی تمام تیاریاں بڑی خاموشی کے ساتھ ہوئیں تاکہ دشمن چوکنا نہ ہو جائے۔ یورت اسی طرح نصب رہے اور ان کے آگے الاؤ جلتے ہوئے چھوڑ دیے گئے۔

میں' ہلاکو خاں اور قط بوغا کے ساتھ اولوس کی اگلی صف میں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں دو درندوں کے درمیان ہوں۔ میری زندگی کسی بھی لمحے خطرے میں پڑ سکتی تھی مگر میرے پاس اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا کہ خود کو خطرے میں ڈالتا۔

گھوڑے بہت آہستہ روی سے حرکت کر رہے تھے تاکہ ان کی ٹاپوں کی آوازیں بلند نہ ہو سکیں۔ اتنے بڑے اولوس میں ایک بھی مشعل روشن نہیں تھی۔ ہر طرف تاریکی اور سناٹا تھا اور اس سناٹے میں ایک بڑا طوفان چھپا ہوا تھا۔ موت جیسے دبے پاؤں بڑھ رہی تھی۔ تاریکی کے سبب گھوڑ سوار منحوس کیلتوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے ہیولے اس طرح حرکت کر رہے تھے جیسے وہ انسان نہ ہوں۔

اور پھر معاً" جیسے سارا اولوس ٹھٹک کر رک گیا۔ ہلاکو خاں نے بھی اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ سب ہی کی نظریں مخالف سمت میں مرکوز ہیولوں پر جمی ہوئی تھیں۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جو چال ہلاکو خاں نے چلی تھی' وہی برقائی خاں کے ذہن میں آئی تھی۔ اس نے بھی شب خون مارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آخر وہ بھی تو منگول ہی تھا پھر بھلا وہ کس طرح ہلاکو خاں کی چال میں آجاتا۔

معاً" ہلاکو خاں کا وحشیانہ قہقہہ بلند ہوا' اور پھر اس نے تیزی سے بڑھ کر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ گھوڑے ہنہنائے اور فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ اب کسی رازداری کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ جواب میں مخالف سمت سے بھی نعرے لگائے گئے' اور پھر مشعلیں روشن ہونے لگیں۔

کچھ دیر بعد ہی دونوں اولوس ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔

دونوں کا طریق جنگ ایک تھا۔ دونوں ہی سفاک اور بے رحم تھے۔ گھوڑوں کی پشتیں خالی ہونے لگیں۔ چیخیں اور کراہیں سنائی دیتی رہیں اور جنگ جاری رہی۔

میں اس پر مجبور تھا کہ دونوں فریقوں میں سے ایک کا ساتھ دوں اور میرے لیے یہی بہتر تھا کہ ہلاکو خاں کی طرف سے لڑوں' سو میں بھی لڑتا رہا۔ میری تلوار کی زد پر منگول تھے اور منگول ہی میرے ساتھی تھے۔ یوں کھلے عام منگولوں کے قتل عام کا موقع مجھے دوسری بار نصیب ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب میں نے مارکوف کے ساتھی آرق کی رہنمائی میں ایک بستی پر حملہ کیا تھا لیکن یہ موقع اس سے بھی زیادہ سنہری تھا۔ میں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر اپنے انتقام کی آگ بجھاتا رہا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک مجھے سپہ سالار قط بوغا کا حکم ملا کہ تیزی سے اپنے سپاہیوں کو لے کر پیچھے ہٹ جاؤں۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ کیونکہ میری نظر میں ہلاکو خاں کی فوجوں کا پلا اب تک بھاری تھا۔ میں برقائی خاں کے اولوس کی دائیں جانب کافی اندر تک گھس گیا تھا۔

اولوس کی کمان قط بوغا کے ہاتھ میں تھی' اس لیے مجھے بہرحال اس کا حکم ماننا تھا۔ میں رفتہ رفتہ پیچھے ہٹنے لگا۔ مجھے اور میرے سپاہیوں کو پسپا ہوتے دیکھ کر برقائی خاں کے سپاہی آگے آنے لگے۔ میں ان سے لڑتا ہوا' اپنے سپاہیوں کو لیے پیچھے ہٹتا رہا۔

اور پھر وہ وقت آ ہی گیا جب میں قط بوغا کی چال سمجھ گیا۔ برقائی خاں کے ان سپاہیوں کو گھیر لیا گیا جو

رے ساتھ لڑتے ہوئے ہلاکو خاں کے اردو میں
س آئے تھے۔ ان میں سے ایک بھی زندہ بچ کر فرار
ہو سکا تھا۔

اس رات منگول ایک دوسرے پر اپنے جنگی حربے
زماتے رہے' ایسے جنگی حربے جو دونوں ہی فریقوں
کے لیے راز نہیں تھے۔ ابتداء میں ان دونوں ہی کو یہ
نساس نہیں تھا مگر کچھ دیر جنگ کے بعد غالباً" وہ
بوں ہی ایک دوسرے کی چالوں کو اچھی طرح سمجھ
لیے۔ جو چالیں ہلاکو خاں چل رہا تھا' اب برقائی خاں
ر اس کا اولوس ان چالوں میں نہیں آ رہا تھا اور یہی
ال ہلاکو خاں کا بھی تھا۔

جنگ اپنی پوری شدت سے جاری تھی لیکن اب
دونوں فریقین ہی بچ بچ کر لڑ رہے تھے۔

دوران جنگ میں ایک ایسا موقع آیا کہ میرے
گھوڑے کی گردن میں دشمن کی طرف سے پھینکا
جانے والا ایک تیر پیوست ہو گیا۔ میرا گھوڑا اپنی پچھلی
دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے اپنی پشت سے نیچے
پھینک دینا چاہتا تھا۔ میں اس کی پشت سے لپٹ گیا اور
ایں پوری قوت سے کھینچ لیں تاکہ وہ بھڑک کر دشمن
کے اولوس میں نہ گھس جائے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب
مخالف سمت سے دو سنسناتے ہوئے تیر آئے اور
گھوڑے کے پیٹ میں گھس گئے۔ اگر گھوڑا اپنی
پچھلی ٹانگوں پر کھڑا نہ ہو جاتا تو یقیناً" وہ تیر میرا جسم
چھید ڈالتے۔ میرا گھوڑا زور سے ہنہنایا اور ایک طرف
گرنے لگا۔ میں گھوڑے کی پشت سے اچھلا اور زمین
پر آ رہا ورنہ گھوڑے کے نیچے دب کر زخمی ہو جاتا۔

غالباً" میرے گھوڑے کو زخمی ہوتے اور مجھے اس
کی پشت سے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔
مجھے گرتے دیکھتے ہی وہ منگول سردار تیزی سے اپنا
گھوڑا دوڑاتا ہوا میری طرف جھپٹا تھا جو میری کمان
میں تھا۔ اس نے میرے نزدیک آتے ہی جھک کر مجھے
اپنے گھوڑے کی پشت پر گھسیٹ لیا تھا۔

"کیا تو زخمی ہو گیا ہے؟" منگول سردار نے پوچھا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اولوس کے ساتھ فاضل گھوڑے بھی تھے جن میں

آپ کی شخصیت ستاروں کی روشنی میں

آپ کی قسمت کے ستارے کب عروج پر ہوتے ہیں؟

آپ کا شریک حیات کیسا ہونا چاہیے؟

آپ کے مالی و کاروباری حالات کیسے بدل سکتے ہیں؟

آپ کی نفسیاتی پریشانیاں کیسے دور ہو سکتی ہیں؟

ان سب سوالوں کا جواب جاننے کے لیے

ہم اور ہمارے ستارے

قیمت :-/40 روپے بمعہ ڈاک خرچ کا مطالعہ کیجیے۔

محبت، شادی، مستقبل اور قسمت!!!

آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟

برجوں کی مکمل کتاب

جس کی مدد سے آپ جان سکتے ہیں کہ؛

آپ کے نفسیاتی مسائل کا حل کیا ہے؟

آپ کی آئندہ زندگی میں کیا رونما ہونے والا ہے؟

آپ کی شخصیت کے کمزور پہلو کونسے ہیں؟

اپنے دوستوں اور دشمنوں کو پہچانیں؟

بارہ برجوں پر ایک مستند اور مکمل کتاب

قیمت :-/40 روپے بمعہ ڈاک خرچ

آج ہی قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں
یا ہم سے منی آرڈر بھیج کر منگوائیں۔

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اُردو بازار لاہور

سے ایک فوراً" ہی میرے لیے فراہم کر دیا گیا۔ ابھی میں دوسرے گھوڑے پر سوار ہی ہوا تھا کہ پسپائی کا حکم ملا۔

یہ پسپائی بھی بڑے انوکھے انداز کی تھی۔ پسپائی سے پہلے شدت کے ساتھ حملہ کیا گیا تھا' اور پھر بس اچانک ہی پسپا ہونے کا حکم ملا تھا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ دشمن اندازہ نہ لگا سکے کہ اگلا قدم کیا ہوگا۔

شب خون کا مقصد دونوں ہی اولوس کے لیے بے مقصد ہو چکا تھا' اس لیے رات کے وقت مزید جنگ سے گریز دونوں ہی فریقین کے لیے بہتر تھا۔ غالباً" وہ اب دن کی روشنی میں ایک دوسرے کے حوصلے آزمانا چاہتے تھے۔ شاید یہی سبب تھا کہ پسپائی کے وقت برقائی خاں نے تعاقب نہیں کیا۔

جب اولوس' پڑاؤ پر پہنچا تو نصف شب گزر چکی تھی۔ میں تھکن سے اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ اپنے یورت میں پہنچتے ہی ہتھیار اتار کر بستر پر دراز ہو گیا اور پھر نیند میری آنکھوں میں جال بننے لگی۔

دوسرے دن علی الصبح میں خود بیدار نہیں ہوا بلکہ مجھے ایک خادم نے جھنجھوڑ کر بیدار کیا کیونکہ میں گہری نیند میں تھا۔ اس نے مجھے ہلاکو خاں کا حکم سنایا۔ ہلاکو خاں نے مجھے فوراً" یورت میں طلب کیا تھا۔

جب میں ہتھیار سجا کر اپنے یورت سے نکلا تو دیکھا کہ ہلاکو خاں اپنے یورت کے در تک پہنچ چکا ہے۔ میں تقریباً" دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔

ہلاکو خاں مجھے بدحواس سا دیکھ کر ہنس پڑا' پھر بولا۔ "تو تو اپنے یورت میں اکیلا تھا پھر بھی اتنی دیر میں اٹھا۔ مجھے دیکھ کہ میں نے الموط کی سات حسیناؤں کا حق بھی ادا کیا' پھر سویا بھی اور بیدار بھی ہو گیا۔"

میں جواب میں خاموش رہا۔ اس کے سامنے کچھ کہنے کا مطلب یہی ہوتا کہ وہ مجھے مزید چھیڑتا۔ اس کے ساتھ سپہ سالار قط بوغا بھی تھا جس نے مجھے بتایا کہ برقائی خاں اپنے پڑاؤ سے اولوس لے کر چل پڑا ہے۔ یہ اطلاع ایسی نہیں تھی کہ ہلاکو خاں اتنا مطمئن اور خوش نظر آتا مگر وہ ہلاکو خاں تھا جو جنگ کا ذکر سن کر قہقہے لگانے لگتا تھا' اس لیے مجھے اس کے اطمینان اور خوش مزاجی پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

کچھ دیر بعد ہی ہلاکو خاں اپنا اردو لے کر روانہ ہو گیا۔ جو سپاہی شدید زخمی تھے' انہیں پڑاؤ ہی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ پسپائی کے وقت، مرنے والوں کی لاشوں کو اٹھا کر لانے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔

پھر وہ خونریز لمحہ آ ہی گیا جب دونوں اولوس (لشکر) ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ گزشتہ رات کی نسبت جنگ میں اس وقت شدت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دشت قپچاق میں وحشی درندوں کو چھوڑ دیا گیا ہے جو ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے ہیں۔ سپاہی اپنے منہ سے دہشت ناک آوازیں نکالتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے اور پھر کسی نہ کسی گھوڑے کی پشت خالی ہو جاتی۔

جنگ کے پہلے مرحلے میں تیراندازی کے جوہر دکھائے گئے لیکن جب اولوس بالکل قریب آ گئے تو نیاموں سے تلواریں باہر آ گئیں۔

تلواریں چلتی رہیں' چیخیں بلند ہوتی رہیں اور خون بہتا رہا' مغلوں کا خون! یہ نظارہ میرے انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ کو سرد کرتا رہا۔ میں مغلوں کا خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاتا رہا۔ مغلوں کی جنگی چالیں اب ایک دوسرے کے لیے قطعی بیکار ہو چکی تھیں۔ وہ اب ایک دوسرے کے قریب میں نہیں آ رہے تھے۔ برقائی خاں اپنے اولوس کے ساتھ بہت جم کر لڑ رہا تھا اور اس کے اولوس کی تعداد بھی زیادہ تھی۔

فتح و شکست کا وارود اب صرف افرادی قوت پر تھا اور افرادی قوت میں برقائی خاں کی برتری ظاہر ہونے لگی تھی لیکن اس کے باوجود ہلاکو خاں کسی طرح بھی شکست ماننے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ میدان جنگ میں اپنے ساتھ اپنی بیوی دوقوز کو بھی لایا تھا جس کا چھکڑا ہلاکو خاں کی دائیں جانب پیچھے کی طرف تھا۔ اس چھکڑے کے اطراف میں ہلاکو خاں کا قشق آہنی دیواروں کی طرح موجود تھا۔

جنگ جاری تھی کہ معاً" اولوس کے عقب سے وحشیانہ نعروں کی گونج سنائی دی' پھر کچھ دیر بعد ہی چیخیں بلند ہونے لگیں۔

جب ہلاکو خاں کو علم ہوا کہ برقائی خاں کے اولوس نے اس کے اردو پر عقب سے بھی حملہ کر دیا ہے تو پہلی بار اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دکھائی دیے۔ میرا گھوڑا اس وقت ہلاکو خاں کے قریب ہی تھا جب یہ اطلاع ملی۔

برقائی خاں اپنی افرادی قوت سے فائدہ اٹھا کر آخر کار ایک اہم جنگی چال چلنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ برقائی خاں کے مقابل کم افرادی قوت ہونے کے سبب ہلاکو خاں یہ چال چلنے کا اہل نہیں تھا ورنہ وہ بھی یقیناً" ایسا ہی کرتا۔

اب جنگ کا نقشہ پلٹ چکا تھا۔ برقائی خاں نے دو طرف سے ہلاکو خاں کے اردو کو گھیر لیا تھا۔ اب اس کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ برقائی خاں کے مقابلے سے بھاگ جائے اور پھر اس نے یہی فیصلہ کیا۔

مجھے اس وقت ہلاکو خاں کی بیوی دوقوز کی باتیں یاد آئیں جو اس نے جنگ سے پہلے کی تھیں۔ اس نے ہلاکو خاں کو برقائی خاں سے مصالحت کا مشورہ دیا تھا لیکن ہلاکو نے پہلی بار اپنی بیوی کا مشورہ ٹھکرا دیا تھا۔ دوقوز یقیناً" بڑی دور اندیش عورت تھی۔ اس نے آنے والے وقت کا پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا۔ خاقان منگو خاں نے اپنے بھائی ہلاکو خاں کو یوں ہی تو مشورہ نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی دوقوز کی باتیں غور سے سنا کرے! اگر ہلاکو خاں اپنی بیوی کا مشورہ مان لیتا تو شاید اسے اتنی عبرتناک شکست سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔

ہلاکو خاں نے بڑی عجلت میں پسپائی کا حکم دیا تھا اور سمت کا تعین بھی خود ہی کیا تھا۔ اب پسپا ہو کر پڑاؤ کی طرف جانے کی راہ تو مسدود ہو چکی تھی اس لیے دو سمتوں میں سے کسی ایک سمت ہی فرار ممکن تھا۔

اگر بائیں جانب فرار کا فیصلہ کیا جاتا تو وہ بھی غلط ہوتا کیونکہ اس سمت برقائی خاں کا علاقہ تھا۔ فرار کے لیے صرف دائیں سمت رہ جاتی تھی' وہ سمت جدھر دریائے کربین تھا۔ ہلاکو خاں بڑی افراتفری میں اسی سمت اپنا اولوس لے کر بڑھا۔ فرار کا یہ فیصلہ بھی غیر متوقع اور اچانک ہی تھا۔ غالباً" برقائی خاں کو یہ امید نہیں تھی کہ ہلاکو خاں اتنی جلدی بھاگ کھڑا ہوگا کیونکہ اگر وہ چاہتا تو ابھی مزید لڑ سکتا تھا مگر شاید ہلاکو خاں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ فرار نہ ہوا تو دن ڈوبنے تک قطعی طور پر چاروں طرف سے برقائی خاں کے نرغے میں آجائے گا۔

فوری پسپائی اور فرار کے فیصلے نے ہلاکو خاں کے اردو کو بہت جانی نقصان پہنچایا تھا مگر یہ نقصان اس سے بہت کم تھا جو مکمل شکست کی صورت میں ہوتا۔

اچانک فرار کے فیصلے سے ایک فائدہ اور بھی ہوا۔ برقائی خاں کا اولوس کچھ دیر سمجھ ہی نہ پایا کہ دشمن فرار ہو رہا ہے اسی لیے تعاقب میں تاخیر ہوئی۔

جب ہلاکو خاں اپنا اردو لے کر کافی دور نکل گیا تو تعاقب شروع ہوا لیکن اب بہت مشکل تھا کہ برقائی خاں اس تک پہنچ سکتا۔ ہلاکو خاں کا اردو ہوا سے باتیں کرتا ہوا دریائے کربین کی طرف اڑا جا رہا تھا۔

دونوں اولوسوں کے درمیان کافی فاصلہ ہونے کے باوجود تعاقب جاری تھا۔ غالباً" برقائی خاں کو یہ امید تھی کہ جب دریائے کربین' ہلاکو خاں کی راہ میں حائل ہو جائے گا تو یقیناً" وہ ہلاکو خاں پر مزید ضرب لگا سکے گا۔ میرے دل میں بھی وسوسے اور اندیشے جاگ رہے تھے اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا۔ ایسی صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ خود میری زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔

مگر حالات اس طرح پیش نہیں آئے۔ اسے ہلاکو خاں کی خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ دریائے کربین میں برف جمی ہوئی تھی۔ پورا اولوس برف جمے ہوئے دریا پر سے گھوڑے دوڑاتا ہوا گزر گیا۔

دن ڈھلا' رات ہوئی مگر ہلاکو خاں نے پڑاؤ کا حکم نہیں دیا۔ رات کے وقت بھی اولوس تیز رفتاری سے بڑھتا رہا۔

جن مخبروں کو پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا' انہوں نے اطلاع دی کہ اب برقائی خاں نے تعاقب ختم کر دیا ہے۔ وہ دریائے کربین ہی سے اپنا اولوس لے کر لوٹ گیا ہے۔

دوسرے دن صبح ہلاکو خاں ان علاقوں میں داخل ہو گیا جنہیں وہ پہلے ہی فتح کر چکا تھا۔ یہ وہی علاقے تھے

جو پہلے شیخ الجبل کے قبضے میں تھے۔ برقائی خاں نے مزید تعاقب نہ کر کے یقیناً "ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ اگر وہ تعاقب جاری رکھتا تو اسے اپنے علاقے سے نکلنا پڑتا اور یہ جنگی حکمت عملی کے خلاف ہوتا۔

ہمدان کے قریب ایک مضبوط اور مستحکم قلعے میں پڑاؤ کا حکم ہوا۔ اسی کے ساتھ ہلاکو خاں نے فوراً" ایک قاصد منگول سردار بائیدو کی طرف روانہ کیا کہ وہ جلد از جلد اپنا اولوس لے کر اس سے آملے۔ اس سلسلے میں وہ پہلے ہی بائیدو کو حکم دے چکا تھا۔ یوں بھی اب ہلاکو خاں کو برقائی خاں سے شکست کھا کر افرادی قوت کی کمی کا احساس ہو چکا تھا۔ بغداد کی طرف بڑھنے سے پہلے وہ اس کمی کو پورا کر لینا چاہتا تھا کیونکہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مستقبل میں اسے کتنی بڑی فوجی طاقت سے برسرپیکار ہونا پڑے۔

اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہلاکو خاں کا قصد بغداد کی طرف جانے کا ہے۔ وہ پلٹ کر دوبارہ برقائی خاں پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر اس بار دوقوز نے پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ ہلاکو خاں ایک بار اس کا مشورہ ٹھکرا کر شکست سے دوچار ہو چکا تھا اس لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے علاوہ منگول سرداروں نے بھی اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ آپس میں لڑ کر اپنی قوت کو کمزور نہ کیا جائے۔

سویوں ہوا کہ سال کا چوتھائی حصہ وہیں گزارا گیا اور اس دوران میں جنگی تیاریاں کی جاتی رہیں۔ برقائی خاں کے ہاتھوں شکست کھا کر ہلاکو خاں اب مزید محتاط و ہوشیار ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب آئندہ اسے کسی شکست سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

پھر وہ دن آیا کہ منگول سردار بائیدو ایک بڑا اولوس لے کر حسب الحکم ہلاکو خاں کے پاس پہنچ گیا۔ اب ہلاکو خاں کے اولوس کی تعداد تقریباً" دگنی ہو چکی تھی۔ یہ اب اتنا بڑا اولوس تھا کہ اگر برقائی خاں کے مقابل آجاتا تو شاید وہ مقابلے کی ہمت نہ کر پاتا۔

حسب توقع ایک بار پھر ہلاکو خاں کے زخم تازہ ہو گئے۔ اس نے برقائی خاں سے جنگ کر کے بدلہ لینے کے بارے میں اپنی بیوی دوقوز سے ضد کی مگر وہ عورت اپنے فیصلے پر اٹل رہی۔ وہ آخر ہلاکو خاں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو ہی گئی کہ وہ غلط راہ پر سوچ رہا ہے۔ یوں برقائی خاں اور ہلاکو خاں کے درمیان دوسری متوقع جنگ ٹل گئی۔

برقائی خاں سے شکست کھانے اور فوری طور پر فرار کا فیصلہ کرنے کے سبب بہت سا ساز و سامان دشت قپچاق ہی میں رہ گیا تھا۔ ہلاکو خاں کو اتنی مہلت نہ مل پائی تھی کہ وہ میدان جنگ سے پڑاؤ کی طرف لوٹ کر جا سکتا۔ وہ سارا ساز و سامان یقیناً" برقائی کے ہاتھ آیا ہو گا۔ سردار بائیدو کا انتظار کرنے کے دوران میں وہ تمام سامان دوبارہ مہیا کرنا پڑا تھا۔ جب سردار بائیدو اپنا اولوس لے کر پہنچا تو تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

روانگی سے تین روز قبل ہلاکو خاں نے حسب معمول مجلس مشاورت منعقد کی۔ اس مجلس میں اس نے پہلی بار اپنے نوجوان بیٹے ابغا کو بھی شریک ہونے کی اجازت دی تھی۔ ابغا بالکل اپنے باپ پر گیا تھا' وحشی' خودسر اور سفاک! لیکن ابھی اس میں اپنے باپ کی سی بے جگری نہیں تھی۔

میرا قیام قلعے کے اس مخصوص حصے میں تھا جہاں ہلاکو خاں اور اس کے اہل خاندان کی رہائش تھی اور جہاں اب سردار بائیدو کو بھی ٹھہرایا گیا تھا۔

میں اب اچھی طرح محسوس کر چکا تھا کہ مجلس مشاورت بس رسماً" ہی منعقد کی جاتی ہے۔ فیصلہ وہی ہوتا ہے جو خود ہلاکو خاں چاہتا ہے یا اس کی بیوی دوقوز! اس رات بھی یہی ہوا تھا۔ ہلاکو خاں نے حکم جاری کیا تھا کہ ٹھیک تین دن بعد علی الصبح اولوس روانہ ہو جائے گا۔

مجلس مشاورت ختم ہوئی تو میں سردار بائیدو کے ہمراہ اس کمرے سے نکلا جہاں مجلس منعقد ہوئی تھیں۔ میں نے مجلس کے دوران ہی میں یہ بات محسوس کر لی تھی کہ سردار بائیدو ہلاکو خاں کے اس فیصلے سے کچھ زیادہ خوش نہیں کہ فوری طور پر روانگی عمل میں آجائے۔ مجلس کے دوران میں اس نے کہا بھی تھا کہ وہ اپنے ہمراہ جو اولوس لے کر آیا ہے' طویل

سفر کے سبب تھکا ہوا ہے مگر ہلاکو خاں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی تھی۔ اس وقت میں نے سردار بائیدو کے بوڑھے چہرے پر ناگواری کے سے اثرات محسوس کیے تھے۔ اس کی شکن آلود پیشانی پر مزید شکنیں پڑ گئی تھی۔

سردار بائیدو کو میرے برابر والے کمرے ہی میں ٹھہرایا گیا تھا اس لیے واپسی میں وہ میرے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر سردار بائیدو کو کسی طرح ہلاکو خاں کی طرف سے اتنا متنفر کر دیا جائے کہ وہ اپنا اولوس لے کر لوٹ جائے تو یہ آپس میں مزید نفاق کا بہترین موقع ہو گا۔ یہ سوچ کر میں نے سردار بائیدو کو اپنے کمرے میں شراب پر مدعو کیا اور اس نے میری دعوت قبول کر لی۔ لوٹتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے میرے کمرے میں آ گیا۔

میرے اندازے کے مطابق جب وہ کافی شراب پی چکا تو میں اصل موضوع پر آ گیا۔

"اے بائیدو! کیا تو نے کبھی سوچا کہ مجلس مشاورت کیوں ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔

جواب میں بائیدو نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا اور آستین سے شراب آلودہ ہونٹ پونچھتے ہوئے بولا۔ "تو یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟"

اس نے میرے سوال کے جواب میں خود سوال کر دیا تو میں کچھ سٹپٹا سا گیا۔ میں نے اپنی دانست میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا چاہا تھا۔

"میں..... میں تجھ سے اس لیے..... تجھ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ تجربہ تیرا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

میری بات سن کر اس نے ایک طویل سانس لیا اور پھر شراب کے برتن کو اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ وہ بوڑھا بلا نوش تھا۔ اس نے شراب کا برتن خالی کر کے نیچے رکھ دیا، پھر بولا۔ "ایسی باتیں نہ پوچھا کر اور نہ سوچا کر بوغا جن کے پوچھنے اور سوچنے سے کچھ حاصل نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں چلتا ہوں اور تو بھی سو جا، بہت رات ہو گئی ہے۔"

سردار بائیدو چلا گیا اور میں غصے میں کھولتا ہوا بستر پر

دنیا بھر کی خوفناک، دہشتناک اور پراسرار کہانیاں

ایسی کہانیاں جن کو پڑھ کر آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ آپ کو یوں محسوس ہو گا کہ آپ کے کمرے کے باہر کوئی دبے پاؤں چل رہا ہے۔ اگر آپ گھر میں اکیلے ہیں تو یقیناً خوف سے چلانا شروع کر دیں گے۔ یا ہو سکتا ہے کہ آپ کی گھگی بندھ جائے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس سے قبل آپ نے یقیناً ایسی کتابیں نہیں پڑھی ہو گی۔

خوفناک کہانیاں	40/-
پراسرار کہانیاں	40/-
ہیبت ناک کہانیاں	40/-
سنسنی خیز کہانیاں	40/-
آسیبی کہانیاں	40/-
ڈراؤنی کہانیاں	40/-
دہشناک کہانیاں	40/-
دیومالائی کہانیاں	40/-
بھوت کہانیاں	40/-
وحشت ناک کہانیاں	40/-
آدم خوروں کی کہانیاں	40/-
خون آشام لڑکیاں	40/-

-:- منگوانے کا پتہ -:-

روبی پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

دراز ہو گیا۔ وہ بوڑھا میری سمجھ میں بالکل نہیں آسکا تھا۔ اس نے مجھے موقع ہی نہیں دیا تھا کہ میں گفتگو کو مزید طول دے سکتا اور اپنے مطلب کی بات پر آسکتا۔

ذاتی طور پر میں ہلاکو خاں کے فیصلے سے خوش ہوا تھا کیونکہ اس طرح جلد سے جلد بغداد پہنچ سکتا تھا جہاں مجھے اپنے باپ شعبان لطفی کو تلاش کرنا تھا۔ مجھے منگولوں کی شکست و فتح سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان کی شکست سے خوشی ہی ہوتی۔

اس شب میں اپنے باپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں اس کا ایک نقشہ بنایا تھا کہ وہ ایسا ہو گا۔ ماں کی موت کے بعد اب وہی میرے لیے سب کچھ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب اسے معلوم ہو گا کہ میں اس کا بیٹا ہوں تو وہ کتنا خوش ہو گا!

مجھے اپنے باپ کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم تھا جو میری ماں نے اپنی موت سے قبل بتایا تھا' یہ کہ وہ ایک تاجر ہے۔ میں نے اب تک یہ نہیں سوچا تھا کہ اسے کہاں اور کس طرح تلاش کروں گا! اب بغداد کے لیے روانگی کا فیصلہ ہو چکا تھا تو بار بار یہ سوال میرے ذہن میں چکرا رہا تھا۔ اسے تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسی سوال پر غور کرتے ہوئے میرے ذہن میں ایک ایسا خیال آیا کہ میں لیٹے لیٹے ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں ان آبادیوں کی تباہی و بربادی کے منظر گھوم گئے جہاں منگولوں نے موت کا بازار گرم کیا تھا۔ قزوین' بلاد جبل' ہمدان اور دوسری چھوٹی بڑی آبادیاں جہاں بھڑکتے ہوئے شعلے اور دھوئیں کے بادل چھوڑ کر وحشی منگول' دشت قپچاق کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اب وہ بغداد کی جانب قہر بن کر لپکنے والے تھے۔ کیا وہ بغداد میں تباہی نہیں مچائیں گے' قتل عام نہیں کریں گے؟ میں نے سوچا۔ کیا اس قتل عام سے میرا باپ شعبان لطفی بچ سکے گا؟ کیا میں اسے تلاش کر پاؤں گا؟ میرے ذہن میں پے در پے سوالات ابھرتے رہے۔

جب میں قراقرم سے ہلاکو خاں کے ساتھ چلا تھا تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جنگ کیا ہوتی ہے اور کیسے لڑی جاتی ہے۔ مفتوحوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے منگولوں کی وحشت و بربریت کا اندازہ تو تھا لیکن اس قدر نہیں۔

میرا ذہن بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ مجھے بہرحال ہلاکو خاں سے پہلے بغداد پہنچنا ہو گا ورنہ میں اپنے باپ شعبان لطفی کو کبھی تلاش نہ کر پاؤں گا۔

میں نے سوچا کہ اگر وہ مجھے مل گیا تو اسے لے کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ میں اسے بتا دوں گا کہ بغداد کی طرف منگولوں کی صورت میں موت بڑھ رہی ہے۔

مجھے علم تھا کہ اگر میں نے تنہا سفر کیا اور اولوس کے ساتھ نہ رہا تو ہلاکو خاں سے بہت پہلے بغداد پہنچ سکوں گا۔ پورے اولوس کو نقل و حرکت میں کافی دیر لگتی ہے جبکہ تنہا آدمی اس سے نصف وقت میں وہ فاصلہ طے کر سکتا ہے' اگر وہ راستے میں زیادہ قیام نہ کرے۔

میں اٹھ کر ٹہلنے لگا اور سوچنے لگا کہ وہ کیا صورت ہو جو میں ہلاکو خاں سے پہلے بغداد پہنچ سکوں۔ بظاہر ایک سیدھی سی بات ذہن میں فوراً" آگئی کہ میں اولوس سے فرار ہو جاؤں مگر جب میں نے اس پر مزید غور کیا تو اسے رد کر دیا۔ اولوس سے فرار کی سزا موت تھی' خواہ فرار ہونے والا کوئی سپاہی ہو یا کوئی سردار! ہلاکو خاں کی اور میری منزل ایک تھی۔ ہلاکو خاں کو بغداد پہنچنا تھا اور ابھی یہ طے نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مجھے اپنے باپ کی تلاش میں وہاں کتنے دن رکنا پڑتا۔ یہ ممکن تھا کہ میں اپنے باپ کو تلاش نہ کر پاتا اور ہلاکو خاں' بغداد پہنچ جاتا۔ اس صورت میں میری موت یقینی ہوتی۔ ہلاکو خاں' یا ساکے قانون کی رو سے مجھے قتل کرانے میں حق بجانب ہوتا۔ منگولوں کے لیے اب میری شخصیت جانی پہچانی تھی۔ میں خود کو ان سے کس طرح چھپا سکتا۔

شیخ العجبل حسن بن صباح کا انجام دیکھ کر مجھے اب یقین سا ہو چلا تھا کہ خلیفہ بغداد وحشی منگولوں کی یلغار نہ روک پائے گا ورنہ میرے ذہن میں اتنے اندیشے جنم نہ لیتے اور میں اتنی دور تک کی باتیں نہ سوچتا۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ ہلاکو خاں' خلیفہ بغداد کو شکست نہ

ے پائے گا تو شاید اسی رات وہاں سے فرار ہو جاتا مگر
ہری نظر میں ایسا نہیں تھا۔ اس سے قطع نظر اگر اپنے
اپ شعبان لطفی کو فوری طور پر ڈھونڈ نکالنے کی کوئی
ید میرے ذہن میں ہوتی تو بھی میں راہ فرار اختیار
رنے کو ترجیح دیتا۔ لیکن بدقسمتی سے دونوں ہی باتیں
یر یقینی تھیں۔

اس رات میں دیر تک سوچتا رہا اور آخر کار میرے
ہن نے ایک راہ نکال ہی لی۔ ہر چند کہ وہ راہ خطرناک
تھی مگر اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ اس
لمحے میں ہلاکو خاں سے پہلے بغداد پہنچ سکتا تھا اور
مستقبل میں میری زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔
ں ہلاکو خاں کی ایما ہی پر بغداد کے لیے فوری طور پر
روانہ ہو سکتا تھا۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن کافی تھک
گیا تھا لیکن اب ایک راہ بھی نکل آئی تھی۔ مجھے یوں
محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو
ی لیے اب میری پلکیں بھاری ہونے لگی تھیں۔
ں بستر پر دراز ہونے کے کچھ دیر بعد ہی بے خبر ہو گیا۔

دوسرے دن میں دیر سے بیدار ہوا۔ یہی سبب تھا
کہ جب میں ہلاکو خاں سے ملنے گیا تو وہ تنہا نہیں تھا۔
سردار بائیدو، سپہ سالار قط بوغا اور ایک منگول سردار
ہائی بھی وہاں موجود تھے۔ ان کے علاوہ ہلاکو خاں کی
ی دو قوز بھی اس کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔ میری
واہش تو یہی تھی کہ میں تنہائی میں ہلاکو خاں سے ملتا
مگر اب مجبوری تھی۔ وہاں سردار بائیدو کو بیٹھا ہوا دیکھ
کر یوں بھی میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ کہیں اس نے رات کی
بات ہلاکو خاں کو نہ بتا دی ہو! میرے خیال میں ہلاکو
خاں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ یہ ذکر چھیڑ
سکتا تھا۔

مجھے دیکھ کر ہلاکو خاں نے حسب معمول چھیڑ خانی
کی مگر میں نے جواب میں ایک ایسی بات کہی کہ وہ
سنجیدہ ہو گیا۔

"کیا تو نے گزشتہ رات واقعی آسمانوں کی سرگوشیاں
سنی ہیں؟" ہلاکو خاں بولا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، سردار بائیدو بول
اٹھا۔ "گزشتہ رات تو بوغا دیر تک میرے ساتھ شراب

حسینوں کے خون کا پیاسا

ڈریکولا

انتخاب جاوید بخاری

قیمت صرف -/90 روپے

خون کی گواہی

ایسی کتاب جو آپ کو تجسس اور سسپنس
کی وادی میں لے جائے گی اور آپ اس
سے باہر نہ نکل پائیں گے

مترجم عظیم احمد

قیمت صرف -/100 روپے

پُراسرار شیطان

خوفناک اور پُراسرار کہانیاں پڑھنے والوں
کے لئے ایک بہترین کتاب

انتخاب جاوید بخاری

قیمت صرف -/100 روپے

ثناء پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

پیتا رہا تھا۔" سردار بائیدو کا انداز تمسخرانہ تھا۔
"یہ آسمانوں پر کب چلا گیا!"
"بائیدو! تو اسے نہیں جانتا۔" ہلاکو خاں نے بائیدو سے کہا۔ "یہ شامان بھی ہے۔"
"شامان!" بائیدو حیرت سے بولا۔ "مگر..... مگر یہ تو نہ لباس سے شامان لگتا ہے نہ صورت سے!"
"اس لیے کہ شامانوں کی طرح نہ یہ لالچی ہے نہ شہرت چاہتا ہے۔" ہلاکو خاں نے بائیدو سے کہا' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بتا کہ تو نے آسمانوں پر کیا سرگوشیاں سنیں؟"
"میں نے سرگوشیوں میں بہت کچھ جانا اور میں وہ سب کچھ تجھے بتانا چاہتا ہوں اے بگھاتر خاقان کے بگھاتر بھائی!"
"تو پھر بتا!" ہلاکو خاں کے لہجے میں تجسس تھا اور وہاں موجود دوسرے افراد بھی اب ہمہ تن گوش نظر آنے لگے تھے۔
"میں نے سنا کہ برقائی خاں مسلمان ہو چکا ہے اور ....."
"مگر یہ خبر تو نئی نہیں۔" معاً دوقوز نے میری بات کاٹ دی۔ "پہلے بھی اس کے بارے میں ایسی خبریں ملتی رہی ہیں۔"
"لیکن اے عظیم دوقوز! تیرے لیے یہ خبر ضرور نئی ہو گی کہ برقائی خاں' خلیفہ بغداد سے مل چکا ہے۔" میں نے کہا۔
میری بات سن کر کچھ دیر کو سناٹا سا طاری ہو گیا' پھر اس سناٹے کو ہلاکو خاں کی آواز نے شکست کیا۔ "تو وہ اسی لیے مجھ سے لڑا تھا کہ میری طاقت توڑ دے!"
"ہاں اے بگھاتر ہلاکو! تو نے ٹھیک کہا۔"
"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ ہم سے کٹ گیا اور دشمنوں کی صف میں آ گیا!" سردار بائیدو پر تفکر لہجے میں بولا۔
"پھر تو میرا کہنا ٹھیک ہی تھا اے دوقوز کہ پہلے اسی سے نمٹ لیا جائے۔" ہلاکو خاں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دشمن جو چاہتا ہے وہی تو کرنے جا رہا ہے۔" دوقوز بولی۔
"وہ کیسے؟" ہلاکو خاں نے پوچھا۔
"دشمن کا مقصد ہی یہ ہے کہ منگول آپس میں لڑ کر اپنی طاقت کمزور کر لیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ خلیفہ ہی کی ایما پر برقائی خان نے تجھ سے جنگ کی ہے تو اسے تجھے اس سے دوبارہ لڑ کر ہرگز خلیفہ کا مقصد پورا نہیں کرنا چاہیے۔"
دوقوز کی بات میں وزن تھا' اس لیے وہاں موجود دوسرے افراد نے بھی اس کی تائید کی۔ ہلاکو خاں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ کچھ سوچنے لگا۔
میں نے اس بات کے لیے یہ موقع غنیمت جانا کہ گزشتہ رات سوچی تھی۔ میں نے ہلاکو خاں کو مخاطب کیا۔ "اے عظیم اور بگھاتر ہلاکو! میں نے خلیفہ کی چال کا ایک توڑ سوچا ہے۔ اگر تو کہے تو بتاؤں۔"
"ہاں کہہ!" ہلاکو خاں متوجہ ہو گیا۔
"بغداد پر حملہ کرنے سے پہلے ہی خلیفہ کی فوجی قوت تقریباً ختم کر دی جائے۔" میں نے کہا۔
"یہ تو کیسی عجیب باتیں کرنے لگا بوغا!" ہلاکو خاں حیرت سے بولا۔ "حملہ کیے بغیر اس کی فوجی قوت کس طرح ختم کی جا سکتی ہے!"
"کیا تو بھول گیا کہ تو نے شیخ الجبل کو کس طرح اس کے مضبوط قلعے سے نکال مارا!"
"کیا کوئی فریب؟"
"ہاں!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "فریب ایسا فریب کہ خلیفہ اسے سمجھ ہی نہ سکے۔"
"بیان کر!"
"مجھے بغداد روانہ کر دے۔" میں نے دھڑکتے دل سے مطلب کی بات کہہ دی' پھر بغیر رکے جلدی سے بولا۔ "میں برقائی خاں کے قاصد کی حیثیت سے اس کے پاس جاؤں گا۔ میں اسے برقائی خاں کی طرف سے یہ پیغام دوں گا کہ وہ فوراً اپنے اولوس کو مغربی دشت روانہ کر دے تاکہ برقائی خان' ہلاکو خاں کو راستے میں روک دے اور بغداد تک نہ پہنچنے دے۔"
"لیکن خلیفہ تیری باتوں پر یقین کیسے کر لے گا اور پھر تحریری پیغام پر برقائی خاں کی مہر کیسی لگائی جائے

گی؟" ہلاکو خاں نے دریافت کیا۔

"تیرے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میرے پاس شہباز کی طلائی لوح ہوگی جو صرف خاندان زریں کے قاصدوں کے پاس ہوتی ہے۔ یہی لوح تو بھی استعمال کرتا ہے اور یہی ابھی تک برقائی خاں کے بھی زیر استعمال ہے۔ میرے پاس اس طلائی لوح کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہوگی کہ میں شاہی قاصد ہوں اور مجھے برقائی خان نے ہی بھیجا ہے کیونکہ خاندان زریں کے کسی اور فرد سے خلیفہ کی سازباز نہیں۔ تیرے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ضروری نہیں' قاصد کے ہاتھ تحریری پیغام ہی بھیجا جائے۔ پہلے بھی زبانی پیغام بھیجے جاتے رہے ہیں تاکہ اگر قاصد راستے میں دشمنوں کے ہتھے چڑھ جائے تو پیغام محفوظ رہ سکے۔ اگر خلیفہ نے اس سلسلے میں سوال بھی کیا تو میں اسے مطمئن کردوں گا۔ میں اس سے یہ کہوں گا' برقائی خاں نے ہلاکو خاں کے خوف سے تحریری پیغام نہیں بھیجا کہ کہیں راستے میں' ہلاکو خاں مجھے نہ پکڑ لے اور تحریری پیغام کی موجودگی میں راز نہ کھل جائے۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔

میری تجویز سے سردار بائیدو اور سپہ سالار قط بوغا نے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ خلیفہ کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے گا' مگر دوقوز میرے حق میں تھی اس لیے میرا پلا بھاری رہا۔

دوقوز کا کہنا یہ تھا کہ اگر خلیفہ فریب میں نہ بھی آیا تو اس سے منگولوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اس لیے کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

میرے لیے ہلاکو خاں نے یہ حکم صادر کیا کہ میں اس وقت تک بغداد ہی میں رکوں جب تک یہ معلوم نہ ہوجائے کہ خلیفہ نے کیا فیصلہ کیا ہے' وہ اپنا اولوس مغربی دشت بھیج رہا ہے یا نہیں! یہ معلوم ہونے کے بعد میں فوراً" بغداد سے چل دوں اور راستے میں ہلاکو خاں سے آملوں تاکہ وہ تازہ ترصورت حال سے واقف ہوسکے۔

ہلاکو خاں کے اولوس کی روانگی کا دن بدستور وہی رہا جو پہلے تھا البتہ مجھے اسی دن روانگی کا حکم مل گیا تاکہ میں اولوس سے بہت پہلے بغداد پہنچ سکوں اور یہی میرا مقصد بھی تھا جو میں نے حاصل کرلیا تھا۔

اسی دن دوپہر تک میری روانگی کی تمام تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ راستوں کا علم جاننے والوں نے مجھے ایک ایک منزل کے بارے میں تفصیل سے سمجھا دیا تھا کیونکہ میں پہلی بار بغداد جارہا تھا۔ یوں بھی میں وقتاً" فوقتاً" ابونصار سے بغداد کے بارے میں بہت سی تفصیلات معلوم کرتا رہا تھا تاکہ کبھی ان سے فائدہ اٹھا سکوں۔ میں نے اپنے سامان میں شہباز کی طلائی لوح بہت سنبھال کر رکھی تھی کیونکہ اسی کے ذریعے میں خلیفہ بغداد تک پہنچ سکتا تھا۔

جس وقت میں قلعے سے اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا نکل رہا تھا تو میرا دل خوشی سے بے قابو تھا۔ میں اس شخص کی تلاش میں جارہا تھا جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا' وہ شخص جس کا لہو میری رگوں میں دوڑ رہا تھا وہ شخص جو میرا باپ تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

کب دن نکلا' کب رات ڈھلی' کب میں نے قیام کیا اور کب چلا' نہ میں نے یاد رکھا اور نہ یاد رہا۔ مجھ پر تو صرف ایک دھن سوار تھی کہ جلد سے جلد بغداد پہنچ جاؤں۔ کوئی عجیب سی کشش تھی جو مجھے بغداد کی طرف تیزی کے ساتھ کھینچے لیے جارہی تھی۔ میں اس وقت گردش روز و شب کے افسوں سے نکلا جب مجھے اس آبادی کے آثار نظر آنے لگے جس کا نام مجھے حلہ بتایا گیا تھا۔ راستوں کا علم جاننے والوں نے مجھے بتایا تھا کہ جب میں حلہ پہنچ جاؤں تو سمجھ لوں کہ اب بغداد زیادہ دور نہیں۔

میں اس آبادی میں داخل ہوا تو میری آنکھوں میں ٹھنڈک سی اترنے لگی۔ وہاں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اور باغات ہی باغات تھے۔ میں نے اب تک دشت دیکھے تھے' لق و دق اور وسیع دشت! بغداد کی طرف سفر کرتے ہوئے پہلی بار میں نے اتنی سرسبزی و شادابی دیکھی تھی۔ میں نے ان علاقوں کو دیکھ کر سوچا تھا کہ وہاں بہترین چراگاہیں بن سکتی تھیں۔

اس آبادی کے گرد مٹی کی ایک پرانی سی دیوار

تھی۔ دیوار کے درمیان ایک بڑا سا دروازہ تھا جس میں سے بڑی بڑی بیل گاڑیاں اور چھکڑے باسانی گزر سکتے تھے۔

اس آبادی کے قریب ہی دریا بہہ رہا تھا جس کا نام مجھے فرات بتایا گیا تھا۔ آبادی دریا کے مشرقی کنارے کی طرف دور تک لمبی چلی گئی تھی۔

میں نے وہ تمام دن گھوڑے کی پیٹھ پر گزارا تھا اور اب کافی تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے ایک شب اس بستی میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ ان بستیوں میں سے اکثر بستیوں میں یام (سرائے) نہیں ہوتے اور مسافر' عبادت گاہوں میں سوتے ہیں۔ میرا گھوڑا اس وقت ایک بھرے پرے بازار سے گزر رہا تھا اور میں نے اب اس کی رفتار بہت کم کر دی تھی۔ اس بازار میں کچھ کچھ فاصلے پر عمارتیں بنی ہوئی تھیں جن کے گرد درخت جھوم رہے تھے۔ راہگیر مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے جس کا سبب غالباً" میرے جسم پر موجود لباس تھا۔

مجھے کسی عبادت گاہ کی تلاش تھی تاکہ وہاں رات بسر کر سکوں مگر ابھی تک مجھے مخصوص طرز کی وہ عمارت نظر نہیں آئی تھی۔

معاً" میری سماعت سے ایک شیریں اور بلند آواز ٹکرائی۔ "اللہ بڑا ہے' اللہ بڑا ہے۔" یہ الفاظ عربی زبان میں ادا کیے گئے تھے جن کا مطلب میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ وہ آواز یقیناً" کسی عبادت گاہ ہی سے بلند ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا گھوڑا آواز کی سمت موڑ دیا۔

بازار میں اب جگہ جگہ چراغ روشن ہو گئے تھے اور لوگ آواز کی سمت بڑھنے لگے تھے۔ اس کے ساتھ بازار بند ہونے لگا تھا۔

مجھے علم تھا کہ عبادت کے دوران میں وہ لوگ گفتگو نہیں کرتے اس لیے میں عبادت ختم ہونے تک عبادت گاہ کے دروازے کی ایک جانب کھڑا رہا۔ میں اب گھوڑے سے اتر گیا تھا اور اس کی لگام تھام لی تھی۔

عبادت ختم ہوئی تو لوگ عبادت گاہ سے نکل کر جانے لگے۔ ان میں سے اکثر نے مجھے بغور دیکھا تھا مگر کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ میں نہ ان کی زبان سمجھ سکتا ہوں نہ بول سکتا ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

دو افراد میرے قریب سے باتیں کرتے ہوئے گزرے تو میں چوکنا ہو گیا وہ میرے ہی بارے میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔

"یہ یقیناً" کوئی وحشی منگول معلوم ہوتا ہے۔" ایک نے خیال آرائی کی تھی۔

"ہاں۔" دوسرے نے کہا تھا۔ "منگولوں کا حلیہ ایسا ہی ہوتا ہے مگر یہ وحشی ادھر کہاں آنکلا!"

"کیا خبر!" دوسرے کے لہجے میں تشویش تھی۔ "آج کل یوں ہی بری بری خبریں سنائی دے....."

پھر وہ دور نکل گئے تھے اور میں ان کی گفتگو نہیں سن پایا تھا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب عبادت گاہ میں سوائے اس سے متعلق فرد یا افراد کے اور کوئی نہیں ہو گا تو میں نے اپنے گھوڑے کو ایک قریبی درخت سے باندھ دیا' پھر میں عبادت گاہ کے دروازے کی طرف بڑھا۔

میں اسی سفر کے دوران میں' پہلے بھی عبادت گاہوں میں ٹھہر چکا تھا اس لیے مجھے علم تھا کہ وہ لوگ اپنی عبادت گاہوں کا بہت احترام کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ میں نے اسی لیے دروازے ہی پر اپنے جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لیے' پھر عبادت گاہ کے صحن میں قدم رکھا۔ سامنے ہی' حوض کے برابر ایک باریش شخص بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا تو اس شخص نے ہاتھ اٹھا کر اس انداز میں اشارہ کیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ وہ بھی شاید مجھے عربی زبان سے ناآشنا سمجھ رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ مجھے عربی بولتے سن کر اس شخص کو حیرت ہو گی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی سی ہوتی تھی۔ کسی کو ایک دم حیرت زدہ کر دینے سے بھی تو مسرت ہوتی ہے۔ میں سفر کے دوران میں پہلے بھی اس مسرت سے

کئی بار ہمکنار ہو چکا تھا۔

"اے بزرگ! میں مسافر ہوں اور آج شب یہاں قیام کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے عربی میں کہا اور حسب توقع اس باریش شخص کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"تم... تم کہاں سے آئے ہو اور..... اور کہاں کا قصد ہے؟" وہ چند لمحے بعد بولا۔

میں نے اس کے پہلے سوال کو نظر انداز کر دیا اور دوسرے سوال کا جواب دیا۔ "میں بغداد جا رہا ہوں کہ وہی میری منزل ہے۔"

"کیا تم مسلمان ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"نہیں۔" میں نے بے جھجک جواب دیا کیونکہ مجھے علم تھا کہ ان کی عبادت گاہ میں ٹھہرنے کے لیے یا رات گزارنے کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہیں۔

"تمہیں بغداد میں کس سے ملنا ہے اور تم کس غرض سے وہاں جا رہے ہو؟" باریش شخص کے لہجے سے شک کا اظہار ہونے لگا تھا۔

مجھے امید تھی کہ وہ یہ سوال ضرور کرے گا۔ ان علاقوں میں یہ سوال مجھ سے پہلے بھی کئی بار کیا جا چکا تھا اور میرے پاس اس سوال کا ایک ایسا جواب تھا جس کے بعد مزید سوال جواب کی گنجائش ختم ہو جاتی تھی۔

"میں خلیفہ بغداد سے ملنے جا رہا ہوں کیونکہ میرے پاس ان کے لیے ایک پیغام ہے۔" میں نے کہا۔

خلیفہ بغداد کا ذکر میری زبان سے سن کر اس شخص کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں' اور پھر وہ مجسم انکسار بن گیا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں کس کا پیغام لے کر خلیفہ کے پاس جا رہا ہوں۔ اس نے مجھے اپنے چھوٹے سے حجرے میں ٹھہرا دیا۔

مجھے اس شخص نے اپنی دانست میں بہت عمدہ کھانا کھلایا مگر مجھے لطف نہیں آیا۔ سوکھے ہوئے گوشت کے کچھ ٹکڑے میرے پاس بچ گئے تھے جو میں نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے آخر میں چبائے۔

اسے بہت ہی زیادہ مہمان نواز دیکھ کر میں نے اس سے کہا۔ "کیا یہاں گھوڑی کا دودھ پینے کو مل سکے گا؟"

"گھوڑی کا دودھ!" وہ اس قدر حیرت زدہ ہوا کہ چند لمحے کچھ بول ہی نہ سکا' پھر اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

گھوڑی کے دودھ کے ساتھ ہی مجھے اپنے گھوڑے کا خیال آیا جسے میں عبادت گاہ سے باہر ایک درخت سے باندھ آیا تھا۔ میں نے اس شخص سے کہا تو اس نے گھوڑے کے لیے گھاس کا بندوبست کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ شخص مجھے حجرے میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ میں دن بھر سفر کرنے سے خاصا تھک گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہی میری پلکیں بوجھل بوجھل سی ہونے لگی تھیں۔ حجرے کے فرش پر ایک موٹی سی چادر بچھی ہوئی تھی اور ایک طرف میلا سا تکیہ پڑا تھا۔ سامنے طاق میں چھوٹا سا چراغ جل رہا تھا۔ اگر مجھے اس باریش شخص کی واپسی کا خیال نہ ہوتا تو میں چراغ کو گل کر کے فرش پر دراز ہو جاتا کیونکہ مجھے اس کی مدھم سی روشنی بھی گراں ہو رہی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے فرش پر دراز ہونے کے کچھ دیر بعد "اللہ بڑا ہے' اللہ بڑا ہے" کی صدا پھر سنی تھی۔ اس آواز سے کچھ دیر کے لیے میری نیند اچٹ گئی تھی مگر میں دوبارہ سو گیا تھا۔ پھر صبح بھی میں یہی آواز سن کر بیدار ہوا تھا۔

صبح بھی اپنی عبادت سے فارغ ہو کر باریش شخص نے میری بڑی خاطر مدارت کی تھی اور پھر میں اس سے رخصت ہو گیا تھا۔ بستی کی نشیبی سمت دریائے فرات پر کشتیوں سے پل بنایا گیا تھا۔ مجھے اس پل کے بارے میں باریش شخص ہی سے معلوم ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میں پل عبور کیے بغیر اپنی اگلی منزل قنطرہ کی طرف نہیں جا سکتا۔

میں اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا بہت جلد اس پل تک پہنچ گیا۔ وہ پل' کشتیوں کے دونوں سروں کو موٹی موٹی زنجیروں سے آپس میں باندھ کر بنایا گیا تھا۔ دریا کے کنارے موٹی موٹی لکڑیاں گاڑی گئی تھیں جن سے زنجیریں لپٹی ہوئی تھیں۔ کشتیوں کے اوپری حصوں کو موٹے موٹے تختوں سے ڈھک دیا گیا تھا تاکہ بآسانی گزارا جا سکے۔ میں پل عبور کرنے کے لیے گھوڑے

سے اتر گیا اور اس کی لگام تھام لی۔

میرے علاوہ بھی کچھ لوگ پل عبور کر رہے تھے جن میں سے کچھ کے پاس سواریاں تھیں اور کچھ بغیر سواری کے تھے۔ دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا اور پانی کی طرف دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ دریا بہت گہرا ہے۔

میں دریا پار کر کے پھر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ وہاں سے بغداد تک کا راستہ مجھے بہت صاف اور ہموار ملا۔ راستے کے دونوں جانب آباد بستیاں تھیں۔ دریا کی شاخیں چاروں طرف ایک خوب صورت جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔

میں دوپہر تک قنطرہ پہنچ گیا۔ یہاں مجھے انواع و اقسام کے میووں کے درخت نظر آئے۔ درخت اتنی کثرت سے تھے کہ دور تک سایہ ہی سایہ نظر آتا تھا۔ میں نے یہاں جو کے کھیت بھی کٹتے ہوئے دیکھے۔ میں قنطرہ میں کچھ دیر رک کر اپنی اگلی منزل فراشہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ رات وہیں بسر کروں۔ یہ علاقہ کیونکہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا اس لیے میں رات کے وقت سفر کرنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

میں سورج ڈوبنے سے پہلے فراشہ پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی سبز و شاداب اور خوب صورت بستی تھی اور یہاں ایک یام بھی تھا۔ میں نے اسی یام میں رات بسر کی۔

صبح ہوتے ہی میں زریران کی طرف چل دیا۔

زریران مجھے اب تک دیکھی ہوئی تمام بستیوں سے زیادہ خوب صورت بستی نظر آئی۔ یہاں پھولوں کے باغات اور کھجور کے درختوں کی بہتات تھی۔ اس بستی کی مشرقی سمت دریائے دجلہ اور مغربی سمت دریائے فرات ہے اور یہ دونوں کے درمیان واقع ہے۔ ہر چند کہ زریران کا حسن میرے پاؤں کی زنجیر بن رہا تھا مگر میں وہاں نہیں رکا اور صرصر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس کے بعد میں بغداد پہنچ سکتا تھا۔

زریران سے نکل کر میں مدائن کے قریب سے گزرتا ہوا صرصر کی طرف چل دیا۔ میں نے اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھا دی کیونکہ شام ہونے لگی تھی اور میں اندھیرا پھیلنے سے پہلے صرصر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق بغداد اب صرف ایک منزل دور رہ گیا تھا۔ اگر دن ہوتا تو شاید میں صرصر میں قیام کیے بغیر سیدھا بغداد کی طرف ہو لیتا لیکن اس وقت ایسا ممکن نہیں تھا۔

صرصر سے بغداد تین فرسخ (تقریباً نو میل) ہے مجھے وہاں پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی مگر اب میرا دل مطمئن تھا کہ بغداد زیادہ دور نہیں اور میں دوسرے دن وہاں پہنچ جاؤں گا۔

بستی کے قریب دریائے فرات سے نکلی ہوئی ایک نہر تھی جس کے پل کو عبور کر کے بستی میں داخل ہو جا سکتا تھا۔ نہر پر کشتیوں کا ایک بڑا پل تھا۔ حلہ کے پل کی طرح یہ کشتیاں بھی موٹی موٹی زنجیروں سے جکڑی ہوئی تھیں۔ میں نے وہاں ایک نو تعمیر اور وسیع عبادت گاہ میں قیام کیا۔

صبح جب میں اس بستی سے چلا تو دیکھا کہ یہ بستی بھی زریران کی طرح خوب صورت تھی۔

جب میں اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا بغداد کی طرف جا رہا تھا تو بار بار میرے ذہن میں یہ خیال آ رہا تھا کہ جس دن ان راستوں سے وحشی منگول گزریں گے، وہ دن کتنا بدنصیب دن ہو گا۔ ان گل و گلزار بستیوں کا کیا بنے گا۔ یہاں کیا تباہی و بربادی نہ آئے گی اور ان کے باشندوں پر کیا گزرے گی جو ایک آنے والی ہولناک تباہی سے بے خبر ہیں۔ کاش ایسا نہ ہوتا! مجھے نہ جانے کیوں ان بستیوں سے ایک لگاؤ سا، ایک قربت سی محسوس ہو رہی تھی، جیسے وہ میری اپنی بستیاں ہوں، میرے اپنے گل و گلزار ہوں۔ جیسے میرا خمیر اسی مٹی سے اٹھا ہو، جیسے وہی میرا وطن ہو۔ حالانکہ وہ بستیاں، وہ آبادیاں میرے لیے بالکل اجنبی تھیں مگر ان میں میرے لیے عجیب سی کشش تھی۔ وہ جیسے میرے پاؤں کی زنجیر بن جانا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایسا کیوں ہے میرے دل میں یہ احساسات کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟ اور پھر

میں نے جانا کہ اس کا سبب میری رگوں میں دوڑتا ہوا لہو تھا۔ میں ایک عرب تاجر ہی کا تو بیٹا تھا' پھر مجھے وہ زمین اپنی زمین کیوں نہ محسوس ہوتی۔

میں نے یہ فیصلہ اسی وقت کر لیا تھا جب بغداد کے لیے روانہ ہوا تھا کہ خلیفہ بغداد سے نہیں ملوں گا۔ وہ ساری باتیں بغداد پہنچنے کا ایک بہانہ تھیں جو میں نے ہلاکو خاں سے کی تھیں۔ مجھے بھلا کیا ضرورت تھی کہ منگولوں کی خاطر ایک ایسے شخص کو فریب دیتا جس سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ شخص وحشی منگولوں کا شکار بننے والا تھا اس لیے مجھے اس سے ہمدردی ضرور تھی مگر میں اس کے لیے آندھیوں کا رخ نہیں موڑ سکتا تھا۔ اس کی طرف منگولوں کی متوقع یلغار کو روکنا میرے بس میں نہیں تھا رہی یہ بات کہ اس شخص کو منگولوں کے حملے سے آگاہ کر دیا جاتا تو یہ بھی ایک فضول سی بات تھی۔ میری نظر میں اس شخص کو اتنا بے خبر نہیں ہونا چاہیے تھا جو ایک بڑی سلطنت کا حکمراں تھا اور جس میں اتنی جرات تھی کہ منگولوں کو منہ توڑ جواب دے سکتا کہ وہ اپنے گھوڑوں کا سم کاٹ ڈالیں تو وہ ہتھیار ڈال دے گا۔ خلیفہ کے سفیر سے خود میرے سامنے خاقان منگو خاں نے جو کچھ کہا تھا' اس کا واضح مطلب اعلان جنگ ہی تھا۔ منگولوں کے خاقان نے اس کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا اور وہ یقیناً" اس سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس دوران میں لازماً" اس نے زبردست جنگی تیاریاں کر لی ہوں گی۔ پھر یہ کہ اپنے جاسوسوں کے ذریعے اس نے منگولوں کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھی ہو گی۔ اس کے علاوہ یہ کہ موجودہ صورت حال سے اسے خود برقائی خاں نے بھی آگاہ کر دیا ہو گا جو اس کا خلیفہ بن چکا تھا۔ ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ سوچنا کہ خلیفہ' بغداد' منگولوں کے حملے سے بے خبر ہو گا' حماقت کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ میری نظر میں اسے اطلاع فراہم کرنا' وقت کا زیاں تھا اور وقت بہت قیمتی تھا۔ مجھے بہرحال ہلاکو خاں کے بغداد پہنچنے سے پہلے اپنے باپ شعبان لطفی کو تلاش کرنا تھا اور پھر اسے لے کر بغداد سے فرار ہو جانا تھا۔

صرصر سے بغداد تک کا سفر میں نے نہایت تیز رفتاری سے طے کیا۔ میں دریائے دجلہ کے کنارے گھوڑا دوڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ یہ دریا کا مشرقی کنارے تھا۔ جب مجھے فصیل شہر نظر آنے لگی تو میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ فصیل شہر نصف دائرے کی صورت میں نظر آ رہی تھی اور دریا شہر کے بیچوں بیچ داخل ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ شہر دریا کے دونوں کناروں پر آباد ہے مگر کثیر آبادی مشرقی کنارے پر ہے۔ شہر کے مغربی حصے میں نخلستان اور باغات ہیں اور اسی حصے میں مسلمانوں کا وسیع و عریض قبرستان ہے جہاں ان کے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کے مزارات ہیں۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں اس حصے کی طرف نہ جاؤں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ خلیفہ کا محل مشرقی حصے کے آخر میں ہے۔ شہر میں داخل ہونے کے چار دروازے ہیں اور میں آخری دروازے کو شہر میں داخل ہونے کے لیے استعمال کروں۔ اس دروازے کا نام مجھے "باب البصیلہ" بتایا گیا تھا۔ یہ مشرقی حصے کا آخری دروازہ تھا اور یہ خلیفہ کے محل سے بہت قریب تھا۔ شاید یہی سبب تھا جو مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں اسی دروازے سے شہر میں جاؤں۔

میں نے بوڑھے منگولوں سے سنا تھا کہ چنگیز خاں نے بھی ایک بار اس شہر پر حملہ کیا تھا۔ غالباً" اسی وقت سے اس شہر کے بارے میں تمام معلومات منگولوں کو تھیں اور انہوں نے یہ معلومات محفوظ رکھی تھیں۔ چنگیز خاں کے زمانے سے اب تک منگولوں نے جہاں جہاں حملے کیے تھے اور جہاں جہاں تک پہنچے تھے' وہاں کے بارے میں انہیں تمام معلومات تھیں۔

کیونکہ مجھے خلیفہ سے نہیں ملنا تھا' اس لیے میں شہر کے پہلے ہی دروازے "باب السلطان" سے شہر میں داخل ہو گیا۔ مجھے چاروں دروازوں کے نام بتائے گئے تھے جو میں نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھے تھے۔

میں جب اس شہر میں داخل ہوا تو مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی حسین

خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ شہر اتنا ہی حسین اور بارونق نظر آرہا تھا کہ میں کچھ دیر کے لیے مبہوت سا ہو گیا۔ میں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لی تھیں اور اس طرح اطراف کا جائزہ لے رہا تھا جیسے شاید پھر کبھی میں ادھر نہ آسکوں گا۔

پھر کافی دیر بعد جیسے مجھے ہوش آیا اور یہ یاد آیا کہ اس شہر میں میری آمد کا مقصد کیا ہے۔ مجھے اس شہر کے اندرونی حصوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا گیا تھا۔ نہ مجھے محلوں کے نام معلوم تھے اور نہ راستے! شاید یہ معلومات منگولوں کے لیے فضول تھیں جو انہوں نے محفوظ نہیں رکھی تھیں۔

میرے سامنے دور تک ایک وسیع و عریض شہر پھیلا ہوا تھا جس کی آبادی کا میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا اور اس آبادی میں مجھے صرف ایک ہستی کی تلاش تھی۔

اس شہر میں یقیناً" تجارتی مراکز اور منڈیاں بھی ہوں گی۔ میں نے سوچا۔ میرا باپ ایک تاجر ہے اور وہ مجھے کسی ایسی ہی جگہ مل سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میں گھوڑے کی پشت سے اتر گیا۔

اس وقت میں ایک بھرے پرے بارونق بازار میں تھا۔ میں نے اب تک لوگوں کو اپنی جانب جس انداز میں دیکھتے ہوئے پایا تھا' اس سے اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھ رہے۔ ان کے جسموں پر ڈھیلے ڈھالے لباس تھے جو اتنے بڑے تھے کہ زمین پر گھسٹتے تھے۔ مجھے ان کا یہ عجیب و غریب لباس دیکھ کر حیرت ہوئی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ وہ اتنے بڑے لباس کیوں پہنتے ہیں جو زمین پر گھسٹیں۔ ان میں سب ہی باریش تھے۔ بہت کم ایسے تھے جن کے چہروں پر داڑھیاں نظر نہیں آرہے تھیں۔ دراز قد اور تیکھے نقوش والے یہ لوگ مجھے چہرے ہی سے مغرور نظر آرہے تھے لیکن مجھے بہرحال ان میں سے کسی نہ کسی سے معلومات حاصل کرنا تھیں۔

کچھ دیر میں اپنے اندر یہ ہمت پیدا کرتا رہا کہ کسی راہگیر کو مخاطب کروں' پھر میں نے اپنے قریب سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو مخاطب کر ہی لیا۔ میں نے اسے عربی زبان میں مخاطب کیا تھا۔ وہ شخص ٹھٹھک کر رک گیا' پھر دوسرے لمحے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے مگر یہ تاثر اس کے چہرے پر زیادہ دیر قائم نہیں رہا اور دوبارہ چہرے پر نخوت نظر آنے لگی۔

"تم نے مجھے کیوں روکا ہے اور کیا چاہتے ہو؟" اس شخص نے ترشروئی سے کہا۔ اس کے لہجے سے حقارت کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔

"مجھے ایک ایسے شخص کی تلاش ہے جو تاجر ہے میں....."

"تو پھر میں کیا کروں!" اس شخص نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"اسے خود تلاش کرو!"

"لیکن میں اس شہر میں اجنبی ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ تجارتی منڈیاں کہاں ہیں۔ میں تم سے۔"

"مجھے اتنی فرصت نہیں کہ تمہاری بکواس سنوں۔" یہ کہہ کر وہ شخص بڑھا اور لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔

اس شخص کے رویے پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ نہ معلوم وہ خود کو کیا سمجھ رہا تھا۔ مجھے اس پر اتنا غصہ آیا کہ کچھ دیر تک میں نے کسی دوسرے شخص سے بات نہ کی اور اپنے گھوڑے کی لگام تھامے پیدل ہی ایک طرف بڑھنے لگا۔

کچھ دور چل کر ہی مجھے ایک بڑی عبادت گاہ نظر آئی۔ اتنی بلند و وسیع عمارت دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اتنی بڑی عبادت گاہ میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ میں نے سوچا کہ یقیناً" اس شہر کے لوگ بہت مذہبی ہوں گے اسی لیے تو انہوں نے اتنی بڑی عبادت گاہ بنائی تھی۔

عبادت گاہ کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ایک اور شخص کو مخاطب کرنا چاہا مگر اس شخص نے مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کی اور حقارت آمیز نگاہ سے دیکھتا ہوا گزر گیا۔ پھر میں نے باری باری کئی افراد

وکا اور ان سے بات کی۔ مجھے ان کے رویے پر
غصہ آرہا تھا مگر مجبوری تھی۔
کافی دیر کوشش کے بعد اور کئی افراد سے گفتگو کر
مجھے اس محلے کا نام اور راستہ معلوم ہوا جس کے
میں اتنی دیر سے تگ و دو کر رہا تھا۔
اس محلے کا نام وسط بتایا گیا تھا جہاں کپڑے کے
خانے تھے اور جہاں دریائے فرات سے نکلی ہوئی
نہر کے ذریعے اطراف کا تجارتی مال آتا تھا۔ بعد
مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نہر دریائے دجلہ میں
تی ہے۔
میں پتا معلوم کرنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر
سڑک پر روانہ ہو گیا جو کچھ دور جا کر دائیں جانب
تی تھی۔
میں بغداد کے مختلف محلوں سے گزرتا ہوا اور آگے
نے کے لیے معلومات حاصل کرتا ہوا بڑھتا رہا۔
ے جگہ جگہ چھوٹی بڑی عبادت گاہیں نظر آئیں
میں دیکھ کر میں حیران ہوا۔ میں نے اتنی عبادت
ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔
میں ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ مسلح سپاہیوں
ے کئی دستے تیزی سے ایک طرف جاتے دیکھے۔ اسی
رف میرا بھی رخ تھا۔ مسلح گھوڑ سوار دستے آگے چلے
ئے تو میں نے بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی کیونکہ میں
نے شور سن کر اپنا گھوڑا راستے کی ایک جانب کر لیا تھا
ور رک گیا تھا۔ گھوڑ سواروں کو آتا ہوا دیکھ کر راہگیر
ی راستے کی دونوں جانب جمع ہو گئے تھے۔ میرے
گھوڑے کی اطراف میں بھی لوگ جمع تھے اور عجیب
عجیب باتیں کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان میں سے
کسی نے کہا تھا کہ آج کرخ والوں کی خیر نہیں۔ یہ کرخ
والے کون تھے، مجھے اس وقت تک علم نہیں تھا۔
میں گھوڑا دوڑاتا ہوا بڑھتا رہا اور پھر میں نے اپنے
گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ ایک تیر سنسناتا ہوا
میرے قریب ہی سے گزرا تھا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر
ایک بلند و وسیع چار دیواری نظر آرہی تھی جس کے
اوپر چڑھ کر کچھ لوگ نیچے موجود سپاہیوں پر تیر چلا رہے
تھے۔
میں یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس چار دیواری
کے درمیان ایک بڑا سا دروازہ نظر آرہا تھا جو بند تھا۔
مسلح سپاہی اس دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہے
تھے۔ بالکل ایسا منظر تھا جیسے کسی شہر کا محاصرہ کر لیا گیا
ہو اور اہل شہر قلعہ بند ہو کر لڑ رہے ہوں۔
چار دیواری کے نیچے نیچے سپاہی ہی سپاہی نظر آ
رہے تھے جن میں سے زیادہ تر گھوڑوں پر سوار تھے اور
تیر اندازی کر رہے تھے۔ وہاں ایک عجیب ہنگامہ بپا
تھا۔ ہر طرف سے شور، چیخیں اور نعرے سنائی دے
رہے تھے۔
جہاں میں نے اپنا گھوڑا روکا تھا، وہیں سے بائیں
جانب بھی ایک چھوٹا سا راستہ جاتا تھا جو ویران پڑا ہوا
تھا۔ میں نے اپنا گھوڑا اسی راستے پر ڈال دیا کیونکہ اس
ہنگامے سے گزرنا، ممکن نہیں نظر آرہا تھا۔
اسی راستے پر کچھ دور جا کر مجھے لوگوں کا ہجوم نظر آیا
جس نے راستے کو مسدود کر دیا تھا۔ وہ ہجوم اسی طرف
دیکھ رہا تھا، جدھر سے میں آیا تھا۔ مجھے مجبوراً اپنے
گھوڑے سے اترنا پڑا۔
مجھے گزرنے کے لیے راستہ دیتے ہوئے ان لوگوں
کے چہروں پر کبیدگی کے آثار ابھرے تھے۔ ان میں
سے بہت سوں نے مجھے برا بھلا بھی کہا تھا مگر میں کوئی
جواب دیے بغیر خاموشی سے گھوڑے کی لگام تھامے
گزرتا چلا گیا۔ وہ مجھے وہاں دیکھ کر ایک دوسرے سے
حیرت کا اظہار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھ
جیسا جنگلی وہاں کدھر سے آگیا۔
ہجوم سے گزر کر کچھ دور موجود ایک اور چار دیواری
پر میری نگاہ پڑی مگر وہاں ہنگامہ نہیں تھا۔ میں اس کے
قریب سے گزرتا چلا گیا۔ میں حیران تھا کہ شہر کے اندر
وہ چار دیواریاں کیوں بنائی گئی تھیں اور ان کا مقصد کیا
تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ وہ چار
دیواریاں بڑے بڑے محلوں کی تھیں۔ وہ محلے چھوٹے
چھوٹے شہروں کی مانند تھے۔
اب مجھے ایک بار پھر کسی نہ کسی سے راستہ

دریافت کرنا تھا اور یہ میرے لیے ایک بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ ایک بارونق بازار میں میں گھوڑے سے اتر گیا۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بازار ایک چھوٹے سے محلے سوق المارستان کا تھا جس کے گرد چار دیواری نہیں تھی۔

وہاں مجھے معلومات حاصل کرنے پر اب نئی بات پتا چلی کہ کپڑے کے کارخانے محلہ وسط میں نہیں عتابیہ میں ہیں۔ وسط میں صرف تجارتی مال کی آمد و رفت ہوتی ہے۔ گویا مجھے اب ایک کی بجائے دو محلوں میں جانا تھا جو آپس میں ملے ہوئے تھے۔ جس شخص نے مجھے پہلے وسط کے بارے میں بتایا تھا یا تو غلط بتایا تھا یا میں اس کی بات پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔

مجھے سوق المارستان کے بازار میں جو شخص ملا' وہ کچھ شریف الطبع معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے کافی دیر تفصیلی گفتگو کی۔ اس نے مجھے وسط تک پہنچنے کا راستہ اچھی طرح سمجھا دیا۔ اسی شخص سے مجھے شہر کے اندر برپا ہونے والے اس ہنگامے کے بارے میں بھی علم ہوا تھا جسے دیکھ کر میں حیران ہوا تھا۔

اس شخص نے بتایا تھا کہ اس محلے کا نام کرخ تھا اور وہاں ایک خاص عقیدہ رکھنے والے لوگوں کی آبادی ہے۔ وہ لوگ خود سر ہیں اور عموماً" خلیفہ کے جاری کردہ احکامات پر کان نہیں دھرتے اور جو جی میں آتا ہے' کرتے ہیں کیونکہ انہیں خلیفہ کے وزیر ابن العلقمی کی پشت پناہی حاصل ہے جو ان کا ہم عقیدہ ہے۔ اس شخص کی اطلاع کے مطابق اس بار کرخ والوں نے کچھ زیادہ ہی خود سری کا مظاہرہ کیا تھا' اس لیے خلیفہ نے انکے خلاف سخت احکامات جاری کر دیے تھے۔

مجھے اس شخص سے یہ بات سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ ابونصار نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ مسلمانوں کے درمیان عقائد میں اختلاف ہے اور نہ ہی میں نے اب تک یہ سنا تھا کہ عقائد کی بنیاد پر وہ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ سب مسلمان ایک ہیں۔ ابونصار کی شخصیت نے مسلمانوں کے لیے میرے دل میں جو جگہ پیدا کی تھی وہ بغداد آکر ختم ہو گئی تھی۔

سوق المارستان سے چل کر میں وسط ہی میں رکا حالانکہ درمیان میں ایک بڑا محلہ شارع بھی پڑا مگر میں وہاں نہیں رکا کیونکہ اس محلے کے بارے میں وہ شخص پہلے ہی بتا چکا تھا اور اب مجھے کسی سے راستے کے بارے میں بھی معلوم نہیں کرنا تھا۔

وسط کے بازاروں میں مجھے جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی چار دیواریاں نظر آئیں جو مال تجارت کی منڈیاں تھیں۔ میں ایک منڈی میں داخل ہو گیا۔ مجھے وہاں جگہ جگہ چھوٹے بڑے کھجوروں کے ڈھیر نظر آئے۔ منڈی میں کافی ہجوم تھا۔

میں ایک ایسی دکان پر پہنچا جہاں نسبتاً" کم لوگ نظر آرہے تھے۔

"کیا تم شعبان لطفی کو جانتے ہو؟ وہ ایک تاجر ہیں۔" میں نے دکاندار کو مخاطب کیا۔

"ہو گا۔" دکاندار نے مجھ سے کہا اور اپنے ایک گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے میرے عربی بولنے پر بھی کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

وہ اپنے گاہک سے سودا کر کے فارغ ہوا تو میں پھر اس سے مخاطب ہوا۔ "مجھے شعبان لطفی کی تلاش ہے۔ اگر تمہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہو تو ....."

"ارے تم اب تک یہیں کھڑے ہو! چلو راستہ لو! مجھے کچھ پتا نہیں۔" دکاندار نے مجھے بڑی حقارت سے دھتکار دیا۔

میرا جی چاہا کہ جواب میں اس کا منہ توڑ دوں مگر اپنا غصہ پی کر میں دوسری دکان کی طرف بڑھ گیا۔

پھر اس کے بعد میں نہ صرف اس منڈی میں بلکہ وہاں موجود تمام ہی منڈیوں میں' اپنے باپ کے بارے میں پوچھتا پھر مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ لوگوں نے تو سیدھے منہ بات ہی نہیں کی اور کچھ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں وہاں سے کبیدہ خاطر ہو کر عتابہ پہنچ گیا۔ وہاں بھی میں ایک ایک شخص سے پوچھتا پھرا کہ

میرے باپ کو جانتا ہے مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ دن اسی تلاش و جستجو میں گر گیا مگر مجھے کامیابی ہوئی۔ مجھے ایک شخص سے محلہ قرافہ کے بارے ضرور معلوم ہوا جہاں بڑے بڑے تاجروں کی ش تھی۔

میرے پاس اب سامان خورد و نوش بالکل ختم ہو چکا ور بھوک بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ علم تھا کہ کھانا کہاں مل سکتا ہے اس لیے میں نے سمت کا رخ کیا۔ مجھے علم تھا کہ مسلمانوں کی ت گاہوں میں مسافروں کے لیے خورد و نوش کا بست کر دیا جاتا ہے اور اس کا مجھے عملی تجربہ بھی ہو تھا۔

میں کچھ دور موجود ایک عبادت گاہ کی طرف بڑھ رہا کہ میں نے اپنے عقب میں دو بارش اشخاص کے موں کے چاپ محسوس کی۔ وہ مجھ سے بہت قریب ے اور میں گھوڑے سے اتر کر تھکے تھکے قدموں سے وڑے کی لگام تھامے چلا جا رہا تھا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے ان دونوں اشخاص کے رے کچھ شناسا سے لگے۔

"ٹھہرو!" ان میں سے ایک نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور ں رک گیا۔

پھر جب وہ دونوں میرے قریب آ کر رکے تو مجھے یاد یا کہ میں نے انہیں وسط کی ایک منڈی میں بھی یکھا۔ اس کے بعد وہ مجھے کئی بار عتابیہ میں بھی نظر ئے تھے مگر میں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

"تمہیں کس کی تلاش ہے؟" ایک شخص نے وال کیا۔ اس کے لہجے میں کرختگی کی بجائی نرمی ی۔

"میں ایک تاجر شعبان لطفی کو تلاش کر رہا وں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے حلیے سے تو پتا چل رہا ہے کہ تم منگول ہو، پھر تمہیں عربی زبان کیسے آتی ہے؟" دوسرے خص نے چبھتے ہوئے سے لہجے میں پوچھا۔

ممکن تھا کہ اگر وہ شخص اس لہجے میں سوال نہ کرتا تو میں اسے بتا دیتا۔ عربی زبان میں نے ایک عرب مبلغ ابو نصار سے سیکھی تھی مگر میں اس وقت تک ان لوگوں کے رویے سے کچھ چڑ سا گیا تھا۔ اب تک مجھے اتنے لوگوں سے گفتگو کا موقع ملا تھا ان میں سے بہت کم نے سیدھے منہ بات کی تھی اسی لیے میں نے بھی اس شخص کے سوال کا جواب چبھتے ہوئے لہجے ہی میں دیا۔ میں نے کہا۔ "تمہیں یہ جاننے کی فکر کیوں ہے کہ میں نے عربی زبان کہاں سے سیکھی؟ یہ صرف تمہاری ہی....."

"تم چپ رہو!" پہلے شخص نے یہ بات اپنے ساتھی سے کہی تھی مگر اس کے بولنے کی وجہ سے میرا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ دوسرا شخص خاموشی سے مجھے گھورنے لگا۔ پھر پہلے شخص نے نرمی کے ساتھ مجھے مخاطب کیا۔ "اے اجنبی نوجوان! تم جس شخص کے بارے میں پوچھ رہے ہو، اس سے تم کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

میرا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ میں بولا۔ "تم اگر اس شخص سے واقف ہو تو بتاؤ ورنہ میں اپنا راستہ لوں۔"

"ناراض ہونے کی ضرورت نہیں نوجوان!" پہلے شخص نے پھر نرمی سے کہا۔

"یہ اس طرح کچھ نہیں بتائے گا۔ اسے....."

"میں نے تم سے کہا تھا کہ چپ رہو!" پہلے شخص نے اپنے ساتھی کی بات کاٹ دی اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو اس پر مجھے عیاری سی نظر آئی۔ مجھے اس کے لہجے کی نرمی فریب معلوم ہونے لگی۔

"یہ بتاؤ نوجوان کہ تم کہاں سے آ رہے ہو؟" پہلے شخص نے سوال کیا۔

"میں اس وقت تک تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا جب تک تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ شعبان لطفی کو جانتے ہو یا نہیں!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"ہاں میں اسے جانتا ہوں۔"

پہلے شخص کا جواب سن کر مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ میں کچھ دیر کو گم صم سا ہو کر رہ گیا، پھر بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا "تم کیا تم واقعی شعبان لطفی کو جانتے ہو؟"

"ہاں!" اس شخص نے نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تمہیں میری بات پر یقین کیوں نہیں آرہا!"

"وہ کہاں رہتا ہے، کہاں مل سکے گا؟" میں نے بیتابی کے ساتھ پوچھا۔

"وہ محلہ قرافہ میں رہتا ہے۔" اس شخص نے جواب دیا اور مجھے اس کی بات پر یقین آگیا کیونکہ مجھے پہلے بھی ایک شخص نے بتایا تھا کہ بغداد کے بڑے بڑے تاجر وہیں رہتے ہیں۔

"کیا تم اس کے گھر سے واقف ہو؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"ہاں مجھے اس کا گھر معلوم ہے۔"

"تو پھر..... پھر مجھے وہاں..... وہاں لے چلو!" میرے لہجے میں عاجزی آگئی مگر یہ جملہ ادا کرتے ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ دو افراد ہیں جنہیں میں بیک وقت اپنے گھوڑے پر نہیں بٹھا سکوں گا۔ یہ سوچ کر میں نے اس شخص کے کچھ کہنے سے پہلے ہی پوچھا۔ "وہ محلہ یہاں سے کتنی دور ہے؟ کیا ہم وہاں تک پیدل چل سکتے ہیں؟"

"نہیں!" حلیم الطبع شخص نے جواب دیا۔ "وہاں تک پیدل نہیں چلا جا سکتا لیکن تم نے یہ کیوں پوچھا؟"

"اس لیے کہ تم لوگوں کے پاس سواری نہیں اور میں تم میں سے کسی ایک ہی کو گھوڑے پر بٹھا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو کیا ہوا، ہم میں سے ایک شخص تمہارے ساتھ چلا جائے گا کیونکہ میرا ساتھی بھی شعبان لطفی سے اور اس کے گھر سے واقف ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "تم اس نوجوان کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ کر چلے جاؤ۔ میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔"

مجھے یہ بات کچھ اچھی نہ لگی کہ وہ شخص میرے ساتھ جائے جس کا لہجہ مجھے ناگوار گزرا تھا اور جو صورت ہی سے خطرناک معلوم ہوتا تھا مگر یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں ان معمولی باتوں کو خاطر میں لاتا۔ میں نے اس شخص کو اپنے ساتھ گھوڑے پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ وہ میری طرف متوجہ ہونے کے بجائے حلیم الطبع شخص سے کچھ سرگوشی کرنے لگا جسے سن کر اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ اس کے بعد خطرناک صورت شخص میرے گھوڑے پر چڑھ گیا اور مجھ سے پیچھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ مجھے اس کا یہ انداز بھی ناگوار گزرا۔

"میں تمہیں اس لیے پیچھے بٹھا رہا ہوں کہ تم راستوں سے ناآشنا ہو۔" اس نے میری طرف جھک کر کھرکھراتی ہوئی آواز میں کہا اور میرے گھوڑے کی لگامیں تھام لیں۔

"بیٹھ جاؤ!" حلیم الطبع شخص نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میں رکاب میں پاؤں ڈال کر گھوڑے پر چڑھ گیا اور ابھی سنبھل کر بیٹھا بھی نہ تھا کہ اس نے گھوڑے کو دوڑا دیا۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید گھوڑے سے گر پڑتا مگر میں پہلے ہی اس شخص کی طرف سے محتاط تھا اور ایک اچھا گھڑسوار بھی تھا۔ مجھے اس شخص کی یہ حرکت بھی گراں گزری مگر میں نے اس سے کچھ کہا نہیں۔

میرے ذہن میں اس وقت اپنے باپ شعبان لطفی کی تصوراتی شبیہہ گھوم رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ یقیناً "میرا باپ اس شہر کے عام باشندوں کی طرح مغرور و متکبر نہیں ہوگا۔ اس انداز میں میرے سوچنے کا سبب شاید یہ رہا ہو کہ وہ میرا باپ تھا۔

گھوڑا تیز رفتاری سے دوڑتا رہا اور اس سے بھی تیز میرے خیالات کی رو دوڑتی رہی۔

معاً" گھوڑے کی رفتار کم ہونے لگی تو میں چونکا۔ میں نے سامنے ہی دائیں جانب ایک بڑی سے عمارت دیکھی جس کے سامنے لوگوں کا ہجوم نظر آرہا تھا۔ اسی

ہوم کے سبب راستے کا بڑا حصہ گھر گیا تھا جو آنے
جانے والوں کے لیے دشواری کا سبب بن رہا تھا۔ مجھے
وہاں مسلح سپاہی بھی نظر آئے جو ہجوم کو منتشر کرنے
کے لیے ان پر ڈنڈے برسا رہے تھے مگر اس کے باوجود
لوگ وہاں سے نہیں ہٹ رہے تھے۔ سپاہیوں کی
تعداد کم تھی اور ہجوم بہت تھا۔

میں جس شخص کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھا' اس
نے اب گھوڑے کی رفتار بہت ہی کم کر دی تھی۔ میں
دیکھ رہا تھا کہ لوگ ڈنڈے کھا کر چیختے ہوئے بھاگتے
تھے اور پھر ہجوم میں شامل ہو جاتے تھے۔ میں حیران تھا
کہ لوگ اس عمارت کے سامنے کیوں جمع ہیں۔ بظاہر
یہ عمارت ایسی بھی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ میں یہ
سمجھتا' وہاں خلیفہ کا کوئی نائب وغیرہ رہتا ہو گا جس کے
سامنے احتجاج کرنے کی غرض سے لوگ جمع ہوئے
ہوں گے۔

اسی دوران میں گھوڑا ہجوم کے قریب سے گزرتا
ہوا بڑھ گیا۔ میں نے اپنے اجنبی خیر خواہ کو مخاطب کیا۔
"یہ لوگ اس عمارت کے سامنے کیوں ہجوم کیے
ہوئے ہیں؟"

نہ جانے اس شخص کے دل میں کیا بات آئی کہ اس
نے مجھے صحیح جواب دے دیا۔ "یہ شفاخانے کی
عمارت ہے اور اس کے سامنے جمع ہونے والے لوگ
ایک محلے کرخ کے باشندے ہیں۔ ان کے زخمی'
شفاخانے میں ہیں اور وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں لیکن
ظاہر ہے کہ اتنے سارے لوگوں کو بیک وقت
شفاخانے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جا
سکتی۔"

"محلہ کرخ کے یہ لوگ شاید سپاہیوں کے ہاتھوں
ہی زخمی ہوئے ہوں گے!" میں نے خیال آرائی کی مگر
اپنے میرے اجنبی خیر خواہ نے میری بات سنی ہی
نہیں۔ میں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی۔

"غیر ضروری باتوں سے گریز کرو نوجوان!" اجنبی
نے سختی سے کہا اور اس کے ساتھ ہی گھوڑے کی رفتار
بڑھا دی۔

کچھ دور چل کر گھوڑا اسی راستے پر آ گیا جہاں سے
میں صبح گزرا تھا۔ مجھے وہ راستہ پہچاننے میں زیادہ
دشواری نہیں ہوئی کیونکہ سامنے ہی وہ چار دیواری
نظر آ رہی تھی جس پر چڑھے ہوئے لوگوں کو میں نے
سپاہیوں پر تیر برساتے ہوئے دیکھا تھا۔ گویا وہ محلہ کرخ
کی چار دیواری تھی۔

اس چار دیواری میں نصب بڑا سا دروازہ ٹوٹا ہوا پڑا
تھا اور وہاں سپاہیوں کا ہجوم تھا۔ سپاہی محلے سے نکلنے
والوں کو روک کر انہیں دوبارہ اندر بھیج رہے تھے۔ ٹوٹا
ہوا دروازہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ سپاہیوں
نے اہل محلہ پر قابو پا لیا تھا۔

یہ لوگ آپس ہی میں لڑ رہے ہیں اور ان میں اتحاد
نہیں تو پھر یہ دشمن کا مقابلہ کیسے کریں گے؟ میرے
ذہن میں خیال آیا۔ ان کا داخلی انتشار یقیناً "منگولوں
کے لیے سود مند ثابت ہو گا۔ میں انہی خیالوں میں
کھویا رہا اور گھوڑا دوڑتا رہا۔

گھوڑا مختلف محلوں سے گزرتا ہوا بڑھتا رہا اور پھر
جب وہ آبادی سے نکلا تو مجھے فکر ہوئی۔ میں نے اجنبی
کو بلند آواز میں مخاطب کیا کیونکہ گھوڑے کی رفتار تیز
تھی۔ "تم آبادی سے نکل کر کدھر جا رہے ہو؟"

"خاموش بیٹھے رہو!" اجنبی کی کرخت آواز سنائی
دی۔ "میں تمہیں وہیں لے جا رہا ہوں جہاں تمہیں
جانا ہے۔"

"کیا محلہ قرافہ آبادی سے الگ ہے؟ مجھے تو کسی
نے بتایا تھا کہ وہ شہر کا سب سے بڑا محلہ ہے۔" میں
نے کہا۔

"ہاں وہ اسی طرف کچھ فاصلے پر شہری ہنگاموں سے
الگ تھلگ ایک پر سکون محلہ ہے۔ تمہیں غلط نہیں
بتایا گیا۔" اجنبی نے جواب دیا۔

میں اس کے بعد خاموش ہو گیا۔ اس کے علاوہ
میرے پاس چارہ بھی کیا تھا۔

کچھ دیر خاصے فاصلے پر روشنیاں سی نظر آئیں۔
گھوڑے کا رخ اسی سمت تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان
سا ہوا۔

میں یہ دیکھ کر کچھ کھٹکا تھا کہ اس محلے کے گرد چار دیواری نہیں تھی کیونکہ میں نے اب تک بغداد کے جتنے بڑے بڑے محلے دیکھے تھے ان کی اطراف چار دیواریاں تھیں۔ میں نے اس سلسلے میں اجنبی سے کچھ کہنا مناسب خیال نہیں کیا۔

اس آبادی میں کچھ دور چل کر ایک جگہ ہجوم سا نظر آیا جس کے درمیان ایک گھوڑ سوار نظر آ رہا تھا۔ گھوڑا ہجوم کے قریب پہنچ کر کچھ آہستہ ہوا اور میں نے گھوڑ سوار کے الفاظ سنے۔ اس کے جسم پر سپاہی کی وردی تھی اور وہ ہجوم سے بلند آواز میں مخاطب تھے۔

"تو سنو اے رصافہ والو! اگر تم نے بھی سر اٹھایا تو تمہارا وہی حشر ہو گا جو کرخ والوں۔۔۔۔"

میں اس سے زیادہ کچھ نہ سن سکا کیونکہ گھوڑا تیزی کے ساتھ وہاں سے بڑھ گیا تھا۔ اجنبی نے غالباً" دانستہ گھوڑے کو تیز دوڑایا تھا۔

تو یہ محلہ فراقہ نہیں، رصافہ ہے۔ میں نے سوچا۔ آخر وہ اجنبی مجھے وہاں کیوں لایا ہے؟ وہ میرے ساتھ کیا کھیل کھیل رہا ہے؟ مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ میرے باپ کی رہائش گاہ محلہ فراقہ میں ہے پھر وہ مجھے رصافہ میں کیوں لے آیا تھا۔

"کیا ہمیں اسی محلے میں پہنچنا تھا؟" میں نے بلند آواز میں اجنبی سے پوچھا۔

"ہاں!" اجنبی نے جواب دیا۔ "تمہارے باپ کا مکان اب زیادہ دور نہیں۔"

"لیکن یہ محلہ تو رصافہ ہے جبکہ تمہارے ساتھی نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا باپ محلہ فراقہ میں رہتا ہے۔ پھر تم مجھے ادھر کیوں لے آئے ہو؟"

"تم نے یقیناً" غلط سنا ہو گا۔ اس نے فراقہ نہیں رصافہ کہا تھا۔" اجنبی نے کہا۔

"لیکن میری معلومات کے مطابق تو تاجروں کی رہائش گاہیں فراقہ میں ہیں۔" میں نے بحث کی کیونکہ اب اس اجنبی کی طرف سے میرے دل میں خدشات پیدا ہونے لگے تھے۔

"تو پھر میں گھوڑے سے اتر جاتا ہوں۔ تم جاؤ اور فراقہ میں اپنے باپ کی رہائش گاہ تلاش کرو!" یہ کہہ کر اس اجنبی نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔

میرا دل چاہا کہ اس سے کہہ دوں، دفع ہو جائے مگر میں نے سوچا، مجھے دھوکا دینے سے اسے کیا فائدہ ہو گا۔ اس کے سچ یا جھوٹ کا اندازہ ابھی کچھ دیر بعد ہی اس وقت ہو جائے گا جب وہ اپنے کہنے کے مطابق مجھے میرے باپ کی رہائش گاہ پر پہنچا دے گا۔ یہ سوچ کر میں نے اس سے اپنے رویے کی معذرت کر لی اور اس پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔

میری بات سن کر وہ عجیب سے انداز میں ہنسا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ غالباً" وہ اپنی دھمکی کے کارگر ہونے پر میرا مذاق اڑا رہا تھا۔

وہ آبادی سے الگ تھلگ ایک مکان تھا جس کے سامنے پہنچ کر اس اجنبی نے گھوڑا روکا۔ اس مکان کی اطراف کھجور کے پیڑ بکثرت تھے جن کے سبب وہ مکان چھپ سا گیا تھا۔

مکان کا دروازہ سامنے ہی نظر آ رہا تھا جہاں روشنی تھی۔ دروازے پر ہی مجھے دو تنومند افراد کھڑے ہوئے دکھائی دیے۔ گھوڑے کے رکتے ہی اجنبی اس پر سے کود گیا تھا۔ اس نے مجھے بھی گھوڑے سے اترنے کا اشارہ کیا، پھر ان تنومند افراد سے بلند آواز میں کچھ کہا جسے میں نہیں سمجھ سکا۔ اس نے عربی زبان کی بجائے کوئی اور زبان استعمال کی تھی۔ ان میں سے ایک بڑھ کر میرے گھوڑے کی لگام تھام کر ایک طرف چلا گیا تھا اور دوسرا اسی جگہ کھڑا رہا تھا۔

اس وقت میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا جب میں اس اجنبی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پھر جیسے ہی میں دروازے سے داخل ہوا، تنومند شخص مجھ پر جھپٹ پڑا۔ حملہ کیونکہ قطعی غیر متوقع تھا اس لیے میں سنبھل نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ تنومند شخص مجھ پر چھا گیا، پھر اجنبی بھی اس کا ساتھ دینے لگا۔ انہوں نے مجھے بہت جلد غیر مسلح کر دیا۔

اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ اس اجنبی

نے مجھے دھوکا دیا تھا لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ مجھے انہوں نے رسیوں میں جکڑ دیا تھا۔ اب دوسرا تنومند بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔

"اسے اٹھاؤ اور تہ خانے میں لے چلو!" اجنبی نے اپنے دونوں ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ اس مرتبہ اس نے انہیں عربی زبان ہی میں حکم دیا تھا۔ اجنبی نے کچھ توقف کے بعد پھر کہا۔ "میں بھی ابھی وہاں آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بائیں جانب موجود ایک راہداری کی طرف بڑھ گیا۔

"سنو اے عیار شخص!" میں چیخ پڑا "تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

مگر اس شخص نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور میں چیختا ہی رہ گیا۔ وہ مجھ پر اچانک حملہ آور ہو گئے تھے اس لیے میں ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہاتھ پاؤں بھی نہ مار سکا تھا۔ میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا کہ آخر وہ کون لوگ ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔

اچانک ان دونوں نے مجھے زمین سے اٹھایا اور دائیں جانب والی راہداری کی طرف بڑھنے لگے۔ ان دونوں نے مجھے اس طرح اٹھا رکھا تھا جیسے میں انسان کی بجائے کوئی جانور ہوں جسے وہ گلے پر چھری پھیرنے کے لیے لے جا رہے ہوں۔

پھر وہ مجھے لیے ہوئے راہداری میں موجود ایک کمرے کے اندر چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے مجھے کمرے کے فرش پر پٹخ دیا اور میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ کہیں یہ لوگ میرے باپ شعبان لطفی کے دشمن تو نہیں! مگر ابھی یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اس کمرے میں ایک بڑا سا چراغ روشن تھا جس کی روشنی میں مجھے وہ دونوں پتھر کی ایک بھاری سل اٹھائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس سل کے بھاری ہونے کا اندازہ میں نے ان کے چہروں سے لگایا تھا کیونکہ اسے اٹھانے میں انہیں خاصی دشواری ہو رہی تھی جس کا اظہار ان کے چہروں سے بھی ہو رہا تھا۔

وہ سل، پہلے کمرے کے فرش میں پیوست تھی۔ اس کے درمیان لوہے کا ایک بڑا کنڈا تھا جس میں ہاتھ ڈال کر ان دونوں نے اسے اٹھا لیا تھا اور اب ایک طرف رکھ رہے تھے۔

سل رکھ کر وہ میرے قریب پہنچے اور دوبارہ مجھے اٹھا لیا۔ تہ خانے کے زینے تک پہنچتے ہوئے میری نگاہ اس سل پر بھی پڑی تھی جس میں کئی جگہ گول گول سوراخ تھے۔

کچھ دیر بعد ہی انہوں نے مجھے تہ خانے میں پہنچا دیا۔ وہ ایک چھوٹے سے زینے کے ذریعے تہ خانے میں اترے تھے۔ تہ خانے میں پہنچ کر انہوں نے مجھے فرش پر ڈال دیا تھا اور پھر وہیں موجود رہے تھے۔ وہ شاید اجنبی کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ تہ خانہ قدیم طرز کا کوئی اذیت خانہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہاں پہلے ہی سے مشعلیں روشن تھیں جن میں جلنے والی چربی کے سبب تہ خانے میں بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف دو چھوٹے چھوٹے ستون نظر آ رہے تھے جن کے درمیان کوئی شخص زنجیروں سے بندھا ہوا نڈھال سا پڑا تھا۔ اس نے تہ خانے میں قدموں کی چاپ سن کر ایک بار سر اٹھایا تھا اور پھر سر ڈال کر پڑ رہا تھا۔ اس شخص کے چہرے سے عجیب سی وحشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں اسے ایک نظر دیکھ کر ہی کانپ اٹھا تھا۔ اس کے جسم کا نچلا حصہ ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر سوچا تھا کہ کیا میرا بھی یہی حشر ہو گا؟ ان دونوں ستونوں کے سامنے ہی چمڑے کا ایک بڑا سا کوڑا پڑا ہوا تھا۔ قریب ہی کچھ فاصلے پر ایسے ہی دو ستون اور تھے مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ تہ خانے میں ہر طرف عجیب کاٹھ کباڑ بھرا پڑا تھا۔

کافی دیر گزر گئی تو تہ خانے کے زینوں پر قدموں کی چاپ گونجی مگر وہ کسی ایک شخص کے قدموں کی چاپ نہیں ہو سکتی تھی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے اور پھر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ آنے والے دو ہی تھے۔ ان میں سے ایک تو وہی خطرناک صورت شخص تھا جو مجھے وہاں لے کر آیا تھا اور دوسرا اس کا وہی ساتھی تھا

جو عتابیہ ہی میں رہ گیا تھا، حلیم الطبع اور بظاہر شریف آدمی! مگر اس وقت مجھے اس کے چہرے پر بلا کی عیاری نظر آ رہی تھی جیسے اب میری آنکھیں اس کا اصل چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنے ساتھی سے باتیں کرتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔

"تم اسے یہاں تہہ خانہ میں کیوں لے آئے؟ کوئی ضروری تو نہیں کہ اس پر تشدد ہی کیا جائے تو یہ زبان کھولے۔" حلیم الطبع مگر عیار شخص اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔

"تم نے شاید اس نوجوان کے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے رواحہ!" دوسرے شخص نے اپنے ساتھی کو اس کا نام لے کر مخاطب کیا۔ "یہ بظاہر جتنا مسکین صورت نظر آ رہا ہے، اتنا ہے نہیں۔ اس نے راستے میں سوالات کر کر کے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ یہ یقیناً" بہت عیار ہے اور بغیر تشدد کیے یہ زبان نہیں کھولے گا۔"

"خیر ابھی معلوم ہو جائے گا۔" یہ کہتا ہوا رواحہ میرے قریب پہنچ کر رک گیا، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے اجنبی نوجوان! تیرا نام کیا ہے؟"

"میں اپنا نام بھی بتا دوں گا اور ممکن ہے کہ وہ باتیں بھی بتا دوں جو تم پوچھنا چاہتے ہو، اگر میرے علم میں ہوئیں لیکن پہلے میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم لوگ مجھے دھوکا دے کر یہاں کیوں لائے ہو؟" میں نے ہمت کر کے رواحہ سے کہا۔

"تم نے دیکھ لی، اس کی چرب زبانی رواحہ!" خطرناک صورت شخص اپنے ساتھی سے بولا۔ "یہ تمہارے سوال کا جواب دینے کی بجائے خود سوال کرنے لگا۔"

"تم کچھ دیر خاموش رہو زبیر! مجھے اس نوجوان سے بات کرنے دو۔" رواحہ نے اپنے ساتھی سے کہا اور پہلی بار مجھے پتا چلا کہ خطرناک صورت شخص کا نام زبیر ہے۔

"ٹھیک ہے، میں خاموش رہوں گا لیکن یہ طے ہے کہ اگر اس نے زبان نہیں کھولی تو میں اپنے طریقے آزماؤں گا۔" زبیر بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ غالباً اسے اپنے ساتھی کی بات ناگواری ہوئی تھی۔

"میں تمہیں بھی جانتا ہوں اور تمہارے طریقوں کو بھی!" رواحہ کے لہجے میں سختی آ گئی۔ اس نے ستونوں کے درمیان بندھے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے تشدد ہی کے نتیجے میں وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے اور اب کسی طرح اس سے معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ شہزادوں میں سے کسی کے ذہن میں سب سے پہلے سازش۔۔۔" رواحہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رک گیا۔ غالباً" وہ کوئی ایسی بات کہنے جا رہا تھا جو اسے میری موجودگی میں نہیں کہنی چاہیے تھی۔

"مگر طبیبوں نے تو کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔" زبیر بول اٹھا۔

"کون جانے ٹھیک بھی ہو یا نہیں! اور اگر ٹھیک بھی ہو جائے تو اسے ٹھیک ہونے میں کتنا عرصہ لگے۔ خیر اس ذکر کو چھوڑو! یہ ان باتوں میں الجھنے کا وقت نہیں۔"

"اس کا ذکر میں نے نہیں تم نے چھیڑا تھا رواحہ!" زبیر کی تیوریوں پر اب تک بل پڑے ہوئے تھے۔

رواحہ نے اپنی ساتھی کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "سنو اے اجنبی نوجوان! تم میرے ساتھی کے بارے میں اب تک یہ جان چکے ہو گے کہ یہ تشدد پر یقین رکھتا ہے لیکن میں اس کا قائل نہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ بغیر تشدد کیے بھی کام چل سکتا ہے۔ اگر تم نے میرے سوالوں کے صحیح جوابات دے دیے تو میں تمہیں اپنے ساتھی کے سپرد نہیں کروں گا ورنہ تم جانو اور یہ! بولو تم میرے سوالوں کے جوابات دینے پر آمادہ ہو؟"

مجھے علم نہیں تھا کہ آخر وہ مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں اس لیے پہلے میرے لیے بہرحال یہ جاننا ضروری تھا۔ میں نے اسی لیے اثبات میں جواب دیا۔

میری بات سن کر رواحہ نے کہا۔ "تم یقیناً" عقل نوجوان معلوم ہوتے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے پھر اپنے

پہلا سوال دہرایا کہ میرا نام کیا ہے۔

"بطریق بوغا۔" میں نے جواب دیا۔

"تم منگول ہو اور غالباً" انہی کے علاقے سے آ رہے ہو؟"

"نہیں دشت سے ضرور آ رہا ہوں مگر..... مگر..."

میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ میرے ذہن میں پھر وہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا تھا کہ یہ لوگ میرے باپ شعبان لطفی کے دشمن ہو سکتے ہیں۔ اگر اس صورت میں انہیں میں نے یہ بتا دیا کہ شعبان لطفی سے میرا کیا رشتہ ہے تو یہ شاید مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔

رواحہ نے میرے تذبذب کا اندازہ غالباً" میرے چہرے سے کیا تھا۔ وہ مجھے خاموش دیکھ کر کچھ دیر گھورتا رہا' پھر کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔ "اگر تم نے کوئی بات چھپانا چاہی تو یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔ بتاؤ تم کیا کہنے والے تھے؟"

اس دوران میں خود کو میں نے کافی حد تک سنبھال لیا تھا اس لیے پر سکون آواز میں بولا۔ "میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ منگول ہونا کوئی جرم تو نہیں لیکن میں یہ کہتے ہوئے رک اس لیے گیا تھا کہ کہیں تمہیں میری یہ بات ناگوار نہ ہو۔"

"ہوں۔" رواحہ نے میری بات سن کر ایک طویل سانس لیا' پھر بولا۔ "تمہیں شعبان لطفی کی کیوں تلاش ہے اور تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"مجھے اس تک ایک نہایت ضروری اور اہم پیغام پہنچانا ہے۔" میں نے بے دریغ جھوٹ بولا۔

"وہ پیغام اسے کس نے بھیجا ہے؟" رواحہ نے سوال کیا۔

"یہ میں نہیں بتانا چاہتا۔" میں نے بغیر کسی غصے کا اظہار کیے نرمی سے کہا۔

رواحہ نے میرے انکار کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

"وہ پیغام تحریری ہے یا زبانی؟"

"زبانی۔" میں نے جواب دیا۔

"جب تم یہ بتانا نہیں چاہتے کہ وہ پیغام شعبان لطفی کے لیے کس نے بھیجا ہے تو غالباً" اس پیغام کے بارے میں بھی بتانا پسند نہیں کرو گے؟ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں تمہارا خیال غلط نہیں۔" میں نے کہہ دیا۔

"منگولوں کے علاقے سے شعبان لطفی کے نام ایک پیغام!" رواحہ جیسے خود کلامی میں مبتلا تھا۔ "میرے خیال سے یہ..... یہ ناممکن سی بات ہے' قطعی ناممکن!" یہ بڑبڑاتے ہوئے رواحہ ایک دم تیز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم جھوٹے ہو کیونکہ شعبان لطفی کو وہاں کوئی نہیں جانتا۔"

مجھے احساس تھا کہ رواحہ غلط نہیں کہہ رہا مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہیں زبیر کے حوالے کیے دیتا ہوں۔ پھر تمہارا اس کے ہاتھوں جو حشر ہو اس کے تم خود ذمے دار ہو گے۔" یہ کہہ کر رواحہ میرے چہرے کو گھورنے لگا۔ شاید وہ میرے چہرے پر اپنی دھمکی کا ردعمل تلاش کر رہا تھا۔

کچھ دیر وہ میرے چہرے کو گھورتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوبا رہا۔ اس کا ساتھی اور تہ خانے میں موجود بقیہ دو تنومند افراد اب تک پتھروں کے مجسموں کی طرح خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ وہ غالباً" رواحہ کے کسی فیصلے تک پہنچنے کے منتظر تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی قباحت نہیں ہوئی تھی کہ رواحہ کی حیثیت بہرحال زبیر سے بلند تھی۔ رواحہ اب ایک جگہ کھڑا رہنے کی بجائے تہ خانے میں ٹہلنے لگا تھا اور اب تہ خانے میں اس کے قدموں کی چاپ کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

معاً" ایک قہقہے نے اس سکوت کو توڑ دیا۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ستونوں کے درمیان زنجیروں سے بندھا ہوا قیدی قہقہے لگا رہا تھا' پھر وہ قہقہے لگاتے لگاتے ایک دم چیخ پڑا۔ "سازش' خلیفہ کے خلاف

کنیزوں کی سازش! وہ خلیفہ کو اپنے دراز گیسوؤں سے باندھ کر رکھنا چاہتی ہیں' افسوس صد افسوس! خلیفہ پر ظلم ہو رہا ہے' ظلم سراسر ظلم!" یہ کہہ کر وہ زور سے رونے لگا۔

"خاموش!" زبیر کی آواز تہ خانے میں گونجی اور اس نے بڑھ کر ستونوں کے سامنے پڑا ہوا چمڑے کا کوڑا اٹھا لیا۔

قیدی نے سہم کر اس طرف دیکھا اور پھر دوبارہ کسی خوفزدہ جانور کی طرح گردن ڈال دی مگر اس کی سسکیاں اب بھی تہ خانے میں گونج رہی تھیں' پھر چند لمحے بعد ہی تہ خانے میں دوبارہ سکوت چھا گیا۔ ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ قیدی جیسے سو گیا ہو۔

رواحہ ٹہلتا ہوا زبیر کے قریب پہنچا' پھر بولا۔ "میرا خیال ہے زبیر کہ ہمیں اس معاملے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔"

"پھر؟" زبیر نے سوال کیا۔

"اطلاعات کے مطابق انہیں موصل یا میافارقین دونوں میں سے کسی ایک جگہ لازماً ہونا چاہیے کیونکہ یہ معاملہ انتہائی اہم نوعیت کا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ایک جگہ تم جاؤ اور دوسری جگہ میں! اس سلسلے میں' میں تمہاری سوا کسی اور شخص پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔" رواحہ نے کہا۔ ہر چند کہ اس کی آواز مدھم تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ میں نہ سن سکتا۔

میں ان لوگوں کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے رواحہ نے دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے زبیر کے سپرد کر دے گا اور اب وہ خود بھی کہیں جانے کی بات کر رہا تھا اور زبیر کو بھی کہیں بھیج رہا تھا۔ آخر یہ کیا چکر ہے اور میرا اس سے کیا تعلق ہے؟ میں نے سوچا اور میرا ذہن مزید الجھ گیا۔

رواحہ کی بات سن کر زبیر کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا کوڑا اسی جگہ پھینک دیا جہاں وہ پہلے پڑا ہوا تھا' پھر رواحہ سے مخاطب ہوا۔ "کیا وہ یہ نہیں پوچھیں گے کہ ہم نے اپنے طور پر کچھ معلوم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ کوشش میں کیا حرج ہے' ممکن ہے یہ زبان کھولنے پر آمادہ ہو ہی جائے!"

"نہیں!" رواحہ مضبوط و مستحکم لہجے میں بولا۔ "میں اب ان مکانات پر بھی غور کر رہا ہوں کہ ممکن ہے' اس نوجوان پر ظلم و تشدد کو وہ ناپسند کریں۔ اگر اس سلسلے میں جواب طلبی ہو گئی تو اس کا ذمے دار کون ہو گا؟"

ان کی باتوں سے میں نے صرف یہ اندازہ لگایا کہ مجھ پر تشدد کر کے کسی کے سامنے جواب دہ بھی ہو سکتے ہیں مگر وہ کون شخص تھا' اس کے بارے میں' میں لاعلم ہی رہا کیونکہ ان دونوں ہی نے اب تک اس کا نام نہیں لیا تھا' شاید دانستہ! وہ غالباً" اس شخص کی شخصیت کو مجھ سے چھپانا چاہتے ہوں گے۔

رواحہ کی بات کے جواب میں زبیر نے خاموشی اختیار کر لی۔ شاید رواحہ کے سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ رواحہ نے جس امکان کا اظہار کیا تھا وہ غالباً" اس کی نظر میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"اچھا تو پھر چلو!" رواحہ نے زبیر کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"کیا اس نوجوان کو یہاں اسی طرح بندھا ہوا چھوڑ دیا جائے؟" زبیر نے میری طرف اشارہ کیا۔

"کیا حرج ہے!" رواحہ بولا۔

"میرے خیال سے اسے بھی دوسرے ستونوں کے درمیان زنجیروں میں جکڑ دینا چاہیے تاکہ یہ ہماری واپسی تک فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکے۔" زبیر نے تجویز پیش کی۔

"یہ کام ان دونوں کے سپرد بھی کیا جا سکتا ہے۔" رواحہ نے دونوں تنومند افراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارا یہاں رکنا ضروری تو نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" زبیر نے رواحہ کی بات سے اتفاق کیا' پھر ان دونوں تنومند افراد کو مخاطب کیا۔ "تم دونوں جا رہے ہیں۔ تم اس نوجوان کو ستونوں سے

درمیان مضبوطی سے باندھ دینا۔ ہماری واپسی تک ہوشیار اور چوکنا رہنا۔ تمہیں اس نوجوان کا خاص طور پر خیال رکھنا ہے کہ یہ فرار نہ ہو سکے۔" یہ کہہ کر وہ رواحہ کی طرف مڑا اور بولا۔ "چلو!"

دونوں تہہ خانے کے زینے کی طرف بڑھ گئے اور دونوں تنومند میری طرف آنے لگے۔

کچھ دیر بعد ہی رواحہ اور زبیر کے قدموں کی چاپ معدوم ہو گئی۔ وہ دونوں تنومند مجھے اٹھا کر ان ستونوں کے قریب لے آئے جہاں انہیں میرے جسم کو بھاری زنجیروں میں جکڑنا تھا۔

ان میں سے ایک، میرے جسم پر موجود رسیاں کھولنے لگا اور دوسرا تلوار سونت کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تاکہ اگر میں کوئی غیر متوقع حرکت کروں تو مجھ سے نمٹا جا سکے۔

وہ دو تھے اور مسلح بھی تھے لیکن میں دشت کا پروردہ تھا، جہاں بچپن سے لے کر جوانی تک میں نے وحشت و بربریت کے نہ جانے کتنے تماشے دیکھے تھے۔ میری نظر میں یہ ایک سنہری موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر میں فرار ہو سکتا تھا۔ زنجیروں میں جکڑے جانے کے بعد شاید مجھے فرار کا موقع نصیب نہ ہو سکتا۔ یہ سوچ کر میرے اعصاب تن گئے۔ کچھ کر گزرنے کے لمحے بہت قریب آتے جا رہے تھے۔ اب میرے جسم پر رسیوں کی گرفت خاصی ڈھیلی ہو چکی تھی، لیکن وہ شخص جو میرے سر پر تلوار لیے کھڑا ہوا تھا، انتہائی چوکنا تھا۔ اس کے علاوہ جو شخص میری رسیاں کھول رہا تھا، اس نے بھی اب تک میرے ہاتھوں کو آزاد نہیں کیا تھا۔ وہ غالباً "سب سے بعد میں ہاتھوں کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔

میرے پاؤں آزاد ہو گئے تو ایک تنومند نے سخت لہجے میں مجھے گویا حکم دیا۔ "کھڑے ہو جاؤ!"

ابھی تک میرے ہاتھ نہیں کھولے گئے تھے جو پشت پر مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ کچھ کر گزرنے کے لیے میں نے اسی وقت کا انتخاب کیا تھا جب وہ میرے ہاتھ کھولتے، اس لیے میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"قدم بڑھاؤ!" شمشیر بکف تنومند نے تلوار کی نوک میرے ایک شانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب میرے دائیں جانب آ کھڑا ہوا تھا اور مجھے ستونوں کی طرف بڑھنے کا حکم دے رہا تھا جو صرف چند قدم کے فاصلے پر تھے۔

میں نے ستونوں کی طرف قدم اٹھایا۔ کیا میں اسی طرح باندھ دیا جاؤں گا اور زنجیروں میں جکڑے جانے کے بعد وہ لوگ میرے ہاتھ کھولیں گے؟ میں قدم بڑھاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہو گا۔ ایسی صورت میں کیا مجھے صرف اپنی ٹانگوں سے کام لینا ہو گا؟ لیکن کیا میں اس طرح ان دونوں سے نبرد آزما ہو سکوں گا جبکہ وہ مسلح بھی ہیں؟ میرے ذہن پر اس وقت تک سوالوں کی یلغار ہوتی رہی جب تک میں ستونوں کے درمیان نہ پہنچ گیا۔

اب صورت یہ تھی کہ ان میں سے ایک میرے سینے پر تلوار کی نوک رکھے ہوئے کھڑا تھا اور دوسرا میری پشت پر پہنچ کر میرے ہاتھ کھول رہا تھا۔ وہ دونوں یقیناً "بہت چالاک تھے۔ انہوں نے اب تک مجھے اس کا موقع نہیں دیا تھا کہ میں کچھ کر سکتا۔

میں نے سوچا کہ وہ شخص جو میری پشت پر ہے یقیناً "ہاتھ کھولنے کے بعد وہاں موجود نہیں رہے گا۔ اسے بہرحال ستونوں سے لپٹی ہوئی زنجیروں کو کھولنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی تاکہ میرے جسم کو زنجیروں میں جکڑا جا سکے۔ مجھے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ میں نے سوچا اور اس شخص کی طرف دیکھا جو تلوار کی نوک میرے سینے پر رکھے ہوئے کھڑا تھا۔

جتنی دیر میں اس شخص نے میرے ہاتھ کھولے اتنی دیر میں، میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے! وہ شخص میری توقع کے مطابق میرے ہاتھ کھول کر دائیں جانب والے ستون کی طرف آ گیا۔ اب وہ ستون سے لپٹی ہوئی زنجیر کھول رہا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں نے ستونوں کی طرف

بڑھتے ہوئے' اس چھوٹی سی زنجیر کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا جو ستونوں کی پچھلی سمت میں کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔

میں ایک دم انتہائی تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹا۔ اگر مجھے پیچھے ہٹنے میں ذرا سی بھی تاخیر ہو جاتی تو شاید ستون سے زنجیریں کھولنے والے شخص نے میری ٹانگ پکڑ لی ہوتی۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس کا ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گیا تھا۔ تیزی سے پیچھے ہٹنے کے سبب میں اس شخص کی تلوار کی زد سے بھی نکل گیا تھا جو میرے سینے پر تلوار کی نوک رکھے ہوئے کھڑا تھا۔

پیچھے ہٹتے ہی میں ایک دم پلٹا تھا اور اس زنجیر کی طرف چھلانگ دی تھی جو کچھ فاصلے ہی پر پڑی ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ دونوں بھی مجھ پر جھپٹے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھ تک پہنچ سکتے' میں زنجیر اٹھا چکا تھا۔

اب ان دنوں ہی کے ہاتھوں میں تلواریں نظر آ رہی تھیں۔ وہ دونوں مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے تھے۔

"زنجیر پھینک دو!" ان میں سے ایک غرایا اور ساتھ ہی اس نے مجھے خوفزدہ کرنے کی غرض سے اپنی تلوار لہرائی۔

"اگر تم نے زنجیر نہ پھینکی تو۔"

دوسرے شخص کی بات ادھوری ہی رہ گئی کیونکہ اسی وقت میرے منہ سے قہقہہ ابل پڑا تھا۔ وہ دونوں ہی مجھے اس طرح حیرت سے دیکھنے لگے تھے جیسے میرا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔

"تم اپنے آقاؤں کی واپسی سے پہلے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "تمہیں تمہارے آقاؤں نے میری حفاظت کا حکم دیا ہے' قتل کرنے کا نہیں۔"

"مگر ہم تمہارے ہاتھ پیر تو توڑ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ تم نے فرار ہونا چاہا تھا اور مجبوراً" ہمیں یہ قدم اٹھانا پڑا۔" پہلا شخص دانت پیس کر بولا۔

"اگر تمہیں اس کا موقع ملا!" یہ کہتے ہی میں نے اچانک بھاری زنجیر گھمائی۔

میرا حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ ان میں سے ایک ہی زنجیر کی زد سے بچ سکا۔ بھاری زنجیر دوسرے کے سر پر پوری قوت سے پڑی تھی اور وہ ایک چیخ مار کر زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے قریب آ گری تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ بچ جانے والا شخص سنبھل پاتا اور مجھ پر حملہ کرتا' میں نے دوبارہ زنجیر گھمائی لیکن اب وہ ہوشیار ہو چکا تھا۔ وہ زنجیر کی زد سے بچنے کے لیے ایک دم زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے بیٹھے بیٹھے ہی میری طرف چھلانگ دی تھی۔ اس کی تیزی اتنی غیر متوقع اور حیرت انگیز تھی کہ کچھ دیر کے لیے میں چکرا کر رہ گیا۔ اگر میں چکرا نہ جاتا تو شاید اس کے حملے سے بچنے کی خاطر اپنی جگہ چھوڑ دیتا لیکن میں ایسا نہ کر سکا تھا اور وہ شخص مجھ پر آ پڑا تھا۔

میں اپنا جسمانی توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ میرا گرنا ہی میرے حق میں بہتر ثابت ہوا۔ میرا بایاں ہاتھ اس تلوار کے قبضے سے ٹکرایا تھا جو پہلے شخص کے ہاتھ سے گری تھی۔ دشمن کیونکہ اب قریب آ گیا تھا اس لیے میں اس کے خلاف زنجیر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے تلوار اٹھانے اور زنجیر استعمال کرنے سے پہلے دیر نہیں کی تھی۔ پھر میں انتہائی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن مجھ سے پہلے میرا دشمن اٹھنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اٹھ کر کھڑا ہوتے ہی اگر میری نظر دشمن پر نہ پڑتی اور میں اسے خود پر حملہ کرتے ہوئے نہ دیکھ لیتا تو اس کی تلوار میرا کام تمام کر چکی ہوتی۔ اس نے میرے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اب وہ مجھے ہلاک کر دینے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ میرا یہ خیال اب غلط ثابت ہو رہا تھا کہ وہ دونوں غالباً" اپنے آقاؤں کی جواب طلبی کی صورت میں جو جواز پیش کرنے کا اظہار کیا تھا' غالباً" اسے میری ہلاکت کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ میں نے فرار ہونا چاہا' انہوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ان پر میں نے

حملہ کردیا۔ پھر انہوں نے مجھ سے اپنی جان بچانے کی خاطر مجھے قتل کردیا۔ یہ تمام باتیں بہت تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں آئیں صرف چند لمحوں میں! اور ان لمحوں کے دوران میں بھی میں اپنے دشمن کی طرف سے غافل نہیں رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ دشمن میرے سنبھلنے سے قبل مجھ پر دوسرا حملہ کرسکتا، میں نے اس پر حملہ کردیا۔ میری تلوار کی بھرپور ضرب کو اس نے اپنی پوری تلوار پر روک لیا تھا اور اب ہم دونوں ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کررہے تھے۔

میرا دشمن مجھے پیچھے کی طرف دھکیلنے کے لیے زور لگاتے لگاتے ایک دم تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹا تاکہ میں اپنے ہی زور میں اوندھے منہ زمین پر گر پڑوں مگر میں خود یہی داؤ استعمال کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کے ساتھ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ میرا دشمن بھی یہ داؤ استعمال کرسکتا ہے۔ میں نے یہ خیال آتے ہی اپنا ایک پاؤں آگے اور ایک کچھ فاصلے سے پیچھے رکھ لیا تھا تاکہ دشمن کے داؤ کو ناکام بنا سکوں اور اپنا جسمانی توازن برقرار رکھ سکوں۔ دشمن کے تیزی سے پیچھے ہٹنے کی وجہ سے میرے جسم کو خفیف سا جھٹکا تو ضرور لگا تھا مگر میں فوراً ہی سنبھل گیا تھا۔ جتنی تیزی سے میرا دشمن پیچھے ہٹا تھا، چند لمحے بعد اتنی ہی تیزی سے میں اس کی طرف بڑھا تھا اور یقیناً یہ اس کے لیے غیر متوقع صورت حال ہی رہی ہوگی اسی لیے تو وہ میری تلوار کی ضرب سے نہ بچ سکا تھا۔ میری تلوار اس کا شانہ کاٹتی ہوئی دھنستی چلی گئی، اور پھر میں نے ایک جھٹکے سے تلوار کھینچ لی۔ اس کے منہ سے بڑی بھیانک چیخ بلند ہوئی تھی۔ ضرب پڑتے ہی تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی تھی کیونکہ میں نے اس کے دائیں شانے ہی کو نشانہ بنایا تھا۔ اس کے شانے سے خون کی دھار بہنے لگی تھی، پھر وہ اوندھے منہ زمین پر آرہا تھا۔

اس تمام ہنگامے کے دوران میں پاگل قیدی بالکل خاموش رہا تھا مگر جب میں تہ خانے سے فرار ہو رہا تھا تو وہ ایک دم چیخ پڑا۔

"ٹھہر جا، ٹھہر جا اے خلیفہ! مجھے یوں تنہا چھوڑ کر نہ جا ورنہ میں تیری یاد میں بہت ہنسوں گا۔"

اور پھر جب میں نے اس کی بکواس پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا تو وہ واقعی زور زور سے ہنسنے لگا تھا۔ مجھے خطرہ صرف یہ تھا کہ اس عمارت میں موجود مزید افراد کہیں اس پاگل کی چیخ و پکار سن کر وہاں نہ آجائیں کیونکہ تہ خانے کا راستہ بند کرنے کے لیے جو پتھر کی سل رکھی جاتی تھی وہ اس وقت ہٹی ہوئی تھی۔ تہ خانے کی آوازیں باہر سنائی دے سکتی تھیں۔

جب میں تہ خانے سے فرار ہو رہا تھا تو میرے ذہن میں کوئی لائحہ عمل نہیں تھا کہ وہاں سے فرار ہو کر کہاں اور کیسے جاؤں گا اس وقت تو میرے ذہن میں صرف یہ تھا کہ کسی طرح اس عمارت سے نکل جاؤں۔

میں تہ خانے سے نکل کر اوپری کمرے میں پہنچ گیا۔ خون آلود تلوار اب تک میرے ہاتھ میں تھی۔ مجھے کسی بھی لمحے کوئی خطرہ پیش آسکتا تھا۔ میں اپنے دشمنوں کے بارے میں یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ میرے ہاتھ قتل ہوچکے تھے یا شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہوگئے تھے۔ زخمی ہونے کی صورت میں یہ امکان تھا کہ انہیں جب ہوش آتا تو وہ میرے فرار کے بارے میں اپنے دوسرے ساتھیوں کو مطلع کر دیتے اور پھر مجھے دوبارہ پکڑنے یا گھیرنے کی کوشش کی جاتی۔ میں نے اس امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پتھر کی سل کو اٹھانا چاہا جس کے ذریعے تہ خانے کا راستہ بند کیا جاسکتا تھا۔ اس سل کو ان دونوں نے مل کر اٹھایا تھا کیونکہ وہ بہت وزنی تھی، لیکن اس وقت میں اتنے جوش میں تھا کہ تنہا ہی زور لگا کر سل اٹھائی، پھر اسے وہاں رکھنے میں کامیاب ہوگیا جہاں رکھا جانا تھا۔ اس کوشش میں میرا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا۔

پھر اسے میری خوش قسمتی ہی کہا جاسکتا ہے کہ مجھے اس عمارت میں کوئی نہیں ملا تھا۔ عمارت بالکل خالی پڑی ہوئی تھی۔ اس بات کا احساس مجھے کچھ دیر بعد ہی

ہو گیا تھا۔ یہ یقین ہونے کے بعد کہ عمارت کے اوپری حصے میں کوئی نہیں، مجھے اپنے گھوڑے کی تلاش ہوئی۔ میرا تمام ضروری سامان اسی پر بندھا ہوا تھا۔

کچھ دیر کی تلاش و جستجو کے بعد میں عمارت کی پشت پر بنے ہوئے ایک چھوٹے سے اصطبل تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ وہاں تین گھوڑے اور بھی بندھے ہوئے تھے مگر مجھے اپنا گھوڑا پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اصطبل کی ایک طاق میں چراغ جل رہا تھا اور اس کا دروازہ مجھے کھلا ہوا ہی ملا تھا۔ چراغ کی روشنی اصطبل کے باہر تک پہنچ رہی تھی۔ اندھیرے میں وہ روشنی کی ننھی سی کرن مجھے دور ہی سے دکھائی دے گئی تھی۔

اس عمارت کے گرد چار دیواری نہیں تھی بلکہ اطراف میں کھجور کے پیڑ لگے ہوئے تھے جنہوں نے عمارت کو تقریباً "چھپا رکھا تھا۔

اصطبل سے اپنا گھوڑا نکالتے ہی میں اس پر سوار ہو گیا تھا اور میں نے عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف جانے کی بجائے فرار کے لیے پچھلی سمت اختیار کی تھی۔

میں گھوڑا دوڑاتا ہوا درختوں کے درمیان سے نکلا، پھر کچھ دور نکل کر اطراف کا جائزہ لیا۔ محلہ رصافہ کی آبادی دائیں جانب نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنے گھوڑے کا رخ ادھر ہی کر دیا۔

جو لوگ مجھے دھوکا دے کر وہاں تک لائے تھے، میں ان کے بارے میں اس سے زیادہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ میرے باپ شعبان لطفی کے دشمن ہو سکتے تھے۔ اسی کے ساتھ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ لوگ بہت سفاک و بے رحم تھے، اس قدر سفاک کہ انہوں نے ایک شخص پر تشدد کر کے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ نہ جانے وہ شخص کون تھا اور وہ لوگ اس سے کیا معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس پاگل کے بے سروپا جملوں سے میں نے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی تعلق خلیفہ سے ضرور تھا ورنہ اس کی زبان پر بار بار خلیفہ کا نام نہ آتا۔

جو حالات مجھے پیش آئے تھے، ان کی روشنی میں اب میرے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے اجنبی دشمنوں سے بچنے کے لیے کوئی محفوظ پناہ گاہ تلاش کرتا۔ اگر میں یونہی مارا مارا پھرتا تو آج نہیں کل میرے دشمن پھر مجھ پر حاوی ہو جاتے۔ وقتی طور پر میں ان کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب تو ضرور ہو گیا تھا لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب دوبارہ مجھے ڈھونڈ لیتے۔ دوبارہ ان کے ہتھے چڑھنے کا مطلب یہی ہوتا کہ میں پھر ان کے چنگل سے نہ نکل پاتا۔ اب وہ یقیناً" یہ جان جائیں گے کہ میری طرف سے ذرا سی بھی بے احتیاطی یا لاپروائی انہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ مجھ سے اپنے ان ساتھیوں کا انتقام بھی لے سکتے تھے جو میرے ہاتھوں یا تو شدید زخمی ہو چکے تھے یا ہلاک ہو گئے تھے۔

ان کی کسی عبادت گاہ میں پناہ لینے کا مطلب یہ ہوتا کہ میں خود ان کے جال میں پھنس جاتا۔ یہ بات بہرحال ان کے علم میں بھی ہو گی کہ ایک اجنبی مسافر کی پناہ گاہ کوئی عبادت گاہ ہی ہو سکتی ہے۔ اس طرح وہ بہت جلد مجھے تلاش کر لیتے۔ اس شہر میں کوئی سرائے ڈھونڈ کر وہاں چھپنا بھی میری نظر میں غیر محفوظ ہی تھا۔ اپنی حفاظت سے قطع نظر میرے ذہن میں یہ خیال بھی بار بار گردش کر رہا تھا کہ مجھے اس شہر میں جلد از جلد اپنے باپ کو تلاش کرنا تھا۔ موجودہ حالات ایسے نہیں تھے کہ میں اپنے باپ کو تلاش کر سکتا۔

میں سوچتا رہا اور میرا گھوڑا رصافہ کی آبادی سے نکل کر شہر کی گھنی آبادی کی طرف دوڑتا رہا۔

جب میں شہر کی گھنی آبادی میں داخل ہوا تو میرا ذہن آخر کار ایک نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس سے بہتر اور محفوظ راہ کوئی دوسری نہیں تھی۔ اس طرح میں اپنے اجنبی دشمنوں کی دسترس سے بھی نکل جاتا اور اپنے باپ کی تلاش کے سلسلے میں بھی کچھ کر سکتا۔

خلیفہ کا محل میرے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ہو سکتا تھا اور میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہیں جاؤں۔ میں

برقائی خاں کے قاصد کی حیثیت سے وہاں جا سکتا تھا۔ میرے پاس شہباز کی وہ لوح موجود تھی جو صرف شاہی قاصدوں کے پاس ہوتی تھی۔ میں وہ لوح' خلیفہ کو دکھا کر یہ کہہ سکتا تھا کہ مجھے برقائی خاں نے بھیجا ہے۔ میں خلیفہ کو برقائی خاں کا کوئی فرضی اور زبانی پیغام دے سکتا تھا مگر یہ پیغام بہرحال وہ نہ ہوتا جو میں نے ہلاکو خاں کو بتایا تھا۔ میں خلیفہ کو یہ پیغام دینے کی بجائے کہ وہ اپنا مسلح اردو' برقائی خاں کے پاس بھیج دے' اسے کوئی اور ہی پیغام پہنچاتا جس کے بارے میں مجھے کوئی تردد نہ ہوتا۔ میں اس فرضی اور زبانی پیغام کے بارے میں بھی سوچ چکا تھا۔

برقائی خان کا قاصد ہونے کی حیثیت سے مجھے خلیفہ کی جانب سے تحفظ مل سکتا تھا۔ میں اس سے واضح طور پر کہہ سکتا تھا کہ کچھ لوگ میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ وہ اجنبی لوگ غالباً" یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں خلیفہ تک پہنچ سکوں۔ اس صورت میں یقیناً" خلیفہ حفاظت کا معقول بندوبست کر دیتا۔ ان باتوں کے علاوہ بھی میرے ذہن میں بہت کچھ تھا جو مجھے خلیفہ سے کہنا تھا۔

مجھے علم تھا کہ قاصدوں کے معاملے میں وقت کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ وہ کسی بھی وقت پیغام لے کر پہنچ سکتے ہیں اس لیے رات کے وقت محل کا رخ کرتے ہوئے مجھے کوئی فکر لاحق نہیں تھی۔

خلیفہ کے محل تک پہنچنے کا آسان راستہ مجھے معلوم تھا۔ مجھے شہر کے مشرقی حصے کے آخری دروازہ باب البصیلہ تک پہنچنا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں با آسانی خلیفہ کے محل تک جا سکتا تھا کیونکہ خلیفہ کا محل باب البصیلہ کے قریب ہی تھا۔

شہر کے بارونق بازار اب بند ہو چکے تھے مگر راہگیر اب بھی ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا شہر کے مشرقی حصے کے گویا کنارے کنارے بڑھا چلا جا رہا تھا۔

پھر وہ وقت آ ہی گیا جب میں باب البصیلہ تک پہنچ گیا۔ میری دائیں جانب باب البصیلہ تھا' ایک بڑا سا دروازہ جو اب اندر سے بند کیا جا چکا تھا۔ دروازے کے سامنے مسلح پہریدار نظر آ رہے تھے۔ پہریدار غالباً" دروازے کی بیرونی سمت میں بھی رہے ہوں گے تاکہ رات کے وقت کوئی شہر میں داخل ہو تو ضروری پوچھ گچھ کے بعد اسے شہر میں آنے دیا جائے۔ میں صبح پہریداروں سے کچھ فاصلے پر تھا اور میرے گھوڑے کا رخ سامنے نظر آنے والے عظیم الشان محل کی طرف تھا۔ نہ ان پہریداروں نے مجھے روکا اور نہ میں نے ہی ان کے قریب جا کر کوئی بات کی۔ میں سیدھا محل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

رات کے وقت محل کے باہر بھی روشنی کا معقول بندوبست تھا۔ مجھے دور ہی سے روشنی نظر آنے لگی تھی۔ میں اسی روشنی کی سیدھ میں بڑھتا رہا۔

ابھی میں محل کے دروازے تک نہ پہنچ سکا تھا کہ نہ جانے کدھر سے مسلح گھوڑ سواروں کا دستہ آیا اور اس نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ یہ واقعہ میرے لیے خلاف توقع تھا اس لیے میرا گھبرا جانا لازمی تھا مگر میں نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کون لوگ ہو سکتے تھے۔

گھوڑ سوار دستے کا ایک مسلح وردی پوش اپنا گھوڑا بڑھا کر میرے قریب پہنچ گیا' پھر اس نے بھاری گونجدار آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

"تم کون ہو اور محل کی طرف کیوں جا رہے ہو؟"

اس نے غالباً" ابھی میرے لباس پر توجہ نہیں دی تھی۔

"میں قاصد ہوں اور خلیفہ کے لیے ایک اہم پیغام لے کر آیا ہوں۔" میں نے بے جھجک عربی زبان میں جواب دیا۔

شاید میرا لہجہ سن کر ہی وہ چونکا تھا کیونکہ بہرحال میرا لہجہ عربی نہیں تھا۔ پھر اس نے مجھے بغور دیکھا تھا۔ اب اس کی نگاہ میرا پورا جائزہ لے رہی تھی۔

"تم لباس سے منگول معلوم ہوتے ہو!" اس نے کہا۔ "مگر۔۔۔ مگر تم عربی زبان کیسے جانتے ہو؟"

"عربی زبان سیکھنا شاید کوئی جرم نہیں۔" میں نے

چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں اب پوری طرح اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا اور مجھے علم تھا کہ وہ لوگ مجھے روکنے کے مجاز نہیں تھے۔

میرے لہجے کی چبھن شاید اس شخص نے بھی محسوس کرلی۔ وہ سخت اور کھردرے سے لہجے میں بولا۔ "فضول باتوں سے گریز کرو اور یہ نہ بھولو کہ تم اس وقت خلیفہ بغداد کے خصوصی محافظ دستے کے نگراں سے مخاطب ہو۔"

یہ عین ممکن تھا کہ وہ شخص مجھے رعب میں لینے کے لیے خود کو خلیفہ کے خصوصی محافظ دستے کا نگراں ظاہر کررہا ہو۔ میں نے اس کے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے مطمئن لہجے میں کہا۔ "تم میرا وقت ضائع نہ کرو اور مجھے آگے جانے دو!"

"میں اس وقت تک تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا جب تک تم اس بات کا ثبوت پیش نہیں کردو گے کہ تم واقعی قاصد ہی ہو۔" اس وردی پوش نے بدستور سخت لہجے میں جواب دیا۔

شہباز کی لوح دائیں جانب لٹکتے ہوئے چمڑے کے ایک تھیلے میں محفوظ تھی۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ وردی پوش جو کہہ رہا تھا، وہی کرے گا۔ یوں بھی محافظ دستے سے متعلق ہونے کے سبب اس کا یہ فرض تھا کہ میری جانب سے مطمئن ہونے کے بعد ہی مجھے محل کی طرف جانے دیتا۔ میں یہ سوچ کر گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے دائیں جانب جھکا اور پھر میں نے لوح نکال کر اسے تھمادی۔

لوح کو اس نے بغور دیکھا اور اس دوران میں اس کے چہرے پر موجود تاثرات بدل گئے۔ اس نے مجھے لوح واپس کردی۔ مجھے علم نہیں کہ اس نے پہلے بھی ویسی کوئی لوح دیکھی تھی یا نہیں لیکن اس کے بعد وہ نرم پڑگیا۔ اس نے نسبتاً نرم لہجے میں مجھ سے کہا۔ "چلو! میں خود تمہیں لے کر محل میں چلوں گا اور وہاں تمہیں متعلقہ افراد کے سپرد کرکے لوٹ آؤں گا۔"

پھر بقیہ کارروائیوں سے گزرنے میں کوئی خاص قباحت نہیں ہوئی۔ مجھے محل کے اندر ایک عالیشان کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں وہاں انتظار کروں۔ خلیفہ کو میری آمد سے مطلع کردیا جائے گا اور جب وہ چاہے گا مجھے طلب کرلے گا۔

شہباز کی لوح اب بھی میرے پاس تھی تاکہ میں اسے خلیفہ کو دکھا کر یہ یقین دلا سکوں کہ میں برقائی خاں کا قاصد ہوں۔ میرے گھوڑے کو اصطبل میں پہنچا دیا گیا تھا اور بقیہ سازوسامان لاکر اسی کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔

مجھے انتظار کرتے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بہترین لباس زیب تن کیے ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے خود کو خلیفہ کا خادم خاص بتایا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

میں خلیفہ کے خادم خاص کی رہنمائی میں محل کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں حیرت سے اس محل کے دروبام دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ بلاشبہہ میں نے اب تک اتنا عظیم الشان اور حسین محل نہیں دیکھا تھا۔ وہ محل حسن وخوب صورتی کا شاہکار تھا۔

محل کے اندر جو لوگ ادھر ادھر آجارہے تھے، ان کے جسموں پر بھی بہترین ریشمی لباس تھے، ایسے لباس میں نے صرف خاندان زریں کے نویانوں (شہزادوں) کو پہنے ہوئے دیکھا تھا۔

خلیفہ کا خادم خاص مختلف چھوٹی بڑی راہداریوں سے گزرتا رہا اور میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر وہ محل کے ایک ایسے حصے میں داخل ہوا جہاں مسلح پہریدار قدم قدم پر موجود تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اب محل کا وہ حصہ شروع ہوچکا ہے جس سے گزر کر خلیفہ کے پاس پہنچا جا سکتا ہے۔ کچھ اسی سے ملتے جلتے انتظامات میں نے منگولوں کے یہاں بھی دیکھے تھے مگر خلیفہ کی شان ہی اور تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب اس کے خادموں کے جسموں پر نویانوں جیسے لباس ہیں تو وہ خود کس لباس میں ہوگا۔ یقیناً اس کا لباس اور بھی شاندار ہوگا۔

خادم مجھے لے کر ایک بڑے سے دروازے کے سامنے رک گیا، جہاں بہت سے مسلح محافظ نظر آرہے

تھے۔ وہ محافظ دروازے کی دائیں اور بائیں جانب بالکل اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے گوشت و پوست کی بجائے پتھر کے ہوں۔ وہ اس طرح تنے کھڑے ہوئے تھے جیسے حرکت ہی نہ کریں گے لیکن جب خلیفہ کا خادم خاص ان کے بالکل قریب پہنچ گیا تو ایک دم ان کے جسم حرکت میں آگئے انہوں نے بہت تیزی کے ساتھ میری تلاشی لی اور تلوار وہیں چھوڑ دینے کے لیے کہا۔ میں نے تلوار کھول کر انہیں دے دی۔ یہ تلوار میرے دشمنوں میں سے ایک کی تھی کیونکہ انہوں نے مجھے پہلے ہی غیر مسلح کر دیا تھا اور میرے تمام ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا تھا جن میں خنجر بھی تھے اور تیر و ترکش وغیرہ بھی! میرے پاس اس تلوار کے سوا کوئی اور ہتھیار نہیں تھا۔ محافظوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جب میں خلیفہ سے ملاقات کر کے باہر آؤں گا تو میری تلوار مجھے واپس کر دی جائے گی۔ اس تلوار کی نیام نہیں تھی اور میں نے اسے یوں ہی اپنی کمر کی پیٹی سے باندھ لیا تھا۔

محافظ میری تلاشی لیتے رہے اور خلیفہ کا خادم اس دروازے سے اندر چلا گیا۔ تلاشی لینے کے بعد انہوں نے مجھے ایک طرف کھڑا ہو جانے کے لیے کہہ دیا تھا اور میں وہاں کھڑا ہوا اپنی طلبی کا منتظر تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں شہباز کی لوح اور دوسرا ہاتھ خالی تھا۔

کچھ دیر بعد ہی خلیفہ کا خادم خاص دروازے سے باہر آیا اور مجھے اپنے ہمراہ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل سے اس کے پیچھے ہو لیا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ اس دروازے سے اندر جاتے ہی خلیفہ کا سامنا ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ ایک طویل اور لمبا سا دالان تھا جس کی دونوں دیواروں کے قریب مسلح محافظ، پتھر کے مجسموں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں نظر آ رہی تھیں۔

اس طویل دالان کا اختتام بھی ایک چھوٹے سے دروازے پر ہوا مگر وہ دروازہ اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ جھک کر گزرنا پڑا۔ اب میری سمجھ میں آگیا تھا کہ خلیفہ کے خادم خاص کو واپسی میں کیوں دیر ہوئی تھی۔

وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ خلیفہ کا خادم خاص مجھ سے وہیں رکنے کے لیے کہہ کر اندر چلا گیا اور پھر مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ "حضور کا حکم ہو تو اس قاصد کو حاضر کیا جائے!"

جواب میں ایک بھاری سی آواز ابھری۔ "اجازت ہے۔"

پھر خادم الٹے قدموں دروازے سے نکلا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم اندر جا سکتے ہو۔"

میں نے قدم اٹھائے اور پھر جیسے ہی اندر پہنچا، لطیف خوشبو سی محسوس کی، کمرے کی چھت سے خوب صورت فانوس لٹکا ہوا تھا اور سامنے ہی بڑی سی مسند پر خلیفہ بغداد تخت نشین تھا، وہ گاؤ تکیے پر کہنی ٹیکے نیم دراز تھا اور دو حسین عورتیں تخت کے پیچھے کھڑی ہوئی اسے پنکھا جھل رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایک شخص اور بھی موجود تھا جو تخت کی بائیں جانب مودب کھڑا ہوا تھا لیکن اس وقت میری تمام تر توجہ خلیفہ پر تھی۔

خلیفہ زرنگار سفید قبا پہنے ہوئے تھا جو اس کے سرخ و سفید رنگ پر بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے سر پر زریں ٹوپی تھی جس پر بیش قیمت سمور کے قسم کا سیاہ اونی حاشیہ تھا اس کی داڑھی کے بال چھوٹے اور سرخ تھے۔ وہ معتدل القامت تھا اور اس کی عمر تقریباً" ساڑھے تین درجن سال معلوم ہوتی تھی۔ اس کی وضع ایسی تھی کہ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ اس کے سامنے کس طرح احترام و عقیدت کا اظہار کروں اور مجھے اس سلسلے میں کسی نے کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں نے منگولوں کے طریق آداب ہی کو اپنا لیا۔ میں اس کے تخت کے سامنے پہنچا اور اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی پیٹی کھول کر سر جھکا دیا۔ میرے سر پر سمور کی ٹوپی نہیں تھی ورنہ اسے بھی اتار دیتا۔ میری

ٹوپی اسی تہ خانے میں اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے وقت کہیں گر گئی تھی جہاں میں قید تھا۔ فرار ہوتے وقت مجھے اتنا ہوش نہیں تھا کہ اسے تلاش کر سکتا۔

میں اسے ادب دے کر سیدھا کھڑا ہوا تو دیکھا کہ اس کی نگاہ میرے ہی چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

"ہمارے علم میں لایا گیا ہے نوجوان کہ تم کوئی اہم پیغام لے کر ہم تک پہنچے ہو۔" خلیفہ کی آواز گونجی۔ "اور ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تم ہماری زبان بھی بولنے کے اہل ہو۔ ہم یہ جان کر خوش ہوئے کہ ہماری زبان دشت کے دور دراز علاقوں تک پھیل چکی ہے۔ بتاؤ کہ تم کس کی طرف سے آئے اور کیا پیغام لائے ہو؟"

"مجھے حضور کے پاس مغربی دشت کے موجود آقا برقائی خاں نے بھیجا ہے۔" میں نے ادب سے جھک کر کہا۔

"تمہیں برقائی خاں نے ہمارے پاس بھیجا ہے؟" خلیفہ کے لہجے سے حیرت کا اظہار ہوا جس کا سبب میں نہیں سمجھ سکا کیونکہ میرے نزدیک یہ بات کوئی قابل حیرت نہیں تھی۔

"خادم اسی کے پاس سے آیا ہے۔" میں نے تصدیق کی۔

"حیرت ہے۔" خلیفہ دھیمی آواز میں بولا، پھر کہا۔ "وہ پیغام ہمیں دے دو!"

میں نے خلیفہ کی بات سے نتیجہ اخذ کیا کہ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا، میرے پاس کوئی تحریری پیغام ہے۔ یہ سوچ کر میں بولا۔ "اے مسلمانوں کے خلیفہ! پیغام تحریری نہیں، زبانی ہے۔"

"زبانی پیغام!" اس کے لہجے سے پھر حیرت ظاہر ہوئی۔ "مگر ابھی دو روز قبل ہی تو برقائی خاں نے یہ تحریری پیغام بھیجا تھا کہ زبانی پیغام کو....." خلیفہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رک گیا، پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "تو پھر بیان کرو کہ اس نے کیا پیغام بھیجا ہے؟"

"اے مسلمانوں کے خلیفہ! اس نے کہلوایا ہے کہ ہلاکو خاں اس سے شکست کھانے کے بعد اب تیزی کے ساتھ بغداد کی طرف بڑھنے والا ہے۔ اس کے ساتھ اب بہت بڑا اولوس ہے کیونکہ منگول سردار بائیدو بھی اپنا اردو لے کر اس سے آملا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایک بار پھر ہلاکو خاں سے ٹکرا جاتا اور اس کی طاقت توڑ دیتا۔ اس نے کہلوایا ہے کہ وہ امید کرتا ہے، بغداد میں ہلاکو خاں کو منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔" میں نے وہ پیغام سنا دیا جو خود میرے ذہن کی پیداوار تھا، پھر میں خاموشی سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا پیغام ختم ہو گیا اور تمہیں مزید کچھ نہیں کہنا؟" خلیفہ کی بھاری آواز سن کر میں نے سر اٹھایا۔

"ہاں اے مسلمانوں کے قابل احترام خلیفہ! پیغام کا ایک حصہ ختم ہو گیا مگر ابھی مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے توقف کیا تاکہ خود کو وہ بات کہنے کے لیے آمادہ کر سکوں جو میرے لیے بہت اہم تھی۔

توقف کے دوران میں خلیفہ بول اٹھا۔ "آگے کہو! تم چپ کیوں ہو گئے!"

"برقائی خاں نے کہلوایا ہے کہ اسے ایک عرب تاجر شعبان لطفی کی تلاش ہے جو یہاں بغداد میں ہے۔ اس نے کہلوایا ہے کہ شعبان لطفی کو تلاش کر کے میرے ہمراہ اس کے پاس فوراً ہی بھیج دیا جائے۔" آخر میری زبان پر وہ بات آ ہی گئی جسے کہنے کے لیے اتنی دیر سے ہمت کر رہا تھا۔

جس وقت میں نے اپنی بات ختم کی تھی، خلیفہ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس وقت واضح طور پر خلیفہ کو چونکتے دیکھا تھا جب میری زبان پر اپنے باپ کا نام آیا تھا۔

"برقائی خاں نے شعبان لطفی کو بلایا ہے مگر وہ تو اس کے....." خلیفہ ایک بار پھر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس وقت خلیفہ نے عجیب سی نگاہ سے میری طرف دیکھا تھا۔ اس کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا تھا اور ماتھے پر موجود شکنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ میرے بجائے وہاں موجود دوسرے شخص سے مخاطب ہوا جو اس دوران میں

قطعی خاموش رہا تھا۔ "اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے ابن العلقمی؟"

میں خلیفہ کی زبان سے یہ جملہ سن کر حیران سا رہ گیا۔ آخر وہ شخص جسے خلیفہ نے ابن العلقمی کہہ کر مخاطب کیا تھا' میرے باپ کے سلسلے میں کیا اظہار خیال کر سکتا تھا؟ پھر خلیفہ نے اس کا خیال کیوں دریافت کیا تھا؟ میرے ذہن میں پے در پے سوالات ابھرے۔ اسی کے ساتھ میری نگاہ اس شخص کی طرف اٹھ گئی جو کچھ کہنے ہی والا تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا تھا جس پر بڑی سی داڑھی تھی۔ اس داڑھی نے اس کے چہرے کو مزید لمبوترا بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور گول تھیں اور ان میں بلا کی چمک تھی۔ فاصلے کے باوجود بھی میں نے اس کی آنکھوں کی چمک محسوس کر لی تھی۔

"حضور ہی بہتر جان سکتے ہیں کہ یہ معاملہ کیا ہے۔" میں نے پہلی بار ابن العلقمی کی آواز سنی۔ اس کی آواز اس کی شخصیت کا حصہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ اکہرے جسم کا شخص تھا لیکن اس کی آواز بڑی بارعب اور پاٹ دار تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "جہاں تک خادم کو علم ہے' برقائی خاں کو اس نام کے بارے میں خبر نہیں ہونی چاہیے۔"

"ہمارا خود بھی یہی خیال تھا۔" خلیفہ نے ابن العلقمی کے خاموش ہوتے ہی کہا۔ "لیکن ہم حیران ہیں کہ اگر برقائی خاں اس نام سے واقف نہیں ہو سکتا تو پھر اس نے قاصد کے ذریعے یہ پیغام کیوں بھیجا!"

"حضور اجازت مرحمت فرمائیں تو کچھ عرض کروں۔" ابن العلقمی میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"اجازت ہے۔" خلیفہ نے کہا۔

"حضور کے خادم کو اس قاصد پر شک ہے۔" ابن العلقمی کی بات سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بغیر رکے کہے جا رہا تھا۔ "حضور کو یاد ہو گا کہ ابھی دو دن قبل ہی برقائی خاں کا ایک قاصد تحریری پیغام لے کر آیا تھا جس میں اس نے واضح طور پر یہ تحریر کیا تھا کہ آئندہ صرف اس کے ان تحریری پیغامات کو اصل سمجھا جائے جن پر اس کی خاص مہر ہو۔ اس سلسلے میں اس نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ اس کا دشمن بھی وہ لوحیں استعمال کر سکتا ہے جو صرف شاہی قاصدوں کو دی جاتی ہیں کیونکہ اس کے دشمن اور اس کی لوحیں فی الحال ایک جیسی ہیں' اس لیے دشمن کوئی دھوکا دے سکتا ہے۔ برقائی خان کے اس پیغام کی روشنی میں یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے حضور کہ یہ قاصد اس کا بھیجا ہوا نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر یہ کہ جو باتیں برقائی خاں نے اس تحریری پیغام میں رقم کی تھیں' تقریباً" وہی باتیں اس قاصد نے کی ہیں' ایسی عورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے حضور! اگر یہ قاصد اپنے قول میں سچا ہے کہ اسے برقائی خاں ہی نے بھیجا ہے تو اس کے یہاں بھیجے جانے کا مقصد کیا ہے؟ برقائی خاں نے وہی باتیں زبانی پیغام کے ذریعے بھی کیوں کہلوائیں جن سے وہ پہلے ہی اپنے تحریری پیغام میں ہمیں آگاہ کر چکا تھا؟" یہ کہہ کر ابن العلقمی خاموش ہو گیا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ برقائی خاں نے یہ قدم احتیاطاً" اٹھایا ہو کہ اگر ایک قاصد کسی وجہ سے بروقت یہاں نہ پہنچ سکے تو دوسرے قاصد کے ذریعے ہمیں اس کا پیغام مل جائے!" خلیفہ نے خیال آرائی کی۔

"حضور نے جیسا فرمایا ویسا ممکن تھا مگر اس صورت میں اس قاصد کے پاس بھی تحریری پیغام ہوتا اور دونوں پیغامات لفظ بہ لفظ یکساں ہوتے۔ اس کے علاوہ یہ کہ حضور' شعبان لطفی کا معاملہ کس خانے میں رکھیں گے!"

خلیفہ کچھ دیر خاموش رہا' پھر بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ معاملہ کچھ پراسرار معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً" اس ضمن میں شعبان لطفی کا ذکر بہت معنی خیز ہے۔ ہمارے خیال میں اس قاصد کو حراست میں لے لینا چاہیے۔ جب تک اس راز سے پردہ نہ اٹھ جائے کہ اصل معاملہ کیا ہے' اسے حراست میں رکھا جائے اور اسی وقت ایک قاصد کو موصل روانہ کر دیا جائے کیونکہ وہی اس کا اہل ہے کہ اس راز سے پردہ اٹھا

سکے۔ تم غالباً" میرا مطلب سمجھ چکے ہو گے۔"

"حضور نے بجا فرمایا۔ خادم، حضور کا اشارہ سمجھ گیا۔" ابن العلقمی سر جھکا کر بولا۔

اور پھر چند لمحے بعد ہی میں مسلح محافظوں کے نرغے میں تھا۔ جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا تھا، اس پر میں سخت حیران تھا، اتنا حیران کہ میں اس وقت عالم حیرت سے نکلا جب مسلح محافظ مجھے خلیفہ کے سامنے سے گھسیٹ کر وہاں سے باہر لے گئے۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں وہاں گرفتار کر لیا جاؤں گا۔

محافظوں نے مجھے محل ہی سے ملحق ایک زنداں میں ڈال دیا۔ مجھے زنجیریں پہنا دی گئیں اور زندان کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ وہ ایک تاریک سی کوٹھری تھی۔ وہاں قریب قریب اور بھی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جن میں سے کچھ آباد بھی تھیں۔ جب مسلح محافظ مجھے لے کر اس کوٹھری تک آ رہے تھے تو میں نے کچھ کوٹھریوں کی آہنی سلاخوں سے اجنبی چہروں کو جھانکتے دیکھا تھا۔ وہ ایک طویل سی راہداری تھی جس کی دونوں طرف کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ راہداری کے ایک سرے پر صرف ایک ہی مشعل روشن تھی جس کی روشنی ناکافی تھی۔ مجھے جس کوٹھری میں قید کیا گیا تھا، وہاں تک مشعل کی روشنی بالکل نہیں پہنچ رہی تھی۔

مسلح محافظ چلے گئے تو میں کوٹھری کے پختہ فرش پر بیٹھ گیا۔ لمحے بھر کے لیے زنداں میں میری زنجیروں کی جھنکار گونجی اور پھر سناٹا چھا گیا۔

اول تو یہی ممکن تھا کہ میں مسلح محافظوں پر حملہ کر دیتا اور اس طرح وہاں سے فرار کی کوشش کرتا۔ ایک تو ان کی تعداد کافی تھی، دوسرے یہ کہ میں نہتا تھا۔ اگر میں کوئی ایسی کوشش بھی کرتا تو اس کا مطلب خودکشی ہی ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ کہ اگر میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس توقع پر یہ قدم اٹھا لیتا کہ ان میں سے کسی محافظ کی تلوار چھیننے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو پھر میرا محل سے فرار ہونا قطعی ناممکن تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہاں قدم قدم پر مسلح محافظ دیکھے تھے۔ ان کی موجودگی میں میرا زندہ بچ کر نکل جانا ممکنات میں سے نہیں تھا۔ یہی سوچ کر میں نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں خلیفہ اور اس کے پاس موجود شخص ابن العلقمی کے درمیان ہونے والی گفتگو سے یہ تو سمجھ ہی چکا تھا کہ مجھ سے دو روز قبل برقائی خاں کا کوئی قاصد، پیغام لے کر آیا تھا اور وہ پیغام تحریری تھا جس میں برقائی خاں نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے دشمن کی متوقع چال کو ناکام بنا دیا تھا لیکن اس کی یہی ذہانت میرے حق میں مضر ثابت ہوئی تھی۔ اگر برقائی خاں کا وہ قاصد مجھ سے پہلے نہ پہنچ گیا ہوتا تو شاید میرے ساتھ وہ پیش نہ آتا جو پیش آ چکا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ خلیفہ اور وہ شخص جو خلیفہ ہی کی سلطنت کا کوئی اہم عہدیدار معلوم ہوتا تھا، دونوں ہی اسے جانتے تھے مگر کس حیثیت سے، یہ سوال الجھا دینے والا تھا۔ اپنے باپ کے سلسلے میں ہونے والی گفتگو سے میں کوئی بھی نتیجہ اخذ نہیں کر سکا تھا۔

معاً" میرے ذہن میں خلیفہ کا وہ جملہ گونجا جس میں اس نے کسی قاصد کو موصل بھیجے جانے کے لیے کہا تھا۔ آخر خلیفہ نے موصل کا نام کیوں لیا تھا اور کس کے بارے میں یہ کہا تھا، وہی اس کا اہل ہے کہ اس راز سے پردہ اٹھا سکے؟ وہ شخصیت کس کی تھی جس سے خلیفہ کو یہ امید وابستہ تھی؟ انہی باتوں پر غور کرتے ہوئے میں ایک دم چونک اٹھا۔ مجھے اپنے اجنبی دشمنوں میں سے ایک کی بات یاد آ گئی تھی۔ اس کی زبان پر بھی موصل کا نام آیا تھا۔ کیا ان دونوں باتوں میں کوئی رشتہ تھا؟ میرے ذہن میں سوالات کی آندھیاں سی چلتی رہیں۔ اب وہ شخصیت میری نظر میں بہت اہم ہو گئی تھی، جو موصل میں تھی، جسے خلیفہ بھی جانتا تھا اور شاید میرے اجنبی دشمن بھی! لیکن ایک امکان یہ بھی تو تھا کہ وہ دو افراد کی شخصیتیں ہوتیں۔ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی ایک ہی شخصیت ہے اور وہ شخصیت، خلیفہ اور میرے اجنبی دشمنوں دونوں ہی کے لیے اہم ہے۔ میں اپنے

اجنبی دشمنوں کو' اپنے باپ شعبان لطفی کا دشمن سمجھا تھا۔ اب مجھے خلیفہ اور اپنے دشمنوں کے درمیان ایک قدر مشترک نظر آئی تو میرا ذہن اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا باپ شاید حکومت وقت کا بھی باغی ہے یا حکومت کی نظر میں وہ معتبر نہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو پھر مجھے حراست میں کیوں لیا جاتا۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر وہ پراسرار شخصیت بھی میرے لیے الجھن کا سبب بنی ہوئی تھی جو یقیناً" موصل میں تھی۔ آخر اس پراسرار شخصیت سے میرے باپ کے معاملے کا کیا تعلق تھا؟ انہی سوالوں کے حصار میں نہ جانے کب میں اونگھنے لگا اور پھر نہ جانے کب کوٹھری کے پختہ فرش پر دراز ہو کر بے خبر سو گیا۔

کوٹھری کا آہنی دروازہ کھلنے کی آواز سے میری نیند ٹوٹ گئی۔ پھر مجھے جیسا سکتہ سا ہو گیا۔ میری نگاہ کوٹھری کے دروازے کی طرف اٹھی تھی۔ مسلح سپاہیوں کے ساتھ کوٹھری میں داخل ہونے والی ایک ایسی ہی شخصیت تھی جسے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک سپاہی کے ہاتھ میں موجود مشعل کی روشنی جس چہرے پر پڑ رہی ہے' وہ چہرہ ابونصار ہی کا ہے۔

غالباً" ابونصار بھی مجھے وہاں اس حال میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ وہ کوٹھری میں داخل ہوتے ہی ایک دم ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

کچھ دیر کو کوٹھری میں سوائے وہاں موجود لوگوں کے سانسوں کے کوئی اور آواز سنائی نہیں دی' پھر اس بوجھل خاموشی کو ابونصار کی آواز ہی نے ختم کیا تھا۔

"بوغا!..... بوغا تو..... تو یہاں!" اس نے کہا تھا اور اس کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

میں جواب میں کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکا تھا۔ دراصل اس اجنبی ماحول اور اجنبی شہر میں اپنے ایک ہمدرد کو دیکھ کر مجھ پر رقت سی طاری ہونے لگی تھی۔ مجھے نہ یہ علم تھا کہ ابونصار' بغداد میں ہے اور نہ مجھے یہ توقع تھی کہ وہ مجھے ان حالات میں مل جائے گا۔

"اس کی زنجیریں کھول دو!" ابونصار نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سپاہیوں کو حکم دیا۔ غالباً" اس نے میرے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو دیکھ لیے تھے۔ سپاہی میری طرف بڑھے تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا مگر اس بار اس نے دشت میں بولی جانے والی زبان استعمال کی تھی۔ "تو ہراساں نہ ہو بوغا! جو کچھ تجھے پیش آیا ہے' وہ غالباً" کسی بڑی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ گھبرا مت! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ابونصار کی بات سن کر میری ڈھارس بندھی۔ وہ بہرحال کوئی معمولی حیثیت کا شخص نہیں تھا جس کا تجربہ مجھے شہر کیف میں بھی ہو چکا تھا اور اس وقت بھی میں ایک ایسے ہی تجربے سے گزر رہا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر سپاہی میری زنجیریں کھولنے کے لیے بڑھ گئے تھے۔ یقیناً" وہاں بھی وہ کسی کم حیثیت میں نہیں رہا ہو گا۔ اس کا پہلا ثبوت تو یہی تھا کہ وہ زنداں کی کوٹھری تک آگیا تھا اور دوسرا ثبوت قید سے میری رہائی کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔

کچھ دیر ہی میں سپاہیوں نے میری زنجیریں کھول دیں اور ابونصار مجھے اپنے ہمراہ لیے زنداں سے نکلا۔ زنداں سے باہر آکر مجھے معلوم ہوا کہ دن نکل چکا تھا۔ ہاں اس زنداں میں دن اور رات کی تمیز کرنا بہرحال مشکل تھا۔ کیونکہ وہاں دن کے وقت بھی تاریکی ہی نظر آرہی تھی۔ اس کا سبب غالباً" یہ تھا کہ وہ زنداں زیر زمیں تھا۔ وہاں شاید کچھ اہم اور خاص قسم کے قیدیوں ہی کو رکھا جاتا ہو گا جن کی غیر معمولی حفاظت مقصود ہوتی ہو گی۔

زنداں سے نکل کر ابونصار نے محل کا رخ کیا۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ مجھے محل کے مغربی حصے میں لے آیا اور پھر وہاں موجود ایک کمرے کے دروازے پر رک کر مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

اس کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ پر ایک بار پھر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مجھے اس کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنے اجنبی دشمنوں کے چہرے نظر آئے تھے۔ وہ دونوں رواحہ اور زبیر ہی تھے جو ابونصار کو

آتا دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں ٹھٹھک کر کمرے کے دروازے ہی پر رک گیا تھا۔

"یہ..... یہ وہی ہے..... وہی ہے یہ۔"

"مجھے علم ہے۔" ابونصار نے رواحہ کی بات کاٹ دی' پھر بولا۔

"اب تم دونوں رصافہ چلے جاؤ اور میرے اگلے حکم کا انتظار کرو!"

حکم! میں نے سوچا اور چکرا کر رہ گیا۔ تو کیا وہ دونوں ابونصار ہی کے آدمی تھے؟

"بوغا! ادھر آجا اور ذہن سے ہر خوف کو جھٹک دے۔" ابونصار میری طرف مڑ کر بولا۔ اسے غالباً" احساس ہو گیا تھا کہ میں کمرے کے دروازے ہی پر رک گیا ہوں۔

رواحہ اور زبیر کمرے سے نکل گئے اور میں اس طرف بڑھا جہاں فرش پر ایک بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا اور جس پر ابونصار بیٹھ چکا تھا۔ ابونصار دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے گاؤ تکیوں میں سے ایک پر کہنی رکھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کمرہ یقیناً" بہترین طور پر آراستہ تھا۔ دریچوں پر چھوٹے چھوٹے ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے مگر وہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں کمرے کی آرائش و زیبائش دیکھنے میں محو ہو جاتا۔ میرے ذہن پر تو پے در پے سوالوں نے یورش کر دی تھی۔ رواحہ اور زبیر کی وہاں موجودگی نے میرے ذہن کو مزید الجھا دیا تھا۔

میں ادب کے ساتھ ابونصار کے قریب بیٹھ گیا کیونکہ میں اس کا احترام کرتا تھا۔ کچھ دیر ابونصار خاموشی سے میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا' پھر معاً" اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ "بوغا! جہاں تک مجھے علم ہے تو مغربی دشت سے قراقرم کے لیے روانہ ہوا تھا' پھر تو کس طرح اور کب دوبارہ وہاں پہنچ گیا اور برقائی خاں کا زبانی پیغام لے کر یہاں آیا؟"

میں اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ ابونصار کے روبرو جھوٹ بولنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ مجھے کئی بار اس کا تجربہ ہو چکا تھا وہ چہرے سے جھوٹ یا سچ کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ میں نے اسی لیے فیصلہ کیا کہ اسے سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔

"اے ابونصار! میں نے خلیفہ سے جھوٹ بولا تھا کہ میں برقائی خاں کی طرف سے آیا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"تجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" ابونصار نے پوچھا مگر اس کا لہجہ نرم تھا۔

"میں کوئی محفوظ پناہ گاہ چاہتا تھا تاکہ میرے اجنبی دشمن مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔" یہ کہتے ہی مجھے رواحہ اور زبیر کا خیال آگیا اور میں نے ابونصار سے پوچھا۔ "وہ دونوں جو ابھی یہاں تھے اے ابونصار! کیا وہ تیرے ہی آدمی تھے؟"

"بوغا! ابھی تو خود کوئی سوال نہ کر!" ابونصار نے کہا۔ "فی الحال میں تجھ سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دے۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کیا' پھر بولا۔ "پہلے یہ بتا کہ شہر کیف سے قراقرم پہنچ کر کیا حالات پیش آئے؟"

میں نے جواب میں اسے مختصراً" قراقرم سے اپنی روانگی کا حال سنا دیا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تو ہلاکو خاں کے لشکر میں تھا جب وہ برقائی خاں سے نبرد آزما ہوا! اور تو نے شیخ الجبل حسن بن صباح کی تباہی بھی دیکھی!" ابونصار بولا۔

"ہاں اے ابونصار! تیرا خیال درست ہے۔" میں نے تائید کی۔

"پھر تو ہلاکو خاں کے لشکر سے جدا ہو کر اس سے پہلے یہاں کیوں پہنچ گیا؟" اس نے بغور میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ غالباً" اپنے سوال کا ردعمل میرے چہرے سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے..... مجھے ایک شخص کی تلاش تھی۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جواب دیا۔

"اور تجھے جس شخص کی تلاش تھی' اس کا نام شعبان لطفی تھا' ایک عرب تاجر!" ابونصار نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

میں جواب میں صرف اپنے سر کو اثباتی حرکت دے سکا مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔

"ایک بات بتا بوغا! بالکل سچ!" اس نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تو کبھی ایران بھی گیا ہے؟"

"نہیں میں کبھی وہاں نہیں گیا مگر..... مگر نہیں..... ہلاکو خاں کا اولوس ادھر سے گزرا تھا۔" میں نے کڑھ کر جواب دیا کیونکہ ابو نصار نے خلاف توقع سوال کیا تھا۔

"میں حال کی نہیں، ماضی کی بات کر رہا ہوں۔" ابو نصار بولا۔ "کیا تو پہلے کبھی وہاں گیا تھا؟"

"نہیں!" میں نے بے جھجک جواب دیا کیونکہ میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ "ہاں میں نے بچپن ہی سے ایران کے قصے سنے تھے، اپنی ماں سے اور اپنی منہ بولی ماں فاطمہ سے!"

میں نے محسوس کیا کہ میری بات سن کر ابو نصار چونکا اور پھر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔ "بوغا!" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "کیا تیری ماں ایرانی النسل تھی؟"

اب میرے خاموش ہونے کی باری تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو اپنے راز میں شریک کروں یا نہیں؟ کیا میں اسے سب کچھ بتا دوں کہ میں کون ہوں؟ میرے خیال میں اسے وہ تمام باتیں تو بتائی ہی جا سکتی ہیں۔ جنہیں دہرانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہاں میں اسے بہرحال یہ کبھی نہ بتاتا کہ میں منگولوں سے انتقام لیتا رہا ہوں اور میں نے ہمیشہ ان کے درمیان نفرت کے بیج بوئے ہیں۔ ابو نصار میری نظر میں وہ حیثیت اختیار کر چکا تھا کہ میں اس سے اپنا دکھ کہہ سکتا تھا اور اسے بتا سکتا تھا کہ مجھے اپنے باپ شعبان لطفی کی تلاش ہے۔ وہ اس سلسلے میں میری بھرپور مدد کر سکتا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر ابو نصار نے کچھ نہیں کہا اور خاموشی کے ساتھ میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد میں نے ہی خود اس کے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔

اس نے میری بات سن کر ایک طویل سانس لیا پھر بولا۔ "تو نے شعبان لطفی کا نام اپنی ماں ہی سے سنا ہو گا۔"

"ہاں اے ابو نصار!" میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "منگولوں نے، وحشی منگولوں نے میری ماں پر اتنا تشدد کیا تھا کہ..... کہ....." میری آواز مزید بھرا گئی اور گلا رندھ گیا جس کے سبب میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا لیکن کچھ دیر بعد ہی میں نے خود پر قابو پا لیا۔ "اس نے میری ماں نے میری ہی آغوش میں دم توڑا تھا اور مرنے سے پہلے..... مگر نہیں تو اس طرح کچھ نہ سمجھ پائے گا۔ میں ابتدا سے بتاتا ہوں۔ پھر میں نے ابو نصار کو وہ دردناک داستان سنا دی جس کے نتیجے میں میری منہ بولی ماں فاطمہ پر جادوگری کا الزام لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا، پھر مجھ پر اور میری ماں پر ظلم توڑے گئے تھے۔ میں اپنی داستان سناتا رہا اور ابو نصار پوری توجہ سے سنتا رہا۔ پھر میں داستان کے آخری حصے پر پہنچا۔ "میری ماں نے اپنی موت سے قبل مجھے جو کچھ بتایا، وہ میرے لیے سوہان روح تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ چنکائی میرا باپ نہیں۔ پھر اس نے بتایا تھا کہ چنکائی اسے ایران سے اغوا کر لایا تھا حالانکہ وہ شادی شدہ تھی اور اس کے وجود میں ایک اور وجود پرورش پا رہا تھا..... اور وہ..... وہ وجود میرا تھا اے ابو نصار! اس نے..... میری ماں نے مرتے وقت مجھے میرے باپ کا نام بتایا تھا، میرا باپ شعبان لطفی، ایک عرب تاجر! وہ غالباً" اس وقت ایران میں نہیں ہو گا جب..... جب وہ منگول چنکائی میری ماں کو اغوا کر کے لایا ہو گا۔"

"تیرا خیال درست ہے بوغا! شعبان لطفی واقعی اس وقت ایران میں نہیں تھا۔" میں چپ ہوا تو ابو نصار کی بھرائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

"مگر تو..... تو..... اسے ابو نصار تو یہ بات کس طرح جانتا ہے؟" میں نے اپنے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا جو نہ جانے کب اپنی داستان سناتے ہوئے میری آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

"اس لیے..... اس لیے کہ میرے بیٹے..... میں.....

میں ہی وہ گنہگار ہوں..... میں..... میں ہی شعبان لطفی ہوں..... میں۔" ابونصار کا گلا رندھ گیا۔ اس نے اپنے دونوں بازو میری طرف اٹھا دیے۔

میں حیرت سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مجھے کچھ دیر اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا کہ میں نے جو کچھ سنا ہے' وہ حقیقت ہے۔ پھر جب مجھے یہ احساس ہوا کہ میرا باپ شعبان لطفی میرے سامنے موجود ہے اور مجھے اپنے سینے سے لگا لینا چاہتا ہے تو میں جیسے ہوش میں آگیا۔ میں اٹھ کر اس کے سینے سے لگ گیا۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے میرے سارے دکھ آنسو بن کر میری آنکھوں میں بہہ رہے ہیں۔

"میرے بچے..... میری جان..... میرے چاند!" میرا باپ شعبان لطفی میرے رخسار چوم رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو میرے چہرے پر گر کر میرے آنسوؤں میں مل رہے تھے۔

نہ جانے کتنی دیر وہ مجھے سینے سے لگا کر روتا رہا اور پھر جب دکھ کی دھند کچھ کم ہوئی تو اس نے میری پیشانی چوم کر مجھے اپنے سینے سے الگ کیا۔

"میں جانتا ہوں میرے بیٹے کہ تیرے ذہن میں بہت سے سوالات گردش کر رہے ہوں گے۔ میں تجھ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا کہ تیرا اور میرا سینہ ایک ہے۔ میرے سینے کے سب راز تیرے سینے میں منتقل ہو جائیں گے۔ میں تجھ سے صرف اتنا کہوں گا میرے بیٹے کہ ان رازوں کو اپنے سینے ہی میں دفن کر لینا کیونکہ یہ تیرے باپ کے راز ہیں' یہ تیرے راز ہیں۔ انہیں اگر تو نے کبھی افشا کیا تو میں تجھ سے خفا ہو جاؤں گا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ کس قدر سخت ہو گیا۔

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ راز کبھی ظاہر نہ ہوں گے۔ پھر میرے باپ نے اپنی پراسرار شخصیت کے سارے پردے ایک ایک کر کے اٹھا دیے۔

دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف ملکوں میں وہ مختلف ناموں سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ کہیں اس کا نام شعبان لطفی ہوتا کہیں ابونصار' کہیں وہ عبداللہ کے نام سے جانا جاتا تو کہیں اسے عمر کہہ کر پکارا جاتا کہیں وہ ابن ثابت ہوتا تو کہیں رشد کے نام سے مشہور ہوتا۔ اس کے اصل نام سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ خود بغداد میں بھی اسے ہشام کہا جاتا تھا مگر اس کا اصل نام حماد تھا۔

وہ خلیفہ بغداد کے خاص الخاص آدمیوں میں سے تھا۔ اس کی حیثیت خلیفہ کے جاسوسوں کے سربراہ کی تھی۔ وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں طرح طرح کے بہروپ بھر کر جاتا تھا' کہیں ایک عرب تاجر کی حیثیت سے اور کہیں مبلغ کی حیثیت سے! لیکن دراصل وہ خلیفہ کا جاسوس ہوتا تھا۔ وہ خلیفہ کے لیے مختلف ملکوں میں جاسوسی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ وہ اپنے عہدے پر عرصہ دراز سے فائز تھا اور اس دوران میں اس نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔

وہ برسوں پہلے ایران بھی خلیفہ کا جاسوس بن کر گیا تھا مگر اس کی ظاہری حیثیت ایک عرب تاجر کی تھی۔ عرب تاجر شعبان لطفی! پھر ایران ہی کے دوران قیام میں اس نے میری ماں سے شادی کر لی۔ وہ اس قدر محتاط اور چوکنا رہتا تھا کہ اس نے اپنی اصل شخصیت کا اظہار میری ماں سے بھی نہیں کیا۔ میری ماں اسے ایک عرب تاجر ہی کی حیثیت سے جانتی رہی۔ ابھی اس کی شادی کو نصف سال ہی ہوا تھا کہ کسی اہم معاملے کو نمٹانے کے لیے اسے واپس بغداد جانا پڑا۔ پھر جب وہ دوبارہ ایران پہنچا تو اس کی دنیا جیسے تاریک ہو گئی۔ اسے پتا چلا کہ میری ماں کو وحشی منگول اٹھا لے گئے۔ اس نے چاہا کہ وہ فوراً" قراقرم جا کر میری ماں کی تلاش کرے مگر اس کے فرائض پاؤں کی زنجیر بن گئے۔ اسے دوبارہ بغداد لوٹنا پڑا۔ پھر اسے عرصہ دراز تک اس کے فرائض نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ دشت کا رخ کر سکتا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ وسیع و عریض دشت میں میری ماں کو تلاش کرنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ اس کی ہمت ٹوٹتی گئی اور پھر وہ دن آیا جب اسے ایک مبلغ کی حیثیت سے دشت میں جانے

موقع ملا۔ اسے خلیفہ کی طرف سے حکم ملا تھا کہ وہ اتوخاں کے بھائی برقائی خان سے ملے اور خلیفہ کی طرف سے بیعت لے کیونکہ برقائی خاں اطلاعات کے مطابق مسلمان ہو چکا تھا۔

مجھے پہلی بار اپنے باپ کی زبان سے یہ بات سن کر حیرت ہوئی کہ برقائی خاں اس کے ہاتھ پر مسلمان نہیں ہوا حالانکہ مشہور یہی تھا۔ غالباً" اس کا سبب اس کی اصل شخصیت کو چھپانا ہو گا۔ میرے باپ نے مجھے اصل حالات سے آگاہ کیا تو میری حیرت دور ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب برقائی خاں' بخارا گیا تھا تو وہاں صوفیائے کرام کے شیخ کبیر نجم الدین کے ایک ساتھی شیخ شمس الدین باخوری سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ برقائی خاں نے انہی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام قبول کیا تھا۔ شیخ موصوف ہی نے برقائی خاں کو خلیفہ بغداد کی اطاعت کرنے پر آمادہ کیا تھا اور اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ خلیفہ سے رابطہ قائم کر کے خلافت کی بیعت کر لے۔ اس کے بعد ہی برقائی خاں نے اپنا ایک خاص قاصد' خلیفہ بغداد کے دربار میں بھیجا تھا جس کے ذریعے اس نے خلیفہ کو اظہار اطاعت کے طور پر بہت سے تحائف بھی بھیجے تھے۔ خلیفہ بغداد نے میرے باپ کو اپنی جانب سے بیعت لینے برقائی خاں کے پاس بھیجا تھا۔ میرے باپ کو عرصہ دراز کے بعد دشت جانے کا موقع ملا تھا۔ سیاسی مصلحتوں اور اپنے فرائض سے قطع نظر اس کے ذہن میں میری ماں کی تلاش کا معاملہ بھی تھا۔ اس نے اسی لیے خلیفہ سے کچھ دن دشت ہی میں گزارنے کی اجازت چاہی اور خلیفہ کی طرف سے اجازت مل گئی۔

دشت پہنچ کر میرے باپ نے پہلے اپنا فرض ادا کیا' یعنی خلیفہ کی طرف سے بیعت لی' پھر وہ ایک مبلغ کی حیثیت اختیار کر کے پورے دشت میں میری ماں کو تلاش کرتا پھرا۔ وہ اسی غرض سے برقائی خاں کے ہمراہ قراقرم بھی گیا مگر وہ بے خبر تھا کہ اس وقت تک میری ماں موت کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

یہ کتنی عجیب بات تھی' کتنی عجیب کہ میرا باپ' میری ماں کو تلاش کرتا پھر رہا تھا اور میں بیشتر مواقع پر اس کے ساتھ ہونے کے باوجود اس بات سے بے خبر رہا کہ وہی میرا باپ ہے۔ جب میرا باپ اپنی طویل اور دکھ بھری داستان سنا چکا تو اس نے پھر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بعد میں وہ ایران آتا جاتا رہا اور اسے وہاں ایک عرب تاجر شعبان لطفی ہی کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا رہا۔ ایران میں وہ کس حیثیت سے مشہور تھا' اس کا علم صرف چند لوگوں کو تھا۔ ان چند افراد میں خلیفہ بغداد مستعصم باللہ' اس کا وزیر ابن العلقمی' رواحہ' زبیر اور میرے باپ کے وہ چند ساتھی تھے جو وقتاً" فوقتاً" اس کے ہمراہ ایران گئے تھے۔

اب میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ بغداد میں مجھے جو واقعات پیش آئے تھے' ان کا سبب کیا تھا۔ کسی اجنبی کی زبان سے ایک عرب تاجر شعبان لطفی کا نام سن کر رواحہ اور زبیر کو چوکنا ہو ہی جانا چاہیے تھا اور انہیں بہرحال یہ معلوم کرنا چاہیے تھا کہ میں اسے کس طرح جانتا ہوں جبکہ میں ایرانی بھی نہیں تھا۔

خود برقائی خاں میرے باپ کو ابونصار کے نام سے جانتا تھا اور اسے علم نہیں تھا کہ میرا باپ کن کن ملکوں میں کس کس نام سے جانا جاتا ہے۔ نہ برقائی خاں کے علم میں یہ بات تھی کہ میرا باپ دراصل خلیفہ کا ایک معتبر جاسوس تھا۔ میں نے جب خلیفہ کے سامنے شعبان لطفی کا نام لیا تو وہ اسی لیے میری طرف سے شک میں پڑ گیا۔ برقائی خاں کو بہرحال میرے باپ کے اس نام سے آگاہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ خلیفہ نے اپنے وزیر ابن العلقمی سے اسی لیے مشورہ کیا تھا اور ابن العلقمی نے براہ راست مجھ پر شک کا اظہار کیا تھا۔ پھر برقائی خاں کے اس تحریری پیغام نے خلیفہ کو میری طرف سے اور بھی شک میں ڈال دیا تھا جو اسے دو روز قبل ملا تھا۔

میرا باپ اس وقت بغداد کی بجائے ایک اور شہر موصل میں تھا اس لیے رواحہ اور زبیر میں سے کسی

ایک نے موصل کا رخ کیا تھا اور خلیفہ نے بھی اپنے قاصد کو موصل ہی بھیجا تھا تاکہ وہ خود آکر اس معاملے کی تفتیش کرے۔

اپنے باپ ہی سے مجھے پتا چلا تھا کہ بغداد آنے کے بعد میں بہت جلد رواحہ اور زبیر کی نظر میں آگیا تھا کیونکہ یہ ان کے فرائض میں داخل تھا کہ وہ اجنبیوں کے بارے میں پوری معلومات رکھیں۔ جب ان دونوں نے مجھے شعبان لطفی کی تلاش میں دیکھا تو میرے پیچھے لگ گئے۔ انہوں نے وہ تمام باتیں بھی سنیں جو میں نے مختلف لوگوں سے کی تھیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر مجھ سے کہا جائے گا کہ میرا باپ محلہ قرافہ میں رہتا ہے اور وہ اسے جانتے ہیں تو میں ان کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو جاؤں گا۔ اس کا سبب یہ کہ مجھے انہوں نے ایک راہگیر سے گفتگو کرتے سنا تھا جس نے مجھے بتایا تھا کہ بڑے بڑے تاجر محلہ قرافہ میں رہتے ہیں۔ رواحہ اور زبیر مجھے رضافہ لے جانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے مصلحتاً "قرافہ کا نام لیا تھا تاکہ میں فوراً" ان کے ساتھ چل دوں اور یہی ہوا بھی تھا۔ لاعلمی کے سبب میرے ہاتھوں خود اپنے باپ کے ساتھی ہلاک یا زخمی ہو گئے تھے۔ میں نے اس سلسلے میں اس سے معذرت کی' پھر ان کے بارے میں دریافت کیا۔ پتا چلا کہ ان میں سے ایک مر گیا اور دوسرا جس کے سر پر زنجیر پڑی تھی' شدید زخمی ہے مگر مرا نہیں۔ مجھے یہ سن کر افسوس ہوا اور میں نے اظہار افسوس بھی کیا۔

"اگر تیری جگہ میں بھی ہوتا تو شاید ان حالات میں وہی قدم اٹھاتا جو تو نے اٹھایا تھا۔" میرے باپ حماد نے مجھے پشیمان دیکھ کر کہا۔ "ان دونوں کی حیثیت عام محافظوں کی تھی مگر بہرحال وہ بہت عرصے سے میری خدمت کر رہے تھے اور مجھے بھی افسوس ہے۔ خیر تو اب ان تمام باتوں کو ذہن سے جھٹک دے۔ جو ہوا سو ہوا۔ اس میں تیرا کوئی قصور نہیں۔"

"تو خلیفہ سے میرے بارے میں کیا کہے گا؟ وہ یقیناً "حقیقت جاننا چاہے گا۔" میں نے کہا۔

"یہ بات ان کے علم میں ہے کہ میں نے ایران میں شادی کر لی تھی اور پھر میری بیوی کو منگول اٹھا لے گئے تھے۔ میں انہیں حقیقت سے آگاہ کر دوں گا۔ تو کوئی فکر نہ کر!"

"کیا تیرا قیام یہیں محل میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں محل میں بھی میرے لیے کئی کمرے مخصوص ہیں مگر مصلحتاً" میں یہاں کم ہی رہتا ہوں۔ میرا قیام زیادہ تر رضافہ کی اسی عمارت میں ہوتا ہے جہاں سے تو فرار ہوا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ محلہ شہر کی گنجان آبادی سے ذرا ہٹ کر ہے اور جیسا کہ میں تجھے اپنے فرائض کے بارے میں بتا چکا ہوں' وہاں مجھے بڑی آسانی رہتی ہے۔"

معاً" مجھے اس پاگل قیدی کا خیال آگیا جس پر زبیر نے اتنا تشدد کیا تھا کہ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا کہ وہ کون ہے؟

"تقریباً" چھ ماہ قبل خلیفہ کے خلاف ہونے والی ایک سازش کا پتا چلا تھا۔ وہ شخص اس سازش کے سلسلے میں پکڑا گیا تھا۔ اس سازش کا قلع قمع کر دیا گیا مگر یہ پتا نہیں چلا کہ وہ سازش کس کے ذہن کی پیداوار تھی۔ خیال تھا کہ وہ شخص اس راز سے واقف ہو گا کیونکہ جن افراد پر شک تھا' ان میں وہ بھی شامل تھا لیکن زبیر کی حماقت سے وہ شخص ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ تشدد کیے جانے کے دوران میں اس شخص کے سر پر ضرب لگ گئی تھی جس سے وہ اس حال کو پہنچا۔ طبیب کہتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا اسی لیے اس کا علاج ہو رہا ہے تاکہ جب وہ ٹھیک ہو جائے تو اس سے مطلوبہ معلومات حاصل کی جا سکیں۔" میرے باپ نے تفصیل سے بتایا۔

کچھ دیر بعد وہ میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے مجھے وہیں اپنا انتظار کرنے کے لیے کہا تھا اور بتایا تھا کہ وہ خلیفہ سے ملنے جا رہا ہے۔ وہاں سے لوٹ کر آنے کے بعد وہ مجھے اپنے ہمراہ رضافہ لے جانا چاہتا تھا۔

میں نے اسے سب کچھ بتانے کے باوجود صرف

ایک بات نہیں بتائی تھی اور وہ بات سولدہ سے متعلق تھی۔ میں نے دانستہ گفتگو میں اس کا ذکر نہیں آنے دیا تھا۔ جب میں اسے اپنی ماں کی موت اور اپنے قید کیے جانے کے بارے میں بتا رہا تھا تو محتاط ہو گیا تھا کیونکہ مجھے اس موت کے گڑھے سے سولدہ ہی نے نکالا تھا۔ میں نے سولدہ کی بجائے اپنے کچھ عزیز اور وفادار ساتھیوں کا ذکر کیا تھا جنہوں نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے اس موت کے گڑھے سے نکالا تھا اور فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ سولدہ ہی کے ذکر کو نظرانداز کرنے کی غرض سے میں نے شامان بغورچی کا ذکر بھی نہیں چھیڑا تھا کیونکہ بغورچی کے ساتھ ہی سولدہ کا ذکر آ جاتا۔ سولدہ کا ذکر اپنے باپ کے سامنے نہ کرنے کا پہلا سبب تو یہ تھا کہ میں سولدہ سے محبت کرتا تھا۔ مجھے اس کے سامنے یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم آتی۔ دوسرا سبب سولدہ کا پراسرار وجود تھا جس پر شاید میرا باپ یقین نہ کرتا۔ تیسرا سبب یہ خوف تھا کہ کہیں میرا باپ بھی منگولوں کی طرح مجھے ذہنی طور پر بیمار نہ سمجھ لے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد تھے جب شامانوں نے اپنی دانست میں میرا علاج کیا تھا۔ میں دوبارہ کسی اور انداز میں اپنی وہ درگت نہیں بنوانا چاہتا تھا۔

● میرے باپ حماد نے خلیفہ کے پاس سے لوٹنے میں زیادہ دیر نہیں کی تھی۔ اس کے چہرے پر موجود اطمینان سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میری طرف سے خلیفہ کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ میں نے اسی لیے اس سلسلے میں اس سے کچھ نہیں پوچھا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی میں اس کے ساتھ محل سے نکل کر رصافہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے شاہی اصطبل سے دو گھوڑے لے لیے تھے جن پر میں اور وہ سوار تھے۔

رصافہ کی اس عمارت میں پہنچ کر پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا جیسے میں اپنے گھر آ گیا ہوں۔ وہاں پہنچتے ہی میرے باپ نے مجھے رواحہ اور زبیر سے متعارف کرایا تھا۔

"یہ میرا بیٹا ہے۔" اس نے کہا تھا اور میرا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔ "اسے میری ہی تلاش تھی اور آخر کار اس نے مجھے پا لیا۔ جو کچھ ہوا، وہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ اب ان باتوں کو بھول جاؤ!"

رواحہ اور زبیر کے چہروں سے حیرت کا اظہار ضرور ہوا تھا مگر انہوں نے میرے باپ سے تفصیلات معلوم کرنے کی جرات نہیں کی تھی۔ مجھے خبر نہیں کہ بعد میں میرے باپ نے انہیں کچھ تفصیلات سے آگاہ کیا یا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس دن کے بعد سے ان دونوں کا رویہ میرے ساتھ یکسر بدل گیا تھا۔ میرے باپ نے ان سے کہا تھا کہ اب میں بھی ان لوگوں میں شامل ہو چکا ہوں اور انہی کے ساتھ رہوں گا بھی!

پھر اسی دن پہلی بار میں نے عربی لباس زیب تن کیا تھا میرے چہرے کے نقوش یوں بھی منگولوں کی بجائے عربوں جیسے تھے اس لیے وہ لباس پہننے کے بعد میں بالکل عرب معلوم ہونے لگا۔

ابھی مجھے وہاں رہتے ہوئے تین چار دن ہی گزرے تھے کہ ایک شام میں نے اپنے باپ کو فکرمند سا پایا۔ میں نے سبب دریافت کیا تو وہ بولا۔ "آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لیا۔

"مگر میں اس سلسلے میں کر بھی کیا سکتا ہوں!" پھر میرے مزید استفسار پر اس نے بتایا۔ "خلیفہ محترم کا وزیر ابن العلقمی ناقابل اعتماد ثابت ہوا۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ہلاکو خاں اب اس ملک کی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ابن العلقمی نے حاکم اربل ابن الفلایا کے ذریعے ہلاکو خاں سے رابطہ قائم کر لیا ہے اور اسے یقین دلایا ہے کہ وہ ہلاکو خاں کے ساتھ ہے۔ میرے آدمی، ابن العلقمی پر نظر رکھے ہوئے تھے اور انہوں نے یہ اطلاعات فراہم کی ہیں۔"

"لیکن اس میں فکر کی کیا بات ہے!" میں نے کہا۔

"تو خلیفہ کو اس کی غداری سے آگاہ کر دے۔"

"مجھے حالات کا علم نہیں اسی لیے ایسا کہہ رہا ہے۔" وہ بولا۔

"خلیفہ کو اس غدار نے اپنی مٹھی میں لے رکھا

ہے۔ خلیفہ اس وقت تک میری بات پر یقین نہیں کرے گا جب تک میں اس کے سامنے کوئی واضح ثبوت پیش نہ کردوں اور بدنصیبی یہ ہے کہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ میرے آدمی اس سلسلے میں کوشش کے باوجود کوئی ثبوت حاصل نہیں کرسکے۔ یوں بھی ابن العلقمی بہت عیار شخص ہے۔ وہ بھلا اپنی سازش کا کوئی ثبوت کیسے چھوڑ سکتا تھا!"

میں اس کی بات سن کر چپ ہو گیا اور میری آنکھوں میں اس عیار شخص کا چہرہ گھومنے لگا جسے میں نے خلیفہ کے پاس دیکھا تھا لیکن میں حیران اس بات پر تھا کہ آخر وہ شخص نمک حرامی پر کیوں کمربستہ ہے؟ یہی سوال میری زبان پر بھی آگیا۔

"دراصل وہ رقیب خاندان کے ان شہزادوں میں سے کسی ایک کو برسراقتدار لانا چاہتا ہے جو نظربند ہیں۔" میرے باپ نے بتایا۔ "پہلے بھی جو سازش کی گئی تھی، اس کا مقصد بھی یہی تھا لیکن تاحال اس بارے میں کوئی ثبوت نہیں ملا کہ اس سازش میں ابن العلقمی کا ہاتھ تھا حالانکہ ذاتی طور پر میں یہی سمجھتا ہوں۔ حال ہی میں شہر کے ایک محلے کرخ میں جو کچھ ہوا، وہ بھی اسی سازش کا حصہ تھا۔ ابن العلقمی دراصل بیرونی خطرے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ چاہتا ہے کہ اندرونی طور پر بھی خلفشار پیدا ہو جائے جس سے بیرونی حملہ آور کو مدد ملے۔"

"میرا خیال ہے کہ غدار ابن العلقمی اگر ہلاکو خاں سے سازباز نہ بھی کرتا تو ہلاکو خاں، بغداد پر حملہ ضرور کرتا۔" میں نے خیال آرائی کی۔

"تیرا کہنا ٹھیک ہے بیٹے مگر بیرونی جارحیت کی صورت میں اندرونی بغاوت یا سازش ہمیں مزید کمزور کردے گی۔" میرے باپ نے کہا، پھر وہ اٹھتا ہوا بولا۔ "اچھا تو یہیں رہ! میں ذرا محل ہو آؤں۔ عموماً ابن العلقمی، خلیفہ کا سایہ بنا رہتا ہے اور انہیں بہت کم تنہا چھوڑتا ہے، پھر بھی کوشش کروں گا کہ خلیفہ سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل جائے اس کے باوجود میرے لیے خطرہ بہرحال ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کیونکہ پانسا پلٹ بھی سکتا ہے۔"

"میں تیری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔" میں نے کہا۔

"خلیفہ اپنے وزیر سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھتے اور ان پر مجھ سے زیادہ ابن العلقمی کا اثر ہے۔ ایسی صورت میں میرے لیے ابن العلقمی کے خلاف زبان کھولنا بہرحال خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر تو یہ خطرہ مول ہی نہ لے!" میں نے مشورہ دیا۔

اس نے میری بات سن کر طویل سانس لیا، پھر بولا۔ "یہ خطرہ تو بہرحال مول لینا ہی پڑے گا۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر وہ رات گئے لوٹا۔ میں اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے اب تک فکر و تردد کے سائے دور نہیں ہوئے تھے۔

"تو ابھی تک سویا نہیں بیٹے!" وہ میری مسہری پر بیٹھتا ہوا بولا۔

میں اسے آتا دیکھ کر ہی اٹھ بیٹھا تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے تیری واپسی کا انتظار تھا۔ بتا کہ خلیفہ سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا؟"

"ہاں۔" اس نے تھکی ہوئی سی آواز میں جواب دیا، پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ "میں انہیں یہ یقین دلانے میں ناکام رہا کہ ان کا وزیر غدار ہے۔ انہوں نے اس بات کو میری غلط فہمی پر محمول کیا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا۔ "بہت رات ہو گئی ہے، تو سو جا!"

اس رات میں کوشش کے باوجود جلدی نہ سو سکا۔ جب میرا باپ مجھ سے نہیں ملا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ اسے لے کر بغداد سے کسی اور طرف نکل جاؤں گا لیکن اب میرے خیالات یکسر بدل چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب میں ہمیشہ بغداد ہی میں رہوں گا کیونکہ یہ میرا اصل وطن کہلائے جانے کا مستحق تھا۔ فرانزم میرا وطن نہیں تھا اور نہ ہی میری ماں کا وطن! وہ تو تقدیر و حالات کا ایک جبر تھا جس نے مجھے اور میری ماں کو

دشت میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب میری ماں مر چکی تھی اور باپ مل چکا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ بغداد ہی میرا اصل اور آبائی وطن ہے۔ پھر میں اسے چھوڑ کر کس طرح جا سکتا تھا۔ یہ سراسر بزدلی ہوتی کہ میں اپنے وطن اور اہل وطن کو مصیبت میں چھوڑ کر چلا جاتا اور میں بزدل نہیں تھا۔ منگول پہلے بھی میرے دشمن تھے اور اب بھی! لیکن حال اور ماضی میں بڑا فرق تھا۔ اب میں تنہا نہیں رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے وطن کو بچانے کے لیے آخر وقت تک لڑوں گا اور اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ مجھے اپنے وطن کی خاطر دشمنوں سے لڑتے ہوئے ہلاک ہو جانا تو پسند تھا مگر بزدلوں کی طرح وہاں سے جان بچا کر بھاگ جانا میری نظر میں انتہائی ذلت آمیز تھا۔ جب خود میرے یہ جذبات و احساسات تھے تو پھر میں اپنے باپ کو وہاں سے فرار ہو جانے کا مشورہ کیسے دے سکتا تھا! جبکہ میرا باپ وطن کے لیے انتہائی اہم خدمات انجام دے رہا تھا۔ مجھے اس رات سولدہ بھی بہت یاد آئی مگر وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں تھی! میرے خیال میں اس کی پراسرار قوتوں کو دشمنوں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اگر وہ ہمارے سپاہیوں کو اپنے جادوئی ہتھیار فراہم کر دیتی تو ہماری فتح یقینی ہو سکتی تھی۔ منگول سپاہی ان جادوئی ہتھیاروں کے سامنے ہرگز نہ ٹک سکتے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ سولدہ بھی تو اپنے دشمنوں سے جنگ کر رہی تھی۔ وہ خود اپنے معاملات میں الجھی ہوئی تھی۔ اس صورت میں وہ بھلا کس طرح میرے کام آ سکتی تھی! میرے دل کو اگر کوئی اطمینان تھا تو صرف یہ کہ وہ جانتی تھی، میں کہاں ہوں اور وہ میری طرف سے غافل نہیں۔

پھر وہ بدنصیب دن آیا جب ہلاکو خاں کا ایک قاصد دربار خلافت میں اس کا ایک پیغام لے کر آیا۔ اس وقت دربار عام منعقد تھا اور میں بھی دربار میں اپنے باپ کے ساتھ شریک تھا۔ خلیفہ کے حکم پر وہ پیغام با آواز بلند پڑھا گیا۔ پیغام عربی زبان ہی میں تحریر تھا۔

"تم جانتے ہو کہ دنیا کی مختلف قوموں کا چنگیز خاں کے زمانے سے اب تک منگول فوجوں کے ہاتھوں کیا حشر ہوا! بغداد کے دروازے کبھی خوارزمیوں اور سلجوقیوں پر بند نہیں ہوئے تو پھر ہم ہمیں کس طرح بغداد میں داخل ہونے سے روک سکتے ہو جبکہ ہم اس قدر طاقتور ہیں؟ دیکھو پرچم چنگیزی کے مقابلے پر نہ آنا! ورنہ تمہاری خیر نہیں۔"

پیغام ختم ہو گیا مگر دیر تک دربار پر سناٹا چھایا رہا، پھر اس سناٹے کو خلیفہ ہی کی آواز نے توڑا۔ وہ اپنی بھاری آواز میں ہلاکو خاں کے قاصد سے بولا۔ "اس سے کہنا کہ وہ ہمارے جواب کا انتظار کرے!"

قاصد واپس ہو گیا اور اسی کے ساتھ دربار برخواست کر دیا گیا۔ میں اس وقت وزیر ابن العلقمی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ جب پیغام پڑھا جا رہا تھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں بڑی عیارانہ چمک دیکھی تھی۔

دربار برخواست ہوتے ہی خلیفہ کا وزیر اس کے ساتھ ساتھ محل کے اندرونی حصے میں چلا گیا تھا اور میں اپنے باپ کے ہمراہ محل سے نکل کر رصافہ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میرے باپ کو اس وقت رصافہ پہنچنے کی بہت جلدی تھی کیونکہ رواحہ وہاں ایک اہم اطلاع لے کر آنے والا تھا۔

ہم گھر پہنچے تو رواحہ کو اپنا منتظر پایا۔ مجھے علم تھا کہ اسے میرے باپ نے کہاں بھیجا تھا۔

رواحہ نے استفسار کا بھی انتظار نہیں کیا اور میرے باپ کو دیکھتے ہی بول اٹھا۔ "ہلاکو خاں کی فوجیں اربل سے چل چکی ہیں اور بکریت کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ایک اور عجیب بات بھی معلوم ہوئی ہے اور اربل میں موجود ہمارے جاسوسوں نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی ہے۔ وہ عجیب بات یہ ہے کہ خود ہلاکو خاں ان فوجوں کے ساتھ نہیں۔ ان فوجوں کی کمان دو منگول سرداروں کے ہاتھ میں ہے جن میں سے ایک کا نام سوغونچاق اور دوسرے کا باجو خاں ہے۔

میں ان دونوں ہی منگول سرداروں سے اچھی طرح

واقف تھا۔ وہ دونوں ہی بے حد سفاک اور وحشی تھے۔

رواحہ سے وہ اطلاع پا کر میرا باپ کچھ دیر کسی سوچ میں ڈوبا رہا مگر میں یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے چہرے سے کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

پھر اسی وقت اس اہم اطلاع سے خلیفہ کو باخبر کرنے کے لیے میرا باپ محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب وہ محل سے لوٹ کر آیا تو اس کے ماتھے کی لکیروں میں اضافہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کوئی نئی بات اس کی فکر کا سبب بنی ہے۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا۔ "ابن العلقمی کے مشورے پر خلیفہ نے ہلاکو خاں کے پیغام کے جواب میں بہت نرمی برتی ہے جو یقیناً" ان کے شایان شان نہیں۔ پھر یہ کہ جو پیغام ہلاکو خاں کو بھیجا گیا ہے' وہ بہت مبہم اور غیر واضح ہے۔ میں نے اس کی نقل دیکھی تھی۔"

"لیکن اس میں اتنا فکر مند ہونے کی تو بات نہیں۔" اپنے باپ کے چپ ہوتے ہی میں بول اٹھا۔

"فکر مندی کا سبب یہ نہیں دوسرا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے طویل سانس لیا۔ "فکر مندی کا سبب وہ حکم ہے جو خلیفہ نے آج ہی جاری کیا ہے۔"

پھر میرے باپ نے مجھے جو کچھ بتایا' اسے سن کر میں اسی نتیجے پر پہنچ سکا تھا کہ خلیفہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے درپے ہے۔

خلیفہ نے اپنے غدار وزیر ابن العلقمی کے مشورے پر فوراً" ہی فوج میں تخفیف کا اعلان کر دیا تھا۔ ایسے نازک وقت پر جب دشمن حملہ آور ہونے والا تھا' فوج میں تخفیف کا اعلان حیرت انگیز اور ناقابل یقین سا تھا مگر یہ حقیقت تھی۔

"اس نمک حرام نے خلیفہ کو یہ پٹی پڑھائی ہے کہ اس طرح اخراجات میں کمی ہو جائے گی اور اس سے جو رقم بچے گی' وہ منگولوں کی مدافعت کے انتظامات پر خرچ کی جائے گی۔ اس نے خلیفہ سے یہ بھی کہا ہے کہ فوج اپنے بقایا جات بھی طلب کر رہی ہے۔ اس طرح بقیہ فوج کے بقایا جات بھی با آسانی ادا کیے جا سکیں گے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خود اس کی ایما پر فوج کا ایک حصہ بقایا جات ادا کیے جانے پر زور دے رہا ہے۔"

"لیکن اب تک میں واضح طور پر یہ نہیں سمجھ پایا کہ اسے' اس غدار کے بغداد کی تباہی سے کیا فائدہ ہو گا؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ ایک ایسا خواب دیکھ رہا ہے جو شاید کبھی پورا نہیں ہو گا۔" میرا باپ دور کہیں خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولا اور پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ میری طرف مڑ کر بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس غدار کو فاطمیوں کی حکومت کے خاتمے کا بہت صدمہ ہے۔ وہ ہلاکو خاں سے اسی لیے ساز باز کر رہا ہے کہ بنو عباس کو نیست و نابود کر کے کسی فاطمی کو برسر اقتدار لے آئے لیکن جہاں تک میں نے منگولوں کو سمجھا ہے' وہ اس غدار کے خوابوں کو کبھی پورا نہیں ہونے دیں گے۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے اس کی تائید میں کہا۔ "یہ تو ممکن ہے کہ ہلاکو خاں اس کی غداری کے صلے میں اسے زندہ چھوڑ دے مگر یہ ممکن نہیں کہ ہلاکو خاں اس کی ایما پر اپنا مفتوحہ علاقہ کسی کے سپرد کر دے۔"

"کاش وہ غدار یہ بات' یہ معمولی سی بات سمجھ سکتا اور کاش خلیفہ محترم اس کے ہاتھوں میں کھلونا نہ ہوتے۔" میرے باپ کے لہجے میں تاسف تھا۔ "ہر طرف سے تباہی و بربادی کی خبریں آ رہی ہیں۔ مسلمانوں کے دل پر منگولوں کی ہیبت بیٹھ گئی ہے۔ ان علاقوں سے ایسی خبریں بھی ملی ہیں کہ وہاں کے حاکم اپنی جان بخشی کے صلے میں ہلاکو خاں کا ساتھ دینے آمادہ ہو گئے ہیں۔ خود حاکم موصل کے بارے میں ایک ایسی ہی اطلاع ملی تھی جس کے بعد میں خود اس معاملے کی تفتیش کرنے موصل گیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور میرے قریب آ بیٹھا۔

"کیا وہ اطلاع صحیح ثابت ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ فوری طور پر بغداد آنا پڑا۔ اب میں نے زبیر کو وہاں

ہے۔ میں جہاں تک معلومات حاصل کر سکا تھا' وہ یہ تھیں کہ حاکم موصل بدر الدین لولو نے اپنے ایک بیٹے شمس الدین اسحاق کو تحائف دے کر ہلاکو خاں کے پاس روانہ کیا ہے اور اسے اپنی اطاعت کا یقین دلایا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں خود حاکم موصل سے استفسار کیا تو معاملہ الجھ گیا۔ اس نے کسی ایسی بات سے قطعی انکار کیا اور ثبوت کے طور پر اپنے بیٹے شمس الدین اسحاق سے مجھے ملوا دیا۔ میں اب مزید تحقیقات کرنے لگا۔ حاکم موصل کے تین بیٹے ہیں۔ سب سے بڑا رکن الدین اسماعیل' پھر شمس الدین اسحاق اور علاء الدین! تحقیقات سے پتا چلا کہ ان تینوں میں سے ایک غائب ہے' یعنی رکن الدین اسماعیل! مجھے اس کا سراغ کہیں نہیں مل رہا تھا کہ وہ کہاں ہے! میں ایک بار حاکم موصل کے سامنے خجل ہو چکا تھا یہی وجہ تھی کہ دوبارہ رکن الدین اسماعیل کے بارے میں اس سے براہ راست کچھ پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں حاکم موصل سے اس وقت اس معاملے میں استفسار کرنا چاہتا تھا جب خود اس یقین کی منزل تک پہنچ جاتا کہ رکن الدین اسماعیل واقعی موصل سے غائب ہے اور ہلاکو خاں ہی کے پاس اظہار اطاعت کی غرض سے تحفے دے کر بھیجا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ابھی میں کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا تھا کہ تیرے معاملے میں مجھے یہاں آنا پڑا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔

جب وہ کافی دیر کچھ نہ بولا تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ "مجھے بھی بتا کہ تو کس سوچ میں گم ہے۔ ممکن ہے کہ میں تجھے کوئی راہ سجھا سکوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ تیرے ذہن کو نہیں پہنچ سکتا مگر بعض اوقات حالات اتنے الجھے ہوتے ہیں کہ سامنے کی بات سمجھ میں نہیں آتی اسی لیے تو منگول کوئی بڑا قدم اٹھانے سے پہلے مجلس مشاورت طلب کرتے ہیں۔"

میری بات سن کر میرے باپ حماد نے مجھے عجیب سی نگاہ سے دیکھا' پھر وہ بولا تو مجھے اس کے لہجے میں دکھ محسوس ہوا۔ اس نے کہا۔ "بیٹے! ان وحشیوں کی مثال نہ دے اور اس بات کو بھلا دے کہ کبھی تو ان کے درمیان تھا۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کیا' پھر بولا۔ "میں اس وقت ہلاکو خاں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کیوں اور کہاں غائب ہو گیا؟"

"اس سلسلے میں ان دونوں منگول سرداروں کو یقیناً علم ہو گا جو اولوس لے کر ادھر آ رہے ہیں۔" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"پھر؟" میرے باپ نے مجھے سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔

"پھر یہ کہ ان سے باسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہلاکو خاں کہاں ہے' اس کے کیا ارادے ہیں اور وہ خود اردو کے ساتھ کیوں نہیں۔"

"لیکن یہ کس طرح ممکن ہے؟ ان سے کون یہ باتیں معلوم کر سکتا ہے؟"

"تیرا بیٹا۔"

میری بات سن کر وہ چونک پڑا اور بولا۔ "تو آخر کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"وہ دونوں منگول سردار مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ میری حیثیت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ جب میں ان سے مطلوبہ معلومات حاصل کرنا چاہوں گا تو وہ بلا جھجک سب کچھ بتا دیں گے۔"

"لیکن اس کے بعد؟" میرے باپ کے لہجے میں اضطراب تھا۔

"اس کے بعد تو واپس کیسے آئے گا؟"

"اس کی صرف دو صورتیں ہیں۔" میں اطمینان سے بولا۔ "ایک سیدھی سی صورت تو یہ ہے کہ میں وہاں سے خاموشی کے ساتھ فرار ہو کر ان سے پہلے یہاں پہنچ جاؤں۔ دوسری صورت یہ کہ میں انہیں کوئی دھوکا دے کر نکل آؤں۔"

کچھ دیر گفتگو کے بعد میں نے اپنے باپ کو یہ یقین دلا ہی دیا کہ میری زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں اور میں باآسانی مطلوبہ معلومات حاصل کر کے دوبارہ بغداد پہنچ جاؤں گا۔

طے یہ ہوا کہ میں وہاں سے رواحہ کے ہمراہ بکریت کی طرف روانہ ہوں گا تاکہ راستہ نہ بھول جاؤں

کیونکہ وہ سفر اسی رات طے کرنا تھا۔ جاتے ہوئے مجھے اس راستے کو ذہن نشین کر لینا تھا کیونکہ وہ علاقہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ رواحہ کو بکریت ہی سے لوٹ آنا تھا اور مجھے بکریت میں رک کر منگول اولوس کا انتظار کرنا تھا۔ رواحہ کی اطلاع کے مطابق ابھی منگول اولوس بکریت سے کافی دور تھا۔ رات بھر سفر کرنے کی صورت میں ہم اس سے پہلے بکریت پہنچ سکتے تھے۔

پھر کچھ دیر بعد میرا باپ، حماد مجھے اور رواحہ کو رخصت کر رہا تھا۔ جب میں گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا تو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی پلکیں آنسوؤں سے بوجھل سی ہو رہی تھیں۔ اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "جا جا میرے بیٹے! خدا تجھے تیرے مقصد میں کامیاب کرے۔"

پھر رواحہ اور میں نے بیک وقت اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی تھی۔ گھوڑے تیزی سے بڑھے تھے۔ میں نے آخری بار پلٹ کر اپنے باپ کی طرف دیکھا تھا جو اسی جگہ خاموشی سے کھڑا ہوا ہماری طرف دیکھے جا رہا تھا۔

رات کی تاریکی میں ہمارے گھوڑے برق رفتاری سے بڑھ رہے تھے۔ بغداد کی آبادی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ جس وقت ہم بغداد سے چلے تھے تو شہر کے دروازے بند نہیں ہوئے تھے اس لیے ہمیں شہر سے باہر جانے میں کوئی قباحت نہیں ہوئی تھی۔ اگر ایسا ہوتا بھی تو کوئی مشکل پیش نہ آتی کیونکہ رواحہ کے پاس ایک ایسا مخصوص نشان موجود تھا کہ وہ رات کے کسی بھی پہر میں شہر سے باہر جا سکتا تھا اور واپس بھی آ سکتا تھا۔ مجھے یہ بات رواحہ سے اس وقت معلوم ہوئی تھی جب میں اور وہ تیزی کے ساتھ شہر کے ایک مشرقی دروازے "باب الغلبہ" کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں دروازہ شہر ہمارے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی بند نہ ہو جائے۔ جواب میں رواحہ نے مجھے اپنے مخصوص نشان کے بارے میں بتایا تھا جسے دکھانے کے بعد بغیر کسی پوچھ گچھ کے ہمارے لیے دروازہ شہر کھولا جا سکتا تھا۔

وہ راستے رواحہ کے لیے جانے پہچانے تھے اس لیے رات کے وقت بھی سفر کرتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ رواحہ نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے گھوڑے دریائے فرات کی مغربی سمت میں آباد ایک شہر 'ابناء' کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کے بعد شہر ابناء سے گزر کر ہمیں دریائے دجلہ کو مغربی جانب سے عبور کرنا تھا' پھر کچھ فاصلہ طے کر کے ہم بکریت پہنچ سکتے تھے۔ بکریت ہی سے رواحہ کو واپس چلا جانا تھا۔

لیکن ہم جو کچھ سوچ کر بغداد سے روانہ ہوئے تھے' وہ حالات پیش نہیں آئے۔ ہم بکریت نہ پہنچ سکے اور اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

ہوا یہ کہ ہم نے جیسے ہی دریائے دجلہ عبور کیا اور بکریت کی طرف بڑھنا چاہا' ایک گھوڑ سوار کو تیزی کے ساتھ اسی راستے سے دریائے دجلہ کی طرف آتے دیکھا جس سے گزر کر ہم بکریت پہنچنا چاہتے تھے۔ میں نے اور رواحہ نے مصلحتاً" اپنی اپنی مشعلیں روشن نہیں کی تھیں مگر آنے والے کی مشعل روشن تھی جس کی روشنی اس کے چہرے پر بھی پڑ رہی تھی۔

آنے والے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ دوست تھا یا دشمن! کیونکہ ابھی اس کے اور ہماری درمیان کافی فاصلہ تھا اور روشنی کے باوجود اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر اس کا چہرہ واضح طور پر نظر بھی آ جاتا تو ضروری نہیں تھا کہ وہ رواحہ کے لیے آشنا ہی ہوتا۔

اس کی آمد کو محسوس کرتے ہی رواحہ نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لی تھیں اور مجھے بھی رکنے کا اشارہ کیا تھا۔

ہم دونوں راستے سے ہٹ کر کھجور کے پیڑوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ میں چھپ گئے تھے تاکہ آنے والے کی نگاہ سے چھپے رہ سکیں اور ہم اسے دیکھ سکیں۔

رات کے سناٹے میں گھوڑے کی ٹاپیں گونجتی ہیں اور اجنبی گھوڑا سوار رفتہ رفتہ قریب آتا گیا۔ اب اس کا چہرہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ... یہ طلحہ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے رواحہ سے بڑبڑاتے ہوئے سنا۔

"کون طلحہ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اربل میں ہمارا جاسوس!" رواحہ نے جواب دیا۔ "اسی سے یہ اطلاع ملی تھی کہ منگول لشکر، دو منگول سرداروں کی رہنمائی میں بغداد کے لیے روانہ ہوا ہے اس کے ساتھ ہلاکو خان نہیں ہے۔"

"مگر یہ اس وقت جا کہاں رہا ہے؟" میں بولا۔

"یہی سوال میرے ذہن میں پیدا ہو رہا ہے۔" رواحہ نے کہا۔

"اگر اس وقت بکریت پہنچنا ضروری نہ ہوتا تو میں اس کا تعاقب کر کے یہ ضرور جاننے کی کوشش..."

"تمہارا تعاقب کرنا فضول ہی ثابت ہوتا۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ رات کے سناٹے میں تمہارے گھوڑے کی ٹاپیں اسے تمہاری طرف سے چوکنا کر دیتیں اور وہ اس طرف نہ جاتا جہاں اسے پہنچنا ہوتا۔" میں نے جواب دیا۔

اس دوران میں اجنبی گھوڑ سوار اس پیڑوں کے جھنڈ سے بہت قریب آ چکا تھا جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔

"اب صرف یہی صورت ہے کہ ہم اسے روک کر استفسار کریں کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔" رواحہ نے کہا اور اسی کے ساتھ اپنا گھوڑا بڑھاتا ہوا بولا۔ "آؤ!"

ہم دونوں نے بالکل راستے کے درمیان اپنے گھوڑے روک دیے۔ طلحہ کا گھوڑا اب زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس نے ہمیں پیڑوں کے جھنڈ سے نکل کر اپنی راہ میں حائل دیکھا تو پہلے چونکا، پھر اس نے تیزی سے اپنی تلوار سونت لی۔ تاریکی کے سبب غالباً وہ رواحہ کو نہ پہچان سکا تھا۔

"طلحہ! یہ میں ہوں رواحہ۔" معاً سناٹے میں رواحہ کی آواز گونجی۔ "اپنی تلوار نیام میں رکھ لو!"

رواحہ کی آواز سن کر طلحہ چونک پڑا۔ اس نے غالباً آواز پہچان لی تھی مگر اس کے باوجود اس نے تلوار نیام میں نہیں رکھی تھی۔ اب اس نے بھی اپنا گھوڑا روک لیا تھا۔

"تمہارے ساتھ یہ دوسرا کون ہے رواحہ؟" طلحہ نے دور ہی سے سوال کیا۔

"قریب آؤ اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔" رواحہ نے اس کے سوال کی نظرانداز کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا اس کا لہجہ حکمیہ تھا۔

شاید چند لمحے طلحہ ہچکچایا، پھر اس نے تلوار نیام میں رکھ لی اور گھوڑے کی باگیں ہلا دیں۔ گھوڑا سبک روی سے چلتا ہوا ہمارے قریب پہنچ گیا۔ اب ہم دونوں کے چہروں پر بھی مشعل کی روشنی پڑ رہی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ طلحہ کچھ پوچھتا یا کہتا، رواحہ نے اسے مخاطب کیا۔ "تم رات کے اس پہر کہاں جا رہے ہو طلحہ؟"

"محترم ہشام تک ایک اہم خبر پہنچانے!" طلحہ نے جواب دیا اور میں سمجھ گیا کہ وہ ہشام کے کہہ رہا تھا۔ "ہشام" بھی میرے باپ کے بہت سے ناموں میں سے ایک تھا اور مجھے علم تھا کہ وہ بغداد میں اسی نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ ابھی رواحہ کچھ نہ کہہ پایا تھا کہ طلحہ پھر بول اٹھا۔ "مگر تم کہاں جا رہے ہو؟"

"وہ اہم خبر بیان کرو!" طلحہ کے سوال کو رواحہ نے ایک بار پھر نظرانداز کر دیا۔ "تم جانتے ہو کہ میں غیر ضروری سوالات پسند نہیں کرتا۔" رواحہ کے لہجے سے برائی کا اظہار ہو رہا تھا جیسے طلحہ اس کا ماتحت ہو۔

رواحہ کی بات سن کر طلحہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نہ ابھرے تو میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ رواحہ کی حیثیت اس سے افضل ہے۔

"ہلاکو خاں اپنا لشکر لے کر اربل پہنچنے ہی والا ہے۔ یہ اطلاع مجھے اس وقت ملی جب تم اربل سے روانہ ہو چکے تھے۔" طلحہ بتایا۔

"مگر تم نے تو پہلے یہ بتایا تھا کہ اس کا لشکر، دو منگول سرداروں کی رہنمائی میں بغداد کی طرف بڑھ رہا ہے؟ تو کیا وہ اطلاع غلط تھی؟" رواحہ نے استفسار کیا۔

"پہلے والی اطلاع بھی قطعی درست تھی اور یہ خبر بھی صحیح ہے۔" طلحہ نے جواب دیا، پھر مزید کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بولا۔ "تازہ ترین اور تفصیلی اطلاعات یہ ہے کہ جب ہلاکو خاں، ہمدان سے روانہ ہو رہا تھا تو اس نے اپنی روانگی سے ایک روز قبل اپنے لشکر کا نصف حصہ ان دونوں منگول سرداروں کی رہنمائی میں روانہ کر دیا تھا۔ پہلے روانہ کیے جانے والے لشکر کی روانگی کا مقصد یہ تھا کہ اگر راستے میں کسی قسم کی مزاحمت ہو تو اس سے نمٹا جا سکے اور ہلاکو خاں کے ساتھ جو لشکر ہو، وہ تازہ دم رہے لیکن راستے میں کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔" طلحہ تفصیلات بتا کر خاموش ہو گیا۔

"اور کوئی اہم بات؟" رواحہ نے اس کے خاموش ہوتے ہی پوچھا۔

"حاکم اربل ابن الصلایا کے بارے میں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ خلیفہ محترم سے بغاوت پر آمادہ ہے۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہلاکو خاں کو اپنی وفاداری کا یقین دلا دے گا اس کے علاوہ ابن الصلایا کے پاس کوئی اہم پیغام بھی ہے جو وہ خود ہلاکو خان کو دے گا۔" طلحہ نے بتایا۔

"اس اہم پیغام کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟" رواحہ نے سوال کیا۔

"صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ پیغام وزیر ابن العلقمی کی طرف سے ہے لیکن وہ پیغام کیا ہے، اس کے بارے میں اب تک علم نہیں ہو سکا۔" طلحہ نے جواب دیا۔

"تمہیں جیسے ہی اس پیغام کے بارے میں علم ہو، مطلع کرنا!" رواحہ نے کہا، پھر بولا۔ "اب تم اربل کی طرف واپس جاؤ! محترم ہشام تک تمہاری فراہم کردہ تمام اہم اطلاعات پہنچ جائیں گی۔"

"بہتر ہے۔" طلحہ بولا اور مزید کوئی سوال کیے بغیر اپنے گھوڑے کا رخ موڑ لیا۔ "خدا حافظ!" اس نے کہا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

طلحہ نے جو اہم اطلاعات فراہم کی تھیں ان کے بعد اب میرا بکریت پہنچ کر منگول سرداروں سے ملنا قطعی ضروری نہیں رہا تھا اسی لیے جب رواحہ نے واپسی کا سفر اختیار کرنے کے لیے کہا تو میں نے اس کی بات فوراً ہی مان لی۔

میں اور رواحہ جب واپس بغداد پہنچے تو صبح ہونے والی تھی۔ ہم نے رضافہ پہنچ کر ہی دم لیا۔

اس وقت تک میرا باپ صبح کی عبادت کے لیے بیدار ہو چکا تھا۔ رواحہ کے ساتھ مجھے بھی دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی مگر اسے کوئی سوال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ رواحہ نے اسے تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ رواحہ سے تفصیلی حالات سن کر میرے باپ نے ایک طویل سانس لیا اور پھر عبادت کے لیے کھڑا ہونے سے پہلے بولا۔ "اب تم دونوں سو رہو! رات بھر کے سفر نے تمہیں تھکا دیا ہو گا۔ میں نماز پڑھ کر محل جاؤں گا۔"

میں نے تو فوراً ہی اپنے باپ کی ہدایت پر عمل کیا مگر رواحہ نے کہا کہ وہ صبح کی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد سوئے گا۔

میں دوپہر کے بعد اٹھا تو میرا باپ، محل سے لوٹ آیا تھا۔ اس کے چہرے سے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیا تو نے خلیفہ کو موجود خطرناک صورت حال سے آگاہ کر دیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "مگر وہ ابھی تک اس نمک حرام وزیر کے مشورے پر عمل کر رہے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہو گا لیکن بظاہر تمام آثار تباہی کے ہیں، بھیانک تباہی، ایسی تباہی جس کا شاید تصور بھی ممکن نہیں۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے۔ مجھے علم نہیں کہ خلیفہ کا اولوس

کتنا بڑا ہے مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ منگولوں کے اردو (لشکر) کی تعداد۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" میرے باپ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اگر اس سازشی کی باتوں میں آکر خلیفہ محترم نے فوج میں تخفیف نہ کردی ہوتی تو شاید مقابلہ ممکن ہوتا لیکن اب۔ اب" اس نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

"ہم اب بھی ان کا بہادری سے مقابلہ کریں گے۔" میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

میرے باپ نے مجھے عجیب سی نگاہ سے دیکھا' پھر بولا "کیا تو نے نہیں سنا کہ اس کا لشکر بغیر کسی مزاحمت کے بڑھتا چلا آرہا ہے؟"

"ہاں مجھے علم ہے مگر یہاں ایسا نہیں ہوگا۔" میں پر یقین لہجے میں بولا۔ "یہاں ہر قدم پر منگولوں کو خون بہانا پڑے گا۔ وہ اتنی آسانی سے بغداد پر قبضہ نہیں کر سکیں گے۔"

"خدا تیری زبان مبارک کرے بوغا! اور خلیفہ محترم کو اب بھی یہ احساس ہو جائے کہ ان کے ساتھ سازش کی جارہی ہے۔"

ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ ایک حبشی خادم نے اطلاع دی کہ زبیر' موصل سے واپس آگیا ہے اور فوراً" میرے باپ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ وہ یقیناً" کوئی اہم خبر لایا ہوگا۔

"اسے بھیج دو!" میرے باپ نے خادم سے کہا۔

چند لمحے بعد ہی زبیر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے تھکن اور پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیا خبر لائے ہو زبیر؟" زبیر ایک طرف بیٹھ گیا تو اس سے میرے باپ نے پوچھا۔

"اسے محترم ہشام! حاکم موصل بدرالدین لولو کا بڑا بیٹا رکن الدین اسماعیل واقعی موصل میں نہیں' اس کے علاوہ اس کے دونوں چھوٹے بیٹے بھی گزشتہ دن موصل سے غائب ہو چکے ہیں معلوم ہوا ہے کہ انہیں بھی تحفے تحائف دے کر کہیں بھیجا گیا ہے۔ خیال اغلب ہے کہ اس نے اپنے تینوں بیٹوں کو منگولوں کے پاس بھیجا ہے۔ اس کے مصاحب سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ اب خود بھی ہلاکو خاں سے ملنے کا قصد کر چکا ہے لیکن ابھی اس اطلاع کی تصدیق نہیں ہو سکی۔" زبیر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"گویا حاکم موصل نے بھی منگولوں کے سامنے سر جھکا دیا۔" میرے باپ نے اظہار خیال کیا۔ "مجھے پہلے ہی یہ خدشہ تھا۔"

پھر میرے باپ نے خود محل جانے کی بجائے رداحہ کو یہ اطلاع خلیفہ تک پہنچانے کا حکم دیا وہ اب کچھ دلبرداشتہ سا نظر آنے لگا تھا۔

اسی دن رات ہونے سے قبل اربل سے طلحہ کا بھیجا ہوا ایک قاصد تحریری پیغام لایا۔ پیغام میں تحریر تھا کہ ہلاکو خاں کا لشکر اربل پہنچ چکا ہے اور اس کے وہاں پہنچتے ہی حاکم اربل ابن الصلایا اس سے ملا۔ ابن الصلایا نے وزیر ابن العلقمی کی جانب سے ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کرنے کی دعوت دی ہے اور اسے یقین دلایا ہے کہ وہ ہر طرح ہلاکو خاں کے ساتھ تعاون کرے گا۔ اس کے علاوہ اس پیغام میں ایک اور اندوہناک بات درج تھی۔ اس میں لکھا گیا تھا کہ ہلاکو خاں کے لشکر میں اب مسلمانوں کی بڑی تعداد بھی شامل ہے۔ یہ خبر خود میرے لیے بھی نئی تھی کیونکہ جب تک میں وہاں تھا' ایسا نہیں ہوا تھا۔ پیغام کے مطابق حاکم شیراز ابوبکر بن سعد زندگی اپنے مسلمان سپاہیوں سمیت' ہلاکو خاں کے لشکر میں شامل تھا۔

"تو اب مسلمان بھی مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہوں گے!" میرے باپ نے بڑے دکھ سے کہا۔ "عین ممکن ہے کہ حاکم موصل بدرالدین بھی اپنی فوجیں لے کر اس وحشی درندے کے ساتھ ہو جائے۔"

اربل سے جو تحریری پیغام موصول ہوا تھا' اس کی روشنی میں یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ہلاکو خاں اگلے روز تک بغداد پر حملہ آور ہونے والا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بڑا اولوس تھا اور اب اسے بغداد پر فوراً" ہی حملہ آور ہو جانا چاہیے تھا۔ موصولہ اطلاعات ایسی نہیں تھیں کہ ان سے فوری طور پر خلیفہ کو آگاہ نہ کیا

جاتا۔ اطلاعات کی اہمیت کے سبب میرے باپ نے خود محل جانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی وہ روانہ ہونے ہی والا تھا کہ اطلاع ملی' وہ لشکر بغداد کے نواح میں پہنچ چکا ہے۔ جس کی رہنمائی دو منگول سردار کر رہے ہیں۔ اس لشکر کے میرے باب السلطان سے تقریباً" ایک فرسخ دور پڑاؤ ڈال لیا ہے۔ یہ اطلاع میرے باپ کے ایک ماتحت ہی نے پہنچائی تھی۔ مجھے علم تھا کہ بغداد کے نواح میں میرے باپ نے اپنے ماتحتوں کا جال پھیلا رکھا تھا تاکہ وہ بروقت تازہ ترین صورت حال سے آگاہ ہوتا رہے۔

دشمن اب دروازے تک آپہنچا تھا اور کسی وقت بھی یلغار کر سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میرا دوران خون تیز ہو گیا۔ میں نے اپنے باپ کو دشمن کی ایک چال سے آگاہ کیا۔ "دشمن نے فوری طور پر حملہ نہیں کیا' یہ اس کی چال بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ شب خون مارے۔"

"ہو سکتا ہے کہ تیرا اندیشہ درست ہو لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جب تک ہلاکو خود یہاں نہیں پہنچ جائے گا حملہ نہیں ہو گا۔" میرے باپ نے کہا۔ "پھر بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پوری طرح جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ میں خلیفہ محترم کو مشورہ دوں گا کہ وہ فوری طور پر اعلان جہاد کر دیں۔"

"جہاد کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تفصیلات کا وقت نہیں۔ میں تجھے جہاد کا مطلب پھر کبھی سمجھا دوں گا۔ فی الحال یہ سمجھ لے کہ جب مسلمان' کافروں اور غیر مسلموں کے خلاف جنگ کرتے ہیں تو اسے جہاد کا نام دیتے ہیں۔"

"لیکن دشمنوں میں تو خود مسلمان بھی شامل ہیں۔" میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

"ہاں' یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے۔ دشمن کا ساتھ دینے والا بھی دشمن ہوتا ہے اس لیے ہمارے نظر میں ان کی حیثیت بھی وہی ہے جو منگولوں کی ہے۔" یہ کہہ کر میرا باپ اٹھ کھڑا ہوا۔

جب میرا باپ محل سے لوٹ کر آیا تو اس کے چہرے سے کسی قدر بشاشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے مخاطب کیا۔

"بوغا! خلیفہ محترم نے میرا مشورہ قبول کر لیا۔"

"کیا خلیفہ نے اس نمک حرام وزیر کو معطل کر دیا اور ان سپاہیوں کو دوبارہ اردو میں واپس لے لیا جنہیں پہلے سازشی وزیر کے مشورے پر نکال دیا گیا تھا؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں میرے بیٹے!" وہ میرے قریب آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ تو ناممکن سی بات ہے۔"

"تو پھر تو خوش خوش سا کیوں ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں نے خلیفہ محترم کو اعلان جہاد کا مشورہ دیا تھا مگر ابن العلقمی ابھی اعلان جہاد کے حق میں نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی حملہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ ہلاکو خاں یہاں نہیں پہنچا جو یقیناً" پوری قوت سے حملہ کرنا چاہے گا۔ اس کی یہ بات غلط نہیں تھی مگر اس کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ بروقت اعلان جہاد کا مطلب یہ ہوتا کہ پوری طرح جنگی تیاری نہ ہو پاتی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ جب میں نے خلیفہ محترم کو تمام حالات سے آگاہ کیا تو انہوں نے فوراً" ہی سپہ سالار فوج ایبک دوا کو بھی طلب کر لیا۔ سپہ سالار ایبک دوا دار نے بھی میرے مشورے کی تائید کی۔ نمک حرام وزیر منہ دیکھتا رہ گیا اور خلیفہ محترم نے میرا مشورہ قبول کرتے ہوئے اسی وقت جہاد کا حکم جاری کر دیا۔ یہ پہلا موقع ہے جب خلیفہ محترم نے اس سازشی کی بات کو رد کر دیا۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تو مجھے سپہ سالار کے حوالے کر دے!" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھا نہیں کہ تو کیا کہنا چاہتا ہے۔" میرے باپ نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں ۔۔۔ میں بھی اپنے وطن کی خاطر لڑنا چاہتا ہوں۔" میں پرجوش لہجے میں بولا۔

"ہم جو فرائض انجام دے رہے ہیں' وہ بھی جہاد ہی

حصہ ہیں میرے بیٹے!"

"مگر میں ... میں روبرو جنگ کرنا چاہتا ہوں۔ تو دشمن کے خلاف اپنے ذہن کے ذریعے جنگ کر رہا ہے اور میں تلوار اٹھانا چاہتا ہوں۔" میں نے پہلے سے بھی زیادہ پرجوش لہجے میں کہا۔

"اگر تیری یہی خواہش ہے میرے بیٹے تو میں تجھے نہیں روکوں گا مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ جب وقت آئے گا تو میں تیری خواہش ضرور پوری کر دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا' پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا خبر کل کیا صورت ہو' کسے معلوم کہ کون زندہ رہے اور کون مارا جائے۔ تو ان حالات میں تو ... تو میرے بیٹے جتنی دیر اور میرے ساتھ رہ سکے' میری نگاہ کے سامنے موجود رہے' اتنا ہی غنیمت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور مجھے اس لمحے یوں محسوس ہوا جیسے میرا وجود بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔

نہ جانے وہ کب تک مجھے اپنے سینے لگائے روتا رہا اور میری آنکھوں سے بھی آنسو بہتے رہے۔ مجھے ایک عجیب سی راحت کا احساس ہو رہا تھا جس کا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

میرے باپ نے ایسے انتظامات کر دیے تھے کہ ہلاکو خاں جیسے ہی اربل سے روانہ ہوتا' اسے اطلاع مل جاتی۔ توقع یہ تھی کہ ہلاکو خاں فوراً ہی اربل سے روانہ ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ خیال کیا گیا کہ شاید اس کی روانگی آئندہ روز عمل میں آئے لیکن اس دن بھی اربل سے کوئی پیغام موصول نہیں ہوا۔ اب میرے باپ کا فکر مند ہونا بجا تھا۔ اس نے دوسرے دن ہی رات کے وقت رواحہ کو اربل روانہ کر دیا کہ وہ صورت حال کا خود جائزہ لے کر آئے اور پتا چلائے' ہلاکو خاں' اربل میں کیوں رکا ہوا ہے۔ وہ حملہ کیوں نہیں کر رہا۔

رواحہ دوسرے دن رات ہوتے ہوتے لوٹ آیا۔ اس نے عجیب ہی بات بتائی۔ اس کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق ہلاکو خاں' بغداد پر حملہ کرتے ہوئے کچھ ہچکچا رہا تھا۔ اس ہچکچاہٹ کا سبب وہ مسلمان بنے تھے جو خود اس کے اردو میں شامل ہو چکے تھے۔ حاکم شیراز ابوبکر بن سعد زنگی نے ہلاکو خاں کو فی الحال کچھ صبر و تحمل کا مشورہ دیا تھا۔ ابوبکر بن سعد زندگی نے ہلاکو خاں کو یہ احساس دلایا تھا کہ خلافت بغداد کو مسلمانوں کی دینی حکومت کی حیثیت حاصل ہے اور دنیا کے تمام مسلمانوں کو بغداد سے دینی عقیدت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بغداد پر حملہ کرنے کی صورت میں سارے مسلمان یکجا ہو کر منگولوں کے مقابلے پر آجائیں۔ اگر یہ صورت حال پیش آئی تو بغداد فتح نہ ہو سکے گا۔ دوسرے یہ کہ ہلاکو خاں کو بیک وقت کئی مسلمان حکومتوں سے جنگ کرنی پڑے گی جس کا مطلب اس کی شکست کے سوا کچھ اور نہیں ہو گا۔ ہلاکو خاں نے ابوبکر بن سعد زندگی کے مشورے پر مختلف مسلم حکومتوں میں اپنے جاسوس بھیجے ہیں۔ یہ جاسوس مسلمان ہیں۔ ان جاسوسوں کو یہ تجزیہ کر کے لوٹنا ہے کہ دوسری مسلمان حکومتیں تو بغداد پر متوقع حملے کے بارے میں سن کر جنگی تیاریاں نہیں کر رہیں۔ ہلاکو خاں انہی جاسوسوں کی واپسی کے بعد کوئی فیصلہ کرے گا۔

رواحہ بڑی اہم معلومات حاصل کر کے لوٹا تھا۔ اتنے کم وقت میں اس قدر اہم نوعیت کی معلومات حاصل کر لینا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ میرا باپ اسی لیے تو اس پر اعتماد کرتا تھا اور اسی لیے زبیر کی جائے اسے اربل بھیجا تھا۔ میرے باپ نے رواحہ کی پیٹھ تھپک کر اسے آرام کرنے کے لیے کہا۔

رواحہ آرام کرنے چلا گیا تو میرے باپ نے ایک طویل سانس لیا اور بولا۔ "کاش خلیفہ محترم نے ابن العلقمی کی فریب کاریوں کا شکار ہو کر دیگر مسلمان حکومتوں سے تعلقات خراب نہ کیے ہوتے۔ کاش ایسا نہ ہوتا تو آج بغداد کی عزت و آبرو بچانے کے لیے وہ سب بھی سینہ سپر ہو جاتے اور ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اگر پھر بھی وہ حملہ کرتا تو منہ کی کھاتا مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ اگر اب وقتی

طور پر ہلاکو خاں حملہ کرتے ہوئے ہچکچا رہا ہے تو کچھ دن بعد اس کی یہ ہچکچاہٹ ختم ہو جائے گی۔ جب اس کے بھیجے ہوئے جاسوس واپس ہوں گے اور اسے بتائیں گے کہ بغداد پر متوقع حملے سے کسی مسلمان حکومت کو تشویش نہیں تو وہ پہلے سے زیادہ اعتماد و قوت کے ساتھ بغداد پر حملہ آور ہو گا۔"

میرا باپ بہت دیر تک اس صورت حال پر ملال کرتا رہا اور میں اس کی باتیں توجہ سے سنتا رہا۔ میں نے صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے جو اندازہ لگایا تھا' اس کی روشنی میں ہر سمت سے خطرہ ہی خطرہ نظر آ رہا تھا۔ ایسی صورت میں' میں اس قابل بھی نہیں تھا کہ اپنے باپ کو جھوٹی تسلیاں ہی دے سکتا۔ اب بے چینی کے سبب میرا باپ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔

معاً" وہ بڑبڑایا۔ "زبیر کو اب تک لوٹ آنا چاہیے تھا۔"

"اسے تو نے کہاں بھیجا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"وہ ان افراد سے معلومات حاصل کرنے گیا ہے جنہیں میں نے وزیر ابن العلقمی کی نگرانی پر مامور کیا ہے۔" میرے باپ نے جواب دیا۔ "ان حالات کے پیش نظر میں اس نمک حرام کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھنا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد میں کچھ نہیں بولا۔ زبیر کافی دیر بعد لوٹا۔ اس وقت تک میرا باپ مضطرب ہی رہا۔ زبیر جب میرے باپ کو بتا رہا تھا کہ اس دن ابن العلقمی کس کس سے ملا اور کس سے اس کی کیا گفتگو ہوئی تو اس کی زبان سے ایک نام سن کر میں چونک اٹھا۔ زبیر میرے باپ کو بتا رہا تھا۔ "وہ سخت حیران ہے کہ ہلاکو اب تک بغداد پر کیوں حملہ نہیں کر رہا۔ گزشتہ روز وہ اپنے بھائی کو بھی زبانی پیغام دے کر ہلاکو خاں کے پاس بھیج چکا ہے مگر وہ مطمئن نہیں۔ آپ کے علم ہی میں ہے کہ جب سے مشہور فلسفی اور عالم ریاضی خواجہ نصیر الدین طوسی' بغداد آیا ہے' ابن العلقمی کی اس پر خاص نوازشیں رہی ہیں۔ آج خواجہ نصیر الدین طوسی' ابن العلقمی سے ملا تو اس نے خواجہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ خواجہ نصیر الدین طوسی اس کا نمائندہ بن کر ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کر لے گا کیونکہ وہ بہت دانشمند آدمی ہے۔ ابن العلقمی کو اپنے ذرائع سے یہ علم ہو چکا ہے کہ ہلاکو خاں حملہ کرنے سے کیوں گریز کر رہا ہے۔ خواجہ نصیر الدین طوسی کو وہ اسی لیے ہلاکو خاں کے پاس بھیجنا چاہتا ہے کہ وہ ہلاکو خاں کو کسی دوسری مسلمان حکومت کے مداخلت نہ کرنے کا یقین دلا سکے۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے ابن العلقمی کی بات مان لی ہے اور وہ کل صبح ہی اربل کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔" اس کے بعد زبیر اور بھی بہت سے افراد کے بارے میں بتاتا رہا جو وزیر ابن العلقمی سے ملے تھے مگر میرا ذہن خواجہ نصیر الدین طوسی میں الجھا ہوا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا' منگولوں کے خاقان منگو خاں نے ہلاکو خاں سے کہا تھا کہ اگر خواجہ نصیر الدین طوسی' ہلاکو خاں کو ملجائے تو وہ اسے قراقرم بھیج دے۔ ان حالات میں خواجہ نصیر الدین طوسی کا ہلاکو خاں کے پاس جا کر اسے یہ یقین دلانا کہ کوئی دوسری مسلمان حکومت مداخلت نہیں کرے گی' خاصی اہم بات تھی۔ جب اس کا بڑا بھائی منگو خاں' اس شخص سے ملنے کا مشتاق تھا اور اس کی صلاحیتوں کا معترف تھا تو خود وہ اس سے متاثر کیوں نہ ہوتا۔

زبیر اب تمام حاصل کردہ معلومات بیان کر کے جا چکا تھا مگر میں ابھی تک سوچ میں غرق تھا۔ میری کیفیت کو بہت جلد میرے باپ نے بھی محسوس کر لیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تو کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے' میرے بیٹے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ اگر نصیر الدین طوسی' ہلاکو خاں کے پاس پہنچ گیا تو یہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"کیوں؟"

جواب میں' میں نے اسے وہ باتیں بتائیں جو میرے علم میں تھیں اور آخر میں کہا۔ "میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ تو اس شخص کو اغوا کر لے اور اربل نہ

جانے دے۔"

"ایسا کرنے سے صرف ایک فائدہ ممکن ہے کہ کچھ دن مزید ہلاکو خاں حملہ نہ کرے۔ اس کے سوا کچھ اور حاصل نہیں۔" میرے باپ نے کہا۔

"آج نہیں تو کل ہلاکو خاں کو پتا چل ہی جائے گا کہ اس نے بغداد پر حملہ کیا تو اس کے مقابلے پر صرف ایک حکومت ہوگی اور وہ بھی ایک ایسی حکومت جو بے دست و پا ہو چکی ہے اور سازشوں کا شکار ہے۔ ایسی صورت میں خواجہ نصیرالدین طوسی کو اس کے پاس جانے سے روک دینے اور اغوا کر لینے سے کچھ حاصل نہیں۔ جلد یا بدیر ہونا وہی ہے جو سوچا جا چکا ہے۔ ہلاکو خاں بہرحال بغداد پر حملہ کرے گا' خواہ اس کے پاس خواجہ نصیرالدین طوسی پہنچے یا نہ پہنچے۔ اس وقت ہماری کیفیت ایسی ہے جیسے ہم برزخ میں ہوں اور یہ کیفیت بہت روح فرسا ہے۔ جو ہونا ہے' وہ ہو کر رہے گا' اسے کوئی نہیں ٹال سکتا' پھر ان جھوٹی تسلیوں سے دل کو کیوں بہلایا جائے!"

حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے باپ نے جو نتائج اخذ کیے' وہ غلط نہیں تھے کیونکہ خواجہ نصیرالدین طوسی کے اغوا سے وقتی طور پر ممکن ہے جنگ ٹل جاتی لیکن آخر کار یہ دن آنا ہی تھا۔ میں نے اسی لیے اپنے باپ سے اس مسئلے پر مزید گفتگو نہیں کی مگر اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال اور بھی آیا۔

"تو نے شاید ایک بار کہا تھا کہ خلیفہ اپنے وزیر کی نمک حرامی کا ثبوت چاہتا ہے اور تیرے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں۔" میں نے اپنے باپ کو مخاطب کیا۔

"ہاں مجھے یاد ہے کہ میں نے ایسی کوئی بات تجھ سے کہی تھی۔"

"تو پھر خواجہ نصیرالدین طوسی کو ضرور اغوا کرنا چاہیے۔" میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"تو غالباً" اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہے کہ اس عیار نے خواجہ نصیرالدین طوسی کو کوئی تحریری پیغام دیا ہوگا۔ اگر تو ایسا سوچ رہا ہے تو اپنے ذہن سے اس بات کو نکال دے۔ ابن العلقمی بڑے سازشی اور عیار دماغ کے مالک ہے۔ اس سے ایسی کوئی غلطی سرزد ہو جائے گی' اس بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے واقعی یہی سوچا تھا مگر اپنے باپ کی بات سن کر مجھے مایوسی ہوئی' پھر بھی ایک موہوم امید کے پیش نظر بولا۔ "کیا خواجہ نصیرالدین طوسی کو کسی بھی طرح اس پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خلیفہ کے سامنے سب کچھ بیان کر دے؟"

"ناممکن!" میرے باپ نے جواب دیا۔ "اول تو خود خواجہ نصیرالدین طوسی پر ہاتھ ڈالنا ناممکن سی بات ہے دوسرے اگر کسی طرح اسے خلیفہ محترم کے سامنے سچ بولنے پر مجبور یا آمادہ بھی کر لیا گیا تو وہ ہرگز ان باتوں پر یقین نہیں کریں گے۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ ان کا وزیر بے گناہ ہے اور اس کے خلاف کوئی سازش تیار کی گئی ہے۔ دراصل ابن العلقمی اتنا چالاک ہے کہ وہ خود خلیفہ محترم کے کانوں میں ایسی باتیں ڈالتا رہتا ہے جنہیں وہ اپنے خلاف افواہیں بتاتا ہے۔ ایسی صورت میں خلیفہ محترم کے سامنے وہ باتیں آئیں گی جو وہ پہلے ہی خود ابن العلقمی کی زبانی سن چکے ہیں تو ان باتوں کو افواہ ہی تصور کریں گے۔"

میرے باپ کی باتوں میں وزن تھا جنہوں نے مجھے خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر یہ کہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو وہ خود اب تک اس پر عمل کر چکا ہوتا۔ وہ بہرحال میرا باپ تھا اور مجھ سے زیادہ ذہین تھا۔ جو امکانات میرے ذہن میں آئے تھے' یقیناً" اس کے ذہن میں بھی آئے ہوں گے مگر وہ لاحاصل تھے۔ کوئی ایسی صورت ممکن نہیں تھی کہ خلیفہ کو اس کے وزیر کی نمک حرامی کا یقین دلایا جا سکتا۔

میں نے اپنے باپ سے وزیر ابن العلقمی کے اختیارات سے متعلق جو کچھ سنا تھا' اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس کے پاس سوائے چند اختیارات نہ ہونے کے باقی تمام اختیارات ہیں۔ خلیفہ نے تمام کاروبار حکومت کی نگرانی اور انجام دہی اسی کی رائے اور سمجھ پر چھوڑ دی ہے۔ میرے خیال میں جو چند باتیں وزیر کے اختیار سے باہر تھیں' وہ یہ تھیں۔ پہلا

اختیار ولیعہدی کے سلسلے میں تھا جو وزیر کو حاصل نہیں تھا۔ خلیفہ جسے مناسب سمجھتا اپنا ولیعہد مقرر کر سکتا تھا۔ دوسرا اختیار کسی شخص کی تقرری یا معزولی! چاہے اسے خود وزیر ہی نے عہدہ دیا ہو' خلیفہ اس شخص کو معزول کر سکتا تھا لیکن وزیر کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ خلیفہ کے کسی مقرر کردہ شخص کو برخواست کر دے۔ اگر وزیر ابن العلقمی کو یہ اختیار حاصل ہوتا تو وہ کبھی کا میرے باپ کو معزول کر چکا ہوتا۔ مجھے معلوم تھا کہ مہر خلافت بھی عموماً" وزیر ابن العلقمی کے پاس رہتی تھی تاکہ وہ خلیفہ کا دست نگر نہ رہے اور فرامین و ضروری کاغذات پر خلیفہ کی مہر ثبت کر سکے۔

پھر تیسرے دن اربل سے پیغام موصول ہوا کہ ہلاکو خاں' خواجہ نصیر الدین طوسی کی باتوں سے بہت متاثر ہوا ہے اور اسی دوران میں اس کے بھیجے ہوئے دو جاسوس بھی دو مسلمان حکومتوں سے واپس آ چکے ہیں۔ ان جاسوسوں نے ہلاکو خاں کو یقین دلایا ہے کہ وہ دونوں ممالک جہاں کا جائزہ لینے انہیں بھیجا گیا تھا' خلیفہ بغداد سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں رکھتے بلکہ وہ خلیفہ کی تباہی سے خوش ہیں۔ ان دونوں جاسوسوں اور خواجہ نصیر الدین طوسی کی یقین دہانیوں کے بعد اب بہت جلد ہلاکو خاں کوئی فیصلہ کرنے والا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہ کسی بھی وقت اولوس کو روانگی کا حکم دے سکتا ہے۔ اسی پیغام میں یہ بھی درج تھا کہ حاکم موصل بدر الدین لولو بھی ہلاکو خاں سے ملا ہے اور اس نے اپنی اطاعت کا اظہار کیا ہے۔ ہلاکو خاں نے حاکم موصل کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی مسلمان فوجوں کو لے کر اس کے اولوس (لشکر) میں شامل ہو جائے۔ حاکم موصل نے اس حکم کی تعمیل کا یقین دلایا ہے اور وہ بھی موصل سے روانہ ہو چکا ہے۔

اب وہ وقت آ گیا تھا جب میں مسلمان اردو میں شامل ہو جاتا۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے باپ سے کر دیا اور آخر میں بولا۔ "مجھے منگولوں کے طریق جنگ سے پوری طرح آگہی ہے لیکن عرب کس طرح لڑتے ہیں' ان کے پاس کیسے ہتھیار ہیں' ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے کیا طریقے ہیں اور اپنے اردو کی تنظیم کس طرح کرتے ہیں' میں ان تمام باتوں سے ناواقف ہوں۔ اب یہ ضروری ہے کہ آپ مجھے سپہ سالار ایبک دوادار کے سپرد کر سکیں تاکہ میں دوسرے عرب سپاہیوں کے ہمراہ جنگی مشق میں حصہ لے سکوں۔"

اسے تازہ ترین اطلاعات پہنچانے کے لیے محل بھی جانا تھا اس لیے جب وہ روانہ ہوا تو مجھے بھی ساتھ لے لیا۔

محل پہنچ کر اس نے مجھے ایک کمرے میں چھوڑا اور خود خلیفہ سے ملنے چلا گیا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ میرے باپ خلاف توقع جلد لوٹ آیا۔ پتا چلا کہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد خلیفہ سو رہا ہے اور اس وقت اسے بیدار نہیں کیا جا سکتا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد سونا اس کی عادت تھی اور اس وقت کسی کو اجازت نہیں تھی کہ اسے بیدار کر سکے۔ ہر چند کہ میرا باپ' خلیفہ تک بہت اہم نوعیت کی اطلاعات پہنچانا چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی۔ میرے باپ کے علاوہ خلیفہ سے براہ راست ملنے کی اجازت بہت کم لوگوں کو تھی۔ خلیفہ تک کوئی بات پہنچانے اور احکامات حاصل کرنے کے لیے ایک وزارت الگ سے قائم تھی جسے وزارت تنفید کہا جاتا تھا۔ خلیفہ سے اسی کے ذریعے رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا۔ اس وزارت میں دو بڑے عہدیدار تھے جن میں سے ایک' اردو (لشکر) اور خلیفہ کے درمیانی رابطہ کا کام دیتا تھا اور دوسرا' عوام سے رابطہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ خلیفہ کے جاری کردہ احکامات عوام تک پہنچانے کا ذمے دار سمجھا جاتا تھا مگر میرے باپ کے معاملے میں یہ محکمہ حائل نہیں ہوتا تھا اور یہ احکامات خود خلیفہ کی طرف سے تھے۔

"چل بوغا!" میرے باپ نے آتے ہی مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ "جب تک خلیفہ محترم بیدار ہوں' میں تجھے سپہ سالار ایبک کے سپرد کر آؤں۔ مجھے خیال تھا کہ شاید ابھی خلیفہ محترم سوئے نہیں ہوں گے مگر

محل تک پہنچتے پہنچتے شاید دیر ہو گئی۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے محل سے نکل کر اس کے جنوبی حصے کی طرف بڑھا جہاں محل سے متصل بہت سے چھوٹے چھوٹے پختہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ میں نے وہاں سخت پہرا دیکھا۔ اپنے باپ سے استفسار کرنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ انہی مکانوں میں رقیب خاندان کے افراد نظر بند تھے جنہیں وہاں سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی اسی لیے وہاں قدم قدم پر سخت پہرا تھا۔

ان مکانوں کا سلسلہ ختم ہوا تو میں نے ایک وسیع و عریض میدان میں ہر طرف پھیلے ہوئے مسلح سپاہیوں کو دیکھا جو جنگی مشقوں میں مصروف تھے۔ اسی جانب بڑا سا یورت نصب تھا جس کے در پر برہنہ شمشیریں لیے سپاہی چوکنا کھڑے تھے۔ میرا باپ اسی یورت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں نے مسلح سپاہیوں کے جسموں پر سیاہ وردی دیکھی جو مجھے بڑی عجیب سی لگی۔ حالانکہ میں پہلے بھی سپاہیوں کے جسموں پر سیاہ وردیاں دیکھ چکا تھا مگر بیک وقت اتنی بڑی تعداد میں یہ وردیاں دیکھ کر مجھے عجیب سے حزن کا احساس ہوا۔

میں نے واضح طور پر یہ بات محسوس کی کہ میرے باپ کی شخصیت ان لوگوں کے لیے قابل احترام اور جانی پہچانی تھی۔ اسے کہیں نہیں روکا گیا۔ جب وہ مجھے لیے ہوئے یورت کے در پر پہنچا تو برہنہ شمشیر بکف ایک طرف ہٹ گئے اور یورت میں جانے کا راستہ دے دیا۔

میں اپنے باپ کے ہمراہ یورت میں داخل ہوا۔ وہاں میں نے تین افراد کو دیکھا جن میں سے ایک بارعب شخص درمیان میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور دو افراد مودب انداز میں اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

میرے باپ کی طرف بارعب شخص نے نگاہ اٹھائی اور میرے باپ نے اسے سلام کیا۔ میں نے بھی اپنے باپ کی تقلید میں وہی الفاظ دہرائے۔

بارعب شخص نے میرے باپ کو ہاتھ کے اشارے سے دائیں جانب بیٹھنے کو کہا۔ وہ متوسط عمر کا شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں اور رنگ سفید! چہرے پر چھوٹی سے داڑھی تھی جو اس کی بارعب شخصیت میں اضافے کا سبب نظر آتی تھیں۔ اس کا چہرہ کتابی تھا اور ہونٹ پتلے، اس کے جسم پر بھی سیاہ وردی تھی مگر عام سپاہیوں سے ذرا مختلف تراش اور بہترین کپڑے کی!

میرے خیال کے مطابق وہی بارعب شخص سپہ سالار ایک دوا دار ہو سکتا تھا اور پھر کچھ دیر بعد ہی میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔

سپہ سالار کیونکہ میرے باپ کے عہدے اور حیثیت سے آگاہ تھا اس لیے اس نے وہاں موجود دونوں افراد کو رخصت کر دیا۔ وہ دونوں بھی وردی ہی میں تھے اس لیے میں نے سمجھا کہ ان کا تعلق بھی اردو ہی سے ہو گا اور وہ کسی سلسلے میں سپہ سالار سے مشورہ کرنے آئے ہوں گے۔ میرے باپ کے فرائض کو مد نظر رکھتے ہوئے شاید سپہ سالار یہ سمجھا تھا کہ کسی اہم اور خفیہ گفتگو کی خاطر میرا باپ اس کے پاس آیا تھا۔ غالباً" اسی لیے اس نے وہاں موجود دونوں افراد کو رخصت کر دیا تھا۔

جب وہ دونوں چلے گئے تو میرے باپ نے سپہ سالار کو مخاطب کیا۔ "اے محترم ایک! کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی جس کے لیے خلوت ضروری ہوتی۔ میں تمہارے پاس ایک بہت معمولی کام سے آیا ہوں۔"

"میں واقف ہوں ہشام کہ تمہاری نظر میں جو معمولی کام ہوتے ہیں، ان کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔" سپہ سالار مسکرا کر بولا۔ "پھر بھی بیان کرو!"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔" میرے باپ بولا۔ "میں اپنے بیٹے کو تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف مڑا۔ "یہ فنون حرب و ضرب میں کامل دستگاہ رکھتا ہے مگر یہ صرف میرا خیال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے تم اپنی نظر سے دیکھو

جانچو اور اس کا امتحان لو! پھر اس کی لیاقت و اہلیت کے مطابق اسے کوئی عہدہ دو۔"

"غالباً" یہ وہی ہے جس کا ذکر مجھ سے تم نے پہلی ملاقات میں کیا تھا!" سپہ سالار بغور میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "وہی جو منگولوں کے درمیان پلا بڑھا ہے اور ان کے طریق جنگ سے پوری طرح واقف ہے!"

"ہاں یہ وہی ہے' میرا اکلوتا بیٹا!" میرے باپ کی آواز بھرا سی گئی۔ خود اسی کی یہ خواہش تھی کہ یہ لشکر کے ساتھ لڑے اور میں ... میں اس کی خواہش نہ ٹھکرا سکا۔"

"اس نوجوان کی صلاحیتوں اور تجربے سے تو ہم بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے ذریعے ہمارے سپاہی' منگولوں کے طریق جنگ سے واقف ہو سکتے ہیں اور پھر اس کا توڑ کیا جا سکتا ہے۔ جب میں نے پہلی بار اس نوجوان کے بارے میں سنا تھا' اسی وقت سوچا تھا' تم سے کہوں گا کہ اسے میرے سپرد کر دو مگر بس سوچ کر رہ گیا۔ مجھے یہ خیال آگیا تھا کہ یہ بلاکو خاں کے ساتھ اگلی صفوں میں لڑ چکا ہے اور اس وقت بھی یہ بلاکو خاں کے ساتھ تھا جب وہ ایران میں تباہی پھیلا رہا تھا۔"

"تم نے غلط نہیں سنا محترم ایبک!" میرے باپ نے کہا۔

"اسے کئی جنگوں کا تجربہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ ذہین اور بہادر بھی ہے جس کا مشاہدہ میں خود کر چکا ہوں۔ میں یہ سب کچھ اس لیے نہیں کہہ رہا کہ یہ میرا خون ہے بلکہ یہ حقیقت ہے تم خود اس کا امتحان لے سکتے ہو۔"

"مجھے تمہاری بات پر پورا یقین ہے مگر پھر بھی تمہاری تسلی اور اصرار کو مدنظر رکھتے ہوئے میں اس کا امتحان لوں گا۔ آؤ یہ کام ابھی ہو جائے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں چاہتا ہوں کہ جنگ سے قبل یہ عربی فوجی تنظیم اور طریق جنگ سے بھی واقف ہو جائے تاکہ بہتر طور پر لڑ سکے۔" میرے باپ نے بھی اٹھتے ہوئے کہا اور میں بھی کھڑا ہو گیا۔

"یقیناً!" سپہ سالار خیمے کے در کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ بہت جلد سب کچھ سیکھ جائے گا۔ ہاں تم نے ابھی تک اس کا نام نہیں بتایا اور یہ کہ اسے عربی زبان بھی ٹھیک طرح آتی ہے یا نہیں!"

"عربی زبان یہ اچھی طرح بول اور سمجھ سکتا ہے کیونکہ اسے میں نے خود عربی سکھائی ہے اور اس کا نام بطریق بوغا ہے۔" میرے باپ نے جواب دیا۔

"بطریق بوغا!" سپہ سالار کے لہجے سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "کیا تم نے اس کا نام اب تک نہیں بدلا؟"

"نام بدلنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا محترم ایبک! اصل مسئلہ عقائد کا ہوتا ہے۔" میرے باپ نے جواب دیا۔

"تو کیا تم نے اسے مسلمان نہیں کیا؟" سپہ سالار نے مزید حیرت سے کہا۔

"نہیں!" میرے باپ نے یورت سے نکلتے ہوئے جواب دیا۔ "اسلام قبول کرنا یا نہ کرنا ہر فرد کا اپنا مسئلہ ہے۔ ہاں اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت ضرور دی جا سکتی ہے مگر بدقسمتی سے گزشتہ دنوں میں اتنا مصروف رہا کہ یہ فرض ادا نہ کر سکا۔ یوں بھی مسلمان ہو جانے کا زبانی اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک کہ قلب و ذہن اس کی طرف مائل نہ ہوں اور وہ بھی اسلام کی صداقت کا اقرار نہ کریں۔ کسی مسلمان کی اولاد ہونے سے کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا بلکہ مسلمان ہونے کے لیے ہر بالغ کو اسلام کی تعلیمات سمجھنا اور اس پر صدق دل سے ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرا بیٹا ابھی مسلمان نہیں ہوا لیکن اگر زندگی اور حالات نے مہلت دی تو میں اسے دعوت اسلام ضرور دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میری دعوت پر لبیک کہے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میں اسے صحیح معنی میں مسلمان دیکھنا چاہتا ہوں' صرف نام کا مسلمان نہیں۔"

میں نے سپہ سالار ایبک دوادار کو اپنے باپ کی
توں سے متاثر ہوتے محسوس کیا جس کا اظہار اس
کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ وہ میرے باپ کی طرف
یکھتے ہوئے بولا۔ "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو ہشام! میں
ہارے خیال سے متفق ہوں۔ افسوس کہ ہم میں
سے بیشتر صرف نام کے مسلمان ہیں اور ہمارے دل
یمان سے خالی ہیں۔"

یہی باتیں کرتے ہوئے سپہ سالار اور میرا باپ'
رت سے کافی دور نکل آئے۔ میں ان دونوں کے
یچھے پیچھے چل رہا تھا۔

سپہ سالار' سپاہیوں کے ایک ہجوم کی طرف بڑھا جو
یک پیڑ کے سامنے نظر آرہا تھا۔ وہاں سپاہی تیراندازی
ں مشق میں مصروف تھے۔ اسے آتا دیکھ کر سپاہی
ب سے ایک طرف ہو گئے۔

میں نے ایک مردہ جانور کو درخت سے لٹکتا ہوا
یکھا جس کے جسم میں کئی تیر پیوست تھے۔ سپہ سالار
کے حکم پر جانور کے جسم سے تیر نکال لیے گئے اور
سے رخ بدل کر ٹانگ دیا گیا۔ اب اس کی پشت
امنے کی طرف تھی۔ سپاہیوں کے چہروں سے حیرت
ا اظہار ہو رہا تھا۔ غالباً" اس حیرت کا سبب وہاں
ات خود سپہ سالار کی آمد تھی۔ ان سپاہیوں کے دلوں
ں تجسس پیدا ہوا ہو گا کہ سپہ سالار وہاں کیوں آیا
ہے۔ سپہ سالار کو وہاں موجود پا کر اردو کے بڑے بڑے
مردار بھی شاید وہاں جمع ہونے لگے تھے۔ میں نے یہ
ندازہ اس سے لگایا کہ عام سپاہی ان کے احترام میں
ی پیچھے ہٹ گئے تھے۔

سپہ سالار کے حکم پر مجھے تیر اور کمان دیے گئے' پھر
ں نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں نے سنا ہے کہ منگول
ت اچھے تیر انداز ہوتے ہیں مگر ہمارے سپاہی بھی
ں ہنر میں کم نہیں ہیں۔ ہم اعلیٰ درجے کے تیرانداز
و اماۃ الحق کہتے ہیں۔ ایک اماۃ الحق کے لیے یہ کوئی
شکل کام نہیں ہوتا کہ وہ جانور کی ریڑھ کی ہڈی کے
یک ایک جوڑ کو تیروں سے چھیدتا چلا جائے۔ تیر
اندازوں میں یہ خطاب بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔ کیا تم
بھی ایسا کر سکتے ہو؟"

وہ بڑا مشکل امتحان تھا کیونکہ اس سے پہلے میں نے
کبھی ایسا کوئی تجربہ نہیں کیا تھا۔ میں فیصلہ کن طور پر
کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس امتحان میں کامیاب
رہوں گا یا نہیں لیکن بہرحال مجھے خود پر اعتماد تھا۔ میں
نے چند لمحے توقف کے بعد سپہ سالار کی بات کا جواب
دیا۔ "اے محترم! میں نے اس سے پہلے کبھی اس
طرح کی مشق نہیں کی مگر پھر بھی کوشش ضرور کروں
گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ منزل بڑی مشق کے بعد
حاصل ہوتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ صرف جانور کی گردن
میں تیر پیوست کر دو! بعد میں مشق کر کے تم اس پر بھی
قادر ہو سکتے ہو کہ تمہیں اماۃ الحق کا خطاب مل
سکے۔" سپہ سالار نے کہا۔

"اے محترم! مجھے کوشش کرنے دیں۔ اگر میں
ناکام رہا تو آپ کے دوسرے حکم کی تعمیل کروں گا
کیونکہ گردن کو تو کوئی بھی معمولی تیرانداز نشانہ بنا سکتا
ہے۔" میں بولا۔

"ٹھیک ہے' کوشش کرو!" سپہ سالار نے مجھے
اجازت دے دی۔

فاصلہ کافی تھا۔ میں نے پیڑ کی طرف نگاہ اٹھائی اور
کمان پر تیر چڑھایا۔

میرا چلایا ہوا پہلا تیر صحیح نشانے پر بیٹھا تو سپہ سالار
نے میری پشت تھپتھپا کر مجھے شاباش دی۔ میرا حوصلہ
بڑھ گیا اور اعتماد بھی! پھر تو یکے بعد دیگرے میں تیر چلاتا
گیا۔ جب میں اس جانور کی ریڑھ کی ہڈی کے تمام
جوڑوں میں تیر پیوست کر چکا تو وہاں موجود سپاہیوں نے
ایک پرجوش نعرہ مارا۔ میرے باپ نے مجھے سینے سے
لگا لیا۔

"تو نے میری عزت رکھ لی میرے بیٹے!" میرا باپ
بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"آج تک کسی تیرانداز نے اپنی پہلی کوشش میں
یہ کامیابی حاصل نہیں کی۔ میں تمہیں مبارکباد دیتا
ہوں نوجوان اور اے نئے اماۃ الحق!" جب میں اپنے

باپ کے سینے سے جدا ہوا تو سپہ سالار نے کہا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد شمشیر زنی اور نیزہ بازی کے جوہر دکھانے کا موقع ملا اور ان امتحانات میں بھی کامیاب رہا۔

آخری امتحان نسبتاً" سخت تھا۔ مجھے بیک وقت دو گھوڑ سوار نیزہ بازوں سے نبرد آزما ہونا تھا اور وہ دونوں ہی اردو کے بہترین نیزہ بازوں میں شمار ہوتے تھے۔

میں نیزہ سنبھالے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ وہ دونوں مجھ سے کافی فاصلے پر اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ سپہ سالار نے مجھے بتایا تھا کہ جیسے ہی اس کی زبان سے "ہوجوا" نکلے میں اپنا گھوڑا حریفوں کی طرف دوڑا دوں۔ میرے حریفوں کو بھی وہ لفظ سن کر ایسا ہی کرنا تھا۔ میں چوکنا ہو کر گھوڑ پر بیٹھا ہوا تھا۔

معاً" سپہ سالار کا ہاتھ بلند ہوا اور اس نے تیز آواز میں "ہوجوا" کہا۔

میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور حریفوں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی تیزی سے میری طرف لپکے چلے آ رہے تھے۔ میں نے نیزے کو اپنی بغل کے نیچے دبا کر اسے اپنے گھوڑے کی دونوں کنوتیوں کے درمیان رکھا تھا اور اسی حالت میں سیدھا باندھے اپنے حریفوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب میرے حریف قریب آئے تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنے اپنے نیزے داہنی جانب کر لیے۔ میں نے فوراً" ہی اپنا نیزہ بائیں طرف کر لیا۔ پھر حملے میں پہل میں نے ہی کی۔ میں حریفوں کو مرعوب کرنے کی خاطر اپنے نیزے کو مسلسل جنبش دیتا رہا تھا۔

میں نے چال یہ چلی تھی کہ حملہ تو دوسرے حریف پر کیا تھا مگر ظاہر میں یہی معلوم ہوا ہو گا کہ میں پہلے حریف کو زد میں لے رہا ہوں۔ پہلا حریف یہ سمجھ کر کہ میں اس پر حملہ کر رہا ہوں، ایک دم پیچھے ہٹ گیا تاکہ میرے حملے سے بچ سکے اور اسی دوران میں، میں نے تیزی سے دوسرے حریف پر حملہ کر دیا جو غالباً" اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ نتیجے کے طور پر اس کا نیزہ، میرے نیزے کی بھرپور ضرب سے ٹوٹ گیا اور وہ مقابلے سے دست بردار ہو گیا۔ اب میرے مقابلے پر ایک نیزہ باز رہ گیا اور میں ایک نیزے باز کو تو پہلے ہی شکست دے چکا تھا۔ دوسرے نیزے باز کا نیزہ ٹوٹنے ہی میں تیزی کے ساتھ اپنے گھوڑے کو سیدھا اڑاتا چلا گیا تھا تاکہ اس دوران میں پہلا نیزے باز مجھے زخمی نہ کر دے اور ایسا ہوا بھی تھا۔ صرف چند لمحوں کا فرق پڑا تھا۔ میں پہلے ہی وہ جگہ چھوڑ چکا تھا اور اس کا نیزہ ہوا میں لہرا کر رہ گیا تھا۔

جو نیزے باز اب میرے مقابلے پر تھا، وہ بھی اپنے فن میں ماہر تھا۔ مجھے اس پر ضرب لگانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ نیزے بازی میں اپنے مدمقابل سے زیادہ قریب جانا خطرناک سمجھا جاتا ہے مگر اب اس سے لڑتے ہوئے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ یہ خطرہ مول لینا ہی پڑتا۔ یہ خطرہ مول لے کر ہی مجھے یہ موقع مل سکتا تھا کہ جس مقام کو بھی اس کے نیزے کی گردش سے خالی پاؤں فوراً" اسی طرف سے گھس کر اس پر حملہ کر دوں۔ یہی فیصلہ کر کے میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے بھی غالباً" میرا ارادہ بھانپ لیا اور بچ کر دور جانے لگتا کیونکہ قریب ہونا اس کے لیے بھی اتنا ہی خطرناک تھا جتنا میرے لیے! میں نے یہ دیکھ کر اپنے نیزے کو نیچے کی طرف سے بائیں ہاتھ میں تھام لیا اور اس کے پھل کو سیدھا اٹھائے تیزی کے ساتھ بڑھا مگر جیسے ہی اس کے قریب پہنچا نیزے کو فوراً" داہنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ میرے فریب میں آ گیا۔ وہ آخر وقت تک یہی سمجھتا رہا کہ نیزہ میرے بائیں ہاتھ میں لے رہا ہے، کیونکہ وہ حصہ اس کے نیزے کی گردش سے خالی تھا۔ اسے بائیں جانب سے حملے کی توقع تھی مگر حملہ دائیں جانب سے کیا گیا تھا۔

میرا ارادہ ہرگز یہ نہیں تھا کہ اسے زخمی کر دوں مگر پینترا بدلتے ہوئے اس کا جسم میرے نیزے کی زد میں آ ہی گیا۔ میرا نیزہ اس کے دائیں بازو کو چھیدتا ہوا پار ہو گیا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ دائیں ہاتھ ہی میں وہ بھی نیزہ تھامے ہوا تھا جو چھوٹ کر زمین پر گر

گیا۔

سارا میدان ایک بار پھر تحسین آمیز نعروں سے گونج اٹھا۔ میں جیت چکا تھا' اس لیے اپنا نیزہ اس کے بازو سے جھٹکے کے ساتھ نہیں بلکہ آہستہ آہستہ کھینچ لیا۔ اس نے اپنی چیخ روکنے کے لیے دونوں ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تھے۔

سپہ سالار' میرا باپ اور اردو کے دو بڑے سردار' اس میدان کے ایک کنارے پر کھڑے ہوئے تھے۔ میں اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

جب میں اپنے گھوڑے سے اترا تو میرے باپ نے میری پیشانی چوم لی۔ میں نے سپہ سالار کی طرف دیکھتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "میرا ارادہ اسے زخمی کرنے کا نہیں۔۔۔"

"کوئی بات نہیں نوجوان!" سپہ سالار میری بات کاٹ کر بولا۔

"اس کی بجائے تم بھی زخمی ہو سکتے تھے۔ میں نے خود کئی بار محسوس کیا تھا کہ تم نے موقع ملنے کے باوجود ان کے جسموں کو نشانہ نہیں بنایا۔" یہ کہہ کر اس نے میری پیٹھ تھپکی۔ چند لمحے توقف کے بعد میرے باپ کو مخاطب [illegible] تمہارا بیٹا ایسا ہی ہے ہشام کہ تم اس پر فخر کرو۔ تم نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ درست تھا۔ واقعی یہ فن حرب و ضرب میں باکمال ہے۔ بیک وقت نیزے باز' بہترین شمشیر زن اور بہترین نشاب [illegible] انداز) صرف قائد ہی ہوتے ہیں اور میں اس نوجوان [illegible] یہی عہدہ دینے [illegible] کا اعلان کرتا ہوں۔"

اس وقت [illegible] مجھے علم نہیں تھا [illegible] قائد کوئی بڑا عہدہ ہوتا [illegible] مگر اپنے باپ کے چہرے پر بشاشت دیکھ کر [illegible] یہ اندازہ ضرور [illegible] گیا کہ وہ کوئی معمولی عہدہ [illegible] بہرحال [illegible] ہوگا۔

[illegible] سالار [illegible] کوئی خیال [illegible] باپ سے مخاطب ہوا۔ "ہشام! تم [illegible] یہ کہا تھا [illegible] فن حرب [illegible] آشنا [illegible] بازی۔

جو مظاہرہ کیا' اس سے تو تمہاری بات کی تردید ہوتی ہے۔"

"ہاں' میں نے یہ بات صاف طور پر محسوس کی تھی۔" میرا باپ بولا۔ "اس نے عربوں کی نیزہ بازی کا مخصوص طریقہ مواجہہ اپنایا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خود حیرت ہوئی تھی لیکن میرے خیال میں یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیوں بونا! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں' تیرا کہنا درست ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے اس سے پہلے کبھی نیزے کو اس طرح گردش نہیں دی لیکن جب میں پہلے نیزے باز سے نبرد آزما ہوا تھا تو میں نے اسے اس طرح لڑتے دیکھا تھا اور لڑنے کا یہ انداز مجھے پسند آیا تھا۔ میں نے اسی لیے دوسرے مقابلے میں اس مخصوص طریقے کو اپنایا۔" میں بولا۔

"لیکن اس قدر جلد اور بغیر مشق کیے اس مخصوص طریقے کو آزمانا' یقیناً" ذہانت کی دلیل ہے۔" سپہ سالار نے پرستائش لہجے میں کہا' پھر بولا۔ "کیا تمام منگول سپاہی ایسے ہی ذہین اور بہادر ہوتے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' میرا باپ بول اٹھا۔ "سب اتنے ذہین اور بہادر نہیں ہوتے محترم ایک! لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ بہت سفاک اور درندے ہوتے ہیں۔"

کچھ دیر کے بعد میرا باپ مجھے وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ خلیفہ سے ملاقات کرنے کے بعد سیدھا رضافہ چلا جائے گا اور آئندہ روز مجھ سے اسی میدان میں ملاقات کرے گا۔

میں پورے دو دن ان کے ساتھ جنگی مشقوں میں مصروف رہا اور رات کے وقت انہی چھوٹے چھوٹے مکانات میں سے ایک کی کوٹھری میں سویا جو اردو کے لیے مخصوص تھے وہ چھوٹے چھوٹے مکانات محل کی جنوبی سمت ہی میں اس میدان سے کچھ فاصلے پر بنے ہوئے تھے جہاں جنگی مشقیں کی جا رہی تھیں۔

ان دو دنوں کے درمیان مجھے عربوں کی فوجی تنظیم سے پوری طرح آگہی ہو گئی۔ مجھے بہت سی نئی باتیں

معلوم ہوئیں اور اسی دوران میں انہوں نے بھی مجھ سے بہت کچھ معلوم کیا۔ منگولوں کے طریق جنگ اور ان کی فوجی تنظیم سے متعلق مجھے جو کچھ معلومات تھیں، میں نے انہیں بتادیں۔

دس جوانوں کا ایک دستہ جس شخص کے تحت ہوتا تھا، اسے عریف کہا جاتا تھا۔ دس عریفوں یا سو جوانوں پر نقیب ہوتا تھا۔ دس نقیبوں یا ایک ہزار جوانوں پر مقررہ عہدیدار قائد کہلاتا تھا اور یہی عہدہ مجھے دیا گیا تھا۔ دس قائدوں یعنی دس ہزار سپاہیوں کے سربراہ کو وہ امیر کہتے تھے۔ ان امیروں کی تعداد، سپاہیوں کی تعداد کے پیش نظر کم یا زیادہ ہو سکتی تھی۔ تمام امیر، سپہ سالار کے ماتحت ہوتے تھے۔ ان کے اردو میں صرف تین امیر تھے جن میں سے ایک امیر میرا افسر تھا مگر کیونکہ مجھ پر سپہ سالار ایک دوادار کی خصوصی توجہ تھی اس لیے مجھے امیروں جیسی حیثیت حاصل تھی۔ سپہ سالار ان دو دنوں میں کئی بار مجھے اپنے یورت میں بلا چکا تھا اور یہ ایک قائد کے لیے بڑی عزت کی بات تصور کی جاتی تھی۔ سپہ سالار مجھ سے عموماً منگولوں کے طریق جنگ پر گفتگو کرتا تھا اور اس وقت اردو کے تینوں امیر بھی وہاں موجود ہوتے تھے تاکہ وہ بھی ان معلومات سے فیضیاب ہو سکیں۔

دوسرے دن میرا باپ مجھ سے ملنے آیا تو تھا مگر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکا۔ اول تو اسے جانے کی جلدی تھی، دوم میں بھی اپنے دوستوں کو جنگی مشقیں کرانے میں مصروف تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس وقت تک ہلاکو خاں، اربل سے روانہ نہیں ہوا تھا لیکن اس کے روانہ ہوتے ہی فوری طور پر اطلاع مل سکتی تھی کیونکہ ہلاکو کو اس سلسلے میں سخت تاکید کردی گئی تھی۔ وہی ہلاکو جس سے خود میں بھی رواحہ کے ہمراہ ایک بار مل چکا تھا اور جو اربل میں ہلاکو خاں کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

مجھے پہلے ہی دن فوجی وردی اور تمام ہتھیار فراہم کر دیے گئے تھے۔ مجھے ایک مخصوص یمنی تلوار "مخفورہ" دی گئی تھی۔ یہ مخصوص قسم کی تلوار صرف قائدوں اور امیروں ہی کے پاس ہوتی تھی۔ اس تلوار کے اندر کی نالیاں نہروں کی طرح بنی ہوئی تھیں جو مدور سوہان کے ذریعے کھودی گئی تھیں۔ انہیں تلواروں میں سے میں نے ایک پر مرہم کھدے ہوئے دیکھا۔ وہ تلوار میں نے اردو کے ایک اور قائد کے پاس دیکھی تھی کیونکہ اس نے بھی میری تلوار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

تلوار کے ساتھ ہی مجھے دو قسم کی ڈھالیں بھی دی گئی تھیں اور دو ڈھالیں بھی صرف قائدوں ہی کو دی جاتی تھیں۔ عام سپاہیوں کے پاس صرف ایک ڈھال ہوتی تھی۔ دونوں ڈھالوں میں سے ایک قبہ نما تھی جس کے کنارے جھکے ہوئے تھے۔ یہ خمیدہ مگر والی ڈھال پتھروں اور تیروں کی بوچھار میں خوب کام دے سکتی تھی اور اس پر تلوار کے وار بھی بہت آسانی سے روکے جا سکتے تھے مگر اس ڈھال میں ایک خرابی تھی، وہ یہ کہ اس پر نیزے کا وار نہیں روکا جا سکتا تھا۔ اس ڈھال میں با آسانی نیزہ پیوست ہو سکتا تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ نیزے کی ضرب روکنے کے لیے دوسری ڈھال بھی دی گئی تھی تاکہ جس وقت جس طرح کی ڈھال درکار ہو، استعمال کی جا سکے۔ دوسری ڈھال مستطیل تھی اور یہ ڈھال پہلی سے زیادہ کار آمد تھی کیونکہ اس پر نیزے کا وار بھی روکا جا سکتا تھا اور یہ تیروں سے بچنے کے لیے بھی استعمال کی جا سکتی تھی۔ ایک ڈھال کا سرا سوار کے سر کو اور اس کی لمبائی جسم کو محفوظ رکھنے میں بڑی کار آمد تھی۔ اس کی آڑ میں سوار، اپنا سر کھولے بغیر ہی سامنے کی چیزوں کو بڑی آسانی سے [illegible] سکتا تھا۔ یہ ڈھال دمشقی تھی اور پہلی ڈھال [illegible] تھی۔ میں نے پہلی ڈھال کے وسط میں ایک [illegible] کھدی ہوئی دیکھی۔ "اللہ تمہارے ساتھ [illegible]"

ان [illegible] کے علاوہ بھی [illegible] نے مختلف ساختوں کی ڈھ[illegible] جن میں سے کچھ [illegible] لولہ انگیز اشعا[illegible] ہوئے تھے۔

[illegible] اقو[illegible] تھیں۔ مجھے کتان کی بنی

ہوئی ایک مخصوص زرہ دی گئی جیسے وہ لوگ دلاص کہتے تھے۔ کتان کے علاوہ فولاد اور اسپات کی عمدہ زرہیں بھی تھیں۔ یہ تمام زرہیں ملک روم اور ایران کی بنی ہوئی تھیں۔ زرہ کا اوپری حصہ خود' سر کی حفاظت کے لیے تھا اور جوشن سینے کی حفاظت کے لیے' زرہ کے کچھ حصے کلائیوں' پنڈلیوں اور ہاتھوں کے پنجوں کی حفاظت کے لیے بھی تھے۔

ان کے علاوہ مجھے بہترین ترکش اور کمان بھی دیے گئے۔ نیزے' خنجر' تیر اور فارس بھی ملے جو سبھی مضبوط اور عمدہ تھے۔ عرب' نیزوں کو ناقابل اعتبار سمجھتے تھے کیونکہ ان کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود نیزے بھی ہتھیاروں میں شامل تھے۔

تلواریں بھی میں نے مختلف ملکوں کی دیکھیں جن میں ہندی سلیمانی یمامی خراسانی اور یمنی' سبھی طرح کی تلواریں شامل تھیں۔ ان تلواروں کو وہ "سیوف عتیقہ" کہتے تھے۔

مجھے مختلف قسم کے نیزے دیے گئے تھے جن کی انیاں ایک دوسرے سے مختلف تھیں' کمر کھی' چوڑی' لمبی' ترچھی اور سیدھی انیاں!

جہاں اردو کی رہائش کے لیے بہت سے چھوٹے چھوٹے پختہ مکانات بنے ہوئے تھے' ان کے پیچھے بھی ایک بہت بڑا میدان تھا۔ اس میدان میں' میں نے بڑی بڑی منجنیقیں' دبابے اور کبش کھڑے ہوئے دیکھے۔ میں اردو ہی کے دو قائدوں کے ہمراہ اس میدان میں گیا تھا۔ سپہ سالار ایبک دوادار نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ان ہتھیاروں کو بھی دیکھ لوں۔

میں نے وہاں مختلف قسم کی منجنیقیں دیکھیں جن میں سے کچھ بہت بڑی تھیں' کچھ چھوٹی تھیں۔ ان میں سے کچھ لبلبیوں اور کمانیوں کے ذریعے چلتی تھیں اور کچھ گوپھن کی طرح چکر سے چلنے والی تھیں۔ ان منجنیقوں کا استعمال بھرے تیر' پتھر یا نفت پھینکنے کے لیے ہوتا تھا۔ میرے ہمراہ جو دو قائد تھے ان میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ اگر منجنیقوں کے ذریعے ہلکی اشیاء پھینکنا مقصود ہوتی ہیں تو ان اشیاء کے ساتھ شیشے کے ڈلے رکھ کر انہیں بھاری کر دیا جاتا ہے۔ منجنیقوں سے نفت پھینکنے کے لیے ایک پیالے نما برتن استعمال کیا جاتا ہے جو ترازو کے پلے کی طرح زنجیروں سے لٹکا ہوتا ہے۔

ان منجنیقوں کو دیکھ کر مجھے منگولوں کے اولوس میں موجود وہ ختائی (چینی) عملہ یاد آیا جو اسی سے ملتے جلتے ایک ہتھیار کو استعمال کرتا تھا۔ اس ہتھیار کا نام پاؤیو تھا اور اس عملے کے امیر کو کلپاؤیو کہا جاتا تھا۔ شیخ الجبل کے کچھ باقی ماندہ قلعوں کو مسمار کرنے کے لیے بھی پاؤیو کو استعمال کیا گیا تھا مگر اس ہتھیار سے صرف نفت ہی پھینکا جا سکتا تھا۔ عربوں کے پاس جس طرح کے ایسے ہتھیار میں دیکھ رہا تھا' وہ پاؤیو سے کہیں بہتر اور کارآمد تھے لیکن عموماً" ان ہتھیاروں کو اسی وقت استعمال کیا جا سکتا تھا جس کسی قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا ہو۔

منجنیقوں کے علاوہ میں نے اس میدان میں دبابے بھی دیکھے۔ یہ پہیوں والی بڑی بڑی گاڑیاں تھیں جو بھاری لچکدار لکڑی کے تختوں سے بنائی گئی تھیں اور ان تختوں پر سرکے میں تر کیے ہوئے نمدے اور کھالیں منڈھی ہوئی تھیں تاکہ ان پر آگ اثر نہ کرے۔ اس کے اوپر ایک برج سا بنا ہوا تھا جس میں دو افراد سے لے کر دس افراد تک کے چھپ کر بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ جتنا بڑا دبابہ ہوتا تھا' اس میں اتنے ہی زیادہ افراد بیٹھ سکتے تھے مگر دس افراد سے زیادہ بیٹھنے کی گنجائش کسی دبابے میں نہیں تھی۔ دبابوں کو دھکیل کر آگے لے جایا جاتا تھا۔ اس کے آگے ایک مضبوط آہنی نوک ہوتی تھی جس سے قلعے کی دیوار کو منہدم کیا جاتا تھا۔ اس کے اونچے برج پر چڑھ کر سپاہی شہر پناہ کی فصیلوں پر بھی پہنچ سکتے تھے۔ ان دبابوں میں چھپ کر محاصرین سے جنگ کی جاتی تھی لیکن یہ ہتھیار بھی اسی وقت دشمن کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا جب وہ قلعہ بند ہو۔

کبش بھی دبابے ہی کی طرح تھا۔ اس میں بھی آدمی چھپ سکتے تھے مگر اس کی بناوٹ دبابے سے ذرا

مختلف تھی۔ اس کے ذریعے بھی قلعے کی مضبوط دیواروں میں سوراخ کیے جا سکتے تھے۔ میں نے کئی بڑے بڑے کبش بھی دیکھے جن کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ خلیفہ نے وہ کبش اس وقت بنوائے تھے جب عموریہ فتح کیا تھا۔ عموریہ کی فتح میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔

میں نے دوسرے دن مشق کے میدان سے لوٹ کر یہ ہتھیار دیکھے تھے۔ مشق کے میدان سے واپسی سرِشام ہوئی تھی اس لیے مجھے زیادہ تفصیل کے ساتھ ہتھیاروں کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا جب میں رہائش گاہ کی طرف لوٹا۔ میرے ہمراہ وہ دونوں قائد بھی تھے۔

تیرے دن صبح ہوتے ہی جب میں مشق کے میدان میں پہنچا تو سپہ سالار ایبک دوادار نے طلب کر لیا۔ طلبی تمام ہی قائدوں کی ہوئی تھی جن کی تعداد تقریباً ڈھائی درجن تھی۔

جب میں دوسرے قائدوں کے ہمراہ سپہ سالار کے یورت کی طرف جا رہا تھا تو سوچ رہا تھا تو یقیناً "کوئی اہم بات ہے جس کے سبب سارے اردو کے قائدوں کو سپہ سالار کے یورت میں طلب کیا گیا ہے۔

میں دوسرے قائدوں کے ہمراہ سپہ سالار کے یورت میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں اردو کے تینوں امیر پہلے سے موجود ہیں۔ ہم سب کو سپہ سالار نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم ادب سے اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

"ہلاکو خاں اپنا لشکر لے کر اربل سے چل دیا ہے اور آج وہ کسی بھی پہر یہاں پہنچ جائے گا۔" سپہ سالار کی آواز بلند ہوئی۔

"وہ آج پہنچنے والا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ گزشتہ روز وہ وہاں سے چلا ہو گا۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں۔" سپہ سالار نے جواب دیا۔ "مجھے گزشتہ رات ہی یہ اطلاع مل چکی تھی مگر اس وقت تک نصف شب گزر چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ رات ہی رات میں یہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ میں ان اسی لیے رات کے وقت لشکر لے کر شہر سے نکلنا ضروری نہیں سمجھا لیکن اب فوری طور پر ہمیں روانہ ہونا ہے۔ ہم شہر سے نکل کر اس سے جنگ کریں گے۔ ہماری روانگی سے قبل خلیفہ محترم حسب دستور لشکر کا معائنہ بھی فرمائیں گے۔ اپنے اپنے دستوں کے سپاہیوں کو حکم دے دو کہ وہ اپنے تمام ہتھیار سجا کر جلد سے جلد تیار ہو جائیں۔ خلیفہ محترم، لشکر کا معائنہ محل کے اندر ہی کریں گے۔ محل کے اندر باب بدر کے سامنے جو وسیع میدان ہے، معائنہ وہیں ہو گا۔" یہ کہہ کر سپہ سالار ایبک دوادار خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے چند ولولہ انگیز کلمات ادا کیے جن سے اس کی شجاعت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بزدلوں کی طرح دشمن کے مقابلے سے بھاگنے پر موت کو ترجیح دے گا اور یہی توقع اسے ہم سب سے ہے پھر اس نے ہم سب کو رخصت کر دیا۔

جب ہم مشق کے میدان میں پہنچے تو ہمیں سپاہیوں نے گھیر لیا۔ انہیں بھی کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی اہم ہی معاملہ تھا جس کے سبب ہم سب کو طلب کیا گیا تھا۔

انہیں جب علم ہوا کہ وہ وقت آ گیا ہے جس کے لیے ساری تیاریاں ہو رہی تھیں تو پرجوش نعروں سے انہوں نے میدان کو سر پر اٹھا لیا۔ مجھ پر ان کے عزم و ہمت کا بہت اثر ہوا مگر انہیں یقیناً "صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس بات سے لاعلم تھے کہ انہیں اپنے سے چوگنی افرادی قوت سے نبرد آزما ہونا تھا۔ انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ دشمن کو بس آنا "فانا" ترتیغ کر دیں گے۔

سپاہیوں کے دستے بہت جلد تیار ہو گئے اور پھر وہ صف بہ صف محل کی طرف بڑھے۔ میں نے منگولوں کو بھی اولوس کا معائنہ کرتے دیکھا تھا مگر عربوں میں اسے ذرا مختلف پایا۔ منگولوں میں ہر سپاہی کا معائنہ کرنے کے لیے خاقان جیا اس کا مقرر کردہ نائب خود چل کر ہر سپاہی کے پاس پہنچتا تھا لیکن میں نے بغداد

ں اس کے برعکس دیکھا۔
باب بدر کے سامنے خلیفہ کا تخت بچھا ہوا تھا جس پر وہ ہتھیار سجائے بیٹھا ہوا تھا۔ تخت کے قریب ہی دائیں جانب ایک چھوٹی سے چوکی پر ایک بھاری بھرکم شخص بیٹھا تھا جس کے سامنے اشرفیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

خلیفہ اس وقت خود اور زرہ پہنے ہوئے تھا جس سے مجھے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ شاید وہ خود بھی اولوس کے ساتھ چلے گا مگر بعد میں ایسا نہیں ہوا تو میں نے سمجھ لیا کہ وہ محض ایک رسم تھی۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ شاید ہر سپاہی کا معائنہ ہو گا مگر ایسا بھی نہیں ہوا۔

صف بہ صف تمام اولوس خلیفہ کے تخت کے روبرو کھڑا ہوا تھا۔ تخت کی بائیں جانب ایک دراز قد شخص موجود تھا جس نے خلیفہ کا اشارہ پاتے ہی بلند آواز میں سپہ سالار ایک دوادار کا نام پکارا اور اسی وقت میری نگاہ نمک حرام وزیر ابن العلقمی پر پڑی جو خلیفہ کے پیچھے تخت ہی پر بیٹھا ہوا تھا اور خلیفہ کی آڑ میں پہلے نظر نہیں آیا تھا۔ میں اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اس لیے اس کی الوؤں جیسی گول گول آنکھوں میں پیدا ہونے والی غیر معمولی چمک دیکھ سکتا تھا اس کے چہرے سے عیاری ٹپک رہی تھی۔

سپہ سالار ایک دوادار، خلیفہ کے روبرو پہنچا اور ادب سے جھکا، پھر اس نے اپنے ہتھیاروں کا معائنہ کرایا۔ خلیفہ نے ہتھیاروں کو دور ہی سے دیکھ کر سر ہلا دیا اور پھر دائیں جانب مڑ کر بھاری بھرکم شخص کو کچھ حکم دیا۔ خلیفہ کی آواز اتنی مدھم تھی کہ میں اس کے الفاظ نہ سن سکا لیکن جب سپہ سالار، بھاری بھرکم شخص کے سامنے پہنچا تو میں سمجھ گیا کہ خلیفہ نے اسے کیا حکم دیا ہو گا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس شخص کو عارض کا عہدہ حاصل تھا۔ اس نے سپہ سالار کو ڈھیر ساری اشرفیاں گن کر دیں۔ سپہ سالار نے وہ اشرفیاں ایک کپڑے میں باندھیں، پھر خلیفہ کے سامنے ادب سے جھکا اور الٹے پاؤں چلتا ہوا اپنی جگہ آ گیا۔

"جلال الدین!" منادی نے ایک اور نام پکارا۔
ایک امیر، تخت کی طرف بڑھا۔ پھر وہی ہوا جو سپہ سالار کو پیش آیا تھا۔ باری باری تینوں امیر اپنے اپنے ہتھیاروں کا معائنہ کرانے اور انعامات پانے کے بعد اپنی جگہ آ کھڑے ہوئے تو قائدوں کی باری آئی۔
مجھے پانچویں قائد کی حیثیت حاصل تھی۔ جب مجھ سے پہلے چار قائد معائنہ کرا چکے تو میری باری آئی۔
"بطریق بوغا!" منادی نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا کاغذ پڑھ کر پکارا۔
میں مسلمان نہیں تھا اور نہ میرا نام ان جیسا تھا اس لیے جب میرا نام پکارا گیا تو میدان میں ہلکی سی بھنبھناہٹ سنائی دی جسے لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے ہوں۔
"سکوت!" معاً سپہ سالار کی بلند آواز گونجی اور سناٹا چھا گیا۔
میں خلیفہ کو اپنے ہتھیاروں کا معائنہ کرا رہا تھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ "نوجوان! تم ایک مسلمان کی اولاد ہو تمہیں اسلام قبول کر لینا چاہیے۔"
"حضور نے بجا فرمایا۔" میں نے ادب سے جھک کر جواب دیا۔ "مگر میرے باپ کا کہنا ہے کہ پہلے میں اسلام کو سمجھوں، پھر اگر میرا قلب اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو تو اسلام اختیار کروں ورنہ نہیں۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے اب تک اس کا موقع نہیں مل سکا مگر موقع ملتے ہی میں یہ فرض ضرور انجام دوں گا۔"
"تمہارا باپ ٹھیک کہتا ہے نوجوان!" خلیفہ نے کہا۔ "اپنے ہتھیار سجا لو! میں مطمئن ہوں۔" یہ کہہ کر وہ عارض سے مخاطب ہوا اور پھر میں اپنا انعام لے کر اپنی جگہ پہنچ گیا۔
قائدوں کے بعد نقیبوں کا معائنہ ہوا لیکن عریفوں کی باری نہیں آئی۔ ان کے معائنے کی ذمے داری نقیبوں ہی پر ڈال دی گئی تھی اور عریفوں کو اپنے دستے کے ہر سپاہی کا معائنہ کرنا تھا۔
جب خلیفہ معائنے کے بعد اپنے وزیر ابن العلقمی کے ہمراہ محل میں چلا گیا تو سب سے پہلے سپہ

سالار ایبک دوادار نے، پھر امیروں نے اپنے اپنے انعامات عام سپاہیوں میں تقسیم کیے جانے کا اعلان کیا۔ ان کے بعد جب قائدوں نے بھی ایسا ہی کیا تو میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ میں نے بھی وہ اشرفیاں اپنے دس نقیبوں کو دیں، انہوں نے عام سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح ایک سپاہی کے حصے میں ایک ایک اشرفی آئی۔ نقیبوں کو کیونکہ، صرف سو سو اشرفیاں ملی تھیں اس لیے انہوں نے اپنے انعامات تقسیم نہیں کیے۔

روانگی سے قبل میں نے ایک اور ہتھیار دیکھا۔ ہر قائد کے ساتھ دو سپاہی اس ہتھیار کو لیے ہوئے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کی تعداد ڈھائی درجن کے قریب تھی یعنی جتنے قائد تھے اتنے ہی وہ ہتھیار تھے۔ اس ہتھیار کا نام مجراۃ تھا۔ یہ ہتھیار روانگی سے قبل اسلحہ خانے سے نکلوایا گیا تھا۔ اس ہتھیار کے ذریعے بھاری تیر دشمن کی طرف پھینکے جا سکتے تھے۔

مجراۃ، لوہے کے ایک بڑے سے نلکے کی طرح تھا۔ اس کے اندر ایک پرزہ لگا ہوا تھا۔ اس نلکے میں تیر ڈال کر دوسرے پرزے کے زور سے تیر کو پھینکا جاتا تھا۔ کمان کی نسبت مجراۃ سے تیر زیادہ قوت و تیزی کے ساتھ پھینکا جا سکتا تھا۔

مجراۃ کے علاوہ اور کوئی بھاری ہتھیار ساتھ نہیں لیا گیا تھا کیونکہ انہیں میدان جنگ میں ساتھ لے جانا بے فائدہ تھا۔ نہ وہاں منجنیقیں کام دے سکتی تھیں، نہ دبابے اور کبش!

روانگی سے قبل ہی سپہ سالار ایبک دوادار نے اردو کو ترتیب دیا۔ یہ ترتیب میرے لیے قطعی نئی تھی۔ اس نے با آواز بلند امیروں کو حکم دیا تھا کہ لشکر کی ترتیب ساتویں تعبیے کے مطابق کی جائے۔

عربوں میں لشکر کی ترتیب کے ساتھ مختلف طریقے رائج تھے۔ اس ترتیب کو وہ تعبیہ کہتے تھے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ وہ ساتویں تعبیے کو اس وقت بروئے کار لاتے تھے جب دشمن کی تعداد زیادہ ہو اور ان کی تعداد قلیل!

میں نے پورے اولوس کو دائرہ مزدوجہ کی شکل میں منتقل ہوتے دیکھا۔ پہلے ایک بڑا دائرہ بنا، پھر اس کے اندر دوسرا چھوٹا دائرہ!

پورے اولوس کے پانچ حصے تھے جسے وہ اخماس کہتے تھے۔ پہلا حصہ مقدمہ تھا جو سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے والے حصے کا نام قلب الجیش تھا اور بالکل پچھلے حصے کو ساقہ کہا جاتا تھا۔ میمنہ دائیں جانب کے حصے کو کہتے تھے اور میسرہ بائیں جانب کو!

ساتویں تعبیے کی صورت میں دائرے کا اگلا حصہ مقدمہ تھا جس سے ملا ہوا دائیں جانب میمنہ تھا جو پچھلے حصے ساقہ سے جا ملا تھا۔ اسی طرح بائیں جانب میسرہ گھومتا ہوا ساقہ سے مل گیا تھا۔ بڑے دائرے کے اندر جو چھوٹا دائرہ بنا تھا، وہ قلب الجیش پر مشتمل تھا۔ اردو کے ہر حصے میں نشاب (تیرانداز) سب سے آگے آگے تھے۔

میں قلب الجیش میں تھا اور اسی میں سپہ سالار ایبک دوادار تھا۔ قلب الجیش ہی میں ان کا جنگی پرچم تھا۔ اس جنگی پرچم کا کپڑا سیاہ تھا اور اس پر سنہری تاروں سے عقاب کی شبیہہ بنی ہوئی تھی۔

پورا اولوس اسی ترتیب کے ساتھ روانہ ہوا۔

باب البصیلہ کیونکہ محل سے زیادہ قریب تھا اس لیے اردو کو اسی سے گزر کر شہر سے نکلنا تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ شہر سے نکلنے کے لیے دریائے دجلہ کا رخ کیا گیا۔ دریا پار کر کے شہر کے مغربی حصے میں پہنچا جا سکتا تھا کیونکہ دشمن اسی سمت میں تھا۔ شہر کے مغربی حصے سے تقریباً دو فرسخ کے فاصلے پر دشمن کے اردو کا وہ حصہ ڈیرے ڈالے ہوا تھا۔ جو ہلاکو خاں سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا اور جس کی رہنمائی منگول سردار سوغنچاق اور باجو خاں کر رہے تھے۔

شہر کا مغربی حصہ تقریباً ویران ہی تھا۔ اولوس باب الطاق سے گزر کر شہر کے باہر پہنچ گیا۔ شہر سے باہر آتے ہی سپاہیوں نے جوش نعرے بلند کیے تھے۔

جب اولوس شہر کے باہر پہنچا تو شام قریب تھی مگر ابھی دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا اس لیے مشعلیں روشن

کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اب اولوس باب الطاق سے تقریباً" ایک ڈیڑھ فرسخ دور نکل آیا تھا اس لیے مزید بڑھنے سے اجتناب کیا گیا کیونکہ اندازوں اور اطلاعات کے مطابق دشمن اب قریب ہی تھا۔

ابھی اولوس کو وہاں رکے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ معاً" فضا دہشتناک اور وحشیانہ نعروں سے گونج اٹھی۔ یہ نعرے میرے لیے نئے نہیں تھے۔ مجھے علم تھا کہ منگول' دشمن پر حملہ کرتے ہوئے ایسے ہی وحشیانہ انداز میں نعرے لگاتے تھے تاکہ دشمن پر ان کی دہشت بیٹھ جائے۔ وہ وحشیانہ نعرے واقعی ایسے ہوتے تھے کہ دل لرز اٹھیں۔ ابتدائی لمحوں میں مسلمان اردو پر بھی اس کا یہی رد عمل ہوا مگر پھر جیسے ایک دم مسلمانوں کو ہوش آگیا۔ انہوں نے بھی جواب میں فلک شگاف نعرے بلند کیے۔ اسی کے ساتھ سپہ سالار ایبک دوادار نے پیش قدمی کا حکم دیا۔

پیش قدمی کا حکم ملتے ہی بیک وقت سینکڑوں طبل' ضربوں سے جیسے چیخ اٹھے۔ بوقوں کی گونج سے فضا جاگ اٹھی۔ مسلمانوں کا اردو ایک بپھرے ہوئے طوفان کی طرح بڑھا' اس طرح جیسے اپنے سامنے آنے والی ہر رکاوٹ کو نیست و نابود کر دے گا۔

قلب الجیش میں سیاہ جنگی پرچم پر بنا ہوا سنہری عقاب جیسے دشمن پر جھپٹ پڑنے کے لیے فضا میں پرواز کرتا ہوا بڑھا چلا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ میں مسلح سپاہیوں کے پرے ترتیب برقرار رکھے ہوئے نعرہ زناں یوں لپک رہے تھے جیسے بجلیاں سی کوند رہی ہوں۔ ان کے آبدار ہتھیاروں کو سورج کی آخری کرنیں بوسے دے رہی تھیں۔

میرے جلو میں ایک ہزار مسلح سپاہی تھے۔ کم وقت ملنے کے باوجود میں نے کوشش کی تھی کہ انہیں منگول طریق جنگ کی تربیت دے سکوں کیونکہ لوہا' ہی لوہے کو بہتر طور پر کاٹ سکتا ہے۔ میں اپنے تربیت یافتہ سپاہیوں سے پوری طرح مطمئن تو نہیں تھا مگر مجھے اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ دشمن کے مقابل کمزور ہرگز نہیں پڑیں گے۔

روانگی سے پہلے ہی مجھے اس بات کا خیال تھا کہ دست بہ دست لڑائی کی صورت میں میرا پہچان لیا جانا عین ممکن ہے۔ منگولوں کے درمیان میں ایک نمایاں حیثیت کا حامل رہ چکا تھا اس لیے عام سپاہی بھی مجھے با آسانی پہچان سکتے تھے۔ کسے شکست ہوتی اور کون فتحیاب ہوتا' اس بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ میں دوران جنگ میں خود کو دشمن کی نگاہ سے چھپائے رکھوں۔ اسی غرض سے میں نے ایک سیاہ نقاب اپنی وردی میں چھپالی تھی تاکہ بروقت اسے استعمال کر سکوں۔ اب وہی سیاہ نقاب میرے چہرے پر تھی جس نے آنکھوں کے سوا پورے چہرے کو چھپالیا تھا۔ میرا ماتھا آہنی خود سے چھپا ہوا تھا اور یوں بھی صرف ماتھے اور آنکھوں سے کسی کو پہچان لینا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے' وہ بھی حالت جنگ میں جب تمام تر توجہ حملہ کرنے یا مدافعت پر مرکوز ہوتی ہے۔

منگولوں اور مسلمانوں کے اولوسوں کا درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا اور وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ اب فاصلہ ہونے کے باوجود نوپا کوپ کی دموں والا پرچم بھی نظر آنے لگا تھا۔ نعروں کی گونج اب پہلے سے بھی زیادہ بڑھ چکی تھی۔ نعرے دونوں ہی طرف سے بلند ہو رہے تھے اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے نعرے لگانے میں بھی وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتے ہوں۔

پھر وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جب صرف ایک تیر کی مار کا فاصلہ رہ گیا اور اسی وقت ہر دو طرف سے کمانیں کھینچ گئیں۔ دونوں طرف سے بیک وقت اتنی تعداد میں تیر پھینکے گئے کہ چند لمحے کو فضا میں تیروں سے ایک قوس سی بن گئی۔ کچھ تیر آپس میں ٹکرا کر ہی درمیان میں رہ گئے مگر ان کی بڑی تعداد دونوں اولوسوں پر جیسے چھا کر رہ گئی۔ مجراتوں سے بھی دشمن کی طرف بھاری تیر پھینکے جا رہے تھے لیکن وہ مسلسل بڑھا چلا آ رہا تھا اور ادھر بھی یہی حال تھا۔ دونوں میں سے ایک اولوس بھی

تیروں کی مسلسل بوچھاڑ سے نہیں رکا تھا۔ مسلمانوں کے اولوس کی ترتیب اب بھی اسی طرح برقرار تھی۔

ابھی دشمن کے مقابل مسلمانوں کے اولوس کے صرف تین حصے تھے' مقدمہ' میمنہ اور میسرہ! ابھی قلب الجیش اور ساقہ کی باری نہیں آئی تھی مگر یہ صورت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ جب دونوں اولوس ایک دوسرے سے بھڑ گئے تو قلب الجیش اور ساقہ کے دستے بھی جنگ میں شریک ہو گئے۔

منگولوں کے پہلے وحشیانہ اور بھرپور حملے نے اولوس کے مقدمے کو کچھ پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تو مجھے اپنے دستے لے کر بڑھنے کا حکم ملا کیونکہ مقدمے کے بعد قلب الجیش میں سب سے پہلے میرے ہی دستے تھے۔ میرے پیچھے ہی دوسرے دو قائدوں کے دستوں کو بڑھنے کے احکامات ملے تاکہ دشمن کو پوری قوت کے ساتھ بڑھنے سے روک دیا جائے۔

میرے دستوں کے بڑھتے ہی پیچھے ہٹتے ہوئے قلمدے کے دستوں کا حوصلہ بلند ہو گیا اور وہ اپنی جگہ جم کر لڑنے لگے۔

میرے دستے آندھی کی طرف بڑھے تھے اور دشمن پر چھا گئے تھے اور پھر فوراً" ہی میرے حکم پر انہوں نے پسپائی اختیار کر لی تھی۔ درمیان سے میرے دستے ایک دم پیچھے ہٹے تو دشمن گھستا چلا آیا اور پھر اسے اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا جب وہ تین اطراف سے نرغے میں آ چکا تھا۔ میرے حکم پر پھر یلغار کی گئی اور یہ یلغار دائرے کی صورت میں تھی تاکہ دائرہ مکمل ہونے کی صورت میں دشمنوں کے وہ دستے اپنے بقیہ ساتھیوں سے کٹ کر رہ جائیں۔ پھر یہی ہوا اور دائرہ مکمل ہو گیا۔ اب دشمنوں کے وہ دستے نہ بڑھ سکتے تھے نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ وہ چاروں طرف سے نرغے میں لیے جا چکے تھے۔ دشمنوں کے ان فوجی دستوں کا ایک سپاہی بھی زندہ بچ کر نہ جا سکا۔ ان دستوں کی رہنمائی ایک منگول سردار کر رہا تھا۔ میں اسے پہچانتا تھا اور وہ بھی یقیناً" مجھے جانتا ہو گا مگر میرے چہرے پر نقاب تھی اس لیے میرے ہاتھوں قتل ہوتے وقت بھی وہ میرا چہرہ نہ دیکھ پایا۔

پہلے ہی پہلے میں دشمن کے اتنے سپاہی مارے جانا معمولی بات نہیں تھی۔ میدان جنگ مسلمانوں کے نعروں سے گونج اٹھا۔ دشمن کے نعرے اب اتنے بلند نہیں رہے تھے۔

منگول وحشیوں کو یوں شکار کرنے کے بعد مسلمانوں کے حوصلے کچھ اور بڑھ گئے تھے۔ وہ بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے۔

دشمن نے کئی بار اپنے مخصوص جنگی حربے آزمانے چاہے مگر میں نے انہیں ناکام بنا دیا۔ مجھے اس بات کا پہلے ہی سے احساس تھا کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہے اور وہ اپنے اردو کا ایک حصہ الگ کر کے عقب سے بھی حملہ کر سکتا ہے۔ میں نے اس خطرے سے فوری طور پر سپہ سالار ایک دوادار کو مطلع کرایا۔ میں جنگ سے قبل ہی اسے دشمن کی اس چال سے آگاہ کر چکا تھا۔ میں نے اسے ایک سپاہی کے ذریعے پیغام بھجوایا۔ اس سے ملے کہ دشمن یہ حربہ استعمال کرے خود ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ ہمارے اردو کا ایک حصہ ساقہ اب تک جنگ میں شریک نہیں ہوا۔ وہ عقب سے جا کر دشمن پر حملہ کر سکتا ہے۔

جواب میں سپہ سالار ایک دوادار نے کہلوایا کہ وہ میرا پیغام ملنے سے قبل ہی یہ قدم اٹھا چکا ہے۔

منگولوں کے خون سے میری تلوار اپنی پیاس بجھاتی رہی اور منگول پیچھے ہٹتے رہے۔ میں اس دوران میں لڑتا ہوا ایک بار ہلاکو خاں کی بیوی دو قوز کے عبادتی چبوترے سے بہت قریب پہنچ گیا مگر مجھے فوراً" ہی خطرے کا احساس ہو گیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ دشمن دانستہ پسپائی اختیار کر رہا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں اپنے دستوں کو لیے تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ اگر میں ایسا کرنے میں کچھ اور تاخیر سے کام لیتا تو اپنے دستوں سمیت دشمن کے نرغے میں آ جاتا مگر اس کے باوجود دشمن نے دائیں اور بائیں سمت سے تیزی کے ساتھ جھپٹ کر بھرپور حملہ کیا جسے بہرحال میں نے روک لیا اور رفتہ رفتہ پیچھے ہٹ گیا۔

اسی وقت دشمن کے عقب سے مسلمان اولوس کے مخصوص نعرے بلند ہوئے۔ مسلمان اولوس کے ساقہ نے دشمن پر عقب سے حملہ کر دیا تھا۔ یہ حملہ ہلاکو خاں کے لیے قطعی غیر متوقع رہا ہو گا۔ وہ مسلمانوں کے اردو کی تعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عقب سے بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ نتیجہ حسب توقع ہی ظاہر ہوا۔

منگولوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ مقابل سے بھاگنے لگے۔ بھاگتے ہوئے منگول سپاہیوں پر مسلمانوں نے شدید حملے کیے اور انہیں زبردست جانی نقصان پہنچایا۔

مسلمان اولوس کا ایک امیر، منگولوں کا تعاقب کرنے بڑھا۔ اسی کے زیر کمان میں بھی تھا۔ جنگی نقطہ نظر سے یہ قطعی غلط قدم تھا مگر مجھے اور اس کے ماتحت دوسرے قائدوں کو اپنے اپنے فوجی دستے لے کر اس کے حکم پر بڑھنا پڑا۔ ابھی امیر کے حکم پر عمل ہی ہوا تھا کہ سپہ سالار ایک دوادار کا حکم آیا کہ تعاقب نہ کیا جائے۔ مجبوراً" اس امیر کو اپنا حکم واپس لینا پڑا اور یوں ایک غلط قدم اٹھتے اٹھتے رک گیا۔

جنگ کا نقشہ بدل چکا تھا اس لیے اب ضرورت اس بات کی تھی کہ دائرہ ایک بار ٹوٹ کر ہلالی شکل اختیار کرتا ہوا دوبارہ دائرے میں تبدیل ہو جائے۔ اس طرح دشمن کو چاروں طرف سے نرغے میں لیا جا سکتا تھا۔

پھر ایسا ہی کیا گیا۔ اولوس کا میمنہ اور میسرہ ہلالی شکل میں دشمن کی دائیں اور بائیں سمتوں سے بڑھے تاکہ دشمن کے عقب میں موجود ساقہ سے مل کر ایک بار پھر دائرے کی تکمیل کر دیں مگر اس امیر کی غلطی کے سبب جس نے منگولوں کا تعاقب کرنا چاہا تھا اور فوجی ترتیب بگاڑ دی تھی، یہ قدم اٹھانے میں کچھ تاخیر ہو گئی۔

دشمن نے اس تاخیر سے پورا فائدہ اٹھایا۔ پھر اس سے پہلے کہ دائرہ ٹوٹ کر دوبارہ دائرے میں تبدیل ہو سکتا، وہ نرغے سے نکل گیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نرغے سے نکلنے کے لیے اپنے بے شمار سپاہیوں کی قربانی دینا پڑی۔

ہلاکو خاں زبردست افرادی قوت کے باوجود مسلمانوں کے چھوٹے سے اولوس سے شکست کھا جائے گا، یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا مگر ہوا ایسا ہی تھا۔ میدان جنگ میں دشمن کی ہر طرف بکھری ہوئی لاشیں اس بات کا واضح ثبوت تھیں کہ ہلاکو خاں اپنی تمام تر وحشت و بربریت کے باوجود مسلمانوں سے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کر چکا ہے۔

سپہ سالار ایک دوادار نے پیچھے ہٹنے کی بجائے وہیں پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔

اب ہر طرف اندھیرا پھیلنے لگا تھا اس لیے مشعلیں روشن کر لی گئی تھیں۔ مسلمان اولوس کے دو امیروں کا خیال یہ تھا کہ اب ہلاکو خاں شکست کھانے کے بعد دوبارہ حملہ کرنے کی ہمت نہیں کرے گا اس لیے بغداد واپس چلا جائے مگر سپہ سالار نے ان کے مشوروں کو قبول نہیں کیا۔

اولوس کے ساتھ طبیب اور جراح بھی تھے۔ پڑاؤ ڈالنے کے بعد وہ زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ اولوس کے کچھ دستے مارے جانے والے سپاہیوں کی لاشوں کو ایک جگہ جمع کرنے لگے تاکہ انہیں عزت و احترام اور مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق زمین میں گاڑ دیا جائے۔ منگول سپاہیوں کی لاشوں کے درمیان مسلمان سپاہیوں کی لاشیں پہچاننا بہت آسان تھا کیونکہ مسلمان سپاہیوں کے جسموں پر سیاہ وردیاں تھیں۔

اولوس کی گنتی ہوئی تو پتا چلا کہ جنگ میں مسلمان بھی کافی مارے گئے تھے۔ اولوس کا ایک چوتھائی حصہ تقریباً" ناکارہ ہو چکا تھا۔ اس ایک چوتھائی میں سے نصف کے قریب شدید زخمی حالت میں تھے اور نصف سے کچھ زیادہ مارے گئے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دشمن کا اس سے کہیں زیادہ جانی نقصان ہوا تھا مگر مسلمانوں کے مختصر اولوس کے لیے یہ تھوڑا جانی نقصان بھی بہت تھا۔ جب یہ خبر عام

ہوئی تو مسلمان اولوس میں اداسی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ شاید اس سے پہلے بھی وہ کسی ایسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے جس میں ان کی اتنی بڑی تعداد ماری گئی ہو۔ فتح کے باوجود ان کے چہروں سے اضمحلال کا اظہار ہونے لگا۔ جن دو امیروں نے بغداد واپسی کا مشورہ دیا تھا اور ان کے مشوروں کو سپہ سالار نے رد کر دیا تھا اب وہ کبھی دوبارہ یہ اصرار کرنے لگے کہ بغداد کی طرف مراجعت کی جائے۔ ان کے رویوں سے پتا چل رہا تھا جیسے وہ اب مزید جنگ لڑنے کے حق میں نہ ہوں۔

سپہ سالار ایبک دوادار کے لیے یہ صورت حال تشویش کن تھی مگر اس جواں مرد نے ہمت نہ ہاری اور سختی سے انکار کر دیا کہ وہ بغداد واپسی کا حکم نہیں دے سکتا۔ اس نے امکان ظاہر کیا تھا کہ دشمن دوبارہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہو سکتا ہے اور یہ امکان کم از کم میری نظر میں قطعی درست تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ہلاکو خاں جیسا شخص ایک بار شکست کھانے کے بعد خاموشی سے واپس چلا جائے اور دوبارہ حملہ نہ کرے۔

وہ شب یونہی سوتے جاگتے گزری کیونکہ میں نے سپہ سالار ایبک دوادار کو منگولوں کی اس سرشت سے بھی آگاہ کر دیا تھا کہ وہ عموماً "شب خون مارنے کو ترجیح دیتے ہیں مگر ایسا نہیں ہوا۔

صبح ہوئی تو میں نے اولوس میں ایک عجیب سی بے چینی دیکھی۔ ہر سپاہی کی زبان پر ایک ہی مطالبہ تھا کہ بغداد واپس چلا جائے۔ بڑی عجیب صورت حال تھی۔ وہ جنگ جیت کر بھی خوش نہیں تھے بلکہ متوقع جنگ سے دامن بچانا چاہتے تھے۔ ان میں سے کچھ کی زبانی میں نے یہ بھی سنا کہ اگر دوبارہ جنگ ہوئی تو وہ محصور ہو کر لڑنا پسند کریں گے۔ سپاہیوں میں اداسی اور بے چینی کی جو لہر دوڑ گئی تھی اسے کسی صورت روکنا ممکن نہیں تھا۔ بنیادی غلطی دراصل ان دو امیروں کی تھی جنہوں نے پہلی بار ایسا غیر دانشمندانہ مشورہ دیا تھا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی سلسلے میں نقیبوں کا ایک وفد عام سپاہیوں کا مطالبہ لے کر سپہ سالار ایبک دوادار سے ملنے جانے والا تھا کہ وہ خبر مل گئی جس کی توقع سبھی کو تھی مگر اس کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔

اردگرد کے علاقوں میں پھیلے ہوئے جاسوسوں نے خبر دی تھی کہ ہلاکو خاں دوبارہ حملہ آور ہونے والا ہے۔ اس خبر سے اولوس میں جوش پیدا ہونے کی بجائے ایک دہشت سی پھیل گئی۔

سپہ سالار ایبک دوادار نے اولوس کو ترتیب دیا۔ اس نے اس بار بھی ساتویں تعبیے پر عمل کیا تھا یعنی دائرہ در دائرہ!

ابھی اولوس کی ترتیب عمل ہی میں آئی تھی اور جنگ کا پرچم بلند ہوا تھا کہ دشمن کے نعرے چاروں طرف سے سنائی دینے لگے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایک بہت بڑے دائرے کی صورت میں ہر طرف سے بڑھتا چلا آ رہا ہو اور یہ دائرہ دم بہ دم تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا ہو۔

میں نے سپاہیوں کے چہروں پر خوف اور گھبراہٹ کے آثار دیکھے اور یہ دیکھ کر مجھے ملال ہوا۔ حوصلہ ہارا ہوا اولوس بھلا کس طرح لڑ سکتا ہے؟ میں نے سوچا اور چہرے پر سیاہ نقاب چڑھا لی۔

کچھ دیر بعد پتا چل گیا کہ دشمن چاروں طرف سے حملہ آور نہیں ہو رہا بلکہ اس نے صرف دو طرف سے حملہ کیا ہے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب پہلے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔

دشمن کے وحشیانہ نعروں کی گونج قریب آتی جا رہی تھی اور سپہ سالار ایبک دوادار کے چہرے سے بھی اب فکر مندی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ اسے اپنے سپاہیوں کی کم ہمتی کا پوری طرح اندازہ ہو چکا تھا اور اس کی فکر مندی کا سبب غالباً "اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ آخر کار اس نے بھی پیش قدمی کا حکم دیا اور پہلی بار مسلمان اولوس نے نعرے لگائے مگر ان نعروں میں وہ جوش نہیں تھا جس کا اظہار پہلی بار دشمن سے جنگ کے دوران میں ہوا تھا۔

دشمن کیونکہ دو اطراف سے بڑھ رہا تھا اس لیے

پہلے کی نسبت اس بار ذرا جم کر اور سنبھل کر لڑنے کی ضرورت تھی مگر اس مرتبہ تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سپاہیوں کو زبردستی لڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ ان میں نہ کوئی جوش تھا نہ ولولہ! ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ سپہ سالار ایبک دوادار نے پیش قدمی سے قبل جو مختصر سی ولولہ انگیز تقریر کی تھی' اس کا بھی سپاہیوں پر کوئی خاطر خواہ اثر مرتب نہ ہو سکا تھا۔

پھر وہ وقت آ ہی گیا جب دشمن نے بیک وقت پوری قوت سے میمنے اور میسرے پر حملہ کر دیا۔ اس دو طرفہ حملے کے سبب مقدمہ' قلب الجیش اور ساقہ تینوں ہی متاثر ہوئے اور ان تینوں کو مجبوراً" دو حصوں میں بٹنا پڑا۔ ان کا ایک حصہ میمنے کی طرف ہو گیا اور ایک میسرے کی طرف!

میرے فوجی دستے سپہ سالار ایبک دوادار کے ہمراہ میمنے کی طرف تھے کیونکہ اسی طرف ہلاکو خاں خود موجود تھا اور اسی طرف سی زیادہ دباؤ پڑ رہا تھا۔

دشمن کے دو طرفہ دباؤ کو مسلمان اولوس زیادہ دیر برداشت نہ کر پایا اور اس نے ہمت ہاری دی۔

سپہ سالار کے پاس بیک وقت تینوں امیروں کے پیغام پہنچے کہ اب اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ دشمن سے محصور ہو کر لڑا جائے اور بغداد کی طرف مراجعت کی جائے۔

سپہ سالار ایبک دوادار یقیناً" یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اب اس کا اولوس' دشمن کے سامنے نہ ٹک سکے گا اس لیے اس نے مجبوراً" پسپائی کا حکم دیا۔

پسپائی کا حکم ملتے ہی مسلمان اولوس اس طرح بھرا مار کر بغداد کی طرف بھاگا کہ تمام ترتیب بگڑ گئی۔ جس کے سبب منگول وحشیوں نے ان میں سے بڑی تعداد کو قتل کر دیا۔ اگر وہ پسپا ہونے میں اتنی جلد بازی کا ثبوت نہ دیتے تو شاید انہیں اتنا بھاری جانی نقصان نہ اٹھانا پڑتا۔

میدان جنگ سے فرار ہوتے وقت مسلمان اولوس نے اپنے جنگی پرچم تک کا خیال نہ کیا۔ جس دستے کے پاس جنگی پرچم تھا' وہ سپہ سالار ایبک دوادار کے ساتھ تھا اور اسے اسی کے ساتھ رہنا چاہیے تھا لیکن پسپائی کا حکم ملتے ہی وہ دستہ اتنی تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگا کہ دشمنوں کے نرغے میں آ گیا۔ اس دستے کا ایک سپاہی بھی نہ بچ سکا۔ اس کے علاوہ سپہ سالار کے ہمراہ جو دوسرے فوجی دستے تھے' وہ بھی منتشر ہو گئے۔ جب وہ بغداد کی طرف فرار ہو رہا تھا تو اس کے ہمراہ بس گنتی کے چند سپاہی تھے اور دشمن منگول اس کے تعاقب میں تھے۔

میں سپہ سالار سے کافی فاصلے پر تھا اور خود میرے ساتھ بھی صرف ایک دستہ تھا۔ میں نے خود وہ اندوہناک منظر دیکھا جو نہ دیکھتا تو بہتر تھا۔

سپہ سالار ایبک دوادار اور اس کے ساتھ جو سپاہی تھے ان سب کو منگولوں نے اپنے تیروں سے چھلنی کر دیا تھا۔ اس بہادر سپہ سالار کو میں نے خود گھوڑے سے گرتے دیکھا تھا۔

منگول وحشی بھاگتے ہوئے مسلمان اولوس کا برابر تعاقب کر رہے تھے۔ ایک امیر کا گھوڑا میرے برابر دوڑ رہا تھا۔ میں نے بلند آواز میں اسے بتایا۔ "سپہ سالار ایبک دوادار مارا گیا۔"

"اسے مرجانے دو اور اپنی جان کی پروا کرو!" امیر نے چیخ کر جواب دیا اور مجھے اس کا یہ جواب سن کر بہت افسوس ہوا۔

آخر کار مسلمان اولوس کے بچے کھچے سپاہی اور عہدیدار دریائے دجلہ کے اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں سے انہیں دریا عبور کر کے شہر میں داخل ہونا تھا مگر ان کی قسمت میں دریا عبور کرنا نہیں تھا۔ ان کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ دریائے دجلہ میں طغیانی آ گئی تھی جس نے وہاں موجود پل میں جگہ جگہ شگاف ڈال دیے تھے اور اب اس پل کے ذریعے دریا عبور کرنا' ممکن نہیں رہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ دریائے دجلہ پر بنے ہوئے کسی دوسرے پل کی طرف جا سکتے' دشمن ان کے سر پر پہنچ گیا۔

مسلمان اولوس کے عہدیداروں کو تو زندہ نہیں

چھوڑا گیا۔ میں اپنی گرفتاری سے قبل چہرے سے سیاہ نقاب الگ کر چکا تھا لیکن اس کے باوجود بھی گرفتاری سے نہ بچ سکا تھا کیونکہ مجھے گرفتار کرنے والے منگول نہیں' ایرانی مسلمان سپاہی تھے جو ہلاکو خاں کی طرف سے لڑ رہے تھے اور مجھے نہیں پہچانتے تھے۔

جن فوجی دستوں نے مسلمان اولوس کا تعاقب کیا تھا' ان کا سردار دربائی تھا۔ میرے ساتھ گرفتار ہونے والوں میں چار قائد تھے اور ایک وہی امیر جس نے سپہ سالار ایبک دوادار کی موت کے بارے میں سن کر اظہار افسوس کرنے کی بجائے مجھے اپنی پروا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

منگول سردار دربائی کچھ دور دریا کے کنارے اپنے گھوڑے پر سوار' مسلمان سپاہیوں کے قتل عام سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایرانی سپاہیوں نے مجھے اور دوسرے فوجی عہدیداروں کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"تو تو ہے اس بھگوڑے اردو کے سردار!" یہ کہہ کر دربائی نے قہقہہ لگایا۔

ہم سبھی کے جسم زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور ہم سے ہتھیار چھین لیے گئے تھے۔ اب وقت آگیا تھا کہ میں اپنی اس شخصیت کا اظہار کر دیتا جو میری اصل شخصیت نہیں تھی مگر میں اپنی زندگی بچانے کے لیے ایسا کرنے پر مجبور تھا۔

معاً میں نے سر اٹھا کر دربائی کو مخاطب کیا۔ "اے دربائی! سپاہیوں کو حکم دے کہ میری زنجیریں کھول دیں۔" میں نے دشت میں بولی جانے والی زبان استعمال کی تھی۔

منگول سردار ایک دم اچھل پڑا اور حیرت کی زیادتی کے سبب چند لمحے کچھ نہ بول سکا' پھر وہ بولا بھی تو اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "تو... تو بوغا... مگر... مگر یہ تیرے جسم پر دشمنوں کا لباس۔" وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے دربائی!" میں نے بے جھجک کہا۔ "دشمن کی قید سے نکلنے کا اس کے سوا میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔"

"مگر... مگر تو قید سے نکلنے کے بعد تو دشمن کے ارد سے فرار ہو سکتا تھا۔" دربائی کے لہجے میں اب بھی حیرت تھی۔ وہ غالباً "کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے!

"اس کا بھی ایک سبب تھا۔" میں نے کہا' پھر ذرا سخت لہجے میں بولا۔ "کیا تو تمام باتیں اسی وقت اور اسی حالت میں پوچھے گا؟"

میری توقع کے عین مطابق منگول سردار گھبرا گیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ مجھے آزاد کر دیں۔ میرے ہمراہ جو قائد تھے' وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ انہی میں سے کوئی بڑبڑایا۔ "دشمن کا جاسوس!"

مگر میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ زنجیروں کی قید سے آزاد ہوتے ہی میں نے دربائی کو مخاطب کیا۔ "اے دربائی! یہ بتا کہ الاؤ کی رکھوالی کا بیٹا کہاں ہے؟"

"اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ تعاقب کر کے بھگوڑوں کو قتل کر دوں اور ان کے سرداروں کو گرفتار کر کے اس تک پہنچوں۔ وہ میدان جنگ ہی میں رک گیا تھا اور وہیں ہو گا۔" دربائی نے جواب دیا۔

"اچھا تو پھر میں اسی کی طرف چلتا ہوں۔" میں نے کہا اور بڑھ کر ایک آوارہ گھوڑے کی لگام تھام لی جس کے مسلمان سوار کو یقیناً "قتل کیا جا چکا تھا۔

اپنے چہرے سے میں نے اسی وقت نقاب الگ کر دی تھی جب سپاہیوں کو گرفتاری کی غرض سے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا تاکہ وہ مجھے پہچان لیں مگر قریب آنے پر وہ منگول کی بجائے ایرانی سپاہی ثابت ہوئے تھے۔

جب میں گھوڑے پر سوار ہو کر ہلاکو خاں سے ملنے جا رہا تھا تو میرا ذہن چند نتائج اخذ کر چکا تھا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ خلیفہ بغداد' ہلاکو خاں کے سامنے نہیں ٹک سکتا تھا کیونکہ اس کا اولوس تباہ ہو چکا تھا۔ جو تھوڑے بہت سپاہی بغداد میں رہ گئے تھے' وہ محصور ہونے کی صورت میں خلیفہ کو نہیں بچا سکتے

تھے۔ اب اپنی اور اپنے باپ کی زندگی بچانے کا صرف ایک ہی راستہ میرے سامنے تھا کہ دوبارہ ہلاکو خاں سے جا ملتا۔ اگر مجھے صرف اپنی زندگی کی فکر ہوتی تو ممکن ہے میں کوئی دوسری راہ اختیار کرتا مجھے یہ موقع بھی حاصل تھا کہ وہاں سے فرار ہو جاتا لیکن اس صورت میں میرے باپ کی زندگی کا قطعی کوئی امکان باقی نہ رہتا جو بغداد میں تھا۔ میں اسے موت کے حصار میں چھوڑ کر بھلا کس طرح فرار ہو جاتا۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ میرا ذہن اس کہانی کے تانے بانے جوڑنے میں بھی مصروف تھا جو مجھے ہلاکو خاں کو سنانی تھی۔

ہلاکو خاں تک پہنچنے سے قبل میرا ذہن ایک کہانی ترتیب دے چکا تھا۔ اس کہانی میں اگر کوئی جھول تھا تو صرف یہ کہ جس وقت میں خلیفہ سے ملا تھا' وہاں وزیر ابن العلقمی بھی موجود تھا۔ مجھے برقائی خان کے قاصد کی حیثیت سے یہ کہنا تھا کہ خلیفہ اپنا اولوس' مغربی دشت روانہ کر دے مگر میں نے اسے یہ پیغام نہیں دیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ نمک حرام وزیر ابن العلقمی' ہلاکو خاں سے ملا ہوا ہے اس لیے زوال بغداد کے بعد اسے بہرحال قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کی زندگی میرے لیے خطرہ بن سکتی تھی کیونکہ وہ میری حقیقت سے واقف تھا۔ مجھے ہلاکو خاں کو جو کہانی سنانی تھی' اسے ترتیب دیتے ہوئے یہ خیال رکھا تھا کہ اگر کسی طرح ہلاکو خاں کے علم میں وہ تمام باتیں آجائیں جو میری اصل شخصیت سے پردہ اٹھا دیں تو وہ ان پر یقین نہ کرے۔

میں نے ہلاکو خاں کو سنانے کے لیے اپنے ذہن میں جو کہانی ترتیب دی تھی' وہ ہلاکو خاں کو میری طرف سے پوری طرح مطمئن کر دینے کے لیے کافی تھی۔ شرط صرف یہ تھی کہ ہلاکو خاں اس سے اتنا مطمئن ہو جاتا کہ کسی قسم کی تصدیق ضروری نہ سمجھتا۔ مجھے ہلاکو خاں کی طرف سے تو یقین تھا مگر وزیر ابن العلقمی کی طرف سے یہ خطرہ ضرور لاحق تھا کہ وہ مجھے ہلاکو خاں کے ساتھ دیکھ کر کہیں بغیر کسی تفتیش یا پوچھ گچھ کیے ہی میرے لیے زہر نہ اگلنے لگے۔ مجھے بہرحال یہ خطرہ مول لینا تھا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

جب ہلاکو خاں کا اولوس نظر آنے لگا تو میں نے ایک بار پھر اپنے ذہن میں وہ کہانی دہرائی تاکہ ہلاکو خاں کوئی سوال کرے تو میں اسے اطمینان بخش جواب دے سکوں۔ وہ کہانی حقیقت سے قریب تر ضرور تھی مگر حقیقت پر مبنی نہیں تھی۔

کہانی یہ تھی کہ جب میں برقائی خاں کا قاصد بن کر خلیفہ سے ملا تو اس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کا سبب یہ تھا کہ برقائی خاں ہوشیاری سے کام لے کر پہلے ہی ایک قاصد کے ذریعے خلیفہ کو ایک تحریری پیغام بھیج چکا تھا۔ برقائی خاں نے اس تحریری پیغام میں واضح کر دیا تھا۔ کہ اس کے صرف ان تحریری پیغاموں کو درست سمجھا جائے جن پر اس کی مہر بھی ہو۔ میں کیونکہ زبانی پیغام لے کر گیا تھا اس لیے یہ راز کھل گیا کہ میں برقائی خاں کا بھیجا ہوا قاصد نہیں اور مجھے یقیناً ہلاکو خاں نے بھیجا ہے۔ قید کے دوران میں مجھ سے ابونصار ملا جو خلیفہ کے خاص آدمیوں میں سے تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے قید سے رہائی دلا سکتا ہے مگر ایک شرط پر کہ میں رہائی پانے کے بعد اس کا ایک کام کر دوں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں نے سپہ سالار ایبک دوادار کو قتل کر دیا تو وہ مجھے بغداد سے فرار ہو جانے دے گا اور مجھے نہیں روکے گا۔ میں نے ابونصار سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ سپہ سالار کو کیوں قتل کرانا چاہتا ہے اور نہ ہی خود اس نے بتایا تھا کہ مگر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یقیناً" ان دونوں کے درمیان شدید قسم کے اختلافات ہوں گے۔ میں نے اس کی یہ شرط قبول کر لی کیونکہ سپہ سالار ایبک دوادار کے قتل سے منگولوں کو بھی فائدہ ہو سکتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہ بہت ذہین اور بہادر شخص ہے۔ ابونصار نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے رہا کرانے کے سلسلے میں اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب میں اس کے مشوروں پر عمل کروں اور اس کی ہر بات مان لوں۔ پھر اس نے

مجھے رہا کرانے کے لیے خود کو میرا باپ ظاہر کیا اور ایک فرضی کہانی خلیفہ کو سنا کر اسے اطمینان دلا دیا۔ قید سے رہا کرانے کے بعد اس نے مجھے اپنا کھویا ہوا بیٹا ظاہر کر کے مسلمانوں کے اولوس میں بھرتی کرا دیا تاکہ میں سپہ سالار ایبک دوادار کو با آسانی قتل کر سکوں۔ ابونصار نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے آدمی ہر وقت میری نگرانی کر رہے ہیں اس لیے میں فرار کی کوشش نہ کروں۔ اگر میں نے ایسا کیا تو مجھے بے دریغ قتل کر دیا جائے گا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اب میں خود سپہ سالار کو قتل کرنا چاہتا ہوں اور اسے قتل کیے بغیر فرار ہونا نہیں چاہتا۔ ابونصار کی کوششوں اور میری ذاتی صلاحیتوں کے سبب مجھے مسلمانوں کے اولوس میں قائد کا عہدہ مل گیا۔ مجھے ابھی اولوس میں بھرتی ہوئے دو دن ہی گزرے تھے اور ابھی مجھے سپہ سالار کو قتل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ وقت جنگ آ گیا۔ سپہ سالار ایبک دوادار کی رہنمائی میں مسلمانوں کا اولوس، بغداد سے نکلا جس کے ساتھ میں بھی تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ حالت جنگ سے فائدہ اٹھا کر کسی مناسب موقع پر سپہ سالار کا کام تمام کر دوں گا تاکہ اس کے قتل سے مسلمانوں کے اولوس کی کمر ٹوٹ جائے۔ پہلے دن مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا تو میں نے سوچا کہ دوسرے دن یہ کام ضرور کر دوں گا مگر دوسرے دن یوگدو (آسمانی روح) نے خود بخود ایسے حالات پیدا کر دیے کہ نہ صرف سپہ سالار ایبک دوادار مارا گیا بلکہ پورا مسلمان اولوس تباہ ہو گیا۔

میری گھڑی ہوئی کہانی اتنی بھرپور اور قابل یقین تھی کہ جب اسے ہلاکو خاں نے سنا تو کوئی سوال کرنا ضروری نہ سمجھا بلکہ اس نے میری ذہانت و بہادری کے اعتراف میں چند کلمات بھی ادا کیے۔ یوں بھی وہ فتح کے جوش میں بہت خوش نظر آ رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا۔

جب میں ہلاکو خاں کے پاس پہنچا تو وہ اولوس کو از سر نو ترتیب دے رہا تھا تاکہ بغداد پر آخری فیصلہ کن حملہ کر سکے۔ اس نے مجھے بھی حکم دیا کہ مسلمانوں کی سیاہ وردی اتار کر منگولوں کا مخصوص لباس پہن لوں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے ایک بار پھر ان وحشیوں کا لباس پہننا پڑے گا۔ اب میرے جسم پر ایک منگول سردار کی وردی تھی۔

ہلاکو خاں کو اپنی طرف سے مطمئن کرنے کے بعد اب میرا ذہن اپنے باپ کی زندگی بچانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرے باپ کو ہلاکو خاں، ابونصار کی حیثیت سے اچھی طرح جانتا تھا۔ خاقان منگو خاں کی رسم تاجپوشی میں بھی وہ برقائی خاں کا استاد مشہور تھا۔ اور یوں بھی وہ سارے دشت میں برقائی خاں کا استاد مشہور تھا۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ہلاکو خاں سے ہمدردی رکھتا تھا۔ یہ بات ہلاکو خاں کے لیے ناقابل یقین ہوتی۔ پھر یہ کہ میرا باپ بھی شاید اپنی زندگی بچانے کی خاطر اتنا بڑا جھوٹ بولنے پر قطعی آمادہ نہ ہوتا۔ میں نے اس کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی، اس کی روشنی میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ مرنا پسند کرے گا مگر جھوٹ نہیں بولے گا۔

ان حالات کے پیش نظر اس کی زندگی بچانے کا صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا۔ وہ یہ کہ جب وہ بدنصیب دن آئے کہ ہلاکو خاں اپنا اولوس لے کر بغداد میں داخل ہوئی کسی طرح اپنے باپ کو وہاں سے فرار ہونے کا موقع فراہم کر دوں۔ اس کے بعد خود بھی مناسب موقع دیکھ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ اب تک میری آنکھیں وحشت و بربریت کے اتنے نظارے کر چکی تھیں، اتنا کشت و خون دیکھ چکی تھی اور اب تک میں خود اتنے منگولوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا کہ میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ سرد پڑ چکی تھی۔ یہ انتقام کی آگ اس وقت مزید بجھ گئی تھی جب میں نے اپنے باپ کو تلاش کر لیا تھا۔ اب میرے دل میں مزید خون خرابے کی آرزو نہیں رہی تھی اور میں اپنے باپ کی شفقت و محبت کے سائے میں پرسکون زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ ہنگاموں، سازشوں اور فریب کاریوں سے اب میرا دل بھر چکا تھا کیونکہ جوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی میں مجبوراً ان

کا شکار ہو گیا تھا۔ آغاز جوانی سے لے کر اب تک میری زندگی ہنگاموں ہی میں گزری تھی مگر اب میں قرار چاہتا تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ منگول سردار دربائی' گرفتار ہونے والے مسلمان اولوس کے عہدیداروں کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ یہ خبر ہلاکو خاں کو پہلے ہی مل چکی تھی کہ مسلمان اولوس کے ایک سپاہی کو بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ روانگی سے قبل ہلاکو خاں کے حکم پر زندہ گرفتار کیے جانے والے عہدیداروں کو باندھ کر اولوس کے سامنے ڈال دیا گیا اور پھر گھوڑے دوڑا دیے گئے۔ اولوس کے گھوڑے ان کے جسموں کو روندتے ہوئے گزر گئے۔

پھر وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ خلیفہ بغداد شہر کے سارے دروازے بند کر کے محصور ہو گیا تھا۔ ہلاکو خاں کے حکم پر شہر کا محاصرہ کر کے پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ اولوس کے چینی عملے نے جگہ جگہ پاؤ یو نصب کر دیں تاکہ ان کے ذریعے دشمن پر نفت پھینکا جا سکے۔

بظاہر یہ معلوم ہو رہا تھا کہ شہر بہت جلد فتح کر لیا جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہلاکو خاں مسلسل کوششوں کے باوجود بغداد کو فتح نہ کر پایا۔ شہر کی فصیلوں سے دن بھر تیر برستے رہتے جن کے سبب منگول سپاہی فصیلوں تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو پاتے اور سپاہی ہلاکو خاں کے حکم پر بڑھتے بھی تو ان کے جسم تیروں سے چھلنی کر دیے جاتے۔ خلیفہ زبردست مدافعتی جنگ لڑ رہا تھا مگر میں مایوس تھا۔ میرے خیال میں خلیفہ طویل عرصے تک محصور ہو کر نہیں لڑ سکتا تھا کیونکہ اس کے اولوس کا بڑا حصہ قتل کیا جا چکا تھا اور اس کے پاس جو ہتھیار تھے' وہ بھی کب تک ساتھ دے سکتے تھے۔

ہلاکو خاں کے اولوس کو بغداد کا محاصرہ کیے ہوئے وہ چالیسواں دن تھا۔ ابھی سورج اپنی بیوی کی آغوش سے اٹھ کر ہی آیا تھا کہ ہلاکو خاں نے اپنے بڑے سے یورت میں تمام منگول سرداروں کو طلب کر لیا۔

ہلاکو خاں کو میں نے اتنا جھنجلایا اور غصے میں کبھی نہیں دیکھا جتنا اس دن دیکھا کیونکہ یہ بات اس کے خلاف مزاج تھی۔ وہ اس دن تمام منگول سرداروں پر برس پڑا۔ اس کے خیال میں محاصرے کو اتنا طول نہیں کھینچنا چاہیے تھا۔

ابھی اجلاس جاری ہی تھا اور کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا تھا کہ کیا کیا جائے' ہلاکو خان کے قشق کا تومان باشی' یورت میں داخل ہوا۔ اجلاس کے دوران میں' اس کا وہاں آنا' اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے۔

وہ ہلاکو خاں کے استفسار پر بولا۔ "ابھی کچھ دیر قبل شہر کا ایک دروازہ کھلا اور اس سے ایک گھوڑ سوار نکلا جس کے ہاتھ میں سفید پرچم تھا۔ وہ یقیناً "خلیفہ کا کوئی اہم آدمی ہے کیونکہ اس کے جسم پر بہترین لباس ہے۔ ہمارے سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔ تو کہے تو اسے تیرے سامنے پیش کیا جائے!"

"وہ یقیناً" خلیفہ کا کوئی پیغام لے کر آیا ہو گا۔" ہلاکو خاں کی بیوی دوقوز نے کہا۔ "اسے فوراً" یہاں لے کر آؤ!"

کچھ دیر بعد ہی جو شخص یورت میں داخل ہوا' اسے دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا۔ وہ خلیفہ کا نمک حرام وزیر ابن العلقمی تھا۔

اس وقت یورت میں میرے سوا کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو عربی زبان جانتا ہو اس لیے ہلاکو خاں نے مجھے حکم دیا کہ میں ترجمان کے فرائض انجام دوں۔

ابن العلقمی نے ہلاکو خاں کی مسند کے سامنے پہنچ کر منگول آداب کے مطابق اپنا سر جھکایا' کمر کے گرد بندھی ہوئی پیٹی کھولی اور سرے صافہ! تار کر ہاتھ میں لے لیا۔ گویا اس طرح اس نے اظہار اطاعت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ یقیناً "منگولوں کے طریق آداب سے آگاہ تھا۔

ہلاکو خاں کے حکم پر جب میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا تو ابن العلقمی کی نگاہ میری جانب اٹھ گئی۔ وہ مجھے وہاں دیکھتے ہی اچھل پڑا اور اس کے چہرے سے شدید حیرت کا اظہار ہونے لگا۔

"بوغا! اس سے پوچھ کہ یہ کون ہے اور کیوں آیا

ہے؟" ہلاکو خاں نے مجھ سے کہا۔

"یہ خلیفہ کا وزیر ابن العلقمی ہے اور اسے میں پہچانتا ہوں۔" میں نے ابن العلقمی سے کوئی سوال کیے بغیر ہلاکو خاں کو جواب دیا' پھر بولا۔ "میں اس کی آمد کا سبب ابھی معلوم کر کے بتاتا ہوں۔"

میری بات سن کر ہلاکو خاں کے چہرے پر رونق آگئی اور وہ بولا۔ "تو یہی وہ شخص ہے جو میرے پاس اب تک کئی بار پیغامات بھیج چکا ہے کہ میں بغداد پر حملہ کر دوں اور یہ میرا ساتھ دے گا۔ اس سے پوچھ کہ بغداد کو کس طرح فتح کیا جا سکتا ہے؟ اور یہ بھی پوچھ کہ جب خلیفہ کا اولوس تباہ کر دیا گیا تو پھر اس کے پاس اور سپاہی کہاں سے آگئے جو اس طرح شہر کی حفاظت کر رہے ہیں کہ اب تک میرے سپاہی فصیلوں تک نہیں پہنچ سکے؟" یہ کہتے ہوئے ہلاکو خاں نے ابن العلقمی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ابھی تک شدید حیرت کے آثار نظر آرہے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ابن العلقمی کو مخاطب کرتا' ہلاکو خاں دوبارہ بول اٹھا۔ اس نے بھی غالباً" ابن العلقمی کے چہرے سے ظاہر ہونے والی انتہائی حیرت کو بھانپ لیا تھا۔ "بوغا! یہ شاید تجھے یہاں دیکھ کر حیران ہو گیا ہے۔ پہلے اس کی غلط فہمی دور کر دے کہ تو ابونصار کا بیٹا نہیں۔" یہ کہہ کر ہلاکو خاں ہنس پڑا۔

"اے ابن العلقمی! مجھے یہاں دیکھ کر حیران نہ ہو۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تو میرے بارے میں جو کچھ جانتا ہے' وہ غلط ہے۔ میں ابونصار کا بیٹا نہیں ہوں اور....."

"تو پھر..... پھر اس نے..... اس نے یہ کیوں ظاہر کیا تھا؟" ابن العلقمی نے درمیان ہی میں میری بات کاٹ دی۔ "کیا..... کیا وہ بھی ہلاکو خاں سے ملا ہوا ہے؟"

"اس نے جو کچھ ظاہر کیا تھا' اس کا سبب ایک مصلحت تھی جس کا جاننا تیرے لیے ضروری نہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے خلیفہ کو فریب دیا!" ابن العلقمی بولا۔

"فریب تو خلیفہ کو تو بھی دیتا رہا ہے۔" میں نے چاہا تھا کہ یہ الفاظ میری زبان سے ادا نہ ہوں مگر اپنی کوشش میں ناکام رہا اور دل کی بات زبان پر آہی گئی۔

میری بات سن کر ابن العلقمی سٹپٹا گیا اور بغلیں جھانکنے لگا۔

میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ "ہلاکو خاں یہ جاننا چاہتا ہے کہ تو کیوں آیا ہے؟ اور یہ بھی کہ بغداد اب تک کیوں فتح نہیں کیا جا سکا؟ اسے کس طرح فتح کرنا ممکن ہے؟"

میرے سوال سن کر کچھ دیر وہ خاموش رہا' پھر میری طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں بولا۔ "کیا میں یقین کر لوں کہ تو واقعی اس کا بیٹا نہیں اور وہ سب باتیں کہہ دوں جو ہلاکو خاں سے کہنے آیا ہوں؟" آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کے لہجے سے تذبذب کا اظہار ہونے لگا۔

"کیا اس بات کا ثبوت یہ نہیں کہ تو مجھے یہاں دیکھ رہا ہے۔" میں بولا۔

"پھر بھی میں..... میں کسی اور ترجمان کے ذریعے ہلاکو خاں سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔" وہ کچھ سوچ کر عیاری سے بولا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا' تجھے مجھ پر یقین نہیں کہ جو تو کہے گا' میں ہلاکو خاں سے کہہ دوں گا اور اس کے الفاظ سے بھی تجھے آگاہ کر دوں گا؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تو کچھ بھی سمجھ سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کی بات ہلاکو خاں تک پہنچا دوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ ہلاکو خاں نے یہ سن کر حقارت سے ابن العلقمی کی طرف دیکھا۔ ممکن تھا کہ وہ ابن العلقمی کی بات رد کر دیتا مگر اس وقت دو قوز نے مشورہ دیا کہ ابن العلقمی کی خواہش پوری کر دی جائے۔

ہلاکو خاں کو اپنی بیوی کا مشورہ ماننا پڑا۔ کچھ دیر ہی میں ایک بوڑھے ایغوری کو یورت میں پہنچا دیا گیا جو

عربی زبان بول اور سمجھ سکتا تھا۔ میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا کہ کہیں ابن العلقمی کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو میرے لیے مشکل پیدا کردے۔

"اب کہہ تو کیا کہنا چاہتا ہے؟" ہلاکو خاں بولا اور بوڑھے ایغوری نے اس کے الفاظ عربی زبان میں دہرائے۔

"یہ نوجوان جو ابھی مجھ سے گفتگو کر رہا تھا' میں اس کے بارے میں منگولوں کے عظیم قائد کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ برقائی خان کا قاصد بن کر خلیفہ بغداد کے پاس آیا تھا۔" ابن العلقمی نے زہر اگلا اور اس کے الفاظ بوڑھے ایغوری نے ہلاکو خاں کو بتائے۔

"اس احمق کو بتا کہ میں بطریق بوغا کے بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا کیونکہ وہ جو کچھ بتانا چاہتا ہے' میں پہلے ہی جانتا ہوں۔ اس سے پوچھ کہ کیا یہ بطریق بوغا کے بارے میں یہی بتانے کے لیے بے چین ہے کہ کسی منگول کی بجائے ایک عرب کا بیٹا ہے؟! اگر وہ یہی کہے تو اس سے کہہ کہ ہلاکو خاں بطریق بوغا کو اس سے زیادہ جانتا ہے اور مزید کچھ جاننے کی خواہش نہیں رکھتا۔"

جب بوڑھے ایغوری کی زبانی ابن العلقمی نے ہلاکو خاں کے الفاظ سنے تو اس کے چہرے سے اطمینان کا اظہار ہونے لگا اور پھر وہ فوراً" مطلب کی بات پر آ گیا۔

"اگر منگولوں کا عظیم رہنما اپنے خادم کی جان بخشی کا وعدہ کرے تو بغداد فتح ہو سکتا ہے۔" ابن العلقمی نے کہا۔

"میں تیری جان بخشی کا وعدہ کرتا ہوں۔" ہلاکو خاں نے اس کے الفاظ جاننے کے بعد کہا۔

"تو پھر میں خلیفہ کو یقین دلا دوں گا کہ منگولوں کا عظیم رہنما اسے منصب و خلافت پر برقرار رکھے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس فریب میں آ جائے گا۔ میں اس سے کہوں گا کہ منگولوں کا قائد اپنی لڑکی کی شادی اس کے لڑکے ابوبکر سے کر دے گا۔" ابن العلقمی اپنا عیارانہ منصوبہ بیان کر رہا تھا "میں خلیفہ کو یہ باور کر دوں گا کہ منگولوں کا رہنما اسے بدستور خلیفہ بنائے رکھنا چاہتا ہے جس طرح کہ روی حکومت میں خلیفہ برقرار رہے۔ میں خلیفہ سے کہوں گا کہ منگول رہنما اس سے صرف اپنی بادشاہت تسلیم کرانا چاہتا ہے جس طرح کہ خلیفہ کے آباء و اجداد کے زمانے میں سلجوقی بادشاہ رہے ہیں۔ اس کے بعد منگولوں کا رہنما اپنا لشکر لے کر واپس چلا جائے گا۔ میں خلیفہ کو سمجھاؤں گا کہ اس طرح مسلمانوں کا خون بھی نہ بہے گا اور اقتدار بھی برقرار رہے گا۔ میں خلیفہ کو یہ ذہن نشین کرا دوں گا کہ اگر وہ اپنے مخصوص ارکان حکومت اور امراء و فقہا کو ساتھ لے کر منگولوں کے رہنما سے ملنے اس کی خیمہ گاہ میں چلا گیا تو تمام معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اس طرح منگولوں سے اس کا خونی رشتہ بھی قائم ہو جائے گا جس کے بعد پھر کبھی جنگ کا خطرہ نہ رہے گا۔" یہ کہہ کر نمک حرام و عیار وزیر ابن العلقمی خاموش ہو گیا۔

بوڑھے ایغوری ترجمان کی زبانی ہلاکو خاں نے ابن العلقمی کا پورا شر انگیز اور عیارانہ منصوبہ سنا' پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ آخر اس کی کیا ضرورت ہے' اس بوڑھے گدھ سے یہ بھی کہا جائے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی اس کے لڑکے سے کر دوں گا؟"

"اس میں حرج بھی کیا ہے۔" دوقوز ہنس کر بولی۔ "اگر اس طرح وہ آسانی کے ساتھ فریب میں آ سکتا ہے تو میرے خیال میں یہ بات اس سے ضرور کہی جانا چاہیے۔"

"تو ٹھیک کہتی ہے۔" یہ کہہ کر ہلاکو خاں بھی ہنس پڑا' پھر بولا۔

"یہ عیار بھی تو اس کے بدلے کچھ انعام چاہتا ہو گا۔"

"یقیناً"!" دوقوز بولی۔ "خود اس سے کیوں نہ پوچھ لے کہ یہ کیا انعام چاہتا ہے؟"

"اس سے پوچھ کہ اپنی وفاداری کے صلے میں یہ مجھ

سے کیا چاہتا ہے۔" ہلاکو خاں نے بوڑھے ایغوری ترجمان کو مخاطب کیا اور اس نے تعلیم حکم کی۔

"فی الحال صرف یہ کہ خادم جس عہدے پر ہے' اسے برقرار رکھا جائے اور وہ جس کے لیے سفارش کرے اسے بغداد کے تخت خلافت پر بٹھا دیا جائے۔" ابن العلقمی نے اپنی ناپاک خواہشوں کا اظہار کیا۔

"کوئی اور خلیفہ؟" ہلاکو خاں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "یہ ناممکن ہے۔" وہ دوٹوک الفاظ میں بولا۔

اس سے پہلے کہ ایغوری ترجمان اس کے الفاظ دہراتا' ہلاکو کی بیوی دوقوز بول اٹھی۔ اس نے ایغوری ترجمان کو ہلاکو خاں کے الفاظ دہرانے سے روک دیا' پھر ہلاکو خاں کو مخاطب کیا۔ "سن اور غور کر کہ اس شخص کو کس بات نے مجبور کیا کہ یہ اپنے مالک سے غداری کرے؟" پھر دوقوز نے خود ہی اس سوال کا جواب دیا۔ اس شخص نے یقیناً" اس امید پر ہم سے سازباز کی ہے کہ یہ اپنے پسندیدہ شخص کو تخت خلافت پر بٹھا سکے۔ تو سن کہ اگر یہ اپنے مالک کے ساتھ غداری کر سکتا ہے' اسے دھوکا دے کر یہاں لا سکتا ہے تو کیا ہم اپنا مقصد حاصل کرنے تک اسے وقتی طور پر دھوکا نہیں دے سکتے۔ جب بغداد پر ہمارا قبضہ ہو جائے گا تو یہ شخص اس حیثیت میں نہیں ہو گا کہ ہم سے اپنی بات منوا سکے۔"

"اور پھر اسے مناسب وقت دیکھ کر راستے سے ہٹایا بھی جا سکتا ہے۔" ہلاکو خاں اپنی بیوی کے چپ ہوتے ہی بولا' پھر زور سے ہنس پڑا۔

نمک حرام ابن العلقمی حیرت سے ہلاکو خان کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس بات سے بے خبر تھا کہ خود اس کے سامنے اس کے قتل کیے جانے اور دھوکا دیے جانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میرے باپ نے غلط نہیں کہا تھا کہ اس سازش کے خواب کبھی پورے نہیں ہوں گے۔

پھر ہلاکو خاں کی ایما پر ایغوری ترجمان نے ابن العلقمی کو وہ خوشخبری سنا دی جسے سننے کے لیے وہ نہ جانے کب سے منتظر تھا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا' وہ ممکنہ حد تک ہلاکو خاں کے سامنے جھک گیا اور اپنی دونوں باتیں مان لیے جانے پر انتہائی شکر گزاری کا اظہار کیا۔ رخصت ہونے سے قبل ابن العلقمی نے ہلاکو خاں کے اس سوال کا جواب بھی دے دیا تھا کہ شہر کی حفاظت اب کون لوگ کر رہے ہیں۔ ابن العلقمی نے بتایا تھا کہ بچے کھچے سپاہی شہر کی حفاظت کے لیے ناکافی تھے۔ یہ دیکھ کر خلیفہ نے ہر جوان مرد پر یہ لازم کر دیا کہ وہ جہاد میں حصہ لے۔ اہل شہر نے سپاہیوں سے بھی زیادہ جرات و بہادری کا ثبوت دیا تھا اور منگولوں پر مسلسل تیر برسا کر انہیں شہر کی فصیلوں کے قریب نہ آنے دیا تھا۔ ہلاکو خاں نے یہ سن کر کہا تھا کہ جب اس کا اولوس' بغداد میں داخل ہو گا تو اہل شہر سے وہ اس کا انتقام لے گا اور پھر بعد میں یہی ہوا بھی تھا۔

بغداد کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ نمک حرام ابن العلقمی چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ روز صبح خلیفہ اور اس کے دوسرے اہم ارکان سلطنت کو لے کر ہلاکو خاں کے پاس آئے گا۔ اہم ارکان سلطنت میں میرے باپ کو بھی شمار کیا جا سکتا تھا۔ اگر خلیفہ اسے اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیتا تو وہ خلیفہ کا حکم نہ ٹال سکتا۔ یہ بات اس وقت میرے ذہن میں آئی جب وہ نمک حرام جا چکا تھا۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے سا لگا کہ آئندہ صبح خود میرے باپ کی زندگی کے لیے بھی آخری ثابت ہو سکتی ہے مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ اگر ایسا ہی ہوا اور میرا باپ بھی خلیفہ کے ساتھ آ کر منگولوں کے جال میں پھنس گیا تو ابن العلقمی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

دوسرے دن صبح مجھ پر انتہائی اضطراب طاری تھا جو اس وقت ختم ہوا جب میں نے خلیفہ کے ہمراہ اپنے باپ کو نہیں دیکھا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا۔

ہلاکو خاں کے یورت کا منظر بہت عجیب اور عبرت انگیز تھا جب مسلمانوں کا خلیفہ اپنے نمک حرام وزیر

کی سازشوں کے نتیجے میں حیران حیران سا' اپنے ارکان سلطنت' عباسی شہزادے اور شہزادیوں' مصاحب' اہل کمال' امراء اور رفقا کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی گردن پر ہلاکو خاں کے بیٹے ابغا کی تلوار کی نوک رکھی ہوئی تھی اور ہلاکو خاں کے وحشیانہ قہقہوں سے بورت گونج رہا تھا۔ ان قہقہوں میں بلا کی سفاکی و درندگی تھی۔ ابن العلقمی بورت میں ایک جانب کھڑا ہوا کانپ رہا تھا۔ اس نے بھی شاید اتنی بے رحمی و سفاکی سے لوگوں کو قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس وقت خلیفہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے' مجبوری و بے بسی کے آنسو! اور پھر وہ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک کر رخساروں پر بہتے ہوئے داڑھی میں جذب ہو گئے۔ اس نے ایک بار نگاہ اٹھا کر اپنے نمک حرام وزیر کی طرف دیکھا' پھر آنکھیں بند کر لیں اور اس کے ساتھ ہی تاریخ کا ایک باب بند ہو گیا۔

پھر اسی دن ہلاکو خاں کا اولوس بغداد میں داخل ہو گیا۔ شہر کے سارے دروازے ابن العلقمی کے حکم پر کھول دیے گئے تھے کیونکہ خلیفہ کے بعد اسی کا حکم چلتا تھا۔

اس کے بعد میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھے جنہیں بیان کرنے کے لیے میرے پاس لفظ نہیں۔ منگولوں نے جس طرح بغداد کا سماگ لوٹا' اس کے لیے ظلم' جبر' سفاکی' بے رحمی اور وحشت و بربریت کے الفاظ بہت چھوٹے ہیں۔ یہ الفاظ منگولوں کی اس درندگی کا احاطہ کرنے کے لیے ناکافی ہیں جس کا مظاہرہ انہوں نے بغداد میں کیا۔

ہلاکو خاں نے بغداد میں داخل ہوتے ہی قتل عام کا حکم دے دیا تھا۔ ہر طرف نالہ و شیون تھا' چیخیں تھیں' بچوں کے بلکنے کی آوازیں تھیں' عورتوں کے رونے کی صدائیں تھیں اور قتل ہونے والے مردوں کی آخری ہچکیاں تھیں۔ قتل ہونے والوں میں عورتیں' بچے' بوڑھے علماء و فضلا' اہل ہنر' اساتذہ' طلبہ' مریض اور معذور سبھی شامل تھے۔ ناز پروردہ اور عصمت مآب خواتین جن پر کبھی کسی غیر مرد کی نگاہ تک نہیں پڑی تھی' اپنے گھروں سے کھینچ کھینچ کر باہر لائی جا رہی تھیں۔ سڑکوں اور چوراہوں پر منگول بھیڑیے انہیں جانوروں کی طرح پچھاڑ کر ان کی عصمت لوٹ رہے تھے اور انہیں اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے بعد قتل کر رہے تھے۔ میں نے ایک منگول درندے کو' ایک گھر میں سے ایک عورت کو گھسیٹ کر باہر لاتے دیکھا۔ وہ عورت حاملہ تھی۔ منگول درندے نے خنجر سے اس عورت کا پیٹ چاک کر دیا اور پھر اپنا نیزہ اس کے پیٹ میں گھسیڑ کر اس کی انتڑی میں ایک ننھی سی جان کو پرو لیا' پھر قہقہے لگانے لگا۔

میری حیثیت کسی عام منگول سردار یا اولوس کے کسی معمولی عہدیدار کی سی نہیں تھی اس لیے میں ہلاکو خاں کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ ہلاکو خاں کے ہمراہ میرے علاوہ دوسرے اہم سردار بھی تھے۔ ان میں سردار بائیدو' سردار سوغنچاق' سردار باجو خاں' سردار دربائی کے علاوہ ہلاکو خاں کا بیٹا ابغا' اس کی بیوی دوقوز' حاکم موصل بدرالدین لولو اور شیراز کا ابوبکر بن سعد زنگی سبھی تھے۔ خلیفہ کا نمک حرام وزیر ابن العلقمی بھی ایک گھوڑے پر سوار پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا اور اس کے قریب ہی چلنے والے گھوڑے کی پشت سے بغداد کا خلیفہ بندھا ہوا تھا جو یا تو بیہوش تھا یا اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

بغداد کو تہس نہس اور تباہ و برباد کرنے والوں میں موصل اور شیراز سے آنے والے مسلمان سپاہی بھی شامل تھے۔ وہ بھی منگول درندوں کے شانہ بشانہ وحشت و بربریت کے مظاہرے کر رہے تھے۔

میری خواہش یہ تھی کہ جلد از جلد رضافہ پہنچ کر اپنے باپ کی خبر لوں اور اسے بغداد سے بچ کر نکل جانے کا موقع فراہم کر دوں مگر میری یہ خواہش اس وقت پوری ہوئی جب ہلاکو خاں نے خلیفہ کے محل میں گھس کر اسے اچھی طرح لوٹ لیا۔ محل میں ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ ہلاکو خاں نے حکم دیا کہ اس کتب خانے کی تمام کتابوں کو دریائے دجلہ میں پھینک دیا

جائے۔ سپاہی اس حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ اسی دوران میں ہلاکو خاں نے مزید حکم دیا کہ شہر میں مزید جتنے کتب خانے اور مدرسے نظر آئیں' ان میں موجود کتابیں بھی جلا کر دریا میں پھینک دی جائیں۔ خلیفہ کے محل سے ہلاکو خاں کو بے اندازہ دولت ہاتھ آئی۔ اس نے ابن العلقمی سے بغداد کے دیگر امراء کے نام پتے حاصل کیے اور مختلف سرداروں کو ان کے گھر لوٹنے کے لیے روانہ کر دیا۔ ہلاکو خاں اپنی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ اب محل میں قیام پذیر ہو گیا تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ جب تک وہ نہ کہے شہر کے باشندوں کا قتل عام جاری رکھا جائے۔

جب محل کو اچھی طرح لوٹا جا چکا تو میں نے ہلاکو خاں سے قتل عام اور لوٹ مار میں شرکت کی اجازت چاہی تاکہ میں اس بہانے فوراً" رضافہ پہنچ سکوں۔

"جا اور عیش کر!" ہلاکو خاں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ تو بھی جوان ہے اور سپاہیوں کو کھلے عام عیش کرتے دیکھ کر تیرا لہو بھی جوش مارنے لگا ہے۔"

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور تیزی کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر محل سے نکل گیا۔

تمام راستے میں نے وہی ہولناک و شرمناک مناظر دیکھے۔ وہ شہر میرے باپ کے بقول صدیوں سے بوسہ گاہ خلائق رہا تھا۔ اب وہاں زبان شمشیر کے سوا کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس شہر کے لاتعداد فلک بوس قصر و ایوان' رفیع الشان مساجد و مدارس بے نظیر کتب خانے اور شفاخانے' قدم مقبرے اور مزارات سبھی تباہی و بربادی کی زد پر تھے۔ انہیں جلایا جا رہا تھا' لوٹا جا رہا تھا اور پامال کیا جا رہا تھا۔

میں اس وقت بغداد کے سب سے بڑے محلے قرافہ سے گزر رہا تھا جہاں بغداد کے امراء اور بڑے بڑے تاجروں کے قصر تھے۔ وہاں ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی مگر میں کہیں نہیں رکا۔

جلتے اور تباہ و برباد ہوتے محلوں سے گزرتا ہوا جب میں رضافہ پہنچا تو وہاں کا بھی وہی حال تھا۔ میں نے اپنا گھوڑا تیزی سے اس مکان کی طرف دوڑایا جہاں میرے باپ کو ہونا چاہیے تھا۔ میں اس مکان کے قریب پہنچا تو اس سے دھواں اٹھتے دیکھا مگر جب نزدیک گیا تو پتا چلا کہ آگ صرف اطراف میں موجود پیڑوں ہی کو اپنی زد میں لے سکی تھی۔ عمارت قطعی محفوظ تھی۔

عمارت کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے دھواں اندر جا رہا تھا۔ میں دھوئیں کی پروا کیے بغیر گھوڑے سے اتر کر مکان میں گھستا چلا گیا۔ کچھ دیر ہی میں مجھے پتا چل گیا کہ عمارت میں کوئی نہیں تھا۔ معاً" مجھے تہ خانے کا خیال آیا اور پھر میں اس کمرے کی طرف بھاگا جس کے نیچے تہ خانہ بنا ہوا تھا۔

میں نے بمشکل وہ بھاری سل اٹھائی جو تہ خانے کا راستہ روکے ہوئے تھی۔ پھر میں زینہ عبور کر کے تہ خانے میں اتر گیا۔ تہ خانہ تاریک پڑا تھا۔

میں نے ابھی نیچے اتر کر ایک طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ کسی نے پشت سے میرے اوپر چھلانگ لگائی۔ حملہ غیر متوقع تھا اس لیے میں سنبھل نہ پایا اور حملہ آور سمیت زمین پر گر گیا۔ مجھ پر حملہ آور ہونے والا میرے باپ کے ساتھیوں ہی میں سے ہو سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے فوراً" با آواز بلند رواحہ کو پکارا تاکہ میری آواز پہچان لی جائے۔ پھر یہی ہوا۔ مجھے چھوڑ دیا گیا اور میں نے زبیر کی آواز سنی۔

"بطریق بوتا!" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

وہ آواز میرے قریب ہی سے آئی تھی اس لیے میں سمجھ گیا کہ مجھ پر حملہ آور ہونے والا زبیر ہی تھا۔ میں فوراً" اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میری آنکھیں تاریکی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ میرے سامنے ایک ہیولا نظر آ رہا تھا جو یقیناً" زبیر ہی کا تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اس سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھا۔

جواب میں زبیر کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی' پھر وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "کل۔۔۔ کل انہیں ان

کی زندگی بھر کی وفاداریوں کا صلہ مل گیا۔ انہیں کل خلیفہ محترم کے محل میں طلب کیا گیا تھا اور۔۔۔ اور پھر وہ۔۔۔ وہ وہاں سے نہیں لوٹے۔ جب ہم۔۔۔"

"وہ کہاں گیا؟" میں نے بے چینی کے عالم میں اس کی بات کاٹتے ہوئے چیخ کر پوچھا۔

"وہاں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔" زبیر کی آواز اب بھی بھرائی ہوئی تھی۔

ہر چند کہ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا' اسی لیے میں نے پوری قوت سے چیخ کر کہا۔ "صاف صاف بتاؤ کہ اس کے ساتھ کیا گزری اور وہ کہاں ہے؟"

"انہیں خلیفہ' محترم کی ایما پر قتل کر دیا گیا۔" زبیر نے بتایا۔

"نہیں!" میں چیخ پڑا۔ "یہ۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔" پھر مجھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا اور میں دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میرے حواس جیسے معطل ہو گئے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کتنی دیر تک بلک بلک کر روتا رہا مگر اتنا احساس ضرور ہے کہ زبیر مجھے اپنے سینے سے لگا کر تسلیاں دیتا رہا۔

جب میرے ہوش و حواس کسی قدر بحال ہوئے تو میں نے زبیر سے اپنے باپ کے قتل کی تفصیلات معلوم کیں۔ زبیر کو زیادہ تفصیلات کا علم نہیں تھا مگر اس نے مجھے اتنا ضرور بتا دیا گیا تھا۔ زبیر سے یہ معلوم ہونے کے بعد میرے کانوں میں وہ گفتگو گونجنے لگی جو میرے اور ابن العلقمی کے درمیان' ہلاکو خاں کے بورت میں ہوئی تھی۔ ابن العلقمی نے میرے باپ کے بارے میں کہا تھا کہ اس نے خلیفہ کو فریب دیا ہے کیونکہ اس نے خلیفہ کو بتایا تھا کہ میں اس کا بیٹا ہوں جبکہ ابن العلقمی مجھے ہلاکو خاں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ میرے باپ کے قتل میں اسی نمک حرام کا ہاتھ تھا۔ اس نے خلیفہ کو میرے بارے میں بتایا ہو گا کہ مجھے کہاں اور کس حیثیت میں دیکھا۔ اس کے بعد میرے باپ پر غداری کا الزام عائد کرنا مشکل نہ رہا ہو گا۔

زبیر ہی سے مجھے پتا چلا کہ قتل کیے جانے کے بعد میرے باپ کی لاش کو رواحہ اور اس کے سپرد کر دیا گیا تھا کیونکہ بظاہر اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ زبیر اور رواحہ نے میرے باپ کو اسی عمارت کے احاطے میں دفن کر دیا تھا۔ رواحہ کے بارے میں زبیر نے بتایا کہ وہ صبح ایک ضروری کام سے محل کی طرف گیا تھا اور اب تک نہیں لوٹا۔ اس کا خیال تھا کہ رواحہ مارا گیا ہو گا کیونکہ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی منگول درندے بغداد میں گھس پڑے تھے۔

میں زبیر کے ہمراہ عمارت کے عقبی حصے میں پہنچا جہاں جلتے ہوئے پیڑوں کے نیچے میرے باپ کی قبر بنی ہوئی تھی۔ میں پھر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور رونے لگا۔

رونے سے میری طبیعت کچھ ہلکی ہوئی تو میں نے اس عمارت میں موجود رہنے والے خدام کے بارے میں پوچھا۔ زبیر نے بتایا کہ وہ سب عام اعلان جہاد کے بعد شہر کی حفاظت کے لیے فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ اس عمارت میں میرے باپ' رواحہ اور زبیر کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ زبیر نے تہ خانے سے باہر آنے کے بعد میرے جسم پر موجود منگول لباس دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا مگر میں نے غیر ضروری تفصیل سے گریز کیا تھا اور اسے صرف اتنا بتایا تھا کہ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ پھر میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ میرے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ کر وہاں سے نکل جائے۔ میں اسے وہاں سے فرار کا موقع فراہم کر دوں گا مگر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا تھا کہ وہ وہاں سے فرار ہونا نہیں چاہتا۔ وہ اپنے مرشد یعنی میرے باپ کی قبر کی حفاظت کرنے کے لیے وہیں رہنا چاہتا تھا تاکہ اس کے جیتے جی کوئی قبر کی بے حرمتی نہ کر سکے۔ اپنے باپ سے اس کی عقیدت دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔

"اے زبیر! یقین کر کہ اب میں بھی بغداد سے کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے کہا۔ "یہاں میرا باپ دفن ہے اور میں بھی

اس مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد میں نے اس سے رخصت کی اجازت چاہی تھی۔ زبیر کیونکہ حقیقت سے بے خبر تھا اس لیے اس نے مجھے وہیں اپنے ساتھ تہ خانے میں چھپنے کا مشورہ دیا تھا مگر میں نے اس کا مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے عمارت کے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا جہاں میرا گھوڑا موجود تھا۔

"زبیر! میرے باپ کے قتل میں یقیناً" اس نمک حرام ابن العلقمی کا ہاتھ ہے۔ میں جب تک اس سے انتقام نہیں لوں گا' میرے دل کو قرار نہیں آئے گا۔ تو مجھے جانے دے۔ میں پھر آؤں گا۔" یہ کہہ کر میں گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

"خدا تیری حفاظت کرے اور تو اپنے باپ کا انتقام لے سکے۔" زبیر نے مجھے دعا دی اور میں نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

میں ایک بار پھر سیلاب خوں سے گزرا اور محل پہنچ گیا۔ مجھے کچھ دیر بعد ہی پتا چل گیا کہ ابن العلقمی محل میں نہیں۔ وہ ایک منگول سردار کے ہمراہ بغداد کے کسی بڑے رئیس کے قصر کی طرف روانہ ہوا تھا تاکہ اس کی نشاندہی پر رئیس بغداد کو لوٹا جا سکے۔

ہلاکو خان' اس کے اہل خاندان اور بڑے بڑے منگول سرداروں کی رہائش کا بندوبست محل ہی میں کیا گیا تھا اور میں بھی انہی میں شامل تھا مگر وزیر ابن العلقمی کو محل میں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اس کا قصر محل کی قریب ہی تھا۔ وہ بدستور وہیں قیام پزیر تھا۔ اس کے قصر کے گرد انتہائی سخت پہرہ تھا۔ اس عیار نے اپنے حفاظت کی خاطر زبردست بندوبست کیا تھا اور منگول سپاہیوں کی بجائے ان عرب مسلمان سپاہیوں کو ترجیح دی تھی جو حاکم موصل کے ساتھ بغداد آئے تھے۔

مجھے دوسرے ہی دن اس بات کا احساس ہو گیا کہ اس نمک حرام اور سازشی کو قتل کرنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ یہی دیکھ کر میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ میں نے اس کے خلاف ہلاکو خاں کے کان بھرنا شروع کر دیے۔

ہلاکو خاں نے پورے چالیس دن تک بغداد کا محاصرہ کیا تھا اور اتنے ہی دن اہل شہر نے اسے اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا' غالباً" اس لیے ہلاکو خاں نے حکم دیا تھا کہ پورے چالیس دن تک بغداد میں قتل عام کیا جائے اور اس کے حکم کی تکمیل ہوئی۔

چالیس دن میں بغداد کی صورت ہی بدل کر رہ گئی۔ منگولوں نے اس عظیم الشان شہر کو کھنڈر بنا دیا تھا۔ ہلاکو خاں کا منشا تو یہ تھا کہ تمام شہر کی عمارتوں کو زمیں بوس کر دیا جائے مگر اس کی بیوی دوقوز کو خلیفہ کا محل بہت پسند آیا تھا اس لیے اس نے ہلاکو خان کو ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ چالیس دن کے قتل عام کے بعد پورے بغداد کی کثیر آبادی کا صرف چوتھائی حصہ باقی بچا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کنوؤں اور تہ خانوں میں چھپ گئے تھے اور ان میں وہ حسین ترین عورتیں بھی شامل تھیں جنہیں منگولوں نے اپنی کنیزیں بنا لیا تھا۔ دریائے دجلہ میں اس کثرت سے کتابیں پھینکی گئی تھیں کہ دریا پر ان سے ایک پل بن گیا تھا جس کے اوپر سے منگول سپاہی گھوڑے دوڑاتے گزر جاتے تھے۔ دریا کا پانی جلی ہوئی کتابوں کے سبب سیاہ ہو گیا تھا۔

خلیفہ مستعصم باللہ سے جان بخشی کا وعدہ کیا گیا تھا مگر وہ وعدہ محض ایک فریب تھا۔ قتل عام کے چوتھے دن اسے بھی ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے وہ عبرتناک منظر دیکھا تھا۔ خلیفہ کو ہلاک کیے جانے سے پہلے ہلاکو خاں نے وہاں تمام اہم اور بڑے بڑے منگول سرداروں کو بلوا لیا تھا اور ان میں' میں بھی شامل تھا۔

خلیفہ کو باب بدر کے سامنے موجود میدان میں ہلاک کیا گیا۔ محل کے اندر یہ وہی میدان تھا جہاں اس نے اولوس کا معائنہ کیا گیا تھا اور اپنے اولوس کے عہدیداروں کو انعامات سے نوازا تھا اور ان انعامات پانے والوں میں' میں بھی تھا۔ اب اسی میدان میں وہ بندھا ہوا' ہلاکو خاں کے قدموں میں پڑا تھا اور اس کی

آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ معاً ہلاکو خاں کا دایاں پاؤں حرکت میں آیا اور خلیفہ کے ماتھے پر بھرپور ٹھوکر پڑی۔ خلیفہ کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی۔ اس کے ماتھے کی کھال پھٹ گئی جس سے خون بہنے لگا۔ اسی وقت ہلاکو خاں کی آواز بلند ہوئی۔ "اے خلیفہ مکر نہ کر اور آنکھیں کھول! کل دوپہر تک میرے حکم پر تجھے کھانا دیا گیا ہے۔ بس کل رات سے میرے حکم پر تیرا کھانا بند کیا گیا ہے مگر تو اس سے اتنا کمزور نہیں ہوا کہ بے ہوش ہو جانے کا مکر کرے۔ آنکھیں کھول اور یاد کر کہ تو نے اپنے قاصد سے کیا کہلوایا تھا۔ شاید یاد ہو کہ نہ ہو مگر مجھے ایک ایک لفظ یاد ہے۔ اب دیکھ لے کہ میں نے تیرے غرور کو خاک میں ملا دیا۔" یہ کہہ کر ہلاکو خاں نے قہقہہ لگایا' پھر اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے طلائی ظروف' چاندی کی سلفچی اور جواہرات جڑی ہوئے عود ان لانے کا حکم دیا۔

یہ وہ تمام برتن تھے جنہیں خلیفہ کھانا کھاتے ہوئے استعمال کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ ہلاکو خاں نے یہ حکم بھی دیا کہ ان تمام برتنوں کو جواہرات اور سونے چاندی سے بھر کے لایا جائے نہ جانے اس سے اس کا مقصد کیا تھا۔

جب ہلاکو خاں کے حکم کی تعمیل ہو گئی تو اس نے سونے اور جواہرات سے بھرے ہوئے وہ ظروف خلیفہ کے سامنے رکھوا دیے' پھر خلیفہ کو مخاطب کیا۔ "تو کل سے بھوکا ہے۔ مجھے اس کا بہت خیال ہے۔ اب ایسا کر کہ تو نے جو سونا اور جواہرات جمع کیے تھے' انہیں کھا جا!"

"سونا کھانے کے لیے نہیں ہوتا۔" خلیفہ کی مدھم سی آواز سنائی دی۔

"تو پھر تو نے جمع کیوں کیا؟" ہلاکو خاں نے سوال کیا۔

خلیفہ اس بار کچھ نہ بولا۔

ہلاکو خاں نے محل کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تو نے جس لوہے سے محل کے لیے آہنی جالیاں بنوائیں' اس لوہے کو پگھلا کر آہنی تیر کیوں نہ بنوائے؟ تو نے اپنے خزانے میں یہ جواہرات جمع کرنے کی بجائے اپنے سپاہیوں کو رقم کیوں نہ دی تاکہ وہ جاں بازی سے میرا مقابلہ کرتے اور مجھے بڑھنے سے روک دیتے۔"

"اللہ کی مرضی یہی تھی۔" خلیفہ نے پھر جواب دیا۔

"تو پھر جو کچھ تجھ پر گزرے گی وہ بھی اللہ کی مرضی ہے۔ سن! میں تجھے ایسے گھر میں رکھوں گا جہاں نہ تجھے سردی لگے گی نہ پیاس!" یہ کہہ کر ہلاکو خاں نے حکم دیا کہ خلیفہ کو ایک سمور کے لبادے میں لپیٹ دیا جائے۔

تعمیل حکم ہو گئی تو ہلاکو خاں خود بھی گھوڑا منگوا کر اس پر سوار ہوا اور وہاں موجود منگول سرداروں کو بھی گھوڑوں پر سوار ہونے کا حکم دیا جن کے لیے گھوڑوں کا بندوبست پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ جو سپاہی میدان کی ایک جانب گھوڑوں کی لگامیں تھامے کھڑے ہوئے تھے' وہ گھوڑے لے کر سرداروں کے پاس پہنچ گئے۔

منگولوں کے قانون کے مطابق خلیفہ کا خون نہیں بہایا گیا اور اسے گھوڑوں کی ٹاپوں میں کچل کر مار ڈالا گیا۔ میں اس سفاکانہ کھیل میں حصہ نہیں لینا چاہتا تھا مگر ہلاکو خاں کے حکم سے کسی طرح انحراف کر سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی خلیفہ کے جسم کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندنا پڑا تھا۔

خلیفہ کی لاش کئی دن تک بے گور و کفن اسی میدان میں پڑی رہی اور جب اس سے تعفن اٹھنے لگا تو ہلاکو خاں کے حکم پر سپاہی اسے محل سے دور کہیں پھینک آئے۔

ہلاکو خاں نے اب تک بظاہر' نمک حرام ابن العلقمی کو وزارت کے عہدے پر برقرار رکھا تھا مگر آمد و خرچ کا تمام حساب منگول سردار دربائی کے سپرد تھا کیونکہ وہ ہلاکو خاں سے زیادہ قریب تھا۔ ابن العلقمی کو آمد و خرچ کے بارے میں صرف ایک حد تک مشورے دینے کا حق حاصل تھا۔

اب قتل عام ختم ہو چکا تھا اور ہلاکو خاں کا ارادہ یہ

تھا کہ اولوس کو لے کر میافارقین پر حملہ آور ہو۔ وہ بغداد کو باجوخاں یا دربائی کے سپرد کر کے بقیہ شہروں کی تسخیر کے لیے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرا منشا یہ تھا کہ اس کی روانگی سے قبل ہی ابن العلقمی کا قصہ پاک ہو جائے۔ میں نے اسی لیے منگول سردار دربائی کو بھی ابن العلقمی کی طرف سے برگشتہ کرنا شروع کر دیا تھا جو درحقیقت وزارت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ ہلاکو خاں کو تو میں روز اول ہی سے اکساتا رہا تھا کہ وہ ابن العلقمی کا کانٹا بھی نکال دے۔

ایک شام میں نے منگول سردار دربائی کو اس بات پر آمادہ کر ہی لیا کہ وہ ہلاکو خاں سے ابن العلقمی کی شکایت کر دے۔ یوں بھی دربائی، ابن العلقمی سے خوش نہیں تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ ابن العلقمی وقت بے وقت اس کے اختیارات میں مداخلت کرے اور اسے خواہ مخواہ مشورے دے۔

ہلاکو خاں نے منگول سردار دربائی کی شکایت سنی اور میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "بوغا کا تو بہت دن سے یہ خیال ہے کہ اس بیوقوف شخص کو قتل کر دیا جائے۔ وہ مجھے بھی بڑے الٹے سیدھے مشورے دیتا رہتا ہے۔ کبھی کہتا ہے فلاں کو خلیفہ بنا دوں، کبھی کہتا ہے فلاں کو! میں اسے کئی بار ڈانٹ کر ذلیل و رسوا کر چکا ہوں مگر وہ بڑا ڈھیٹ ہے، باز ہی نہیں آتا۔ میرے خیال میں اب اس کا وقت آ ہی چکا ہے۔ جب وہ اپنے مالک کا وفادار نہ ہوا تو ہمارا وفادار کیسے ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی بیوی دوقوز کی طرف مشورہ طلب نظر سے دیکھا جو اس کی دائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" دوقوز نے صرف دو لفظ کہہ کر اپنے شوہر کے فیصلے کی تائید کر دی اور میرا دل خوشی کے سبب تیزی سے دھڑک اٹھا ابن العلقمی کی موت کے حکم نے میرے لیے سامان مسرت فراہم کر دیا تھا۔

"اے بگھاتر بھائی کے بگھاتر بھائی اور اے الاؤ کی رکھوالے کے تیسرے بیٹے!" میں نے ہلاکو خاں کو مخاطب کیا۔ "اگر تو مجھے حکم دے کہ میں اس کے قصر میں گھس کر اسے قتل کر دوں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی کیونکہ اس نے میرے دوست دربائی کو بہت تنگ کر رکھا ہے۔"

"تجھے اس کی اجازت ہے۔" ہلاکو خاں بولا۔

منگول سردار دربائی نے ہلاکو خاں کا شکریہ ادا کیا اور مجھے اپنے ہمراہ لے کر محل سے باہر آ گیا۔

اس نمک حرام کا قصر محل سے زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے میں اور دربائی پیدل ہی وہاں پہنچ گئے۔ دربائی کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی محافظوں نے اندر جانے کا راستہ دے دیا۔

"اے دربائی! میری خواہش ہے کہ میں اسے اپنی تلوار سے قتل کروں۔" میں نے بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں تجھے ہی خواہش پوری کرنے کا موقع دوں گا۔ میں تو صرف اس لیے تیرے ساتھ چلا آیا تھا کہ تجھے محافظ اس قصر میں داخل ہونے سے نہ روک دیں۔" دربائی نے جواب دیا۔

قصر کے خادموں سے پتا چلا کہ وہ نمک حرام سرِ شام ہی اپنی خوابگاہ میں چلا گیا تھا جہاں اس کے ہمراہ پانچ حسین ترین نوخیز دوشیزائیں بھی ہیں۔ خادموں ہی نے خوابگاہ کا علم ہوا۔

اب میں نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی تھی۔ دربائی نے خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ کر اس میں ٹھوکر ماری اور با آواز بلند دروازہ کھولنے کا حکم دیا جو اندر سے بند تھا۔

کچھ دیر بعد ہی ابن العلقمی کی غصیلی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے پر ٹھوکر مارنے والے کو برا بھلا کہتا ہوا، دروازہ کھولنے بڑھ رہا تھا کیونکہ اس کے قدموں کی چاپ دروازے سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ غالباً "دربائی کی آواز نہ پہچان سکا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی اندر کا منظر واضح ہو گیا۔ اس کی خوابگاہ میں روشنی تھی۔ دو نوخیز دوشیزائیں ایک چادر سے اپنے برہنہ جسموں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک سامنے بچھی ہوئی مسہری پر دراز تھی اور اس نے بھی چادر سے اپنا جسم ڈھانپ رکھا تھا مگر جلد بازی میں وہ اپنا پورا جسم چادر

Pakistanipoint
Waqar Azeem

میں نہ چھپا سکی تھی۔ اس کی ایک برہنہ ٹانگ چادر سے باہر تھی جس سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بھی برہنہ ہی تھی۔ ایک دوشیزہ زمین پر بچھے ہوئے قالین پر اس طرح اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے دراز گیسوؤں نے بڑی حد تک اس کی برہنگی کو چھپا لیا تھا۔ اسے غالباً "اتنا موقع نہیں مل سکا تھا کہ اپنا مجسم کسی کپڑے سے ڈھک سکتی۔ ان میں سے ایک صراحی و ساغر لیے ابن العلقمی کے پیچھے آچھپی تھی مگر صاف نظر آرہی تھی اور اس کے جسم پر بھی لباس نہیں تھا۔ ابن العلقمی کے جسم کا اوپری حصہ بھی لباس کی قید سے آزاد تھا مگر نچلے حصے پر اس نے ایک چادر لپیٹ لی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موجود سرخی بتا رہی تھی کہ وہ کافی شراب پی چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک بلوریں ساغر موجود تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں وہ تمام منظر دیکھ لیا تھا۔

اپنی خوابگاہ کے دروازے پر مجھے اور دربائی کو موجود پا کر ابن العلقمی کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک ٹک مجھے اور دربائی کو دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ سردار دربائی عربی زبان نہیں جانتا اس لیے میں نے عربی میں ابن العلقمی کو مخاطب کیا۔ "اے نمک حرام، اے غدار، اے محسن کش، اے بغداد کے بے گناہ باشندوں کے قاتل اور اے میرے باپ کو قتل کرانے والے! دیکھ کہ انتقام کا دن آگیا۔ دیکھ اے عیار، اے سازشی! اس کا بیٹا تجھے قتل کرنے تیرے ہی قصر میں گھس آیا جسے تو نے غداری کا الزام لگا کر مروا ڈالا۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ نمک حرام کچھ کہہ سکتا یا سنبھلتا، میرا دایاں ہاتھ بلند ہوا۔ میری تلوار کی بھرپور ضرب اس کے گردن پر پڑی تھی۔ اس کا سر کٹ کر دور جا گرا تھا اور قالین پر اچھلنے لگا تھا۔ اس کی گردن سے خون کا فوارہ سا بلند ہوا تھا جس نے اس لڑکی کے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا جو اس کے پیچھے صراحی و ساغر لیے کھڑے ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے ایک چیخ ماری تھی اور بیہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ ابن العلقمی کا جسم بھی چند لمحے لہرا کر زمین پر آرہا تھا اور وہ چادر کھل گئی تھی جو اس نے اپنے جسم کے نچلے حصے پر باندھ رکھی تھی۔

اپنے باپ کے قاتل کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے میرے دل کو جیسے قرار سا آگیا تھا۔ اس کے بعد میں اسی دن محل سے نکلا جب ہلاکو خان کا اپنا اردو لے کر میا فارقین کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ بغداد میں اس نے اپنی نیابت کے لیے باجو خاں کو چھوڑ دیا تھا۔ باجو خاں کے ساتھ ہی میں نے بھی اس سے بغداد ہی میں رہ جانے کی اجازت لی تھی۔ ہلاکو خاں نے مجھے کاروبار سلطنت سنبھالنے کے لیے کوئی عہدہ دینا چاہا تھا مگر میں نے معذرت کر لی تھی کہ مجھے نہ دولت چاہیے نہ اقتدار! اور ہلاکو خاں میری بات سن کر بہت خوش ہوا تھا کیونکہ میرا طرز عمل عام منگول سرداروں سے قطعی مختلف تھا۔ اس نے بڑے فخر سے اپنی بیوی دوقوز سے کہا تھا کہ اس کے اولوس میں، صرف میں ہی وہ واحد سردار ہوں جسے نہ دولت کا لالچ ہے نہ اقتدار کی پروا!

ہلاکو خاں اپنا اولوس لے کر میا فارقین روانہ ہو گیا تو مجھے زبیر کا خیال آیا جو رضافہ میں میرے باپ کی قبر کی حفاظت کر رہا تھا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا اور مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی مگر اس کے باوجود میں گھوڑے پر سوار ہو کر محل سے چل دیا۔

تباہ و برباد گلی کوچوں اور محلوں سے گزرتا ہوا میں صارفہ پہنچ گیا۔ محل سے چلتے ہوئے منگول سردار باجو خاں سے میں کہہ آیا تھا کہ اگر دو چار دن نہ لوٹوں تو وہ میری طرف سے فکر مند نہ ہو۔ اس کے استفسار پر میں نے اسے بتا دیا کہ بغداد ہی میں رہوں گا مگر تفصیلات بتانے سے گریز کیا تھا۔ میری بات سن کر باجو خاں مسکرا دیا تھا۔ وہ کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ غالباً "یہ کہ میں عیاشی کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے اس کی غلط فہمی کو دور کرنا ضروری نہ سمجھا تھا اور محل سے چلا آیا تھا۔ دراصل اب میرا ارادہ مستقل طور پر رضافہ ہی میں رہنے کا تھا مگر پہلے دو ایک دن رہ کر میں یہ جائزہ لینا چاہتا تھا کہ میری وجہ سے زبیر کو تو کسی پریشانی کا سامنا نہیں ہو گا۔

حسب توقع زبیر مجھ سے بڑی محبت سے ملا۔ میں نے اور اس نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا لیکن اس دوران میں مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی قباحت پیش نہ آئی کہ اس کی معاشی حالت بہتر نہیں تھی۔ اسے نمک حرام ابن العلقمی کے انجام کا علم ہو چکا تھا لیکن وہ اس سے بے خبر تھا کہ ابن العلقمی کو کس نے قتل کیا اور میں نے غیر ضروری سوال جواب سے بچنے کے لیے خود بھی اسے کچھ نہیں بتایا۔ میں مصلحتاً" اس ذکر کو ٹال گیا تھا حالانکہ زبیر اس موضوع پر مزید گفتگو کا خواہش مند نظر آ رہا تھا۔

منگول سردار ہونے کے سبب میرے حصے میں اتنا مال و دولت آیا تھا کہ اگر میں ساری زندگی بھی اسے خرچ کرتا تو ختم نہ ہوتا۔ میں نے اسی لیے زبیر کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر میں مستقل طور پر وہاں رہا تو اس کے اور اپنے اخراجات خود برداشت کروں گا۔ ہر چند کہ زبیر کی غیرت اس پر آمادہ نہ تھی مگر میرے اصرار کو دیکھتے ہوئے اسے راضی ہونا ہی پڑا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ وقتی طور پر ہی سہی میری بات مان لے۔ پھر جب وہ کوئی آمدنی کا ذریعہ تلاش کر لے گا تو میں خود یہ اصرار نہیں کروں گا۔

دوسرے ہی دن میں محل سے اپنا تمام ساز و سامان لے کر رصافہ منتقل ہو گیا۔ باجو خاں سے میں نے کہا تھا کہ میری رہائش بغداد ہی میں رہے گی اور میں وقتاً" فوقتاً" اس سے ملتا رہوں گا۔ زبیر میرے پاس اتنا مال و دولت دیکھ کر سخت حیران ہوا تھا لیکن اس کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اس سلسلے میں مجھ سے کچھ پوچھ سکتا۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ کہیں میں اسے لالچی نہ سمجھ بیٹھوں۔

مجھے زبیر کے ہمراہ رہتے ہوئے تقریباً" درجن بھر دن گزر چکے تھے۔ اس دوران میں، اس نے اور میں نے اپنے باپ کی قبر کے گرد ایک چار دیواری کھینچ دی تھی اور قبر کو محفوظ کر دیا تھا۔ میں اور وہ صبح شام قبر پر جاتے تھے۔

بغداد میں جو تباہی و بربادی پھیلی تھی، اس کے سبب رصافہ کا چھوٹا سا بازار قطعی ختم ہو گیا تھا اس لیے وہاں رہنے والوں کو ضروریات زندگی کی تمام اشیاء لینے قرافہ اور وسط کی منڈیوں اور بازاروں میں جانا پڑتا تھا۔ یہ کام زبیر کے سپرد تھا۔ وہ ہر آٹھویں دن کی صبح سودا خریدنے جاتا تھا اور دوپہر کے بعد لوٹتا تھا۔ وہ بھی ایک ایسی ہی صبح تھی۔ زبیر گھر میں نہیں تھا اور میں تنہا اپنے باپ کے قبر کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔

معاً" میری سماعت سے کسی کے قدموں کی چاپ ٹکرائی۔ کوئی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا۔ میری طرف عقب سے بڑھ رہا تھا۔ میں نے ایک دم پلٹ کر دیکھا اور مبہوت سا رہ گیا چند لمحے مجھے اپنی بصارت پر یقین ہی نہ آیا کہ آنے والی سولدہ ہے۔ وہ مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ پھر جب وہ بولی تو میں چونکا۔ فضا میں جیسے بیک وقت بہت سے اکتارے بج اٹھے تھے۔

"آخر میں نے تجھے تلاش کر ہی لیا۔" سولدہ نے کہا۔

اب وہ میرے بہت قریب آ گئی تھی۔ اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پھر خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور پھر جیسے میری ساری محرومیاں اور سارے دکھ ایک ساتھ جاگ اٹھے تھے۔ میں اس کے سینے سے لگا ہوا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ وہ میری محبوبہ تھی ہمراز تھی، غمگسار تھی اور دنیا میں واحد ہستی تھی جو میرے دکھ بانٹتی رہی تھی، ان کا حتی الامکان مداوا کرتی رہی تھی اور مجھے مستقبل کے لیے روشنی دکھاتی رہی تھی۔

"سولدہ ـــ سولدہ! تو نے آنے میں دیر کر دی، بہت دیر!" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میں لٹ گیا، برباد ہو گیا اور میری زندگی کا آخری ـــ آخری سہارا بھی مجھ سے چھن گیا۔"

سولدہ نے میری پشت سہلائی، مجھے تسلیاں دیں اور پھر میرے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑی توجہ

اور ہمدردی سے میری دکھ بھری داستان سنی اور پھر اس پر افسوس کا اظہار بھی کیا۔

"خیر جو ہو گیا اسے بھول جا بوغا!" اس نے میرے رخساروں سے آنسو پونچھتے ہوئے انہیں چوم کر کہا۔ "تو اس بات کو ذہن سے نکال دے کہ تنہا رہ گیا ہے۔ میں جو تیرے ساتھ ہوں۔"

"تو!" میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "تو بھی اب تک مجھے تنہا چھوڑ کر جاتی رہی ہے اور ـــــ اور اس بار بھی چلی جائے گی، مجھے اکیلا چھوڑ کر!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری آواز بھرا گئی تھی۔

"نہیں بوغا! اب ایسا نہیں ہو گا۔" اس نے پر یقین لہجے میں کہا۔

"تو اب تو مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جائے گی نا!" میں خوشی سے جیسے کھل اٹھا اور اسی کے ساتھ مجھے اس کے دشمنوں کا خیال آ گیا جن سے وہ نبرد آزما رہی تھی۔

میں اس کے دشمنوں کے بارے میں کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بول اٹھی۔ "میں نے ایسی راہ نکال لی ہے کہ اب تو اور میں کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔"

"کیا تو نے اپنے دشمنوں کو ختم کر دیا؟" میں نے پوچھا، پھر مجھے معاً یہ خیال آیا کہ وہ ہمیشہ اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے دامن بچاتی رہی ہے۔ یہ موقع بہتر تھا کہ میں اس سے اس سلسلے میں سب کچھ معلوم کر سکتا تھا کیونکہ اس کے انداز سے جلد بازی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ پھر یہی خواہش میری زبان پر آ گئی۔

"ہاں آج میں تجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گی کیونکہ اب یہ بتانا ضروری بھی ہو گیا ہے۔" اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "میں بھی تیری طرح بہت دکھی ہوں بہت!" وہ پھر ٹھنڈا سانس بھر کر بولی اور پھر اپنی عجیب و حیرتناک داستان سنانے لگی۔

سولدہ نے مجھے اپنی جو داستان سنائی، وہ میرے لیے ناقابل یقین سی تھی اور اس میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جو اس کے سمجھانے کے باوجود میری سمجھ میں نہ آ سکیں۔

سولدہ نے مجھے بتایا کہ وہ اب سے نو سو سال بعد آنے والے زمانے، یعنی اکیسویں صدی میں پیدا ہوئی تھی۔ سولدہ کا تعلق اکیسویں صدی کے ایک شاہی خاندان سے تھا اور اسی خاندان کی حکومت ساری دنیا پر تھی۔ اس نے بتایا کہ اکیسویں صدی میں دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے جس کا تصور بھی میرے لیے محال ہے۔ اس صدی کے رہنے والوں نے ایسی عجیب و غریب چیزیں دریافت کر لی ہیں۔ جنہیں استعمال کر کے وہ گزرے ہوئے زمانوں میں بھی آ جا سکتے ہیں۔ سولدہ اسی لیے اپنے زمانے سے نو سو سال پیچھے سفر کر کے مجھ تک پہنچ گئی تھی۔

اس کی یہ بات مجھے بڑی عجیب سی لگی کہ اس کے زمانے میں دنیا سمٹ کر بہت چھوٹی سی ہو گئی ہے۔ اس بات کی تشریح اس نے یوں کی کہ دنیا کے فاصلے، مختلف ایجادات کے سبب بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور انہیں اتنی تیزی کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے جس کے بارے میں، میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

اس نے مجھے ایک بار پھر اس بات کا یقین دلایا کہ وہ بھی میری ہی طرح ایک عام انسان ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرا تعلق بارھویں صدی سے ہے اور وہ اکیسویں صدی کی ہے۔

اس نے مجھے مختصراً مختلف صدیوں کے بارے میں بتایا جو میرے زمانے کے بعد آنے والی تھیں۔ وہ دنیا کے عروج و زوال اور مختلف صدیوں کے بارے میں بتاتی ہوئی اکیسویں صدی تک پہنچ گئی جس میں ایک بار پھر تقریباً اسی طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے جو بارھویں صدی میں تھے۔ دنیا ایک بار پھر بادشاہت اور ایک شخص ہی کی حکمرانی پر یقین لے آئی تھی مگر فرق یہ تھا کہ اکیسویں صدی میں پورے کرہ ارض پر ایک واحد ہستی حکمراں تھی اور اس کے سوا دوسرا کوئی حکمراں نہ تھا۔

سولدہ نے اپنا وطن یونان بتایا تھا جو قدیم علوم و فنون کا مرکز تھا۔ وہ مجھے کافی دیر تک یونان کے مختلف

عہدوں کے بارے میں بتاتی رہی۔

"اکیسویں صدی کی ابتدا سے اب تک ساری دنیا پر ہمارے خاندان ہی کی حکمرانی تھی۔" سولدہ مجھے بتا رہی تھی اور میں پوری توجہ سے اس کی داستان سن رہا تھا۔ "دنیا کے واحد حکمران میرے والد تھے اسی لیے ساری دنیا پر انہی کا حکم چلتا تھا۔ ان سے پہلے میرے دادا اور ان کے جدامجد دنیا پر حکمرانی کرتے چلے آئے تھے۔ یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ حکمرانی اسی خاندان کے پاس رہے گی۔ میرے والد کو دنیا پر حکمرانی کرتے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا کہ ان کے علم میں ایک بات لائی گئی کہ چند سرپھرے ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ بات ناقابل یقین سی تھی کیونکہ اکیسویں صدی کے عوام ہمارے خاندان کے سوا کسی کو بھی برسراقتدار دیکھنا پسند نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ہمارے خاندان کے سوا کسی اور کی حکمرانی قبول ہی نہیں کر سکتے تھے۔ میرے والد نے اسی لیے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وہ اکیسویں صدی کے چند سرپھرے سائنسداں تھے۔ سائنسداں کا لفظ تیرے لیے نیا ہو گا اس لیے تو یہ سمجھ لے کہ سائنسدانوں سے مراد ایسے افراد ہیں جو دنیا کو نئی نئی ایجادات سے مالا مال کرتے ہیں اور اس ترقی میں حصہ لیتے ہیں۔"

میں اس کے سمجھانے کے باوجود سائنسداں کا مطلب نہ سمجھ سکا مگر میں نے درمیان میں مداخلت کرنا ضروری نہ سمجھا۔

چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولنے لگی۔ "بچپن سے ہی مجھے مختلف زمانوں میں جا کر سیر و تفریح کا شوق تھا۔ ہر چند میرے والدین مجھے بار بار ایسا کرنے سے منع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں یہ شوق چھوڑ دوں مگر میں باز نہیں آتی تھی۔ اس رات جب انقلاب آیا اور سب کچھ تباہ ہو گیا، میں قصر شاہی میں نہیں تھی۔" یہ کہتے ہوئے سولدہ کی آواز بھرا سی گئی اور وہ خود پر قابو پانے کے لیے کچھ دیر کو چپ ہو گئی۔

میں اسے ایک ٹک دیکھتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ اس دوران میں اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ مجھے یقیناً "کوئی دردناک بات بتانے والی تھی۔

جلد ہی سولدہ نے خود پر قابو پا لیا۔ اب اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مضبوطی سے تھام لیا تھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔ پھر وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ "قصر شاہی کے خودکار حفاظتی نظام کی دیکھ بھال اور اس کی نگرانی کا اہم کام سائنسدانوں ہی کے سپرد تھا۔ ان افراد پر میرے والد کو اندھا اعتماد تھا اور یہی اعتماد تباہی کا سبب بنا۔ قصر شاہی کے خودکار نظام کی حفاظت پر جو سائنسداں مقرر تھے، وہ ان سرپھرے سائنسدانوں سے مل گئے جو دنیا پر اپنی حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک رات، انقلاب کی رات ان سائنسدانوں نے خودکار حفاظتی نظام میں ایک ایسا نقص پیدا کر دیا کہ قصر شاہی میں ایک خاص قسم کی ہوا کا داخلہ بند ہو گیا۔ اس ہوا کو ہم آکسیجن کہتے ہیں اور اس کے بغیر انسانی زندگی برقرار نہیں رہ سکتی۔ جیسا کہ بتا چکی ہوں کہ اس رات میں قصر شاہی میں نہیں تھی اس لیے شاہی خاندان کے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے باوجود وہ مجھے ہلاک نہ کر سکے۔ میرے والد، والدہ، بہنیں، بھائی اور دوسرے تمام عزیز مارے گئے۔ شاہی خاندان کے تمام افراد مارے جانے کے بعد ان سائنسدانوں نے اقتدار سنبھال لیا۔ انہیں عوام نے وقتی طور پر اس لیے مجبوراً" قبول کر لیا تھا کہ شاہی خاندان کا ایک فرد بھی باقی نہ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے لاپتا ظاہر کیا تھا کیونکہ انہیں میری لاش نہ مل سکی تھی اور یہ ان کی بدقسمتی ہی تھی کہ اس رات میں قصر شاہی میں نہیں تھی۔ انہیں فوراً" ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور اسی کے ساتھ انہوں نے ایسے انتظامات کر دیے تھے کہ میں اکیسویں صدی میں داخل نہ ہو سکوں۔ پھر انہوں نے میری تلاش شروع کر دی تھی۔ وہ مجھے مختلف زمانوں میں اس لیے ڈھونڈتے پھر رہے تھے کہ اپنے راستے سے ہٹا دیں کیونکہ اگر میں کسی طرح اکیسویں صدی میں پہنچ جاتی تو ان کی حکومت کا تختہ الٹ جاتا

اور ساری دنیا کے عوام مجھے اپنا حکمراں تسلیم کر لیتے۔ پھر ایک طویل عرصے تک ان کے اور میرے درمیان رزم آرائی ہوتی رہی۔ میں نے مختلف زمانوں میں اپنے جو دوست بنائے تھے' اس دوران میں میرے بہت کام آئے۔ پھر میں اپنے دشمنوں پر حاوی ہونے لگی۔ اس کے بعد وہ دن بھی آیا جب میں ان کے تمام حفاظتی حصاروں کو توڑ کر اکیسویں صدی میں جا پہنچی۔ وہ دن ان سرپھروں کی موت کا دن تھا۔ پھر وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ میں کیونکہ خاندانِ شاہی کی واحد فرد تھی اس لیے مجھے دنیا نے اپنا حکمراں تسلیم کر لیا۔ غداروں کو بڑی عبرتناک سزائیں دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ اب بہت جلد میری رسم تاجپوشی ہونے والی ہے جس میں دنیا کے مختلف حصوں کے نمائندے شرکت کریں گے۔ میرے دشمن کیونکہ ٹائم مشین ہی سے فائدہ اٹھا کر مجھے ہلاک کرنے کے منصوبے بناتے رہے تھے اور مستقل طور پر میرا تعاقب کرتے رہے تھے اس لیے اب اس مشین کے استعمال کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا ہے۔ آج شام ساری دنیا میں موجود تمام ٹائم مشینیں تباہ کر دی جائیں گی اور ایسا اس مرکزی سائنسی نظام کے ذریعے کیا جائے گا جس کی تکمیل حال ہی میں سائنسدانوں نے کی ہے۔ وہ مرکزی سائنسی نظام قصرِ شاہی کے اندر قائم کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے دنیا بھر میں موجود تمام ٹائم مشینیں خود بہ خود تباہ ہو جائیں گی۔ میں اسی لیے اس وقت سے پہلے تیرے پاس آئی ہوں کہ تجھے اپنے ساتھ یہاں سے لے جاؤں کیونکہ آج کے بعد اگر میں چاہوں بھی تو اپنے زمانے سے کسی اور زمانے میں نہیں جا سکتی۔"

یہ کہہ کر سولدہ خاموش ہو گئی۔

"سولدہ ... سولدہ تو ... تو مجھے اپنے ساتھ لے جانے آئی ہے اور ... اور خود ... یہاں نہیں رہ سکتی۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کیونکہ میں اس کا مقصد اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور یہ بھی کہ اب وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والی ہے۔

"ہاں' بوغا ہاں!" وہ جلدی سے بولی۔ "اب تو ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا کیونکہ میں تجھے اپنے زمانے میں لے جاؤں گی۔"

"نہیں ... نہیں سولدہ!" میں عالمِ اضطراب میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تیرے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔"

"مگر کیوں؟" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس لیے کہ میں نے اپنے باپ کی قبر کے سامنے کھڑے ہو کر ایک عہد کیا تھا کہ بغداد سے اب اور کہیں نہیں جاؤں گا۔" پھر میں جذباتی سا ہو گیا اور نسبتاً" بلند آواز میں بولا۔ "میں اس مٹی کو چھوڑ کر اب کبھی اور کہیں نہیں جاؤں گا جس میں میرا باپ سو رہا ہے۔ اب ... اب میری زندگی کا سرمایہ یہی مٹی ہے۔"

سولدہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر میں نے اس کے ہونٹ لرزتے دیکھے۔ اس نے بڑھ کر میری پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ میرا سارا وجود جیسے پیشانی میں منتقل ہو گیا۔ پھر چند لمحے بعد اس کی لرزتی ہوئی سی آواز سنی۔ "کاش ... کاش ... میں تیرے عہد میں رہ سکتی بوغا! مگر میں ... میں مجبور ہوں۔ اگر میں نے دنیا کی حکمرانی قبول نہ کی تو ... تو دنیا ایک بار پھر سرپھرے سائنسدانوں کے چنگل میں پھنس جائے گی اور تباہی کے کنارے جا پہنچے گی کیونکہ انہیں روکنے اور ٹوکنے والا کوئی نہ ہو گا۔ وہ خود بر سرِ اقتدار ہوں گے اور ... اور عوام کو اپنا غلام بنا لیں گے جس کا تلخ تجربہ چند ہی سالوں میں ساری دنیا کے عوام کو ہو چکا ہے۔ مجھے ... مجھے معاف کر دینا بوغا! یہ سوچ کہ میں ... میں بھی تیری ہی طرح مجبور تھی۔"

میں نے چاہا کہ جواب میں کچھ کہوں مگر میرے ہونٹ صرف کانپ کر رہ گئے۔ اس نے ایک بار پھر میری پیشانی چومی اور اس کے ساتھ میں نے لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سنی۔ سولدہ جا چکی تھی' ہمیشہ کے لیے' ہمیشہ کے لیے!